ترجمان جامعہ رشیدیہ ساہیوال

الرشید

جلد ۵ شمارہ ۲، ۳ صفر المظفر، ربیع الاول ○ فروری، مارچ

دارالعلوم دیوبند نمبر

مکتبہ محمودیہ جامعہ رشیدیہ کریم پارک لاہور

شافعِ کون ومکاں کی راہ پر لاتا رہا | گمرہانِ شرک کو توحید سکھلاتا رہا

پرچمِ اسلام ابرِ درخشاں کے دوش پہ | بحر و بر کی چار دیواری پہ لہراتا رہا

ہمرہانِ دل گرفتہ کو باعلانِ جہاد | تیغِ جوہردار کا آئینہ دکھلاتا رہا

اس کے سینے میں خدا کا آخری پیغام تھا | وہ خدا کی سرزمیں پر حجۃ الاسلام تھا

حضرات اکابر رشیدیہ و بزرگان رائے پور نام

- حضرت مولانا الحاج محمد عبداللہ رائے پوری خلیفہ حضرت گنگوہی (مؤسس اول جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا فضل احمد رائے پوری خلیفہ حضرت مولانا رائے پوری (مہتمم اول جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ رائے پوری تلمیذ حضرت شیخ الہند (صدر مدرس و مفتی جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا حافظ احمد الدین رائے پوری خلیفہ حضرت مولانا رائے پوری (واعظ و مفتی جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا مفتی رحمت علی بہوڑی خلیفہ حضرت مولانا رائے پوری (رکن دارالعلوم دیوبند و سرپرست جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا خیر محمد جالندھری بانی خیر المدارس (رکن دارالعلوم دیوبند و سرپرست جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا رشید احمد مفتی رشیدی (بانی جامعہ رشیدیہ [illegible])
- حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (فضلاء جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا محمد علی جالندھری (بانی مجلس تحفظ ختم نبوت) فضلاء جامعہ رشیدیہ
- حضرت مولانا محمد انوری جالندھری (تلمیذ خاص حضرت مفتی فقیر اللہ صاحبؒ)
- حضرت مولانا عبدالجبار ابوہری (تلمیذ خاص حضرت مفتی فقیر اللہ صاحبؒ) مبلغ دارالعلوم دیوبند
- حضرت مولانا محمد ابراہیم سلیم پوری (میاں چنوں)، سرپرست جامعہ رشیدیہ
- شہید فی سبیل اللہ حضرت مولانا حافظ قاری لطف اللہ (مؤسس مبلغ اعظم جامعہ رشیدیہ)
- استاذ العلماء حضرت مولانا الحاج عبدالعزیز رائے پوری جالندھری مدظلہ (خلیفہ حضرت رائے پوری سرپرست جامعہ)
- حضرت پیر جی الحاج مولانا عبداللطیف رائے پوری مدظلہ (چیچہ وطنی) خلیفہ حضرت رائے پوری سرپرست جامعہ

خادمان جامعہ اشرفیہ لاہور،

کتاب وسنت کے خادم ادارہ!

دارالعلوم دیوبند

کے متعلق ماہنامہ الرشید کے خصوصی شمارہ شائع کرنے پر

ادارہ الرشید اور جامعہ رشیدیہ ساہیوال کو

پیش کرتے ہیں اور دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالے

اس محنت کو قبول فرمائیں!

اراکین واساتذہ وطلباء

جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن لاہور

قال الله تعالیٰ فی القرآن العظیم
ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن
رسول اللہ وخاتم النبیین
قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم
انا خاتم النبیین لا نبی بعدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تشکر و اعتذار

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم نے ہمت "دارالعلوم دیوبند نمبر" شائع کرنے کی توفیق بخشی تاہم یہ حسرت بھی رہی کہ دارالعلوم کے شایانِ شان نمبر مرتب نہیں کر سکے۔ بہرحال جو کچھ ہو سکا پیشِ خدمت ہے دارالعلوم کی صدسالہ تقریبات پر اس طرح کے کئی ضخیم نمبر نکل سکتے ہیں۔ ہم ان شاء اللہ آئندہ سال "شخصیات نمبر" شائع کریں گے۔ کہ ۱۲۹۰ھ/۲۰۰۰ء میں دارالعلوم دیوبند کے سلسلہ جو جو ہستیاں منارہ بلند ...

جہاں ہم اپنے اکابر اور احباب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے مضامین عطا فرمائے، وہاں اُن حضرات سے معذرت خواہ بھی ہیں کہ جن کے مضامین شاملِ اشاعت نہیں ہو سکے ــــ **خصوصاً** حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی، حضرت مولانا عبدالشکور ترمذی، محترم مولانا قاری نورالحق علوی ایڈووکیٹ اور برادرِ مکرم مولانا زاہد الراشدی کی طرف سے شرمندہ ہیں کہ ان کے مضامین شامل نہیں ہو سکے۔ حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب کا ایک مضمون رہ گیا۔ ان سے بھی بصد ادب معذرت ہے۔ نہ وقت تھا نہ گنجائش۔

حضرت مفتی محمود صاحب، مولانا قاری نورالحق، مولانا زاہد الراشدی تینوں حضرات کے مضامین ایک ہی انداز اور ایک ہی طرح کے تھے۔ لہٰذا قاری صاحب کے مضمون کو لے لیا گیا اور باقی دو چھوڑنا پڑے۔

یہاں قاضی محمد اسمٰعیل صاحب مالک کنول آرٹ پریس کا شکریہ ادا کرنا بھی واجب ہے کہ جن کی انتھک محنت سے تمام رسالہ بروقت مکمل کرنے پر مرکوز رہیں۔ پروگرام کے مطابق اتنے دنوں میں پانچ صد صفحات شائع ہونا بھی مشکل نظر آتے تھے۔ جب کہ ان کی توجہ سے آٹھ صد صفحات شائع ہو گئے۔ اپنے رفقائے کار مولانا سعید الرحمٰن علوی (ایڈیٹر خدام الدین)، جناب اکرام القادری ایڈیٹر ترجمان اسلام، مولوی محمد دین شوق اور رانا عنایت اللہ نے جس خلوص اور محنت سے ہر ہر مرحلے پر ساتھ دیا: وہ بھی لائقِ صد تحسین ہے۔

حضرت سید نفیس رقم کی زیر سرپرستی شعبۂ کتابت میں برادران، عبدالرشید، محمد جمیل حسن، معراج الدین: چوہدری محمد صادق: عزیزم عبدالشکور، محمود الحسن نے جس لگن سے کام کیا۔ قابلِ صد ستائش ہے ـــ خصوصاً برادرم عبدالرشید نے جس توجہ سے کام کیا، اس پر وہ بہت تبریک کے مستحق ہیں۔

آخر میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم العالی کے تہہ دل سے ممنون ہیں: جنہوں نے ہماری استدعا کو قبول فرما کر ۲۸ مارچ کو افتتاح کے لیے وقت مرحمت فرمایا۔ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ کا شکریہ ادا کرنا ان کے لطف و کرم اور شفقت بے پایاں کی توہین ہے۔

قارئین سے استدعا ہے کہ وہ نمبر میں حصہ لینے والوں کے لیے دعا کریں۔

فاضل حبیب اللہ رشیدی

عبدالرشید ارشد

عبدالرشید ارشد

آفتاب آمد دلیل آفتاب

دارالعلوم دیوبند کی ہمہ جہتی خدمات کا انکار کرنا ایسے ہی ہے جیسے دن کی روز روشن میں یہ کہے کہ مجھے وجود آفتاب کی دلیل دو۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب" لیکن اس کے باوجود اگر کوئی انکار کرتا چلا جائے تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم — چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

دارالعلوم دیوبند نمبر قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ دارالعلوم کا قیام کن حالات میں ہوا اور ایک سو دس سال میں اس نے کیا کیا خدمات انجام دیں۔ اس کے تذکرے تعارف کے لیے ماہنامہ الرشید نے اپنا خصوصی نمبر دارالعلوم دیوبند پر شائع کرنے کا اعلان و اہتمام کیا۔ ایک ایسا ادارہ جس کے ایک ایک فرد کے حالات و سوانح بیان کرنے کے لیے صدہا صفحات پر مشتمل کئی کئی جلدیں لکھی جا چکی ہوں اس کے حالات و تاریخ بیان کرنے کے لیے یقیناً یہ نمبر کافی نہیں تاہم یہ خیال کرتے ہوئے کہ کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا مفید ہے۔ اجمال و اختصار کے ساتھ تعارف کرانے کی کوشش کی ہے اور انشاءاللہ آئندہ اس سلسلے میں مزید کام کرتے رہیں گے۔ اس کوشش کو اس کا پہلا قدم سمجھنا چاہیے دوسرے قدم تدریجاً اٹھتے رہیں گے۔

سربراہ خاندان

جس طرح ایک خاندان کے سربراہ کو اپنے کنبہ و خاندان کی تمام ضروریات کے فراہم کرنے، اپنے آباؤاجداد کی خصوصیات و صفات کو قائم رکھنے اور ہر ہر فرد کی تعلیم و تربیت، لباس و خوراک، رہائش و آسائش کا خیال رکھنا پڑتا ہے اسی طرح ملت اسلامیہ بھی اسلامی برادری کے علی حسب مراتب سربراہ ہوتے ہیں۔ برصغیر کی تاریخ پر نظر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذمہ داری ایک وقت میں حضرت مجدد الف ثانیؒ پر تھی۔ پھر ایک وقت میں اس کے حامل الامام المحدث شاہ ولی اللہؒ تھے۔ ان کے بعد ان کے اخلاف و صاحبزادگان نے اس فرض کو سنبھالا۔ جس کے ایک دور کی قیادت و سیادت امیرالمومنین حضرت سید احمد شہید کے حصہ میں آئی اور اس کے بعد یہ کام اللہ تعالیٰ نے شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر

ط ———

۷

گئی اور ان کے جانشینیان ستے لیا اور یہ بوجہ ان کو ایسے ناخوشگوار حالات اور نامساعد وقت میں اٹھانا پڑا کہ جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کلیۃً ختم ہو چکی تھی اور چھ ہزار میل دور سے آئے ہوئے ذہنی طور پر قابض ومسلط ہو چکے تھے۔ اور ملک کی حالت ایسی ہوشربا اور روح فرسا ہو چکی تھی جس کا نقشہ میکم ارنیسٹ ممبر کونسل نے ایک ...... لندن سے لکھا تھا۔

ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا۔ ان کے قانون وراثت کو منسوخ کیا۔ بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا۔ مذہبی رسم و رواج کی توہین کی عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ سرکاری کاغذات میں انہیں کافر لکھا۔ امراء کی ریاستیں ضبط کر لیں۔ لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا۔ انہیں تکلیف دے کر مالگزاری وصول کی۔ سب سے اونچے خاندانوں کو برباد کر کے انہیں آوارہ گرد بنا دینے والے بندوبست قائم کئے[1]

لارڈ ڈلہوزی وائسرائے کی نسبت ایک قابل مصنف اور فوجی افسر نے لکھا۔

"وہ ہندوستانیوں کے عقائد اور محسوسات، عادات اور روایات کا کوئی لحاظ نہ کرتے تھے"[2]

مورخ کئی تسلیم کرتا ہے کہ:۔

"ایک مقام میں چھ ہزار ہندوستانیوں کا قتل عام کیا گیا۔ تنہا الہ آباد کے علاقہ میں میں نے اتنے ہندوستانیوں کو مروا ڈالا جتنے انگریز مرد و عورت اور بچے بوڑھے ہندوستان بھر میں ۱۸۵۷ء کے سارے ہنگامے میں انقلابیوں کے ہاتھ سے انقلاب کی وجہ سے نہیں مرے ہیں"[3]

ایک انگریز افسر نے لکھا ہے کہ:۔

"الہ آباد سے دلی تک ہزاروں بے قصور دیہاتیوں کو انگریزوں نے مار ڈالا، ان کے بدنوں کو سنگینوں سے چھیدا جاتا تھا اور ہندوؤں کے منہ میں گائے کا گوشت ٹھونسا جاتا تھا"[4]

ٹامسن نے لکھا ہے:۔

"دہلی کے کچھ مسلمانوں کو ننگا کر کے اور زمین سے باندھ کر سر سے پاؤں تک جلتے ہوئے تانبے کے ٹکڑوں سے اچھی طرح داغ دیا جاتا اور مسلمانوں کو سور کی کھالوں میں سی دیا جاتا"[5]

خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے کہ:۔

---

[1] منقول از مسلمانوں کا روشن مستقبل مولفہ سید طفیل احمد منگلوری (علیگ) مطبع علیمی دہلی ۱۹۴۵ء صفحہ ۸۶
[2] فوجی بغاوت از لیفٹیننٹ جنرل میک ڈونلڈ صفحہ ۱۲ بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۸۸
[3] ۔ [4] ۔ [5] بحوالہ مذکور روشن مستقبل

"خواتین عصمت قلعہ کے خوف سے کنوؤں میں گر پڑیں یہاں تک کہ پانی سے اوپر ہوگئیں۔ جب زندہ عورتوں کو کنویں سے نکالنا چاہا تو انہوں نے کہا ہمیں گولی سے مار دو تلوار نہیں ہم شریفوں کی بہو بیٹیاں ہیں ہماری عصمت خراب نہ کرو۔ بعض لوگوں نے اپنی عورتوں کو قتل کرکے خودکشی کرلی۔"

(بہادر شاہ کا مقدمہ از خواجہ حسن نظامی دفتر اخبار منادی دہلی)

یہ تو تھے مظالم جو انگریز نے کیے تاکہ اس کی حکومت مستحکم ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریز نے اپنے مذہب عیسائیت کے فروغ اور ہندوستانیوں کو بہتیرے دینے کو عیسائی بنانے کے لیے جو مہم شروع کی اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ دارالحکومت دہلی میں جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر عیسائی پادری اسلام کی حقانیت کو چیلنج کرتے اور تین خداؤں کی دعوت دیتے نظر آتے (اس کی کچھ تفصیل آئندہ اوراق میں آرہی ہے) یہ تھے وہ حالات جن میں دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا۔ پھر اس دارالعلوم کے خدام نے جو دراصل کتاب وسنت کے خادم تھے ہر ہر محاذ پر کس استقلال و استقامت، تدبر و حکمت، اور جہد و عمل سے کام کیا۔ وہ تاریخ تیرہ صدیہ کا جلی عنوان بن چکا ہے۔ جو نہ مٹ سکتا ہے اور نہ ہی مخالفوں یا حاسدانہ اور مخالفانہ پروپیگنڈہ سے اس کو دھندلایا جاسکتا ہے۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا		ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

خادمانِ علوم و اعمالِ نبوت

ان حضرات کی اصل حیثیت کتاب وسنت کے خدام کی تھی اور اس سلسلے میں انہوں نے دین الٰہی (اسلام) کی جو گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ اس کے لیے اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ مغربی پاکستان میں ۱۹۶۲ء میں کل مدارس دینیہ کی تعداد ۵۰۵ تھی (یہ وہ مدارس ہیں جن کے حالات انتہائی محدود وسائل رکھنے والے ایک شخص حافظ نذر احمد صاحب نے مہیا کیے۔ ؎ سیکڑوں مدارس اس کے علاوہ اور ہوں گے) جن میں ۲۹۱ مدارس دیوبندی اور ۱۷۲ مدارس بریلوی، اہلحدیث اور شیعہ حضرات کے ہیں اور انہی ۲۶۲ میں ۹۰ مدارس ایسے ہیں جو بلاتخصیص مسلک کام کر رہے ہیں اور ان میں بھی یقیناً اکثریت [illegible] مدارس کی ہوگی جو دارالعلوم دیوبند سے قریب اور دوسروں سے دور ہوں گے ——— اب ایک اور انداز سے دیکھئے کہ مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی تعداد کیا ہے۔ دیوبندی مکتب کے بڑے

؎ حافظ نذر احمد صاحب مسلم اکادمی لاہور نے ایک کتاب "جائزہ مدارس عربیہ مغربی پاکستان" کے نام سے شائع کی ہے۔ یہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

لہ ———

مدارس کا جائزہ مدارس عربیہ کو سامنے رکھ کر یا براہ راست مدارس کو خط لکھ کر یا وہاں جاکر اندازہ لگائیے تو معلوم ہوگا کہ علماء کی دیوبندی مدارس میں کل مدارس کے علماء کا اسی فیصد ہوگی ———— ان مدارس سے کتاب وسنت کی کس قدر اشاعت ہوئی، کس قدر مصنف۔ مبلغ۔ مدرس۔ مناظر۔ خطباء اور صوفیا پیدا ہوئے اور انہوں نے ہر شعبۂ زندگی میں کس قدر کام کیا۔ اس کی بھی قدرے تفصیل آئندہ اوراق میں ملے گی۔ یہاں اس کی تفصیل تحصیل حاصل ہوگی۔ ہم یہاں بعض دوسری اہم باتوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

چند مذہبی مغالطے

دارالعلوم کے قیام سے پہلے، قیام پر، بعد اور آج بعض حلقوں کی طرف سے پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ دارالعلوم کے بانیان۔ سرپرست اور اساتذہ کی بعض عبارات ایسی ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر مانتے ہیں۔ نور نہیں مانتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ ان کو مختار کل نہیں مانتے اور ہروقت ہر جگہ حاضر ناظر وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ واقعتہً ان بزرگوں کا یہی عقیدہ و یقین ہے کہ مختار کل عالم ماکان ومایکون (ماضی و حال و استقبال) ازل تا ابد اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کی صفات و خصوصیات صرف خدائے عزوجل کو حاصل ہیں اور یہ صفات اسی کے لیے مختص ہیں ———— یہ چیزیں یا صفات اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں مان لی جائیں تو پھر خدا اور رسول میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ معبود، حضورﷺ عابد، اللہ تعالیٰ خالق۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق ہیں۔ اگر ہم بھی ان صفات خداوندی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں مان لیں تو پھر اسلام اور عیسائیت میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ تمام صفات تسلیم کر لی جائیں تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت۔ صبر و استقامت۔ توکل علی اللہ اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین۔ اس کے سامنے گریہ وزاری وغیرہ کے تمام باب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے خارج کرنا پڑیں گے اور پورے قرآن کا انکار کرنا پڑے گا اور پھر اللہ تعالیٰ کا فرمان بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے کہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ	بے شک تمہارے لیے رسول اللہؐ کی زندگی میں اسوۂ حسنہ ہے
قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ	(اے پیغمبرؐ) کہہ دیجئے اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے

اب فرمائیے کہ اگر الوہی صفات حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تسلیم کر لی جائیں تو پھر ان کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کیسے کیا جا سکتا ہے، اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام عالم الغیب تھے تو پھر ان سے بیٹے کی قربانی طلب کرنے کا کیا مقصد ؟ کہ جب انہیں صفت علم غیب سے یہ پتہ ہو کہ بیٹا قربان نہ ہوگا تو پھر ان سے قربانی طلب کرنا،

ل ————

اس کا قربانی کرنا اور پھر اللہ تعالیٰ کا یہ کہنا کہ وہ ہر آزمائش میں پورے اترے ۔ ان سب حقائق کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے ۔ سوال ہوگا کہ بات تو حضور علیہ السلام کی ہو رہی ہے اور درمیان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ آگیا ۔ تو گذارش ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام ایک باڑوں کے فرد ہیں ۔ علیحدہ بات ہے تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض ۔ مگر یہ گروہ جس کا ذکرِ خیر ہو رہا ہے وہ تو تمام اولیاء تک کو ان صفات کا حامل قرار دیتا ہے ۔ بہشتی زیور سے کون واقف نہیں ، مولانا احمد رضا خاں کے ایک خلیفہ صاحب نے " اصلاح بہشتی زیور" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس کے تعارف و اشتہار میں یہ عبارت درج ہے :

" اس میں انبیاء کرام و اولیائے عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی نیاز و فاتحہ دینے ، نذر منت ماننے ۔ ان سے مدد چاہنے ۔ انہیں پکارنے یا رسول اللہ ، یا علی ، یا غوث کہنے ، انہیں ہر حال کی خبر رہنے ، ان کے نام کا جانور پالنے ، چھوڑنے ، ذبح کرنے ، ان کے مزارات پر عرس کرنے ، چراغ جلانے ، چادر ، مٹھائی ، حلوا ، گلگلے وغیرہ چڑھانے ، ان کے نام کا وظیفہ کرنے ، بازو پر پیسہ باندھنے ، ان کی دہائی دینے ، حذاق رات کرنے ، کسی جگہ کا ادب و تعظیم طواف و سجدہ کرنے ، کسی کے سامنے جھکنے ، کھڑا رہنے ، عبدالنبی ، غلام رسول ، نبی بخش ، علی بخش ، غلام محی الدین وغیرہ نام رکھنے ، گلے میں کلاوا ڈالنے ، بدھی پہننے ، سہرا باندھنے اور ان کو مثل بہت سی باتوں کو جو بہشتی زیور میں مذکور اور وہابیہ کے نزدیک شرک و کفر و حرام و بدعت تھیں ، تردید اور علاوہ ان کے بہت سے مسائل فقہ کی اصلاح و تصحیح کی گئی ہے "

(اشتہار مندرجہ بر ٹائٹل صفحہ آخر اصلاح بہشتی زیور صفحہ ۴۳۲)

(مطبوعہ مسلم پریس دہلی

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے

جو دین بالکل سادہ اور ان معلوم اعمال و افعال جو کتاب و سنت اور امت کے متواتر و متوارث عمل سے ثابت ہیں ، سے عبارت تھا ! اور جس سادگی ، قناعت ، کفایت شعاری اور توحید خالص کی تعلیم اسلام نے دی تھی کیا یہ سب کچھ اسی اسلام کا حصہ ہے ؟

ایک نیا مغالطہ

اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اتباع کی بدولت امت کے افراد کو بعض ایسی کرامتیں یا فضیلتیں حاصل ہو جاتی ہیں جن کو کشف و کرامت کے اصطلاحی نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ، جیسے

م ——

حضرت فاروق اعظمؓ کا مسجد نبوی میں خطبہ دیتے ہوئے "یا ساریۃ الجبل" کہنا، اور اس آواز کا سیکڑوں میل دور سنا جانا، اکابر دیوبند اس دور میں پورے عالم اسلام میں اتباعِ سنت میں ایسا ممتاز مقام رکھتے ہیں کہ باید و شاید اسی اتباع و اطاعت کی بدولت ان سے کرامتیں اور خرقِ عادت قسم کے واقعات ظہور میں آئے جن کا ذکر کتب میں آیا اور اس شمارہ میں بھی بعض چیزوں کا ذکر ہے۔ اب حاسدین ان چیزوں کو لے کر عام کر رہے ہیں کہ دیکھو یہ اپنے بزرگوں میں تو ان کو مانتے ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں۔ یہ مغالطہ اس لئے دیا جا رہا ہے کہ پہلے حربے تو ناکام ہو گئے اب یہ نیا ہتھیار استعمال کیا جائے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ بیشک ہمارے ان اکابر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالِ اتباع کے طفیل اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما دیں لیکن اس کے باوصف ہم ان کو خدا کے عاجز بندے ہی سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں۔

سیاسی مغالطے

ایک اور حربہ جس کا استعمال ملک کے مختلف لوگ موقع بموقع استعمال کرتے رہتے ہیں، ان میں سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور ان کے رفقائے کار کا تحریکِ پاکستان کی (قیام پاکستان سے قبل) مخالفت کرنا اور علامہ اقبالؒ کا حضرت مدنیؒ کے متعلق فارسی میں ایک نظم کہنا ہے۔ ہم یہاں اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہنا چاہتے، صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ قیامِ پاکستان سے قبل جب یہ تحریک مشاورتی مرحلہ میں تھی۔ سے اختلاف کفر تھا نہ جرم، ایک نظریہ کی حمایت و مخالفت تھی بالکل اسی طرح جس طرح سفر کرنے سے پہلے ایک ہی خاندان کے افراد میں اختلاف ہوتا ہے کہ سفر کیا جائے یا نہ اور اگر کیا جائے تو پھر ریل میں کیا جائے۔ ہوائی جہاز میں کیا جائے یا بس اور کار میں۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ قیامِ پاکستان کے بعد اپنے ان لاکھوں متوسلین کو جو پاکستان میں تھے، ہمیشہ اس بات کی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ وہ پاکستان کی ترقی و استحکام کے لئے سینہ سپر رہیں اور خود دعائیں کیا کرتے تھے بلکہ یہاں تک فرمایا کہ "پاکستان کا مسئلہ اب مسجد کی حیثیت رکھتا ہے۔" اور اس بات کے گواہ و راوی سیکڑوں لوگ ہیں[1]

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور مشرق وسطے کے دورے سے واپسی پر چند گھنٹوں کے لیے کراچی ایئرپورٹ پر اترے ان چند گھنٹوں سے وقت نکال کر قائد اعظم کے مقبرے پر گئے اور دعائے مغفرت کی اخبارات میں اسکا فوٹو آیا

---

[1] ڈاکٹر عبدالرحمٰن شاہ ولی پیپلز اوپن یونیورسٹی اسلام آباد نے بتایا کہ میں نے حضرت سے یہ فقرہ پچاسوں آدمیوں کی موجودگی میں دیوبند میں سنا۔

ن

"نوائے وقت" کے بانی و ایڈیٹر حمید نظامی مرحوم (جو مدنیان میں سے مولانا کے سب سے بڑے سیاسی مخالف تھے)
نے اداریہ نوٹ لکھا اور پاکستان کے ان حکام و مقتدر حضرات کی مذمت میں سخت الفاظ لکھے کہ جنہوں نے مولانا مرحوم
کے مقام کے مطابق آداب اختیار نہیں کئے ——— باقی رہی علامہ اقبالؒ کی نظم کی بات تو صاف کیجیے مسلّم
علامہ اقبال کے پورے احترام کے باوجود ان کو پیغمبر یا صحابی نہیں سمجھتے وہ مسلمانوں کے عظیم مفکر تھے۔ ان کو
ایک غلط بات پہنچی اور انہوں نے اس سے متاثر ہوکر فوراً ایک نظم کہہ دی اور پھر حضرت مدنیؒ کی تقریر کے الفاظ
"قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کے غلط تھے اور علامہ اقبالؒ نے "ملت از وطن است" استعمال کیا ہے اور پھر اس
نظم میں حضرت مدنیؒ کی توہین کی گئی ہے مگر دیوبند کو خراج تحسین پیش کیا ہے ——— اور پھر جب ہم یہ
دیکھتے ہیں کہ اسی پاکستان میں ایوب خان کے زمانے میں تحریک جمہوریت کے سربراہ نوابزادہ نصراللہ خان تھے اور
ان کے تحت قیوم مسلم لیگیں اور دیگر جماعتیں کام کر رہی تھیں۔ مس فاطمہ جناح کے پشاور میں استقبال میں عبدالولی خان
کے علاوہ کوئی آگے نہ آیا اور لاکھوں کے جلسہ کی صدارت خان صاحب موصوف نے کی اور مس فاطمہ جناح نے
خطاب فرمایا۔ مغربی پاکستان (ون یونٹ) کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان بنے۔ مفتی محمودؒ صاحب سرحد کے وزیراعلیٰ
رہے اور آجکل مرکزی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف ہیں کیا ان سب باتوں کے بعد بھی اس بات میں کوئی وزن رہ جاتا
ہے کہ فلاں کانگریسی تھا یا پاکستان کا مخالف تھا اور اب مولانا محمد ضیاء القاسمی اسلامی مشاورتی کونسل کے ممبر اور مولانا
غلام غوث ہزاروی حکومت کے حلیف ہیں لیکن شقاوت قلبی اور ذہنی تعیش کا کیا علاج کہ یہ بات ہمیشہ دہرائی جاتی ہے
ان لوگوں کو یہ کیوں یاد نہیں رہتا کہ پاکستان بنانے میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی
محمد شفیع مدظلہ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت مفتی محمد حسن امرتسری اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے تقریباً سبھی
خلفاء قائدانہ حیثیت رکھتے تھے بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ پاکستان کی حمایت نہ کرتے تو شاید پاکستان کا خواب
شرمندۂ تعبیر ہی نہ ہوتا۔ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے بانی پاکستان کی نماز جنازہ پڑھائی کراچی میں پرچم کشائی علامہ
شبیر احمدؒ نے اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے کی۔

لہو پکارے گا آستین کا

گزشتہ سطور میں تو ہم نے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو مذہبی یا سیاسی مغالطے کے طور پر اٹھائے جاتے
ہیں۔ اب یہاں ہم ایک ایسے مختصر سے گروہ کا ذکر کرتے ہیں جو اپنے آپ کو سواد اعظم سمجھتا ہے اور اس فریب

۱؎ موصوف حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے مرید ہیں۔

میں مبتلا ہے کہ شاید پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت ان کے ساتھ ہے۔ حرمین شریفین کے اماموں کی پاکستان میں تشریف آوری نے کیا ان کی آنکھیں نہیں کھول دیں اس مختصر سے گروہ کے سرخیل اور اکابر کا۔ جن میں سے ایک کی عبارت "گنگوہ والی" اوپر پیش کی جا چکی ہے) فتویٰ یہ ہے کہ یہ لوگ کافر ہیں اگر یہ لوگ کافر ہیں تو پھر کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، ملتان، حیدرآباد میں (سب ملا کر ایک کروڑ کی تعداد میں) جن مسلمانوں نے امام حرم کے پیچھے نماز ادا کی ہے۔ وہ سواد اعظم تو یقیناً ہے لیکن ان عقائد کا حامل نہیں جن کو آپ اصل اسلام سمجھتے ہیں اب ہم یہاں ان حضرات کے چند فتوے نقل کرتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ لوگ ملت اسلامیہ کی کیا خدمات سرانجام دیتے رہے۔

امیرالمومنین حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، حضرت محمد قاسم نانوتویؒ، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ۔ حضرت مولانا شیخ الہندؒ حکیم الامت مولانا اشرف تھانوی رحمہم اللہ اجمعین کے متعلق ان کے فتویٰ کی عبارت تو ادب مانع ہے ایسا مرقع ہے کہ جس کی داد نہیں دی جا سکتی ایک فتنہ پڑھئے

(۱) "خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ طائفے سب کے سب کافر، مرتد ہیں باجماع امت اسلام سے خارج ہیں۔ (حسام الحرمین، صد ۱۱۳) (۲) سید احمد خلیل احمد، رشید احمد، اشرف علی کے کفر میں جو شک کرے خود کافر (۳) اس میں (حسام الحرمین) نانوتوی و دیوبندیوں کی نسبت صاف تصریح ہے کہ من شک فی کفرہ فقد کفر جو ان کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے" (عرفان شریعت صد ۲۲، ج ۲) حمد و صلوٰۃ کے بعد میں کہتا ہوں کہ یہ طائفے جن کا تذکرہ سوال میں واقع ہے غلام احمد قادیانی اور رشید احمد اور جو اس کے پیرو ہوں جیسے خلیل احمد انبیٹھوی اور اور اشرف علی وغیرہ ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں نہ شک کی مجال بلکہ جو ان کے کفر میں شک کرے بلکہ کسی نہ کسی حال میں انہیں کافر کہنے میں توقف کرے اس کے کفر میں شک نہیں (حسام الحرمین صد ۴۳)

یہاں تک مولانا احمد رضا خان کے فتوے ہیں اب ایک مشہور و معروف کتاب تجانب اہل السنۃ[1] سے چند فتوے نقل کیے جاتے ہیں۔

مولانا شبلی نعمانیؒ

اور ان ضلع کی نیچری لیڈروں کا مقصد سیاست کے پردے میں بے دینی و دہریت پھیلانا ہے ان ضلع کی لیڈروں میں اعظم گڑھ کے مولوی شبلی بہت نمایاں ہستی رکھتے ہیں۔ صد ۲۸۹

قسم کیے نابکار جو اللہ اور رسول جل جلالہ و صلی اللہ علیہ وسلم کی کھلی توہینیں و صریح تکذیبیں کرنے والوں

---

[1] یہ کتاب ۱۳۶۱ھ میں شائع ہوئی جس کے مؤلف مولوی محمد طیب صاحب دانا پوری فاضل مرکزی مدرسہ حزب الاحناف لاہور ہیں اور اس پر منجملہ اور تقریظات کے ملا اعلیحضرت مولوی حشمت علی کی تقریظ بھی ہے

آئے اور ان پر بھروسہ کرکے ارشادات الٰہیہ کو جھٹلائے" بحکم شریعت مطہرہ یقیناً بے ایمان و بے دین ہے صہ۲۳۲
شاید ایسی باتوں کو دیکھ کر ڈاکٹر مرحوم نے کہا تھا ۔ ؎

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی — اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی

مولوی دیدار علی صاحب[1] کا تکفیری فتویٰ جو انہوں نے علامہ اقبالؒ کے متعلق دیا تھا وہ مشہور و معروف ہے جس پر علامہ اقبال نے مبارکباد دی ۔ ؎

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے — کہ یک زباں ہیں فقیہان شہر میرے خلاف

جو لوگ شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے متعلق علامہ اقبالؒ کے اشعار شوق سے لہرا لہرا کر گا گا کر پڑھتے ہیں ان سے سوال ہے کہ تمہارے بزرگوں کا علامہ اقبال کے متعلق تو یہ فتویٰ تھا کہ وہ نعوذ باللہ کافر تھے ۔ جناب آپ کے ہاں تو علامہ اقبال کا اسلام ہی معتبر نہیں ، پہلے ان کا اسلام تو ثابت کیجئے ۔ ہمارے اکابر کا علامہ سے کیا تعلق تھا وہ اسی پرچے میں پڑھا جا سکتا ہے ۔ حضرت مدنیؒ یا اکابر دیوبند میں سے کسی نے ان کے متعلق اس طرح کے خیالات کا اظہار نہیں فرمایا

سیرت کمیٹی

قاضی عبدالمجید قریشی (پٹی ضلع لاہور) نے سیرت کمیٹی کے نام سے ایک مرکزی کمیٹی بنائی تھی ۔ آج جو سیرت میلاد کے جلسے جلوس نکلتے ہیں اس کا بطور تحریک انہوں نے آغاز کیا اب ملاحظہ فرمائیے کہ مولوی حشمت علی صاحب ان کے متعلق کیا فرماتے ہیں ۔

"سیرت کمیٹی درحقیقت "خباثت کمیٹی" اور حسب فرمان شریعت مطہرہ "ضلالت کمیٹی" اور بحکم قرآن عظیم" لعنت کمیٹی" اور بلحاظ نتیجہ "ردت کمیٹی" اور عند التحقیق اپنے چہیتے ماں باپ "خلافت کمیٹی" و ندوہ کی لاڈلی بیٹی ہے":
(راز سیرت کمیٹی مطبوعہ سلطانی پریس بمبئی صہ۱) "جس سیرت کمیٹی کا سنگ بنیاد یہ کفر و ارتداد ، دہریت و الحاد کفار و مشرکین و منافقین و مرتدین کے ساتھ کھلا میل اور اتحاد ہے اس کی تمامتر کارروائیاں مخالف شریعت منافی اسلام ہی ہوں گی سیرت کمیٹی کے اسی بنیادی کفر و ارتداد و زندقہ و الحاد کا نتیجہ ہے کہ اس کمیٹی کی طرف سے جو متعدد رسائل شائع ہوئے ان میں بکثرت کفریات و ضلالات واقع ہوئے" صہ بحکم شریعت مطہرہ مسلمانوں کو سیرت کمیٹی میں شامل ہونا اور اس کا ممبر ہونا ، حرام ، حرام ، حرام صہ۵

---

[1] مولوی دیدار علی خطیب جامع مسجد وزیر خان مولانا ابوالحسنات اور مولانا ابوالبرکات کے والد ماجد تھے۔

سرسید کے نورتن

جس طرح بے دین بادشاہ اکبر نے اپنے نورتن بنائے تھے جو اس کے وزیران حکمت اور مشیران سلطنت تھے، اسی طرح پیر نیچر نے بھی اپنے نورتن بنا رکھے تھے جو پیر نیچر کے وزیران نیچریت اور مشیران دہریت اور مبلغین زندیقیت تھے جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ نواب محسن الملک مہدی علی خان ۲۔ نواب اعظم یار جنگ ۳۔ مولوی چراغ علی خان ۴۔ نواب انتصار جنگ ——— ۵۔ مولوی مشتاق حسین ۶۔ مولانا الطاف حسین حالی ۷۔ شمس العلماء مولوی ذکا اللہ ۸۔ مولوی مہدی حسن ۹۔ سید محمود خان ۱۰۔ شبلی نعمانی آف اعظم گڑھی ۱۱۔ ڈپٹی نذیر احمد خان دہلوی (تجانب اہل السنۃ ص۲۰۸)

خواجہ حسن نظامی

"خواجگی کے دعویدار، کفر کی تبلیغ کے ٹھیکیدار، اسلام کی مخالفت کے علمبردار، کرشن کنھیا کے اُمتی، مشرب جناب دھاری خواجہ حسن نظامی" (حوالہ مذکور ص۱۳۱)

شاہ ابن سعود مرحوم

کتاب مذکور میں ص۲۵۶، ص۲۵۹ پر شاہ ابن سعود مرحوم کو ابن سعود نجدی الملک المجبور عبد ابن سعود قہر الملک الودود کے "معزز القاب" سے یاد کیا گیا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے "کفار نجد کے اس مجموعہ خبیثہ میں لو بھی بکثرت کفریات قطعیہ و ارتدادات یقینیہ اسلئے گھر بھر رہے ہیں مگر آدمی کے کافر و مرتد ہو جانے کیلئے معاذ اللہ ایک ہی کفر و ارتداد بس ہے۔" کتاب مذکور ص۲۶۳

حج فرض نہیں

مولانا احمد رضا خان نے ایک کتاب "تنزیہ الحجۃ عن بجوز التواء الحجۃ" رقم فرمائی اس کی ایک عبارت "جب یہ معلوم ہو گیا تو ہم کہتے ہیں اور بجزم یقین کہتے ہیں کہ آج جب کہ حجاز مقدس میں ابن سعود منحوس و نامسعود و مخذول و مطرود و مردود اور اس کے ہمراہیان نامحمود کا تسلط وورود ہے اور حسب بیان سائل فاضل و دیگر کثیر حضرات حجاج و افاضل امان مفقود ہے، فرضیت ساقط ہے یا ادا غیر لازم ہے۔" کتاب مذکور ص۹

قائدِ اعظم

"تجانب اہلسنت" سے آخری دو حوالے پیش کر کے ختم کرتے ہیں :

۱۔ "اور مسٹر جناح ان کا قائدِ اعظم ہے اگر صرف انہیں دو کفروں پر اکتفا کرتا تو قائدِ اعظم کی خصوصیت ہی کیا رہتی لہٰذا وہ اپنی اسپیچوں، اپنے لکچروں میں نئے نئے کفریات قطعیہ بکتا رہتا ہے" تجانب اہلسنت ص۱۱۹

۲۔ "بحکم شریعت مسٹر جناح اپنے ان عقائد کفریہ قطعیہ خبیثہ کی بنار پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے جو شخص اس کے کفروں پر مطلع ہونے کے بعد اس کو مسلمان جانے یا اس کے کافر مرتد ہونے میں شک رکھے یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے۔ وہ بھی کافر و مرتد اور قطعاً اور بے توبہ مرا تو مستحق لعنت عذاب علام" (کتاب مذکور ص۱۲۲)

ان تمام فتوؤں کو جو مذکور ہوئے پڑھیے پھر سوچیے کہ اس کے بعد پوری دنیا میں اس مختصر گروہ کے علاوہ کوئی فرد مسلمان رہ سکتا ہے۔ شیخ العرب و العجم حضرت مدنیؒ کو تو مسلم لیگ اور قائدِ اعظم سے سیاسی نظریاتی اختلاف تھا کہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں جمعیۃ علمار ہند اور مسلم لیگ کا اتحاد بھی ہوا (جو اگرچہ بوجوہ ختم ہو گیا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں)

... ہمارا یہ خیال نہ تھا کہ اس قصے کو طول دیں اور اپنے اس نمبر میں ان فتاوٰی کو جگہ دیں لیکن صرف یہ بتانے کے لیے کہ جو لوگ آج آسمان سر پہ اٹھائے ہوئے ہیں ان کی خدمات سے بھی تاریخی واقف ہو سکیں کہ

تعرف الاشیاء باضدادھا　　　　　　اشیاء اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں

یہ لوگ جن کے فتاوٰی کا ذکر ہوا ان حضرات کو برصغیر کی ان اسلام دشمن طاقتوں کی سرگرمیوں سے کوئی سروکار نہ تھا جو اسلام کے خلاف برسرِ پیکار تھیں۔ عیسائیوں کو ہر ہر محاذ پر شکست دی تو علمار حق اکابر دیوبند نے آریہ سماجیوں سے مناظرے کیے تو اکابر دیوبند نے (ہم مولانا ثنار اللہؒ کو بھی اسی تعلقے کا ماہرہ سمجھتے ہیں کہ وہ دیوبند میں پڑھتے رہے ہیں) انگریز سے لڑائی لڑی تو اسی گروہ نے قائدانہ حصہ لیا۔ مگر کسی نے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا سید عطار اللہ شاہ بخاری وغیرہ میدان میں آئے۔ لاہور کے ایک کالج کے پرنسپل نے حضورؐ کی شان میں بے ادبی کے الفاظ لکھے تو مولانا سید عطار اللہ شاہ بخاری ہزاروں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے انسانی سمندر کو رات کے بارہ بجے کالج لے گئے۔ قرآن و حدیث کی خدمت و اشاعت کا سہرا انہی کے سر رہا۔ یہاں ہم بطور شہادت مولوی احمد رضا خاں صاحب کے ہمنوا و ہم مشرب لاہور کے مشہور روزنامہ "سیاست" کے ایڈیٹر سید حبیب صاحب کی رائے بطور :

ل ———

[illegible] یہ اخبار رقم کرتے ہیں

"جہاں تک تحفظِ دین، تردیدِ مخالفین اور اصلاحِ مسلمین کا تعلق ہے، دارالعلوم دیوبند کے متوسلین و منتسبین کا حصہ سارے ہندوستان سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ مثال کے طور پر ان فرقہ وارانہ کوششوں کو ملاحظہ کر لیا جائے جو آریہ سماج نے اسلام کے خلاف کیں تو آپ کو روزِ روشن کی طرح نظر آئے گا کہ ان مساعی کے مقابلہ میں سب سے زیادہ نمایاں طریق پر جو سینہ سپر رہا وہ مدرسہ عالیہ دیوبند ہے اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں دینی حمیت، علومِ عربیہ، تفسیر، حدیث اور فقہ کے چشمے جو بحمد تعالیٰ بہت حد تک دیوبند کے وجودِ مسعود کی وجہ سے قائم ہیں" (سیاست لاہور ۱۲۔ جون ۱۹۲۷ء)

ایک دوسرا اخبار "عصرِ جدید" کلکتہ لکھتا ہے:

"دارالعلوم دیوبند اسلام کی جو مذہبی اور تعلیمی خدمت انجام دے رہا ہے اور مغربی تہذیب و تمدن کے سیلاب سے جس طرح اس نے اسلامیانِ ہند کی روحانی عمارت کو محفوظ رکھا ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض تو عالم کا ایک ایک گوشہ اس کی گواہی دے سکتا ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ علومِ جدیدہ کی دلکشی نے ظاہر بین نظروں کو خیرہ کر دیا تھا جب کہ دنیاوی عزت اور مناصب کی کشش اچھے اچھے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی جبکہ لوگ مذہب سے بے پرواہ اور مذہبی تعلیم کی طرف سے غافل ہو چکے تھے اور قال اللہ و قال الرسولؐ کی مقدس آواز نئی تعلیم کے نقار خانہ میں دب گئی تھی اور مغربی تعلیم و تمدن کے شور و غوغا سے مضطرب ہو چکی تھی۔ اس نازک وقت میں دیوبند اور صرف دیوبند تھا جو قرآن و حدیث کے علم کو سنبھالے ہوئے کھڑا رہا۔ ملک کی مخالفتوں اور سرد مہریوں کی آندھی نے رہ رہ کر اس کو گرانا چاہا مگر وہ پہاڑ کی طرح قائم رہا۔ فرنگی تہذیب کی خندہ زنی اس کو اپنی قدامت سے منحرف نہ کر سکی نئی تعلیم کے سیلاب نے چاہا کہ اپنی رَو میں اسے بہا لے جائے مگر کسمپرسی کے باوجود وہ ایک طرف اپنے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا اور دوسری طرف اپنی روحانیت کی روشنی ملک کے ہر ہر گوشہ میں پہنچاتا رہا یہاں تک کہ مسلسل جد و جہد کے بعد آج نہ صرف پشاور اور رنگون بلکہ قفقاز، موصل، بخارا اور اسلامی دنیا کے ہر حصہ سے فدائیانِ قرآن و حدیث آ آ کر پروانہ وار اس کے گرد جمع ہیں۔" (عصرِ جدید کلکتہ ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء)

تبلیغی جماعت

یوں تو بالاستقلال دارالعلوم ایک تبلیغی تحریک ہے تاہم اسی دارالعلوم کے ایک نامور فرزند حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ نے اپنے والد ماجدؒ کی تبلیغی تحریک میں اپنے سوزِ عمل سے جو روح پھونکی

مش

اور ان کے نامور فرزند حضرت مولانا محمد یوسف دہلوی نے اس کو جس معراج پر پہنچایا وہ کسی تعارف و تبصرہ یا تائید کی محتاج نہیں۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تبلیغی جماعت اس دور کی سب سے بڑی بین الاقوامی تبلیغی تحریک ہے جس کے افراد آج پوری دنیا کے ہر ملک میں نہایت خاموشی اور اخلاص کے ساتھ اللہ کے دین کی اشاعت میں مصروف ہیں جس میں زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہیں۔ کروڑ پتی تاجر، فوج کے جنرل، بڑے بڑے پروفیسر، علماء، صلحا اپنا سامان اپنے کندھوں پر اٹھائے پوری دنیا میں یہ کام کر رہے ہیں اور حیرت در حیرت کی بات یہ کہ اس جماعت کا کوئی اخبار نہیں، روداد نہیں، ممبر سازی نہیں، چندہ نہیں جھنڈا نہیں، جماعتوں کے معروف قواعد و ضوابط میں سے ان کے ہاں کوئی قاعدہ ضابطہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی نصرت

اکابر و مشائخ دیوبند ایمانی و احسانی کمال صبر و شکر اور خلوص و للہیت کے پیکر تھے اور جس پیغمبر کی سنتوں اور سیرت کو عام کرنے کا انہوں نے اپنی زندگی کا مشن قرار دیا اس نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

و رفعنا لك ذكرك　　　　　　　　اور ہم نے آپ کا ذکر بلند کیا

تو اس کے نام لیواؤں کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور تائید سے نوازا اور ان کے کام میں اتنی برکت عنایت فرمائی کہ اسے تائید ایزدی ہی کہا جا سکتا ہے ان لوگوں کی نظر دنیاوی مفاد کے بجائے "ان اجری الا علی اللہ" پر رہی۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے راستے پر اپنے آپ کو ڈال دیا تو اللہ تعالیٰ نے راستے ان پر کشادہ فرما دیئے

والذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا وان الله لمع المحسنين　　　　اور جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو سیدھے راستوں پر چلاتے ہیں۔ بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

شیخ الہند نے قرآن پاک کا ترجمہ لکھا اور ساتھ ساتھ عملی جہاد بھی کیا اس ترجمے کو کہ جس کے حواشی علامہ شبیر احمد عثمانی نے لکھے۔ اتنی قبولیت حاصل ہوئی کہ اس کے اب تک لاکھوں نسخے شائع ہو چکے ہیں۔ صرف پاکستان میں سات آٹھ مکتبوں نے اسے شائع کیا ہے۔ ہانگ کانگ اور جرمنی سے شائع ہوا۔ حکومت افغانستان نے اس کے ترجمے اور حواشی کو فارسی میں ترجمہ کر کے شائع کرایا ــــ حضرت تھانوی کی تفسیر بیان القرآن کو کئی ناشر شائع کر چکے ہیں۔ بہشتی زیور کو پندرہ بیس ناشر شائع کر رہے ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ کے فضائل کے رسائل بنام "تبلیغی نصاب" پندرہ سولہ سال کے عرصے میں دس بارہ لاکھ شائع ہو

ت ـــــــ

چکے ہیں .... یہ سب کچھ کیا ہے اور کیوں ہے؟

اس کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو سال پیشتر دے چکے ہیں۔

من کان للہ کان اللہ لہٗ   جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔

اور اس پر برصغیر کا ذرہ ذرہ شاہد عادل ہے

اور علمائے دیوبند کی عنداللہ مقبولیت کو مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں یوں بھی واضح طریقے سے پیش کیا جا سکتا ہے:

"نظام شمسی کی طرح نظام انسانی کے بھی مرکز و محور ہیں مگر تکوین انسانی کا علم شاید مطلوب تم کو اجرام سماویہ کا مرکز معلوم کرنے میں جب ہزاروں برس لگ گئے تو نہیں معلوم عالم انسانیت کے نظام و مراکز کے کشف کے لئے کتنا زمانہ درکار ہوگا۔ تاہم اتنا معلوم رہے کہ ہر دور میں خدا کے چند بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا وجود ستاروں کے مرکز شمسی کی طرح تمام انسانوں کا مرکز نیت اور کعبۂ انجذاب ہوتا ہے اور جس طرح نظام شمسی کا ہر متحرک ستارہ صرف اس لئے ہے کہ کعبۂ شمس کا طواف کرے اسی طرح انسانوں کے گروہ اور آبادیوں کے ہجوم بھی صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ اس مرکز انسانیت اور کعبۂ ہدایت کا طواف کریں زمین والوں پر ہی موقوف نہیں آسمانوں میں صرف انہی کے ناموں کی پکار ہوتی ہے۔"

(تذکرہ ص ۶۶)

اکرام القادری

شہرہ جہاں میں عام ہے دارالعلوم کا
الہام پر قیام ہے دارالعلوم کا

اس کا وجود عظمتِ اسلام کی دلیل
کتنا بلند مقام ہے دارالعلوم کا

محمودؒ ہو، حسینؒ ہو، قاسمؒ ہو یا رشیدؒ
روشن انہی سے نام ہے دارالعلوم کا

جس کو ہوا نصیب وہاں درسِ آگہی
وہ تیغ بے نیام ہے دارالعلوم کا

شاخیں نگر نگر میں ہیں دارالعلوم کی
کیسا عظیم کام ہے دارالعلوم کا

بٹتا ہے اب بھی بادۂ عرفاں شبانہ روز
گردش میں اب بھی جام ہے دارالعلوم کا

دشنامیوں کا طائفہ، انگریز کے غلام
کیا جانیں کیا مقام ہے دارالعلوم کا

تبلیغِ دینِ خواجۂ کیہاں شعارِ خاص
یہ کام صبح و شام ہے دارالعلوم کا

تاریکیوں میں اس نے جلائی ہیں مشعلیں
یہ شغل مدام ہے دارالعلوم کا

چرچا ہوا ہے دینِ محمد کا چار کھونٹ
یہ ہی تو فیضِ عام ہے دارالعلوم کا

روشن قلوب میں ہیں چراغ علوم و فن
یہ حسنِ اہتمام ہے دارالعلوم کا

چڑھتا نہیں گناہ پہ یاں نیکیوں کا جھول
پیغام حق پیام ہے دارالعلوم کا

ہر آنکھ میں اسی سے ہے شرم و حیا کا رنگ
ہر دل میں احترام ہے دارالعلوم کا

ہے امن و آشتی کی بقا اس کے نام سے
دارالسلام نام ہے دارالعلوم کا

اکرام مجھ سا ننگ بزرگانِ دیوبند؟
ادنیٰ سا اک غلام ہے دارالعلوم کا

تصانیف حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب شیخ الحدیث مدرسہ نصرۃ العلوم — و — دیگر مطبوعات

1- احسن الکلام فی ترک قراءۃ الفاتحہ خلف الامام مکمل مجلد ..
2- المنہاج الواضح یعنی راہ سنت فی رد بدعات .. 21.00
3- ہدایت المرتاب الی طریق الصواب یعنی راہ ہدایت (فی تحقیق المعجزات و الکرامات) قسم اول 4.50
قسم دوم 3.60
4- تبرید النواظر فی تحقیق الحاضر و الناظر یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک .. 6.75
5- مقام حضرت امام ابو حنیفہ مجلد 18.00
غیر مجلد 12.00
6- باب جنت بجواب راہ جنت ختم
7- گلدستہ توحید فی رد شرک 3.76
8- دل کا سرور ، مسئلہ مختار کل .. 6.00
9- تبلیغ اسلام ، حصہ اول .. 3.00
10- ضوء السراج فی تحقیق المعراج موسوم بہ چراغ کی روشنی .. 2.25
11- عیسائیت کا پس منظر .. 2.50
12- انکار حدیث کے نتائج .. 5.62
13- صرف ایک اسلام بجواب دو اسلام ، حصہ اول .. 5.62
14- عبارات اکابر حصہ اول ..
15- اطیب الکلام ملخص احسن الکلام 2.25
16- رسالہ تراویح .. 1.62
17- کیفیت تحریری مناظرہ .. 3.37
18- عقیدۃ الطحاوی .. 2.25
19- مودودی کا غلط فتویٰ .. 1.12
20- ملا علی قاری اور مسئلہ علم غیب 1.12
21- حکم الذکر بالجہر .. 8.00
22- دلیل المشرکین مترجم .. 8.00
23- تنقید متین بر تفسیر نعیم الدین .. 6.75
24- بانی دارالعلوم دیوبند .. 2.25
25- تحقیق الدعا اور نماز جنازہ .. 3.36
26- چالیس دعائیں ..
27- آئینہ محمدی . 1.12
28- صلوٰۃ المسلمین معہ رسالہ اعتقاد اللحیہ
29- درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ 1.94
30- چہل مسئلہ حضرات بریلویہ .. 1.50
31- مسئلہ قربانی مع رسالہ سیف یزدانی 2.25
32- نماز مسنون مترجم مع اذکار و ادعیہ .. 1.12
33- مسئلہ طلاق ثلاثہ .. 4.00
34- تسکین الصدور .. 9.00
35- فیوضات حسینی .. 9.00
36- بیان ازہر . 1.12
37- الطاف القدس فارسی معہ ترجمہ اردو از شاہ ولی اللہ . 5.25
38- تکمیل الاذہان (عربی) از شاہ رفیع الدین .. 5.75
39- اسرار محبت (عربی) .. 4.75
40- تفسیر آیت نور (عربی) .. 1.50
41- حاشیہ مصورہ
42- معجم العادہ فی عبارۃ الطحاوی رحمۃ
43- ازالۃ الریب عن مسئلہ علم غیب
44- تحقیق مسائل قسم اول 3.50
قسم ثانی 3.50
45- دمغ الباطل از شاہ رفیع الدین 50 ٪
46- مجموعہ رسائل • - رحمۃ

ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ پاکستان

لاہور میں ملنے کا پتہ ، مکتبہ تنویر القرآن ، اردو بازار لاہور

ہم
اہلِ میاں چنوں کی جانب سے
ادارہ الرشید کو
عالم اسلام کی عظیم دانشگاہ
دارالعلوم دیوبند
سے متعلق عظیم تاریخی نمبر نکالنے پر بصمیمِ قلب
مبارکباد پیش کرتے ہیں!
مولانا رشید احمد • میاں محمد ثناء اللہ بودلہ • حاجی اللہ رکھا
حاجی عبدالعزیز • حافظ عبدالحق عابد • چوہدری عصمت علی ملک
حاجی سجاد الرحمان خاں • ملک اشتیاق احمد • چوہدری نذیر احمد جاوید
عبداللہ سلام • چوہدری غلام علی آزاد • بشیر احمد خالد ایڈووکیٹ

ھدیۂ تبریک

بآں گروہے کہ از ساغر وفا مستند — سلام ما برسانید ہر کجا ہستند

ہم مسلمانانِ گلاسگو برطانیہ کی جانب سے ——

کارکنانِ ماہنامہ "الرّشید"

اور ارکان جامعہ رشیدیہ ساہیوال کو

دار العُلوم دیوبند نمبر

شائع کرنے پر خلوصِ قلب سے

مبارکباد پیش کرتے ہیں

خاکپائے اکابرِ دیوبند

حافظ شفیق احمد، رانا کفایت اللہ، حاجی ولی محمد، حاجی فضل محمود اکبر، حاجی محمد بخش

گلاسگو سکاٹ لینڈ

محافظِ ختمِ نبوّۃ — و — محافظِ ناموسِ صحابہؓ

— اور —

ملت اسلامیہ کی ایک صدی سے خدمت کرنے والے

ادارہ دارالعلوم دیوبند

کی خدمات کو اجاگر کرنے کی خاطر خصوصی شمارہ شائع کرنے پر ماہنامہ "الرشید" اور جامعہ رشیدیہ ساہیوال کو ہم دل کی گہرائیوں سے سلام کرتے ہیں

عبدالشکور دین پوری (صدر) عبدالمجید ندیم (ناظم اعلیٰ)

مجلس تحفظِ حقوقِ اہلِ سنت — پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جوہر آئینہ!

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند !
آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم !

دارالعلوم دیوبند اپنی عالمگیر شہرت و ناموری کی وجہ سے کسی تعارف کا محتاج نہیں کہ اس کا نام لے کر یا کام پیش کر کے اسے پہچنوایا جائے البتہ اس کی غیر معمولی شہرت وعظمت ہی اس کی ضرور متقضی ہوتی ہے کہ اب تک جیسے اسے کانوں سے سنتے اور دلوں سے سمجھتے آئے ہیں کاش ایک نگاہ اس کو دیکھ بھی لیتے۔ چنانچہ اس کے لئے لوگ دور دراز سے سفر کر کے دیوبند آتے ہیں اور اسے دیکھنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں جس سے دلوں کو مزید طمانیت وتسکین حاصل ہوتی ہے۔ کوئی اس کے علم وتعلیم سے متاثر ہوتا ہے تو وہ درسگاہوں کا چکر لگاتا ہے۔ کوئی اس کے نظم ونسق سے اثر لیتا ہے تو وہ انتظامی دفاتر میں گھوم گھوم کر اس کا انتظامی لائحہ عمل دیکھتا ہے۔ کوئی اس کے غیر معمولی ذخیرۂ کتب قلمی وغیر قلمی سے شغف لیتا ہے تو وہ اس کے کتب خانہ کی شاندار عمارت کی طرف دوڑتا ہے۔ کوئی اس کے حسابات کی صفائی سے مسرور ہوتا ہے تو وہ دفاتر حساب محاسبی اوقاف اور مطبخ وغیرہ کی عمارتوں میں گھومتا ہے اور کوئی اس کے مرکزی نظم وتنظیم پر نگاہ جماتا ہے تو وہ مرکز نظم دائرہ اہتمام کی عمارت میں آکر بیٹھنے میں خوشی محسوس کرتا ہے غرض کاموں کے رنگ رنگ ہونے سے کاموں سے متعلقہ مکانات اور عمارات میں پہنچ کر حسب التفات خاطر کاموں کے نقوش دیکھنے ہی سے ہر ایک کو تسلی ہوتی ہے۔ لیکن ملک کے کروڑوں انسانوں میں سے معدودے چند ہی ہوتے ہیں جو دور دراز سفر کی سہولتیں بہم پہنچا کر دارالعلوم کے جمال جہاں آرا کا مشاہدہ کر پاتے ہیں ورنہ اکثریت ان ہی بندگان خدا کی ہے جو عمر بھر دارالعلوم کے شوق دیدار کے جذبات دل کے دل ہی میں لئے ہوئے ہیں مگر یہاں پہنچ کر دیدار کرنے کی مالی استعداد نہیں رکھتے ان کے انتہائی جذبات شوق کی تسکین کے لئے دارالعلوم نے اپنی ممتاز اور شاندار عمارات کے فوٹو تیار کرنے کا فیصلہ کیا اور زر کثیر صرف کر کے ان مخلصین کے شوق کا مداوا کرتے ہوئے دارالعلوم کی وسیع اور پرشکوہ درسگاہوں شاندار دفاتر انتظامی شعبہ جات کے مراکز اور خصوصی مقامات کے فوٹوؤں کا ایک مجموعہ (البم) تیار کیا جو "**آئینہ دارالعلوم**" کے نام سے آپ کے سامنے ہے تاکہ جس طرح آئینہ کسی چیز کا عکس دکھلا کر اس کی اصل سے روشناس کرا دیتا ہے۔ اسی طرح دارالعلوم کی عمارات کا یہ کامل آئینہ اس کی تعمیرات کا عکس دکھلا کر شائقین کو اصل کے دیدار کا کسی حد تک لطف بہم پہنچا سکے گا اور اس کے نادیدہ مخلصین جس مرکزی درسگاہ کا نام اور کام اپنے کانوں سے سنتے چلے آئے ہیں۔ اس کی ایک جھلک گھر بیٹھے آنکھوں سے بھی دیکھ لیں گے۔

یہ ضرور ہے کہ عکس دیکھ کر اصل کے دیکھنے کی بیتابیاں اور بڑھ جائیں گی لیکن جہاں یہ شوق دیدار کے جذبات بھڑکیں گے وہیں فی الجملہ

تسلی بھی حاصل ہوگی کہ کم از کم اصل کے خد وخال کافی الجملہ عکس تو نگاہوں کے سامنے ہے اور اگر کسی بڑی رقم سے وہاں کا سفر دشوار تر ہے تو کم سے کم اس کی بڑھتی ہوئی ترقیات کے ساتھ تعاون اور حسب استطاعت اس کی مالی اعانت تو دشوار نہیں جو دیدار سے زیادہ اہم ہے اس لئے اس آئینہ میں دارالعلوم کی ممتاز عمارات کے یہ ۳۰ عکس پیش کئے جا رہے ہیں اور دفتر جلسہ دستار بندی نے ان عمارات کے آغاز و اختتام کی جو مختصر تاریخ مرتب کی ہے اسے ہر عمارت کے نیچے درج کر دیا گیا ہے جس سے پورے دارالعلوم کی ایک اجمالی تاریخ بطور خلاصہ کے سامنے آجائے گی۔

پس اس آئینہ سے صورتاً تو دارالعلوم محسوس ہوگا اور اس کی اجمالی تاریخ سے دارالعلوم کا کام اور مقصد معلوم ہوگا اور اس طرح مخلصین دارالعلوم کے لئے فکر اور نظر اور حس وعلم دونوں کا سامان بہم پہنچ سکے گا جو اس آئینہ کے بے تعداد جوہروں میں سے چند جوہروں کی نقاب کشائی ہے ورنہ غیر معلوم جوہر معلوم جوہروں سے زیادہ ہیں جو اصل ہی کے دیکھنے سے سامنے آسکتے ہیں۔ بقول اقبال مرحوم :-

کتنے بے تاب ہیں جو ہر مرے آئینے میں :
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں :

واللہ الموفق لما یحب ویرضی

محمد طیب مدیر دارالعلوم دیوبند

۱۰ ذی الحجہ [illegible] ہجری یوم العید
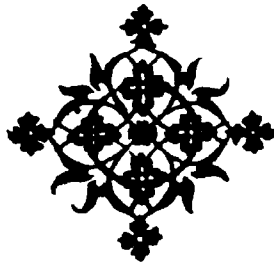
الإهداء

إن الذى سمك السماء بنى لنا　　بيتا دعائمه أعز وأطول !!

لسنا بحاجة إلى أن نعرف بهذا المعهد الإسلامي الجليل، فإن منزلته أشهر وأرفع من أن ينوه به. فقد بلغ صيته إلى أرجاء العالم من أقصاها إلى أقصاها ما يغنينا عن سرد خدماته الحيوية فقد عرفه كل من له قلب سليم أو ألقى السمع وهو شهيد.

نعم قد تجعل سمعته أفئدة من الناس تهوى إليه فيودون لو قدر الله لهم زيارة هذا المعهد السعيد. فيتهافت عليه الزوار ما استطاعوا إليه سبيلا ويسعدون بزيارته وينالهم من شدة إعجابهم به عندما يرونه رأى العين وينالهم من شغفهم بخدماته الجلى.

منهم من يطوف بقاعات الدروس معجبا بدروسه ودراساته، ومنهم من يجول فى المكاتب وهو يتدبر فى نظمها وإدارتها ومنهم من يقضى أوقاته فى مكتبتها الذاخرة السنية مفيدا من كتبها القيمة. ولا يخلو عدد الزوار ممن يسره ما يشاهد فى مكتبى التموين والمحاسبة من دقة فى نظمهما كما لا يفوته زوار يستهويهم نظامه الرئيسى فيقصد مكتب المدير حيث يجلس متمتعا بما يراه من تثبيت الأشغال وتوارد الموظفين بصددها. والحق أن لكل وجهة هو موليها يستمتع بما يلائم وسريرته. ومن الطبيعى أن يكون من يرتاد إليه إذا ما أطاق مشاق السفر وتحمل متاعبه مهما كثر عددهم، أقل عددا ممن أقض عليهم مضاجعهم شوقا الى زيارته ولا يجدون إلى ذلك سبيلا.

فقررت دار العلوم أن تنشر مجموعة من الصور لمبانيها الشامخة حتى يتروى به غليل الراغبين فى زيارتها وصرفت فى هذا السبيل مبالغ طائلة وأتت بمجموعة رائعة تسر الناظرين تحتوى على صور جميع مبانيها من مكتب المدير والمكاتب الأخرى وقاعات الدروس ودور القرآن، والحديث والتفسير وما إلى ذلك نشرتها تحت عنوان" مرآة دار العلوم" فإنه لمرآة تتجلى فيها دار العلوم مبانيها ومناظرها لمن أحب وتاق إلى زيارة هذا المعهد العظيم.

وقد لا يستبعد أن الصور لتزيد فى الهوى إلا أنها لا تخلو من كونها تأساء وسلوى

إلى حد ما وكيف لا فإنها ترى الناظرين نبذة من لمحات و معالم لما حال دونه تلال الجبال والبيد الصحارى، وإذا لم يستطع الزائرون برتاد وا إليه من الأقطار النائية فما بالهم لا يسرعون إلى ما يسعهم من المساهمة والتعاون فى بنائها ورقيها ولعمرى إن ذلك أغلى وأثمن من رؤيتها .

فإليكم أيها الإخوان، مبانى دارالعلوم الشامخة ومناظرها الخلابة، ترونها فى هذه المرآة كرأى العين ولم يفتنا أن نذكر عند كل صورة نبذة من تاريخ المبنى الذى تمثلها هذه الصورة. وقام بهذا العمل المشكور مكتب " دستار بندى " فإذا جمعنا هذه اللمح التاريخية تمثل لنا دارالعلوم فى تاريخها الوافى. ويجد القراء فى هذا الا لبوم ما تريهم مناظر هذا المعهد وتقرب معالمه إليهم مع ما تطلعهم على الأهداف السنية والمرمية إليها وراء تأسيسه . فكفى لنا بهذا رؤية لعمارات الدار وفكرة عن غاياتها . ولا مراء أن هذه المجموعة لن تكشف للقراء عن جميع ماتحتضنها الدار من الدرر واللآلى . وأنى لها ذلك ، فهى محض مرآة ليس لها إلا أن تعكس معالم الحبيب فحسب اللهم إلا أنها لا تقل من أن تعطى للقراء فكرة عما أتى وباتى به هذا المعهد المبارك .

ربنا وسعت كل شئى رحمة وعلما فاغفر للذين تابوا واتبعوا سبيلك وآتنا من لدنك رحمة وهيئى لنا من أمرنا رشدا

محمد طيب

(مدير دارالعلوم (ديوبند ـ الهند)

مشاہیرِ عالم کی نظر میں

علامہ سید رشید رضا (مصر)

"اگر میں اس مدرسہ کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے بہت غمگین واپس جاتا ——— (تقریر)

"میں نے مدرسہ دیوبند میں جس کو از ہرِ ہند کا خطاب دیا جاتا ہے ایک جدید علمی رجحان ترقی کرتے دیکھا۔ ہندوستان بھر میں میری آنکھوں کو ایسی ٹھنڈک کہیں حاصل نہیں ہوئی جیسی کہ مدرسہ دیوبند میں حاصل ہوئی اور نہ اتنی خوشی کہیں حاصل ہونی جتنی وہاں۔ اس کی وجہ صرف وہ غیرت و اخلاص ہے جو میں نے اس مدرسہ کے علماء میں دیکھا۔" ——— (بحوالہ رسالہ المنار مصر)

مولانا ابوالکلام آزاد (وزیر تعلیم حکومت ہند)

آپ کی یہ درسگاہ دراصل ایک ایسا کارخانہ ہے جو مسلمان کی روحوں کو ڈھالتا ہے۔ یہ کارخانہ قائم ہے تو ہمیں پریشان نہ ہونا چاہیئے اس درسگاہ کے اسلاف نے عمل کا جو نمونہ پیش کیا تھا اور جن مقاصد کو لے کر یہ درسگاہ قائم کی گئی اگر وہ روشنی آپ کی رہنمائی کر رہی ہے تو میں آپ کو یقین دلاؤں گا کہ شاندار مستقبل اس کے لئے تیار ہے۔" ——— (تقریر)

"ہندوستان میں اسلامی تعلیمات کے اس عظیم ترین ادارے میں نہ صرف یہ کہ اس ملک کے تمام حصوں سے بلکہ بعید ترین علاقوں مثلاً انڈونیشیا، ملایا، افغانستان، وسط ایشیا اور چین سے طلبا کھنچے چلے آتے ہیں۔ اتنے وسیع رقبہ کے طلبا اور علما میں اس کی مقبولیت اس کی عظمت و شہرت کی دلیل ہے۔ اس بنا پر یہ ادارہ صحیح معنی میں تعلیماتِ اسلامی کی ایک بین الاقوامی یونیورسٹی ہے۔" ——— (معائنہ)

ڈاکٹر راجندر پرشاد (صدر جمہوریہ ہند)

"آپ کے دارالعلوم نے صرف اس ملک کے بسنے والوں ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ آپ نے اپنی خدمات سے اتنی شہرت حاصل کر لی ہے کہ غیر ممالک کے طلبا بھی آپ کے یہاں آتے ہیں اور یہاں سے تعلیم پاکر جو کچھ یہاں انہوں نے سیکھا ہے اپنے ممالک میں اس کی اشاعت کرتے ہیں۔ یہ بات اس ملک کے سب ہی باشندوں کے لئے قابلِ فخر ہے۔"

"دارالعلوم دیوبند کے بزرگ علم کو علم کے لئے پڑھتے اور پڑھاتے رہے ہیں۔ ایسے لوگ پہلے بھی ہوتے ہیں، مگر کم۔ ان لوگوں کی عزت بادشاہوں سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ آج دارالعلوم کے بزرگ اسی طرز پر چل رہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف دارالعلوم یا مسلمانوں ہی کی خدمت نہیں بلکہ پورے

ملک اور دُنیا کی خدمت ہے۔ آج دُنیا میں مادیت کے فروغ سے بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ اور دلوں کا اطمینان اور چین مفقود ہے اس کا صحیح علاج روحانیت ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ سکون و اطمینان کا وہ سامان یہاں کے بزرگ دُنیا کے لئے مہیا فرما رہے ہیں۔ اگر خدا کو اس دنیا کو رکھنا منظور ہے تو دُنیا کو بالآخر اسی لائن پر آنا ہے۔ میں دارالعلوم میں آکر بہت زیادہ مسرور ہوا۔ اور یہاں سے کچھ لے کر جا رہا ہوں۔

اعلیٰ حضرت شاہ افغانستان

"میں بہت مسرور ہوں کہ آج مجھے دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع حاصل ہوا۔ یہ دارالعلوم افغانستان میں اور خاص طور سے وہاں کے مذہبی حلقوں میں بہت مشہور و معروف ہے۔ افغانستان کے علماء دارالعلوم دیوبند کے بانیوں اور یہاں کے اساتذہ کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں اور علم و روحانیت کے میدان میں جو فضیلت اور مرتبت انہیں حاصل ہے اس کے ہمیشہ قائل و مداح رہے ہیں۔ بہت سے افغان علما اس دارالعلوم سے فیضیاب ہوئے اور انہوں نے اپنے وطن عزیز واپس جاکر وہاں علم کی روشنی پھیلائی اور ملک کی خدمات انجام دیں۔"

مسٹر عبد اللطیف (وزیر عدل وصحت برما)

"یہ ایک ایسا ادارہ ہے جس نے صرف اپنے ہم مذہبوں ہی کے لئے نہیں بلکہ پورے ملک کے لئے لائق انسان پیدا کئے۔"

محمد عبد الفتاح عودہ (مصر)

"میں نے دیوبند میں اسلام اور سنن و ایمان کا ایک قلعہ دیکھا اور محسوس کیا کہ دین کس طرح دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کا ضامن ہوتا ہے اور کس طرح سلف صالح کی تقلید جس کی حفاظت یہاں کے بزرگان دین کر رہے ہیں اور جس سے یہاں کے طلبا فیضیاب ہو رہے ہیں۔ ایک بیش بہا میراث شمار کی جا سکتی ہے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس طریقہ کو مضبوطی سے پکڑیں اور مستقبل کی عمارتوں کے لئے اسے بنیاد بنائیں۔"

رشید احمد اسماعیل نکولیا (جوہانسبرگ جنوبی افریقہ)

"انگریزی زبان بولنے والی دنیا میں اس کو (دارالعلوم دیوبند کو) ایٹن اور کیمبرج کا درجہ دیا جاتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ درجہ اس کی شان کے لئے کمتر ہے۔ دارالعلوم کا مرتبہ دوسرے اداروں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا کوئی ہمسر نہیں۔"

نیاز برکیز (ترکی)

"لائبریری اور اس کے بیش قیمت قلمی کتب کے ذخیرے نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ میں نے یہاں اتنا خلوص پایا کہ اپنی ممنونیت کے

اظہار کے لئے پوری طرح الفاظ نہیں پاتا میں اس عمدہ کام پر جو قیاں کا عملہ اور مدرسین انجام دے رہے ہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں ۔ "

ایس۔ای ملاّں (جنوبی افریقہ)

" دارالعلوم کے جملہ شعبوں کو بغور ملاحظہ کرتے ہوئے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میں نے اپنی سیاحت و سفر میں کسی جگہ ایسی عظیم الشان دینی درسگاہ نہیں دیکھی جو اپنی نوعیت میں ایک مرکزی درسگاہ کہلانے کے قابل ہو۔ موجودہ تاریخ اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی ۔ "

ڈی جولیس جرمینس (پروفیسر بوڈاپسٹ یونیورسٹی ہنگری)

" میں نے خود اپنے ملک میں دیوبند کے مدرسہ کے بارے میں سنا۔ مجھے ہمیشہ سے شوق تھا کہ علوم اور اسلامی اسپرٹ (روح) کے اس قلعہ کو دیکھوں۔ ترکی اور مصر کے قدیم مدرسوں کے بعد جو مسجدوں میں قائم کئے جاتے ہیں مجھے عربی اور تعلیمات اسلامی کی اس گہرائی اور جدوجہد کو دیکھ کر اور بھی زیادہ حیرت ہوئی جو اس مدرسے کے در و دیوار میں دائر و سایر ہے ۔ "

جناب ابراھیم الجبالی (رئیس وفد جامعہ ازہر مصر)

" ہمیں جامعہ دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی ہم نے مختلف درجات میں پھر کر درس و تدریس کا معائنہ کیا اور اس مدرسے کے مدیر جناب شیخ شبیر احمد عثمانی[*] اور حضرات اساتذۂ کرام سے ملاقات کی، ہم نے ایسا منظر دیکھا جس نے ہمارے قلوب کو مسرت سے پُر کر دیا۔ اور ان کے چہروں پر علم کا نور دیکھا۔ ہم نے ایک ایسی جماعت دیکھی جس نے علوم دین یعنی تفسیر قرآن، حدیث، فقہ اور اصول فقہ کی خدمت کیلئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ خلا عربی، ادب، منطق، فلسفہ اور الہیات وغیرہ۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ ان علوم سے امت اسلامیہ کو یہ حضرات نفع پہنچائیں ۔ "

پروفیسر گرے ونٹ (آکسفورڈ یونیورسٹی - لندن)

" یہ میری بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ مجھے دیوبند دیکھنے کا اتفاق ہوا میں نے دیکھا کہ قدیم اسلامی کلچر اب بھی یہاں پوری آب و تاب سے درخشاں ہے۔ ایک مورخ کے لئے اس سے زیادہ روشن مواقع کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا ۔ "

عثمان کیدو (نمائندہ چینی اسلامی نیشنل سالویشن فیڈریشن)

" میرے لئے یہ باعث سعادت ہے کہ مجھے دارالعلوم دیوبند کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک خالص مذہبی ادارہ ہے جسے ازہر مشرق کا خطاب دیا جا سکتا ہے ۔ "

([*] اس وقت جب یہ معائنہ لکھا گیا مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دارالعلوم کے مدیر تھے ۔)

ایم حسن (وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی)

"یہ (دارالعلوم دیوبند) صحیح معنی میں ایک یونیورسٹی ہے۔ مجھے ہندوستان اور یورپ کی بہت سی یونیورسٹیوں کے بارے میں ذاتی تجربہ ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ جدید طرز کی بہت سی یونیورسٹیاں اس قدیم طرز کی یونیورسٹی سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہیں۔"

جناب انوار السادات (وزیر حکومت مصر و جنرل سکریٹری موتمر اسلامی) حال صدر جمہوریہ مصر

"اس عظیم تاریخی یونیورسٹی کی زیارت نے مجھے مجبور کیا کہ میں خلوص دل سے اپنے ان بھائیوں کو مبارک باد پیش کروں جو اس کے نظام کو چلا رہے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس سے اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ نفع پہنچے اور یہ علم و معرفت کا ایک منار ثابت ہو۔"

رئیس روسی وفد (برائے ہندوستان)

"میں نے یونیورسٹی (دارالعلوم دیوبند) کو دلچسپی سے دیکھا۔ برّ اعظم کے اس حصہ میں یہ مذہب اسلام کا ایک مرکز ہے۔ میں اپنے میزبانوں کی دریا دلی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ امن اور فیاضی کا جذبہ جو مذہب اسلام کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ہندوستانی عوام اور سوویٹ یونین کے عوام کے درمیان ہمیشہ ترقی پذیر رہے۔"

امریکی وفد برائے ہندوستان

"ہماری امریکی جماعت کو ایک دن یہاں (دارالعلوم دیوبند میں) قیام کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ ہم نے مشہور علماء اور ان کے شاگردوں سے ملاقاتیں کیں۔ درحقیقت اسلام ہی کا جذبہ روح کو نور بخشتا ہے اور یہ نور یہاں (دارالعلوم دیوبند میں) ضو فشاں ہے۔"

(مختار حسن، عمر حسن احمد، امیر رشید، سعید احمد، امیر حسین، محمد احمد امریکہ)

جناب علی اصغر حکمت (سفیر ایران برائے ہندوستان)

"اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اس عبد ضعیف کو اس عظیم الشان دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی نعمت سے نوازا۔ اور یہاں کے اساتذۂ کرام اور علمائے عظام کی مصاحبت کی توفیق عطا فرمائی۔ ان کے کلمات طیبات سے اس عبد ضعیف کے دل و جان بہرہ ور ہوئے۔ ان کے باقی رہنے والے آثار و تالیفات سے میں محظوظ ہوا جو کہ بقول "مداد العلماء افضل من دماء الشہداء" (علماء کی روشنائی شہداء کے خون سے افضل ہے) اپنے دامن میں ربانی برکات اور آسمانی فضیلتیں لئے ہوئے ہیں"

دار العلوم

كما يراها قادة العالم!

العلامة السيّد رشيد رضا - رئيس تحريرات مجلة المنار القاهرة. مصر

ولو لم أرها رأى دار العلوم الديوبندية لرجعت من الهند حزينًا (من خطابه)

" انى رأيت فى مدرسة ديوبند التى تلقب بأزهر الهند نهضة دينية وعلمية جديدة. ماقرت عينى بشئ فى الهند كما قرت برؤية مدرسة ديوبند ولا سررت بشئ هناك كسرورها بما لاح لى من الغيرة والإخلاص فى علماء هذه المدرسة"

(المنار)

صاحب المعالى فقيد الأمة مولانا أبو الكلام آزادؒ

" لا يأتى الطلبة إلى هذا المعهد الدينى العظيم من شتى نواحى الهند فحسب وإنما يقصدونه من أقصى العالم من إندونيسيا وملايا وأفغانستان وأواسط آسيا والصين، وإن صيته الذائع بين رجالات الدين والأدب إلى هذه الأقطار النائية يدل على عظمته وفخامته. فيمكننا أن نقول بأن المعهد لجامعة دينية دولية." (من خطابه)

إن معهدكم هذا معمل عظيم تصاغ فيه أرواح المسلمين. ومادام هذا المعمل قائمًا لا يجوز لنا أن نقلق، أو نضطرب. وإن الأهداف السامية التى أسس المعهد لأجلها وإن الأسوة الحسنة التى اتخذها وخلفها مشائخ هذا المعهد لئن كانت هذه ترشدكم وتنور الطريق لكم فإن للمعهد مستقبلا مستنيرا فى انتظار واستعداد.

الدكتور راجندرا براساد (رئيس الجمهورية الهندية)

إن معهدكم هذا لم تقتصر الإفادة منه عند مواطني هذه البلاد فحسب وإنما يعب في مناهله غيرهم أيضا، ويهرع إليه بفضل خدماتكم السنية رواد العلم والمعرفة من كل فج عميق فيعودون إلى أوطانهم حيث ينشرون ما حملوا معه من العلوم والمعرفة

وما زال من دأب شيوخ دار العلوم أن لم يبغوا وراء حصول العلوم ونشرها الإخلاصها ولم يتخذوها وسيلة لأي غرض مادي قط على أن قد خلت العلماء من قبل لا أنهم قليلون. وقد كانوا أن نالوا من احترام الناس وتبجيلهم ما لم ينل منهم الملوك وظل مشائخ هذا الدار محتفظين بهذه التقاليد. والحق أن أعمال هذه الدار ليست بخدمات تنتفع بها نفسها أو المسلمون فحسب بل هي خدمات للبلاد بأسرها بل للعالم أجمع. لقد عم العالم اليوم نوع من الهياج والفوضى عن انتشار المادية في أرجائها وفقدت القلوب هدوءها وطمانينتها. ولاشك أن ليس إلى حصوله من سبيل لا الروحية وإني أرى أن هذه هي السبيل التي ينورها وبها يعود إلى قلوب الناس سكينتها وطمانينتها.

ولو شاء الله أن يبقى هذا العالم فسعيده إلى هذه الروحية. ولقد سررت أي سرور بزيارتي هذه الدار وإني عائد إلى بيتي مستفيد امنها مليًا بفضائلها جرابي.

جلالة الملك "ظاهر شاه" (ملك أفغانستان)

يسرني أن رفقت اليوم بزيارة دار العلوم. لقد ذاع صيتها في أرجاء أفغانستان قاطبة وخاصة في دوائرها الدينية. ولم يزل علماءها ينظرون إلى شيوخ دار العلوم وعلمائها نظرة إجلال واحترام وظلوا معترفين بعلو كعبهم في الروحية وما أوتوا من أوفر حظ في العلوم الإسلامية

وكم من عالم أفغاني استفاد من هذه الدار فنشر العلوم بين مواطنيه بعد عودته إلى بلاده وأسدى لها خدمات جمى.

عبد اللطيف . وزير العدل والصحة بورما

لم يتخرج من هذا المعهد رجال من الاسلام فحسب بل له كبير فضل
، إنتاج كبار الرجال لوطنه أيضا .

الأستاذ محمد عبد الفتاح عوده (من مصر)

قد وجدت فى ديوبند معقلا للاسلام وحصناً للسنن والإيمان ، وعرفت كيف
يكون الدين صلاحاً للدنيا والآخرة وكيف أن تقاليد السلف الصالح التى يحافظ
عليها الشيوخ الأجلاء ويقتبسها الطلبة النجباء . هى ميراث ثمين لا بد أن نتمسك
به وأن نجعله عماداً لبنيان المستقبل .

السيد رشيد احمد اسمعيل نكوليا . جوهانسبرگ (جنوبى افريقيا)

إنى اعتقد أن مكانة هذا المعهد مكانة جامعتى اكسفورد وكمبرج فى عالم اللغة
الإنكليزية لكن أنى لهما أن تبلغا قدره من شانه فإنه أرفع من المعاهد
الاخرى أى رفعة . والحق أقول أن لا يوجد له نظير .

نيازبركيز (تركيا)

لقد تأثرت كثيرا بمكتبة دار العلوم و ذخائرها العلمية الثمينة و لى وجدت
فى هذه البيئة حبا خالصا ما يعجزنى عن إظهار امتنانى و تشكرى . وأسدى تهنئاتى
على الاعمال المباركة التى يقوم بها مدرسوها وموظفوها .

ايس . اى مّلاں (من إفريقيا الجنوبية)

لقد استيقنت بعد استقصائى جميع مكاتب دار العلوم وأقسامها بأنى لم أر فى

أى من البلاد الكثيرة التى زرتها وفى أى بقعة من بقاع الأرض التى حلت فيها معهدا دينيا أرفع منه مرتبة وعظمة وأجدر منه تعبيرا بمركز دينى وعسير أن يوجد له مثيل أى عسر.

البروفيسر ڈی، جوليس جرمانوس (بجامعة بودابست الجر)

سمعت فى بلادى عن أخبار دار العلوم وكنت اشتاق إلى أن أزور معقل الروح الإسلامى هذا. وليس من شك فى أن الخدمات الدينية وروح العلوم الإسلاميه التى تجرى بين أبناء هذا المعهد، أدهشتني دهشة عميقة بعد المدارس الدينية التى أسست فى مساجد تركيا ومصر.

الأستاذ إبرهيم الجبالى (رئيس البعثة الأزهرية من مصر)

فقد سعدنا بزيارة جامعة دار العلوم الديو بندية وطفنا على دروسها فى مختلف الطبقات واجتمعنا بمديرها فضيلة الأستاذ الشيخ شبير أحمد العثمانى وحضرات أساتذة الأكرمين فشهدنا ماملأ قلوبنا سرورا ولمحنا للعلم فى وجوههم نوراً. رأينا قوما قد وقفوا حياتهم لخدمة علوم الدين من تفسير القرآن والحديث والفقه وأصوله. وأضافوا إلى ذلك من وسائل العلوم الأخير كعلوم اللغة العربية والمنطق والفلسفة والهيئة، مانرجوأن يعم به النفع للأمة الإسلامية

الأستاذ گرے ونٹ (آکسفورڈ)

وكان من حسن حظى أن أتيحت لى الفرصة للحضور إلى دار العلوم، ورأيت أن الحضارة الإسلامية القديمة لاتزال متلألأة ومزدهرة فى هذا المعهد ولست أظن أن يتأتى لمورخ فرصة أوسع واحسن من ذلك.

الأستاذ عثمان كيدو (ممثل الصين اسلامى نيشنل سالويشن فيڈريشن)

ان من سعادتى أن سنحت لى فرصة زيارة دار العلوم وانامستيقن بان

هذا المعهد معهد إسلامى خالص" و يستحقُّ لأن نسميه " أزهر الشرق ".

الأستاذ ايم حسن (نائب مدير جامعة داكه)

حقًا إن دار العلوم ديوبند معهد كبير، وإن لى تجارب خاصة فى معاهد أوربا و الهند، و إنى أقول أن المعاهد الجديدة تحتاج أن تأخذ أشياءً ثمينة فى هذا المعهد الذى اسس على الطراز القديم.

الأستاذ أنور السادات . وزير الدولة بمصر والسكريتير العام للمؤتمر الاسلامى

فى مناسبة زيارتى لهذا المعهد التاريخى العظيم يهمنى أن أتقدم بخالص التهنية لإخوتى القائمين على أمره وأسأل الله أن ينفع به دائما الإسلام والمسلمين وان يظل منارًا للعلم والمعرفة.

رئيس الوفد (الاتحاد السوفيتى للهند)

لقد قمت بزيارة الجامعة (دار العلوم ديوبند) زيارة شائق مهتم بها. إنه حد المراكز الإسلامية التى تحتضنها هذا البقعة من القارة. و إنى لجد ممتن لمضيفى الكرام وأدعو الله ان تتقوى بين الشعبين السوفيتى والهندى روابط الاتحاد عاطفة الأمن و النصح التى هى من أس الإسلام.

رئيس الوفد (من ولايات المتحدة الامريكية)

لقد قضينا يوما كاملا فى دار العلوم بديوبند حيث اجتمعنا بكبار العلماء و تلامذتهم. وإنه الحق أن الوعى الإسلامى هو الذى ينور الأرواح و أن دار العلوم ثرية بهذا النور المبين.

مختار عمر حسن احمد، امير رشيد، سعيد احمد، اميرحسن محمد احمد
(من ولايات المتحدة الامريكية)

علی أصغر حکمت ، سفیر ایران فی الہند سابقا

إنی أشکر الله و أحمده علی ما أنعم علی هذا العبد الضعیف بأن وفقه لزیارة دار العلوم هذه وأسعده بالاجتماع مع أجلاء أساتذتها وکبار علمائها وامتلأ قلبی و مسامعی نورا و سعادة بکلماتهم الطیبات. واحتظیت بآثارهم الخالدة وتآلیفهم الثمینة فإنها کما قیل "مداد العلماء أفضل من دماء الشهداء" ینابیع البرکات الربانیة و السعادات الأبدیة.
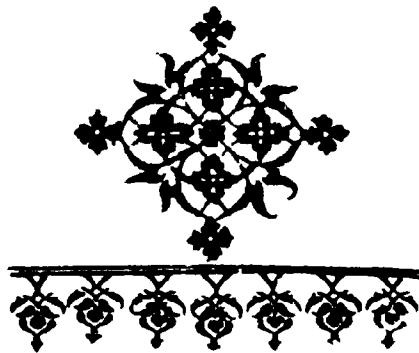
تصاویر
عمارات دارالعلوم
(دیوبند)

باب الامداد

دارالعلوم دیوبند کا سب سے پیشین اور اولین صدر دروازہ جو شیخ الطائفہ حضرت مولینا حاجی امداد اللہ قدس سرہ کے نام نامی سے موسوم کیا گیا ہے. یہ لب سڑک واقع ہے اور بزمانۂ اہتمام حضرت مولینا رفیع الدین صاحب قدس سرہ تعمیر ہوا.

باب الإمداد

البوابة القديمة المرتفعة لدارالعلوم، سميت باسم شيخ الطائفة حضرة الحاج مولانا إمداد الله المهاجر المكيّ، وهي المدخل الرئيسي للدار من الشارع العام. وبنيت في إدارة المدير الشاه رفيع الدين طاب الله ثراهٗ.

Babul Imdad

The Main gate of Darul Uloom which is called after Late Hazrat Moulana Haji Imdadullah sb. the party leader. It is just faeing the road and was built during the ehtemam of Hazrat Moulana Rafiuddin sb

बाबुल इमदाद

दारुल उलूम देवबन्द का सब से पेशीन और अव्वलीन सदर दरवाजा जो शैखुत्ताइफा हजरत मौलाना हाजी इमदादुल्ला साहब के नामे नामी से मौसूम किया गया है यह लबे सड़क वाकेअ है और बजमानये अहतमाम हजरत मौलाना रफीउद्दीन साहब कुद्दसा सिर्रहू तामीर हुआ।

باب قاسم

احاطۂ نودرہ کا صدر دروازہ جس کے اوپر دفتر اہتمام کی عظیم عمارت ہے جو حضرت بانیٔ دار العلوم حجۃ الاسلام مولینا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کی حیات میں تعمیر ہوا اور حضرتِ اقدس کے نام نامی کی طرف منسوب کیا گیا۔

باب القاسم

البوابة الشامخة التی بنیت فوقها عمارة دار الاهتمام وتم بناؤها فی حیاة حضرة حجة الاسلام مؤسس الدار الشیخ مولانا محمد قاسم النانوتوی رحمه الله وسمیت باسمه

Bab-e-Qasim

The main gate of ehata Naudara on which the building of **Daftar-e-Ehtemam is situated.** It was built during the life time of **Late Hazrat Moulana Mohammed Qasim** sb. the founder of Darul Uloom. **So it is called after the said Moulana** Mohammed Qrsim sb.

बाबे कासिम

अहाते नौदरे का सदर दरवाजा जिस के ऊपर दफ्तर अहतमाम की अज़ीम इमारत है जो हज़रत बानिये दारुलउलूम हुज्जतुल इस्लाम मौलाना मुहम्मद कासिम साहब नानौतवी की हयात में तामीर हुआ और हज़रते अकदस के नामे नामी की तरफ मनसूब किया गया।

۲

مسجد دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم کی خوشنما مسجد جو سنگ تراشی کی بہترین صنعت کا شاہکار ہے جس میں ہر نماز کے وقت ایک ہزار سے زیادہ علماء طلباء اور صلحاء بارگاہ حق میں سربسجود ہوتے ہیں۔ پانچوں نمازوں میں نماز جمعہ کی طرح ہجوم رہتا ہے۔ یہ مسجد ۱۳۲۷ھ مطابق سنہ ۱۹۱۰ء میں بہ زمانۂ اہتمام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب بن قاسم العلوم قدس سرہ تعمیر ہوئی۔ اندرون مسجد کا رقبہ ۴۲ × ۳۳ مربع فٹ بیرون مسجد کا رقبہ ۱۱۸ × ۵۰ مربع فٹ

مسجد دار العلوم

مسجد الدار الجميل وهو نموذج أنيق من نماذج النحت على الطابع الإسلامي ويصلي فيه خمس مرات يوميا حوالي ألف نسمة ما بين طالب وعالم وصالح فنراه مزدحمة عند كل صلوة كما تزدحم المساجد الأخرى أيام الجمعة. وتم بناؤها في إدارة حضرة الحافظ مولانا محمد أحمد سنة ١٣٢٧هـ الموافقة لسنة ١٩١٠م — ومساحة المسجد من الداخل ٤٢×٣٣ قدما وفسحة المسجد من الخارج ١١٨×٥٠ قدما

Masjid-e-Darul Uloom

The splendid mospue of Darul Uloom, Deoband which contains masterpiece of carving and in which at every prayer time more than a thousand Ulamas, saints and students bow down their heads before Allah. In all the five prayers of the day and night the gathering presents a scene of Jumma prayer.. It was built in 1327 Hijri (1910-A.D.) during the ehtemam of Late Moulana Hafiz Mohammed Ahmad sb.

The Area of the internal portion :- 42ft x 33ft.

The Area of the external portion :- 118ft x 50ft.

मसजिद दारुल उलूम देवबन्द

दारुल उलूम देवबन्द की खुशनुमा मसजिद जो सगतराशी की बेहतरीन सनअत का शाहकार है जिसमें हर नमाज के वक्त एक हजार से जायद ओलमा, तलबा और सोलहा बारगाहे हक में सर बसुजूद होते है। पांचो नमाजो मे नमाजे जुमा की तरह हुजूम रहता है यह मसजिद सन् १३२७ हि० मुताबिक सन् १९१० ई० मे बजमानये अहतमाम हजरत मौलाना हाफिज मुहम्मद अहमद सा० रहमतुल्ला अलेह पुत्र कासिमुलउलूम तामीर हुई। रकबा अन्दरून मसजिद ४२ × ३३ वर्ग फीट बैरून मसजिद का रकबा ११८ × ५० वर्ग फीट

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

جہاں سے ہند وبیرون ہند کے تقریباً بارہ ہزار استفتوں پر ہر سال فتاویٰ صادر کئے جاتے ہیں۔ یہ عمارت مسجد دارالعلوم کے شرقی بالائی حصہ پر ہے اس کے نیچے مسجد دارالعلوم کا حوض نظر آرہا ہے۔ یہ عمارت ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۸ء بزمانہ اہتمام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ تعمیر ہوئی۔ اس میں تین بڑے بڑے کمرے ہیں جن کا رقبہ یہ ہے۔ (۱) ۱۷×۱۴ مربع فٹ (۲) ۱۸×۱۴ مربع فٹ (۳) ۱۴×۱۲ مربع فٹ۔

دارالإفتاء

أكبر المراكز الهندية للإفتاء يقصده المسلمون من كل ناحية باستفتاءاتهم واستفساراتهم في الأمور الدينية وتصدر من هذا المركز فتاوى سنويا يبلغ عددها نحو اثنى عشر ألفا ۔ ويقوم البناء على الجانب الشرقي من مسجد الدار في الطابق الأول ويحتوى على ثلث غرف فسيحة ويقع تحتها حوض المسجد الذي يرى في الصورة وتم البناء سنة ١٣٦٧هـ الموافقة لسنة ١٩٤٨ الميلادية في إدارة المدير مولانا محمد طيب أطال الله بقاءه. مساحة الغرفات الثلاث ١٧×١٤، ١٨×١٤، ١٤×١٢ قدما

Darul - Ifta

From here nearly twelve thousand questions (Istiftas) are answred with reference every year. This Building is situated on the upper story of the eastern portion of the mosque of Darul Uloom. Under this building the fountain (Hauz) of the mosque can be seen. It was built in 1367Hijri (1948-A.D.) during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb. It has three spacious rooms with the following areas.

(1) 17ft x 14ft. (2) 18ft x 14ft. (3) 14ft 12ft.

दारुल इफ्ता दारुलउलूम देवबन्द

जहा से हिन्द व बैरून हिन्द के लग भग १२ हजार इस्तफतो पर हर साल फतवे सादिर किये जाते है यह इमारत मस्जिद दारुल उलूम के पूर्वी बालाई हिस्से पर है इसके निचे मस्जिद दारुलउलूम का हौज नजर आरहा है। यह इमारत सन् १३६७ हि० १९४८ ई० मे बजमाना महतमाम हजरत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दजिल्लहू तामीर हुई। इसमे तीन बड़े २ कमरे हैं जिनका रकबा निम्न लिखित है :—

१— १७×१४ २— १८×१४ ३— १४×१२ वर्ग फोट

دفتر محاسبی

دارالعلوم کے مالیات کا مرکزی دفتر جہاں اہل خیر مسلمانوں کے تقریباً چھ لاکھ سالانہ کے آمد و صرف کا ریکارڈ مرتب رہتا ہے اس عمارت کی تعمیر ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولینا حافظ محمد احمد صاحب ابن قاسم العلوم قدس سرہ ہوئی۔

رقبہ ۴۴ × ۱۱ مربع فٹ

إدارة الحساب

إدارة الدار الرئيسية للمحاسبة والمراقبة على الشؤون المالية فهي التي تستلم تبرعات المسلمين التي تقدر بستمائة ألف روبية سنويا وترفع إليها الحسابات من كل إدارة تابعة. بنيت العمارة سنة ۱۳۱۷ﻫ الموافقة لسنة ۱۸۹۹ الميلادية حين إدارة الشيخ الحافظ محمد أحمد بن قاسم العلوم مولانا محمد قاسم رحمهما الله ومساحة البناء ۴۴ × ۱۱ قدما

Daftar Mohasabi :-

The central accounts office of Darul Uloom, where the accounts of income and expenditure of nearly six Lacs Rupees received as donations from the well wishers of Darul Uloom is maintained. It was built in 1317 Hijri (1899-A D.) during the ehtemam of Late Hazrat Moulana Hafiz Mohammed Ahmad sb. Area :- 44ft x 11ft.

'दफ्तर महासबी'

दारुल उलूम के मालियात का मर्कज़ी दफतर जहां अहले ख़ैर मुसलमानों के लग भग ६ लाख सालाना के आमदो ख़र्च का रिकार्ड मुरत्तब रहता है इस इमारत की तामीर सन् १३१७ हि० मुताबिक सन् १८९९ ई० मे बज़मानये अहतमाम हज़रत मौलाना मुहम्मद अहमद साहब रहमतुल्लाअलैह पुत्र कासिमुल उलूम तामीर हुई।

रकबा ४४×११ वर्गफीट

دارالاہتمام دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا مرکزی دفتر جس کے تحت بیس شعبوں کے دفاتر کام کرتے ہیں۔ یہ عمارت ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تعمیر ہوئی۔

رقبہ ۲۳×۱۹ مربع فٹ

دار الاهتمام

الإدارة الرئيسية لدار العلوم، التي يجلس فيها المدير، وتشرف هذه الإدارة على عشرين شعبة تابعة، وتم بناؤها سنة ١٣١٥هـ الموافقة لسنة ١٨٩٧ الميلادية بعهد حضرة الحافظ محمد أحمد رحمه الله نجل مؤسس المعهد المغفور له مولانا محمد قاسم، ومساحتها ٢٣ × ١٩ قدما.

Darul-Ehtemam

The central office of Darul Uloom which controls twenty sub-Offices of different departments. It was built in 1315 Hijri (1897 A.D.) during the ehtemam of Late Moulana Hafiz Mohammed Ahmad sb.

Area:- 23ft x 19ft.

'दारुल अहतमाम दारुलउलूम देवबन्द'

दारुल उलूम देवबन्द का मरकजी दफ्तर जिसके तहत बीस शोबो के दफातिर काम करते हैं वह इमारत सन् १३१५ हि० मुताबिक सन् १८९७ ई० में बजमाना अहतमाम हजरत मौलाना हाफिज मोहम्मद अहमद साहब तामीर हुई।

रकबा २३ × १९ वर्ग फीट

دفتر نشر و اشاعت دارالعلوم دیوبند

اس دفتر سے دارالعلوم کے ماہانہ احوال وکوائف نشر کئے جاتے ہیں اور یہیں سے دارالعلوم دیوبند کا ماہانہ آرگن رسالہ "دارالعلوم"
ہر ماہ پابندی سے شائع ہوتا ہے۔ رقبہ ۲۳ × ۱۳ مربع فٹ ۔

دار النشر والإشاعة

الإدارة المسئولة عن تسجيل نشاط الدار الأدبي والديني ونشره،
فتنشر التقارير شهريا، كما تصدر مجلة شهرية تسمى "دار العلوم" مليئة
بالمقالات الدينية الممتعة . المساحة ۲۳×۱۳ قدما

Daftar Nashr-o-Ishaat :- (Publications)

From this office the montnly organ of Darul Uloom is published every month regularly in which the activities of Darul Uloom are also published
Area 23ft x 13ft.

दफ्तर नशरो इशाअत दारुल उलूम देवबन्द

इस दफ्तर से दारुल उलूम के माहाना अहवाल व क्वाईफ नशर किये जाते हैं और यहीं से दारुल उलूम देवबन्द का माहाना आर्गन रिसाला "दारुल उलूम" हर माह पाबन्दी से शाये होता है।
रकबा २३×१३ वर्ग फीट
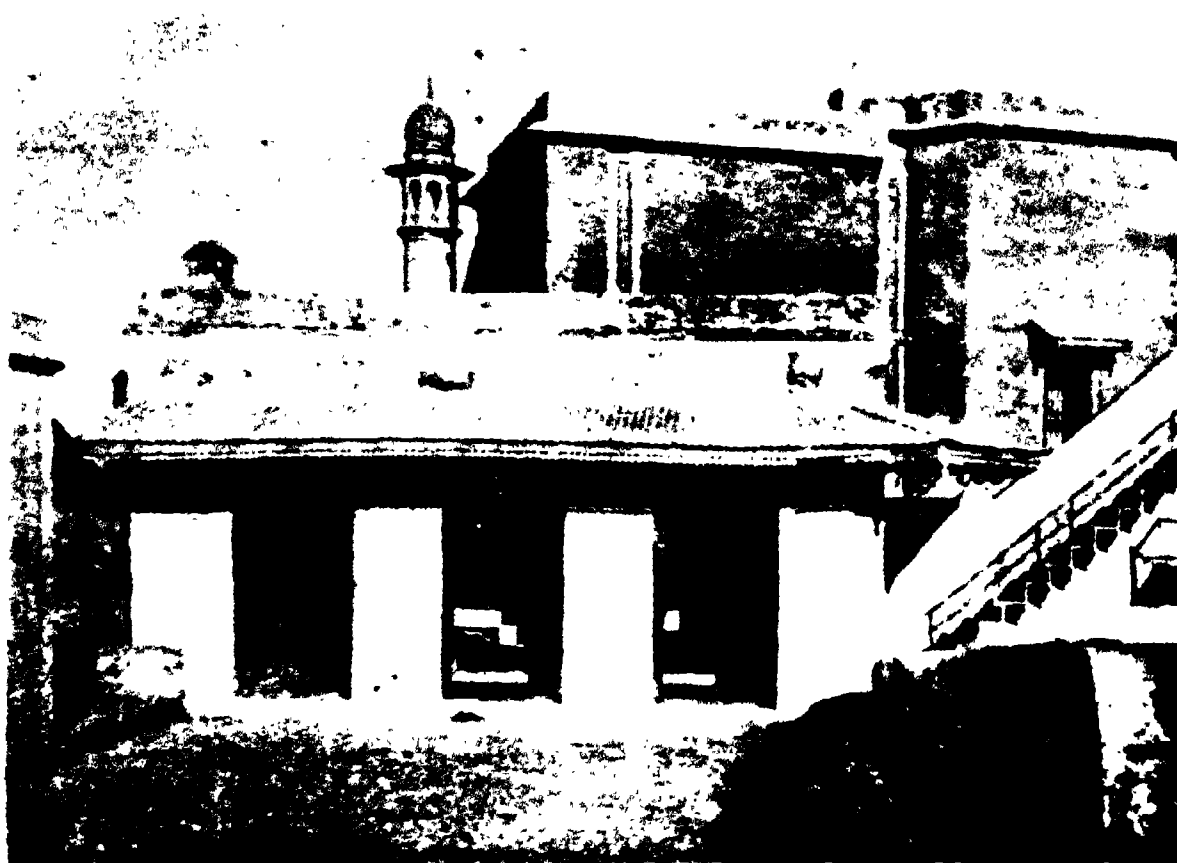
نودرہ دارالعلوم دیو بند

دارالعلوم دیوبند کی اولین درسگاہ حدیث جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ بانی دارالعلوم کی حیات میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ تعمیر ہوئی جس میں دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس حضرت اقدس مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ درس حدیث دیتے تھے۔ اس عظیم عمارت میں تین بڑی بڑی درسگاہیں ہیں جن میں اس وقت مختلف علوم و فنون کے اساتذہ درس دیتے ہیں۔ سن تعمیر ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۷ء۔ کل نودرہ کا رقبہ ۷۴×۵۰ مربع فٹ تینوں درسگاہوں میں سے ہر ایک درسگاہ کا رقبہ ۳۶×۲۵ مربع فٹ ہے۔

"نودرہ" دارالعلوم

أول دار للاحاديث النبوية بنيت أثناء حياة الشيخ حجة الإسلام مولانا محمد قاسم النانوتوى تحت إدارة الشيخ الشاه رفيع الدين طاب الله ثراهما سنة ۱۲۹۳ھ الموافقة لسنة ۱۸۷۷ الميلادية وكان يحدث فيها أول رئيس المدرسين لدار العلوم مولانا محمد يعقوب نور الله مرقده وهذا البناء الفخم يحتوى على ثلث قاعات كبيرة والآن يدرس فيها أساتذة المعهد علوما متنوعة وفنونا عديدة. —— ومساحة البناء كلها ۷۴×۵۰ قدما ومساحة كل قاعة ۳۶×۲۵ قدما

Naudara

The first lecture room of Hadis which was built in 1293 Hijri (1877 A.D.) during the lifetime of Hujjatul Islam Late Hazrat Moulana Mohammed Qasim sb. the founder of Darul Uloom, under the ehtemam of Late Hazrat Moulana Rafiuddin sb. The first principal of Darul Uloom Late Hazrat Moulana Mohmmed Yaqub sb., taught Hadis in this building. It consists of three spacious lecture rooms in which different subjects are tauhght by renowned professors.

The Area of Naudara as a whole:- 74ft x 50ft.

The Area of each lecture room:- 36ft x 25ft.

नौदरा दारुल उलूम देवबन्द

दारुल उलूम देवबन्द की अव्वलीन दरसगाहे हदीस जो हुज्जतुलइसलाम हजरत मौलाना मोहम्मद कासिम सा० नानौतवी कुद्दसा सिर्रहू बानिये दारुल उलूम की हयात मे बजमाना महतमाम हजरत मौलाना शाह रफीउद्दीन साहब कुद्दसा सिर्रहू तामीर हुई। जिसमे दारुल उलूम के सब से पहले सदर मदरिस हजरते अकदस मौलाना मुहम्मद याकूब साहब दरसे हदीस देते थे। इस अजीम इमारत मे तीन बड़ी दरसगाहे है। जिनमे इस वक्त मुख्तलिफ उलूम व फनून के असातजा दरस देते है

सने तामीर सन् १२९३ हि० मुताबिक सन् १८७७ ई०।

कुल नौदरे का रकबा ७४×५० वर्ग फीट तीनो दर्सगाहो मे से हर एक दर्संगाह का रकबा ३६×२५ वर्ग फीट है।

دارالحدیث (بیرونی منظر)

دارالحدیث (منظر من الخارج)

Darul Hadis (External View)

दारुलहदीस (बैरूनी मंज़र)
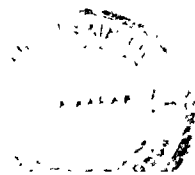
دارالحدیث دارالعلوم دیوبند کا روکار

دارالعلوم دیوبند کی سب سے بڑی اور شاندار درسگاہ حدیث جو ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۴ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ تعمیر ہوئی۔ جس میں دورۂ حدیث کی جماعت کے دو سو سے زائد طلباء درس حدیث میں شرکت کرتے ہیں۔ برقی روشنی اور برقی پنکھوں کا معقول انتظام ہے۔ اس دارالحدیث میں درس کا آغاز حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے فرمایا اور آخر دم تک اسی میں پڑھاتے رہے۔ رقبہ ۶۸ × ۳۵ مربع فٹ۔

دارالحدیث

القاعة الكبيرة الخاصة لدراسة الحديث النبوي على صاحبه الصلاة والتسليم

وهي أكبر مدرجات الدار تم بناؤها سنة ١٣٥٢هـ ١٩٣٤ الميلادية في عهد مدير الدار الحالي مولانا محمد طيب أطال الله بقاءه وبدأ المغفور له الشيخ حسين أحمد المدني التدريس في هذه القاعة وواظب عليه إلى أن توفاه الله. والقاعة مزينة بالأنوار والمراوح الكهربائية. (المساحة ٦٨×٣٥ قدما)

Front View of Darul Hadis

Darul Hadis, the most spacious and magnificient lecture room, of Darul Uloom, which was built in 1352 Hijri (1934 A D) during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab Sb with suitable arrangements of electric lights and fans. It accomodates more than two hundred students of Daura-e-Hadis. Late Sheikhul Islam Moulana Syed Husain Ahmad Madani inaugurated it by teaching lessons of Hadis and took his classes of Hadis in it till his last moments.

Area 68 ft ×35ft.

दारुल हदीस दारुलउलूम देवबन्द का रुकार

दारुल उलूम देवबन्द की सब से बड़ी और शानदार दरसगाहे हदीस जो सन् १३५२ हि० मुताबिक १९३४ ई० में बज़मानये एहतमाम हज़रत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दजिल्लहू तामीर हुई जिस में दौरये हदीस की जमाअत के २०० से अधिक विद्यार्थी दरसे हदीस में शिरकत करते हैं। बरक़ी रोशनी और बरक़ी पंखों का माकूल प्रबन्ध है। इस दारुलहदीस में दरस का प्रारम्भ हज़रत शैखुलइस्लाम मौलाना सैयद हुसैन अहमद साहब मदनी रहमतुल्ला अलैह ने फरमाया और आखीर दम तक इसी में पढ़ाते रहे।

रक़बा ६८×३५ वर्ग फीट

باب رشید

احاطۂ نودرہ کا شمالی دروازہ جو بزمانۂ اہتمام حضرت مولینا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ
احاطۂ باغ سے داخل ہونے والوں کے لئے تعمیر کیا گیا اور آج حضرت اقدس فقیہ الاسلام مولینا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ
سرپرست ثانی دارالعلوم دیوبند کے نام نامی کی طرف منسوب ہے۔

باب الرشید

الباب الشمالي لنودرة المنسوب إلى فقيه الإسلام رئيس العلماء حضرة
الحاج مولانا رشيد أحمد الكنكوهي برد الله مضجعه بني في إدارة حضرة
الحاج مولانا رفيع الدين رحمه الله .

Bab e Rasheed

The Northern gate of Naudara, which was constructed during the ehtemam of Moulana Rafiuddin sb. for those who wanted to come from ehata Bagh to Naudara. It has been named after Faqihul Islam Late Hazrat Moulana Rashid Ahmed sb. of Gangoh who was the second patron of Darul Uloom. Late Moulana Mohammed Qasim sb. was the first patron (Sarparast)

बाबे रशीद

अहातए नौदरे का शुमाली दरवाज़ा जो बज़मानये इहतमाम हज़रत मौलाना रफ़ीउद्दीन साहब रहमतुल्ला अलैह अहातये बाग़ से दाख़िल [illegible] के लिये तामीर किया गया। और आज हज़रते अक़दस फ़क़ीहुल इस्लाम मौलाना रशीद अहमद साहब गंगोही [illegible] सरपरस्त सानी दारुलउलूम देवबन्द के नाम नामी की तरफ़ मन्सूब है
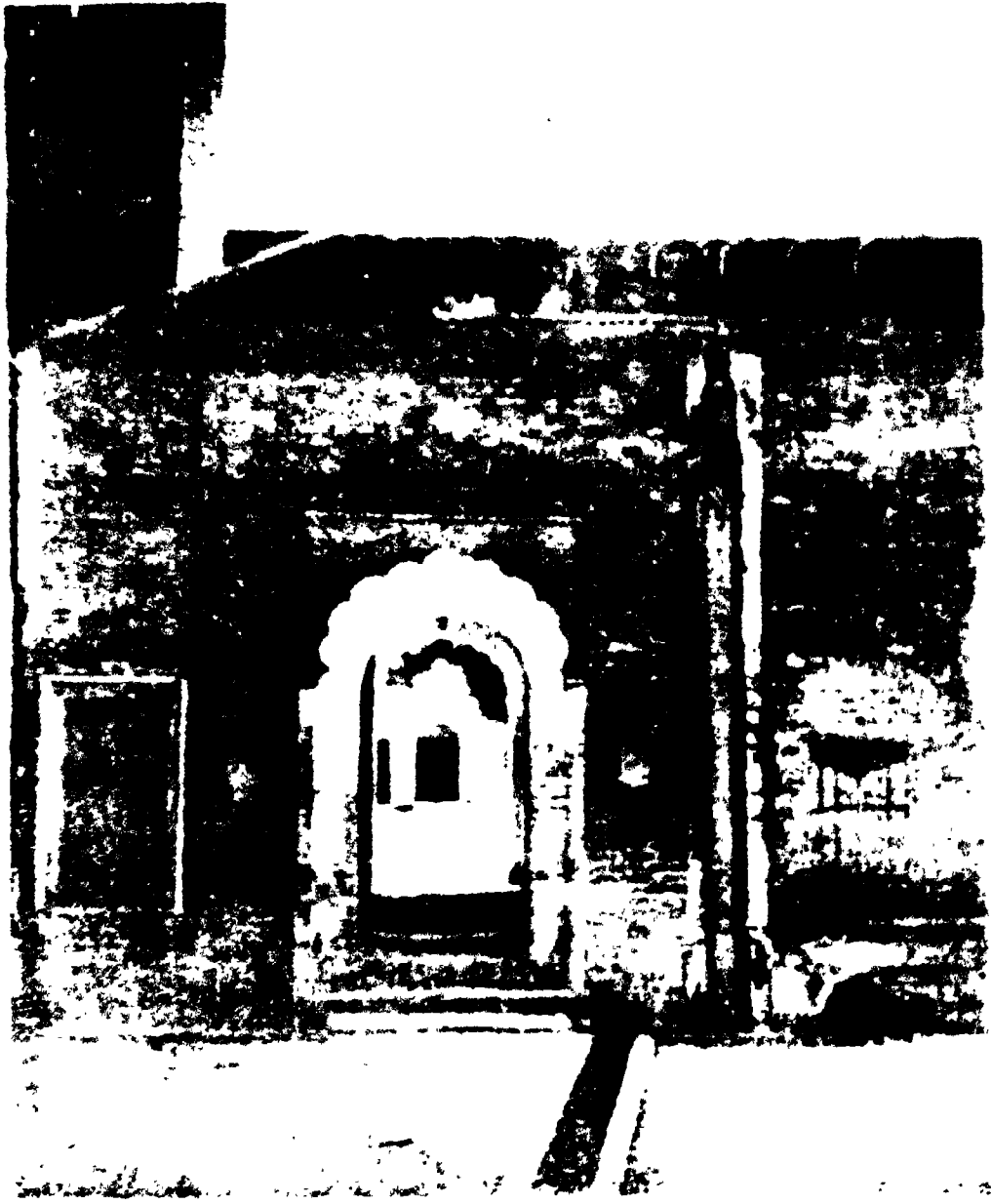
دارالطلبا قدیم دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم کا قدیم دارالاقامہ جو انیس کروں پر مشتمل ہے۔ جس میں بیک وقت ۵۶ طلبہ کی گنجائش ہے۔ اس دارالاقامہ کی تعمیر بزمانۂ اہتمام حضرت مولینا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہوئی۔

ہر کمرے کا رقبہ ۱۱×۹ مربع فٹ ہے۔

دار الطلبة القديمة

دار الإقامة القديمة التي تحتوي على تسع عشرة غرفة، ويقيم فيها الآن ستة وخمسون طالباً تم بناؤها في زمن حضرة الحافظ محمد أحمد المغفور له ومساحة كل غرفة منها ۱۱×۹ قدماً

The Old Hostel of Darul Uloom Deoband

The old hostel of Darul Uloom Deoband, which contains ninteen rooms and accomodates 56 students, was costructed during the time of Late Hazrat Moulana Hafiz Mohammed Ahmad, the then Mohtamim.

Area of each class room is 11ft x 9ft.

दारुत तलाबा कदीम दारुल उलूम देवबन्द

दारुलउलूम का कदीमी दारुल इकामा जो उन्नीस (१६) कमरों पर मुशतमिल है। जिसमें बयकवक्त ५६ विद्यार्थियों की गुन्जाएश है। इस दारुल इकामे की तामीर बजमाना महतमाम हजरत मौलाना हाफिज मुहम्मद अहमद साहब रहमतुल्लाअलैह हुई। हर कमरे का रकबा ११×९ वर्ग फीट है

باب محمود

احاطہ نودرہ کا جنوبی دروازہ جس سے مطبخ کی سمت رہنے والے طلبہ اس احاطہ میں داخل ہوتے ہیں یہ دروازہ بزمانۂ اہتمام
حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تعمیر ہوا اور آج حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ
کے نام نامی کی طرف منسوب ہے۔

باب محمود

الباب الجنوبي لنودره وهو المدخل لطلبة المقيمين في الجنوب
عند دار الطعام، بني في إدارة مدير الدار حضرة الشيخ مولانا رفيع الدين رحمه الله
وهو معنون باسم شيخ الهند مولانا محمود حسن نور الله ضريحه .

Bab-e-Mahmood

The Southern gate of Naudara through which the students residing in **Khata Mathakh** enter Naudara. This gate was built during the **ehtamam of Late Hazrat** Moulana Rafiuddin sb. and is called after Late **Sheikhulhind Hazrat** Moulana Mahmood Ul Hasan sb

बाबे महमूद

अहाता नौदरा का दक्षिणी दरवाज़ा जिस से मतबख़ की सिम्त रहने वाले तलबा इस अहाते में दाख़िल होते हैं यह दरवाज़ा बज़माने अहतमाम हज़रत मौलाना रफ़ीउद्दीन साहब रहमतुल्ला अलैह तामीर हुआ। और आज हज़रत अकदस शैखुलहिन्द मौलाना महमूद हसन साहब रहमतुल्ला अलैह के नामे नामी की तरफ़ मन्सूब है।

دارالحفلات ــ دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا مرکزی ہال جو دارالحدیث کے نیچے واقع ہے اس مرکزی ہال میں دارالعلوم کے بڑے بڑے جلسے ہر سال ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ہال ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب بن قاسم العلوم حضرت مولانا نانوتوی تعمیر ہوا۔

رقبہ مشرقی حصہ کا ۷۳ × ۴۰ مربع فٹ۔ مغربی حصہ کا ۳۶ × ۳۵ مربع فٹ

دارالحفلات

قاعة الدار المركزية الواقعة تحت دار الحديث تنعقد فيها حفلات الدار الكبيرة كل سنة. تم بناؤها في إدارة حضرة الحافظ محمد أحمد بن قاسم العلوم مولانا محمد قاسم طاب الله ضريحهما سنة ١٣٣٠هـ الموافقة لسنة ١٩١١م

مساحة جانبها الشرقي ٧٣×٤٠ قدما وجانبها الغربي ٣٦×٣٥ قدما

Darul-Hafalat

The central hall of Darul Uloom, Deoband which is just under the Darul Hadis. All important functions and general meetings of the year take place in this central hall. It was built in 1330 Hijri (1911-A.D.) during the ehtemam of Late Hazrat Moulana Hafiz Mohammed Ahmad sb. son of Late Moulana Mohammed Qasim sb. the founder of Darul Uloom.

Area of the eastern portion 73ft x 40 ft.
Area of the western portion 36ft x 35 ft.

दारुल हफलात दारुलउलूम देवबन्द

दारुल उलूम देवबन्द का मरकजी हाल जो दारुलहदीस के नीचे वाकेय है इस मरकजी हाल में दारुल उलूम के बड़े २ जलसे हर वर्ष होते रहते हैं यह हाल सन् १३३० हि० मुताबिक सन् १९११ ई० में बजमाना अहतमाम हजरत मौलाना हाफिज मुहम्मद अहमद साहब रहमतुल्ला अलेह पुत्र कासिमुल उलूम हजरत मौलाना नानौतवी तामीर हुआ।

रकबा पूर्वी भाग का ७३ X ४० वर्ग फीट   पश्चिमी भाग का ३६ X ३५ वर्ग फीट

دارالحدیث (اندرونی ہال)

دارالحدیث (منظر من الداخل)

Inner view of Darul Hadis

दारुल हदीस का अन्दरूनी मंजर
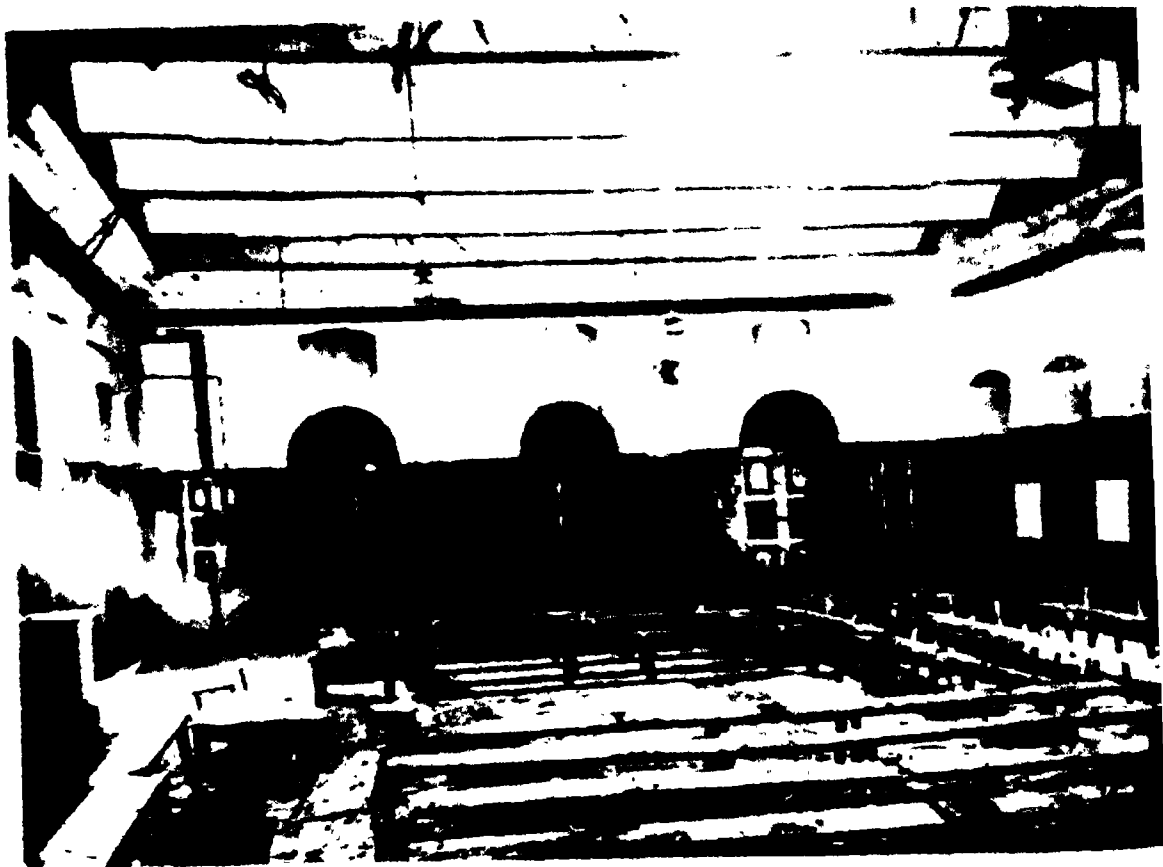
دارالتفسیر دارالعلوم دیوبند

علوم قرآن سے افادہ کی سب سے بڑی درسگاہ جو دارالحدیث کے اوپر واقع ہے۔ اس کا چمکدار گنبد سامنے نظر آرہا ہے

یہ ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولینا محمد طیب صاحب مدظلہ تعمیر ہوئی۔

رقبہ ۳۰ × ۳۰ مربع فٹ

دار التفسير

أكبر الينابيع الهندية التي تتفجر منها علوم القرآن، وتروي غليل رواد المعرفة والحكمة، الذين يؤمون الدار من كل صوب. وهي قاعة فخمة ذات قبة شامخة شيدت فوق دار الحديث، وترى في الصورة القبة الشامخة بنيت خلال إدارة المدير الحالي مولانا محمد طيب سنة ١٣٥٨هـ الموافقة لسنة ١٩٣٩ الميلادية. مساحتها ٣٠×٣٠ قدما.

Darul-Tafseer

The **biggest** department of imparting knowledge about the Holy **Quran, which is situated** just **above** Darul Hadis . **The shining** dome **is just before you.** It was built in 1358 Hijri (1939-A.D.)during the ehtemam **of Hazrat Moulana** Mohmmed Tayyab sb.

Area 30 ft x 30 ft.

'दारुत्तफसीर दारुल उलूम देवबन्द'

उलूम कुरान से इस्तफादे की सबसे बडी दर्सगाह जो दारुल हदीस के उपर वाकेय है। इसका चमकदार गुम्बद सामने नजर आरहा है यह सन् १३५८ हि० मु० सन १९३९ ई० में बजमाना महतमाम हजरत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्‌जिल्लहू तामीर हुई

रकबा ३०×३० वर्ग फीट

باب الظاہر

دارالعلوم کے جدید دارالاقامہ کا عظیم الشان دروازہ جو حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے سفر
افغانستان کے موقعہ پر اعلیٰ حضرت امیر ظاہر شاہ بادشاہ افغانستان کے عطیے سے ان کے نام پر بطور ان کی یادگار کے
۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ تعمیر ہوا۔ رقبہ ۵۴ × ۴۲ مربع فٹ

باب الظاهر

البوابة الفخمة لدار الإقامة الجديدة بنيت من تبرعات صاحب الجلالة
محمد ظاهر شاه ملك افغانستان وهو تفضل بمنحها عند ما قام المدير
الحالي مولانا محمد طيب بزيارة أفغانستان وعاهله. وتم بناؤها سنة ١٣٥٩ﻫ
الموافقة لسنة ١٩٤٠ الميلادية ' وسميت باسم الملك.
المساحة ٥٤×٤٢ قدما

Babuzzahir (Zahir Gate)

The massive and splendid gate of the new hostel of **Darul Uloom** which was built in 1359 Hijri (1940 A.D.) with the royal donation presented by his Majesty Zahir Shah, the king of Afghanistan to Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb. during his visit to Afghanistan So the gate was named after His majesty, the king of Afghanistan.

Area :- 54ft x 42ft.

बाबुज़्ज़ाहिर

दारुल उलूम के जदीद दारुल इकामे का प्रजीमुश्शान दरवाजा जो हजरत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दज़िल्लहू मोहतमिम दारुल उलूम देवबन्द के सफरे अफगानिस्तान के अवसर पर आला हजरत अमीर जाहिर शाह बादशाह अफगानिस्तान के अतीय्ये से उनके नाम पर बतौर उनकी यादगार के सन १३५६ हि० मुताबिक सन १६४० ई० में बजमानये अहतमाम हजरत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दज़िल्लहू तामीर हुआ।

रकबा ५४×४२ वर्ग फीट

دارالطلبہ جدید دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم کا عظیم ترین شاندار دارالاقامہ جو ایک سو سات کمروں پر مشتمل ہے جس میں بیک وقت آٹھ سو طلبا قیام پذیر رہتے ہیں۔ اس دارالاقامہ کی تعمیر ابتداءً ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۱۹ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز شروع ہوئی تھی اور ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۶ء تک حافظ صاحبؒ کے زمانہ ہی میں اسکے تیرہ کمرے تیار ہو چکے تھے۔ بقیہ کمروں کی تکمیل ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا طیب صاحب مدظلہ ہوئی۔ ہر کمرے کا رقبہ ۱۹ × ۱۸ مربع فٹ۔ پورے احاطہ کا رقبہ ۵۰۰ × ۳۶۱ مربع فٹ ہے۔

دار الطلبة الجديدة

دار الإقامة الحديثة العظيمة التي تشتمل على سبع ومائة غرفة ويقيم فيها حوالي ثمانمائة طالب. ابتدأ بناؤها بعهد حضرة الحافظ محمد أحمد سنة ۱۳۳۸هـ الموافقة لسنة ۱۹۱۹ الميلادية وبني منها ثلاثة عشر غرفة في حياته سنة ۱۳۴۴هـ الموافقة لسنة ۱۹۲۶ الميلادية لكن تم بناؤها بعهد إدارة المدير الحالي مولانا محمد طيب سنة ۱۳۶۴هـ الموافقة لسنة ۱۹۴۵ الميلادية.

ومساحة كل غرفة منها ۱۹ × ۱۸ قدما ومساحة دار الإقامة ۵۰۰ × ۳۶۱ قدما.

Daruttalaba Jadid : (New Hostel)

The biggest and most attractive hostel of Darul Uloom which contains 107 rooms and accomodates 800 students free of all charges. The construction of this hostel was started in 1338 Hijri (1919-A.D) during the principalship of Late Moulana Hafiz Mohammad Ahmad sb. By 1344 Hijri (1929-A D.) thirteen rooms were completed during his life time The rest of the rooms were built during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb. and were completed in 1364 Hijri (1945-A.D.)

Area of the whole compound 500ft x 361ft
Area of each room:- 19ft x 18ft

दारुत तलबा जदीद दारुल उलूम देवबन्द

दारुल उलूम का अज़ीम तरीन, शानदार दारुल इक़ामा जो एक सौ सात (१०७) कमरों पर मुश्तमिल है। जिसमें बयक वक़्त आठसौ विद्यार्थी क़याम पज़ीर रहते हैं। इस दारुल इक़ामे की तामीर प्रारम्भ में सन् १३३८ हि० मुताबिक़ सन् १९१९ ई० बज़माना मुहतमिम हज़रत मौलाना हाफ़िज़ मुहम्मद अहमद साहब मरहूम शुरू हुई थी और सन् १३४४ हि० मुताबिक़ सन् १९२९ ई० तक हाफ़िज़ साहब रहमतुल्ला अलैह के ज़माने ही में इसके १३ कमरे तैयार हो चुके थे। बाक़ी कमरों की तकमील सन् १३६४ हि० मुताबिक़ सन् १९४५ ई० में बज़माना मुहतमिम हज़रत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दज़िल्लहू हुई।

हर कमरे का रक़बा १९ × १८ वर्ग फ़ीट पूरे अहाते का रक़बा ५०० × ३६१ वर्ग फ़ीट है।

باب یعقوب

دارالاقامہ جدید کا شمالی دروازہ جو بہ زمانۂ اہتمام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ تعمیر ہوا۔ اور حضرت مولینا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ سب سے پہلے صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کے نام نامی کی طرف منسوب کیا گیا اس دروازہ سے شیخ الاسلام حضرت مولینا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ درس حدیث دینے کے لئے دارالعلوم میں داخل ہوا کرتے تھے۔

باب یعقوب

الباب الشمالی لدار الإقامة الحديثة المنسوب إلى حضرة الحاج مولانا محمد يعقوبؒ اول رئيس المدرسين للمعهد وبنيت في إدارة المدير مولانا محمد طيب ومن ميزاتها أن المغفور له شيخ الإسلام مولانا السيد حسين أحمد المدني كان يدخل من هذا الباب عند دخوله المعهد لتدريس الحديث النبوي على صاحبه الصلوٰة والتسليم.

Bab-e-Yaqoob

The Northern gate of Daruttalaba Jadid, which was built during **the ehtemam of Hazrat** Moulana Mohammed Tayyab **sb. and is called after Hazrat. Moulana Mohammed** Yaqoob sb, the first principal of **Darul Uloom. Late Sheikhul Islam** Ḥazrat Moulan Syed **Husain Ahmad sb. used to enter through this gate** while going to lecture room for teaching Hadis.

बाबे—याकूब

दारुल इकामा जदीद का उत्तरी दरवाजा जो बजमानये महतमाम हजरत मौलाना मु० तैयब साहब मद्दाजिल्लहू तामीर हुआ और हजरत मौलाना मुहम्मद याकूब साहब सब से पहले सदर मुदर्रिस दारुलउलूम देवबन्द के नामे नामी की तरफ मनसूब किया गया। इस दरवाजे से शेखुल इसलाम हजरत मौलाना हुसैन अहमद साहब रहमतुल्लाह अलैह दरसे हदीस देने के लिये दारुल उलूम मे दाखिल हुआ करते थे।

دارجدید دارالعلوم دیوبند کا غربی بالائی حصہ

اوپر طلباء کے چار کمرے نظر آرہے ہیں۔ جن میں تقریبا ۳۲ طلباء کی رہائش کی گنجائش ہے۔ یہ کمرے ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۸ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ تعمیر ہوئے۔

ہر کمرے کا رقبہ ۱۹½ × ۱۸ مربع فٹ

الطابق الثانی لدار الإقامة الجدیدة

تری فی الصورة أربع غرفات بنیت حدیثا علی الجانب الغربی، وتتسع لاثنین وثلاثین طالبا، وإنما یعود الفضل فی بناءها أیضا إلی حضرة الشیخ مولانا محمد طیب المدیر الحالی، ومسلحة کل غرفة ۱۹½ × ۱۸ قدما.

The upper story of the western portion of Dar-e-jadid

On the Upper story four rooms are visible which can accomodate 32 students. They were built in 1377 Hijri (1958-A.D.) during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb.

Area of each room 19'5ft x 18 ft.

दारे जदीद दारुल उलूम देवबन्द का पश्चिमी ऊपरी हिस्सा

ऊपर विद्यार्थियों के चार कमरे नज़र आरहे हैं। जिन में लग भग ३२विद्यार्थियों के रहने की गुन्जाइश है। यह कमरे सन १३७७ हि॰ मुताबिक १९५८ ई॰ में बज़मानये अहतमाम हज़रत मौलाना मु॰ तैयब साहब मद्‌ज़िल्लहू तामीर हुए।

हर कमरे का रकबा १९½X१८ वर्ग फीट

باب رفیع

دارالاقامہ جدید کا جنوبی دروازہ جو بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ تعمیر ہوا۔ یہ دروازہ مسجد چھتہ کی پشت پر جانب شہر واقع ہے۔ اس سمت کے وارد و صادر اکثر اسی دروازے سے دارالعلوم میں داخل ہوتے ہیں۔

باب الرفیع

البوابة الجنوبية لدار الإقامة الواقعة خلف مسجد تشتة مواجهة لمدينة ديوبند. بنيت تحت إشراف وفي إدارة المدير مولانا محمد طيب

Bab-e-Rafi

The southern gate of Daruttalaba Jadid, which was built during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb. This gate is situated on the back of Chhatta Masjid facing towards the city. The visitors of this side mostly come in through this gate.

बाबे रफी

दारुल इकामा जदीद का जुनूबी दरवाजा जो बजमानये महतमाम हजरत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दजिल्लहू तामीर हुआ। यह दरवाजा मसजिद छत्ता की पुश्त पर जानिबे शहर वाकय है। इस सिम्त के वारिद व सादिर अकसर इसी दरवाजे मे दारुल उलूम मे दाखिल होते है।

دارالعلوم دیوبند کی دو نئی درسگاہیں

جو احاطۂ مولسری کے جانب جنوب اسی سال (۱۳۷۸ھ مطابق ۱۹۵۸ء میں) بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ
تعمیر ہوئیں۔ ہر درسگاہ کا رقبہ ۲۳½ × ۲۸½ مربع فٹ ہے۔

القاعتان الجديدتان

مدرجان بنيا حديثا في جنوب من احاطه مولسری في إدارة حضرة
الحاج مولانا محمد طيب سنة ۱۳۷۸ﻫ الموافقة لسنة ۱۹۵۸ الميلادية
ومساحة كل منهما ۲۳½ × ۲۸½ قدما.

The two New Lecture Rooms

Both these new lecture rooms were built in 1378 Hijri (1958 A. D.) during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tyyab sb.

Area of each rooms 28'5ft x 23'5ft.

दारुल उलूम देवबन्द की दो नई दर्सगाहें

जो अहाताये मौलसरी के जानिबे जुनूब सन १३७८ हि० मुताबिक १९५८ ई० में बज़मानये अहतमाम हज़रत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दज़िल्लहू तामीर हुईं।

हर दर्सगाह का रकबा २३½ × २८½ वर्ग फीट

دارالطعام دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا مطبخ جس میں روزانہ تقریباً آٹھ سو طلبہ کا کھانا دونوں وقت تیار کیا جاتا ہے۔ یہ عمارت ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء
میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولینا محمد طیب صاحب مدظلہ تعمیر ہوئی ۔ رقبہ ۷۰×۵۵ مربع فٹ
لکڑیاں رکھنے اور کھانا تقسیم ہونے کی جگہ اس رقبہ کے علاوہ ہے ۔

دارالطعام

إحدى المباني الفخمه التي تشتمل على مطبخ الدار إلى جانب الأمكنة المختصة بالوقود والأروقة لتوزيع الطعام يعد الطعام في هذا المطبخ لنحو ثمان مائة طالب غدوة وعشيا، تم بناء العمارة سنة ۱۳۶۲ھ الموافقة لسنة ۱۹۴۳م تحت إشراف المدير الحالي مولانا محمد طيب أطال الله بقاءه . ومساحة المطبخ ۷۰×۵۵ قدما (غير الأمكنة والأروقة المخصصة للوقود وتوزيع الطعام)

Darul - Taam

The kitchen of Darul Uloom, Deoband where food is prepared twice a day for 800 students. It was built in 1362 Hijri (1943-A.D.) during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb.

Area-: Excluding the rooms for distributing the meals and for the storage of fuel 70ft x 55 ft.

दारुत्तआम दारुल उलूम देवबन्द

दारुल उलूम देवबन्द का मतबख जिसमें रोजाना लगभग ८०० तुल्बा का खाना दोनों वक्त तैयार किया जाता है यह इमारत सन् १३६२ हि० मुताबिक सन १९४३ ई० में बजमाना मुहतमाम हजरत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दजिल्लहू तामीर हुई। रकबा ७० ५५ वर्ग फीट

(नोट—लकड़ियां रखने और खाना तकसीम होने की जगह इस रकबे में अलग है।)

دارالقــرآن

قرآن شریف حفظ وناظرہ، اور اردو کے ابتدائی درجات کی تعلیم کے لئے پانچ درسگاہوں کا مجموعہ جو جناب شیخ فیروز الدین صاحب تاجر کلکتہ کے مخصوص عطیہ سے ۱۳۶۸ھ مطابق ۱۹۴۹ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولینا محمد طیب صاحب ظلہٗ تعمیر ہوا۔

پانچوں درسگاہوں میں سے ہر درسگاہ کا رقبہ ۲۵ × ۲۱ مربع فٹ

دارالقــرآن

إحدى المباني الفخمة التى تحتوى على خمس مدرجات فسيحة بنيت مما تبرع الشيخ فيروز الدين أحد تجار كلكته خاصا لهذا الغرض، وتم بناؤها تحت إشراف وفي إدارة المدير مولانا محمد طيب سنة ١٣٦٨هـ الموافقة لسنة ١٩٤٩ الميلادية وتختص للقرآن الكريم قراءة وحفظا كما يتعلم فيها الطلاب اللغة الأردوية . ومساحة كل غرفة ٢٥ × ٢١ قدما

Darul Quran

A row of five class rooms with the primary classes of Urdu and the classes of the Holy Quran (Hifz and Nazira). A special donation was awarded by Sheikh Ferozuddin, a prominent businessman in Calcutta for the construction of this building. It was built in 1368 Hijri (1949 A. D.) During the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb.

Area of each class room. 25ft x21ft.

'दारुल कुरान दारुलउलूम देवबन्द'

कुरान शरीफ हिफ्ज व नाजरे और उर्दू के इब्तदाई दरजो की तालीम के लिए पांच दर्सगाहों का मजमूआ जनाब शेख फीरोजुद्दीन साहब ताजिर कलकत्ता के मखसूस अतीये से सन् १३६८ हि० मु० १९४९ई० बजमाना अहतमाम हजरत मौलाना मु० तैयब साहब मद्जिल्लहू तामीर हुआ । पांचों दर्सगाहों में से हर एक का रकबा २५×२१ वर्ग फीट

شعبۂ زبان فارسی دارالعلوم دیوبند

۱۳۵۶ھ مطابق ۱۹۳۷ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ تعمیر ہوا اس شعبہ میں دیگر عصری مضامین کے ساتھ ساتھ فارسی کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ جس سے مسلم اور غیر مسلم دونوں نے استفادہ کیا ہے۔ رقبہ ۴۶×۴۳ مربع فٹ

معهد اللغة الفارسية

بناء جميل بني في إدارة مولانا محمد طيب سنة ١٣٥٦هـ الموافقة لسنة ١٩٣٧ الميلادية، ويدرس الطلاب فيه اللغة الفارسية، ويتخرجون فيها منه نهائيا إلى جانب العلوم الحاضرة اللازمة. ومما يذكر أنه لم تقتصر إفادة هذا المعهد عند المسلمين، وإنما يفيد منه غيرهم أيضا.

المساحة ٤٦×٤٣ قدما

The Department of Persian Studies

It was built in 1356 Hijri (1937-A.D.) during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb. In this department the modern subjects are taught together with the persian language. the standard of which is very high. Muslims and non Muslims both derive benefits from this department.

Area :- 46 x 43ft.

शोबये ज़बान फारसी दारुल उलूम देवबन्द

सन १३५६ हि० मुताबिक सन् १९३७ ई० मे बज़मानये अहतमाम हज़रत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दज़िल्लहू तामीर हुआ। इस शोबे में दीगर असरी मज़ामीन के साथ साथ फारसी की आला तालीम दी जाती है। जिस से मुसलिम और गैर मुसलिम दोनों ने इस्तफादा किया है

रकबा ४६ × ४३ वर्ग फीट
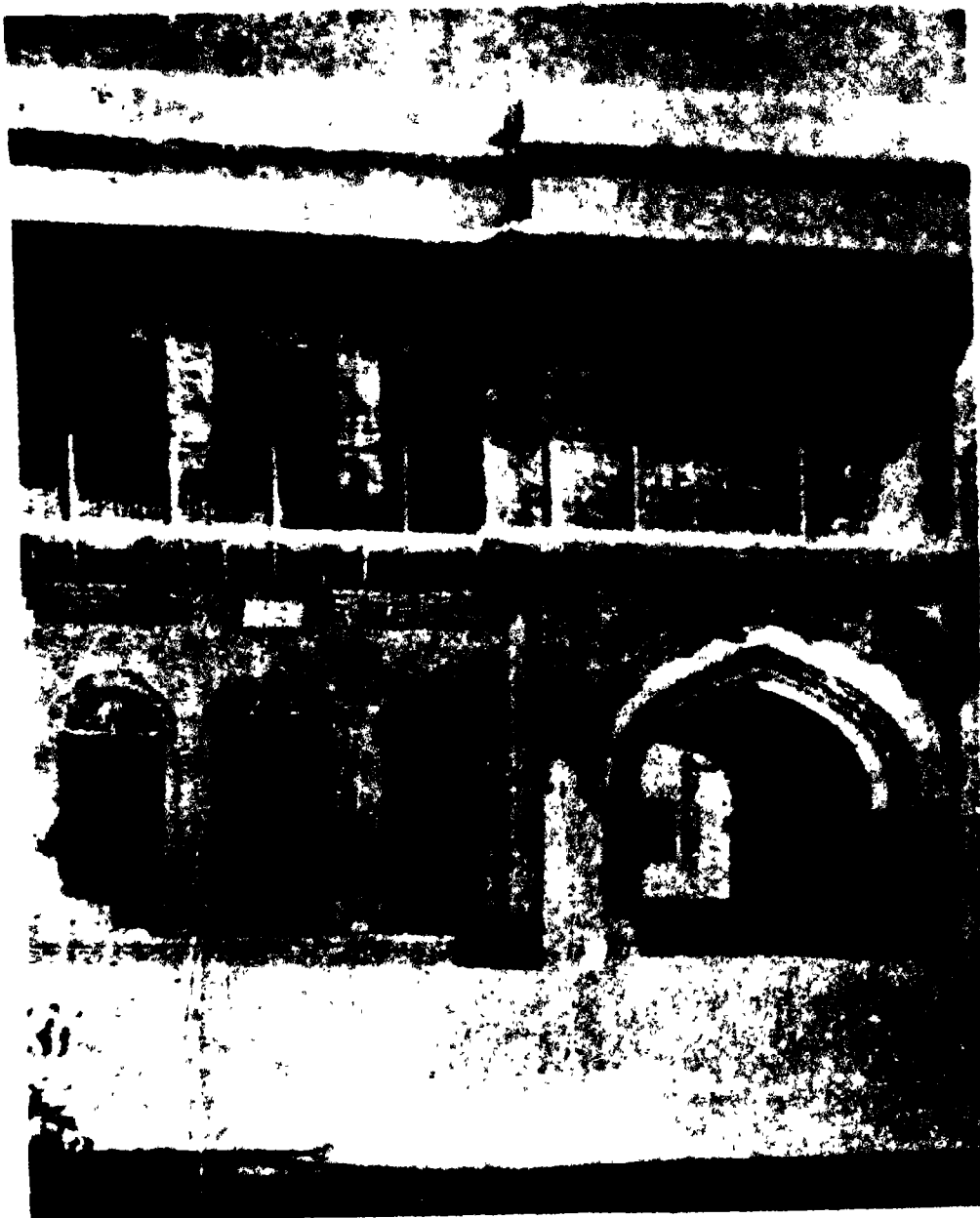
دارالکتب دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم کے عظیم الشان کتب خانہ کی طویل و عریض عمارت جس میں ایک عظیم ہال اور اس کے اردگرد چھ بڑے بڑے کمرے ہیں۔ تقریباً ایک لاکھ کتابوں کا ذخیرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ یہ عمارت ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب بن قاسم العلوم حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہٗ تعمیر ہوئی۔ ہر کمرے کا رقبہ یہ ہے (۱) ہال کا رقبہ ۴۹×۲۳ مربع فٹ (۲) ۲۰×۱۹ مربع فٹ (۳) ۲۵×۱۳ مربع فٹ (۴) ۲۴×۲۰ مربع فٹ (۵) ۳۷×۱۳ مربع فٹ (۶) ۲۲×۲۰ مربع فٹ۔ اس کے نیچے صنعتی درسگاہ ہے جس میں جلد سازی، چرم دوزی، خیاطی وغیرہ کا شعبہ فضلاء دیوبند کو سکھائی جاتی ہیں۔

دارالکتب

للمعهد مكتبة فخمة تحوى على مائة ألف كتاب تقريباً وتشغل بناية عالية فيها قاعة كبيرة تحوطها ست غرفات فسيحة من حولها. تم بناؤها تحت إشراف فضيلة المدير مولانا محمد أحمد بن قاسم العلوم حجة الاسلام مولانا محمد قاسم النانوتوىؒ سنة ١٣٢٤ھ الموافقة لسنة ١٩٠٦ الميلادية وتقع تحتها بناية دار الصناعة التى يتعلم فيها الخريجون وغيرهم تجليد الكتب والخياطة وغيرها فى الصورة. مساحة القاعة الرئيسية (١) ٤٩×٢٣ قدما. مساحة الغرفات (١) ٢٠×١٩ قدما (٢) ٢٥×١٣ قدما (٣) ٢٤×٢٠ قدما (٤) ٣٧×١٣ قدما (٥) ٢٢×٢٠ قدما.

Darul-Kutub

The spacious building of the grand library of Darul Uloom which consists of a great hall and five big rooms. The collection of books amounts to nearly one Lac. It was built in 1324 Hijri (1906 A. D.) during the "ehtemam" of Late Moulana Hafiz Mohammed Ahmad sb. Areas of various rooms

Hall :- **49ft x 23ft.** Ist room :- **20ft x 19ft.**
2nd room :- **25ft x 13ft.** 3rd room :- **24ft x 20ft**
4th room :- **37ft x 13ft.** 5th room :- **22ft x 20ft.**

(**The rooms below the library** are occupied by the Industrial Department)

'दारुल कुतुब दारुल उलूम देवबन्द'

दारुल उलूम के अजिमुश्शान कुतुब खाने की तवील व अरीज इमारत जिस में एक अजीम हाल और उसके इर्द गिर्द ६ बड़े बड़े कमरे हैं। तकरीबन एक लाख किताबों का जखीरा हर वक्त मौजूद रहता है। यह इमारत सन् १३२४ हि० मुताबिक सन् १९०६ ई० मे बजमाना अहतमाम हजरत मौलाना हाफिज मुहम्मद अहमद साहब पुत्र कासिमुल उलूम मौलाना नानौतवी तामीर हुई। हर कमरे का रकबा निम्न लिखित है : -

(१) हाल का रकबा ४९×२३ वर्ग फीट (२) २०×१९ वर्ग फीट (३) २५×१३ वर्ग फीट (४) २४×२० वर्ग फीट (५) ३७×१३ वर्ग फीट (६) २२×२० वर्ग फीट

इसके नीचे दारुल उलूम की सनअती दर्सगाह दारुस्सनाये है जिस मे जिल्द साजी, चिर्मदोजी, खय्याती आदि की सनअतें फुजलाये देवबन्द को सिखाई जाती हैं।

دارالکتب (اندرونی ہال)

دارالکتب (منظر من الداخل)

Darul Kutub (Inner view)

दारुल कुतुब (अन्दरूनी नजर)

دارالاضیاف

دارالعلوم دیوبند کا جدید شاندار مہمان خانہ جس میں بیک وقت تقریباً پچاس ساٹھ مہمانوں کے قیام وآسائش کا ہر وقت انتظام رہتا ہے۔ یہ مہمان خانہ ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۸ء میں بزمانۂ اہتمام حضرت مولٰنا محمد طیب صاحب مدظلہٗ تعمیر ہوا۔

رقبہ ۱۱۵ × ۸۰ مربع فٹ

دار الأضياف

مبنى جديد يخص للأضياف وهو بناء فخم مزود بكل ما يحتاج إليه الزوار والعلم يسع لخمسين ضيفاً في وقت واحد وتم بناؤها تحت إشراف المدير مولانا محمد طيب أطال الله بقاءه سنة ۱۳۷۷هـ الموافقة لسنة ۱۹۵۸ الميلادية ٠

مساحتها ۱۱۵ × ۸۰ قدما

Darul - Azyaf

The new magnificient guest house, furnished with all the requirements to accomodate fifty to sixty guests at a time, free of all charges. It was built in 1377 Hijri (1958-A.D.) during the ehtemam of Hazrat Moulana Mohammed Tayyab sb.

It covers an area of 115ft x 80ft.

"दारुल—अजयाफ़"

दारुल उलूम देवबन्द का जदीद शान्दार मेहमान खाना जिसमे एक ही वक्त मे लग भग पचास साठ मेहमानों के क्याम व आराम का हर वक्त प्रबन्ध रहता है। यह मेहमान खाना सन् १३७७ हि० मुताबिक सन् १९५८ ई० में बजमाना अहतमाम हजरत मौलाना मुहम्मद तैयब साहब मद्दजिल्लहू तामीर हुआ।

रकबा ११५×८० वर्ग फीट
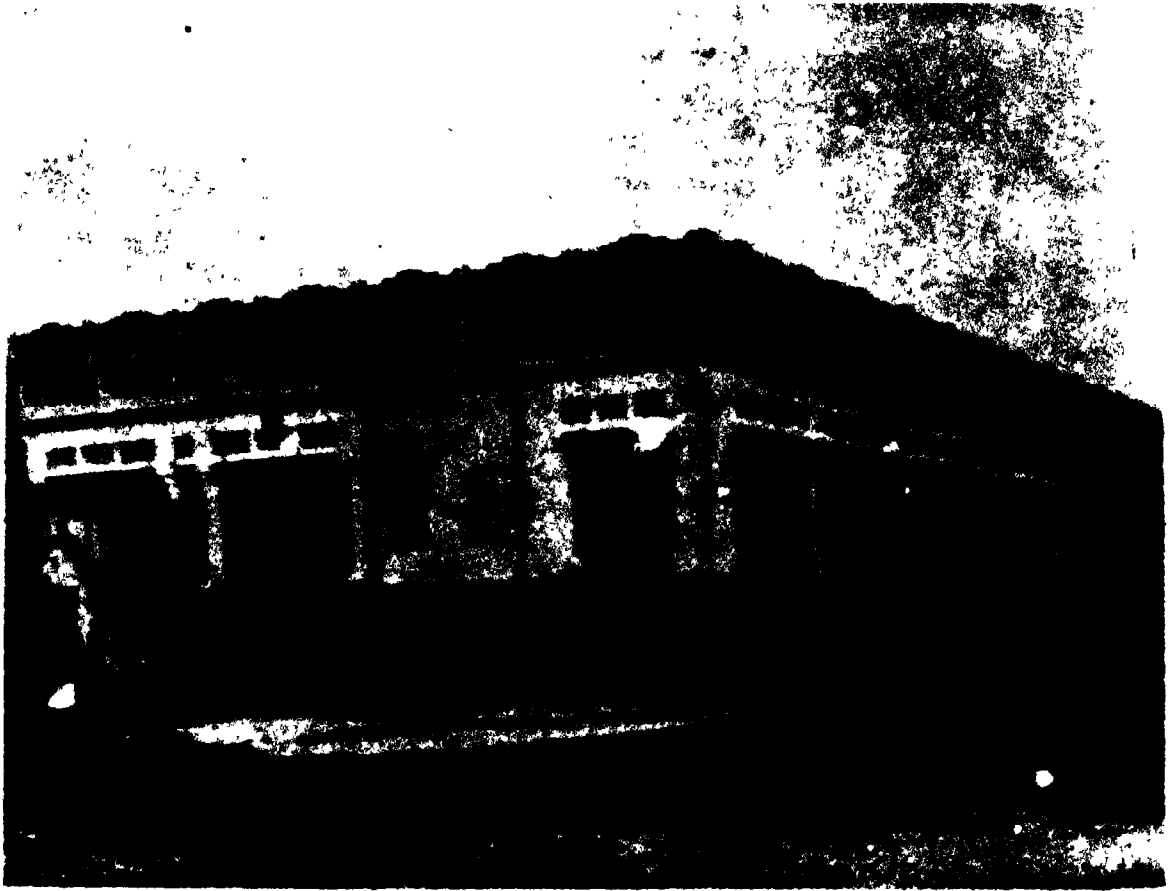
مسجد چھتہ

دارالعلوم دیوبند کا اولین نقطہ فیض جس کے صحن میں انار کے درخت کے نیچے ایک شاگرد (شیخ الہند حضرت مولینا محمود الحسن صاحب قدس سرہ) اور ایک استاد (ملا محمود قدس سرہ) سے دارالعلوم دیوبند کا افتتاح ہوا۔ یہ مسجد کئی صدی پہلے کی قدیم ترین تعمیر ہے۔

رقبہ ۸۴ × ۴۰ مربع فٹ

مسجد تشتہ

إحدى المبانى الأثرية القديمة بنيت منذ قرون، ولهذا المسجد فى تاريخ الدار أهمية خالدة فهو الينبوع الأول الذى تفجرت منه عيون المعرفة والحكمة إذ جلس فيه تحت شجرة رمان مولانا محمود حسن (شيخ الهند) أول تلميذ أمام مولانا ملا محمود أول أستاذ لدار العلوم، وتلقى أول درس فى هذا المعهد الذى قدر له أن يصبح فيما بعد ما هو عليه اليوم

المساحة ٤٠ × ٨٤ قدما

Chhatta Masjid

The starting point of Darul Uloom's spiritual progress, the "Chatta mosque". In its courtyard Darul Uloom was started under a pomegranate tree with a teacher (Late Mulla Mahmood) and a student (Late Hazrat Moulana Mahmood Ul Hasan.) It is an ancient mosque centuries old.

Area :- 84ft x 40ft.

'मसजिद छत्ता'

दारुल उलूम देवबन्द का अव्वलीन नुकतये फैज़, जिसके सहन में अनार के दरख्त के नीचे एक शागिर्द (शैखुलहिन्द हज़रत मौलाना महमूद हसन साहब) और एक उसताद मुल्ला महमूद कुद्दसा सिर्रहू से दारुल उलूम देवबन्द का इफ़्तताह हुआ। यह मसजिद कई सदी पहले की क़दीम तरीन तामीर है

रक़बा ८४ × ४० मुरब्बा फ़ीट

دارالعلوم دیوبند کی وسیع عمارت کا مجموعی اور عمومی منظر

جس میں دارالعلوم کی تمام عمارات کے ساتھ دارالتفسیر کا شاندار گنبد نمایاں نظر آرہا ہے ۔
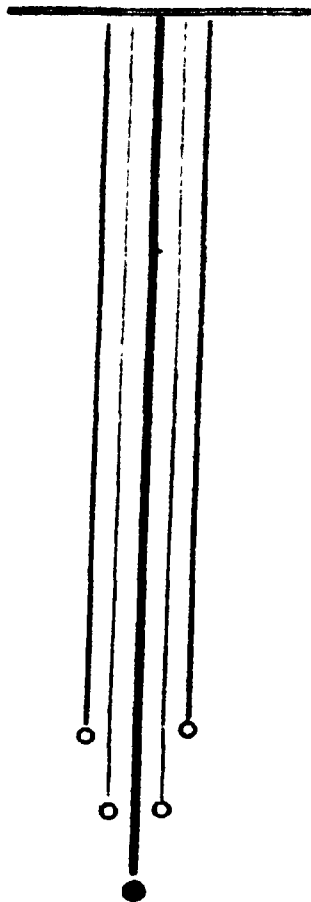
المنظر العام لدار العلوم مبانيها الشامخة

و يرى فيه قبة دار التفسير العالية الشامخة مع مباني دار العلوم الأخرى .

General view of the buildings of Darul Uloom Deoband

All the buildings of Darul Uloom together with the splendid dome of Darul-Tafseer are visible.

दारुल उलूम देवबन्द की वसी इमारत का मजमूई और अमूमी मंजर

जिस में दारुल उलूम की तमाम इमारात के साथ दारुत्तफसीर का शानदार गुम्बद नुमायां नज़र आरहा है।

PHOTOS

of

THE BUILDINGS OF DARULULOOM DEOBAND

एम हसन (वाइस चांसलर ढाका यूनिवर्सिटी)

"यह दारुलउलूम देवबन्द सही मानों में यूनिवर्सिटी है। मुझे हिन्दुस्तान और यूरोप की बहुत सी यूनिवर्सिटियों के बारे में जाती तजरबा है मैं कह सकता हूं कि जदीद तर्ज की बहुत सी यूनिवर्सिटियां इस कदीम तरज की यूनिवर्सिटी से बहुत कुछ सीख सकती हैं"।

श्री अनवारुस्स सादात (वजीर हुकूमत मिस्र व जनरल सेक्रेटरी मोतमर इस्लामी)

इस अजीम तारीखी यूनिवर्सिटी की जियारत ने मुझे मजबूर किया कि मैं हुकूमत मिस्र से अपने उन भाईयों को मुबारकबाद पेश करूं जो इस के निजाम को चला रहे हैं। मैं अल्लाह ताला से दुआ करता हूं कि यह से इस्लाम और मुसलमानों को हमेशा नफा पहुंचे और यह इल्म व मारफत का एक मीनार साबित हो।

रईस रूसी वफ्द (बराये हिन्दुस्तान)

मैं ने यूनिवर्सिटी (दारुलउलूम देवबन्द) को दिलचस्पी से देखा। बर्रे-सगीर के इस हिस्से में यह मजहब इस्लाम का एक मरकज है। मैं अपने मेजबानों को दरया दिली का शुक्रिया अदा करता हूं और दुआ करता हूं कि अमन और दोस्ती का जज्बा जो मजहब इस्लाम की रीढ़ की हड्डी है हिन्दुस्तानी जनता और सोवियत यूनियन की जनता के दरमियान हमेशा तरक्की पजीर रहे"।

अमरीकी वफ्द बराये हिन्दुस्तान

"हमारी अमरीकी जमात को एक दिन यहां (दारुलउलूम देवबन्द) में क्याम करने का मौका नसीब हुआ। इसके प्रसिद्ध ओलमा और उनके शागिर्दो से मुलाकातें कीं। दर हकीकत इस्लाम ही का जज्बा यह को नूर बख्शता है और यह नूर यहां (दारुलउलूम देवबन्द में) चमकता है"।

(मुख्तार हसन, उमर हसन अहमद, बशीर रशीद, सईद अहमद, बशीर हुसैन, मुहम्मद अहमद, अमेरीका)

जनाब अली असगर हिकमत (सफीर ईरान बराये हिन्दुस्तान)

अल्लाह तआला का शुक्र है कि उसने इस अब्द जईफ को इस अजीमुश्शान दारुलउलूम देवबन्द की जियारत से नवाजा और यहां के असातेजाकराम और ओलमा कराम की मलाकात की तौफीक अता फरमाई। उनके कमालात तैयबात से इस अब्द जईफ के दिल व जान बहरावर हुए। इनके बाकी रहने वाले आसार व तालीफ से मैं महसूस हुआ जो कि बकौल "मदादुल ओलमा अफजल मन माउश्शोहदा" (ओलमा की रोशनाई शोहदा के खून से अफजल है) अपने दामन में रूहानी बरकात और आसमानी फयोजात लिए हुये है।

एस० ई० मुल्लां (दक्षिणी अफ्रीका)

"दारुलउलूम के तमाम शोबों का बगौर मुलाहज़ा करते हुये मैं इस नतीजे पर पहुंचा हूं कि मैं ने अपनी सयाहत और सफ़र में किसी जगह ऐसी अज़ीमुश्शान मज़हबी दर्सगाह नहीं देखी जो अपनी नौईयत में एक मर्कज़ी दर्सगाह कहलाने के काबिल हो। मौजूदा तारीख इसकी नज़ीर नहीं पेश कर सकती"।

डी० जूलियस जरमीनस (प्रोफ़ेसर बूडा पेस्ट यूनिवर्सिटी हंगरी)

मैं ने खुद अपने मुल्क में देवबन्द के मदरसे के बारे में सुना। मुझे हमेशा से शौक था कि उलूम और इस्लामी कल्चर (रूह) के इस किले को देखूं। तुरकी और मिस्र के कदीम मदरसों के बाद जो मस्जिदों में कायम किये जाते हैं मुझे अर्बी और तालीमाते इस्लामी की इस गहराई और ज़ोरो जहद को देखकर और भी ज़्यादा हैरत हुई जो इस मदरसे के दर व दीवार से ज़ाहिर व बाहर है।

जनाब इब्राहीम अलजिबाली (रईस वफ्द जामेआ अज़हर मिस्र)

"हमें जामेआ दारुलउलूम देवबन्द की ज़ियारत नसीब हुई। हम ने भिन्न २ दरजात में फिर कर दर्स व तदरीस का मुआइना किया और इस मदरसे के मुदीर जनाब शेख़ अतीक़ुर्रहमान अहमद उसमानी और हज़रात असातेज़ा केराम से मुलाकात की। हम ने ऐसा मंज़र देखा जिसने हमारे दिलों को मुसर्रत से भर दिया। और उनके चेहरों पर इल्म का नूर देखा। हम ने एक ऐसी जमात देखी जिसने उलूमे दीन यानी तफ़सीरे कुरान, हदीस, फ़िक़ा और उसूले फ़िक़ की ख़िदमत के लिए अपनी ज़िन्दगी वक़्फ़ कर रखी है। इसके अलावा दूसरे उलूम भी पढ़ाये जाते हैं मसलन अर्बी, अदब मन्तिक फ़लसफ़ा और रियाज़ियात आदि। हम दुआ करते हैं कि इन उलूम से उम्मत इस्लामिया को यह हज़रात नफ़ा पहुंचायें"।

प्रोफ़ैसर ग्रेविन्ट (आक्सफोर्ड यूनिवर्सिटी - लन्दन)

यह मेरी बहुत बड़ी खुशकिसमती है कि मुझे देवबन्द देखने का इत्तिफाक हुआ। मैं ने देखा कि कदीम इस्लामी कलचर अब भी यहां पूरी आबो ताब से दरख़्शां है। एक मुवर्रिख़ के लिए इस से ज़्यादा रोशन मौके का मैं तसव्वुर भी नहीं कर सकता"।

उसमान कीदू (नुमाइन्दा चीनी इस्लामी नेशनल साल्वेशन फेडरेशन)

मेरे लिए यह बाइसे सआदत है कि मुझे दारुलउलूम देवबन्द को देखने का मौका नसीब हुआ। मैं समझता हूं कि यह एक ख़ालिस मज़हबी इदारा है जिसे मज़हरे मशरिक का ख़िताब दिया जा सकता है"।

आला हज़रत शाह अफ़ग़ानिस्तान

मै बहुत मसरूर हूं कि आज मुझे दारूलउलूम को देखने का मौका हासिल हुआ। यह दारूलउलूम अफ़ग़ानिस्तान मे और खास तौर पर वहां के मज़हबी हलको मे बहुत मशहूर व मारूफ है। अफ़ग़ानिस्तान के ओलमा दारूलउलूम देवबन्द के बानियो और वहां के असातज़ा को हमेशा इज़्ज़त की निगाह से देखते आये है और इल्म व रूहानियत के बकीन मे जो फ़ज़ीलत और बरतरी उनको हासिल है उसके हमेशा कायल व मद्दाह रहे हैं। बहुत से अफ़ग़ान ओलमा इस दारूलउलूम से फ़ैज़याब हुए और उन्हों ने अपने वतन अज़ीज़ वापस जाकर वहां इल्म की रोशनी फैलाई और मुल्क की खिदमात अंजाम दी।

मिस्टर अब्दुल लतीफ़ (वज़ीर अवक़ाफ़ व देहात बर्मा)

'यह एसा इदारा है जिसने न सिर्फ़ हम मज़हबों ही के लिए नहीं बल्कि पूरे मुल्क के लिये लायक इनसान पैदा किये

मु० अब्दुल फ़त्ताह ओदा (मिस्र)

मै ने देवबन्द मे इस्लाम और सुन्नत व ईमान का एक किला देखा और महसूस किया कि दीन किस तरह दुनिया और आख़िरत की भलाइयो का ज़ामिन होता है और किस तरह सल्फ़ सालेह की तफ़सीर, जिसकी हिफ़ाज़त यहां के बुज़ुर्गान दीन कर रहे है और जिस से यहां के तलबा फ़ैज़याब हो रहे हैं एक बेश बहा मीरास शुमार की जा सकती है। हमारे लिये ज़रूरी है कि हम इस तरीके को मज़बूती से पकड़ें और भविष्य की इमारतों के लिए इसे बुनियाद बनायें"

रशीद अहमद इसमाईल टिक्रोसिया (जोहांसबर्ग जुनूबी अफ़्रीका)

अंग्रेज़ी ज़बान बोलने वाली दुनिया मे इसको (दारूलउलूम देवबन्द को) एटिन और कैम्ब्रिज का दरजा दिया जाता है। लेकिन मै कहता हूं कि यह दरजा इस की शान के लिए कमतर है। दारूलउलूम का मरतबा दूसरे इदारों से कहीं ज़्यादा बुलन्द है। सच्चा यह है कि इस का कोई हमसर नहीं।

नियाज़ बरकीज़ (टरकी)

लाइब्रेरी और उसके बेशकीमत क़लमी कुतुब के ज़खीरे ने मुझे खास तौर पर मुतास्सिर किया। मैं ने यहां इतना मसरूर पाया कि अपनी ममनूनियत के इज़हार के लिये पूरी तरह अलफ़ाज़ नहीं पाता। मैं उस काम पर जो यहां का अमला और मदर्रसीन अंजाम दे रहे हैं मुबारकबाद पेश करता हूँ"।

दारुल उलूम देवबन्द

मशाहीर आलम की नज़र में

अल्लामा सैयद रशीद रज़ा (मिस्र)

" अगर मैं इस मदरसे को न देखता तो हिन्दुस्तान से बहुत ग़मगीन वापस जाता (तक़रीर)
मैं ने मदरसा देवबन्द में जिस को अज़हरे हिन्द का ख़िताब दिया जाता है एक अजीब इसकी इस्लाह तरक़्क़ी करते देखा। हिन्दुस्तान भर में मेरी आँखों को ऐसी ठंडक कहीं हासिल नहीं हुई जैसी कि मदरसा देवबन्द में हासिल हुई और न इतनी ख़ुशी कहीं हासिल हुई जितनी यहाँ। इसकी वजह सिर्फ़ वह दीन व इस्लाम है जो मैं ने इस मदरसे के उलमा में देखा"।
(रिसाला मिनार मिस्र)

मौलाना अबुल कलाम आज़ाद (वज़ीर तालीम हुकूमते हिन्द)

आपकी यह दर्सगाह दर असल एक ऐसा कारख़ाना है जो मुसलमानों की रूहों को ढालता है यह कारख़ाना कायम है तो हमें परेशान न होना चाहिये। इस दर्सगाह के अस्लाफ़ ने अमल का जो नमूना पेश किया था और जिन मक़ासिद को लेकर यह दर्सगाह कायम की थी अगर वह रोशनी आपकी रहनुमाई कर रही है तो मैं आपको यक़ीन दिलाऊँगा कि शानदार मुस्तक़बिल इसके लिए तैयार है (तक़रीर)
"हिन्दुस्तान में इस्लामी तालीमगाह के इस अज़ीम तरीन इदारे में न सिर्फ़ यह कि इस मुल्क के तमाम हिस्सों से बल्कि बईद तरीन इलाक़ों मसलन इण्डोनेशिया, मलाया, अफ़ग़ानिस्तान, वस्त-एशिया और चीन से तलबा खिंचे चले आते हैं। इतने वसी रक़्बे के तलबा और ओलमा में इस की मक़बूलियत, इसकी अज़मत व शोहरत की दलील है। इस बिना पर यह इदारा सही मानों में तालीमाते इस्लामी की एक बैनुलअक़वामी यूनिवर्सिटी है"। (मुआइना)

डाक्टर राजेन्द्र प्रसाद (सदर जमहूरिया हिन्द)

"आपके दारुलउलूम ने केवल इस मुल्क के बसने वालों की ही ख़िदमत नहीं की बल्कि आप ने अपनी ख़िदमात से इतनी प्रसिद्धता प्राप्त करली है कि गैर मुमालिक के तलबा भी आपके यहाँ आते हैं और यहाँ से तालीम पाकर जो कुछ उन्होंने यहाँ सीखा है अपने मुल्कों में उसकी इशाअत करते हैं। यह बात हम देश के सब ही निवासियों के लिये क़ाबिले फ़ख़्र है।

दारुल उलूम देवबन्द के बुज़ुर्ग इल्म को इल्म के लिए पढ़ते, और पढ़ाते रहे हैं। ऐसे लोग पहले भी हुए हैं, मगर कम। उन लोगों की इज़्ज़त बादशाहों से भी ज़्यादा होती थी। आज दारुलउलूम के बुज़ुर्ग उसी तर्ज़ पर चल रहे हैं और मैं समझता हूँ कि यह सिर्फ़ दारुलउलूम या मुसलमानों की ही ख़िदमत नहीं बल्कि पूरे मुल्क और दुनिया की ख़िदमत है। आज दुनिया में माद्दियत के फ़रोग़ से बेचैनी फैली हुई है। और दिलों का इतमिनान और चैन मफ़क़ूद है। इसका सही इलाज रूहानियत है। मैं देखता हूँ कि सुकून व इतमिनान का वह सामान यहां के बुज़ुर्ग दुनिया के लिये मुहैया करा रहे हैं। अगर ख़ुदा को इस दुनिया को रखना मन्ज़ूर है तो दुनिया को बिल आख़िर इसी लाईन पर आना है। मैं दारुलउलूम में आकर बहुत मसरूर हुआ। और यहाँ से कुछ लेकर जा रहा हूँ"

M. Hasan. Vice Chancellor Dacca University.

It is a University in the real sense of the term. I have personal experience of many Universities in India and Europe and I can say that many Universities of the "Modern Type" may well learn many things from this Muslim "University" of the old type

Anwarussadat - Minister Govt. of Egypt And General Secretary Of The Islamic Congress. Egypt.

On the occasion of my visit to this grand historical University I am compelled to offer my heartiest congratulations to my brethren who are running it. I pray to God to benefit Islam and the Muslims by it for ever, and that it may prove a light-house of learnings and spirituality

Leader Of The Russian Delegation.

I have examined the University with interest. It seems to be a centre of Muslim religion in this part of the continent I thank the hosts for their hospitality and hope that the spiritual peace and hospitality which is the back bone of Muslim religion will always prevail between the people of India and the people of the Soviet Union.

Leader of the American Delegation

We, the Jamat from America had the opportunity to spend a day here, met the leading Ulmas and their students. The spirit of Islam is indeed the light for soul. This light presents its rays here. (Mukhtar Omar, Hasan Ahmad, Amir Rasheed, Syeed Ahmed, Amir Husain, Mahmood Ahmad.)

Ali Asghar Hekmat. Ambassador of Iran

I thank God that He bestowed upon this humble servant the blessings of a visit to this grand institution Darul Uloom, Deoband and gave me a chance to sit in company with the revered professors and Ulamas. The heart and soul of this humble servant were enlightened with their pious words. I was extremely glad to see the ever lasting work and publications which bear the heavenly blessings and the celestial honour according to the saying "The ink of Ulamas is superior to the blood of martyrs"

unable to express my gratitude adequately. I offer my congratulations for the fine work carried by the staff and teachers and wish them all the best for the coming years.

S. E. Mullan (Durban - South Africa.)

After visiting all the departments of Darul Uloom, Deoband. I am of opinion that I have not seen such a splendid and grand religious institution, during my journey abroad, which may be titled as a central religious institution. Modern history cannot present its rival.

D. Julius Jermanus, Professor Budapest University Hungry.

I heard of Madrassa of Deoband already in my native country and have always been eager to visit this fortress of learning and of true Islamic spirit. After the old mosque schools of Turkey and Egypt I still was surprised by the depth of Arabic and Islamic learning and the vigour which reign supreme among the walls of the Madrassa.

Ebrahim Al-Jibali, Leader of The Delegation of Alazhar University, Cairo (Egypt)

We had the opportunity of visiting Jamia Darul Uloom, Deoband. We were shown round the lecture rooms of different departments and had a discourse with its secretary the revered Moulana Shabbir Ahmad Usmani and the revered professors. We perceived that which filled our hearts with joy, and witnessed the light of learning glaring on their faces. In other words we met those who have devoted their lives for the service of Islamic Learnings such as Tafsir of Holy Quran , Hadis, Fiqah and Usule Fiqah and included with it other subjects also, such as Arabic literature, Logic, Phillosophy and Astrology. We hope that it will prove to be a means of success for the Muslim community.

Grey Wint Oxford.

It has been my very good fortune to visit Deoband and to find here the ancient Islamic Culture still flourishing vigorously. For a historian I can imagine few more illuminating experiences.

Usman Kedov, Representative of Chinese Islamic National Salvation, Federation.

It is a priviledge to me for having an opportunity to pay a visit to Darul Uloom, Deoband. I find it is a pure religious institution which may be titled as the Al-Azhar in the East.

ever increasing materialism. Peace and tranquility have disappeared. The proper remedy for this disease is spritnality I see that the authorities of Darul Uloom, Deoband are engaged in supplying this means towards peace and tranquility to the whole world. If God really wants this world to last longer, the world is compelled to follow this line. I was extremely glad to visit Darul Uloom, and I have gained something from here.

His Majesty The King Of Afghanistan

I am extremely pleased to have a chance to visit Darul Uloom, Deoband to day. This Darul Uloom is very well known in Afghanistan, specially in relegious quarters. The Ulamas of Afghanistan have ever been paying tributes of honour to the founders of Darul Uloom, Deobond and its professors, and have ever been admitting and appreciating their high position in the faith of learnings and sprituality. A number of Afghan Ulamas graduated from this Darul Uloom and after going back to their motherland they spread the light of learnings and served their own country.

Abdul Lateef, Minister of Law And Health Burma

It is an institution which has produced worthy hands of not only the community but the country.

Mohammed Abul Fattah Auda, Egypt

In Deoband I found a fortress of Islam and a strong hold of Sunnat and man and came to know how Al-deen (Religion) adorns the worldly life and here after, and how the following of the righteons proves to be a precious heritage. which the renowned Ulamas have been preserving so long, and the shining students have been clinging to. It is exceedingly necessary that we should stand fast and build our future constructions on these very pillars

Rashid Ahmad Ismail Takolia, Johannesburg, South Africa.

In the English speaking world it (Darul Uloom, Deoband) is ranked as the equal to Eton and Cambridge. May I state that it is an understatement. Deoband towers greatly above any other institutions. Truly it has no equal.

Niyaz Berkez Turkey

I have been particularly impressed by the library and the valuable manuscripts it contained. I have seen so much cordiality and friendliness that I am

DARUL ULOOM, DEOBAND
AS
World famous personalities saw it

Syed Rashid Raza. Editor Almanar. Cairo. Egypt.

If I had not visited it (Darul Uloom, Deoband) I would have returned fro India, sadly disgusted (Speach). Throughout India my eyes were not so much refreshe anywhere as in madrassa Deoband, nor did anything fill me with as much joy as th (Institution). It is merely due to the sincerity and devotedness which I witnesse in the Ulamas of this institution. I witnessed in madrassa Deobanbd, which known as "Alazhar" of India, the dawn of a new religious and educational era (Almana

(Late) Moulana Abul Kalam Azad, Minister of Education Govt of India.

This premier institution of Islamic studies in India attracts students not onl from all parts of the country but also from distant regions like Indonesia, Malaya Afghanistan, Central Asia, and China. Its popularity with students and schelors o such a wide area is proof of its eminence. It is thus in the true sense an Internation University of Islamic studies This institution of yours is really a workshop whic moulds the souls of muslims. We should not bother about our future if this worksho is in order. If the practical example, set by the elders of this institution and the aim and objects for which this institution was started, are still guiding you, I will assur you that brilliant future is ready to embrace it.

Dr. Rajandara Prashad, President of India.

Your Darul Uloom has served not only the inhabitants of this country bu has already gained such a reputation that students from far off countries come to join it. After completing their education here they go back to their native lands and preach whatever they have learnt. It is a thing which all the inhabitants of this country should be proud. of.

The elders of Darul Uloom have been learning and imparting education for the sake of education only. Such personalities, although very rare, were present in bygone days. They were honoured even more than the kings. Today the authorities of Darul Uloom are treading the same path. I think this is not the service to Darul Uloom and Muslims only, but the service to the whole country; in fact to the whole world. Today discontentment and un-easiness prevail all over the world due to the

In this "**Reflection of Darul Uloom**" thirty photographs of important buildings of Darul Uloom have been included. **A brief history of the buildings prepared by the** office of **Jalsa-e-Dastar-bandi** has been given on **the opposite page. So this album will** present before you the picture of Darul Uloom and the brief history will give you a conception of the works performed by this institution so far.

Mohammad Tayyab,

Mudeer, Darul Uloom, Deoband- (U. P.

Jauhar -e- Aina

Dar Pase Aina Tuti Sifatam Dashtaand Unche Ustade Azal guft Human me goyam

(They have seated me behind the mirror, I repeat whatever the master of eternity has taught)

Darul-Uloom, Deoband does not need any introduction due to its world-wide fame and the services rendered by it. But the very uncommon fame and dignity creates a desire to visit this institution. To fulfil this desire people come to Deoband from far off countries which gives them much satisfaction

Those interested in education go round the lecture rooms: those interested in management visit the offices and the mode of the office work: those interested in the huge stocks of rare manuscripts and printed books go towards the grand library: those interested in the accounts visit the offices of the accounts, the endowments and the kitchen; and those interested in the general management visit the hub of the management "Daftar Ehtemam"

In brief every visitor satisfies himself by visiting different departments according to his own taste. But out of the millions of people there are a few only who can afford to manage for such a long journey to visit Darul Uloom. The majority does not find an occasion to fulfil their long-cherished desire of visiting it. To fulfil this desire of such persons Darul Uloom decided to spend a large sum and arranged for the photographs of some of its prominent and splendid buildings such as spacious and grand lecture rooms and offices of different departments. We had it printed in the shape of an album, which is before you as a "**Reflection of Darul Uloom, Deoband.**" It serves the purpose of a mirror in which the virtual images of the buildings of Darul Uloom are reflected.

The well wishers of Darul Uloom can there-by satisfy there keen desire of having a glimpse of this institution at there respective homes. Just as these virtual images are sure to incite the desire of visiting the real buildings, in the same way they are sure to satisfy that desire to some extent. Though it will be difficult to travel to such a long distance for paying a visit to Darul Uloom, it can be much easier to co-operate with its ever increasing improvements by helping it financially. This is more important than a visit.

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

بآں گروہ کہ از ساغر وفا مستند
سلام ما برسانید ہر کجا ہستند

جس قوم کا تہذیبی ورثہ لٹ جائے اور حال ماضی سے کٹ جائے وہ قوم گو نام سے باقی رہے۔ مگر حقیقت میں اس کی نبضیں ساکت ہو جاتی ہیں۔ وہ کسی دوسری قوم کے قالب میں جذب ہو کر ہو تو یہ زندگی کی علامت نہیں اپنی اصل کے لحاظ سے موت کی آغوش میں ہے۔

اسلام اگر ایک زندہ مذہب ہے۔ تو تاریخ اسلام کے ہر دور میں اس کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ زندگی تسلسل کے بغیر زندگی نہیں اور اس کے تمام دور آپس میں زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط و منظم ہونے چاہئیں۔ اسلام تاریخ کے مختلف ادوار میں خواہ کسی پیمانے میں رہا اور ناسازگار حالات میں سے اسے کیسے ہی کیوں نہ گزرنا پڑا، اسلام کی شاہراہ حیات ہر دور میں موجود رہی اور اس پر کوئی زمانہ ایسا نہیں آیا کہ اس کی اساسی حیثیت کلیتہً مٹ چکی ہو اور آئندہ پھر نئے سرے سے طلوع اسلام ہوا ہو۔

دین کی غایت اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی رضا جوئی اور اس کے احکام کی تعمیل ہے۔ وہی ذات واجب الوجود اس شاہراہ تسلسل کی آخری منزل ہے۔ سب پیغمبر اسی ایک کی طرف دعوت دیتے رہے اور اسی کی تلاش ہر دینی کاوش کا منتہیٰ رہی۔ جس نے اسے پایا، اس نے سب کچھ پایا۔ اس کی طرف لوٹنا نجات، اور اس سے ٹوٹنا انقطاع و اضطراب کی آگ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے من انصاری الی اللہ کہہ کر بتلایا کہ میں خدا کی طرف بلانے والا ہوں تو حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی منزل کی نشاندہی فرمائی اور اللہ کی طرف بلانا اپنا راستہ بتلایا۔ قل هذه سبيلي ادعوا الى الله على بصيرة انا ومن اتبعني

یہ شاہراہ تسلسل اسی ذات واجب سے چلتی اور اسی کی طرف لوٹتی ہے۔ تمام پیغمبرانہ دعوت کا اجتماعی نقطہ وہی ایک ذات ہے۔ جہاں تمام دینی تحقیقیں منتہی اور سب مذہبی کاوشیں ختم ہو جاتی ہیں۔ وہی منزل حقیقی ہے، جو اسے پالے، پھر اس کا انتقال بھی وصال ہو جاتا ہے۔

اور ہر اس بات سے بچنا چاہیے جو اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی ضد ہو۔ حضرت عمرؓ نے اپنی اس
نسبت میں پیروی کرنیوالوں کے پیروی کرنے پر کوئی تنقید نہیں کی، بلکہ پیروی ان کی راہ جانی۔ انہیں وہ اپنے قبل طریقہ کے
التزام کی تاکید کی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ کو آسمانی ہدایت کے سرچشمے سمجھتے تھے کہ جو ان میں
سے کسی کی پیروی کرے۔ ہدایت پا جائے۔ وہ لوگوں کو اسی شاہراہ پر رکھنا اور اسی پر چلانا چاہتے تھے، جو اپنے ماقبل اور ماقبل
سے مسلسل ہو۔ منزل کی رہنمائی کا ہر جزو اپنے ماقبل اور مابعد سے تو متصل ہو، لیکن دائیں بائیں کسی طرف سے مربوط نہ ہو۔

حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ (۹۳ھ) کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ (۲۳ھ) جب منیٰ سے واپس لوٹے، تو وادی
بطحا میں ٹھہرے، زمین پر چادر بچھائی، اس پر بیٹھے اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا: اللهم كبرت
سني وضعفت قوتي وانتشرت رعيتي فاقبضني اليك غير مضيع ولا مفرط (اے اللہ
میں بوڑھا ہو چکا ہوں، قوتیں کمزور ہو گئیں اور میری رعیت بہت دور تک پھیل چکی ہے۔ اب تو مجھے اپنے حضور بلا لے کہ میں
بغیر کسی زیادتی اور کمی کے تیرے ہاں حاضر ہو جاؤں۔ پھر آپ مدینہ تشریف لائے اور خطبہ ارشاد فرمایا اور ایک ہاتھ دوسرے
پر مارتے ہوئے کہا: ايها الناس قد سننت لكم السنن وفرضت لكم الفرائض وتركتم
على الواضحة الا ان تضلوا بالناس يمينا وشمالا ـ وضرب باحدى يديه على الاخرى
(موطا امام مالک ص ۳۲۹ کتاب الحدود) (اے لوگو! تمہارے راستے متعین ہو چکے ہیں اور فرائض مقرر ہو چکے
ہیں، تم ایک شاہراہ پر چھوڑے گئے ہو۔ دیکھنا دائیں بائیں طرف دیکھ کر دوسری قوموں کے متوازی نظریات سے اثرات لے کر
گمراہ نہ ہو جانا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے آقا حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے پیشرو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
سے جو شاہراہ پائی تھی، جس پر آپ خود بھی چلتے رہے اور دوسروں کو بھی چلاتے رہے۔ اب آپ اسی شاہراہ پر سلامتی کی
راہ بتلا رہے ہیں اور متنبہ فرما رہے ہیں کہ دوسری تحریکات سے متاثر ہو کر اپنی شاہراہ کو چھوڑ دینا یا اس میں ترمیم کرنا گمراہی کی
راہ ہے۔ سلامتی انہی کی ہے، جو اسی شاہراہ پر مسلسل چلتے چلیں اور زندگی کے ہر شعبے میں سنت کی اتباع کا رنگ بھریں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (۳۲ھ) نے شاہراہ اسلام کے پہلے قافلہ سے متصل رہنے کی یوں تلقین فرمائی:

من كان مستنا فليستن بمن قد مات فان الحي لا تؤمن عليه الفتنة اولئك
اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم كانوا افضل هذه الامة ابرها قلوبا واعمقها
علما واقلها تكلفا اختارهم الله لصحبة نبيه ولاقامة دينه فاعرفوا لهم فضلهم
واتبعوهم على اثرهم وتمسكوا بما استطعتم من اخلاقهم وسيرهم فانهم كانوا
على الهدى المستقيم۔ (مشکوٰۃ شریف)

(ترجمہ) جس کو کسی راہ پر چلنا ہو اسے چاہیے کہ ان لوگوں کی راہ پر چلے جو اس دنیا سے جا چکے، کیونکہ زندوں پر

مسلمانوں میں امام ابوحنیفہؒ سے گہری دینی عقیدت پیدا کر دی تھی۔

ائمہ اربعہ میں دوسرے امام جنہیں ان الحادی فتنوں سے واسطہ پڑا، حضرت امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) تھے۔ آپ فقہ میں زیادہ تر اہلِ حجاز کے ہم نوا تھے۔ مگر آپ نے جب مسئلہ خلقِ قرآن میں معتزلہ کے فتنوں کو قریب سے دیکھا، تو آپ بھی مذہب سے تمسک کرنے میں امام ابوحنیفہؒ کے ہمنوا ہوگئے۔

حافظ ابن عبدالبر (۴۶۳ھ) لکھتے ہیں: جعل الصحابۃ فی ذالک مالم یجعل لغیرہم وا ظنہ مال الی ظاہر حدیث اصحابی کالنجوم واللہ اعلم والیٰ نحو ھذا کان احمد بن حنبل یذھب (جامع بیان العلم جلد ۲ صفحہ) ترجمہ: امام ابوحنیفہؒ نے اتباعِ حق میں صحابہ کا وہ درجہ ٹھیرایا ہے۔ جو صحابہؓ کے علاوہ اور کسی طبقہ کے لیے نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ حدیث اصحابی کالنجوم کے ظاہر پر چلتے تھے اور یہی مذہب امام احمد بن حنبلؒ کا تھا۔ محمد بن عبدالرحمٰن الصیرفیؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ سے پوچھا کہ جب صحابہ کرام کسی مسئلہ میں مختلف ہوں تو اس میں غور و فکر کرنا کہ حق پر کون ہے تاکہ اس کی پیروی کی جائے، کیا جائز ہے؟ امام احمدؒ نے فرمایا: "نہیں"

یجوز النظر بین اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (جلد ۲، صفحہ ۱۰۲) میں نے پوچھا: اس کی کیا وجہ؟ تو آپ نے فرمایا: تقلد ایھم احببت تاکہ ان میں سے جس کی چاہو پیروی کرسکو۔

حنبلی مسلک کے مقتدر امام حدیث ابوداؤد سجستانی (۲۷۵ھ) لکھتے ہیں کہ اگر کسی مسئلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مختلف روایتیں نقل ہوں تو صحابہ کرام کا عمل فیصلہ کرے گا کہ ان روایات میں سنت کیا ہے: نظر الی ما عمل بہ اصحابہ۔ سنن ابی داؤد ج ۱ باب المرور بین یدی المصلی۔

یہ اسلام کی علمی میراث اور اس کا تنقیدی ورثہ ہے، جو حضورؐ سے صحابہؓ کو اور صحابہؓ سے تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ کو پہنچا۔ اسلام کی شاہراہ یہ مسلسل تھی خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم کی بشارت نبوی میں صحابہ، تابعین سے مسلسل چلی آرہی تھی، امام ابوحنیفہؒ نے اس پر پہرہ دیا، امام احمدؒ نے تائید کی۔ اس سے تمسک دین مسلسل سے وابستگی ہے اور یہی دین قیم اور ایک زندہ مذہب ہے...... اسلام کی چودہ صدیوں میں ہر صدی میں بھی کچھ ایسے لوگ ابھرتے رہے، جنہوں نے اسلام کے اصول و عقائد اور اساسی اعمال کو ہر قیمت پر زندہ رکھا اور اس کی تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں آیا، جب قرآن کی تعبیر اور اسلام کی تعبیر تمام تحریف کی نذر ہوچکی ہوں، ورنہ اسلام ایک زندہ مذہب نہ رہتا۔ پھر یہ ایک مجموعہ دساتیر ہے زندگی کا تسلسل نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں ایسے افراد پیدا کیے جن کی زندگی اظہار حق اور ابطال باطل کے لیے وقف رہی۔ ناسازگار حالات اور الحاد کی لہریں انہیں ایک انچ بھی شاہراہ عظیم سے نہ ہٹا سکیں۔ یہ پاک شخصیتیں گو علی الانفراد معصوم نہیں، مگر ان کا مجموعی موقف ضرور معصوم رہا ہے۔ یہی اسباب کی وہ دنیا ہے، جس کے ذریعے دین کی ابدی حفاظت ہوئی اور رب العزت کا یہ وعدہ پورا ہوتا آیا۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (پ ۱۴/سورۃ الحجر) (بے شک ہم نے ہی قرآن اُتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنیوالے ہیں) قرآن کریم نظم و معنی کے مجموعہ کا نام ہے۔ جہاں الفاظ کا یہ نظم نہیں، وہ قرآن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محض ترجمہ قرآن کو قرآن نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ وہاں الفاظ کی وہ نشست اور ترتیب نہیں رہتی اسی طرح اگر معانی کی تعبیر غلط ہو تو بھی قرآن محفوظ نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی صحیح مراعات بتلانے والا طبقہ ہر دور میں موجود رہا۔ پس قرآن پاک کی وہی تعبیر صحیح ہوگی، جس کا حال اس کے ماضی سے منقطع نہ ہو اور ہم صرف اسی تعبیر کو اختیار کر سکتے ہیں، جو اسلام کے اسنادی پہلو سے کہیں نہ ٹکرائے اسلام کے تسلسلِ حیات اور خلاوین کی خصوصیت اس کا اسنادی پہلو ہے اور تدریج کے ہر موڑ پر اسے تھامے رہنا اسلام کا ایک معجزہ ہے، اسباب کی دنیا میں اس کا باعث وہ علمائے ربانی رہے ہیں، جو آج سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط ہیں ——— یہ صحیح ہے کہ صحابہ کے بعد کوئی طبقہ بحیثیت طبقہ کے مقدس نہیں کہ پورے طبقہ کو پاک جانیں اور بلا استثناء عدول کہا جائے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس امت کا کوئی قرن مصلحین، داعیوں مجددوں اور متقدمین سے خالی نہیں رہا اور ائمہ علوم، ائمہ ہدایت اور ائمہ کمالات ظاہرہ و باطن کی کسی دور میں نفی نہیں ہوئی الاانبیاء نبوت میں کوئی طبقہ نسبت ایمان و احسان کا محافظ رہا۔ کوئی نسبت احسان و عرفان کا، کوئی الفاظِ قرآن کا اور کوئی سنتِ صاحبِ قرآن کا اور یہ سب طبقے اپنے عصری تقاضوں کے ساتھ تا قیامت باقی رہیں گے، یہی اسلام کی زندگی ہے اور یہی اسلام کا تسلسل ہے

قرآن کریم کی ابدی حفاظت کا دائرہ الفاظِ کتاب اور مطالبِ کتاب ہر دو کو محیط ہے، جس طرح اس کے نقوشِ کتابت ہر تحریفِ لفظی سے محفوظ ہیں، اس کے معانی و مطالب بھی ہر تحریفِ معنوی سے مصئون ہیں۔ الفاظ اور معانی و مطالب دونوں کی حفاظت ہوتی چلی آئی ہے۔

قرآن کریم کی اس ابدی حفاظت کا خود رب العزت نے تکفل فرمایا اور اس کے لیے جو اسباب پیدا کئے، وہ اُمت کے اہل حق کے ذریعے اس کے طرقِ حفاظت ہیں، جب بھی اسلام کے خلاف کفر و الحاد کی آندھی چلی۔ رب العزت نے اس امت کے بہترین نفوس اس کے مقابلے میں کھڑے کر دیئے۔ ہر بزرگ نے اپنے مناسبِ حال کسی نہ کسی مورچے کو سنبھالا اور ایسے بڑے مسلمانوں کا ایک قافلہ ہر دور میں باطل سے نبرد آزما رہا، ان افراد کا کسی جزئی مسئلے میں کوئی اختلاف ہو تو ہو، لیکن ان کی مجموعی کوششیں ہمیشہ معصوم رہی ہیں۔ یہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ آپ کا دین تاریخ کے ہر دور میں زندہ ہے، دسویں صدی ہجری کے مشہور فاضل علامہ حسن شرنبلالی (صاحب نورالایضاح) اپنے رسالہ "النفحۃ القدسیہ" میں لکھتے ہیں: امرنا بحفظ النظم والمعنی جمیعا فانہ دلالۃ علی النبوۃ صلا) ہم لوگ قرآن پاک کے الفاظ و معنی دونوں کی حفاظت پر مامور ہیں اور یہی نبوت کا معجزہ ہے۔

ابراہیم بن عبدالرحمن العذری کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عن تحریف الغالین وانتحال المبطلین

(وتاویل الجاهلین۔ (کتاب المدخل) (ترجمہ: اس علم کو ہر پیچھے جانشین سے اگلے ثقہ لوگ لیتے رہیں گے۔ وہ اس سے غلو کرنے والوں کی تحریف، جھوٹوں کی من گھڑت باتوں اور جاہلوں کی تاویل کو ہمیشہ دور کرتے رہیں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:۔

ان منکم من یقاتل علی تاویل القرآن کما قاتلت علی تنزیلہ۔ (بے شک تم میں ایسے لوگ بھی ہوں گے، جو قرآنی مرادات کے لیے بھی اسی طرح جہاد کریں گے، جیسے تنزیل قرآن پر میں جہاد کرتا رہا ہوں (دوکما قال) رواہ احمد و البیہقی) اس روایت میں الفاظ قرآن کی طرح مرادات قرآن کے تحفظ کی بھی خبر دی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ امت کے ضیعے قرآن پاک کی ہر لفظی اور معنوی تحریف سے پوری طرح حفاظت رہے گی۔ حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:۔

لن یبرح ھذا الدین قائماً یقاتل علیہ عصابۃ من المسلمین حتی تقوم الساعۃ (یہ دین برابر قائم رہے گا اور اس کے لیے مسلمانوں کا ایک طبقہ برابر لڑتا رہے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے یہ حدیث روایت کی:۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لا تزال طائفۃ من امتی قائمۃ بامر اللہ لا یضرھم من خذلھم او خالفھم حتی یاتی امر اللہ وھم ظاھرون علی الناس (صحیح مسلم ج۲ ص۱۴۳) (میری امت کا ایک طبقہ امر الٰہی پر برابر قائم رہے گا، جو انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کریں گے یا ان کی مخالفت کریں گے، وہ انہیں کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے اور وہ طبقہ لوگوں پر ظاہر رہے گا۔)

فطرتِ سلیمہ کے خلاف چلنے اور حق سے ٹکرانے والے اگر قیامت تک رہیں گے تو ایسے مسلمانوں کا بھی ایک طبقہ ضرور رہے گا، جو اپنے مالک کی وفاداری اور اطاعت میں اس کے رحم و کرم اور رضوان و غفران کا مظہر ہوں۔

ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربک ولذالک خلقھم (پ ۱۲۔ سورۂ ھود)

اور وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے، مگر جس پر تیرا پروردگار رحم کرے اور اسی لیے ان کو پیدا کیا ہے۔

درخانۂ عشق از کفر ناگزیر است   دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

قرآن پاک نے اس مقام پر ایک ایسے ہی طبقہ کی نشاندہی کی ہے، جو رحم و کرم کا مظہر ہو کر قیامت تک دین فطرت کا ساتھ دے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ بتلایا کہ آپ کی اُمت گمراہی کے کئی حصوں میں بٹ جائے گی، تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ایک طبقہ جو میری سنت اور میری جماعت کے مطابق ہوگا، وہ حق پر ہوگا اور وہی راہِ نجات ہوگی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حق پر قائم رہنے والا طبقہ قیامت تک باقی رہے گا اور کوئی آندھی حق کے درخت کو اپنی جڑ سے نہ اکھاڑ سکے گی ؎ نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن   پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

ائمہ ھدایت اور ائمہ ضلالت

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حق اور باطل کی معرکہ آرائی برابر جاری رہے، تو جس طرح ہدایت مسلسل رہے گی، گمراہی بھی برابر چلے گی۔ اب ان کا امتیاز کیسے ہو؟ جواباً گزارش ہے کہ خطِ مستقیم صرف ایک ہوتا ہے اور ٹیڑھے خط کئی۔ ہدایت کی راہ صرف ایک ہے۔ اور باطل کی راہیں کئی ہیں۔ قرآن کریم نے ظلمتوں کو جمع کی صورت میں اور نور کو واحد کی صورت میں ذکر فرمایا ہے۔ جیسا ظلمات والنور (پ ۷ سورۃ انعام)

پس ہدایت کے باقی رہنے میں مسلسل رہنے کی بقا ہے اور گمراہی کے باقی رہنے میں کسی ایک طریق کی بقا ضروری نہیں، بلکہ کبھی کوئی گمراہی سر اٹھاتی ہے اور کبھی کوئی گمراہی دم مارے۔ گمراہی میں گو وہ سب برابر ہوں، مگر ہر گمراہی کی راہ ایک دوسرے سے مختلف ہوگی جیسے ٹیڑھے خط آپس میں سب مختلف ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ائمہ ضلالت اپنے طریق کو کبھی ایک دوسرے کی طرف اسناد نہیں کرتے۔ نمرود، شداد، فرعون، ہامان، سب اپنے اپنے وقت میں ائمۃ الکفر تھے، مگر ایک دوسرے سے انتساب کے ہرگز قائل نہ تھے۔ بخلاف ان کے انبیائے کرام جو ائمہ ہدایت تھے۔ سب ایک دوسرے کے مصدق اور ایک ہی راستے کے داعی تھے۔

اولئک الذین ھدی اللہ فبھدا ھم اقتدہ (پ ۷، سورۃ انعام)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی حکم ہوا کہ یہ "سارا طبقہ میرے رستے پر تھا، آپ بھی اسی راہ پر چلیں" نبوت کے جھوٹے مدعی اور انکار حدیث کے مبلغین، مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، مرزا غلام احمد، عبداللہ چکڑالوی اور غلام احمد پرویز یہ سب گمراہی کے امام ہیں۔ مگر آپس میں کوئی انتساب نہیں رکھتے اور نہ ان میں سے کسی نے اپنے طریق کفر کو اپنے ماقبل سے اسناد کیا ہے۔ یہ سب اپنے اپنے طریقے کے موجد ہوتے ہیں بخلاف ان کے وہ تمام اہل حق جو ان ائمہ ضلالت کے مقابلے میں ائمہ ہدایت بنے۔ آپس میں اسناد و اتحاد رکھتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جو مسیلمہ کذاب کے خلاف اٹھے۔ ان کی غلامی پر وہ سب اہل حق فخر کرتے ہیں، جنہوں نے مرزا غلام احمد کی تحریک کا مقابلہ کیا، بلکہ علماً اور عملاً وہ اسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہی پیروی سمجھتے ہیں۔ ختم نبوت کے عقیدے میں یہ امت کا اتصال ہے۔ مگر یہ مدعیان نبوت آپس میں متصل نہیں۔ مسٹر پرویز اپنی فکر کے خود موجد ہیں، لیکن ان کے خلاف اٹھنے والے اپنے مسلک کے موجد نہیں، وہ پہلے کے متوارث دین کے داعی ہیں اور اپنے متقدمین اہل حق کی پیروی کو ہی راہ نجات سمجھتے ہیں۔ حق ایک مسلسل راہ ہدایت ہے، جس کے کارکن آپس میں اسناد و اعتقاد رکھتے ہیں اور باطل کی راہیں گو ہر دور میں موجود رہیں، لیکن وہ آپس میں مسلسل اور مربوط نہیں، حق کا امتیاز اس کا اسنادی پہلو ہے۔ حق ایک راہ ہے، جو مسلسل چلی آرہی ہے۔ یہی صراط مستقیم (سیدھی راہ) ہے اور اس کے سوا باقی سب سبل (کئی راہیں) ہیں

وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ (پ ۸ سورۃ انعام)

"یہ میری ایک سیدھی راہ ہے۔ اسی پر چلو اور متعدد راہوں پر نہ چلو، یہ تمہیں میری راہ سے جدا کر دیں گی۔"

سیدھی راہ چلنے والے اہل حق جو انبیاء کرام کی پیروی میں اس راہ پر چلے وہ گو فرداً فرداً معصوم نہ ہوں، مگر ان کا مجموعی موقف ضرور معصوم رہا ہے اور اسی طریق سے ہدایت کی راہ آگے پھیلتی رہی۔ اس میں اسلام کی بقا تھی اور اسی میں اسلام کی زندگی تھی۔ یہ صحیح

ہو کہ اختلافنا مستقیم نہ جیسے کہ ان میں بھی اختلافات اور تنازعات ہوتے۔ مگر ان کے اختلافات دو نوعیت کے اختلاف تھے۔
مثلاً وحدت کے شیوں ہم ان کی توجیہ کرتے ہیں تاہم فقہی اختلافات میں انھیں ناقل اور مرجوح سے آگے نہیں جانے دیتے۔ یہی
وہ وجہ کہ ان سب کے باوجود یہ ایک راہ ہے اور یہ راہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی جماعت کی راہ ہے۔ یہ سب
اہل حق اپنے ہر عقیدے اور اعمال کی سند اپنے پہلوں سے پاتے رہے اور اسی طریق سے یہ متوارث دین ہم تک پہنچا ہے۔

یہ سلسلہ صحابہ کرام سے چلا اور بارھویں صدی کے بعد یہ اسناد حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندان میں جمع ہوگئے
پاک و ہند بلکہ جزیرہ عرب کی دینی فضا اسی گھرانے سے قائم ہوئی اور اپنے بعد والوں کے لیے یہی خاندان روشنی کا مینار رہا۔ حضرت
شاہ صاحب کے بیٹوں شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اور شاہ رفیع الدین دہلوی نے قرآن پاک کے پہلے اردو ترجمے لکھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث
دہلوی نے حدیث و فقہ کی سند سنبھالی انگریزی عملداری میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا اور حضرت شاہ صاحب کے پوتے۔ شاہ
اسماعیل شہید عملی جہاد کے لیے اٹھے۔ بعد میں آنے والے سب اہل حق اسی گھرانے سے سند لیتے رہے اور یہی خاندان ان ممالک میں اہل حق
کا سلسلہ اسناد اور مرکز اعتماد تھا۔

اس عہد کے قریب یورپ صدیوں کی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ انگریز ہندوستان میں اپنے پاؤں مضبوط کر رہے تھے مسلم حکمرانوں
کی باہمی مخالفت کا انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور DIVIDE AND RULE کی راہ سے وہ پورے ہندوستان پر قابض ہوگئے۔ مسلمانوں
اور تہذیب اسلام کے تحفظ کے لیے یہ نہایت نازک وقت تھا۔ یورپ کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے مسلم ممالک کو تہذیب جدید کی راہیں دکھائیں
۔ وقت کے تقاضوں پر پورا اترنا چاہیے۔ یہ ایک بڑا حسین عنوان تھا۔ جدت پسندی کے نام سے مغرب پسندی اپنا دامن پھیلا رہی تھی
محدثین دہلی کے پیرو وقت کے تقاضوں سے غافل نہ تھے۔ مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ MODERNISATION کی راہ سے
WESTERNISATION ہمارے گھروں میں گھس رہی ہے۔ سماجی اور اقتصادی تبدیلیاں جب اقتدار کے سائے میں پروان
چڑھیں تو دینی اور روحانی قدروں کی زمین بھی ہل جاتی ہے

اس باب میں عثمانی ترکوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ترک قوم مصطفیٰ کمال کی قیادت میں اپنے ماضی سے کٹ گئی اور
مغربی قدروں میں بہہ کر اپنے رسم الخط تک کو بدل ڈالا آئندہ ترک نسلیں ایک عظیم ذخیرۂ علم سے جو عربی، فارسی اور ترکی زبانوں
میں مشرقی رسم الخط میں پھیلا ہوا تھا، محروم ہوگئیں۔ ترک کلچر مغربیت میں فنا ہوگیا۔ اور ایک عظیم اسلامی سلطنت اپنے ماضی سے
کٹ کر رہ گئی۔

ہندوستان کے مسلمانوں اور خاص کر محدثین دہلی کے علم و فکر کے وارثوں کے لیے یہ وقت بڑا نازک تھا۔ جنگ
آزادی (۱۸۵۷ء) کی ناکامی کے بعد اس باب میں کہ اب مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ مسلم مفکرین کی آراء مختلف تھیں۔

۱۔ مسلم مفکر (بعض) یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے لیے دفتروں اور ملازمتوں میں کچھ رعایت مل کر مغربی فکر و نظر سے سمجھوتہ
کر لینا چاہیے اور مسلمانوں کو دنیوی تعلیم میں اتنا آگے نکلنا چاہیے کہ غلام ہندوستان میں وہ کسی دوسری قوم سے پیچھے نہ رہیں۔

یہ دستہ ابتدا میں بالکل بے ضرر تھا، لیکن مغربی فکرونظر سے مرعوب ہونے کے باعث انجام کار اپنے ماضی سے کٹ گیا تھا۔ چنانچہ جلد ہی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عقائد و افکار میں ڈھیلے ہوگئے اور اعمال وسعت قلب BROADMINDEDNESS کی بھینٹ چڑھنے لگے۔ اسی دور کے قریب سرسید نے علیگڑھ سکول کی بنیاد رکھی (جو بعد میں کالج اور یونیورسٹی تک پہنچ گیا) اور جدید تعلیم یافتہ مسلمان اس نظریہ کے گرد جمع ہوگئے۔ یہ ایک اچھی تجویز تھی، مگر وقتی تدبیر تھی، جس کا شعائرِ اسلام سے کوئی اساسی تعلق نہ تھا۔

۲۔ محدثین دہلی کے پیرو اس بات کے حامی تھے کہ گو جنگ آزادی میں ہم ناکام ہو چکے ہیں، مگر مغربی فکرونظر سے مرعوب نہ ہونا چاہیے۔ انگریزی زبان بے شک سیکھ لی جائے، مگر انگریزی تہذیب و تمدن کو نہ اپنایا جائے اور درس و تدریس اور تزکیہ و تعلیم کے ذریعہ اسلام کی علمی اور باطنی قوت کو محفوظ رکھا جائے، جس سے پھر کسی وقت راہ عمل کے چراغ روشن ہو سکیں۔ یہ حضرات اپنی فکرونظر کے معیار سے علم نبوت کے ترجمان اور شعائرِ اسلام کے داعی تھے اور اسی راہ سے وہ ملتِ اسلامیہ کی راہنمائی کرنا چاہتے تھے۔ ان کا اسنادی سلسلہ صحابہ کرامؓ، بزرگانِ اسلام اور محدثینِ دہلی سے مربوط تھا۔ اسی دور کے قریب اہلسنت والجماعت کی مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند قائم ہوئی۔

۳۔ مسلمانانِ ہند میں ایک خیال یہ بھی کام کر رہا تھا کہ نماز روزہ جیسے چند اعمالِ اسلام کو باقی رکھ کر انگریزی غلامی کو خلوصِ قلب سے اپنا لیا جائے اور انگریزوں کو اپنے اولی الامر داخل سمجھا جائے۔ یہ لوگ دین اور دنیا کی تقسیم کے حامی تھے اور دنیوی مراعات حاصل کرنے کے سوا ان کا کوئی مطمحِ نظر نہ تھا۔ انگریزوں سے کامل وفاداری کے اظہار کے لیے یہ لوگ محدثینِ دہلی کے خلاف بھی دم مارتے رہے اور ان کی کھلی دینی رہنمائی انہیں بہت کھٹکتی تھی۔ اس دور کے قریب کئی دنیا دار مشائخ کو استحکام ملا اور ان کی گدیوں نے باقاعدہ شکل اختیار کی، مگر انگریزوں کو اولی الامر میں داخل کرنے کے لیے ان کی آواز پھر بھی کافی نہ تھی۔ کیونکہ ابھی تک سب علمی چراغ محدثینِ دہلی کے چراغوں سے روشن تھے۔ اس کام کے لیے نبوت کی حمایت درکار تھی۔ انگریزوں نے ضرورت محسوس کی کہ غلام ہندوستان میں ایک نبوت بھی قائم کی جائے، جو انہیں اپنے اولی الامر میں داخل کرے۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں انگریزوں نے ایک کمیشن لندن سے ہندوستان بھیجا تاکہ وہ انگریز کے متعلق مسلمانوں کا مزاج معلوم کرے اور آئندہ کے لیے مسلمانوں کو رام کرنے کی تجاویز مرتب کرے۔ اس کمیشن نے ایک سال ہندوستان میں رہ کر مسلمانوں کے حالات معلوم کیے۔

۱۸۷۰ء وائٹ ہاؤس لندن میں کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں کمیشن مذکور کے نمائندگان کے علاوہ ہندوستان میں متعین مشنری کے پادری بھی دعوتِ خاص پر شریک ہوئے۔ اس میں دونوں نے علیحدہ علیحدہ رپورٹ پیش کی جو کہ "دی ارائیول آف برٹش ایمپائر ان انڈیا" کے نام سے شائع کی گئی، جس کے دو اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔

رپورٹ سربراہ کمیشن سر ولیم ہنٹر

"مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ وہ کسی غیر ملکی حکومت کے زیرِ سایہ نہیں رہ سکتے اور ان کے لیے غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کرنا ضروری ہے، جہاد کے اس تصور سے مسلمانوں میں ایک جوش اور ولولہ ہے اور وہ جہاد کے لیے ہر لحظہ تیار ہیں۔ ان کی کیفیت کسی وقت بھی انہیں حکومت کے خلاف ابھار سکتی ہے۔"

بہت پادری صاحبان

"یہاں کے باشندوں کی ایک بہت بڑی اکثریت یسوع مسیح کے تعلیمات کی حامل ہے۔ اگر اس وقت ہم کبھی ایسے غدار کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں، جو کلی سلطنت کا دعویٰ کرنے کو تیار ہو جائے تو اس کے صف بستہ میں ہزاروں لوگ جوق در جوق شامل ہو جائیں گے۔ ہمیں مشکلات میں سے اس قسم کے ادھر سے کے لیے کسی کو تیار کرنا ہی بنیادی کام ہے۔ یہ مشکل حل ہو جائے تو اس شخص کی نیت و طاقت کے زیر سایہ پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ ہم اس سے پہلے برصغیر کی تمام حکومتوں کو غدار تلاش کرنے کی حکمت عملی سے شکست دے چکے ہیں۔ وہ مرحلہ اور تھا۔ اس وقت فوجی نقطۂ نظر سے غداروں کی تلاش کی گئی تھی۔ لیکن اب جب کہ ہم برصغیر کے چپے چپے پر حکومت کر چکے ہیں اور ہر طرف امن و امان بھی بحال ہو گیا ہے۔ تو ان حالات میں ہمیں کسی ایسے منصوبے پر عمل کرنا چاہئے، جو یہاں کے باشندوں کے داخلی انتشار کا باعث ہو۔" (اقتباس از مطبوعہ رپورٹ کانفرنس مانشن ہاؤس لندن، منعقدہ ۱۸۸۸ء۔

(دی ارائیول آف برٹش ایمپائر ان انڈیا) ماخوذ

ان تینوں ذہنوں میں نمایاں فرق یہ تھا کہ پہلا ذہن دنیوی تقاضوں کے ضمن میں دین کو باقی رکھنا چاہتا تھا۔ دوسرا طبقہ دین کے ضمن میں دنیوی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا حامی تھا اور تیسرا ذہن دین اور دنیا کی پوری تقسیم کا حامی تھا۔ ان تینوں طبقوں میں اسلامی امتیاز صرف مدرسہ طبقہ کو حاصل تھا۔ یہ حضرات درس و تدریس میں باقاعدہ اسناد اور تزکیہ و تعلیم میں باقاعدہ سندوں کے حامل تھے۔

دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند، محدثین دہلی کے نظر و فکر کی نشاۃ ثانیہ تھی۔ اس کے بانی اور پہلے سرپرست حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں باقاعدہ شریک تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے پہلے اور دوسرے ذہن کو ایک دوسرے کے قریب کرنے کے لیے صحت عقائد پر سرسید سے خط و کتابت کی۔ جو ابھی دنوں "تصفیۃ العقائد" کے نام سے شائع ہو گئی۔ پھر ان حضرات کے ارشد تلامذہ اور دیوبند کے پرنسپل شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ خود علیگڑھ تشریف لائے۔ حضرت مرحوم اور ان کے شاگرد رشید شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تقریروں سے نہ صرف دونوں ذہن ایک دوسرے کے قریب ہوئے بلکہ پہلے طبقے کی کافی حد تک دینی اصلاح بھی ہو گئی۔ علامہ شبلیؒ اور ندوۃ العلماء کے ذریعے جو جدید نظریات اسلام کے نام سے سامنے آ رہے تھے۔ ان کی اصلاح کے لیے دارالعلوم دیوبند نے خاص سعی فرمائی، جو تاریخ دیوبند کا بہترین طرۂ ہے۔
حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نہ صرف دارالعلوم دیوبند کے سرپرست حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہوئے بلکہ ان کے اجل خلفاء میں شمار ہوئے۔ مولانا عبدالباری ندوی اور عبدالماجد دریابادی جیسے ماہرِ علوم کے مشاہیر اکابر دیوبند پر اپنی جان نچھاور کرنے لگے اور اس کا اثر پھیلتا گیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی جو ندوۃ العلماء کے ناظم، جامعہ اسلامیہ مدینہ یونیورسٹی کے رکن اور مجلس تاسیسی رابطہ اسلامی کے رکن رکین ہیں، اور آج دنیائے اسلام کے جانے پہچانے مفکر اور اپنی خاص صلاحیتوں کی وجہ سے پوری اسلامی دنیا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، وہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور قطب الاقطاب حضرت مولانا احمدؒ سے خلیفہ مجاز ہوئے۔ علمائے دیوبند کی ان کوششوں

مقامِ نبوت کی ان بے لوث وفاداریوں کے پیچھے گو مغربی طرز کا پروپیگنڈا سامنے نہ تھا۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ان حضرات نے علم و تقویٰ اور تزکیہ و طہارت کی روشنی میں مسلمانانِ ہند کی ہر شعبے میں راہنمائی کی ہے۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم کا دردمند دل جب ملی قوم کو جگا رہا تھا اور مرحوم کی آتشیں نوائیں مسلمانانِ ہند کو جھنجھوڑ رہی تھیں تو علمائے دیوبند نے محسوس کیا کہ مبادا ڈاکٹر صاحب مرحوم کی نظر اسلام کی اساسی علم سے ذرا مختلف ہو جائے۔ فلسفۂ اسلام کی بعض گرہوں پر مرحوم سے گفتگو ہونی چاہیئے۔ چنانچہ امام العصر حجۃ الاسلام علامہ انور شاہؒ اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لاہور تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم سے اہم ملی مسائل اور اسلام کی نظری گرہوں پر کئی دن تبادلۂ افکار رہا۔ انجمن حمایتِ اسلام میں ڈاکٹر صاحب نے قادیانیوں کے متعلق جو مؤقف اختیار کیا۔ وہ زیادہ تر انہی مذاکرات کی صدائے بازگشت تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دائرۂ اثر میں اس حقیقت کو خوب اجاگر کیا کہ نبوت کے اختلاف سے قوم بدل جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت پر اسرائیل سے ایک نئی قوم نکلی اور نصاریٰ یہود سے علیحدہ ایک نئی ملت ہو گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت آگے ایک اور ملت کا موجب ہوئی اور یہود و نصاریٰ کے بعد امتِ مسلمہ کا قیام عمل میں آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر کسی اور نبی کا پیدا ہونا مان لیا جائے، تو پھر ایک اور قوم عمل میں آئے گی، جو ملتِ اسلام سے علیحدہ ایک الگ قوم قرار پائے گی اور جس طرح اہلِ اسلام کی عقیدت کے مرکز مکہ اور مدینہ ہیں۔ اس نئی قوم کی وفاداریاں اپنے جدید مرکزِ نبوت سے وابستہ ہوں گی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ان پاکیزہ کوششوں میں علمائے دیوبند کا بہت دخل ہے اور ان ہی حضرات کی کوششوں کا ثمرہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے افکار سلف سے کہیں نہیں ٹکراتے اور نازک سے نازک مسائل میں وہ اسلام کی شاہراہِ عظیم سے ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہوئے۔ ان ہی دنوں ڈاکٹر علامہ اقبال اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جداگانہ قومی نظریئے پر متفق ہوئے۔ جس کی صدائے بازگشت ہندوستان کے سیاسی میدانوں میں برسوں بعد تک سنی جاتی رہی۔ البدر الساری کے مصنف لکھتے ہیں:

لم يستغن عن آرائه الدقيقة فى الفلسفة مثل الفيلسوف الدكتور السر محمد اقبال الهندى وسمعت سنة ١٣٤٧ھ فى ديوبند من المحترم عبد الله چغتائى من اخص اصحاب الدكتور المرحوم ان الدكتور اقبال يثنى كثيرا على دقة رايه فى غوامض الفلسفة منه — طبع مصر[1]

علمائے دیوبند کا اعتدال

علمائے دیوبند دین کے سمجھنے سمجھانے میں نہ تو اس طریق کے قائل ہیں، جو ماضی سے یکسر کٹا ہو، کیونکہ وہ مسلسل رشتہ نہیں۔ ایک نئی راہ ہے اور نہ وہ اس افراط کے قائل ہیں کہ رسم و رواج اور تقلیدِ آباء کے تحت ہر بدعت کو اسلام میں داخل کر دیا جائے۔ جن اعمال میں تسلسل نہ ہو اور وہ تسلسل خیرالقرون تک مسلسل نہ ہو وہ اعمال اسلام نہیں ہوسکتے۔ یہ حضرات اس تقلید کے پوری طرح

---

[1] ترجمہ: حضرت شاہ صاحب کے دقیق فلسفیانہ نظریات سے ڈاکٹر سر محمد اقبال جیسے فلسفی بھی بے نیاز نہ تھے۔۔۔ اور میں نے دیوبند میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دوست ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سے ۱۳۴۷ھ میں سنا کہ ڈاکٹر اقبال فلسفے کی گرہوں میں حضرت شاہ صاحب کی دقتِ نظری کے بہت مداح تھے۔

قائل ہو جاتے ہیں، جو قرآن و حدیث کے سرچشمہ سے غلط اسلام کے نام پر چلتی آئی ہے۔ قرآن کریم تقلید آباء کی صرف اسی بنا پر مذمت کرتا ہے کہ وہ آباء عقل و اجتہاد کے نور سے خالی ہوں۔

او لو کان آباؤھم لا یعقلون شیئا و لا یھتدون (پ ۲) ترجمہ: بھلا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ راہ کو جانتے ہوں:

اگر سلف اور فقہائے اسلام جو علم و اجتہاد کے نور سے منور تھے۔ ان کی پیروی نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں بلکہ عین مطلوب ہے اور ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ صرف پیغمبروں ہی کی نہیں، صدیقین، شہداء اور صالحین کے رستے پر چلنے کی بھی ہر نماز میں رب العزت سے درخواست کریں۔ کیونکہ یہی صراط مستقیم ہے۔

اھدنا الصراط المستقیم۔ صراط الذین انعمت علیھم (پ۱) ترجمہ: اے اللہ! چلا ہمیں سیدھی راہ پر۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا:

اس مسلک اعتدال کی وجہ سے علمائے دیوبند دینی بے قیدی اور خود رائی سے بھی محفوظ رہے اور شرک و بدعت کے اندھیرے بھی انہیں اپنے جال میں نہ کھینچ سکے۔ ان کے اعمال و افکار سے اسلام کا تسلسل بھی قائم رہا اور کوئی غیر مسلسل نظریہ و عمل دین کے نام سے اسلام میں داخل بھی نہ ہونے پایا۔ یہ حضرات علم و عمل کے تسلسل سے اسلام کے چراغ روشن کرتے گئے اور تاریخ دیوبند پر نظر کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام واقعی ایک زندہ دین ہے، جو ان حضرات سے لے کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد سعادت عہد تک مسلسل ہے۔

مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا علامہ قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

" اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کا طبقہ علمائے دیوبند کی رو سے امت کے لیے روح رواں کی حیثیت رکھتا ہے جس سے اس امت کی باطنی حیات وابستہ ہے جو اصل حیات ہے۔ اس لیے علمائے دیوبند ان کی محبت و عظمت کو تحفظ ایمان کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، مگر غلو کے ساتھ اس محبت و عقیدت میں انہیں ربوبیت کا مقام نہیں دیتے۔ ان کی تعظیم شرعاً ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس کے معنی عبادت کے نہیں لیتے۔ کہ انہیں یا ان کی قبروں کو سجدہ و رکوع یا طواف و نذر یا منت و قربانی کا محل بنا لیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت سید احمد کبیر رفاعی، حضرت شیخ علی ہجویری، حضرت شیخ معین الدین چشتیؒ، حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور حضرت الامام المحدث شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے صحیح جانشین اور ان کے فیوض سے زندگی کے خاکوں میں اتباع سنت کا رنگ بھرنے والے یہی بزرگان کرام ہیں ان حضرات کا فیض روحانی اعمال تسخیر سے نہیں اعمال سنت سے قائم ہے اور یہ حضرات باقاعدہ چشتی، سہروردی، نقشبندی اور قادری نسبتوں سے انتساب رکھتے ہیں۔ بلکہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو سلوک اور تزکیۂ نفوس کا یہ رستہ اب صرف اسی مسلک کے لوگوں سے آباد ہے۔ یہ حضرات علم و عمل، ہر دو ابواب میں اسنادی پہلو قائم رکھتے ہیں۔ بدعات کی روک تھام میں بھی یہ حضرات اسی لیے پیش پیش رہے کہ ان کے

اعمال کا استثنائی پہلو کہیں موجود نہ تھا اور یہ تردید بھی حق نہیں، بلکہ حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) بھی اسی رنگ میں بدعات کی تردید فرماتے رہے ہیں۔

اجتناب از ہم رسم بدعت تا از بدعت حسنہ در رنگ بدعت سیئہ احتراز نماید بوئے ازیں دولت بمشام جان او نرسد، این معنی امروز متعسر است کہ عالم در دریائے بدعت غرق گشتہ است بظلمات بدعت آرام گرفتہ کراجال است کہ دم از رفع بدعت زند و باحیائے سنت لب کشاید اکثر علماء این وقت رواج دہندہ ہائے بدعت اند و محو کنندہ ہائے سنت، بدعتہا پہن شدہ را تعامل خلق دانستہ بجواز بلکہ باستحسان آن فتوے مے دہند و مردم را ببدعت دلالت می نمایند۔ (مکتوب ۵۴ دفتر دوم)

ترجمہ: بدعت کے تمام اور عمل سے بھی پرہیز لازم ہے۔ جب تک بدعت حسنہ سے بھی اسی طرح پرہیز نہ کرے جس طرح بدعت سیئہ سے پرہیز کی جاتی ہے۔ روحانیت کی بو طالب کے دماغ تک نہیں پہنچ سکتی اور یہ بات آج بہت مشکل ہو گئی ہے کیونکہ جہاں بدعت کے دریا میں ڈوب رہا ہے اور لوگ بدعت کے اندھیروں میں آرام لے رہے ہیں۔ کس کی مجال ہے کہ بدعت کے خلاف دم مارے اور احیائے سنت کے لیے زبان کھولے۔ اس وقت اکثر مروجہ بدعتوں کو رواج دے رہے ہیں اور سنتوں کو مٹا رہے ہیں۔ رواج یافتہ بدعتوں کو مجبوری قرار دیکر ان کے جائز بلکہ بہتر ہونیکا فتویٰ دے رہے ہیں اور لوگوں کو بدعت کی راہ دکھا رہے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جن علمائے ربانی کی تمنا کی تھی کہ احیائے سنت کے لیے زبان کھولنے والے اور بدعات کے خلاف دم مارنے والے کہاں ہیں؟ ان کی یہ تمنا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان اور اس تحریک کی نشاۃ ثانیہ حضرات اکابر دیوبند سے پوری ہوئی۔ فللہ المنۃ

فقہ میں سنت کی راہیں

سرزمین پاک و ہند میں نوے فی صد مسلمان فقہ حنفی کے مقلد ہیں۔ فقہ حنفی امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد، ان کے تلامذہ کے استنباطات اور پھر اصحاب ترجیح کے فیصلوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی چھان بین اور کانٹ چھانٹ کے بعد فقہ کا کوئی مسئلہ اصولی شریعت کے خلاف باقی نہیں رہ سکتا، مگر اس طریق عمل میں ایک اور پہلو بھی تھا، وہ یہ کہ عمل کرنے والے کی نظر فقہاء ہی تک محدود رہتی اور گو وہ اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہؓ کے طریق سے متجاوز نہ ہوتے، مگر عمل کرنے والے کا شعور اتباع سنت کی لذت پوری طرح محسوس نہ کر سکتا تھا علمائے دیوبند نے اعمال و عبادات کو ان کے مصادر کی طرف لوٹایا، احادیث کے دفاتر کھلے، تحقیقات پھیلیں، رجال کی نئے سرے سے چھان بین ہوئی، مطالب و معانی میں کاوشیں کی گئیں اور گو ان حضرات کو فقہ کا کوئی مفتیٰ بہ فیصلہ اصول شریعت سے متصادم نظر نہ آیا تاہم اس راہ تحقیق نے ایک فضا پیدا کردی کہ پہلے جن مسائل پر فقہ سمجھ کر عمل کیا جاتا تھا، اب وہی مسائل نور سنت کی روشنی دینے لگے اور ان اعمال و عبادات میں اتباع سنت کی وہ لذت محسوس ہونے لگی، جو اس فکری تبدیلی کے بغیر ہرگز ممکن نہ تھی۔ علمائے دیوبند نے نہ صرف پاک و

...ئے احناف کو سنت کا لشکر بخشا بلکہ ان کی حدیثی تحقیقات نے شام و مصر تک ان حضرات کے علوم پھیلا دیئے۔ یہ حضرات
...رف علمائے حنفی ہیں۔ بلکہ آج حنفیت کی مسند تدریس انہی کے دم قدم سے قائم ہے۔ یہاں نہ ظاہریت کی تعطیل ہے اور نہ
...ایت کی سی افراط بلکہ سلف صالحین کی سی کامل اتباع دیوبند کا مسلک مختار ہے۔

تیرھویں صدی ہجری میں علمائے احناف کے پاس اصحاب ترجیح کے کچھ متون رہ گئے تھے۔ جن سے فقہ کی تدریس باقی تھی۔ ان
...بڑی کتاب ہدایہ تھی۔ جسے حضرت برہان الدین المرغینانی (۵۹۳ھ) نے اس ہدایہ میں لکھا تھا کہ دین کی اصل حجیت نفس مجتہدین
کے ہاتھ میں بلکہ طالب کا مرکز توجہ کتاب الٰہی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ ہو۔ علامہ ابن ہمام اسکندری
...ھ) اور صاحب بحر علامہ ابن نجیم (۹۷۰ھ) کے بعد فقہ حنفی کا مدار رد مختار۔ عالمگیری طحطاوی اور شامی پر رہ گیا تھا
...میں شک نہیں کہ ان کتابوں میں فقہ حنفی کے فتاویٰ نہایت منقح اور قابل اعتماد صورت میں ملتے ہیں۔ لیکن فقہ کے طالب علم
...ن کتابوں میں فقہ کے مجتہدانہ ذوق کا ادراک نہ کر سکتے تھے فقہ حنفی کی اساس حضرت امام محمدؒ (۱۸۹ھ) کی کتابوں پر تھی۔
...ان کی ظاہر الروایات فقہ حنفی کا اصل خزانہ تھیں۔

امام محمدؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی وفات کے بعد مدینہ تشریف لائے اور حضرت امام مالکؒ (۱۷۹ھ) کے حلقہ درس
میں شامل ہوئے۔ آپ نے امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے ذوق اجتہاد کا تقابلی مطالعہ کیا تو امام ابوحنیفہؒ کے
اجتہاد کو اصول سنت کے زیادہ قریب پایا۔ آپ نے اپنے ان احساسات پر الحجۃ علی اہل المدینۃ کے نام سے ایک کتاب
لکھی اور اس کا ایک نسخہ مدینہ منورہ بھجوا دیا۔ یہ کتاب مدینہ شریف کے کتب خانہ محمودیہ میں موجود تھی۔ ایک نقل شکل کے کتب خانہ
عثمانیہ میں تھی۔ علماء و فضلاء دور دراز سے اس کتاب کو دیکھنے آتے تھے۔

شیخ الہندؒ کے نامور شاگرد محدث جلیل حضرت مولانا مفتی مہدی حسنؒ (جو ۲۰ واسطوں سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی
کی اولاد ہیں) نے اس کتاب پر تحقیقاتی کام کیا اور بیس سال میں اس کے مسودے کی تصحیح اور تعلیق مکمل کی حیدرآباد دکن
کے مطبع المعارف الشرقیہ نے ۱۳۸۵ھ میں اس کی دو جلدیں شائع کردیں۔ دوسری جلد کتاب البیوع پر ختم ہوتی ہے۔ پوری
کتاب چار جلدوں میں ہے۔ علماء دیوبند کی فقہ حنفی کی خدمت میں یہ ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ امام محمدؒ کی کتاب مبسوط جو ظاہر الروایہ
میں کتاب الاصل کی حیثیت رکھتی ہے اور اسے اس نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ استانبول کے مکتبہ فیض اللہ میں چھ
جلدوں میں موجود تھی۔ دیوبند کے مقتدر عالم مولانا ابوالوفا افغانی رئیس لجنۃ المعارف النعمانیہ نے اس کتاب پر تحقیقاتی کام کیا
اور تعلیق لکھی ۱۳۹۰ھ میں اس کتاب کی پہلی دو جلدیں بڑی آب و تاب سے شائع ہوگئیں اور وہ کتاب جسے دیکھنے
کے لیے علماء ایک ہزار سال سے تجسس کر رہے تھے۔ دیوبند کے فیض کا صدقہ منصۂ شہود پر آگئی۔ تیسری جلد کتاب التحری سے
شروع ہوتی ہے کتاب الاصل کی اشاعت سے فقہ کے طالب علم تحقیقات میں قرن اول کے ذوق فقہ سے حصہ پا رہے ہیں

امام محمد کی کتاب السیر الکبیر بھی امام سرخسی کی شرح کے ساتھ چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اسلامی سیاست کی تمہید میں یہ کتاب اساسی حیثیت رکھتی ہے۔

فقہ میں سنت کی راہیں معلوم کرنے کے لیے آٹھویں صدی میں حافظ جمال الدین زیلعیؒ (۷۶۲ھ) نے علم حدیث کا ایک بڑا ذخیرہ "نصب الرایہ" کے نام سے جمع کیا تھا۔ یہ عظیم علمی سرمایہ سالہا سال سے نایاب تھا۔ علمائے دیوبند نے نہ صرف اسے دوبارہ طبع کرانے کا اہتمام فرمایا بلکہ اس پر بغیۃ الالمعی فی تخریج الزیلعی کے نام سے ایک جلیل القدر حاشیہ تحریر فرماکر علمائے حدیث پر ایک بڑا احسان فرمایا۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں مصر سے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ علمائے دیوبند کی یہ کاوش فقہ حنفی اور علم و حدیث کی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ محدث کبیر ملا علی قاریؒ کی کتاب شرح نقایہ فقہ و حدیث کا عظیم سرمایہ تھی مگر زیور طباعت سے آراستہ نہ تھی۔ دیوبند کے شیخ الادب والفقہ حضرت مولینا اعزاز علیؒ نے "محمود الرایہ" کے نام سے اس پر ایک مستقل حاشیہ لکھ کر اسے بڑے اہتمام سے شائع فرمایا۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسے شرح وقایہ کے ساتھ درس نظامی میں مستقل جگہ دی جائے۔ اب یہ کتاب حسبِ مکمل صورت میں شائع ہو رہی ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے تمام فقہی ابواب کو احادیث و روایات کی روشنی میں مرتب کرنے کا اہتمام فرمایا اور خانقاہ تھانہ بھون میں اعلاء السنن کے نام سے ایک عظیم علمی ذخیرہ بیس جلدوں میں مرتب ہوا۔ یہ عظیم علمی خدمت حاس المحدثین حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے سر انجام دی اسکا مقدمہ قواعد علوم الحدیث علمائے شام نے بڑی آب و تاب سے شائع کیا ہے۔ یہ مقدمہ ایک مستقل کتاب کی شکل میں ہے۔ شیخ ابوغدہ نے اسکی بہت توصیف فرمائی ہے اور عرب کے مشہور فضلاء نے اس کی خوارت علما کا اعتراف کیا ہے تقسیم ملک سے پہلے اعلاء السنن کی تیرہ جلدیں شائع ہو چکی تھیں کتاب ایک متن اور ایک شرح پر مشتمل ہے۔ متن اور شرح کی زبان عربی ہے بعض جلدوں کے آخر میں صرف متن کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے جس سے اردو داں حضرات بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

جہاں تک فقہ کی عام خدمت کا تعلق ہے یہ کہنا کافی ہوگا کہ علمائے دیوبند نے کئی کتابوں پر مفید حاشیے لکھے علامہ ابن ہمامؒ (۸۶۱ھ) کی کتاب زاد الفقیر پر حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی نے المستدرک الکبیر نام سے مفید عربی حاشیہ تحریر فرمایا دیوبند کے شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علیؒ نے مختصر القدوری پر نور الایضاح پر اور کنز الدقائق پر بہت اعلیٰ عربی حاشیے تحریر فرمائے آپکا نور الایضاح کا حاشیہ بہت مقبول ہوا اور کئی دفعہ چھپا ہے۔ آپ نے آزاد قبائل اور افغانستان کے طلبہ کے لیے نور الایضاح کا ایک فارسی حاشیہ بھی تحریر فرمایا جسے مطبع قاسمیہ نے شائع کیا ہے۔

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا فتاوے رشیدیہ تین حصوں میں حضرت مولانا تھانویؒ کا فتاوے امدادیہ چھ ضخیم جلدوں میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب نقشبندیؒ کا عزیز الفتاوی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا فتاوے دار العلوم دیوبند مفتی عبدالرحیم صاحب کا فتاوے رحیمیہ (جو انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے اور اہل یورپ اس سے اسلامی قانون استفا

رہے ہیں) اور مفتی رشید احمد صاحب کا احسن الفتاویٰ وہ فقہی مواد ہے جو علماء دیوبند کی فقہ حنفی کی خدمات میں بہت
اہمیت رکھتا ہے اور اس دور میں ہزاروں تشنگان علوم دینی کو سیراب کرتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ اور صحابہ کرام پر رحمتوں کے پھول برسانے جو انگریزوں کی مہلک سازشوں اور اپنوں کی بھولی نادانیوں نے بیج بوئے
سوامت سواد اعظم کی راہ چھوڑ کر امت کو سنت کا ذوق متوارث دے گئے اغیار کی سازش سے ان پر تکفیر کے گولے
بھی برسائے جاتے رہے مگر دیوبند سے انتساب رکھنے والا ہر فرد سنت کے روشن چراغوں سے امت کو شاہراہ مستقیم کی دعوت دیتا رہا

علم حدیث کی خدمات

اس مسلک کے اکابر نے علم حدیث کی وہ خدمت انجام دی ہیں جن کا تصور بھی اس قرن میں مشکل تھا ۔ حدیث کی ہر
ہر کتاب پر عربی شرحیں لکھیں حاشیے رقم فرمائے اور نئے تقاضوں کے مطابق حدیث کا گرانقدر ذخیرہ اردو میں بھی نئی ترتیب سے
پیش فرمایا ۔ امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری کے امالی "فیض الباری" علی صحیح البخاری مصر سے چار ضخیم جلدوں میں شائع
ہوئے ہیں ۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے صحیح بخاری پر اپنی تقریرات کو اپنے تفسیر قرآن کے مخصوص انداز میں ایک
نہایت نفیس شرح کی صورت میں مرتب فرمایا یہ شرح فضل الباری علی صحیح البخاری کے نام سے چھپ گئی ہے ۔ عصر حاضر کے اس
شاہکار کا ساتھ ہی ساتھ انگریزی میں بھی ترجمہ ہو رہا ہے ۔ حکیم الاسلام مولانا قاری طیب صاحب نے اس کتاب کو دیکھ کر
فرمایا کہ اس سے حضرت مولانا محمد قاسمؒ کی وہ تمنا پوری ہوگی جس کے تحت وہ یورپ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا
پھیلاؤ دیکھنا چاہتے تھے ۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب کی عربی تصنیف لامع الدراری علی صحیح البخاری حضرت گنگوہیؒ کی
تقریر صحیح بخاری کے متن کے ساتھ تین ضخیم جلدوں میں مکمل چھپ چکی ہے اور صحیح بخاری پر تحقیقات کا نادر خزانہ ہے ۔
حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے تراجم بخاری کی مکمل عربی شرح کئی جلدوں میں تحریر فرمائی ہے خدا کرے کہ یہ علمی خدمت جلد
طباعت پذیر ہو ۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا فخرالدین امروہیؒ کی صحیح بخاری پر اردو تقریرات نہایت نفیس انداز میں چھپ رہی
ہیں ۔ صحیح مسلم کی بہترین عربی شرح جسے علماء ازہر نے احناف و شوافع کی جملہ سابقہ شروح پر فائق تسلیم کیا ہے فتح الملہم کے نام
سے کئی ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی یہ عظیم خدمت حدیث دیوبند کا مایہ ناز سرمایہ ہے رأس المحدثین
مولانا خلیل احمد نے ابوداؤد کی شرح بذل المجہود پانچ ضخیم جلدوں میں عربی میں تحریر فرمائی اب یہ شرح حضرت مولانا شیخ الحدیث
محمد زکریا کے مختصر حواشی کے ساتھ مصر میں دوبارہ بڑے آب و تاب سے چھپی ہے حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا انور
شاہ صاحبؒ کے امالی علی سنن ابی داؤد انوار المحمود کے نام سے دو جلدوں میں چھپ چکے ہیں ۔ الطیب الشذی مولانا
اشفاق الرحمن کاندھلوی ، الکوکب الدری شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا اور معارف السنن مولانا یوسف بنوری جامع ترمذی کی بہترین
شرحیں ہیں ۔ معارف السنن کی پہلی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں دعا ہے کہ باقی درمیانی جلدیں بھی جلد طباعت پذیر ہوں
مولانا محمد یوسف بنوری کی یہ عظیم شرح اس دور میں خدمت حدیث کا شاہکار ہے ۔ عرب ممالک کے علماء حدیث

شرح ترمذی پر انگشت بدنداں ہیں۔ امام محمدؒ کی کتاب الآثار کی شرح حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب
ضخیم جلدوں میں عربی میں لکھی جو پوری تاریخ میں پہلی مثال ہے جامع ترمذی کے املاء میں شیخ الہندؒ اور حضرت ا
انور شاہ صاحب کی تقریرات بہت معروف ہیں حضرت شاہ صاحب کی العرف الشذی سے حدیث کا کوئی مدرس مستغ
نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے عجیب مقبولیت بخشی ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نامور شاگرد عبدالرزاق بن ہمام صنعانی (۲۱۱ھ) کی حدیث کی ضخیم کتاب المصنف علم حد
کا بڑا ذخیرہ تھی۔ اس کے چند نسخے مختلف جگہ موجود تھے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اس کے مسودہ
بڑی عرق ریزی فرمائی اور اس پر نہایت نفیس تعلیق لکھی۔ حدیث کی یہ عظیم کتاب گیارہ ضخیم جلدوں میں بیروت سے شا
ہے اور اسے جوہانسبرگ (افریقہ) کی مجلس علمی نے شائع کیا ہے۔ علماء دیوبند کی یہ خدمت قرن حاضر کا بہت
علمی کام ہے۔

ابوبکر بن ابی شیبہ (۲۳۵ھ) کی حدیث کی کتاب المصنف کا ذکر بھی صرف شروح حدیث میں ملتا تھا اور
کی آنکھیں اسے دیکھنے کو ترستی تھیں۔ جمعیت علماء حیدرآباد (ہند) کے نائب صدر مولانا عبدالخالق افغانی نے اس
تحقیقاتی کام کیا اور علم حدیث کا یہ نادر خزانہ منصۂ شہود پر آگیا ۱۳۸۱ھ تک اس کی تین جلدیں شائع ہوئی ت

حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم نے بھی ترمذی کی ایک نہایت جامع اور نفیس عربی شرح ت
فرمائی ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ سنن نسائی پر حضرت مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب نے بہترین حاشیہ تحریر فرمایا۔ م
امام مالک کی مفصل عربی شرح شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہٗ نے چھ ضخیم جلدوں میں مرتب کرکے شائع فرمائی۔ ا
طحاوی کی شرح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی نے "امانی الاحبار فی شرح معانی الآثار" کے نام سے کئی ضخیم جلدوں میں ت
فرمائی اس کی دو جلدیں چھپ چکی ہیں۔ مشکوٰۃ کی شرح "التعلیق الصبیح" حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے سات ضخیم جل
میں عربی میں تحریر کی۔ سنن ابن ماجہ پر حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ نے ایک نہایت عمدہ حاشیہ لکھا جو ابھی تک
چھپ نہیں سکا۔ ایک اور حاشیہ جو مفصل شرح کا درجہ رکھتا ہے۔ مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلویؒ نے بھی تحریر ف
جو المنذ بذ کراچی سے شائع ہوگیا ہے۔

اردو میں حدیث کی خدمت

سب سے پہلے شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس طرف توجہ فرمائی اور اپنے مخصوص ادبی ان
میں صحیح بخاری پر تشریحی نوٹ لکھے ان کے بعد عمدۃ المحدثین حضرت مولانا سید بدر عالم صاحب مدنیؒ نے ترجمان ا
کے نام سے ایک گرانقدر علمی ذخیرہ چار ضخیم جلدوں میں مرتب فرمایا جسے ندوۃ المصنفین دہلی نے اپنے سلسلۂ اشاعت میں شا
کیا اور اسی طرح صاحب موصوف نے "جواہر الحکم" کے نام سے تین چھوٹے چھوٹے مجموعے موجودہ دور کے خصوص

تاموں کو ملاحظہ کر کے لکھتے : "ترجمان السنہ" کے نام سے انہوں نے جو کام کیا وہ گو پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا کیونکہ وہ
اس موضوع کی تقریباً دس جلدیں لکھنے کا تھا مگر زندگی نے مہلت ہی اتنی دی کہ چار جلدیں پوری کر سکے، تاہم یہ ایک ایسا عمدہ
علمی ذخیرہ ہے کہ اس کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے یہ اپنے دور کی حدیث کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ حضرت مؤلف مرحوم
کا انداز تحریر ایسا ہے کہ متوسط درجہ اور اونچے طبقہ کے لوگ اس سے زیادہ مستفید ہو سکتے ہیں۔ حضرت مولانا
محمد منظور نعمانی مدظلہٗ نے نہایت عام فہم مفید اور سلیس انداز میں "معارف الحدیث" کے نام سے علم حدیث کی خدمت کی
ہے جس کی ۵ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان گراں بہا تحریرات پر نظر کرنے سے وہ غلط پروپیگنڈا دور ہو جاتا ہے کہ دیو
بند علمائے کرام عصر حاضر کے تقاضوں سے غافل ہیں۔

قرآن کریم کی عصری خدمات

علمائے دیوبند نے عصر جدید کے پیدا شدہ الحاد کے آگے ہر ممکن بند باندھنے کی کوشش کی ہے۔ اس باب
میں سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ قرآن کریم کو نئی نسلوں کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ روایات کے
اس قسم کے الحاد کے بغیر نفس مواد نہایت آسان پیرایہ میں ادا ہو جائے اور جہاں جہاں دشمنان اسلام مورچے بنائے ہوئے
ہیں وہاں ایسی تعبیر اختیار کی جائے کہ نفس اختلاف میں الجھے بغیر تمام پیدا ہونے والے یا پیدا کیے گئے شبہات زائل
ہو جائیں۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے حضرت شیخ الہند کے ترجمہ قرآن پر ایک نہایت شگفتہ، مختصر اور
مکمل تفسیری حاشیہ لکھ کر عصر حاضر کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا۔ آپ کے حواشی گو ایک طرف سلف صالحین
کے مسلک کے مطابق ہیں۔ تو دوسری طرف موجودہ ضروریات کے بھی عین مطابق ہیں پڑھتے جائیے۔ معاندین اسلام کے
پیدا کیے ہوئے شبہات کی جڑ از خود کٹتی چلی جائے گی۔ پھر کسی فریق کی دلآزاری نہیں کسی فرقہ کا نام تک نہیں زبان
اور طرز بیان خشک اور پرانا نہیں بلکہ نہایت سلیس اور دل نشین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس تفسیری حاشیہ کو اتنی مقبولیت
عطا فرمائی ہے کہ پاکستان، ہندوستان، چین، امریکہ اور افغانستان وغیرہ میں (فارسی میں ترجمہ ہوکر) چھپ چکا
ہے۔ اور پاک و ہند میں چھ سات اداروں نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ تاج کمپنی نے حسب روایت
دو سائزوں میں چار قسم کے کاغذ پر شائع کیا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات جو اسلام کو سلف کے آئینہ میں مطالعہ کرنا چاہتے
ہیں۔ وہ اس مختصر تفسیر میں نہایت اطمینان اور شرح صدر محسوس کرتے ہیں۔ یہ ترجمہ اور حاشیہ علمائے دیوبند کا جدید
نسل پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے قرآن پاک کے ترجمہ و تفسیر کا کام بیان القرآن
کے نام سے کیا ہے۔ حکیم الامت کی یہ تفسیر اپنی معنوی خوبیوں کے اعتبار سے اتنی جامع اور مختصر ہے کہ بلا خوف
تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس تفسیر کو غور سے پڑھنے کے بعد کسی دوسری تفسیر کی مراجعت کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔
لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا پیرایۂ بیان علمی ہے اور معمولی پڑھے لکھے لوگ اس سے کما حقہ فائدہ نہیں

اٹھا سکتے قرآن کریم کا مفسر —— عام فہم اور ربط آیات سے مطالعہ کرنے والے حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب لاہوری کے ترجمہ اور حواشی سے زیادہ مستفید ہو سکتے ہیں۔ قرآن کریم کو ادبی پیرایہ بیان میں پڑھنے اور سمجھنے والوں کے لیے سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی کا ترجمہ اور تفسیر بہت مفید ہے۔

مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب کی تفسیر معارف القرآن آٹھ ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے عام فہم اور سلیس اردو میں قرآنی مسائل اور معارف کا بیش بہا خزانہ ہے اس میں عصری فتنوں پر پوری گرفت ہے جدید تعلیم یافتہ نوجوان پڑھے لکھے لوگ اس تفسیر میں زبان کی فصاحت عصر حاضر کی بلاغت اور سلف کی سی ثقاہت محسوس کرتے ہیں۔ تفسیر میں مولانا تھانوی اور علامہ عثمانی رحمہما اللہ کی تفسیرات کی روح بولتی ہے اور اس نے تفسیر کے تمام جدید ذخیروں کو اپنی سلاست، جامعیت اور افادیت میں پیچھے کر دیا ہے۔ کتابت اور طباعت بہت عمدہ ہے۔

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے بھی معارف القرآن کے نام سے ایک نہایت جامع تفسیر لکھی ہے مولانا کا علمی انداز بیان حقائق و معارف کے مرل چن چن کر پیش کرتا ہے یہ تفسیر سورہ احزاب تک مکمل ہو چکی تھی کہ مولانا رحمت الٰہی سے جا ملے خدا کرے کہ یہ عظیم تفسیری خدمت جلد طباعت پذیر ہو۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے آخر عمر میں قرآن کریم کی آیات احکام پر کام کرنے کا ارادہ فرمایا وقت نے مہلت نہ دی اور آپ نے یہ خدمت اپنے اصحاب و خدام میں تقسیم فرما دی کل کتاب سات جلدوں میں ہے پانچ جلدیں چھپ چکی ہیں تیسری اور چوتھی جلد ابھی باقی ہے یہ عربی تفسیر احکام القرآن تفسیر علم اصول حدیث اور فقہ کا بحر ناپیدا کنار ہے علماء عرب اس زمانے میں اس عظیم خدمت پر حیران ہیں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے سورہ نساء تک آٹھ سو صفحات میں اس کی دو جلدیں تحریر فرمائیں پانچویں اور چھٹی جلدیں مفتی محمد شفیع صاحب نے چھ سو صفحوں میں مکمل کیں اور ساتویں جلد حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے قلم بلاغت رقم سے پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے۔

امام العصر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری کی تفسیر مشکلات القرآن عربی نادر علمی تحقیقات کا عجیب خزانہ ہے آپ نے قرآن کریم کے مشکل مقامات پر بصیرت افروز کلام کیا ہے محدث العصر مولانا محمد یوسف بنوری نے —— اس کا ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے جو مقدمہ تفسیر القرآن پر ایک بڑی خدمت ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد سالم استاذ دارالعلوم دیوبند ان دنوں تفسیر کے جدید عصر کے تقاضوں کے پیش نظر ایک مبسوط مقدمہ تفسیر قرآن عربی میں لکھ رہے ہیں خدا کرے کہ قرآن کریم کی یہ عظیم خدمت بھی جلد زیور طباعت سے آراستہ ہو اپنے مسلک کے علمی حلقے اس کے شدت سے منتظر ہیں۔

اس وقت جو ترجمے برصغیر پاک و ہند میں سب سے زیادہ مقبول اور مؤثر ہیں وہ زیادہ تر علماء دیوبند کے ہی ہیں مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے گو بعض امور میں ہمیں شدید اختلاف ہے تاہم ان کی خدمات قرآن کریم انگریزی

حاشیہ قرآن اور اردو تفسیر قرآن زیادہ تر علماء دیوبند خصوصاً حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا یہ فیضان ہی تھا جو ہلکا
ماہیا مرشد تھانوی کی ہدایت کی مدد ملتے ہیں۔

جدید عصری تقاضوں پر دینی لٹریچر

عقلیت پسند ذہن کو اسلامی احکام کے قریب کرنے کے لیے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کی "عقل و نقل"، "خوارق عادات" اور "مسئلہ تقدیر" جیسی تحریرات عصری تقاضوں کے پیش نظر بہت مفید کتابیں ہیں۔ حضرت مولانا تھانوی کی کتاب "سائنس اور اسلام"، حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی کی "اشاعت اسلام"، مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی "اسلامی معاشیات"، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کی "اسلام کا اقتصادی نظام"، "اخلاق اور فلسفہ اخلاق"، "قصص القرآن" (چار جلد)، مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی "علم الکلام"، حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندی کی "آلات جدیدہ" اور "نظام اسلام"، مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی "اسلام اور مسئلہ غلامی" اور اسی طرح حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا محمد منظور نعمانی کی مختلف کتابیں وہ صحیح دینی لٹریچر ہے جو اکابر دیوبند اور منتسبین دیوبند کے ذریعہ جدید نسلوں کو ملا ہے۔

ندوۃ المصنفین دہلی

عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو میں کتاب و سنت اور سیرت تاریخ اسلام کی وسیع تر اشاعت کے لیے فضلائے دارالعلوم دیوبند مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، مولانا سید محمد بدر عالم مہاجر مدنی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی (حال صدر شعبہ دینیات علیگڑھ یونیورسٹی) نے ندوۃ المصنفین دہلی کی بنیاد ڈالی۔ یہ چاروں حضرت علامہ شاہ انور کشمیری کے ہونہار تلامذہ اور دارالعلوم دیوبند کے قابل فخر فرزند ہیں۔ ان کی مساعی سے ندوۃ المصنفین دہلی نے اردو میں جو مفید دینی لٹریچر شائع کیا اس لٹریچر اور مذکورہ بالا لٹریچر کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اکابر دیوبند اور منتسبین دیوبند نے عربی اور اردو میں کتاب و سنت اور فقہ کی اشاعت و تبلیغ میں جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اس کے مقابلہ میں کسی دوسری ایک جماعت یا سب جماعتوں کے دینی لٹریچر کو ملا کر بھی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جن حضرات نے اس مفید دینی لٹریچر کا پورے غور سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اسلام کو ماضی سے وابستہ رکھتے ہوئے اور اسلاف پر تنقید سے بچتے ہوئے جدید نسلوں تک دین پہنچانے کی عزت انہی حضرات کو حاصل ہے۔ یہ بزرگ پرانے فن میں نیا مطالعہ کرنے کی بحمداللہ پوری استعداد رکھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس مفید دینی لٹریچر کے پیچھے کسی منظم پارٹی کا پراپیگنڈہ نہیں۔ اور نہ اسے کسی سیاسی گروہ کی تائید حاصل ہے مگر یہ کوئی کمزوری نہیں دین کا تقدس ہے کہ اسے اس قسم کی آلائشوں سے پاک رکھا جائے۔

سرزمین پاک و ہند میں کئی افراد اور جماعتیں دین کا کام کر رہی ہیں۔ جماعت دیوبند کا امتیاز یہ ہے کہ یہ اپنے علم و فکر کو اسلاف سے جوڑ کر آگے چلتے ہیں ان کا حال ماضی سے مربوط اور ان کا دین عہد صحابہؓ تک مسلسل ہے۔

دین کے نام پر جب یہ کہا جائے کہ پہلوں نے دین کو غلط سمجھا تھا۔ صرف ہم اس کے صحیح واقف ہیں اس طور تنقید و جرح کی جائے کہ جس سے نقادوں کی عظمت دلوں میں راسخ اور اسلاف کی عزت و وقعت اور رفعت کم ہوتی چلی جائے تو ظاہر ہے کہ ایسے داعی حق اس عظیم قافلے کے رکن نہیں ہو سکتے جو عہد رسالت کے حق کے لیے چلا تھا اور قیامت تک اس کے ارکان اس راہ پر کاربند رہیں گے یہی حق کا تسلسل ہے اور یہی زندگی ہے۔ دین کی جو دعوت اسلاف سے مربوط نہیں وہ حق نہیں نفس کا فریب ہے۔ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے اس تسلسل کی یوں خبر دی ہے۔

لاتزال طائفة من امتی قائمة بامر الله لایضرهم من خذلهم اوخالفهم حتی یاتی امر الله

میری امت کا ایک طبقہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا مخالفت کرنے والے اسے کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے۔

زیر نظر دارالعلوم نمبر میں اکابر دیوبند کی جن خدمات کا ذکر ہے۔ یہ اہل حق صدیوں سے قائم بامراللہ چلے آ رہے ہیں اور اس وقت بھی ان کے جانشین اور خلفاء اس عظیم قافلہ کا نشان ہیں۔ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ جب یہ کہتے ہیں کہ:۔ ع سوئے قطار مے کشم ناقۂ بے زمام را

تو گویا وہ بھی اس مسلسل قطار کا ہی دم بھرتے ہیں اور اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلاف قائم رہے حضرت امام ابن سیرینؒ تو علم اسناد کو بھی دین ہی قرار دیتے ہیں کیونکہ اس پر دین کا مدار ہے۔ ان سے نقل کرتے ہیں:۔

ان هذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون دینکم

بے شک یہ علم (علم اسناد) دین ہے پس دیکھو کہ کن لوگوں سے دین حاصل کرتے ہو۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اگر کہا جائے کہ جماعت دیوبند آئینی طور پر جماعت نہیں اس کو کسی ایک رجسٹر میں ممبر سازی نہیں۔ اس کے موضوع مختلف ہیں اگر مولانا سید حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ دہلی استخلاص وطن کے لیے قیدوبند کی صعوبتیں اٹھاتے رہے تو حکیم الامت حضرت تھانویؒ زیادہ تر حکمت اور تزکیہ نفوس میں مصروف رہے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے درس حدیث کی مسند کو زینت دی۔ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی امر بالمعروف کے لیے ہر بستی و صحرا میں گھومے تو شیخ الحدیث مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، مولانا عبدالشکور لکھنوی، مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید عطاءاللہ شاہ صاحب بخاری باطل کے سامنے تلوار بن کر چمکتے رہے اور ان سب کے شیوخ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے تزکیہ نفوس اور جہاد بالسیف، درس و تدریس اور مسند ارشاد و فتاویٰ میں سار

۔ تو یہ علماء جو مختلف موضوعوں اور میدانوں میں کام کرتے رہے اور ہر ایک کا دائرہ عمل ایک دوسرے سے مختلف رہا اب بھی حضرات اس عظیم قافلے کے رکن کہے جا سکتے ہیں جو عہد رسالت سے قائم بامراللہ چلا آرہا ہے ۔ طائفہ وہی ہے جو کہ زمان ایک نظام میں منسلک ہوں جناب عرض ہے کہ طائفہ کے لیے موضوع عمل ایک ہونا ضروری نہیں جو لوگ اصولاً متحد ہیں اور موضوعاً تقسیم کار میں جدا جدا کام کرتے ہوں وہ سب کے ایک جماعت ہونے کے منافی نہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ ایک جگہ جمع ہوں اور ایک رجسٹر میں مندرج ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ اقطار عالم میں پھیلے ہوئے ہوں اور بعض ایک دوسرے کو جانتے بھی نہ ہوں مگر سنت سے مربوط رہنے میں سب ایک دوسرے کے دست و بازو ہوں ۔ حدیث مذکورہ بالا کو بعضوں نے یہی مطلب بیان کیا ہے ۔ ساتویں صدی ہجری کے مشہور محدث امام محی الدین نوویؒ اس طائفہ کی تشریح میں لکھتے ہیں ۔

قلت ويحتمل ان هذه الطائفة متفرقة
بين انواع المؤمنين منهم شجعان
مقاتلون ومنهم فقهاء ومنهم محدثون
ومنهم زهاد وآمرون بالمعروف و
والناهون عن المنكر ومنهم اهل
انواع اخرى من الخير ولا يلزم ان يكونوا
مجتمعين بل قد يكونون متفرقين في
اقطار الارض وفي هذا الحديث معجزة
ظاهرة فان هذا الوصف ما زال
بحمد الله تعالى من زمن النبي
(صلى الله عليه وسلم) الى الآن ولا
يزول حتى يأتي امر الله المذكور
في الحديث وفيه دليل لكون
الاجماع حجة وهو اصح ما يستدل
به من الحديث

میرے خیال میں طائفہ میں اس بات کی گنجائش
ہے کہ وہ مسلمانوں کی متفرق اقسام پر مشتمل ہو، (۱) نڈر
اور بہادر بھی ہوں (۲) فقہا بھی (۳) محدثین بھی (۴)
زاہد و عابد بھی (۵) امر بالمعروف کا تبلیغی کام کرنے والا
(۶) باطل کا مقابلہ کرنیوالے اور (۷) کئی دوسرے نیک کام
کرنیوالے بھی ۔ طائفہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ (ایک
رجسٹر یا ایک جگہ) جمع ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ
اقطار ارض میں پھیلے ہوئے ہوں اس حدیث میں
اسلام کا ایک ظاہر معجزہ مذکور ہے کیونکہ قیام بامراللہ کا
یہ وصف اس امت میں عہد رسالت سے اب تک
مسلسل چلا آرہا ہے اور یہ تسلسل اس وقت تک قائم
رہے گا جب تک کہ قیامت واقع نہ ہو جائے ۔ اس
میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ امت کا اجماع حجت
ہے[1] ۔ اور اجماع کے حجت ہونے پر احادیث سے
جو استدلال کیے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ
صحیح یہ استدلال ہے ۔

---

[1] کیونکہ اجماع بھی ہوگا جب یہ طائفہ بھی ساتھ ہو اور اس طائفہ پر ہونا منصوص ہے ۔ پس اجماع کے حق ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا ۔

اسنادِ سلف کے اثرات

جن حضرات نے علم و عمل کے چراغ سلف کے اسناد سے روشن کیے ہیں ان کے ذمہ سلف کا دفاع لازمی ہو جاتا ہے اور وہ اس بات کے مکلف ہیں کہ اپنے اسلاف کے عمومی کردار کو ہر دور میں ہے دافع اور آئندہ نسلوں کے لیے بمنزلہ چراغ ثابت کرتے چلے آئیں۔ اس کے بغیر اسلام ایک مسلسل حقیقت نہیں رہتا۔ اور نہ اسے ایک زندہ مذہب کہا جا سکتا ہے۔

اسلام کے اس تسلسل کا آغاز صحابہ کرامؓ سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ پاک و ہند کی علمی و عملی فضا میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان تک پہنچتا ہے۔ ہمارے بعض دوست اس زنجیر کی پہلی کڑی کو کمزور بتاتے ہیں اور جو چند نفوس کا اقرار کرتے ہیں نہیں بھی حکمت عملی (یا تقیہ) اور خاموشی کی چادر اوڑھا دیتے ہیں اور دوسرے بعض حضرات شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان مثلاً شاہ اسماعیل شہیدؒ اور شاہ محمد اسحاقؒ محدثین دہلی پر اعتراض کرتے ہیں اور گو ان کے ایک بزرگ یہ بھی کہتے ہیں کہ علمائے مخالفین شاہ اسماعیلؒ کو کافر نہ کہیں اسی میں سلامتی ہے مگر ان کی اس خاندان سے مخالفت پھر بھی ڈھکی چھپی نہیں۔ محدثین دہلی کے پیرو تحریک خلافت میں ترکوں کے ساتھ تھے لیکن یہ بزرگ اور ان کے ساتھی ترکوں کی مخالفت میں کام کرتے رہے ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا کہ علمائے حق اسناد دین کے دفاع میں صحابہؓ پر تنقید اور مخالفت بھی روکیں اور محدثین دہلی کی بھی عمومی صفائی پیش کریں کیونکہ اسناد کی یہی کڑیاں انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاتی تھیں۔ اور اسلام کا تسلسل انہی حضرات سے قائم تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیرو تیرہ اسلام کے اسناد سے یوں بے نیاز ہوگئے کہ انہوں نے اس لڑی کے اعلیٰ ترین افراد صحابہ کرامؓ سے بھی ایک بڑا منصب (نبوت) اپنے گھر میں تجویز کر لیا، اور مرزا صاحب نے اعلان کر دیا کہ وہ ہر حدیث جو میری وحی کے خلاف ہو قابل قبول نہیں۔ چودھری غلام احمد پرویز نے پرانے اسلام سے بغاوت کرکے نیا "طلوع اسلام" جاری کر دیا۔ دینی نظریات کی اس کش مکش میں علمائے دیوبند مکمل طور پر صحابہ کرامؓ سے لے کر محدثین دہلی تک اسناد اسلام کی ہر کڑی سے پورے وفادار رہے اور سلف صالحین کی اتباع کی یہاں تک پابندی کی کہ چھوٹی سے چھوٹی بدعت کو بھی دین نہ بننے دیا۔

دنیا نے اپنے آپ کو بدلا گھڑی گھڑی

اک اہل عشق ہیں کہ جہاں تھے وہیں رہے

تسلسل اسلام اور اسناد دین کو کمزور کرنے والے ان مختلف طبقوں سے ان اکابر نے اگر کوئی اختلاف کیا تو یہ اس لیے نہیں کہ وہ اختلاف پسند تھے یا انہیں کسی طبقے سے کوئی ذاتی بغض تھا بلکہ محض اس لیے کہ اسلام جس مبارک سلسلے سے ہم تک پہنچا ہے اس سے پوری وفا کی جائے۔ ان کے الحادی یا بدعی نظریات کی تخریب و تردید اس لیے ضروری تھی کہ اس کے بغیر اسلام کی تعمیر اور بقا کی کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن ان کی یہ تردید بھی اصولی رہی اور اس کا انداز جدل احسن رہا جس کی تعلیم

جو قرآن پاک نے دی ہے۔

وجادلھم بالتی ھی احسن کا   اور ان سے مجادلہ احسن طور پر کرو۔

ناموس صحابہ کا دفاع

ناموس صحابہؓ کے دفاع میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ہدیۃ الشیعہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ہدایۃ الشیعہ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے مطرقۃ الکرامۃ علی مرآۃ الامامۃ اور ہدایات الرشید الی افحام العنید تحریر کیں اور محدثین دہلی کے علمی اور فکری موقف کی پوری ترجمانی کی۔ جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء اور قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی کتاب تحفہ اثنا عشریہ سے ظاہر ہے۔ پھر امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی دفاع صحابہ کی اس عظیم خدمت میں پوری عمر مصروف رہے۔ اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ جیسی ضخیم کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا جو کئی جلدوں میں پھیلی ہوئی کتاب تعارف صحابہ کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ مولانا عبدالشکورؒ کا برصغیر پاک و ہند پر بڑا احسان ہے۔ حضرت مولانا لکھنویؒ نے ازالۃ الخفاء کا بھی تین جلدوں میں اردو ترجمہ کیا۔ آیات امامت و خلافت اور مقام صحابہ سے متعلق دوسری آیات کی وہ بے نظیر تفسیر لکھی کہ اس کا تصور اس دور میں مشکل تھا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے مقام صحابہ پر کامیاب مضامین لکھے اور جب وقت کی سیاسی آندھیوں نے قافلہ اسلام کی صف اول پر یلغار کی تو حضرت مدنیؒ نے صحابہ کے معیار حق ہونے پر وہ مباحث تحریر فرمائے جو قرن حاضر کا سرمایہ ناز ہیں۔

پھر دفاع صحابہ کے لیے حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ کے شاگرد آگے بڑھے مولانا دیانت حسین رئیس دیوبند نے صوبہ بہار میں اور سلطان المناظرین مولانا حافظ محمد شفیع سنگھتروی نے پنجاب میں اس محاذ کو سنبھالا۔ مولانا دیانت حسین نے کشف التلبیس تین حصوں میں تحریر فرمائی اور حافظ صاحب مرحوم نے مناظرے کے پلیٹ فارم کو سنبھالا۔ حضرت مولانا عبدالشکور کے شاگرد خصوصی مولانا بشیر احمد پسروری (جو حدیث میں حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کے شاگرد اور سلوک میں شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے خلیفہ مجاز تھے) نے پوری زندگی دفاع صحابہ کے محاذ پر لگا دی اور ان موضوعات پر پچیس کے قریب لاجواب رسائل تحریر فرمائے۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا لکھنوی رحمہما اللہ کے ارشاد پر مخدوم القوم سردار احمد خان پتافی نے تنظیم اہل السنۃ کی بنا رکھی جو تقریباً نصف صدی سے دفاع صحابہ کی شمع فروزاں ہاتھ میں لیے ہے۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے شاگرد علامہ دوست محمد قریشی نقشبندی اور حضرت مولانا لطف اللہ جالندھری (جو حضرت مفتی فقیر اللہ صاحب رائپوری کے فرزند رشید تھے) اس پلیٹ فارم پر فتنہ رفض و الحاد کے خلاف تیغ براں بن کر چمکے اور اسی محنت میں حضرت عثمانیؒ کے یہ دونوں شاگرد اپنے خالق سے جا ملے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد اور خلیفہ مجاز مولانا قاضی مظہر حسین صاحب امیر انجمن خدام اہل السنۃ جو اپنے والد ماجد مولانا کرم دین دبیر مصنف آفتاب ہدایت کی نسبت سے بھی دفاع صحابہ کے پہلے مجاہد ہیں ۔ اس میدان میں ربع صدی سے خدمات جلیلہ سر انجام دے رہے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں جو خاصی شہرت رکھتی ہیں ۔

حضرت مدنیؒ کے شاگرد مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری اور مولانا عبدالستار تونسوی اس وقت پوری قوم کو اسلام کی شاہراہ اعتدال کی دعوت دے رہے ہیں اور اس شاہراہ کے پیچھے قافلے کا پورا دفاع کر رہے ہیں مولانا نور الحسن شاہ بخاری تنظیم اہل السنۃ کے قیام میں سردار احمد خاں پتافی رئیس اعظم جام پور ضلع ڈیرہ غازیخان کے دائیں بازو تھے سالہا سال تک ہفت روزہ دعوت لاہور کے مدیر رہے اور دفاع صحابہ پر عظیم اور تاریخی خدمات سرانجام دیں مولانا تونسوی دفاع صحابہ پر صف اول کے مناظر ہیں اور رب العزت نے انہیں ہر میدان میں عجیب فتح و نصرت سے نوازا ہے حضرت مدنیؒ نے اپنے تلامذہ میں عظمت صحابہ اور دفاع صحابہ کی وہ روح پھونک رکھی ہے کہ وہ جہاں کہیں ہے شاہراہ اسلام کے اس ہزاروں رستے کی مدح میں معروف ہے اور قوم کو اسی کے نقش قدم پر آنے اور چلنے کی دعوت دے رہا ہے ۔

عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ

اس عظیم شاہراہ اسلام پر ایک اور یلغار ہوئی ایک بڑا فتنہ انکار ختم نبوت پیدا ہو گیا اور انگریز کی خانہ ساز نبوت کے داعی یورپ اور بلاد افریقہ میں تبلیغی مشن کے حسین عنوان سے مسلمانوں کو ارتداد کی دعوت دینے لگے علماء حق نے مسلمانوں کو اس فتنے سے خبردار کیا سرخیل اکابر دیوبند حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے اپنے خلفاء حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی کو اس طرف متوجہ فرمایا پیر صاحب حجاز ہجرت کے ارادہ سے آئے تھے ۔ حضرت حاجی صاحب مرحوم کی نظر بھانپ رہی تھی کہ حضرت گولڑوی کو مرزا غلام احمد کے مقابلہ میں کام کرنا ہے ۔ آپ نے پیر صاحب کو واپس ہندوستان جانے کا امر فرمایا شیخ الہند کے شاگرد امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ۔ مناظر اسلام مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری ۔ مولانا محمد عالم آسی امرتسری اور مناظر اسلام مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ میدان میں نکلے اور ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں شاہ صاحب مرحوم نے اس سلسلے میں عربی اور فارسی میں کتابیں لکھ کر دوسرے ممالک کو بھی اس فتنے سے خبردار کیا اور مہر شاہ صاحب کے شاگرد حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی ، مولانا مفتی محمد شفیع ، مولانا مناظر احسن گیلانی ، مولانا محمد ادریس کاندھلوی ، مولانا قاری محمد طیب صاحب اور مولانا محمد یوسف بنوری نے پوری قوت سے فتنہ انکار ختم نبوت کا مقابلہ کیا اور عقائد اسلام کے تحفظ کے لیے مسلمانان ہند اور دیگر مسلم ممالک کو وہ علمی اور تحقیقی مواد مہیا کیا کہ منکرین ختم نبوت دم بخود رہ گئے مولانا مناظر احسن گیلانی کے شاگرد رشید پروفیسر الیاس برنی کی کتاب قادیانی مذہب اب بھی قادیانی نظریات کا انسائیکلو پیڈیا سمجھی جاتی ہے ۔

شیخ الہند کے شاگردوں میں مولانا ثناء اللہ امرتسری مسلک فقہ میں شیخ کے مسلک پر نہ تھے لیکن ختم نبوت
پر وہ آپ کے ارشاد پر جان چھڑکتے تھے حضرت شیخ الہند نے مولانا امرتسری کے ذریعہ اہل حدیث کے پورے حلقہ میں
مرزائیت کے خلاف بیداری پیدا کر دی اور مولانا امرتسری نے مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور مولانا محمد داؤد غزنوی کو بھی
اس محاذ پر لا کھڑا کیا۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء

مجلس تبلیغ امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی شعلہ نوائی سے امت مسلمہ کے قریب کر دیا۔ شاہ
صاحب آخر دم تک مرزائیت کے خلاف نبرد آزما رہے اور ان کے دوران یہ تحریک زور پکڑتی رہی آپ کے بعد
مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولانا محمد علی جالندھری نے اس مورچے کو سنبھالا اور اپنی زندگی اس محاذ پر لگا دی
۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے صدر مولانا ابوالحسنات خطیب جامع مسجد وزیر خان لاہور تھے مگر محسوس میں
یہ ولولہ پیدا کرنے والے اور انہیں اس صداقت کے لیے تیار کرنے والے خود مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تھے اور تحریک کی
زمام کار حضرت شاہ صاحب کے ہاتھ میں تھی جب وہ وقت قریب آیا کہ مرزائیت قانونی طور پر بھی غیر مسلم اقلیت قرار پائے
تو اللہ سبحانہ نے مجلس تحفظ ختم نبوت کے صدر کے عہدہ پر محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کا انتخاب فرما
لیا۔ پھر ۱۹۷۴ء میں تمام مسلم جماعتوں نے حضرت مولانا بنوری کو مجلس عمل کا صدر منتخب کیا ملک میں ہمہ گیر تحریک
چلی۔ پاکستان قومی اسمبلی نے مرزائیوں کو قانونی طور پر مسلمانوں سے الگ ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔۔۔۔ اور تحفظ ختم نبوت
کا جو کام حاجی امداد اللہ اور علامہ انور شاہ کے ہاتھ سے شروع ہوا مولانا یوسف بنوری کے ہاتھ پر پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا۔
اب خدام دیوبند مختلف ممالک میں ختم نبوت کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

علماء دیوبند نے اس محاذ پر نہ صرف عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ کیا بلکہ اسلام کے جملہ وہ مسائل جن پر قادیانی الحاد
کا آرہ چل رہا تھا ان کا پورا دفاع کیا حرمت جہاد، مسیح ہندوستان میں، وفات مسیح اور معجزات خارق عادات کے خلاف
کام کیا مسلمانوں کو اسلام کی شاہراہ مسلسل سے جوڑا اور یہ ان کی قربانیوں اور محنتوں کا فیضان ہے کہ امت ان مسائل میں
ابھی تک شاہراہ اسلام پر گامزن ہے۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اہل باطل کے مقابلہ میں ہمیشہ تیغ بے نیام رہے اور انہیں جہاں اور جب
کہیں پتہ چلا کہ کوئی اسلام میں رخنہ اندازی کر رہا ہے اور ملت اسلامیہ کو سلف صالحین کے ساتھ جوڑے رکھنے کی
بجائے توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ایسا کرنے والے بزعم خود و مردان امت کی ایسی رہبری کر رہے ہیں کہ پوری
تاریخ میں ملت کو ایسا عالی دماغ قائد و رہنما میسر نہیں آیا تو حضرت مولانا اس کے سامنے بلا خوف و لومۃ لائم سینہ سپر
ہوگئے۔ اپنی زندگی کے بالکل آخری ایام میں جب انہوں نے محسوس کیا کہ فتنہ انکار حدیث پر ضرب کلیمی کی ضرورت ہے
تو انہوں نے صاف اور واشگاف الفاظ میں ایک جلسہ عام میں اعلان فرمایا کہ جو حدیث کا منکر ہے وہ قرآن کا منکر

ہے اور قرآن کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ گرچہ اس سے پہلے بھی علمائے ربانی خاموش نہیں تھے۔ حضرت لاہوری کے اس نعرہ رستاخیز کے بعد ملک اور بیرون ملک کے ہر فرقہ و خیال کے علماء کے دستخطوں سے ایک ضخیم جلد شائع ہوئی جس میں حضرت مولانا کے اس خیال کی مکمل تائید کی گئی اور اس پر اجماع امت ہوگیا کہ حدیث کے منکر کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ور اب اس سلسلے میں مولانا سرفراز احمد خاں صاحب صفدر شیخ الحدیث مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ اور حضرت مولانا یوسف صاحب بنوری قابل قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ردِ بدعت وشرک

اتباع سنت اور حدیث کا انکار کرنے والا گروہ "مرکز ملت" کے نام سے ایک نئی اصطلاح وضع کرکے قرآن کی تعبیر و تشریح کا اختیار اسے سونپ دیتا ہے کہ یہ نام نہاد مرکز ملت زمانے کے تقاضوں اور امنگوں کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، صحابہؓ کے فیصلوں اور اجماع امت کے مسائل سے قطع نظر کرکے جو چاہے فیصلہ کر دے ایک دوسرا گروہ ایسا ہے جو زبانی کلامی محبت وعشق رسول کا بہت دعویدار ہے اور اپنے سوا تمام طبقات امت کو قابل گردن زدنی اور دنیا کے ہر کافر و مشرک سے بدتر سمجھتا ہے لیکن عملاً اسکا حال یہ ہے کہ شریعت کے پُرنور چہرے کو مسخ کرکے دین میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے اور جب ٹوکا جاتا ہے تو "ثواب کا کام ہے، کیا حرج ہے"۔ ان جیسی باتیں کہہ کر اپنی وضع کردہ رسوم و بدعات کو اسلام میں داخل کرتا اور من گھڑت افکار کو شریعت قرار دیتا ہے اور پھر اسی پر بس نہیں اپنے ان رسوم و رواج کو دین و شریعت کا جزو بنانے کے لیے بے سر و پا دلائل کا انبار لگا دیتا ہے ایسے رسوم و رواج کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعت قرار دیا ہے اور بدعت ایسی برائی ہے کہ جس کا چھوڑنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی کے لیے نیا دین اختیار کرنا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہر خطبہ میں بدعت کی برائی بیان فرمایا کرتے تھے آپؐ کے بعد صحابہؓ سے لے کر آج تک علمائے حقانی نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو سب سے زیادہ ردبدعت پر مرکوز رکھا کیونکہ اسی سے شرک کی راہ نکلتی تھی۔ جانشینان محدثین دہلی نے اس سلسلے میں بھی بہت کام کیا۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد شہید بریلویؒ نے اس بارے میں بہت مضبوط موقف اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مبتدعین کی نظر میں سب سے زیادہ یہی دو افراد کھٹکتے ہیں۔ ان حضرات کے بعد اکابر دیوبند کی باری آئی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمدؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے شرک و بدعت کے رد میں ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں۔ ماضی قریب میں مولانا حسین علی (واں بھچراں) اور مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری نے اس فریضہ کو بطریق احسن ادا کیا۔ مولانا محمد منظور نعمانی سالہا سال اس میدان میں کام کرتے رہے اور آج کل ان سب کی جانشینی کا حق تحریری طور پر سرفراز احمد خاں شیخ الحدیث مدرسہ عربی نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سرانجام دے رہے ہیں اور حق یہ ہے کہ مختلف موضوعات پر انہوں نے قابل قدر ذخیرہ جمع کر دیا ہے جس سے کتاب و سنت کی راہیں واضح اور کشادہ نظر آتی ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے قلم میں اثر رکھا ہے چنانچہ مختصر عرصہ میں ان کی اکثر کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

قافلہ اسلام کے ان کارکنوں کی نظر مخالفین کی مخالفت کی بجائے اصل اسلام کی اشاعت پر مرکوز رہتی ہے مخالفت برائے مخالفت کو علمائے حق علمائے دیوبند پسند نہیں کرتے۔ اور کوئی آ پڑے تو پھر اس سے گریز بھی نہیں کرتے پھر حضرت علیہ الرحمہ مخالفوں کو کھلی کا دعوت یاد کرا دیتے ہیں اور صدق کی تلوار حق کو حلال کر کے چلتی ہے اس کا مقصد بھی مخالفت کی تذلیل نہیں متوازنہ اسلام کی وفا ہے کیونکہ اسلاف اسلام کی کڑیاں اپنی اپنی جگہ واقع محفوظ ہیں۔

ردِ بدعت میں داعیہ اہتمام

بدعت کا لفظ سنت کے مقابلہ میں ہے جس طرح سنت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تک مسلسل پہنچتی ہے بدعت اس سے پہچانی جاتی ہے کہ اس میں تسلسل نہیں ہوتا اہل بدعت سے جب کسی عمل پر اس کے تسلسل کا حوالہ پوچھا جاتا ہے تو وہ یہ کہہ کر جان چھڑاتے ہیں کہ اس میں حرج کیا ہے؟ اہل بدعت کا نظریہ یہ ہے کہ اعمال اسلام میں تسلسل ضروری نہیں اسلام میں نئے طریقے داخل کرنے کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔

مولانا احمد رضا خان نے فتاوے افریقہ ص۱۴۲ میں تصریح کی ہے کہ راہ احداث کشادہ ہے ظاہر ہے کہ وہ بزرگ جو مسلسل اسلام پر رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی وہ مسلسل اسلام کی تعلیم دینے کے حامی ہیں وہ مولانا احمد رضا خان کا ساتھ نہ دے سکتے تھے انہیں سنت اسلام ہر مصلحت سے زیادہ پیاری تھی۔

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ بتلاتی ہے کہ یہ حضرات اسلام کی سنت قائمہ کے حامی اور بدعت سے بہت دور تھے۔ اور وہ اپنے کسی عمل کو جو شاہراہ مسلسل سے نہ آئے وہ اسلام کا نام دینے کے لیے تیار نہ تھے پس ردِ بدعت میں ان حضرات کا موقف اسلام کی سنت قائمہ سے وفاداری تھی اہل السنۃ والجماعۃ وہ حضرات ہیں جو اسلام کی سنت قائمہ سے وابستہ اور جماعت صحابہؓ کے نقش پا سے دین کی راہیں تلاش کرنے والے ہوں اور احداث کشادہ کر بدعت کا دروازہ کھلا ہے، کہہ کر بدعت کو فروغ نہ دیں۔ بدعت کا دروازہ کھلا رکھنے سے تفریق بین المسلمین لازمی ہوگی کیونکہ بدعات ہر ایک گروہ کی اپنی اپنی ہوں گی یہ فقط سنت ہے جو تمام مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو سکتی ہے اور ملت واحدہ بنا کر رکھ سکتی ہے۔ پس بدعت کے رد میں مذکور الصدر حضرات کا اہتمام کوئی منفی داعیہ نہ تھا بلکہ اسلام کی شاہراہ سے مخلصانہ عقیدت تھی۔

عصری تقاضوں میں احساس ذمہ داری

علم و تحقیق اور تزکیہ و تدریس تک ہی نہیں اکابر دیوبند نے نئے نئے پیش آمدہ حالات میں ملت کی ہر قدم پر راہنمائی کی ہے۔ جس طرح فروعی مسائل میں ائمہ مجتہدین میں اختلاف ہوا اسی طرح خالصۃً سیاسی مسائل میں ہر دور میں نظریاتی اختلاف پایا گیا ہے برصغیر میں بھی یہ نظریاتی اختلاف پیدا ہوا اکابر دیوبند کا ایک وسیع گروہ اگر کانگریس کے ساتھ اتحاد و اشتراک کو ملک و ملت کیلئے مفید خیال کرتا تھا تو دوسرا وسیع گروہ مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم اور کانگریس سے عدم اشتراک و اتحاد کا مؤید تھا پہلے گروہ کے قائد حضرت مولانا

سید حسین احمد مدنی اور دوسرے کے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تھے اور دونوں گروہوں کا یہ اختلاف علی بروایت تھا اور ہر ایک کے پاس اپنے موقف کے لیے دلائل تھے ۔ کتنا تاریخی حقائق کا منہ چڑانا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے تمام خدام یا متعلقین کانگریس کے موید تھے ۔ دارالعلوم دیوبند کے سرپرست حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے کانگریس کے خلاف مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کی علی الاعلان حمایت کی اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کے لیے اور بہتر قرار دیا شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے پاکستان کی نہ صرف پرزور حمایت کی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ قائد اعظم کے بعد تصور پاکستان کے خاکہ میں رنگ بھرنے کا سب سے موثر عمل حضرت علامہ ہی کا تھا تو بیجا نہ ہوگا ۔ آپ نے قرار داد پاکستان میں بیان جاری فرمائے ۔ جمعیت علمائے اسلام کی بنیاد رکھی ، مضامین لکھے ، پرزور تقاریر کیں ۔ پیرانہ سالی میں ہمت کو جوان کرکے قائد اعظم کا پورا پورا ساتھ دیا ۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی فضائیں پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھیں ۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی سحر آفرین خطابت کا جواب مسلم لیگ کے پاس شیخ الاسلام کی وجد آفرین زبان تھی ۔ اور ، سابق صوبہ سرحد اور سلہٹ (مشرقی پاکستان) کا ریفرنڈم تو شیخ الاسلام نے جیتا تھا ۔ حضرت علامہ پاکستان کی حمایت میں نہ نکلتے تو آج یہ علاقے بھی ہندوستان کے پاس ہوتے ۔ صوبہ سرحد اور سلہٹ کی پاکستان میں شمولیت محدث دیوبند کا پاکستان پر احسان عظیم ہے ۔ حلقہ دیوبند سے حضرت علامہ ہی پاکستان کی حمایت میں نہیں نکلے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی ، مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی ، حکیم الامت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن اور حکیم الامت کے دوسرے سب خلفاء پاکستان کے حامی تھے ۔ دارالعلوم دیوبند کے چار بڑے عہدیداروں (سرپرست ، صدر مہتمم ، صدر مدرس ، مہتمم) میں سے تین مسلم لیگ کے ہم خیال تھے ۔ سرپرست حکیم الامت حضرت تھانوی تھے ۔ صدر مہتمم شیخ الاسلام حضرت شبیر احمد عثمانی تھے اور مہتمم حکیم الاسلام قاری محمد طیب دامت برکاتہم تھے صدر مدرس شیخ الحدیث حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کانگریس میں تھے ۔

ہمیں ان دوستوں پر بہت افسوس ہے جو پاکستان کی مخالفت میں تو دیوبند کا ذکر کرتے ہیں لیکن پاکستان کی حمایت میں اکابر دیوبند کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا جاتا حالانکہ ان اکابر کی خدمات کے بغیر پاکستان کی تعمیر کسی طرح ممکن نہ تھی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کا اختلاف بھی مسلمانوں کے سودے پر نہیں دیانت پر مبنی تھا ۔ انکا خیال تھا کہ مسلمان وہ قوت ایمان اور ہمت عمل رکھتے ہیں کہ متحدہ ہندوستان میں کبھی مغلوب نہ رہیں گے ایک تہائی کے قریب تعداد اتنی بڑی اقلیت ہے کہ اگر یہ خدا کے ہوکر رہیں اور محمد بن قاسم ، سلطان محمود غزنوی وغیرہم حضرات کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرلیں تو ہندو اکثریت انکا کچھ نہ بگاڑ سکے گی اور اگر ایمانی جذبہ مفقود رہا ، بے عملی و الحاد نے راہ پکڑ لی تو پھر ایک علیحدہ ملک لے کر بھی ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا ۔ حضرت مولانا مدنی مسلمانوں کو اپنے آئینہ میں دیکھتے تھے مگر حضرت تھانوی انہیں حالات کے آئینہ میں اور ان کی عملی کوتاہیوں کو دیکھ رہے تھے بہرحال

۔ سے انکار نہیں کہ حضرت مدنیؒ کا اختلاف کسی غرض پر نہیں دیانت و خلوص پر مبنی تھا چنانچہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے مسلم لیگ کے جلسے میں فرمایا کہ مجھے مولانا حسین احمد مدنیؒ سے پورا سیاسی اختلاف ہے مگر مجھے ان کی دیانت پر کبھی آج تک کے لیے بھی شبہ نہیں ہوا۔ واقعی جیسے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں یہ حقیقت ہے کہ دیوبند کے ایک حصے میں اگر کانگریس کی حمایت تھی تو دوسرا حلقہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں کھلم کھلا مسلم لیگ کے ساتھ تھا۔ اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے تمام خلفا بھی پاکستان کے حامی تھے۔

اس تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جو لوگ پاکستان کی مخالفت میں حضرت مولانا مدنیؒ کے اسم گرامی کو اچھالتے ہیں لیکن پاکستان کی حمایت میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی کوششوں کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔ انہیں اصولاً اس وقت کے سیاسی تنازعات سے دلچسپی نہیں بلکہ علماء کے خلاف ایک اندرونی بغض ہے جس کو یہ لوگ وقتاً فوقتاً اگلتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کو ایسے بے جا طرز فکر سے محتاط رہنا چاہیے۔ علمائے دین کے خلاف اس قسم کے خیالات دین سے بیزاری کا ایک نیا عنوان ہے۔

قرارداد مقاصد

پاکستان بننے کے بعد شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے مسلمانوں سے کئے گئے اس وعدے کو پورا کیا کہ پاکستان کا دستور قرآن و سنت پر مبنی ہوگا اور پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے قرارداد مقاصد پاس کرائی جس میں اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ پاکستان ایک اسلامی سلطنت ہوگا اور اس کے قوانین شریعت اسلامیہ پر مبنی ہوں گے۔ شیخ الاسلامؒ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور بڑی محنت سے قرارداد مقاصد پاس کرائی مگر افسوس کہ مولانا کی وفات کے بعد ملکی قیادت کے معدودے چند نے اس قرارداد کو بھی ایک یادگار ماضی بنا کر رکھ دیا حالانکہ یہ قرارداد پاکستان کی روح تھی اور اسی مقصد کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔

تعلیماتِ اسلامی بورڈ اور شریعت کی قانونی دفعات

خان لیاقت علی خان مرحوم نے شیخ الاسلام کے ارشاد کے مطابق تعلیمات اسلامیہ کا ایک بورڈ قائم کیا جو شریعت کی روشنی میں پاکستان کی قانون سازی کرے اور پھر یہ سفارشات دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوں۔ بعض اعیان حکومت کا خیال تھا کہ علمائے اسلام وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلامی قانونی جزئیات مرتب نہ کر سکیں گے اور روایات کے اختلاف میں الجھ کر رہ جائیں گے مگر علمائے دیوبند نے وقت کے اس چیلنج کو بھی قبول کر لیا اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حضرت علامہ سید محمد سلیمان ندویؒ خلیفہ خاص حضرت حکیم الامت تھانویؒ جو اس بورڈ کے ممبران میں سے تھے۔ انہوں نے اس بیدار مغزی، روشن خیالی اور وسعت نظر سے اسلام کی قانونی جزئیات مرتب کیں کہ حکمران طبقے کے لیے اعتراض کا کوئی موقع نہ رہا سوائے اس کے کہ وہ قانونی مسودات کو سرخ فیتے سے باندھ رکھیں اور دستور ساز اسمبلی تک پہنچنے ہی نہ دیں ہمیں اس وقت اس کی علت و غایت سے بحث نہیں۔ ہمیں صرف یہ بتلانا ہے کہ علمائے دیوبند نے وقت کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ہر مرحلے پر مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اکابر علمائے اسلام نئے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کی بھی

پوری صلاحیت رکھتے ہیں بشرطیکہ وہ اجتہاد آزاد نہ ہو۔ پچھلے مجتہدین کرام کے بیان کردہ اصولوں کے ماتحت ہو اور اس کا مقصد بھی نئے مسائل کا حل ہو پہلے فیصلوں کی تردید و تنقیص نہ ہو۔ اس قسم کے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔ نئے اجتہاد کا مطلب پچھلے مجتہدین کی تغلیط نہیں۔ پچھلے ذخیرۂ اجتہاد پر ایک ضروری اضافہ ہے۔ علمائے دیوبند نے اس قسم کے اجتہاد کو کبھی منع نہیں کیا۔ یہ ضروری ہے کہ اس کی اجازت انہی لوگوں کو ہو جو اس کے اہل ہوں اور پچھلے فقہاء و مجتہدین کے اصول و فروع پر پوری نظر رکھتے ہوں۔

اسلامی دستور مملکت کی مساعی

پاکستان ایک مسلم جمہوری مملکت ہے۔ یہاں ہر مکتبِ فکر کے مسلمان رہتے ہیں۔ ہر ایک کی فکر اور فقہ جدا ہے۔ شیعہ لوگوں میں اکثریت اثنا عشری فرقے کی ہے۔ اہلِ سنت کے بڑے بڑے گروہ دیوبندی اور بریلوی ہیں۔ اہل حدیث کے ہم خیال بھی کافی موجود ہیں۔ مولانا مودودی کے ہم مسلک بھی کچھ نہ کچھ پائے جاتے ہیں۔ ان تمام مکاتبِ فکر میں کوئی ایسا مکتب نہیں جس پہ دوسرے سب مکاتب جمع ہو جائیں۔ ہر ایک کے اپنے اصول ہیں اور اپنے مسائل ہیں۔ ان میں سے جو جماعت بھی نفاذِ شریعت کے لیے آگے بڑھے گی دوسری جماعتیں اسے اپنے مسلک کے لیے خطرہ سمجھیں گی۔ گو وہ جماعت دوسرے مکاتبِ فکر کو کتنا ہی یقین کیوں نہ دلائے کہ اسلامی قانون سازی کے وقت ہر مکتبِ فکر کی فقہ کا پورا احترام کیا جائے گا۔ یہ یقین دہانی اسی قسم کی ہوگی جیسے کانگریس مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو یقین دلاتی ہے کہ ہندوستان آزاد ہونے پر ہر طبقے کو اس کے حقوق پورے ملیں گے۔ لیکن مسلم لیگ نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ اقتدار پر قبضہ ہونے کے بعد مسلمان انہی کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ اسی طرح مسلمانوں کا ہر مکتبِ فکر نظامِ اسلامی کے قیام کی باگ کسی ایک مکتبِ فکر کے ہاتھ میں دینا اپنے لیے خطرناک سمجھتا ہے۔ مبادہ وہ لوگ اقتدار پر آکر ان کی فکر و فقہ کو نظرانداز کر دیں۔ جماعت اسلامی اگرچہ اپنے آپ کو تمام فرقوں سے بالا سمجھتی ہے اور گروہی تعصبات سے دور رہنے کا اعلان کرتی ہے، لیکن عملاً وہ مولانا مودودی کی مساعی سے ایک ایسا فرقہ بن چکی ہے جس کو ہر فرقے سے تھوڑا بہت اختلاف ہے۔ جماعت کی اپنے مقصد میں ناکامی کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کے ارکان اور متفقین وغیرہ زیادہ تر مولانا مودودی کا مسلک رکھتے ہیں مگر اسی ایک مکتبِ فکر کے ساتھ وہ تمام مکاتبِ فکر کی نمائندگی کرنا چاہتے ہیں۔ اور جب یہ بات سامنے آتی ہے تو مولانا مودودی کی یقین دہانی پھر وہی رنگ اختیار کرتی ہے جو کانگریس کے لیڈر اختیار کرتے تھے۔ ان حالات میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ پاکستان میں اسلامی دستورِ مملکت اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لیے یہاں کے بسنے والے تمام مکاتبِ فکر مشترکہ کمان سے نہ چلیں۔ جماعت اسلامی کے ارکان علیحدہ علیحدہ ہر مکتبِ فکر کے افراد کو اپنے ساتھ کھینچتے ہیں، لیکن ان کے مکاتبِ فکر کو ان کی نمائندہ حیثیت میں کبھی انہوں نے دعوت نہیں دی اور نہ انہوں نے دوسرے تمام مکاتبِ فکر کی کبھی کوئی مشترکہ میٹنگ بلائی ہے۔ نظامِ اسلامی کے نفاذ کے لیے وہ کسی مشترکہ قیادت کے قائل نہیں۔[1]

---

[1] امیرِ جماعت اس دور میں داعیِ اسلام کہلاتے ہیں، بلکہ انہوں نے خود بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ داعیِ اسلام بے چارہ کیا کرے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں
باقی صفحہ ۱۲۹ پر

علمائے دیوبند اس اصول ضرورت سے پوری طرح باخبر تھے۔ نظام اسلامی سے گریزاں کرنے والے مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو نظام اسلام کے نفاذ کا ایک بہانہ بنا رکھا ہے۔ علمائے دیوبند نے اس مغرب زدہ طبقہ کا چیلنج بھی قبول کیا اور کراچی میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کی ایک مشترکہ میٹنگ بلائی۔ جس میں دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث اور شیعہ تمام مکاتب فکر کے اکابر شامل ہوئے جنہوں نے اپنے مکتب فکر کی نمائندگی خود کی۔ اکتیس علماء کی یہ نمائندہ میٹنگ بلانے کا سہرا حضرت سید سلیمان ندوی اور حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی کے سر تھا۔ کافی بحث وتمحیص اور محنت و عرق ریزی کے بعد وہ مشترکہ دستوری خاکہ تیار ہوا۔ جس پر تمام مکاتب فکر متفق ہوگئے۔ یہ اکتیس علماء کا تاریخی فیصلہ کہلاتا ہے اور بارہا چھپ چکا ہے اور ان لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے کافی ہے جو فرقہ وارانہ اختلافات کی آڑ میں اسلامی نظام زندگی سے بھاگنا چاہتے ہیں علمائے دیوبند کا یہ تاریخی کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک مثال رہے گا۔ ہمیں اس وقت اس کی تفصیلات سے بحث نہیں۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان پاک و ہند میں مسلک دیوبند ہی ایسا معتدل مسلک رہا ہے جس کے علماء نے باہمی اختلافات کو کم کرنے اور مشترک ضروریات کے موقع پر مختلف مکاتب کو ملانے کی پوری مخلصانہ کوشش کی ہے۔

عائلی قوانین اور علمائے حق

عائلی اختلافات و مسائل پر حکومت پاکستان نے ایک عائلی کمیشن مقرر کیا جو یہ رپورٹ پیش کرے کہ عائلی قوانین کو کس طرح کتاب وسنت کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔ اس کمیشن میں مولانا احتشام الحق تھانوی بھی ایک رکن تھے، لیکن اس کے باقی اراکین مغرب زدہ تھے۔ انہوں نے اپنی جو رپورٹ مرتب کی اس میں عورتوں کے حقوق کی نگہداشت کے عنوان سے ایسی تجاویز پیش کی گئیں جو سراسر اسلامی تعلیمات کے منافی تھیں۔ مولانا احتشام الحق تھانوی نے اس پر اختلاف کیا اور اپنا ایک مفصل اختلافی نوٹ لکھا جو کتاب وسنت کی صحیح عکاسی کرتا تھا۔ خود اعیان حکومت میں اکثریت ایسے افراد کی تھی جو اسلام کے نام پر غیر اسلامی قانون کو نافذ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس اختلاف کو اہمیت نہ دی۔ عائلی سفارشات جو منظوری کے لیے گئی تھیں، لیکن ان کا نفاذ نہ ہوا تھا کہ مارشل لاء کا نفاذ ہوگیا۔ اور مارشل لاء کے سائے میں ان سفارشات کو ایک آرڈیننس کے ذریعہ قانون کی شکل دے دی گئی اور اس کی دفعات قوم کے سامنے آئیں تو معلوم ہوا کہ بعض امور میں صریحاً قرآن وسنت

بقیہ صفحہ ۱۲۸

نے اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مختلف فرقوں کو یکجا کرنے کے لیے آج تک کیا کیا۔ تحریری طور پر تو وہ سبق دیتے ہیں کہ دین است [illegible] کہ گویا کہ کہ میں کھڑا ہوا ہوں اور اسی نعرے کی بدولت شروع شروع میں ہندوستان کے بعض بڑے علماء نے اس آواز پر لبیک کہی اور کئی اکابر نے ان کی تحسین بھی کی جس کو آج بھی جماعت اسلامی اچھالتی ہے، لیکن علاوہ بعض اجتہادی مسائل اور بعض دوسرے امور میں پوری امت کے مجددوں پر تنقید کرکے اہل سنت والجماعت کے تمام فرقوں سے ایک علیحدہ فرقہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اسلامی نظام جو اصل مقصد ہے اس کے لیے تو وہ مشترکہ قیادت کے قائل نہیں لیکن [illegible] کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کی بھی قیادت قبول کرتے ہیں اور نوابزادہ نصراللہ خاں کی بھی۔ ع این چہ بوالعجبی است (ارشد)

کی مخالفت کی گئی ہے اور قرآن و پاک میں تحریف کر دی گئی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت مفتی محمد حسن صاحب مہتمم اکبر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تجویز و صدارت میں شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث تمام مکاتب فکر کا نمائندہ اجتماع جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد میں ہوا۔ اور باتفاق عائلی قوانین کو مداخلت فی الدین قرار دیا گیا۔ لیکن اس فیصلہ کی اشاعت کی اجازت نہ ملی۔ اسی طرح مولانا احمد علیؒ کی صدارت میں اسی قسم کا فیصلہ ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں صدر محمد ایوب خاں مرحوم نے ملک کو نیا آئین دیا اور اس کے تحت انتخابات ہوئے۔ ہزارہ سے مولانا غلام غوث ہزاروی صوبائی اسمبلی کے ممبر اور ڈیرہ اسماعیل خاں سے مفتی محمود قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، صوبائی اسمبلی میں عائلی قوانین کے خلاف صدائے بازگشت سنی گئی۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے اس سلسلے میں ایک معرکۃ الآرا تقریر کی اور کہا کہ صوبائی اسمبلی ان قوانین کو مسترد کرنے کی سفارش کرے۔ ایک مرد مجاہد کی اس جرأت و بیباکی اور کتاب و سنت کی ترجمانی کا یہ اثر ہوا کہ سوائے چار پانچ ممبروں کے تمام ہاؤس نے مولانا کی تائید کی ——— اور عظیم اکثریت سے مولانا کی تجویز پاس ہوئی۔ اور یہ قرارداد ... مرکزی اسمبلی کو بھیج دی گئی، لیکن قومی اسمبلی میں اس کا جو حشر ہوا وہ ایک طویل دلگداز داستان ہے۔ جس کو علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں مختصر یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ ان الملوک — سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

ختم نبوت اور علمائے حق

اسلام اللہ کا آخری دین ...... قرآن پاک خدا کی آخری کتاب اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں۔ لیکن مملکت پاکستان میں موجودہ اس عقیدہ کے خلاف کام ہوتا رہا۔ ضرورت محسوس ہوئی کہ تحفظ ختم نبوت کے بارے میں ایک مؤثر تحریک چلائی جائے اور حکومت تک اپنے مطالبات پہنچائے جائیں۔ چنانچہ مولانا محمد علی جالندھری نے تمام مکاتب فکر کے تقریباً پانچ صد نمائندہ علمائے کرام کو دعوت دی اور برکت علی اسلامیہ ہال لاہور میں ایک عظیم تاریخی اجتماع ہوا اور طے ہوا کہ اس سلسلے میں آئینی اور قانونی طور پر اپنے مطالبات حکومت تک پہنچائے جائیں۔ ایک مجلس عمل ترتیب دی گئی جس کے صدر مولانا ابوالحسنات قادری خطیب جامع مسجد وزیر خاں مقرر ہوئے۔ تحریک پُرامن طریق سے چل رہی تھی کہ مجلس عمل کے تمام ارکان کو کراچی میں گرفتار کر لیا گیا۔ تحریک اتنی ہمہ گیر اور وسیع ہو چلی تھی کہ مغربی پاکستان کے نوے فیصد عوام و خواص اس کے ساتھ تھے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب محمد ممتاز دولتانہ سے بھی ہمنوائی کی۔ امید تھی کہ اس عوامی اور اسلامی تحریک کے دور رس نتائج برآمد ہوں گے، لیکن مجلس عمل کی گرفتاری سے مت میں آگ لگ گئی۔ اور تحریک جذبات کی نذر ہو گئی۔ اس کے بعد ملک میں جو حالات پیدا ہوئے اور لاہور میں مارشل لا لگا وہ اس کی تمام تر ذمہ داری حکومت کی غلط پالیسی اور مجلس عمل کے ارکان کی گرفتاری کا ردعمل تھی۔ عرض کرنا یہ مقصود ہے کہ علمائے حق نے یہاں بھی ملت اسلامیہ کے ایک اہم بنیادی مسئلہ کی حفاظت کے لیے پوری اُمت کو ایک سٹیج پر اکٹھا کیا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ مختلف فرقے آپس میں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ وہ حقائق سے چشم پوشی کرتے اور اپنے مخصوص مفادات و نظریات کے

پہلے کی مانند جذبہ سے خدا بھگتی کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ تحریک وقتی طور پر دب گئی تھی۔ لیکن اس کی بنیادوں میں خلوص اور اخلاص
دامن و خون تھا۔ شہیدوں کا خون ہمیشہ رنگ لاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۷۴ء میں یہ تحریک حضرت مولانا یوسف بنوری کی قیادت میں کامیاب
ہوئی۔ ہوگئی اور مرزائی قانون کی نظر میں باقاعدہ غیر مسلم اقلیت قرار پائے۔

اس مختصر تحریر میں ان خدمات کی تفصیل کا احاطہ ممکن نہیں کیا جا سکتا جو ان علمائے حق نے برصغیر پاک و ہند میں ملت اسلامیہ
کی ادا کرتے ہوئے سر انجام دیں۔ اس کام کی قدرے تفصیل "بیس بڑے مسلمان" میں آپ کو ملے گی۔ یہ کتاب بیس علمائے حق
کے تاریخ حیات ہے۔ جس میں ذی علم اور فاضل حضرات کے قلم سے ان اکابر کے سیرتی خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ
ان اہل حق کی پاکیزہ داستان ہے جو ایک صدی کے قریب اپنے اپنے دائرہ عمل میں حق کا نشان بنے رہے۔ اس
داستان کی تحریک تجویز اور ترتیب عزیز محترم مولانا حافظ عبدالرشید ارشد فاضل خیر المدارس نے کی ہے۔ جو اس پاکیزہ کوشش
پر ترتیب کے مستحق ہیں۔ رب العزت عزیز موصوف کی اس کوشش کو اسی طرح حیات دوام بخشیں جس طرح انہوں نے اپنے
اسلاف کی خدمات کو زندہ رکھنے کی یہ گراں بہا کوشش کی ہے ؎

نام نیک رفتگاں ضائع مکن　　　　تا بماند نام نیکت برقرار

راقم الحروف اپنی علمی بے بضاعتی اور ذاتی کمزوریوں کی وجہ سے اس لائق نہ تھا کہ ان پاکباز و پاک نہاد اکابر کی
تاریخ پر کچھ سطور لکھے لیکن مولانا موصوف کے اصرار اور گزشتہ کئی سال کی مودت نے مجبور کرکے یہ چند سطور لکھوا دی ہیں
میں سمجھتا ہوں کہ ان سے ان بزرگوں کے تبحر، تقدس اور ان کی قربانیوں کا حق ادا نہیں ہو سکا۔ لیکن اس انتساب سے یہ
تو امید ہو گئی ہے کہ رب العزت ان کی محبت کا صدقہ ان کے ساتھ حشر فرمائے ؎

أحب الصالحين ولست منهم　　　　لعل الله يرزقني صلاحا

یہ سطور اپنے وطن سے ہزاروں میل دور انگلستان میں جہاں کوئی مطلوب کتاب پاس نہیں مسافرت کی حالت میں لکھی
گئی ہیں کوئی کمزوری رہ گئی ہو یا کوئی ضروری بات نہ آ سکی ہو تو دوستوں سے معذرت اور چشم پوشی کا خواستگار ہوں۔

خالد محمود حال مقیم برمنگھم

مکتوب گرامی حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ العالی

احقر نے حضرت کی خدمت میں مضمون کے لیے عرض کیا۔ حضرت نے اس کے جواب میں یہ مکتوب ارسال فرمایا :- ارشد

مکرم و محترم عزیز مضلکم - بعد سلام مسنون ۔ آج کی ڈاک سے گرامی نامہ اور دارالعلوم
کے اشتہار پہنچے - مختصر اشتہار تو دارالرشید کے ٹائیٹل پر پہلے بھی سن چکا تھا مگر جو تفصیل آج
کے اشتہار سے معلوم ہوئی یہ پہلے نہیں سنی تھی - بہت ہی طبیعت خوش ہوئی - اللہ تعالیٰ
بہت مبارک فرمائے - یہ ناکارہ دعا کرتا ہے اللہ جل شانہ جلد از جلد اس کی تکمیل فرما کر بزرگوں کو
زیادہ سے زیادہ متمتع فرمائے - اس ناکارہ کو اپنے بزرگوں کے حالات پڑھنے کا بہت
بچپن سے شوق عشق کے درجہ تک پہنچا ہوا ہے - اکابر کی جو بھی سوانح چھپی میں نے اس کو
ایک رات یا دو رات میں پوری پڑھی - جب تندرستی تھی اور صحت تھی - اب جب سے معذور
ہو گیا ہوں اشتیاق تو بدستور ہے مگر سننے میں دیر لگتی ہے - سب سے پہلے تو اپنا نام مجوزہ
کتاب کے خریداروں میں درج کرتا ہوں - یہاں سے پیسے بھیجنا تو مشکل ہے مگر عنقریب جناب
تک پہنچ جائیں گے - تیاری کے بعد ہدیۃً ڈاک تو ہرگز نہ بھیجیں کہ ڈاک میں بالعموم رسائل
بہت ضائع ہوتے ہیں - رسالہ پر میرا نام لکھ کر عزیز مولوی احسان الحق راشد یا حضرت مولانا
محمد یوسف صاحب بنوری کے صاحبزادے عزیز محمد بنوری کو کراچی بھیج دیں -

اس کے بعد آپ نے گرامی نامہ میں کچھ لکھنے کو تحریر فرمایا - اس ناکارہ کو اس قسم کے مضامین لکھنے کی
کبھی عادت نہیں ہوئی - میرے حضرت اور حضرت تھانوی، حضرت مدنی، خود حضرت رائے پوری
چچا جان عزیز یوسف کے انتقال پر بہت سے احباب کے تقاضے آئے کہ میں کچھ لکھ بھیجوں مگر میں یہی
معذرت کرتا رہا کہ مجھے اس قسم کے مضامین لکھنے کی عادت نہیں نہ مناسبت ہے - لوگ اصرار
کرتے ہیں کہ تیرا تعلق ان سب حضرات سے بہت خصوصی رہا میں کچھ بتا کر یہ تو صحیح ہے
اور واقعات بھی بہت یاد ہیں مگر تذکرہ میں واقعات یاد آتے رہتے ہیں مسلسل لکھنے کی عادت
نہیں - آپ نے دو باتیں خاص طور سے معلوم کیں، مدرسہ مظاہر علوم، دارالعلوم کے اوائل کے واقعات
تو بہت ذہن میں آتے رہے اور رات نیند بھی ان ہی خیالات میں نہیں آئی جس سے آج بخار
بھی ہو گیا مگر پھر وہی بات کہ مرتب تو لکھوانے کی عادت نہیں بات میں بات یاد آتی رہتی ہے
یہ تو سب کو معلوم ہے کہ دہلی کا علمی چمن اجڑ جانے کے بعد سب اکابر کے ذہنوں میں کثرت سے مدارس
قائم کرنے کا خیال بیک وقت موجزن ہوا اور یکے بعد دیگرے بہت سے مدارس قائم ہوئے - محرم الحرام
۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند اور اسی سال رجب میں مظاہر علوم سہارنپور کی ابتداء ہوئی اس کی
تفصیلات تو اس ناکارہ کے رسالہ تاریخ مظاہر حصہ اول میں گزر چکی ہیں - اس میں سے کوئی

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ دیوبندی، مولانا ذوالفقار علی صاحب کے انتقال کے بعد حضرت شیخ الہند ہی
سرپرست بنے اور فوراً ہی رہے۔ اس زمانے میں دارالعلوم دیوبند بھی انتشار کا مرکز
بنا ہوا تھا جس کو میرے رسالے کے صفحہ ۹ پر دارالعلوم اور مظاہر علوم کی باہم آویزش کے عنوان سے
حضرت شیخ الاسلام کی تحریر درج ہے۔ حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہ سے چونکہ مولانا احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند
وغیرہ سے بڑی قرابت بھی تھی اس لئے تقریبات میں آمد و رفت بھی کثرت سے رہتی —
حضرت مولانا احمد صاحب کے اہتمام میں حضرت سہارنپوری کو بھی دخل ہے جیسا کہ تذکرۃ الخلیل
میں ہے کہ مولانا احمد صاحب کے اہتمام کی تحریک سے پہلے حضرت گنگوہی کی خدمت میں میں
نے ہی [illegible] بار بار یاد دہانی بھی کرتا رہا۔ اگر صحت اجازت دیتی تو تھوڑی تفصیلات
لکھتا اب تو آپ کا جی چاہے تو ان حوالوں سے دیکھ لیجئے۔ سنہ ۱۳۲۳ھ کے بعد سے دونوں مدرسہ
کے طلباء میں کچھ تنافس پیدا ہوا اور ایک مدرسہ کو دوسرے پر ترجیحات میں گفتگوئیں ہوتی
رہتیں۔ مگر اس کا اثر اکابر تک نہیں پہنچا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب نور اللہ مرقدہ نے
عزیز مولوی طاہر مرحوم برادر خورد حکیم الاسلام قاری طیب صاحب کو مظاہر علوم میں پڑھنے کیلئے
بھیجا اور اس ناکارہ کو خاص طور سے نگراں بنایا۔ میرا وہ زمانہ حماقتوں اور الشباب شعبۃ
من الجنون کا تھا۔ میں طلبہ پر زبانی نکیر کے بجائے ہاتھ سے نکیر کیا کرتا تھا۔ خاص طور سے صاحبزادوں
پر جس میں میرے حضرت نور اللہ مرقدہ حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب ناظم مدرسہ حضرت مولانا
عبد الرحمن صاحب صدر مدرس کے اعزہ و اقارب زیادہ شکار رہتے تھے۔ عزیز مولوی طاہر مرحوم
میری دست درازی کا تحمل نہ کر سکے اور بیمار ہو گئے۔ آب و ہوا کی عدم موافقت کی وجہ سے
مولانا حبیب الرحمن صاحب کو شکایت اس لئے مولانا نے ان کو بلا لیا۔ میری دست درازی میں
حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب اور قاری سعید صاحب کو زیادہ دخل تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ
ان خوردوں اور بڑوں کے بچوں کی نگرانی ہمارے بس کی تو ہے نہیں تو اس پر قادر ہے اور
تیرے ہاتھ پاؤں سے تجھ سے باز پرس ہوگی۔ ان کی یہ تقریر مجھے اور تشدد پر برانگیختہ کرتی رہتی۔
بہرحال تنافس کا زمانہ چند سال تک چھوٹوں میں رہا۔ لیکن حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمہ اللہ
کی صدر مدرسی کے بعد حضرت کی کثرت سے آمد و رفت نے اس چیز کو بالکل ہی زائل کر دیا —
حضرت قدس سرہ کے بعد مولانا فخر الدین صاحب نور اللہ مرقدہ بھی اکثر تشریف لاتے رہتے تھے
اور رمضان کے دو چار دن بھی خاص طور سے سہارنپور گزارتے تھے۔ نیز مولانا اعزاز علی صاحب
بھی اپنے زمانہ میں تقریباً ہر جمعہ کو تشریف لاتے رہتے تھے۔ حضرت حکیم الاسلام قاری طیب صاحب
زاد مجدہم بھی اپنی شفقتوں میں اپنے اکابر کے قدم بہ قدم ہیں۔ ان سب امور نے اس
تنافس کا سلسلہ جو دارالعلوم مظاہر علوم میں چند سال تک رہا بالکل نسیاً منسیاً کر دیا۔ اب

عام یا خاص ادبی نہیں جا سکتا تھا۔ ایسے علاوہ صاحب نور اللہ مرقدہ کی بعض صاحبوں نے شکایت
کر دی اور تو یہی حضرت سہارنپوری اور حضرت رائے پوری تک پہنچا دی تھیں۔ میں نے عرض کیا تھا
کہ کیا یہ حضرات ان شکایات پر کچھ غور کر سکتے ہیں؟ ایسے والد صاحب نے خوب یاد ہے کہ ندوہ
سے ملوانا پڑا کہ وہ ایسی تھوڑی ہی ہیں کہ جس کے واسطے ان میں جو لی طلب شوریٰ ہوتی
اور حضرت شیخ الہند اور مولانا احمد صاحب گنگوہی سے کیا تعلق۔ یہ حضرات تو جانے کہاں کہاں
کی پرواز کر رہے ہیں۔ اس کا دوران میں حضرت شیخ الہند رح کی غیبت میں بعض حضرات
دیوبندیوں کی تحریک کے سرپرست قرار پائے تھے جو اسد میں معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند اور حضرت
سہارنپوری نور اللہ مرقدہ کا مدرسہ ایک ہی جگہ تھا) اور حصہ تین وغیرہ اکٹھی ہوتی رہتی
حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ کی حیات میں سخت جاں حصہ پاکر حضرت مولانا اور حضرت سہارنپوری والا قصہ
نقل کرنا ایسی اس لئے ہے کہ [illegible] حضرت نور اللہ مرقدہ کی دونوں کی سخت مشغول اور
اس کے بعد حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ کی طویل بیماری (جو وصال پر منتج ہوئی) نے نوبت نہ آنے دی

نہ جانے تھے کہ اس جان جہاں سے یوں جدا ہوں گے
یہ سمجھے گو چلے آئے تھے اک دن جان بے جانی

(۱۰) آپ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشق و محبت کا سوال کیا۔ یہ چیز تو بہت طویل ہے
لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین۔ جب عام مومنین
کے لئے یہ ہے تو محبت نبی سلوک کا کیا پوچھنا۔ حضرت نانوتوی رح کے قصائد تو قصائد قاسمی میں
ملاحظہ فرمائیں۔ حضرت شیخ الہند اور حضرت سہارنپوری کے دو ایک قصے لکھوا دیتا ہوں ———
حضرت شیخ الہند کا معمول وتروں کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنے کا تھا کسی نے عرض کیا کہ حضرت بیٹھ کر
پڑھنے کا تو آدھا ثواب ہے تو حضرت نے فرمایا ہاں بھائی یہ تو معلوم ہے مگر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم سے بیٹھ کر پڑھنا حدیث میں آیا ہے۔

اور بذل المجہود لکھوانے کے وقت جب حدیث النفل شروع کی جو مصحف عثمانی کی ترتیب کے خلاف ہے
تو حضرت نور اللہ مرقدہ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ ایک پرچہ پر اس حدیث کو نقل کر دیجیو ہم رات
کو تہجد میں پڑھیں گے۔ پوری حدیث بذل جلد ۲ باب تحزیب القرآن میں ہے۔

آپ کی طرف سے روضہ اقدس پر صلوٰۃ و سلام میں نے حاضری میں پیش کر دیا اور احباب سے بھی تاکید
کر دی۔ اور پیش کرتا رہتا ہوں۔ آپ کے لئے آپ کے مقاصد کے لئے دل سے دعا کرتا رہتا ہوں۔ والسلام

الرشید زیر ادارت مولانا حبیب اللہ (ابن حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ) فاضل دیوبند، چونکہ اپنے رسالہ **الرشید** کا دارالعلوم دیوبند نمبر نکال رہے ہیں اور اس ناکارہ سے فرمائش فرمائی کہ میں دارالعلوم کے سلسلے میں کوئی مضمون پیش کروں۔ اس لیے دارالعلوم کے بارے میں حسب ذیل چند سطور پیش ہیں:

دارالعلوم دیوبند کا اجرا عام مروجہ طریقے پر نہیں ہوا کہ چند افراد نے جمع ہو کر مشورہ کیا ہو کہ ایک مدرسہ قائم کیا جائے اور مجموعی رائے سے مدرسہ دیوبند قائم کر دیا گیا ہو بلکہ یہ مدرسہ بالالہام غیب قائم کیا گیا ہے۔ وقت کے اہل اللہ اور ارباب قلوب افراد کے قلوب پر یکدم وارد ہوا کہ اس وقت ہندوستان میں جب کہ انگریزی اقتدار مسلط ہو چکا ہے اور اس کے تحت ان کا تمدن اور ان کے افکار و نظریات طبعاً اس ملک پر مسلط ہونے والے ہیں جو یقیناً اسلام کے منافی اور نصرانیت کے فروغ کا باعث ہونگے اور ممکن ہے کہ اُن کے نفسانی تمدن کے زیر اثر اسلامی معاشرت بلکہ نفس دین و مذہب ہی سے قلوب میں بیگانگی پیدا ہو جائے (جو کچھ ہی عرصہ کے بعد اُن کی فراست ایمانی کے مطابق یہ خطرہ واقعہ بن کر نمایاں ہونے لگا) ایک دینی مدرسہ قائم کیا جائے، جو مسلمانوں کو اس سیلاب کے بہاؤ سے بچا سکے — چنانچہ ہر ایک نے اپنے واردات کو ایک مجلس میں جمع ہو کر ظاہر کیا؛ کسی نے کہا کہ مجھ پر منکشف ہوا ہے کہ ان حالات میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا جائے، جو کم سے کم مسلمانوں کے دین کو محفوظ رکھ سکے کسی نے کہا کہ میرے قلب پر بھی یہی وارد ہوا ہے، کسی نے کہا کہ مجھے خواب میں یہی حقیقت دکھلائی گئی ہے۔ غرض قدرتی طور پر ایک باطنی اجماع اس پر منعقد ہو گیا کہ ایک دینی مدرسہ قائم کیا جائے تاکہ اس ملک میں مسلمانوں کا دین محفوظ ہو جائے، گو اُن کی اسلامی شوکت پامال ہو چکی ہے، لیکن اگر دین اور دینی جذبات محفوظ ہو جائیں گے، تو ایسا وقت آنا بھی ممکن ہے کہ وہ ان دینی جذبات و دماغی سے رہتی دنیا کو بھی سنوار

لیں، یہ تھے، وہ الہاماتِ غیب جن کے تحت ۱۰ محرم ۱۲۸۳ھ بمطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء میں اس ادارے کا آغاز کیا گیا، اس لیے یہ مدرسہ کسی رسمی مشورہ و مفاہمت سے قائم نہیں ہوا، بلکہ باشاراتِ غیب وقوع پذیر ہوا۔ حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے اُن روشن ضمیر رفقاء کے ساتھ اجراءِ مدرسہ پر مستعد ہوئے اور مُلا محمود صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ جو میرٹھ میں مدرس تھے، میرٹھ ہی میں بُلا کر فرمایا کہ آپ کو یہاں دس روپے ماہوار تنخواہ مل رہی ہے، آپ اپنے وطن دیوبند تشریف لے چلیں، وہاں مدرسہ قائم ہو رہا ہے اور وہیں درس و تدریس شروع فرمائیں، آپ کی تنخواہ بھی پندرہ روپے ماہوار ہوگی، مُلا صاحب جب ہی تشریف لے آئے اور مسجد چھتہ میں جو دارالعلوم سے متصل اور اب دارالعلوم ہی کے زیرِ انتظام ہے، مُلا محمود صاحب نے صرف ایک شاگرد مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند) کو سامنے بٹھلا کر مدرسہ دیوبند کا آغاز کر دیا۔ بعد میں اجراءِ مدرسہ کا اعلان ہوا اور بتدریج ایک سے دو اور دو سے دس پانچ تک طلبہ کی تعداد بڑھنی شروع ہو گئی، پھر حضرت نانوتویؒ نے اس مدرسہ کو بلکہ اس جیسے تمام مدارس کے لیے آٹھ اصول وضع فرمائے اور ان پر عنوان یہ رکھا کہ "وہ اصول جن پر مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں" مولانا محمد علی جوہر مرحوم جب تحریکِ خلافت کے موقع پر دیوبند تشریف لائے، دارالعلوم میں پہنچے اور یہ اصولِ ہشتگانہ حضرت ہی کے قلم سے لکھے ہوئے ان کے سامنے پیش کیے گئے (جو بجنسہٖ خزانۂ دارالعلوم میں حضرت ہی کی قلمی تحریر کے ساتھ محفوظ ہیں) تو مولانا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا: "ان اصول کا عقل سے کیا تعلق؟ یہ تو خزانۂ غیب اور مخزنِ معرفت سے نکلے ہوئے ہیں، حیرت ہے کہ جن نتائج تک ہم سو برس میں دھکے کھا کر پہنچے ہیں، یہ بزرگ سو برس پہلے ہی ان نتائج تک پہنچ چکے تھے۔" اس شہادت اور ہم خدامِ دارالعلوم کے یقین کی گواہی سے صاف ظاہر ہے کہ اس مدرسہ کے اصول بھی الہامی ہیں، کسی رسمی مشورہ و مفاہمت کا نتیجہ نہیں، اجراءِ مدرسہ کے بعد یہ مدرسہ مختلف مسجدوں اور پھر کرایہ کے مکانات میں چلتا رہا۔ سات آٹھ برس کے بعد جب طلبا کی کثرت ہوئی اور رجوعِ عام ہوا تو ضرورت پیش آئی کہ مدرسے کا کوئی اپنا مستقل مکان ہونا چاہیے، اور جگہ اور اس کے حصے جہاں آج دارالعلوم کی وسیع عمارات کھڑی ہوئی ہیں تحریک و ترغیب کے بعد مدرسے کے لیے دینے شروع کیے، بعض نے قیمتہً اور بعض نے حسبۃً للہ، جس سے ایک بڑا قطعہ مدرسے کے ہاتھ آ گیا۔ یہ جگہ عموماً شہر کا میلا پڑنے اور کوڑا پڑنے کی جگہ تھی۔ دارالعلوم کے قیام سے تقریباً ایک صدی یا کم و بیش پہلے یہاں سے حضرت سید احمد شہید بریلوی مع اپنے رفقاءِ مجاہدین کے گزرے تو فرمایا کہ مجھے یہاں سے علم کی بو آتی ہے، جس کا ظہور ایک صدی کے بعد ہوا اور اسی گندی جگہ سے بالآخرہ ۱۸۰ء کے بعد علومِ نبوت کی اشاعت و ترویج شروع ہوئی، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دارالعلوم کی جگہ انتخاب بھی الہامی ہے، جو باشاراتِ غیب پہلے سے منتخب تھی اور آخر کار اسی جگہ پر ان اہل اللہ کا قرعۂ فال پڑا اور اس پر دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی۔

زمین مل جانے کے بعد جب حضرت مولانا رفیع الدین صاحب دیوبندی قدس سرہٗ مہتمم ثانی دارالعلوم دیوبند (جو نقشبندی خاندان کے اکابر میں سے تھے، صاحبِ کشف و واردات اور صاحبِ کرامات بزرگ تھے) کے زمانۂ اہتمام میں عمارتِ مدرسہ تجویز ہوئی اور اس کی پہلی بنیاد کھود کر تیار کی گئی اور وقت آگیا کہ اسے بھر لیا جائے اور اس پر عمارت اٹھائی جائے، تو مولانا علیہ الرحمۃ نے خواب دیکھا کہ اس زمین پر حضرت اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، عصا ہاتھ میں ہے، حضورؐ نے مولانا سے فرمایا: شمال کی جانب جو بنیاد کھودی گئی ہے، اس سے صحنِ مدرسہ چھوٹا اور تنگ رہ گیا اور آپؐ نے عصائے مبارک سے دس بیس گز شمال کی جانب ہٹ کر نشان لگایا کہ بنیاد یہاں ہونی چاہیے۔ تاکہ مدرسے کا صحن وسیع رہے، یہ جہاں تک اب صحن کی لمبائی ہے، مولانا علیہ الرحمۃ خواب دیکھنے کے بعد علی الصباح بنیاد کے معائنے کے لیے تشریف لے گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نشان لگایا ہوا اسی طرح بدستور موجود تھا تو مولانا نے پھر نہ ممبروں سے پوچھا، نہ کسی سے مشورہ کیا، اسی

داخلہ ہوتا ہے اور طلبہ آتے ہیں تو میں ہر ایک کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ بھی اُس مجمع میں تھا اور یہ بھی، لیکن اِس گستاخ طالبعلم پر میں نے سر سے پیر تک تین دفعہ نظر ڈالی، یہ اُس مجمع میں تھا ہی نہیں، اس لیے میں نے قوت سے کہدیا کہ یہ مدرسۂ دیوبند کا طالب علم نہیں ہے، اس سے اندازہ ہوا کہ اس مدرسے کے لیے طلبا کا انتخاب بھی منجانب اللہ ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں نہ اشتہار ہے، نہ پروپگنڈہ، اور نہ ترغیبی پمفلٹ کہیں جاتے ہیں کہ طلبہ آکر داخل ہوں، بلکہ من اللہ جس کے قلب میں داخلے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے، وہ خود ہی کشاں کشاں چلا آتا ہے۔

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم ثانی دارالعلوم کا مقولہ بزرگوں سے سُننے میں آیا کہ مدرسہ دیوبند کا اہتمام میں نہیں کرتا بلکہ حضرت نانوتویؒ کرتے ہیں، جو جو ان کے قلب پر وارد ہوتا ہے وُہ میرے قلب میں منعکس ہو جاتا ہے اور میں وُہی کام کر گزرتا ہوں، چنانچہ جب بھی مولانا کوئی غیر معمولی کام کرتے تھے، تو اگلے دن حضرت نانوتویؒ فرماتے کہ مولانا اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، کچھ عرصے سے یہی کام جو آپ نے انجام دیا ہے، میرے دِل میں آرہا تھا کہ ایسا ہونا چاہیئے جسے آپ نے عملاً انجام دے دیا، اس سے واضح ہے کہ اِس مدرسے کے اُمورِ مہتمم بھی اشاراتِ غیب اور الہامات ہی سے انجام پاتے تھے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ جہاں قوی النسبت اکابرین میں سے تھے، وہیں اُمّی محض تھے، نہ لکھنا جانتے تھے، نہ پڑھنا، امورِ متعلقہ مولانا کے ارشاد، احکامِ اہتمام قلمبند ہوتے تو مولانا اس پر اپنی مُہر لگا دیتے تھے، گویا احکامِ اہتمام بھی کچھ ماورای اسباب ہی قلمبند ہوتے تھے جس میں رسمی نوشت و خواند کا دخل نہ ہوتا تھا، حضرت کا اُمّی ہونا خود اس کی بھی دلیل ہے کہ اُن کے قلبی حضرات کسبی علم کے تابع نہ تھے، بلکہ قلبی واردات ہوتے تھے، جنھیں اشاراتِ غیب کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اوّلین صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کا مکاشفہ اپنے بزرگوں سے بارہا سُننے میں آیا۔ فرمایا کہ میں دارالعلوم کی اصلی درس گاہ نودرہ سے عرش تک نُور کا ایک مسلسل سلسلہ دیکھتا ہوں جس میں کہیں بھی بیچ میں فصل یا انقطاع نہیں، اور اس لیے بزرگوں کا بلکہ خود اپنا بھی تجربہ یہ ہے کہ مشکل سے مشکل مسئلہ جو بہت سے مطالعے سے بھی حل نہیں ہوتا، اس درس گاہ میں بیٹھ کر پڑھنے اور سوچنے سے حل ہو جاتا ہے اور اس میں شرحِ صدر نصیب ہو جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اس مدرسے کا فیضان بھی کچھ رسمی اسباب کے تابع نہیں بلکہ من اللہ قلوبِ طلبا و اساتذہ پر وارد ہوتا ہے اور ان میں علمی شرحِ صدر پیدا ہو جاتا ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا یہ بھی مکاشفہ ہے کہ درس گاہ نودرہ کے سامنے کے صحن میں درس گاہ کے ایک دو گز کے فاصلے پر اگر کسی جنازے کی نماز پڑھی جائے تو وُہ مغفور ہوتا ہے، اس لیے اس احقر نے اس جگہ کی تشخیص کے بعد اس پر سیمنٹ کا ایک چوکھٹا نشان بنا لیا ہے اور اس پر جنازہ رکھ کر خواہ شہری ہوں یا متعلقین مدرسہ ان کے جنازے کی نماز پڑھی جاتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جگہ کی مقبولیت صرف تعلیم تک اور صرف متعلقینِ مدرسہ تک محدود نہیں، بلکہ عوام بھی اس سے فیضیاب ہو رہے ہیں، خواہ وُہ اس مدرسہ کے تعلیم یافتہ ہوں یا نہ ہوں، ھم القوم لا یشقی جلیسھم پھر اس مدرسہ کے اساتذہ اور عہدیداروں میں بھی تکوینی طور پر ایسے ہی حضرات کا انتخاب ہوتا رہا ہے، جو صاحب نسبت اور صاحب دل ہی ہوتے رہے ہیں۔

بہرحال اس مدرسے کے ابتدائی تصور اس کی جگہ کا انتخاب، اس کا اجراء اس کا سنگ بنیاد، اس کے ذمہ داروں کا انتخاب اس کے طلبا کی تشخیص، طریق کار اور طریق اجراء احکام سب ہی کچھ اس عالم اسباب سے زیادہ عالمِ غیب سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے میں نے اس مدرسے کا لقب عنوان میں "الہامی مدرسہ" رکھا ہے۔

اس سے اندازہ کر لیا جائے کہ اس کے فضلاء و علماء جو سو برس میں

ہزاروں سے کم تیار نہیں ہوئے جنھوں نے اس ماحول میں تربیت پا کر علوم و اعمال کا اکتساب کیا۔ ان کا علم عام حالات میں محض درسی نہیں ہو سکتا، بلکہ اگر ذوقی ہو، اس میں معرفت اور گہرائی شامل ہی ہے۔

اور جو بھی دارالعلوم کا فاضل ہو حقیقتاً فاضل اور یہاں کے ذوق پر تربیت یافتہ ہے، وہ جہاں بھی ہے خواہ شہر ہو یا قصبہ اور دیہات عوام کے ایمانوں کی حفاظت کئے ہوئے ہے۔

ہزاروں فضلاء وہ ہیں کہ جن کا نہ نام کسی کو معلوم ہے، نہ اشتہار اور تشہیر کا سلسلہ ہے، مگر ایمان کا تحفظ خاموش طریقے پر ہو رہا ہے اور کوئی بھی دینی شعبہ ایسا نہیں جس کی وہ کم تمام میں وہ حسب استطاعت و قابلیت مصروف نہ ہوں، دارالعلوم کے فضلاء کا سلسلہ اور مرکز سے ان کی وابستگی کسی تنظیم یا ممبر سازی کے ساتھ نہیں ہے، مگر روحانی رشتہ ان ساری تنظیموں سے بالاتر اور مضبوط و مستحکم ہے اور الحمد للہ کامیاب و بار آور ہیں، تدریس و تصنیف، تربیت باطن، تعلیم مسائل، افتاء، املا کے تمام علمی سلسلے ان سے خاموش طریق پر انجام پا رہے ہیں اور عالم غیب کے دفاتر میں منضبط ہیں، جیسا کہ عالم غیب کے ہی اشاروں سے ان کی اور ان کے مرکز کی ابتداء ہوئی ہے۔

ظاہر ہے کہ کوئی بھی درسگاہ یا تربیت گاہ ایسی نہیں ہو سکتی کہ اس کے پروردہ سب کے سب ایک درجے کے ہوں، جب کہ قرآن حکیم نے عمومی طور پر یہ ارشاد بھی فرمایا ہے، والذین اوتوا العلم درجٰت، جنھیں علم سے سرفراز کیا گیا ہے، ان کے درجات اور مراتب متفاوت ہیں، اس لیے اس سلسلے کے علماء بھی مختلف المراتب ہیں اور ان کی طبعی خصوصیات اور ذوقی الوان بھی الگ الگ ہیں، لیکن قدر مشترک سب کا ایک اور نصب العین واحد ہے، اس سو سال میں ان کی خدمات حق تعالیٰ کے یہاں منضبط ہیں۔ اس لیے بعض سادہ لوح اور بر خود غلط لوگوں کی زبانوں پر آجاتا ہے، کہ اس طبقے کی کچھ خدمات نہیں، خدمت اگر کی ہے تو مثلاً ہم نے یا فلاں طبقے نے۔ لیکن ان کی خدمات کا انکار نہ کرتے ہوئے یہ عرض کیا جائیگا کہ فضلاء دارالعلوم کی خدمات میں شور و نمائش نہیں ہے اور یہی انکی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس لیے اگر شور و نمائش یا تشہیر ہی کسی خدمت کا معیار ہو تو یہ مقولے صحیح باور کئے جا سکتے ہیں کہ ان کی کچھ خدمات نہیں لیکن اگر کسی خدمت کی واقعیت کا معیار خدمت ہے جس میں تشہیر و نمائش کا دخل نہ ہو تو وقت پوچھتے ہیں کہ اس سو سالہ جماعت کی کیا خدمات ہیں؟ اگر کوئی ان کی خدمات کا اعتراف نہ کرے، تو انھوں نے یہ خدمت کسی کے اعتراف پر کی کب ہیں کہ وہ اس سے دلگیر ہوں جب کہ ان کا نصب العین ہی یہ رہا ہے کہ نیکی کر دریا میں ڈال کوئی نہیں دیکھتا تو وہ اپنی آخرت کے تصور اور حسن خاتمہ کو سامنے رکھ کر اس سے قطعاً بے پرواہ ہیں اور انھیں بے پرواہ ہی رہنا چاہیے کہ کوئی ان کی خدمت کو نہیں دیکھتا تو نہ دیکھے۔ اس سے ان کی خدمت پر کوئی داغ دھبّہ آ سکتا ہے، نہ خدمت گزاروں کے دل میں کوئی ادنیٰ میل

زبادشاہ و گدا فارغم بحمداللہ

گدائے خاک در دوست بادشاہ من است

اس مختصر فرصت میں یہی چند سطریں بعجلت ذہن میں آئیں جو الرشید کے لیے بطور انگشت دم آلود شہیدوں میں شامل ہونے کے لیے سپرد قلم کر دی گئیں۔ خدا کرے کہ قابل قبول ہوں۔

محمد طیب غفرلہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲۳ ۵ ۱۳۹۵ھ

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد بعشق

ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

— خواجہ حافظؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ماہنامہ الرشید لاہور کی طرف سے یہ روح افزا خوشخبری ملی۔ کہ یہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند نمبر شائع کر رہا ہے۔ اس کے مدیر محترم مولانا عبدالرشید ارشد نے اس ناکارہ سے بھی اس موضوع پر ایک مقالہ لکھنے کی فرمائش کی۔ اس فرمائش نے میرے قلب و دماغ میں ایک تلاطم برپا کر دیا۔ دارالعلوم کی مبارک فضاؤں میں بیتے ہوئے عمر کے ۲۵ سال کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ اس میں کیا کیا دیکھا اور سنا۔ کیسے کیسے بزرگانِ دین اولیاء اللہ کی زیارت و صحبت کا شرف حاصل ہوا۔ ایک طویل داستان ہے جو دفتر کی متقاضی ہے۔ ادھر اسی سالہ عمر، قلب و دماغ کے سب قویٰ جواب دے چکے ہیں۔ نگاہ میں ایک دھندلا سا چراغ ہو کر رہ گئی ہے۔ نہ لکھنے کی قدرت، نہ لکھوانے کا سلیقہ۔ بس ایسا ہی ایک شعر یاد آیا۔ جو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں کہا تھا۔

دل مست رسولِ عربی کہنے کو ہے بے چین — عاجز ہو تحیر سے زباں ہے نہ قلم ہے

دارالعلوم دیوبند حضور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات مقدسہ کی مبارک یادگار ہے۔ اس سے حفاظت کے وقت میں اس کے متعلق جو بھی عالم تحریر میں آگیا تو کیا بعید ہے۔ قلم اٹھایا کہ شروع کروں۔ دارالعلوم دیوبند کے نام سے کوئی نمبر شائع ہو اور اس ناکارہ کا اس میں کچھ بھی حصہ نہ ہو۔ تو ایک پرانا لکھا ہوا مضمون دارالعلوم دیوبند سے متعلق ہاتھ آگیا اسی پر نظرِ ثانی اور ترمیم کر کے ارسال کر رہا ہوں۔

بندہ محمد شفیع ۱۳۹۸ھ شعبان

دارالعلوم دیوبند اور

اس کا مزاج و مذاق

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ:

دارالعلوم دیوبند برصغیر کی وہ عظیم علمی درس گاہ ہے، جس نے گزشتہ صدی میں عالمِ اسلام کی مایہ ناز شخصیتیں پیدا کیں اور ملت کی فکری اور عملی رہنمائی کرکے مسلمانوں کی تاریخ پر گہرے اور دُور رس اثرات مرتب کئے۔

دارالعلوم دیوبند کیا ہے؟ وہ کیوں قائم ہوا؟ اور اس نے کیا خدمات انجام دیں؟ ان سوالات کا صحیح جواب معلوم کرنے کے لیے آج سے تقریباً ایک صدی پہلے کے حالات پر ایک نگاہ ڈالنی ضروری ہے کیونکہ یہی حالات دارالعلوم دیوبند کے قیام کے سبب بنے، اور اس درس گاہ کو اسی وقت ٹھیک ٹھیک سمجھا جا سکتا ہے۔ جب کہ اس کے قیام کا پورا پس منظر سامنے ہو۔

۱۸۵۷ء کا جہاد آزادی مسلمانوں کی طرف سے ہندوستان کو غیر ملکی تسلط سے نکالنے کی آخری کوشش تھی اور اس تحریک نے انگریز حکمرانوں پر کم از کم یہ بات ضرور واضح کردی تھی کہ مسلمان ایسی قوم ہے جو کسی بھی حالت میں غیروں کی غلامی پر قانع نہیں ہوسکتی چنانچہ اس مرحلے پر انگریز نے اپنی پالیسی میں تبدیلی پیدا کی اور وہی انگریز جس نے لاکھوں مسلمانوں کا خون بہاکر اور سینکڑوں کو تختۂ دار پر کھینچ کر ہندوستان میں اپنے پنجے جمائے تھے، اب ہندوستانی عوام کا خیرخواہ بن کر اُن کے سامنے آیا۔ مقصد یہ تھا کہ جو قوم زور اور زبردستی سے قابو میں نہیں آسکی، اس کے ذہن کو رفتہ رفتہ ایسا بدلا جائے کہ وہ ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے اپنے وجود کو فراموش کر بیٹھے، وہ اپنی دینی روایات، تہذیبی اقدار اور تابناک ماضی سے دھیرے دھیرے بےخبری ہوتی چلی جائے یہاں تک کہ ایک عرصے کے بعد اُسے یہ یاد ہی نہ رہے۔

وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

اس مقصد کے لیے سب سے زیادہ مؤثر حربہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی نظام تعلیم میں کچھ ایسی انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں جن کے ذریعے ان کے ذہنوں پر مغرب کی ہمہ جہتی بالادستی کا سکہ بٹھایا جاسکے اور وہ اس بالادستی سے مرعوب ہوکر اپنے ذہن سے سوچنے کے قابل ہی نہ رہ جائیں چنانچہ لارڈ میکالے نے ہندوستانی باشندوں کے لیے ایک نئے نظام تعلیم کی سفارش کی اور اس غرض کے لیے ایک طویل یادداشت مرتب کی جس میں اسلامی اور مشرقی علوم کا بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مذاق اُڑایا، مسلمان علماء پر بے بنیاد الزامات لگائے اور آخر میں صاف صاف کہا کہ:

"ہمیں اس وقت بس ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیے، جو ہمارے اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین ترجمانی کے فرائض انجام دے سکے جن پر ہم اس وقت حکمران ہیں۔ ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو، مگر ذوق، طرزِ فکر، اخلاق اور فہم و فراست کے نقطۂ نظر سے انگریز۔"

مسلمانوں کو ذہنی طور پر مفلوج کرکے انھیں ہمیشہ کے لیے انگریز کا غلام بنا دینے کی یہ سازش درحقیقت ہندوستان پر اپنے اس اقتدار کو جما دینے کے لیے تیار کی گئی تھی، جو آزادی کی مختلف تحریکوں کی بنا پر ہر وقت ڈانواڈول رہتا تھا، اور جس کی حفاظت کے لیے توپ و تفنگ کی طاقتیں ناکام ہوچکی تھیں، اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے ایک چھوٹے سے شعر میں اس سنگین انگریز سازش کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

توپ کھسکی، پروفیسر آئے

جب بسولہ ہٹا تو رندہ ہے

لیکن مسلمانوں میں سے اہل بصیرت علماء اس خطرناک سازش کے دوررس اثرات سے غافل نہ تھے، وہ جانتے تھے کہ اگر اس مرحلے پر مسلمانوں کے دین و ایمان کی حفاظت کے لیے کوئی مؤثر قدم نہ اٹھایا گیا، تو کچھ عرصے کے بعد یہ قوم ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے اپنا وجود ہی کھو بیٹھے گی اور چند نسلوں کے بعد ان میں شاید یہ بات جاننے والا بھی کوئی نہ رہے کہ اسلام کس چیز کا نام ہے؟ اور اس کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟

اب تک اُس دور کے اہل بصیرت علماء اس کوشش میں مصروف تھے کہ ہندوستان سے انگریز کے سیاسی اقتدار کو ختم کیا جائے اور اس مقصد کے لیے آزادی کی مختلف تحریکوں کے ذریعے وہ انگریزوں کے خلاف نبردآزما ہوچکے تھے، لیکن جب انگریز نے توپ و تفنگ کا راستہ چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ یہ سنگین سازش شروع کی تو یہی علماء جنھوں نے انگریزی اقتدار کے خلاف سردھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ انھوں نے بھی اپنی پالیسی میں تبدیلی کرکے انگریز کے براہ راست مقابلے کو چھوڑ دیا، نئے تعلیمی نظام کی

ہلاکت آفرینیوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی طرف سے خود ایسے تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں جن میں وہ اسلام کو اپنی صحیح شکل و صورت کے ساتھ محفوظ رکھ سکیں

چنانچہ ان حضرات نے اپنی ساری توانائیاں اسی کام میں صرف کر دیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور حضرت حاجی سید عابد حسین صاحبؒ یہ وہ حضرات تھے، جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے جہاد میں نمایاں حصہ لیا تھا اور یوپی کے ایک چھوٹے سے خطے میں باقاعدہ اسلامی حکومت بھی قائم کرلی تھی اور اسی کے بدلے میں انھیں عرصہ دراز تک حکومت کا سخت معتوب بھی رہنا پڑا، لیکن جب تعلیمی نظام کا یہ منصوبہ سامنے آیا تو ان حضرات نے دیوبند کے مقام پر ایک دینی درسگاہ کی بنیاد ڈالی اور اسی درس گاہ کا نام آج "دارالعلوم دیوبند" ہے۔

یہ وہ وقت تھا جبکہ ہندوستان میں کسی دینی درسگاہ کو قائم کرنا نت نئے مصائب کو دعوت دینے کے مرادف تھا، دہلی میں جہاں سلطان محمد تغلق کے دور میں ایک ہزار مدارس قائم تھے، انگریزی تسلط کے بعد ایک بھی مدرسہ باقی نہ رہا تھا، علماء کو جہاد میں حصہ لینے کے جرم میں یا پھانسی پر چڑھا دیئے گئے تھے یا انھیں کالا پانی بھیج دیا گیا تھا، باقی ماندہ حضرات منتشر اور اپنے اپنے حالات میں گرفتار تھے۔ اسی لیے ان حضرات نے اس درسگاہ کے لیے کسی شہر کے بجائے قصبۂ دیوبند کو پسند کیا اور کچھ علماء کو جمع کر کے اس سلسلۂ خیر کا آغاز کر دیا۔

اس درسگاہ کے قیام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسلام اور اسلامی علوم کو مٹانے کی جو کوششیں لارڈ میکالے کے نظامِ تعلیم کے ذریعہ کی جا رہی ہیں، اسے ناکام بنا کر اسلامی علوم کی ٹھیک ٹھیک حفاظت کی جائے اور ایسے جاں نثار علماء کی ایک کھیپ تیار کر دی جائے، جو سخت سے سخت حالات میں دین کو نہ صرف محفوظ رکھ سکیں، بلکہ اسے دوسروں تک پھیلا اور پہنچا سکیں، اور اس طرح عام مسلمان الحاد اور بے دینی کے ان فتنوں سے باخبر ہو سکیں جو مغربی طرزِ فکر اپنے ساتھ لائے گا، تاکہ جب کبھی مسلمانوں کو مغرب کے سیاسی اقتدار سے آزادی نصیب ہو تو انھیں اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے لیے اسلام کی ہدایات جوں کی توں محفوظ مل جائیں اور وہ ان کی بنیاد پر اپنے مستقبل کی تعمیر کر سکیں۔

چنانچہ مورخہ ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو نہایت سادگی کے ساتھ اس عظیم دینی درسگاہ کا آغاز کیا گیا۔ اس درسگاہ کے بانیوں کا مقصد چونکہ دین کی پُرخلوص خدمت تھی۔ اس لیے اس کے قیام کے لیے نہ اخبار و اشتہار کا اہتمام ہوا نہ اس مقصد کے لیے کوئی باضابطہ بورڈ قائم کیا گیا اور نہ ہی شہرت اور نام و نمود کے دوسرے طریقے اختیار کیے گئے۔ بس اللہ کے کچھ مخلص بندوں نے دیوبند کے چھوٹے سے قصبے کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جسے چھتہ کی مسجد کہتے تھے ایک انار کے درخت کے نیچے آبِ حیات کا یہ چشمہ جاری کر دیا۔ اس عظیم الشان تعلیمی منصوبے کو عملاً شروع کرنے والے، صرف دو افراد تھے۔ ایک استاد، ایک شاگرد دونوں کا نام محمود تھا، استاد حضرت ملا محمود دیوبندی تھے جنھیں مدرس کی حیثیت میں میرٹھ سے بلایا گیا تھا اور شاگرد دیوبند کے ایک نوجوان محمود الحسن تھے، جو بعد میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام سے معروف ہوئے اور جنھوں نے اپنی ریشمی رومال کی تحریک کے ذریعے انگریزی حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ ڈال دیا۔

دارالعلوم دیوبند کی

خدمات اور خصوصیات

دارالعلوم کی ابتداء ایک انار کے درخت کے سائے میں ہوئی تھی کسے معلوم تھا کہ یہ دو افراد جو انتہائی مسکنت اور گمنامی کے ساتھ یہاں ایک چشمۂ فیض جاری کر رہے ہیں بالآخر برصغیر کی تاریخ کا رُخ موڑ کر رکھ دیں

لے۔ لیکن دُنیا نے دیکھ لیا کہ اسی سادہ سی درسگاہ سے علم و فضل کے ایسے ایسے آفتاب و ماہتاب پیدا ہوئے جنھوں نے ایک دنیا کو جگمگا کر رکھ دیا۔ ملک سے کئی گنا دنیا میں بحث سی ایسی عالیشان عمارتیں قائم ہوئی ہیں۔ دینی درسگاہوں کا بھی سیلاب بہت ہی ہے مگر جو عظمت حاصل نہیں ہوا، لیکن اللہ نے دارالعلوم دیوبند کو جو فضیلت اور جو امتیاز بخشا، بہت کم علمی اداروں کے حصے میں آتا ہے۔ یہاں مجھے مختصراً اسی امتیاز کو واضح کرنا ہے۔

دارالعلوم کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض ایک درسگاہ کا نہیں، ایک خاص نظریہ اور ایک خاص طرزِ عمل کا نام ہے جو کتاب و سنت کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اس درسگاہ کی بنیاد ہی چونکہ اس لیے رکھی گئی تھی کہ اس کے ذریعے اسلام اور اسلامی علوم کو اپنی صحیح شکل و صورت میں محفوظ رکھا جائے۔ اس لیے اس کا مسلک یہ رہا ہے کہ دین صرف کتابی حروف و نقوش کا نام نہیں ہے اور نہ دین محض کتابوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اللہ نے ہمیشہ کتاب کے ساتھ رسُول کو اس لیے بھیجا ہے کہ وہ اپنے عمل سے کتاب کی تفسیر کرے۔ چنانچہ ایسی مثالیں تو ملتی ہیں کہ دُنیا میں رسُول بھیجے گئے مگر کتاب نہیں آئی، لیکن ایسی مثال ایک بھی نہیں ہے کہ صرف کتاب بھیجی گئی ہو اور اس کے ساتھ رسُول کوئی نہ آیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بتلاتی ہے کہ دین کو سمجھنے اور سمجھانے کا راستہ صرف کتاب نہیں بلکہ اس کے ساتھ وہ اشخاص بھی ہیں جو کتاب کا عملی پیکر بن کر اس کی تفسیر و تشریح کرتے ہیں۔ لہٰذا دین کو سمجھنے کے لیے کتاب اللہ اور رجال اللہ، لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ قرآن کریم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر و تشریح کی روشنی میں اور سُنّتِ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہؓ و تابعین اور دُوسرے بزرگانِ دین کی روشنی میں ہی ٹھیک ٹھیک سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے بغیر دین کی تعبیر و تشریح کی ہر کوشش گمراہی کی طرف جا سکتی ہے۔

مراتب کا فرق ضرور ہے، جو مقام اللہ تعالیٰ کا ہے، وہ کسی نبی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو مرتبہ ایک نبی کا ہے، وہ کسی صحابی کا نہیں ہو سکتا اور جو درجہ ایک صحابی کو حاصل ہے، کوئی بڑے سے بڑا ولی اس درجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ بس فرقِ مراتب کے ساتھ دین کے ان سرچشموں میں سے ہر ایک کے حقوق و حدود کی رعایت دارالعلوم دیوبند کا وہ خصوصی مزاج ہے جس نے اسے دُوسرے اداروں سے امتیاز عطا کیا ہے اور جس کی بنا پر اس کا مسلک مسلمانوں کے مختلف مکاتبِ فکر کے درمیان ایک ایسی راہِ اعتدال کی حیثیت رکھتا ہے جس میں کتاب و سنت کی صحیح ترجمانی ہے اور افراط و تفریط سے بچتی ہوئی انسان کو رضائے الٰہی تک پہنچاتی ہے۔ اور جب دارالعلوم کا اساسی نظریہ یہ ٹھہرا کہ دین کتاب اللہ اور رجال اللہ کے مجموعے کا نام ہے، تو یہیں سے اس کا ایک دُوسرا عملی امتیاز ظاہر ہوتا ہے اور وہ یہ کہ دارالعلوم اپنے عہدِ شباب میں محض ایک علمی درسگاہ نہیں تھی جس میں طلبہ کو صرف کتابوں کے حروف و نقوش اور صرف علم کا ظاہری خول دیا جاتا ہو۔ بلکہ ساتھ ساتھ ایک عملی تربیت گاہ بھی تھی، جہاں علم کے ظاہری بدن میں عملِ صالح اور اخلاقِ فاضلہ کی رُوح بھری جاتی تھی، یہاں سے فارغ ہو کر نکلنے والے صرف ظاہری علُوم ہی سے آراستہ نہیں ہوتے تھے، بلکہ وہ عملی اعتبار سے بھی سچے اور پکے مسلمان ہوتے تھے۔ جن کے چہرے دیکھ کر خدا یاد آجاتا تھا۔ جن کی ہر نقل و حرکت اسلام کی نمائندگی کرتی تھی۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ دارالعلوم کے قرنِ اوّل کے طلباء میں سے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے دارالعلوم کا وہ زمانہ دیکھا ہے، جب اس کے ایک چپراسی سے لے کر صدر مدرس اور مہتمم تک ہر ہر شخص صاحبِ نسبت، ولیٔ کامل تھا۔ دن کے وقت یہاں علوم و فنون کے چرچے ہوتے اور رات کے وقت اس کا گوشہ گوشہ اللہ کے ذکر اور تلاوتِ قرآن سے گونجتا تھا۔ چنانچہ اس دور میں جو شخصیتیں دارالعلوم دیوبند سے تیار ہوئیں۔ انھوں نے عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت

سیاست اور اجتماعی امور میں ایسے ایسے تابناک کردار پیش کیے ہیں۔ کہ آج اس کی نظیر ملنا مشکل ہے، ان میں سے ہر شخص اسلام کی مجسم تبلیغ تھا وہ جہاں بیٹھ گیا ایک جہان کو سچا مسلمان بنا کر اٹھا، علم اگر روح عمل سے خالی ہو تو عموماً انسان میں خود پسندی اور پندار پیدا کر دیتا ہے، لیکن دارالعلوم دیوبند کا علم چونکہ روکھا پھیکا علم نہ تھا، بلکہ اس میں اخلاق و عمل اور عشق و محبت کا سوز و ساز بھی شامل تھا۔ اس لیے

اس کی تیسری خصوصیت یہ رہی کہ اس کا پورا ماحول، تواضع اور سادگی اور بے تکلفی کا ماحول تھا، وہاں ہر شخص علم و عمل کا آفتاب ہونے کے باوجود عبدیت اور تواضع کا پیکر تھا۔ اس جماعت کے افراد ایک طرف علمی وقار، استغناء اور خودداری کے حامل تھے۔ اور دوسری طرف فروتنی خاکساری اور ایثار و زہد کے جذبات سے معمور۔

(دارالعلوم کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ہر علم و فن میں یگانۂ روزگار تھے۔ ان کی تصانیف آج بھی ان کے علوم کی شاہد ہیں لیکن ان کی سادگی کا عالم یہ تھا کہ ان کے پاس کبھی کپڑوں کے دو سے زائد جوڑے جمع نہیں ہوتے، دیکھنے والا یہ بھی نہ لگا سکتا تھا کہ یہ وہی مولانا محمد قاسم ہیں جنہوں نے مسلمانوں ہی سے نہیں، غیر مسلموں اور مخالفوں سے بھی اپنے علم و فضل کا لوہا منوایا ہے۔ دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی ہیں، جو بانیانِ دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے ہم سبق اور ہم کام میں رفیق، حضرت حاجی صاحبؒ کے خلیفہ، اور استاذ الکل حضرت مولانا مملوک العلی صاحب کے صاحبزادے تھے۔ مزاج شاہانہ، مگر سادگی کا عالم یہ کہ بعض اوقات گزر بسر ملاتو رستی ہی سے کام لے لیا۔ تمام علوم و فنون اور بعض صنعتوں میں بھی اللہ نے انکو کمال بخشا تھا، صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ حضرت مولانا سید احمد دہلوی دارالعلوم کے قرن اول کے اساتذہ میں سے تھے اور فلسفہ، ریاضی، ہیئت اور دیگر عقلی علوم میں اس وقت اُن کا ثانی نہیں تھا، انھوں نے ساری عمر دیوبند کے قصبے میں گزاری اور اس حالت میں دنیا سے تشریف لے گئے کہ دیوبند میں ان کی ذاتی جائیداد تو کجا، رہنے کا مکان بھی اپنا نہیں تھا حضرت ملا محمود صاحب جن سے دارالعلوم کی ابتداء ہوئی، دیوبند کے زمیندار بھی تھے، مگر کوئی وقت علمی خدمت سے خالی نہیں، میرے والد محترم نے ایک بڑی کتاب ان سے صرف اس شرط پر پڑھی ہے، جب کہ وہ گھر سے گوشت ترکاری لینے کے لیے بازار جاتے تھے، تو شاگرد ساتھ ہوتے۔ یہ سبق اسی طرح پورا ہوا، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ جو مدرسے کے پہلے طالب علم تھے اور بعد میں علم عمل اور سیاست دونوں میدانوں میں عالمگیر شہرت حاصل کی، جب وہ دارالعلوم کے صدر مدرس ہوئے تو انھیں صرف بڑے مولوی صاحب کہا جاتا تھا تعظیمی القاب کے تکلفات بعد میں پیدا ہوئے۔

مفتی عزیز الرحمن صاحب دارالعلوم کے پہلے مفتی اعظم تھے لیکن مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ وہ محلے کی بیواؤں، یتیموں اور بے کس افراد کا سودا سلف خود اپنے ہاتھوں سے لا کر انھیں پہنچایا کرتے تھے۔

حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ (جو حضرت میاں صاحب کے نام سے معروف ہیں) حدیث کے اونچے درجے کے اساتذہ میں سے تھے لیکن آخر عمر تک ایک کچے مکان میں مقیم رہے اور صرف اس لیے پختہ مکان نہیں بنایا کہ محلہ غریبوں کا تھا۔ اور جب تک سب کے مکان پختہ نہ بن جائیں۔ اپنا مکان پختہ کرانے کو دل نہیں مانتا تھا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جنھیں آج دنیا اس صدی کے عظیم رہنما کی حیثیت سے جانتی ہے اور جنھوں نے ایک ہزار سے زیادہ تصانیف چھوڑی ہیں، ایک امیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے، لیکن دارالعلوم میں طالب علمی کی زندگی اس طرح بسر کی کہ مدرسے کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد میں رہتے اور طالب علمی ہی کے زمانے میں اوقات کے نظم و ضبط کا یہ عالم تھا کہ ان کی معمولات کو دیکھ کر وقت معلوم کیا جا سکتا تھا۔ نہ اہتمام کا

... وہ ہمیشہ کے بعد سو جاتے اور آخر شب میں تہجد کے لیے
بیدار ہوتے۔ اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا۔

... علماء کی جو حقیقی خصوصیت رہی ہے کہ اس نے اپنے
... خدا کی طرف دعوت اور دوسروں پر تنقید کے سلسلے میں ...
... اختیار کیا جس میں مخاطب کو زیر کرنے کے بجائے اس کی دینی خیرخواہی
... اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند نے حق کے معاملے
... مداہنت کو کبھی گوارا نہیں کیا اور جس بات کو حق سمجھا، اس کا برملا اظہار بھی کیا لیکن
... حکمت اور نرمی کا پہلو ہمیشہ مدنظر رکھا گیا۔

دارالعلوم دیوبند کا اصل مقصد چونکہ دین کی حفاظت تھا اور یہ مقصد
اس وقت تک حاصل نہ ہو سکتا تھا جب تک ایک جماعت دوسرے ہر کام کو
چھوڑ کر صرف اسی کی نہ ہو رہے۔ اس لیے انھوں نے دنیوی مناصب
و عہدوں سے قطع نظر کر کے اور خود پیٹ پر پتھر باندھ کر اس خدمت
کو انجام دیا۔ لیکن عام مسلمانوں کی مادی ترقی کی فکر بھی انھیں ہمیشہ دامن گیر رہی۔
انھوں نے ہر اس پرخلوص تحریک کے ساتھ بھرپور تعاون کیا جو دین
کو محفوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کی اجتماعی فلاح اور مادی ترقی کا مقصد لے کر
اٹھی تھی۔ ہاں جس جگہ مادی ترقی کے شوق میں انھیں دین پامال ہوتا نظر آیا، وہاں
وہ دین کی حفاظت کے لیے سد سکندری بن گئے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ دو سو
سال تک انگریز اور ہندو کی دوہری چکی میں پسنے کے باوجود اللہ کے فضل و
کرم سے آج دین اپنی صحیح شکل میں محفوظ ہے۔ برصغیر میں دین کو سمجھنے والے، اس کی
دعوت دینے والے اور اس پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ رکھنے والے موجود
ہیں اور عام مسلمان بھی مغربی افکار کے بے پناہ سیلاب کے باوجود نظری طور پر
آج بھی مسلمان ہیں اور اسلام پر فخر کرتے ہیں۔)

دارالعلوم دیوبند نے جتنی عظیم شخصیتیں پیدا کیں، اتنی شخصیتیں
کم ہی کسی علمی درسگاہ کے حصے میں آئی ہیں۔ شیخ العرب والعجم حضرت شیخ الہند
مولانا محمود الحسن صاحب جنھوں نے تقریباً چالیس سال دارالعلوم میں درس حدیث
وغیرہ کی خدمات انجام دیں، اس کے ساتھ ہی اصلاح و تربیت و ... کا سلسلہ
قائم فرمایا۔ ہزاروں علماء، صلحا اور رشد و ہدایت کی صورت میں ...
بیرون ہندوستان میں پھیلا۔

آخر عمر میں اہل یورپ کے متحدہ محاذ کے ذریعے ترکی اسلامی خلافت
کے زوال کے وقت جذبہ جہاد عام ہوا تو ہندوستان کو انگریزی تسلط سے
آزاد کرا کے اسلامی سلطنت بنانے کے لیے وہ سب شامل ہوئے ...
کر انگریزی جیل میں رہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ جو دارالعلوم
کے فضلا میں ایک بے نظیر شخصیت ہیں۔ دین اور علم دین کی خدمات کے
جتنے شعبے ہیں، سب میں آپ کے آثار بکھرے ہیں۔ ایک ہزار سے
زائد آپ کی وہ مقبول تصانیف ہیں جن سے لاکھوں مسلمانوں کی زندگیوں میں
انقلاب آیا۔ آپ کے سلسلہ ارشاد سے بھی لاکھوں مسلمانوں کی زندگی بدلی اور
سیکڑوں مشائخ طریقت پیدا ہوئے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی جو حضرت شیخ الہند کے
اخص تلامذہ میں سے ہیں جو دارالعلوم میں تعلیم سے فراغت پا کر تزکیہ
نفس کے لیے چند سال حضرت قطب عالم مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی خدمت
میں رہے۔ بالآخر ان کے خلیفہ مجاز ہوئے اور اٹھارہ سال تک مدینہ منورہ
مسجد نبوی میں علوم قرآن و حدیث کا درس دیا۔ پھر اپنے استاذ حضرت شیخ الہند
کے ساتھ جہاد آزادی میں شرکت فرما کر چار سال مالٹا جیل میں آپ کے ساتھ رہے
پھر رہائی کے بعد بھی اسی مشن کی تکمیل میں جد و جہد کرتے رہے اور آخر میں ۱۳۴۶ھ
تا ۱۳۷۷ھ ۳۲ سال دارالعلوم کے صدر مدرس اور ناظم تعلیمات کی حیثیت سے
علمی خدمات انجام دیتے ہوئے دارالعلوم ہی میں وفات پائی۔

محدث عصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ
جن کو اللہ تعالیٰ نے تمام علوم و فنون میں ایک بے نظیر جامع عالم بنایا تھا۔ خصوصاً
حدیث میں تو اپنے زمانے کے زہری اور حافظ ابن حجر سمجھے جاتے تھے۔ آپ کا درس

حدیث ایک مثالی درس تھا۔ اپنے استاذ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی وفات کے بعد دارالعلوم میں بحیثیت صدر مدرس گیارہ سال درسِ حدیث کی خدمات انجام دیں جن میں ایک ہزار سے زائد طلبہ نے آپ سے درسِ حدیث لیا اور سینکڑوں علماء و محدثین پیدا ہوئے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح آپ بھی حضرت شیخ الہند کے اخص تلامذہ میں سے ہیں۔ صحیح مسلم شریف کی شرح فتح الملہم اور قرآن مجید کی مختصر جامع تفسیر جو مقبولِ عالم ہوئی اور افغانستان میں اس کا فارسی ترجمہ کرکے شائع کیا گیا۔ آپ کی دو شہرۂ آفاق تصانیف ہیں جو آپ کے علمی کمال کی شاہد ہیں، عرصہ دراز تک دارالعلوم میں درسِ حدیث کی خدمات انجام دیں اور آخر میں دارالعلوم کے صدر مہتمم کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر دارالعلوم سے مستعفی ہو کر تحریک بنائے پاکستان کے سلسلے میں مؤثر اور مفید خدمات انجام دیں۔ جن کے نتیجے میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت "پاکستان" وجود میں آئی پھر مملکتِ خداداد مملکت میں اسلامی دستور و نظام لانے کی مساعی میں پوری کوشش کی۔
اس وقت بطور مثال کے چند اہم شخصیتوں کے نام سامنے آگئے۔
ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ؎ ایں خانہ تمام آفتاب است

دارالعلوم سے پیدا ہونیوالی بے مثال شخصیتیں جن سے دنیا میں علم و عرفان کے چشمے جاری ہوئے۔ اس کثرت سے ہیں کہ شمار میں لانا مشکل ہے دارالعلوم دیوبند درحقیقت ان ہی شخصیتوں اور اسی طرز فکر کا نام ہے جس کی مختصر تشریح اوپر پیش کی گئی ہے۔ احقر نے اپنی آنکھ دارالعلوم ہی کے پُرنور صحن میں کھولی ہے اور بچپن ہی سے ان بزرگوں کے نورانی چہروں کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے اور گویا ان ہی بزرگوں کی آغوشِ شفقت میں پل کر جوان ہوا اور طالب علمی سے لے کر مختلف درجات کی درس و تدریس پھر خدمتِ فتوے میں عمر کے ۵۳ سال گزارے ہیں۔ ۵۲ سال کی عمر میں پاکستان کی طرف ہجرت نصیب ہوئی۔

دارالعلوم کی نورانی فضاؤں میں بیتے ہوئے ۵۲ سال کی کہانی کوئی مختصر بھی کرے تو کہاں تک کرے۔ خصوصاً اب جب کہ عمر کے اسی سال پورے ہونے والے ہیں، قویٰ کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ لکھنے پڑھنے سے تقریباً معذور ہو چکا ہوں اب تو بس اس سلسلے میں اس شعر پر اکتفا کرتا ہوں۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد
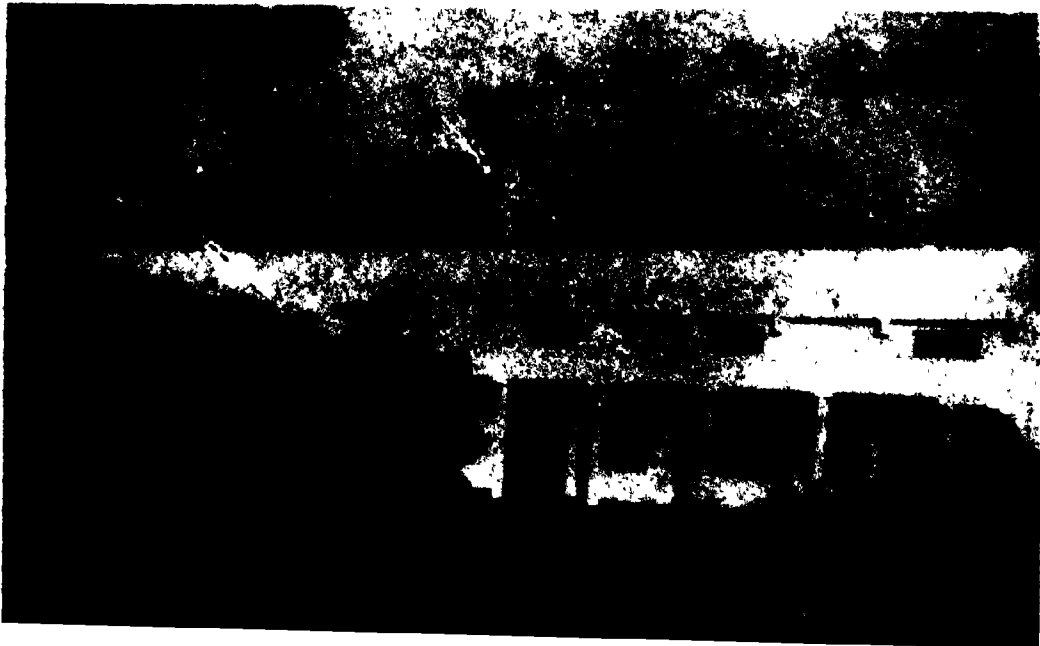
ماہنامہ الرشید کے خاص نمبر دارالعلوم دیوبند نمبر کے لیے عالم اسلام کی ... بنوری سے عزیزم عبدالرشید ارشد نے مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ ضعیف اور عدیم الفرصت ہونے کی وجہ سے جدید مضمون لکھنے سے قاصر رہا ..... آج سے تقریباً ۲۰ سال قبل قاہرہ میں ایک مضمون عربی میں ایک بحث۔ وہ رسالۃ الاسلام میں ایک مضمون وہاں کے فضلاء کے مطالعہ کے لیے لکھا تھا کہ وہ دارالعلوم کی خدمات سے واقف ہو سکیں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ۲۰ سال پہلے دارالعلوم کا جو کارنامہ تھا۔ بعد میں دارالعلوم دیوبند نے بہت سے جدید کارنامے اور آثار مبارکہ اضافہ کیے ہیں، ان کا ذکر اس میں نہ ملے گا، یہ بات پیش نظر ہے ... محمد یوسف بنوری

دارالعلوم دیوبند ○ ایک جائزہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زمانے میں اللہ تعالیٰ کے کچھ نفحات ہیں، وہ ایک قوم کو خاص خوبی عطا کرتا ہے اور دوسری قوم کو دیگر خصائص سے مشرف کرتا ہے، کبھی یہاں کو یہ خصائص عطا کرتا ہے اور کبھی اُن سے روک لیتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: "اور ان ایام کو ہم بدلتے رہتے ہیں لوگوں میں" نیز ارشاد ہے: "یہ اللہ کی سنت ہے جو گزر چکی ہے اس کے بندوں میں" قرون اولیٰ کی بات رہنے دیجئے جن میں علوم قرآن وسنت اور حدیث کے چشمے ابل رہے تھے۔ قرون متوسط، چوتھی صدی سے آٹھویں صدی تک ہی کو لیجئے، آپ دیکھیں گے کہ اس دور میں خطۂ عرب، حجاز، عراق، شام، اندلس مصر اور خراسان و ماوراء النہر کے علاقے کتاب وسنت اور دیگر علوم دینیہ سے بکثرت بہرہ ور ہیں اور ان میں بلند پایہ حفاظ حدیث، ناقدین رجال، مایہ ناز ائمہ فقہ اور حاملین دین کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آئے گا، جن کی کثرت سے عقل حیران ہے۔

حافظ علائی الشافعی، ابو عمر قرطبی مالکی، حافظ عزالدین ابن عبدالسلام الشافعی، حافظ ابن دقیق العید، حافظ فضل اللہ تورپشتی حنفی، حافظ علاء الدین المارینی الحنفی، حافظ علاء الدین مغلطائی، حافظ ابن حجر، اور اس پایہ کے دیگر جہابذۂ اُمت، اس دور میں آسمان علم وفضل کے درخشندہ ستارے بن کر چمکے اور ایک عالم کو اپنی روشنی سے منور کیا۔

لیکن اس دور میں سرزمین ہند بنجر نظر آتی ہے اور وہ مذکورہ بالا علاقوں کے عبقری افراد سے شانہ بشانہ چلنے سے قاصر ہے۔ بلاشبہ اس دور میں بھی کچھ سربرآوردہ افراد پیدا ہوئے، اور باہر سے یہاں آئے، لیکن ان کے آثار و نشانات امت ثابت نہ ہوئے۔ تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے خطۂ ہند پر احسان فرمایا، اور عبقری امام نابغۃ الایام، الامام الحجۃ الشاہ ولی اللہ فاروقی دہلوی کو پیدا کیا، جب کہ ہندوستان کے افق پر غالی شیعوں اور رافضیوں کے سیاہ بادل

منڈلا رہے تھے۔ قریباً سارے ہندوستان پر اُن کا تسلط تھا، بدعات رائج ہو چکی تھیں اور سُنّت کی رسی بوسیدہ ہو رہی تھی۔

نوامیسِ فطرت میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت جاری ہے کہ ایک جماعت تا قیامت حق پر قائم رہے گی اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر آئندہ نسل میں ایسے رجالِ کار کو کھڑا کرتا رہے گا، جو دین سے غالیوں کی تحریف اور باطل پرستوں کے غلط ادعا کی اصلاح کرتے رہیں گے، چنانچہ اسی سُنّت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس امام کے ذریعے ملتِ حنیفیہ کے ستونوں کو مضبوط کیا قرآن و سنت کے علم صحیح کی بنیاد ڈالی اور قوم کی بدحالی کا مداوا کیا۔ ان کے جانشین کی اولاد و احفاد کے ذریعے ولی اللّٰہی تحریک پروان چڑھی اور اس کے حُسن و زاف کو چار چاند لگے۔

(پس ہندوستان میں یہ پہلی دینی و علمی تحریک تھی، جس کی بنیادیں نہایت راسخ اور جس کی عمارت بلند و بالا تھی۔ امام ولی اللہ محدث دہلویؒ کی جدید علمی تحریک اور شیعوں کی دستبرد سے اہلِ سنت والجماعت کے مسلک کی حمایت و حفاظت کا بار ان کے فرزند اکبر شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اُٹھایا اور ان کی تحریکِ دینی، اور مروّجہ بدعات کی اصلاح و تردید کو سنبھالنے کا فریضہ شاہ اسمٰعیل شہید بن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ نے انجام دیا۔ یوں ان دو شخصوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے شاہ ولی اللہ کی علمی و اصلاحی تحریک کی تکمیل کرائی۔

بعد ازاں جب ویرانۂ ہند پر حکومت کے منحوس سائے پھیلنے لگے اور اس کے جبر و استبداد اور تسلط کو استحکام نصیب ہوا، تو ولی اللّٰہی تحریک کے انوار مٹنے لگے اور اس باد سموم سے اس کی تر و تازہ شاخیں پژمردہ ہونے لگیں۔ ادھر برٹش گورنمنٹ کے تکبر و خودسری میں اضافہ ہوا جس کے نتیجے میں حکومت اور مسلمانوں کے درمیان ۱۸۵۷ء کا معرکہ ہوا جس میں بدقسمتی سے حکومت کو غلبہ اور مسلمانوں کو شکست ہوئی، اس سے حکومت برطانیہ کی تیزی و تندی میں مزید اضافہ ہوا۔ اس کا تسلط اور بھی مستحکم ہو گیا۔

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کی انتقامی سازشوں سے دین کی بنیادیں ہلنے لگیں اور شعائرِ اسلام ایک ایک کر کے مٹنے لگے۔ ان بھیانک تاریکیوں میں ایک گمنام سے خطے میں دارالسلطنت دہلی سے تقریباً سو میل کے فاصلے پر واقع ہے؛ روشنی کی صبح صادق نمودار ہوئی۔ یہ مبارک خطۂ قصبہ دیوبند ہے چنانچہ عارف باللہ الشیخ مولانا محمد قاسم نانوتوی دیوبندی نے ۱۲۸۳ھ میں ایک دینی و علمی مرکز کی بنیاد رکھی، جو آج دارالعلوم اور جامعہ قاسمیہ کے نام سے شہرۂ آفاق ہے۔ یہ روشنی بتدریج پھیلتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس سے دُور دراز کے تاریک علاقے بھی منور ہو گئے اور خطۂ ہند سے جہل کے پردے ہٹ گئے، اور پھر اس کا فیضان خطۂ ہند سے نکل کر جاوا، سماٹرا، چین، جنوبی افریقہ افغانستان اور ایران تک پہنچا اور ان شاء اللہ اس کے نور و ضیا اور حسن و بہار میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے گا۔)

جو حقائق میری آنکھوں کے سامنے ہیں وہ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں علیٰ رؤس الاشہاد یہ دعوےٰ کروں کہ اگر سرزمینِ دیوبند سے علم و معرفت کا یہ چشمۂ صافیہ نہ پھوٹا ہوتا تو تیرھویں صدی کے اواخر میں ہندوستان سے قرآن و سنت کے علوم کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔

میں یہاں اس عظیم الشان دانش کدہ کی ابتدائے تاسیس سے لے کر اسلامی صدی کے نصف تک کے ۱۰۰ سالہ دَور کے آثار و برکات کی جانب چند اشارات کرنا چاہتا ہوں۔

دیوبند اور افراد سازی

جن حضرات نے اس دارالعلوم میں داخل ہو کر اس کے درجاتِ عالیہ میں درس لیا، مگر اس کے پورے نصاب کی تعلیم نہیں پائی ان کی تعداد دس ہزار سے زائد ہے اور جو حضرات اس کے مقررہ نصاب کی تکمیل کے بعد دارالعلوم کی آخری سند سے مشرف ہوئے، ان کا شمار پانچ ہزار تک پہنچتا ہے اور ان میں سے وہ نابغۂ شخصیتیں، جنہوں نے علم و حکمت کے دروازے کھولے

ہندوستان میں مختلف جہتوں سے فیض کے چشمے جاری ہو گئے، ان کی تعداد ہزار نفوس قدسیہ سے کم نہیں۔ ۱۳۵۰ھ سے ۱۲۵۰ھ تک دارالعلوم سے فیضیاب ہونے والے طلبہ کا سالانہ داخلہ ڈیڑھ ہزار رہا ہے۔ اور اب ان کی تعداد دو ہزار ہے۔ یہ صرف وہ طلبہ ہیں، جو خاص دارالعلوم میں اقامت رکھتے ہیں۔ ان طلبہ کی تعداد اس کے علاوہ ہے، جو دارالعلوم سے وابستہ مدارس میں تعلیم پاتے ہیں اور مجموعی طور پر ان دینی مدارس سے فارغ ہونے والے علمائے کرام کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے، جو میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔

دیوبند اور تاسیس مدارس

جو حضرات اس شیریں اور فیاض چشمہ (دارالعلوم دیوبند) سے سیراب ہو کر نکلے، انھوں نے اپنے اپنے علاقے میں بے شمار مدارس دینیہ کی بنا ہی استوار کیں، اس وقت ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہے۔ تاہم جو مدارس اس جامعہ (دارالعلوم دیوبند) سے منسوب ہیں، ہندوستان میں ان کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہو گی۔

ان میں سے بعض مدارس وہ ہیں، جن کی بنیاد فضلائے ازہر نے خود رکھی، بعض ایسے ہیں جن کو فضلائے دارالعلوم کے مبارک ہاتھ تدریس واہتمام کی شکل میں چلا رہے ہیں اور بعض ایسے ہیں، جن کا دارالعلوم سے امتحانی رابطہ ہے اور سالانہ امتحان کے پرچے دارالعلوم سے ارسال کئے جاتے ہیں۔ مگر یہ مدارس کسی محکمۂ اوقاف کے زیر انتظام چل رہے ہیں۔ نہ کوئی مخصوص جماعت ان کی کفیل ہے، تاکہ جامعہ ازہر سے متعلقہ مدارس کی طرح ان میں انتظامی وحدت ہوتی۔ بلکہ ہر مدرسہ اپنے امور و معاملات میں مستقل ہے بہرحال یہ جامعہ دارالعلوم دیوبند ان تمام دینی مدارس کی اصل و بنیاد دام المدارس ہے۔ جو سرزمین ہند کو منور کر رہے ہیں۔

دیوبند کی نابغہ اور سرآمد روزگار شخصیتیں

علماء دیوبند میں سب سے اول جن حضرات کو سیادت و قیادت کا شرف حاصل ہوا، وہ تین افراد تھے، جن کے سینوں میں پاک صاف دل اور ان کے دماغ میں بلند پایہ اسلامی افکار و علوم کا وسیع سمندر تھا۔

(۱) الشیخ الامام، عارف باللہ مولانا محمد قاسم (المتوفی ۱۲۹۷ھ)
(۲) الفقیہ المحدث العارف مولانا الشیخ رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ)
(۳) بحر بیکراں الشیخ مولانا محمد یعقوب نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۲ھ)

ان حضرات کے خصائص کی تفصیل کے لیے مستقل فرصت درکار ہے مختصر یہ کہ حضرات علوم کتاب و سنت اور علوم ظاہر و باطن کے جامع اور عارفین اور اصحاب قلوب کی وراثت کے امین تھے، انھوں نے پہاڑ سے زیادہ راسخ عزائم کے ساتھ، ورع و زہد، انکسار و تواضع، شہرت سے نفرت اور اتباع سنت ایسے بلند پایہ اخلاق و شمائل کو اس حد تک جمع کر لیا تھا کہ اخلاق عالیہ میں یہ حضرات اپنے دور میں ضرب المثل تھے، ان کی تعریف میں راقم الحروف کا یہ قصیدہ ہے۔

ھمم لھم فی الدھر درۃ تاجھم
ان کا عزم و ہمت زمانے میں ان کے تاج کا موتی ہے
کلم لھم تشفی الصدی صلصال
ان کے کلمات سے خشک لب تشنہ سیراب ہوتا ہے
سمت وصمت والوقار ھیبۃ
خوش روئی، خاموشی، وقار، ہیبت
علم غزیر ھامر ھطال
بے پناہ برسنے اور بہنے والا علم
لھم التواضع والرزانۃ والتقی
ان کی تواضع، رزانت و متانت اور تقوی
فضل لھم ضربت بہ الامثال
وطہارت کے فضائل ضرب المثل ہیں

وتلألأت انوارهم بوجوههم
ان کے انوار ان کے چہروں سے چمکتے ہیں

هدى النبي جلالهم وجلال
ان کا جلال و جمال طریقۂ نبوی کی تفسیر ہے

كرم وخلق عفة وديانة
کرم، اخلاق، عفت و دیانت میں ان کا قول و

هدى الصحابة حالهم ومقال
عمل صحابہ کے نقش قدم پر ہے۔

باهي جمالهم جمال شريعة
ان کے ذاتی جمال کا جمال شریعت سے آمیزہ ہوا

فبهي جمال وزاد كمال
تو ان کے جمال کو چار چاند لگ گئے اور کمال میں اضافہ ہوا

وبهى كمالهم كمال علومهم
اور بوقت مقابلہ کمالِ علوم کے ساتھ ان کا ذاتی کمال

عند التباهي فاستزاد جمال
غالب آیا اور ان کے حسن و جمال میں اضافہ کا موجب ہوا

دع وصف قوم انهرت آثارهم
اس قوم کی کیا تعریف کی جائے جن کے آثار تاباں و درخشاں ہیں

فالشمس الهبر والمديح خيال
پس آفتاب خود ہی روشن ہے اور مدح و ثنا خیال محض ہے

والشمس طالعة زهت انوارها
اور آفتاب طلوع ہے۔ اس کے انوار خود چمکتے ہیں

والوصف يقصر والمجال مجال
وصف قاصر رہتا ہے اور گفتگو کی مجال وسیع ہے

ان حضرات کے بعد قیادت مندرجہ ذیل حضرات کے سپرد ہوئی:

(۱) مسند الوقت شیخ العصر الاستاذ الامام شیخ الہند مولانا محمود حسن ۱۳۳۹ھ۔

(۲) عارف باللہ الشیخ مولانا عبدالرحیم رائے پوری (۱۳۳۷ھ)

(۳) شیخ المحدث مولانا خلیل احمد سہارنپوری (المتوفی بالمدینۃ المنورۃ ۱۳۴۶ھ و دفن بالبقیع)

ان کے بعد شیخ محدث حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی طال بقائہٗ۔ اور الشیخ امام العصر شاہ محمد انور الکشمیری (متوفی ۱۳۵۲ھ)

اور موجودہ دور میں اس کے ستون، جن پر اس کی عمارت قائم ہے۔ چار نفوس ہیں۔

(۱) الشیخ مولانا اشرف علی تھانوی

(۲) محقق العصر مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی، صاحب فتح الملہم شرح صحیح مسلم شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل۔

(۳) شیخ العصر مولانا الشیخ حسین احمد مدنی، شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

(۴) فاضل محقق مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ دہلوی، صدر جمعیت علماء ہند۔

مسلمانوں کی رہنمائی اور بیداری میں ان چاروں حضرات کی مساعی جمیلہ قابل شکر ہیں، انھوں نے مسلمانوں کے لیے علم و عمل اور دین و سیاست کا بہت اونچا معیار قائم کیا ہے اور ان کے لیے ملی، سیاسی اور اجتماعی و انفرادی مسائل پر غور و فکر کرنے کی راہیں کشادہ کر دی ہیں۔ یہ حضرات پختہ فکر، ذہن رسا، صدق عمل اور خلوص نیت کے جامع ہیں۔ ان کے چہروں سے علم و حکمت کا نور جھلکتا ہے اور فضل و کمال کی علامات نمایاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ امت کے لیے ان کی نافع زندگی کو عافیت و سلامتی سے ہمکنار کرے اور عزت و کرامت کے ساتھ ان کی مساعی مبارکہ میں برکت فرمائے۔

علمائے دیوبند اور اُن کے علمی آثار

علمائے دیوبند نے تفسیر قرآن، شرح حدیث، اصول فقہ، فقہ حنفی، فرائض، تجوید وقرأت، سیرت، آداب اور دیگر علوم وفنون میں، نیز فرق باطلہ عیسائیت، ملاحدہ، دہریت، مرزائیت، قادیانیت اور غالی شیعوں کے رد میں۔ نیز دین حق کی حفاظت اور بدعتیوں کے رد اور غیر مقلدین کی بعض بیہودگیوں کی تردید میں جو کتابیں تالیف فرمائی ہیں، ان کی تعداد دو ہزار کے قریب ہے، جن میں چھوٹے چھوٹے رسالے سے لے کر کئی کئی جلدوں پر مشتمل ضخیم کتابیں شامل ہیں۔ یہ شمار صرف اکابر اور نابغہ شخصیتوں کی تالیفات کی ہے، دارالعلوم کے دیگر فضلاء اور منتسبین کی تالیفات مزید برآں ہیں۔ ان تمام کتابوں کے نام کی تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ ان اکابر میں سے صرف ایک مصنف حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی تصنیفات ۸۰۰ سے زائد ہیں، ان میں سے بعض کتابوں کی دس سے لے کر بیس تک جلدیں ہیں، یہاں تک کہ موصوف کثرت تالیف میں قاہرہ کے نابغہ عصر علامہ شیخ جلال الدین سیوطی سے بھی فائق ہیں۔ اگر میں یہ کہوں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ اس نابغۂ ہند کی کتابیں اتقان وتحقیق میں نابغۂ مصر کی کتابوں سے فائق ہیں، اگر سیوطی کی وسعت معلومات اور ان کا حیرت افزا تبحر کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ شیخ تھانوی کی ان کتب مذکورہ میں سے بیشتر کی زبان اُردو میں ہیں، لیکن عربی میں بھی کم نہیں، پھر ان تالیفات کے علاوہ آپ کے وہ مواعظ وملفوظات ہیں، جو آپ نے مختلف مجالس اور جلسوں میں بیان فرمائے اور جن میں عجیب سے علوم اور بلندپایہ تحقیقات ہیں۔

علمائے دیوبند میں سے صرف ایک عالم مولانا الشیخ المفتیہ عزیز الرحمن دیوبندی نے مختلف سوالات کے جواب میں پچاس ہزار فتاوے صادر فرمائے۔ ان کے فتاوے دارالعلوم کے کتب خانے میں محفوظ ہیں اور شیخ تھانوی کے فتاوے کی ۸ ضخیم جلدیں طبع ہوچکی ہیں اور شیخ محدث وفقیہ مولانا رشید احمد گنگوہی کے فتاوے ۳ جلدوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ اس طرح ان حضرات کے علم ونفع کثیر کا دُنیا میں چرچا ہے۔ میں یہاں ان حضرات کی ان کتابوں کا اجمالی تذکرہ کرتا ہوں، جو تفسیر قرآن، شرح حدیث، شروح کتب حدیث اور علم وادب سے متعلق ہیں۔

علمائے دیوبند اور تفسیر قرآن

(۱) ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی۔ بزبان اُردو۔ اس پر عجیب وغریب فوائد تحریر فرمانے کا سلسلہ شروع کیا تھا، مگر ان کی تکمیل نہ فرماسکے۔

(۲) تکملہ فوائد شیخ الہند از محقق عصر مولانا شبیر احمد عثمانی سورۂ آل عمران اور سورۂ مائدہ سے آخر قرآن تک۔

(۳) تفسیر بیان القرآن ۱۲ حصص۔ از مولانا اشرف علی تھانوی، جو نفائس جلیلہ پر مشتمل ہے۔

(۴) خلاصہ تفسیر بیان القرآن، از مصنف موصوف۔

(۵) فتح المنان فی تفسیر القرآن از مولانا عبدالحق دہلوی، دیوبندی (تحصیلاً) آٹھ ضخیم جلدوں میں یہ تفسیر عربی اور اُردو دونوں میں مشتمل ہے، اور اس میں بلند پایہ فوائد ہیں۔

(۶) البیان فی علوم القرآن، از مولانا عبدالحق موصوف، یہ بہت ہی عمدہ کتاب ہے، اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔

(۷) ترجمہ قرآن، مولانا عاشق الٰہی، مع فوائد تفسیریہ (اُردو)

(۸) مشکلات القرآن از امام العصر مولانا محمد انورشاہ کشمیری (عربی)

(۹) اعجاز القرآن از محقق العصر مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی۔

(۱۰) حاشیہ تفسیر بیضاوی، کامل از مولانا عبدالرحمن امروہی (عربی)

(۱۱) حاشیہ تفسیر جلالین از مولانا حبیب الرحمن دیوبندی، سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند

(۱۲) سبق الغایات فی نسق الآیات (عربی) از حکیم الامۃ تھانوی

(۱۳) رسالہ اسرار قرآنی (اُردو) از مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ آپ کا ایک رسالہ آیات قبلہ کے اسرار میں ہے۔

(۱۴) درس تفسیر قرآن (اردو) از مولانا حسین علی پنجابی، تلمیذ حضرت شیخ گنگوہیؒ۔

(۱۵) تقریرات متعلقہ تفسیر قرآن : از مولانا عبید اللہ سندھی، دیوبندی جو ان کے بعض تلامذہ نے قلمبند کیں۔

(۱۶) حاشیہ تفسیر مدارک تا بقرہ از بعض علمائے دیوبند

(۱۷) فوائد تفسیریہ از مولانا احمد علی لاہوری، جو مولانا سندھی سے مستفاد ہیں۔

(۱۸) قرآن کریم کی چند سورتوں سے متعلقہ چند رسائل، از مولانا احمد علی لاہوری یہ بھی مولانا سندھی سے مستفاد ہیں۔

نوٹ : (مولانا احمد علیؒ لاہوری کے نام کا محمد علی لاہوری قادیانی کے نام سے التباس نہ ہونا چاہیئے۔ مولانا احمد علیؒ اہل حق میں سے ہیں اور محمد علی لاہوری طائفہ قادیانیہ مرزائیہ کے بڑے طاغوتوں میں سے تھا، قادیانیت کے بانی اور اس کے موافقین کی تکفیر پر علمائے ہند کا اجماع ہے، ان بر خود غلط دعاوی کی بنا پر جن کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مسٹر محمد علی لاہوری نے بھی بیان القرآن کے نام سے ایک تفسیر لکھی ہے، جس میں ہذیانات اور اباطیل ہیں، پس متنبہ رہنا چاہیئے۔)

(۱۹) شیخ محقق تھانویؒ کے دو رسالے، جن میں سے ایک میں نذیر احمد دہلوی پر اور دوسرے میں مولانا احمد علی کے رسائل پر تنقید کی ہے۔

(۲۰) ہدیۃ المہدیین فی تفسیر آیت خاتم النبیین، از مولانا محمد شفیع دیوبندی۔ خاصا بڑا اور عجیب رسالہ ہے۔

(۲۱) خاتم النبیین : امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری کا آیت خاتم النبیین میں ایک رسالہ ہے، جو بہت ہی عجیب و غریب علوم پر مشتمل ہے[۱]

(۲۲) عقیدۃ الاسلام : فی حیات عیسیٰ علیہ السلام، از امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلقہ آیات کی مبسوط شرح جو بہت سے علوم و لطائف پر حاوی ہے۔ قرآن کریم سے متعلقہ علمائے دیوبند کی تالیفات کا احاطہ بہت ہی دشوار ہے۔ بلا تأمل جو غیر مرتب طور پر اس وقت ذہن میں آئیں میں نے بطور نمونہ ان کا تذکرہ کر دیا۔ تاکہ علمائے دیوبند کی خدمت دین اور خدمت قرآن کا قدرے اندازہ ہو سکے۔ ورنہ تفصیل کے لیے دوسرا موقعہ درکار ہے۔

حاصل یہ کہ یہ جلیل القدر تالیفات ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے امت کو بہت ہی نفع پہنچایا، اور ان کو زمین میں حسن قبول عطا فرمایا جس سے توقع ہوتی ہے کہ وہ عند اللہ بھی مقبول ہوں گی۔ جیسا کہ کہا گیا ہے۔

انا لنرجوا فوق ذالک مظهرا

فضلائے دارالعلوم دیوبند کے مآثر میں سے نماز فجر کے بعد قرآن کریم کا درس دینا بھی ہے، جو ہندوستان کی بہت سی مساجد میں رائج ہے۔ اس درس کے ذریعے جمہور امت اور عوام مسلمین کو جو علوم دینیہ سے واقف نہیں، قرآن کے مقاصد کی جانب توجہ دلائی جاتی ہے اور یہ خدمت دین کی ایک جدید تحریک ہے، اور اس کے آثار بہت ہی عمدہ ہیں، حق تعالیٰ اس میں برکت فرمائے۔

دیوبند اور علم حدیث

علم حدیث میں علمائے دیوبند کی بہت سی تالیفات ہیں، جن کا احاطہ کرنا مشکل ہے، یہاں مختصر سی تعداد ذکر کرتا ہوں :

(۱) حاشیہ صحیح بخاری (عربی) از مولانا الشیخ احمد علی سہارنپوری (المتوفی ۱۲۹۷ھ) موصوف کا شمار اکابر علمائے دیوبند میں ہوتا ہے اور ان کا یہ حاشیہ ایک ضخیم شرح کا حکم رکھتا ہے۔

(۲) بذل المجہود فی شرح سنن ابی داؤد (عربی) از مولانا الشیخ خلیل احمد سہارنپوری (المتوفی ۱۳۴۶ھ) ۵ ضخیم جلدوں میں (اور اب مصر سے ۲۰ جلدوں میں

---

[۱] ماہنامہ بینات کراچی میں اس کا ترجمہ و تشریح قسط وار شائع ہو رہی ہے۔ مترجم۔

ناشر ہو رہی ہے۔ مترجم)

(۳) فتح الملہم فی شرح صحیح مسلم (عربی)، از محقق العصر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
یہ تین جلدوں میں ہے، دو جلدیں چھپ چکی ہیں، تیسری زیر طبع ہے (مکمل
باقی کی تکمیل نہ ہو سکی۔ مترجم)

(۴) فیض الباری بشرح صحیح البخاری (عربی)، یہ امام العصر مولانا الشیخ محمد انور شاہ کشمیریؒ کی تقاریر کا مجموعہ ہے، ان شاء اللہ متعدد جلدوں میں عنقریب مصر سے شائع ہوگی۔

(۵) العرف الشذی علی جامع الترمذی (عربی)، یہ شیخ محدث گنگوہیؒ کی تقاریر کا مجموعہ ہے۔

(۶) الکوکب الدری علی جامع الترمذی (عربی)، یہ شیخ محدث گنگوہیؒ کی تقاریر درس کا مجموعہ ہے۔

(۷) النفح الشذی شرح الترمذی (اردو)، یہ بھی حضرت گنگوہیؒ کی تقریر درس ہے۔

(۸) شرح سنن ابی داؤد (عربی)، امام العصر کی تقاریر کا مجموعہ۔ دو جلدوں میں

(۹) حاشیہ ابن ماجہ (عربی) از امام العصر

(۱۰) اوجز المسالک فی شرح موطا امام مالک (عربی)، از مولانا الشیخ محمد زکریا کاندھلوی متعدد ضخیم جلدوں میں۔ دو جلدیں طبع ہو چکی ہیں (کامل چھ جلدیں ہیں اور اب بیروت وغیرہ سے متعدد جلدوں میں شائع ہو رہی ہے۔ مترجم)

(۱۱) التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح (عربی)، از مولانا محمد ادریس کاندھلوی
اس کی چار ضخیم جلدیں دمشق سے شائع ہو چکی ہیں۔

(۱۲) اعلاء السنن، متعدد اجزاء میں (عربی)، اس میں امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی احادیث جمع کی گئی ہیں اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے زیر اشراف تالیف کی گئی ہے

(۱۳) الآثار (عربی)، از مولانا اشرف علیؒ۔ اس میں امام ابوحنیفہؒ کے اقوال ایک جزء میں جمع کئے ہیں۔

(۱۴) شرح شمائل ترمذی (عربی، اردو) از مولانا الشیخ محمد زکریا کاندھلوی

(۱۵) النبراس الساری فی اطراف البخاری (عربی)، از مولانا عبدالعزیز پنجابی دو جلدوں میں۔ فہارس البخاری کے نام سے اس پر مؤلف کا حاشیہ بھی ہے۔

(۱۶) حاشیہ نصب الرایہ للزیلعی (عربی)، اس کا نام بغیۃ الالمعی رکھا جائے۔ مجلس علمی کے زیر اہتمام مصر میں نصب الرایہ کے ساتھ زیر طبع ہے۔

(۱۷) التعلیق المحمود علی سنن ابی داؤد، مولانا فخر الحسن گنگوہی تلمیذ رشید شیخ محدث گنگوہیؒ کا نفیس اور مختصر حاشیہ ہے۔

(۱۸) حاشیہ ترمذی: جو شیخ محدث شیخ الہند دیوبندی کی جانب منسوب ہے۔

(۱۹) شرح تراجم بخاری: از شیخ الہند۔

یہ ان کے آخر دور کا مختصر سا جائزہ ہے، جو نسائی کے سوا صحاح ستہ کی شروح سے متعلق ہے۔ جن کتابوں کا نام تذکرے سے رہ گیا ہے ان کی تعداد بھی معمولی نہیں ہوگی۔ اس پر ان علمی رسائل کا مزید اضافہ کر لیا جائے جو حدیث کے مباحث سے مزین ہیں، مثلاً ایضاح الادلہ، اوثق العریٰ، احسن القریٰ، القطوف الدانیہ، اسرار البیع، المصابیح، فصل الخطاب، فاتحۃ الخطاب، کشف الستر، نیل الفرقدین۔ ان کے علاوہ دیگر رسائل جو احادیث و فقہ کے مختلف موضوعات پر ان اکابر نے تالیف فرمائے ہیں اور اس مقالے میں ان سب کے تذکرے کی گنجائش نہیں۔

دیوبند اور علم و ادب

علمائے دیوبند نے علم و ادب پر بھی بڑی عمدہ اور نافع کتابیں تالیف کی ہیں۔ چند نام حسب ذیل ہیں:

(۱) شرح حماسہ از مولانا فیض الحسن سہارنپوری، تلمیذ حضرت گنگوہیؒ۔ یہ نفیس شرح فیضی کے نام سے معروف ہے۔

(۲) تسہیل الدراسہ شرح دیوان حماسہ (عربی۔ اردو) از مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، والد ماجد شیخ العصر مولانا شیخ الہند مولانا محمود حسن

(۳) التبیان شرح دیوان متنبی۔ از مولانا موصوف

(۴) التعلیقات علی سبع المعلقات، از مولانا موصوف ایضاً

(۵) عطر الوردہ فی شرح البردہ، ایضاً نفیس شرح ہے

(۶) الارشاد الی بانت سعاد۔ ایضاً قصیدہ کعب بن زہیرؓ کی عجیب شرح۔

(۷) فتح المغلقات شرح المعلقات۔ از مولانا نظام الدین کیرانوی

(۸) شرح حماسہ از مولانا محمد اعزاز علی امروہی شیخ الادب دارالعلوم دیوبند

(۹) شرح دیوان متنبی، ایضاً۔

(۱۰) التعلیقات شرح المعلقات: از مولانا نور الحق، تلمیذ مولانا محمود حسن استاذ ادب کالج لاہور

(۱۱) درایۃ المتیقظ علی کفایۃ المتحفظ لابن الاجدابی۔ از بعض فضلائے دیوبند

(۱۲) حاشیہ نفحۃ الیمن از مولانا محمد شفیع دیوبندی۔

پس یہ قرآن و حدیث اور ادب سے متعلق آثار ہیں اور یہ جواہر علمائے دیوبند کے قلم کے رہین منت ہیں۔ ان کے علاوہ اصول فقہ، فقہ حنفی، علم عقائد، فرائض، تصوف، سیرت نبویہ اور تاریخ اسلام وغیرہ سے متعلق اکابر دیوبند کی تصانیف بے شمار ہیں، جن کے تعارف کے لیے دوسرا موقعہ درکار ہے، ان تمام امور سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے ساری عمر درس و تقریر کے ذریعے قوم کو حیات علمی کی روح پھونکنے میں اپنی زندگی صرف کر دی اور ان مآثر جلیلہ کے مقابلے میں مذکورہ بالا آثار نسبتاً ہی معمولی ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ علمائے دیوبند ہیں اور یہ ان کے آثار ہیں، جو ان کی علمی خدمت میں بلندی مرتبت پر شاہد ہیں۔ تو قع ہے کہ ایک تجربہ کار صاحب بصیرت ان آثار کی قدر شناسی کرے گا۔ اگر ایسے قلب میں انصاف اور فکر میں بصیرت عطا کی گئی ہو۔ اور ان آثار کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ ہندوستان کے جمہور مسلمانوں میں اس کی تاثیرات کو ملاحظہ فرمایا جائے۔

تلك آثارنا تدل علينا
فانظروا بعدنا الى الآثار

اگر تم چاہتے ہو کہ ایسے مردانِ راہ کی زیارت کرو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک وجاہت رکھتے ہوں، مگر انسانوں میں گمنامی کو پسند کرتے ہوں تو ان علمائے دیوبند کو جا کر دیکھو۔ اگر صحف و مجلات اور اخبار و جرائد میں ان کا ذکر نہیں تو نہ ہو۔ ان کا ذکر خیر مخلوق کی زبانوں پر ہے۔ قلوب ان کی گواہی دیتے ہیں عالم کے جنات اور کائنات کے صحیفے ان کے شاہد ناطق ہیں۔ اور اگر اس سے کچھ لوگ جاہل یا متجاہل ہیں، تو کچھ افسوس اور شکایت نہیں اور جو کچھ جو چیز کہ اللہ کے پاس ہے، وہ زیادہ بہتر اور پائدار ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ دیوبندی تحریک یا صحیح معنوں میں ہندوستان کی دینی و علمی تحریک دراصل اسی دہلوی تحریک کی تجدید ہے، جس کے لیے امام شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادگان گرامی قدر اُٹھے تھے اور دوسری جہت سے دیکھئے تو یہ اس تحریک کی تکمیل اور تشئید ہے۔ پس اکابر دیوبند اس جماعت کا نام ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے خدمت دین، خدمت علم دین، خدمت علوم قرآن و سنت کے لیے منتخب فرمایا اور اس بیان پر تعجب کیوں کیجیے۔ آفتاب اپنے مطلع سے طلوع ہو چکا ہے اور چیز اپنے معدن میں اجنبی نہیں رہی۔ اس کی بوئے عنبریں اقطار ہند میں مشام جان کو معطر کر رہی ہے اور اس کے چشمے اُبل اُبل کر زمین کے اطراف و اکناف کو سیراب کر رہے ہیں۔ اس کے انوار و برکات آفاق و بلاد کو روشن کر رہے ہیں اور یہ روشنی صفحات ایام پر مسلسل پھیلتی جائے گی۔

● پس یہ ہیں علمائے دیوبند اور ان کا علمی مرکز ●

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ

محمد یوسف بنوری، عفی عنہ، نزیل قاہرہ

مقالہ
حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب

تلخیص
مشوف محمد اقبال قریشی

مفتی اعظم پاکستان حضرت اقدس سیدی و مرشدی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دظلہٗ دیوبندی دامت برکاتہم نے جمعرات ۳۰ر نومبر ۱۹۷۰ء کی شب دارالحدیث دارالعلوم دیوبند کے وسیع ہال میں طلباء دارالعلوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ: "آپ حضرات کو ابھی اس نعمت خداوندی کی قدر نہیں ہے کہ اُس نے آپ کا تعلیمی رشتہ دارالعلوم دیوبند سے منسلک کر دیا، جب اس بسم اللہ کے گنبد سے آپ باہر نکلیں گے اور کتاب و سُنّت اور فقہی مسائل کی تعبیر میں آپ کو افراط و تفریط کا ایک بھیانک منظر نظر آئے گا، اُس وقت معلوم ہوگا کہ دیوبند اور اس کا معتدل مسلک کیسی عظیم نعمت ہے، میں بھی طالب علمی کے زمانے میں آپ کی طرح محض اپنے والدِ مرحوم کے حکم کی تعمیل میں دارالعلوم سے متعلق ہوا، یہاں کے اساتذہ سے اپنے حوصلہ کے مطابق علم حاصل کیا اور مسلک دیوبند بھی تقلیداً اختیار کیا۔ لیکن دنیا کے نشیب و فراز اور رنگ دیکھے، فرقہ وارانہ مباحث سے گزرنے کے بعد اپنی تحقیق سے اس مسلک اعتدال کی خوبیاں مستحضر ہوئیں، وطن کے اعتبار سے تو میں دیوبندی فطرۃً تھا اور مسلک کے اعتبار سے تقلیداً۔ لیکن طویل غور و فکر، بحث و تحقیق کے بعد مسلک دیوبند کے اتباع کا محض تقلید سے نہیں بلکہ بصیرت سے پابند ہوں۔" (نقوش و تأثرات و سفر نامہ بعنوان "دیوبند" ص۴۳)

نیز آپ نے ایک مرتبہ مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "ایک صدی میں اس مرکز علوم دارالعلوم دیوبند سے دُنیا کے ہر خطے میں علم نبوت پھیلے۔ دہلی اور دیوبند کے مراکز علوم کی اہم خصوصیت اسلامی فرقوں اور جماعتوں کے اختلافی مسائل میں نظری اور فکری اعتدال، علم کے ساتھ عمل اور ظاہر کے ساتھ

باطن کی اصلاح رہی ہے، یہی دیوبند کا طرۂ امتیاز ہے، جس نے اسے قبولیت عامہ اور خاص برکات کا مظہر بنایا۔ نظریاتی اعتدال میں تو دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ کا رسالہ دیکھنے کے قابل ہے ملاہنامہ بینات کراچی، ربیع الآخر ۸۸ھ

"علماء دیوبند کا مسلک" از حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب مدظلہ شیخ الحدیث مدرسہ قاسم العلوم ملتان نے فرمایا کہ:

"یہ مقالہ سراسر الہامی معلوم ہوتا ہے" ... (ماہنامہ الصدیق اگست ۱۹۶۴ء)

اس لیے بندہ برادر محترم مولانا عبدالرشید ارشد صاحب مدظلہٗ کے ارشاد پر باوجود ضعف و علالت کے اس کی تلخیص شروع کرتا ہے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔ بندہ محمد اقبال قریشی

خادم مجلس صیانۃ المسلمین، ہارون آباد ۔ ۱۰ رجب ۱۳۹۵ھ

علماءِ دیوبند اپنے مسلک کے اعتبار سے حقیقتاً اہلِ سنت والجماعت ہیں

علماء دیوبند اپنے مسلک اور دینی رُخ کے لحاظ سے کوئی اہلسنت والجماعت ہیں اور اہل سنت کا بھی اصل حصہ ہیں، جس سے وقتاً فوقتاً مختلف شاخیں کٹ کٹ کر الگ ہوتی رہی ہیں، علماء دیوبند نے نہ صرف اہلسنت والجماعت کے تمام اصول و قوانین ہی کے از اوّل تا آخر پابند رہے ہیں، بلکہ ان کے متوارث ذوق کو بھی انھوں نے تھاما۔ پھر وہ خود نو قسم کے اہلسنت نہیں، بلکہ اُوپر سے ان کا استناد اور سند کا سلسلہ ملا ہوا ہے، اس لیے مسلک کے اعتبار سے نہ وہ کوئی جدید فرقہ ہیں، نہ بعد کی پیداوار ہیں بلکہ وُہی قدیم اہلسنت والجماعت کا مسلسل سلسلہ ہے، جو اُوپر سے تسلسل و استمرار اور سند متصل کے ساتھ کابراً عن کابر چلا آرہا ہے۔

سو اہلسنت والجماعت کے اس اصل طبقہ یا علماء دیوبند کے اس جامع اور معتدل ترین مسلک کو سمجھنے کے لیے جس میں افراط ہے، تفریط، نہ غلو ہے، نہ مبالغہ بلکہ کمال اعتدال و جامعیت کا جوہر پیوستہ ہے۔ اس کے لقب اور ماخذ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو اجزاء سے مرکب ہے، ایک السنت جس سے اصول، قانون اور طریق نمایاں ہے اور الجماعت کے لفظ سے ذوات شخصیات اور رفقائے طریق نمایاں ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس مسلک میں اصول و قوانین بغیر ذوات کے (مثلاً القرآن الحکیم اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یعنی عمل کا نمونہ خود آپ نے کرکے دکھایا اور آپ کے متبعین حضرات صحابہ کرام رض، ائمہ مجتہدینؒ وغیرہم) اور ذوات بغیر قوانین کے معتبر نہیں، کیونکہ قوانین ان ذوات ہی کے راستے سے آتے ہیں۔ اس لیے ماخوذ کو لیا جانا اور ماخذ کو چھوڑ دینا کوئی معقول مسلک نہیں ہو سکتا، اس لیے حدیث مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ میں بہتر فرقوں میں سے فرقۂ حقہ کی نشاندہی فرماتے ہوئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معیارِ حق ان ہی دونوں چیزوں کو قرار فرمایا۔ مَا سے اشارہ اسی السنۃ یعنی روشِ نبوی یا قانونِ دین کی طرف ہے جس سے ملت حقہ پیدا ہوئی اور جس سے پھر مختلف دینی شعبے بنے اور أَنَا وَ أَصْحَابِيْ[1] سے اشارہ الجماعۃ یعنی برگزیدہ شخصیتوں کی طرف ہے، جو پیغمبر سے شروع ہوئیں اور بعد میں دینی شعبوں میں کسی نہ کسی شعبہ حذاقت و مہارت سے بنتی رہیں، جس سے فرقۂ حقہ پیدا ہوا۔

---

[1] بلکہ امام احمد و ابوداؤد میں اسی مضمون کی روایت میں وَأَصْحَابِيْ کی جگہ الجماعۃ کا صریح لفظ موجود ہے۔

ان سب صحابہؓ سے لے کر تابعین ائمہ مجتہدین اور علماء
حق تک اسلام کے مسلک کی عظمت و محبت اور متابعت اور ادب و احترام
اس مسلک کا جوہر ہے۔ کیونکہ خود دینی شخصیتیں ذات نبویؐ کے ظلال ہے
ہیں ... اسے دینی شخصیت کیوں کہا جاتا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ
وسلم ان ساری شخصیتوں کے جامع اور ان میں فرد اکمل ہیں
شریعت کے تمام علمی و عملی شعبے بلکہ دین کی ساری حیثیتیں حضور
صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی مختلف الانواع نسبتوں کے ثمرات و آثار ہیں۔ مثلاً
آپؐ کی نسبت ایمانی سے عقائد کا شعبہ پیدا ہوا جس کا فنی اور اصطلاحی
نام کلام ہے۔ آپؐ کی نسبت اسلامی سے عملی احکام کا شعبہ پیدا ہوا
جس کا اصطلاحی نام فقہ ہے۔ آپؐ کی نسبت احسانی سے تزکیۂ نفس اور
تکمیل اخلاق کا شعبہ پیدا ہوا جس کا اصطلاحی نام تصوف ہے۔ آپؐ
کی نسبت اعلاء کلمۃ اللہ سے سیاست و جہاد کا شعبہ پیدا ہوا جس
کا عرفانی لقب امارت و خلافت ہے۔ آپؐ کی نسبت استنادی سے
سند کے ساتھ نقل دین کا شعبہ پیدا ہوا جس کا اصطلاحی نام فن روایاتؐ و
اسناد ہے، آپؐ کی نسبت استدلالی سے حجت طلبی اور حجت بیانی کا
شعبہ پیدا ہوا جس کا اصطلاحی نام درایت و حکمت ہے، آپؐ کی
نسبت اشراقی سے علوم فراست و معرفت کا شعبہ پیدا ہوا جس کا
اصطلاحی نام فن حقائق و اسرار ہے، آپؐ کی نسبت استقرائی سے کلیات
دین کا شعبہ پیدا ہوا جس کا اصطلاحی نام فن اصول ہے، خواہ اصول
فقہ ہوں یا تفسیر و حدیث وغیرہ، آپؐ کی نسبت اجتماعی سے تعاون باہمی
اور حسن معاشرت کا شعبہ پیدا ہوا، جس کا فنی اور اصطلاحی نام حضارۃ
و مدنیت ہے، آپؐ کی نسبت تیسیری سے سہولت پسندی اور میانہ
روی کا شعبہ پیدا ہوا، جس کا اصطلاحی لقب عدل و اقتصاد ہے۔ پھر
شرعی حجتوں کا سلسلہ دیکھیے جس سے اس جامع شریعت کا وجود ہوا ہے
آپؐ کی نسبت انبائی (نبوت) سے وحی متلو کا ظہور ہوا جس کے مجموعہ کا
نام القرآن ہے، آپؐ کی نسبت الہامی اور وجدانی سے استنباط و
استخراج مسائل کا ظہور ہوا، جس کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے۔ آپؐ کی
نسبت حاکمیت سے اُمت میں دوامی حجیت اور عدم اجتماع بر ضلالت
کا مقام پیدا ہوا جس سے اس میں حجت کی شان طاری ہوئی جس کا
اصطلاحی نام اجماع ہے۔ غرض آپؐ ہی کی نسبتوں سے دین کی چار
حجتیں قائم ہوئیں یعنی کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع
امت اور اجتہاد مجتہد۔ اگرچہ ان کے اصطلاحی نام بعد میں رکھے گئے
مگر ان کی حقیقتیں قدیم اور پہلے ہی سے ذات نبوت سے وابستہ تھیں
ان سب کو علماء دیوبند نے جوں کا توں لے کر اپنے مسلک کا جزو بنا لیا
اور وہ اس کے مسلک کے عناصر ترکیبی قرار پاگئے۔ پھر ہر طبقے میں کمال
حذاقت و مہارت اور خداداد فراست و بصیرت کے لحاظ سے اس
فن کے مدار اور اولوالامر پیدا ہوئے اور وہ اس فن میں اس درجہ
منہمک و فانی ہوئے کہ یہ فن ان کا اوڑھنا بچھونا اور جوہر نفس ہوگیا۔
ایسی شخصیتوں کو ان فنون کا امیرالمؤمنین اور [illegible] پکارا گیا۔ اور وہ
امام و مجتہد کے ناموں سے یاد کیے گئے۔ مثلاً ائمہ اجتہاد و امام ابوحنیفہؒ
امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ۔ ائمہ حدیث جیسے
بخاریؒ و مسلمؒ، ابوداؤدؒ وغیرہ۔ ائمہ تصوف جنیدؒ و شبلیؒ اور معروفؒ و
بایزیدؒ وغیرہ۔ ائمہ درایت و تفقہ، ابویوسفؒ، محمد حسن، مزنی اور ابن حبیبؒ
وغیرہ ائمہ حکمت و حقائق رازیؒ و غزالیؒ و ابن عربیؒ، ائمہ کلام ابوالحسن اشعریؒ، ابومنصور ماتریدیؒ وغیرہ
ائمہ اسلام فخرالاسلام بزدویؒ و علامہ دبوسیؒ وغیرہ اور اسی قسم کی
دین کی برگزیدہ شخصیتیں، مسلک علماء دیوبند کے اعضاء و اجزا قرار پائے جن
کی درجہ بدرجہ توقیر و عظمت مسلک کا دوسرا اہم ترین رکن ہے۔ پس جیسے
علماء دیوبند کا رجوع ان شعبوں کی طرف یکساں ہے اور کسی ایک شعبے پر
غلو کے ساتھ زور دینا ان کا مسلک نہیں کہ وہ تصوف کو لے کر حدیث سے
بے نیاز ہو جائیں یا حدیث کو لے کر تصوف و کلام سے بیزاری کا اظہار کریں

اس لیے علماء دیوبند کے محدث ہونے کے یہ معنے نہ ہوں گے کہ وہ متکلم کو کم رتبہ سمجھیں، صوفی ہونے کا یہ مطلب ہوگا کہ صوفی کو حقارت سے دیکھیں یا صوفی ہونے کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ وہ متکلم کو کم رتبہ سمجھیں فقیہ ہونے کے یہ معنی نہ ہونگے کہ وہ حدیث سے بیگانہ ہوں جبکہ یہ تمام نوع شخصیتیں کسی نہ کسی جہت سے آثارِ نبوت سے ہیں جیسا کہ صحابہؓ میں ہر رنگ اور ہر طبقے کے افراد جمع تھے اور ایک دوسرے کی عظمت و محبت اور ادب و احترام میں بھی انتہائی مقام پر تھے، تمام شعبہ ہائے دین جن شخصیتوں میں جمع ہوتے، ان میں جامعیت کی شان پیدا ہوتی، یہ الگ بات ہے کہ کسی شخصیت پر غلبہ کسی خاص شعبے یا فن کا رہا ہو۔ الحمد للہ اکابر دیوبند میں ایسی شخصیتیں رہی ہیں اور موجود ہیں

تمام دینی شعبوں کا خلاصہ

پھر ان تمام دینی شعبوں کے اصول و قوانین کا خلاصہ دو ہی چیزیں ہیں، عقیدہ اور عمل۔ عقیدے میں بنیادی عقیدہ اور تمام عقائد کی اساس توحید ہے اور عمل میں سارے اعمال کی بنیاد اتباعِ سنت و پیروئ اسوۂ حسنہ ہے۔

توحید

اس مسلک میں اصل چیز توحیدِ خداوندی پر زور دینا ہے جس کے ساتھ شرک یا موجباتِ شرک جمع نہ ہو سکیں اور کسی بھی غیر اللہ کی اس میں شرکت نہ ہو، لیکن ساتھ ہی تعظیمِ اہل اللہ اور توقیرِ اہلِ فضل و کمال کو اس کے منافی سمجھنا مسلک کا کوئی عنصر نہیں اور ایسے ہی تعظیمِ شخصیات میں مبالغہ کرنا جس سے توحید میں خلل پڑتا ہو یا اس میں شرک کی آمیزش کر دینا جو تعظیم کا غلو ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں علماء دیوبند کا نقطۂ اعتدال یہ ہے کہ یہ مقدسین پیغامِ الٰہی کے امین ہیں، جنہوں نے کمالِ دیانت اور عزم و احتیاط کے ساتھ پیغامِ الٰہی مخلوق تک پہنچایا، وہ عالم کے معلم و مربی ہیں، جو ہر تعظیم و عظمت کے مستحق اور ہر ادب و احترام کے مستوجب ہیں، مگر ساتھ ہی اس مسلک کا اہم جزو یہ بھی ہے کہ وہ بشر بھی ہیں، نوعِ بشر سے الگ اُن کی کوئی نوع نہیں، اس لیے جہاں ان کی بے ادبی کفر اور عظمت عین ایمان ہے، وہیں اس عظمت میں کفر کی آمیزش بھی کفر سے بڑھ کر کفر ہے۔

خاتم الانبیاء سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

علماء دیوبند بصدقِ قلب حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو افضل الخلق افضل البشر اور افضل الانبیاء یقین کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی آپؐ کی بشریت کا بھی اقرار کرتے ہیں۔ غلوئے عقیدت و محبت میں نفی بشریت یا ادعاء نورانیت یا پردۂ مجاز وغیرہ کہنے کی جرأت نہیں کرتے۔ وہ آپؐ کی ذاتِ بابرکات کو تمام انبیاء کرام کی تمام کمالاتی خصوصیات خلّت، اصطفائیت کلیمیت، روحیت، صادقیت، خلیلیت اور صدیقیت وغیرہ کا جامع بلکہ مبدأ نبوتِ انبیاء اور منشأ ولایتِ اولیاء سمجھتے ہیں لیکن پھر بھی آپؐ کا سب سے بڑا کمال عبدیت سمجھتے ہیں، وہ آپؐ کے علوِّ درجات ثابت کرنے کے لیے حدودِ عبدیت کو توڑ کر حدودِ معبودیت میں پہنچا دینے سے مدد نہیں لیتے وہ آپؐ کی اطاعت کو فرض عین سمجھتے ہیں، لیکن آپؐ کی عبادت کو جائز نہیں سمجھتے، وہ آپؐ کی خصوصیاتِ الوہیت تسلیم نہیں کرتے، اور اس میں ذاتی و عرضی کا فرق بھی تسلیم نہیں کرتے، وہ آپؐ کے ذکرِ مبارک اور مدح و ثناء کو عین عبادت سمجھتے ہیں، لیکن اس میں عیسائیوں کے مبالغے جائز نہیں سمجھتے ہیں کہ حدودِ بشریت کو حدودِ الوہیت سے جا ملائیں، وہ برزخ میں آپؐ کی جسمانی حیات کے قائل ہیں، مگر وہاں معاشرتی زندگی کے قائل نہیں، وہ اس کے اقراری ہیں کہ آج بھی اُمت کے ایمان کا تحفظ گنبدِ خضراء ہی کے منبعِ ایمانی سے ہو رہا ہے، لیکن پھر بھی آپؐ کو حاضر

...لا ہیں جانتے، جو خصوصیاتِ الوہیت میں سے ہے، وہ آپ
کے علم کو ساری کائنات کے علم سے خواہ ملائکہ ہوں یا انبیاء واولیاء
سب سے بے شمار زیادہ اور بالاتر جانتے ہیں، لیکن پھر بھی اس کے
... محیط ہونے کے قائل ہیں۔ غرض تمام ظاہری و باطنی کمالات
آپ ساری مخلوقات میں بلحاظ کمال و جمال یکتا، بے نظیر اور بے مثال
تسلیم کرتے ہیں، لیکن خالق کے کمالات سے ان کے کمالات کی وہی
نسبت مانتے ہیں جو مخلوق کو خالق سے ہو سکتی ہے کہ خالق کی ذات
و صفات اور کمالات سب لامحدود اور مخلوق کی ذات و صفات
اور کمالات سب محدود۔ وہ ذاتی ہیں یہ عرضی اور عرضی ہو کر بھی محدود
وہ ماورا ہیں اور یہ عطا کا ثمرہ، پس یہ حدود کی رعایت ہی
نقطۂ اعتدال ہے، جو اس مسلکِ اعتدال کی اساس ہے۔

صحابۂ کرامؓ

علماء دیوبند صحابہ کی عظمت اور جلالت پر اس کے قائل نہیں
کہ کسی کو ذاتی محبت بخشیں اور کسی کو معاذ اللہ ذاتی عداوت۔ کسی کی مدح
میں رطب اللسان ہوں اور معاذ اللہ کسی کی مذمت میں، وہ انہیں
بلا استثناء نجومِ ہدایت مانتے ہیں کہ بعد والوں کی نجات ان ہی کے علمی
و عملی اتباع کے دائرے میں محدود ہے، لیکن انہیں شارع تسلیم نہیں
کرتے کہ حقِ تشریع ان کے لیے ماننے لگیں، علماء دیوبند کے نزدیک
سب صحابہؓ شرفِ صحابیت اور صحابیت کی برگزیدگی میں یکساں ہیں
اس لیے محبت و عظمت میں بھی یکساں ہیں، البتہ ان میں باہم فرقِ
مراتب بھی ہے تو عظمتِ مراتب میں بھی فرق ہے، لیکن یہ چونکہ نفسِ صحابیت
کا فرق نہیں، اس لیے محبت و عقیدت میں فرق نہیں پڑ سکتا۔ پس اس
مسلک میں الصحابة كلهم عدول (صحابہؓ سب کے
سب عادل تھے) کا اصول کارفرما ہے، جو اس مسلک کا سنگِ بنیاد
ہے معیارِ حق بحیثیت فرق، جمیع من حیث الطبقہ، نہ کہ ذات
کے لیے نبی کے قائم مقام اور معیارِ حق ہیں۔ نبوت کے منکر کی طرح ان کے
اجماع کا منکر بھی کافر ہے اور جو ان کے بارے میں بدگمانی یا بدزبانی کا
شکار ہے، وہ حقانیت سے جدا ہو گیا ہے۔ علماء دیوبند انہیں ہمیشہ
کفر کے بجائے بوجوہ محفوظیتِ دین انہیں قابلِ تنقید و تبصرہ نہیں سمجھتے کہ
معاملہ انہیں اپنی تنقیدات کا ہدف بنائیں، ان کے مشاجرات اور باہمی
نزاعات میں خطا و صواب کا تقابل ہے، حق و باطل یا طاعت و معصیت
کا نہیں اور سب جانتے ہیں کہ مجتہد خاطی کو بھی اجر ملتا ہے نہ کہ زجر۔
پس ان کے معاملات میں جو نیک نیتی اور پاک نفسی پر مبنی تھے، حسبِ مسلک
علماء دیوبند نہ بدگمانی جائز ہے نہ بدزبانی۔ یہ توجیہ … ہے تلك
دماء طهر الله عنها ایدینا فلا نلوث بها السنتنا

تصوف اور صوفیاء

علماء دیوبند جملہ اولیائے امت (خواہ وہ کسی سلسلے کے ہوں)
کی محبت و عظمت کو تکملۂ ایمان کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، مگر غلو کے ساتھ
اس محبت و عقیدت میں انہیں ربوبیت کا مقام نہیں دیتے، ان کی
تعظیم ضروری سمجھتے ہیں، لیکن اس کے معنی عبادت کے نہیں لیتے کہ انہیں
یا ان کی قبروں کو سجدہ و رکوع یا طواف و نذر یا منت و قربانی کا محل بنا
لیا جائے، وہ ان کی منور قبروں سے استفادہ اور فیض حاصل کرنے
کے قائل ہیں، لیکن انہیں مشکل کشا اور دافع البلاء والوباء نہیں سمجھتے کہ وہ
صرف شانِ کبریائی ہے، وہ اہلِ قبور سے حصولِ فیض کے قائل ہیں، استمداد
کے نہیں، وہ حاضریٔ قبور کے قائل ہیں، مگر ان کے عید گاہ بنانے کے قائل
نہیں، وہ مجالس ابدال میں شروط و قیود کے ساتھ نفسِ سماع کے منکر نہیں
مگر گانے بجانے کے کسی درجے میں بھی قائل نہیں، البتہ نسبتِ نبوت
اور اتباعِ سنت کے غلبہ کی وجہ سے سماع سے الگ رہنا قابلِ مدحت

نہیں، قابلِ مدح ہے۔ مشائخ دیوبند کا عمومی معمول اس بارے میں یہی ہے کہ وہ رسوم شادی و غمی کو اسوۂ حسنہ اور سلف صالحینؒ کے سادہ اور بے تکلف طریق عمل میں محدود رکھنا چاہتے ہیں، وہ غمی کی رسوں مثلاً تیجہ، دسواں، چہلم، برسی وغیرہ کو بدعت سمجھتے ہیں اور سختی سے روکتے ہیں، کیونکہ وہ ثواب سمجھ کر کی جاتی ہیں اور شادی کی رسوم تمدن و ثقافت کے جذبے سے انجام دی جاتی ہیں۔ اس لیے وہ ان رسوم محض خلافِ سنت ہیں اور خلافِ سنت میں عقیدہ محفوظ نہیں رہتا، وہ ایصالِ ثواب کو مستحسن اور اموات کا حق سمجھتے ہیں، مگر اس کی محض نمائشی صورتیں بنانے کے قائل نہیں، جنہیں مخصوص اصطلاحات نیاز، فاتحہ وغیرہ کے وضع کردہ عنوانات سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ تکمیلِ اخلاق اور تزکیۂ نفس کیلئے حسبِ اصول طریقت مشائخ کی بیعت و صحبت کو حق اور طریقت کے اصول و ہدایات کی پابندی تجربۃً مفید اور ضروری سمجھتے ہیں، لیکن طریقت کو شریعت سے الگ کوئی مستقل راہ نہیں سمجھتے، بلکہ شریعت ہی کے باطنی اور اخلاقی حصہ کو طریقت کہتے ہیں، جسے شریعت نے احسان کہا ہے۔

وہ مشاہد و آثار صلحاء کی برکت اور ان سے تبرک و استفادہ کے قائل ہیں، مگر انہیں سجدہ گاہ بنا لینے کے قائل نہیں، اگر آثار نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام جیسے موئے مبارک، پیرہن مبارک یا نعلین مبارک کا ایک تسمہ بھی مستند طریق پر مل جائے تو اسے سلاطین کے تاج اور دنیا و مافیہا کی ہر دولت سے کہیں زیادہ بڑھ کر دولت سمجھتے ہیں، غیر مستند ہوں تو بے ادبی سے بچ کر بے سند چیزوں سے کنارہ کش ہو جانا ضروری سمجھتے ہیں۔

اولیاء اللہ کے شطحیات اور غلبۂ حال کے کلمات و افعال کے بارے میں علماء دیوبند کا مسلک یہ ہے کہ وہ نہ تو ان اقوال و افعال کی بنا پر جنکی سطح بظاہر سنت و شریعت سے ہٹی ہوئی نظر آتی ہے، ان حضرات کی شان میں ادنیٰ بے ادبی و گستاخی کو جائز نہیں سمجھتے اور نہ ہی ان موہم یا مبہم کلمات کو غلو سے محبت میں شریعت سمجھتے ہیں۔ نہ انہیں کوئی حجتِ شرعی سمجھتے ہیں کہ ان کی طرف لوگوں کو بلائیں اور نہ ہی انہیں اسلام سے خارج کرنے کے درپے ہوتے ہیں، درحقیقت ایسے کلمات و افعال انکا ایک مخصوص حال ہے، جو بظاہر خلافِ سنت معلوم ہوتا ہے، درحقیقت نہیں، عارف اور بصیر علماء نے ان کی توجیہات میں مستقل رسائل تالیف کر دیئے ہیں، اس مسلک کا جزو جہاں یہ ہے کہ مغلوب الحال اہل اللہ کا عذر قابلِ قبول اور قابلِ تاویل ہے، وہاں یہ جزو بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ مغلوب الحال کوئی اونچا مقام نہیں بلکہ ایسے مقام میں علوِ مقام کی بات یہ ہے کہ ان سے سنت و شریعت ہاتھ سے نہ چھوٹے، مشائخ دارالعلوم کی روش اس بارے میں یہی رہی ہے کہ وہ غلبۂ حال میں از خود رفتہ نہیں ہوتے اور اتباع سنت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

فقہ اور فقہاء

علماء دیوبند کا مسلک فقہی اور اجتہادی مسائل میں فقہ حنفی پر عمل کرنا ہے، لیکن اسے آڑ بنا کر دوسرے فقہی مذاہب کو باطل ٹھیرانا یا ائمہ مذاہب پر زبانِ طعن دراز کر کے عاقبت خراب کرنا نہیں کیونکہ یہ حق اور باطل کا مقابلہ نہیں، سب ائمہ حق پر ہیں، دین کے بارے میں آزادیٔ نفس سے بچنے اور خود رائی سے دور رہنے کے لیے کسی ایک امام کی تقلید ضروری ہے، تقلید میں بھی علماء دیوبند کا مسلک افراط و تفریط سے پاک ہے وہ کسی بھی امام مجتہد یا اس کے فقہ کی کسی چھوٹی سے چھوٹی جزئی کے بارے میں تمسخر یا سوءِ ادب یا رنگِ ابطال و تردید سے پیش آنے کو خرابیٔ دنیا و آخرت سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک یہ اجتہادات شرائع فرعیہ ہیں شرائع اصلیہ نہیں کہ اپنے فقہ کو موضوع بنا کر دوسروں کی تردید کریں البتہ

ہے مختلف فیہ کردہ فقہ کی حد تک ترجیح پر محمول ہیں

حدیث اور محدثین

علماء دیوبند کے مسلک میں قوتِ سند یا اصح ما فی الباب ہونا ہی نہیں، بلکہ بحیثیت جمع مناطِ حکم اور بصورتِ ترجیح تفقہ اصل ہے۔ حنفیہ کے یہاں بلاشبہ جمع بین الروایات اور تحقیق و تنقیح مناط کی وجہ سے ترجیحات کی کثرت ہے کہ اس کے بغیر روایات باہم جوڑ کر علم کا جامع نقشہ پیش نہیں کر سکتیں۔ مگر یہ ترجیحات و تاویلات محض یا تخمینی بات نہیں، بلکہ اصول اور نصوص سے مؤید ہونے کی وجہ سے تقریباً تفصیلاتِ حدیث ہم پلہ ہوتی ہیں۔ اس لیے حدیث کے بارے میں علماء دیوبند کا غالب عنصر جامعیت و اعتدال ہے، جس میں نہ تشدد ہے، نہ تساہل بلکہ وہ روایات کے ساتھ تمام ان کے اصول کو لے کر چلتا ہے

کلام اور متکلمین

علماء دیوبند کا مسلک تمام متکلمین کی عظمت کے ساتھ امام ابو منصور ماتریدی کا اتباع ہے، لیکن یہاں بھی کلامِ معین کی پابندی و اتباع کے ساتھ تحقیق کا سرا ہاتھ سے نہیں دیا گیا، کلامی مسائل کے ساتھ علماء دیوبند میں قاسمیت غالب ہے، جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی حکیمانہ تعلیمات سے ماخوذ ہے، جس کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کے اختلافات میں رد و قدح کی بجائے رفعِ اختلافات اور تطبیق و توفیق کا راستہ اختیار کیا گیا ہے، جس سے بڑے سے بڑا اختلاف نزاعِ لفظی محسوس ہونے لگتا ہے مذہب کے مخالف جنگ کرنے والوں نے عقل کو بڑا استعمال کیا ہے، علماء دیوبند کا اس کے بارے میں نقطۂ اعتدال یہ ہے کہ وہ دین کے بارے میں نہ تو عقل کو ناکارہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی اسے مستقل درجہ دیتے ہیں، وہ عقل سے نقل کو نہیں پرکھتے، بلکہ نقلِ صحیح کو عقل کے صحت و سقم کے پرکھنے کی کسوٹی سمجھتے ہیں، وہ عقل کو محسوسات کے ناپ تول کا ترازو سمجھتے ہیں مغیبات کے ادراک کا آلہ اور حاسہ باور نہیں کرتے، اس سے ان کے نزدیک دین و مذہب کی اصل وحی خداوندی ہے اور اس کے اثبات کے خدام میں ایک خادم عقل بھی ہے۔ گو شریف ترین خادم ہے، مگر حاکم نہیں۔ گو بے فکر اور بے ذکر عقل خادمِ دین ہونے کے منصب کی اہل نہیں۔

سیاست اور خلفاء

سیاسی اور اجتماعی امور میں شریعت نے زیادہ تر قواعد ہی کو سامنے رکھا ہے، کیونکہ سیاست ملکی تدابیر کے انصرام کا نام ہے اور تدبیر و وسائلِ تدبیر ہر دور کے مناسبِ حال الگ ہے۔ اس لیے شریعت نے اس کے اصول بیان کر دیے۔ مخصوص صورتوں پر زور نہیں دیا، اس بارے میں علماء دیوبند کا مسلک امارات، شورائیت جیسے اہم تفصیلات کا عقلی اور نقلی نقشہ حکمتِ ولی اللہی میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے پیش فرما دیا ہے۔

ظاہر و باطن کے جامع

علماء دیوبند کا مسلک استدلال کے دائرے میں نصوص کے ساتھ ظاہر و باطن دونوں کو جمع رکھ کر دونوں ہی کا صحیح حق ادا کرنا ہے کہ کوئی ایک پہلو نظر انداز نہ ہو، پھر اس جامع ظاہر و باطن مسلک سے ایسے جامع لوگ بنتے رہیں، جو عالم باللہ بھی اور عالم بامر اللہ بھی ثابت ہوں، اس لیے

ے علماء دیوبند کے ہاں استاد اور کتاب دونوں کی صحبت ہے، صرف کتاب کافی نہیں، بدون صحبتِ مشائخ دین کا صحیح ذوق پیدا نہیں ہوتا، کورس تو صرف لفظ ہی سکھاتے ہیں، جب کہ آدمی آدمی بناتے ہیں۔

اس کا افادہ عمومی، ہمہ گیر اور نفع عام ہے۔

علمائے دیوبند کا نقطۂ آغاز

اگر دارالعلوم کی تاریخ کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اسلاف اور مؤسسین صرف مدعیانِ مسلک ہی نہ تھے، بلکہ مسلک کا عملی نمونہ تھے، بالخصوص حضرت بانیٔ دارالعلوم قدس سرہٗ مسلک کے ان نظری و عملی پہلوؤں کے مجسم پیکر تھے، اس کا کچھ نقشہ پیشِ خدمت ہے۔

۱۔ حضرت بانیٔ دارالعلومؒ نے دارالعلوم کی بنیاد رکھ کر درس و تدریس اور تعلیم کا آغاز کرایا اور خود بھی چھتہ کی مسجد میں جو اس دارالعلوم کا نقطۂ آغاز ہے، درس شروع فرمایا۔

۲۔ یہ مسجد چھتہ جو دارالعلوم کا نقطۂ آغاز اور حضرت بانی قدس سرہٗ کی قیام گاہ تھی، اسی میں حضرتؒ نے حلقۂ ارشاد و تلقین قائم فرمایا، جس میں بھی اعضائے دارالعلوم شریک ہوتے اور حضرتؒ کے روحانی توجہ و تصرف سے ان کی باطنی تربیت کی جاتی تھی، اس لیے بانیؒ ہی کے عمل سے علمائے دیوبند کا دوسرا مقصد تربیتِ باطنی اور تزکیۂ نفس بھی مشخص ہوا۔

۳۔ اسی دارالعلوم میں حضرت بانیؒ نے محکمۂ قضا قائم فرما کر صدر المدرسین دارالعلوم حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو اس کا قاضی مقرر فرمایا، جس سے ہزارہا الجھے ہوئے مقدمات شرعی انداز سے فیصل ہونے لگے اور اسلامی عدلیہ مسلمانوں کے قبضے میں آنے لگی جو حکومت کا ایک اساسی شعبہ ہے۔

۴۔ اسی دارالعلوم میں حضرت بانی قدس سرہٗ نے طلبہ کو گتکا، بنوٹ اور لاٹھی چلانے کی مشقیں شروع کرائیں جس کا مقصد طلبہ میں فنِ سپہ گری اور مجاہدانہ اسپرٹ کو باقی رکھنا تھا، جو سیاست کا اساسی شعبہ ہے۔

مخالفین نے اس پر اعتراضات کئے کہ مدرسہ حربیہ ہو گیا مگر حضرتؒ نے پرواہ نہ کی۔

۵۔ عیسائی مشنریوں، آریوں اور دوسرے فرقِ باطلہ کے اسلام سے متعلق مشکوک انداز میں الزام تراشی اور متعصبانہ اعتراضات کے جواب میں جارحانہ مدافعانہ اور مناظرانہ تقریروں کا سلسلہ شروع فرمایا اور ساتھ ہی اصلاحی اور تبلیغی مواعظِ حسنہ کا بھی آغاز فرمایا۔

۶۔ حضرتؒ نے دیوبند کے مشیوخ میں سنیت اور مسلکی مذاق رائج کرنے کی جد و جہد شروع فرمائی، کیونکہ یہاں شیوخ میں تفضیلیت کے اثرات رچے ہوئے تھے اگر وہ تفضیلی نہ تھے۔

۷۔ حضرت بانیؒ نے آخری عمر میں خواہش ظاہر فرمائی کہ کاش میں انگریزی پڑھتا اور مدعیانِ حکمت فرنگ کو یورپ جا کر بتلاتا کہ حکمت وہ نہیں، جسے تم سمجھ رہے ہو، حکمت وہ ہے جو انبیاءؑ کے قلب سے اتر کر روشن سینوں میں اتری۔ والحمد للہ اس مقصد کے لیے دارالعلوم میں انگریزی و سنسکرت کی تعلیم کا اہتمام کر دیا گیا ہے اور بانیؒ کی آرزو مستقل جامہ پہن رہی ہے۔

۸۔ حضرتؒ نے محققانہ اور مدافعانہ تحریرات کا خود بھی سلسلہ شروع فرمایا اور اپنے تلامذہ کو بھی تصنیف و تالیف کی طرف لگایا۔

۹۔ حضرت بانیؒ نے سلطان ترکی سے اپنی عقیدت و محبت کا رشتہ قائم رکھا اور ترکوں کی امداد کے لیے لاکھوں روپے چندہ جمع کیا اور ان کی مدح میں قصیدے لکھے۔

۱۰۔ دارالعلوم کے تمام تعلیمی و عملی کاموں کو مخالفتِ اغیار سے بچانے اور حکومتِ وقت کی امداد سے گریز کے لیے آٹھ اساسی اصول وضع فرمائے جو الہامی معلوم ہوتے ہیں۔

تلك عشرة كاملة

پس مسلک علمائے دیوبند صرف نظری مسلک نہیں بلکہ عملی طور

...صورت ہے جس کا رنگ تعلیمی ہے، جہادی و تبلیغی ہے، جا و معاشرتی ہے، بجا و فکر و فضاتی ہے، چڑھاؤ ریاضت سپہ گری ہے، ضبط نفس تربیتی ہے اور مدافعت مجاہدانہ ہے اور بین الاقوامیت بھی ہے اسی ہمہ گیر، جامع اور معتدل مزاج کو دیکھ کر ڈاکٹر اقبال مرحوم نے دیوبندیت کے بارے میں ایک جامع اور جیتا جاگتا سوال کیا تھا جو اُس مسلک کی صحیح تصویر کھینچ دیتا ہے۔ اُن سے کسی نے پوچھا کہ یہ دیوبندی کیا کوئی فرقہ ہے؟ کہا نہیں

"ہر معقول پسند دیندار کا نام دیوبندی ہے۔"

بہرحال اس جامعیت، اصول و شخصیت سے پیدا شدہ امتزاج کا نام مسلک علماء دیوبند ہے۔ تمت بالخیر

مدحِ طیب

از قلم جناب [illegible] عبدالعزیز صاحب [illegible]

طیب العترت ہیں آپ اور طیب الاخلاق ہیں — آپ اپنے نام کے ہر طور سے مصداق ہیں

آپ کی تحریر ہے رشکِ فنونِ سامری — آپ کی تقریر میں اعجازِ نطق دلبری

آپ کا حسنِ عمل انموذج اسلاف ہے — آپ کی ہستی یقیناً جامع الاوصاف ہے

ایشیا میں منفرد علم و عمل کی درس گاہ — کہہ رہی ہے آپ ہیں اس دور میں ملت پناہ

آپ نے اس دور میں برتا ہے ملت کا مزاج — آپ پر نازاں ہے روحِ قاسم و محمود آج

آپ ہیں بے شک وحیدُ العصر اے عالی جناب — عالموں میں آپ کا ممکن نہیں کوئی جواب

آپ کا تقویٰ فرشتوں سے فزوں پاتے ہیں ہم
آپ کے صدق و دیانت کی قسم کھاتے ہیں ہم

دیوبندی مدرسۂ فکر

پروفیسر مولانا محمد اشرف، صدر شعبہ عربی، اسلامیہ کالج پشاور

اسلام اللہ تبارک و تعالیٰ کا آخری پیام تھا، جو پورے عالم کی ہدایت اور پوری انسانیت کی اصلاح و فلاح و نجات کے لیے آیا، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی تھے اور رسول تھے، جن کے دائرہ نبوت کو ہر زمان و مکان پر محیط اور ابدالآباد تک مستمر کر دیا گیا، نبی انور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس کار رسالت کی ادائیگی اور اپنے دین کی دعوت و پیام کو عام کرنے کے لیے جن فرائض نبوت سے نوازا، ان کا تذکرہ قرآن کریم نے کئی مقامات پر کیا ہے۔

سب سے پہلے امت مسلمہ کے مورث اول سیدنا ابراہیم علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والتسلیم، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے دعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ربنا وابعث فیہم رسولا منہم یتلوا علیہم آیٰتک ویعلمہم الکتٰب والحکمۃ ویزکیہم، انک انت العزیز الحکیم (البقرۃ - ۱۵)

[1] اے ہمارے پروردگار! اس جماعت کے اندر ان ہی میں کا ایک ایسا پیغمبر بھی مقرر کیجئے، جو ان لوگوں کو آپ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کریں اور ان کو (آسمانی) کتاب کی اور خوش فہمی کی تعلیم دیا کریں اور ان کو پاک کر دیں، بلاشبہ آپ ہی ہیں غالب القدرت، کامل الانتظام۔ (بیان القرآن از مولانا تھانویؒ)

دعائے خلیل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی صورت میں قبول ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنا احسان جتلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیہم رسولا من انفسہم یتلوا علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتٰب والحکمۃ ، وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین ۔ (آل عمران)

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں ان ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور

اور ان لوگوں کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب
اور فہم کی باتیں بتلاتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ
قبل سے صریح غلطی میں تھے۔

(بیان القرآن، تھانوی)

دوسری جگہ سورۂ جمعہ میں ارشاد ہے:

هو الذي بعث في الأميين رسولا منهم
يتلوا عليهم آياته ويزكيهم
ويعلمهم الكتاب والحكمة وإن
كانوا من قبل لفي ضلال مبين

(الجمعة-۲)

وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں ان
ہی کی قوم میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا
جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں، اور ان
کو (عقائد باطلہ و اخلاق ذمیمہ سے) پاک کرتے ہیں
اور ان کو کتاب اور دانشمندی کی باتیں سکھلاتے ہیں اور
یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔

(بیان القرآن، تھانوی)

یعنی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا کام بحیثیت نبی کے
یہ تھا کہ آپ لوگوں پر اللہ کی آیات پڑھ کر انہیں اللہ تعالیٰ کے دین اور احکام
کی طرف بلائیں اور جو اس دعوت کو قبول کرلیں، انہیں قرآن کریم، حکمت
(یعنی ارشادات نبوی) اور کتاب و سنت کی سمجھ (فقہ) و احکام و فرائض سے
بہرہ مند فرمائیں اور اپنی صحبت اور تربیت سے ان کے نفوس و ارواح کو
پاک فرمائیں۔ انہیں فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو
جہد و جہاد و دعوت و ارشاد کے دیگر احکام مرحمت فرمائے گئے۔ چنانچہ ایک
جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

فلا تطع الكافرين وجاهدهم به
جهادا كبيرا (الفرقان-۵۲)

تو کافروں کا کہنا نہ مانیے اور بذریعہ قرآن کے ان
سے جہاد کر، بڑا جہاد۔

گویا جہاد بالقرآن کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کبیر قرار دیا ہے۔ دوسرے
مقام پر فرماتے ہیں:

يا أيها النبي جاهد الكفار والمنافقين
واغلظ عليهم (سورۂ توبہ۔ سورۂ تحریم)

اے نبی، کفار سے (بالسنان) اور منافقین سے
بالسان جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جہاد کا حق ادا فرمایا اور عالم کو ہدایت
سے بقعۂ نور بنا دیا۔ امت کو نیابتاً یہ فرائض سونپ کر تشریف لے گئے
اور ہر زمانے میں نسلاً بعد نسل امت ان فرائض کو ادا کرتی رہی۔ کاشانۂ اسلام
کی رونق انہیں فرائض سے کار نبوت کے لیے جد و جہد سے قائم ہوئی اور
قرون اولیٰ سے لے کر اب تک دین کی سرسبزی و شادابی انہیں فرائض کی
بجا آوری کے لیے جہد و جہاد سے باقی و قائم رہی۔

غرض کہ ہند میں اسلام کے قدم صحابہ کے عہد سعادت میں پہنچ
چکے تھے، غزنوی و غوری کے خاندانوں کی ترکتازیوں اور ایبک و التمش کی
معرکہ آرائیوں نے اقصائے ہند تک سلطنت اسلامیہ کا پرچم لہرا دیا تھا،
دوسری طرف علما و صوفیہ کرام کی کاوشوں نے ساکنان ہند کے لیے اسلام میں
داخلے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اسلام کے ظاہری و باطنی استیلا کو خاندان مغلیہ
کے بعض فرمانرواؤں کی غلط سیاست و اقدامات سے زک پہنچی اور اسلام
کا بڑھتا ہوا سیلاب تھم گیا، لیکن رحمت حق کو جوش آیا اور اللہ تعالیٰ کی حکمت
بالغہ نے سیاسی کوتاہیوں کے تدارک کے لیے گیارھویں صدی ہجری میں قطبیت
تشریعیہ کا مرکز زمین ہند کو قرار دیا اور حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی احمد سرہندی

نور اللہ مرقدہ سے ہدایت اور نیابت نبوت کا وہ کام لیا، جس کی مثال قرون
متاخرہ میں نہیں ملتی۔ اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے
دورۂ تجدید سے دین کی بقاء، فروغ و نیابت و فرائض رسالت کی بجا آوری
انہیں کے منتسبین کے سپرد ہے۔ دارالعلوم دیوبند بھی اسی سلسلے کی وہ سنہری
کڑی ہے جسے من حیث الجامع فرائض رسالۂ نبوت کی ادائیگی اور جہاد
فی سبیل اللہ کی سعادت، اور تصلب دینی اور احقاق حق اور ابطال باطل اشاعت
اسلام اور رد بدعات کی دولت نصیب ہوئی۔ کفر و استعمار کے مقابلہ میں
دیوبند ایک عظیم قلعہ ثابت ہوا اور گزشتہ ایک سو سال سے دیوبند میراث
نبوت کا حامل و امین اور داعی ہے، جو نہ صرف برصغیر ہند و پاک میں بلکہ پورے
عالم اسلام میں ہمہ جہتی، فرائض نبوت کا وارث، دعوت و ارشاد، جہد و جہاد،
حفاظت علوم رسالت، تعلیم و دعوت کتاب و سنت، تدریس و اشاعت فقہ
و کلام، تزکیۂ قلوب و تربیت و تصفیۂ نفوس کا علمبردار ہے۔ دارالعلوم دیوبند
کو بجا طور "قاسم العلوم والخیرات" و "امام الفحول والنوابغ" کہا جا سکتا ہے جسکے
فیض عام سے بحمد اللہ تعالیٰ نہ صرف پورا ہند و پاک سیراب ہے، بلکہ اس کا
سایۂ برکت نور اور ظل سعادت و رحمت اقصائے عالم پر محیط ہے۔ ذالک
من فضل اللہ علینا وعلی الناس ولکن اکثر الناس
لا یشکرون۔

اور یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل اور بانیان دارالعلوم کا اخلاص و
تقویٰ ہے، جس نے اس شجرۂ طیبہ کو:

اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء
تؤتی اکلھا کل حین باذن
ربھا (ابراہیم-۲۴) ——— جس کی
جڑ خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں
جا رہی ہوں، وہ خدا کے حکم سے ہر فصل میں اپنا پھل دیتا
ہے۔ (بیان القرآن از حضرت تھانوی) کا مصداق بنا

بایں ہمہ ؎ کعبہ ما ہر دم تجلی می فزود
زانکہ از اخلاصات ابراہیم بود

فقیر کے نزدیک دارالعلوم نرا ایک جامعہ، مدرسہ یا مرکز تعلیم و تربیت
نہیں بلکہ ایک مستقل تحریک و دعوت و مدرسۂ فکر ہے۔ آج دیوبندیت کا اطلاق
نہ صرف دارالعلوم دیوبند پر ہوتا ہے، بلکہ وہ تمام مدارس و افراد سے جو دیوبند
کے رنگ میں رنگے چکے ہیں اور مسلک دیوبند کے ترجمان بن چکے ہیں اگر
دارالعلوم دیوبند کو شارح قرار دیا جائے گا۔ اس اعتبار سے دیوبندی مدرسۂ
فکر کے دائرہ میں سہارنپور، ڈابھیل، دہلی و میرٹھ، کراچی و لاہور، ملتان و پشاور،
ساہیوال، اکوڑہ، ٹنڈو اللہ یار اور ہند و پاک کے دیگر بے شمار ادارے و
مدارس آجاتے ہیں۔ جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچی ہے۔

جس طرح درخت کا اپنی جڑ کی مضبوطی و استواری پر انحصار ہوتا ہے
اور وہ اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اسی طرح کوئی دینی ادارہ اور جماعت
اپنے بانیوں کے اخلاص و تقویٰ کے بقدر پھلتا پھولتا اور قائم رہتا ہے اور
اس کے تربیت یافتہ افراد سے اس کی کارکردگی، کمال و خوبی کا اندازہ ہوتا
ہے۔ اس معیار پر جب ہم دارالعلوم دیوبند کو جانچتے ہیں، تو اس کی بنیاد
کو اٹھانے والی وہ قدسی الصفات ہستیاں دکھائی دیتی ہیں، جن کی پیشانیاں
علم و تقویٰ، زہد و قناعت، تشبیع و تعلق مع اللہ، محبت الٰہی، خشیت الٰہی
حب للہ، بغض فی اللہ کے نور سے چمکتی تھیں، جو سنت کے کامل اتباع کے
ساتھ متصف، حب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبے ہوتے، دین کی محبت
و حفاظت کے نشے سے سرشار، اور کفر و ضلالت، الحاد و بدعت کے ہر
فتنہ سے بیزار تھے جو اسلام کی ذات پر جان کی بازی لگاتے ہوئے جہاد و قتال فی
سبیل اللہ کے عملی میدانوں میں سرگرم رہ چکے تھے جو دنیاوی جاہ و منصب
مال و دولت، عزت و شہرت، نام و نمود، ذاتی آرام و آسائش سے کنارہ کش
اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے جذبہ میں ان صلاتی ونسکی ومحیای و
مماتی للہ رب العالمین کا پیکر تھے، اگرچہ ظاہری اعمال و کردار

کے بعد میں اس قسم کا فیض علم دین کا مولوی صاحب سے جاری ہوا ہے۔ ہندوستان میں مولوی صاحب یک فرد واحد ہیں، مسائل مشکلہ کی عقدہ کشائی مولوی صاحب سے ہوتی ہے، ہر سال میں پچاس آدمی کے قریب علم حدیث پڑھ کر مولوی صاحب سے سند لیتے ہیں اتباع سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں محو ہیں، محبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور عشق خداوندی میں مستغرق ہیں، حق گو ہیں۔ لا یخافون لومۃ لائم کے مصداق ہیں خدا کے اوپر پورے طور سے توکل رکھتے ہیں، بدعات سے پورے طور سے مجتنب ہیں، اشاعت سنت ان کا پیشہ ہے۔ بدعقیدوں کو خوش عقیدہ بنانا ان کا فرض ہے ان کی صحبت اہل اسلام کے واسطے کیمیا اور اکسیر اعظم ہے ان کے پاس بیٹھنے سے اللہ یاد آتا ہے، یہی اللہ والوں کی علامت ہے، متقی اور تارک الدنیا ہیں راغب الی الآخرۃ اور تصوف اور سلوک میں کامل ہیں امیر و غریب ان کے نزدیک یکساں ہیں، سب کی طرف توجہ برابر ہے لا طمع ہیں، فقیر نے جو کچھ ان کی ثنا میں ضیاء القلوب میں تحریر کیا ہے، وہ حق ہے اور وہ یہ ہے ـــــ

ونیز ہر کس کہ ازیں فقیر محبت وعقیدت وارادت دارد مولوی رشید احمد صاحب سلمہٗ و مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند بجائے من راقم اوراق بمدارج فوق از من شمارند۔ اگرچہ بظاہر معاملہ برعکس شد کہ او شاں بجائے من و من بمقام او شاں شدم و صحبت او شاں را غنیمت دانند کہ ایں چنیں

کساں دریں زماں نایاب اند و از خدمت بابرکت ایشاں فیضیاب بودہ باشند)

ترجمہ: (جو شخص اس فقیر سے محبت، عقیدت و ارادت رکھے، مولوی رشید احمد صاحب، مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ کو کہ تمام کمالات ظاہری و باطنی ان میں موجود ہیں مجھ راقم کی جگہ سمجھے۔ بلکہ مجھ سے بھی فائق فی المدارج جانے۔ اگرچہ ظاہر میں معاملہ برعکس ہو گیا کہ میں ان کی جگہ اور وہ میری جگہ ہو گئے اور ان کی صحبت کو غنیمت سمجھے کہ اس زمانے میں ایسے آدمی نایاب ہیں اور ان کی بابرکت خدمت سے فیضیاب ہوتا رہے۔)

اور اب فقیر کا حسن ظن اور محبت بہ نسبت پہلے کے ان کے ساتھ بہت زیادہ ہے۔ فقیر ان کو اپنے واسطے ذریعہ نجات کا سمجھتا ہے اور میں صاف کہتا ہوں کہ جو شخص مولوی صاحب کو برا کہتا ہے، وہ میرا دل دکھاتا ہے، میرے دو بازو ہیں۔ ایک مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم اور دوسرا مولوی رشید احمد صاحب۔ ایک جو باقی ہے، اس کو بھی نظر لگاتے ہیں؛ میرا اور مولوی صاحب کا ایک عقیدہ ہے، میں بھی بدعات کو برا سمجھتا ہوں، جو مولوی صاحب کا اور دینیہ مخالف ہے، وہ میرا مخالف ہے اور خدا اور رسول کا مخالف ہے ـــــ

اسی اقرار کے آخر میں فرماتے ہیں: "اور میں چاہتا ہوں کہ مولوی صاحب کی نسبت سے کوئی کلمہ بے ادبی کا نہ نکالے اور منکر نہ کہے مجھ کو ان امور سے سخت ایذا ہوتی ہے، عجیب بات ہے کہ میرے تحت جگر کو اپنا پہنچاتے ہیں اور اپنے آپ کو میرا دوست کہیں، ہرگز نہیں، مولوی صاحب سچے حنفی اہل

خواہ کسی سے خوشی کا ہو، کسی طرح ہوائے نفسانی، بغض اور عداوت پر محمول نہیں کرسکتے۔ ان کے تمام کام جن کو وہ کرتے تھے بلاشبہ للہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے۔ ان کا کسی سے ناراض ہونا، صرف خدا کے واسطے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا، کسی شخص کو مولوی محمد قاسم صاحب اپنی ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ برے کام کرتا ہے، یا بری بات کرتا ہے، خدا کے واسطے برا جانتے تھے۔ بمصداق حب فی اللہ اور بغض فی اللہ خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں، ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے زندگی بسر کی ہو بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔ اس زمانے میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے، تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم صاحب اس دنیا میں بے مثل تھے، ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ کم ہو۔ الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحق صاحب سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا، درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے، اور ایسے شخص کے وجود سے زمانے کا خالی ہو جانا، ان لوگوں کے لیے جو ان کے بعد زندہ ہیں، نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے، افسوس کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کام کرے، زبانی عقیدت و ارادت بہت زیادہ کرتی ہے ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایک شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت و افسوس کے کہہ کر خاموش ہو بیٹھے، یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرے کو صاف کریں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں۔

دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ قائم اور مستقل رہے۔ اور اس کے ذریعہ تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جمارہے۔"

* علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء صفحہ ۴۶۸ ۴۶۹

منقول از رسالہ دارالعلوم بابت ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۹ھ (از مجلہ تعارف علماء شوریٰ۔ صفحہ نمبر ۷۷ تا ۸۰)

صاحب نزہۃ الخواطر نے حضرت الشیخ گنگوہی نور اللہ مرقدہ کے بارے میں جو لکھا ہے قابل دید ہے:-

الشيخ الإمام العلامة المحدث رشيد احمد .....
أحد العلماء المحققين والفضلاء المدققين.
لم يكن مثله في زمانه في الصدق والعفاف
والتوكل والتفقه والشهامة، والإقدام
في المخاطر والصلابة في الدين والتشدد
في المذهب .... وكان آية باهرة ونعمة
ظاهرة في التقوى، واتباع السنة النبوية
والعمل بالعزيمة والاستقامة على الشريعة
ورفض البدع ومحدثات الأمور ومحاربتها
بكل طريق والحرص على نشر السنة وإعلاء
شعائر الإسلام والصدع بالحق وبيان الحكم

بھاگنے والے تھے، اس زمانے میں آپ نہ فتوے دیتے تھے اور نہ وعظ کہتے تھے، بلکہ اللہ سبحانہ کے ذکر، مراقبہ میں مشغول رہتے تھے، حتیٰ کہ آپ پر حقائق و معانی کے دروازے کھلے، اور حضرت شیخ امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو خلافت سپرد کی اور آپ کی مدح فرمائی کہ قاسم جیسا شخص سوائے زمانۂ سلف کے کہیں نہیں پایا جاتا۔

محدث کبیر حضرۃ الاستاذ علامہ سید محمد یوسف البنوری مدظلہٗ نے "فیض الباری" کے مقدمہ میں "بیان ما لاھل الھند من المفاخر" کے زیرِ عنوان ایک عجیب اور اچھوتی بحث میں حضرت شاہ عبدالعزیز کے بارے میں لکھا ہے کہ:

بل ھو الذی جمع مع علوم العرفاء ارباب القلوب علوم المحدثین و ارباب الظواھر واستبحار مدھش فی علوم الروایۃ ورقۃ مدھشۃ فی فنون الدرایۃ علوم ناجحۃ وافکار ثاقبۃ وانوار من الغیب مع ساطعۃ، وعلی بصیرۃ اقول: ان اللہ سبحانہ وتعالیٰ خلق شخصا من شخصین احدھما جمع بین اشتات علوم الظاھر روایتھا ودرایتھا، منقولھا ومعقولھا، وھو الحافظ ابن تیمیۃ الحرانی وذلک البحر المندفق الذخار والآخر جمع بین الحقائق الالھیۃ وعلوم العارفین الربانیۃ مع حظ وافر من علوم الظاھر وعلوم غریبۃ من العلوم الدقیقۃ، وھو الشیخ الاکبر الاندلسی محی الدین ابن العربی جمع من ھذین الشخصین العظیمین شخصیۃ کبیرۃ بارزۃ وھو الشیخ الحجۃ عبدالعزیز الدھلوی ولم یقم بمثلہ الا افراد من الائمۃ الاعلام الافذاذ الحجۃ الدھلوی نظیر اولئک الافذاذ والجہابذۃ۔

ترجمہ: آپ وہ شخص ہیں کہ جو اہلِ دل عارفین کے علوم کے ساتھ ساتھ محدثین اور اہل ظواہر کے علوم کے بھی جامع ہیں اور جو علوم روایت کے ساتھ حیران کن تبحر کے ساتھ فنونِ درایت میں بھی حیرت زا مہارت کے جامع ہیں، رائخ علوم اور روشن افکار کے ساتھ ساتھ غیب کے روشن و ظاہر انوار کے بھی جامع ہیں اور میں بصیرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے دو شخصوں سے ایک شخص کو بنایا ان میں سے ایک شخص گوناں گوں ظاہری علوم اور ان کی روایت و درایت اور منقول و معقول کے جامع ہیں اور وہ شخص حافظ ابن تیمیہ حرانی ہیں جو کہ ایک بحر ناپیدا کنار ہیں اور دوسرے وہ جو ظاہری علوم کے ایک حصۂ وافر سے بہرہ مند اور دقیق علوم میں سے عجیب عجیب علوم سے بہرہ مند ہونے کے ساتھ ساتھ حقائق الٰہیہ اور عارفین کے ربانی علوم کے بھی جامع ہیں، وہ شیخ اکبر اندلسی محی الدین ابن عربی ہیں۔ ان دو بڑی ہستیوں سے ایک دوسری بڑی ہستی بنائی گئی اور وہ حضرۃ شیخ الحجۃ عبدالعزیز دہلوی کی ذاتِ گرامی ہے ..... ایسا کام امت کے چند نادر افراد کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا اور حضرت شیخ و حجۃ دہلوی ان ہی چند نادر ہستیوں کے نظیر تھے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

وورث علوم الشیخ عبدالعزیز الدھلوی عالمان جلیلان: الامام الحجۃ محمد قاسم النانوتوی والمحدث الفقیہ الحجۃ الشیخ احمد الگنگوھی. بید

انه غلب على النانوتوي علوم المتكلمين وعلوم الحقائق، وغلب على الشيخ الكنكوهي علوم الفقهاء وعلوم السنة، مع حسن الجمع بين الجانبين، ولكن اصبحت جهة الحقائق مغلوبة في واحد، كما ان جهة علوم الفقهاء مغلوبة في الآخر، فهو شبيه مثيل لاقتسام علوم النبوة وكمالاتها في الخلفاء الراشدين ... فكان المحدث الفقيه هذه العصر ... الشيخ رشيد احمد الكنكوهي الانصاري رحمه الله جمع مع العلوم الرائجة علوم ارباب القلوب ووهب نوراً في القلب يلمع به ما اظلم على الناس فكان يأتي بتوجيهات في المشكلات الفقه ومعضلات الحديث ما خلت عنها الاسفار الضخمة والمجلدات الكبيرة وكان موفقاً طيلة حياته المباركة لدرس الامهات الست طول النهار غير فترة قليلة في البين وبقي نصف قرن يدرس الحديث وكتب السنة لا يلحقه ملل ولا ضجر ولا سآمة ولا تعب مع اشتغاله بتربية النفوس وتربية القلوب بالاذكار والتوجه فكان نفسه الزكية تتجلى كل حين وهذا ما عدا افتاءه في النوازل والمسائل

حيث كان مرجعاً في معضلات النوازل

كما كان مرجعاً لارشاد وتربية النفوس

وتدريس الصحاح الستة من الامهات.

(مقدمة لامع الدراري ص ۱۲)

ترجمہ: ... حضرت شیخ عبدالعزیز دہلوی کے مذہب کے محدث و جلیل القدر عالم ہوئے۔ اور دو حضرت امام و مجدد ملت محمد قاسم نانوتوی اور حضرت محدث و فقیہ و محدث شیخ احمد گنگوہی ہیں۔ ہاں دونوں ناموں کے ہر دونوں جانب سے بہرہ مند ہونے کے باوجود، حضرت نانوتوی پر متکلمین کے علوم و حقائق کے علوم کا غلبہ ہے اور حضرت شیخ گنگوہی پر فقہا کے علوم اور سنت کے علوم کا غلبہ ہے لیکن ایک میں حقائق کا پہلو مغلوب ہے، جب کہ دوسرے میں فقہا کے علوم کا پہلو مغلوب ہے اور یہ خلفائے راشدین کے ساتھ علوم نبوت اور اس کے کمالات کی تقسیم میں ادنیٰ سی مشابہت ہے۔

پس ہمارے زمانہ کے محدث و فقیہ حضرت محدث شیخ رشید احمد گنگوہی انصاری رحمۃ اللہ علیہ مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ اہل دل کے علوم کے بھی جامع ہیں۔ اور انھوں نے دلوں کو ایسا نور بخشا جس سے لوگوں پر اندھیرا روشن ہو گیا۔ آپ فقہ اور حدیث کے مشکلات کی ایسی ایسی توجیہ فرماتے کہ جن سے بڑی بڑی ضخیم کتابیں بھی خالی ہیں۔ آپ اپنی ساری مبارک عمر میں سارا سارا دن سوائے تھوڑے سے درمیانی وقفے کے صحاح ستہ کی درس و تدریس کی توفیق سے سرفراز رہے اور نصف صدی تک حدیث و کتب سنت کی اس طرح تدریس فرماتے رہے کہ جس سے نہ آپ کبھی شکستہ خاطر ہوئے اور نہ کبھی تھکے، باوجود اس کے کہ آپ ذکر کے ذریعے نفوس کی تربیت و قلوب کے تصفیہ اور توجہ کے ساتھ مشغول ہوتے تھے پس آپ کا پاکیزہ نفس ہر وقت متجلی رہتا تھا اور یہ کام حوادث مسائل میں افتاء کے علاوہ تھا۔ آپ جس طرح کہ ارشاد و تربیت نفوس اور صحاح ستہ کی درس و تدریس کے لیے مرجع خلائق تھے، اسی طرح آپ حوادث کے مشکل مسائل کے لیے بھی مرجع خلائق تھے۔

بانیان دیوبند میں سے صرف دو بزرگوں کے بارے میں چند آثار محض نمونہ کے لیے نقل کر دیے گئے، ورنہ این خانہ ہمہ آفتاب است۔ شاید اس میں مبالغہ نہیں ہوگا کہ دیوبندی مدرسۂ فکر نے پچھلے سو سال میں جس قدر عظیم دینی و روحانی شخصیتوں کو وجود بخشا، اس کی مثال ماضی قریب میں کسی دوسرے ادارے میں دکھائی نہیں دیتی۔ بقول حضرت علامہ مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ ہمیں دیوبند کا وہ دور یاد ہے کہ مہتمم سے لے کر ادنیٰ چپراسی تک صاحب نسبت بزرگ ہوتا تھا۔

از سرِ بالین من برخیز اے ناداں طبیب
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

دیوبند کی یہ بار آوری جہاں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم، ملاءِ اعلیٰ کے فیضانِ خاص اور بانیانِ مدرسہ کے اخلاص و تقویٰ کا نتیجہ تھی، وہاں نیابت نبوت کی اس جامعیت کا ثمرہ تھی، جو روزِ ازل سے ہی "دارالعلوم" کے لیے مقدر تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کا کوئی کام اس وقت تک استوار اور پائیدار نہیں ہو سکتا جب تک اس کی بنا و نشو و نما منہاجِ نبوت کے مطابق نہ ہو اور وہ جامعیت نبوت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) کا پرتو و عکس اپنے میں لیے ہوئے نہ ہو اور عقائد و تعلیمات و اعمالِ نبویہ کا ظاہراً و باطناً آئینہ دار نہ ہو۔ اہلِ دیوبند پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم تھا کہ جامعیت کبریٰ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ و تحیۃ) کی نیابت کا شرفِ کامل انھیں میسر آیا، ان کے علومِ ظاہر نے انھیں باطن و روحانیت اور "تزکیہم" کی نبوی صفت سے غافل نہیں ہونے دیا اور باطن کا سوز و حقیقت علومِ ظاہرہ اسلامیہ میں رسوخ سے مانع نہیں ہوا، علومِ عقلیہ کا حصول علومِ نبویہ کی عظمت و فوقیت کو ماند نہ کر سکا۔ نہ یونانی علوم و دانشِ فرنگ انھیں مسحور کر سکی، بلکہ دائرۂ علومِ نبوت کے باہر سے جو بات بھی آئی، وہ دین و علومِ نبوت کی خادم بن کر آئی، جوشِ طریقت و محبت ہو، یا جوشِ علوم و عقلیت، ہر بات شریعتِ مطہرہ کی تابع ہی رہی۔ نہ غلبۂ محبت نے سنت کی راہِ مستقیم کو نگاہوں سے اوجھل ہونے دیا، نہ جوشِ خرد نے حریم نبوت کے انوار و برکات سے محروم رکھا۔ حقیقتاً دیوبندیت کا طرۂ امتیاز کمال اعتصام و تمسک بالکتاب والسنہ اور جادۂ اعتدال ہی ہے

بر کفے جامِ شریعت و در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سندان باختن

ترے میخواروں کے ساقی کچھ عجب انداز ہیں
دل سراپا جوش ہے، لیکن زباں خاموش ہے

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم
دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

لیکن دیوبند کے "اولی الایدی والابصار" کے لیے یہ بحرِ ذخار بھی عنایتِ الٰہیہ نے پایاب کر دیا اور علم کی وسعت و رسوخ کے ساتھ اعمالِ صالحہ و تقویٰ کے نور نے بھی ان سے فروغ پایا، علم و عمل کے سوتے ان کی ذواتِ عالیہ سے یکجا بہتے رہے اور ظاہر و باطن کا جمال و کمال ان کی جلوت و خلوت کی آرائش رہا۔ اتباعِ نبوت کی برکت سے فریضۂ دعوت و ارشاد کی ادائیگی اور سعادات خیر و برکت کا جو فیضانِ عام ان نفوسِ قدسیہ سے جاری و ساری رہا۔ اس سے انکار کی گنجائش ممکن نہیں، دین کی اس ہمہ جہتی اشتغال کے باوجود "دیوبند" نے رہبانیت کو اپنا کیش نہیں بنایا اور مسلمانانِ ہند و پاک کے جملہ سیاسی و معاشرتی میدانوں میں اس کی حیثیت متبوع و امام کی رہی، سیاست کے خار زار میں خواہ وہ تحریکِ خلافت ہو یا تحریکِ پاکستان یا آزادیٔ ہند، ہم ہر جگہ دیوبند کے اساطین کو پہلی صف کے رہنماؤں میں پاتے ہیں اور یہ دیوبند کی اس جامعیت کا ایک ادنیٰ نشان ہے، جو اس کے تمام کمالات و خدماتِ دینی کی بنیاد رہی کہ دین کا ہر کام "جامعیتِ محمدیہ" کا پرتو بن کر ہی مکمل ہوا کرتا ہے، ذٰلک تقدیر العزیز العلیم

مسلکِ دیوبند کی جامعیت پر اپنے دعوے کی بین دلیل کے طور پر حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ کا مضمون نقل کرتا ہوں،

دارالعلوم کا مسلک

علمی حیثیت سے ولی اللٰہی جماعت

مسلک اہل السنت والجماعت ہے جس کی بنیاد کتاب و سنت اور
اجماع و قیاس پر قائم ہے۔ اس کے نزدیک تمام مسائل میں اولیت
منقول و روایت اور آثار سلف کو حاصل ہے جس پر پورے دین
کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس مسلک میں کتاب و سنت کی مرادات اقوال
سلف اور ان کے متوارث مذاق کی حدود میں محدود رہ کر محض قوت
مطالعہ سے نہیں بلکہ اساتذہ اور شیوخ کی صحبت و ملازمت اور تعلیم و
تربیت ہی سے متعین کی جا سکتی ہیں۔ اس کے ساتھ عقل و درایت اور تفقہ
فی الدین بھی اس کے نزدیک فہم کتاب و سنت کا ایک بڑا اہم جزو ہے۔
وہ روایات کے مجموعے سے حنفی فقہ کی روشنی میں شارع علیہ السلام
کی غرض و غایت کو سامنے رکھ کر تمام روایات کو اسی کے ساتھ وابستہ
کرتا ہے اور سب کو درجہ بدرجہ اپنے اپنے محل پر اسی طرح چسپاں
کرتا ہے کہ وہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں دکھائی دیں۔ اس لئے جمع
بین الروایات اور تعارض کے وقت تطبیق احادیث اس کا خاص
اصول ہے۔ جس کا منشا یہ ہے کہ وہ کسی ضعیف سے ضعیف روایت
کو بھی چھوڑنا اور ترک کر دینا نہیں چاہتا۔ جب تک کہ وہ قابل احتجاج
ہو۔ اسی بنا پر اس جماعت کی نگاہ میں نصوص شرعیہ میں کہیں تعارض
اور اختلاف محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ سارے کا سارا دین تعارض و اختلاف
سے مبرا ہو کر ایک ایسا گلدستہ دکھائی دیتا ہے جس میں ہر رنگ کے
علمی و عملی پھول اپنے اپنے موقع پر کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ
طریق اہل سلوک جو رسمیات اور رواجوں اور نمائشی حال و قال سے
بیزار اور بری ہے۔ تزکیہ نفس اور اصلاح باطن بھی اس کے مسلک میں ضروری
ہے۔ اس نے اپنے منتسبین کو علم کی رفعتوں سے بھی نوازا اور عبدیت و
تواضع جیسے انسانی اخلاق سے بھی مزین کیا اور اس جماعت کے افراد
ایک طرف علمی وقار و استغناء (علمی حیثیت سے) اور غنائے نفس (اخلاقی حیثیت
سے) کی بلندیوں پر فائز ہوئے۔ وہیں فروتنی، خاکساری، اور ایثار و
ذہن کے متواضعانہ جذبات سے بھی معمور ہوئے۔ نہ رعونت اور کبر و
نخوت کا شکار ہوئے اور نہ ذلت نفس اور مسکنت میں گرفتار۔ وہ
جہاں علم و اخلاق کی بلندیوں پر پہنچ کر عوام سے اونچے دکھائی دینے
لگے، وہیں عجز و نیاز، تواضع و فروتنی اور وقار کے جوہر سے مزین
ہو کر عوام میں ملے جلے اور کام میں لگے رہے۔ جہاں مجاہدہ
و مراقبہ سے خلوت پسند ہوئے، وہیں مجاہدانہ اور غازیانہ اسپرٹ
نیز قومی خدمت کے جذبات سے جلوت آرا بھی ثابت ہوئے۔ غرض علم و اخلاق
خلوت و جلوت اور مجاہدہ و جہاد کے مخلوط جذبات وہ راہ ہے جو فطرۃً
دین میں اعتدال اور میانہ روی ان کے مسلک کا امتیازی نشان بن گئی۔
جو علوم کی جامعیت اور اخلاق کے اعتدال کا قدرتی ثمرہ ہے۔ اسی لئے ان
کے محدث ہونے کے معنی فقیہ سے لڑنے یا فقیہ ہونے کے معنی محدث
سے بیزار ہو جانے یا نسبت احسانی (تصوف پسندی) کے معنی متکلم
دشمنی یا علم کلام کی صداقت کے معنی تصوف بیزاری کے نہیں بلکہ اس کے
جامع مسلک کے تحت اس تعلیم گاہ کا فاضل درجہ بدرجہ بیک وقت محدث
فقیہ، مفسر، مفتی، متکلم، صوفی، (محسن) اور حکیم و مربی ثابت ہوا جس میں
زہد و قناعت کے ساتھ عدم تقشف، حیاء و انکسار کے ساتھ عدم
مداہنت و رأفت و رحمت کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر قلبی
یکسوئی کے ساتھ قومی خدمت اور خلوت و انجمن کے ملے جلے جذبات
راسخ ہو گئے۔ ادھر علم و فن اور تمام ارباب علوم و فنون کے بارے میں اعتدال
پسندی اور حق شناسی نیز ادائیگی حقوق کے جذبات ان میں بطور جوہر
نفس پیوست ہو گئے۔ بنا بریں دینی شعبوں کے تمام ارباب فضل و کمال اور
راسخین فی العلم خواہ محدثین ہوں، یا فقہاء، صوفیاء ہوں، یا عرفاء متکلمین
ہوں یا اصولیین، امراء اسلام ہوں یا خلفاء اس کے نزدیک سب واجب
الاحترام اور واجب العقیدت ہیں، اس لئے جذباتی رنگ سے کسی طبقہ
کو بڑھانا اور کسی کو گرانا یا مدح و ذم میں حدود شرعیہ سے بے پروا ہو جانا

اس کا منکر نہیں۔ اس جامع طریق سے دارالعلوم نے اپنی علمی خدمات سے شمال میں سائبیریا سے لے کر جنوب میں سماترا اور جاوا تک اور مشرق میں برما سے لے کر مغربی سمتوں میں عرب اور افریقہ تک علم نبوی کی روشنی پھیلادی، جس سے پاکیزہ اخلاق کی شاہراہیں کھلتی نظر آنے لگیں۔ دوسری طرف سیاسی خدمات سے بھی اس کے منتسبین نے کسی وقت بھی بے توجہی نہیں کی۔ حتیٰ کہ ۱۸۰۳ء سے ۱۹۴۷ء تک اس جماعت کے افراد نے اپنے اپنے رنگ میں بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ کسی وقت بھی ان بزرگوں کی سیاسی اور مجاہدانہ خدمات پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ بالخصوص تیرھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں مغلیہ حکومت کے زوال کی ساعتوں میں خصوصیت سے حضرت شیخ المشائخ مولانا حاجی محمد امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی تحریک میں ان کے ان دو مریدان خاص حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب، اور ان کے منتسبین و متوسلین کی مساعی انقلاب جہادی اقدامات اور حریت و استقلال ملی کی فداکارانہ جدوجہد اور گرفتاریوں کے وارنٹ پھر ان کی قید و بند وغیرہ وہ تاریخی حقائق ہیں جو نہ جھٹلائی جا سکتی ہیں، نہ بھلائی جا سکتی ہیں۔ جو لوگ ان حالات پر محض اس لیے پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہ خود اس راہ سرفروشی میں قبول نہیں کیے گئے تو اس سے خود ان ہی کی نامقبولیت میں اضافہ ہوگا۔ اس بارے میں ہندوستان کی تاریخ سے باخبر اور ارباب تحقیق کے نزدیک ایسی تحریریں خواہ وہ کسی دیوبندی النسبت کی ہوں یا غیر دیوبندی کی جن سے ان بزرگوں کی ان جہادی خدمات کی نفی ہوتی ہو، بے معنیٰ اور قطعاً ناقابل التفات ہیں۔ اگر حسن ظن سے کام لیا جائے تو ان تحریرات کی زیادہ سے زیادہ توجیہ صرف یہ کی جاسکتی ہے کہ ایسی تحریریں وقت کے مرعوب کن حوائل کے نتیجے میں محض ذاتی حد تک حزم و احتیاط کا مظاہرہ ہیں، ورنہ تاریخی اور واقعاتی شواہد کے پیش نظر نہ ان کی کوئی اہمیت ہے اور نہ وہ قابل التفات ہیں۔

ان خدمات کا سلسلہ مسلسل آگے تک بھی چلا اور ان ہی مجاہدانہ خدمات کے ساتھ ان بزرگوں کے اخلاف و منتسبین بھی سرفروشانہ انداز سے قومی اور ملی خدمات کے سلسلے میں آگے آتے رہے۔ خواہ وہ تحریک خلافت ہو یا استخلاص وطن اور بروقت انتخابی اقدامات میں اپنے منصب کے عین مطابق حصہ لیا۔ مختصر یہ کہ علم و اخلاق کی جامعیت اس جماعت کا طرۂ امتیاز رہا اور وسعت نظری، روشن ضمیری اور رواداری کے ساتھ دین و ملت اور قوم و وطن کی خدمت اس کی مخصوص شعار۔ لیکن ان تمام شعبہ ہائے زندگی میں سب سے نمایاں جامعیت اس جماعت میں مسئلہ تعلیم کو حاصل رہی ہے جب کہ یہ تمام شعبے علم ہی کی روشنی میں صحیح طریق پر بروئے کار آسکتے تھے اور اسی پہلو کو انسانی نمایاں رکھا۔ اس لیے اس مسلک کی جامعیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جامع علم و معرفت، جامع عقل و عشق، جامع عمل و اخلاص، جامع مجاہدہ و جہاد جامع دیانت و سیاست، جامع روایت و درایت، جامع خلوت و جلوت، جامع عبادت و مدنیت، جامع حکم و حکمت، جامع ظاہر و باطن اور جامع حال و قال ہے۔ اس مسلک کو جو سلف و خلف کی نسبتوں سے حاصل شدہ ہے، اگر اصطلاحی الفاظ میں لیا جائے، تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیناً مسلم، فرقۃً اہل السنۃ والجماعت، مذہباً حنفی، مشرباً صوفی، کلاماً اشعری، سلوکاً چشتی بلکہ جامع سلاسل، فکراً ولی اللہی، اصولاً قاسمی، فروعاً رشیدی اور نسبتاً دیوبندی ہے۔ (اس سلسلے میں چونکہ "مسلک علماء اسلام" کے نام سے ہم نے ایک مستقل رسالہ لکھ دیا ہے، اس موقع پر اس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کے بعض جامع جملے اس تحریر میں لے لیے گئے ہیں تفصیلات کے لیے اس رسالے کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۱۲۱ ص ۲۳)

مباحث بالا سے یہ بات واضح ہے کہ دیوبندی مسلک کی جامعیت

ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم

تیسری طرف علوم دینیہ کے تصنیف و تالیف کی کثرت، فضلائے دیوبند کے حصے میں جس طرح آئی اور جس کثرت سے علمائے دیوبند نے ہر نوع کے علوم دینیہ پر تصنیف و تالیف کے انبار لگا دیئے، وہ انہیں کا حصہ ہے۔ ترجمہ اور تفسیر حدیث اور علوم حدیث، فقہ و فتاویٰ، علم کلام اور رد فرق باطلہ، تاریخ و سیر ہر عنوان پر اکابر و اصاغر دیوبند کی مستند کتابیں مل جائیں گی، صرف حضرت تھانویؒ تصنیف و تالیف کا وہ بے پایاں دفتر و کتب خانہ تالیف فرما گئے کہ ایک شخص کیا، بڑی بڑی اکاڈمیاں اس کے مرتب کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ ایک ہزار سے اوپر کتابیں جو بیس ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، مواعظ اور ملفوظات کا سلسلہ اس کے علاوہ ہے، دیگر کئی بزرگوں کی کتابیں مثلاً مفتی محمد شفیع، قاری محمد طیب، مولانا ادریس کاندھلویؒ، سو سے متجاوز ہو چکی ہیں، کوئی فن کوئی مسئلہ جدید ہو یا قدیم شاید ایسا ہی رہا ہو جس پر علماء دیوبند نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ تراجم میں حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ، حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے تراجم بے نظیر ہونے کے علاوہ ہر مسلمان کے گھر کی زینت ہیں، علامہ شبیر احمد عثمانی کا حاشیہ قرآنی، مفتی محمد شفیع صاحب کی معارف القرآن اور دیگر علمائے دیوبند کی قرآنی خدمات سے خلق کثیر مستفید ہو چکی ہے، جہاں تک احادیث مبارکہ کی اردو میں خدمت کا تعلق ہے، مولانا منظور نعمانی کی معارف الحدیث، مولانا بدر عالم کی ترجمان السنہ، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کا سلسلہ فضائل اپنے رنگ اور اپنے دائرے میں خوب مقبول ہوا، بلکہ حضرت تھانوی کے بہشتی زیور کی طرح حضرت شیخ کی کتب فضائل سے شاید ہی کوئی گھر خالی ہو۔ فتاویٰ میں فتاویٰ رشیدیہ، فتاویٰ دیوبند اور فتاویٰ امدادیہ، دیوبند کی فقہی خدمت کا شاہکار ہیں، سلوک و تصوف کے بارے تصانیف کا جو سلسلہ حضرت حاجی امداد اللہ سے شروع ہوا تھا، وہ حضرت گنگوہیؒ، حضرت تھانویؒ اور دیگر اکابر دیوبند کی تصانیف سے ایک بحر ناپیدا کنار بن چکا ہے، جس کی مثال پورے اسلامی لٹریچر میں نہیں ملتی، حضرات جنید و شبلی و بسطامی و جیلانی قدس اللہ اسرارہم کے علوم، غزالیؒ و رازی، قشیریؒ، رومیؒ کے حکمت و معارف کو جس نے اس دور میں عرض ہو، انہیں ان اکابر کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے، جدید مسائل اور ضروریات کے بارے میں بھی دیوبندی مکتبۂ فکر کی ہر نوع کی کتابیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں، مثلاً وقت مناظر احسن گیلانی صاحب نے خاص رنگ میں جو جدید فتنوں کے بارے میں قلم اٹھایا ہے، وہ بے مثل و مآثر الجزو میں اپنی نظیر آپ ہے، مجلس علمی ڈابھیل، کراچی، ندوۃ المصنفین دہلی اور اسی نوع کی متعدد دیگر مجالس کی علم و دین کی خدمات کو کون نظر انداز کر سکتا ہے، غرض علمی میدان میں ہر نوع اور ہر ضرورت کے مطابق علمائے دیوبند نے اپنی علمی کاوشوں سے دین کی خدمت کا حق ادا کر دیا ہے، جہاں تک حدیث کی عربی میں خدمت کا تعلق ہے، پچھلے عالم اسلامی میں اس کی نظیر نہیں ملتی، صحاح ستہ کے متعدد عربی میں حواشی، ان پر تقاریر کے علاوہ مستقل شروح کتب حدیث علمائے ہند و پاک کا افادہ ہے، یہاں تک کہ علامہ رشید رضا مصری کو مفتاح کنوز السنہ کے مقدمہ میں لکھنا پڑا:

ولولا عناية اخواننا علماء الهند
بعلوم الحديث في هذه العصر
لقضي عليها بالزوال.

ترجمہ: اگر ہمارے برادران، علماء ہندوستان نے اس زمانہ میں علوم حدیث پر توجہ نہ کی ہوتی، تو اس علم کے زوال کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔

بخاری کی شرح فیض الباری (حضرت مولانا انور شاہ کشمیری)، لامع الدراری (حضرت شیخ علامہ زکریا سہارنپوری)، فتح الملہم شرح مسلم (شبیر احمد عثمانی)، معارف السنن، شرح جامع ترمذی (علامہ محمد یوسف بنوری)، بذل المجہود شرح ابوداؤد (حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری)، امانی الاحبار شرح معانی الآثار طحاوی (مولانا محمد یوسف کاندھلوی)، اوجز المسالک شرح موطا امام مالک (حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا سہارنپوری)، التعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ المصابیح (مولانا ادریس کاندھلوی)، اعلاء السنن (حضرت ظفر احمد عثمانی) وغیرہ دیوبندی مدرسۂ فکر

ریاست علی ظفر بجنوری
دیوبند

ترانۂ دارالعلوم

یہ علم و ہنر کا گہوارا، تاریخ کا وہ شہ پارہ ہے
ہر پھول یہاں اک شعلہ ہے، ہر سرو یہاں مینارہ ہے

خود ساقیٔ کوثر نے رکھی، میخانے کی بنیاد یہاں
تاریخ مرتب کرتی ہے، دیوانوں کی روداد یہاں

جو وادیٔ فاراں سے اٹھی، گونجی ہے وہی تکبیر یہاں
ہستی کے صنم خانوں کے لیے ہوتا ہے حرم تعمیر یہاں

برسا ہے یہاں وہ ابرِ کرم، اٹھا تھا جو سوئے یثرب سے
اس وادی کا سارا دامن سیراب ہے، جوئے یثرب سے

کہسار یہاں دب جاتے ہیں، طوفان یہاں رک جاتے ہیں
اس کاخ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں

ہر بوند ہے جس کی امرت جل، یہ بادل ایسا بادل ہے
سو ساگر جس سے بھر جائیں، یہ چھاگل ایسا چھاگل ہے

مہتاب یہاں کے ذرّوں کو ہر رات منانے آتا ہے
خورشید یہاں کے غنچوں کو، ہر صبح جگانے آتا ہے

یہ صحن چمن ہے برکت کا، ہر موسم ہے برسات یہاں
گلبانگ سحر بن جاتی ہے، ساون کی اندھیری رات یہاں

اسلام کے اس مرکز سے ہوئی تقدیس عیاں آزادی کی
اس بام حرم سے گونجی ہے سو بار اذاں آزادی کی

اس وادیٔ گل کا ہر غنچہ خورشید جہاں کہلایا ہے
جو رند یہاں سے اٹھا ہے، وہ پیر مغاں کہلایا ہے

جو شمع یقیں روشن ہے یہاں وہ شمع حرم کا پرتو ہے
اس بزم ولی اللّٰہی میں تنویر نبوت کی ضو ہے

یہ مجلس مے وہ مجلس ہے، خود فطرت جس کی خادم ہے
اس بزم کا ساقی کیا کہئے، جو صبح ازل سے قائم ہے

جس وقت کسی یعقوب کی لے اس گلشن میں بڑھ جاتی ہے
ذرّوں کی ضیا خورشید جہاں کو ایسے میں شرماتی ہے

عابد کے یقیں سے روشن ہے سادات کا سچا صاف عمل
آنکھوں نے کہاں دیکھا ہوگا، اخلاص کا ایسا تاج محل

یہ ایک صنم خانہ ہے، جہاں محمودؔ بہت تیار ہوئے
اس خاک کے ذرّے ذرّے سے کس درجہ شرر بیدار ہوئے

ہے عزم حسین احمد سے بپا ہنگامۂ گیر و دار یہاں
شانوں کی لچک بن جاتی ہے، باطل کے لیے تلوار یہاں

رُومی کی غزل، رازی کی نظر، غزالی کی تلقین یہاں
روشن ہے جمالِ انور سے پیمانۂ فخرالدین یہاں

ہر رند ہے ابراہیم یہاں، ہر مے کش ہے اعزاز یہاں
رندانِ ہُدیٰ پر کھلتے ہیں، تقدیسِ طلب کے راز یہاں

ہیں کتنے عزیز اس محفل کے انفاس حیات افروز ہمیں
اس سازِ معانی کے نغمے دیتے ہیں، یقیں کا سوز ہمیں

اس بزمِ جنوں کے دیوانے، ہر راہ سے پہنچے یزداں تک
ہیں عام ہمارے افسانے، دیوارِ چمن سے زنداں تک

سو بار سنوارا ہے ہم نے، اس مُلک کے گیسوئے برہم کو
یہ اہلِ جنوں بتلائیں گے، کیا ہم نے دیا ہے عالم کو

جو صبحِ ازل میں گونجی تھی، فطرت کی وُہی آواز ہیں ہم
پروردۂ خوشبو غنچے ہیں، گلشن کے لیے اعجاز ہیں ہم

اس برقِ تجلی سے سجا، پروانۂ شمعِ نور میں
یہ وادیٔ ایمن دیتی ہے، تعلیمِ کلیم طور میں

دریائے طلب ہوجاتا ہے، ہر مے کش کا پایاب یہاں
ہم تشنہ لبوں نے سیکھے ہیں مے نوشی کے آداب یہاں

بلبل کی دعا جب گلشن میں فطرت کی زباں ہوجاتی ہے
انوارِ حرم کی تابانی، ہر سمت عیاں ہوجاتی ہے

ہر موج یہاں اک دریا ہے، اک ملت ہے ہر فرد یہاں
گونجا ہے ابد تک گونجے گا، آوازۂ اہلِ درد یہاں

امداد و رشید و اشرف کا یہ قلزمِ عرفاں پھیلے گا
یہ شجرۂ طیب پھیلا ہے تا وسعتِ امکاں پھیلے گا

خورشید یہ دینِ احمد کا، عالم کے افق پر چمکے گا
یہ نور ہمیشہ چمکا ہے، یہ نور برابر چمکے گا

یوں سینۂ گیتی پر روشن، اسلاف کا یہ کردار رہے
آنکھوں میں رہیں انوارِ حرم، سینہ میں دل بیدار رہے

◎

دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی خصوصیت

سید محبوب رضوی

اسلام کا تعلیمی نظریہ

تعلیم جس قدر سادہ اور مختصر سا لفظ ہے، اتنا ہی اہم اور رُوح کی گہرائی تک کو متاثر کرنے والا ہے۔ تعلیم محض نقوش حرُوف، خطوط، آواز، بولیوں اور چھوٹی بڑی کتابوں کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی ذہنی دماغی اور علمی تربیت کا نام ہے، جس کے ذریعے انسان کی فطری قوّت وصلاحیت کو اُبھار کر سنوارنا اور منظم کرنا ہے اور انسانی جذبات وحسیات کو ایک مقصد اور اعلیٰ نصب العین کے تحت لاکر مہذب اور شائستہ بنانا ہے، تاکہ نوع انسانی کے لیے مفید ثمرات ونتائج بروئے کار لائے جاسکیں۔ انسان کو اُس کی اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال سکھانا بہت دُشوار ہے اور جس قدر دُشوار ہے، اسی قدر ضرُوری بھی ہے، بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ اگر تعلیم صرف زبانی ہوئی چیزوں کی واقفیت تک محدود ہو تو کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، لیکن اگر اُسے عمل کا پابند بنا دیا جائے، تو پھر اُس کی دُشواریاں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں، اگرچہ علم کی قدر دُنیا کی ہر قوم کرتی ہے لیکن علم کی نسبت مُسلمانوں کا جو نظریہ ہے۔ وہ دُوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے۔ غیر مُسلم علم اس لیے حاصل کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے دُنیا میں قوّت وعظمت اور ترقی وبرتری حاصل کریں۔ علم کو عام طور پر حصُولِ دولت کے لیے وسیلہ سمجھا جاتا ہے، مگر مُسلمانوں کی خصُوصیت ہے کہ انھوں نے علم کو وسیلے کے بجائے مقصد سمجھا ہے، ذریعۂ معاش نہیں سمجھا مسلمانوں نے ہمیشہ علم کو علم کے لیے سیکھا ہے، انھوں نے علم کو کبھی اس لیے حاصل نہیں کیا کہ اس کے ذریعے معیشت حاصل کریں مُسلمانوں کے نزدیک حصُولِ علم ایک فرض ہے، جس کو پُورا کرکے مُسلمان علاوہ دُنیوی مفاد کے اُخروی نجات بھی حاصل کرتا ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ۔ یعنی ہر مُسلمان مرد وعورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔ یہ فرضیت علم ہی کے لیے ضرُوری قرار دی گئی ہے اور ہر شخص پر بقدرِ ضرُورت واجب ہے، تاریخ کی یہ مسلّم حقیقت ہے کہ کوئی قوم اُس وقت تک سربلند نہیں ہوسکی، جب تک اُس میں علم وعمل کی قوتیں بیدار نہیں ہوئیں، تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی بدولت انسانی، تمدنی اور اخلاقی ترقی ہوسکتی ہے، جو انسانی تخلیق کا مقصدِ اعلیٰ ہے، ایسی ترقی کے پیشِ نظر یہ ضرُوری ہے کہ ہر طالب علم کو اس امر کا پُورا پُورا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کی بہتر سے بہتر طریقے پر نشو ونما کرسکے، بالفاظ دیگر معاشرے کا فرض اوّلین ہے کہ وہ تمام ایسی سہولتیں مہیا کردے، جس سے ہر طالب علم اپنے بہترین جوہر دکھا سکے، اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علم سے قومیں بنتی اور جہل سے بگڑتی ہیں، بنا بریں ضرُوری ہے کہ ہر شخص کو تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔

ہر ترقی کرنیوالی قوم کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس کی ترقی کا راز اس قوم کے عوام کے تعلیم یافتہ ہونے میں مضمر ہوتا ہے اور یہ اس وقت تک آسان نہیں جب تک تعلیم کا مفت انتظام نہ ہو۔ موجودہ طریقۂ تعلیم میں مصارف کی گراں باری نے اکثریت کو تعلیم کے فوائد سے محروم کر دیا ہے، صدہا برس کے تجربے کے بعد بیسویں صدی کے بڑے بڑے ماہرین تعلیم بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عوام کی تعلیم مفت ہونی چاہیئے اور جب تک یہ طریقہ اختیار نہ کیا جائیگا، تعلیم کا عام ہونا مشکل ہے۔

ہمارا قدیم نظامِ تعلیم

لیکن ہمارے قدیم تعلیمی نظام میں ہمیشہ سے اسی اصول پر عملدرآمد ہو رہا ہے، چنانچہ ان مدارس میں تعلیم کا جو نہج اختیار کیا گیا تھا، اس میں تعلیمی مصارف کو طلباء کے بجائے درسگاہوں کے ذمہ رکھا گیا ہے۔ اس تعلیمی نظام میں تعلیم پر کوئی فیس عائد نہ تھی اور صرف یہ بلکہ طلبہ کے لیے زیرِ درس اور معلوماتِ عامہ کے لیے کتابوں کا انتظام بھی مُفت ہوتا تھا، پھر نہ صرف یہ کہ تعلیم مُفت تھی اور قیام گاہ (بورڈنگ ہاؤس) کا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا تھا، بلکہ نادار اور غریب طلبہ کو درسگاہوں کی جانب سے کھانا، کپڑا اور دوسری ضروریات کے لیے نقد وظائف بھی دیئے جاتے تھے۔

اس کے علاوہ مدارسِ عربیہ میں حصولِ علم پر کبھی کوئی ایسی پابندی بھی عائد نہیں کی گئی، جس کے ذریعے، قوم کے کچھ افراد پر تعلیم و تعلم کے دروازے بند کر دیئے گئے ہوں، بلکہ ان میں ہر وہ شخص جس کو اکتسابِ علم کا کچھ بھی ذوق ہوتا، بغیر کسی رکاوٹ کے علم حاصل کر سکتا تھا، عمر اور پیشے کی قید سے ہمارے مدارس ہمیشہ آزاد رہے ہیں اور ان میں رنگ و نسل، امیر و غریب اور آزاد و غلام کے مابین کوئی امتیازی فرق روا نہیں رہا ہے۔ اس بنا پر ہر شخص کے لیے خواہ وہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ اور کتنا ہی کم مقدور کیوں نہ ہو۔ بلاتکلف اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی راہیں ہمیشہ کھلی رہی ہیں، مسلمانوں کی علمی تاریخ میں بے شمار ایسے علماء و فضلاء ملیں گے، جو آبائی طور پر مختلف ادنےٰ و اعلےٰ پیشوں سے تعلق رکھتے تھے

ادنیٰ پیشوں سے تعلیم کی پابندی اٹھانا یورپ نے درحقیقت مسلمانوں ہی سے سیکھا ہے، اور جس چیز کا سہرا آج یورپ کے سر باندھا جا رہا ہے اگر مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مدارسِ عربیہ ہی کا پرتو ہے، البتہ عمر کی قید اٹھا دینے کا فلسفہ ابھی دُنیا کو ان مدارس سے سیکھنا باقی ہے اور گو تعلیمِ بالغان کی شکل میں اس کی داغ بیل پڑ چکی ہے، تاہم حصولِ سند میں ابھی تک اس پر پابندی موجود ہے، با ایں ہمہ اب وہ زمانہ زیادہ دُور نہیں جب دُنیا کی یونیورسٹیوں سے یہ لعنت بھی اٹھا دی جائے گی۔

دارالعلوم کی تعلیم

ہمارے قدیم نظامِ تعلیم کی یہی روایات دارالعلوم دیوبند کی طرۂ امتیاز ہیں، یہاں بھی طلبہ سے تعلیمی فیس نہیں لی جاتی، غیر مستطیع اور ضرورتمند طلباء کو دارالعلوم کی جانب سے کھانا، کپڑا اور نقد وظائف دیئے جاتے ہیں۔ زیرِ درس کتابیں اور قیام کے لیے جگہ ہر مستطیع اور غیر مستطیع طالب علم کے لیے مفت مہیا کی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دارالعلوم کی تعلیم صرف دولت مندوں کے ساتھ مخصوص نہیں رہی ہے، بلکہ غریب شخص بھی اس کے ذریعے سے اپنے بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر سکتا ہے، اس کا فیض عام اور بقدرِ استعداد تام ہے۔

تعلیمی آزادی

دارالعلوم ہی ہندوستان میں وہ سب سے

پہلی درس گاہ ہے، جس نے آزاد طریق تعلیم کو پیش کیا اور سیاسی
غلامی کی فضا میں ملت کی ذہنی آزادی کو برقرار رکھنے کی جدوجہد
کی، اگرچہ یہ کام بہت مشکل تھا، مگر دارالعلوم نے بعونہٖ تعالیٰ اس پر
عمل کر کے اس مشکل کو آسان بنا دیا، دارالعلوم کی یہ وہ خصوصیت ہے
جو بہت کم درسگاہوں میں پائی جاتی ہے دارالعلوم نے برطانوی
حکومت کی پیشکش کے باوجود کبھی اس کی امداد قبول نہیں کی، ایسے
وہ بہت سی ایسی پابندیوں سے آزاد رہا ہے جو سرکاری زرِ امداد کے
ساتھ ساتھ آتی لازمی ہیں، بعض لوگوں کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ
جب حکومت دارالعلوم کو گراں قدر مالی امداد دینے پر آمادہ تھی، تو
اس کو قبولِ امداد میں احتراز و انکار مناسب نہ تھا، قوم خواہ کتنی
ہی فیاضی دکھائے، مگر پھر بھی وہ حکومت کی پیش کردہ امداد (گرانٹ)
کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ان لوگوں کی نظر غالباً اس امر پر نہیں گئی کہ مدارس
عربیہ کو حکومت کے اثر سے اس لیے آزاد رکھنا ضروری ہے، کہ
حکومت خواہ مسلمانوں ہی کی کیوں نہ ہو، جب تک وہ خالص اسلامی
طرز کی حکومت نہ ہو، اس کی سیاست بے لاگ اور بے غل و غش
نہیں ہو سکتی اور مدارس عربیہ کے لیے ایسی تعلیم درکار ہے، جو ہر قسم
کے غیر اسلامی اثر اور خارجی عمل دخل سے بالکلیہ آزاد ہو، دارالعلوم
دیوبند نے اپنی پوری زندگی میں ایک لمحہ کے لیے بھی حکومت
وقت سے مالی امداد حاصل نہیں کی، اس کا تمام تر سرمایہ اعتماد علی اللہ
ہے اور یہ صرف مسلمانوں کے بل بوتے پر علم اور دین کی خدمت
میں منہمک رہا ہے اور لیل و نہار کی تند و تیز گردشوں کے باوجود
اپنی قدیم شان اور روایات کے ساتھ قائم ہے۔

آج ہماری قومی بدقسمتی سے تعلیم کا مقصد یہ ہو کر رہ گیا ہے
کہ اس کے ذریعے سے کوئی اچھی اور پُرمنفعت ملازمت حاصل کر کے
معقول روزی کمائی جائے، گویا تعلیم کا مفہوم ہی سرے سے بدل
ڈالا گیا ہے اور علم برائے علم کے بجائے اب صرف حصولِ معاش
کے دوسرے بہت سے ذرائع کی طرح یہ بھی ایک ذریعہ بن کر
رہ گیا ہے، حالانکہ شرفِ علم کا قدرتی تقاضا ہے کہ اس کا نصب العین
بلند ہو بے شبہ دنیاوی علوم و فنون اس لیے حاصل کیے جا سکتے
ہیں کہ ان کے ذریعے دنیاوی ترقی حاصل کی جا سکے، لیکن اگر اس
نصب العین کو صرف اپنے ذاتی مفاد تک محدود کر دیا جائے اور
اپنی ہی منفعت سامنے رکھی جائے تو یہ خود غرضی ہے، علم جیسی گراں قدر
دولت کو صرف اپنی اغراض پر خرچ کرنا، علم کی تعظیم نہیں، توہین ہے
پس دنیاوی علوم و فنون حاصل کرنے کا مقصد بھی یہ ہونا چاہیے
کہ اس کے ذریعے سے پوری قوم کے سرمائے کو ترقی دی جا سکے
اور یہ نہ صرف اپنے عروج و ترقی کا بلکہ ملک و ملت کی ترقی کا
ذریعہ بن سکے!

بحمد للہ دارالعلوم کے طلبہ کے سامنے حصولِ علم کا مقصد
اور نصب العین اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی اور نہس کی مخلوق کی بہترین
خدمت ہے۔ اسلامی تاریخ کا یہ زرّیں واقعہ یاد رکھنے کے لائق
ہے کہ جب بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم ہوا اور اس کے اساتذہ
اور طلبا کے لیے گراں قدر مشاہرے اور وظائف مقرر ہوئے اور
حکومت کی جانب سے ہر قسم کا سامان آسائش مہیا کیا گیا، تو علماء
بخارا نے زوالِ علم کی مجلس ماتم منعقد کی اور اس پر اظہار افسوس
کیا کہ اب علم، علم کے لیے نہیں جاہ و ثروت کے لیے حاصل کیا جائے
گا اور ظاہر ہے کہ جس شخص کے سامنے یہ مقصد نہ ہوگا، وہ یونیورسٹی
کے بجائے دارالعلوم کا رخ ہی کیوں کرے گا، جس کی سند کی
قیمت حکومت کی نظر میں کھوٹے سکے سے زائد نہیں ہے۔
ایک مرتبہ صوبہ متحدہ کے گورنر سر جیمز مسٹن نے جب کہ وہ دیوبند
کے معائنے کی غرض سے یہاں آئے تھے، دیوبند سے دور دراز

نے ایک طالب علم سے سوال کیا تھا،

"اتنی دُور سے تمہارے یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟"

طالب علم نے بے ساختہ جواب دیا کہ:

"میں یہاں اس لیے پڑھنے آیا ہوں تاکہ واپس جاکر اپنے وطن کے لوگوں کی دینی خدمت انجام دے سکوں!"

دار العلوم کے نصاب تعلیم سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وُہ "السنۂ شرقیہ" کے سرکاری امتحانات "مولوی فاضل" وغیرہ کے معیار سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہے، اس لیے اگر دار العلوم چاہتا تو بڑی آسانی سے اپنی سند کو "مولوی فاضل" کے مساوی تسلیم کرا سکتا تھا مگر اس نے اپنی سند کو سرکاری محکموں کی ملازمت کیلئے پروانۂ راہداری بنانے کے بجائے اس امر کو زیادہ مناسب سمجھا کہ وُہ طلبا میں ایسی علمی قابلیت و فضیلت پیدا کر دے کہ لوگ اس کے طالب علم اور اس کی سند کو دیکھتے ہی یہ باور کرلیں کہ یہ کوئی کام کی چیز ہے اور یہ شخص دین کے جس کام کو اپنے ذمے لے گا، اس کو قابلیت اور خوش اسلوبی سے انجام دے سکے گا۔

کتاب وار نظامِ تعلیم

مدارس عربیہ اور بالخصوص دار العلوم کے نظام تعلیم میں ایک خصوصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، یونیورسٹی نظام میں ابھی تک اس کی افادیت پر توجہ نہیں کی گئی ہے۔ وُہ یہ ہے کہ "جماعت وار نظام تعلیم" یعنی درجہ بندی جو عام طور پر علمی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہے۔ اسکے بجائے دار العلوم میں کتاب وار نظام تعلیم اختیار کیا گیا ہے یعنی ہمارے مدارس میں "جماعت بندی" (کلاس سسٹم) نہیں ہے۔ بلکہ طلبا کو تعلیمی لحاظ سے کتابوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ اگر یہ بتلانا ہو کہ طالب علم تعلیمی استعداد کے لحاظ سے کس دور سے گزر رہا ہے۔ تو جماعت کا نام لینے کے بجائے یہ کہا جائے گا کہ فلاں فلاں کتاب پڑھ رہا ہے، یا پڑھ رہا ہے، سالانہ تعلیمی ترقی میں بھی درجات کے بجائے کتابوں ہی کا لحاظ رکھا جاتا ہے، سالانہ امتحان میں اگر طالب علم ایک یا دو کتابوں میں فیل ہو جاتا ہے اور بقیہ میں پاس تو وہی جن میں طالب علم فیل ہوا ہے۔ ان کتابوں کی سالانہ ترقی میں ثابت نہیں ہوتیں جن میں اس نے کامیابی حاصل کرلی ہو۔ جن کتابوں میں طالب علم ناکام ہوتا ہے۔ سال آئندہ میں صرف ان ہی کتابوں کا اُسے اعادہ کرنا ہوتا ہے، یہ نہیں ہوتا کہ ایک یا دو کتاب کی ناکامی کے باعث کامیاب شدہ کتابوں کے اعادے پر بھی مجبور کیا جائے جیساکہ یونیورسٹی نظام میں بالعموم ہوتا ہے۔ اس نظام تعلیم کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں بہت ہی کم طلبا ایسے نکلتے ہیں جو ساری کتابوں میں ناکام ہوں۔ اس لیے طالب علم کی نفسیات پر اس کا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ اسے اپنی جزوی ناکامی کا اس شدت سے احساس نہیں ہونے پاتا جس شدت سے جماعت وار نظام کی کلی ناکامی میں ہوتا ہے، اس کا نتیجہ جہاں ایک طرف یہ نکلتا ہے۔ کہ طالب علم میں بددلی پیدا ہونے نہیں پاتی، وہیں دُوسری جانب اس کی مدت اور مصارف تعلیم میں بھی فی الجملہ وقت اور روپے کی کفایت ہو جاتی ہے۔

اس کے برخلاف "جماعت وار نظام تعلیم" میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ امتحان میں فیل ہو جانے کی وجہ سے بعض طلبا میں ایسی بے رغبتی اور بددلی پیدا ہو جاتی ہے کہ وُہ مایوس ہوکر تعلیم ہی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیتے ہیں، بلکہ بعض اوقات تو امتحان کی ناکامی محنتی اور غیور طلبا میں خطرناک نتائج تک پیدا کر دینے کا باعث بن جاتی ہے، اور طالب علم اپنے آپ کو شرمندگی سے بچانے کیلئے

خودکشی تک کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔

کتاب دار تعلیمی نظام میں باعموم ان میں سے کوئی بات پیش نہیں آتی۔ ذیل میں ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء سے ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء تک دارالعلوم کے دس سال کے امتحان کے نتائج کا گوشوارہ پیش ہے۔ گوشوارے کے تعداد طلبہ کے خانے میں طلبا کی وہ تعداد درج ہے، جو شروع سال میں موجود ہوتی ہے۔ دارالعلوم میں داخلہ شوال میں ہوتا ہے اور امتحان سن آئندہ کے شعبان میں، درمیان میں طلبا کی تعداد کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ اس کے بعد کے خانے میں جو تعداد درج کی گئی ہے وہ شعبان میں سالانہ امتحان کے زمانے میں موجود طلبا کی ہے۔

ناکام طلبا کی تعداد میں وہ طلبا بھی شامل ہیں جو عین امتحان کے زمانے میں بیمار ہو گئے۔ یا امتحان کے دوران میں کسی وجہ سے غیر حاضر رہے۔ نتیجہ فی صد میں ان سب کو شامل کر لیا گیا ہے اگر

نمبر شمار	سن	تعداد طلبا	شریک امتحان	کامیاب	ناکام	نتیجہ فی صد
۱	۱۳۵۰ھ	۱۰۰۹	۱۰۰۶	۸۷۳	۱۳۳	۸۷
۲	۱۳۵۱ھ	۱۱۴۰	۱۱۳۸	۱۰۶۹	۶۹	۹۴
۳	۱۳۵۲ھ	۱۰۹۰	۱۰۰۰	۹۲۶	۷۴	۹۳
۴	۱۳۵۳ھ	۱۱۴۲	۱۰۱۳	۸۶۱	۱۵۲	۸۵
۵	۱۳۵۴ھ	۱۱۱۴	۱۰۷۶	۸۶۰	۲۱۶	۷۱
۶	۱۳۵۵ھ	۱۱۹۶	۱۰۱۴	۸۵۳	۱۶۱	۷۴
۷	۱۳۵۶ھ	۱۲۲۶	۱۰۷۶	۱۰۰۴	۷۲	۹۳
۸	۱۳۵۷ھ	۱۴۱۶	۱۲۵۵	۱۱۶۶	۸۹	۹۳
۹	۱۳۵۸ھ	۱۴۹۳	۱۱۹۸	۱۱۲۱	۷۷	۹۴
۱۰	۱۳۵۹ھ	۱۴۲۲	۱۲۳۱	۱۱۴۸	۸۳	۹۳

ان کو محسوب نہ کیا جائے، جیسا کہ اصولاً ضروری ہے، تو کامیابی کا معیار اور زیادہ بڑھ جائے گا!

دس سال کے ان نتائج میں کامیابی کا عام معیار ۸۴ سے ۹۴ فی صد تک ہے۔ البتہ ۱۳۵۴ھ میں ۷۱ فی صد تک گر گیا ہے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ وبائی امراض کی کثرت کی وجہ سے بیشتر طلبا امتحان میں شرکت نہیں کر سکے۔

طریقِ تعلیم

دارالعلوم میں لکچروں کے بجائے تعلیم کا یہ طریقہ رائج ہے، کہ استاذ اور شاگرد دونوں کے سامنے کتاب ہوتی ہے، استاذ کا فرض ہے کہ جب طالب علم سبق کی عبارت پڑھ چکے تو استاذ فنی حیثیت سے اس پر ایک جامع تقریر کرے جس میں متعلقہ مسائل کے ہر ہر پہلو پر روشنی ڈالے اور آخر میں اپنی تقریر کو کتاب کی عبارت پر منطبق کر کے طالب علم کو مطمئن کر دے، طلبا درس میں بالکل آزاد ہوتے ہیں اور وہ اس کے مستحق ہوتے ہیں کہ جب تک سبق کو پوری طرح سمجھ نہ لیں اور جتنے اعتراضات اس سبق کے بارے میں ہوں ان کا تشفی بخش جواب استاد سے نہ سن لیں، اسے آگے نہ بڑھنے دیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو طالب علم مطالعہ اور پوری تیاری کر کے درس میں آ کر بیٹھتے ہیں اور دوسری طرف استاد بھی پوری محنت اور تیاری کے ساتھ پڑھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

موجودہ طریقِ تعلیم کے مطابق دارالعلوم میں یہ طریقہ رائج نہیں ہے کہ استاد آئے مضمون پر لکچر دے اور طلبا لکچر نوٹ کریں۔

امتحان یہ کہنا تو آسان نہیں ہے کہ مدارس عربیہ

میں امتحانات کا طریقہ عموماً مروج تھا، تاہم بعض مدارس کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں طلبہ کا سالانہ امتحان لیا جاتا تھا، چنانچہ سجاد مرزا بیگ "بستان السلاطین" میں اس کے مدارس کے حالات میں لکھتا ہے

"امتحان بتاریخ سلخ ذی الحجہ می شد"

یعنی ذی الحجہ کے ختم پر طلبہ کا امتحان ہوتا تھا، ایک دوسری جگہ اسی کتاب میں امتحان کے سالانہ ہونے کی بھی تصریح ہے، لکھا ہے

"سالانہ امتحان می شد" (بحوالہ نظام تعلیم و تربیت صفحہ ۲۴۱ ج ۱)

مگر قیام دارالعلوم کے قریبی زمانے میں یہ رواج متروک ہو چکا تھا اور مدارس عربیہ میں سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان کا طریقہ جو طالب علم کی استعداد اور محنت و جانفشانی کے اندازہ کرنے کا ایک عمدہ ذریعہ ہے مروج نہیں تھا، طالب علم جب استاد سے ایک کتاب پڑھ چکتا تو اس سے مافوق، دوسری کتاب بغیر امتحان لیے شروع کرا دی جاتی تھی، ظاہر ہے کہ اس میں طالب علم کی استعداد کے جانچنے اور پرکھنے کا کوئی موقع نہ تھا اور بسا اوقات ناقابل طالب علم بھی ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا تھا، دارالعلوم نے اس نقص کو محسوس کرتے ہوئے اس طریقے کو ختم کر کے سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان کو لازمی قرار دیا۔

دارالعلوم میں امتحان کے سلسلے میں جو قواعد مروج ہیں، وہ فی الجملہ یونیورسٹیوں کے امتحانات سے زیادہ سخت ہیں، یہاں پرائیویٹ امتحان کا قاعدہ نہیں ہے۔ یونیورسٹی کے امتحان میں ایک مضمون سے متعدد سوالات کیے جاتے ہیں اور ہر سوال کے نمبر متعین ہوتے ہیں، نیز طالب علم کو اس کا حق بھی ہوتا ہے کہ جواب کے لیے ان میں سے اپنی مرضی اور معینہ تعداد کے مطابق سوالات کا انتخاب کر لے۔ پورے سوالات کے جوابات دینے لازمی نہیں ہوتے، لیکن دارالعلوم کے امتحان میں ہر کتاب سے متعلق تین سوال ہوتے ہیں اور ہر پرچے میں تینوں کا حل اس لیے لازمی ہوتا ہے کہ تینوں کے نمبر مشترک ہوتے ہیں، اگر ایک سوال بھی چھوڑ دیا جائے تو طالب علم فیل ہو جاتا ہے، کامیابی کے نمبروں کا معیار ۵۰ فی صد رکھا گیا ہے، جو یونیورسٹیوں کے ۳۳ فی صد سے کہیں زیادہ ہے۔

البتہ اگر کسی کتاب میں اس معیار سے کم نمبر مل سکے ہوں، تو اس صورت میں طالب علم کو مافوق کتاب پڑھنے کی اس شرط کے ساتھ اجازت مل جاتی ہے کہ اس کتاب میں مکرر سالانہ امتحان دے کر کامیابی حاصل کرنی ہوگی گویا یونیورسٹی کی موجودہ اصطلاح میں اس کو کمپارٹمنٹ سمجھنا چاہیے

اس کے علاوہ یونیورسٹی کے پرچوں میں بعض کتابوں کے گروپ بھی مقرر کر دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً دو مضمون کی کتابیں ساتھ ساتھ ایک گروپ میں شامل کر دی جاتی ہیں، اور دونوں میں مجموعی طور پر کامیابی کے نمبر حاصل کرنے ہوتے ہیں جو کم از کم ۳۳ فی صد ہونے چاہییں۔ اب خواہ دونوں میں نمبر برابر ہوں یا کم و بیش، مثلاً ایک میں ۲۰ اور دوسری میں تیرہ تو کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا، اس میں یہ سہولت ہے کہ طالب علم کو دونوں مضمونوں میں سے اگر کسی ایک مضمون سے بھی مناسبت ہے، تو دوسرے میں معمولی شد بد سے بھی کام نکل جاتا ہے۔

مادری زبان میں تعلیم

دارالعلوم کی ایک اور خصوصیت جو قابل ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ یہاں درس و تعلیم کی زبان اردو قرار دی گئی ہے۔ جو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، کتابیں عربی زبان میں ہیں مگر اساتذہ کی تقریریں اردو میں ہوتی ہیں۔ علوم و فنون کی تعلیم میں جو اہمیت مادری زبان کو حاصل ہے، اس کو یونیورسٹی کے نظام تعلیم میں بڑی مدت کے بعد سمجھا جا سکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ علمی مسائل جس آسانی سے مادری زبان میں سمجھ میں آتے ہیں اور حافظے میں محفوظ رہتے ہیں، وہ دوسری زبان میں ممکن نہیں ہے۔ مگر انگریزی اقتدار کے غلبہ نے قوم کے دماغوں کو استعد

متاثر اور مغلوب کر دیا تھا کہ وہ ایک عرصے تک اس حقیقت کا سراغ نہ پا سکی۔ بعض باتیں بظاہر معمولی دکھائی دیتی ہیں اور لوگ انھیں حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ اس قدر اہم ہوتی ہیں کہ انھیں بڑی بڑی باتوں کے لیے بنیاد بنایا جا سکتا ہے اور اُن کے ذریعے پورے نظامِ زندگی کو اُستوار کیا جا سکتا ہے، اگرچہ بعض دفعہ حقائق تو سامنے ہوتے ہیں مگر ان کی اہمیت کا ادراک نہیں ہوتا۔ اُن کی اچھائی اور بُرائی بھی پیشِ نظر ہوتی ہے، لیکن طبیعت اس کا زیادہ احساس نہیں کرتی، چنانچہ طویل مدت کے بعد ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کو سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن اور جامعہ ملیہ دہلی نے محسوس کیا اور اُس پر عملدرآمد شروع کر دیا، جس میں دونوں جگہ نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور انھوں نے دوسری یونیورسٹیوں کے لیے ایک قابلِ تقلید مثال پیش کر دی ہے اور اب تو ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی جانب سے یہ مطالبہ عام ہوتا جا رہا ہے کہ اُن میں ذریعۂ تعلیم مادری زبان قرار دی جائے۔

عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن نے اس سلسلے میں دارالترجمہ قائم کر کے انگریزی اور عربی و فارسی کی بہت سی کتابوں کے ترجمے کرا کر اُردو کے علمی سرمایہ میں بیش قرار اضافہ کر دیا ہے۔ اسی طرح جامعہ ملیہ دہلی نے بھی اس سلسلے میں قابلِ تعریف کام انجام دیا ہے۔

بہرحال اس سلسلے میں اوّلیت کا سہرا دارالعلوم ہی کے سر ہے ہمارے اکابر کی دُور بین نظروں نے جس چیز کو سو سال پہلے سمجھ لیا تھا۔ بیسویں صدی کے ماہرینِ تعلیم بھی بالآخر اسی نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوئے ہیں

اُردو کی اشاعت و ترویج

یہ تو اس مسئلے کا تعلیمی پہلو تھا، لیکن اس کے علاوہ اس کا ایک لسانی پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ دارالعلوم میں اُردو کے درسی زبان ہونے سے اُردو کو جو عظیم الشان فائدہ پہنچا ہے، گو اس پہلو سے ترقی و اشاعت کے حلقوں کی ابھی تک نظر نہیں گئی ہے تاہم اس کے نتائج و ثمرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، وہ یہ ہے کہ دارالعلوم چونکہ عالمِ اسلامی کی کلاں کی مرکزی درسگاہ ہے اور اُس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے علاوہ مختلف ممالک کے طلبا تحصیلِ علم کی غرض سے آتے ہیں جو اپنے دورانِ قیام میں خاصی اُردو سیکھ جاتے ہیں، چنانچہ چند سال کی بات ہے کہ ایک صاحب جنھوں نے مختلف ممالک کی سیاحت کی تھی، دارالعلوم میں آئے تھے وہ کہتے تھے کہ :

"میں جب بخارا پہنچا، جو وسط ایشیا کا مشہور مقام ہے، تو وہاں ایک ایسے شخص سے میری ملاقات ہوئی جس نے مجھے ہندوستانی سمجھ کر ہمدردانہ لہجے میں اُردو میں مجھ سے گفتگو کی، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ہندوستان سے اس قدر دُور دراز اتنی صاف اُردو اس کو کیونکر آئی ہوگی، میرے دریافت کرنے پر اُس نے بتلایا کہ "یہ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی فیض ہے اور میں ہی نہیں بلکہ یہاں کا علمی حلقہ بالعموم اُردو سمجھتا اور بولتا ہے": اس شخص نے نہایت اخلاق اور محبت سے مجھے اپنے یہاں مہمان ٹھیرایا اور میرے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی دی، جس کی یہ خصوصیت میں کبھی نہیں بھولوں گا کہ اُس میں جس نے بھی تقریر کی وہ میری خاطر سے اُردو میں کی":

غرض کہ اس طرح دارالعلوم نے اُردو کے دائرہ کو اپنے طلباء کے ذریعے دُنیا کے تقریباً تمام ایشیائی ممالک تک وسیع کر دیا ہے۔

تربیتِ اخلاق

✓ اسلامی علوم کے پڑھنے پڑھانے کا مقصد تہذیبِ اخلاق، تدبیرِ منزل اور سیاستِ مدن کے ہر شعبے میں اسلامی نقطۂ نظر سے ایسی فضا پیدا کرنا ہے، جس کو صالح نظام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کو دارالعلوم

...خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس لیے دارالعلوم محض ...یسی ادارہ ہی نہیں ہے، جس میں صرف قوتِ ادراک کو تیز کر دینے ...لایا جاتا ہو، بلکہ وہ اسلامی تہذیب و اخلاق، ذہن و فکر، تہذیبِ نفس ...تربیت کی ایسی تربیت گاہ بھی ہے، جس میں رہ کر طالب علم اسلامی تہذیب و معاشرت سے قریب تر اور اُس کا عادی ہو جاتا ہے۔ تاکہ ...ی صلاحیتوں سے اس مقصد کو پورا کر سکے، جو علماء کے لیے نہایت ...روری ہے

حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ (شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند) اکثر اپنے درس میں فرمایا کرتے تھے: جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں ان کا مقصد تحصیلِ علم یا تو دین ہوتا ہے یا فقط دُنیا، اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو علم کو محض علم کے لیے حاصل کرتے ہیں، یہ ...نیت ہے، لیکن علم سے معاش کا کام لینا اور اسی مقصد کے لیے اُسے حاصل کرنا ایک بدترین معصیت ہے، ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو بازار سے ایک قیمتی شال اس لیے خرید کرتا ہے کہ اس سے وہ اپنے جُوتے صاف کیا کرے گا۔

اس کے بعد طلباء سے تاکیداً فرماتے کہ تم لوگوں کو سب سے پہلے اپنی نیت اور ارادے کا جائزہ لینا چاہیئے اور یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ تم میں سے کون شخص کس طبقے میں شامل ہونا چاہتا ہے۔

دارالعلوم کے ماحول میں طلباء کو تقریباً ہر کام خود کرنے کا موقع دیا جاتا ہے، کمرے کی صفائی اور اپنے کپڑے دھونا عام معمول ہے۔ مطبخ میں جا کر خود ہی اپنا کھانا لانا ہوتا ہے، اس طرزِ زندگی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ طلباء میں اپنی بڑائی کا احساس اور غرورِ علم پیدا نہیں ہونے پاتا اور وہ تواضع کے ساتھ فروتنی کے عادی بھی بن جاتے ہیں غرض کہ وہ انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں جو سخت کوشی کے مرادف ہوتی ہے، وہ زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک معمولی اور سستا لباس پہنتے ہیں، کُرتہ، پاجامہ، دوپلی ٹوپی اور سلیم شاہی جوتہ یا چپل ان کا عمومی لباس ہوتا ہے، یہی حال کھانے کی سادگی کا ہے۔ وہ سادہ ترین خوراک استعمال کرتے ہیں بس کھانے پینے میں بڑے سے بڑا تکلف چائے نوشی ہے، آرائشی فرنیچر کی انہیں چنداں ضرورت نہیں ہوتی صرف چارپائی اور بسیہ یا ٹاٹ کا معمولی فرش ان کے بیٹھنے اور سونے کیلئے کافی ہوتا ہے۔

جدید تہذیب و تمدن کی طرح جس میں زندگی کے گوناں گوں بے شمار تکلفات پیدا کر لیے گئے ہیں وہ اپنے آپ کو گم کر دینے کے عادی نہیں ہوتے، جس کا نتیجہ ہے کہ وہ زندگی کی جد و جہد میں بڑی سے بڑی تکلیف برداشت کر لینے کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ طلبائے دارالعلوم کی یہ وہ خصوصیت ہے جو دوسری قدیم و جدید درسگاہوں سے اُسے ممتاز کرتی ہے اور جسے ان لوگوں سے ملنے والا اوّلین لمحات میں محسوس کر لیتا ہے۔ یہ نہ بتلا سکنے کی بات ہے اور نہ سُننے سے تعلق ہے۔ بلکہ دارالعلوم کی اس کیفیت کے خط و خال کو صرف اس کی زندگی کے آئینے ہی میں ٹھیک طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

دارالعلوم کے تعلیمی موقف پر
ایک انگریز مبصر کی شہادت

دارالعلوم کی تعلیمی خصوصیات کو دوسرے لوگوں نے کس نظر سے دیکھا ہے، اس کی تفصیل کی گنجائش تو اس مختصر کتابچے میں مشکل ہے، تاہم ایک انگریز مبصر جان پامر (JOHN PALMER) کے مشاہدات آئندہ سطور میں پیش کیے جاتے ہیں۔ (دارالعلوم جس زمانے میں قائم ہوا، اس وقت برطانوی حکومت مسلمانوں سے سخت بدظن اور بدگمان تھی اور ان کے ہر قول و فعل کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے دارالعلوم کی نسبت عرصے تک خفیہ و علانیہ تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا، چنانچہ ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۵ء

میں صوبہ متحدہ کے گورنر سر جان اسٹریچی نے ایک معتمد خاص جان پامر کو اسی غرض سے خفیہ طور پر دارالعلوم میں بھیجا کہ وہ تحقیقات کر کے رپورٹ دے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد کیا ہے اور مسلمان علماء دارالعلوم کے پس پردہ کس فکر و عمل میں مصروف ہیں۔

جان پامر نے دارالعلوم کو دیکھ کر جو رپورٹ مرتب کی اور جو تاثرات اخذ کئے وہ اس نے اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے بسط و تفصیل سے بیان کئے ہیں (جان پامر نے اس خط کی نقل دارالعلوم کو بھی بھیجی تھی، جو دارالعلوم کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ یہ شخص چونکہ ایک ایسی سوسائٹی کا پروردہ ہے جو ایشیا کی ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کی عادی ہے، اس لیے جان پامر کے اعتراف حقیقت سے جہاں اس کے بیان کی صداقت اور انصاف پسندی کا ثبوت ملتا ہے، وہاں دارالعلوم کے تعلیمی خد و خال بھی زبان غیر سے متعین ہو جاتے ہیں)

جان پامر نے دارالعلوم کی تعلیمی زندگی کا انگریزی یونیورسٹیوں سے موازنہ کرتے ہوئے اپنے مشاہدات و تاثرات کا جس غایت دلچسپ اور عالمانہ طریقے سے اظہار کیا ہے، وہ دارالعلوم کے تعلیمی موقف کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔ یہ واقعہ دارالعلوم کی ابتدائی زندگی کا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم کا تعلیمی موقف شروع سے کیا رہا ہے۔

جان پامر لکھتا ہے کہ صوبہ متحدہ کے گورنر سر جان اسٹریچی کے حکم سے میں ۱۸۷۵ء / ۱۲۹۱ھ کو اتوار کے دن اس مدرسہ (دارالعلوم) میں پہنچا، یہاں پہنچ کر میں نے ایک بڑا کمرہ دیکھا، جس میں چٹائی کے فرش پر چھوٹے چھوٹے لڑکے کئی درجن کتابیں سامنے رکھے ہوئے بیٹھے تھے اور ایک بڑا لڑکا ان کے درمیان میں بیٹھا ہوا تھا، میں نے لڑکوں سے دریافت کیا کہ تمہارا استاد کون ہے؟ ایک نے اشارے سے بتایا، معلوم ہوا کہ جو شخص درمیان میں بیٹھا تھا، وہی استاد ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ یہ کیا استاد ہو گا، میں نے پوچھا آپ کے لڑکے کیا پڑھتے ہیں؟ جواب دیا: یہاں فارسی پڑھائی جاتی ہے

یہاں سے آگے بڑھا، تو ایک صاحب میانہ قد، نہایت خوب صورت بیٹھے ہوئے تھے، سامنے بڑی عمر کے طلباء کی ایک قطار تھی، قریب پہنچ کر سنا تو علم مثلث کی بحث ہو رہی تھی، میرا خیال تھا کہ مجھے اجنبی دیکھ کر لوگ چونکیں گے، مگر کسی نے مطلقاً توجہ نہ کی، میں قریب جا کر بیٹھ گیا اور استاد کی تقریر سننے لگا، میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ علم مثلث کے ایسے ایسے عجیب اور مشکل قاعدے بیان ہو رہے تھے جو میں نے کبھی ڈاکٹر اسپرنگر سے بھی نہیں سنے تھے، یہاں سے اٹھ کر میں دوسرے دالان میں گیا تو دیکھا ایک مولوی صاحب کے سامنے طالب علم معمولی کپڑے پہنے ہوئے بیٹھے تھے، یہاں اقلیدس کے چھٹے مقالہ کی دوسری شکل کے اختلافات بیان ہو رہے تھے اور مولوی صاحب اس برجستگی سے تقریر کر رہے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اقلیدس کی روح ان میں آگئی ہے، میں سن کر تکتا رہ گیا، اسی دوران میں مولوی صاحب نے جبر و مقابلہ ٹاڈہنٹر سے مساوات درجہ اول کا ایک ایسا مشکل سوال طلباء سے پوچھا کہ مجھے بھی اپنی حساب دانی پر پسینہ آگیا اور میں حیران رہ گیا، بعض طلبہ نے جواب صحیح نکالا۔

یہاں سے اٹھ کر میں تیسرے دالان میں پہنچا، ایک مولوی صاحب حدیث کی کوئی موٹی سی کتاب پڑھا رہے تھے اور ہنس ہنس کر تقریر کر رہے تھے، یہاں سے میں ایک زینے پر چڑھ کر دوسری منزل میں پہنچا، اس کے تین طرف مکلف مکان تھے، بیچ میں ایک چھوٹی سی بنگلی تھی جس میں دو اندھے بیٹھے بڑبڑا رہے تھے، میں یہ سننے کے لیے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں دبے پاؤں ان کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ علم ہیئت کی کسی کتاب کا سبق یاد کر رہے ہیں، اتنے میں ایک اندھے نے دوسرے اندھے سے کہا کہ: "بھائی! کل کے سبق میں شکل عروسی اچھی طرح میری سمجھ میں نہیں آئی، اگر تم سمجھے ہو تو بتلاؤ۔" دوسرے اندھے نے وہی بیان کیا اور اس کی ہتھیلی پر لکیریں کھینچ کر ثبوت شروع کیا، پھر جو آپس میں ان کی بحث ہوئی تو میں دنگ رہ

لیا اور مسٹر پامر پرنسپل کی تقریباً ساری باتیں میری آنکھوں میں پھر گئیں۔ وہاں سے اٹھ کر ایک بیچ و دہ میں گیا، چھوٹے چھوٹے لڑکے صرف نحو کی کتابیں نہایت ادب سے استاد کے سامنے بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ تیسرے درجے میں علم مثلث کا درس ہو رہا تھا۔

میں دوسرے زینے سے اتر کر نیچے آیا۔ میرا خیال تھا کہ مدرسہ بس اسی قدر ہے۔ اتفاقاً ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اس سے اپنے خیال کی تصدیق چاہی، اس نے کہا: "نہیں، قرآن شریف دوسری جگہ پڑھایا جاتا ہے۔" میں نے پوچھا، کہاں؟ وہ مجھ کو مسجد میں لے گیا۔ مسجد کے دالان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے ایک نابینا حافظ کے سامنے قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ حافظ نے ایک چھوٹے سے بچے کو پکڑ کر نہایت بے رحمی سے جھڑجھڑایا، بچہ چلایا، میں نے اپنے رہنما سے کہا کہ ننھے ننھے بچوں سے ایسی سخت محنت لینا بڑا ظلم ہے، اس نے ہنس کر جواب دیا: "یہ ظلم نہیں ہے، شفقت ہے۔ بچوں کو شروع ہی سے محنتِ شاقہ کا عادی بنا دینا عین حکمت اور ان کی آئندہ زندگی میں پیش آنے والی مشکلات پر قابو پانے کے لیے بہت ضروری ہے۔ آج کل مسلمانوں میں یہی تو ایک بات ہمت اور محنت کی رہ گئی ہے اور اسی لیے کچھ ٹوٹا پھوٹا دین ان کے پاس باقی ہے۔"

میں نے پوچھا سالِ گزشتہ اخباروں میں دیکھا تھا کہ چار طالب علموں کے دستارِ فضیلت باندھی گئی تھی، ان میں سے یہاں کوئی موجود ہے؟ وہ بولا کہ "ہاں ایک صاحب ہیں، چلئے میں ملا دیتا ہوں۔" وہ مجھے ایک مکان میں لے گیا، جہاں ایک نوجوان شخص بیٹھا تھا، ایک موٹی سی کتاب سامنے رکھی تھی اور دس بارہ طالب علم بیٹھے پڑھ رہے تھے، ایک طرف دو بندوقیں پڑی ہوئی تھیں، میں نے سلام کیا، اس نے کمال اخلاق سے جواب دیا، میں نے پوچھا کہ سالِ گزشتہ آپ ہی کے دستارِ فضیلت بندھی تھی؟ بولے کہ "اساتذہ کی عنایت ہے" میں نے کہا کہ یہ کیا کتاب ہے؟ فرمایا کہ یہ عربی میں ایک فلسفی کتاب ہے۔ ایک مطبع کے مہتمم نے ترجمے کے لیے بھیجی ہے، اس کی اجرت ایک ہزار روپے ٹھہری ہے۔ مجھے ترجمہ کرتے ہوئے تین مہینے ہوئے ہیں اور تین چوتھائی کے قریب ہو چکا ہے، بقیہ ان شاء اللہ ایک مہینے میں ہو جائے گا۔ میں نے پوچھا کہ یہ بندوقیں کیسی ہیں؟ کہنے لگے کہ مجھ کو شکار کا شوق ہے۔ سات بجے سے دس بجے تک پڑھاتا ہوں، گیارہ سے ایک تک شکار کھیلتا ہوں اور دو سے چار تک ترجمہ کرتا ہوں۔

میں نے دریافت کیا کہ آپ نوکری کیوں نہیں کرتے؟ بولے کہ خدا نے فضلاً گھر بیٹھے بٹھائے ڈھائی سو روپیہ مہینہ دیتا ہے، پھر کس لیے نوکری کروں؟[1]

یہاں سے اٹھ کر کتاب خانہ میں آیا، منتظم کتب خانہ نے میرا خیر مقدم کرتے ہوئے کتابوں کی فہرست دکھلائی، میں حیران رہ گیا، کوئی فن ایسا نہ تھا جس کی کتاب موجود نہ ہو، پھر ایک دوسرا رجسٹر دکھلایا، جو طلبا کی حاضری کا تھا، اور نہایت صاف اور خوشخط لکھا ہوا تھا، منجملہ دو سو دس (۲۱۰) طلبا کے ۲۰۰ حاضر تھے۔

میں اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک صاحب سبز رنگ آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے، میں نے پوچھا کہ آپ کی تعریف؟ بولے کہ "میں مہتمم ہوں" اور تین بڑے بڑے رجسٹر میرے سامنے رکھ دیئے اور بتلایا کہ یہ سال بھر کی آمد و صرف کا حساب ہے، ملاحظہ کیجئے: میں نے دیکھا تو تاریخ وار نہایت صحت کے ساتھ حساب لکھا ہوا تھا۔

گوشوارے سے معلوم ہوا کہ گزشتہ سال کے آخر میں خرچ کے بعد کچھ روپیہ بچ گیا تھا۔ طبیعت چاہتی تھی کہ کتابوں کی کچھ سیر کروں مگر

---

[1] غالباً یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن تھے، حضرت موصوف ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۴ء میں فارغ ہوئے اور ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۵ء میں بلا تنخواہ کے مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۴ء کے فارغ ہونے والے حضرات میں دیوبند کے رہنے والے صرف حضرت شیخ الہند ہی تھے، شکار کا بے حد شوق تھا۔ م

وقت تنگ ہو گیا تھا اور شام ہونے کی تھی مجبوراً واپس ہوا، میری تحقیقات کے نتائج یہ ہیں کہ یہاں کے لوگ تعلیم یافتہ، نیک چلن اور نہایت سلیم الطبع ہیں، کوئی ضروری فن ایسا نہیں جو یہاں پڑھایا جاتا ہو، جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں کے صرف سے ہوتا ہے، وہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے، جو کام پروفیسر ہزار ہا روپیہ لے کر کرتا ہے، وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپے میں کر رہا ہے، مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر کوئی تعلیم گاہ نہیں ہو سکتی اور میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی غیر مسلمان بھی یہاں تعلیم پائے۔ تو نفع سے خالی نہیں۔

انگلستان میں اندھوں کا اسکول سنا تھا، مگر یہاں آنکھوں سے دیکھا کہ وہ اندھے تحریر اقلیدس کی شکلیں کف دست پر اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ باید و شاید۔

مجھے افسوس ہے کہ آج سر ولیم میور صاحب (سابق گورنر صوبہ متحدہ) موجود نہیں ہیں ورنہ وہ بکمال ذوق و شوق اس مدرسہ کو دیکھتے اور طلبہ کو انعام دیتے۔"

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

اگر اس موقع پر بعض ان غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کر دیا جائے جو بالعموم علماء اور مدارس عربیہ کی نسبت انگریزی تعلیم اور انگریزی مدارس سے مسلمانوں کو باز رکھنے کے بارے میں عام طور پر پیدا کر دی گئی ہیں تو شاید بے محل نہ ہوگا۔ علمائے کرام کے متعلق ابھی تک یہ مغالطہ پایا جاتا ہے کہ انھوں نے انگریزی اقتدار کے ابتدائی زمانہ میں انگریزی تعلیم کو ناجائز قرار دے کر مسلمانوں پر دنیاوی ترقی کے دروازے بند کر دیئے جس سے وہ ترقی کے میدان میں برادرانِ وطن کے مقابلے میں پچاس سال پیچھے رہ گئے۔

یہ ایک شدید غلط فہمی ہے، انگریزی تعلیم کو کبھی ناجائز اور حرام نہیں کہا گیا، بلکہ وہ تہذیب و کلچر جو انگریزی تعلیم کے ساتھ لازمی قرار دیا گیا تھا اور اسی کو ترقی کا واحد ذریعہ سمجھا جاتا تھا، علماء کو صرف اس سے اختلاف تھا، مناسب ہوگا کہ اس موقع پر اس الزام پر تاریخی حقائق کی روشنی میں غور کر کے دیکھا جائے کہ اس کی اصلیت کیا ہے؟ ٹھیک اسی زمانے میں جب کہ سر سید احمد مرحوم کی تعلیمی تحریک کا آغاز تھا، ہندوستان کے قدیم تعلیمی مرکز "فرنگی محل" لکھنؤ کے یگانۂ روزگار عالم مولانا عبدالحی لکھنوی نے انگریزی تعلیم کے متعلق فتویٰ دیا تھا کہ

"لغت انگریزی کا پڑھنا یا انگریزی لکھنا سیکھنا اگر بلحاظ تشبہ کے ہو تو ممنوع ہے، اور اگر اس لیے ہو کہ ہم انگریزی میں لکھے ہوئے خطوط پڑھ سکیں اور ان کی کتابوں کے مضامین سے آگاہ ہو سکیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو یہود کا خط (عبرانی) سیکھنے کے لیے حکم فرمایا تو انھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں اُسے سیکھ لیا۔ (مجموعۂ فتاویٰ مولانا عبدالحیؒ باب العلم والعلماء جلد سوم ص۱۰)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ میں انگریزی پڑھنے پڑھانے کے استفتاء کے جواب میں تحریر ہے کہ

"انگریزی زبان سیکھنا درست ہے، بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اس سے نہ آئے۔ (فتاویٰ رشیدیہ جلد اوّل ص۹۲)

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا فتویٰ بھی یہی تھا کہ انگریزی پڑھنا جائز ہے، غرض کہ علمائے کرام نے کسی زمانے میں بھی نفس تعلیم انگریزی سے کبھی اختلاف نہیں کیا، بلکہ حصول معاش اور علم و آگاہی کے لیے صراحۃً اس کے جواز کا فتویٰ دیا، جیسا کہ خود عہد نبوت میں حضرت زید بن ثابتؓ کی مثال سے صاف واضح ہے، البتہ جس صورت میں مخلف

اسباب سے مسلم کے عقیدہ و اعتقاد و ایمان پر اس کا اثر پڑتا ہو اور وہ غیر اسلامی تہذیب، غیر اسلامی اخلاق اور خلاف اسلام معتقدات کے اختیار کر لینے کا ذریعہ بنتی ہو، صرف اس کو ناجائز بتلایا گیا تھا۔

واقعہ در اصل یہ ہے کہ انگریزی زبان سے مسلمانوں کے اجتناب کے متعدد اسباب تھے، سب سے پہلا سبب تو یہ تھا کہ ایک طرف تو مسلمانوں کے دلوں میں چلا آرہا انگریز کے خلاف جس نے انھیں حکومت و سلطنت سے محروم کر دیا تھا شدید غیظ تھا، وہ اُس کی ہر چیز کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے انگریز کے علوم اور اس تہذیب و تمدن کی نسبت مسلمانوں میں معاندانہ جذبات کا موجود ہونا بالکل فطری بات تھی

دوسری طرف انگریز بھی اپنا اصل سیاسی حریف مسلمانوں ہی کو سمجھتا تھا، ہرچند ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کے افراد شریک تھے اور دونوں قوموں نے مل کر بقدر استعداد اس جنگ میں حصہ لیا تھا، مگر انگریز کی نظر میں اس کا اصلی مدمقابل مسلمان ہی تھا اس لیے انگریز نے قابو یافتہ ہونے کے بعد اسی کو اصل باغی سمجھ کر زیادہ سے زیادہ اپنے ظلم و استبداد کا نشانہ بنایا، ملک کی ہر سربلندی اور آسودہ حالی سے مسلمان کو محروم رکھنے کی پالیسی اختیار کی گئی، اُس کا خیال تھا کہ تعلیمی لحاظ سے جب تک مسلمانوں کو پست اور ناکارہ نہ بنادیا جائے گا، اس وقت تک حکومت اور سربلندی کا خواب ان کے دماغوں سے نہیں نکل سکے گا۔

یہ زخم ایسا گہرا لگایا گیا تھا، جو چند روز میں مندمل ہونے والا نہ تھا۔

اسی کے ساتھ ہندوستان میں پادریوں کو تبلیغ عیسائیت کی نہ صرف اجازت تھی بلکہ پُشت پناہی بھی ان کو حاصل تھی، اسکولوں اور کالجوں کے مدرسین عموماً پادری ہوتے تھے، انجیل کا درس لازمی تھا، اس چیز سے نہ صرف علماء کو اختلاف تھا، بلکہ کوئی عامی سے عامی مسلمان بھی ایسی حالت میں اپنی اولاد کو اسکولوں میں بھیجنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔

مولانا فضل حق خیرآبادی جن کو فتویٰ جہاد ۱۸۵۷ء کے جرم میں کالے پانی کی سزا دی گئی تھی اپنے رسالہ اسارت کی تصنیف "الثورة الہندیہ" میں لکھتے ہیں:

"انگریزوں نے تمام باشندگان کو نصرانی بنانے کی سکیم بنائی، اُن کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو کوئی مددگار اور معاون نصیب نہ ہو سکے گا، اس لیے انقیاد و اطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت نہ ہو سکے گی۔ انگریزوں نے یہ بھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر یہاں کے باشندوں سے اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا۔ اس لیے پوری جاں فشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب و ملت کے مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکر و حیلے سے کام لینا شروع کیا۔ انھوں نے بچوں اور نا فہموں کی تعلیم اور زبان و دین کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے اور پچھلے علوم و معارف کے مٹانے کی بڑی کوشش کی۔" (الثورة الہندیہ صفحہ ۲۵۶ / ۲۵۷)

یہ تھے وہ اسباب جو مسلمانوں کے لیے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی طرف جانے سے مانع ہوئے، مگر انگریز نے نہایت ہوشیاری اور کمال چابکدستی کے ساتھ اپنے آپ کو مسلمانوں کی تعلیمی پستی کے الزام سے بچانے کے لیے غریب علماء کے سر یہ الزام لگا دیا کہ مسلمانوں کو انگریزی کے حصول سے ان کے علماء نے باز رکھا، جس کی وجہ سے مسلمان تعلیمی میدان میں پچاس سال پیچھے رہ گئے۔ اس الزام کا اس شدومد سے پروپیگنڈہ کیا گیا کہ خود مسلمانوں کو اس کا یقین آگیا۔

چنانچہ جب پادریوں کی سرگرمیوں کو ان کی مسلسل ناکامی نے سرد کر دیا اور انجیل کی تعلیم اسکولوں کے نصاب سے خارج کر دی گئی اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ قدرتی طور پر مسلمانوں کے دلوں سے انگریز کی نفرت بھی کم ہوتی گئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان انگریزی تعلیم پر متوجہ ہونے لگے، اور رفتہ رفتہ غصہ و نفرت کی خلیج کم سے کم ہوتی چلی گئی۔

ایک اور غلط فہمی

خواجہ الطاف حسین صاحب حالی نے حیات جاوید میں مدارس عربیہ کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"جوں جوں تہذیب الاخلاق مدرسۃ العلوم (علیگڑھ کالج) کی طرف لوگوں کو بلاتا تھا اور جس قدر وہ انگریزی تعلیم کی ضرورتیں ان کے ذہن نشین کرتا تھا، اسی قدر مدارس اسلامیہ قائم کرنے کا جوش مسلمانوں میں بڑھتا جاتا تھا، چنانچہ اسی کی تحریک سے بے شمار اسلامی مدرسے ہندوستان میں قائم ہو گئے اور برابر ہوتے چلے جاتے ہیں۔"

خواجہ صاحب نے مدارس عربیہ کے قیام کا ذکر تہذیب الاخلاق کے نتائج کے عنوان کے تحت کچھ اس انداز سے کیا ہے جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مدارس عربیہ کے قیام کا باعث تہذیب الاخلاق کی دعوت کا ردعمل تھا، وہ جوں جوں قوم کو انگریزی تعلیم کی طرف بلاتا تھا، لوگوں میں مدارس عربیہ کے قائم کرنے کا جوش بڑھتا جاتا تھا، یہ بات کہاں تک صحیح ہے اس کے لیے مدارس عربیہ کے قیام اور تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے کی تاریخ کا جان لینا کافی ہوگا۔ حیات جاوید میں خود خواجہ صاحب ہی نے لکھا ہے کہ:

"یکم شوال ۱۲۸۷ھ بمطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو اس کا (تہذیب الاخلاق) کا نمبر اوّل شائع ہوا اور پہلی بار شوال ۱۲۸۷ھ سے رمضان ۱۲۹۲ھ تک پورے چھ سال برابر نکلتا رہا۔ (حیات جاوید ص۱۲۳ حصہ اوّل)

دارالعلوم ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء میں قائم ہوا، اسکے متصل ہی مختلف مقامات میں مدارس عربیہ قائم ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز تقریباً پانچ سال پہلے عالم وجود میں آچکی ہو، اس کو بعد کی چیز کے ردعمل سے کس طرح بھی تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔

دارالعلوم دیوبند

کفیل الرحمٰن نشاط ایم اے (علیگ)
فاضل دیوبند

اے مرکز دیں مرکز انوار نبوت
امت کے لیے ترکۂ سردار نبوت

تو بحر ہے، دریا ہے کہ ہے چشمہ جاری
ترا نشۂ فیض ہے، مخلوق پہ طاری

تو مرجع ارباب جنوں، جان شریعت
کہتے ہیں تجھے لوگ گلستان شریعت

پھیلی ہے ہر اک سمت ترے علم کی خوشبو
چمکے ہیں اندھیروں میں ترے فیض کے جگنو

اس دور میں کیوں راہنما تجھ کو نہ کہدیں
کیوں اپنے اکابر کی دعا تجھ کو نہ کہدیں

ذرے بھی تری چشم کرم سے بنے مہتاب
حاصل ہوئی اک دولت دیں، دولت کمیاب

تعریف کے عنوان کی تعبیر کے قابل
الفاظ میسر نہیں تحریر کے قابل

مولانا سید نورالحسن بخاری

دارالعلوم دیوبند میں

طلبا دارالعلوم کا عظیم کردار

دارالعلوم دیوبند کو اللہ رب العزت نے جو عظمت عطا فرمائی ہے لاریب وہ اس کے عالی مقام اساتذۂ کرام کی وجہ سے ہے مگر میں حضرات اساتذہ سے قطع نظر طلبا دارالعلوم کی عظمت کا ذکر کروں گا جس دارالعلوم کے پہلے متعلم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن ہوں، اسکے طلبا عظیم کردار کے مالک کیوں نہ ہوں؟

حصول علم کے دوران طالب علم کا کردار تحصیل علم ہے اور میں تحصیل علم ہی کے سلسلے میں مختصر طور پر طلباء دارالعلوم کا عظیم کردار بیان کروں گا۔

غالبا ۱۹۲۰ء میں مجھے حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ سے شرف بیعت حاصل ہوا اور اس کے دو تین سال بعد حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مدظلہ سے، پھر میری دعوت پر ان دونوں اکابر امت نے میرے دور افتادہ وطن بھکانی از ضلع ڈیرہ غازی خان قدم رنجہ فرمایا۔ ان اکابر کی صحبت کے نتیجے میں مجھے تحصیل علم دین کا شوق دامنگیر ہوا اور میں غالبا ۳۶/۳۷ عیسوی میں ملازمت سے رخصت لے کر حصول علم کے لیے دارالعلوم دیوبند جا پہنچا۔ چونکہ میں سکولوں کے ماحول سے نکل کر گیا تھا جہاں دس بجے رات کے بعد پڑھنا صحت کے لیے مضر سمجھا جاتا ہے۔ لہذا جب دارالعلوم کے اندر میں نے اپنی پہلی شب اٹھ کر ایک جگہ نہیں کئی جگہ دیکھا کہ حضرات طلبہ بارہ ایک بجے رات کو کتابوں کے اوپر جھکے ہوئے ہیں تو مجھے ان کی یہ بات کچھ اچھی نہ لگی۔

مگر یہ کوئی حادثہ یا اچانک واقعہ نہ تھا۔ یہ تو دارالعلوم کا معمول تھا۔ پھر لطف یہ کہ کوئی ذمہ کا کام نہیں کوئی استاد کہنے پوچھنے والا نہیں مگر طلبا کرام ہیں کہ آدھی رات سے پہلے تو گویا سونا جانتے ہی نہیں اور بعض تو آدھی رات کے بعد بھی پڑھتے رہتے ہیں۔ سارا دن پڑھائی، رات کا اکثر حصہ پڑھائی، نہ رات کو پوری نیند، نہ دن کو آرام، پھر خوراک کا یہ حال کہ دو چپاتیاں اور عموما دال، کبھی کبھار، بڑا گوشت، جس میں گھی برائے نام۔ میں سوچتا تھا کہ اس طرح ان کی صحت جواب دے جائے گی مگر اس ماحول میں رہتے رہتے میرا اپنا یہ حال ہوگیا کہ بعد جب دورۂ حدیث میں تھا، تو اسی رنگ میں رنگا گیا ؎

ہر چیز کہ در کان نمک رفت نمک شد

کے مصداق میں بھی اپنے دوسرے رفقاء درس بعض حضرات کی طرح کتابوں کا کیڑا بن گیا اور آدھی آدھی رات تک کتابوں کاپیوں کے مطالعے میں مصروف و منہمک رہتا۔

شیخ العرب والعجم و شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ دین و سیاست میں امام العصر تھے، پورے ہندوستان میں آپ کی مثال و نظیر نہ تھی، جہاں آپ عالم اسلام کے اس مرکزی دارالعلوم کے شیخ الحدیث تھے، وہاں کراچی سے سلہٹ

اور پشاور سے دور اس تک کی دینی اور سیاسی اسٹیج کو بھی آپ شرف مزین فرماتے، عموماً ایسا ہوتا کہ رات کو ۱۱-۱۲ بجے آپ دور دراز کے طویل سفر سے واپس دارالعلوم تشریف لاتے۔ دارالعلوم پہنچتے ہی حضرت دارالحدیث پہنچ جاتے، نہ کوئی الارم نہ گھڑیال، مگر جانے کس طرح پورے دارالاقامہ میں خبر ہو جاتی اور طالب علم ہیں کہ کمروں اور بستروں سے نکل کر بھاگے بھاگے دارالحدیث پہنچ کر سبق میں شریک ہو رہے ہیں، یہ تو ہوا کہ نیند کے غلبے میں آنکھ لگ گئی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، جاؤ آنکھیں دھو کر آؤ، مگر یہ بہت مشکل بلکہ شاید ناممکن تھا کہ کوئی طالب علم بستر میں خواب غفلت کے مزے لے رہا ہو اور بخاری شریف کے سبق سے محروم رہ گیا ہو، خواب و بیداری، غفلت و ہشیاری جس حال میں بھی جو ہوتا تھا، چل کر نہیں تو دوڑ کر دارالحدیث پہنچتا تھا اور آناً فاناً دارالحدیث طلبہ سے بھر جاتا تھا۔

امتحان

اب امتحان کا حال سنیے: امتحان کے دنوں تو یہ نشہ اور بڑھ جاتا ہے۔ سالانہ امتحان کے دنوں میرا یہ حال تھا کہ دو راتیں جب کہ صبح صحیح بخاری اور شمائل ترمذی کا امتحان تھا، میں اپنے رفیقوں کے ساتھ بیٹھا ایک کے بعد دوسری کاپی دیکھتا رہا۔ پل بھر کے لیے بھی بستر پر نہ لیٹا، حتیٰ کہ صبح کی اذان ہو گئی۔

نماز میں نے دارالعلوم کی مسجد میں باجماعت ادا کی۔ میرے حواس تو بفضلہ تعالیٰ بجا رہے، مگر میرے ساتھ والے صاحب کا یہ حال تھا کہ ان پر نماز ہی کے اندر نیند کا اس قدر غلبہ ہو گیا کہ وہ کھڑے کے کھڑے ہی رہے۔ امام کے ساتھ رکوع اور سجدہ بھی نہ کر سکے۔

خوراک

اس شبانہ روز محنت کے ساتھ خوراک کا حال میں ضمناً بیان کر چکا ہوں، بالکل قوت لایموت! پھر یہ بھی سبھی طلبہ کو میسر نہ تھا، مجھے آج بھی وہ منظر اچھی طرح یاد ہے کہ بات کرتا ہوا عشاء سے قبل میں چہل قدمی کے لیے دارالعلوم سے باہر نکل گیا نہر کے کنارے ایک پل پر ایک طالب علم بیٹھے تھے، میں ان کے قریب ہو کر کیا دیکھتا ہوں کہ چنے چبا رہے ہیں۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مدرسے سے کھانا نہیں ملتا، وجہ کیا بیان کی۔ یہ مجھے یاد نہیں... اور گرہ سے کھانا کھانے کی استطاعت نہیں؛ اس لیے چنے کھا رہے ہیں۔

میں دارالعلوم کے اس عظیم فرزند کے اس پرخلوص اور مجاہدانہ کردار سے بہت متاثر ہوا، مجھے اس بہادر بھائی کا نام اب تک یاد نہیں یہ برادر خوشی محمد تھے۔ غالباً ضلع جالندھر کے رہنے والے۔

میں بحر حیرت میں ڈوب کر رہ گیا کہ حصول علم میں رات دن محنت کا وہ حال کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ اور خوراک کا یہ حال کہ دال روٹی بھی میسر نہیں۔

میرا یقین یہ ہے کہ روئے زمین پر کسی دنیوی کالج تو کجا، کسی دینی دارالعلوم میں بھی دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کے عظیم کردار کی مثال تلاش و تجسس کے باوجود نہیں مل سکے گی۔

دارالعلوم دیوبند پائندہ باد
ابنائے دارالعلوم زندہ باد

> اب کام کا بس اب سامان ہونا چاہیے
> سب کا دستور العمل قرآن ہونا چاہیے
> بس یہی دھن اب تجھ کو ہر آن ہونا چاہیے
> حق کا جاری ہر جگہ فرمان ہونا چاہیے
> (خواجہ عزیز الحسن مجذوب)

مولانا محمد عبداللہ سلیم
مفتی دارالعلوم دیوبند

[illegible] مولانا محمد نعیم استاذ دارالعلوم دیوبند [illegible] تعداد تیار کی، ان میں [illegible] دارالعلوم نے [illegible] صاحب [illegible] سلیم [illegible] دارالعلوم کی [illegible]

نوعِ انسانی کے عباداتی، معاشی اور معاشرتی امور میں خدائی احکام و ہدایات کی طرف علمی رہنمائی اور رہبری کرنے کو اسلام میں افتاء اور جس عظیم الرتبت خدمت سے متعلق ہے، اس کو مفتی کہا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے اس کے اداری نظام کو دارالافتاء کا نام دے دیا جاتا ہے۔

افتاء کی اہمیت

افتاء کی عظمت و اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دین جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو حاوی ایک جامع حقیقت کا نام ہے اور اسی وجہ سے زندگی کی ہر متغیر حالت میں وہ ہدایت و رہبری کرنے سے عاری نہیں ہے، خواہ قرآن و حدیث میں مصرح اصول و فروع کے ذریعے ہو، یا اُن سے مستنبط فقہی جزئیات کے ذریعے تو اسی صورت میں افتاء کا دائرہ بھی گوشہ ہائے زندگی کی وسعتوں سے ہم کنار ہی نہیں ہوتا، بلکہ اُن سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں دارالاسلام میں تو قوتِ حاکمہ اور مسلم معاشرہ کے زیرِ اثر بہت سے اسلامی قوانین و ہدایات پر خواہی نخواہی عمل ہو بھی جاتا ہے، لیکن جو ملک ایسا نہ ہو، وہاں بجا آوری احکام ہر فرد کے اپنے اختیار و تمیز ہی پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جگہ ایک مفتی کی مشغولیت اور ذمہ داریوں اور پیچیدگیوں میں کس قدر اضافہ ہو جاتا ہے — پھر مسلکِ حنفی کو چونکہ یہ امتیاز حاصل ہے کہ دیوانی اور فوجداری قوانین کے اصول و کلیات اور فروع و جزئیات غیر معمولی تفصیل کے ساتھ منضبط ہیں، اسلئے ایک حنفی مفتی کو عبادات و معاملات کے مسائل کے ساتھ قوانین محاکمہ و مجادلات پر بھی گہری نظر رکھنی پڑتی ہے۔

منصبِ افتاء کی نزاکت

پھر چونکہ عام حالات میں کسی الجھن کے پیش آجانے پر ہی اصحابِ فتوے کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، ان کا مطالعہ وسیع اور ذہن رسا ہونا نہایت ضروری ہے، اگر سوال کے کنہ کی طرف ذہن کی رسائی اور پھر اس کے جواب باصواب کا مع اپنے دلائل و مآخذ کے استحضار نہ ہو تو صحیح رہبری نہیں ہو سکتی، بلکہ بعض اوقات رہزنی ہوگی۔

آقائے دوجہاں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"من افتى بغير علم كان اثمه على من افتاه"

جس شخص کو بغیر کسی علم کے فتوے دیا گیا ہے۔ تو اس کے گناہ اور عمل کا ذمہ دار وہ شخص ہی ہوگا جس نے فتوے دیا ہے۔

اصل مفتی اللہ اور رسول ہیں

اور چونکہ اس منصب جلیل کی نسبت اس ذات گرامی سید الرسل خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہے، جن کو بطور خلیفہ امر کے منجانب مفتی حقیقی و اصل جل علا کے افتاء کی ذمہ داری سپرد کی گئی تھی اس لیے اگرچہ کسی بھی عالم کے لیے اس خطاب کی نسبت مجازاً ہی سہی لیکن منصب وخطاب کی جلالت قدر کا تقاضا ہے کہ مہارت علمی کے ساتھ کمال اعمال و تقوے بھی حاصل ہو۔ اسی صورت میں استفتاء اور استفسار کرنیوالوں کو بھی وہ اعتماد نصیب ہوتا ہے جو اس فتوے کے مطابق عمل کرنے میں آمادہ کرنے میں کافی موثر ثابت ہو ــــ مفتی اگر اخلاص اور تقوے سے بہرہ مند نہیں ہے، تو از رُوئے حدیث یہ بات دین کے لیے ایک بڑی آفت ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا گیا

"آفة الدين ثلاثة فقيه فاجر وامام جائر ومجتهد جاهل" (الحديث)

دین کے لیے تین باتیں آفت ہیں ایک بدکردار فقیہہ دوسرے ظالم حاکم، اور تیسرے جاہل مجتہد ــــ

(ا) جو مفتی علم و عمل کے اعتبار سے مضبوط ہوگا، وہی اصل دین کا ایسا خادم ہوگا جس کی خدمت سے دین کو قوت بھی حاصل ہو اور مذہب دشمن طاغوتی اور شیطانی عناصر کے لیے اس کا وجود اور مساعی نقصان دہ ثابت ہوں ارشاد پیغمبری ہے:

"فقيه واحد اشد على الشيطان من الف عابد"

ایک فقیہہ شیطان کے لیے سو عبادت گزاروں سے زیادہ سخت ہے۔

دارالعلوم دیوبند

کا تعارف یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جس وقت برطانوی سامراج نے ہندوستان پر پہلے سے کی جانے والی مسلسل ریشہ دوانیوں کے بعد بھرپور حملہ کرکے اپنا تسلط جمایا تو اس نے اپنے اور اپنے تہذیب کے مد مقابل صرف اسلام اور مسلمانوں کو قرار دیا۔ ایک تو اس لیے کہ مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے اقتدار چھین کر اُن کی ایک ہزار سالہ تاریخ حکومت و سلطنت کو یکسر ختم کر دیا تھا۔ دوسرے اس لیے کہ صرف اسلام ہی اس بات کا صلاحیت مندانہ اہل ہے۔ کہ مذاہب کے تقابل کی صورت میں وہ سینہ سپر ہو جائے۔

لہٰذا طاقت کے بل بوتے پر مسیحیت کے پرچار کے ساتھ ہی ساتھ اقتدار کے زیر سایہ منفی اور مثبت طور پر اسلام کے خلاف کوششوں کو اس حد تک فروغ دیا کہ ذرا دیر اور توقف کر لیا جاتا اور بیدار مغزی نہ دکھلائی جاتی۔ تو بر صغیر سے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ چکے ہوتے اور پھر اس کے دُور رس اور ناگزیر جغرافیائی اثرات کے نتیجے میں دیگر اسلامی ممالک بھی متاثر ہوتے۔

یہ حقیقت ہے کہ اُس وقت ہندوستان میں اسلام کا درخت بے برگ و بار نظر آنے لگا تھا، ٹھیک اسی وقت اس فرعون نژاد قوم کے مقابلے میں کچھ ہستیاں جانشین موسیٰ بن کر میدان میں آئیں تحفظ اسلام کا جوا اپنے کاندھوں پر رکھا، تعلیم و تبلیغ کے جھنڈے کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں سنبھالا اور اس کو سر بلند کرنیکا تہیہ کر لیا۔

تاسیس دارالعلوم کا مقصد

چونکہ میدان کارزار کے عملی تجربات نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ایک ہزار سال تک غفلت کا شکار ہونیوالے عامہ مسلمین سامراج کے

---

* قرآن حکیم میں ہے ویستفتونک قل اللہ یفتیکم (اور وہ لوگ آپ سے فتوے طلب کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں فتوے دیتے ہیں (الخ) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فتوے دینے کی نسبت ظاہر کی ہے۔

کے عالمانہ اور مجاہدانہ کارناموں سے اس قصبے اور سان ہمیشہ ہیں کہ اب تک
بے تیغ داستاں سے مقابلہ بس میں نہیں رہا تو ایک اور صرف ایک ہی راستہ
تجویز ہوا کہ ملت میں دینی علوم سے جو بُعد اور دوری پیدا ہو چکی ہے اس کو دُور
کیا جائے۔ علوم علما سے جس قدر بہرہ مندی ہوگی، اسی قدر عقائد اور اعمال
میں پختگی آئے گی اور اسی کے نتیجے میں اسلام کے تحفظ کا حوصلہ بنے ہوگا اور
اس طرح کسی قوم کی سازش ناکام ہوتی چلی جائے گی۔

ان حضرات نے عالمانہ اور عارفانہ بصیرت سے اس حقیقت کو سمجھ
لیا تھا کہ جب تک سینوں میں قرآن حکیم اور اس کے علوم محفوظ ہیں اس وقت تک
اسلام کو کوئی آنچ نہیں پہنچ سکتی۔

اسی حقیقت نے ان حضرات کو ایک ایسا دارالعلوم قائم کرنے کی طرف
متوجہ کیا جو مفت دینی تعلیم کے ذریعے اسلام کی اس طرح خدمت کرے کہ سال
بسال یہاں سے فارغ ہونے والے مستند علماء و فضلاء فروغ علم اور تحفظ اسلام کے جذبہ
سے سرشار ہو کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل کر اسی طرز کے مدارس قائم کریں
اور پھر وہ بھی دارالعلوم ہی کی طرح علماء، خطباء، مجاہدین اور مصنفین کی فوجیں تیار
کر کے میدان میں اتارتے رہیں۔ ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم قائم ہوا، خدا نے مدد
کی اور بالآخر چند ہی سال میں یہ اسلام اور علوم اسلامیہ کی مضبوط چھاؤنی بن گیا

دارالافتاء دارالعلوم

دارالعلوم جس مقصد کے تحت قائم کیا
گیا۔ اسی کی بناء پر از خود اس کے فرائض میں یہ بات داخل ہو جاتی ہے کہ بعنوان
افتاء بھی عوام کی خدمت کرے۔ دارالعلوم نے اس فریضہ کی ادائیگی سے پہلو تہی نہیں
کی اس ذمہ داری کو محسوس کیا۔ ابتدائی سالوں میں اساتذہ دارالعلوم بالخصوص قطب الارشاد
حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ صاحب ضرورت و موقع فتاویٰ تحریر کرتے
رہے۔ لیکن کام کی ذمہ دارانہ نوعیت و اہمیت نے اس بات پر مجبور کیا کہ کسی مناسب
شخصیت کو باقاعدہ مفتی نامزد کر کے دارالافتاء کو مستقل حیثیت میں قائم کیا جائے۔

دارالافتاء کی رفتار ترقی

چنانچہ ۱۳۱۰ھ میں قطب الارشاد حضرت مولانا
رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ نے مجلس میں تجویز پیش کی مجلس کی منظوری کے
بعد اسی جلیل القدر منصب کے لیے جس کو نامزد کیا گیا، اس کے حالات نے ثابت
کر دیا کہ یہ نہ صرف اسی منصب کے لیے موزوں تھے، بلکہ اسی کے لیے پیدا ہوئے تھے

عظیم المرتبت شخصیت فقیہ الوقت عالم متقی، ذہن تربیت عالم
باکرامت بزرگ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی قدس سرہ کی تھی جنھوں
نے ۱۳۱۰ھ سے تا دم آخر یعنی ۱۳۴۶ھ تک صدر مفتی کی حیثیت سے عوام و
خواص کو فیض یاب اور نزدیک کے فرق کے بغیر فیض پہنچایا

افسوس ہے کہ ۱۳۲۹ھ تک نقول فتاویٰ کا کام دارالافتاء میں نہیں کیا
گیا۔ اس طرح ۱۹ سال تک برآمد ہونے والے فتاویٰ کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا
کہ وہ کتنے تھے اور کیسے تھے۔ ۱۳۳۰ھ سے نقول فتاویٰ کا باقاعدہ نظام قائم ہوا۔
اس طرح اگرچہ دارالافتاء بہت پہلے سے قائم تھا۔ لیکن باقاعدہ شکل ۱۳۳۰ھ
میں ہی ملی۔

دارالعلوم جو واحد مرکزی دینی یونیورسٹی بن چکا تھا۔ اس کی مرکزیت کا
لازمی اثر دارالافتاء پر بھی سوالات کے جواب میں تحریر کیے جانے والے فتاویٰ
عددی کثرت کے اعتبار سے بھی اور علمی دینی ہمہ گیری اور ساتھ ہی ان کی مقبولیت
کے لحاظ سے بھی ایک بے مثال تاریخی ریکارڈ بن گئے۔

عددی کثرت کا یہ حال ہے کہ ۱۳۳۰ھ سے ۱۴۰۴ھ کے اختتام
تک چوہتر سال کے عرصے میں دارالافتاء سے موصولہ سوالات کے جو جوابات دیے
ہوئے ان کی مجموعی تعداد چار لاکھ پندرہ ہزار آٹھ سو ستاون (۴۱۵۸۵۷) ہے
بلاشبہ یہ ایک زبردست علمی ذخیرہ ہے اور تاریخ دارالعلوم میں جلی حروف سے لکھا جانے والا
قابل فخر کارنامہ ہے۔

ان فتاویٰ کی علمی اور دینی ہمہ گیری کا اندازہ اس سے کہ دیکھنے سے ہی
بخوبی ہو سکتا ہے۔ فتاویٰ دارالعلوم کی ترتیب کے بعد جو حصے اب تک شائع ہو چکے

ہیں ان کا مطالعہ بتلاتا ہے کہ شاید ہی کوئی عنوان ایسا ہوگا جس سے متعلق فتوے اس ذخیرے میں موجود نہ ہو، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے نئے عنوانات ایسی مجتہدانہ حل کے ذریعے سامنے آئے ہیں اور نہ صرف دینی اور مذہبی بلکہ غیر دینی مسائل پر بھی مستند رہبری کی گئی ہے۔

اس طرح اس عظیم ذخیرے کو بجا طور پر "موسوعۃ دارالعلوم" اور انسائیکلو پیڈیا کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ان فتاویٰ کے اندرون و بیرون ملک معتمد و مقبول ہونے کی کیفیت یہ ہے کہ مشکل اور اختلافی مسائل پر دارالافتاء دارالعلوم ہی کے فتوے کو حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔ گویا مسائل شرعیہ میں فیصلے کے لیے اسی کو سپریم کورٹ کی حیثیت حاصل ہے۔

مکانی مرحلے: دارالافتاء، احاطہ مولسری کے شمال مشرقی حجرہ روبرو برآمدے کے کمرے میں رہا جس میں آج کل دفتر تبلیغ اور دفتر تنظیم ابنائے قدیم ہے، پھر جب کام میں اضافہ اور کام میں پھیلاؤ نے اس جگہ کو تنگ بنا دیا، تو مسجد دارالعلوم کے مشرق میں وسیع صحن مسجد کے اختتام پر دو منزلہ وسیع و عریض عمارت بنائی گئی، نچلی منزل میں مسجد کا خوبصورت اور حسین حوض بنا دیا گیا اور اوپر کے ۲ کمرے ہال کرے دارالافتاء کے لیے خاص کر دیے گئے۔ یہ عمارت ۱۳۷۶ھ میں مکمل ہوئی جس پر پتھر کا یہ کتبہ لگا ہے:

"الحمد للہ کہ ایں تعمیر مقدس موسوم بہ "دارالافتاء" بزمانۂ اہتمام مولوی قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند در ماہ ربیع الثانی ۱۳۷۶ھ حلیۂ تکمیل پوشید۔

مادہ تاریخش از نتائج فکر حاجی محمد قاسم صاحب ناظم تعمیرات دارالعلوم حسب ذیل است۔

فاسئلوا اھل الذکر یہ ہے قول اللہ

سال تاریخ یہ سن ہجری یہ ہے واشہر

کارکردگی دارالافتاء ذیل میں ایک نقشہ پیش کیا جاتا ہے جس سے آغاز دارالافتاء سے اب تک جن حضرات مفتیان کرام نے بحیثیت صدر مفتی یا نائب مفتی کام کیا ہے۔ ان کی مدت کارکردگی اور شعبے کی رفتار ترقی کو بیک نظر دیکھا جا سکتا ہے۔ بعد میں انشاء اللہ حتی الوسع ان حضرات کا مختصر تعارف بھی پیش کیا جائے گا۔

اسمائے گرامی حضرات صدور افتاء	مدت کارکردگی	ہر دور کے فتاویٰ کی تعداد
(۱) قطب الہند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی	از ۱۳۱۰ھ تا ۱۳۴۶ھ (۳۶ سال)	۴۲۵۱۹
(۲) شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہی، حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحب	۱۳۴۷ و ۱۳۴۸ھ (۲ سال)	۴۴۴۸
(۳) حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحب	۱۳۴۹ھ (ایک سال)	۲۴۵۳
(۴) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ (حال مفتی اعظم پاکستان)	۱۳۵۰ھ تا ۱۳۵۴ھ (۵ سال)	۱۸۳۹۵
(۵) حضرت مولانا مفتی محمد سہول صاحب	۱۳۵۵ھ تا ۱۳۵۷ھ (۳ سال)	۱۵۱۸۵
(۶) حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب میرٹھی	۱۳۵۸ھ (ایک سال)	۵۸۴۰
(۷) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ (مدرج الصدر)	۱۳۵۹ھ تا ۱۳۶۱ھ (۳ سال)	۱۸۶۸۷
(۸) حضرت مولانا مفتی محمد فاروق صاحب	۱۳۶۲ھ تا ۱۳۶۳ھ (۲ سال)	۸۴۲۷

(۹) شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب (مدرس الصدر)	۱۳۶۳ھ تا ۱۳۶۶ھ، ۳ سال	۲۲۴۰۰
(۱۰) محدث و فقیہ حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری مدظلہ	۱۳۷۰ھ تا ۱۳۸۱ھ، ۱۰ سال	۱۹۰۴۹۲
(۱۱) حضرت العلامہ مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی، حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمی	۱۳۰۷ھ تا حال (یعنی ۳۳ ویں)	۹۶۰۰۰

حضرات نائبین افتاء

(۱) مولانا قاضی مسعود احمد صاحب دیوبندی	از ۱۳۴۳ھ تا	
(۲) مولانا مفتی سید احمد علی سعید صاحب نگینوی	از ۱۳۵۹ھ تا حال	
(۳) مولانا مفتی محمد جمیل الرحمن صاحب سیوہاروی	از ۱۳۷۴ھ تا	

ان فتاویٰ کے ذیل میں اکثر مقالات اور رسالے بھی لکھے گئے جو فتاویٰ دارالعلوم کا جزء ہیں۔ اور کچھ کو مستقل رسالے کی شکل میں شائع بھی کیا گیا۔ یہ مقالات و مضامین اپنی جگہ کافی تحقیقی اور اہل علم و عوام کے لیے مفید ہیں۔ اس طرح دارالافتاء کے زیر تصنیف کا سلسلہ بھی ہے۔ کچھ مقالات کی نشاندہی ذیل میں کی جاتی ہے۔

القول الطیب: اجابۃ الاذان بین یدی الخطیب

سائل نے ایک حدیث اور بحر الرائق کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ خطبہ جمعہ سے پہلے کی اذان کا جواب سامعین کو دینا چاہیئے؟ جواب میں فقہائے احناف کے اختلاف اور ان کے دلائل کو نقل کر کے اپنے اکابر کی رائے کو مع وجوہ ترجیح کے تحریر فرمایا ہے۔ نہایت مختصر ہونے کے باوجود نہایت مکمل و جامع فتویٰ بصورت مقالہ ہے۔

تنقیح المقالات فی تصحیح الاستقبال

سائل نے سمت قبلہ کے سلسلے میں ہیئت دانوں کے اختلاف کو نقل کر کے کہ قبلہ کس وجہ عرض البلد پر واقع ہے، سوال کیا ہے کہ تعمیر مسجد کے وقت قبلہ کی سمت کا کیسے تعین کیا جائے؟ جواب میں نہایت تفصیل کے ساتھ استقبال قبلہ کی حد اور دور دراز علاقوں میں مرکزی سمت قبلہ معلوم کرنے کے شرعی طریق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

الرحمن الصحیح من تشریح الحکم(؟)

سائنس دانوں کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر نہایت تحقیق سے بحث کی گئی ہے کہ لاؤڈ سپیکر کے ذریعے بلند ہونے والی آواز بعینہٖ متکلم کی آواز ہے یا اس کی بازگشت ہے اور دونوں صورتوں میں اس پر پڑھائی جانے والی نماز کا کیا حکم ہے؟

دارالافتاء اور دیگر فقہی مسالک

یہ دارالافتاء دارالعلوم کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں حل مسائل میں کبھی جمود نہیں رہا، پیش آمدہ ہر مشکل مسئلہ میں علم و تحقیق کی رو سے وسعت نظر و فکر کے ساتھ رہبری کی گئی، ناگزیر مواقع میں پیش آنے پر قواعد اصول فقہیہ کے مطابق دوسرے فقہی مسلک سے بھی استفادہ کئے گئے اور عوام کو ابتلاء و الجھن سے نجات دی، اسی کی ایک یادگار کتاب الحیلۃ الناجزہ بھی ہے، جس میں فقہ مالکی کے مطابق زوجۂ عنین اور زوجۂ مفقود الخبر وغیرہ کے مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے۔

طلباء دارالافتاء

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ہر سال علوم دینیہ سے فارغ ہونیوالے ذی استعداد طلباء کو فتویٰ نویسی کی مشق کرائی جاتی ہے یہ ایک سالہ کورس ہے جس میں رسم المفتی اور سراجی کے سبق بھی پڑھائے جاتے ہیں اور طلباء تفصیلی مطالعے میں مشغولیت کے ساتھ حضرات مفتیان کرام کی زیرنگرانی فتاویٰ بھی لکھتے ہیں اس شعبے میں داخلے کے لیے ان ہی طلباء کا انتخاب کیا جاتا ہے جنھوں نے حدیث اور فقہ کی اعلیٰ کتابوں میں بطور خاص امتیازی نمبر حاصل کرکے اپنی بہترین صلاحیت و مناسبت کی شہادت دی ہے۔

فتاوائے دارالعلوم ترتیب جدید

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کے جو فتاوے بنام عزیزالفتاوے شائع کئے تھے وہ بہت مختصر تھے۔ غالباً ایک یا دو سالوں کے فتاوے کا مجموعہ تھے۔ اس لیے منجانب دارالعلوم حضرت مفتی اعظم کے تمام فتاوے کو جدید ترتیب سے شائع کرنے کا پروگرام جاری ہے محترم مولانا ظفیرالدین صاحب ترتیب فتاوے کا کام انجام دے رہے ہیں — اس وقت تک ۹ جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔

اب ہم ان حضرات مفتیان کرام کا تذکرہ ذیل میں پیش کر رہے ہیں جنھوں نے بحیثیت صدر مفتی دارالعلوم دیوبند میں کام کیا ہے۔

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مفتی اعظم مولانا عزیزالرحمٰن صاحب کا تعلق عثمانی شیوخ کے خاندان سے ہے۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے بڑے صاحبزادے ہیں جو حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے قریبی احباب میں سے اور دارالعلوم کے بانیین میں سے ہیں، مفتی صاحب کے دوسرے بھائی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم سادس دارالعلوم اور علاتی بھائی حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب تھے

حضرت مفتی صاحب ۱۲۷۵ھ میں پیدا ہوئے، تاریخی نام ظفرالدین تھا، ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند ہی میں تمام علوم و فنون سے فارغ ہوکر اور سلسلہ تعلیم و تدریس میرٹھ تشریف لے گئے۔ وہاں کافی حضرات آپ کے ظاہری و باطنی فیوض سے مستفید ہوتے رہے۔ ۱۳۰۹ھ میں دارالعلوم کی طلب پر آپ دیوبند تشریف لائے اور نیابت اہتمام کا منصب آپ کے سپرد کردیا گیا۔

پھر ۱۳۱۰ھ میں جب حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے آپ ہی کو منتخب فرمایا اور پھر اس وقت سے ۱۳۴۶ھ تک برابر بحیثیت صدر مفتی دارالعلوم بلکہ مفتی اعظم ہندوستان فتاوے صادر فرماتے رہے۔

افسوس کہ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ تک دارالافتاء میں فتاوے کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا گیا، نقول فتاوے کا سلسلہ ذیقعدہ سنہ مذکور سے شروع ہوا۔ اس وقت سے اب تک کا ریکارڈ دارالافتاء میں محفوظ ہے۔ مفتی اعظم کا پندرہ سالہ فتاویٰ کا ریکارڈ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی دوران آپ کے تحریر فرمودہ فتاویٰ کی مجموعی تعداد ۳۷۵۱۹ ہے جو ۲۰۷۶۱ خطوط کی صورت میں روانہ کئے گئے حضرت مفتی اعظم کو فن افتاء میں اس قدر مہارت ہوگئی تھی کہ مشکل ترین معاملات پر بھی برجستہ فتوے تحریر فرما دیتے تھے۔ آپ کی حیات ہی میں ملک کے طول و عرض میں آپ کے فتاوے کو درجہ استناد حاصل ہوگیا تھا، فتوے میں آپ کا طرز تحریر نہایت جامع ہے۔ اور یہی اس دور کے اکابر کا دستور بھی تھا۔ اکابر کی نصیحت اس پر شاہد ہیں نہایت مختصر اور بچے تلے لفظوں میں مسئلے کے ہر پہلو پر روشنی پڑجائے اور دو فتاویٰ میں یہ حضرت مفتی اعظم کی اہم خصوصیت ہے، ہر فتوے میں دلیل و حوالہ کہنے کا بھی معمول نہیں تھا۔

مثلاً سائل نے دریافت کیا کہ کنواں ناپاک ہونے کے وقت پے درپے ڈول نکالنا ضروری ہے، یا بتدریج بھی نکال سکتے ہیں، آپ نے جواب تحریر فرمایا

الجواب: پے درپے نکالنا شرط نہیں۔ فقط۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو علوم ظاہری پر جس طرح درک تھا، اسی طرح

روحانیت و تصوف اور اخلاقِ باطنی میں بھی بلند مقام حاصل تھا حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ مہتمم الثانی[1] دارالعلوم سے بیعت و خلافت حاصل تھی، کمالات و تصرفات کے بہت سے واقعات آپ کی طرف منسوب ہیں، جن کے دیکھنے اور جاننے والے آج بھی دیوبند میں موجود ہیں۔ مزاج میں بے حد سادگی تھی۔ اہلِ محلہ کا سودا سلف خود ہی بازار سے لاتے تھے۔ ۱۰ جمادی الثانی ۱۳۴۰ھ کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور قبرستان قاسمی میں دفن ہوئے۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم و جناب قاری جلیل الرحمٰن صاحب استاذِ تجوید دارالعلوم آپ کے صاحبزادگان ہیں

شیخ الادب حضرت مولانا مفتی اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

اصل وطن امروہہ ضلع مراد آباد۔ پیدائش ۱۳۰۰ھ بمقام بدایوں۔ والد منشی محمد معراج علی صاحب سرکاری ملازمت پیشہ تھے، ان کو بچوں کی تعلیم کی طرف بوجہ کثرتِ کار توجہ نہ ہو پاتی، والدہ کو بے حد شوق تھا کہ بچے حافظِ قرآن اور عالم بنیں، شیخ الادب صاحبؒ نے بچپن میں ہی بمقام شاہجہانپور حافظ شرف الدین صاحب کے پاس حفظِ قرآن مکمل کر لیا۔ جید حافظ ہو گئے، پھر استاذ کے کہنے پر کہ اس وقت تک کیا فائدہ، جب تک کہ الفاظ کے معنی معلوم نہ ہوں عربی پڑھنے کا شوق دامن گیر ہوا، اپنے والد صاحب سے فارسی اور مولانا مقصود علی خاں صاحب سے تلہر بستی میں عربی کتابیں پڑھنی شروع کیں، والد صاحب کا تلہر ہی میں تبادلہ ہو گیا تھا۔ پھر پنشن ہونے پر شاہجہانپور جاکر مقیم ہو گئے تھے۔ شیخ الادب صاحبؒ دس گیارہ سال کی عمر میں ہزاروں اشعار کے حافظ اور خود اچھے خاصے شاعر ہو گئے تھے۔ شاہجہانپور میں مدرسہ عین العلوم کے اندر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور مولانا بشیر احمد صاحب مرادآبادی سے عربی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ پھر عربی کی تکمیل کے لیے دیوبند آنا چاہا، والدہ نے کم عمری کی وجہ سے سختی سے منع کر دیا، لیکن لگن اور شوق نے مجبور کیا اور خاموشی سے دیوبند پہنچ گئے۔ دو ماہ کے بعد والدہ کا انتقال ہو گیا، کچھ دنوں کے بعد میرٹھ جانا ہوا اور وہاں مولانا عاشق الٰہی صاحب کے اصرار پر مقیم ہو گئے۔ اور عربی کی تکمیل کی۔ پھر اپنے دیرینہ شوق کے مطابق دیوبند آگئے اور حضرت شیخ الہندؒ اور دوسرے اساتذہ سے معقولات و ادب و فقہ استفادہ کیا۔ بعد فراغت مدرسہ نعمانیہ پورینی ضلع بھاگلپور اور پھر افضل المدارس شاہجہانپور میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں بلایا گیا اور ابتدائی عربی کتابیں تدریس کے لیے سپرد کر دی گئیں۔ ۹ سال تک بڑی محنت اور جانفشانی سے درس دیتے رہے۔ پھر ۱۳۴۲ھ اور پھر ۱۳۶۳ھ میں صدر مفتی کا عہدہ سپرد کر دیا گیا۔ اوقاتِ مدرسہ تدریس و افتا کے علاوہ ہمیشہ مولانا کے خارجی اوقات بھی تصنیف و تربیت میں گھرے رہتے تھے۔ ہر محنتی طالب علم سے اولاد جیسا برتاؤ ہوتا تھا۔ وقت کے نہایت پابند تھے کئی کتابیں پڑھاتے بھی تحریر فرمائے۔ نہایت سادہ مزاج، نہایت متقی اور منکسر تھے۔ آخر کئی سال ناظم تعلیمات رہے اور حدیث کے اعلیٰ اساتذہ میں شامل ہو گئے تھے۔ سنہ ۱۳۷۴ھ میں انتقال فرمایا اور قبرستان قاسمی میں مدفون ہوئے۔ دو صاحبزادے جناب قاری محمد میاں صاحب اور مولانا حامد میاں صاحب مدرسین دارالعلوم ہیں۔ طرزِ تحریر نہایت سادہ اور محققانہ تھا۔

مفتی محمد شفیع صاحب

پیدائش ۱۳۱۴ھ دیوبند کے عثمانی خاندان سے تعلق ہے، والد بزرگوار حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب دارالعلوم کے فارسی کے مشہور استاذ تھے مفتی صاحب کے دادا میاں جی امام علی صاحب دیوبند میں فارسی پڑھاتے تھے اور کافی لوگ ان سے شرفِ تلمذ حاصل کیے ہوئے تھے۔ مفتی صاحب کی تحریر کے مطابق ان کا خاندان پہلے موضع جوڑا متصل قصبہ بگلور ضلع سہارنپور میں آباد تھا، مفتی صاحب کے پردادا میاں جی کریم صاحب دیوبند منتقل ہو گئے اور پھر یہیں گھرانہ آباد ہو گیا

مفتی صاحب ۱۳۳۵ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔

[1] مہتمم اول حضرت حاجی عابد حسین صاحب دیوبندی تھے اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ مہتمم دوم تھے از مصحح

اور عربی کی ابتدائی کتب کا درس آپ کے سپرد کر دیا گیا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم اور حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب محدث دارالعلوم نیز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہم سے بطور خاص ربط و تعلق تھا۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مفتی صاحب نے مشکوٰۃ شریف و جلالین پڑھی تھی اور حضرت توجہ خاص فرمایا کرتے تھے، اس لیے وقتاً فوقتاً کچھ فتاویٰ بھی لکھنے کے لیے مفتی صاحب کو دیتے تھے۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصے باقی نہ رہا اور مفتی صاحب بدستور مدرسی ہی میں مشغول رہے، تا آنکہ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد جب ان کی جگہ متفرق حضرات سے کام لیا جاتا رہا، مگر ضرورت باقاعدہ اور مستقل کسی مفتی کے تقرر کی باقی رہی، تو ۱۳۴۹ھ میں مفتی صاحب کو باقاعدہ دارالافتاء میں منتقل کر کے مفتی کا عہدہ سپرد کر دیا گیا

حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ کو آپ کے فتاویٰ کی نگرانی سپرد ہوئی۔ حضرت میاں صاحب کے علاوہ اہم اور مشکل فتاویٰ حضرت حکیم الامت کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کیے جاتے رہے۔ دارالافتاء میں آپ کے دو دور ہوئے ہیں، ۱۳۵۰ھ تا ۱۳۵۴ھ اور پھر ۵۹ھ تا ۶۱ھ۔ مفتی صاحب نے علاوہ فتاویٰ نویسی کے ایک اہم اور یادگار خدمت یہ انجام دی کہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے فتاویٰ کو مرتب صورت میں شائع کیا اور حضرت تھانوی کے مشورے کے مطابق اسی کے ساتھ اپنے تحریر کردہ فتاویٰ بھی امداد المفتین کے نام سے شریک اشاعت فرمائے۔ آٹھ جلدوں میں یہ مجموعہ دیوبند سے بارہا شائع ہوا۔

مولانا مفتی محمد سہول صاحب بھاگلپوری

پورینی ضلع بھاگلپور آپ کا وطن ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور پھر شہر بھاگلپور میں حضرت مولانا شاہ باز کی خانقاہ واقع ملاچک میں مولانا شاہ اشرف عالم سے پڑھتے رہے، پھر کانپور گئے اور مدرسہ جامع العلوم میں حضرت تھانوی قدس سرہ اور مولانا محمد اسحٰق صاحب بردوانی سے اور مدرسہ فیض عام میں رہ کر مولانا محمد فاروق صاحب چڑیا کوٹی، مولانا احمد حسن کانپوری اور مولانا نور محمد پنجابی سے تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مولانا لطف اللہ صاحب علیگڑھی، مفتی حیدرآباد کے درس میں شریک ہونے کے لیے پیدل سفر کر کے حیدرآباد تشریف لے گئے، وہاں ۲½ سالہ قیام کے دوران مولانا عبدالوہاب بہاری سے منطق فلسفہ ہیئت ادب اور اصول فقہ کا درس لیا۔ حیدرآباد سے دہلی آئے اور مولانا سید نذیر حسین مونگیری کے درس میں شریک ہوئے۔ پھر دارالعلوم دیوبند پہنچے اور حضرت شیخ الہند کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد سات آٹھ سال تک یہیں درس دیتے رہے اسی دوران ۱۳۲۵ھ سے ۵۵ھ تک ۲ سال دارالافتاء میں صدر مفتی کی حیثیت سے بھی کام کیا اور ۵۱۸۵ فتاویٰ تحریر کیے

اس کے بعد مدرسہ عزیزیہ بہار شریف، مدرسہ عالیہ کلکتہ، مدرسہ عالیہ ڈھاکہ کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث اور سولہ سال تک مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل بھی رہے۔

۱۳ رجب ۱۳۶۷ھ مطابق ۲۲ مئی ۱۹۴۸ء کو وفات پائی اور اپنے وطن میں ہی مدفون ہوئے۔ حواشی مکاتیب گیلانی صفحہ ۱۶۔

مولانا مفتی ریاض الدین صاحب

آپ ضلع بجنور کے رہنے والے تھے اور غالباً حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، نہایت نیک طبع سادہ دل اور ذی استعداد بزرگ تھے، عرصے تک دارالعلوم کے مفتی اور اس کے بعد مدرس اعلیٰ رہے اور معقولات و منقولات کی بڑی کتابیں آپ نے پڑھائیں۔ ۱۳۵۶ھ کے لگ بھگ آپ کا انتقال ہوا۔ دارالعلوم کے دارالافتاء میں بھی آپ کی خدمات نہایت درجہ ممتاز اور اہم تھیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد فاروق صاحب

آپ حضرت مولانا محمد صدیق صاحب ...... کے فرزند تھے اور حضرت مولانا محمد صدیق صاحب دارالعلوم

پر مشاہرہ دس روپیہ ماہانہ تقرر ہو گیا۔ والد صاحب کے خط لکھنے پر کہ اتنا قلیل مشاہرہ اہل خانہ کے لیے ناکافی ہے، اس لیے کسی اور جگہ مناسب تنخواہ پر ان کو بھیج دیا جائے۔ مولانا عبد اللطیف صاحب ناظم مدرسہ (مظاہر العلوم) نے جواب تحریر فرمایا تھا کہ ان کی اہلیت و صلاحیت کی وجہ سے ہی انکو یہاں رکھ کر ذمہ داریاں سپرد کی گئی تھیں جو ان کے لیے آئندہ چل کر نہایت مفید ہوں گی، لیکن اگر آپ کو اس سے اتفاق نہ ہو تو ان کو کسی دوسری جگہ بھی بھیجا جا سکتا ہے۔

۱۳۷۱ھ میں مدرسہ جامع العلوم کانپور میں تشریف لے گئے۔ کانپور میں قیام کے دوران عام افادہ علمی ہوا، بحیثیت مفتی کافی شہرت ہوئی۔ رسالہ نظام اور دیگر رسائل میں مفید علمی تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس طرح کانپور کے اہل علم میں مرکزی شخصیت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

۱۳۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں مفتی کے جلیل القدر منصب پر تقرر ہوا۔ نہایت سادہ مزاج، متواضع، پرہیزگار، کثیر المطالعہ اور ذاکر و شاغل ہیں۔ توکلاً علی اللہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ بخاری شریف جلد ثانی کا درس بھی متعلق رہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلوی مدظلہ سے بیعت و خلافت حاصل ہے، اسی وجہ سے ہر جمعہ سہارنپور میں گزارنے کا معمول ہے۔ طلباء کو ذکر و شغل کی تلقین بھی فرماتے رہتے ہیں۔ فتاویٰ میں طرز تحریر اختصار پسندانہ ہے، کم سے کم اور باریک حرفوں میں ہر جواب ہوتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب

سن پیدائش: صبح صادق چہار شنبہ ذی قعدہ ۱۳۲۸ھ تاریخی نام حفیظ الرحمن، جائے پیدائش، موضع اوندرا، ضلع اعظم گڑھ۔ والد صاحب کا نام، مولانا محمد رفیع صاحب، خاندانی سلسلہ شیخ الہند استاذ قدیم حضرت عالمگیرؒ سے جا ملتا ہے، جو اس علاقے میں آکر آباد ہوئے تھے۔

ابتدائی تعلیم دیہاتی مکتب میں اور فارسی و ابتدائی عربی مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں، درمیانی تعلیم مدرسہ عزیزیہ بہار شریف اور مدرسہ فتحپوری دہلی میں اور پھر تکمیل دارالعلوم دیوبند میں ہوئی، دارالعلوم سے ۱۳۵۰ھ میں فراغت کے بعد مدرسہ جامع العلوم حسین پور ضلع اعظم گڑھ میں جا کر تدریسی خدمات انجام دیں ۵ سال کے بعد مدرسہ دارالعلوم مئوناتھ بھنجن میں استاذ عربی اور مفتی کے عہدے پر فائز ہوئے، ۱۳۸۵ھ میں دارالعلوم دیوبند کی طلب پر دارالعلوم تشریف لائے اور دارالافتاء میں مفتی کی حیثیت سے کام شروع کیا

حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ ارشد حضرت تھانوی قدس سرہ) سے ۱۳۴۴ھ میں جب وہ مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں دوبارہ مدرس بن کر تشریف لائے تو ان سے ربط و تعلق قائم ہوا، تا آنکہ حضرت ہی سے بیعت ہوئے اور ان ہی کی خدمت سے وابستہ ہو گئے حضرتؒ سے آپ کو اجازت و خلافت حاصل ہے۔

تحریر فتاوے میں اختصار کے بجائے تفصیل و تشریح پسند ہے۔

حیرت انگیز اعداد و شمار

دارالعلوم کا قیام ۱۲۸۲ھ میں ہوا اور اسی وقت سے افتاء کا کام شروع ہو گیا۔ لیکن ۱۳۲۹ھ تک (۴۷ سال) نقول فتاویٰ کا اہتمام نہ کیا گیا۔ ۱۳۳۰ھ سے ۱۳۹۴ھ تک ۶۴ سال میں جو فتاویٰ جاری کیے گئے۔ ان کی تعداد پڑھئے اور سر دھنیے کہ ایک یہی خدمت کس قدر ہے۔ ۶۴ سال کے فتاوی

۴ لاکھ پندرہ ہزار آٹھ سو ستاون

۴۱۵۸۵۷

دارالعلوم دیوبند

اور

حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہ العالی

افتاء کی اہمیت و عظمت

اسلام ایک ہمہ گیر وسیع اور دائمی نظام حیات ہے، جو انسان کو انسانیت بخشتا ہے۔ انسانی مجد و شرف سے ہم آغوش کرتا ہے رب العلمین نے اس عظیم الشان نظام حیات کے لیے قرآن مقدس کو نازل کیا، رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو برگزیدہ رسول اور معلم کائنات بنا کر مبعوث فرمایا، اس نظام نے اپنی امتیازی شان ہمہ گیری اور دوامی حیثیت کے بقاء کی خاطر اپنے اندر ایسی لچک اور گنجائش رکھی ہے کہ ہر دور میں اور ہر جگہ انسانی ضرورٰیات کا ساتھ دے سکے! انسان ترقی کرتا گیا اور نئے نئے مسائل پیدا ہونے گئے۔

یہ حقیقت ہے کہ مسائل و احکام کا اصل ماخذ کتاب و سنت ہی ہے۔ ان میں ایک خاص انداز سے سب بیان کیا گیا ہے، لیکن عموماً ہر زمانے میں ہر شخص کو یکساں حالات سے واسطہ نہیں پڑتا اور پھر ہر ایک کے بس کی بات نہیں کہ ہر حالت کے لیے قرآن و سنت سے صحیح جواب حاصل کر سکے، اسی کے پیش نظر ضرورت تھی کہ قرآن و حدیث پر نظر عمیق رکھنے والی ایک معتمد جماعت ضروری مسائل کو مستنبط کرتی رہے، ان ہی مستنبط احکام و مسائل کا نام فقہ و فتاوے ہے۔

مفتیان کرام کی جماعت جن کو فقہ سے مناسبت تام ہوتی ہے، ہر زمانے میں پائی گئی ہے اور عوام و خواص ہر ایک ان کی جانب رجوع کرتے رہے۔

دین کی خدمت

دین کی خدمت کے لیے امت کے دو طبقے مخصوص طور پر سامنے آئے اور دین کی خدمت میں پیش پیش رہے، ایک طبقہ محدثین کا، جنھوں نے حفاظت و صیانت حدیث نبوی کا شغل اپنایا، انھوں نے احادیث نبوی کی روایات اور ان کے بیان و ضبط کا اہتمام کیا،

دوسرا طبقہ فقہاء کا، جنھوں نے قرآن و حدیث سے مسائل و احکام مستنبط کئے، ان کی نظر الفاظ حدیث سے زیادہ معانی اور اصول و قواعد پر مرکوز رہی۔

مفتیوں کا تعلق دوسری جماعت سے ہے، پھر اسی امت

کے سب سے پہلے مفتی خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جب کہ
صحابہ کرام اور دوسرے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے اور
اپنے پیش آمدہ مسائل کے سلسلے میں حکم دریافت کرتے اور آپ
جواب ارشاد فرماتے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اس عظیم الشان منصب پر
جلیل القدر، صاحب بصیرت، صحابہ کرامؓ فائز ہوئے جنھیں کتاب و
سنت کا فہم خصوصی حاصل تھا۔ صحابہ کرامؓ کے بعد تبع تابعین، پھر بعد
کے فقہاء و علماء نے اس سلسلے کو قائم رکھا اور یہی سلسلہ ہے، جو ہمارے
اس دور تک پہنچا ہے، دارالعلوم دیوبند کا دارالافتاء بھی اسی سلسلے
کی ایک کڑی ہے۔

پس منظر

جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہو گئی، نظام
حکومت کے ہر شعبے پر انگریزوں کا تسلط ہوا، اس وقت انگریزوں
کی حکومت میں اسلامی نظام ختم سا ہو گیا۔ دینی مدارس، علمی مراکز خاص
طور پر نشانہ بنے، اسلامی تہذیب و تمدن، اسلامی طور و طریق کے
آثار مٹائے جانے لگے، مغربی تہذیب رائج ہونے لگی؛ چونکہ عنان
حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں تھی، اس لیے وہ اپنے عقائد و نظریات
افکار و خیالات کی بآسانی اشاعت کرنے لگے، دین پر ظاہری و باطنی ہر
صورت سے یورش ہونے لگی، اس وقت خدا کے چند برگزیدہ بندوں
نے اسلامی نظام کو کسی نہ کسی صورت میں باقی رکھا، ایسے ہی نازک وقت
میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی۔

مقصد یہ تھا کہ دین کی حفاظت ہو، اسلامی نظام کو باقی رکھا
جائے، مسلمانوں کو فکری، دینی اور مذہبی فتنوں، گمراہیوں کی مسموم
ہواؤں سے بچایا جائے، علم و فن، دین و شریعت، تبلیغ و ہدایت
اور تصنیف و تالیف کا ایک عظیم مستحکم قلعہ ہو، تعلیم و تربیت کے ذریعے
سے ان کے دل و دماغ کی تعمیر کرکے ان کے بقاء کا سامان کیا
جائے، چنانچہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم و تربیت کے لیے مختلف شعبے
قائم ہوئے جن میں سب سے اہم شعبہ دارالافتاء کا ہے۔

دارالافتاء کا قیام

مدرسہ قائم ہونے کے بعد افتاء کی یہ صورت رہی کہ جب
کسی کو مسئلہ میں استفسار کرنا ہوتا وہ اساتذہ اور علماء ادارہ سے
معلوم کرلیتا، اس وقت کوئی منظم نوعیت نہیں تھی، بس انفرادی طور پر
مستفتیوں کو جواب مل جاتا، عملی انضباط کی کوئی صورت نہیں تھی، پھر استفتاء
زیادہ آنے شروع ہوئے اور دارالعلوم کو دارالافتاء کی منظم شکل میں
قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

چنانچہ ۱۳۰۴ھ میں جب کہ دارالعلوم کو قائم ہوئے ۲۲ سال
گزر چکے تھے منظم طور پر دارالافتاء کی داغ بیل ڈالی گئی، لیکن اس وقت
بھی اس کے لیے افراد متعین نہیں کیے گئے اور ذمہ داری کسی مخصوص
فرد کو نہیں دی گئی، اب بھی اس کی ارادی اور عملی انضباط کی کوئی صورت
نہ تھی، ۱۳۱۰ھ میں باضابطہ طور پر دارالافتاء کو مستقل شعبہ بنانے کا
منصوبہ سامنے آیا۔

منصب افتاء کیلئے نامزدگی

اب ضرورت پڑی ایسی شخصیت کی جو اس عظیم منصب کی اہل
ہو، چونکہ منصب افتاء علمی شعبوں میں سب سے زیادہ اہم، مشکل اور دقیق
سمجھا گیا ہے، فقہ کی بے شمار جزئیات اور ان سے متعلقہ احکام میں ذرا
سی تبدیلی سے بھی حکم کا تفاوت محسوس کرنا عمیق علم کو چاہتا ہے، جو فقہ
سے کامل مناسبت ذہن و ذکاء میں خاص صلاحیت اور مادہ تفقہ کے

بیرونشوار ہے ماضی کے لیے اعلیٰ زمانے سے واقفیت دینداری،
دور اندیشی، بیدار مغزی، یقین و اعتماد کا ہونا بہت ضروری ہے
اس لیے دارالعلوم جیسے علمی مرکز جسے بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے کے
دارالافتاء کے لیے ایسی شخصیت کی تلاش تھی جو علم و تفقہ کی امتیازی
استعداد کے ساتھ صلاح و تقویٰ اور برگزیدگی کی شان کی حامل ہو
چنانچہ ایک ایسی شخصیت کا انتخاب عمل میں آیا جو گویا ازل سے
اسی عہدے کے لیے پیدا کی گئی تھی وہ ذات گرامی تھی مفتی اعظم عارف
باللہ حضرت مولانا الشیخ عزیز الرحمن عثمانی دیوبندی قدس سرہ کی۔

۱۳۱۰ھ سے ۱۳۴۶ھ تک مسند افتاء پر فائز رہے، گویا
۳۶ سال تک افتاء کی خدمت انجام دیتے رہے، لیکن افسوس تو یہ کہ ۱۸
سال تک افتاء کی نقل نویسی نہ ہو سکی، اس وجہ سے اس وقت کی نقل
موجود نہیں،

۲۹ھ سے طلباء نے نقل شروع کیا، ۱۳۳۲ھ میں مولانا مفتی
مسعود احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تقرر آپ کے رفیق سفر کی حیثیت
سے ہوا، اسی وقت سے رجسٹر میں مستفتی کے سوالات اور ان کے
جوابات کی نقل موجود ہے، جن کی مجموعی تعداد ۳۸ ہزار کے قریب ہے
یہ تعداد درج رجسٹر کی ہے، علاوہ بریں کچھ ایسے حضرات بھی ہوں گے
جن کے فتاویٰ عجلت کی وجہ سے رجسٹر میں درج نہ ہوئے ہوں۔
نیز ایک مستفتی کئی کئی سوالات ایک کاغذ میں لکھتے ہیں، اگر اوسطاً تین
سوالات مان لیے جائیں تو فتاویٰ کی مجموعی تعداد تقریباً سوا لاکھ ہوتی
ہے اور یہ تعداد بھی ان فتاویٰ کی ہے جو رجسٹر میں درج ہوئے
اس سے پہلے کی جب کہ نقل افتاء کا انتظام نہیں تھا، اتنی ہی تعداد
فرض کر لی جائے، تو اس طرح مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ کی
تعداد کم و بیش ڈھائی لاکھ ہوتی ہے۔

ان کے بعد ایک بار پھر ضرورت محسوس ہوئی ایسی ہی جامع
ہستی کی جو کبھی دقت اس عہدے کو سرانجام دے سکیں، چنانچہ ۴۶ھ
میں منصب افتاء کے لیے شیخ الادب والفقہ مجمع علوم و فنون حضرت
مولانا اعزاز علی امروہوی رحمۃ اللہ علیہ افتاء کی خدمت پر مامور ہوئے۔
[illegible]ھ تک رہے

پھر ایک دفعہ ضرورت پڑی، اس مسند کی زینت کے لیے کسی
کامل ہستی کی، جو ان اہم ترین ذمہ داریوں کو انجام دے سکے، چنانچہ حضرت
مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوری کا انتخاب عمل میں آیا، دن رات
کد و کاوش اور غیر معمولی جانفشانی کے ساتھ لگے رہے ۱۳۸۶ھ تک
دارالافتاء میں مفتی اعظم کے بطور منصب افتاء کی ذمہ داری نبھاتے
رہے، حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی علیہ الرحمۃ کے بعد ان کی دوسری
شخصیت تھی جنھوں نے طویل عرصے تک دارالافتاء کے ساتھ وابستہ
رہ کر شعبے کی نگرانی اور عظیم خدمت انجام دی۔

ضعف لاحق ہونے کی بنا پر عہدے سے سبکدوش ہو کر
وطن کوچ کر گئے، آج کل وہ اپنے وطن ہی میں ہیں۔ ادام اللہ بقاءہ
مع الصحۃ والعافیۃ۔

ان کا زمانہ بھی دارالافتاء کی ترقی کا زمانہ تھا، جب دنیا کے
ہر ہر گوشے سے بکثرت استفتاء آتے رہے اور تندہی کے ساتھ
ان کے جوابات لکھتے گئے، ان کے معاون کی حیثیت سے حضرت مولانا
مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی کو مفتی اعظم کی حیثیت سے منتخب کیا گیا، جو
اس سے پہلے کانپور میں افتاء کا کام کرتے رہے تھے، لوگوں میں
ان کے حسن عمل، علم و تفقہ کی وجہ سے کافی مقبولیت تھی، ان کی ہی شخصیت
تھی جن کو عظیم منصب کا اہل مناسب خیال کیا گیا، تا حال اس عہدے پر
فائز ہیں، حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمی مدظلہم العالی اور مفتی
علی احمد سعید صاحب مدظلہم رفیق کار کی حیثیت سے افتاء اور طلبہ کی
تمرین فتویٰ نویسی میں مشغول ہیں۔

ترتیب فتاوی دارالعلوم

فتاویٰ کا یہ بے نظیر مجموعہ اور مسائل فقہیہ کا یہ بے مثال ذخیرہ عام نظروں سے اوجھل تھا ان فتاویٰ سے صرف مستفتیوں نے فائدہ اٹھایا، دوسرے طالبوں کی ان تک رسائی کی کوئی صورت نہ تھی ضرورت تھی کہ انھیں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ اس کا نفع عام ہو جائے چنانچہ قبلہ حضرت الحاج مولانا قاری طیب صاحب مدظلہ العالی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اس کی تجویز رکھی، جس کو اراکین شوریٰ نے منظور کر لیا۔ پھر ترتیب کا کام شروع ہو گیا۔ آخر میں ترتیب فتاویٰ کے لیے جناب مولانا ظفیر الدین صاحب مفتاحی (بہاری) کو مامور کیا گیا، انھوں نے غیر معمولی جانفشانی اور تندہی سے ترتیب فتاویٰ کا کام حسن و خوبی سے انجام دینا شروع کیا، سب سے پہلے حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے فتاویٰ کی ترتیب دیجانے لگی جس کی ۹ جلدیں شائع ہو چکی ہیں جو صرف طہارت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، نکاح، طلاق پر مشتمل ہیں، تکمیل جانے کتنی جلدوں میں ہو!

تمرین فتویٰ نویسی

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند جہاں ایک طرف امت اسلامیہ کو فتاویٰ ارسال کرنے کی خدمت انجام دے رہا ہے، وہیں دوسری طرف ایسے افراد کو بھی تیار کرتا ہے، جو ملک کے دیگر اطراف میں افتاء کا کام کریں، اس واسطے ہر سال دارالعلوم سے فارغ ممتاز ذی فہم اور محنتی دس طلباء کا انتخاب کر کے افتاء کی تربیت دی جاتی ہے، چنانچہ وہ طلباء مشق فتاویٰ نویسی کے ساتھ کتب فقہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنے وطن جا کر فتاویٰ نویسی کی خدمت انجام دیتے ہیں۔

اصحاب حق و اقتصاد

کا

طریقہ یہ ہے کہ تمام ائمہ سلف کو حق اور راستی پر یقین کرتے ہیں — اور تمام —

ائمہ مجتہدین اہل سنت کو اپنے اپنے مجتہدات میں برسر حق و بصیرت سمجھتے ہیں

— — — اور سب کی — —

محبت و تعظیم اور عدم حسن ظن کو اہل سنت کیلئے ایک علامت بتلاتے ہیں

— — سب کا

علم و عمل کتاب و سنت پر تھا — — کوئی نہیں

— — جس نے

بلا کسی دلیل و بصیرت کے اجتہاد کیا ہو، البتہ عصمت صرف انبیاء کے لیے ہے۔ (انتہیٰ)

(ابوالکلام آزاد)

مدح طیب

یادگار حضرت قاسم نانوتوی عالی تبار

حضرت قاری محمد طیب صاحب وقار

حکمت احکام اسلامی کے ماہر بے بدل

علم کو بھی جن کی نسبت پر ہے فضل افتخار

◉

فضل الفضل / فاضل دیوبند

مکتبِ تدریسِ مسلم ، حق نوا دارالعلوم — جوہرِ حسنِ تکلم حق رسا دارالعلوم
جوہرِ تدریس موہن بہرِ تنظیم رزمِ حق — جلوۂ نظمِ شریعت حق نما دارالعلوم
نغمۂ آدابِ محفل ، بزم نورس حق نما — مرکزِ آداب روشن دل رسا دارالعلوم
ذوقِ احساسِ الفت از اخوت چشم دید — کلّ مومنٍ اخوۃ نظم بجا دارالعلوم
مرکزِ تدریس روشن ، نظمِ بزم شیخ پا — جوہرِ تدریس اشرفؒ عزم وا دارالعلوم
مرکزِ درسِ حقائق شان شیخ الہندؒ پیش — بہرِ تنظیم حق روا ، گرم نوا دارالعلوم
جوہرِ تبلیغِ اولیٰ از ادارہ پیش پیش — گوہرِ الیاسؒ روشن مجسم راہ دارالعلوم
مرکزِ دین و سیاست بہرِ تنظیم قوم حق — روشنی درسِ قرآں حق بجا دارالعلوم
جوہرِ حسنِ شریعت از امیرِ شرح خوب — مرکزِ حسنِ بخاریؒ درس گاہ دارالعلوم
جلوۂ آدابِ مسلم نظمِ بزم حق شاداب — جوہرِ فاراب مسلم ، حق نگاہ دارالعلوم
جلوتِ آدابِ طیب جلوتِ السلام حق — جلوۂ قرآں ز قرأت ، حق نوا دارالعلوم
جوہرِ نقد سیاست نظمِ بزم حق عجب — جذبۂ آزاد مومن برملا.......دارالعلوم
مرکزِ علمِ شریعت ، حق طریقت ، حق سرا — جوہرِ جذباتِ قاسمؒ حق عجب دارالعلوم
گردشِ آلام روشن بہرِ مسلم حق جہاد — ورزشِ مسلم بجا در ہند ، پا دارالعلوم
جلوتِ آداب روشن بہرِ مسلم چار سو — جلوت خلوت نمایاں حق نگاہ دارالعلوم
جوہرِ حسنِ تکلف نظمِ بزم ادب وا — نظمِ بزم ادب شرع حق بپا دارالعلوم
گردشِ آدابِ مومن بہرِ مکتب شیخ پا — گوہرِ حسنِ جبلت چشم وا دارالعلوم
شیوۂ آدابِ الفت نظمِ شرع حق بساط — جوہرِ تکذیبِ باطل ، جسم بجا دارالعلوم

جلوتِ احساس خلوت حق رسا مومن نوید
نظمِ بزم حق ندا ہو یا صدا دارالعلوم

دارالعلوم دیوبند

— اور —

اس کا مستقبل

علامہ قاری محمد طیب صاحب قاسمی

ایک ملاقات

○

بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا

مقام دعوت و تجدید

علمی، سیاسی، معاشرتی، تجدیدی، کارنامے

• انٹرویو • ضبط و ترتیب سمیع الحق ایڈیٹر ماہنامہ الحق • ۲۰ رجب ۱۳۹۸ھ کو لیا گیا

پچھلے دنوں جب حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند سے اپنے سفر پاکستان کے دوران اپنی خاص محبت اور تعلق کی بنا پر دارالعلوم حقانیہ کو بھی اپنی تشریف آوری سے نوازا اور دارالعلوم کی فضائیں حضرت کی آمد کی وجہ سے پُرنور مجالس اور محافل سے سراپا نور بن گئیں تو اچانک دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ماہنامہ الحق کے لیے مرکز اسلام کے، دیرینہ شیرازہ حضرت حکیم الاسلام مولانا نانوتوی کے علوم و اسرار کے امین سے ایک انٹرویو لیا جائے۔ ادھر یہ خواہش، ادھر حضرت کی مصروفیات اور دیگر پروانوں کا ہجوم اور پھر حضرت کی علالت اور تکان سفر کے ساتھ ساتھ تازہ زکام اور نزلہ اس پر مستزاد مگر خدا کی خاص دستگیری شامل رہی کہ رات گیارہ بجے کے بعد اس مقصد کے لیے کچھ یکسوئی کا وقت نکل ہی آیا۔

حضرت سے پہلا سوال دارالعلوم دیوبند کے مستقبل کے بارے میں تھا، بھارت سے مسلمانوں کی ثقافت، پرسنل لاء اور ثقافتی مراکز کے متعلق جو خبریں آتی ہیں وہ اگر مبالغہ آمیز ہی لیکن پریشان کن ضرور ہوتی ہیں پھر مادر علمی دارالعلوم دیوبند کا تو خیال آتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں کہ مشن سلامت و ہزار بدگمانی ۔ جس شجرۂ طوبیٰ کے لیے حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور شہدائے بالاکوٹ نے زمین ہموار کی، جس کی داغ بیل حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور فقیہ الاسلام مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے سراپا اخلاص و عمل بزرگوں نے رکھی، پھر جس کی آبیاری میں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، مولانا انور شاہ کشمیری اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے اساطین امت نے اپنی زندگی کھپا دی۔ آج انوار و معارف قاسمیہ کے امین اور بانی دارالعلوم کے خلف رشید مولانا محمد طیب صاحب قاسمی سے پہلا سوال اسی دارالعلوم دیوبند کے بارے میں تھا، جس کی تعمیر و تشکیل سے خود حضرت قاری صاحب مدظلہ کی پوری زندگی کی داستان وابستہ ہے۔ حضرت نے پورے اعتماد، مضبوطی، ایمان اور توکل

سے بھرپور انداز میں جواب دیا۔

"جی ہاں اللہ بہتر کرے۔ بنیاد تو اس کی ایسی ہے کہ مستقبل روشن ہے۔ انشاء اللہ اور یہ اس لیے کہ بڑی بڑی گھاٹیاں آئیں، اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا، بڑے بڑے مخالف پیدا ہوتے، مگر اللہ کا فضل ہے، وہ بڑھتا ہی رہا۔

اطمینان اور تسلی کے لیے یہی کچھ کافی تھا، مگر یکایک دھیان مولانا محمد یعقوب صاحب صدر اوّل دارالعلوم دیوبند کے ایک مکاشفے یا پیشگوئی کی طرف گیا۔ جیسے کہیں پڑھا یا سُنا تھا اور پھر جب یہ خیال آیا کہ دارالعلوم دیوبند اپنی زندگی کے سو سال تو پورے کر چکا ہے تو گویا دل و دماغ پر ایک بجلی سی کوند پڑی اور سائل نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب ؒ سے اس بارے میں پوچھا کہ حضرت کسی بزرگ غالباً مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا ایک مقولہ سُننے میں آیا ہے کہ سو سال تک تو اس دارالعلوم کا خدا محافظ ہے اس کے بعد حق اللہ تعالیٰ کی شانِ بے نیازی کا جو فیصلہ ہو۔ حضرت نے اس کا جواب دیا تو یکایک فکر و اضطراب کی گھٹائیں، اطمینان اور امید کی قندیلوں سے روشن ہو گئیں۔

بات دُوسرے پیرائے میں دُہرائی۔

حضرت مجددین کا زمانہ تو اشخاص و افراد کے لحاظ سے سو سال کا ہوتا ہے، تو یہ تو دین، علوم دین کا ایک مجدد ادارہ ہے تو اس کی عمر تو ہزار سال ہونی چاہیئے۔ ابھی میں نے اپنی بات پُوری نہیں کی کہ حضرت نے ایسا امید افزا اور ایمان پرور جواب دیا کہ دل و دماغ میں فکر و اضطراب کی بجائے خدا کی رحمت اور وعدۂ حفاظت دین کے یقین کی شمع فروزاں ہو گئی۔ حضرت نے فرمایا:

"میں نے اپنے بزرگوں، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور دیگر حضراتؒ سے کئی بار سُنا ہے کہ مجدد کے لیے شخصِ واحد کا ہونا ضروری نہیں بلکہ جماعت بھی ہو سکتی ہے اور ان حضرات نے فرمایا کہ یہ جو حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ اور ان اکابر کی جماعت ہے۔ یہ سب مجدد ہیں جنہوں نے سنت اور بدعت میں معروف اور منکر میں تمیز پیدا کی اور اس کے بعد فرمایا کہ ان حضرات کی تجدید کا مظہر اتم دارالعلوم دیوبند ہے۔ لہٰذا اسی کو مجدد کہا جائے اور مولانا حبیب الرحمٰن نے دُوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ یہ جو عمل ہے۔ تجدید دین کا، اس کی نسبت اور قیام کا مرکز ہے۔ دارالعلوم اور ہندوستان میں یہ دارالعلوم قطب الرحیٰ کی حیثیت رکھتا ہے، جیسے چکی کے پاٹوں کے بیچ میں کلی ہوتی ہے، تو اس کے ارد گرد کے پاٹ گھومتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے نہ صرف دینی معاملات بلکہ ملکی معاملات بھی اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اس کے اندر کچھ قوت اور مقناطیسی طاقت خدا نے رکھی ہے"

۔ اس امید و بیم میں راقم الحروف نے اپنی

حضرت اپنی بات ابھی سمیٹ رہے تھے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ مجلس میں تشریف لائے اور حضرت کے پہلو میں بیٹھ گئے، حضرت نے ان کی طرف متوجہ ہو کر اندرونِ نگاروں کی ستم کاری کا

شعور ہدایات آمیز انداز میں فرمایا کہ :

ان لوگوں کا منشا یہ ہے کہ تم رات کو بھی جاگتے رہو، دن کو بھی نہیں سونا چاہیے، آج بھی جاگنا چاہیے اور کل کو آٹھ گھنٹے کا سفر ہے، جاگ کے جانا تاکہ مجاہدہ مکمل ہو جائے :

بزرگوں کی شفقت سے طبیعت میں جو گستاخی اور شوخی آگئی تھی اس کی بنا پر عرض کیا گیا کہ حضرت پچھلے سفر میں ہماری قدر ناشناس میزبان حکومت نے آپ کے تقریر و بیان پر پابندی[1] لگا کر آپ کو بڑی اذیت پہنچائی ہے۔ اب ہم کل سے اس کی کسر یہاں دارالعلوم حقانیہ میں نکالنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے جن کی طبیعت کو خدا نے شکوہ و شکایت کی بجائے صبر رضا اور تحمل کی صفت سے بڑی فراوانی سے نوازا ہے۔ ہماری اسلامی حکومت کے اس بظاہر نامناسب اقدام پر احتجاج یا افسوس کی بجائے احسان مندی کے لہجے میں فرمانے لگے کہ جی ہاں : یہ تو واقعی یہاں کی حکومت کا میرے ساتھ نادانستہ احسان ہے، یا پھر میرے ضعیف بڑھاپے اور علالت پر خداوند کریم کا غیبی کرم، ورنہ تقریر پر پابندی نہ ہوتی اور جگہ جگہ دوستوں کے تقاضے پر مجھے بولنا پڑتا، تو شاید میری طبیعت اس کی متحمل نہ ہو سکتی۔ مگر میں تو وہاں سے یہ ارادہ کر کے آیا تھا کہ تقریر و بیان سے حتی الوسع علالت کی وجہ سے پہلو تہی کروں گا۔

عالم اسلام کے ایک جلیل القدر عالم دین اور مسلمانوں کے قابل فخر بزرگ کی اپنے ملک میں اس پذیرائی کا ذکر چھیڑ کر مجھے خود ندامت اور خفت محسوس ہونے لگی، مگر حضرت کی زبان سے ایسا تبصرہ سن کر اپنے اکابر کی شرافت نفس اور علو اخلاق کا ایک پہلو تو سامنے آہی گیا۔

اس کے بعد گویا اصل انٹرویو شروع ہوا اور ایک پرزہ جس پر عجلت میں چند سوالات لکھے گئے تھے حضرت کی طرف بڑھایا گیا۔ حضرت نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر گویا ہماری طفلانہ خواہش اور تنگی داماں کو دیکھ کر کہنے لگے: ارے بھئی یہ تو بڑے لمبے سوال ہیں۔ ان میں سے کسی ایک سوال کے ایک گوشے پر گفتگو کے لیے بھی یہ پوری رات ناکافی ہے :

مگر ایک ایسے بہار گلشن سے گزرنے والے کسی رہرو شوق کی نظر تو اپنی تنگ دامنی سے زیادہ انواع و اقسام کی زیبائش اور رعنائی پر ہوتی ہے اس کے دامان نگاہ میں تو پورا چمن ہی سمیٹ لینے کی چیز ہے کہ پھول ہے، تو پتی اور ہر سبز و شاداب گوشہ ہے تو بس یہی۔

پہلا سوال حجۃ الاسلام محمد قاسم نانوتویؒ کے بارے میں تھا جن کے ذریعے خدا نے ظلمت کدۂ ہند میں حفاظت دین کا سہرا باندھا اور جن کی ہمہ گیر بصیرت، مجاہدانہ جد و جہد حکیمانہ علوم اور جدید علم کلام کی وجہ سے خداوند کریم نے دور غلامی میں اسلام اور مسلمانان ہند کے علوم و تہذیب کو محفوظ رکھا۔ بلاشبہ اس امام کبیر کی نظیر قرون اولیٰ ہی میں مل سکتی ہے۔ علم میں، عمل میں، جہاد میں اور ریاضت میں، تدبر اور سیاست میں۔ تصوف اور سلوک میں حضرت حجۃ الاسلام یگانۂ روزگار تھے۔ ایک نقاد عالم نے بالکل صحیح کہا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ کی ذات ستودہ صفات انیسویں صدی کے نصف آخر میں بلاشبہ آیت من آیات اللہ تھی۔ آپ کے علمی اخلاقی اور روحانی کارنامے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے رازی کا فلسفہ شعرانی کا علم الکلام، غزالی کا سوز و گداز، ابن تیمیہ کا صولت بیان، ولی اللہ کی حکمت و دانش، احمد سرہندیؒ کی غیرت و حمیت اسلامی اور شیخ کی شجاعت، یہ سب چیزیں کس فیاضی سے ایک شخص میں جمع کر دی تھیں اور بقول حضرت حکیم الامۃ مولانا تھانوی، ہمارے اکابر تو وہ ہیں کہ اگر ان کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرا دیا جائے اور بتلایا نہ جائے تو دیکھنے والے رازیؒ اور غزالیؒ ہی سمجھیں گے۔ اور آج حضرت قاری صاحب سے اسی امام دعوت و عزیمت پر کچھ روشنی ڈالنے کے لیے کہا گیا تھا اور حجۃ الاسلام کے پوتے فرما رہے تھے۔

[1] جس سفر کا ذکر ہے، اس دوران حکومت نے حضرت مدظلہ کی تقریر و تحریر پر پابندی لگا رکھی تھی۔

حضرت نانوتویؒ نے زندگی میں جو کام انجام دیئے، وہ تو بہت زیادہ ہیں، لیکن بنیادی طور پر ۳ بڑے بڑے کام انجام دیئے۔ سب سے پہلا کام دارالعلوم دیوبند کا قیام ہے۔ یہ کام اتنا عظیم کام ہے کہ پوری دنیا پر اس نے اثر ڈالا ہے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ حضرت نانوتوی خلافتِ اسلامیہ کی تائید میں ہمہ وقت منہمک رہے۔ سلطان عبدالحمید صاحب خلیفہ تھے، گو وہ نام کی رہ گئی تھی، مگر حضرت چاہتے تھے کہ وہ نام ہی قائم رہے اس سے تمام ممالک اسلامیہ میں ایک مرکزیت قائم رہے گی۔ اس لیے حضرت نے خود بھی سلطان کی حمایت میں قصیدے لکھے، مولانا محمد یعقوبؒ، مولانا ذوالفقار علیؒ سارے بزرگ رطب اللسان رہے اور جب بھی ترکوں سے کسی کی جنگ چھڑی، یہ حضرات ترکوں کی حمایت میں کھڑے ہو گئے۔ کہیں چندہ جمع کر رہے ہیں، کہیں رائے عامہ پیدا کر رہے ہیں، غرض ہمہ وقت مصروف رہتے۔ تو مقصد یہی تھا کہ خلافت کا نام قائم رہے تاکہ تمام ممالک اسلامیہ میں کچھ نہ کچھ ارتباط تو قائم رہے اور تیسری چیز یہ انجام دی کہ دیوبند اور نواحِ دیوبند میں نکاحِ بیوگان کو انتہاء درجے کا عیب سمجھا جاتا تھا اور یہ چیز ہندوؤں سے آئی تھی۔ اگر کسی نے نام بھی لیا تو تلواریں نکل آتی تھیں، حضرت نے لطیف پیرائے میں اس کی تحریک شروع کی، جب اندرونی طور پر خواص کو اپنا ہم خیال بنایا تو اس کے بعد جلسہ عام کیا، ہمارے یہاں دیوان دروازہ جو ہے، وہ نواب لطیف اللہ خان مرحوم کا محل تھا، جو اورنگزیبؒ کے وزیرِ خارجہ تھے اور دیوبند میں عثمانیوں کے مورثِ اعلیٰ تھے، اس میں حضرت نے وعظ فرمایا، بہت بڑا مجمع تھا۔ درمیان میں ایک شخص اٹھا اور کہا کہ حضرت مجھے کچھ عرض کرنا ہے، فراست سے سمجھ گئے کہ کیا کہنا ہے۔ جواب میں فرمایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ ایک ضرورت پیش آگئی ہے، لوگوں نے سمجھا کہ استنجا وغیرہ کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔

حضرت گھر میں گئے، حضرت کی بڑی بہن بیوہ تھیں۔ ۹۵ برس کی عمر میں۔ نہ نکاح کے قابل، نہ کچھ۔ مگر اعتراض کرنے والے کو اس کی کیا ضرورت ہے، وہ تو یہ کہتا ہے کہ آپ دنیا کو نصیحت کرتے ہیں مگر آپ کی بہن تو بیٹھی ہے۔ گھر میں گئے تو بڑی بہن کے پیروں پر ہاتھ رکھا، رونے لگے اور کہا کبھی تم تو عالم ہو یہ کیا کر رہے ہو۔ فرمایا: بہرحال میں آپ کا چھوٹا بھائی ہوں، آج ایک سنتِ رسولؐ زندہ ہوتی ہے اگر آپ ہمت کریں تو آپ پر موقوف ہے، فرمایا کہ میں ناکارہ اور سنتِ رسولؐ کا احیا میری وجہ سے ہو۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ نکاح کیجئے، فرمایا کہ بھئی تم میری حالت دیکھ رہے ہو۔ منہ میں دانت نہیں ہے، کمر جھک گئی ہے، ۹۵ برس میری عمر ہے۔ کہا یہ سب میں جانتا ہوں۔ اعتراض کرنے والے اس چیز کو نہیں دیکھتے۔ تو فرمایا کہ اگر سنتِ رسولؐ میری وجہ سے زندہ ہو سکے تو میں جان قربان کرنے کو بھی تیار ہوں۔ تو ان کے دیور کی بیوی کا انتقال ہوا تھا اور ان کے خاوند کا وہاں پر جو چودہ پندرہ آدمی خاندان کے تھے، ان ہی کے سامنے نکاح پڑھایا گیا۔ گواہ بنا دیئے گئے، اس میں کچھ دیر لگ گئی، پھر حضرت نانوتویؒ باہر آئے اور مجمع میں دوبارہ تقریر شروع کی، پھر وہی سائل کھڑا ہوا کہ کچھ عرض کرنا ہے۔ فرمایا کہیے، اس نے کہا کہ آپ دنیا کو نصیحت کر رہے ہیں اور آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہے، تو ہم پر کیا اثر ہوگا؟ فرمایا کہ ان کے نکاح کے تو شاید گواہ بھی یہاں موجود ہوں گے۔ وہ تین آدمی درمیان میں کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ہمارے سامنے نکاح ہوا ہے۔

اصلاحِ معاشرت اور رسومات مٹانے کے لیے حضرت نے خود اپنے گھر سے قربانی پیش کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی مجلس میں ۶۰، ۷۰ نکاح پڑھائے گئے، پھر یہ سنت ایسی چلی کہ ہزاروں بیواؤں کا نکاح ہو گیا۔

تو پہلی چیز تو دارالعلوم کے قیام پر زور دیا، اس کی روح فی الحقیقت یہ تھی کہ علومِ نبوت اگر عام ہو جائیں اور ایمان سنبھل جائیں، تو پھر مسلمان سب کچھ کر سکتے ہیں اور اگر ایمان ہی نہ رہا تو پھر کچھ نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ جب شوکت اور حکومت جا چکی تو کم از کم دین تو محفوظ رہ جائے، وہ رہ گیا تو

آئے سب کچھ ہو جائے گا

اس سلسلہ سفر میں جہاں بھی گئے تو مدارس قائم کرتے چلے گئے۔ مراد آباد میں مدرسہ شاہی، امروہہ میں مدرسہ عربیہ، ہرولی میں مدرسہ اشاعت العلوم، انبہٹہ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسے اور گاؤں گاؤں میں مدرسہ قاسمیہ جاری کیا اور جتنے متوسل تھے، خطوط لکھے کہ جہاں ہو مدرسہ قائم کرو۔ یہ حضرت کی ایک بڑی سیاست تھی، اور اس کا حاصل یہ تھا کہ قوم کو علم کے راستے تیار رکھا کہ وہ مضبوطی سے قائم رہے اور جب دین ہوگا تو آئندہ ممکن ہے کہ ان میں شوکت اور قوت بھی آجائے۔ اہم معاشرت کو درست کیا۔ معاشرے کی سب سے بڑی خرابی نکاح بیوگان کی طرف توجہ دی۔ تیسری چیز یہ بھی کہ خلافت اسلامیہ کی طرف لوگوں کو مائل کیا۔ ہر وقت اس کا دھیان جس سے میں نے یہی سمجھا کہ حضرت چاہتے تھے کہ اسلامی نظام کی کوئی نہ کوئی بود و نبود باقی رہے۔ اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے، تو کم سے کم کسی اسلامی حکومت سے تو مربوط رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی امیدوں کا مرکز بہت دنوں تک افغانستان رہا اور برطانیہ کو یہ شکایت رہی کہ یہ جماعت شورش کر رہی ہے۔ اور افغانستان سے مل کر برطانوی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے، مگر ان حضرات کو اس کی کیا پرواہ تھی؟ افغانستان سے برابر اپنا ایک رابطہ قائم رکھا اور یہی وجہ ہوئی کہ جب امیر نادر خاں کا انتقال ہوا اور ظاہر شاہ تخت سلطنت پر بیٹھ گئے تو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے مجھے نمائندہ بنا کر بھیجا کہ امیر مرحوم کی تعزیت اور امیر موجود کی تہنیت کروں، میں افغانستان حاضر ہوا اور میں نے یہ تحریر لکھ کر پیش کی کہ ہمارا مقصد کوئی مالیہ اور چندہ لینا

نہیں، بلکہ ان دعاؤں کی ضرورت ہے جو جاتے اکابر کے تھے۔ جس پر صدر اعظم نے مجھے بلایا، امیر بڑی عنایت اور شفقت سے پیش آئے۔ جب میں قصر صدارت میں پہنچا تو ہم لوگ بیٹھ گئے اور یہ خیال تھا کہ ملاقات کے لیے کسی کمرے میں بلایا جائے گا، لیکن یکایک دیکھا کہ خود صدر اعظم وہیں آرہے ہیں ہم سب لوگ کھڑے ہوگئے۔ آگے بڑھے تو وہی افغانی طریقے پر معانقہ۔ دایاں بایاں مونڈھا چوم کر بڑی محبت کا اظہار انھوں نے کیا۔ پھر بڑھ کر فرمایا: بفرمائید، آپ آگے چلیں۔ میں نے کہا: خلاف ادب است۔ فرمایا: نہیں نہیں آپ کو آگے چلنا ہوگا اور میں اس کی وجہ بتاؤں گا۔ اب ہم اس شان سے چلے کہ میں آگے آگے، میرے پیچھے صدر اعظم صاحب ان کے پیچھے سردار نعیم خاں اور ان کے پیچھے مولانا محمد میاں صاحب و منصور انصاری اور ان کے پیچھے قاری حاجی صاحب اس ترتیب سے ہم آگے بڑھے تو وہ جو بڑی کرسی تھی اس پر مجھے بٹھلایا اور خود دوسری کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اب میں وجہ بیان کرتا ہوں اور وجہ مختصر یہ ہے کہ حکومت کابل کی خدمت ہمیں آپ بزرگوں کی دعاؤں سے ملی ہے اور یہ اشارہ تھا اس طرف کہ امیر نادر خاں صاحب کے چچا تایا سردار محمد یوسف خان اور سردار محمد آصف خان، یہ دونوں بیعت تھے حضرت گنگوہیؒ سے اور برطانیہ نے انھیں ڈیرہ دون میں نظر بند کر رکھا تھا، تو یہ حضرات شکار کے حیلے سے گنگوہ آکر حضرت کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔ اور حضرت کوئی نصیحت فرما دیتے۔ آخری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو حضرت نے فرمایا کہ جاؤ کابل کی حکومت تمہارے خاندان میں آئے گی اور عدل سے کام کرنا۔ انھیں حیرت ہوئی کہ کابل کی حکومت سے ہمارا کیا تعلق؟ امان اللہ کی حکومت

حضرت چاہتے تھے کہ اسلامی نظام کی کوئی نہ کوئی بود و نبود قائم رہے اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے، تو کم سے کم کسی اسلامی حکومت سے مربوط تو رہے۔ خلافت عثمانیہ کی حمایت کا مقصد بھی یہی تھا کہ عالم اسلام میں کچھ نہ کچھ مرکزیت باقی رہے — اور — رابطہ باقی رہے

کابل کی حکومت ہمیں اکابرِ دیوبند کی دعاؤں سے ملی

صدرِ اعظم افغانستان

تھی۔ یہ لوگ بنی عمام میں سے تھے انہیں عہدے وزارتیں تو ملتی تھیں، مگر حکومت کا کوئی سوال نہ تھا وہ سمجھے کہ حضرت نے حوصلہ افزائی کے طور پر یہ کلمہ کہہ دیا ہے اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ بچہ سقہ کی حکومت آئی، امان اللہ خاں معزول ہو گئے۔ کیونکہ اس نے مظالم ڈھائے تو قوم متوجہ ہوئی کہ امیر نادر خاں کو فرانس سے بلایا جائے، وہ آئے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور پھر شہید ہو گئے۔ تو صدرِ اعظم کا اشارہ اسی طرف تھا۔ پھر صدرِ اعظم نے فرمایا کہ ہمارے پاس کچھ تبرکات آپ کے بزرگوں کے محفوظ تھے۔ مولانا نانوتویؒ کی ایک ٹوپی تھی جو میری والدہ کے پاس تھی اور ہمیں جب کوئی بیماری ہوتی تو والدہ ہمیں وہ ٹوپی اُڑھاتی تھی اور ہمیں شفا ہو جاتی تھی۔ آج ڈاکٹر رفیق بے رجوترک ہے، کو ہم چھ ہزار روپے ماہانہ دیتے ہیں، مگر اس کے نسخوں سے وہ شفا نہیں ہوتی، جو ان تبرکات کی وجہ سے ہوتی تھی اور فرمانے لگے کہ بچہ سقہ کے زمانے میں ہمارا گھر لُٹا گیا۔ لاکھوں روپے کا سامان چوری ہو گیا، لیکن ہمیں صدمہ ہوا تو تبرکات کا جس کا آج تک ہمارے اوپر اثر ہے، پھر صدرِ اعظم افغانستان نے فرمایا کہ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو آگے بڑھا رہا ہوں۔

یہ تو تھے افغانستان سے روابط۔ اور سلطان عبدالحمید خان ترکوں سے تعلق کا حال معلوم ہوا۔ جیسے ان حضرات کے ذہن کا اندازہ ہے کہ یوں چاہتے تھے کہ کسی طرح اسلامی حکومت بازیافت ہو جائے مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو، شیخ الہندؒ کی بھی یہی تحریک تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ عالم اسلام متحد ہو کر ترکی اور افغانستان، سب مل کر ہندوستان پر حملہ آور ہوں۔ حضرت کی یہ تحریک تھی اور وہ پہلے بھی حملہ آور، مگر کچھ تو یہ کہ تیار نہ تھا کچھ یہ ناتربیت یافتہ تھے نتیجہ شکست کی صورت میں نکلا اور یہ خواہش انہیں ورثے میں اپنے استاذ حضرت نانوتویؒ سے ملی تھی ۱۸۵۷ء میں تو گویا حضرت جوشِ جہاد میں غرق تھے اور بس یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جان دے دوں۔ الغرض حضرت کی زندگی کے کارناموں میں ایک علمی کارنامہ تو دارالعلوم ہے، جس کا فیض اطراف عالم میں پہنچا، دوسرا معاشرتی کارنامہ ہے اور تیسرا سیاسی اور اجتماعی کارنامہ کہ تہذیب و تعلیم ہی کے سلسلے میں سہی، مگر ممالک اسلامیہ میں کوئی نہ کوئی رابطہ قائم رہے اس سلسلے میں حضرت نے دارالعلوم دیوبند میں محکمۂ قضا قائم کیا اور مولانا یعقوبؒ کو قاضی بنایا تو ہزاروں مقدمات جو برس ہا برس سے لٹکے ہوئے تھے منٹوں میں طے ہو گئے۔ لوگوں کا وقت اور مالیہ بچا۔ یہ سلسلہ جاری رہا، مگر انگریز نے آخر میں آکر توڑ دیا۔ دیوبند میں ایک تھانیدار کو بھیجا، جو بڑا سخت قسم کا آدمی تھا، چنانچہ وہ آیا، رمضان شریف کا آخری عشرہ تھا، اس نے آکر حضرت نانوتویؒ سے مصافحہ کیا اور بہت جرأت کے ساتھ کہا کہ کیا آپ ہندوستان میں شرعِ محمدی کا جھنڈا اُڑانا چاہتے ہیں؟ یہ کیا آپ نے محکمہ قضا قائم کیا ہے؟ حضرتؒ نے بڑی نرمی سے کہا کہ تو ہم لوگ گورنمنٹ کی مدد کر رہے ہیں جو لاکھوں

> حضرت چاہتے تھے کہ کسی طرح اسلامی حکومت بازیافت ہو جائے مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو۔ شیخ الہندؒ کی بھی یہی تحریک تھی کہ عالم اسلام متحد ہو۔ ترکی اور افغان مل ملا کر غلام ہندوستان پر حملہ آور ہوں۔ ۱۸۵۷ء میں تو حضرت نانوتویؒ جوشِ جہاد میں غرق اور جان دینے کے لیے بے تاب رہتے

...ہے مرچ کر کے مقدمات فیصل کر لی ہے، ہم نے منٹوں میں فیصل کر دیا مگر اس نے کہا کہ نہیں، آپ خواہ مخواہ استادی کرنا چاہتے ہیں، میں رپورٹ کروں گا اس پر حضرت کو غصہ آیا اور کہا کہ کان پکڑ کر اسے نکال دو۔ طالب علموں نے دھکے دے کر اسے نکالا اور حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ جا ہم تیری رپورٹ دیں گے، نکال دو اس شیطان کو یہاں سے، بہرحال عید کا دن آیا۔ تھانیدار نے دودھ کے بدلے بھرے تھے، کپڑے تیار، خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ اچانک گورنمنٹ کا حکم پہنچا کہ اس کی رشوتوں کی انتہا ہو گئی ہے، اس کو فوری طور پر برخاست کیا جائے اور بازار میں دکان دکان پر جہاں سے اس نے رشوت لی، پیروں میں رسی ڈال کر اسے پھرایا جائے۔ تو عدالت میں اسے گھمایا گیا کہ یہ وہ تھے کہتا جا رہا تھا کہ افسوس! میں نے رپورٹ نہیں کی، مگر مولوی جی نے میری رپورٹ کر دی، تو اس کا خمیازہ جلد اس نے بھگت لیا۔ اس کی جگہ دوسرا آیا۔ اس کے بعد ان بزرگوں کی وفات ہو گئی اور محکمہ نہیں چلا۔

تو حضرت کا چوتھا منصوبہ یہ تھا کہ اسلامی پرسنل لاء اور محکمہ قضا شریعت کے مطابق طے ہو۔ اس کے تحت دارالعلوم دیوبند کے اکابر نے جب لندن سے مسٹر مانٹیگو وزیر ہند آیا اور جدوجہد کا زمانہ تھا، تو میرے والد صاحب مولانا حافظ محمد احمد، علماء کا ایک وفد لے کر ان سے ملنے کے لیے گئے اور درخواست یہ کی کہ ہندوستان میں محکمہ قضا قائم کر دیا جائے، جس میں شریعت اسلام سے مخصوص چیزیں، نکاح، طلاق، عدت، میراث، اوقاف وغیرہ طے ہوں۔ خیر اس نے ظاہر میں تو کہا کہ اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کروں گا اور پارلیمنٹ میں بھی لیکن یہ ایک وقتی بات تھی۔ نہ اس نے یہ پیش کیا، نہ ایسا ہوا۔

مگر ان بزرگوں کا جذبہ برابر یہی تھا کہ اسلامی اقتدار مسائل کے ذریعے ہی سہی قائم ہو جائے۔ تحفظ خلافت اور روابط اسلامیہ کے سلسلے میں حضرت نانوتوی نے ایک کام یہ کیا کہ لوگوں کو بہت زیادہ حج کے لیے مائل کرتے تھے اور فرمایا کہ اول تو عبادت ہے اور عبادت بھی اجتماعی، وہاں جا کر مکہ والوں سے بھی سابقہ پڑے گا۔ وہاں اسلامی حکومت دیکھیں گے، تو ان کے قلب پر اثر پڑے گا تو شوکت اسلام کے جذبات ابھر آئیں گے۔ تو علم و معاشرت، سیاست اور خلافت یہ چند چیزیں ایسی ہیں جو حضرت کی تمام خدمات کی محور ہیں۔

رات آدھی گزر چکی تھی مگر مجلس ذکر قاسمی میں بیٹھے محو کر گیا آپ جیسے خواب دیکھ رہے ہوں اور زمانہ پیچھے کی طرف پلٹ گیا ہو کہ یکایک حضرت قاری صاحب نے بساط سمیٹنی چاہی کہ سننے والے تھک چکے اور حضرت کے ضعف و نقاہت کے باوجود ان کی توجہ حضرت نانوتوی کی ایک مخصوص شان علمی کمالات کی طرف مبذول کرانا چاہی کہ ابھی ذکر محبوب کچھ دیر اور چلتا رہے کہ اصحاب غرض کو تو اپنی مطلب برآری سے ہی کام ہوتا ہے۔ ورنہ عقل اور ادب دونوں حضرت کو تکلیف دینے سے روک رہے تھے۔ مگر دل مصر تھا کہ:

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دو!

حضرت نانوتوی کی علمی شان تجدید کا ذکر آیا تو حضرت قاری صاحب گویا یکدم تازہ دم ہو گئے اور فرط و نشاط میں محو ہو کر فرمانے لگے کہ علوم و معارف میں بھی حضرت کا بالکل مجددانہ انداز ہے۔ حضرت کی جو تصانیف ہیں، مولانا شبیر احمد عثمانی کی نگاہ بہت تھی تصانیف پر اور یہ جملہ فرمایا کرتے تھے کہ سو برس تک فلسفہ کتنے ہی روپ بدل کر آئے، لیکن حضرت کی حکمت اس کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہو گی۔ سو برس تک کوئی اسلام کا مقابلہ اور اسلام پر حملہ حجت سے نہیں کر سکتا، اتنی حجتیں جمع فرما دیں، تو گویا ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال دی جس سے اسلامی حقائق اور دقائق پورے واضح ہوتے ہیں اور مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنی نظر کے لحاظ سے کتابوں کو سلف میں بھی بہت کم لوگ ملیں گے جنہوں نے اس قسم کی حکمت جمع کی ہو۔ یہ حضرت ہی کا حصہ ہے اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حضرت کی ہر چیز بیچ کی نہ تھی، بلکہ آخری کنارے پر لگی ہوئی۔

علم کے بارے میں ایک بات مجھے اور یاد آئی کہ مولانا یعقوب صاحب کشف و کرامت بزرگوں میں سے تھے اور ان کے ہاں اخفا تھا ہی نہیں، جو واردات ہوتی، صبح طالب علموں کے سامنے پیش کر دیتے کہ یہ رات کو کشف ہوا۔ یہ الہام ہوا۔ یہ عادت تھی، تو ایک دن فرمایا کہ بھئی آج صبح کی نماز پڑھنے کھڑا ہوا تو بال بال بچ گیا، میرے مرنے میں کسر نہیں تھی۔ طلبہ نے عرض کیا کہ کیا پیش آئی: فرمایا کہ قرآن کریم کے علم کا ایک اتنا بڑا دریا میرے قلب کے اوپر گزرا اور غنیمت یہ ہے کہ وہ گزرتے ہی نکل گیا۔ ورنہ میں تحمل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد خود فرمایا کہ میں مراقب ہوا کہ یہ کیا چیز تھی، تو منکشف یہ ہوا کہ میرے بھائی حضرت نانوتویؒ میرٹھ میں میری طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی توجہ کا یہ اثر کہ علم کا ایک عظیم دریا میرے قلب میں گزرا اور اس کے بعد خود فرمایا کہ جس شخص کی توجہ کا اتنا اثر ہے کہ اتنا بڑا علم گزر جائے کہ برداشت نہ کر سکے تو وہ شخص اتنا بڑا علم کس طرح اٹھائے پھر رہا ہے۔ اس میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ مولانا یعقوبؒ اور تمام اساتذہ دارالعلوم نے جن میں اساتذہ ائمہ فنون تھے مولانا سید احمد صاحب امام معقولات سمجھے جاتے تھے ان سب نے مل کر حضرت نانوتویؒ سے درخواست کی تفسیر کی کوئی کتاب پڑھا دیں تاکہ قرآنی علوم ہم بھی سیکھیں۔ حالانکہ یہ سب ائمہ علوم تھے۔ مولانا یعقوب صاحبؒ تو صدر مدرس تھے۔ تو حضرت نے منظور فرمایا۔ چھتہ کی مسجد میں حضرتؒ نے درس شروع کر دیا۔ الٓمّٓ سے شروع فرمایا تو حروف مقطعات پر کوئی دو ڈھائی گھنٹے تقریر فرمائی اور عجیب و غریب علوم و معارف ارشاد فرمائے اور یہ عجیب بے نفسی کا دور تھا کہ یہ سارے اساتذہ سبق پڑھ کر باہم کہنے لگے: بغیر تکرار کے یہ علوم محفوظ نہ ہوں گے۔ لہذا تکرار کیا جاوے، تو مسجد میں بیٹھ کر تکرار شروع ہو گیا۔ مولانا یعقوبؒ نے تقریر شروع کی، بیچ میں ایک جگہ کچھ بات یاد نہیں رہی، کسی اور کو بھی یاد نہ آئی تو کہا کہ میں مولانا سے پوچھ کر یہ تقریر کروں گا، تو صبح کی نماز پڑھ کر حضرت جب اپنے حجرے میں آ رہے تھے، تو مولانا یعقوبؒ نے عرض کیا کہ حضرت تقریر کا فلاں حصہ یاد نہیں رہا تو حضرتؒ نے کھڑے کھڑے یہ تقریر شروع کی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ علما اس عالم کے تھے نہ معنی اس عالم کے ایک حرف بھی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا فرما رہے ہیں، تو عرض کیا کہ حضرت ذرا نازل ہو کر فرمائیے کہ کچھ سمجھ جاؤں۔ اب دوبارہ تقریر شروع کی، تو الفاظ سب سمجھ میں آ گئے، مگر معانی نہیں۔ تو پھر عرض کیا کہ حضرت کچھ اور نازل فرمائیے، ہم وہاں تک نہیں پہنچے، تو فرمایا کہ مولانا دوسرے وقت سہی، تو اس وقت کہوں گا۔ تو علوم میں اس وقت عروج ہو گا کہ ادھر کہہ رہے ہیں اور ادھر سمجھ میں نہیں آتا، تو علم کا یہ حال تھا اور عمل تو ظاہر ہے۔ راقم نے عرض کیا کہ حضرت ایسے علوم و معارف کی تسہیل اگر ہو جائے تو اس میں مثبت سے مستشرقوں کا علاج ہے، فرمایا ہاں ہم نے مجلس معارف القرآن سے لے شروع کیا اور ایک آدھ رسالہ چھاپا بھی، تسہیل بھی کی، لیکن سلسلہ چلا نہیں، اس لیے کہ علما کی توجہ نہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ منطقی مضامین ہیں۔ میں نے کہا کہ بھئی حمد اللہ، ملا حسن اور قاضی مبارک پڑھ کر تو ان علوم میں کیا دقت ہے، تو ارادہ نہیں سمجھنے کا۔ عرض کیا گیا کہ کاوش: مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے سوانح قاسمی میں علوم قاسمی کا جو منصوبہ پیش کیا، اس کے مطابق کام کرنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ حضرت قاری صاحب فرمانے لگے کہ وہ منصوبہ میں نے ہی مولانا گیلانی مرحوم کے سامنے رکھا تھا کہ آپ نے تین جلدوں میں سوانح لکھی مگر اصل سوانح تو حضرت کے علوم ہیں۔ آپ اس پر تبصرہ کریں۔ مگر افسوس کہ اس کام سے پہلے مولانا گیلانی کی وفات ہو گئی پانچ ہی صفحات مقدمہ کی شکل میں لکھ پائے تھے۔

الغرض بڑے عجیب و غریب علوم و حقائق ہیں

(اردو ترجمہ)

جو

خادم دارالعلوم دیوبند کی طرف سے مولانا مولوی حبیب الرحمن صاحب معاون مہتمم نے

علامہ سید رشید رضا

کی

خدمت میں عربی میں پیش کیا، جب وہ دارالعلوم دیوبند کی زیارت کیلئے ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۲ء میں تشریف لائے تھے

بسم اللہ الرحمن الرحیم! اے بزرگانِ انجمن و مردِ دانا سید رشید رضا!
اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم زندہ سلامت رکھے۔

مہمان کی مدارات ایک ایسی برگزیدہ اور پسندیدہ خصلت ہے جو فطرت کا اقتضا۔ انسانیت کا جوہر، شریعت کی تعلیم اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی عادت ہے، بالخصوص جب کہ مہمان کوئی کریم النفس عظیم الشان بلند مرتبہ شخص ہو، جب کہ آپ نے از رہِ تخلق محض اخلاقِ اسلامیہ کے ادا کرنے اور بزرگانِ دین کے طریقے کو زندہ کرنے اور برقرار رکھنے کی غرض سے ہمارے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا۔ ہمارا فرض تھا کہ ہم آئینِ مہمانداری اپنے مہمانِ مکرم کے شایانِ شان، شاندار جماعت کے ساتھ اور پُر تکلف دھوم دھام سے استقبال کرتے، لیکن سادگی کے جس کے ہم فطرت سے ہم خوگر ہیں۔ اور ضروریاتِ تکلف کا یہاں نہ ملنا کہ ہنوز اس قصبے میں شہریت کی شان پیدا نہیں ہوئی تمدن کی ضروریات خاطرداری اور مہمان نوازی کے سامان آسائش و آرام کی چیزیں یہاں دستیاب نہیں ہوتیں اور نیز یہ خیال کہ چونکہ ہمارے برگزیدہ مہمان کا پاک دل علم کے انوار سے منور اور بزرگانِ دین کے اخلاقِ حمیدہ سے ملتذ ہے، لہٰذا آرائش و تکلفاتِ مروجہ جو آج کل کے جدت پسند حضرات کا شعار ہے اور جس کو اسلام اور سچے مسلمان پسند نہیں کرتے بالضرور ہمارے مہمانِ مکرم کو پسند نہ ہوگا۔

داعی ہوئے کہ ہم ظاہری تکلفات کو چھوڑ کر صرف اپنے سچے دلی اخلاص، محبت ایمانی پر اکتفا کریں کہ جس نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو

یکجہتی کے رشتے میں وابستہ اور اتحاد کے سلسلے میں جکڑ کر بند کر دیا ہے اور ایک پائندہ دار اور ہمیشہ باقی رہنے والی شے ہے:

خدا کے واسطے ہے جو محبت
اسے ہر حال میں بے شک بقا ہے
سوا اس کے ہے جو الفت جہاں میں
وہ خود غرضی کے شعلوں کی فضا ہے

پس یہ اسلامی رابطہ جس میں نہ ریا کاری کا شائبہ ہے نہ کدورت کا۔ نہ طمع کی آمیزش ہے، نہ خود غرضی کی۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی کہ ان میں باوصف کمال علم اور صفائی قلب کے تکلفات کا نام ونشان نہ تھا۔ ہمارے لیے مشعل راہ ہوئی کہ ہم تکلفات سے قطع نظر کرکے محض سادگی سے اپنے مہمان عزیز کا خیر مقدم کریں۔

اگر در پئے مصطفیٰ امیدوی
میانہ روی بایدت اے اخی

ہم کو سید مکرم کے الطاف کریمانہ سے امید ہے کہ ہم سے جو کچھ فروگذاشت ہو اس سے چشم پوشی اور جو کچھ خطا ہو اس کو معاف فرما کر نظر عنایت والفت سے مسرور فرمائیں گے۔

خطاؤں کا کرے اقرار اپنی
تیری خدمت میں جب کوئی خطاکار
نہ ہو ناخوش خطا کو بخش دے تو
کہ ہے یہ شیوہ احرار و ابرار

اے سید مکرم: آپ کا وطن مألوف (مصر) سبز وشاداب پر رونق پر فضا خوش منظر، رفیع العمارات ہونے کے علاوہ اسلام کا قبہ اور اسلامی دنیا کا گہوارہ ہے۔ ہمیشہ سے علم کا منظور نظر رہا ہے۔ شرف وفضائل کی گرم بازاری نے اہل مصر کی علمی تجارت کو نفع بخشا اور مالا مال کر دیا۔ ہر زمانے میں علم کے ارکان اور عظمت نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے نگہبان وہاں پیدا ہوتے رہے، ہمیشہ اہل معارف واہل حکمت کا گنجینہ رہا اور ان شاء اللہ تعالیٰ رہے گا۔ انہی مصر کے اہل کمال میں سے ایک آپ کی ذات ہے کہ مشرق ومغرب میں آپ کے علم کا ڈنکا بجا ہوا ہے اور عرب وعجم میں فضل وہنر کا شور مچا ہوا ہے۔ آپ کی ذات مقدس قوم کی ہمدردی میں منہمک ہے۔ اصلاح قوم کا آپ نے بیڑا اٹھایا ہے۔ قوم کی کج روی دور کرنے میں سعی بلیغ فرمائی ہے۔ راستی اور درستی کی ہدایت کی ہے اہل زمانہ کو فلاح کی سڑک پر ڈالنے اور گمراہی وکجی وفساد کے میل کچیل سے پاک صاف کرنے میں بے حد جد وجہد سے کام لیا ہے اور ہندوستان بلاد اسلامیہ سے دور پھر یہاں نہ وہ تروتازگی۔ نہ وہ رونق وفضا۔ اس پر طرہ یہ کہ بدقسمتی سے آئے دن اختلافات کی آندھیاں آتی ہیں۔ افتراق کی بجلیاں کوندتی ہیں۔ ہوا پرستی اور خود رائی نے ناس کر دیا ہے۔ جسے دیکھو، اپنی رائے کا متوالا، جسے دیکھو اپنے خیالات کا تابع ایک دوسرے کی آبرو کا لیوا۔ خانہ جنگی فرقہ بندی نے جمعیت کے شیرازے کو پریشان کر دیا۔ اس مہلک مرض نے تالب گور پہنچا دیا۔ ذلت ورسوائی کا اچھی طرح ذائقہ چکھا دیا اور پھر یہ ہمارا وطن دیوبند، جس کو آپ نے تشریف آوری کی عزت سے نوازا ہے اور ہندوستانی آبادی میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور اس کی مثال بعینہٖ ایک چٹیل زمین اور تیرہ وتاریک گھر سی ہے کہ جہاں کسی آنے والے مہمان کو مسرت وفرحت ودلچسپی کا کوئی سامان نظر نہیں آتا، ہم شرم سے سر نہیں اٹھا سکتے۔ ہم حیران ودم بخود ہیں کہ آپ کی جناب میں کیا تحفہ پیش کریں اور کیونکر آپ کے اس بار احسان سے جو آپ نے ہماری گردن پر رکھا ہے، سبکدوش ہوں۔

ہاں ہمارے پاس کچھ علوم کی پونجی ہے کہ آج اہل زمانہ کی قدر شناسی سے جس کی کساد بازاری ہے جس کی دکانیں بند ہیں، جس کے بازاروں میں ہڑتال ہے۔ اللہ رے ویرانی کہ اب صرف اس کے آثار ویران شکستہ

حالی ملاقات بڑا انعام ہیں، نہ ذہن کوئی مانع ہے نہ عجیب؛ کوئی مرض ہے، نہ عجیب۔ یہ وہ خدمت عالی میں پیش ہے۔ ہم کو خدا کے فضل سے یقین ہے کہ ہمارا یہ حقیر ہدیہ شرف قبول حاصل کرے گا۔ آپ کی گزشتہ دولت ہے۔ آپ اس کے مستحق ہیں۔ اور یہ آپ کا مال ہے جو آپ کو ملے۔

مدرسہ کا قیام: ہندوستان میں اسلام پر ایسا نازک وقت آ چکا ہے۔ قریب تھا کہ علوم شرعیہ کے چشمے خشک ہو جاتے۔ ان کے چشمے خشک ہو جاتے۔ ان کے عالی شان آسمان سے باتیں کرنے والی عمارتیں منہدم ہو جاتیں، ان کے جھنڈے سرنگوں ہو جاتے، ان کی علامتیں مٹ جاتیں۔ حق تعالیٰ شانہ کے احسان کا شکریہ کس زبان سے ادا ہو کہ اس نے اپنے اولیاء سے باخبر اور دلدادگان باصفا کی ایک جماعت کو ادھر متوجہ فرمایا۔ خدا تعالیٰ ان کی سعی کو مشکور فرمائے کہ انہوں نے تباہی اور استیصال سے پہلے امت مرحومہ کی دستگیری فرمائی۔ اس برگزیدہ جماعت نے اپنی فراست و یقین سے معلوم کر لیا تھا کہ اگر علوم شرعیہ کا انتظام نہ کیا گیا اور اس کی بقاء کے لیے کچھ قوانین و ضوابط مہیا نہ کئے گئے تو ہندوستان میں ان کا بقاء ناممکن ہو گا۔ بلکہ علماء ربانیین کی وفات کے ساتھ یہ علوم بھی مردہ اور ان کے ساتھ دفن ہو جاتے اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے امت مرحومہ کی دستگیری نہ فرماتا تو اس میں کچھ شک بھی نہ تھا کہ علم ہندوستان سے رخصت ہو جاتا۔ ان بزرگوں نے ۱۲۸۳ھ میں عام مسلمانوں کی ذمہ داری پر اس مدرسے کی بنیاد رکھی۔ کسی خاص قوم یا جماعت یا شہر کی تخصیص نہیں کی۔ بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو وہی ساری تعلق و استحقاق ہے جو دیوبند کے مسلمانوں کو، اور نظام تعلیم و قواعد و ضوابط مہیا کیے۔ اس مدرسے کی اصل غرض اور مقصود یہ ہے کہ شریعت محمدی کی پورے طور پر حفاظت اور حمایت کی جائے۔ لوگوں کو اسلام کے سیدھے اور روشن راستے پر چلایا جائے۔ نہ کسی کی برائی کے درپے ہوں، نہ کسی سے جھگڑا کیا جائے۔ نہ کسی کے خلاف ہو۔ اپنے کام سے کام ہو۔ ہاں اگر اظہار حق اور تبلیغ دین کی ضرورت داعی ہو اور اس لیے کسی کا خلاف ہو جائے تو ناچاری ہے۔ مداہنت سے بچنا مسلمان کا فرض ہے۔

مدرسے کا قائم ہونا تھا کہ دور دور سے طلبہ ٹوٹ پڑے، تعلیم علوم اسلامیہ میں مصروف ہوئے۔ جوہر علوم سے اپنی جیبیں بھر کر علم کی دولت سے مالا مال، آداب شریعت سے آراستہ ہو کر خلق خدا کی ہدایت اور حق کی طرف دعوت کرنے کے لیے دنیا میں پھیل گئے۔ یہ طرز پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ اکثر شہر، قصبات، دیہات میں مدارس اسلامیہ چھوٹے بڑے ہر قسم کے اسی طرز پر قائم ہوئے۔ جہالت کی آندھیاں، خواہشات نفسانی کے جھکڑ، فتنوں کے بگولے علم کے درخت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ کی رحمت کے چھینٹوں سے درخت علم کی شاخیں ہری بھری، تر و تازہ نظر آنے لگیں، اور مدرسے کو اپنی امیدوں میں پوری کامیابی ہوئی کہ دور دراز سے علم کے مشتاق سفر کی زحمتیں برداشت کر کے آتے ہیں اور فائز المرام ہو کر واپس جاتے ہیں۔ خدا کے فضل سے اس مدت میں باوجود بے سر و سامانی تقریباً ایک ہزار فاضل ایسے یقیناً حامل شرع و ناشر سنت، مبلغ الاسلام مدرسے نے پیدا کئے ہیں جو تدریس تعلیم، ارشاد و تلقین، وعظ، مناظرہ، تصنیف و تالیف، افتاء کی گرانقدر خدمات کو انجام دے رہے ہیں۔ ہندوستان باوجود اپنی وسعت کے بحمد اللہ تعالیٰ اس مدرسے کے شاگردوں سے اور علم برداروں اور فیض رسانوں سے معمور ہو گیا ہے۔ مسلمان علمی فیض کے گوشے گوشے میں راحت گزیں ہیں تو اسلام کے دشمن جس شریعت کی طرف نظر اٹھانے سے معذور ہیں سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ مدرسے کے مقدس بانی و مؤسس حضرت امام مجدد وقت و محیی سنت، حامل لوائے شریعت، فخر اسلام حضرت مولانا نانوتوی

اور اس کے مربی سرپرست نگہبان حضرت شیخ محدث فقیہ مجتہد امام شریعت و طریقت مولانا مولوی رشید احمد صاحب قدس اللہ سرہ کی غرض اور مقصود گویہ تھا کہ دین کی حمایت اسلام کی حفاظت جس طرح بھی حاجت واقع ہو کی جاوے۔ لیکن ہر کے بازو کی تقویت اور جماعت علماء کا ابقاء کہ جن کی بقا پر مذہب کی روح کا بقا موقوف و منحصر ہے۔ اصلی غرض و اہم مقصود تھا۔ لہٰذا اوّلاً انھوں نے مدرسہ کے قواعد و ضوابط کے استحکام اصول کی مضبوطی نظامات تعلیم وغیرہ کی تکمیل کی طرف توجہ اور کوشش بلیغ فرمائی اور جب یہ امور مکمل ہوگئے اور مدرسہ اپنی مراد کو پہنچ گیا تو مدرسہ کے اراکین نے دوسرے مدارج کی تکمیل کی طرف توجہ فرمائی اور مدرسہ میں درجہ تکمیل مقرر کیا کہ طالب علم بعد تکمیل نصاب درسی و تحصیل سند فضیلت درجہ تکمیل میں ترقی کرے اور فنون ضروریہ میں یدطولیٰ حاصل کرے۔ اور ایک انجمن منعقد کی جس کا نام جمعیۃ الانصار ہے یہ اس مدرسے کے فارغ التحصیل طلبہ کی انجمن ہے۔ اس انجمن کا اصل اصول مدرسہ کے فیوض و برکات کو پھیلانا ہے۔ احکام شرعیہ کو عوام طبقے میں پختگی کے ساتھ پہنچانا اسلام کی حفاظت معاندین و مخالفین کی مدافعت کا فیض کرنا ہے۔ اس انجمن کے چند شعبے ہیں۔

دینی رسائل و کتب کی تالیف و تصنیف اور گمراہوں کے چنگل سے عوام اہل اسلام کی حفاظت کرنا، واعظین و مناظرین مقرر کرنا۔ دوسرے ملکوں میں اسلام کی اشاعت کرنا انگریزی دان فاضلوں (ایف اے۔ بی اے ایم اے) کو بڑے بڑے وظائف دے کر دینیات کی تعلیم دینا۔ سرکاری مدارس میں مسلمان طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے مدرسین مقرر کرنا۔ دیہات میں مکتب قائم کرنا وغیرہ ذالک۔

لیکن ان مقاصد عالیہ میں جلد اور معمولی سعی سے کامیابی نہیں ہو سکتی، ان میں کامیابی کے لیے بہت سا روپیہ، سعی بلیغ، ایک ممتد وقت درکار ہے اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ

مسلمان ضروریات دین سے غافل ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے جس کو بھی توفیق دی مسلمان فرمانبردار ہے۔

اے سید مکرم! یہ جماعت جس کو آپ پرانی وضع اور پرانے لباس میں ملاحظہ فرماتے ہیں اور جس پر امیری و دولتمندی کا کوئی اثر نہیں ہے۔ ایسی تنگ خیال نہیں ہے کہ دینی و مذہبی ضروریات پورا کرنے میں اس کو اس کا تعصب مانع ہو۔ اسلام کی ضروریات اور مسلمانوں کی دینی و دنیوی مصالح سے ہم غافل نہیں ہیں۔ اور نہ ہم کاہل نکمے۔ تدبیر معاش سے ناآشنا ہیں، جیسا کہ عوام اور نادان دوستوں نے ہم کو خیال کر رکھا ہے، ہاں دین میں پختہ کاری کو ہم اپنا فرض مذہبی سمجھتے ہیں اور مداہنت کو ہم برا جانتے ہیں۔ اصول اسلام و مسائل دین کے مذاق اڑانے کو ہم گناہ کبیرہ اور سم قاتل خیال کرتے ہیں۔ بلاشبہ ایسی گستاخیوں سے قصر دین میں زلزلہ آجاتا ہے اور مذہب کا شیرازہ درہم ہو جاتا ہے۔ شاہی چراگاہ کے پیچھے بکریاں چرانے کو ہم روا نہیں رکھتے۔ اس خوف سے کہ مبادا کوئی بکری اس چراگاہ میں داخل ہو جائے۔ اس لیے محارم خداوندی سے پرحذر رہنا ہمارا اوّلین فرض اور روشن طریقہ ہے اور ہم کو یقین ہے کہ بزرگان دین اور سلف صالحین کے پختہ اصول اور سچے عقائد کی پیروی میں بقائے مذہب اسلام منحصر ہے جب تک مسلمان ان محکم اصول و سچے عقائد کی پیروی کے پابند رہیں گے۔ ذرائع کسب معاش اور دینی ترقی کے زینے ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔

الحاصل ہمارے نزدیک حفاظت اسلامیہ دو باتوں پر موقوف ہے۔ اوّل یہ کہ مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے کہ جو مذہب کی خدمت گزار ہو۔ عوام الناس کو احکام شریعت پہنچائے۔ دن رات تعلیم و ارشاد میں مشغول رہے۔ خدمت علوم دینیہ اور عبادت الٰہی میں اپنے آپ کو وقف کر دے۔ یہ جماعت، اسلام کا ستون ہے اور اس کے عدم و وجود پر اسلام کا عدم و وجود منحصر ہے۔ دوم یہ کہ ہمارے عوام جو کہ کسب معاش

تحصیل علوم مروجہ میں مصروف ہیں، وہ دین سے واقف ہوں۔ اگرچہ مسلمان یہ حال ہو۔ دنیا کی طلب اور علوم مروجہ کی ذہن ان کو فرائض حقوق مذہبی سے ناآشنا اور غافل نہ کردے۔ اگر یہ دونوں قسم ... ہو جائیں تو اسلام کا ضعف اور جو نقائص ہماری غفلت سے ... پائے جاتے ہیں، رفع ہو جائیں، قرون اولیٰ اور اس کے بعد قرون صالحہ کے بزرگوں کا یہی طریقہ تھا۔ سو بحمد اللہ تعالیٰ جمعیۃ الانصار نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ مسلمانوں کی دینی ضروریات اور اسلامی حاجات کی تکمیل ہو، مگر چونکہ ہندوستان میں تجربہ سے ہم کو یہ بات خوب ثابت ہو چکی ہے کہ عام مسلمانوں کے دل دنیا کی ظاہری بناوٹ سنگار پر فدا و شیدا ہیں اور ان کی آنکھیں نئی روشنی پر فریفتہ ہیں۔ اور دنیا کی ان تیز شعاعوں سے دین کے نورانی چہرے کو زخمی کر دیا ہے۔

آہ! ایسا تو کوئی شاذ و نادر ہی ملے گا، جس نے دین کو دنیا پر اختیار کیا ہو۔ لہٰذا اراکین جمعیۃ الانصار نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ دارالعلوم تعلیمی ترقیات میں کامیابی حاصل کرے، مگر اس کی قدیم وضع، اسلامی طرز، قاسمی شان، رشیدی انداز، بحال خود باقی رہیں۔ اس میں کسی ایسے امر کی آمیزش نہ ہونے پائے کہ علوم دینیہ خدانخواستہ مغلوب اور علوم مروجہ دنیویہ غالب ہو جائیں اور بقدر وسع یہ کوشش کی جائے کہ دارالعلوم کے طلبہ کے چہروں سے دینداری و تقویٰ شعاری ظاہر ہو، جو دارالعلوم کے امتیازات میں سے اولین امتیاز ہے۔

یہ جمعیۃ الانصار کے مقاصد کا اجمالی بیان ہے اور اگر جناب اس اجمالی تفصیل سے واقف ہونا چاہیں تو وہ مدرسہ کی سالانہ رودادوں اور مقاصد جمعیۃ الانصار و قواعد قاسم المعارف سنہ مطبوعہ میں موجود ہے جو کہ جناب کی خدمت میں پیش کئے گئے اور اگر زیادہ وضاحت کی ضرورت سمجھی جائے تو مولانا محمد حبیب اللہ صاحب ناظم جمعیۃ الانصار مفصل مشرح بیان فرما سکتے ہیں؛

سب سے بڑی مصیبت جو اسلام پر پڑی ہے اور سب سے بڑا حادثہ جس نے مسلمانوں کا ناس کر دیا ہے، وہ یہی علما کی خرابیاں ہیں جب دل بگڑا اور خراب ہو گیا تو جسم کیونکر سالم رہ سکتا ہے۔ ہم علم کو دین کے لیے طلب نہیں کرتے بلکہ دنیا کے لیے طلب کرتے ہیں، ہم علوم کو ہدایت و ارشاد وحق کا وسیلہ نہیں بناتے بلکہ دنیا کے حصول کا ذریعہ گردانتے ہیں، علما اگر دین پر استقامت اختیار کریں تو وہ دین کے ستون اور ہدایت کے ستارے ہیں اور اگر وہ گمراہی اختیار کریں تو وہ شیطان کے جال اور گمراہی کے نشان ہیں۔

بھائیوں کی ناعاقبت اندیشی، زمانے کی گردش، علم کی ذلت جہل کی عزت کا شکوہ کس سے کریں۔ ہائے اگر ہم علم کی قدر دانی کرتے اور اس کے پاکیزہ چہرے کو طمع و سوال کے غبار سے آلودہ نہ کرتے تو آج ہم سردار ہوتے۔ دنیا خود ہماری مطیع ہوتی۔ مگر افسوس کہ کیا کیجئے، ہم نے دین کو بدلا ہم خود بدل گئے اور ذلیل ہوئے۔ پاک ہے وہ ذات کہ تغیر پر قادر ہے اور خود تغیر سے منزہ ہے

کیا اچھا اور سچا کلام ہے، کسی عربی شاعر کا جس کا حاصل اردو نظم میں ہدیہ ناظرین ہے۔

گرگ طمع آز کر جب تک نہ دریا میں ہم
ہے مناسب علم کے زینے پہ بس چڑھ جائیں ہم
علم سیکھا، تاکہ مخدوم جہاں کہلائیں ہم
خوب گلچھرے اڑائیں، کھائیں اور غرائیں ہم۔
چاہیے تھا قوم کی خدمت گزاری کے لیے
علم حاصل کر کے قربان قوم پر ہو جائیں ہم
کیا شقاوت ہے کہ نخل علم سے عزت کے پھل
ہم نہ کھائیں، ڈوب جائیں، تشنہ لب کہلائیں ہم
اتباع جہل اسلم تھا ہمارے واسطے

(نقیب، (۹۰))

مصر کے مشہور عالم

حضرت السید الامام حکیم الاسلام السید محمد رشید رضا مصری

دارالعلوم دیوبند میں

۱۳۳۰ ہجری مطابق ۱۹۱۲ء میں مصر کے مشہور عالم علامہ سید رشید رضا مرحوم متحدہ ہندوستان تشریف لائے تھے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسۃ العلوم علی گڑھ (موجودہ مسلم یونیورسٹی) اور دارالعلوم دیوبند میں ملت تعارفی تقریبات ہوئیں۔ ان میں سے دارالعلوم دیوبند میں کی گئی عربی تقریر کا اردو ترجمہ ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں یہ تقریر آج بھی ہمارے لیے سنگ میل ہے

حضرات علمائے کرام! میں آپ کی اس حسن ضیافت اور مہمان نوازی اور عزت افزائی کا جو آپ نے میری کی ہے اور جو میری حیثیت سے بہت زیادہ ہے، صدق دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، نیز جو عظیم الشان اور گراں بہا خدمت آپ علم اور دین کی انجام دے رہے ہیں، اس کے لحاظ سے آپ میرے اور تمام مسلمانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ مجھے اس مدرسے کو دیکھ کر بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ حضرات علمائے کرام! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں مدرسے کو نہ دیکھتا تو میں ہندوستان سے نہایت غمگین جاتا۔ ہندوستان میں آکر اس مدرسے کی نسبت جو کچھ میں نے اب تک سنا تھا، اس سے بہت زیادہ پایا شیخ انور شاہ نے جو اصول میرے سامنے بیان کئے ہیں اور جو مسلک مشائخ کا مجھے بتلایا ہے، میں اس کو پسند کرتا ہوں اور اس سے متفق ہوں، میرا پہلے آنے سے پہلے یہ خیال کرتا تھا کہ دیوبند میں خاص فقہ حنفی کی تعلیم ہوتی ہے اور فقہ حنفی۔ اگر اس پر عمل کیا جاتے تو بلاشبہ کافی ووافی ہے، لیکن آپ نے بیان کیا کہ یہ مدرسہ ابھی اصلاح کا محتاج ہے اور یہ کہ یہاں کے اساتذہ اصلاح کی طرف مائل ہیں

حضرات! اس زمانے میں اصلاح طریقۂ تعلیم اور اشاعت اسلام مسلمانوں کی ضروریات میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ یہ ظاہر کر کے مجھے خوشی ہوئی کہ آپ اس کی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہیں اور اس کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائیے۔ مجھے نہایت تعجب ہوا کہ قدیم زمانے کا یونانی فلسفہ جو اب قدیم پارینہ ہو کر محض بیکار ہو گیا ہے اور کوئی کام دین اور دنیا کا اس سے متعلق نہیں، ہندوستان کے اسلامی مدارس میں اب تک کیوں پڑھایا جاتا ہے اور کیوں کر

... باتیں کیں یا ملاقات منسلک کیے جاتے ہیں، لیکن مجھ کو معلوم ہوا کہ ناظرت اہلِ سنت والجماعت کے مشیروں سے ہوتے ہیں۔ ان میں علما کے جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر امید ہے کہ یہ ضرورت محض رہی ہے اور جب یہ ضرورت زائل ہو جائے گی تو ہم اس کے فرائض سے سبکدوش ہو جائیں گے۔

حضرات! ارشاد و تلقین کے لیے (جو ہمارا دینی فرض ہے) ہم کو عوام کے سوال کا انتظار نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ عوام کا تو یہ حال ہے کہ وہ بسا اوقات طرح طرح کے مفاسد میں گرفتار ہیں۔ ان سے کیونکر توقع ہو سکتی ہے کہ وہ ہدایت اور تلقین حاصل کرنے کے لیے علما کی خدمت میں حاضر ہوں اور سوال کریں۔ اس لیے ہم میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خود حرکت کر کے اسلام کی ضروریات کو عوام الناس تک پہنچا دے۔ عام گزرگاہوں میں، شاہراہوں میں، میلوں، ٹھیلوں میں اور لہو و لعب کے مجمعوں میں اور جہاں جہاں اس قسم کے لوگ بکثرت ہوتے ہیں، جائیں اور گمراہوں کو احکامِ اسلام کی تلقین کریں۔ مجھے یہ معلوم ہو کر بہت تعجب ہوا کہ بعض مسلمان اسلام ترک کر کے عیسائی اور بت پرست ہو گئے ہیں۔ میرے نزدیک اسلام کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار کرنا نہایت تعجب انگیز امر ہے۔ جس کے قلب میں کچھ بھی اسلام کا اثر ہوگا، وہ ہرگز عیسائی یا بت پرست نہیں ہو سکتا۔ جہاں کہیں تھوڑا سا بھی نور موجود ہوگا، وہاں تاریکی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جس قلب میں کچھ بھی اسلام کا نور ہوگا وہاں کفر و بت پرستی کی تاریکی نہیں پہنچ سکتی۔ سید جمال الدین (افغانی) مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ مسلمان ہو کر نصرانی نہیں ہو سکتا، ہاں اگر کوئی محض نام کا مسلمان ہو اور اسلام سے اس کو کچھ لگاؤ نہ ہو یہ اور بات ہے۔ ایسے نام کے مسلمانوں کو دھوکا اور فریب دے کر طرح طرح کی ترغیبوں اور تحریصوں کے سامان مہیا کر کے ہوشیار مشنری پھانس لیتے ہیں۔ میں نے نہایت افسوس کے ساتھ سنا ہے کہ ہندوستان میں لاکھوں مسلمان ایسے ہیں جو بت پرستوں سے اپنے آپ کو صرف اس لیے ممتاز سمجھتے ہیں کہ وہ گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔ گائے کا گوشت کھانے کے سوا ان میں کوئی علامت اسلام کی موجود نہیں ہے۔

حضرات! نہایت افسوسناک امر ہے کہ غریب عام مسلمان بھیڑ بکریوں سے زیادہ مہمل چھوڑ دیے گئے ہیں۔ ہم میں سے کوئی شخص ان کی خبر ہی نہیں لیتا۔ اور ان کی حالت نہایت قابلِ رحم ہو رہی ہے۔ ان لوگوں کی ہدایت کا کون متکفل ہو سکتا ہے۔ آپ یا آپ جیسے علمائے کرام سے امید کی جاتی ہے کہ ایسے مسلمانوں کی ہدایت اور تلقین کے لیے کمربستہ ہوں گے۔ اور اس کے متعلق کوئی مستقل انتظام کریں گے۔

حضرات! آپ نے اپنی سادگی اور طلبہ کے زہد اور تقشف کا ذکر کیا ہے۔ مرشدوں اور ہادیوں کو جو دوسروں کے لیے قدوہ اور نمونہ ہوں بالضرور ایسا ہی ہونا چاہیے، مگر تمام مسلمان ایسے نہیں ہو سکتے۔ ہم نے خود بھی اپنے مدرسے میں اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے اور داخلہ کے قواعد میں فقیروں کے لڑکوں کو دولتمندوں کے صاحبزادوں پر ترجیح دی ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے: قل من حرم زينة الله التي اخرج لعباده والطيبات من الرزق قل هي للذين آمنوا في

---

[1] الحمد للہ کہ حضرات اکابر دیوبند حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہم اللہ کے ایک سچے علمی اور روحانی وارث حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں، علامہ مرحوم و مغفور کی یہ آرزو پوری ہوئی، تبلیغی جماعت کا نظام اسی نہج پر شروع ہوا اور الحمد للہ کہ پورے کرۂ ارض کو محیط ہو گیا۔

اللہ کریم جماعتوں کو منصور و مقبول فرمائیں اور ہمیشہ صحیح نہج پر کام کرنے کی توفیق ارزانی رکھیں۔

محمد عبدالستار ہوشیارپوری

الحیٰوۃ الدنیا خالصۃ یوم القیامۃ اور نیز فرمایا: واللہ فضّل بعضکم علٰی بعض فی الرزق فما الّذین فضّلوا برادّی رزقہم علٰی ما ملکت ایمانہم فہم فیہ سواءٌ

غرضکہ اسلام میں دولت کے لیے بھی کرامت و اجر و مرتبہ ہے۔ اگر وُہ جائز ذرائع سے حاصل کی جاوے، اور صحیح مصارف میں خرچ کی جائے۔ اور فقر کیلیے بھی کرامت و اجر و مرتبہ ہے اگر اس کے ساتھ استغناء و اہلیت ہو۔

حضرات! اشاعت اسلام کے اس وقت دو حصّے ہیں۔ ایک اسلام کے احکام و ہدایات کا عام مسلمانوں تک پہنچانا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات اس کی اہمیّت سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ میں نے قاہرہ کے بازاروں اور قہوہ خانوں میں بذاتِ خود جا کر اس کا تجربہ کیا ہے میں اکثر قہوہ خانوں میں دجہاں زیادہ تر رند اور اوباش لوگ جمع ہوتے ہیں۔ جایا کرتا تھا اور لوگوں کو جمع کر کے ان کی سمجھ کے موافق احکام اسلام سُنایا کرتا تھا۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر اس طریقے پر عمل کیا گیا تو اسلام کو بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

دُوسرا حصہ اسلام کی اشاعت کا فروں اور بُت پرستوں کے درمیان ہے۔ ہندُوستان میں صدہا قسم کے بُت پرست ہیں اور یہاں توپوں کے پوجنے والے، درختوں اور پتھروں کے پوجنے والے۔ چاند سُورج اور ستاروں اور بہت لغویات اور خرافات کے پوجنے والے موجُود ہیں۔ پس اگر ہمارے پاس دُعاۃ اور مبلغین کی ایک مضبُوط جماعت موجُود ہو تو ان لوگوں میں اسلام کی اشاعت اس قدر سُرعت کے ساتھ ہو سکتی ہے جو اس وقت ہمارے خیال میں بھی نہیں آسکتی، اور ہم کو عیسائیوں سے بہت زیادہ کامیابی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص بات اور ہے، جو ہر ایک دُور اندیش مسلمان کی توجہ کے لائق ہے اور وُہ یہ ہے کہ ہندُوستان میں مسلمانوں کی تعداد بمقابلہ بت پرستوں کے اس قدر قلیل ہے کہ ان کی ہستی کو اس ملک میں ہمیشہ معرضِ خطر میں سمجھنا چاہیے۔ انگریزی حکومت نے بُت پرستوں اور مسلمانوں کے درمیان موازنہ قائم کر رکھا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ موازنہ کبھی وقت اُٹھ جائے تو آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ کیا نتیجہ ہوگا۔ غالبًا مُسلمانوں کا وُہی حشر ہوگا، جو ان کا اندلس میں ہوا تھا۔ ایک جماعت ہم میں ایسی بھی ہونی چاہیے، جو ان شُبہات کو رفع کرے، جو اسلام پر کیے جاتے ہیں۔ اور خصُوصًا وُہ شُبہات جو موجُودہ زمانے کے علوم و فنون کی بناء پر کیے جاتے ہیں۔ مگر ایسے شُبہات کا رفع کرنا بغیر فلسفۂ جدید کی واقفیت کے ناممکن ہے۔ اس لیے ضروری یہ ہے کہ اس جماعت کے اشخاص فلسفہ جدید کے اہم مسائل سے واقفیت رکھتے ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اس فلسفہ کو شروع کیا ہے اور جدید فلسفہ کی ابتدائی کتاب اَلْنقش فی الحجر کو درس میں داخل کیا ہے۔ میرے نزدیک کتاب ناکافی ہے اور میں آپ کو ایسی کتابیں بتلاؤں گا۔ جو اس سے زیادہ مفید ہوں گی۔ غالبًا اس اَمر میں آپ میرے ساتھ متفق ہوں گے کہ ہمارا طریقۂ تعلیم محتاج اصلاح ہے۔ طالب علموں کا بہت سا وقت تراجم و شرح و حواشی کے مطالعے اور لفظی بحثوں میں غارت ہو جاتا ہے اور جو اصل مقصُد ہے، وُہ فوت ہو جاتا ہے، موجودہ طریقے کے مطابق اوّل عربی زبان کی صرف و نحو پڑھائی جاتی ہے۔ حالانکہ طالب علم اس چیز سے ناواقف ہوتا ہے، جس کے اصُول و قواعد کی اس کو تعلیم دی جارہی ہے۔ صحیح اور طبعی طریقہ یہ ہے کہ قواعد سے پیشتر معروض سے واقفیت ہو۔ بچہ کس قدر جلد اپنے ماں باپ کی زبان سیکھ لیتا ہے۔ بعض یورپین علاوہ علوم و فنون کے متعدد مشرقی زبانیں حاصل کر لیتے ہیں۔ حالانکہ بوجہ تُبعد و اجنبیت یہ اَمر ان کے لیے ہماری نسبت زیادہ مشکل ہے۔ طریقۂ تعلیم کے ناقص ہونے کے علاوہ بعض درسی کتابیں بھی ناقص ہیں، جن میں بے حد ایجاز و اختصار سے کام لیا گیا ہے

حضرات! مجھے افسوس ہے کہ میں نے ہندُوستان میں علم کا اتنی

دینیہ دکھ دیا کہ مصر سے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں کوئی ضعف موجود ہیں۔ جامعہ ازہر میں دو مدرسہ کا یہ مدرسہ ہے۔ بارہ ہزار طالب علم تعلیم پا رہے ہیں جن میں اکثر مصری ہیں اور تین ہزار غیر مصری۔ اس کے اوقاف کی سالانہ آمدنی ہے۔ ازہر کے علاوہ دسوق، دمیاط اور زقازیق میں بڑے بڑے مدرسے ہیں۔ مگر طریقہ تعلیم ہندوستان کی طرح مصر میں بھی ناقص ہے۔ وہاں بھی متقدمین کا طریقہ تعلیم چھوڑ کر متاخرین کا طریقہ تعلیم اختیار کیا گیا ہے۔

حضرت الاستاذ الامام شیخ محمد عبدہ رحمۃ اللہ علیہ نے ازہر کے طریقہ تعلیم کی اصلاح میں بہت کوشش کی، مگر ان کو کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ازہر کی طرف سے مایوس ہو کر انہوں نے گورنمنٹ مصر سے ایک اور مدرسہ جاری کرایا، جس کا نام مدرسۃ القضاء الشرعی ہے۔ یہ مدرسہ بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اور تھوڑی مدت میں زیادہ علوم کی تعلیم بغیر اس کے کہ طلبہ کی استعداد اور قابلیت میں کچھ کمی ہو، وہاں ہو جاتی ہے۔

حضرات! ہم دیکھتے ہیں کہ تحصیل علوم میں ہماری ہمتیں بہت پست ہو گئی ہیں۔ گزشتہ زمانے میں جب کہ ریل اور دخانی جہاز موجود نہ تھے، طلبا اندلس سے تحصیل علوم کے لیے بخارا تک جاتے تھے اور جو عمدہ کتاب مشرق میں تصنیف ہوتی تھی، بہت تھوڑے زمانے میں اس کی نقلیں مغرب میں شائع ہو جاتی تھیں، مگر ہماری موجودہ پست ہمتی ہمارے علمی افلاس اور تباہی کا باعث ہو رہی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اہل ایمان کی جو صفات بیان فرمائی ہیں، افسوس ہم پر غیر منطبق ہیں۔ مثلاً

لن يجعل الله للكافرين على المؤمنين
سبيلا ولكن العزة لله ولرسوله
وللمؤمنين وعد الله الذين آمنوا منكم
وعملوا الصالحات ليستخلفنهم في الأرض
كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن
لهم دينهم الذي ارتضى لهم و
ليبدلنهم من بعد خوفهم أمنا

آپ کو غور کرنا چاہیے کہ جو صفات مومنین کی بیان فرمائی ہیں، کیا ہم ان صفات کے ساتھ متصف ہیں؟ کیا خدا نے ہماری حالت تبدیل کی ہے؟ باوجودیکہ ہم سے اس کا وعدہ ہے۔ خدا نے ہرگز ایسا نہیں کیا، بلکہ یہ خود ہماری کرتوت کا نتیجہ ہے۔ وما اصابكم من مصيبة فبما كسبت ايديكم ويعفوا عن كثير۔ مصر میں بھی مسلمانوں کی یہی حالت ہے، جو آپ ہندوستان میں دیکھ رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم لوگ متفق ہو کر اپنے اس علمی افلاس کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ آپ ہماری تجاویز سے واقف ہوں اور ہم آپ کے قیمتی مشوروں سے فائدہ اٹھائیں۔

حضرات! اصلاح طریقہ تعلیم کے متعلق جو خیالات میں نے آپ کے سنے ہیں، میں ان کو نیک بشارت خیال کرتا ہوں۔ ہم کو امید رکھنی چاہیے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ حق غالب ہو کر رہے گا اور باطل مغلوب ہوگا۔ قل جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا۔ بل نقذف بالحق على الباطل وكان حقا علينا نصر المؤمنين۔

حضرات! آپ نے بیان کیا ہے کہ ہماری جماعت ایک ضعیف جماعت ہے۔ میں اس مسئلے میں آپ سے اختلاف کرتا ہوں، مگر یہ اختلاف ایسا نہیں ہے جس میں ہم کو یا آپ کو مزید جرح و قدح یا تائید و تردید کی ضرورت پیش آئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ہرگز ضعیف نہیں ہیں۔ آپ کے پاس ایسی زبردست قوت موجود ہے جو دنیا کی تمام قوتوں سے بڑھ کر ہے۔ بلاشبہ قوت ایمان اور قوت اسلام ایسی قوت ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوت نہیں کر سکتی۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی جماعت کس قدر ضعیف تھی، مگر دنیا میں کس قدر عظیم الشان اصلاح اس ضعیف جماعت سے ظہور میں آئی تھی۔ یہ جماعت صرف قوت حق اور قوت ایمان سے دنیا

بر غالب ہوتی تھی۔ ہمارے طالب علم بھی ضعیف نہیں ہیں۔ مگر ہم کو ان میں حق کی روح پھونکنا چاہیئے۔

مسجد اور مدارس کی ایک بڑی مصیبت یہ بھی ہے کہ اب ہمارے ہاں قرآن مجید کی تفسیر کی تعلیم صرف و نحو، اور معانی بیان کی تعلیم رہ گئی ہے۔ حالانکہ تفسیر کی تعلیم اس حیثیت سے ہونی چاہیئے کہ وہ روح خداوندی اور مخلوق کے لیے ہدایت ہے۔

میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ علماء مسلمانوں کے تمام طبقوں کے پیشرو ہوں اور یہ نہیں ہو سکتا، جب تک کہ ان کے اخلاق قرآن مجید سے ماخوذ نہ ہوں۔ اس لیے میرے نزدیک نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی تعلیم کے ساتھ سیرت نبوی اور سیرت خلفائے راشدین کی تعلیم بھی دی جائے۔

بزم و رزم

سیل کی طرح جو نکلے تھے بیابانوں سے
آب جو بن گئے گزرے جو خیابانوں سے
تھا جو اپنوں سے وہی لطف تھا بیگانوں سے
گردنیں دب گئیں اسلام کے احسانوں سے

(مولانا ظفر علی خان مرحوم)

بقیہ طبقات ابنائے دارالعلوم دیوبند

۵ —— سید امین گیلانی (شیخوپوری)، بالواسطہ
۶ —— علامہ اقبال سہیل
۷ —— ریاست علی ظفر بجنوری
۸ —— مولانا محمد مرتضیٰ خان سرحدی
۹ —— خواجہ عزیز الحسن مجذوب
۱۰ —— ذاکر حرم حمید صدیقی
۱۱ —— مرزا غلام نبی جانباز
۱۲ —— سائیں محمد حیات پسروری

اکابر دارالعلوم سے متاثر حضرات

۱ —— مورخ اسلام حضرت علامہ سید سلیمان ندوی خلیفہ از حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
۲ —— امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، متاثر از حضرت شیخ الہند رح
۳ —— حکیم اجمل خان طبیب اعظم ہندوستان 〃 〃
۴ —— ڈاکٹر انصاری مرحوم دہلی 〃 〃 〃
۵ —— ڈاکٹر ذاکر حسین جامعی 〃 〃 〃
۶ —— مولانا محمد علی جوہر مرحوم 〃 〃 〃
۷ —— علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم (متاثر از حضرۃ علامہ سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ
۸ —— مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (از حضرت رائپوری)
۹ —— چودھری افضل حق (از حضرت امیر شریعت)
۱۰ —— آغا شورش کاشمیری مرحوم 〃 〃 〃 〃

علامہ سید رشید رضا شاہ مصر کے مشہور فاضل تھے، علامہ سید جمال الدین افغانی کے شاگرد خاص مفتی عبدہ کے تلمیذ رشید اور جانشین سمجھے جاتے تھے، مشہور ماہنامہ مجلۃ المنار کے مالک و مدیر تھے ۱۵ اپریل ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ تھا۔ ارکان ندوۃ العلما نے علامہ رشید رضا کو اس کی صدارت کے لیے دعوت دی، چنانچہ وہ تشریف لائے اور جلسے کی صدارت سے ۱۹ اپریل ۱۹۱۲ کو فارغ ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند عالم اسلام کی ایک مشہور مرکزی دینی درسگاہ ہے۔ اس کی علمی شہرت کی بناء پر علامہ مرحوم کا خود بھی شوق تھا کہ اس معہد علمی کی زیارت سے مشرف ہوں اور دارالعلوم کے خیر خواہ حضرات مثلاً حاذق الملک حکیم محمد اجمل خان مرحوم وغیرہ نے بھی توجہ دلائی، چنانچہ علامہ موصوف ۱۵ اپریل ۱۹۱۲ء مطابق ۲۷ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کی صبح ۰ بجے کی گاڑی سے دیوبند تشریف لے آئے۔ آپ کا استقبال مناسب شان نہایت سادگی سے کیا گیا، لوازم مہمان داری میں وہی سادگی اور بے تکلفی ملحوظ رہی جو اسلام کا شعار اور دیوبند کا قدیم طرز ہے۔ آپ پر اس سادگی کا گہرا اثر پڑا، علم کے آثار دیکھ کر آپ بے حد محظوظ ہوئے۔ بعد نماز ظہر درسگاہ کلاں میں ایک جلسہ کیا گیا جس میں سب سے اول مدرسے کی جانب سے ایک عربی تحریر میں آپ کا خیر مقدم اور شکریہ ادا کرنے کے بعد مدرسہ اور اس کے اصول اور طرز عمل و مقاصد بیان کیے گئے۔ اس کے بعد حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری مدرس دارالعلوم نے عربی میں مبسوط اور نہایت فصیح و بلیغ برجستہ تقریر تقریباً ایک گھنٹے تک فرمائی۔ جس میں علامہ موصوف کا شکریہ ادا کرنے کے بعد بزرگان مدرسہ کا طرز عمل اور مسائل مختلفہ میں ان کے طریق تحقیق کو مشرح و مبسوط بیان فرمایا، اس درمیان میں اپنی وہ نظم بھی سنائی، جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں تحریر فرمائی تھی۔ یہ وہ باتیں تھیں جن سے علامہ موصوف پر اس مدرسے کی علمی شان و امتیاز صاف واضح ظاہر ہوگئی۔ پھر علامہ موصوف نے اپنی تقریر میں مدرسے کی حالت پر اطمینان و مسرت ظاہر فرماتے ہوئے بہت سی مفید و نافع باتیں بھی بیان فرمائیں، علامہ موصوف مدرسہ میں بارہ گھنٹے کے قیام کے بعد شام کو دیوبند سے سیدھے بمبئی تشریف لے گئے، بمبئی پہنچ کر آپ نے محترم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کی خدمت میں ایک خط ارسال فرمایا

و محبت سے لبریز اور آپ کے قلبی میلان کا مظہر تھا۔

(خلاصہ از روداد مدرسہ اسلامیہ دیوبند بابت ۱۳۳۰ھ)

اس زمانے میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرسے کے مدرس و شیخ الحدیث اور استاذ الکل تھے، مولانا حافظ محمد احمد صاحب مدرسے کے مہتمم تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ مدرسہ کے مہتمم تھے، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مدرسے کے مفتی تھے اور مولانا غلام رسول صاحبؒ ہزاروی، مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ، مولانا محمد سہول صاحبؒ بہاری، مولانا شبیر احمد صاحبؒ عثمانی، مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری، مولانا اعزاز علی صاحبؒ اور مولانا سید میاں اصغر حسین صاحبؒ مدرسہ کے ممتاز مدرسین تھے اور یہ سب حضرات اس جلسے میں تشریف فرما تھے، حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ کشمیری کی یہ عربی تقریر جو ایک ایسے اہم جلسے اور اہل علم کی مجلس میں کی گئی تھی۔ ایک یادگار علمی تقریر ہے۔ اس لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ علماء اور طلباء تک اس دور میں بھی یہ تقریر شائع کر کے پہنچائی جائے، تاکہ ان کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ حضرات اساتذۂ دیوبند رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں درس حدیث اور تطبیق روایات کا کیا طریق کار رہا اور اس سے اندازہ ہو جائے گا، کہ ان حضرات کے ہاں کس قدر توسط اعتدال تھا۔ امید ہے کہ اہل علم اس کی قدر کریں گے اور اس کی روشنی میں کتب احادیث کی تعلیم و تدریس کی خدمات سرانجام دیتے رہیں گے۔

اگرچہ اہل علم خود اس عربی تقریر سے استفادہ کر سکتے ہیں، اور ترجمے میں وہ لطف نہیں ہوتا، جو بلا واسطہ عربی سے حاصل ہو سکتا ہے، لیکن بعض احباب کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ خود عربی نہیں جانتے، ان کو بھی حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان فیوضات سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔ اگرچہ ترجمہ کے واسطے ہو، ان کو بھی استفادے کا موقع دینا چاہیے، اس لیے ہم اصل عربی تقریر کے ساتھ ساتھ اس کا اردو ترجمہ بھی پیش کر رہے ہیں، ہم نے کوشش کی ہے کہ محض لفظی ترجمہ نہ ہو، بلکہ اصل مقصود ذہن نشین کرنے کے لیے آزاد ترجمہ کیا جائے۔ امید ہے کہ عام اردو خواں مسلمانوں کو بھی اس سے بہت فائدہ پہنچے گا اور وہ حضرات اساتذۂ دیوبند رحمہم اللہ تعالیٰ کی فقاہت، ذہن ثاقب، فہم سلیم، رسوخ فی العلم توسط اعتدال کی روش معلوم کریں گے اور قلوب میں ان کی عظمت اور ان کے ساتھ محبت اور بڑھ جائے گی۔

والسلام

خاکپائے اکابر علماء دیوبند رحمہم اللہ تعالیٰ

احقر سید میاں الدین

کاکاخیل عفی عنہ

تقریر عربی

حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد: آپ

ـلني يتقدم الخويدم في الحضرة السامية
تحية الإسلام حياكم الله تعالى أتانا
ـسنا منكم مخائل الكرم والاعتناء
بحالنا وأحسسنا بهمة إسلامية عطفت
بكم وعلينا وأنا أحوج إليكم منكم
إلينا هؤلاء أساتذتي وأكابري وذخائري
عند الله في يومي وغدي أمروني بأن أشـ
ـكركم شكرا على إسداء الخير وتشريفكم
إيانا بأنفسكم المبارك أحسن الله إليكم
وإلينا ورفع درجاتكم في الدين والدنيا
والآخرة آمين وبه نستعين.

مولانا إن حديثنا حديث ذو شجون
والشيء بالشيء يذكر إن بلادنا
هذه على شقة بعيدة ومسافة
شاسعة من بلاد الإسلام كالعراق والشام
ومصر فكانت شعائر الإسلام فيها
على وهى ومنائر العلم على خفاء إلا ما شاء الله
ومن شاء وقليل ما هم وإن عصابتنا
هذه عصابة على ـــــ طريقة قديمة
ليست بحديثة إسنادنا في الدين
متصل بالصدر الكبير والبدر المنير
والإمام الشهير الشيخ الأجل ولي الله
بن عبد الرحيم الفاروقي الدهلوي وحال
الشيخ أظهر من أن يذكر فقد شرقت
تصانيفه وغربت لكن بعض أحوال الشيخ

حضرات کا ایک ادنیٰ خادم آپ کی خدمت عالیہ میں اسلامی طریقے
کے مطابق ہدیۂ سلام مسنون پیش کرتا ہے۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
ہم نے یہ دیکھا کہ آپ میں شرافت و کرامت کی علامات موجود ہیں
اور اس وقت آپ ہماری حالت کی طرف توجہ فرما رہے ہیں ہم نے
محسوس کیا ہے کہ اسلامی محبت و رفاقت کا ذوق آپ کی طرف
اور ہماری طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ اس وقت جس قدر ہم آپ کی طرف
مشتاق اور ضرورت مند ہیں آپ کا احتیاج اس قدر ہماری طرف نہیں
یہ حضرات میرے اساتذہ کرام اور میرے اکابر ہیں اور یہی حضرات
دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں میرے لیے
ذخیرہ ہیں۔ ان حضرات اساتذہ کرام نے مجھے حکم دیا ہے اور میں اس
حکم کی تعمیل کر رہا ہوں کہ میں آپ کے سامنے کھڑا ہو کر اس بات پر
آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے شوق و رغبت سے تشریف لا کر
خیر و برکت، خلوص اور علمی قدردانی کا مظاہرہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ
آپ سے اور ہم سے بھلا کرے اور آپ کے دینی درجات کو دنیا
میں بھی اور آخرت میں بھی بلند فرمائے۔ آمین۔ ہم صرف اللہ ہی
سے امداد حاصل کرتے ہیں

حضرت مولانا! ہمارا قصہ بھی عجیب قصہ ہے، اور بات سے
بات نکلتی جاتی ہے، ہمارا یہ ملک ہندوستان بلاد اسلامیہ یعنی
عراق، مصر، شام وغیرہ سے بہت دور کی مسافت پر واقع ہے تو
اس دوری کی وجہ سے لازماً اسلام کے شعائر اس ملک میں کمزور حالت
میں تھے اور علم دین کی نشانیاں مدھم تھیں۔ (الا ماشاء اللہ)
ہماری یہ جماعت (جو جماعت دیوبند کہلاتی ہے) علما کی ایک ایسی
جماعت ہے جو قدیم طریقہ پر کاربند ہے۔ کوئی نئی قسم کی جماعت
نہیں، دین اور دینی مسائل میں ہمارا اسناد صدر کبیر، بدر منیر
امام شہیر شیخ اجل شاہ ولی اللہ ——— بن شاہ عبدالرحیم

يحتاج الى اخبار شفاهية وواقعات تلقيتها من مشائخنا كان من امر الشيخ رحمه الله انه اتقن العلوم الدينية ومبادئها اولا على والده العلام الشيخ الهمام عبدالرحيم ثم رحل الى الحرمين زادهما الله شرفا وتكريما واستفاد من علمائهما وفقهائهما ولازم الشيخ ابا طاهر الكردي في الحديث واجتهد فيه حتى صار الطرد والعكس في الباب وكان الشيخ ابو طاهر يقول تلقن الفاظ منا وتلقنا المعنى منه يريد بذلك تبين ملاحظ الحديث وتعين مراد الشارع ثم رجع الشيخ ولي الله الى بلاده واشتغل باصلاح ما افسد الناس من سنة النبي الكريم صلى الله عليه وسلم وكان الله اودع في صدره نورا ينظر به عواقب الامور فتفرس انه ستقوم الحرب بين الحق والباطل فاستعد رحمه الله للدفاع عن الدين والذب عنه فما اعد لذلك ان ترجم القرآن العزيز باللسان الفارسية سماه فتح الرحمن جرده عن الاسرائيليات باسرها اراد بذلك تمهيد التوحيد ثم شرح الموطا وسماه المسوى على طريقة فقها الحديث مع تحقيق المناط

فاروقی دہلوی رحمۃ اللہ کے ساتھ متصل و مربوط ہے اور شاہ ولی اللہ کے حالات و سوانح اس قدر مشہور اور واضح ہیں کہ اس وقت ان کے ذکر کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ ان کی تصانیف مشرق و مغرب میں دنیائے اسلام کے ہر گوشے میں اور ہر جانب پھیل چکی ہیں اور حضرت شاہ صاحبؒ کے بعض احوال و سوانح ایسے بھی ہیں کہ زبانی طور سے ہی ان کے بیان کرنے کی ضرورت ہے اور کچھ ایسے ضروری احوال بھی ہیں کہ جن کو ہم نے اپنے اساتذہ اور شیوخ سے حاصل کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے علوم دینیہ اور ان کے مبادی پہلے اپنے والد ماجد شاہ عبدالرحیم سے حاصل کئے ہیں، پھر آپ نے حرمین زادہما اللہ تشریفاً و تکریماً کی طرف حج و زیارت اور استفادۂ علمی کے لیے سفر کیا اور وہاں جا کر آپ نے وہاں کے علماء اور فقہاء سے علمی استفادہ فرمایا اور شیخ ابوطاہر کردیؒ کے ہاں تو خاص طور سے رہے اور ان سے حدیث پڑھی اور اس نے اخذ و استفادہ میں آپ نے خوب کوشش فرمائی۔ شیخ ابوطاہر فرمایا کرتے تھے کہ وہ (حضرت شاہ ولی اللہ) الفاظ حدیث تو مجھ سے سیکھا کرتے تھے، لیکن الفاظ حدیث کے معانی و مطالب میں اُن سے سیکھا کرتا تھا۔ دراصل ان کا مطلب یہ تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اپنی فقاہت و ذہانت کی بنا پر حدیث کے مطالب کی تبیین اور مراد شارع کی تعیین نہایت عمدہ و دلنشین طریقے سے کیا کرتے تھے۔ پھر دو سال وہاں رہنے کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ وہاں سے اپنے ملک ہندوستان کی طرف لوٹ کر آئے اور اس زمانے میں لوگوں نے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جتنا کچھ بگاڑ دیا تھا اس کی اصلاح اور درستگی میں سراسر مشغول ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کے سینۂ مبارک میں ایسی روحانی روشنی ودیعت فرمائی تھی جس کی وجہ سے وہ امور کے عواقب اور انجام کو دیکھ لیا کرتے تھے، چنانچہ فراست

وتنقيحه وتخريجه اريد بذلك ما اصطلح
عليه علماء الاصول فتحقيق المناط ان
يصدر حكم من الشارع في صورة
جزئية ثم يثبت ويحقق ذالك في
سائر الجزئيات من نوع تلك الصورة
مثاله تقويم جزاء الصيد فتعرف القيمة
في جزئي هو تحقيق المناط وليس ذلك
قياس فلذا يشترك فيه الخاص والعام
ولا يحتاج الى الاجتهاد وتنقيح المناط
ان يصدر حكم من الشارع في صورة
قد اجتمعت هناك امور واتفقت وبعض
تلك الامور مناط ذلك الحكم وبعضها
لا دخل لها فيه فتعرف الامر الذي هو
علة تنقيح المناط مثاله ما في الحديث عن
ابي هريرة قال اتى رجل النبي صلى
الله عليه وسلم فقال هلكت قال ما شانك
قال وقعت على امراتي في رمضان قال
فهل تجد ما تعتق رقبة قال لا قال فهل
تستطيع ان تصوم شهرين متتابعين قال لا قال
فهل تستطيع ان تطعم ستين مسكينا
قال لا الحديث فنقح ابوحنيفة والشافعي مناط
وجوب الكفارة كون ذلك الفعل مفطرا كان
جماعا كما في هذه الصورة او اكلا او شربا
بعد ان يكون عمدا فكونه جماعا في
هذه الواقعة امر اتفاقي كسائر الاتفاقيات

اپیل سے انھوں نے اس وقت یہ محسوس کیا کہ عنقریب حق و باطل کے درمیان ایک عظیم الشان لڑائی شروع ہونے والی ہے تو آپ نے دین کی مدافعت و حمایت کی غرض سے اس آنے والی لڑائی کے لیے وسیع پیمانے پر تیاریاں شروع فرمائیں۔ اس تیاری کے سلسلے میں سب سے پہلا کام تو آپ نے یہ کیا کہ آپ نے فتح الرحمن کے نام سے فارسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور اس ترجمے کو اسرائیلی روایات سے بالکل پاک رکھا اور مقصد یہ تھا کہ اس طرح سے توحید کے لیے رستہ ہموار ہو جائے پھر موطا امام مالک کی شرح فارسی زبان میں المسوّیٰ کے نام سے لکھی۔ اس میں انھوں نے فقہا سے محدثین کے طریقے پر احادیث و آثار کی تشریح فرمائی اور اس کے ساتھ ساتھ تحقیق مناط، تنقیح مناط اور تخریج مناط کی طرف بھی اس کتاب میں توجہ فرمائی۔ اس سے مراد وہ ہے، جو علماء اصولِ فقہ کی اصطلاح ہے۔

تحقیق مناط تو یہ ہے کہ شارع علیہ السلام سے ایک جزئی صورت میں کوئی حکم صادر ہو جاتا ہے پھر یہ حکم اس صورت کے نوع کے سارے جزئیات میں ثابت اور محقق کر دیا جائے۔ مثلاً جو لینے صید میں شکار کی قیمت لگا دینا، کسی جزئی میں قیمت کا معلوم کرنا تحقیق مناط ہے۔ یہ تحقیق مناط قیاس نہیں اور اس لیے اس میں خاص و عام سب شریک ہو سکتے ہیں اور اس میں اجتہاد کی طرف کوئی حاجت پیش نہیں آتی اور تنقیح مناط یہ ہے کہ کسی صورت میں شارع کی طرف سے ایک حکم صادر ہو جائے اور اس صورت میں بہت سے امور جمع ہوئے ہوں۔ ان میں سے بعض امور میں تو یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اس حکم مذکور کے لیے مناط یعنی علت بن جائیں اور بعض امور کو مدارِ حکم بننے میں کسی قسم کا دخل نہیں ہوتا تو ان امور کثیرہ میں سے یہ پہچاننا کہ مناطِ حکم اور علتِ حکم ان میں کون سا ہے اور اسے متعین کرنا یہ تنقیح مناط ہے۔ اس کی مثال حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ روایت ہے کہ ایک شخص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا

وذهب احمد الى ان المناط هو كونه جماعا فلا يعدى الحكم الى الاكل والشرب واحتج بحديث اخر عن ابى هريرة ايضا قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من افطر يوما من رمضان فى غير رخصة رخصها الله لم يقض عنه صيام الدهر حمله على الاكل والشرب عامدا وقال لا يقضى عنه صيام الدهر وتخريج المناط ان يصدر حكم من الشارع فى صورة تجتمع هناك امور يصلح كل منها للعلية فيرجح المجتهد امرا من بين تلك الامور للعلية ويجعله مناطا مثاله حديث النهى عن الربو فى الاشياء الستة اجتمع هناك امور القدور الجنسية والطعم والثمنية والاقتيات والادخار فذهب ابو حنيفة الى ان مناط الحكم هو الوصف الاول والشافعى الى انه الثانى ومالك الى انه الثالث على ما ادى اليه اجتهادهم فالفرق بين تنقيح المناط وتخريجه ان فى الاول اجتمعت امور لا دخل لها مع المناط فنقح المجتهد المناط وفى الثانى اجتمعت امور كل منها صالح لان يكون مناطا فرجح المجتهد احدها لان يكون مناطا وتنقيح المناط وتخريجه وظيفة المجتهد يزاحم فيه بعضهم بعضا ومن الامثلة فيه ايضا حديث مفتاح الصلوة الطهور وتحريمها التكبير وتحليلها التسليم فذهب اكثر

اور عرض کی یا رسول اللہ! میں تباہ و برباد ہو گیا۔ آپ نے فرمایا بتاؤ کیا بات پیش آئی، اس نے کہا کہ رمضان شریف کے مہینے میں روزے کی حالت میں میں نے اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کی ہے، تو آپ نے فرمایا: کیا تیرے بس میں ہے کہ ایک غلام آزاد کر دے، اس نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا یہ کر سکتے ہو کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔ اس نے کہا کہ نہیں، آپ نے فرمایا کہ کیا یہ کر سکتے ہو کہ متواتر دو مہینے کے روزے رکھ سکتے ہو، اس نے کہا کہ نہیں۔ تو امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے ہاں وجوب کفارہ کے حکم کے لیے مناط اور علت رمضان شریف میں روزے کی حالت میں قصداً روزہ افطار کرنا ہے، خواہ وہ مخصوص فعل جماع ہو جیسا کہ مندرجہ بالا واقعہ پیش آیا تھا، یا کھانا ہو یا پینا ہو، بشرطیکہ یہ فعل عمداً کیا جائے اور رمضان شریف کے مہینے میں کیا جائے اور یہ بات کہ اس واقعہ خاص میں وہ عمل جماع کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ محض ایک امر اتفاقی ہے اور امام احمدؒ کے ہاں وجوب کفارہ کے لیے مناط اور علت اس فعل کا خاص کر بصورت جماع ہونا ہے۔ لہذا جماع کی صورت میں اگر افطار ہوا ہو تو کفارہ ہوگا، لیکن کھانے اور پینے تک کفارہ کے اس حکم کو متعدی نہیں کر سکتے اور وہ دلیل میں حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک اور حدیث پیش فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی شخص رمضان شریف میں کسی رخصت شرعی کے بغیر روزہ توڑ دے تو خواہ بعد میں وہ عمر بھر بھی روزہ رکھے تو وہ کمی نہ پوری ہو سکے گی، وہ حدیث میں لفظ افطار سے کھانے پینے کے ذریعے سے عمداً روزہ توڑنا مراد لیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ اگر قصداً کھا پی کر روزہ توڑا جائے تو پھر عمر بھر کے لیے بھی روزہ رکھنا اس کے لیے کافی نہ ہو سکے گا، لہذا اس کے لیے کفارہ نہیں ہوتا اور تخریج مناط یہ ہے کہ شارع سے کوئی حکم کسی ایسی صورت کا صادر ہو جاتا ہے، جس صورت میں بہت سے ایسے امور جمع ہوتے ہوں کہ ان میں سے ہر ایک میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ علت حکم

لو نسبة الى ركنية صيغة التكبير والتسليم
وخرج ابوحنيفة المناط في كون الاول
ذكرا مشعرا بالتعظيم وكون الثاني خروجا
بصنع المصلي فقال بفرضية هذين لكن
ثبتت مواظبة النبي صلى الله عليه وسلم على
صيغة التكبير وصيغة التسليم فليكونا
واجبين. وقد التزم الشيخ ابن الهمام وجوب
صيغة التكبير والمشهور انه سنة وقد
تحقق فيها الذكر المشعر بالتعظيم والخروج
بصنع المصلي كتحقق الكلي في الجزئي فليكونا
فرضين وعلى هذا القياس امثلة كثيرة
فهذا ما ادعاه الشيخ رحمه الله في شرح الموطا
واختار فيه ايضا فقها جامعا وقد حقق الشيخ
ايضا في كتاب الانصاف في بيان سبب الاختلاف
وعقد الجيد في مسائل الاجتهاد والتقليد
ان الحق في موضع الاجتهاد متعدد وحكاه
عن الائمة الاربعة واقتضاه واريد بموضع
الاجتهاد ان لا يكون هناك متعدد واذا كان
هناك قاطع فليس بموضع اجتهاد والحق هناك
واحد وهو الموافق لذلك القاطع فمن وافقه
وافق الحق ومن خالفه خالف الحق وصنف
الشيخ في حكم التشريع والعقائد الحقة تصانيف
صارت لكل آت نبراسا ومقياسا منها
حجة الله البالغة والتفهيمات الالهية والخير الكثير
وغير ذلك ثم تبعه على ذلك اولاده واحفاده فمن

پر مختلف ہے کہ مجتہد اپنی قوت اجتہاد و استنباط کے ذریعہ ان امور میں
سے کسی ایک امر کو حکم کے لیے علت قرار دینے کے لیے راجح کر دیتا ہے
اور اسی کو مناطِ حکم ٹھہرا دیتا ہے۔ اس کی مثال وہ حدیث ہے جس میں
مذکورہ چھ اشیاء میں کمی بیشی کر کے اور دست بدست تبادلہ ذکر نے کو
ربا قرار دیا گیا ہے حضرات مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ ان
اشیائے ستہ میں حسب ذیل امور موجود ہیں، قدر، جنسیت، طعم، ثمنیت، اقتیات
ادخار، اب یہ تعین کرنا چاہا کہ حرمت ربا کے لیے علت کیا ہے، تو
حضرت امام ابوحنیفہؒ نے یہ اجتہاد فرمایا کہ مناطِ حکم یعنی تفاضل و نسیہ
کی حرمت کا مدار وصف اول (قدر و جنس) پر ہے امام
شافعیؒ نے فرمایا کہ علت حکم وصف ثانی یعنی طعم و ثمنیت ہے امام
مالکؒ نے فرمایا کہ مدار حکم امر ثالث یعنی اقتیات و ادخار ہے۔ ان
حضرات کا جیسا جیسا اجتہاد رہا۔ اس کے مطابق ہر ایک نے حکم ربا کیلئے
علت کی تعیین و تشخیص فرمائی۔ تنقیح مناط اور تخریج مناط میں فرق یہ ہے
کہ اول میں ایسے امور جمع ہو جاتے ہیں کہ ان کو حکم کے مناط ہونے میں
اصل مناطِ حکم کے ساتھ کوئی دخل نہیں ہوتا، تو اس صورت میں مجتہد
کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ قوت اجتہادیہ سے اصل مناطِ حکم کی تنقیح کر کے
واضح کر دیتا ہے کہ ان امور میں سے درحقیقت مناط یہ ہے اور دوسرے
(تخریج مناط) میں ایسے امور مجتمع ہو گئے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک میں
یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ حکم کے لیے مناط اور علت ہو تو مجتہد ان میں
سے کسی ایک کی تعیین کر دیتا ہے اور اسے مناطِ حکم قرار دینے کو ترجیح
دیتا ہے۔ تنقیح مناط اور تخریج مناط یہ دونوں مجتہد کا کام ہے اور دو
حضرات مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ اس بارے میں ایک دوسرے کے ساتھ
اجتہاد میں اختلاف کرتے ہیں۔ کوئی اپنے اجتہاد سے کسی کو لیتا ہے

---

۱ تحقیق مناط، تنقیح مناط اور تخریج مناط کی اصولی اصطلاحات کی مزید تحقیق کیلئے دیکھیے

اولاده الشيخ الاجل والصدر الاكمل الشيخ
عبد العزيز ثم الشيخ رفيع الدين ثم الشيخ
عبد القادر ثم خلف الشيخ عبد العزيز حفيده
مفيد العصر ومسند المشتهر في الآفاق
الشيخ محمد اسحق وابن اخيه محي السنة
العلامة الجليل الشيخ محمد اسماعيل وكان
الشيخ عبد العزيز يقول الحمد لله الذي وهب
لي على الكبر اسمعيل واسحق نفع الله بهما
هذه البلاد درس الشيخ محمد اسحق حديث
النبي صلى الله عليه وسلم فصار رحلة الاقطار
وصنف الشيخ محمد اسمعيل كتبا في الفرق
بين السنة والبدعة انطلاء فاحي السنة حين
كانت اميتت ومات شهيدا وقد تلمذ
على الشيخ محمد اسحق شيخ مشائخنا
الشيخ عبد الغني صار مدار الرواية في عصره
وارتحل اخرا الى المدينة الطيبة وصار
سند تلك البلاد وكثر الاخذ عنه هناك
وتلمذ على الشيخ عبد الغني شمس الاسلام
والمسلمين العارف الحافظ المحقق الشيخ محمد قاسم
مؤسس هذه المدرسة العالية وبانيها والفقيه
الحافظ المجتهد الولي الشيخ رشيد احمد صنف الشيخ
محمد قاسم كتبا في المعارف والحقائق وكتبا في الرد
على المخالفين من الماديين والدهريين فنفع الله
به كثيرا وقد كنت انشأت هذه الاشعار
في منقبته - فيا صاحبي على الديار وفن

کوئی کسی کو اور اس کی مثالوں میں سے ایک مثال حدیث "مفتاح الصلوٰۃ الطہور وتحریمها التکبیر وتحلیلها التسلیم" بھی ہے۔ اس حدیث کو پیش نظر رکھ کر ائمہ کرام نے صیغہ تکبیر اللہ اکبر اور صیغہ تسلیم یعنی السلام علیکم ورحمۃ اللہ کو رکن نماز قرار دیا ہے، لیکن امام ابو حنیفہؒ کے یہاں منشاء حکم یہ ہے کہ تکبیر سے مراد ہر وہ ذکر الٰہی ہے جو مشعر تعظیم و تکبیر ہو اور تسلیم سے مراد اپنے ارادہ و اختیار سے مصلی کا نماز ختم کر کے خروج عن الصلوٰۃ ہے۔ اور انہوں نے ان دو چیزوں و الفاظ مشعر تعظیم کہہ دینے اور ارادے کے ساتھ نماز کو ختم کر دینے کو فرض اور رکن صلوٰۃ قرار دیا، لیکن چونکہ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً صیغہ تکبیر اللہ اکبر اور صیغہ تسلیم السلام علیکم ورحمۃ اللہ پر مواظبت و دوام ثابت ہے۔ اس لیے بالتخصیص یہ دونوں واجب صلوٰۃ ہوں گے۔ شیخ ابن الہمامؒ نے وجوب صیغہ تکبیر کا التزام کیا ہے اور مشہور یہ ہے کہ یہ سنت ہے۔[1] ان دونوں میں ذکر مشعر تعظیم اور خروج بصنع المصلی یوں پایا جاتا ہے، جیسا کہ کوئی کلی کسی جزئی میں پایا جاتا ہے۔ پس یہ دونوں فرض ہوں گے علیٰ ہذا القیاس اور بھی بہت سی مثالیں ہیں، تو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے موطا امام مالکؒ کی شرح المسوّیٰ میں ان امور کی رعایت فرمائی ہے اور ایک فقہ جامع کو مختار کیا ہے۔ اسی طرح شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" اور حجۃ البالغہ میں مسائل

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)
مقدمہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی مایہ ناز کتاب فتح الملہم شرح مسلم کا مقدمہ از صفحہ ۸۹ تا ۹۱ بغور ملاحظہ فرمایا جائے۔ نیز العرف الشذی، جلد اول صفحہ ۱۵/۱۶ اور معارف السنن جلد اول از صفحہ ۶۱ تا ۶۶ مطالعہ کیا جائے۔

[1] (حاشیہ صفحہ ہذا) اس حدیث کی مزید تحقیق کے لیے العرف الشذی طبع اول جلد اول صفحہ ۱۲ تا ۱۳ اور مولانا بنوری مدظلہ کی شرح ترمذی "معارف السنن" جلد اول از صفحہ ۵۴ تا صفحہ ۶۰ ملاحظہ فرمائی جائے۔

ان الشيخ هوى ازدياد له وكثرت الفتيا واز
دحمت المسائل على الشيخ رشيد احمد حين
لبس الحق بالباطل فاجاب فيها بالصواب وكان فيها
مجتهدا فاخذنا ذلك اماما في الاصول ومنه
ما في الفروع وتفتح لنا منهما علم منقح مبين
ولما استولت الاجانب على هذه البلاد
وقامت الحرب بين الحق والباطل اسس الشيخ محمد
قاسم هذه المدرسة العالية فنفع الله بها
كثيرا جزاه الله خير الجزاء وغاية المدرسة درس
الحديث وفقه الحديث وكان يرى ان المبادى
ضرورية والضرورى يقتدر بقدر الضرورة
حتى ان الشيخ رشيد احمد حظر الفلسفة وحجر
عنها في بعض السنين في هذه المدرسة فمنها
اسنادنا وطريقة مشائخنا في الحديث وفقه الحديث
طريقة معتدلة مثلى يتوسطون بين الاطراف
ويريد بذلك ان للائمة الاربعة اصولا اربعة اكثرية
وذلك ان الامام مالكا ياتى بعمل اهل المدينة
بل قدير حجة على الحديث المرفوع والشافعيؒ
يأخذ باصح ما في الباب واحمد يأخذ بالاصح
والصحيح والحسن والضعيف اذا كان ضعفه
يسيرا و يجوز هذا و ذلك وعلى هذا و
منع مسنده و ابوحنيفةؒ يأخذه بهذه الاقسام
وينزل الاحاديث على محل فلذا كثرت
التاويلات عند الحنفية وكثرت الجروح على
الرواة عند الشافعية والشافعيؒ اول من ابطل

الاجتہاد والتقلید میں یہ بات پوری تحقیق کے ساتھ ثابت فرمائی ہے
کہ اجتہادی مسائل میں حق متعدد ہے۔ اسی کو آئمہ اربعہ سے نقل کیا ہے اور
خود بھی اس رائے کو پسند فرمایا ہے۔ اجتہادی مسائل سے میری مراد
وہ مسائل ہیں کہ جہاں کتاب اللہ یا سنت متواترہ سے کوئی یقینی بات ثابت
نہ ہو تو ایسے مسائل میں حق متعدد ہے اور اگر کوئی قطعی دلیل موجود ہو تو وہ
موضع اجتہاد نہیں اور وہ مسئلہ اجتہادی نہیں۔ وہاں حق صرف ایک ہی ہے
اور وہ وہی ہے جو اس دلیل قطعی کے مطابق ہے۔ تو جس نے اس کے ساتھ
موافقت کی تو حق کے ساتھ موافقت کی اور جس نے اس سے مخالفت کی
تو اس نے حق سے مخالفت کی۔ اور اس طرح شیخ ولی اللہؒ نے تشریع
و عقائد حقہ کے حکم و مصالح کے بارے میں ایسی کتابیں تصنیف فرمائیں جو
ہر آنے والے کے لیے روشن چراغ معیار کامل ہیں۔ ان میں سے حجۃ اللہ البالغہ
و التفہیمات الالٰہیہ، الخیر الکثیر وغیر ذلک مشہور کتابیں ہیں، پھر ان کے بعد
ان کے طریق کار کے مطابق ان کے صاحبزادوں اور پوتوں نواسوں نے
ان کی پیروی کی۔ آپ کے صاحبزادوں میں سے بڑے شیخ اجل صدر اکمل
حضرت مولانا الشیخ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ پھر شیخ شاہ رفیع الدینؒ
اور پھر شیخ شاہ عبدالقادرؒ تھے، پھر حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے بعد
ان کے نواسے مشتہر فی الآفاق حضرت شاہ محمد اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ اور
حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے بھتیجے[1] (حضرت شاہ عبدالغنیؒ کے صاحبزادے)
علامہ جلیل حضرت شاہ محمد اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ تھے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ
رحمۃ اللہ علیہ اکثر یہ آیت تلاوت فرمایا کرتے تھے: الحمد للہ الذی
وھب لی علی الکبر اسمعیل و اسحٰق
واللہ تعالیٰ نے ان دونوں حضرات کے ذریعے اس ملک کو بہت بڑا

[1] حضرت شاہ ولی اللہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے، شاہ عبدالغنی
مہاجر مدنیؒ جو حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ کے جانشین تھے، وہ دوسرے ہیں۔

الاحتجاج بالمرسل الا اذا اعتضد وامام الصنعة ذلك الامام الهمام البخاري قد اخذ اصل مالك والشافعي وركب بينهما فيأتي بامسح ساق الباب ويراعي مساعدة على السلف فلذا لم يأت بحديث يعارض حديثا في كتابه ولم يخرج في الكسوف الاحديث الركوعين مشيا منه على اصله واعتمد مسلم على ثقة الرواة فاخرج حديث ثلاث ركوعات وحديث اربع ركعات بل حديث خمس ركوعات ايضا موقوفا على امير المؤمنين علي رضي الله عنه فالبخاري قد انتقى واتبع مسلم القاعدة فاما نحن فنتوسطون في مثل هذا لا يأخذون بالتشدد ولا بالتساهل ويوجهون الاحاديث المتعارضة بتوجيه يكاد يقبلها من يسمعها مثاله حديث القلتين فقد رواه يزيد بن زريع وكامل بن طلحة وابراهيم الحجاج وهدبة بن خالد وكيع ويحيى بن حسان بلفظ اذا بلغ الماء القلتين او ثلاثا لم يحمل الخبث فيقال فيه ان هذا ليس بتحديد شرعي فقد قال القلتين او ثلاثا بالتنويع فهو تقريب واحالة على خلوص اثر النجاسة من جانب الى جانب وذلك اصل مذهب ابي حنيفة وصاحبيه صرح به الشيخ ابن الهمام والشيخ ابن نجيم وقد سلمت الاحاديث المعارضة لحديث القلتين كحديث النهي عن البول في الماء الراكد وحديث النهي عن

فیض پہنچایا۔ حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ دہلی میں بیٹھ کر درس حدیث دیا کرتے اور ملک کے گوشے گوشے سے جوق در جوق طلبہ علوم حدیث ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے اخذ فیوض کیا کرتے تھے اور حضرت شاہ اسمٰعیلؒ نے سنت مطہرہ اور بدعت کے درمیان فرق و امتیاز کرنے کے لیے تصنیفات کیں اور ایسے دور میں سنت کو از سرِ نو زندہ کیا اور تازہ کیا جب کہ اسے ختم کیا گیا تھا اور ساتھ ہی سلسل جہاد بالسیف بھی کرتا رہا یہاں تک کہ وہ شہادت کی نعمت عظمیٰ سے سرفراز ہوئے۔

حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ کے تلمیذ خاص ہمارے شیخ الشائخ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ کے بعد ان کی جگہ مسند تدریس حدیث کی زینت بنے اور اطراف ملک سے ان کی خدمت میں بھی طلبہ علوم حدیث حاضر ہونے لگے اور استفادہ کرتے رہے اور آخر میں انہوں نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی اور وہاں اس بلاد مقدسہ میں بھی وہ مسند حدیث رسول اللہؐ قرار پائے۔ وہاں بہت سے لوگوں نے ان سے حدیث پڑھی اور سند حاصل کی، اس استاذ الاساتذہ حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذۂ خصوصی شمس الاسلام والمسلمین العارف الحافظ الحق مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی مدرسہ دیوبند اور فقیہہ و مجتہد، ولی کامل الحافظ الشیخ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے دینی حقائق و معارف پر مشتمل اہم علمی کتابیں، اور ملحدین و دہریوں و مخالفین اسلام کی تردید میں کچھ کتابیں تصنیف فرمائیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے اس جلد میں بہت زیادہ دینی فائدہ پہنچایا، میں نے آپ کے فضائل و مناقب میں کچھ اشعار کہے تھے، جو یہ ہیں۔[1]

قفا یا صاحبی علی الدیار — فمن دابہ المشتجی ھری انجیار

ل۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس جلسہ میں پورا قصیدہ پڑھ کر سنایا جیسا کہ تمہید میں لکھا جا چکا ہے، لیکن طوالت کے خوف سے صرف یہ پہلا شعر درج ہے۔

وخال السید فی الاناء اذا استیقظ وحدیث ولوغ الکلب فی الاناء ومثاله ایضا احادیث القرأة خلف الامام فانهم لما استدلوا علی ترک القرأة خلف الامام فی الصلوة بقوله صلی الله علیه وسلم واذا قرئ فانصتوا وبحدیث من کان له امام فقرأة الامام له قرأة اوّلوا حدیث لا تفعلوا الا بام القرآن فانه لا صلوة لمن لم یقرأ بها وذلک انه لم یصح فی شان نزول الآیة شیء من الروایات فالعبرة لعموم اللفظ وایضا فقد روی البیهقی فی کتاب القرأة عن الامام احمد انه اجمع العلماء علی ان هذه الآیة فی الصلوة وحدیث واذا قرأ فانصتوا حدیث صحیح صححه احمد بن حنبل ثم صاحب ابوبکر الاثرم ثم مسلم فی باب التشهد من حدیث ابی موسی الاشعری واحال به علی حدیث ابی هریرة ثم صححه ابن خزیمة والحافظ ابوجعفر بن جریر الطبری والحافظ ابو عمر بن عبد البر والحافظ ابن حزم الاندلسی الظاهری ثم الحافظ زکی الدین عبد العظیم المنذری ثم خاتم الحفاظ الحافظ ابن حجر العسقلانی فی الفتح وهذا من حیث الاسناد واما من عمل السلف والائمة فقد عمل به جماعة من الصحابة ومالک واحمد وابوحنیفة والحدیث اذا کان رواته ثقات ثم ساعده العمل عمل السلف فهو صحیح وبلا ریب لا یقدح فیه قدح ولا یؤثر فیه جرح وحدیث

اور جب لوگوں کو دینی و علمی مسائل میں اشتباہ پڑا اور حق و باطل کی تمیز کی ضرورت ہوئی تو اطراف ملک سے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس استفتاء کی صورت میں سوالات آتے اور آپ پوری تحقیق کے ساتھ فقیہانہ انداز میں جوابات لکھ دیا کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فقیہ محدث تھے۔ تو حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی عقائد میں جانتے اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فروع و جزئیات فقہیہ میں ہادی و پیشوا اور رہنما تھے۔ ان دونوں حضرات کی برکت سے مذہب منقح اور روشن ہوا اور اس میں کسی قسم کی پیچیدگی باقی نہ رہی۔

جب انگریز کی اجنبی حکومت نے اس ملک پر پورا قبضہ جما لیا اور حق و باطل کے درمیان کشمکش شروع ہوئی اور ایک مستقل لڑائی ٹھن گئی، تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مدرسہ دیوبند کی بنیاد[1] رکھی اور اللہ تعالیٰ نے اس مدرسہ کے ذریعے سے بہت زیادہ نفع پہنچایا جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

اس مدرسہ کی غرض و غایت حدیث اور فقہ الحدیث کی تعلیم و تدریس ہے اور اس اصل مقصد و غایت کی تحصیل کے لیے کچھ دوسرے علوم بھی مثلاً مبادی و آلات ضروری ہیں۔ ان مبادی کی تعلیم بھی یہاں دی جاتی ہے لیکن الضرورة تتقدر بقدر الضرورة کے قانون کے مطابق ان مبادی ضروریہ کی تعلیم بہ اندازہ ضرورت ہی ہے، یہاں تک کہ ہمارے شیخ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تو چند سال اس درس میں فلسفہ اور منطق کی آخری کتابوں کا پڑھنا پڑھانا بالکل ہی روک دیا تھا اور ایک عرصے تک یہ سلسلہ رکا ہی رہا۔ مندرجہ بالا تفصیل سے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ یہ ہمارا اور ہمارے اساتذہ کا اسناد حدیث ہے، جو اس طرح حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ تک پہنچتا ہے۔

---

[1] ۱۲۸۳ھ میں

من كان له امام فقراءة الامام له قراءة حكاه الشيخ ابن الهمام عن مسند احمد بن منيع وصححه عان سنده على شرط الشيخين ولم نقف الى الآن على علة فيه واسناده اخبرنا اسحٰق بن يوسف الازرق قال حدثنا سفيان وشريك عن موسى بن ابي عائشة عن عبدالله بن شداد عن جابر بن عبدالله قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الحديث وقد ساعده الموقوف عند الترمذي والمرسل عند آخرين فاذن هو صحيح فوجه شيخ مشائخنا الشيخ رشيد احمد محدث عبادة من طريق محمد بن اسحٰق وسياقه لعلكم تقرأون خلف امامكم قالوا نعم يارسول الله ؛ بهذه هذا قال فلا تفعلوا الحديث فقال هذا دليل الاباحة لا دليل الوجوب وانهم كانوا يقرأون بغير امره صلى الله عليه وسلم ولذا سأل بقوله لعلكم تقرأون خلف امامكم فلما قالوا نعم قال فلا تفعلوا الا بام القرآن فانها سورة متعينة من بين سائر القرآن لا غيرها من السور فعلل النبى صلى الله عليه وسلم اباحتها خلف الامام بكونها متعينة من بين السور لا صلوٰة بدونها وظهر عدم كون الصلوٰة بدونها في حق الامام والمنفرد واثر ذلك في الاباحة في حق المقتدى ومسئلة الاباحة والكراهة

حدیث اور فقہ الحدیث کی تعلیم و تدریس کے بارے میں جامعہ حضرات اساتذہ کرام کا طریقہ نہایت ہی معتدل اور افراط و تفریط سے محفوظ طریقہ ہے میرا مقصد یہ ہے کہ مسائل فقہیہ جزئیہ کے استخراج و استنباط کے بارے میں ائمہ اربعہ کے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق اکثر چار اصول ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ عمل اہل مدینہ کی اقتدار اور ان کی پیروی کو اصل چیز قرار دیتے ہیں، بلکہ کبھی تو اسے ایک حدیث مرفوع پر بھی ترجیح دیا کرتے ہیں؛ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اصح ما فی الباب حدیث کو لے کر باقی روایات کی یا تو تاویل کر دیتے ہیں یا انکو اس اصح کے مقابلے میں ترک کر دیتے ہیں اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اصح صحیح ،حسن اور ضعیف (جب کہ اس کا ضعف معمولی درجے کا ہو) سب کو معمول بہا بنانے کے لیے قبول کر دیتے ہیں اور ہر ایک مدلول و مضمون کے مطابق عمل کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور انھوں نے اسی بنیاد پر اپنی کتاب مسند احمدؒ کو جمع کیا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان تمام اقسام حدیث کو لے لیتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کے مضمون کو ایک قانون کلی ہونے کی وجہ سے اصل شرعی قانون قرار دے کر دوسری مختلف روایات کی مناسب توجیہ کرتے ہیں اور ہر حدیث کے لیے کوئی اچھے سے اچھا محمل تلاش کر دیتے ہیں اور اس لیے حنفیہ کے ہاں تاویلات احادیث زیادہ ہوتی ہیں اور شافعیہ کے ہاں رُواۃ پر جرح و تنقید زیادہ ہوتی ہے اور امام شافعیؒ وہ اوّل بزرگ ہیں، جنھوں نے مرسل حدیث کو حجت تسلیم نہیں کیا، ہاں اگر اس کے مضمون کی تقویت و تائید دوسری روایات سے ہوتی ہو تو اس صورت میں وہ مان لیتے ہیں

امام فن حدیث حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام

---

[1] تفصیل کے ساتھ اس کو حضرت گنگوہیؒ کی تقریر ترمذی الکوکب الدری جلد اوّل صفحہ ۸ اور حضرت علامہ کشمیریؒ کی تقریر العرف الشذی جلد اوّل ص۱۹ اور مولانا بنوری مد ظلہ کی شرح ترمذی معارف السنن جلد اوّل ص۱۰۲ میں مطالعہ کیا جائے۔

مختلف فيها عند الحنفية وان اتفقوا على عدم الوجوب وقالوا في مسئلة رفع اليدين وجهر آمين انه قد صح الرفع والجهر عن النبي صلى الله عليه وسلم وعن الصحابة وقد صح ترك الرفع باسناد صحيح عند ابي داؤد والاخفاء وقد صح ترك الرفع عن امير المومنين عمر وامير المومنين علي وكذا صح الاخفاء بآمين عن جماعة من الصحابة والسلف الصالح فليكن كلا الامرين سنة وانما يبقى الشان في الترجيح هذا وانه رزق سدادا في المبداء والمعاد ثم تلمذ على الشيخ محمد قاسم شيخنا العدل الحجة مسند وقته الشيخ محمود حسن متع الله المسلمين بطول بقائه وهو شيخ المدرسة الآن وعليه المدار في الاسناد في هذه البلاد وهو على طريقة مشائخه ساعده التوفيق الالهي في التوفيق بين المتعارضات وحل المشكلات مثاله ماقال لي مرة ان تعدد الركوع في الكسوف قد ثبت عن النبي صلى الله عليه وسلم لامر اختص به ولكن ارشد الامة الى وحدة الركوع فقال صلوا كاحدث صلوة صليتموها من المكتوبة فراجعته وقلت ان السادة الشافعية يحملون التشبيه على عدد الركعتين لا على وحدة الركوع فقال ان هذا هو جعل السيد بهي نظرتيا فانه اذا كان النبي صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم

بلکہ حضرت امام شافعیؒ کے اقوال کو پسند فرمایا ہے اور بعض سے کچھ ان دونوں کے اقوال کو چھوڑ دیا ہے۔ اسی لیے وہ اپنی کتاب الجامع الصحیح میں ... صحیح و فی الباب حدیث لے آتے ہیں اور ساتھ ہی اس بات کی بھی صراحت فرماتے ہیں کہ عمل حدیث کے ساتھ دوسری بھی ہو اور بسا اوقات وہ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ کوئی ایسی حدیث نہیں ملتی جو کسی دوسری حدیث کے معارض ہو۔ اور صلوٰۃ کسوف کے بارے میں انہوں نے صرف وہ حدیث درج کی ہے جس میں ہر رکعت میں دو رکوعوں کا ذکر ہے اور اس معاملے میں جمہور سے اپنے پسندیدہ مسلک کی رعایت کی ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ نے رُواۃ حدیث کی ثقاہت پر اعتماد کیا ہے۔ اسی لیے انہوں نے ہر رکعت میں تین رکوعوں والی روایت، ایک رکعت میں چار رکوعوں والی روایت بھی اپنی کتاب میں درج کی ہے۔ بلکہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ پر موقوف ہر رکعت میں پانچ رکوعوں والی حدیث بھی روایت کی ہے تو دیکھئے امام بخاریؒ نے انتخاب کرکے ایک بات پسند فرمائی اور امام مسلمؒ نے قاعدے کی پیروی کرکے تخریج روایات کی ہے۔

جہاں تک مشائخ کرام یعنی حضرات اساتذہ مدرسہ دیوبند اس بارے میں توسط و اعتدال سے کام لیتے ہیں۔ نہ تو تشدد اور سختی سے کام لیتے ہیں اور نہ نرمی برتتے ہیں اور احادیث متعارضہ کی ایسی ایسی معقول و دلنشیں توجیہات کرتے ہیں کہ جن کو ہر سمجھدار سننے والا سن کر بدل وجان قبول کر لیتا ہے۔ اس کی ایک مثال حدیث قلتین دیکھئے۔ یزید بن زریع، کامل بن طلحہ ابراہیم الحجاج، حماد بن خالد، وکیع اور یحییٰ بن حسان نے تو اس کو ان الفاظ میں روایت کیا ہے۔ اذا بلغ الماء قلتين او ثلاثا لم يحمل الخبث تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دراصل تحدید شرعی نہیں، کیونکہ یوں فرمایا: القلتين او ثلاثا یعنی او کے ساتھ ذکر کیا ہے، جو تنویع کے لیے ہے تو یہ درحقیقت ایک تخمینی اندازہ ہے اور اصل مدار اس پر ہے کہ ایک جانب کی نجاست دوسری جانب تک

قد صلی الکسوف بتعدد الرکوع بنفسہ علی اعین الناس ورؤس الشہاد وکان یشرع تعدد الرکوع ثلاثۃ فلم نترک الاحالۃ علی ماشاہدہ وعدل الی التشبیہ بالصبح ماذالک الا ان التعدد کان لعارض وارشد الامۃ الی المعروف فی الصلٰوۃ واللہ الموفق والمعین ؛ واٰخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین ۔ تمت بالخیر

اثر انداز ہوتی ہے۔ انہیں نے اور امام ابو حنیفہؒ اور صاحبین رحمہم اللہ کا اصل مذہب یہی ہے، چنانچہ شیخ ابن الہمامؒ اور شیخ ابن نجیمؒ نے اس کی تصریح فرمائی ہے اور اس صورت میں وہ حدیثیں جو بظاہر حدیث قلتین سے متعارض و مخالف ہیں، تعارض و مخالفت سے محفوظ ہو جاتی ہیں مثلاً حدیث النہی عن البول فی الماء الراکد (ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع کرنیوالی حدیث) اور حدیث النہی عن ادخال الید فی الاناء (نیند سے بیدار ہونے کے بعد پانی کے برتن میں ہاتھ داخل کرنے سے ممانعت کرنیوالی حدیث) اور حدیث ولوغ الکلب فی الاناء (کسی برتن میں کتے کے پانی پینے کے بارے میں حدیث) ان تمام احادیث کے ساتھ قلتین والی حدیث کا تعارض اس توجیہ پر باقی نہیں رہے گا۔

دوسری مثال قرأۃ خلف الامام کی حدیثیں ہیں، اس لیے کہ جب حضرات حنفیہ نے امام کے پیچھے نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے کی دلیل اس آیت کو قرار دیا۔ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ اور یہ حدیث نبوی واذا قرأ فانصتوا جب امام قرآن پڑھے تو تم خاموش رہا کرو اور یہ ارشاد نبوی من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ (جس کا امام ہو تو امام کا قرآن پڑھنا، اس کا قرآن پڑھنا ہے) تو انہوں نے اس سے بظاہر متعارض روایات مثلاً حدیث لا تفعلوا الا بام القرآن فانہ لا صلوۃ لمن لم یقرأبھا کی تاویل و توجیہ کی۔ آیت مذکورہ بالا کی شان نزول بارے میں کوئی صحیح روایت مروی نہیں، تو لازماً اس کے الفاظ کے عموم کا اعتبار کیا جائے گا۔ نیز امام بیہقیؒ نے کتاب القرأۃ میں امام احمدؒ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ علمائے کرام نے اجماع کیا ہے کہ یہ آیت قرأۃ فی الصلٰوۃ کے بارے میں وارد ہے اور اذا قرأ فانصتوا ایک صحیح حدیث ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ پھر ابوبکر بن الاثرمؒ نے بھی اس کی تصحیح کی ہے پھر امام مسلمؒ نے باب التشہد میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت سے ذکر کی ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا حوالہ دیا ہے۔ پھر ابن خزیمہؒ، حافظ ابوجعفر بن جریر طبریؒ، حافظ ابوعمرو بن عبدالبرؒ، حافظ ابن حزم، الاندلسی الظاہری نے بھی اس کی تصحیح کی ہے پھر حافظ ذکی الدین، عبدالعظیم المنذری اور پھر خاتم الحفاظ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہم اللہ نے فتح الباری میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہ از حیث الاسناد اس حدیث کی اہمیت و قوت تھی۔ لیکن دوسری طرف سلف صالحین اور آئمہ کرام کے عمل کی حیثیت سے دیکھا جائے، تو اس پر صحابہؓ کی جماعت نے اور امام مالکؒ امام احمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ نے عمل کیا ہے اور جب کسی حدیث کے راوی ثقہ اور معتمد ہوں اور پھر سلف صالحین کا تعامل بھی اس کے مضمون و مدلول کی مساعدت کرے، تو وہ بلا ریب صحیح ہے اور کسی اعتراض کرنیوالے کا رد و قدح اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، اور کوئی جرح اس کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوتی اور حدیث من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ کو حضر

مزید تفصیل معارف السنن، جلد اول از صفحہ ۲۴۴ تا ۲۴۸ میں ملاحظہ فرمائی جائے۔

تھی، امام نے مسند امام بن حنبل سے نقل کیا ہے اور اس کی تصحیح کی ہے کیونکہ اس روایت کی سند حضرت شعبیؒ، امام بخاریؒ و ابوداؤدؒ کی شرائط کے مطابق ہے اور اس میں کسی قسم کی علت قادحہ کا ظہور نہیں ہوا۔ اس کی سند یہ ہے: اخبرنا اسحٰق بن یوسف الازرق قال حدثنا سفیان وشریک عن موسی بن ابی عائشة عن عبد الله بن شداد عن جابر بن عبد الله. قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من كان له امام الحديث اور ترمذی کے ہاں ایک موقوف روایت سے اور دوسرے محدثین کے ہاں ایک مرسل روایت سے اس کی تائید و معاضدت بھی کی ہے۔ تو ایسی صورت میں یہ حدیث بالکل صحیح حدیث ہے تو ہمارے شیخ المشائخ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ والی حدیث کی توجیہ فرمائی جو محمد بن اسحٰق کے ذریعے سے مروی ہے اور اس کا سیاق یہ ہے لعلکم تقرؤن خلف امامکم (شاید کہ تم اپنے امام کے پیچھے قرآن مجید پڑھا کرتے ہو) تو ان صحابہ کرامؓ نے فرمایا کہ ہاں! یا رسول اللہ۔ تو آپ نے فرمایا: فلا تفعلوا (ایسا نہ کیا کرو) آپ نے توجیہ فرمائی ہے کہ یہ تو دلیل اباحت ہے، نہ دلیل وجوب اور یہ کہ وہ حضرات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بغیر از خود پڑھا کرتے تھے اور اسی لیے تو آپؐ نے ان سے پوچھا تھا کہ شاید تم امام کے پیچھے قرآن مجید پڑھا کرتے ہو تو انھوں نے کہا کہ ہاں تو آپؐ نے فرمایا: فلا تفعلوا الا بام القرآن۔ اس لیے کہ یہ سورت قرآن مجید کی دوسری سورتوں میں سے ایک مستقل اور مخصوص سورت ہے، دوسری سورتیں اس طرح مستقل نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کے پیچھے اس کے پڑھنے کی اباحت کی وجہ یہ ذکر فرمائی کہ یہ قرآن مجید کی دوسری سورتوں میں سے ایک مستقل اور مخصوص صورت ہے اور اس کے بغیر نماز کا نہ ہونا امام اور منفرد کے حق میں ظاہر ہو رہا ہے اور مقتدی کے حق میں اباحت کا اظہار ہوتا ہے اور اباحت و کراہت کا مسئلہ تو خود حنفیہ کے ہاں بھی مختلف ہے۔ اگرچہ اس پر تو سب حنفیہ کا اتفاق ہے کہ وجوب قراءت فاتحہ مقتدی کے لیے نہیں[1]

اور ہمارے مشائخ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ سے مسئلہ رفع یدین اور مسئلہ آمین کے بارے میں بھی یہی منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے رفع یدین اور آمین بالجہر ثابت ہے، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور ترک رفع یدین بھی اسناد صحیحہ کے ساتھ امام ابوداؤد کے ہاں ثابت ہے اور اسی طرح اخفائے آمین میں بھی اس کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نیز ترک رفع یدین امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایات صحیحہ کی بناء پر ثابت ہے اور اسی طرح اخفاء آمین بھی صحابہ کرام کی ایک جماعت اور سلف صالحین سے صحیح روایات کی بنیاد پر منقول اور ثابت ہے۔ اس وجہ سے ہونا تو یہ چاہیے کہ یہ دونوں کام سنت ہوں۔ اب البتہ اگر فرق ہے تو ترجیح کس کو دی جائے، یعنی حضرات حنفیہ کے ہاں رفع یدین اور ترک رفع یدین میں اور آمین بالجہر اور آمین بالاخفاء میں کس کو ترجیح دی جائے[2]

جو تفصیلات میں نے ذکر کی ہیں، ان مسائل میں ہمارے حضرات اساتذہ کرام کے مسلک کی حقیقت یہی ہے۔ واللہ الموفق للسداد فی المبدأ والمعاد۔

---

1 حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کی تقریر ترمذی الکوکب الدری میں از صفحہ ۱۴۴ تا ۱۴۹ پوری تحقیق مطالعہ کی جائے۔

2 ان مسائل میں اختلاف صرف راجح و مرجوح یا اولیٰ اور خلاف اولیٰ کا ہے، اس کی مدلل تفصیل تحقیق فیض الباری جلد دوم از صفحہ ۲۵۵ تا ۲۶۲ میں مطالعہ کی جائے۔

یاں پھر حضرت مولانا انورشاہ کے تلمیذ خاص حضرت شیخنا العدل المجتہد مسند الوقت مولانا محمد حسن متعنا اللہ المسلمین بطول بقائہ ہیں، ابھی شیخ الدرس ہیں اور ہمارے ان بلاد میں اسناد حدیث کا مدار اب ان ہی پر ہے، وہ اساتذہ کرام کے مسلک اور طریق کار پر کاربند ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے خاص توفیق عطا فرمائی ہے کہ وہ متعارض روایات کی نہایت عمدہ اور دلنشین تطبیق فرماتے اور مشکلات و معضلات حدیث کا نہایت عمدہ حل پیش فرماتے ہیں۔ اس کی ایک مثال دیکھئے کہ انہوں نے ایک دفعہ مجھے فرمایا کہ صلوٰۃ کسوف میں تعداد رکوع جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، غالباً یہ کسی خاص وجہ کی بنا پر آپ کی خصوصیت ہے، لیکن آپ نے اپنی اُمت کو خطاب کرکے فرمایا: صلّوا کاحدث صلوٰۃ صلیتموھا من المکتوبۃ (تم نے جو فرض نماز ابھی تازہ تازہ پڑھی ہے، یعنی فجر کی نماز اس صلوٰۃ کسوف کو بھی اس کی طرح پڑھو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت، حضرات علمائے شافعیہ اس تشبیہ کو محض تعداد رکعات پر محمول کرتے ہیں، وحدت رکوع پر محمول نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو ایک بدیہی کو نظر کرنا ہوا۔ اس لیے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسوف کی نماز تعدد رکوع کے ساتھ خود ہی تمام لوگوں کے سامنے مجمع عظیم کو پڑھائی، اور آپ اُمت کے لیے تعدد رکوع ہی کو مشروع قرار دینا چاہتے ہیں، تو آپ نے اس پر اکتفا کیوں نہیں فرمایا۔ آپ کا عمل تو لوگوں نے اس وقت دیکھا تھا۔ آپ کا فعل بھی حجت شرعی ہے۔ صرف عمل پر اکتفا نہ کرتے ہوئے، آپ نے صبح کے ساتھ تشبیہ دی اور قول کے ساتھ اُمت کو حکم دیا۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آپ یہ واضح فرماتے ہیں کہ تعدد رکوع کسی عارض کی وجہ سے تھا اور اُمت کو وہ طریقہ بتلا دیا جو نماز کے بارے میں ایک معروف طریقہ تھا۔ واللہ الموفق المعین

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

تمت بالخیر

* تفصیل کے لیے دیکھیے فیض الباری جلد دوم ص ۲۶۹

بقیہ : سپاس نامہ

جب کہ پہل ذلت کے نخل دیں گھاتیں ہم
علم کا چقماق ہے آتش نہ ہو کیوں کر عبث
جب حقوق اس کے ادا کرنے سے کتراجائیں ہم
گر بجائیں علم کو ہم دستبرد ..... طمع ــ سے
آپ پھر دیکھیں کہ کیسے کیسے تمغہ پائیں ہم
عزتیں دنیا و دیں کی ہم کو حاصل ہوں ضرور
علم دیں کے ساتھ گر تعلیم سے پیش آئیں ہم
کی اہانت علم کی دنیا میں رسوا ہوگئے
کاش اس غفلت شعاری پر ذرا شرمائیں ہم
علم کے چہرے پہ ڈالی خاک دست طمع سے
ہائے وہ ناخوش ہوا، اب ڈوب کر مرجائیں ہم

★

احباب! اس سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں اور ملتجی ہوں کہ آپ ہمارے لیے اور دار العلوم کے طلبہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اخلاص نصیب کرے، اللہ کی رضا اور خوشنودی میں سرگرم رہیں۔ اس کے دین کی خدمت گزاری کو سرمایہ حیات سمجھیں اور مسلمانوں کی نفع رسانی میں اپنی مساعی کو وقف کردیں۔

والسلام

ترتیب فکر: فاضل حبیب الحسینی القاسمی مرادآبادی

آنچہ من در بزم شوق آوردہ ام دانی کہ چیست
یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خم خانہ مے

ہندوستان میں لارڈ میکالے کے نظامِ تعلیم اور انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کے اعلان و اجراء کے بعد بانیانِ دارالعلوم و اکابرِ دیوبند نے ایسے مدرسہ کی بنیاد رکھی جو اپنی ذات میں محض ایک انجمن، اور اپنی صفات میں صرف اسلامی یونیورسٹی ہی نہیں، بلکہ ایک عظیم اسلامی تحریک تھی، جو پورے عالم اسلام کو متاثر کرگئی۔ یہ تعلیمی تحریک دارالعلوم دیوبند کے نام سے چلائی گئی، جس نے برصغیر ایشیا میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ملک میں انقلابی تحریکات میں بھی مدد دی اور ملک و ملت کو درسِ حریت دیا .... دارالعلوم کا اساسی کام تعلیم کتاب اللہ، تدریس سنت حدیث رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور تفقہ فی دین اللہ کی روشنی میں ایسے علماء، مجاہدین، محدثین، فقہاء امت، رجال کار پیدا کرنا تھا، جو دل و دماغ کے اعتبار سے صحیح مسلمان اور قلب و نظر کی گہرائیوں سے مومن کے نشان ہوں، بحمد اللہ دارالعلوم کی تعلیمات سے ملک میں متعدد طبقات، مختلف علوم و فنون کے مشاہیر اور علم کے پہاڑ پیدا ہوئے، جو ملک و ملت کے ہر شعبے میں کام آئے اور ہر حلقے کے لیے مفید اور ہر محاذ پر کام کرنے کے اہل ثابت ہوئے ملک و ملت کا کوئی ایسا محاذ نہ ہوگا، جہاں دیوبندی مکتب فکر کا عالم سینہ سپر نہ ہوگا۔ اور کوئی علمی و عملی میدان علمائے دیوبند سے خالی نہ ہوگا، نیز جہاد و حریت، تفسیر قرآن، سنت و حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، توحید باری، تحفظ ناموس رسالت، مقام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، خدمت دین حنیف، غرض دیوبندی اکابر نے اپنی تحقیقات و مزاج و حالات

کے مطابق پوری دیانتداری سے ہر دینی تحریک کی جدوجہد میں حصہ لیا اور ملک و ملت کی خدمات کا حق ادا کیا۔ راقم ہیچمدان، دارالعلوم دیوبند کا ادنیٰ طالب علم، اپنے ناقص معلومات کی بنا پر نہایت اختصار کیساتھ سولہ طبقات پر مشتمل چند اکابر و مشاہیر کے صرف اسمائے گرامی کی ایک کتاب نما فہرست پیش کرتا ہے جن کے سامنے گرامی سے ان کی ذات ستودہ صفات، اور ان حضرات کی جامعیت نیز ان کے کارہائے نمایاں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کون لوگ تھے اور دارالعلوم نے کیسے آفتاب و ماہتاب پیدا کیے، ان کی سیرۃ و سوانح سے پورے ملک کی تاریخ بنتی ہے۔ بعض بزرگ اور ان کے اسمائے گرامی پوری تحریک کا تعارف کراتے ہیں اور بعض حضرات اپنی ذات میں انجمن ہیں اور بعض اکابر کے نام سے تاریخ وابستہ ہے۔ اور بعض لوگوں کے کارنامے پوری ملت کی نشاندہی کرتے ہیں اور یہ وہ یادگار زمانہ لوگ ہیں، جن کی مسانید اب تک خالی پڑی ہیں اور پوری قوم مل کر بھی اس کی تلافی نہ کرسکی ہے۔

ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں یہ!

سلسلے خانوادے سے دو بزرگوں کے سوانح ہی دیکھ لیجئے۔

۱۔ حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، صاحب تصانیفِ کثیرہ، ایسی جامع شخصیت کہ ان کے خلفاء علماء لاتعد، و لاتحصٰی حضرت تھانویؒ کا ہر خلیفہ مجاز ایک ستارہ اور ہزاروں مریدانِ باصفا کا سلسلہ جاری وساری ہے

۲۔ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا مرشدنا سید حسین احمد مدنیؒ کی ذات ستودہ صفات سے عرب و عجم مستفیض ہوئے اور ان کے خدام کا حلقۂ اثر پاک و ہند و بنگلہ دیش اور حرمین شریف تک پھیلا ہوا ہے

یہ فہرست صرف نشاندہی ہے۔ اور حضرات علماء سے پوری معذرت کے ساتھ پیش کی جارہی ہے

حضراتِ مفسرین و مترجمین قرآنِ حکیم

۱۔۔۔ شیخ الہند حضرت مولانا سید محمود حسن دیوبندی (اسیر مالٹا) رحمۃ اللہ علیہ

۲۔۔۔ حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

۳۔۔۔ شیخ الاسلام پاکستان حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

۴۔۔۔ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

۵۔۔۔ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

۶۔۔۔ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (شیخ التفسیر و شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور)

۷۔۔۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع دیوبندی کراچی مدظلہ

۸۔۔۔ بدر العلماء حضرت مولانا علامہ شمس الحق افغانی مدظلہ (شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ)

۹۔۔۔ جناب حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ (واں بھچراں میانوالی)

جماعت محدثین کرام

۱ — حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ
۲ — حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ
۳ — حضرت شیخ الہند دیوبندی (اسیر مالٹا) رحمۃ اللہ علیہ
۴ — حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ (شیخ الحدیث دارالعلوم)
۵ — حضرت مولانا علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ
۶ — حضرت مولانا میاں اصغر حسین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ
۷ — حضرت مولانا مملوک علی رحمۃ اللہ علیہ
۸ — حضرت مولانا عبد العلی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
۹ — حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ مہاجر مدنی
۱۰ — حضرت مولانا محمد اسحٰق امرتسری رحمۃ اللہ علیہ
۱۱ — حضرت مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ
۱۲ — حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (پاکستان)
۱۳ — حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (جامعہ اشرفیہ لاہور)
۱۴ — حضرت مولانا عبد الرحمٰن کامل پوری رحمۃ اللہ علیہ
۱۵ — حضرت مولانا رسول خان صاحب ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ
۱۶ — حضرت مولانا فخر الدین احمد رحمۃ اللہ علیہ
۱۷ — حضرت مولانا عبد السمیع رحمۃ اللہ علیہ
۱۸ — حضرت مولانا عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ (گوجرانوالہ)
۱۹ — حضرت مولانا سید میرک شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

---

۲۰ — حضرت مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث مدظلہ
۲۱ — حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہ
۲۲ — حضرت مولانا عبد اللہ درخواستی مدظلہ (بالواسطہ)

متکلمین اسلام

۱ — حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (بانی دارالعلوم دیوبند)
۲ — حضرت مولانا قاری محمد طیب مدظلہ مہتمم دارالعلوم
۳ — حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ
۴ — حضرت علامہ سید مناظر احسن گیلانی مرحوم
۵ — حضرت علامہ مولانا خالد محمود ایم اے پی ایچ ڈی (لندن)

مفتی و فقہاء

۱ — حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ (مفتی دارالعلوم)
۲ — حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
۳ — حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی رحمۃ اللہ علیہ
۴ — حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ
۵ — حضرت مولانا مفتی ریاض الدین رحمۃ اللہ علیہ
۶ — حضرت مولانا مفتی مہدی حسن رحمۃ اللہ علیہ
۷ — حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مدظلہ (کراچی)
۸ — حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ رائپوری رحمۃ اللہ علیہ (جامعہ رشیدیہ)
۹ — حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی (جامعہ اشرفیہ)
۱۰ — حضرت مولانا مفتی محمد یوسف (آزاد کشمیر)

معلمین و اساتذہ

۱ — حضرت مولانا محمد مراد رحمۃ اللہ علیہ (پاکپتنی سابق مدرس دارالعلوم دیوبند)
۲ — حضرت مولانا محمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ
۳ — حضرت مولانا محمد سہول صاحب رحمۃ اللہ علیہ (بھاگلپوری)
۴ — حضرت مولانا منفعت علی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

۵— حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

۶— حضرت مولانا عبدالحق نافع پشاوری (رحمۃ اللہ علیہ)

۷— حضرت مولانا عبدالوہاب دربھنگوی (رحمۃ اللہ علیہ)

۸— حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی رحمۃ اللہ علیہ

۹— حضرت مولانا شمس الحق بنگالی رحمۃ اللہ علیہ

۱۰— حضرت مولانا محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ (ڈھاکہ)

۱۱— حضرت مولانا عرض محمد رحمۃ اللہ علیہ (بلوچستان)

۱۲— حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی

۱۳— حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہ

۱۴— حضرت مولانا سراج احمد رشیدی رحمۃ اللہ علیہ

۱۵— حضرت مولانا عبدالسمیع انصاری رحمۃ اللہ علیہ

۱۶— حضرت مولانا عبدالحق حقانی مدظلہ ایم این اے

۱۷— حضرت علامہ محمد شریف کشمیری مدظلہ شیخ الحدیث د

۱۸— حضرت مولانا خیر محمد جالندھری بانی خیر المدارس ملتان (بالواسطہ)

مصنفین و مؤرخین

۱— حضرت مولانا علامہ مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

۲— حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ

۳— حضرت مولانا سعید احمد ایم اے اکبر آبادی

۴— حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

۵— حضرت مولانا عبدالصمد صارم ازہری

۶— حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

۷— حضرت مولانا یعقوب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ (عثمانیہ یونیورسٹی)

۸— حضرت مولانا علامہ سرفراز محمد خان صفدر گوجرانوالہ

۹— حضرت علامہ خالد محمود ایم اے، پی، ایچ، ڈی۔

۱۰— خواجہ عبدالحی فاروقی (جامعہ ملیہ)

۱۱— سید نورالحسن شاہ صاحب بخاری، سربراہ تنظیم اہل سنت

مبلغین اسلام

۱— حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ (بانی تبلیغ)

۲— حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ خلف الرشید حضرت مولانا الیاس

۳— حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ

۴— حضرت مولانا سید منظور علی شاہ (مبلغ دارالعلوم)

۵— حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن شاہ " " "

۶— حضرت مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری رحمۃ اللہ علیہ

۷— حضرت مولانا عبدالجبار رحمۃ اللہ علیہ حصاروی

۸— حضرت مولانا مفتی زین العابدین لائلپوری

۹— حضرت مولانا محمد علی جالندھری بانی مجلس تحفظ ختم نبوت

۱۰— حضرت مولانا حافظ قاری لطف اللہ (مبلغ جامعہ رشیدیہ)

۱۱— حضرت علامہ دوست محمد قریشی رحمۃ اللہ علیہ تنظیم اہل سنت

۱۲— حضرت مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمۃ اللہ علیہ (بالواسطہ)

۱۳— حضرت مولانا عبدالشکور دین پوری (بالواسطہ)

۱۴— حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی

مناظرین اسلام

۱— حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن شاہ مناظر دارالعلوم

۲— حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری

۳— حضرت مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری

۴— حضرت مولانا ابوالقاسم رحمۃ اللہ علیہ

۵— حضرت مولانا اسعد اللہ مظاہر العلوم سہارنپور

۶— حضرت علامہ خالد محمود ایم اے، پی، ایچ، ڈی

۷— حضرت علامہ دوست محمد قریشی رحمۃ اللہ علیہ تنظیمی

۲۔ حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ (بالواسطہ)

۳۔ حضرت مولانا لال حسین اختر رحمۃ اللہ علیہ

۴۔ حضرت مولانا محمد حیات فاتح قادیان

۵۔ حضرت مولانا عبدالستار تونسوی

۶۔ مولانا منظور احمد چنیوٹی (بالواسطہ)

مجاہدین و قائدین ملت

۱۔ امام وقت حضرت شیخ الہند دیوبندی اسیر مالٹا

۲۔ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

۳۔ امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ

۴۔ اسیر مالٹا حضرت مولانا عزیر گل پشاور مدظلہ

۵۔ حضرت مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ

۶۔ حضرت مولانا سیف الرحمنؒ (کابل)

۷۔ حضرت مولانا فضل ربی (افغانستان)

۸۔ حضرت مولانا عبدالرزاق (قاضی القضاۃ افغانستان)

۹۔ حضرت مولانا خلیفہ غلام محمدؒ دین پوری

۱۰۔ رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ

۱۱۔ امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ (بالواسطہ)

۱۲۔ حضرت مولانا محمد صادق کراچی (سندھ)

۱۳۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ

۱۴۔ مجاہد ملت حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ العالی سابق وزیر اعلیٰ سرحد

۱۵۔ حضرت مولانا سید وحید احمد مدنیؒ (اسیر مالٹا)

۱۶۔ حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ (صدر جمعیۃ علماء ہند)

۱۷۔ شمس الملت مولانا شمس الدین شہید بلوچستان

— ◆ ◆ —

ائمہ سلوک و حضرات مشائخ کرام و صوفیائے عظام

۱۔ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ

۲۔ محدث اعظم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

۳۔ حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

۴۔ امام وقت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی (اسیر مالٹا)

۵۔ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

۶۔ حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

۷۔ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ

۸۔ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ

۹۔ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ

۱۰۔ حضرت مولانا عبدالغفور عباسی مدنی رحمۃ اللہ علیہ

۱۱۔ حضرت مولانا خلیفہ غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ دین پوری

۱۲۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ (بانی جامعہ اشرفیہ)

۱۴۔ حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ حضرت تھانویؒ

۱۵۔ حضرت مولانا حافظ حاجی محمد صالح رحمۃ اللہ علیہ رائے پوری بانی جامعہ رشیدیہ

۱۶۔ حضرت مولانا مفتی رحمت علی . . . .

۱۷۔ حضرت مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث مدظلہ

۱۸۔ حضرت مولانا عبداللہ سلیم پوری رحمۃ اللہ علیہ (خانقاہ سراجیہ)

۱۹۔ حضرت مولانا عبدالہادی دین پوری مدظلہ

۲۰۔ حضرت مولانا عاشق الٰہی رحمۃ اللہ علیہ (میرٹھی)

۲۱۔ حضرت مولانا تاج محمود امروٹی (سندھ)

۲۲۔ حضرت پیر حماد اللہ ہالیجی شریف (سندھ)

۲۳۔ خلفائے حضرت تھانوی رحمہم اللہ علیہم

قرا و حفاظ

۱— الاستاذ حضرت قاری عبدالوحید معلم دارالعلوم
۲— قاری حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ معلم دارالعلوم
۳— قاری اصغر علی رحمۃ اللہ معلم دارالعلوم
۴— قاری جلیل احمد رحمۃ اللہ معلم دارالعلوم
۵— حضرات قرا پانی پتی رحمہم اللہ (لا تعد و لا تحصیٰ)

اولئك آبائی فجئنی بمثلهم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

ناظمین و مہتممین

۱— حضرت حاجی عابد حسین رح دیوبندی
۲— حضرت شاہ رفیع الدینؒ
۳— حضرت مولانا حافظ محمد احمد قاسمیؒ
۴— حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ
۵— حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ
۶— حضرت مولانا عبداللطیف ناظم سہارنپوری

صحافی و اہل قلم

۱— مولانا سعید احمد ایم۔ اے (مدیر برہان، استاذ علیگڑھ یونیورسٹی)
۲— مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ
۳— مولانا حامد الانصاریؒ غازی (مدیر مدینہ بجنور)
۴— علامہ تاجور نجیب آبادی (ادبی دنیا) لاہور
۵— سید محمد ازہر شاہ قیصر مدیر دارالعلوم
۶— مولانا عزیز احمد قاسمی رح (الجمعیۃ)
۷— مولانا عبدالوحید صدیقی (نئی دنیا دہلی)
۸— مولانا شائق عثمانی عصر جدید کلکتہ
۹— مولانا محمد تقی (مدیر البلاغ کراچی)
۱۰— مولانا مفتی عتیق الرحمٰن (ندوۃ المصنفین دہلی)
۱۱— مولانا محمد یوسف مدیر بینات کراچی
۱۲— مولانا سید عطاء المنعم بخاری ابن امیر شریعتؒ
۱۳— مدیران گرامی۔ القاسم، الرشید، قاسم العلوم، محمود، الخلیل جرائد دارالعلوم

اطبا و حکما

۱— جناب حکیم جمیل الدین نگینویؒ استاذ دارالعلوم و استاد حکیم اجمل خاں مرحوم
۲— جناب حکیم الدین بجنوری
۳— حکیم عبدالوہاب دہلوی (مشہور نابینا طبیب)
۴— حکیم محمد حسن دیوبندیؒ
۵— حکیم سید محفوظ علیؒ
۶— حکیم محمد رمضان حکیم پورٹی
— حکیم محمد محمد طیب دارالعلوم
۸— مولانا حافظ حکیم عبدالمجید بی اے (طبیب نابینا ولیدی)

ادبا و شعرا

۱— مولانا علامہ عبدالرشید نسیم طالوت مرحوم (ملتان)
۲— مولانا عزیز الدین عظامیؒ (تلمیذ گرامی مرحوم ہوشیارپوری)
۳— جناب علامہ انور صابری دیوبندی
۴— حضرت مولانا عبدالمنان دہلویؒ

بقیہ (صفحہ ۲۳۴)

بانیٔ دارالعلوم دیوبند

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم الصدیقی النانوتوی بن شیخ غلام شاہ الخ۔ آپ سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل اور اولاد میں سے تھے۔ اور ۱۲۴۸ھ کو قصبہ نانوتہ میں پیدا ہوئے تاریخی نام خورشید حسین تھا۔ یہ قصبہ دیوبند سے بارہ کوس مغرب میں سہارنپور سے پندرہ کوس جنوب میں گنگوہ سے نو کوس مشرق میں اور دہلی سے ساٹھ کوس شمال میں واقع ہے۔ آپ کے والد بزرگوار تعلیم سے چنداں بہرہ ور نہ تھے۔ صرف ایک معمولی زمیندار رہتے۔ البتہ بزرگوں کی نیک صحبت سے ضرور متاثر تھے اور دین سے کافی لگاؤ تھا۔

حضرت نانوتویؒ نے اکثر کتابیں حضرت مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ) سے پڑھی تھیں جو اپنے وقت کے مشہور مدرس متبحر عالم اور مختلف علوم و فنون کی کامل مہارت رکھنے والے شفیق استاذ تھے۔ رب ذوالمنن نے حضرت نانوتویؒ کو ابتداء ہی سے بڑی ذہانت اور عمدہ فطانت کی دولت عظمیٰ سے وافر حصہ مرحمت فرمایا تھا۔ جب جملہ علوم و فنون کی تعلیم مکمل کر چکے تو آخر میں حضرت مولانا قطب الارشاد رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) کے ساتھ مل کر راس الاتقیاء شیخ وقت محدث کامل اور یکتائے روزگار حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی الحنفی (المتوفی ۱۲۹۶ھ) سے حدیث شریف کا دورہ پڑھا اور اسی زمانے میں دونوں بزرگوں نے وقت کے رئیس الاولیاء مجاہد کبیر عالم باعمل مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۱۳۱۷ھ) سے بیعت کر کے سلوک کی راہ اختیار کی اور ظاہری علوم کے علاوہ باطنی علوم اور تصوف و معرفت میں بھی وہ مقام حاصل کیا جو اس زمانہ میں انہیں کے لیے واہب حقیقی نے مخصوص کر رکھا تھا۔ جن کے ذریعہ سیکڑوں حضرات کو روحانی فیض بھی حاصل ہوا اور تزکیۂ نفس کے وہ اعلیٰ مراتب بھی قادر مطلق نے انہی کی بدولت مرحمت فرمائے جو اس دور میں بہت کم کسی اور کو حاصل اور نصیب ہوئے ہوں گے ؎ سچ ہے

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ایامِ طالبعلمی میں خواب

حضرت نانوتویؒ نے طالب علمی کے زمانہ میں بہت سے خواب دیکھے تھے جو آنے والے دور میں اُن کی دینی خدمات اور رفع درجات کی طرف مُشیر اور رب قدیر کی طرف سے بشریٰ اور خوشخبری تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ (المتوفی ۱۳۰۲ھ) جو حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب کے قریبی رشتہ دار، ہم وطن، رفیق درس، استاد زادہ، بعض کتابوں میں شاگرد، ہم لطف اور پیر بھائی تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ:-

ایام طالب علمی میں مولوی (محمد قاسم) صاحبؒ نے ایک اور خواب

دیکھا تھا کہ میں خانۂ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور مجھ سے نکل کر ہزاروں نہریں جاری ہو رہی ہیں۔ جناب والد صاحبؒ (یعنی حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ) سے ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ تم سے علم دین کا فیض بکثرت جاری ہوگا۔ (سوانح مولانا محمد قاسم صاحبؒ ص [illegible] یہ واقعہ ارواحِ ثلاثہ ص [illegible] میں بھی منقول ہے) اس میں ذرہ برابر شک و شبہ نہیں کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کی دیگر سینکڑوں شاخوں سے قرآن، حدیث، فقہ اور علم دین کی جو نشر و اشاعت ہوئی اس صدی کے اندر تمام جہاں میں اس کی نظیر تلاش کرنا بے سود ہے۔ بلاشبہ قاہرہ یونیورسٹی صدیوں سے حکومتِ مصر کے زیر سایہ دین اور علم دین کی خدمت انجام دے رہی ہے، مگر صورت و سیرت گفتار و کردار ظاہر و باطن کے اعتبار سے علم و عمل کا جو نمونہ مادرِ علوم دارالعلوم دیوبند اور اس کی شاخوں نے قائم کیا ہے وہ اس دورِ انحطاط میں کہیں نہیں مل سکتا۔ دارالعلوم دیوبند اور اس کی قائم کردہ [illegible] اور اس کے نقش قدم پر قائم کردہ شاخوں میں ہزاروں جید اور ربانی علماء کرام اور صوفیاء عظام پیدا ہوئے جن کی بدولت رب العزت نے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو توحید و سنت کا داعی و شیدائی بننے کا شرف عطا فرمایا اور علم ظاہری کے علاوہ جس طرح لوگوں کے دلوں کو اُن سے صفائی اور روشنی نصیب ہوئی اور شرک و بدعت، حسد و تکبر اور اتباعِ ہوا سے جس طرح ان کو چھٹکارا حاصل ہوا، وہ کسی منصف مزاج اور ہوشمند مسلمان سے اوجھل نہیں ہے۔ ایک طرف تو ان اکابر کے قائم کردہ اسلامی مدارس سے سینکڑوں ثقہ مدرس، بہترین مبلغ، عمدہ ترین مناظر، اعلیٰ مصنف، نڈر مجاہد، بیباک سیاستدان اور محقق پروفیسر تیار ہوئے جو اپنے اپنے میدان اور فن میں گوئے سبقت لے گئے اور دوسری طرف قرآن و سنت اور سلفِ صالحین کی واضح ہدایات کی صریح روشنی میں ایسے اہل سلوک، صاحب باطن، زاہد اور صوفی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی خداداد بصیرت اور للہیت اور روحانیت سے لوگوں کے قلوب و اذہان کو منور کیا۔ اُن میں توحید و سنت کا جذبہ پیدا کیا۔ خدا خوفی اور فکرِ آخرت پیدا کی۔ دُنیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی کا نقشہ ان کے دلوں میں نقش کیا۔ آنے والی قبر اور حشر و نشر کی حقیقی زندگی کے حاصل کرنے کا سبق دیا۔ دوزخ کی ابدیت اور اس کی تحصیل و اجتناب کے خصوصی احکام سنائے۔ خالق کے حقوق کے علاوہ مخلوق کے باہمی حقوق کو ملحوظ رکھنے کی تلقین کی۔ نفس امارہ اور شیطان کی پیروی سے لوگوں کو ڈرایا اور سلف صالحین کے صحیح دینی جذبات اُن میں اُجاگر کیے۔ الغرض دل کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کے اخلاقِ ذمیمہ سے بچنے اور اوصافِ فاضلہ سے متصف ہونے کے وہ گر بتلائے جو اس دور میں صرف انہی حضرات کا حصہ ہو سکتا ہے۔ دیوبند کی اس روحانی تعلیم کا یوپی کے مشہور ظریف اور شگفتہ کلام شاعر اکبر الٰہ آبادی نے کس خوبی سے ذکر کیا ہے ۔

دل روشن مثال دیوبند ۔۔۔ اور ندوہ ہے زبان ہوشمند
اور علی گڑھ کی بھی تم تشبیہ لو ۔۔۔ اک معزز پیٹ بس اس کو کہو

(کلیاتِ اکبر مرحوم)

بلاشک دیوبند کی وجہ سے سعید روحوں کو جلا اور نیک دلوں کو بصیرت [illegible] نصیب ہوئی۔

ایک اور خواب

ارواحِ ثلاثہ میں ہے کہ مولانا نانوتویؒ نے خواب میں دیکھا تھا کہ "میں خانۂ کعبہ کی چھت پر کسی اونچی چیز پر بیٹھا ہوں اور کوفہ کی طرف میرا منہ ہے اور اُدھر سے ایک نہر آتی ہے جو میرے پاؤں سے ٹکرا کر جاتی ہے۔" اس خواب کو انہوں نے مولوی محمد یعقوب صاحبؒ (المتوفی ۱۲۸۲ھ برادر شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ المتوفی ۱۲۶۲ھ) سے اس عنوان سے بیان فرمایا کہ حضرت ایک شخص نے اس قسم کا خواب دیکھا ہے، تو انہوں نے یہ تعبیر دی کہ اس شخص سے مذہب حنفی کو بہت تقویت ملے گی اور وہ پکا حنفی ہوگا اور اس کی خوب شہرت ہوگی، لیکن شہرت کے بعد جلد ہی اس کا انتقال ہو جائے گا۔

(ارواحِ ثلاثہ ص ۱۲۹)

[illegible] ہندوستان میں قیام دارالعلوم دیوبند کے ذریعے جس طرح قرآن و حدیث

نے بعد مذہب حنفی کی علمی اور عملی خدمت ہوئی وہ اظہر من الشمس ہے۔

تصحیح کتب

عالم نبیل مصنف جلیل اور فقیہ وقت حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری المتوفی ذی ... جن کا سنہ پیدائش ۱۲۲۵ھ تھا اور بتاریخ ۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ کو خدا کو پیارے ہو گئے نے کتب حدیثیہ کے احیاء، ترویج اور علوم و فنون اسلامیہ کے بقاء اور تحفظ کے لئے مطبع احمدی قائم کیا تھا جس کے ذریعہ درسی اور متداول کتب کی کافی حد تک تصحیح اور بعض کتب کے حواشی بھی لکھے گئے اور وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت اس طرح پوری ہوئی۔ اسی مطبع احمدی میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی تصحیح کتب کا فریضہ سرانجام دیتے رہے اور اس طریق سے علم دین کی خدمت کا حق ادا کرتے رہے۔ اور ضمنی طور پر اس تصحیح سے معمولی سا جو حق محنت ملتا اس پر گزر اوقات کرتے اور اعزہ و اقارب کے علاوہ معاونوں کا حق ادا کرتے۔ زندگی نہایت سادہ بے تکلف اور زاہدانہ تھی۔ شکل و صورت سے دیکھنے والوں کو یہ وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ بھی کوئی مولوی ہیں، مگر ان کو کوڑی کے اس مول کی کیا خبر تھی جو وقت کے فراعنہ کے مقابلہ میں لسان اسماعیل اور ید موسوی لے کر نکلے اور زبان و قلم سے ان کے دلائل باطلہ کے سیل رواں کو بہا کر اور ان کے گمراہ کن براہین کی فوجوں کو ان کے بحر قلزم کی موجوں کی نذر کر دیا۔ سچ ہے کہ ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی بصیرت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

بخاری شریف کے آخری پاروں کا حاشیہ

کتاب اللہ کے بعد دین و اسلام میں سب سے زیادہ صحیح ترین کتاب بخاری شریف ہے جس کی قدر و منزلت اور ضرورت و اہمیت سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے؟ جس میں ہمارا دین بھی ہے اور دنیا بھی، ہمارا مذہب بھی ہے اور ہماری سیاست بھی، ہماری معیشت کے اصول بھی اس میں مذکور ہیں اور ہماری معاشرت کے احکام بھی، ہماری جسمانی خوراک کے اصول انتظام بھی اس میں موجود ہے اور ہماری روحانی غذا کا حل بھی اس میں مشترک ہے۔ سینکڑوں جید علماء اور فضلاء نے مختلف اور متعدد زبانوں میں مستقل شروح و حواشی لکھے ہیں۔ موجودہ بخاری شریف پر جو حاشیہ ہے وہ بڑی کاوش اور محنت کے ساتھ بیسیوں شروح حدیث سے پوری تحقیق کے ساتھ اخذ کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے پچیس پاروں کا حاشیہ تو حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری نے لکھا ہے اور باقی پانچ چھ پاروں کا حاشیہ اور اہل علم تو جانتے ہیں کہ بخاری شریف کے آخری پارے کتنے مشکل ہیں مولانا سہارنپوری نے حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے سپرد کیا جو انہوں نے کمال حزم و احتیاط کے ساتھ لکھا اور بڑی عمدگی کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہوئے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سوانح قاسمی میں ارقام فرماتے ہیں کہ:

"اس زمانہ میں جناب مولوی صاحب مولوی احمد علی صاحب سہارنپوری نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کی پانچ چھ سیپارہ آخر کے باقی تھے، مولوی محمد قاسم صاحبؒ کے سپرد کیا۔ مولوی صاحبؒ نے اس کو ایسا لکھا ہے کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس زمانہ میں بعض لوگوں نے کہ مولوی صاحبؒ کے کمال سے آگاہ نہ تھے مولوی احمد علی صاحبؒ کو بطور اعتراض کہا تھا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا ہے؟ کہ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کر دیا۔ اس پر مولوی صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بدون سمجھے بوجھے ایسا کروں اور پھر مولوی صاحبؒ کا تحشیہ ان کو دکھلایا۔ جب لوگوں نے جانا۔ اور وہ جگہ بخاری میں سب جگہ سے مشکل ہے۔ علی الخصوص تائید مذہب حنفیہ کا اول سے التزام ہے اور اس جگہ بار بار حضرت امام بخاریؒ نے اعتراض مذہب حنفیہ پر کئے ہیں اور ان کے جواب لکھنے معلوم ہے کتنے مشکل ہیں؟ اب جس کا جی چاہے اس جگہ کو دیکھے اور سمجھ لے کہ کیسا حاشیہ لکھا ہے؟ اور اس حاشیہ میں بھی یہ التزام تھا کہ کوئی بات بے سند کتاب کے محض اپنے فہم سے نہ لکھی جائے۔ (الخ سوانح عمری)

مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ

الغرض حدیث کی معلومات کی بناء پر ہندوستان میں حاشیہ کے ساتھ جتنی دفعہ اور جہاں کہیں بخاری شریف طبع ہوئی ہے وہ اسی حاشیہ کے ساتھ طبع ہوئی اور ہو رہی ہے۔ اندازہ فرمائیے کہ یہ صدقہ جاریہ کس قدر ان حضرات کے رفع درجات کا موجب اور حضرات علماء کے صحیح بخاری سے استفادہ کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ تا قیامت اس صدقہ جاریہ کو جاری رکھے۔

ع "رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد مے خانہ"

قیام دارالعلوم دیوبند کے اسباب

دنیا کا کوئی کام بغیر کسی سبب، داعیہ اور محرک کے معرض وجود اور منصہ شہود پر نہیں آتا۔ ہم جب ٹھنڈے دل کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں سرسری اہمیت کی سرگزشتہ تاریخ پہلے سے ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی تاریخ کسی اور صورت میں نظر آتی ہے۔ سیاست کی باتیں تو سیاسی حضرات بہتر جانتے ہیں کیونکہ لِكُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ ہم صرف مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں کم و بیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی حکومت اور دورِ اقتدار رہا ہے۔ جس میں نہایت فراخدلی سے (بلکہ بعض بادشاہوں کی طرف سے بے ملحدانہ انداز میں) ہر فرقہ اور ہر اہل مذہب کو پابندی سے رہنے اور مذہبی رسم بجا لانے کی مکمل آزادی تھی۔ جب گردش زمانہ سے سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہو گیا اور اپنوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے ظالم اور جابر برطانیہ قہر الٰہی کی صورت میں ہندوستان پر نمودار ہوا تو اس کے مقابلہ کے لیے ہندوستان کی دیگر اقوام عموماً اور مسلمان خصوصاً میدان میں نکلے اور عملی صورت میں اس کے ساتھ جہاد کیا جس کو انگریز کے منحوس دور میں نمک خوارانِ برطانیہ غدر ۱۸۵۷ء کے ساتھ تعبیر کرتے رہتے ہیں۔ اس جہاد میں کون کون حضرات شریک تھے اور کس کس مقام پر لڑے؟ اور ہر مقام پر اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟ یہ اور اس قسم کے دیگر کئی امور ہمارے حیطۂ امکان سے باہر نکلے

کے علاوہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں، ہمیں گزارشات صرف یہ لیے بانی دارالعلوم دیوبند اور ان کے چیدہ چیدہ بعض اصحاب و احباب کا تذکرہ کرنا ہے کہ انہوں نے کس حد تک انگریز کے خلاف جہاد کیا؟ اور انگریز نے ان کے خلاف کیا سلسلے قائم کیے؟ اور اس وقت انگریز کے اہل جبر خصوصاً مسلمانوں کے خلاف کیا عزائم تھے؟ اور وہ ہندوستان میں کیا کچھ اور کیا کرنا چاہتا تھا؟ اور کس حد تک وہ کر چکا ہے؟ جب ہم تاریخ کے اس موڑ پر آتے ہیں اور تاریخ کے اوراق میں وہ دلگداز واقعات پڑھتے اور دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ ہاتھ میں قلم لرزنے لگتا دل سیماب کی طرح بیقرار ہو جاتا ہے۔ سانس رکنے لگتا ہے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے سب واقعات تو تاریخ ہی میں پنہاں ہیں۔ ہم مشتے نمونہ از خروارے چند حقائق کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں جو عقلمندوں کے لیے بڑی عبرت ہے

فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

جہادِ شاملی

اہل ہند جب انگریز کے مظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور جب اس کے خلاف لڑتے ہوئے ہزاروں جانیں جاتی رہیں اور ہزاروں مسلمان شہید ہوئے اور تیرہ ہزار سے زیادہ جید علماء کرام کو تختۂ دار پر چڑھایا گیا اور پھانسی پر لٹکایا گیا اور اس وقت میدانِ کارزار کے آس پاس شاید ہی کوئی درخت ایسا ہو گا جس پر مظلوم ہندوستانیوں کی اور شہید مسلمانوں کی لاشیں نہ لٹکتی ہوں اور ظالم انگریز کے کارندے ان کو دیکھ دیکھ کر نہ خوش ہوتے ہوں اسی دور میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی زیر قیادت تھانہ بھون سے مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا لشکر شاملی کی طرف روانہ ہوا جو انگریز کے کارندوں اور اس کی فوج کا ایک مضبوط قلعہ تھا اس لشکر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حافظ محمد ضامن صاحب

شہید ہوئے۔ ۱۸۵۷ء میں اسی شاملی کے محاذ پر شہید ہونے تھے، خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

آپ سمجھتے ہیں کہ کس جانباز ظالم برطانیہ کا کمپ بہادر تھا اور کہیں بخت اور بے سروسامان مجاہد؟ مگر ان مجاہدین اور لیڈروں نے اور ان میں خصوصیت کے ساتھ حضرت نانوتویؒ نے اپنی شجاعت کے جو داد جوہر اس جہادِ شاملی میں دکھائے۔ بالآخر ان حضرات کو شکست ہوئی، کچھ حضرات تو زخمی ہوئے اور حافظ محمد ضامن صاحب شہید ہو گئے۔ الغرض مقابلہ خوب ہوا، بعض دیو پیکر فوجیوں کو اس میں ایک بوڑھے مجاہد یعنی حضرت نانوتویؒ نے اپنی تلوار سے کاٹ کر مولی کی طرح دو ٹکڑے کر دیا تھا، جہنم رسید کیا گیا اور غالباً اسی موقع کے لیے کہا گیا ہے کہ ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

جب انگریزوں کو اس کا علم ہوا کہ حضرت حاجی صاحب، مولانا نانوتوی صاحبؒ اور مولانا گنگوہی صاحبؒ جو اپنے زمانہ کے نامور عالم اور صوفی تھے ہمارے خلاف جہاد میں شریک ہوئے تو ان تینوں کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے۔ چنانچہ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی لکھتے ہیں کہ "ان تینوں حضرات کے نام چونکہ وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے اور گرفتار کنندہ کے لیے صد تجویز ہو چکا تھا اس لیے لوگ تلاش میں ساعی اور حراست کے لیے تگ و دو میں پھرتے رہے۔"

(تذکرۃ الرشید حصہ اول ص...)

انگریز کے ایسے ظالم حکم سے بچنے کے لیے کچھ دن تو حضرت نانوتویؒ وغیرہ احباب کے شدید اصرار پر روپوش رہے پھر نکل آئے جیسا کہ بتفصیل اس کا ذکر آئندہ آئے گا ان شاء اللہ العزیز۔ جب لاکھوں انسانوں پر برطانیہ یہ مظالم کر چکا تو بیرونی دنیا کی مزید بدنامی سے بچنے کے لیے اور اہل ہند پر اپنا جھوٹا احسان جتلانے کی خاطر کچھ عرصہ بعد وارنٹ گرفتاری اور دیگر کئی سخت احکام واپس لے لیے گئے اور اس طرح ان مظلوموں کی ظالم کے ہاتھ سے خلاصی ہوئی۔ اس جہاد اور ہنگامہ میں اہل ہند اس قدر حق بجانب تھے کہ خود ظالم انگریز اس کا اقرار کیے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ مسٹر نیکل اس ہنگامہ کے بارے میں اپنا یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب ہو سکتی ہے تو وہ ہندوستان کی ہندو مسلمان کی بغاوت تھی۔

(بحوالہ حکومت خود اختیاری ص...)

اور اس ہنگامہ میں انگریز نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا اس کا بھی نمونہ دیکھتے جائیے۔ مسٹر رسل کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو خنزیر کی کھالوں میں سی دیا گیا اور قتل کرنے سے قبل خنزیر کی چربی ان کے بدن پر ملی گئی اور پھر انھیں جلا دیا گیا

(تمغہ کارروائی ہرا ترک، مصنفہ ایڈورڈ ٹامس ص...)

ملاحظہ کیجیے کہ ظالم برطانیہ نے کس قدر سفاکانہ اور حیاسوز حرکتیں مسلمانوں پر روا رکھیں اور کس قدر ان کے بیگناہ خون سے ہولی کھیلی گئی مگر باایں ہمہ مسلمان مردانہ وار اس ظالم کے سامنے ایمان سے بھرپور سینہ تان کر پیش ہوتے رہے اور زبانِ حال سے یوں خطاب کرتے تھے کہ

گئے وہ دن کہ ہمیں زندگی کی حسرت تھی
مقتولِ قتل کو دیتا ہے دھمکیاں صیاد

عزائم برطانیہ

انگریز کو جب ہندوستان پر سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا تو شیخ چلی کی طرح اس کے دل میں نئے اور نئی آرزوئیں اور ارادے زبان اور قلم کی نوک سے بھی ظاہر ہونے لگے۔ گورنر جنرل لارڈ ایلن برا نے ۱۸۴۳ء میں ڈیوک آف ولنگٹن کو لکھا ہے کہ "میں اس عقیدہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی قوم اصولاً ہماری دشمن ہے اس لیے ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضا جوئی کرتے رہیں۔"

(ان دی انڈیا ص...)

انڈیا کی سپریم کونسل کے باوقار رکن سر چارلس ٹریویلین جو حکومت کی طرف سے گورنری کے بلند عہدہ پر فائز تھا پورے وثوق سے یہ لکھتے کہ "کریمیر جنین ہے۔ یہ امیدیں قائم کئے ہوئے تھا کہ جس طرح ہمارے بنگال کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے اس طرح یہاں (ہندوستان) میں بھی ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے۔" (مکر اور مسلمانوں کا روشن مستقبل ص۱۳۳)

اور برطانیہ کی پارلیمنٹ کے ممبر مسٹر میگلس نے آغاز ۱۸۵۷ء میں پارلیمنٹ کے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہا کہ "خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیر نگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح (علیہ السلام) کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیئے اور اس میں تساہل نہ کرنا چاہیئے۔" (حکومت خود اختیاری ص۱۳۶ اور علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اول ص۲) اور لارڈ رابرٹس نے کہا کہ "ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے۔" (علمائے ہند کا شاندار ماضی کا آخری حصہ، تصویر کا دوسرا رخ ص۳۳ طبع اول)

غور فرمایئے سایۂ بوم (ظالم برطانیہ) کے منحوس، بد اقتدار میں ہندوستان کی سرزمین پر کس طرح زبوں حالی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا تھا جس میں راستہ گم کرنے والوں نے یہاں تک رائے قائم کی کہ "اب اسلام صرف چند سالوں کا مہمان ہے۔" (موج کوثر ص۵۲ مصنفہ شیخ محمد اکرام صاحب ایم اے)

اس نازک دور اور نامساعد حالات میں علمائے دیوبند کثر اللہ جماعتہم نے جس طرح ہمت و استقلال کا ثبوت دیا ہے اس میں ان کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ آخر بتلایئے کہ اس وقت تمام گمراہ کن تحریکوں کا مقابلہ کس نے کیا؟ ظالم برطانیہ کے فولادی پنجہ سے کس نے ٹکر لی۔ جان عزیز کو ہتھیلی پر رکھ کر کس نے جہاد ۱۸۵۷ء میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا؟ آریوں اور پادریوں کا تعاقب کس نے کیا؟ ان کی تردید میں کتابیں اور رسالے کس نے لکھے تقریروں سے ذریعہ اسلام کی حقانیت واضح کرتے ہوئے ان باطل فرقوں کے مکائد سے مسلمانوں کو آگاہ کیا؟ اور اس ہنگامے میں کس جماعت کے ساتھ انسانیت سوز سلوک روا رکھا گیا؟ اور ملک عزیز سے جلاوطنی کی صعوبتیں اور سزائیں کس جماعت کی اکثریت کو دی گئیں؟ اور تختہ دار پر لٹکنے کے لیے زبان حال سے یہ کہتے ہوئے کس نے خوشیاں منائیں کہ ؎

فنا فی اللہ کی تہ میں بقا کا راز مضمر ہے
جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

برطانیہ کا ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جس کا یہ دعویٰ تھا کہ ہماری حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا اگر ایک جگہ غروب ہوتا ہے تو دوسری جگہ طلوع ہوتا ہے اور برطانیہ کے مدبر وزیر اعظم مسٹر گلیڈسٹون نے یہ کہا تھا کہ اگر آسمان بھی ہمارے سروں پر گرنا چاہے تو ہم سنگینوں پر اسے تھام سکتے ہیں (معاذ اللہ) اس دور میں بھی علمائے دیوبند نے اسی ظالم برطانیہ کے خلاف صدائے حق بلند کی اور اس سے نبرد آزما ہوئے۔ چنانچہ یوپی کے گورنر سر جیمس مسٹن نے اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی (المتوفی ۱۳۳۹ھ) کے بارے میں ایک موقع پر کہا تھا کہ "اگر اس شخص کو جلا کر خاک بھی کر دیا جائے تو وہ بھی اس کوچہ سے نہیں اڑے گی جس میں کوئی انگریز ہوگا" نیز یہ بھی انہیں کا مقولہ ہے کہ اگر اس شخص کی بوٹی بوٹی کر دی جائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کے خلاف عداوت ٹپکے گی (حاشیہ سوانح قاسمی جلد ۲ ص۔۔ مصنفہ حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی) (المتوفی ۱۳۷۵ھ) غالباً ایسے ہی موقعہ کے لیے کہا گیا ہے کہ

ع وہی مومن ہے جس کو دیکھ کر باطل پکار اٹھے
کہ اس مرد خدا پر چل نہیں سکتا فسوں میرا

عیسائی بنانے کیلئے طریق کار

آپ بحوالہ پہلے یہ پڑھ آئے ہیں کہ انگریز نے ہندوستان میں نظام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی تمام ہندوستانیوں کو ایک ساتھ عیسائی بنانے

دو سب دیکھنا شروع کیا۔ اس کے لیے طاقتوں اور حیلوں، ٹوکریوں
اور نوکریوں کی پیشکش کے علاوہ اور بھی کئی حربے اختیار کیے گئے۔ ان میں
ایک طریق یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو اتنا غریب اور مفلوک الحال کر دیا جائے
کہ وہ عیسائیوں کی جھولی میں پڑنے کے لیے مجبور و ناچار ہو جائیں۔ چنانچہ
عوام کی غربت اس حد تک پہنچا دی گئی تھی کہ بقول سرسید صاحب
[illegible] ہر ہندوستانی اپنی گردن کٹوانے کو خوشی تیار
رہتا تھا۔ (بغاوت ہند ص [illegible]) اور سب سے زیادہ خطرناک اور مہلک
طریقہ جو انگریزوں نے تجویز اور اختیار کیا تھا وہ یہ تھا کہ قرآن پاک اور اس کی
تعلیم علوم اسلامیہ کو یکسر مٹا دیا جائے تاکہ ایمان و ایقان کی وہ پختگی جو مسلمانوں
کو حاصل ہے بالکل ختم ہو جائے اور عیسائیت کا راستہ ان کے لیے سہل
اور ہموار ہو جائے اور اس کے مقابلہ میں انگریزی تعلیم کو اس قدر عام اور رائج
کر دیا جائے کہ کوئی شخص اپنے لیے اس کے سوا چارہ کار نہ پائے۔ چنانچہ
قرآن کریم جیسی جامع و مکمل اور بے نظیر اور انقلاب انگیز کتاب کی بے پناہ قوت
و طاقت سے خائف اور بدحواس ہو کر برطانیہ کے مشہور و ذمہ دار وزیر اعظم
گلیڈ اسٹون نے بھرے مجمع میں قرآن کریم کو اٹھاتے ہوئے بلند آواز سے
یہ کہا تھا کہ جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں
ہو سکتی۔ (دیکھو از خطبہ صدارت ص [illegible] اجلاس پنجاہ سالہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل
کانفرنس علیگڑھ از حضرت مدنیؒ)

اور ہنری سر جیکسن طامس نے کہا کہ مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے
جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہو سکتے اس لیے کہ احکام قرآنی کی
موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔ (دیکھو از حکومت خود اختیاری ص [illegible])

الغرض قرآن کریم کو مٹانے اور مسلمانوں کے اسلامی جذبات کو
ہندوستان سے نیست و نابود کرنے کے لیے ایسے ایسے حربے استعمال کیے
گئے کہ شیطان بھی دم بخود ہو کر رہ گیا اور لارڈ میکالے نے تو صاف لفظوں
میں کہا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ و نسل کے
اعتبار سے ہندوستانی ہوں لیکن دل و دماغ کے اعتبار سے فرنگی (دیکھو اخبار
مدینہ بجنور ۔ فروری [illegible]ء)

یہ سچ ہے کہ پچھلے زمانے کو کافی حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ جیسا کہ
کسی بھی صاحب علم پر یہ مخفی نہیں ہے۔ یہ طریقہ وہ تھا جو براہ راست حکومت
برطانیہ اور اس کے ذمہ دار اصحاب نے اختیار کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ
پادری صاحبان کی طرف سے دین کی مخالفت کی نگرانی اور مالی سرپرستی خود
انگریز کر رہا تھا۔ عیسائیت کی جارحانہ تبلیغ ہندوستان میں جو شروع کی
گئی وہ اپنے مقام پر ایک مستقل فتنہ اور آفات ارضی میں سے ایک بہت
بڑی آفت تھی۔ مسلمانوں پر تو حکومت کی طرف سے صدہا آئینی پابندیاں عائد تھیں
کہ وہ انگریز کے خلاف لب کشائی کرنے کے مجاز نہیں۔ مگر (العیاذ باللہ)
اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پادریوں پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی بقول کسے

ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

پادریوں کی تبلیغ

ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے سلطنت اور اقتدار جانے کی دیر تھی کہ مختلف
قسم کے مذہبی فتنے عذاب الٰہی کی صورت میں نمودار ہوئے اور ساون کے
مینڈکوں کی طرح بازاروں اور کوچوں گلیوں اور محلوں میں پادری صاحبان
جوق در جوق اور جماعت در جماعت گردش کرتے ہوئے اور مسلمانوں کے ایمان
پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے نظر آنے لگے اور ہندوستان میں شاید ہی کوئی قابل ذکر
شہر اور خوش نصیب قصبہ ایسا ہوگا جس کو پادری صاحبان نے اس دور
میں اپنے منحوس پاؤں سے نہ روندا ہو اور اسلام کے خلاف خوب زہر اگل کر
مسلمانوں کی دل آزاری نہ کی ہو اور جارحانہ رنگ میں عیسائیت کی تبلیغ
میں کوئی کمی چھوڑی ہو اور مسلمانوں کو چیلنج نہ دیا ہو۔ ایسے تمام واقعات کا
استیعاب اور احاطہ نہ تو ہمارے بس کا روگ ہے اور نہ ان پر ہمارا مدعا
موقوف ہے اس لیے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں۔ صرف دو تین واقعات بطور

سکتا ہے اور نادان کے لیے تو دفتر کے دفتر بھی بے سود ہیں۔

چاندپور کا مذہبی اجتماع

ہندوستان میں عیسائیت کی وسیع پیمانہ پر تبلیغ کو دیکھ کر ہندوؤں میں بھی یہ جرأت پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے مذہب کا پرچار کریں اور عیسائیوں کی طرح وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ مذہبی امور میں الجھتے رہیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہے کہ مشہور شہر شاہجہانپور سے پانچ چھ میل کی مسافت پر ایک قصبہ تھا جس کا نام چاندپور تھا۔ وہاں کے ایک ہندو رئیس منشی پیارے لال کبیر پنتھی نے ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں ایک مذہبی جلسہ بنام "میلہ خدا شناسی" مقرر کیا۔ جس میں مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کا باہمی مباحثہ طے پایا اور تینوں فریق اس میں شریک ہوئے مگر پادری نے کمال ہوشیاری اور انتہائی چالاکی سے مختصر سی نہایت بے معنی اور مہمل کمی ہوئی تقریریں شروع کی کہ میاں کبیر نے کنول کے پھول میں جنم لیا اور ان کے پنتھ میں جاگتے سوتے سانس چلتا رہتا تھا۔ الغرض جس کو چیستاں اور پہیلی کہنا زیادہ مناسب ہوگا اور اس طرح اپنی اور اپنے ہم مذہبوں کی جان چھڑالی اور اصل گفتگو عیسائیوں اور مسلمانوں میں ہی عیسائیوں کی طرف سے ان کے دیگر نامی گرامی پادریوں کے علاوہ پادری نولس صاحب انگلستانی بھی تھے جو بڑے لسّان، عمدہ مقرر اور چوٹی کے مناظر تھے۔ پادری نولس صاحب کا یہ بے بنیاد دعویٰ تھا کہ مسیحی دین کے مقابلہ میں محمدی دین کی کچھ حقیقت نہیں (العیاذ باللہ) اور اہل اسلام کی طرف سے جو حضرات اس موقع پر موجود تھے ان میں مشاہیر میں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ اور حضرت مولانا سید ابوالمنصور صاحب دہلویؒ امام فن، مناظرہ اہل کتاب خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر حضرات علماء اور اہل علم اور دیندار مسلمانوں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ پہلے دن تو اس مباحثہ میں متعدد حضرات نے حصہ لیا اور پادری نولس صاحب کے مزعوم دلائل کے جوابات دیتے رہے اور اپنے دعاوی کا اثبات کرتے رہے۔ مگر دوسرے دن مناظرہ میں صرف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے حصہ لیا اور ایسے زبردست دلائل اسلام کی حقانیت پر پیش کئے کہ مجمع داد تحسین دیئے بغیر نہ رہ سکا اور دین مسیح کے منسوخ اور ناقابل اتباع ہونے پر ایسے ٹھوس براہین پیش کئے کہ پادری باہم کہتے تھے آج ہم مغلوب ہو گئے (ملخصاً کے مذہب بحث مذکور میلہ خدا شناسی ص ۳۳) اس مناظرہ کی مکمل روداد اسی کتاب میں ملاحظہ فرمائیے کہ پادریوں کا غرور سر کیسے سرنگوں ہوا اور اسلام کی حقانیت اور صداقت کس طرح آشکارا ہوئی۔ سچ ہے کہ ع

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

شاہجہان پور

اس مناظرہ کے تقریباً دو سال بعد ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں شاہجہانپور میں اہل اسلام اور مختلف باطل فرقوں کا مناظرہ اور مباحثہ ہوا جس میں پنڈت دیانند سرسوتی، منشی اندرمن، پادری اسکاٹ مفسر انجیل اور پادری نولس صاحب وغیرہ نے حصہ لیا اور اہل اسلام کی طرف سے متعدد علماء اور مشاہیر اس وقت اور اس مقام پر موجود تھے مگر مناظرہ پادریوں اور مسلمانوں کا ہوا اور لالے وقت کی نزاکت سے فائدہ اٹھا گئے اس میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ مناظر تھے۔ انہوں نے عقلی و نقلی رنگ میں ایسی صحیح اور قطعی دلیلیں پیش فرمائیں کہ پادری صاحبان سے ان کا کوئی معقول جواب نہ بن پڑا اور اس موقع پر بھی اسلام اور اہل اسلام کا بول بالا ہوا۔ مسلمانوں کی کھلی فتح کا مسلمانوں اور عیسائیوں کے علاوہ متعصب ہندوؤں نے بھی اقرار کیا۔ چنانچہ منشی پیارے لال نے یہ کہا کہ مولوی محمد قاسم صاحبؒ کا کیا حال بیان کیجئے، ان کے دل پر علم کی سرمستی (علم کی دھن) بول رہی تھی

(مباحثہ شاہجہانپور ص ۹۲)

اور سو سے زائد صفحات پر اس مناظرہ کی روداد بارہا طبع ہو چکی ہے۔ اہل علم

[illegible] سے استفادہ کریں [illegible] پادری [illegible]
چنانچہ [illegible] میں ہے کہ ایک
پادری [illegible] نام تھا اس سے گفتگو ہوئی اور [illegible]
[illegible] کو [illegible] کر سکیں۔

پادری فنڈر کا فتنہ

پادری ڈاکٹر کامل فنڈر (جو ایک جرمنی باشندہ تھا پہلے روسی سلطنت لے [illegible]
تو شاہ [illegible] کر دیا تھا۔ جس نے فارسی زبان میں میزان الحق نامی ایک
کتاب شائع کی۔ پھر اس کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ (ملاحظہ ہو [illegible] صـ ۲
مصنفہ [illegible] اے پی ڈی [illegible] مترجمہ عبد [illegible] پی ایچ
ڈی پنجاب [illegible] سوسائٹی انارکلی لاہور) نے ہندوستان میں پہنچ
کر اردو انگریزی [illegible] حاصل کر کے جس دریدہ دہنی سے عیسائیت کی
تبلیغ شروع کی اور اہل اسلام کے خلاف جو زہر اگلا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ
علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں بہتان تراشی
اتہام بازی اس نے اختیار کی اس سے مسلمان تو آخر مسلمان ہیں منصف مزاج
غیر مسلم بھی صد نفرین کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پادری فنڈر جو اپنی بے باکی
میں مشہور تھا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے تک تبلیغ عیسائیت
کے سلسلہ میں سرگرم عمل تھا، چنانچہ حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب عثمانی
کیرانویؒ ـــــــــ جو حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء
پانی پتی قدس سرہ العزیز کی اولاد میں سے تھے اور سلسلہ ولی اللہی میں منسلک ہو کر
دہلی میں تعلیمی اور تبلیغی خدمت انجام دے رہے تھے اور آپ کی ولادت
جمادی الاول ۱۲۳۳ھ میں کیرانہ ضلع مظفر نگر میں ہوئی تھی) نے پادری فنڈر
کے ساتھ خط و کتابت کی اور اس کو مناظرہ کا چیلنج دیا اور تمام ابتدائی مراحل
طے کر لینے کے بعد اکبر آباد (آگرہ) میں کئی دن کے لیے مناظرہ طے ہوا۔ یہ مناظرہ
۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء مطابق ۱۱ رجب ۱۲۷۰ھ کو ہوا تھا جو اسلام اور عیسائیت
کی صداقت اور حقانیت واضح کرنے کے لیے فیصلہ کن اور تاریخ ہندوستان
میں اس موضوع کا سب سے پہلا اور عظیم الشان مناظرہ تھا جس میں طرفین سے
معزز مسلمان ہندو اور انگریز اس مناظرہ کے جج اور منصف قرار دیے گئے تھے
چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے آخری اور سچے دین کا حامی اور مددگار ہے اس نے اسلام
کی صداقت کا ظاہری سبب اس موقع پر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کو
بنایا جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیت علم، ذہانت اور تبحر علمی سے [illegible]
کے متواتر مناظرہ میں دلائل قاہرہ اور براہین ساطعہ سے اس امر کو ثابت کر دیا
کہ موجودہ انجیل جس پر آج پادری صاحبان کو فخر و ناز ہے بالکل محرف ہے
جس میں ذرہ برابر شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور خود عیسائیوں کے پنڈال
اور مجمع میں سے مناظر پادری فنڈر صاحب کو عام جلسہ میں انجیل تحریف تسلیم کئے
بغیر اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رات کی تاریکی ہی میں پادری فنڈر
صاحب اپنے چیلوں سمیت بھاگ گئے۔ جب چوتھے دن حسب معمول گفتگو کا
وقت آیا تو پبلک اور منصف تو سبھی حاضر ہو گئے مگر پادری فنڈر صاحب کا
کہیں نام و نشان نہ ملا۔ ناچار تمام ججوں اور منصفوں کو [illegible] قرار دیئے گئے
تھے عیسائیت کے خلاف فیصلہ کرنا پڑا اور پادری فنڈر صاحب نے ہندوستان
کو چھوڑ کر دیگر ممالک اسلامیہ میں اپنے دجل کا جال پھیلانے کی سعی اور کوشش
کی۔ چنانچہ وہ پھرتا پھراتا ترکی بھی جا پہنچا اور وہاں کے علماء کو چیلنج کر کے [illegible]
دیا۔ [illegible] اس کے ہتھکنڈوں سے واقف نہ تھے اس لیے دریدہ دہنی کے [illegible]
تھے بالآخر سلطان عبدالعزیز خان ترکیؒ کی خواہش اور صدر اعظم خیر الدین پاشا
تونسی کی تحریک پر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے عربی زبان میں ایک
محقق اور مدلل کتاب تصنیف فرمائی جس کا نام اظہار الحق رکھا جس کا ترکی، فرانسیسی
اور یورپ کی مختلف اور متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ جب ۱۸۶۴ء میں انگریزی زبان
میں اس کا ترجمہ شائع ہوا تو مشہور اخبار ٹائمز آف لندن نے اس پر تبصرہ کرتے
ہوئے یہ لکھا کہ اگر لوگ اس کتاب کو پڑھتے رہے تو دنیا میں عیسائی مذہب
کی ترقی بند ہو جائے گی۔ (ملاحظہ ہو علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اول صـ ۳۳)
راقم الحروف نے آج سے تقریباً سولہ سترہ سال پہلے اظہار الحق کے

عربی نسخہ کا مطالعہ کیا ہے بلاشبہ رد عیسائیت کے لیے بہترین اور لاجواب کتاب ہے مگر صرف اہل علم حضرات کے لیے

ع ان مسائل میں ہے کچھ ژرف نگاہی درکار
یہ حقائق ہیں تماشائے لب بام نہیں

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کے علاوہ اس وقت حضرت مولانا رحمت علی صاحبؒ منگوریؒ مولانا سید محمد علی صاحبؒ مونگیری مولانا منصور علی صاحب آگروی نے بھی عیسائیت کا خوب رد کیا اور اسلام کے ناقابل شکست قلعہ کو محفوظ رکھنے کی سعی کی۔

آریہ کا فتنہ

آپ اوراق گذشتہ میں یہ پڑھ چکے ہیں کہ انگریزنے اقتدار اور حکومت کے بل بوتے پر اور پادریوں نے حکومت برطانیہ ہی کے زیر سایہ رہ کر تبلیغ کے ذریعہ کس طرح مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالا اور کیا کیا کوششیں اور کاوشیں کیں۔ یہ مصائب مسلمانوں کے لیے کیا کم تھے! مگر جب مصائب و آفات کے گھنگھور بادل چھا جاتے ہیں تو ان سے مصیبت کا صرف ایک ہی قطرہ نہیں ٹپکتا بلکہ موسلا دھار بارش ہوتی ہے کہ مشکلات و بلیات کے سیلاب اُمڈ آتے ہیں ایک طرف انگریز اور عیسائیوں کا عظیم فتنہ تھا اور دوسری طرف انگریزوں کے چہیتے ہندوؤں اور آریاؤں کا کرتا دھرتا سوامی دیانند سرسوتی جو اپنے منطقیانہ اور فلسفیانہ استدلات میں مشہور تھا، پورے ہندوستان میں لوگوں کو آریہ بنانے اور مسلمانوں کو مرتد کرنے کی (معاذ اللہ) مہم چلا رہا تھا بیسیوں اس کے شاگرد اور چیلے تھے جو اسی کی ڈگر پر اسلام کے خلاف زہر اگلتے تھے سرسوتی کی حماقت اور دریدہ دہنی کا اندازہ لگانا ہو تو اس کی کتاب ستیارتھ پرکاش کا چودھواں باب ملاحظہ کیجئے جس میں اس نے بخیال خویش قرآن کریم کی بسم اللہ سے لے کر والناس تک کی تمام سورتوں پر اعتراضات کئے اور ان کی کمی اور خامی بتلائی ہے (العیاذ باللہ) سرسوتی ہر مقام پر اسلام اور اسلامی عقائد پر خوب برستا تھا اور اہل اسلام کو جواب کے لیے للکارتا تھا۔ چنانچہ اپنا تبلیغی دورہ کرتا ہوا ۱۸۷۸ء میں وہ رڑکی جا پہنچا اور کچھ عرصہ وہاں قیام کر کے اسلام کے خلاف خوب زہر اگلتا رہا مگر اس وقت وہاں کوئی ایسا مستند اور متبحر عالم نہ تھا جو اس کے لغو اعتراضات کا جواب دے سکتا۔ اس لیے میدان کو خالی دیکھ اس کی ہمت اور دو چند ہو گئی حتیٰ کہ سر بازار اس نے اسلام کے خلاف تاؤ دیا اور واہی تباہی باتیں کہنا شروع کر دیں۔

ان دنوں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ (جو پہلے ہی سے ضیق النفس کے موذی مرض سے دوچار تھے) بخار اور کھانسی کے شدید مرض میں مبتلا تھے اور ان کی حالت کی خبریں باقاعدہ ان کے اصحاب و تلامذہ اور عقیدت مندوں کو پہنچتی رہتی تھیں۔ سرسوتی کے کانوں میں بھی حجۃ الاسلامؒ بیماری کی خبر پہنچ گئی تھی۔ جب رڑکی کے کچھ درد دل رکھنے والے اور غیور مسلمانوں نے سرسوتی کا حسب استطاعت جواب دینا ضروری سمجھا تو پنڈت صاحب یہ کہہ کر بات ٹال گئے ——— کہ ہم تو جاہلوں سے گفتگو کرنے کے لیے بالکل آمادہ ہی نہیں، اپنے کسی بڑے مذہبی عالم کو بلاؤ پھر ہم گفتگو کریں گے ——— پنڈت دیانند سرسوتی اس قسم کے مواقع پر اسی قسم کے پوچ حیلے بہانوں سے جان چھڑایا کرتے تھے۔ ———

——— اور حضرت نانوتویؒ کی علالت کی خبر سُن کر اس سے پنڈت جی نے یہ ناجائز فائدہ اٹھایا کہ ہاں اگر مولوی کاسم (مولوی قاسمؒ) آئیں تو پھر ہم گفتگو کریں گے۔ پنڈت جی نے حالات سے یہ بھانپ لیا تھا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ اس شدید علالت میں کیونکر اور کیسے آ سکتے ہیں؟ لہٰذا کوئی ایسی شرط لگاؤ کہ گفتگو کی نوبت ہی نہ آئے اور نہ پنڈت جی کے مبلغ علم کا بھرم کھلے اور نہ شرمندگی حاصل ہو۔ بقول شخصے نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی جب لوگوں نے شدید اصرار کیا کہ پنڈت جی آپ مولانا نانوتویؒ ہی سے گفتگو کرنے پر کیوں مُصر ہیں تو وجہ تخصیص یہ بیان کی "میں تمام یورپ میں پھرا، اب تمام پنجاب میں پھر کر آیا ہوں۔ ہر اہل کمال سے مولانا کی تعریف سنی۔ ہر کوئی مولانا کو یکتا کہتا ہے اور میں نے مولانا کو شاہجہانپور کے جلسہ میں دیکھا ہے۔ ان کی تقریر

...ہاں یہ تو ہے اگر آدمی مباحثہ کرے تو ایسے اہل دیکھے کہ جس
کو فائدہ ہو کچھ نتیجہ نکلے۔

(مقدمہ انتصار الاسلام از مولانا فخر الحسن صاحبؒ)

اہل رڑکی نے جب حضرت نانوتویؒ سے تشریف آوری کی درخواست کی تو حضرت
کے لیے خود شدت علالت میں وہاں پہنچنا تو ممکن نہ تھا۔ آپ نے اپنی طرف
سے چند تلامذہ بھیجے جن میں خصوصیت سے حضرت مولانا شیخ الہند
محمود الحسن صاحبؒ، حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ اور مولانا عبدالعلی
صاحبؒ قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات پیادہ جمعرات کے دن مغرب سے پہلے
روانہ ہوئے اور شام کی نماز دیوبند کے باغوں میں پڑھی گئی۔ جمعہ کی صبح
رڑکی پہنچے، حتی کہ نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد مقامی باشندوں کے ہمراہ پنڈت جی
کی کوٹھی پر پہنچے اور بحث و مباحثہ کی دعوت دی۔ مگر پنڈت جی اسی پرانی
ضد پر مصر رہے کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ آئیں تو مباحثہ کروں گا۔ جب وہ
کسی صورت مباحثہ کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو یہ حضرات واپس ہو گئے اور
اہل رڑکی نے باوجود حضرت نانوتویؒ کی علالت کے محض اتمام حجت کے لیے
وہاں پہنچنے کی استدعا کی تو مولانا باوجود علالت و ضعف اور کمزوری کے جس
طرح بھی ہو سکا رڑکی تشریف لے گئے۔

رڑکی میں اجتماع

حضرت مولاناؒ اپنے تلامذہ اور احباب کے ساتھ شہر میں مقیم تھے اور سرسوتی صاحبؒ کی
چھاؤنی میں براجمان تھے۔ بحث و مباحثہ کے لیے ابتدائی مراحل طے کرنے کے
لیے خط و کتابت ہوتی رہی مگر سرسوتی صاحب اور ان کے معتقدین اس
سے بھی گھبرا گئے اور یہ بہانہ کیا کہ "ہمارے سامنے کام بند ہو گئے آج سے
ہمارے پاس کوئی تحریر نہ آئے۔ ہم ہرگز جواب نہ دیں گے۔" تتمہ انتصار الاسلام

دوسرے روز حضرت مولانا محمد احسان اللہ صاحب میرٹھی اور
اپنے چند رفقاء کے ساتھ چھاؤنی چلے گئے اور کرنل صاحب کی کوٹھی پر انتظار کیا گیا۔
کپتان صاحب اور کرنل صاحب نے مولانا کی بڑی آؤ بھگت کی اور ان سے ملاقات
مضامین پر تبادلۂ خیال کیا اور دعا کی تھی۔ دیکھئے جہاں پنڈت جی رونق افروز ہیں جا کر
گفتگو ہی مناسب ہے مگر نہیں، کیونکہ عام ہیں، تاریکی میں پنڈت جی نے اس کا
نہ کیا تھا کہ جب پنڈت جی سر بازار اسلام کے خلاف اعتراضات کرتے تھے
اور خوب لوگوں کو سنا سنا کر کہتے تھے اس وقت تو کوئی خطرہ اور اندیشہ نہ تھا
مگر اب اندیشہ پیدا ہو گیا (مصنف) اس پر کپتان صاحب نے کہا اچھا بعد کو
کوٹھی پر گفتگو ہو جائے ہم فساد کا بندوبست کریں گے۔ پنڈت جی سے کہا ہم
تو یہیں کوٹھی پر گفتگو کریں گے اور پھر بھی اگر مجمع عام نہ ہوا جناب مولانا نے
پنڈت جی سے کہا کہ لیجئے اب تو مجمع عام نہیں اس بارہ ہی آدمی ہیں اب
سن۔ آپ اعتراض کیجئے ہم جواب دیتے ہیں۔ پنڈت جی نے کہا کہ میں گفتگو
کے ارادہ سے نہیں آیا تھا (توہین کا سہرا کمانے کا بہانہ کرتے رہے ان کے ساتھ
ہی گفتگو کرنے پر کیسے مصر رہتے۔ مصنف) مولانا نے فرمایا کہ اب ارادہ کیجئے ہم آپ
کے مذہب پر اعتراض کرتے ہیں۔ آپ جواب دیجئے یا آپ اعتراض ہم پر کیجئے
اور ہم سے جواب لیجئے۔ پنڈت جی نے ایک نہ مانی۔ شرائط کے باب میں گفتگو ہوئی
لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مجلس برخاست ہوئی۔ جناب مولانا اپنی فرودگاہ پر تشریف
لائے اور کئی روز تک شرائط میں رد و بدل رہی۔ آخر کار مولانا نے یہ کہلا بھیجا کہ
پنڈت جی کسی جگہ مباحثہ کر لیں بیسیوں شرائط کر لیں، عوام میں کریں، خواص میں کریں
تنہائی میں کریں مگر کریں۔ پنڈت جی (دیانند سرسوتی) کوٹھی پر مباحثہ کرنے کو
راضی ہوئے اور وہ بھی اس شرط پر کہ دو سو سے زیادہ آدمی نہ ہوں۔ مسلمان
پنڈت جی کی کوٹھی پر جانے کو تیار تھے مگر سرکار کی طرف سے ممانعت ہو گئی کہ
چھاؤنی کی حد میں کوئی شخص گفتگو نہ کرنے پائے۔ شہر میں، جنگل میں جہاں کہیں بھی
جو چاہے گفتگو کرے۔ مولاناؒ نے پنڈت جی کو کہا کہ نہر کے کنارے پر یا عیدگاہ کے
میدان میں یا اور کہیں مباحثہ کر لیجئے۔ مگر پنڈت جی کو بہانہ ہاتھ آگیا انہوں
نے ایک نہ سنی۔ یہی کہا کہ میری کوٹھی پر چلے آؤ۔ چونکہ سرکار کی طرف سے ممانعت
ہو گئی تھی (بلکہ پنڈت جی اور ان کے حواریوں نے ممانعت کروا دی تھی۔ مصنف)
اس لیے جناب مولانا کوٹھی پر نہ جا سکے اور پنڈت جی کوٹھی سے باہر نہ نکلے۔

مولانا محمود الحسن صاحبؒ دیوبندی قرار پائے۔ اس مبارک مدرسہ کے آغاز کی خبر جب بتلانے والوں نے مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کو بتائی اور یہ کہا کہ حضرت ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ اس کے لیے دعا کی جائے تو حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا۔

"سبحان اللہ۔ آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔" علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اول صفحہ (سوانح قاسمی جلد ۲ صفحہ ۲۲۶ از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ)

بلاشبہ دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں تحفظ اور بقائے اسلام کا ذریعہ ہے اور اس کی وجہ سے ہزاروں پیاسوں کو سیرابی نصیب ہوئی۔ آہ سے

پینے میں آ گیا کہاں پیتی ہیں اڑ کے مستیاں

اتنی ہے تُند مے یہاں مست ہوں اور پی نہیں

حفظِ قرآن کریم

حضرت نانوتویؒ تصنیح کتب اور دینی بحث و مباحثہ اور سرگرمیوں میں ایسے منہمک رہتے تھے کہ ان اہم دینی کاموں سے فراغت کا موقع ہی ہاتھ نہ آسکا اور دل میں قرآن کریم کے حفظ کا جو شوق تھا وہ کب چین لینے دیتا تھا۔ بالآخر دو سال کے صرف رمضان میں قرآن پاک یاد کر لیا اور ایسی روانی کے ساتھ سُنا دیتے تھے کہ کوئی کہنہ مشق پختہ کار حافظ بھی ایسا نہ سنا سکتا ہو۔ چنانچہ خود ان کا بیان (سوانح قاسمی صفحہ ۲۲ از مولانا محمد یعقوب صاحبؒ میں) ہے کہ "فقط دو سال رمضان میں میں نے یاد کیا ہے۔ اور جب یاد کیا پاؤ سیپارہ کی قدر یا اس سے کچھ زائد یاد کر لیا۔ اور جب سنایا ایسا صاف سنایا جیسے اچھے پرانے حافظ" اور یہ کلام اللہ کی عظمت اور اس کی طرف پوری توجہ اور محبت کا نتیجہ تھا کہ اس کا ایک ایک حرف سینہ میں نقش ہو گیا ہے

ترکی بھی شیریں تازی بھی شیریں حرفِ محبت نہ ترکی نہ تازی

وفاتِ حسرت آیات

آہ! وہ وقت بھی آ پہنچا جس سے کسی مخلوق کو مفر نہیں۔ [illegible] جاتی، پر اس سے چھٹکارا نہیں۔ ہزاروں احتیاطیں کی جائیں اس سے خلاصی نہیں۔ سیکڑوں معالج پاس کھڑے رہ جائیں، جاتی سانس سے [illegible] نہیں۔ حکیموں اور ڈاکٹروں کے علاوہ تعویذوں اور گنڈوں اور جھاڑ پھونک کے ذریعہ کوئی مخلص تلاش کر لیا جائے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ بھلا یہ فتنہ بھی کبھی ٹلی ہے؟ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ کا جام ہر ایک پیا ہے۔ اگر بچے گی تو صرف وہ ذات جس کے بغیر خالق و مالک کارخانۂ جہاں میں کوئی متصرف نہیں۔ البقاء للہ وحدہٗ۔ بالآخر ۴ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء بروز جمعرات بعد از نماز ظہر ہندوستان کا یہ درخشندہ ستارہ انگریز کے خلاف لڑنے والا بہادر سپاہی، پادریوں کا تعاقب کرنے والا شہرۂ مناظر، آریوں کے چھکے چھڑانے والا بیباک ناقد، اسلام کے خلاف فتنوں کی سرکوبی کے سلسلہ میں ہمہ تن پیش کرنے والا جانثار مسلمان، سخاوت و ایثار کا پتلا، قوم و ملت کا ہمدرد، علوم دینیہ کے احیاء کا علمبردار، حامیٔ شفقت اور ماحی بدعت، ملکانِ اممانی حقانیت اسلام کو ثابت کرنے والا فصیح و بلیغ اور زاد قلیل پر قناعت کرنے والا بے نفس صوفی، مسرت کی آغوش میں جا پہنچا اور ہزاروں دلوں کو زخمی کر گیا اور دیوبند ہی میں حکیم مشتاق احمد صاحبؒ کے خطۂ ارضی میں سب سے پہلی قبر ہی حضرت نانوتویؒ کی بنی۔ اللہ تعالیٰ کی کروڑوں رحمتیں نازل ہوں اس بزرگ ہستی پر جس کے لگائے ہوئے مبارک پودے کی وجہ سے ہم روحِ اسلام سے سرفراز ہو گئے ہیں۔

ویرحم اللہ عبداً قال امینا

گونجے کا چار کھونٹ میں نانوتویؒ کا نام
بانٹا ہے اس نے بادۂ عرفانِ مصطفیٰ

—— شورش کاشمیری

سرپرست دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

مضمون: ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی

پاک و ہند میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ[1] کی ذات محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ آپ تحریکِ آزادی کے علمبردار اور اپنے وقت کے فقیہ و امام تھے۔ آپ نے علم کے تمام شعبوں میں بے پایاں خدمات انجام دیں۔ آپ ایک وقت میں فقیہ بھی ہیں، محدث و مفسر بھی اور شیخِ وقت بھی ہیں۔ آپ کا روحانی و علمی فیض ملک اور بیرونِ ملک اس طرح پھیلا کہ آج تک آپ کی روحانی اولاد اس کو جاری کئے ہوئے ہے۔ آپ کی علمی قابلیت کے پیشِ نظر ہی مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "کیا مولانا نانوتویؒ اور گنگوہیؒ غزالی اور رازی سے کم تھے؟ واللہ بعض تحقیقات میں یہ لوگ ان سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔"[2] علماء دیوبند کی سندِ حدیث کسی نہ کسی درجہ میں آپ تک پہنچتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سے حضرت گنگوہیؒ کا رابطہ

مولانا کو جتنا عشق علمِ دین پڑھانے سے تھا اتنا ہی اُنس دینی مدارس سے بھی تھا۔ آپ اپنی استطاعت کے مطابق دینی مدارس کی خدمت بھی کیا کرتے تھے۔ اور ان کو اپنے مشوروں سے بھی نوازتے رہتے تھے۔ آپ باقاعدہ مدارس کے جلسوں میں شریک ہوتے۔ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سے آپ کو بہت دلچسپی تھی۔ حضرت نانوتویؒ اپنی حیات میں دارالعلوم کی سرپرستی فرماتے رہے اور حضرت گنگوہیؒ رکنِ شوریٰ اور اراکین کے ساتھ مدرسہ کو ترقی دینے میں کوشاں رہے۔ ۱۲۹۷ھ میں مولانا نانوتویؒ کا انتقال ہوگیا تو آپ ہی مدرسہ کے سرپرست قرار دیئے گئے

[1] آپ کی ولادت ۶ ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۹ء بروز دوشنبہ بوقت چاشت بمقام گنگوہ ضلع سہارنپور ہوئی (عاشق الٰہی۔ تذکرۃ الرشید صفحہ ۱۳، ۱۴، مطبوعہ ۱۹۰۵ء میرٹھ)

[2] اشرف علی، مواعظ اشرفیہ ج ۲ صفحہ ۳۱ مطبوعہ ۱۹۵۸ء ملتان

آپ نے اپنی سرپرستی کا حق ادا کر دیا اور ہر مخالفت کا مردانہ وار مقابلہ کر کے دارالعلوم کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ آپ مدرسہ کے ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۵ء تک سرپرست رہے[1] دارالعلوم کے فتاویٰ کے جوابات خود ہی تحریر فرمایا کرتے تھے، جلسہ دستار بندی میں شریک ہوتے۔ دارالعلوم کا پہلا جلسہ دستار بندی ۱۲۹۰ھ جامع مسجد میں منعقد ہوا تھا۔ دوسرا جلسہ ۱۲۹۲ھ میں اور تیسرا جلسہ ۱۳۰۱ھ میں منعقد ہوا۔ اس میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی اور مولانا گنگوہی نے اس میں تاریخی وعظ فرمایا۔[2]

دارالعلوم کی پہلی مجلس شوریٰ میں ۱۲۹۸ھ سے ۱۳۲۳ھ تک آپ بھی حضرت نانوتوی کے ساتھ شامل تھے۔ دارالعلوم کو شروع ہی سے حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ جیسے بزرگوں کی سرپرستی کا شرف حاصل رہا جنھوں نے دن رات مدرسے کی ترقی کے لیے کوشش کی اور اس کو بامِ عروج پر پہنچایا۔

مظاہر العلوم سہارنپور کا افتتاح دارالعلوم دیوبند کے قیام کے چھ ماہ بعد رجب ۱۲۸۳ھ میں حضرت نانوتویؒ کے ہاتھوں ہوا تھا جس کے صدر مدرس مولانا مظہر صاحب تھے حضرت گنگوہیؒ کو جس طرح مدرسہ دیوبند سے عشق و محبت تھی۔ اسی طرح مظاہر العلوم کی ترقی کے بھی خواہاں تھے مولانا محمد مظہر ۱۲۹۲ھ سے ۱۳۰۲ھ تک سرپرست رہے۔ ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ کو آپکا انتقال ہو گیا ۱۳۱۴ھ کو مدرسہ کے ممبران نے مولانا گنگوہی کو سرپرست مقرر کیا[3] آپ ۱۳۲۰ھ تک بخیر و خوبی اپنے فرائض انجام دیتے رہے اور اس عرصے میں مدرسے نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی۔ مولانا خلیل احمد دیوبند سے مظاہر العلوم ۸ رجمادی الثانی ۱۳۱۴ھ کو حضرت گنگوہیؒ کے ایما پر تشریف لائے تھے۔

اشاعتِ حدیث

مولانا گنگوہی کو علوم اسلامیہ میں جو کمال اللہ نے عطا فرمایا تھا، وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ آپ ویسے تو تمام علوم مثلاً تفسیر، حدیث، منطق و فلسفہ، فقہ و اصول وغیرہ کے امام تھے۔ مگر علمِ حدیث اور فقہ سے آپ کو بہت شغف تھا۔ دینی علوم کی تدریس کا شوق آپ کو اسی وقت ہو گیا تھا جب آپ دہلی سے فارغ ہو کر وطن واپس تشریف لائے سب سے پہلے سید مولوی علی کو شرح جامی شروع کرائی تھی[1] ابتدا میں آپ نے تمام علوم شرعیہ کا درس دینا شروع کیا۔ جس وقت مولوی قادر علی نے آپ سے ہدایہ پڑھی تو آپ نے فرمایا کہ یہ چودھویں مرتبہ ہے کہ تم کو ہدایہ پڑھاتا ہوں[2] تیسرا حج ادا کرنے کے بعد آپ نے دورۂ حدیث شروع کیا جس میں بلادِ متفرقہ سے علوم معرفت کے پروانے کھنچ کھنچ کر آنے شروع ہو گئے۔ آپ نے علمِ حدیث کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور پر وقف کر دیا تھا اور جب تک بصارت نے ساتھ دیا۔ دورۂ حدیث پڑھاتے رہے۔ فتاویٰ نویسی کا سلسلہ تو نابینا ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔ آپ کے درس میں ہر سال تقریباً چالیس طالب علم شریک ہوتے تھے جن کے قیام و طعام کا انتظام آپ خود ہی فرماتے تھے۔

احادیث میں آپ صحاح ستہ کا دورہ کراتے تھے اور سب سے پہلے ترمذی شروع کراتے۔ دوران درس کسی سے گفتگو نہ فرماتے۔ اول روایتاً و درایتاً تحقیق و پایہ اعتبار پر بحث فرماتے۔ پھر رفع تعارض اور مسائل کا استنباط و استخراج فرماتے تھے۔ مشکل مسائل کو آسان اور عام فہم زبان میں حل فرماتے تھے پڑھاتے وقت طلبا سے اتنے بے تکلف ہو جاتے کہ کوئی بھی کٹ

---

[1] محمد طیب۔ دارالعلوم دیوبند ص۹۴ طبع اول ۱۹۶۵ء دیوبند

[2] محمد شفیع۔ مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ص۱۵ ۱۳۹۲ھ دیوبند۔

[3] عاشق الٰہی، تذکرۃ الخلیل، ص۱۳۲ مطبوعہ میرٹھ۔

[1] عزیز الرحمٰن تذکرہ، مشائخ دیوبند ص۱۱۱

[2] عاشق الٰہی۔ تذکرۃ الرشید حصہ اول ص۹۲

تب ظاہر کرنے میں جھجک محسوس نہ کرتا۔ دوران درس طلبہ کے حالات پر خاص توجہ رکھتے۔ مجھ کو پڑھ کر دوبارہ تقریر فرماتے جاتے تھے اور بہت پہلو پیدا ہونے کی تفتیش فرماتے جاتے تھے۔ پہلے تو آپ مشکل مسائل کو بار بار سمجھانے کی کوشش فرماتے۔ مگر پھر بھی اگر کوئی طالب علم اعتراض کرتا تو نہایت شفقت اور محبت سے سمجھاتے تھے۔

درس میں مشکل حدیث اور اصول فقہ کے نکات بیان فرماتے۔ دلائل و شواہد و اقوال سے مذہب حنفی کو ترجیح دیتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو امام صاحب کا مذہب حدیثوں میں ایسا روشن نظر آتا ہے کہ جیسا نصف النہار میں آفتاب[1] علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ آپ طلبا کی باطنی اور روحانی اصلاح بھی فرماتے تھے۔ ان کی حرکات و سکنات کو ترتیب کے مطابق ڈھالتے تھے۔ غرض یہ کہ آپ دوران درس ہی روحانی بیماریوں کا معالجہ فرماتے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے حلقۂ درس سے ایسے متبع شریعت علماء نکلے جنہوں نے دنیا کے گوشے گوشے میں علم و دین کی اشاعت و ترویج میں اپنی عمریں صرف کر دیں۔ ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء دورہ کا آخری سال تھا کیونکہ آپ کی بصارت میں کمی ہو چلی تھی۔ حدیث کی تقاریر میں "الکوکب الدری" آپ کی مشہور تقریر ہے۔ فضلاء کی تعداد ۳۰۰ سے زائد ہے۔ فارغ ہونے پر آپ زبانی اور تحریری اجازت نامہ بھی عنایت فرماتے تھے۔

حضرت گنگوہیؒ بہ حیثیت فقیہ

مولانا کی فقہی حیثیت بھی اپنے دور میں لاثانی تھی۔ فقہ آپ کا خصوصی فن تھا۔ اسی میں آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ گزرا۔ آپ کی علمی اور فقہی تحقیقات پر ہر دور کے علماء اور مشائخ نے اعتبار کیا ہے۔ فقہ کے وہ مسائل جن کو حل کرنے میں علماء عصر قاصر رہتے تھے۔ آپ کے یہاں اشاروں میں حل ہو جاتے تھے۔ اسی فقہی استعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت نانوتوی نے "ابو حنیفۂ عصر" کا لقب عطا فرمایا تھا۔ آپ کے متعلق حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری کا فرمان ہے کہ ان سے ایک صدی پہلے تک اس پائے کا فقیہ النفس علماء کی جماعت میں نظر نہیں آتا۔[1] آپ کو فقہ سے تو خصوصی تعلق تھا اور نہایت ہی ذوق و شوق سے اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ آپ بڑے سے بڑے مسئلہ کو مختصر مگر جامع الفاظ میں حل فرمایا کرتے تھے۔ ہندوستان بھر میں آپ کے فتاووں کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مولانا حکیم عبدالرشید محمود صاحب نے ایک مکتوب میں احقر کے نام تحریر فرمایا ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیری کا یہ فیصلہ ہے کہ مولانا گنگوہی تفقہ فی الدین میں علامہ شامی اور در مختار سے آگے ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی آپ کے متعلق فرماتے ہیں کہ میں نے مولانا رشید احمد کو فقہ حنفی کا ایک راسخ القدم امام اور مجتہد پایا۔[2] ایک مفتی کے لیے کامل یادداشت بھی بہت ضروری چیز ہے۔ مولانا کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ آنکھوں سے معذور ہونے کے بعد آپ نے مولانا یحییٰ سے فرمایا کہ فلاں مسئلہ شامی میں دیکھو۔ مولوی صاحب نے عرض کیا کہ وہ شامی میں نہیں ہے۔ آپ نے شامی منگوائی اور اس کے دو ثلث اوراق دائیں جانب کر کے ایک ثلث بائیں جانب کر کے فرمایا کہ دیکھو بائیں طرف کے صفحے کے نیچے کی جانب دیکھو۔ دیکھا تو مسئلہ اسی جگہ موجود تھا۔[3] آپ نے جو فتاوے اور رسائل مذہب حنفی کی تائید میں تحریر فرماتے ہیں، ان کے مطالعے سے آپ کی ذہانت، قوت استنباط اور ملکہ استخراج کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

دارالافتاء میں مولانا کی خدمات

مشائخ دیوبند کی فقہی جماعت میں جو کمال حضرت گنگوہیؒ کو حاصل تھا

---

[1] اشرف علی۔ الافاضات الیومیہ۔ ج ۳ ص ۲۳ مطبوعہ ۱۹۵۰ء کراچی

[1] محمد شفیع۔ مقدمہ فتاوے دارالعلوم دیوبند ص ۳۴

[2] عبید اللہ سندھی۔ سیاسی تحریک ص ۲۲، ۱۹۵۲ء لاہور

[3] عاشق الٰہی۔ تذکرۃ الرشید، حصہ دوم ص ۳۶

کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔ ابتداء میں حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ سوالات کے جوابات تحریر فرمایا کرتے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ میں کیونکہ اشاعت دین کا جذبہ بہت تھا۔ اس لیے آپ خطوط کے جوابات فوراً تحریر فرمایا کرتے تھے۔ اگر دن میں فرصت کم ملتی تو اپنے آرام کے وقت میں کمی فرما کر رات کو جوابات تحریر فرماتے۔ تاکہ سائل کو جواب جلد پہنچ جائے۔ مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ بہت سے سوالات حضرت کی خدمت میں بھیجے۔ لکھ دیا، آشوب چشم میں مبتلا ہوں، چنانچہ چشم بند کردہ جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ تمام جوابات اپنے ہی قلم سے تحریر فرماتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کی ابتداء کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ اور دارالعلوم کے فتووں کا دار و مدار آپ ہی کے سپرد تھا۔ آپ ہی کی یہ شان تھی کہ اگر کسی مسئلے میں خطا ہو جاتی تو بلا تکلف فرما دیتے کہ مجھے تحقیق نہیں۔

مجموعہ فتاویٰ رشیدیہ آپ کا فقہی اعتقادی مسائل کا بے نظیر ذخیرہ ہے اور متعدد بار پاک و ہند میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں مسائل فقہ کے ساتھ ایمانیات اور اعتقادات سے متعلق بھی اختصار کے ساتھ مسائل موجود ہیں۔ مثلاً صلیب اور زنار کے پہننے کے متعلق فرماتے ہیں کہ صلیب کا ڈالنا گلے میں کفر ہے کہ صلیب شعائر نصرانیہ کا ہے۔ قال علیہ السلام من تشبہ بقوم فھو منھم (الحدیث) پس دونوں چونکہ شعائر کفر ہیں، لہٰذا دونوں کفر ہوئے۔ اس کے علاوہ غیر اسلامی رسوم اور بدعات کا بھی رد فرمایا ہے۔ مثلاً میت کے پیچھے اور کلمہ طیبہ پڑھنے کے متعلق فرماتے ہیں کہ میت کے واسطے کلمہ طیبہ وغیرہ پڑھنا بہت بہتر اور ثواب ہے۔ مگر تخصیص تیسرے روز کی اور چنوں کی بدعت ہے، وہاں شریک نہ ہونا چاہیئے۔[1]

---

[1] رشید احمد۔ فتاویٰ رشیدیہ ص ۲۰۰-۲۰۱، مطبوعہ قرآن محل کراچی

بعض فتاووں کے جواب میں آپ نے مختصر رسائل تصنیف کئے ہیں۔ تاکہ عوام بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ علم غیب مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حافظ رحمت علی صاحب مدرس مدرسہ حنفیہ جونپور نے فتویٰ طلب کیا تو آپ نے اس مسئلے پر ایک رسالہ بھی تصنیف فرمایا۔ اس میں تفصیل سے بحث فرمانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ "پس حاصل کلام یہ ہے کہ چند آیات کلام اللہ شریف و روایات کثیرہ احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم و نیز اقوال سلف صالح سے یہ امر ظاہر ہو گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں ہیں اور نہ ہر جگہ تشریف رکھتے ہیں، پس اس کا اعتقاد رکھنا صریح خطا بلکہ شائبہ شرک ہے۔"[1] اسی طرح جب آپ سے جماعت تراویح کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے تفصیل سے اس کا جواب تحریر فرمایا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "حضرت عمرؓ جن کے باب میں رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ "اقتدوا بالذین بعدی ابی بکر و عمر و عثمان و علی" نے جس کا امر فرمایا، تو بمقتضا "علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المہدیین" اس کا اتباع اُمت پر رسول اللہ نے لازم فرمایا۔ یہ امر دلیل ہے اس بات کی کہ سب کے نزدیک یہ مرد رسول اللہ سے انکے نزدیک محفوظ تھا کہ کسی نے اس پر اعتراض نہ کیا اور سنت رسول اللہ سمجھ کر اس پر عمل کیا۔"[2]

فرضیت جمعہ کے متعلق کہ گاؤں میں جمعہ فرض ہے کہ نہیں؟ آپ نے ایک مفصل رسالہ "اوثق العریٰ فی تحقیق الجمعۃ فی القریٰ" تحریر فرمایا۔ اس میں تمام اعتراضات کا رد فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ الحاصل محقق ہو گیا کہ فرضیت جمعہ مکہ معظمہ میں ہو چکی تھی اور مکہ میں اقامت جمعہ سے متعذر تھا اور مدینہ میں کہ مصر تھا اور مسلمانوں کو تمکن اقامت جمعہ کا تھا۔ جمعہ بامر رسول اللہ جاری ہوا اور مواقع دیگر اقامت جمعہ نہ تھے۔ مثل عوالی و قبا وغیرہ وہاں جمعہ جاری نہیں ہوا، حالانکہ وہاں

---

[1] رشید احمد۔ رسالہ علم الغیب ص ۱۵ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی

[2] رشید احمد۔ الرای النجیح ص ۱۱ مطبوعہ ۱۹۰۳ء مجتبائی دہلی

ـــے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی فرمان حدیث پہنچ گیا۔ لہ

وقف قرآن کے بارے میں فرقہ غلاۃ نے بحث کا فتنہ
ـــے کہ تمام قراء اہل بدعت۔ قرار دیا تو اس کا رد مولانا گنگوہی نے واضح
در پر مؤید تحریر فرماتے ہیں کہ " بس قرأت قرآن میں دونوں طرح سے
پڑھنا یعنی قرأت عشرہ متواترہ اور شاذہ دونوں طرح سے درست
ہے۔ ایسے ہی وقف اہل رؤس الآیات بھی درست ہے اور عدم وقف بھی
اور اصل یہ ہے کہ اوقاف بھی تفسیر قرآن ہیں کہ فصل و وصل سے معنی قرآن کے
واضح ہو جاتے ہیں۔ لہ

جماعت ثانیہ کے متعلق جب فتویٰ دریافت کیا گیا تو آپ نے
اس کی وضاحت میں ایک مستقل رسالہ " باقطوف الدانیہ فی تحقیق الجماعۃ الثانیہ " تحریر
فرمایا۔ جماعت ثانیہ کا رد کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں، کہ جامع صغیر
میں ہے کہ کوئی شخص مسجد میں داخل ہوا کہ محلہ والوں نے اس میں نماز ادا کر لی
پس وہ بغیر اذان و اقامت کے پڑھے۔ کیونکہ تکرار جماعت اس کے تقلیل کا
باعث ہے چونکہ کوئی شخص جماعت فوت ہو جانے سے نہیں ڈرے گا، تو
اس لیے مکروہ ہے۔ ٹہ

اس کے علاوہ مسائل کی کافی تعداد ایسی بھی ہے جو شائع نہ ہو سکی۔
کیونکہ شروع میں فتووں کی نقل نویسی کا انتظام نہ تھا۔ دارالعلوم دیوبند میں باقاعدہ
دارالافتاء ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں قائم ہوا جس کے مفتی مولانا عزیزالرحمن
مقرر ہوئے۔ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء سے ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۲ء تک ۱۹ سال کے فتووں
کی تعداد کا علم نہیں ہے۔ ته منتشر خطوط کو جمع کر کے فتاوی رشیدیہ شائع کیا گیا ہے

لہ رشید احمد، اوثق العریٰ ص۹ مطبوعہ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند
ٹہ رشید احمد، ردالطغیان ص۳۶ ملحقہ فتاوائے رشیدیہ
ته رشید احمد، باقطوف الدانیہ ص۱۵ مطبوعہ قرآن محل کراچی
کہ محمد طیب، دارالعلوم دیوبند ص۱۰ طبع اول ۱۹۶۵ء دیوبند

حضرت گنگوہی کی قرآن و حدیث میں دقیق النظری

مولانا گنگوہی کو خدا نے عقل و فہم وافر عطا فرمایا تھا کہ جن مسائل کے حل کرنے میں
فضلاء و علماء عاجز ہو جاتے۔ آخرکار آپ کی خدمت میں پیش کیے جاتے
آپ ان کا جواب ایسی سہل طرز سے دیتے کہ علماء حیران رہ جاتے اور
ایسے لطیف نکات و تحقیق بیان فرماتے کہ جن کا علماء کو خیال تک نہ ہوتا تھا
آپ قرآن و حدیث میں گہری نظر رکھتے تھے۔ مندرجہ ذیل اقتباسات سے
قرآن و حدیث میں آپ کی دقیق النظری کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا خلیل احمد نے آپ کو ایک شبہ لکھ کر بھیجا کہ " وان من الحجارۃ
لما یتفجر منہ الانہار " اور " وان منہا لما یشقق فیخرج منہ الماء " ہر دو آیات باعتبار
معنی متحد معلوم ہوتی ہیں، پھر تکرار سے کیا نفع۔ نیز " وان منہا لما یہبط من خشیۃ
اللہ " میں ہبوط دھشۃ حجر کو ثمرہ خوف الٰہی بیان کیا ہے۔ پس تفجر اور تشقق اور
ہبوط کی اس ترتیب مذکورہ فی القرآن کی حکمت سمجھ میں نہیں آتی۔ نیز وما اللہ بغافل
الخ۔ اور افتطمعون الخ کو اس آیت سے کیا ربط ہے۔

مولانا گنگوہی نے اس کے جواب میں مندرجہ ذیل عبارت تحریر فرمائی
" تفجر الانہار اعلیٰ درجہ کا متاثر ہونا ہے کہ نہریں پھوٹ کر جاری ہوئیں اور
تشقق ہو کر پانی نکلا۔ ادنیٰ درجہ کا اور لفظ ہبوط اس سے بھی کم درجہ۔ تو
اعلیٰ سے اسفل کو کلام کا سوق ہوا کہ پتھروں کا یہ حال ہو کہ بعض سے
نہریں جاری ہو گئیں اور بعض سے شق ہو کر پانی نکلا اور بعض ہابط ہو گئے
مگر بنی اسرائیل کو باوصف ان معجزات باہرہ اور رویت قدرت قاہرہ اور
احسانات جیسے ظاہرہ کے اعلیٰ تو کیا ادنیٰ تاثر بھی نہ ہوا۔ تو ادنیٰ ادنیٰ حال
حجر سے بھی ان کا حال خوار و خراب ہوا۔ متفجرالانہار اعلیٰ درجہ کا متاثر ہو کر
ہر تن خشیت سے پانی ہوا اور اس کا نفع خلق کثیر کو ہوا ہر قسم کا اور مشقق
خود منتفع کسی درجے کا ہوا۔ اس کے بارے سے بھی واحد ابعد واحد کو کچھ نفع
ہوا یا نہ ہوا، مگر خود منتفع خشیہ ہوا اور منہبط کو خود تواضع و خشیہ حاصل ہوا

اگرچہ اس سے کسی کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مگر متاثر ہو کر متقل امر ہوا۔ خلاف بنی اسرائیل کے کہ وہ اپنی جبلت عصیان پر برابر ہیں اور جھوٹے میل ان کے اور تیز بیانی لغو ہے۔ وما اللہ بغافل الخ۔ پس اسے قدیم بدفہموں بدترین از حجارہ سے — الادسراو بیہ۔ کیا توقع کرتے ہو۔ افتطمعون الخ والسلام [1]

مولف نے ان لوگوں کے اعتراض کا جواب جو کہتے ہیں کہ قرآن میں ایسی آیات ہیں جن کے معنی واضح نہیں تفصیل سے دیا۔ ترمذی کی ایک حدیث [2] کی تشریح فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ "مخالفین نے یہ طعن کیا ہے کہ کتاب اللہ ایسی کلام پر مشتمل ہو جس کے کوئی خاص معنی واضح نہیں ہیں جاتے تو متاخرین نے ان آیات کی کچھ تاویلات کی ہیں لیکن اس سے یقینی مراد حق تعالیٰ نہیں بلکہ متصور ہے کہ ممکن ہے کہ یہ مراد ہو اور کتاب اللہ میں اس سے منع نہیں کیا گیا اور ان تاویلات صحیحہ کو اصول شرعیہ کی مطابقت پر حمل کیا جائے تو پھر وہ آیات متشابہ نہیں رہیں گی، بلکہ وہ محکمات بن جائیں گی جیسے وجہ اللہ، ید اللہ اور اگر مقطعات میں بھی یہی تاویلات جاری ہوں، تو وہ بھی متشابہ نہیں رہیں گی۔ پس ابتغاء تاویلہم وجہ اللہ میں مثلاً محمول و جو بعض معروف ہیں تو اس وقت یہ آیت متشابہات میں ہو گی تو چاہیے اس خیال سے ایک ہی آیت ایک تاویل سے متشابہات سے خارج ہے، جب کہ وہ اپنے ظاہر معنی کے اعتبار سے متشابہ ہو۔ لیکن ہماری اس تقریر سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں فرمایا ہے کہ "منہ آیات محکمات ہن ام الکتاب واخر متشابہات۔ تو اس تقسیم سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ متشابہات کسی حیثیت سے بھی محکم نہیں ہوں گی، ہم کہتے ہیں کہ آیت صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ متشابہات محکمات کے مغائر ہیں۔ رہی بات یہ کہ متشابہات کسی جہت سے محکمات بن سکتے ہیں یا نہیں تو آیت میں اس نفی پر کوئی دلیل نہیں، تو حاصل یہ ہوا کہ کتاب اللہ میں بعض آیات تو صرف محکم ہیں اور بعض محکم اور متشابہ ہیں لیکن ایسا آخری قسم کو متشابہ سے تعبیر فرمایا محض اس لیے کہ انہیں فتنے میں پڑنے سے روکا جائے تاکہ وہ اس کی دیگر تاویل کر بیٹھیں جس سے اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت پر ترجیح پائی جائے۔ پس ہم کہتے ہیں کہ ید اللہ فوق ایدیہم اور اس کی مثل دوسری آیات، اللہ نے یہ جو مراد لی ہے، وہ حق ہے، لیکن اس کی کیفیت اور اس کا مصداق معلوم نہیں لیکن ممکن ہے کہ آیت میں ید سے مراد قوت ہے۔ پس اس لحاظ سے اس طرح کی آیات متشابہات باقی نہیں رہیں گی۔ [3]

فلا جناح علیہ ان یطوف بہما کی تفسیر کرتے ہوئے اس شبہ کو صاف فرماتے ہیں کہ سعی امر جاہلیت میں سے ہے۔ تحریر فرماتے ہیں کہ اس میں نفی حرج ہے کہ انصار اور مہاجرین صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے میں حرج سمجھتے ہیں، ان کا یہ خیال تھا کہ وہ امر جاہلیہ سے ہے۔ رہی یہ بات کہ صفا مروہ کے درمیان سعی مراتب احکام مشروعیہ میں سے کس مرتبے کی ہے تو یہ نص قرآنی اس بات سے ساکت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری نص قرآنی سے اس کا جواب بیان کیا ہے، تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ سعی امور جاہلیت میں سے نہیں، جیسا تم خیال کرتے ہو، بلکہ وہ تمہارے باپ ابراہیم کی شریعت قدیمہ ہے اور یہ فرمایا کہ "ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ" اس شبہ کی نفی کر دی کہ وہ امر جاہلیت میں سے ہے اور یہ بات واضح کی کہ یہ حج کا واجب ہے۔" [4]

---

[1] عاشق الٰہی۔ تذکرۃ الرشید۔ حصہ اول ص ۱۵۱

[2] حدیث یہ ہے: عن عائشۃ سئل رسول اللہ .... فاحذروھم خاء المؤمنین۔ ترمذی۔ ج ۲ ص ۱۲۳۔ مطبوعہ دہلی۔

[3] رشید احمد۔ کوکب الدری ج ۲ ص ۲۰۱ مطبوعہ ۱۳۵۲ھ سہارنپور

[4] عن عروۃ قال قلت ..... والمروۃ شیئا الخ۔ و ترمذی ج ۲ ص ۱۲۱ دہلی
رشید احمد؛ کوکب الدری ج ۲ ص ۱۹۳، ۱۹۴۔

قرآن پاک کی آیت "وما کان اللہ لیضیع ایمانکم" کی تشریح میں حضرت
نے یہ نقل فرمایا کہ اطاعت نام ہے اعمال کا مرکب ہے۔ چنانچہ فرماتے
ہیں کہ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اعتقاد اور تسلیم سب
نسبت کیونکہ اطاعت اعمال کا نام ہے۔ اس لیے تمہاری نمازیں اللہ ضائع
نہیں ہونگی۔ [1]

مولانا سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ حضرت، اگر وظیفہ
شب کو نہ ہو سکے تو دن میں قضا کرنے میں کوئی ثواب ملے گا؟ آپ نے فرمایا
جواب میں فرمایا: کیوں نہیں: "ھو الذی جعل اللیل والنھار خلفۃ لمن اراد ان یذکر
او اراد شکورا" [2]

مولانا گنگوہی کی حدیث میں دقیق النظری

مولانا حدیث کے مختلف فیہ مسائل کو اس طرح حل فرماتے تھے
کہ ہر طالب علم کی سمجھ میں آسانی سے آجاتے۔ ترمذی کی ایک طویل حدیث کے
کے جملہ فی ذلک او قسمت الصلوۃ بینی وبین عبدی کی تشریح یوں فرماتے ہیں کہ
لہٰذا فی ذلک اس بات پر نص نہیں کہ ہر مصلی پر اس کی قرأت خود بذاتہ ضروری
ہے، بلکہ یہ عام ہے کہ وہ فی نفسہ قرأت کرے۔ یہ اس کا وکیل جیسے
کہ حدیث میں آیا ہے کہ من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ۔ لہٰذا اس روایت
سے اس آیت کا عموم باطل نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "واذا
قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون" اس کے بعد اسی حدیث
کے جملہ قسمت الصلوۃ بینی وبین عبدی کی اس طرح تشریح فرماتے ہیں کہ صلوۃ
سے مراد یہاں فاتحہ ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ جب رسول اللہ نے
فاتحہ پر صلوۃ کا اطلاق فرمایا تو فاتحہ نماز کے فرائض میں کل فرضیہ اور نماز
کے ارکان میں داخل کیوں نہیں ٹھہری۔ پس ہر فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز نہیں۔ ہو سکتا
ہے کہ شاید ابوہریرہؓ کی یہ روایت اسی مقصد کے لیے وارد ہوئی ہو تو جواب ہے کہ
ہم تسلیم ہی نہیں کرتے کہ مقتدی کے لیے قرأت نہیں۔ غایت امر یہ ہو سکتا ہے کہ
مقتدی قاری بالقراءۃ نہ ہوا اور اکثر ایسے ہوتا ہے کہ وکیل کے فعل کو موکل کی طرف
منسوب کرتے ہیں۔ تو یہاں بھی امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہوئی۔ [3]

آپ سے مولوی ابوالبرکات نے دریافت کیا کہ حضرت صدق اللہ
کذب بطن فلان والحدیث، اور کما قال کا کیا مطلب ہے، اور کذب سے
کیا مراد ہے؟ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ دستوں کا جاری ہونا تو بظاہر
مرض کا زیادہ ہونا تھا مگر واقع میں یہی سبب تندرستی تھا۔ اسی کو جناب
رسول اللہ نے کذب سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ ظاہر اور باطن میں تخالف ہی کا
نام "کذب" ہے۔ کما لا یخفی۔ تم احادیث سے بھی آپ فقہی مسائل کا استنباط فرمایا
کرتے تھے۔ ترمذی کی ایک حدیث ہے جس میں حد قذف کا مسئلہ ہے۔ اس کے
متعلق فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے اپنے مملوک پر تہمت
لگائی جس سے وہ بری تھا تو مالک پر حد قذف جاری نہیں کی جائے گی۔

مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث سے تہجد اور تراویح کو جدا جدا ثابت
کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ ہر دو صلوٰۃ جدا گانہ ہیں اور
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کو ہمیشہ منفردا پڑھتے تھے کبھی تداعی جماعت نہیں

---

[1] عن ابن عباس قال لما .... وما کان اللہ لیضیع ایمانکم (ترمذی ج ۲ ص۱۲۱)۔
[2] رشید احمد۔ کوکب الدری۔ ج ۱ ص۱۴۳
[3] عزیز الرحمن۔ تذکرہ مشائخ دیوبند ص۱۱۳
[4] قال قلت یا ابا ہریرہ ..... اکون وراء امام الخ (ترمذی۔ ج ۲ ص۱۹)

---

[1] رشید احمد۔ کوکب الدری۔ ج ۲ ص ۱۸۹-۱۹۰
[2] عاشق الٰہی۔ تذکرۃ الرشید۔ حصہ اول ص۱۰۳
[3] حدیث یہ ہے: عن ابی ہریرۃ .... الا ان یکون کما قال (ترمذی ج ۱ ص۱۸۵)
[4] رشید احمد۔ کوکب الدری۔ ج ۲ ص۲۱

فرمائی۔ اگر کوئی شخص آ کھڑا ہوا تو مضائقہ نہیں، مثلاً ابن عباس خود ایک دفعہ آپ کے پیچھے جا کھڑے ہوئے تھے بخلاف تراویح کے اس کو چند بار تداعی کے ساتھ جماعت کر کے ادا کیا۔[1]

اس حدیث سے آپ نے یہ مسئلہ اخذ کیا کہ نماز تہجد بلا جماعت ہی پڑھنا درست ہے جب کہ تراویح با جماعت پڑھنا مسنون ہے۔ ایک حدیث "لا تدخل بیتا فیہ کلب" سے آپنے یہ مسئلہ اخذ فرمایا کہ اس سے وہ مراد ہے، جو حفاظت کا نہ ہو۔[2]

آہستہ آمین کہنے کے متعلق آپ نے فرمایا کہ آہستہ آمین کہنا حدیث سے ثابت ہے۔ مستدرک میں حاکم نے باسناد صحیح روایت کیا ہے کہ "عن وائل ابن حجر انہ صلی اللہ علیہ وسلم فلما بلغ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔ قال آمین وخفض صوتہ" اس حدیث سے حضرت کا خفیہ آمین کہنا ثابت ہوگیا۔ بعد اس کے انکار کرنا محض تعصب ہے۔ اس باب میں اور بھی روایات ہیں۔ پس کسی کو اشتباہ نہ ہونا چاہیئے۔[3]

مولانا گنگوہیؒ کی فقہ میں دقیق النظری

مولانا کو جس طرح قرآن و حدیث میں مہارت حاصل تھی۔ اسی طرح آپ فقہ کے بھی ماہر تھے۔ ایک مجلس نکاح میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا کہ وہ کون عورت ہے کہ کوئی عورت کسی اجنبی بچہ کو دودھ پلائے اور دوسری عورت یعنی اس کی سوکن اپنے شوہر پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جائے۔ اس سوال پر تمام حضرات حیران تھے کہ دیکھیں مولانا کیا جواب دیتے ہیں؟ آپ نے بلا تکلف فرمایا کہ ایک نے اپنے صغیر سن خاوند کو دودھ پلا

ل رشید احمد الاماء ایرنج صـ۔۔
ت رشید احمد۔ فتاویٰ رشیدیہ صـ۱۵۶ مطبوعہ قرآن محل کراچی
ٹ " " " " صـ۱۹۱

پھر کسی دوسرے سے نکاح کر لیا۔ اب اس کی سوکن اس بچہ کو دودھ پلائے تو دوسری عورت یعنی بچے کو دودھ پلانے والی اپنے شوہر اول پر حرام ہو جائے گی۔[1]

آپ کی اس استعداد پر لوگ حیران تھے کہ حضرت نے یہ مسئلہ کتنی جلدی حل فرما دیا۔ اس سے آپ کی فقہی دقیق النظری کا اظہار ہوتا ہے اللہ نے آپ کو لاجواب فقہی فہم اور ذکاوت عطا فرمائی تھی۔ آپ سے ایک سوال یہ کیا گیا کہ اکثر لوگ عورت کو مسلمان کر کے فوراً نکاح کر لیتے ہیں اور شوہر کافر پر اسلام نہیں پیش کرتے۔ یہ نکاح تو نہ ہوا اور پیش کرنے پر بھی اگر انکار کرے تو تفریق میں قاضی کی ضرورت ہے۔ وہ یہاں ہے کہ نہیں اور اگر دار الحرب میں ہو تو تین حیض گزرنے پر جنوبیہ ہو جائے گی۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ "عورت کو مسلمان کرنے کے ساتھ ہی نکاح کرنا درست نہیں اور اگر ذات زوج ہو، جیسا آپ نے لکھا ہے۔ اسی طرح درست ہوگا۔[2]

مالکیہ کے اس مسئلے کے متعلق کہ بندوق سے شکار کیا ہوا جانور بلا ذبح مر جائے، حلال ہے۔

جب آپ سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ "لوگوں کو اس کی حلت کا اس وجہ سے شبہ ہوا کہ فقہ میں اطلاق بالنار کو قاطع لکھا ہے اور اسی بنا پر بندوق کی گولی کو بھی محرق اور قاطع سمجھ کر بعض علماء نے حلت کا فتویٰ دے دیا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ مولانا ملوک علی صاحب سے ہم نے اس کو دریافت کیا تھا تو فرمایا کہ روئی پر نشانہ لگاؤ۔ معلوم ہو جائے گا۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا، گولی پار ہو گئی اور روئی کچھ نہ جلی، سو گولی توڑنے والی ہے۔ محرق نہیں ہے جب تک

ل عاشق الٰہی۔ تذکرۃ الرشید حصہ اول صـ۱۰۲
گ " " " " صـ۱۹۵

دیں۔ کیا ہے۔ بیشک یہ قابلِ حل نہیں ہے۔

تعزیہ کے متعلق جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ قرونِ ثلاثہ میں تعزیہ بنانے کا ثبوت ہے کہ نہیں۔ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ تعزیہ بنانا قرآن سے ثابت ہے، تو پھر قرونِ ثلاثہ کی کیا ضرورت۔ قال تعالیٰ واسوا ابی الاکرمان تنزہ و تحشیہ۔

غرض یہ کہ حضرت گنگوہیؒ اپنے ہر فن میں یکتا تھے اور ہر شخص آپ کی ذہانت کا معترف تھا۔

مولانا کی سیاسی خدمات

مولانا رشید احمد گنگوہی اور تحریکِ آزادیٔ ہند

تحریکِ آزادیٔ ہند جس کو غدر ۱۸۵۷ء کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ منظم تحریک تھی جس میں مسلمانوں نے جابر برطانیہ سے ملک و قوم کو آزادی دلانے کی انتھک کوشش کی۔ یہاں تک کہ عملی طور پر بھی میدانِ جہاد میں نکل کھڑے ہوئے۔ جس میں ہزاروں مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا اور تقریباً تیرہ ہزار علماء کرام کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا۔ بچوں اور بوڑھوں کو بھی جان بخشی نہ ہو سکی۔ ایڈورڈ ٹامس نے شہادت دی کہ صرف دہلی شہر میں ۵۰۰ علماء کو پھانسی دی گئی۔ ۳ جلادوں کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کیا جاتا کہ وہ ان کو زیادہ دیر تک لٹکائے رکھیں تاکہ وہ ان کے تڑپنے کی کیفیت سے محظوظ ہوتے رہیں۔ پھانسی کے علاوہ تانبے کو گرم کر کے بدن کو داغا جاتا اور اسی حالت میں روح پرواز کر جاتی۔ ایک چینی شاہد نے اپنے بیان میں کہا کہ بدنصیب قیدیوں کے جلتے ہوئے گوشت سے گندہ بدبو نکل کر آس پاس کی فضا کو مسموم بنا رہی تھی۔ ۴

۱۔ عاشق الٰہی، تذکرۃ الرشید ص ۱۳۹ ۔ ۲۔ رشید احمد، فتاویٰ رشیدیہ ص ۱۸۵
۳۔ حبیب احمد، ریشمی رومال ص ۱۴۱ مطبوعہ ۱۹۷۰ء لاہور ۴۔ محمد میاں، علماء ہند کا شاندار ماضی جلد ۴ ص ۵۳۱، ۵۳۲ مطبوعہ ۱۹۶۳ء دہلی

غرضیکہ انگریز جو بھی مخالفانہ و معاندانہ حرکتیں کر سکتا تھا کرتا رہا اور مسلمان مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔ انگریز کی دلی آرزو تھی کہ ہندوستان میں عیسائیت پھیل جائے جس کا ثبوت اس تقریر سے ملتا ہے، جو کہ مسٹر منگلس چیئرمین ایسٹ انڈیا کمپنی نے لندن کی پارلیمنٹ میں کی تھی، اس نے کہا: خدائے تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیرِ نگیں ہو تاکہ عیسیٰ مسیح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیئے اور اس میں کسی طرح تساہل نہ کرے۔ ۱

اس کے علاوہ میکالے نے بھی اپنی والدہ کو ایک خط ۱۲ اکتوبر ۱۸۳۶ء کو لکھا تھا جس میں ہندی قوم کو عیسائی بنانے کے متعلق یوں تحریر کیا تھا کہ اگر ہمارے تعلیمی منصوبے پر پوری طرح عمل کیا گیا، تو مجھے یقین ہے کہ زیادہ سے زیادہ ۳۰ سال بعد بنگال میں ایک بھی بت پرست یعنی غیر عیسائی نہ رہے گا۔ ۲

انگریز نے مسلمانوں کی سرکوبی کرنے اور عیسائی بنانے کے لیے ہر طرح کے ظلم ڈھائے، جن کو پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اب ہندوستان پر ہمیشہ انگریز ہی مسلط رہیگا۔ لارڈ [illegible] نے کہا تھا کہ ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے۔ ۳

انگریز نے ایسی حرکات کیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے اور انگریز کے خلاف نفرت پھیلنا شروع ہو گئی۔ اس نازک دور

۱۔ محمد میاں، علماء حق، جلد ۱ ص ۲۹ مطبوعہ ۱۹۴۶ء دہلی
۲۔ بحوالہ اخبار کوہستان مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۶۴ء، کالم ۲ ص ۳ لاہور
۳۔ محمد میاں، شاندار ماضی جلد ۴ ص ۵۲۲

اور نامساعد حالات میں علماء کرام اللہ، مذہبی جذبہ اور مسلمانوں کی مظلومیت کے پیش نظر علماء کی ایک جماعت نے صدائے حق اور علم حریت بلند کیا۔ اسی جماعت کے ایک قائد مولانا رشید احمد گنگوہی بھی تھے یہیں سے آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے ایک طرف آپ کی خدمت سے ہند اور بیرون ہند میں علوم شرعیہ کی اشاعت اور ترویج ہوئی تو دوسری طرف آپ کی سیاسی خدمات سے بھی پہلو تہی نہیں کی جا سکتی۔ مولانا گنگوہی نے اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی سرکردگی میں، مساعیٔ انقلاب، جہادی اقدامات اور حریت و استقلال ملی کی فداکارانہ جدوجہد میں جو حصہ لیا اسے کسی طرح بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اسی سلسلے میں قید و بند کے جو مصائب برداشت کئے وہ ایسے تاریخی حقائق ہیں جن پر پردہ ڈالنا بہت مشکل ہے۔ ایسے پر آشوب دور میں ظالم برطانیہ کے فولادی پنجے سے ٹکر لینا ان ہی اہل حق کا کام تھا۔

جنگ آزادی میں حصہ

انگریز کی جابرانہ اور ظالمانہ حرکات حد سے تجاوز کرتی جا رہی تھیں اور سہارنپور کے کلکٹر "اسپنکی" کے ظالمانہ فیصلے نے مسلمانوں کو اور بھی مشتعل کر دیا جس کی وجہ سے جہاد کا شعلہ بھڑک اٹھا، واقعہ یوں پیش آیا کہ تھانہ بھون کے رئیس قاضی عنایت علی کے برادر عبدالرحیم مع چند احباب ہاتھی کی خریداری کے لیے سہارنپور گئے۔ مخبر نے اطلاع دی کہ یہ لوگ فوج پر حملہ کرنے کی غرض سے ہاتھی خریدنے آئے ہیں جس وقت یہ اطلاع "اسپنکی" کو ملی تو اس نے بلا تحقیق و تفتیش پھانسی کا حکم دے دیا۔ قاضی صاحب کو مع ساتھیوں کے شہید کر دیا گیا۔ اسپنکی کے اس جابرانہ اقدام کی خبر سے تھانہ بھون میں صف ماتم بچھ گئی اور علماء نے حضرت حاجی صاحب کی موجودگی میں مجلس شوریٰ منعقد کی، تاکہ صورت حال پر غور کیا جائے اور جہاد کی تیاری کی جائے۔ اس میں حاجی صاحب اور مولانا گنگوہی کے علاوہ شیخ محمد بھی تھے، جنہوں نے جہاد کی مخالفت کی تھی۔ کافی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ حضرت حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی جائے۔ اس اسلامی لشکر کی تشکیل اس طرح کی گئی۔

- حضرت حاجی صاحب، امیر المومنین۔ حافظ ضامن شہید
امیر جہاد، مولانا محمد قاسم نانوتوی امیر الافواج یعنی کمانڈر انچیف۔ مولانا منیر مولانا نانوتوی کے فوجی سیکرٹری
اور مولانا گنگوہی وزیر امام بندی مقرر ہوئے۔[1]

- اسپنکی نے مسلمانوں کے جوش و خروش کو دیکھ کر یہ پیشکش کی کہ "یہ سب کچھ نادانستگی میں ہو گیا ہے۔ آپ صبر و شکیب کو کام میں لائیں اور کوئی کارروائی نہ کریں۔ ہم آپ کو مزید جاگیر عطا کریں گے اور تھانہ بھون کا مستقل نواب تسلیم کریں گے"۔[2] مسلمانوں کی طرف سے یہ پیشکش ٹھکرا دی گئی۔

مجاہدین کے حملے

مجاہدین نے سب سے پہلا حملہ باغ شیر علی کی سڑک پر انگریز فوج پر کیا۔ مولانا عاشق الٰہی نے تحریر کیا ہے کہ اتفاق سے چند فوجی سوار کہاروں کے کاندھوں پر کارتوسوں کی کئی بہنگیاں لدوائے سہارنپور سے کیرانہ کی طرف جا رہے تھے۔ قاضی صاحب کو اطلاع ملی، تو مع چند رفقاء حملہ آور ہوئے اور مال و اسباب لوٹ لیا۔[3]

دوسرا حملہ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شاملی پر کیا گیا جس میں مولانا گنگوہی نے حاضر دماغی سے کام لیا اور فتح حاصل کی۔ مولانا حسین احمد مدنی فرماتے ہیں کہ خبر آئی کہ توپ خانہ سہارنپور سے شاملی کو بھیجا گیا ہے اور ایک پلٹن فلاں سڑک سے رات کو یہاں سے گزرے گی۔ اس خبر سے لوگوں میں تشویش ہوئی کیونکہ

---

۱ مناظر احسن۔ سوانح قاسمی۔ ج ۲ ص ۱۲۶، ۱۲۰، مطبوعہ ۱۳۷۳ھ دیوبند

۲ ثناء الحق۔ مقدمہ حقۃ الوجود ص ۴۰

۳ عاشق الٰہی، تذکرۃ الرشید ص [illegible]

ثمرۃ التربیت ○ نظارۃ المعارف

— سے لے کر —

ریشمی رومال کی تحریک

حیات عثمانی غیر مطبوعہ کے چند اوراق

پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی کے قلم سے

دارالعلوم دیوبند قدرت ربانی کا ایک الہامی شاہکار ہے۔ اس کی رحمت کا ایک چھینٹا جب سرزمین دارالعلوم دیوبند پر پڑا، تو اس خطۂ ارضی پر قال اللّٰہ و قال الرّسُول کے وہ انوار برسے کہ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء سے آج ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء جس کو بجری حساب سے ایک سو بارہ سال کا عرصہ ہو چکا ہے، اس کی تجلیات اور برکات ہند، پاکستان، افغانستان، ایران، عراق، شام، مصر، اُردن، انڈونیشیا، ملائشیا، فلپائن، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ نیز افریقہ کے برصغیر، غرضیکہ تمام دیارِ اسلام پر نازل ہو رہی ہیں اور ہزاروں علما اور فضلائے دیوبند کی مساعی جمیلہ احیائے دین و ملت اور حریتِ اسلامی کے جذبات سے سرشار ہو کر دنیائے اسلام میں جلوہ افروز ہیں۔ یقین کیجئے اور یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ دین اللہ اور تقویٰ کا سب سے بڑا ادارہ دنیا میں اگر کوئی ہے تو وہ دارالعلوم دیوبند ہے، مانا کہ جامعہ ازہر مصر کا ایک بڑا مرکزی ادارہ ہے، لیکن وہاں تقوے اور پرہیزگاری کی جنس نایاب ہے۔ آخر علم کے آگے تقویٰ ہی تو صحیح منزل ہے۔

۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت کے بعد دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے پیش نظر ایک ایسے دینی دارالعلوم کی ضرورت تھی جو عالم باعمل، روشن ضمیر محقق، معقولات و منقولات کے ماہر پیدا کرے۔ مزید برآں یہ کہ ان میں جہاد کی سپرٹ اور مجاہدین کے نقش قدم پر چلنے والے وہ جذبات ہوں کہ جب اسلام ان کو جاھدوا فی سبیل اللہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے کمربستہ ہو جاؤ کا نعرہ بلند کر کے جہاد کی دعوت دے تو وہ سربکف ہو کر میدانِ جہاد میں بے تامل اُتر پڑیں اور بلندیوں سے بے جھجک کود پڑیں ۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

چنانچہ دارالعلوم نے منصۂ شہود پر آتے ہی ترقی کی منزلیں ایسی تیزی سے طے کرنی شروع کیں چنانچہ تھانہ بھون میں عربی کا جو ایک مدرسہ ۱۲۹۱ھ سے تھا جس کے مہتمم منشی عبدالرزاق صاحب اور مدرس مولوی فتح محمد صاحب تھے انھوں نے اپنے مدرسے کا الحاق دیوبند سے کر دیا۔ بعد ازاں مظفر نگر، گلاؤٹھی ضلع بلند شہر، کیرانہ ضلع مظفر نگر اور انبیٹھہ ضلع سہارنپور میں دارالعلوم کی شاخیں کھل گئیں اور ان کا الحاق دیوبند سے ہوا۔ بعد ازاں میرٹھ میں مولوی محمد ہاشم کے زیر اہتمام مدرسہ کھولا گیا اور اس کے مدرس اوّلاً دیوبند کے فاضل مولوی

۱۰. مولانا محمد مراد صاحب، ساکن پاک پٹن

۱۱. مولوی عبداللہ صاحب گوالیاری

۱۲. مولانا عبدالعلی صاحب عبداللہ پوری ضلع میرٹھ

۱۳. مولوی نہال احمد صاحب دیوبندی

۱۴. مولوی عبدالاحد صاحب ساکن جلال آباد

۱۵. مولوی عبداللطیف صاحب سیوہاری (ضلع بجنور)

۱۶. مولوی محمد اسمٰعیل صاحب انبہٹوی

۱۷. مولانا عبدالعدل صاحب پھلتی

۱۸. مولانا کرم علی صاحب نگینوی

۱۹. مولانا کرامت اللہ صاحب دہلوی

(رپورٹ موتمر الانصار مراد آباد از مولانا عبیداللہ سندھی)

یہ سب فضلائے دیوبند سالانہ چندہ ادا کرتے رہے اور دارالعلوم دیوبند کی اعانت میں سرگرم رہے، لیکن یہ سلسلہ جس طرح بھی چلتا رہا چلتے چلتے ایک خاص مقام پر پہنچا کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا ...... دور آیا اور آپ کے زمانے میں آپ کی کوشش سے ثمرۃ التربیت نے جمعیۃ الانصار کا روپ دھارا۔

رمضان ۱۳۲۷ھ میں جمعیۃ الانصار کا آغاز

حضرت شیخ الہندؒ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم تھے۔ ۱۲۸۳ھ میں انھوں نے دارالعلوم دیوبند سے میبذی، کنز الدقائق اور مختصر المعانی کا امتحان دیا۔ ۱۲۸۵ھ میں ہدایہ، مشکوٰۃ اور مقامات وغیرہ میں شریک ہوئے۔ ۱۲۸۶ھ میں صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے پڑھیں، فراغت کے بعد ۱۲۸۸ھ میں دارالعلوم دیوبند کے معین مدرس بنے، ۱۲۹۰ھ میں دستار بندی ہوئی، مولانا محمد یعقوب صاحب کی وفات کے بعد ۳۰ روپے پر مدرس سوم، ملا محمود صاحب کی وفات کے بعد مدرس دوم اور مولانا سید احمد صاحب کے بعد [illegible] ۱۳۰۵ھ میں بمشاہرہ چالیس روپے شیخ الہند صدر مدرس قرار دیے گئے۔ آپ کی صدارت کے دو سال بعد ۱۳۲۷ھ رمضان المبارک میں شیخ الہندؒ کی تحریک پر جمعیۃ الانصار دارالعلوم دیوبند قائم کی گئی۔ اس کے جنرل سیکرٹری مولانا عبیداللہ صاحب سندھی بنائے گئے۔ "جمعیۃ الانصار" کے مختلف شعبے قائم کئے گئے جن میں اعلیٰ فکر و نظر کی کتابوں کی تدریس، تبلیغ کا اعلیٰ پیمانے پر کام، ہندوستان کے مختلف شہروں میں عظیم الشان جلسے، فراغت علم کے بعد درجہ تکمیل وغیرہ ایسے امور تھے جن کے قواعد و ضوابط جو موتمر الانصار مراد آباد کی رپورٹ میں درج ہیں، ایسے محیط اور جامع ہیں جو تمام دنیائے اسلام کو محیط ہوسکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمعیۃ الانصار کی پوری سکیم سے بظاہر تبلیغ، اشاعت دین معلوم ہوتی ہے، لیکن اس انجمن کے ذریعے خلافت عادلہ اور راشدہ کی تمہید قائم کی جا رہی ہے اور اس انجمن کے ذریعے تبلیغ اور نشر و اشاعت کا جو انتظام قائم کیا گیا ہے، اس کے ذریعے مسلمانان ہند میں حریت اور انگریز کی حکومت کے خلاف ایسے حالات اور ایسی فضا پیدا کرنی ہے جس سے ہندوستان میں مسلمانوں کی گئی ہوئی حکومت کو دوبارہ زندہ کیا جاسکے۔

(رپورٹ موتمر الانصار مراد آباد مرتبہ مولانا عبیداللہ سندھی)

مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم نے شیخ الہندؒ کے ایما پر اور اکابرین کے مشوروں سے جو قواعد و ضوابط تعلیم و تدریس، تبلیغ و ارشاد، رشد و ہدایت اور تقریر و تحریر، پند و مواعظ، مناظرہ و مباحثہ کے مرتب کئے ہیں، اگر اس راہ پر آج پاکستان کے مدارس عربیہ مثلاً مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ کا دارالعلوم، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کا جامعہ عربیہ، لاہور کا جامعہ اشرفیہ، ملتان کا خیر المدارس، ساہیوال کا جامعہ رشیدیہ، ٹنڈو اللہ یار کا مدرسہ متحد طور پر اپنا لیں تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ شیخ الہندؒ کی اس تنظیم پر چلنے کی وجہ سے عربی علوم کے طلبہ میں ایک انقلاب انگیز ایسی حرکت پیدا ہوسکتی ہے جو پاکستان میں خلافت راشدہ اور حکومت عادلہ اور سیاست فاضلہ کے لیے بڑی آسانی سے راہ ہموار کرسکتی ہے

یہ آپ دیکھیں گے کہ دیوبند کی سرزمین کے خطہ کے سینوں میں جو دلکش ہیں اس کے یہ قسمت کی وہاں کا پیدا کرے گی اور ایسے جواہر کی جماعت تیار ہوگی، جیسے حضرت مولانا سید احمد شہید اور ان کے علماء رفقائے کار تھے ان کے یہ قسمت کچھ خاص رنگ پیدا کرتی ہے۔ جیسا کہ شیخ الہند اور مولانا عبیداللہ سندھی تھے اور ایسی ہستیاں خاص خاص ہوتی ہیں۔ یہ قدرتی طور پر ابھرتی ہیں اور بنتی ہیں۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

محبت کی نہیں جاتی ہے، خود ہی آپ ہوتی ہے
یہ شعلہ خود بخود بھڑکا، بھڑکایا نہیں جاتا
محبت کے لیے دنیا میں دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نحیف البدن، کمزور جسم، لاغر بدن لیکن بقول مولانا گنگوہی علم کے کھلاتے اور سیاست میں بے حد ماہر، چاہتے تھے کہ انگریز کو ملک سے باہر نکال کر اسلامی حکومت قائم کی جائے۔ جتنے طلبہ افغانستان، صوبہ سرحد اور آزاد قبائل سے دارالعلوم دیوبند میں آتے، آغاز درس سے ہی ان کو انگریز کے خلاف جہاد کرنے کا سبق پڑھاتے، تاآنکہ جب مولانا عبیداللہ سندھی افغانستان پہنچ کر معلوم ہوا۔ بہرحال ثمرۃ التربیت سے جمعیۃ الانصار دیوبند تک اور مرور جمعیۃ الانصار سے نظارۃ المعارف دہلی تک کا پورا منصوبہ حریت انقلاب کا تھا اور اسی کے ضمن میں ریشمی رومال کے ذریعے کابل سے حجاز کو مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم نے شیخ الہند کو خط لکھا تھا یا اپنے کام کی رپورٹ۔

چونکہ ہماری یہ کتاب "حیاتِ عثمانی" علامہ شبیر احمد کی شخصیت سے متعلق ہے، اس لیے جمعیۃ الانصار میں علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کے ضمن میں جمعیۃ الانصار کا پورا نقشہ آپ کے سامنے آجائے گا۔

جمعیۃ الانصار میں علامہ عثمانی کی شاندار خدمات

شہرتِ عام اور بقائے دوام

سعادت مند پیشانیاں کسی بلند شخصیت کی جھلک لوگوں کی آنکھوں کو کچھ طرح دکھا دیتی ہیں کہ اہل بصیرت کے لیے سب کچھ ان میں نظر آجاتا ہے۔ علامہ عثمانی جو عہد طالب علمی ہی میں طلبہ اور مدرسین میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔

چنانچہ دارالعلوم دیوبند سے نکل کر ندوۃ العلماء تک ان کی لیاقت کا ذکر پہنچا اور غائبانہ سید سلیمان ندوی سے جو ندوہ میں زیر تعلیم تھے تعارف ہوا۔ دونوں میں نامہ و پیام ہوا اور تبادلۂ سلام و کلام ہونے لگا۔ جب علامہ عثمانی عہد طلب علم سے نکل کر فتح پوری کے مدرسے کے صدر مدرس بن کر دہلی پہنچے تو مرکز میں تقریروں کے سلسلے نے آپ کے نام کو باہر کے علمی اور ادبی حلقوں میں پہنچایا۔ ابھی آپ دہلی ہی میں تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہند نے مولانا عبیداللہ سندھی کو بلایا اور ان کی آمد پر دیوبند کی فضاؤں میں انقلابی حرکت، اور تعلیمی پروگرام میں ایک خاص تبدیلی رونما ہونے کے آثار ہونے لگے۔ شیخ الہند کے اشاروں پر جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک انجمن کی تشکیل ہوئی۔ مولانا عثمانی اس کے سرگرم رکن رہے۔

جمعیۃ الانصار ۲۷ رمضان ۱۳۲۷ھ

اس انجمن کی تشکیل کا پس منظر اور تاریخی خاکہ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی موتمر الانصار مرادآباد کے جلسہ ۱۵/۱۶/۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء کی رپورٹ میں اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"مدت سے اس قسم کے خیالات میرے اور دیگر تعلیم یافتگان مدرسہ میں سے ایک بڑی جماعت کے ذہن میں خطور کر رہے تھے، مگر ان کے اظہار کی نوبت بتاریخ

۲۹ رمضان المبارک ۱۳۲۸ھ بعد عشا آئی جب استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدظلہ العالی نے مدرسہ کی روز افزوں ضروریات تعلیمی و مالی حالت کی طرف تعلیم یافتگان مدرسہ کو متوجہ کرنے کی ضرورت بیان فرمائی رمضان کی ستائیسویں شب مقدس کو حضرت مولانا مدظلہ العالی اور سرپرستان جمعیۃ نے اس مجلس کے انعقاد کی اجازت دی اور بروز چہارشنبہ ۲۷ رمضان بوقت ۹ بجے بصدارت جناب مولانا محمود حسن صاحب سلمہ افتتاحی جلسہ ہوا۔ جس میں قدیم طلبہ مدرسہ کی ایک معتدبہ تعداد شامل ہوئی۔ اول قاری حافظ محمد طیب سلمہ ابن مولانا حافظ احمد صاحب نے سورہ صف کی خوش الحانی سے تلاوت کی، اس کے بعد بندہ نے اپنے مربی علمی مدرسہ عالیہ دیوبند کے حقوق اور انعقاد مجلس کی ضرورت پر مختصر تقریر کی...... بندہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو استاذ العلماء حضرت مولانا مدظلہم نے اس کی تائید میں ایک مفصل تقریر فرماتے ہوئے، مجلس کی ضرورت ظاہر فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ اب ضرورتیں ایسی پیش آ رہی ہیں، جن کی وجہ سے ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا ہے، اس درمیان میں جناب مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ (ابن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ) اور مولانا مولوی حبیب الرحمن صاحب مددگار مہتمم نے بھی تقریریں فرمائیں اور معمولی بحث کے بعد مجلس کے انعقاد کی ضرورت باتفاق رائے تسلیم کی گئی اور مجلس کا نام "الانصار" تجویز ہوا"

رپورٹ صـ۵۵/۵۵

شوال ۱۳۳۰ھ کے اختتام میں مولانا سندھی جمعیۃ الانصار کے آغاز کے متعلق لکھتے ہیں:

"دارالعلوم دیوبند میں ایک ایسی حرکت پیدا ہوئی جس سے منتشر پروانے شمع کے گرد جمع ہونے شروع ہوئے اور یہ جمعیۃ الانصار کی ابتدا تھی، جو ۲۷ رمضان ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو مدرسہ عالیہ میں منعقد ہوئی"

(القاسم صـ۱۲)

ان کی تحریروں سے تشکیل انجمن کی تفصیلی روداد سامنے آگئی جس میں بتایا گیا ہے کہ اس قسم کی انجمن کو جنم دینے کے لیے عرصہ سے دماغ میں خیالات کی کھچڑی پک رہی تھی اور بالآخر وہ وجود میں آگئی۔ انجمن کے اغراض و مقاصد مرتب ہوئے، جو مذکورہ رپورٹ میں تفصیل سے درج ہیں۔ قواعد و ضوابط اور قوانین ترتیب دیئے گئے اور اسی "الانصار" کے ماتحت چھ شعبے قائم کئے گئے۔ یہ رپورٹ اس وقت میرے سامنے ہے اور میں نے اس کے تمام اطراف و جوانب پر غور کیا ہے اور راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس انجمن کو پھر زندہ کر کے اس کی سکیم کو ازسر نو چلایا جائے، جو چھ شعبے جمعیت میں قائم کئے گئے ان کے متعلق دفعہ ۲۱ کے ماتحت مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں:

" جمعیۃ (الانصار) اپنے فرائض (یعنی مدرسے کی تعلیمی انتظامی مالی ترقی) کی تعیین و تشخیص کے لیے ۵ شعبے قرار دیتی ہے (الف) تکمیل التعلیم، (ب) نظام التعلیم (ج) الارشاد (د) التالیف والاشاعت (ہ) جلسہ علمیہ (روداد مؤتمر الانصار مراد آباد صـ۱)

یہ پانچ شعبے اپنے اندر انقلاب کی ہمہ گیر قوت کے حامل ہیں، اس کے قواعد و ضوابط کے ضمیمے میں آگے چل کر قاعدہ ۵ دفعہ ۲ میں رپورٹر لکھتے ہیں:

" جمعیۃ الانصار کا وہ جلسہ علمیہ جس میں (الف) قرآن شریف و حدیث شریف کے اسرار و لطائف بیان ہوں (ب) اصلاح عقائد و اخلاق و اعمال کے متعلق علمی مضامین

پاسکے جائیں (۶) مسلمانوں کی مذہبی علوم و معارف
کی حفاظت و اشاعت کے وسائل پر غور اور مدارس و
مساجد کی اصلاح و عمارت پر حسبِ ضرورت بحث و مشورہ ہو۔
(۷) ان تجاویز پر عمل کرنے کا تہیہ کیا جائے۔ موتمر الانصار
کے نام سے موسوم ہوگا" (رپورٹ موتمر الانصار صـ۱)

غرض یہ ہے کہ دارالعلوم میں ایک خاص حرکت پیدا ہوئی اور ۱۳۲۸ھ
میں جب کہ علامہ شبیر احمد عثمانی مدرسہ فتحپوری دہلی میں مدرس تھے، دارالعلوم میں
انقلابی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں اس اثنا میں علامہ دہلی سے جمعیۃ الانصار
میں شرکت کے لیے دیوبند تشریف لائے، یہاں سے حضرت عثمانی کی شہرت
میں مزید اضافہ شروع ہوا، کیونکہ آپ بھی "الانصار" کے ایک ممتاز ممبر بنائے
گئے، مولانا عبید اللہ صاحب نے رپورٹ میں اس حقیقت کا نشان اس طرح
دیا ہے، لکھتے ہیں:

"اور ایک مجلس خاص جو نصاب اور نظام مدرسہ اور
طرز تعلیم کے بارے میں غور و فکر کرے۔ جمعیت الانصار
کے ارکان ذیل سے مرکب کی گئی، مولانا مولوی ناظر حسن
صاحب، مولانا مولوی مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا شاہ
وارث حسن صاحب بنارسی، مولانا مولوی محمد انور شاہ
صاحب کشمیری، مولانا مولوی حسین احمد صاحب مدنی، مولانا
مولوی کفایت اللہ صاحب شاہجہانپوری، مولانا اصغر
حسین صاحب دیوبندی، مولانا مولوی شبیر احمد صاحب
دیوبندی، عبید اللہ ناظم جمعیۃ الانصار۔

(رپورٹ صـ۵۹)

مذکورہ فہرست سے مولانا عثمانی کا انجمن انصار نیز اصلاح تعلیم کی کمیٹی
میں ہونا صاف ظاہر ہے۔

جمعیۃ الانصار میں حضرت عثمانی کی شاندار خدمات:-

ابھی آپ دہلی کے مدرسے سے ہی وابستہ تھے کہ اصلاح تعلیم کی
کمیٹی کے ایک ممبر ہونے کی حیثیت سے آپ نے ۱۱، ۱۲ محرم ۱۳۲۸ھ کی
میٹنگ میں شرکت فرمائی۔ اس میٹنگ میں جو بغرض اصلاح نصاب و طریقہ
تعلیم منعقد کی گئی تھی۔ نہ صرف کمیٹی کے مذکورہ بالا افراد شامل ہوئے بلکہ
دیگر حضرات کو بھی مشورے کے لیے دعوت دی گئی، رپورٹ کے صفحہ ۶۵ پر اس کا
ذکر کرتے ہوئے آخر میں حسب ذیل حضرات کے دستخط ہیں، جنہوں نے اس میں
شرکت کی۔ العبد

محمد ناظر حسن۔ صدیق احمد عفا اللہ عنہ بقلم خود۔ محمد اشرف علی
عفی عنہ۔ احمد حسن امروہی عفا اللہ۔ خلیل احمد عفا اللہ۔ محمود حسن عفی عنہ
عبید اللہ۔ ابو محمد احمد عفی عنہ۔ عبد المؤمن۔ محمد کفایت اللہ۔ خاکسار
سراج احمد عفی عنہ۔ بندہ محمد امین عفی عنہ۔ محمد سہول عفی عنہ۔ وارث
حسن عفی عنہ۔ عبد الصمد عفی عنہ۔ احقر الزمان گل محمد خان عفی عنہ۔ بندہ
محمد مرتضیٰ حسن عفی عنہ۔ کفایت اللہ گنگوہی۔ احقر الطلبہ حسین احمد
عفا اللہ۔ عبد الرحیم عفی عنہ۔ محمد رشید رة اللہ عفرلہ۔ عبد الرحمن
کان اللہ له ولوالدیه ولجمیع المؤمنین۔ احقر محمد انور عفی اللہ عنہ۔ بندہ
محمد معز الدین عفی عنہ۔ عاشق الٰہی عفی عنہ میرٹھی۔ بندہ عزیز الرحمن
عفی عنہ دیوبندی۔ شبیر احمد عفی عنہ۔ حبیب الرحمن عفی عنہ
احمد مہتمم مدرسہ دیوبند۔

ان اسمائے گرامی کی فہرست میں جو اس میٹنگ میں شریک ہوئے مولانا
عثمانی کے بھی دستخط موجود ہیں۔ ۱۱، ۱۲ محرم سے گزر کر یہ جلسہ ۱۳ محرم تک
گزر گیا اور بقیہ کارروائی عمل میں لائی گئی۔ ۸، ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ کو پھر جلسہ ہوا
جس میں ابنائے قدیم بھی اور نواب محی الدین صاحب قاضی ریاست بھوپال،
حاجی سعید صاحب اتالیق نواب مالیر کوٹلہ، سرپرست حضرات اور دستار بندی
ہونے والے طلبہ شامل ہوئے، اس روز مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جنکو
رپورٹ میں مجلس کا سرپرست لکھا گیا ہے، تقریر فرمائی اور یہی وہ مجلس ہے جس

میں حضرت عثمانیؒ کو حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب نے خاص نوازش سے شرف بخشا، مولانا حبیب اللہ صاحب لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب، مرحوم کی تصانیف کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مولانا مولوی سید مرتضےٰ حسن صاحب سے فرمایا کہ مولوی شبیر احمد صاحب مدرس اول مدرسہ فتحپوری دہلی کو چونکہ مولانا مرحوم کی کتابوں سے ایک خاص مناسبت ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنا عمامہ ان کو دوں، آپ اس امر کا اعلان فرما دیں، مولوی مرتضےٰ حسن صاحب نے حضرت مولانا کی اس قدر افزائی کا اعلان فرمایا: اس کے بعد حضرت سلطان العلماء مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہندؒ مدظلہم سے اجازت لے کر مولانا اشرف علی صاحب عم فیضہم نے اپنا عمامہ مولوی شبیر احمد صاحب کے سر پر رکھا۔ (رپورٹ ص ۵۹-۶۰)

دیوبند میں آمد

یہ عزت افزائی کا واقعہ ہندوستان کے جید علماء کے سامنے ہوا۔ جس نے علامہ عثمانی کی شہرت اور عظمت کو چار چاند لگا دیئے، اس کے بعد ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ کو ایک اور میٹنگ ہوئی، جس میں جمعیۃ الانصار کے ۲۰ اراکین کے علاوہ حضرت شیخ الہندؒ، مولانا مسعود صاحب گنگوہی صاحبزادہ حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ، مولانا عبدالرحیم صاحب رائپوری وغیرہم شریک ہوئے۔ اس میں بھی علامہ عثمانی شریک تھے، یہ سب مجالس اس زمانے میں ہوئیں جب کہ آپ کا تعلق ابھی دہلی سے تھا، لیکن اس کے بعد موصوف شوال ۱۳۲۸ھ میں دارالعلوم دیوبند میں تشریف لے آئے، کیونکہ ان حالات میں کسی نے بھی آپ کا دہلی رہنا پسند نہ فرمایا، وجہ یہ تھی کہ ان جیسے اہم کاموں کو انجام دینے کے لیے ایک قادر الکلام مقرر اور انشا پرداز کی ضرورت تھی اور آپ ان دونوں باتوں میں پوری مہارت رکھتے تھے۔

شعبۂ تکمیل التعلیم کا افتتاح

بعد ازاں ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ کو درجۂ تکمیل کا افتتاح ہوا اب حضرت عثمانی دارالعلوم کے پروفیسر کی حیثیت سے دیوبند میں موجود تھے اس لیے بھی آپ نے شرکت کی بلکہ اس کی رپورٹ خود مرتب کی۔ مولانا حبیب اللہ صاحب رپورٹ میں لکھتے ہیں:

"۱۵ ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ کو عام جلسے میں درجۂ تکمیل کا افتتاح ہوا جس کی روداد مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی معتمد جمعیۃ الانصار کی لکھی ہوئی درج کی جاتی ہے۔"

(رپورٹ ص ۶۲)

یہ پوری کی پوری درجۂ تکمیل کی رپورٹ حضرت عثمانی کی تحریر کی ہوئی موتمر الانصار مراد آباد کی روداد میں درج ہے جس میں اس کلاس کا نصاب درج ہے اور یہ بھی کہ اس درجہ کے طلبہ کے لیے ادب، تاریخ، تفسیر، کلام وغیرہ علوم کی مستند کتابوں کا مطالعہ، اردو عربی لٹریچر کی مہارت اور مناظرہ یا تدریس وغیرہ کی مشق کرنا واجبات میں سے قرار دیا گیا ہے: اس میٹنگ کے بعد ۲۸ ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ میں ایک مختصر سا اجلاس ہوا تھا، جس میں مختلف قواعد منظور کئے گئے۔

موتمر الانصار مراد آباد ۱۵، ۱۶، ۱۷ اپریل ۱۹۱۱ مطابق ۱۳۲۹ھ

مولانا عثمانی دارالعلوم میں فرائض تدریس کے ساتھ کہ جس میں آپ کئی کئی گھنٹے مختلف کلاسوں کو پڑھاتے تھے۔ جمعیۃ الانصار کے کاموں میں بھی سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے، گویا علمی، مذہبی، قومی و ملی اور وطنی تمام ہی خدمات انجام دے رہے تھے۔ تا آنکہ الانصار کے ماتحت ہر سال میں کسی خاص شہر میں جلسوں کا کیا جانا بھی مقاصد میں آتا تھا، اس لیے شوال ۱۳۲۸ ہجری کا

مُرادآباد کے چند ذی وجاہت حضرات کی کوشش و تحریک سے ۱۵، ۱۶، ۱۷ اپریل کی تاریخیں مؤتمر الانصار کے لیے مقرر کی گئیں اور مُرادآباد میں یہ پہلا جلسہ منعقد ہوا. اس جلسے میں علامہ عثمانی نے اپنا معرکۃ الآرا مضمون "اسلام" کے عنوان سے پڑھا. ناظم جمعیۃ الانصار مؤتمر کی رپورٹ روداد میں لکھتے ہیں:

"آٹھ بجے مولانا مولوی شبیر احمد عثمانی دیوبندی کھڑے ہوئے اور اسلام کے عنوان پر اپنی تقریر شروع کی. یہ وہ زبردست تقریر ہے کہ جس کی کوئی بات دلائل عقلیہ سے خالی نہیں. فلسفہ و حکمت اور علم کلام کے ذریعے سے جو آج کل تعلیم یافتہ گروہ کا تختۂ مشق ہیں ان تمام اعتراضات کو اٹھا دیا گیا جس کی نسبت مولوی حالی نے عربی تعلیم یافتہ گروہ کی بے کاری کو اپنے مسدس میں کہا تھا کہ نہ دلائل حقیقت اسلام اور ضرورت نبوت و رسالت کو بھی ثابت نہیں کر سکتے اور نہ اُن کے پاس اس کا ذخیرہ ہے۔"

(رپورٹ ص ۴۳)

علامہ صاحب کا یہ مضمون ۱۵ر اپریل کے تیسرے اجلاس میں صبح کے وقت آٹھ بجے پڑھا گیا اور دس بجے ختم ہوا. اس جلسے میں علیگڑھ، ندوہ، دیوبند کے اکابر اور اعاظم رجال جمع ہوئے تھے. علامہ شبلی بھی موجود تھے. حضرت عثمانی کے اس مقالے کا سب پر اتنا زبردست اثر ہوا کہ ہندوستان کے عوام اور خواص جانتے ہیں، ان کی عظمت و شہرت نے اس مقالے سے ہی ملک میں شہرت حاصل کی. آپ کی تقریر کے اثر کا نقشہ مولانا حبیب اللہ صاحب رپورٹ میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

"اکابر علماء نے اس تقریر کو جس ذوق و شوق سے سنا اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جس وقت مولانا محمد اشرف علی صاحب نے اپنا وعظ شروع کیا، تمہیداً یہ بات فرمائی کہ جو دلائل عقلیہ وجود صانع حقیقی اور ضرورت نبوت و رسالت پر مولوی شبیر احمد صاحب نے بیان فرمائے ہیں میں اب اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں. مولانا اشرف علی صاحب کا یہ قول اگرچہ انکسار پر مبنی تھا، لیکن اس میں شک نہیں کہ مولوی شبیر احمد صاحب نے جس خوبی اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ یہ تقریر فرمائی وہ تمام اہل علم حضرات کے دل پر نقش کالحجر ہو گئی. دس بجے یہ تقریر ختم ہوئی اور تمام حاضرین جلسہ نے مولانا شبیر احمد صاحب کی درازیٔ عمر کے واسطے دعا کی" (ص [illegible])

مؤتمر الانصار کا یہ اجلاس مولانا عثمانی کی زندگی کو چمکانے کا سبب بن گیا۔ ملک کے زبردست اور جید علماء، لیڈر، رؤسا اور عوام سے تعارف کا موقع ملا اور ہندوستان میں شہرت کا ذریعہ بنا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف ۲۴ سال کی تھی۔

چوتھے اجلاس کے بعد عصر کی نماز پڑھ کر ایک مخصوص اہل علم کا اجلاس ہوا جس میں علامہ عثمانی نے تقریر فرمائی. رپورٹر لکھتے ہیں:

"بعد نماز عصر مولوی شبیر احمد صاحب کا وعظ وجود باری اور توحید اور بحث خلق افعال وغیرہ سے متعلق بالکل فلسفیانہ رنگ میں ہوا. جو مخصوص اہل علم کے لیے تھا. اور انھوں نے نہایت دلچسپی کے ساتھ اس کو سنا۔"

(رپورٹ ص ۱۳۲)

اس تقریر سے اندازہ لگتا ہے کہ اتنے بڑے بڑے علماء میں ایک چوبیس سالہ نوجوان عالم ایک خالص علمی اور فلسفیانہ تقریر کر کے اکابر سے داد لیاقت لے رہا ہے۔

کراچی میں علامہ عثمانی کا آریوں سے مناظرہ

مؤتمر الانصار مُرادآباد کے بعد علامہ آریوں سے مناظرے کے لیے

ہو رہے گا۔ افتتاح شوال ۱۳۲۹ھ مطابق اکتوبر ۱۹۱۱ء میں اس مناظرے
کی کارروائی کا سبب ذیل عبارت میں اظہار کیا گیا ہے۔

مدیر القاسم لکھتے ہیں:

"کراچی میں ... کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا اور اس
میں اہل اسلام سے مناظرے کی قرارداد ہو گئی۔ تب
انجمن ضیاء الاسلام کراچی کی جانب سے مولوی شبیر احمد صاحب
دیوبندی عثمانی مدرس مدرسہ عالیہ دیوبند کی طلب میں تار آیا
چنانچہ مولوی صاحب موصوف ۲۲ رمضان کو کراچی روانہ
ہوئے اور وہاں بحمد اللہ مولوی صاحب کے نہایت
مؤثر بیانات ہوئے جو نہایت ہی دلچسپی سے سنے گئے
اور اہل کراچی پر ان بیانات کا گہرا اثر پڑا اور مولوی صاحب
ہی کی موجودگی میں جمعیۃ الانصار کی شاخ قاسم المعارف
کا باضابطہ انعقاد و افتتاح ہوا۔ ۲۸ رمضان ۱۳۲۹ھ
کو عین تراویح کے وقت سیکرٹری صاحب انجمن ضیاء الاسلام
کا تار بدیں مضمون موصول ہوا کہ مولوی شبیر احمد صاحب نے
نہایت کامیابی حاصل کی اور آج کی میل میں روانہ دیوبند
ہو گئے۔ ۳۰ رمضان کو دس بجے دن کے مولوی صاحب
موصوف بخیریت تمام دیوبند پہنچے۔ والحمد للہ علی ذالک"

(القاسم شوال ۱۳۲۹ھ صفحہ ...)

آپ کی شہرت سن کر ہی اہل کراچی نے آپ ہی کو مناظرے کے لیے منتخب
کیا۔ حالانکہ رمضان مبارک کا مہینہ تھا لیکن اس مشقت کو برداشت کیا اور روزہ
برابر سفر میں رہے۔ اس عبارت سے ظاہر ہے کہ آپ کی وجہ سے وہاں جمعیۃ
الانصار کی شاخ قاسم المعارف قائم ہوئی۔

مؤتمر الانصار میرٹھ ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۰ء / ۱۰ اپریل

مراد آباد کے جلسے سے ٹھیک ایک سال بعد جمعیۃ الانصار کا ایک جلسہ
میرٹھ میں ۱۷، ۱۸، ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ مطابق ۷، ۸، ۹ اپریل ۱۹۱۲ء
کو منعقد ہوا۔ اس جلسے کی کارروائی مولانا سراج احمد صاحب نائب ناظم
جمعیۃ الانصار و نائب مدیر رسالہ القاسم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ میں شائع
کی ہے۔ یہ جلسہ تین دن رہا اور کل ۵ نشستوں میں ختم ہوا۔ حضرت مولانا اشرف
علی صاحب تھانوی جلسہ کے صدر تھے۔ لیکن مولانا احمد حسن صاحب کا انتقال
پہلے ہی ۱۳۳۰ھ میں انتقال ہو چکا تھا انہوں نے مرادآباد کے مؤتمر الانصار
کی صدارت بھی فرمائی تھی اور تقریر بھی کی۔ آپ کے علاوہ مولانا محمد ابراہیم صاحب
دہلوی، مشار تفضل حسن صاحب چاندپوری کی دوسرے اجلاس میں تقریریں ہوئیں
۱۸ ربیع الثانی بروز اتوار تیسرے اجلاس میں مولانا عثمانی کی تقریر ہوئی۔ مولانا
سراج احمد صاحب نائب مدیر لکھتے ہیں:

"مولوی قاری محمد شفیع تھانوی کی تلاوت کلام مجید سے آغاز
جلسہ ہوا۔ آپ نے قرأت سبعہ میں قرآن شریف پڑھا۔ پھر
مولوی قاری احمد موسیٰ صاحب امام جامع مسجد کلکتہ نے
عربی لہجہ میں اور پھر چند طلباء نے دارالعلوم دیوبند نے
مختلف قراءتوں میں کلام مجید پڑھا۔ جس سے اہل جلسہ پر
ایک خاص اثر اور وارفتگی کا عالم تھا۔ اس کے بعد جناب
مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی مدرس دارالعلوم
دیوبند نے اپنی وہ تقریر شروع کی، جس کا عنوان الدار الآخرۃ
ہے۔ عنوان بتلا رہا ہے کہ مضمون کیسا کچھ دقیق ہوگا۔ ادھر
مولانا کا طرز تحریر و تقریر فلسفیانہ، مشکل تھا کہ عوام اس
مضمون سے متمتع ہوسکتے، مگر جہاں مولانا کی تقریر فلسفیانہ
ہے، وہاں خدا تعالیٰ کے فضل سے طرز ادا بھی ایسا
عام فہم ہے کہ اس کی نظیر دوسری جگہ مشکل سے مل سکتی
ہے۔ آپ نے دار آخرت کے ثبوت اور ضرورت پر کئی

ان دونوں مقامات پر جمعیۃ الانصار کے جلسے منعقد ہوئے۔ اسی طرح اہلِ شملہ کی خواہشات پر جمعیۃ الانصار کا ایک جلسہ ۹، ۱۰، ۱۱ اگست ۱۹۱۳ء مطابق ۱۳۳۱ھ شعبان میں منعقد ہوا۔ مولانا منظہر الدین شیرکوٹی سیکریٹری جمعیۃ الانصار کی شملہ میں تقریریں ہوئیں، اور ان ہی کی مساعی سے علمائے دیوبند وہاں پہنچے۔
۸ اگست کو شملہ کے اسٹیشن پر وفد علمائے دیوبند کا شاندار زبردست استقبال ہوا کہ اس سے پہلے ایسا شاندار استقبال کسی کا نہ ہوا تھا۔ شملہ اسٹیشن بھرا ہوا تھا کہ دو بجکر دو منٹ پر کلکتہ میل اسٹیشن پہنچی۔ یہ وفد آنریبل میرزا نادر حسین صاحب بیرسٹر شملہ کے یہاں ٹھیرا۔ سالارِ وفد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی تھے۔ آپ کی گاڑی کو آدمیوں نے کھینچنا چاہا، لیکن آپ نے منع فرمایا۔
اس جلسے میں چھ اجلاس ہوئے۔ پہلا اجلاس بعد نماز جمعہ ۹ اگست کو دو بجے سے ۵ بجے تک ہوا۔ پہلے خان بہادر کرنل عبدالمجید خاں نے دارالعلوم دیوبند کے برکات اور خدمات پر تقریر فرمائی۔ اس جلسے میں اتفاق سے شیخ الاسلام افغانستان بھی موجود تھے، جو دیوبند کے فاضل تھے۔ بعد ازاں حکیم الامت نے تقریر فرمائی جس نے لوگوں پر جادو کا کام کیا۔ دوسرے اجلاس میں مولانا سید محمد انور شاہ صاحب نے قرآن شریف کے اعجاز اور عربی زبان کی ضرورت پر تقریر فرمائی۔ تیسرے اجلاس میں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وعظ فرمایا اور ان کے بعد مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے معجزات کی بحث پر ایک زبردست مدلل تقریر فرمائی۔ چوتھے اجلاس میں مولانا محمد سہول صاحب نے علم کے فضائل اور مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے تعلیمِ نسواں پر تقریر فرمائی۔ پانچویں اجلاس میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نے مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کی ضرورت پر تقریر فرمائی۔ بعدہٗ مولانا تھانوی نے "تکمیلِ فلاحِ دارین کے وسائل" پر وعظ فرمایا۔
عبدالقادر صاحب جن کی مذکورہ بالا رپورٹ القاسم رمضان ۱۳۳۰ھ میں چھپی ہے، وہ اپنی اسی رپورٹ میں آگے چل کر لکھتے ہیں:
"یہ پانچواں اجلاس آخری تھا اور اس کے بعد کوئی وقت پروگرام میں نہیں دیا گیا تھا، لیکن سامعین کے بے حد اصرار پر مولانا منظہر الدین صاحب نے ساڑھے نو بجے شب کے جلسے کا اعلان کیا جس میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ پر نہایت پُر مغز اور موثر تقریر فرمائی۔ آپ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ عقلاً و نقلاً اگر کوئی مذہب حق ہو سکتا ہے، تو وہ اسلام ہے" (القاسم رمضان ۱۳۳۰ھ ص ۹)
یہ جلسہ نہایت ہی عظمت اور کامیابی سے ختم ہوا اور علمائے دیوبند ۱۱ اگست کو شملے سے دیوبند واپس ہوئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان اجلاسوں میں بعض حضرات کی اگرچہ دو دو تقریریں ہوئیں، لیکن پانچویں اجلاس پر پروگرام ختم ہو جانے کے باوجود اہلِ شملہ نے جس فاضل کی تقریر کے لیے دوبارہ پوری تمنا اور خواہش سے اصرار کیا وہ علامہ عثمانی تھے، یہاں یہ بھی اطلاع دینی ہے کہ علامہ اس جلسے میں بھی برابر شریک ہیں اور لسانی جہاد میں مصروف ہیں اور وہ کسی جلسے سے بھی پیچھے نہیں رہے، جس سے ان کی سرگرمیاں اور محنت پسندیاں مترشح ہوتی ہیں۔

شملہ میں جمعیۃ الانصار کا ایک جلسہ

جمعیۃ الانصار کا یہ جلسہ ۲۷، ۲۸، ۲۹ شعبان ۱۳۳۲ھ مطابق ۱، ۲، ۳ اگست ۱۹۱۴ء کو پھر دوبارہ اہلِ شملہ کی خواہش پر شملہ میں منعقد ہوا۔ اس وفد میں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا سراج احمد صاحب اور مولانا منظہر الدین صاحب تھے۔ پہلا اجلاس یکم اگست کو بعد نماز جمعہ ہوا۔ دوسرا اجلاس رات کو جس میں مولانا سراج احمد صاحب اور مولانا عبدالسمیع صاحب نے تقریریں کیں۔ تیسرا اجلاس ہفتہ کو ۱ بجے ہوا، اس میں علامہ عثمانیؒ کی تقریر ہوئی۔ اس جلسے کے رپورٹر عبدالقادر صاحب نائب منیجر آرمی پریس شملہ تحریر فرماتے ہیں:

فصیح البیان مولانا شبیر احمد صاحب کا برکات رمضان شریف پر مقالہ شروع ہوا۔ آپ کی تقریر نہایت دلفریب تھی اور ہر ہر جملہ سے فصاحت ٹپکتی تھی۔ علمی نکات کا ذہن نشین کرنا آپ کا حصہ تھا۔ دوسری نشست کے جلسے میں پھر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے وعظ فرمایا اور بعد کو مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے "حدوث عالم" پر ایک مدلل تقریر شروع کی۔ اگرچہ مضمون فلسفی اور نہایت خشک تھا، مگر آپ کی صاف بیانی نے مجمع پر وہ جادو کیا کہ سب محو حیرت تھے۔ زور کلام سے سامعین نقش تصویر کی طرح خاموش تھے۔ کہیں کہیں آپ کی تشبیہیں اس غضب کی تھیں کہ لوگ پھڑک اٹھتے تھے۔ الحمدللہ کہ یہ جلسہ بخیر و خوبی ختم ہو گیا لیکن سامعین کا شوق بڑھتا ہوا، چنانچہ تعلیم یافتہ گروہ کی طرف سے یہ درخواست کی گئی کہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ایک تقریر بابت تنزل اور ترقی کے اسباب پر آج بعد مغرب فرمائیں۔ مولانا نے اس کو منظور بھی فرمایا لیکن بعد میں خیال آیا کہ آج ۲۹ شعبان ہے اور چاند ہونے کا احتمال ہے۔ اس لیے یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اور اگلے روز مسلمانان شملہ کو حضرات دیوبند سراپا حسرت و ارمان بنا کر رخصت ہو گئے۔

عبداللطیف نائب

منیجر آرمی پریس شملہ

نائب صاحب کی رپورٹ آپ کے سامنے ہے۔ اس سال کے جلسۃ الانصار میں بھی علامہ اپنی پوری شان ابتدا ہی سے شریک رہے ہیں۔ آپ کی دو تقریریں ہو چکنے کے باوجود اہل شملہ نے آپ سے ایک اور تقریر کرنے کی خواہش کی ہے۔ یہ بار بار کی فرمائشیں آپ کے علم، تقریر کی بلند پروازی اور دل ربائی کے

شکایات نظر آتی ہیں۔ لیکن اس دفعہ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سنجیدہ نظر ہی نہیں آتے ہیں۔ خدا جانے کہیں تیسرے اور [illegible] کا شکار ہوئی تو نظر نہیں آتی۔ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ [illegible] انشاءاللہ [illegible] اس راز سے پردہ اٹھ جانے سے پہلے کچھ بیان کرنا ہے۔ [illegible] کے حالات کے سلسلے میں ترتیب وار بعض واقعی حالات اور بھی بیان کرنے تھے کہ [illegible] حالات کا [illegible] اور وہ بعض حالات رہ گئے جنکو [illegible] [illegible] اس لیے [illegible] آخری حد تک بیان کرنے کی ضرورت پیش نہیں [illegible] تو تنگ نہیں۔ ہاں تو قصہ کے اس آخری جلسے میں [illegible] کے دو دھا مولانا حبیب الرحمٰن غائب ہیں اور پھر [illegible] [illegible] مرزا [illegible] اور [illegible] میں نظر آتی [illegible] شور و شورش [illegible] سے نکلی [illegible] کا ہونا اور [illegible] کا گرنا لازمی امر ہے۔ آخر رات کا وہ نمایاں غائب ہوا [illegible] کا پتہ چلا کہ دہلی میں موجود ہیں اور دیوبند سے

؎ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

مولانا سندھی کی کہانی خود اُن کی اپنی زبانی

دیوبند سے مولانا سندھیؒ دہلی چلے گئے۔ آپکا ایک بیان اخبار جمعیۃ دہلی میں شائع ہوا تھا اور پھر رسالہ قائد مرادآباد کے ربیع الاول کے پرچے میں نکلا۔ یہ بیان آپ نے ہندوستان کی طویل جلاوطنی سے واپسی کے بعد دیا تھا۔ جو حسب ذیل ہے:

"۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہند نے مجھے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کے لیے حکم دیا، چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس تحریک کی تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی

اور مولانا ابو محمد صاحب لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی
میرے ساتھ شریک تھے۔ پھر حضرت شیخ الہندؒ کے ایماء
سے مرکز کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ ۱۳۳۱ھ ۱۹۱۳ء
میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی، اس کی سرپرستی
میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب
وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے

حضرت شیخ الہندؒ نے اس طرح ۴ سال دیوبند
میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا۔ اسی
طرح دہلی بھیج کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے
تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے دہلی تشریف لائے اور
ڈاکٹر انصاری صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر صاحب
نے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی مرحوم سے
ملایا اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاست
سے واقف رہا۔ ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء میں شیخ الہندؒ کے
حکم سے کابل گیا، مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا۔
اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی
لیکن تعمیلِ حکم کے لیے جانا ضروری تھا، خدا نے اپنے فضل
سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا اور میں افغانستان
میں پہنچ گیا دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتایا کہ میرا کابل
جانا طے ہو چکا ہے، انھوں نے بھی اپنا نمائندہ بنا دیا، مگر
کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہ بتا سکے۔

کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ
جس جماعت کے نمائندے تھے، اس کی ۵۰ سال کی محنتوں کا
حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیلِ حکم کے لیے تیار ہے
اس میں میرے جیسے ایک خادمِ شیخ الہند کی اشد ضرورت
تھی، اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہندؒ کے اس انتخاب
پر فخر محسوس ہونے لگا۔"

مذکورہ بالا بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے مولانا
عبید اللہ سندھی دہلی چلے گئے، وہاں ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی
وغیرہم سے ملاقاتیں ہوئیں اور انقلاب و سیاست کا معاملہ دوسری طرف
کو بہنے لگا۔ جمعیۃ الانصار کی بجائے اب "نظارۃ المعارف" کی بنیاد ڈالی گئی
مگر یہ انجمن مسلمانان، یہ جمعیۃ الانصار کے جلسے، یہ ملک میں مذہبی بیداری کی شمع
ہی نہیں بلکہ شعور کیونکر نمو پا رہا ہے۔ اس کی کیفیت حکومت برطانیہ کی رولٹ
ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ سے سنئے، کمیٹی لکھتی ہے۔

ریشمی خطوط کی سازش یا تحریک

"اگست ۱۹۱۶ء میں اس سازش کا انکشاف ہوا جو گورنمنٹ
کے کاغذات میں ریشمی خطوط کی سازش کہلاتی ہے۔ یہ ایک
تجویز تھی جو ہندوستان میں تیار کی گئی۔ اس کا مقصد یہ
تھا کہ شمالی مغربی سرحد سے ایک حملہ ہو۔ ادھر ہندوستان
کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوں اور سلطنت برطانیہ کو تباہ و
برباد کر دیا جائے۔ اس تجویز پر عمل کرنے اور اس کو تقویت
دینے کے لیے ایک شخص مولوی عبید اللہ نے اپنے ۳ رفقاء
فتح محمد اور محمد علی وغیرہ کو ساتھ لے کر اگست ۱۹۱۵ء میں شمالی
مغربی سرحد کو عبور کیا۔ عبید اللہ سکھ سے مسلمان ہوا ہے اور
صوبہ جات متحدہ کے ضلع سہارنپور میں مسلمانوں کے مذہبی
مدرسہ دیوبند میں اس نے مولوی کی تعلیم پائی تھی، وہاں اس
نے اپنے جنگی اور خلاف برطانیہ خیالات سے مدرسہ
کے خاص لوگوں اور کچھ طلبہ کو متاثر کیا اور سب سے بڑا
شخص جس نے اس پر اثر ڈالا ... وہ مولانا محمود حسن تھا

جو عرصہ دراز سے اس ملک میں بہت دیر تک ہیڈ مولوی رہ چکا ہے۔ عبیداللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور مدرسہ کے تعلیم یافتہ مولویوں کی رفاقت سے تمام ہندوستان بھر میں ایک عالمگیر جوش اور مسلمانوں میں برطانیہ کے خلاف تحریک پیدا کرے لیکن اس کی تجاویز کے راستے میں مدرسے کے منتظم اور انجمن کے لوگ سد راہ ہوئے۔ انھوں نے اسے اور اس کے چند ساتھیوں کو مدرسہ کی ملازمت سے برخاست کر دیا۔"

رولٹ ایکٹ کا تجزیہ

رولٹ ایکٹ کمیٹی کی مذکورہ بالا رپورٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ مولانا عبیداللہ اس انقلاب کے بانی تھے، یہ غلط ہے۔ بلکہ خود مولانا عبیداللہ صاحب کا بیان کہ شیخ الہند نے مجھے ۱۳۲۰ھ میں دیوبند کام کرنے کے لیے بلایا تھا۔ رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ کی تغلیط کرتا ہے۔ کمیٹی کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ مولانا عبیداللہ کو برخاست کیا گیا بلکہ وہ مدرسہ کے ملازم ہی نہ تھے، ہاں دیوبند کے فاضل اور شیخ الہند کے جاں نثار اور معتمد ہونے کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور محرک شیخ الہند تھے۔ چنانچہ مولانا سندھی کو جب کابل بھیجا گیا ہے، تو انھیں اپنے پروگرام کا خود پتہ نہ تھا لیکن جب وہ وہاں پہنچ گئے۔ تو پھر ان کے سامنے وہ تمام سکیم آگئی، جو شیخ الہند چلانا چاہتے تھے۔

شیخ الہند کی سکیم

رولٹ ایکٹ کمیٹی کا یہ بیان درست ہے کہ شیخ الہندؒ ہندوستان سے حکومت برطانیہ کا بستر گول کرانا چاہتے تھے اور اس کے لیے قبائلی علاقے کے پٹھانوں، کابل، ایران اور ترکی حکومت میں اتحاد پیدا کر کے ان کے تعاون سے انگریزوں کا تختہ الٹنا چاہتے تھے، اسی سلسلے میں شیخ الہندؒ ۱۹۱۹ء/۱۳۳۲ھ میں حج کے ارادے سے حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں مکہ معظمہ کے ترکی گورنر غالب پاشا سے اور مدینہ منورہ میں ترکی کمانڈر انچیف انور پاشا اور جمال پاشا سے جو مدینہ میں جب کہ وہ بعض جنگی ضروریات کے باعث اتفاقاً وہاں آئے تھے..... ملاقات ہوئی تھی اور انھوں نے بھی شیخ کی تجویز سے اتفاق کیا تھا۔ ان حضرات کی رائے یہ تھی کہ شیخ الہند خود ترکستان، ایران اور کابل کے راستے قبائلی علاقے میں پہنچ جائیں۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ کرنل لارنس نے شریف حسین والی مکہ معظمہ کو ہموار کر لیا۔ حجاز میں اس وقت ترکی اقتدار تھا لیکن شریف حسین نے ترکوں سے غداری کی اور اس طرح انگریزی اقتدار سے حجاز میں وہ جا بسے اور ترکوں کی حکومت حجاز سے ختم ہو گئی۔ حضرت شیخ الہند حجاز سے باہر نکلنے کی کوشش میں ناکام رہے اور بالآخر حکومت برطانیہ کے اشارے پر شریف مکہ نے ان کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ تفصیلات کے لیے حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سفرنامہ "اسیر مالٹا" اور "نقش حیات" مستقل اور حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی "حیات شیخ الہندؒ" ملاحظہ فرمائیے۔ بالآخر شیخ الہند کو انگریزوں نے مالٹا میں اسیر کر دیا اور آپ ۵ سال تک نظر بند رہ کر پھر دیوبند تشریف لائے۔ اس تحریک کے ضمن میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ آزادی ہند کے پیچھے علمبردار شیخ الہند جن کے بنیادی تصورات پر، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ نے آزادی ہند کی تعمیر کی۔

جمعیۃ الانصار کا انجام

جمعیۃ الانصار نے علمائے دیوبند کے ذریعے ہندوستان کے تمام لیڈروں، علماء اور روشن خیال طبقہ میں ایک جوش برپا کر دیا۔ یہی وہ زینہ تھا جس کے ذریعے شیخ الہند بام آزادی پر چڑھنا چاہتے تھے، چنانچہ جمعیۃ الانصار کے چند جلسوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ ان جلسوں کے ضمن میں مختلف ریزولیوشنوں کے ذریعے گورنمنٹ برطانیہ کی وفاداری کا اظہار اور اس کے زیر سایہ مذہبی آزادی کے شکریے کے تار بھیجے گئے، جیسا کہ روداد

موتمر الانصار اور دوسرے جلسوں کی تجویزوں میں یہ چیزیں موجود ہیں لیکن گورنمنٹ برطانیہ ان جلسوں سے جو کچھ سمجھ رہی تھی، وہ جانتی تھی کہ اس مدرسے کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب انگریزی حکومت کے سخت مخالفین میں سے تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شاملی میں اپنے رفقا کے ساتھ مل کر جہاد کیا تھا اور ان ہی کے نقشِ قدم پر شیخ الہند چل رہے تھے، چنانچہ مکہ معظمہ سے گرفتار کر کے جب آپ کو قاہرہ لے جایا گیا اور وہاں شیخ الہندؒ سے سوال وجواب کیے گئے۔

تو ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا۔

سوال (انگریز افسر) : مولوی عبید اللہ نے دیوبند میں جمعیۃ الانصار کیوں قائم کی تھی؟

جواب (شیخ الہندؒ) مدرسہ کے مفاد کے لیے

سوال : پھر علیحدہ کیوں کیا گیا؟

جواب : آپس کے اختلاف کی وجہ سے۔

سوال : کیا اس کا مقصد اس جمعیۃ سے کوئی سیاسی امر تھا؟

جواب : نہیں

بہرحال جمعیۃ الانصار سے حکومت کے دل میں بے اطمینانی تھی۔ یہ معاملات آگے بڑھ رہے تھے کہ مہتمم صاحبان نے بڑھتی ہوئی سیاسی کارروائیوں کی مخالفت تو نہیں کی، لیکن مدرسہ کے بچاؤ کے لیے یہ ضرور چاہا کہ مدرسہ مسلمانوں کی متاعِ عزیز ہے۔ اگر یہ بند ہو گیا تو پھر مسلمانوں میں دینی تعلیم پھیلانے کا سرچشمہ بند ہو جائے گا، اس لیے مدرسے کے اندر اس نام سے آزادی کی سرگرمیاں کو آگے بڑھنے سے روکنے کی ضرورت تھی، شیخ الہند بھی غلط راہ پر نہ تھے، وہ خیال کرتے تھے کہ استاذ محترم مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد دیوبند کے مدرسے سے جہاں تعلیمِ دین کی اشاعت تھا، وہاں حضرت مولانا سید احمد شہید بریلوی اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب دہلوی جیسے لوگوں کے جذبۂ جہاد اور روحِ حریت کو برقرار رکھنا بھی تھا، اس لیے مہتمم صاحبان کے نزدیک مدرسے کی حفاظت اور شیخ الہند کے نزدیک دین کے ساتھ جذبۂ جہاد و آزادی کی روحانیت کے برقرا

رکھنے میں ایک گونہ نظریاتی اختلاف پیدا ہونا لازمی بات تھی۔ شیخ الہندؒ نے اس بات کو پسند نہ فرمایا اور مولانا عبید اللہ صاحب کو دیوبند سے دہلی بھیج دیا اور جمعیۃ الانصار کو "نظارۃ المعارف" میں تبدیل کر دیا۔ اس صورتِ حال کو رولٹ ایکٹ کمیٹی کے ارکان نے مولانا عبید اللہ اور ان کے ساتھیوں کو دیوبند کی ملازمت سے برخاست کر دینے کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

مسلمانوں کا جمعیۃ الانصار سے تعلق

جمعیۃ الانصار کے جلسوں سے مسلمانوں میں عام بیداری اور اسلامی روح پیدا ہو چکا تھا۔ مولانا عبید اللہ دیوبند سے جا چکے تھے۔ جلسے بھی رفتہ رفتہ بند ہو چکے تھے۔ ان کے بعد جمعیۃ الانصار کا کوئی جلسہ نہ ہوا۔ یہ آخری جلسہ ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء میں ہوا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کی ایک تعداد نے دیوبند خطوط بھیجے اور دریافت کیا کہ جمعیۃ الانصار کے جلسے کیوں نہیں ہوتے۔ مسلمانانِ ہندوستان کی طرف سے یہ استفسار یقیناً درست تھا، لیکن ذمہ داران دارالعلوم نے اس کا کیا جواب دیا، اس کی حقیقت کا پتہ چلانا ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے لیے دارالعلوم دیوبند کے رسالے "القاسم" کے پرچوں سے زیادہ اور کوئی چیز رہبری نہیں کر سکتی، چنانچہ تجسس اور ریسرچ سے ہمیں استاذ محترم مولانا سراج احمد صاحب مرحوم کا ایک مضمون مل گیا، جو اس وقت جمعیۃ الانصار کے نائب ناظم اور القاسم کے نائب مدیر اور دارالعلوم دیوبند کے اعلیٰ مدرسین میں سے تھے، لکھتے ہیں

> "مدت سے القاسم کے صفحات جمعیۃ الانصار کے تذکروں سے خالی ہیں۔ عرصے سے اس کا کوئی کارنامہ مسلمانوں کے روبرو پیش نہیں ہوا۔ سال گزشتہ میں موتمر الانصار کا اجلاس کہیں منعقد نہ ہونے سے بہت سے دردمندوں کو اس کے وجود میں وساوس پیدا ہونے لگے۔ اس پر جناب مولوی عبید اللہ صاحب کی جمعیت سے علیحدگی ان وساوس کی

پیدا کی کہ جمعیۃ کا چلانا دشوار ہو گیا۔ یہاں تک کہ مہتمم صاحب کی
کے بعد مولوی عبیداللہ صاحب کے دہلی میں پہنچنے پر انجمن قائم کرنے
سے اور وہ غلط فہمیوں کا نتیجہ بنا۔ کسی کسی کو کہیں سے یہ خبر ملی کہ
جمعیۃ الانصار کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کی بجائے دہلی میں نظارۃ المعارف
قائم ہو گئی۔ کسی کو یہ معلوم پہنچی کہ نظارہ جمعیت کا ایک شعبہ ہے، جو
بعض مصالح کی بنا پر دہلی میں قائم کیا گیا ہے، بعض احباب نے
بزرگان دیوبند سے مل کر زبانی طمانیت حاصل کر لی، اور بعض دوستوں
نے مراسلات کے ذریعہ سے واقعہ کی اصلیت معلوم کی، مگر عام
مسلمانوں کو رفع غلط فہمی کا کوئی موقع نہیں ملا، ادھر استفسارات بھی
آ رہے ہیں مصلحت ہے کہ مختصرًا اس کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے۔

جمعیۃ الانصار خدا کے فضل سے زندہ ہے۔ سال گزشتہ میں
چونکہ جنگ بلقان کی وجہ سے ترک مظلوموں کی امداد کی طرف عام مسلمین
متوجہ تھے، ہر شہر، قصبہ اور اکثر دیہات میں ہلال احمر کی انجمنیں قائم
تھیں وفود جا بجا پھرتے تھے اور خود دارالعلوم دیوبند اور اس کی
جماعت کے اجزا اس کار خیر کے لیے وقف تھے، اس لیے قرین
مصلحت نہ تھا کہ عامۃ المسلمین کو دوسرے کسی خیال کی طرف متوجہ کیا
جائے اور درحقیقت جو حضرات مؤتمر الانصار کے کارکن ہوتے۔
ان کو اتنی فرصت کہاں تھی، اور مظلوم ترکوں کی مرثیہ خوانی کے سوا کوئی
دوسرا خیال کب ان کے دل میں خطور کر سکتا تھا، چنانچہ چند اخبارات
میں مؤتمر الانصار کے جلسہ نہ ہونے کا موجب اعلان کر دیا گیا تھا۔ کیا آپ کو
یہ معلوم نہیں کہ دارالعلوم دیوبند کی آمدنی ایک مدت تک بند رہی اور
جمعیت کے سفراء کے روزنامچوں اور رسیدوں میں بجائے رقوم آمدنی
کے صفر رہ گیا۔ بدقسمتی سے اسی پُرآشوب زمانے میں جناب مولوی
عبیداللہ صاحب جمعیت کی نظامت سے علیحدہ ہو گئے اور نہ صرف
نظامت سے علیحدہ بلکہ اپنی جماعت سے مفارقت گوارا فرما کر اور
ایسے نازک وقت میں جمعیۃ کو زیر بار چھوڑ کر دہلی میں نظارۃ المعارف
قائم کر لی۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

جمعیت کے اراکین مجلس انتظامیہ نے اپنا جلسہ منعقد کیا اور بحث
و گفت و شنید کے بعد یہ طے ہوا کہ جمعیت دارالعلوم کی فرع (شاخ)
ہے اور اصل کی بقا سے فرع باقی رہ سکتی ہے۔ پھر دارالعلوم کی مالی امداد کرنا
جمعیت کا اولین فرض ہے۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ فی الحال
ناظم صاحب کی اولوالعزمیوں سے قطع نظر کر کے ان تجاویز پر عمل پیرا
ہونا چاہیے۔ جیسے دارالعلوم اپنی امتیازی شان کے ساتھ اپنے
مالی نقصانات کی جبر و مکافات کر سکے اور جمعیت کا وجود باقی ہے
چنانچہ اراکین انتظامیہ اور قائم مقام ناظم نے حضرات سرپرستان
جمعیت کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی کہ ہم خدام دارالعلوم
چاہتے ہیں کہ ہم کو برائے چندے تعلیمی خدمات سے سبکدوش
فرمایا جائے کہ ہم اپنا وفد لے کر چند مقامات کا سفر کریں اور دارالعلوم
کے نقصانات کی کچھ مکافات کر سکیں، چونکہ زمانۂ امتحان سالانہ
قریب تھا، اس لیے سب کو تو اجازت نہ مل سکی، مگر جناب مولانا مولوی
شبیر احمد صاحب، مولانا مولوی سید مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا مولوی
عبدالسمیع صاحب، مولانا مولوی مظہر الدین صاحب اور قائم مقام ناظم
(یعنی راقم الحروف) مولانا سراج احمد صاحب اس خدمت پر مامور
ہوئے۔

ہم نے اس زمانے میں مؤتمر کا جلسہ منعقد نہیں کیا، کسی گریجویٹ
کو وظیفہ نہیں دیا، کوئی وسیع و جامع کام [illegible] نہ ہو سکا۔ مگر ہم سے
جو کچھ ہو سکا، اس کو ہم جمعیت کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل
سمجھتے ہیں اور ہم خدام کی یہ سعی کسی درجے میں بارگاہ حضرت رب العزت

میں قبول ہوگئی، تو پھر سب کچھ پالیا

علمی مجالس کا انعقاد جمعیت کی مفید اور نمایاں مقاصد سے ہے ہم نے تا مقدور اس کو ترک نہیں کیا، سیرتی اور شعلہ وخورجہ وغیرہ میں متعدد جلسے نہایت مفید ثابت ہوئے۔ کسی اہل کار کی علٰحدگی یا عزل سے کیا کوئی محکمہ کوئی سررشتہ کوئی مدرسہ کوئی انجمن معدوم ہوجاتی ہے، بڑے بڑے کالجوں میں بڑے بڑے پروفیسر، پرنسپل، ناظم سیکرٹری علٰحدہ ہوجاتے ہیں، اور معزول کردیئے جاتے ہیں اور معاً ایک دوسرا اُن کا جانشین ہوجاتا ہے۔ ہم نہیں سمجھے کہ جمعیت الانصار سے جناب مولوی عبیداللہ صاحب کی علٰحدگی پر یہ خطرہ دلوں میں کیوں پیدا ہوا۔

براے کار خدا رہبرے ہمی آید
پئے ہمی رود و دیگرے ہمی آید

بلاشک جناب مولوی عبیداللہ صاحب کی مفارقت کا صدمہ ہے اور بہت بڑا صدمہ ہے۔ مگر ان کی علٰحدگی سے جمعیت کی موت آجائے: خدا نہ کرے۔

کل کی بات ہے کہ حضرت شبلی نظامت ندوہ سے علٰحدہ ہوئے کیا خدانخواستہ ندوہ کا خاتمہ ہوگیا، علیگڑھ کالج سے بھی کبھی کبھی بعض جلیل القدر عہدے دار جدا ہوئے ہیں، کیا کالج بند ہوگیا، ہم نہیں سمجھے کہ جمعیت کے متعلق ان سب ہمی وساوس کی پیدائش کا مادہ کیوں ہیجان میں ہے۔ یہ بالکل غلط ہے کہ جمعیت الانصار بند ہوگئی اور یہ بھی بالکل غلط ہے کہ جناب مولوی عبیداللہ صاحب کی انجمن جمعیۃ الانصار کا شعبہ ہے۔ یا دارالعلوم کی ساختہ اور ماتحت ہے اور یہ بھی بالکل غلط ہے کہ دارالعلوم یا جمعیۃ الانصار نے انگریزی خوان طلبہ کی دینی تعلیم و تربیت سے انکار کردیا۔ مولوی عبیداللہ صاحب دارالعلوم میں تعلیمی اور تدریسی جماعت کے جز اور رکن نہیں تھے کہ ان کے چلے جانے کے بعد وقت پیش آتی ہو، بعض انگریزی خوان طلبہ اس وقت بھی دارالعلوم میں تعلیم پاتے ہیں اور دارالعلوم ہر وقت نہایت مسرت اور خندہ پیشانی کے ساتھ گریجویٹ حضرات کی دینی تربیت کی کفالت کے لیے مستعد ہے، مگر جیسے کہ عربی خوان طلبہ اپنے خورد و نوش کی خود کفالت کرتے ہیں یا دارالعلوم کی معمولی کفالت پر قناعت کرتے ہیں، ایسے ہی اگر گریجویٹوں کا طریق عمل ہو تو پھر کوئی دقت نہیں۔ سچ یہ ہے کہ جمعیۃ الانصار کے پاس اب نہ مالی روح باقی ہے اور نہ وظائف میں ایسا امتیاز مناسب ہے اور مشاہرہ کے بعد اب کسی میں یہ جرأت بھی باقی نہیں ہے۔

جناب مولوی عبیداللہ صاحب کی علٰحدگی کا مسئلہ گو پیچیدہ نہیں ہے مگر تفصیل طلب ضرور ہے اور القاسم کے بقیہ صفحات اس کے لیے کافی نہیں ہیں، اور ہمارے موضوع سخن کے اتمام میں سہیم و شریک بھی نہیں، اس لیے اگر ضرورت ہوئی، تو پھر کبھی اس کی بحث معرض بیان میں آجائے گی۔

جمعیۃ الانصار کا شعبہ الارشاد بحمدہ تعالیٰ اعتدال کے ساتھ مناظرہ اور تقریر و تحریر میں تدریجی ترقی کررہا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ القاسم والرشید کے صفحات میں آپ کو جمعیت الارشاد کی ترقیاں برابر نظر آیا کریں گی، جمعیت کا قانون نظرثانی ہونے کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ شائع کیا جائے گا اور اس کے مفید شعبوں کی ترقی میں سرمو کوتاہی نہ ہوگی۔ اراکین جمعیت الانصار القاسم اور الرشید کے ذریعہ تالیف و اشاعت کا موقت الشیوع سلسلہ جاری رکھیں گے اور مسلمانوں کی آگاہی کے لیے مفید مضامین کے ذخائر جمع کرتے رہیں گے۔ اراکین جمعیۃ الانصار کی خدمت میں بطور یاد دہانی عرض کیا جاتا ہے کہ جن حضرات کے ذمے چندہ دوامی جمعیت کا باقی ہے، وہ مہربانی سے جلد مرحمت فرمائیں اور جمعیت کے لیے مالی ذرائع پیدا کرنے میں نمایاں

حقائق اور نیک اشخاص سے مطلع فرمائیں:

خاکسار سراج احمد رشیدی۔ قائم مقام ناظم
جمعیۃ الانصار دارالعلوم دیوبند (القاسم ذی الحجہ
۱۳۳۱ھ صفحہ ۳۱-۳۲-۳۳)

تجزیۂ بیان از مرتب الرشید

جناب مولانا سراج احمد صاحب کا بیان آپ کے ملاحظہ میں ہے۔ ان کی اس طویل تحریر میں جو کچھ نظر آیا وہ یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ صاحب جمعیۃ الانصار کو خود چھوڑ کر چلے گئے۔ انھوں نے جمعیت سے بے وفائی کی اور انجمن کو زیر بار کر کے فرار ہو گئے۔ نیز جمعیۃ الانصار کے جلسے نہ ہونے کی وجہ جنگ بلقان میں علماء کی غیر معمولی مصروفیت اور جنگ کے لیے چندے کی شدید طلب، ترکوں کے ساتھ تعاون، دیوبند کے خزانے کا خالی ہو جانا، الانصار کی طرف توجہ دینے کی بجائے اصل اور بنیاد کو قوت پہنچانا وغیرہ وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۱۲ء میں بلقان کی ریاستوں کے ترکوں کے خلاف اعلان جنگ نے نہ صرف ترکوں کو بلکہ مسلمانان ہند کو سخت مجروح کر دیا تھا۔ اس کا اثر دارالعلوم پر بھی پڑنا لازمی تھا، چنانچہ نہ صرف مسلمانان ہند کی توجہ ترکوں کی اعانت پر تھی، بلکہ طلبائے دیوبند بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے، تا آنکہ کچھ عرصے کے لیے دارالعلوم کو بند کر کے مدرسین اور طلبہ تک چندے کے حصول میں دیوبند سے باہر جا کر مصروف رہے۔ چنانچہ القاسم ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ میں چندہ ہلال احمر اور دارالعلوم دیوبند کے عنوان کے تحت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی، جو ابھی دارالعلوم دیوبند میں تھے۔ لکھتے ہیں:

"دارالعلوم کا فتویٰ (جو گزشتہ نمبر میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں) اب تک مختلف طور پر ایک لاکھ سے زیادہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ دارالعلوم اور اس کے متعلق مدارس کے مدرسین اور طلبہ کے وفود قصبات و دیہات تک چندے کے لیے اطراف میں دورہ کر کے رؤسا و علماء اور مشائخ اور عوام کو متوجہ کر رہے ہیں۔ بعض ان لوگوں کے مواخذہ اس جماعت کی ساعی جمیلہ سے ایک نئی مقدار جس کا تخمینہ ۲ لاکھ روپے سے کم نہیں کیا جاتا ہے، انجمنوں اور اخبارات کے ذریعہ سے بھیجا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اراکین دارالعلوم کی معرفت بھی ۵۰ ہزار سے زیادہ جمع ہو چکا ہے اور یہ روپیہ عموماً عثمانیہ بینک کے توسط سے پریذیڈنٹ ہلال احمر قسطنطنیہ کے نام سے پہنچایا گیا ہے۔ وفود دارالعلوم کے دورے اور خاص دیوبند میں جو روپیہ جمع ہو کر براہ راست قسطنطنیہ بھیجا گیا، یا اراکین دارالعلوم کی کوششوں سے جمع ہو کر بھیجا گیا ہے، اس کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ کسی دوسری اشاعت میں درج کریں گے۔ مگر اس قدر ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ضلع سہارنپور میں مولانا خلیل احمد صاحب (مدرس اول مدرسہ مظاہر علوم، صدر انجمن ہلال احمر سہارنپور) و مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری و مولانا اشرف علی صاحب تھانوی و مولانا حکیم مسعود احمد صاحب گنگوہی و حکیم محمد یوسف صاحب گنگوہی و مولانا حکیم محمد احمد صاحب رامپوری کے ساعی جمیلہ سے جس قدر روپیہ جمع ہوا، غرباء اور متوسط الحال لوگوں سے اتنی رقوم جمع کر لینا آسان نہیں۔ مولانا خلیل احمد صاحب خالص سہارنپور سے زائد از بیس ہزار روپیہ اب تک بھیج چکے ہیں۔" (القاسم ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ صفحہ ۱۹-۲۰)

حضرت مولانا حسین احمد صاحب "سفرنامہ شیخ الہند" میں لکھتے ہیں:

"بلقان کے خونخوار اور طرابلس کے سنگین واقعہ سے مولانا محمود حسن صاحب کے دل و دماغ پر نہایت عجیب اثر

سے بچیں گی اور ڈالو..... مولانا نے چندی جان تو ڑکوشش
امداد اسلام میں فرمائی، مختصر سے حصہ لیا، مدرسہ کو بند کر دیا
طلبہ کو خود بھی جمع کرنے خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے
چندے کئے اور ہر طرح سے مدد کی۔

ان بیانات کی روشنی میں مولانا سراج احمد صاحب کا یہ بیان درست ہے کہ جنگ بلقان کے باعث جمعیۃ الانصار کے ذکی حضرات مصروف رہے۔ یہ بھی درست ہے کہ مدرسے کا خزانہ خالی ہو گیا تھا۔ یہ بھی صحیح کہ جمعیۃ الانصار کا چندہ صفر پر پہنچ گیا تھا، لیکن ان وجوہات کے علاوہ منتظمین مدرسہ اور مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کے خیالات اور آئندہ کے سیاسی نقشوں اور طریق کار نیز بعض مذہبی مسائل میں کش مکش پیدا ہو گئی تھی اور جمعیۃ الانصار سے بھی گورنمنٹ چوکنی ہو چکی تھی۔ ادھر جنگ بلقان ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۳ء سے گزر کر جنگ عظیم تک نوبت پہنچ چکی تھی۔ جرمن اور ترک دونوں برطانیہ سے برسرپیکار تھے۔ ترکوں کی مدد انگریز کی دشمنی کے مترادف تھی۔ علمائے دیوبند نے لاکھوں روپے سے ترکوں کی مدد کی تھی، ان ہی حالات میں شیخ الہند حجاز روانہ ہونے لگے، ادھر ۱۹۱۵ء میں مولانا سندھی کابل پہنچ چکے تھے، وہاں سے انہوں نے ایک ریشمی کپڑے پر وہاں کے حالات لکھ کر مولوی عبدالرحیم صاحب سندھی کے ذریعے حج کے بہانے شیخ الہند کو بھیجے تھے، اس تحریک کا انکشاف اگرچہ پورے طور پر ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا، لیکن مدرسہ دیوبند گورنمنٹ برطانیہ کی نظروں میں کھٹک رہا تھا، اس لیے ارکان و ذمہ داران مدرسہ کے لیے اس صورت حال سے محفوظ رہنے کی ضرورت تھی، اس لیے سرپرست جمعیۃ الانصار سے مولانا عبیداللہ کا علیحدہ ہو جانا ہی مناسب تھا۔ اگرچہ ان کی چلائی ہوئی سکیم مسلمانوں میں آزادی کی روح پھونک چکی تھی، شیخ الہند کے حج کو روانہ ہونے کے بعد، مذکورہ حالات میں لندن کی پارلیمنٹ میں دارالعلوم کو بند کرنے کی تجویز بھی پیش ہو چکی تھی جب یہ مسئلہ لندن کے دارالعلوم میں لیفٹیننٹ کرنل جیمس نے اٹھایا، تو ہندوستان کے مسلم اخبار اور رسالے چیخ اٹھے۔ اخبار الخلیل بجنور نے حسب

ذیل اداریہ سپرد قلم کیا جو اختتام شعبان ۱۳۳۴ھ میں بھی شائع ہوا۔ الخلیل نے لکھا:-

دارالعلوم دیوبند کا ذکر پارلیمنٹ میں

بجواب ایک سوال کے جو لیفٹیننٹ کرنل جیمس نے کیا دارالعوام میں مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے فرمایا:

"جب سے کہ حجاز گورنمنٹ نے دارالعلوم دیوبند کے مقرر کو گرفتار کیا تھا، جو اثنا میں نظر بند کئے گئے تھے، اس وقت سے اور جب تک کہ وہ مالٹا سے روانہ ہوئے مدرسہ عربی دیوبند کی کوئی باغیانہ تبلیغ کی شکایت حکام کے علم میں نہیں ہوئی اور اس تجویز پر عمل کرنے کی کہ مدرسہ موصوف بند کر دیا جائے، کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔"

اس سوال کے ساتھ بالشویک تحریک کے متعلق بھی ایک سوال تھا، جس کا جواب دیا گیا کہ گورنمنٹ ہند اس کے متعلق سرگرم کار ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے آنریبل ممبران ہندوستان میں کسی بڑے پیمانے پر انقلاب عظیم کا خواب دیکھ رہے ہیں، حالانکہ یہاں روز بروز سکون ہو چلا تھا۔ مگر خود انگلستان کی عیسائی آبادی نے صلیبی جنگ کا سوال چھیڑ کر اور مسٹر لائڈ جارج نے اپنے صریح اعلان کے خلاف اور نہایت بے انصافی کے ساتھ ترکی پر الزامات قائم کر کے اُس کو مٹانا چاہا ہے جس سے ہندوستان کی مسلم آبادی قدرتی طور پر بھڑک اُٹھی ہے اور یہ ناممکن ہے کہ مدرسۃ العلوم دیوبند مسلمان بھی رہتا اور اس سے متاثر بھی نہ ہوتا، پھر بھی کارکنانِ مدرسہ دیوبند نے اس میں حصہ لیا ہے، اس سے وہ بالکل اسلامی

پہنچی تو تمام ملک کے علماء میں بے چینی کا باعث ہوئی
شخص ہے جس کا تعلق لیگ سے ہو اور وہ اسلامی
حکومت سے جدا ہے۔ مگر آنریبل لیفٹیننٹ گورنر صاحب
نے مدرسہ دیوبند بند کر دینے کی جو بنا قرار دی ہے
یعنی مولانا محمود حسن صاحب کی ذات گرامی سے، وہ چونکہ
اس سے قطع تعلق کر چکے تھے اور گورنمنٹ کا پیچیدہ
ریکارڈ بھی موجود ہوگا۔ جس سے مدرسہ کی بے تعلقی ثابت
ہو سکتی ہے۔ نیز مولانا کی نظر بندی کسی باضابطہ اس وقت
کی انگریزی عدالتی تحقیقات سے ہرگز عمل میں نہیں آئی بلکہ
محض ایک یکطرفہ کارروائی تھی۔ اگر وہ انگریزی حکومت
پر بیت الحرام سے گرفتار کرائے گئے تھے اور اگر شاہ
حجاز نے از خود گرفتار کر کے برطانیہ کے سپرد کیا ہے
تاکہ وہ نظر بند رکھے جائیں تو اس کی وجہ صرف ایک ہی
تھی کہ مولانا نے اس فتوے پر دستخط کرنے سے اپنی
معذوری ظاہر کی تھی، جس میں بغیر کسی موثر قطعی شرعی وجہ
کے تمام ترکوں کے کفر کا فتویٰ ان سے چاہا تھا اور
انھوں نے جائز طور پر خاموشی کو ترجیح دی۔

پارلیمنٹ میں مسٹر ... کی معلومات اس سوال جواب
کے زمانے تک یہ تھی کہ مدرسۃ العلوم کے متعلق ناقص ہیں
کیونکہ بعض کارکنان مدرسۃ العلوم نے خلافت کے متعلق جو
حصہ لیا، وہ اس کے بعد کا ہے، لیکن اگر یہ اس سے قبل
کا بھی ہو تو یہاں اس سے زیادہ بڑھے ہوئے خیالات دوسرے
مسلمانوں کے ہیں اور جس قدر عربی مدارس ہندوستان میں ہیں
سب ایک رشتہ مذہبی میں منسلک ہیں، تو مدرسۃ العلوم
دیوبند ہی کی کیا خصوصیت ہے۔ مدرسۃ العلوم دیوبند کسی
مخصوص فرقے کی ملکیت نہیں ہے، وہ ایک اسلامی درسگاہ ہے
اگر گورنمنٹ اسے بند بھی کر دے گی تو بحیثیت ایک شاکی
وہ چار و ناچار اسے برداشت کریں گے، لیکن کیا یہ کوئی
تدبر ہوگا؟ نہیں بلکہ ہزارہا مسلمان طلبہ اور استادوں کو
جو خاموشی کے ساتھ ایک بے ضرر مذہبی شغل میں لگے
ہیں، اس لیے متنفر کر دینا ہوگا کہ وہ حکومت کے خلاف
تمام ملک میں پروپیگنڈا پھیلاتے پھریں۔ ایسے ہی ذرائع
نے موجودہ تکلیف دہ حالت پیدا کی ہے اور ایسے
ہی ناعاقبت اندیش آئندہ اس کو مزید ترقی دینا چاہتے
ہیں، ہمیں امید ہے کہ اس تذکرے سے دیوبند میں کوئی
حرکت محسوس نہ ہوگی اور وہ جہاں ہے بے خوف وہیں
کھڑا رہے گا۔ جو اس امر کی علامت ہوگی کہ "آزادہ کہ حساب
پاک است از محتسب چہ باک" اور یہ کہ اسلامی تعلیم صرف
ایک خدائے قادر مطلق سے ہی ڈرنا سکھاتی ہے اور اسی
پر بھروسہ رکھتی ہے۔"   ایڈیٹر الخلیل

(القاسم، شعبان ۱۳۳۸ھ ص ۶)

الخلیل اخبار بجنور کے ایڈیٹر نے یہ ایڈیٹوریل (مقالہ اداریہ) ۲ رجب
۱۳۳۸ھ مطابق ۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء کو شائع کیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے
اس کونے سے اس کونے تک بجلی کی طرح یہ خبر دوڑ گئی۔ دارالعلوم نے اگرچہ
اس کی چنداں پروا نہ کی۔ جیسا کہ مذکورہ ماہ کے القاسم میں دارالعلوم کی طرف
سے حضرت مولانا اعزاز علی صاحب مرحوم نے صرف ایک صفحہ کا نوٹ لکھا ہے
جس میں وہ لکھتے ہیں:

"ہم اس سے نہیں گھبراتے ہیں کہ ممبران پارلیمنٹ نے اس
مدرسے کو کس نظر سے دیکھنا شروع کر دیا ہے، وہ جس نظر
سے چاہیں اس کو دیکھیں، مگر ہم تو اس پر بھی یہی کہیں گے

و ان ساءنی ان تلقنی بمساءۃ
فقد سرنی انی خطرت ببالك

جس کا ترجمہ بقول غالب یہ ہے۔

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے بایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے جو اس محفل میں ہے:

یہ تھے وہ حالات جن کی پیش نظری و پیش بینی مہتمم صاحبان کو مولانا عبید اللہ صاحب کے متعلق فیصلہ کن نتیجہ کے لیے مجبور کر رہی تھی، یہ تیور جب شیخ الہندؒ اور ان کے جاں نثار سندھی شاگرد نے دیکھے تو خود بھی انھوں نے کارکنان مدرسہ کے ساتھ اشتراک عمل کو مناسب نہ سمجھا، چنانچہ دہلی کو اپنا مرکز بنلیا اور دوسرے قسم کے جانبازوں یعنی مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنی تحریک حریت میں شامل کر لیا۔ کہتے ہیں کہ شیخ الہند کی زبان پر یہ شعر اکثر آجاتا تھا۔

کام اس فرقۂ زہاد سے نکلا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

بقیہ سرپرست دیوبند

غرضکہ جہاد حریت کے سلسلے میں جس طرح آپ نے مصائب برداشت کئے۔ اسی طرح آپ کے اعزا نے بھی تکلیفیں جھیلیں۔ خاص طور پر آپ کے ماموں زاد بھائی مولانا ابو النصر کو تو بہت ہی اذیتیں برداشت کرنا پڑیں۔ یہ جس صبر و استقلال سے ان آزمائشوں سے گزرے ان کی مثال ملنا مشکل ہے۔ آپ نے زمانہ حراست میں نماز با جماعت ادا فرمائی اور قیدیوں کو نصیحت فرماتے رہے جس کی وجہ سے بہت سے قیدی توبہ تائب ہو کر بیعت ہو گئے۔ رہائی حاصل کرنے کے بعد آپ مستقل درس و تدریس اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے اور آخری وقت تک اسی سلسلے سے منسلک ہے

دارالعلوم دیوبند کی ادبی خدمات

عبدالصمد صارم

برصغیر پاک و ہند میں دارالعلوم دیوبند سے جہاں مذہبی، علمی اور سیاسی خدمات انجام دی ہیں۔ ادبی خدمات بھی بڑے زور و شور سے کی ہیں، میری مراد اُردو ادب کی خدمت سے ہے۔

یہاں سے اُردو کے بڑے بڑے رائٹر پیدا ہوئے ہیں جیسے مناظر احسن گیلانی، شمس العلماء تاجور نجیب آبادی، سعید احمد اکبرآبادی اور حفظ الرحمن سیوہاروی وغیرہ۔

نہ صرف مضمون نگار یا مصنف، بلکہ بے شمار ایڈیٹر اور شاعر بھی، حامد الانصاری غازی ایڈیٹر مدینہ بجنور، منظر الدین شیرکوٹی مدیر الامان دہلی کو کون نہیں جانتا۔

مولانا منظر الدین نے بہت سے ناول لکھے اور الامان اخبار نے ہندوستان میں بڑا نام پیدا کیا، حامد الانصاری غازی نے سیکڑوں کتابیں لکھیں اور بہت سے شعراء کو بروئے کار لائے۔

تاجور نجیب آبادی کی جہاں بے شمار خدمات ہیں، ان میں مرحوم کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس ایک واحد شخص نے ہندوؤں اور سکھوں میں اُردو کو مقبول بنایا، پنجاب میں اُردو کی ترویج میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے علاوہ سیکڑوں ہندو اور سکھ شاعر، ایڈیٹر، مضمون نگار، افسانہ اور ڈرامہ نویس پیدا کیے اور سیکڑوں رسالوں کی ایڈیٹری کی۔ تلوک چند محروم اور موہن سنگھ دیوانہ جیسے بھی ان سے اصلاح لیتے تھے، انھوں نے ہزاروں اُردو ٹیچر اور پروفیسر پیدا کیے۔

اس قسم کے فرزندان دارالعلوم کی بے شمار خدمات ہیں اور ان کی بڑی بھاری تعداد ہے۔ شاید ہی کوئی گاؤں یا قریہ ایسا ہوگا جہاں دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل یا اُن کے شاگرد یا ان کے شاگردوں کے شاگرد، ادبی خدمات انجام نہ دے رہے ہوں۔ انور صابری اگرچہ دارالعلوم کے فارغ التحصیل نہ تھے۔ مگر انور صابری کو انور صابری دارالعلوم کی چہار دیواری ہی نے بنایا تھا۔

مذکورہ بالا تمام باتوں کو میں دارالعلوم دیوبند کی ایک ادنیٰ سی خدمت شمار کرتا ہوں، سب سے بڑی خدمت جو دارالعلوم نے اُردو ادب کی کی ہے اور جو بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے یہ ہے کہ اس نے برما، بنگال دکن، رنگون، کابل، بخارا، ایران، سماٹرا، جاوا، کشمیر اور نہ جانے کہاں کہاں دور دراز مقامات تک اُردو زبان کو پھیلا دیا۔

اس درسگاہ میں دُور دُور سے تشنگان علوم اپنی پیاس بجھانے آتے تھے، چونکہ یہاں ذریعۂ تعلیم اُردو زبان رہی ہے، لہٰذا وہ اُردو سے شناسا ہو جاتے تھے، نہ صرف شناسا بلکہ اُردو کے بہترین مقرر او خطیب

بن جاتے تھے، بہت سے شاعر اور ادیب بھی بن جاتے تھے، بنگال کی شاید ہی کوئی مسجد ایسی ہو جہاں دیوبند کا پڑھا ہوا امام نہ ہو۔ افغانستان و پشاور و سرحد وغیرہ کے بہت سے فارغ التحصیل ہندوستان و پاکستان وغیرہ میں بڑے مشہور مدرس ہوئے، خود دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا رسول خان صاحب منطق کے مدرس رہے ہیں۔ وہ اہل زبان علماء کی طرح اُردو نہایت صاف و شستہ بولتے تھے۔ شمس الحق افغانی، عزیز گل، تاج گل وغیرہ دارالعلوم کے بڑے اساتذہ میں سے تھے اور ہندو پاک کے بیشتر مدارس میں افغانی، گجراتی، سرحدی، مدراسی اور برمی وغیرہ اساتذہ و خطیب ہوتے ہیں۔

ان علماء کے بہت سے شاگردوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اُردو اخبارات و رسائل کی ایڈیٹری، نگرانی یا سرپرستی کی اور بہت سے مصنف و مضمون نگار پیدا کیے۔

پھر اگر ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے جرائد و اخبارات و تصانیف وغیرہ سے کتنے لوگوں نے اُردو سیکھی اور ان تقریروں سے کتنے عوام نے زبان سے شناسائی پیدا کی تو یہ دائرہ بہت ہی وسیع ہو جاتا ہے، جس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔

میں نے سیکڑوں بنگالیوں اور مدراسی طالب علموں کو دیکھا کہ جب وہ دارالعلوم میں آتے تھے، تو ٹوٹی پھوٹی اُردو بولتے تھے، پھر رفتہ رفتہ خوب بولنے لگتے تھے، حتیٰ کہ اچھے خطیب، مضمون نگار یا شاعر بھی بن جاتے تھے، دارالعلوم میں ہر صوبے یا ضلع کی ایک انجمن ہوتی تھی، جو جمعرات کو نمازِ عشاء کے بعد تقریر کرنے کی مشق کرتے تھے۔ ان انجمنوں کے سالانہ اجلاس بھی ہوتے تھے تو ہم دیکھتے تھے کہ ہر علاقے کی انجمن میں کیسے مقرر پیدا ہو چکے ہیں، جو اہلِ زبان کو بھی مات کرتے ہیں۔

دارالعلوم کی چہار دیواری میں مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔ ان مشاعروں کا یہ اثر دیکھا کہ غیر زبان کے طالب علم بھی اُردو شاعری کی مانگ توڑنے لگے اور پھر رفتہ رفتہ اچھے خاصے شاعر ہو گئے۔ ان مشاعروں میں بعض اوقات شاعرانہ نوک جھونک بھی ہو جاتی تھی اور مہذب و غیر مہذب تنقید بھی، اس طرح وہ زبان کی اونچ نیچ سے واقف ہو جاتے تھے۔

مشاعرہ ایسی چیز ہے، جہاں تفریح کے لیے ہر شخص آ جاتا ہے۔ خصوصاً دارالعلوم جیسے گھٹے ہوئے ماحول میں جہاں تفریح کا کوئی بھی سامان نہ ہو، ہر ملک کا طالب علم کھنچا چلا آتا تھا اور شعر و شاعری سے متاثر ہوتا تھا۔

ہر انجمن ماہانہ، سہ ماہی یا ششماہی رسالہ بھی نکالتی تھی۔ یہ رسالے سب کے سب اُردو زبان میں ہوتے تھے۔ اس طرح طالب علموں میں لکھنے کا ذوق بھی پیدا ہو جاتا تھا، انہی انجمنوں کے اثر سے دارالعلوم سے ادباء و شعراء پیدا ہوئے ورنہ دارالعلوم کو اُردو شاعری و ادب سے کیا تعلق، وہاں نہ اُردو پڑھائی جاتی تھی، نہ شعر و شاعری سکھائی جاتی تھی، بس ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ اثر انداز ہوتا تھا۔

بعض انجمنیں مناظرہ کرنا سکھاتی تھیں، ان میں وہ لوگ شریک ہوتے تھے، جو مناظر بننا چاہتے تھے اور ان شائقین میں بھی ہر علاقے کے طالب علم نظر آتے تھے۔

بعض طالب علم جو ذہین اور قابل ہوتے تھے "تکرار" کرایا کرتے تھے یعنی استاد کے پڑھائے ہوئے سبق کو دہرایا کرتے تھے، ان میں بھی ہر علاقے کے طالب علم نظر آتے تھے۔ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ دارالعلوم میں ہر علاقے کے طالب علم اچھی خاصی اُردو بولنے والے پیدا ہو جاتے ہیں، مگر بنگالیوں کو کبھی بھی اچھی اُردو بولنی نہ آئی، یہ ساری عمر تذکیر و تانیث کی غلطیاں کرتے رہتے ہیں، بنگال میں بھی بعض بڑے اچھے خطیب دیکھے اور مولوی فضل اللہ بنگالی کا حلقۂ درس ادب تو بڑی شہرت رکھتا تھا، وہ بڑی صاف اور شستہ اُردو میں دیوانِ حماسہ و متنبی کا درس دیا کرتے تھے۔ [1]

[1] جنرل ہند و پاک کے دُور دراز علاقوں میں دارالعلوم دیوبند کے ذریعہ اُردو زبان کو فروغ حاصل ہوا اور اس طرح اُردو کا احاطہ کیفیت سے وسیع تر ہوتا چلا گیا کہ حد و حساب باہر ہے۔

از مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیری
استاذ حدیث و تفسیر دارالعلوم دیوبند

حضرت العلامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند دوم کی تعلیم مدرسہ فتح پوری دہلی اور دارالعلوم میں ہوئی، حضرت مولانا مدنیؒ اور حضرت مولانا اعزاز علیؒ اور حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی استاذ خاص ہیں، طالب علمی کے فوراً بعد دارالعلوم میں مدرس مقرر ہوئے۔ اب حدیث و تفسیر کی بڑی کتابیں زیر درس ہیں، شعبۂ تبلیغات کے نائب ناظم، ملک کے مشہور مقرر، دیدہ ور مصنف اور اپنی ذہانت و فطانت میں معاصرین میں ممتاز اور بزرگوں میں پسندیدہ ہیں، ان کی کئی کتابیں، علمی دینی حلقوں میں مقبول ہو چکی ہیں۔ (الرشید)

کسی اور کا نہیں، خود اسلام ہی کے دامن کا جائزہ لیجئے یقین رکھتا ہوں کہ جن دولتوں سے یہ دامن لبریز ہے، اُن میں نمایاں قرآن و حدیث ہی ہیں، قرآن مجید کو اساس قرار دینے کے بعد اس مقدس متن کی دل آویز شرح احادیث کا ذخیرہ گرانمایہ مجموعہ ہے جو ختم نبوت علیہا وعلی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی درخشاں زبان مبارک سے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مقدس اجتماع میں پھیل رہا تھا، اسے حکمت و مصلحت پر مبنی ایک ٹھوس اقدام سمجھ لیجئے کہ اسلام کے صدر اول میں تمام تر راہنما قرآن کریم ہی سے رہا، مگر تصور اپنی ابتدا سے تا انتہا غلط ہی غلط ہے کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے نیازی برتی گئی، جہاں تک اس مظلوم و مجہول کے زیر نظر مضمون کا تعلق ہے، مجھے حدیث کی تدوینی مہم پر کچھ عرض کرنا نہیں ورنہ حقائق و وثائق کی روشنی میں بخوبی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی تدوینی مساعی کو مشکوک و مشتبہ بنانے کی جد و جہد، مغالطہ انگیزیوں کا ایک طومار ہے۔ بہرحال یہ بحث یہیں چھوڑتے ہوئے، ہندوستان بشمول پاکستان میں اسلام کے اساسی مضامین میں حدیث رسولؐ کے ساتھ جو خاص توجہ کی گئی، اس کا اعتراف کسی اور نے نہیں، مصر کے جلیل القدر عالم صاحب المنار علامہ رشید رضا کے الفاظ میں یہ ہے:۔

• اگر علوم حدیث کی جانب ہمارے ہندی علماء کی توجہ

"اگر یہ التفات جبذول نہ ہوتی، تو اسلام کے مشرقی علاقوں میں (خدانخواستہ) حدیث کا خاتمہ ہی ہو چکا ہوتا، کیونکہ مصر و شام، عراق و حجاز، دسویں صدی ہجری میں سب ہی جگہ علمی زوال انتہا کو پہنچ چکا تھا۔"

"مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ"

میں یہ نہیں سمجھتا کہ عجمی ممالک کی علمی جدوجہد اور پاکیزہ ولولوں کو اس کھلے دل سے تسلیم کرنے کے بعد صاحب المنار کی ان نگارشات کو بے وقعت سمجھا جائے گا۔ کیا عرض کروں تاریخ کی ستم ظریفیاں، صدیوں سے دینی درسگاہوں میں امام زہری علیہ الرحمۃ کو حدیث کا مدون اول بتایا جاتا رہا ہے۔ امام ہمام کی علمی جلالت و عظمت کے اعتراف کے باوجود تدوین حدیث کا اولین کارنامہ جو ان کی جانب منسوب کیا جاتا ہے اور جسے اب تاریخی حقائق کی روشنی میں تسلیم کرانا دشوار تر ہی ہو گا، ٹھیک اسی طرح ہندوستان میں حدیثی خدمات کا معمار اول امام المحدثین الشہید ولی اللہ حلب شراہ کو بنا دیا گیا، خاکم بدہن، حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی علمی عظمتوں کو کم کر کے دکھانے کا جرم یہ بے بضاعت ہیچ مدان قلم کبھی نہیں کر سکتا، لیکن خود اس سے ہندوستان کی اس ناواقفیت کو جو فن حدیث کے ساتھ صدیوں پرانی ہے، نقصان پہنچنے کے جو امکانات پیدا کر دیئے گئے۔ راہ کے ان کانٹوں کو بھی دور کرنے کی بہر حال ضرورت ہے، تاریخ سے واقفیت رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ تاتاریوں کے لائے ہوئے معاملے کے بعد ہندوستان کی جانب جن علماء کے قدم اٹھ گئے تھے، اُن ہی میں وہ اہل کمال بھی چلے آ رہے تھے، جو حدیث کی گرانمایہ متاع کو اپنی جیب و دامن میں لے کر ہندوستان کی فضا کو منور کرنے کا منصوبہ رکھتے۔ فیروز شاہی نے اپنی مشہور تاریخ میں اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے۔

"فتنہ چنگیز خاں کے حادثے سے دل شکستہ ہو کر ہندوستان میں اہل علم آتے اور پھر یہ سلسلہ علما کی آمد کا برابر بڑھتا رہا اور سرزمین ہند علم و کمال دینی دانش کی روشنیوں سے جگمگانے لگی"۔ کیا یہ بھی مبالغہ ہے کہ ہندوستان حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے حدیث کے چرچوں سے نا آشنا تھا، یہ وہ افسوسناک تاریخی ناواقفیت ہے، جسے ہندوستان کی علمی تاریخ کا المیہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے اگر تھوڑی سی زحمت اٹھا کر تاریخ کے دریچوں سے حقیقتوں کا تجسس و تلاش کیا جائے تو حضرت شاہ صاحب سے پہلے بلکہ بہت پہلے یہ ملک حدیث سے اس درجہ واقف ہو چکا تھا کہ یہاں حافظ قرآن کی طرح "بخاری شریف" کے حفاظ بھی موجود تھے۔ "یاد ایام" میں مولانا عبدالملک عباسی کے متعلق بتایا گیا۔ "صحیح بخاری ان کو زبانی یاد تھی۔ بخاری کی درس ہمیشہ زبانی دیتے"۔

تذکرہ علماء ہند میں بابا داؤد مشکوٰتی کے حالات میں یہ بھی موجود ہے "فقہ، حدیث، تفسیر اور حکمت و معانی میں کمال رکھتے تھے اور مشکوٰۃ شریف کے حافظ تھے، اسی وجہ سے ان کا لقب مشکوٰتی ہو گیا"۔

غرضیکہ یہ صرف ایک پروپیگنڈا ہی ہے کہ ہندوستان حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے حدیث سے نا آشنا تھا۔ یہی نہیں کہ صرف حدیث کی واقفیت، بخاری شریف اور مشکوٰۃ شریف کے حفاظ بلکہ حدیث کی ابتدائی کتاب "مشارق الانوار" جو صدیوں ہندوستان میں حدیث کی اساسی کتاب قرار دے کر پڑھی، پڑھائی جاتی رہی، سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء نے اپنے متعلق تحریر فرمایا ہے، کہ

"مشارق الانوار" ان کے یہاں زیر درس رہی اور سلطان جی نے اپنے
موقوف خلفا کو اس کی باقاعدہ تعلیم کے لیے خطاب کر کے ہندوستان کے
مختلف حصوں میں پھیلا دیا، تفصیلات کے لیے "فوائد الفواد" اور "سیر الاولیاء"
کا مطالعہ کافی ہوگا۔ بلکہ اس ہندوستان میں حدیث کی اہم شروحات بھی
لکھی جا چکی تھیں، خود حضرت شیخ عبدالحق محدث اور ان کے صاحبزادے
مولانا نورالحق صاحب، مشکوٰۃ شریف، بخاری شریف کی شروحات بالترتیب
فارسی و عربی میں لکھ چکے تھے ـــــ اس میں شک نہیں کہ الدھلوی امام
کے خانوادہ نیک نام سے حدیث کے درس کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا
وہ انشاءاللہ اب قیامت تک باقی رہے گا، ہند اور پاکستان میں
جو اب دینی درسگاہوں میں حدیث کے سلسلے شاہ صاحب پر ختم ہوتے
کئے جاتے ہیں ان کی اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں کہ موجودہ
سند شاہ صاحب ہی پر ختم ہوتی ہے۔ سطور بالا میں عرض کر چکا ہوں
کہ اسلام کے یہ دو اساسی مضمون، قرآن اور حدیث امت کی خاص توجہات کے
مرکز رہے ہیں، جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ قرآن سے متعلق مضامین
مطالب میں جو گلکاریاں کی گئی ہیں وہ باقی تمام امتوں میں اپنی نظیر نہیں
رکھتیں، اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بائیبل کے اشاعتی عدد کو شمار
کرنا بھی مشکل ہو گیا اور اسی طرح انجیل کے مقدس نسخے بھی بے شمار چھپ
چکے ہیں، مگر جہاں تک تشریح و تفسیر اور بیان و تبیین کا تعلق ہے، اچھی تو [illegible]
اور متوازن شرح ان میں سے کسی ایک کی بھی پیش کرنا مشکل ہے، دوسری
جانب قرآن حکیم کا یہ حال ہے کہ اس کے چہرۂ زیبا سے نقاب کشائی کے
لیے امت مرحومہ کے کارنامے اس قدر تابناک ہیں کہ انھیں انصاف پسند
بے مثال ہی کہیں گے۔ لغات القرآن، قراءۃ القرآن، قرآنی نحو، قرآنی صرف،
قرآن اور اس کا اعجاز، بلاغت قرآن، فصاحت قرآن، تفسیر قرآن، قصص القرآن،
مشکلات القرآن، معارف القرآن، نظائر القرآن، امثال القرآن اور خدا
جانے کتنے عنوانات ہیں جن پر تیار شدہ ذخیرہ کتب خانوں کی الماریوں کی

زینت بن چکا ہے اور چودہ سو سال کی طویل مدت کے باوجود آج تک
قرآن مجید سے یہ اعتناء و التفات کم نہیں ہونے پاتا۔ ان دلچسپیوں کے
بعد پھر ذہنی و دماغی وابستگی اگر کسی عنوان و موضوع سے ہے تو وہ صرف
حدیث ہے۔ بخاری شریف اور امام دارالہجرۃ سیدنا امام مالک بن انس کی
مؤطا جو تدوین و تصنیف کی تاریخی حیثیت میں بخاری شریف سے بھی مقدم
ہے، اس کی شروحات کا جہاں تک راقم السطور کو علم ہے۔ تیرھویں صدی
تک شروحات مؤطا مالک اور اصح الکتاب، بخاری شریف پر اہل علم
و دانش کی تحقیقاتی تدقیق نگاہی کے انبار ۲۵ کی تعداد میں ہیں اور پھر
حدیث کے ایک ایک رخ سے نقاب کشائی میں جن فنی جا بکدستیوں کا
مظاہرہ کیا گیا اس کو دیکھ کر تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس امت مرحومہ کو
الرسول اعظم کے اشارات سے کیا کچھ دلچسپیاں رہی ہیں، فقہی مکاتیب کا
باہمی اختلاف اور حدیث کے ذخیرے میں نت نئی موشگافیوں کا باعث
بنا اور یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ خاص اس نقطہ نظر کی باہمی آویزشیں سامنے
نہ آتیں تو حدیث کے بہت سے پہلو مستور رہتے۔

ہندوستان میں تدریس حدیث

عرض کر چکا ہوں کہ حدیث کا درس باقاعدہ حضرت شاہ صاحب
ہی کی درسگاہ سے اپنا تاریخی آغاز رکھتا ہے، اس لیے ہندوستان میں
حدیث کی درسی خصوصیات کے لیے سب سے پہلے اسی عظیم درسگاہ کے طرز کو
بیان کرنا پڑے گا، جہاں تک تاریخی وثائق کا تعلق ہے، شاہ صاحب علیہ الرحمۃ
کا زیادہ زور مشارق الانوار پر رہتا اور مباحث و مضامین متعلقہ اسی
مشارق الانوار میں طلبا کے سامنے پیش کر دیئے جاتے، صحاح ستہ کی
پوری تعلیم تبرکاً بطور قرات ہوتی، خاص خاص مواقع پر کچھ تفصیلات بھی
بیان کر دی جاتیں، شاہ صاحب کے مدرسے میں اس خصوصی انداز کو "سرد"
کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کا لفظی ترجمہ رواں روانی اور ٹھیٹ

ترجمہ دورہ ہے، شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے اس معروف اندازِ درس میں انقلابی تبدیلیاں عالم اسلام کی عظیم ترین درس گاہ دارالعلوم دیوبند نے کیں۔ دارالعلوم کی ان انقلابی کوششوں کا جائزہ لینے کے لیے کچھ تفصیل کرنا ہوگی اور ان تاریخی مرحلوں کی تعیین و تشخص کے بغیر موضوعات سمجھ ہی نہیں آسکیں گی، جہاں سے تبدیلیوں کا نقطۂ عروج ہوتا ہے، اس تحریک خیر کا ظہور، جس کے بارے میں پہلے بھی توجہ دلا چکا ہوں، اسلام کے چودہ سو سالہ دور میں نئے نئے فتنے جو فکر و عقیدہ کے حدود میں نمل رہے تھے، اسلام کی جانب سے دفاع کرنے والوں نے دفاعی مسالا اسی قرآن و حدیث کے ذخیرہ سے بہم پہنچایا، جبر و قدر، شیعہ و رافضیت، اعتزال اور فتنۂ خلقِ قرآن غرضیکہ جو بھی فتنے سر اٹھاتے اُن کے استیصال کے لیے قرآن و حدیث کا ہی استعمال ہوتا۔ اس ذہنی مہم میں قرآن اور حدیث کے رُخِ زیبا سے کچھ اس طرح نقاب اٹھا گیا کہ لطیف اور نازک مضامین کا انبار لگتا چلا گیا۔ تقلید و عدم تقلید، پھر چاروں فقیہوں اور اس کے ساتھ سلوک و معرفت کے مکاتب فکر جب ایک دوسرے سے متصادم ہوئے تو اختلافِ اُمت، رحمت کا موجب بن کر مطالب و مضامین میں ندرت اور تازہ افکار کی تمہید تھی اور اسی طرح یہ شر اس سطریہ کی تخلیق کا باعث بنا جس کی جانب سے اُمت مرحومہ غافل چلی آتی تھی۔ ہندوستان میں حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ چونکہ خود اجتہاد کے مدعی تھے اور فقہ حنفی کے ترجمان، اور اس سے گہری وابستگی کے باوجود اس ماحول میں جو حکومتوں کے روزمرہ انقلاب نے پیدا کر دیا تھا، خاص ان مباحث پر زور نہیں دینا چاہتے تھے، جو حدیث و قرآن کا قانونی اسلوب ہے اور جس کا تمام تر تعلق مسلمانوں کی عملی زندگی سے رہا ہے اور رہے گا۔ مرحوم شاہ صاحب کے عہد میں بدعت و سنت کی آویزشیں، شیعہ اور اُس کے بالمقابل سُنّی افکار کی نمائندگی یا اسلام سے بڑھتا ہوا بُعد۔ اور یہاں کے ماحول سے انفعال کی شدت، شاہ صاحب

کے فکر و ذہن کو قوت سے متاثر کئے ہوئے تھی۔ اس لیے حدیث و قرآن پر اپنے انداز میں کام ہوتا اور اسے موجودہ کشمکش و نزاع سے بچانے کے لیے، شاہ صاحب مرحوم نے جس طرح پیش کیا وہ بھی اپنی جگہ وقیع اور مستحسن ہے۔ آج بھی حضرت شاہ صاحب کی تصانیف کے مطالعہ سے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن و حدیث کی ایک اصیل تفسیر و شرح عصری ضرورتوں کے مطابق ہو کر رہ گئیں۔ آپ کی درسگاہ سے تربیت یافتہ حلقہ جب وہاں سے علوم نبوت کی امانت لے کر اقصائے ہندوستان میں پھیل گیا تو اس امانت کی اشاعت کا مرکز منتقل ہونا دیوبند کی تقدیر میں تھا، یہاں دارالعلوم میں علوم نبوت کے سرچشمے جاری ہوئے اور اس کی موجیں عرب کی حدود تک جا پہنچیں اس لیے ہندوستان میں درسِ حدیث اور اس کی منفرد خصوصیات کی تعمیر و تشکیل میں جو دارالعلوم کا اہم کردار ہے، اس سے انصاف پسند مؤرخ چشم پوشی نہیں کر سکتا، بھلا اس کا انکار کیسے ممکن ہے کہ ادھر ایک صدی میں ہند و پاکستان اور دور و دراز علاقوں میں درسگاہیں جو کچھ کر رہی ہیں وہ دارالعلوم کے علمی فیوض کی تابناک مثالیں اور روشن شواہد ہیں، الامام الثانی حجۃ اللہ فی الارض مولانا قاسم نانوتوی علیہ الرحمۃ نے دارالعلوم کی تشکیل میں اور آپ کے رفیق خاص الامام الکبیر قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے خانقاہ کی صورت میں خانوادہ ولی اللّٰہی کی اس امانتِ خاص کی نشر و اشاعت با کمال انداز میں اس طرح کی کہ وہ اس راہ کے خود ہی سنگِ میل بن گئے، دونوں حضرات کی تصانیف اور موخر الذکر کی ترمذی شریف سے متعلق درسی تقریر منظر عام پر آ چکی ہیں جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان حضرات کا انداز طرز اور تدریس حدیث میں خاص رول کیا تھا۔ بخاری شریف کا جو حاشیہ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے قلم سے تیار ہوا، کچھ خاص اجزاء کی شرح و تشریح حضرت نانوتوی کے علم ریز قلم سے بھی ہوئی ہے اور یہ علمی دستاویز بھی

درسِ حدیث کے لیے مخصوص تھیں، تاہم فنی حیثیت تو واضح اور صاف چونکہ حدیث پر اعلیٰ ترین مباحث کا ان حضرات کے یہاں سراغ نہیں ملتا اور دونوں حضرات اس ماحول کے مطابق حدیث و کلامِ دونوں باہم میں شریک رہے۔ جو آپ کے عہد کے خاص فتنے تھے۔ حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ ہی کے زمانے میں دارالعلوم دیوبند کی صدارتِ تدریس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی علیہ الرحمۃ کے سپرد تھی، جو حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے فرزند ارجمند اور اکابر کے علوم کے امین تھے، آپ کے مشہور تلامذہ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب وغیرہ ہیں۔ مولانا تھانوی نے اپنے ان جلیل القدر استاذ کا کافی تذکرہ کیا ہے، اور کہیں کہیں مرحوم کے اندازِ درس کا بھی ذکر آیا، مثلاً ایک موقع پر اپنی مخصوص مجلس میں فرمایا۔

"مولانا محمد یعقوب صاحب کی تقریر میں علمی نکات بہت ہوتے تھے، مگر بے ساختہ اور اُن کے یہاں اتنے علوم تھے کہ سبحان اللہ! اُن کی تقریر سن کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک کتب خانہ کھول دیا۔"

آپ کی جامعیت کا یہ عالم تھا کہ علمِ ریاضی ایسا خشک مضمون جس سے عام طور پر علماء نابلد ہوتے ہیں، مولانا مرحوم اس فن میں بھی — اس درجہ مہارت رکھتے تھے کہ بقول حضرت تھانویؒ:

"سرکاری مدارس کے ماسٹر صاحبان، ریاضی کے مشکل مسائل آپ سے حل کراتے۔"

درس گاہ کا ایک خصوصی امتیاز یہ بھی تھا کہ:

"درس گاہ دکانِ معرفت معلوم ہوتی، ایک خاص ترتیب سے قلب پر ہوتی۔" (بحوالہ یعقوب و مملوک)

مختلف احادیث میں تطبیق، آیاتِ قرآنی سے مسائل کا استنباط، استخراج، حدیث کی شرحوں میں شرعی نصوص کے صحیح مقامات کی تعیین تشخیص مولانا مرحوم کا امتیاز تھا۔ آپ کی مکمل سوانح پروفیسر انوار الحسن صاحب شیرکوٹی نے بنام "یعقوب و مملوک" تالیف کی ہے۔ اہلِ ذوق کے لیے اس کا مطالعہ دل و دماغ کی تشفی اور روحانی غذا ہے۔

ان تمام ادوار میں برطانوی زیرِ تسلط ہندوستان کے مخصوص فتنوں کا توڑ حدیث و قرآن سے کیا جاتا رہا۔ فقہ حنفی کی تائید میں کچھ خاص اجتہادی نکات پر عمل کیا گیا اور تقلید و عدمِ تقلید کے جھگڑوں کی بھی جڑ کاٹ دی گئی، یہ وہ وقت تھا کہ ہندوستان میں بریلوی فتنے کا آغاز ہو چکا تھا اور پاسبانِ سنت بریلویت کی شکست و ریخت میں مصروف تھے، اس لیے حدیثی درس میں ایک خاص باب کا اضافہ ہو گیا۔ تاہم اپنے پیشرو کی طرح مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا درس بھی مختصر اور متوازن شرح و تفسیر کا حامل رہا اور اتنی ہی تقریر کی جاتی، جو حدیث کے خاص خاص پہلوؤں کو اجاگر کر سکے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے بعد کچھ وقفے سے عہدۂ صدر مدرسی حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ کے خاص تربیت کردہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منتقل ہو گیا، آپ اپنی طبعی ذکاوت و ذہانت کے علاوہ اپنے استاذ اکبر کے علوم و معارف کے مبلغ و ترجمان تھے اور ذوق و مشرب کے اعتبار سے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی اور حریت پسندانہ جذبات کے حامل، اعلاءِ کلمۃ الحق کے جذبے سے سرشار اور ہند میں یہاں کے باشندوں کے اقتدار کی بحالی کے آرزومند تھے۔ مشہور ریشمی رومال کی تحریک، ہندوستان، افغانستان، آزاد قبائل، ترکی اور ممالکِ اسلامیہ تک ہندوستان کی آزادی کے لیے ایک ہمہ گیر تحریک کے مشاور داعی ہیں، اپنی سیاسی جدوجہد میں اخفاءِ راز کا جو اہتمام پیشِ نظر تھا، اس میں اس قدر کامیاب رہے، کہ درس میں کبھی یہ اندرونی

جذبات عام طلباء کے سامنے رونما نہیں ہو سکے۔ زیادہ تر زور فقہ حنفی کی تائید پر رہا، حنفیت میں تصلب کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی قول میں امام اعظم منفرد رہتے۔ بلکہ امام کے مشہور تلامذہ بھی ان کی ہمنوائی میں نہ ہوتے تو صورت حال کی نزاکت سے چیں بجبیں ہونے کے بجائے حضرت فرماتے کہ یہاں ایک ایسا ہی دقیقہ ہے، جس تک امام اعظمؒ کی وقت نظر ہی کامیابی سے پہنچ سکتی تھی۔ [1]

اختصار پسندی کے باوجود اگر ضرورت ہوتی، تو حل مشکلات کے لیے طویل مباحث سے بھی گریز نہ ہوتا۔ زیر مطالعہ کتابوں سے حضرت ان اقوال کا انتخاب فرما لیتے، جو سب سے زیادہ جاندار اور بھاری بھرکم ہوتے، اپنے استاذ اکبر حضرت نانوتویؒ کے افادات کی ترجمانی بھی فرماتے، بخاری شریف کے ترجمۃ الابواب کو اہل علم جانتے ہیں کہ وہ بخاری شریف کا سب سے اہم حصہ ہیں، جملہ شارحین بخاری نے ان پر خاص توجہ کی ہے، حافظ العصر الامام علامہ انور شاہ کشمیریؒ بارہا فرماتے:

"کاش کہ ابن تیمیہ ترجمۃ الابواب پر کچھ لکھتے تو ایک عجیب و غریب سرمایہ علم سامنے آتا۔"

الامام الدہلوی نے بھی بخاری کے تراجم پر مختصر لکھا ہے اور حضرت شیخ الہند کا بھی ایک رسالہ اس عنوان پر موجود ہے، جس کے مطالعے سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ حضرت موصوف نے تراجم کو حل کرنے کے لیے کس ژرف نگاہی کا مظاہرہ فرمایا۔ بعض تصانیف بھی اہم عنوانات پر تیار کیں، جو موصوف کے کمالات علمی کا شاہد ہیں، آپ کا سب سے بڑا امتیاز و اختصاص ان تلامذہ کا آپ کے دامن تربیت سے تیار ہونا ہے، جو فضل و کمال، فقاہت و ذہانت میں اپنی نظیر آپ ہیں، غالباً ہندوستانی علماء میں یہ حضرت مرحوم کی منفرد حیثیت و خصوصیت ہے کہ خدائے تعالے نے آپ کے حلقۂ درس میں علم کے آفتاب اور فضل کے ماہتاب اٹھائے۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا اعزاز علی صاحبؒ وغیرہ، آپ کی وہ علمی یادگار ہیں جن کی نظیر اب چشم فلک دیکھ نہیں سکتی۔ طلباء پر خاص بزرگانہ شفقت رہتی، بعض طلباء سے خصوصی شفقت کا معاملہ رہتا، درس میں بھی ایسے طلباء کے مزاجی جملوں کا تبادلہ فرماتے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ جن کو حضرت کی بارگاہ علم و کمال میں اختصاص حاصل تھا، اگر درس میں کبھی کوئی بات دریافت فرماتے، تو حضرت کی طرف سے ارشاد ہوتا:

"تم بدوی ہو ایسے نازک مسائل کیا خاک سمجھو گے۔"

اس طرح آپ کا درس معقول و منقول، فقہ و تفقہ، فضل و کمال اور دین و دانش کی فیض رسانیوں پر مکمل حاوی تھا، حضرت کی حیات ہی میں آپ کے معروف تلامذہ میں سے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ

---

[1] تقریر مختصر، جامع اور دل نشین لیے ہوتے ہوتی، طلباء کو متیقظ رکھنے کے لیے کبھی کبھی حنفی نقطۂ نظر کی مخالف احادیث پر سکوت فرماتے اگر کوئی طالب علم توجہ دلاتا۔ کہ حضرت یہ حدیث احناف کے قطعاً خلاف ہے، ارشاد ہوتا:

"میں کیا کروں؟"

طالب علم عرض کرتا کہ حنفیہ کا بھی کوئی جواب ہوگا، جواباً ارشاد ہوتا:

"حاشیے پر جواب موجود ہوگا، دیکھ لو۔"

ادھر سے عرض کیا جاتا کہ حاشیہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے، مزاحاً و متجسسانہ انداز میں فرمایا جاتا: "کہ اگر سمجھ میں نہیں آتا تو سر دیوار سے دے مارو۔" اس پرشفقت رد و قدح کے بعد احناف کی جانب سے ایسا جچا تلا جواب پیش کیا جاتا کہ زیر بحث حدیث مسلک حنفیہ کے مخالف نہیں بلکہ موافق نظر آتی۔

صاحب الکشمیریؒ کا بعہدہ صدر المدرسین کا انتخاب ہوا۔ خدائے تعالیٰ نے آپ کو جس بے نظیر قوت حافظہ، یادداشت، خلد و ذکاوت مطالعہ، تبحر علمی کی دولتوں سے نوازا تھا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کے عہد میں تدریسی و تعلیمی زندگی میں ایک خوشگوار انقلاب رونما ہوا اب تک حدیث کے موضوع پر محدود تقریر اور مشہور مسائل کا تذکرہ ہوتا، حضرت شاہ صاحبؒ نے اس طرز میں وہ مجتہدانہ تبدیلی کی جس کے نتیجے میں درآنحالیکہ آج آپ کے سانحۂ وفات پر نصف صدی گزرنے کو آتی ہے، ہند و پاکستان کی تمام درسگاہیں اسی طرز کی محافظ و امین بنی ہوئی ہیں، کیونکہ آپ کی بے پناہ شخصیت اس انقلاب کا سنگ میل ہے، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تدریسی خصوصیات کو قدرے تفصیل کے ساتھ نظر قارئین کیا جائے، اس سے پہلے کہ اس عنوان پر کچھ عرض کروں، آپ کے ایک خصوصی شاگرد مولانا مفتی محمود صاحب نانوتوی، جو نصف صدی "مالوہ" میں افتاء نویسی کی وقیع خدمت انجام دیتے رہے اور سالہا سال دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے باوقار رکن بھی رہے۔ ایک موقعہ پر مرحوم نے اپنے استاد حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں بڑی وقیع اور وزن دار بات فرمائی، فرمایا کہ:

"ہندوستان نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جیسا مصنف نہیں پیدا کیا اور حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ جیسا بے مثال مدرس پھر پیدا نہ ہو سکا۔"

واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی درسی میزات، اور آپ کی اجتہادی بصیرتوں کا گہرا جائزہ لینے کے بعد یہ متوازن فیصلہ مفتی صاحب کی زبان پر آیا۔ عرض کر چکا ہوں کہ آپ سے پہلے تدریس و تعلیم کی بندش حدود ہی میں ہوتی، لیکن آپ نے حدیث کو اسلامی علوم کا آئینہ دار بنا کر طلبا کے سامنے پیش کیا۔ ان حدود میں آپ کی مجددانہ و مجتہدانہ خصوصیات کا اعتراف خود آپ کے کمال تلامذہ نے بھی کیا ہے، چنانچہ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اپنے سوانحی مقالے میں لکھتے ہیں:

"حضرت شاہ صاحبؒ کے درس حدیث میں کچھ ایسی خصوصیات نمایاں ہوئیں جو عام طور سے مدارس میں نہ تھیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ کا طرز تشریح درس و تدریس میں ایک انقلاب عظیم کا باعث ثابت ہوا۔"

یہ انقلاب کیا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے عام درسگاہوں کی ابتدائی تقریروں کی فرسودگی کا تفصیلی ذکر کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحب کے نئے اور حیرت انگیز طریقۂ تدریس کو بیان کرتے ہوئے اطلاع دی ہے۔

"لیکن الامام الکشمیریؒ نے قبل اس کے کہ کتاب کا کوئی لفظ شروع ہو، ایک خاص دلچسپ ترنم آمیز آواز میں تقریر شروع کی کہ کس کس موضوع سے اس تقریر کا تعلق تھا، تقریباً ۴۰ سال بعد اس کا دہرانا آسان نہیں لیکن بعض انقلابی تاثرات کا نشان حافظے پر اب بھی باقی ہے۔"

"پہلے ہی دن کے سبق میں معلوم ہوتا تھا کہ برسوں میں حاصل ہونے والے معلومات یکایک میرے سامنے آگئے۔" (بحوالہ حیات انور)

اس اجتہادی درس میں متنوع اور گوناگوں علوم کا فیضان جو حضرت مرحوم کی جانب سے ہوتا، مولانا گیلانی نے شاہ صاحب ہی کی زبان میں دماغی مسائل سے اس کا ذکر کیا ہے، چنانچہ رقمطراز ہیں:

"یادداشت اور حافظہ کی غیر معمولی قوت کا نتیجہ یہ تھا کہ معلومات کا طوفان شاہ صاحب کے اندر تلاطم

پذیر رہتا، کسی مسئلے پر تقریر فرماتے ہوئے اس کی
مناسبت سے ذہن کسی دوسرے مسئلے کی طرف
منتقل ہوتا تو عموماً فرماتے :
" دماغ ہو گیا ہے مجھے اِس مسئلے کی طرف "
اسی طرح کی تفصیل مولانا قاری محمد طیب صاحب نے بھی سناتے
ہوئے بتایا ہے۔

" حضرت شاہ صاحبؒ کا درسِ حدیث محض حدیث
تک محدود نہ تھا، بلکہ، فقہ، تاریخ، ادب، کلام
فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی، سائنس، غرضیکہ تمام
علوم جدیدہ و قدیمہ پر مشتمل ہوتا۔" (بحوالہ تذکرہ)

محدود تقریروں اور متعینہ لائنوں سے ہٹ کر افادی خطوط میں
اس توسیع نے طلبا کے ذہنوں میں جو تبدیلیاں پیدا کیں، بطور شہادت
مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کا یہ بیان بہت وقیع ہے، لکھا ہے
کہ : " اِس جامع درس کا طالب علم درس سے ہر علم و
فن کا مذاق لے کر اٹھتا اور اس میں یہ استعداد
پیدا ہو جاتی کہ وُہ بہ ضمن کلام خدا و رسول ہر فن پر
محققانہ کلام کرے۔ یہ درحقیقت درس کی لائن کا
ایک انقلاب تھا، جو زمانے کی رفتار کو دیکھ کر
الاستاذ، الامام، الکشمیری نے اختیار فرمایا تھا۔"

طلبا کی بے بضاعتی اور کوتاہ ہمتی کے پیش نظر ایک خاص کام یہ بھی کیا
کہ جس کسی مصنف کا تذکرہ آتا، اس کی مختصر سوانح بھی بیان فرما دیتے۔ اس کا
بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ اسلام کی تیرہ سو سالہ تاریخ کے نامور روزگار اشخاص
سے طلبا کو براہ راست واقفیت ہوتی، حضرت شاہ صاحب نے جہاں
طلبا کے اذہان کو علمی حدود میں وسعت پذیری سے آشنا فرمایا، جدید
فتنوں پر بھی استنباہ درس کا خاص حصہ رہا، قادیانیت کے استیصال

و تردید کی پر درس میں اس تفصیل سے کام لیا کہ طلبا اور متعلقین اس
دجالی فتنے کے قلع قمع کے لیے ہمہ جہت مسلح ہو گئے۔
مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند نے خود حضرت شاہ صاحب
کے حوالے سے سنایا ہے۔

" بحمد اللہ اس زمانے کے کل فتنوں کے مقابلے میں
جس قدر ہو سکا ہم نے سامان جمع کر دیا۔"
جیسا کہ معلوم ہے کہ سلوک و تصوف، معرفت و تزکیہ، باوجودیکہ شریعت
کا مغز اور اس کی رُوح ہیں اور اسرار و حِکم جو شرعی احکام و اوامر منہیات
کو سمجھنے اور قلبی اطمینان کا ایک مضبوط ذریعہ ہیں، ہماری دینی درسگاہوں
میں ان دونوں اہم فنون اور پاکیزہ علوم سے کوئی اعتنا نہیں برتا جاتا
حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے ایک بڑا کام یہ بھی کیا کہ صوفیاء کے
اقوال، اُن کی آراء اور اسرار و حِکم، طلبا کے سامنے بقوّت اور بکثرت
پیش فرما کر ان کے اذہان و قلوب، ان علوم سے بھی آشنا کرنے کے
لیے تیار و ہموار فرما دیئے۔ بلکہ بعض احادیث و قرآنی آیات میں تو
آپ نے صوفیاء کے افکار کو قولِ فیصل قرار دیا۔ اس ذیل میں شیخ محی الدین
بن عربی کی آراء کو نہایت وقیع انداز میں پیش فرماتے۔ کبھی کبھی بطور تحدیث
نعمت بھی ارشاد ہوتا کہ :
" اسرار و حِکم کو باستثناء شیخ محی الدین بن عربی سب سے بہتر جانتا
ہوں۔"

دارالعلوم دیوبند سے گہری نسبت اور دیوبندی ذوق و مشرب
سے بھرپور وابستگی کا یہ بھی نتیجہ تھا کہ شیخ بن عربی کے اقوال و تحقیق پر پورے
اطمینان کے باوجود ان کے تفردات پر کھل کر رد بھی فرماتے، جہاں کہیں
شیخ کے غالی معتقدین نے شیخ کے تفردات کی ہوا خواہی اور اُن
کی جانب سے دفاع میں خواہ مخواہ کی کھینچ تان کی ہے، حضرت مرحوم
شیخ کی جلالت علم کے اعتراف کے ساتھ۔ ان کی تفردات عجیب نہیں و

نیز بڑا کمال نمایاں فرماتے، ایسی فروعات کے باب میں شیخ کی بلند پرواز کر رہے تھے۔ پیسہ الوقت کے ذیل میں فرمانے کے بعد جو بیدوجہد کی ہے حضرت والا فرماتے کہ:

• شیخ کے مسلسل مطالعے کے بعد میں ان کی منہج پر پہنچا ہوں، یہ ان ہی کا کلام ہے الحاق نہیں ہے

غرضیکہ اس طرح آپ کی عقیدت و اعتراف متوازن حدود میں تھا، اس میں کبھی غلو کا دخل نہ ہوتا۔

منطق کی بادِ رہوائی

صدیوں سے ہماری درس گاہوں اور درس و تدریس پر منطق و قدیم فلسفے کا تسلط و غلبہ ہے۔ بعض علمی شخصیتیں ان ہی فنون میں ملکہ و دسترس پیدا کر کے غریب طلبا کے سامنے اپنی قابلیتوں کا مظاہرہ کرتیں۔ علامہ کشمیری نے یہ بھی بڑا کام کیا کہ ان مناطقہ کے استیلاء سے کاناتِ درس و تدریس کو پاک فرمایا۔ اور ان کے بالمقابل حکمائے اسلام یعنی صوفیاء کے معارف و مطالب کے ذائقے سے طلبا کو روشناس کیا۔ بو علی سینا کی موشگافیوں پر زبردست حملہ کرتے ہوئے بے ساختہ زبان پر یہ بھی آتا کہ "انا اعلم بابن سینا" اور اپنے اس دعوے کی دلیل اس طرح ارشاد ہوتی کہ:

• ارسطو کا فلسفہ بشیخ الرئیس تک کل ایک ہی سند سے پہنچا، جب کہ اس فلسفے کو میں نے تین سندوں سے حاصل کیا ہے •

آپ کے ان پیہم حملوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ منطق و فلسفہ کا غلبہ آہستہ آہستہ گھٹا اور بتدریج صوفیائے اسلام کے علوم و معارف سے وابستگی بڑھتی گئی۔

اسماء الرجال جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ حدیث کا نصف فن اسماء الرجال میں ہے۔ لیکن درس کی پچھلی نصف صدی میں درسگاہیں اس بلند فن سے تقریباً ناواقف ہوگئیں، اب حدیث کا درس برابر ہوتا ہے۔ لیکن مدار حدیث، اسناد، احوال رواۃ، اقسام حدیث اور پھر اس فن کے دقیق مباحث زیر بحث نہیں آتے۔ امام العصر مرحوم فن کو درس میں دوبارہ زندہ کیا۔ اور بلا مبالغہ آپ اس کی نشاۃ ثانیہ کے علمبردار ہیں۔ ذیلاً یہ کام بھی کیا کہ جن احادیث سے احناف کو فائدہ پہنچتا اور دوسرے فقہی مکاتیب کی اساسی شخصیتوں نے ان ہی احادیث کے اسنادی سلسلے کو مجروح بنا کر ناقابل استدلال کرنے کی کوشش کی، حضرت شاہ صاحب مرحوم نے ان رواۃ کی توثیق اور تعدیل فرما کر مسلک حنفیہ کے علمی ذخیرہ کو قابل استعمال کیا۔ یہی نہیں بلکہ خلاف کی جانب سے دفاع و جواب دہی میں آپ نے ان گوشوں کو نمایاں کیا، جن پر تبحر علمی کے بغیر واقفیت ممکن نہیں حافظ ابن حجر عسقلانی کی زیادتیوں کو خاص طور پر زیر بحث لا کر اُن کے تعدی و تجاوز کو اس طرح آشکارا فرمایا کہ کم از کم ان کے مستفیدین اب حافظ کے طرز و تعصب سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔

کتابی حوالے اور استناد

آپ کی درسی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کتابی حوالے جس سے اذہان خاص طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ اُن کا رواج درسگاہوں میں یکسر ختم ہو گیا تھا، حالانکہ کسی ایک ہی حدیث کی مزید تفصیل، یا اسی حدیث کا باقی ماندہ حصہ مختصر احادیث میں سے کسی دوسری جگہ ملتا ہے، حدیث پر ناتمام واقفیت کی بنا پر ایک محدث تشریح و تفسیر کی ذمہ داریوں سے اُس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، جب تک احادیث کے پورے ذخیرے پر اس کی نظر نہ ہو۔ پھر مسلک احناف کے اثبات و تائید کے لیے جن احادیث سے کام لیا جاتا۔ وہ عام طور پر

حضرات شوافع کے رتبہ دادہ مجموعوں میں موجود نہیں ہے۔ الامام کشمیریؒ اس گڑ پر خوب واقف تھے اور اپنی وسعت مطالعہ کے نتیجہ میں کارآمد احادیث کے مواقع پر آپ کی اطلاع تام تھی۔ چنانچہ درس میں جا بجا آپ ان احادیث کی نشاندہی فرماتے۔ مولانا محمد منظور نعمانی آپ کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں

"درس کے وقت صحاح ستہ اور ان کے علاوہ حدیث کی دوسری کتابیں حضرت کے سامنے رہتی تھیں۔ جب کسی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے کسی حدیث کا حوالہ دینا ہوتا تو صرف زبانی حوالے پر اکتفا نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ دوران تقریر ہاتھ بے تکلف اسی کتاب پر جاتا، جس کا وہ حوالہ دینا چاہتے اور حسبنا اللہ ونعم الوکیل ایک خاص انداز میں پڑھتے ہوئے اس طرح کتاب کھولتے کہ اکثر تو وہی صفحہ کھلتا تھا، جس پر حدیث ہوتی ورنہ دو چار ورق الٹنے کے بعد وہ حدیث سامنے آجاتی۔"

(بحوالہ مذکور)

آپ کے اس انداز سے درس خاص طور پر متاثر ہوا اور مسائل کی تنقیحات طبع زاد چیزیں نہ رہیں بلکہ ان کو حقائق کے انداز میں قبول کیا گیا اور ایک خاص فائدہ اس صورت میں یہ بھی سامنے آیا کہ آپ سے استفادہ کرنیوالے اب ہوائی تقریروں کے نہ سننے کے عادی رہے اور نہ کرنے کے۔

حنفیت اور درس کی تائید

دارالعلوم دیوبند کے ایک نامور فاضل اور مجاہد جلیل مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نے مسلک دارالعلوم کا ایک مرتبہ تجزیہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ دارالعلوم کا اساسی مقصد حنفیت کی تائید ہے۔ سب سے مقدم عرض یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ دہلوی کے درس سے یہ اہم مضمون اپنی مطلوب واقفیت کے ساتھ منصوص نہ ہوسکا۔ شاہ صاحب علیہ الرحمۃ حنفی نقطۂ نظر سے ہم آہنگی کے باوجود کیونکہ خود اجتہاد کا رنگ رکھتے تھے اس لیے حنفیت کو حضرت شاہ صاحب کی فرازۂ علم سے ممکن و متوقع فائدہ نہیں پہنچ سکا، لیکن اس کمی کی دارالعلوم دیوبند نے بھرپور تکمیل کی، حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ نے حنفیت کی تائید کے لیے اپنی تدریس و تصنیف میں بے مثال کام انجام دیا، لیکن اس حقیقت کے اظہار میں بھی کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کہ سید الامام کشمیری نے اپنی عبقریت خاص اس مقصد شریف کے لیے اس طرح صرف فرمائی کہ بقول آپ کے:

"میں نے حنفیت کو اس طرح مستحکم کر دیا کہ اب انشاء اللہ سو سال تک اس کی بنیادیں غیر متزلزل رہیں گی۔"

بلکہ حنفی مکتبۂ فکر کی تائید میں جو کام خدا تعالیٰ نے آپ سے لیا، اس کا اظہار کرتے ہوئے آپ کو اس حقیقت کے بیان میں بھی کوئی تامل نہیں تھا:

"خدائے تعالیٰ نے مجھے اس عہد میں حنفیت کے استحکام کے لیے پیدا کیا ہے۔"

اور واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کے بیانات پر کوئی شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا، چونکہ حضرت مرحوم نے اپنی عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ فقہ حنفی کی مضبوط بنیادوں کی تلاش میں صرف کیا۔ آپ فقہ حنفی کے صرف مقلد ہی نہیں بلکہ محقق تھے اور ان تمام مظالم پر آپ کی گہری نظر تھی، جن کا مقصد امام ابوحنیفہ کے فقہ کو کمزور و بے بنیاد ثابت کرنا تھا۔ ڈابھیل میں ایک تقریر کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہوا،

"میں نے اپنی عمر کے ۳۰ سال صرف اس مقصد—

کے لیے صرف کردے کہ یہ دیکھیں کہ فقہ حنفیہ
کے مطابق ہے یا نہیں۔ سو میں اپنی ۳۰ سال محنت
کے بعد مطمئن ہوں کہ جہاں جس درجے کی حدیث
دوسرے فقہا کے پاس ہے، اسی درجے کی
حدیث امام اعظم کے پاس بھی ہے اور جہاں
حدیث نہ ہونے کی بنا پر امام صاحب نے مسئلے
کی بنیاد قیاس پر رکھی ہے وہاں خصم کے پاس
بھی کوئی حدیث نہیں۔"

غرضیکہ حضرت شاہ صاحب فقہ حنفی کی حقانیت، صداقت اور اقرب الی السنۃ ہونے کے اپنی علمی کاوشوں کے نتیجے میں گہرے معتقد تھے اور آپ نے دارالعلوم دیوبند کے اس مسلک کی بھرپور تائید کی، جس کے اجزاء میں بقول مولانا سندھی:

"حنفیت کی تائید و استحکام جوہری حیثیت
سے شریک ہے۔"

پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ قدیم فلاسفہ کی موشگافیوں کو پسند نہ فرماتے اور اس کے مقابل طلبا کو سائنس جدید اور نئے علوم کی اہمیت پر بتاکید مطلع کرتے۔ بھوپال میں ایک موقع پر کسی جدید تعلیم یافتہ کے اس سوال پر کہ فلسفۂ قدیم اور سائنس جدید میں اسلام سے کون قریب ہے؟ آپ کا دوٹوک اعلان تھا کہ:

"سائنس جدید اقرب الی الاسلام ہے۔"

الغرض امام العصر کا عہد تعلیم و تدریس اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر ایک ایسا انقلاب تھا کہ نصف صدی سے ہند و پاکستان کے مدارس ہی ان پگڈنڈیوں پر چل رہے ہیں جو مرحوم نے اپنی خداداد علمی تبحر، گہرائی اور گیرائی سے پیش کی تھیں اور عملی طور پر یہ سمجھایا تھا کہ حدیث و قرآن ہی تمام اسلامی علوم کے سرچشمے بلکہ اسلام کی اساس ہیں اور جس وقت آپ دیوبند کو چھوڑ کر ڈابھیل منتقل ہو گئے۔

حضرت مولانا مدنی اور ان کی درسی خصوصیات

صدارتی ذمہ داریاں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خاص تربیت دادہ عارف باللہ و حق آگاہ شخصیت یعنی مولانا مدنی علیہ الرحمۃ کی جانب منتقل کی گئیں۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد آپ کا کافی وقت مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں درس و تدریس میں گزرا تھا۔ یہیں وہ رؤیائے صادقہ بھی پیش آیا کہ مرحوم نے رسالت مآب جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور اس ارشاد پر کہ کیا مانگتے ہو؟ عرض کیا کہ جو کچھ پڑھ چکا ہوں، اس میں رسوخ کی دولت عنایت ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت مرحوم اپنے علوم میں بے نظیر اور حدیث کی تدریس و تعلیم میں اسلاف کے صحیح جانشین تھے۔ دارالعلوم دیوبند جسے الامام کشمیری ایک نئے رخ پر ڈال چکے تھے اور جہاں کی تعلیمی کیفیات ایک خوشگوار انقلاب کی امین تھیں، آپ ان ہی امتیازات و خصوصیات کو نبھانے کی کوشش فرماتے، اگرچہ اس راہ کی ان دشواریوں پر آپ مطلع تھے، جو ایک جلیل محدث کو پیش آسکتی ہیں۔ جس سال راقم السطور دورۂ حدیث شریف میں تھا تو ترمذی شریف کے ابتدائی درس میں فرمایا:

"کہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے اپنے بے
نظیر حافظہ اور یادداشت سے کام لے کر درس کا
رنگ بدل دیا، وہ اپنی تبحر علمی کی بنا پر اس طرز کو
خوب نبھاتے، لیکن ہم ایسوں کے لیے بڑی دشواریاں
پیدا ہو گئیں۔"

اس اعتراف کے باوجود کسی حل طلب مسئلے پر آپ کی تقریر جامع ہوتی۔ حنفیہ کا استحکام، عہدی فتنوں کی تردید، حدیث کے ما

وما علیہ پر مفصل کلام ، اکابر کے اقوال خصوصاً حضرت مولانا نانوتوی کے معارف وعلوم سے دلچسپی اور ان کے ترجمان تھے ، حدیث کی اکثر کتابیں سامنے رہتیں اور ضرورت پر کتابوں کو کھول کر جواب دیئے جاتے طلبا پر بے پناہ شفقت تھی اور ہر سوال خواہ کتنا ہی مہمل کیوں نہ ہو اس کا جواب دینے میں کوئی تکدر محسوس نہ فرماتے ــ

ــ بخاری شریف کا سبق سال کے آخری حصے میں شب میں بھی ہوتا۔ گرمیوں کی مختصر راتیں اور شب و روز کی مسلسل مشغولیت کی بنا پر کچھ طلبا معروف خواب ہوتے ، قریب کا کوئی طالب علم حضرت الا کو مطلع کرتا تو ایک خاص لہجے میں رئیس النائمین ، کو ارشاد ہوتا کہ

"اٹھیے ، اٹھیے ، مٹکے میں منہ لگا کر آیئے ۔"

غریب طالب علم اپنی جگہ سے اٹھتا تو اس کے عقب سے یہ مزید جملہ ہوتا کہ "ہائے کیا بھری محفل میں رسوائی ہوئی"۔

اس پر پوری درسگاہ زعفران زار ... بن جاتی ، اتفاقاً ایک روز ایسا ہی حادثہ خود حضرت والا کو بھی پیش آگیا ، ہوا یہ کہ ایک طویل سفر سے واپسی کے بعد فوراً ہی درسگاہ تشریف لے آئے ، سفر کی صعوبتوں کی بنا پر نیم جان ہو رہے تھے ، چند ہی لمحات کے بعد اس قرینے و سلیقے سے بیٹھے بیٹھے معروف خواب ہوئے کہ جسم میں جنبش کا نام و نشان نہ تھا ، معمول یہ تھا کہ حدیث پر کچھ ارشاد فرمانا ہوتا ، تو تقریر شروع ہو جاتی اور اگر سابق میں یہ مضمون گذر چکا تو فرماتے کہ "چلیے" اور اس روز حدیث ہوتی رہی اور حضرت کا مسلسل سکوت ، طلبا محسوس کر گئے کہ حضرت معروف خواب ہیں ، قرأۃ حدیث روک دی گئی تاکہ آپ کے آرام میں خلل نہ آئے ، پھر اس سکوت پر حضرت بیدار ہو گئے ، طلبا کا اصرار کہ حضرت والا بھی اٹھ کر وضو فرمائیں ، بہت دیر رد و قدح ہوتی رہی ، بالآخر کھانے کی دعوت پر اس دلچسپ

تقریر میں بہت بسط اور کسی بھی مضمون کے تمام گوشوں کو واضح کر دینے کے عادی تھے ، مطالعے کا خاص اہتمام رہتا ، طویل اسفار کے بعد دیوبند واپسی ہوتی اور فوراً ہی مدرس کے لیے درسگاہ میں تشریف آوری لیکن اس مختصر وقفے میں بھی ضروری مطالعہ کر لیا جاتا ، آپ کے انتقال کے بعد حضرت مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ اور حضرت مولانا ابراہیم صاحب بلیاوی کا مشترک درس ہے ۔ اول الذکر مسند درس کے امام اور ثانی الذکر مسند قدرت میں متبحر تھے ۔ دونوں حضرات دارالعلوم کی خصوصیات اور اس کے امتیاز کے محافظ و امین اور درس میں اس اختصاصی پہلو کے ترجمان و محافظ تھے ، جو وراثۃً اپنے اکابر سے پہنچا تھا ، مولانا فخر الدین صاحب حضرت شیخ الہند اور سید نا الامام کشمیری کے براہ راست شاگرد تھے ، اور جناب مولانا بلیاوی صاحب حضرت شیخ الہند کے حلقہ درس کے مستفید مولانا مراد آبادی مرحوم کے درس میں بسط و تفصیل ، ماحصل طلبہ میں پیش کر دینے کی عادت تھی ، مولانا بلیاوی بھی اسی ذوق کے حامل تھے ، افسوس کہ جب یہ دونوں حضرات اس کائنات علم و فن سے جدا ہوئے تو علم کا وقار ، دین و دانش کی آبرو ، وجاہت علمی اور فضل و کمال بھی جنازوں کے ساتھ رخصت ہو گیا اور ایک عظیم خلا پیدا ہو گیا ، اس کمی کی تلافی ہو سکے ، یہ چشم پرنم بھی آنسو روشن میں آج بھی نمایاں اور ایک حسرت گرا جس کی تہہ میں کے لیے بے قرار ہیں ــ

کا اختتام ہو گیا ۔ ۳۰ سال سے زائد اس واقعے پر گزر رہے ہیں ، مگر ان حسین یادوں سے دل و دماغ آج تک لبریز ہیں ۔ سر پر عربی سبز رومال ، عبا زیب تن ، پاؤں میں جنبش ، چوڑا چکلا جسم ، وجیہ چہرہ ، گھنی ڈاڑھی ، پر نور و پر ہیبت آنکھیں ، جب معروف کلام ہوتے ، تو حقیقۃً المتبحر فی الحدیث چلتا پھرتا نظر آتا ، اسی سے متجاوز سن مبارک تھا ، مگر بینائی استعداد و طاقت و رکردات کا درس قسطلانی ، مطبوعہ مصر میں ہوتا ، اور کسی چشمے کی مدد کے بغیر ــ وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

تمت بالخیر ــ

سید محبوب رضوی

دارالعلوم دیوبند ایک نظر میں

دارالعلوم دیوبند کی شاندار اور پرشکوہ عمارات کا دلکش تحریری مرقع جسے پڑھ کر دارالعلوم کا سماں نظروں میں پھرنے لگتا ہے

شاد باش و شاد زی اے سرزمینِ دیوبند　　ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

اگرچہ تاریخ کے اس دور کا صحیح تعین ممکن نہیں ہے مگر پہلے زمانے میں اساتذہ درختوں کے سائے میں بیٹھ کر درس دیتے تھے اور طلبا فرشِ زمین پر بیٹھ کر تحصیلِ علم کرتے تھے، یہی سادہ طریقہ تعلیم کا طغرائے امتیاز تھا لیکن یورپ کی تعلیم اب ڈیپ لکھنے والے نظری طور پر یہ جاننے کے مزید شائق ہوتے ہیں کہ اس تعلیم کا نقشہ کیا ہے اور اس کا جغرافیہ کس طرح واقع ہوا ہے، یہ تو ظاہر ہے کہ محض الفاظ کے ذریعے زمین کی اصل ہیئت اور ان کے خد و خال کی تصویر پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ تاہم ہر قلم نے بازدید لے کر پیش نظر ایسے کی اس خاکہ کے ذریعے دارالعلوم دیوبند کے بارے میں اگر تفصیلاً نہیں تو اجمالاً کچھ نہ کچھ اندازہ آپ کو ضرور ہو جائے گا۔ — مدیر

ناردرن ریلوے اسٹیشن کو شہر سے ملانے والی سڑک کے آخری سرے پر دیوبند کی آبادی کے شمال مغرب میں دارالعلوم دیوبند کی سادہ مگر پرشکوہ قلعہ نما عمارت وسیع قطعۂ زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔

مسجد دارالعلوم

دارالعلوم میں آنے کے لیے آپ سب سے پہلے دارالعلوم کے مشرقی دروازے میں داخل ہوں گے، یہاں پہنچتے ہی داہنی جانب دارالعلوم کی شاندار دو منزلہ خوشنما مسجد ملتی ہے، مسجد کی روکار اور منار سنگِ خارا سے بنے ہوئے ہیں، ان پر نہایت دل آویز نقش و نگار کندہ ہیں۔ صحنِ مسجد میں سنگِ مرمر کا خوبصورت مربع حوض ہے، جو ہر وقت شفاف پانی سے لبریز رہتا ہے، وسطِ حوض میں فوارہ لگا ہوا ہے، جس میں بجلی کے ذریعے سے پانی آتا ہے ۱۳۲۷ھ / ۱۹۱۰ء میں وقت کے منتخب علماء و صلحاء نے مسجد کی بنیادیں خود اپنے مبارک ہاتھوں سے تعمیر کی تھیں۔

یہاں پنجگانہ اوقات میں نمازیوں کی کثرت اور ہجوم کو دیکھ کر جمعہ و عیدین کا منظر نظر آتا ہے، لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان کا سماں عجیب کیف آور ہوتا ہے، روکار کی پیشانی پر سنگِ مرمر کا کتبہ نصب ہے جس میں مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں۔

در مدرسہ مسجدے بنا شد　　ایں مژدہ ز دوستاں شنیدم

بر لوحِ جبینش اسمِ اعظم　　خواندم چو بصحنِ او رسیدم

در سجدۂ شکر چوں فتادم　　در گوش رسید ایں شنیدم

مقرون شدہ عبادت و علم　　در مدرسہ خانقاہ دیدم

۱۳۲۸ھ　　۱۳۲۸ھ

یہ مسجد دو منزلہ ہے، بالائی منزل ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء میں تعمیر ہوئی ہے۔

دارالشفاء

مسجد کے جنوب اور مشرق میں دارالشفاء واقع ہے۔ یہاں مریض طلبا اپنے مرض کی تشخیص اور نسخہ تجویز کرا کر ایسے عطار خانوں سے دوائیں لیتے ہیں، جو دارالعلوم کی جانب سے طلبا کے لیے مقرر ہیں، امسال اس شعبے میں خاص ترقی ہوئی ہے اور دارالشفا کے نام سے مخصوص کمرے، بستروں اور تیمارداروں کا بھی مناسب انتظام کیا گیا ہے، جس میں ضروری مرکبات اور پٹینٹ ادویہ کا ذخیرہ محفوظ رکھا جاتا ہے۔

سال گزشتہ ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء میں مجموعی طور پر ۲۲۵۹ مریض طلبا اس شعبے میں زیر علاج رہے۔ ان کے معالجے پر ۸۲۱ روپے ۱۲ آنے پائی صرف ہوئے، گویا فی مریض ۶ آنے سے بھی کم کا اوسط ہے، مولانا حکیم محمد عمر صاحب اس شعبے کی تعلیمی اور معالجاتی خدمات انجام دیتے ہیں، خواہش مند طلبا کو باقاعدہ فن طب کی تعلیم بھی دی جاتی ہے، طبیب صاحب کی زیر نگرانی دو کارکن مقرر ہیں، دارالشفا کا کام ابھی تک عارضی کمروں سے لیا جا رہا ہے، اس کے لیے مستقل عمارت ارباب خیر کی فیاضی کی منتظر ہے۔

دارالافتاء

مسجد کی مشرقی جانب وہ سامنے بالائی منزل پر دارالافتاء کی جدید شاندار عمارت واقع ہے، یہ تین وسیع کمروں اور ایک کشادہ دالان پر مشتمل ہے۔ اس دارالافتاء سے ہندوستان و پاکستان کے ہزاروں مسلمان ہر سال خط و کتابت کے ذریعے شرعی مسائل میں رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ صرف ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء سے ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء تک دارالافتاء سے جو فتوے دیئے گئے، ان کی تعداد ۱۰۱،۱۴۷ ہے۔ یہ عمارت ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء کی تعمیر ہے۔

حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب اور جناب مولانا قاضی مسعود احمد اور جناب مولانا سید احمد علی صاحب سعید افتاء کی ترتیب کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ نقل فتاویٰ کے لیے تین محرر مامور ہیں۔

مہمان خانہ

مسجد کے جنوبی گوشے میں دوسری منزل پر مہمان خانہ واقع ہے جو دارالعلوم کے مہمانوں کے لیے ہر وقت کھلا رہتا ہے یہاں ایک خادم مامور ہے، جو مہمانوں کی خدمات انجام دیتا ہے۔

دفتر تنظیم

مہمان خانے کے برابر ہی یہ شعبہ تنظیم ترقی کا دفتر ہے۔ اس شعبے کا مقصد دارالعلوم کی مالیات کو تقویت پہنچانا ہے۔ سال گزشتہ ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء میں شعبہ تنظیم کے ذریعے سے دارالعلوم کو تقریباً ایک لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی ہے پچھلے دو سال سے دارالعلوم کے طلبا و ملازمین کی سال بھر کی خوراک کے لیے قریبی مقامات سے پانچ چھ ہزار من غلہ کی فراہمی بھی اسی شعبے سے متعلق ہے۔

شعبہ تنظیم میں ۱۹ سفیر مامور ہیں جو ملک کے گوشے گوشے میں دورے کر کے اپنے مقصد کی اشاعت کرتے ہیں اور کم و بیش ہر جگہ سے انہیں مالی یا اخلاقی امداد ملتی ہے، ہر سفیر کے لیے سال بھر میں کم از کم ڈھائی ہزار روپے کی فراہمی اور دو سو دن سفر میں گزارنا لازمی ہے مولانا محمود احمد صاحب گنگوہی اس شعبے کے ناظم ہیں اور سفراء کی مذکورہ تعداد کے علاوہ دفتری خدمات کے لیے تین محرر اور ایک چپراسی ہے۔

دفتر امور متفرقات

مسجد دارالعلوم سے آگے بڑھنے پر صدر دروازے کے متصل ہی بائیں جانب آپ کو امور متفرقات کا دفتر ملے گا، دارالعلوم کی روشنی، آب رسانی، دربانی اور باغبانی کا کام بھی اسی شعبے سے متعلق ہے۔ ان امور کے علاوہ دارالعلوم کے معاون

کے استقبال اور پذیرائی کے فرائض بھی یہی شعبہ انجام دیتا ہے، پیرجی محمد عمر صاحب گنگوہی اس شعبے کے ناظم ہیں، ان کے تحت متعدد کارکن متعلقہ خدمات پر مامور ہیں۔

دفترِ محاسبی

دفتر اہتمام متعلقات کے اوپر صحن مسجد کے بالمقابل بائیں جانب یہ شعبۂ محاسبی کا دفتر ہے۔ اس کا خوبصورت چبوترہ دیکھنے والے کو فوراً اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ دارالعلوم کی جملہ آمد و صرف کا تعلق اسی شعبے سے ہے۔ سال رواں ۷۲-۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم کے مصارف کی تعداد ۲،۸۰،۱۵،۴ روپے ۹ آنے ۶ پائی ہے۔ دارالعلوم کے یہ عظیم الشان مصارف عام چندے کے ذریعے پورے ہوتے ہیں، اس سلسلے میں حکومت سے امداد لینا دارالعلوم کی روایات کے خلاف سمجھا گیا ہے۔

وہ دیکھئے دارالعلوم کا خزانہ بھی اسی دفتر کے مشرقی گوشے میں واقع ہے جس پر مضبوط آہنی سلاخوں کے کواڑ لگے ہوئے ہیں۔

دفتر کے محاسبی اندراجات مروجہ حسابی طریق کے مطابق نہایت واضح اور صاف رکھے جاتے ہیں اور جانچ و پڑتال کے لیے اس کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا رہتا ہے، دفتر محاسبی کے حسابات کی عمدگی کو تقریباً ہر وارد و صادر نے سراہا ہے، ایک مرتبہ کانپور کے مشہور تاجر حافظ محمد حلیم صاحب نے اپنے معائنے میں لکھا تھا کہ،

> "مدرسہ کا حساب نہایت اطمینان بخش ہے، اندراج جمع و خرچ باقاعدہ ہوتا ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ معطی کا عطیہ اس کے حسب منشا مصارف میں خرچ کیا جاتا ہے۔"

طلبا کے وظائف اور ان کے کپڑے کی تقسیم کا کام بھی اسی شعبے سے متعلق ہے۔ دارالعلوم میں مفت تعلیم کا انتظام ہونے کے ساتھ ساتھ مرغوب اور حاجت مند طلبہ کو کھانے کے علاوہ پہننے کے لیے کپڑے، جوتے اور دوسری ضروریات کی تکمیل کے لیے نقد وظائف بھی دیئے جاتے ہیں۔ اس سال ۷۲-۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۳ء میں دارالعلوم سے امداد پانے والے طلبا چھ سات سو کے درمیان میں ہیں۔ علی العموم فی کس مصارف طعام کا اوسط دس بارہ روپیہ ماہانہ رہتا ہے۔ دفتر محاسبی میں آٹھ کارکن کام کرتے ہیں، شعبے کے ناظم مولوی عبدالاحد صاحب ایک تجربہ کار محاسب ہیں، ان کو دارالعلوم کا سالانہ بجٹ تیار کرنے میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ دارالعلوم کے اوقاف کی نگرانی بھی شعبہ کرتا ہے۔

شعبۂ تعمیرات کا دفتر بھی اسی شعبے میں واقع ہے۔ شعبۂ تعمیر میں بابو رفیق احمد صاحب سب اوورسیر مع ایک ماتحت ملازم کے مامور ہیں۔ دفتر محاسبی کی یہ عمارت ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء میں تعمیر ہوئی ہے۔

محافظ خانہ

دفتر محاسبی سے آگے بڑھنے پر آپ کو بالائی منزل ہی پر محافظ خانہ کی دو منزلہ عمارت ملے گی۔ یہاں دارالعلوم کی قیمتی دستاویزات اور تمام شعبوں کے اہم کاغذات نہایت مرتب طریق پر محفوظ رکھے جاتے ہیں اور دارالعلوم کے آغاز قیام ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۶ء سے اب تک ۹۰ سال کا تاریخی سرمایہ نہایت احتیاط اور ترتیب کے ساتھ رکھا ہوا ہے، یہاں آپ کو الماریوں میں مختلف رنگ نظر آئیں گے۔ دارالعلوم میں ۱۸ شعبے ہیں، ہر شعبے کے کاغذات کے لیے ایک رنگ خاص کر دیا گیا ہے۔ ان مختلف رنگوں کی وجہ سے ہر شعبے کے کاغذات بآسانی پہچانے جا سکتے ہیں۔ یہ عمارت ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۷ء کی تعمیر ہے۔ محافظ خانہ کی خدمات راقم السطور سے متعلق ہیں۔

ادارۂ اہتمام

مسجد میں جس زینے سے آپ داخل ہوئے تھے، اسی زینے میں ایک دوسرا زینہ ہے، ادارۂ اہتمام میں جانے کا

یہی راستہ ہے۔ ادارہ اہتمام دارالعلوم کا وہ مرکزی مقام ہے جس سے پورے دارالعلوم کا انتظام و انصرام وابستہ ہے۔ صدر دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر دوسرا دروازہ ہے۔ ادارہ اہتمام کی شاندار اور وسیع عمارت اسی دروازے کے اوپر واقع ہے۔ جائے عجیب غریب" ۱۳۱۵ھ / اس کی تعمیر کا مادۂ تاریخ ہے۔ ادارہ اہتمام کی عمارت تین کمروں پر مشتمل ہے۔

فخر الاماثل حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ مسند اہتمام پر اور حضرت مولانا سید مبارک علی صاحب نیابت اہتمام پر رونق افروز ہیں۔ مولانا عبدالحق صاحب غازی پوری حضرات ممدوحین کی پیش کاری کے فرائض اپنے ماتحت عملے کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

ماہنامہ دارالعلوم

ادارۂ اہتمام کے شمال میں ماہنامہ دارالعلوم کا دفتر ہے۔ یہ ماہنامہ دارالعلوم کی آواز اور اس کے مسلک کا ترجمان ہے، جو حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کی نگرانی اور صاحبزادہ سید محمد ازہر شاہ صاحب قیصر کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ مجلہ "دارالعلوم" اپنے علمی دینی اور اصلاحی مضامین کے ذریعے عامۂ مسلمین کی زبردست خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہ ماہنامہ اپنے معنوی محاسن کے ساتھ کتابت و طباعت کے لحاظ سے بھی اردو کے بلند پایہ پرچوں میں شمار کیا جاتا ہے، اس کا مختصر سا دفتر تین کارکنوں پر مشتمل ہے۔

شعبۂ دارالاقامہ

یہ شعبہ آٹھ (۸) وسیع احاطوں اور دو سو بیس کمروں پر مشتمل ہے، ہر کمرے میں اس کی وسعت کے لحاظ سے طلبا کو رکھا جاتا ہے، کم و بیش سات آٹھ سو طلبا اس دارالاقامہ میں ہر سال مقیم رہتے ہیں، یہاں ایشیا کے تقریباً ہر ملک کے طالبانِ علم آپ کو نظر آئیں گے جو اپنی اپنی زبان بولتے ہوئے ملیں گے، ہندوستان و پاکستان کے علاوہ، کابل، ایران، وسط ایشیا، چین، برما، سیلون، سیام، ہند چینی، ملایا، انڈونیشیا اور جنوبی افریقہ، وغیرہ ممالک کے مختلف رنگ و نسل اور شکل و صورت اور وضع قطع کے لوگوں کا اجتماع ایشیائی مسلم ممالک کی تہذیب و تمدن کا ایک ایسا گلدستہ یہ دارالاقامہ پیش کرتا ہے جو اپنی بوقلمونی اور ندرت کے اعتبار سے بڑی دلچسپی سے دیکھا جاتا ہے، اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس درسگاہ کی کشش نے اپنے گلشن میں کیسے کیسے گل بوٹے جمع کر لیے ہیں۔ اس لیے احاطۂ دارالعلوم کو اگر ایک ایسے علمی اور بین الاقوامی شہر سے تعبیر کیا جائے، جو تمام ایشیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تو قطعاً مبالغہ نہ ہوگا۔

ایک بڑے سرکاری افسر نے اپنے معائنۂ دارالعلوم میں لکھا ہے:

> "مجھے اس تعلیم گاہ کے طلبہ سے ملنے کا اکثر موقع ملتا ہے اور کبھی کبھی مختلف بحثوں پر ان سے گفتگو بھی کرتا ہوں، ان میں غیر معمولی قوت مناظرہ ہوتی ہے اور ہندوستان کے گریجویٹوں کی قوت مناظرہ سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔"

دارالاقامہ کے دفتر کا فریضہ یہ ہے کہ وہ طلبا کے قیام کے لیے کمروں کی تجویز و تعیین کرے۔ اور ان کے اخلاقی امور کی نگرانی رکھے، اس کام کے لیے متعدد اساتذہ منتخب کر لیے جاتے ہیں، جو ایک دفتری محرر کے ذریعے یہ فرائض انجام دیتے ہیں۔ احاطہ ہائے دارالعلوم کی شب و روز کی نگرانی کے لیے دس افراد دربانی و چوکیداری کی خدمت پر مامور ہیں۔

شعبۂ تعلیمات

دفتر دارالاقامہ سے آگے بڑھ کر مغرب کی جانب آپ کو دفتر تعلیمات نظر آئے گا، اس شعبے میں آپ فاضل اساتذہ کو صرف و نحو، معانی، عروض، ادب، تاریخ، منطق، فلسفہ، ہندسہ، ہیئت، تجوید و قرأت، طب، مناظرہ، عقائد، کلام، اصول فقہ، فقہ، فرائض

مشتمل حدیث، حدیث، مشتمل تفسیر اور تفسیر وغیرہ علوم کی ۱۰۹ کتابوں کی طلبا کو تعلیم دیتے ہوئے مصروف پائیں گے، یہ اساتذہ بفضلہٖ بدست علم و فضل اور تجربہ کے باوجود نہایت معمولی مشاہروں پر خلوص و ایثار کے ساتھ علم دین کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہیں اور اپنے کام کو فرض شناسی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں، علمائے معاصر مصر کے ایک وفد نے جو ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۷ء میں دیوبند آیا تھا۔ اساتذہ دارالعلوم کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"یہاں ہم نے ایک ایسی جماعت کی زیارت کی جس نے اپنی زندگی تفسیر قرآن، حدیث، فقہ اور اصول وغیرہ علوم دینیہ کے لیے وقف کردی ہے۔ یہاں کے اساتذہ سے مذاکرۂ علمی کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ خدمت علوم میں انہیں کامل دسترس اور زبردست مہارت حاصل ہے۔"

ان حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب، مولانا بشیر احمد صاحب، مولانا سید فخر الحسن صاحب، مولانا ظہور احمد صاحب، مولانا محمد جلیل صاحب، مولانا سید اختر حسین صاحب، مولانا عبد الاحد صاحب، مولانا سراج الحق صاحب، مولانا سید حسن صاحب، مولانا محمد حسین صاحب، مولانا محمد نعیم صاحب، مولانا نصیر احمد خاں صاحب، مولانا قاری اصغر علی صاحب، مولانا سعید احمد صاحب، مولانا محمد عرشان صاحب، مولانا محمد ہارون صاحب، مولانا محمد سالم صاحب، مولانا محمد اسعد صاحب، مولانا فیض علی شاہ صاحب، مولانا محمد انظر شاہ صاحب، قاری حفظ الرحمٰن صاحب، قاری محمد عتیق صاحب، قاری جلیل الرحمٰن صاحب عثمانی، قاری احمد میاں صاحب:

مذکورہ اساتذہ کے علاوہ شعبۂ تعلیمات سے متعلق دفتری امور کی انجام دہی، طلبا کی حاضری و غیر حاضری کے رجسٹروں کی ترتیب سہ ماہی ششماہی اور سالانہ امتحانات کے نتائج کا اندراج، طلبا کے سرپرستوں کو طلبا کے تعلیمی نتائج اور اخلاقی حالات سے باخبر رکھنا اور داخلہ وغیرہ امور دفتر تعلیمات کے فرائض ہیں۔ نظامت تعلیمات میں ۶ کارکن متعلقہ خدمات انجام دیتے ہیں، صدر المدرسین عموماً اس شعبے کے ناظم ہوتے ہیں، اور نائب صدر مدرس، نائب ناظم، اس وقت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہٗ صدارت تدریس و نظامت تعلیمات اور حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب نیابت کی مسند پر رونق افروز ہیں۔ منشی محمد عزیز صاحب دفتر تعلیمات کے نگران ہیں۔

اب آئیے! ذرا ایک سرسری نظر امسال کے زیر تعلیم طلبا کے اجتماع پر بھی ڈال لیجئے۔ اگرچہ انقلاب زمانہ سے اس کی سابقہ حالت بہت کچھ بدل گئی ہے۔ ہند و پاکستان کے درمیان پاسپورٹ سسٹم کی وجہ سے طلبا کی آمد و رفت میں پہلی سی سہولت باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن پھر بھی ہر طرح کی دقتوں اور دشواریوں کے باوجود یہ چشمۂ فیض اپنی خصوصیات کے ساتھ تشنگان علم کی ایک بڑی تعداد کو سیراب کر رہا ہے۔

بیرون ہند

پاکستان (مشرقی و مغربی)	۲۰۳	کشمیر (پاکستان)	۲
بدخشان	۲	نیپال	۲
برما	۲۰	انڈوچائنا	۱

قندھار	۲	جنوبی افریقہ	۲
ختن	۲	انڈونیشیا و ملایا	۸
کابل	۱	سیلون	۲

کل میزان ——— ۲۵۸

ہند

مغربی بنگال	۹۱	بمبئی	۴۱
آسام	۱۵۲	ریاستہائے ہند	۲۶
بہار	۱۴۴	مشرقی پنجاب دہلی	۷
مدراس	۴	اترپردیش	۴۹۸
برار	۱		

کل میزان ——— ۹۳۵

ان طلباء کی تعلیمی تقسیم یہ ہے:

عربی	۸۹۴	حفظ قرآن	۶۱
فارسی	۱۰۲	ناظرہ قرآن شریف	۸۹
قرأت و تجوید	۴۷		

کل میزان ——— ۱۱۹۳

احاطۂ مولسری

ادارۂ اہتمام کے زیریں دروازے سے گزرنے پر احاطۂ مولسری آتا ہے، جس میں مولسری کے کھڑے ہوئے دو درخت اس احاطے کی وجہ تسمیہ کا پتہ دیتے ہیں، اسی احاطے میں وہ کنواں ہے، جو دارالعلوم کی ابتدائی تعمیر کے وقت بنا تھا یہ کنواں دارالعلوم میں بڑا بابرکت سمجھا جاتا ہے — دارالعلوم کے دوسرے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ جو ایک صاحب حال بزرگ اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اجلۂ خلفاء میں سے تھے، اُن کے زمانۂ اہتمام میں یہ کنواں تعمیر ہوا تھا، انہوں نے خواب میں دیکھا کہ:

"کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیالے سے دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔ بعض لوگوں کے پاس چھوٹے برتن ہیں اور بعض کے پاس بڑے، ہر شخص اپنا اپنا برتن دودھ سے بھروا کے جا رہا ہے۔"

مولانا نے برتنوں کے چھوٹے اور بڑے کے فرق کی یہ تعبیر فرمائی کہ:

"اس سے ہر شخص کا ظرف علم مراد ہے جس کا جتنا ظرف ہے، اسی قدر علم اس کے نصیب حصے میں آئے گا۔"

احاطۂ مولسری کے ہر چہار سمت میں درسگاہیں اور دارالاقامے واقع ہیں۔

نودرہ

احاطۂ مولسری کی مغربی جانب نودرہ کی وہ مشہور عمارت ہے، جو اپنی مضبوطی اور پرکاری میں دیکھنے والے کو محو حیرت کیے بغیر نہیں رہتی، دارالعلوم کی یہ سب سے قدیم درسگاہ اور سب سے پہلی عمارت ہے ۱۲۹۲ھ/۱۸۶۷ء کے اواخر میں قیام دارالعلوم کے دس سال بعد اس کی بنیاد رکھی گئی اور ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۷ء سے تعمیر شروع ہوئی، اس کا سنگ بنیاد حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ، قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، حضرت حاجی عابد حسین صاحب اور حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کاندھلوی جیسے علماء و صلحاء اور مشائخ وقت کا رکھا ہوا ہے، اس وقت دیوبند کے اطراف و جوانب کا بہت بڑا مجمع موجود تھا، سب لوگوں نے نہایت خشوع و خضوع اور الحاح و زاری کے ساتھ

دارالعلوم کے لیے وہ جو اپنی فکر کی وسعت میں سب ملک سے کہیں آگے تھا، جس کی
حضرت نانوتوی قدس سرہ نے فرمایا:

• عالم مثال میں اس مدرسہ کی شکل ایک معلق ہانڈی کے
مانند ہے جب تک اس کا مدار توکل علی اللہ پر رہے گا
یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا۔

"اشرف عمارات" (۱۲۹۳ھ) اس کی تعمیر ازدہ قدیم ہے، نودرہ کے دو درجے ہیں اور ہر ایک درجے میں ۹۔۹ دروازے ہیں۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ جن کے زمانۂ اہتمام میں نودرہ تعمیر ہوا تحریر فرماتے ہیں:

• اس میں سادگی اور استواری کو مقدم رکھا گیا
ہے، اس کا نقشہ منجانب اللہ قلب میں الہام ہوا تھا"

احاطۂ مولسری کی تعمیر کے وقت مولانا رفیع الدین صاحبؒ ہی نے یہ خواب دیکھا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم احاطۂ مولسری میں تشریف رکھتے ہیں اور یہ فرما رہے ہیں کہ "احاطہ تو بہت مختصر ہے" یہ فرما کر خود عصائے مبارک سے احاطہ کا طول و عرض نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ "ان نشانات پر تعمیر کی جائے" مولانا نے صبح اٹھ کر دیکھا تو نشانات موجود تھے، چنانچہ ان ہی نشانات پر بنیاد کھدوا کر تعمیر شروع کرا دی گئی۔

ہمارے شاعرِ انقلاب انور صابری صاحب نے اپنے اِن شعروں میں اسی واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔ ؎

خواب میں جس کے بشیر تھے شفیع دوجہاںؐ
نودرہ اس خوابِ ماضی کی حسیں تعبیر ہے
اس کے دامن سے اُبلتے ہیں وہ چشمے فیض کے
جن کا حاصل زندگی کی آخری تفسیر ہے

احاطۂ باغ — احاطۂ مولسری کے شمال میں چند کمروں پر مشتمل یہ وہ مختصر سا خوبصورت دارالاقامہ ہے، جس میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و سیاسی تلمیذ رشید اور مشہور انقلابی رہنما مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا قیام رہا، آزادیٔ ہند کی کشمکش کا یہی وہ تاریخی مقام ہے جہاں سے پہلی جنگ عظیم کے دوران میں مشہور "ریشمی خطوط" کی تحریک جاری ہوئی تھی

دارالحدیث — جس طرح دارالعلوم کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ ہندوستان بھر میں یہ پہلی درسگاہ ہے، جو اسلامی علوم کے عین زوال کے وقت قائم ہوئی، اسی طرح اس کو یہ تقدم و فضیلت بھی حاصل ہے کہ دارالعلوم کا دارالحدیث ہندوستان بھر میں پہلی عمارت ہے جو اس خاص نام سے عالمِ وجود میں آئی۔ نودرہ جس کو ابھی ابھی آپ نے دیکھا ہے، اس کی بالائی منزل اور پشت پر دارالحدیث کی یہ طویل و عریض سربلند عمارت واقع ہے۔ یہ عمارت دو حصوں پر منقسم ہے، نودرہ کی پشت پر جو عمارت ہے، قدیم دارالحدیث یہی ہے، مگر آج کل اس میں درس کی بجائے دوسری مختلف جماعتیں پڑھتی ہیں۔ دارالحدیث کے گرد و پیش ۱۲ کمرے ہیں جو درسگاہوں کے کام میں آتے ہیں۔ دارالحدیث کا طول ۹۰ فٹ اور عرض ۲۵ فٹ ہے، اس کی رو کار مغرب کی جانب ہے، دارالحدیث کی بنیاد طلبہ نے باصرار مزدوروں کے بجائے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ والہانہ انداز میں خود کھودی ہے، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق اس وقت جس قدر لوگ موجود تھے سب نے اپنے اپنے ہاتھوں سے دو دو اینٹیں رکھی ہیں، یہ عمارت ۱۹ سال کی طویل مدت میں مکمل ہوئی ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۱ء میں اس کی ابتدا ہوئی اور ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء میں تکمیل، دوسرا دارالحدیث ہے جو نودرہ کے اوپر واقع ہے۔ یہ عمارت ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء کی تعمیر ہے یہ بھی نہایت کشادہ اور وسیع ہال ہے، دارالعلوم کے بڑے بڑے جلسے عموماً ان ہی دونوں

ہاں میں منعقد ہوتے ہیں

دار التفسیر

قدیم دار الحدیث کے اُوپر یہ دار التفسیر کی مربع عمارت ہے۔ یہ طول و عرض میں ۳۰ × ۳۰ فٹ ہے، اسی کے اُوپر وہ نہایت پرشکوہ گنبد بنا ہوا ہے، جو دُور دُور سے نظر آتا ہے اور اپنی رفعت و عظمت، بلندی اور حسنِ تعمیر کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دار العلوم کے سر پر تاج رکھا ہوا ہے۔ دار التفسیر ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء کی تعمیر ہے، دار الحدیث و دار التفسیر کی یہ سر بفلک عمارت بہ ہیئتِ مجموعی اس قدر عظیم الشان اور پُرشوکت ہے کہ دیکھنے والا غرقِ حیرت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اس کا آسمان سے باتیں کرنے والا گنبد میلوں سے نظر آتا ہے۔

دارِ جدید

دار الحدیث کے سامنے جدید دار الاقامہ ہے۔ یہ بڑے بڑے کمروں پر مشتمل ہے، دارِ جدید کے کمروں کا سلسلہ دار الحدیث کی شمال جانب سے شروع ہو کر مستطیل شکل میں مغرب سے گزرتا ہوا جنوبی سمت تک چلا گیا ہے، کمرے وسیع اور کشادہ ہیں اور سب کے سامنے برآمدے ہیں، اس احاطے کے شمال و جنوب اور مغرب میں تین دروازے ہیں۔ یہ مغربی دروازہ جو عین دار الحدیث کے مقابل ہے "باب الظاہر" کے نام سے موسوم ہے، دارِ جدید کا یہ احاطہ دار العلوم کا سب سے زیادہ پُر فضا مقام ہے۔ یہ کئی ایکڑ زمین کا نہایت وسیع صحن ہے جس کی تینوں سمتوں میں اقامت خانے اور مشرقی جانب دار الحدیث ہے۔ دارِ جدید میں دو کشادہ سڑکیں ہیں۔ ایک دار الحدیث سے شروع ہو کر "باب الظاہر" اور شہر سے گزرتی ہوئی ریلوے روڈ سے جا ملتی ہے اور دُوسری سڑک شمالی دروازے سے نکل کر جنوبی دروازے میں گم ہو جاتی ہے۔ ان سڑکوں نے دارِ جدید کے احاطہ کو چار قطعوں میں تقسیم کر دیا ہے، ان قطعوں میں رنگ رنگ کے پُر بہار اور جاذبِ نظر پھول دار درختوں کی چمن بندی کی گئی ہے جس نے منظر میں ایک ایسی دلکشی کی کیفیت پیدا کر دی ہے، جو ہر دیکھنے والے کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے، ہری بھری گھاس سے صحن کا یہ احاطہ نہایت پُر فضا اور خوش منظر نظر آتا ہے، یہاں اب رسالے کے پلاٹ کے علاوہ جا بجا ہر رنگ کے نل بھی لگائے گئے ہیں۔

باب الظاہر

یہ دارِ جدید کا صدر دروازہ ہے، یہ دروازہ دار الاہتمام کی ایک نہایت خوشنما اور عالیشان عمارت ہے ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء میں اس کی تعمیر ہوئی۔ باب الظاہر سابقہ تاجدارِ افغانستان اعلیٰ حضرت المتوکل علی اللہ محمد ظاہر شاہ کے گرانقدر شاہانہ عطیے اور دار العلوم سے وابستگی کی ایک ایسی یادگار ہے جو تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

شعبۂ کتابت

باب الظاہر کی بالائی منزل میں متعدد چھوٹے بڑے کمرے بنائے گئے ہیں، ان ہی میں سے چند کمروں میں شعبۂ کتابت کی تعلیم گاہیں قائم ہیں، دار العلوم میں تعلیم کے ساتھ ساتھ خط کی درستگی اور پاکیزگی کی جانب بھی خصوصی توجہ کی جاتی ہے، چنانچہ اس کے لیے چار ماہرینِ فن مامور ہیں جو طلبا کو نستعلیق اور نسخ دونوں خطوں کی تعلیم اور اصلاح دیتے ہیں طلبا کو مشقِ خط کا امتحان دینا ہوتا ہے، یہ ایک ایسا فن ہے، جو علمی بھی ہے اور طلبا کے لیے فراغتِ تعلیم کے بعد حصولِ معاش کا ایک اچھا ذریعہ بھی ہے مولانا اشتیاق احمد صاحب جو فنِ کتابت کے مسلّم استاد سمجھے جاتے ہیں شعبۂ کتابت کے صدر ہیں۔

دار القرآن

دارِ جدید کے جنوبی گوشے میں یہ دار القرآن کی عمارت ہے، جو کوروڈر نگلش کے مشہور تاجر الحاج فیروز الدین صاحب کی فیاضی اور خدمتِ قرآن کی یادگار ہے۔ یہ عمارت بھی اپنے نام کی ہندوستان میں سب سے پہلی عمارت ہے، جس میں مخصوص طور پر بچوں کو قرآن مجید کا ناظرہ

اور حفظ تعلیم دی جاتی ہے۔ اس میں ہر سال کم و بیش ڈیڑھ سو دو سو بچے قرآن مجید پڑھتے اور حفظ کرتے ہیں۔ دارالقرآن میں قرآن مجید کے ساتھ ساتھ بچوں کو اردو اور دینیات وغیرہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ۸ مدرس بچوں کی تعلیم پر مامور ہیں۔ دارالقرآن کے ۸ کشادہ کمرے ہیں ۱۳۷۰ھ/۱۹۴۹ء میں اس کی تعمیر ہوئی ہے۔

مطبخ دارِ جدید کے جنوبی گوشہ میں دارالقرآن ہے۔ اور مشرقی گوشہ میں مطبخ کی عمارت واقع ہے پہلے بتلایا جا چکا ہے کہ دارالعلوم میں چھ سات سو غریب اور نادار طلباء کو ہر سال مفت کھانا دیا جاتا ہے چنانچہ یہاں اُن کے لیے دونوں وقت کھانا پکتا اور تقسیم کیا جاتا ہے۔ ۱۳۲۰ھ/۱۹۱۱ء میں مطبخ قائم کیا گیا تھا، پہلے سال میں ۳۰ یا ۳۵ طلباء کا کھانا پکتا تھا، رفتہ رفتہ یہ تعداد بڑھتی گئی اور اب سات سو تک پہنچ گئی ہے۔ صرف ایک طباخ سے اس کی ابتداء ہوئی تھی، لیکن اب ۲۲ افراد کا عملہ اس کام میں لگا ہوا ہے۔ اور کم و بیش دس بارہ من آٹا یومیہ پکتا ہے۔ حافظ مظہر الحق صاحب اس شعبے کے ناظم ہیں اور دو محرر اُن کی اعانت کے لیے مقرر ہیں۔ مطبخ کی یہ عمارت دو حصوں پر منقسم ہے، ایک حصے میں اس کا دفتر ہے، دوسرے میں اجناس کا گودام ہے، تیسرے حصے میں نان کے تنور اور چپاتی کے چولھے ہیں چوتھے حصے میں سالن پکتا ہے اور پانچویں حصے میں سوختہ رکھا جاتا ہے کھانا تقسیم کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ ہر طالب علم کے پاس ایلومنیم کا ٹکٹ ہوتا ہے۔ یہ ٹکٹ صبح و شام کے لیے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں ٹکٹوں پر صبح و شام کے الفاظ کی صراحت کے علاوہ اختلافِ رنگ سے ان کو ممیز کر دیا گیا ٹکٹ پر نمبر کندہ ہوتا ہے اور ہر نمبر کے صبح و شام کے دو ٹکٹ ہوتے ہیں۔ کھانا پانے والے طلبا کے رجسٹر میں جس نمبر پر طالب علم کا نام درج ہوتا ہے، اور وہی نمبر اس کے ٹکٹ کا ہوتا ہے، تقسیم طعام کے کمرے کو کٹہرے لگا کر اس طرح بنایا گیا ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی آدمی کٹہرے سے گزر سکے۔ ایک طرف سے داخل ہونے کا راستہ ہے۔ اور دوسری طرف سے نکلنے کا۔ ٹکٹ داخل کرنے پر اگلے وقت کے لیے اسی نمبر کا دوسرا ٹکٹ دے دیا جاتا ہے آگے بڑھنے پر مہتمم طعام کھانا حوالے کر دیتا ہے، اسی طریق پر چھ سات سو طلبہ صرف گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں نہایت اطمینان اور سہولت کے ساتھ کھانا حاصل کر لیتے ہیں، ہر طالب علم کو ایک وقت میں دو تنوری روٹیاں دی جاتی ہیں جن کے خشک آٹے کا وزن ۲۲ تولے ہوتا ہے۔ شام کے کھانے میں گوشت پکتا ہے اور دوپہر کو دال دی جاتی ہے۔ مطبخ میں قیمتاً کھانا دینے کا بھی انتظام ہے۔ جس میں مذکورہ کھانے کے علاوہ دو ایک قسم کا کھانا بفرقِ مراتب پکتا ہے بیمار طلباء کے لیے پرہیزی کھانا بھی پکایا جاتا ہے۔

جمعیۃ الطلباء مطبخ سے شمال کی جانب یہ جمعیۃ الطلباء کا دفتر ہے۔ اس کے تین وسیع کمرے ہیں جمعیۃ الطلباء دارالعلوم کی ایک باضابطہ جماعت ہے اس کے ارکان بطریقِ انتخاب چنے جاتے ہیں۔ یہاں طلبہ جمع ہو کر تقریر و تحریر اور مناظرے وغیرہ کی مشق کرتے ہیں، تاکہ تبلیغ اور حق و صداقت کے پیغام کو پہنچانے کے طور طریق سے واقفیت حاصل کر سکیں یہاں کتابوں اور اخبارات و رسائل کے مطالعے کا بھی انتظام کیا گیا ہے، جمعیۃ الطلباء میں چند طلبہ کے علاوہ دو تنخواہ دار کارکن بھی مامور ہیں۔

شعبۂ تبلیغ جمعیۃ الطلباء کے ساتھ ہی شعبۂ تبلیغ قائم ہے اس شعبے نے مسلمانوں میں دینی روح بیدار اور اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کا زبردست کام انجام دیا ہے، آج ہندوستان و پاکستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں دارالعلوم کے مبلغین نے سینکڑوں لوگوں کو کلمۂ حق نہ سنایا ہو، بلکہ تمام علمی اور عوامی حلقوں نے اس شعبے کی کارگزاری کی ہمیشہ تعریف کی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ملک میں جہاں کہیں جلسے ہوتے ہیں ان میں عموماً دارالعلوم کے حضرات کو خصوصیت سے بلایا جاتا ہے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی

صدر المدرسین اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند بھی بحیثیت تبلیغی دورے فرماتے ہیں۔ اس شعبے میں باضابطہ طور پر چار مبلغ مامور ہیں مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی بی اے، مولانا سید نور الحسن صاحب ہاشمی مولانا سید سیف اللہ صاحب ہاشمی اور مولانا ارشاد احمد صاحب فیض آبادی۔

درجہ فارسی

جیسا کہ اطلاقات سے آگے بڑھ کر شمال ہی کی جانب یہ اُردو، فارسی اور ریاضی کے درجات ہیں، یہاں ابتدائی تعلیم کے ذریعے درجہ عربی کے لیے طلبا کو تیار کیا جاتا ہے، درجہ فارسی کا نصاب تعلیم ۵ سال کا ہے، آمد نامہ اور حمد باری سے لے کر سکندر نامہ، انوار سہیلی اور مثنوی مولانا روم تک فارسی پڑھائی جاتی ہے اور حساب، تحریر بہتہ سے لے کر اربعہ متناسبہ، مساحت اور مثلث تک پڑھایا جاتا ہے، اسی درجہ میں ہندوستان اور ایشیا کا جغرافیہ بھی شامل ہے، درجہ فارسی میں ۵ مدرسین ہیں، مولانا ظہیر احمد صاحب جھنجھانوی درجہ فارسی کے صدر مدرس ہیں۔ یہ عمارت یادگار سعدی کے نام سے موسوم ہے۔

دارالصنائع

درجہ فارسی سے ملحق ہی دارالصنائع کا شعبہ ہے، جس میں طلبہ کو جلد سازی، خیاطی، چرم دوزی، گھڑی سازی، بڑھئی اور پلاسٹک کی مختلف چیزیں بنانے کا کام سکھلایا جاتا ہے، مدارس دینیہ میں دارالعلوم کو جس چیز نے بے مثال بنا دیا ہے، وہ یہی شعبہ ہے دارالصنائع کا مقصد طلبا کو صنعتی تربیت دے کر حصولِ علم کے بعد کی زندگی میں بے روزگاری سے بچانا اور ان کے لیے آزاد ذرائع معاش کی راہیں کھولنا ہے، مولانا سیف اللہ صاحب جو اس شعبے کے نگران اعلیٰ ہیں، صنعتی کاموں سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

کتب خانہ

دارالصنائع اور مدرسہ ثانویہ کی بالائی منزل پر دارالعلوم کا عظیم الشان کتب خانہ واقع ہے جو ایک ہال اور چار کمروں پر مشتمل ہے، یہ کتب خانہ دارالعلوم کی جان اور ہندوستانی مسلمانوں کی علمی کا بے نظیر علمی سرمایہ ہے، اس میں دینی کتب کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے جس کی کسی دوسری جگہ مثال نہیں ملتی۔ کتب خانہ میں جب تک آپ گھنٹوں ٹھہر کر تفصیلی سیر نہ کریں اس وقت تک اس کا صحیح لطف نہیں اٹھا سکتے! یہاں ۷۰ ہزار سے اوپر کتابیں موجود ہیں۔ بیش بہا کتب کے اس عظیم الشان ذخیرے میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ مخطوطات (قلمی کتب) کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے، ان میں فن خطاطی کے لحاظ سے بعض مخطوطات بڑے عجیب و غریب ہیں، بعض کتابیں مختلف شاہی کتب خانوں کی زینت رہ چکی ہیں۔ اس لیے تاریخی اہمیت کی حامل ہیں، چند مخطوطات ایسے بھی ہیں جن کی نسبت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نقل آج دنیا کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں ہے، اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ یہ کتب خانہ ہندوستان کے بہترین کتب خانوں میں سے ایک ہے تو اس میں غالباً مبالغہ نہ ہوگا، بعض مخطوطات پر چھ چھ سو اور سات سات سو برس گزر چکے ہیں لیکن کاغذ اپنی حالت پر قائم ہے، سیاہی کا عالم یہ ہے کہ گویا ابھی لکھ کر اٹھایا ہے۔ کاغذ اور حسن تحریر دیکھنے کے لائق ہے۔ کیا مجال کہ سینکڑوں صفحات لکھنے پر خط کی یکسانیت اور سیاہی کے رنگ اور قلم میں ادنیٰ فرق پیدا ہو جائے۔ اگر تاریخی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو صاف محسوس ہوگا کہ کاغذ کی ساخت اور خط کی شان میں عہد بعہد ترقی ہوتی گئی ہے۔ ان کتابوں سے اسلامی ممالک کی تہذیب و تمدن اور علمی کاموں سے مسلمانوں کی دلچسپی اور شغف کا فی الجملہ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتابیں مختلف زبانوں کی ہیں اور گو بڑا ذخیرہ عربی، فارسی اور اُردو میں ہے، تاہم عبرانی، یونانی، ترکی، لاطینی، انگریزی، ہندی، گجراتی، سندھی، پنجابی، پشتو، تامل، سنسکرت اور بھاکا وغیرہ

مختلف زبانوں کی کتابیں ایک ہی جگہ پر بیٹھی ہوئی ہیں

یہاں عام مشرقی کتب خانوں کی طرح کتابوں کی تقسیم فنی اور ہے یعنی ایک فن و موضوع سے تعلق رکھنے والی تمام کتابیں خواہ وہ کسی زبان میں ہوں، اس فن کے تحت میں رکھی گئی ہیں۔ کتب خانہ بڑے بڑے اٹھائیس فنون پر منقسم ہے۔ کتب خانہ کی عمارت ناکافی ہونے کے باعث اکثر فنوں کو ان کے مناسب فنون کو شامل کر دینا پڑا ہے۔ مثلاً تاریخ میں محاضرات، سیر سیرت، مناقب، سفرنامے اور جغرافیہ وغیرہ مستقل فنون شامل ہیں۔

سیاسیات، معاشیات، اقتصادیات، نفسیات اور حکمت جدیدہ وغیرہ علوم علیحدہ علیحدہ ہونے کے بجائے علوم متفرقات کے ذیل میں رکھے گئے ہیں۔ یہاں بھی محافظ خانہ کی طرح ہر علم کے لیے ایک رنگ مخصوص کر دیا گیا ہے اور اسی رنگ کی اُبری اس علم کی کتابوں کی پشت پر لگائی جاتی ہے۔

اب ذرا فن وار کتب کا اعداد و شمار بھی سن لیجئے جن سے ہر ایک فن کی علیحدہ علیحدہ کتابوں کی تعداد معلوم ہوگی۔

فن	تعداد	فن	تعداد
۱۔ تفسیر و اصول تفسیر و علوم قرآن	۲۰۸۲	۱۲۔ اخلاق	۱۷۵
۲۔ تجوید و قرأت	۲۸۲	۱۳۔ وعظ	۹۲۳
۳۔ اوراد و وظائف	۲۸۲	۱۴۔ طب قدیم و طب جدید اور کیمیا وغیرہ	۷۰۸
۴۔ حدیث و اصول حدیث	۳۵۴۴	۱۵۔ فلسفہ	۲۹۴
۵۔ رجال	۲۷۸	۱۶۔ منطق	۹۰۳
۶۔ اصول فقہ	۲۹۸	۱۷۔ ہیئت	۵۴
۷۔ فقہ	۳۲۵۹	۱۸۔ ریاضی	۳۸۷
۸۔ فرائض	۲۹۲	۱۹۔ مناظرہ اور مذاہب	۵۱۶۴
۹۔ عقائد و کلام	۱۳۷۱	۲۰۔ صرف	۹۶۱
۱۰۔ تاریخ و جغرافیہ وغیرہ	۳۹۲۲	۲۱۔ نحو	۹۷۶
۱۱۔ تصوف	۲۱۲۲	۲۲۔ معانی و بیان	۱۵۶
۲۳۔ عروض	۹۱	۲۶۔ ادب فارسی	۱۲۵۲
۲۴۔ لغت	۹۰۵	۲۷۔ ادب اردو	۹۵۰
۲۵۔ ادب عربی	۱۲۵۹	۲۸۔ متفرقات	۳۹۶

کل میزان ——— ۳۲۱۹۸

یہ تعداد صرف بڑی بڑی کتب کی ہے، درسیات کی مجموعی تعداد ۲۰ ہزار کے قریب ہے۔ ہمارے قدیم نظام تعلیم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں طلبہ کے لیے زیر درس کتابوں کا مہیا کرنا بھی درسگاہ ہی کے ذمہ ہوتا ہے اسلیے ہر درسی کتاب کے نسخے اس جماعت کی تعداد کے مطابق موجود رکھے جاتے ہیں جگہ کی قلت اور کتابوں کی کثرت کی وجہ سے کتب خانے کے کمرے چونکہ ناکافی ہیں۔ اس لیے فرش سے چھت تک دیو ہیکل الماریاں لگائی گئی ہیں تاکہ ان میں زیادہ سے زیادہ کتابیں کھپائی جا سکیں لیکن اس کے باوجود بھی ہزاروں کتابوں کے لیے جگہ مہیا نہیں کی جا سکی اور یوں ہی فرش پر ان کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔

کتب خانہ کی عمارت کا آغاز ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء سے ہوتا ہے۔ اس وقت سے لے کر وقتاً فوقتاً حسب ضرورت چار کمرے اور تعمیر ہو چکے ہیں، مگر ابھی مزید دو تین کمروں کی ضرورت باقی ہے۔ مولانا سلطان الحق صاحب کتب خانے کے ناظم ہیں اور چار کارکنوں کا عملہ ان کے ماتحت کتب خانے کے نظم و نسق کو درست رکھنے اور کتابوں کی داد و ستد کے لیے مامور ہے

مسجد چھتہ دارالعلوم دیوبند کی سیر اس وقت تک نامکمل رہے گی جب تک آپ چھتہ کی مسجد کو نہ دیکھ لیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دارالعلوم کا آغاز بھی اسی جگہ سے ہوا تھا اور اس کی سیر بھی یہیں ختم ہوتی ہے۔ یہ مسجد احاطۂ دارالعلوم سے گو باہر ہے، مگر ہے بالکل اسی سے ملحق، اس کے لیے آپ کو کتب خانے سے مطبخ کی جانب لوٹنا پڑے گا جس کے جنوب و مشرق میں

یہ مسجد واقع ہے۔ یہ وہی تاریخی مسجد ہے، جس کے صحن میں آج سے ۱۰۹ سال قبل نہایت معمولی مکتب کی صورت میں دارالعلوم کا افتتاح عمل میں آیا تھا یہ مسجد ابتدا سے مشائخ و اکابر اہل اللہ کی قیام گاہ رہی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہاں حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے چلّہ کشی کی ہے۔ دیوبند کے مشہور بزرگ حاجی عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام بھی اسی مسجد میں رہتا تھا۔ دارالعلوم کے قیام کے بعد قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے اسی مسجد میں قیام پذیر رہے ہیں، غرضیکہ یہ مسجد دیوبند کے اکثر اہل اللہ کی جائے قیام اور سرچشمۂ فیض رہ چکی ہے، مسجد کے صحن میں انار کا وہ تاریخی درخت بھی اب تک کھڑا ہوا ہے جس کے سائے میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ نے ملا محمود صاحبؒ کے سامنے سب سے پہلے کتاب کھولی تھی۔

یہ مسجد ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی طرزِ تعمیر کا نہایت سادہ مگر پرشکوہ نمونہ ہے، لکھوری اینٹ، بغیر چونہ و پلاسٹر کی تعمیر ہے

اب آپ دارالعلوم کی سیر سے فارغ ہو چکے ہیں اور کوئی ایسا قابلِ ذکر مقام باقی نہیں رہا جس کو آپ دیکھ نہ چکے ہوں، اب اس مسجد کے بارے میں شاعرِ انقلاب انور صابری صاحب کے دو شعر بھی سن لیجئے!

مسجدِ چھتہ، وہ پہلی درسگاہِ علمِ دیں
جس جگہ محمودؒ نے محمودؒ پایا تھا مقام

قاسم الخیرات کے اس مرکزِ تبلیغ کا
آدمی تو کیا، فرشتے کر رہے ہیں احترام

دارالعلوم کی اس سیر سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس درسگاہ کے مبارک وجود پر ہند و پاکستان کے مسلمان جس قدر فخر و مسرت کا اظہار کریں اس کے درست اور حق بجانب ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دیوبند کی اس سرزمین میں اس دینی درسگاہ کا قیام ہند و پاک کے مسلمانوں کی ایک متحدہ اور مرکزی تحریک کا نتیجہ ہے، دین کی خدمت، اسلام کی تائید، اسلامی علوم و فنون کا احیاء اور ان کی نشر و اشاعت، علمِ دین کے شائق اور ہونہار طلبہ کی دستگیری اس درسگاہ کے مخصوص اور عظیم الشان کارنامے ہیں مگر دارالعلوم دیوبند کے حالات سے اب تک بہت کم لوگ واقف ہیں عدم شہرت کا پردہ اس وجہ سے اور بھی گہرا ہو گیا ہے کہ دارالعلوم نے اس طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ اس کے پیشِ نظر کام رہا ہے، نام نہیں، زوالِ بغداد کے بعد جس طرح قاہرہ (مصر) اسلامی علوم و فنون کا مرکز بنا، ٹھیک اسی طرح دہلی کے زوال کے بعد دیوبند کو علمی مرکزیت نصیب ہوئی اور بڑی بڑی علمی شخصیتیں اس سرزمین سے پیدا ہوئیں، چودہ پندرہ ہزار سے زائد علماء و فضلاء اس وقت تک اس درسگاہ کی آغوش میں تعلیم و تربیت میں پرورش پا چکے ہیں جنہوں نے نسیمِ بہار بن کر دارالعلوم کی علمی خوشبو کو چاردانگ عالم میں پھیلا دیا ہے ؎

کبھی جب ذکر آ جاتا ہے اُن کا
زباں دو دو پہر ہوتی نہیں بند

---

(۱)

لوگ کہتے ہیں:

بینا سارے، اندھا کوئی کوئی

میں کہتا ہوں:

اندھے سارے، بینا کوئی کوئی

(۲)

اللہ والوں کی جوتیوں میں وہ موتی ملتے ہیں، جو بادشاہوں کے تاجوں میں نہیں ہوتے۔

ماخوذ از ملفوظاتِ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ

یہ مضمون حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی کتاب [illegible] کی تحریرات سے ماخوذ و مستنبط ہے، اکثر جگہ فقرے بھی بزرگ حضرت قاری صاحب کے ہیں (مجاہد)

تیرھویں صدی آخری سانس لے رہی تھی، تو ہندوستان میں مسلمانوں کی شوکت کا چراغ گل ہو چکا تھا، صرف ہلکا ہلکا دھواں سا اٹھ رہا تھا جو چراغ کی نشاندہی کر رہا تھا۔ مغل حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی ساتھ مرکزیت ختم ہو گئی تھی اور مرکزیت کے خاتمے نے افراتفری اور ہر شعبہ حیات میں بے راہ روی اور پستی کو جنم دے دیا تھا۔ یہ زوال اور شعبوں میں جس طرح محسوس ہو رہا تھا۔ مذہب اور تعلیم کے معاملے میں اس کی حالت اور بھی زیادہ ناگفتہ بہ تھی۔ سرکاری حمایت اور پناہ کے خاتمے کی وجہ سے ہر طرح کی درسگاہوں کا حال روز بروز خراب ہوتا جا رہا تھا اور وہ آہستہ آہستہ بند ہوتی جا رہی تھیں۔ دینی درسگاہوں کا حال اور بھی خراب تھا جو ملک کے سہارے یہ تمام ادارے چلا کرتی ہیں اور ملک کی حالت نے عوام کو اس قابل ہی نہ چھوڑا تھا کہ سہارا دے سکیں۔

دینی درسگاہوں کے ابتلا میں سب سے زیادہ واقعہ اس امر کا تھا کہ عوام و خواص کے دل و دماغ سے دینی شعور رفتہ رفتہ ختم ہوتا چلا جا رہا تھا جہل و گمراہی کا دور دورہ تھا اور یہ جہالت کا راج ہر لمحہ دن کچھ زیادہ ہی مستحکم ہو رہا تھا۔ وہ زمانہ اب کہاں رہ گیا تھا کہ سنت پیغمبر یا حکم الٰہی کا اجرا ہو۔ اب قرآن کی بجائے جاہلانہ رسوم و رواج، شرک و بدعت اور ہوا و ہوس کا راج تھا۔ وہ روشنی جو مشرق کی خصوصیت تھی ختم ہو رہی تھی اس کی جگہ وہ آفتاب طلوع ہو رہا تھا جو مغربی تہذیب تمدن سے متعلق تھا جس کی کرنیں اپنی جلو میں دہریت، الحاد، فطرت پرستی نفس پروری لیے ہوئے تھیں۔ ان خواہشات نے نگاہوں کو خیرہ کر دیا تھا دلوں کو بے ذوق بنا دیا تھا۔ اب وہ انسان خال خال ہی نظر آتے تھے جو اسلامی خدوخال کو سجا لیتے۔ غرض کہ چمن ہند میں ہر طرف خزاں کا دور دورہ تھا۔ بہار رخصت ہو چکی تھی۔ خوش آواز و خوش الحان پرندے اب داستان ماضی ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کی جگہ زاغ و زغن کی مکروہ آوازوں نے لے لی تھی۔ یہ تو مختصر سا تذکرہ ہے کس کس چیز کا رونا روتے

تن ہمہ داغ داغ شدہ، پنبہ کجا کجا نہم

ایسے حالات میں یقین ہو چلا تھا کہ سرزمین ہند سے اسلام کا چمن کسی لمحے بھی اجڑ سکتا ہے۔ یہاں بھی اب وہی تاریخ دہرائی جانے والی ہے جس کا ایک مظاہرہ سرزمین اسپین میں ہو چکا ہے۔ اس لیے چند نفوس قدسیہ کے دلوں میں خلش اور کسک کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ ان حضرات نے

الہامی طور پر یہ ضرورت محسوس کی کہ دین کے تحفظ کی قدرتی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کی جائے۔ کوئی نہ کوئی سبیل ایسی نکالی جائے کہ ستم رسیدہ مسلمان محفوظ رہ سکیں۔ وقت کے یہ اولیاء اللہ ایک جگہ جمع ہوئے اور اپنے اپنے القاء قلبی کو بیان کیا۔ اس سب کا خلاصہ صرف یہ تھا کہ اس وقت بقائے دین کی ضرورت اس کے علاوہ اور کوئی نہیں کہ دینی تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کی حفاظت کی جائے۔ ایک ایسی درسگاہ قائم کی جائے جس میں علوم نبویہ کی تعلیم کا انتظام ہو اور اس کی مدد سے مسلمانوں کی دینی معاشرتی اور تمدنی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھلے گی۔ ایسا مدرسہ ہی مسلمانوں کی داخلی راہنمائی کرسکتا ہے اور ایسے مدرسے کے ذریعے ہی مسلمانوں کی خارجی مدافعت ہو سکتی ہے۔

ان مقاصد کے لیے جو حضرات کمربستہ ہوئے تھے۔ وہ رسمی قسم کے لیڈر یا راہنما نہ تھے۔ بلکہ خدا رسیدہ بزرگ اور اولیاء اللہ تھے۔ ان کی یہ باہمی گفت و شنید رسمی قسم کا مشورہ یا تبادلۂ خیال نہ تھا، بلکہ تبادلۂ الہامات تھا۔ مولانا قاری محمد طیب صاحب کا قول ہے کہ مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ان تمام اولیاء اللہ پر بیک وقت یہ الہام ہوا کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کے تحفظ اور بقا کی وجہ صورت قیام مدرسہ ہے۔ چنانچہ کسی نے دیکھا کہ خواب میں حفظ دین و علم کے لیے مدرسہ کے قیام کا حکم ملتا ہے۔ کسی کو کشف ہوا کہ مدرسہ قائم کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسے کا قیام ضروری ہے۔ غرض یہ کہ سب کا قیام مدرسہ پر جمع ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قیام مدرسہ کا فیصلہ من جانب اللہ تھا[1]

اس سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ اس وقت کے ہندوستان میں قیام مدرسہ کی یہ تجویز کوئی رسمی تجویز نہ تھی۔ وہاں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس تجویز کے پس منظر میں ملک گیر اصلاح کا پروگرام پوشیدہ تھا۔ یعنی یہ اصلاح ہنگامی یا مقامی نوعیت کی نہ تھی۔ بلکہ انگریز جس لادینی نظام حیات کو پورے ملک پر مسلط کرنے کی فکر میں تھا یہ تحریک اسے پورے ملک سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے شروع ہوئی تھی۔ گو ابتداء میں اس کی شکل ایک چھوٹے سے تخم کی سی تھی۔ مگر اس تخم میں ایک تناور شجرِ طیبہ پوشیدہ تھا جس کی جڑیں سچے قلوب کی زمین میں پھیلی ہوئی تھیں اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس سلسلے میں ہم مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے غیبی اشارات کا تفصیلی ذکر کر چکے ہیں۔ موصوف ہی کی ذات گرامی نے اس تجویز کو عملی شکل عطا کی۔

بنائے دارالعلوم

دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جو مسجد چھتہ کہلاتی ہے ایک انار کا درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کے روز سعید آبِ حیات کا یہ چشمہ پھوٹا۔ اور اس چشمے نے ایک طرف تو دین کے چمن کی آبیاری شروع کی۔ دوسری طرف شرک و بدعت، فطرت پرستی، الحاد اور دہریت کے ان خس و خاشاک کو بہانا شروع کیا جو مسلمانوں کے قلوب میں جڑیں پکڑ چکے تھے اور جن کی وجہ سے مسلمانوں کو پستی اور روز بد دیکھنا پڑ رہا تھا۔

بانی دارالعلوم کا یہ خواب کہ: میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوا ہوں میرے ہاتھوں کی دسیوں انگلیوں سے نہریں جاری ہیں اور اطراف عالم میں پھیل رہی ہیں پورا ہوا۔ اور مشرق و مغرب میں علوم نبوت کے چشمے جاری ہونے کی راہ ہموار ہو گئی۔ دارالعلوم کے مہتمم ثانی حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب مہاجر مدنی قدس سرہٗ کا یہ خواب کہ علوم دینیہ کی چابیاں میرے ہاتھ میں دے دی گئی ہیں خواب ہی نہ رہا۔ بلکہ حقیقت کے لباس میں جلوہ گر ہو گیا اور اس مدرسے کے ذریعے ان علوم کے خزانے کھولے گئے جو عالم کی نجات و فلاح کا باعث تھے۔ یا ظرف بننے والے تھے۔ اور جن سے عالم کو پہنچے

[1] تاریخ دیوبند۔ از قاری محمد طیب صاحب ص۱۱۔

منقولات شاہ ولی اللہ صاحب کے ہاں معقولات کا رنگ لئے تھے وُہ محسوسات میں بدل گئے۔ اسی لیے عموماً کہا جاتا ہے کہ ولی اللّٰہی مکتب فکر کے تحت دیوبندیت درحقیقت قاسمیت یا قاسمی طرزِ فکر کا نام ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد دارالعلوم کی سرپرستی مولانا رشید احمد گنگوہی کو حاصل ہوئی جنھوں نے دارالعلوم کی تعلیمات میں فقہی رنگ بھرا اور اس طرح اصول پسندی کے ساتھ فروعِ شرعیہ اور جزئیات کا قوام اس پر مستزاد ہو گیا۔

ان دونوں حضرات کے بعد شاہ عبدالعزیز ثانی اور مولانا محمد یعقوب صاحب آئے جنھوں نے تعلیمات کو عاشقانہ اور مجذوبانہ جذبات عطا کئے۔ اس طرح یہ صہبائے دیانت سے آتشہ ہو گئی۔ مولانا محمود حسن رح آئے اور ان کے چالیس سالہ دورِ صدارت میں علوم و فنون نے تمام عالمِ اسلام میں پھیلنا شروع کیا۔ چنانچہ ہزارہا تشنگانِ علوم ان کے دریائے علم سے سیراب ہو ہو کر اطرافِ عالم میں پھیلے۔ اس لحاظ سے یوں سمجھنا چاہیے کہ شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ جماعت دارالعلوم کے جدِ امجد ہیں۔ حضرت گنگوہی اور مولانا محمد یعقوبؒ اور شیخ الہند وغیرہم ان کے رُوحانی بیٹے ہیں

دارالعلوم کا مَسلک

علمی حیثیت سے ولی اللّٰہی مسلک، اہلِ سنت والجماعت کہلاتی ہے جس کی بنیاد کتاب، سنت، اجماع اور قیاس پر ہے۔ اس جماعت کے نزدیک تمام مسائل میں اوّلین درجہ نقل اور روایت اور آثارِ سلف کو حاصل ہے۔ جس پر پورے دین کی عمارت کھڑی ہے۔ اس جماعت کو یقین ہے کہ کتاب و سنت سے مراد اقوالِ سلف اور ان سے ملتے جلتے مذاق ہیں۔ اس کا حصول محض قوتِ مطالعہ سے نہیں ہو سکتا، بلکہ اساتذہ اور شیوخ کی صحبت اور تربیت اوّلین شرط ہے۔ اسی طرح کتاب اللہ کو سمجھنے کے لیے عقل و درایت اور تفقہ فی الدین کا ہونا ضروری ہے۔ روایات کے مجموعے کے سلسلے میں اہلِ سنت والجماعت حنفی فقہ کو بہتر سمجھتے ہیں اور فقہ ہی کی روشنی میں شارع علیہ السلام کی غرض و غایت کو سمجھتے ہیں، وہ تمام روایات کو اسی سے وابستہ کرتے ہیں اور انھیں درجہ بدرجہ اپنے اپنے محل پر اس طرح چسپاں کرتے ہیں کہ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ جمع بین الروایات اور مقابلے کے وقت تطبیق اس جماعت کا خاص اصول ہے۔ جس کا منشا اور غرض یہ ہے کہ ضعیف سے ضعیف روایات کو بھی چھوڑنا اور ترک کرنا نہیں چاہتی، حتیٰ کہ وہ قابلِ استشہاد ہو۔ اسی بنا پر اس جماعت کی نگاہ میں امورِ شرعیہ میں کہیں تعارض اور اختلاف نہیں ملتا، بلکہ سارے کا سارا دین اختلاف اور تضاد سے مبرا ہو کر ایک ایسا گلدستہ دکھائی دیتا ہے، جس میں ہر رنگ کے علمی پھول اپنے اپنے موقع پر کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اہلِ سلوک کے طریقے کے مطابق جو رسمیات رواجیات اور نمائشی حال و قال سے بیزار ہے۔ اس جماعت کے ہاں بھی تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن پر بہت زور ملتا ہے۔

ولی اللّٰہی جماعت اپنے پیروؤں کو علم کی روشنیوں سے نوازتی ہے۔ عبدیت اور تواضع جیسے اعلیٰ اخلاق سے مزین کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت کے افراد ایک طرف علم و قار اور غنائے نفس کی بلندیوں پر فائز نظر آتے ہیں، تو دوسری طرف فروتنی، خاکساری اور ایثار و زہد کے متواضعانہ جذبہ سے بھی بھرپور ملتے ہیں۔ نہ رعونت اور کبر و نخوت کا شکار ہوتے ہیں اور نہ ذلتِ نفس اور مسکنت میں گرفتار رہتے ہیں، وہ جہاں علم و اخلاق کی بلندی پر پہنچ کر عوام سے اونچے دکھائی دیتے ہیں، وہیں عجز و نیاز، تواضع اور فروتنی کے جوہر سے مزین ہو کر عوام میں کآحد من الناس کا مصداق بنتے ہیں۔ ایک طرف اگر وہ مجاہدات اور مراقبہ سے خلوت پسند ہیں تو دوسری طرف مجاہدانہ و غازیانہ اسپرٹ نیز قومی خدمت کے جذبات سے جلوہ آرا ہوتے ہیں۔ اعتدال اور میانہ روی ان کا خاصہ ہے اور یہ علوم کی جامعیت اور اخلاق کے اعتدال کا

تو رنگ غالب ہے۔ اس کے یہاں محدث ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فقیہ
نہیں ہے۔ اسی طرح صوفی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علم کلام
یا منطق سے بیزاری ہے۔ بلکہ اس کے جامع مسلک کے تحت اس جماعت
کا فاضل بیک وقت (درجہ بدرجہ) محدث، فقیہ، متکلم، صوفی، حکیم
اور مربی ہوتا ہے۔ جس میں زہد و قناعت کے ساتھ عدم تقشف، حمیدہ اخلاق کے
ساتھ، عدم مداہنت، رافت و رحمت کے ساتھ امر بالمعروف اور
نہی عن المنکر، تعلیم و تبلیغ کے ساتھ قومی خدمت کے جذبات
راسخ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دینی شعبوں کے تمام ارباب فضل و کمال
اور راسخ فی العلم، خواہ محدث ہوں، فقیہ ہوں، عارف ہوں، صوفی ہوں
متکلم ہوں یا اصولی، امیر اسلام ہوں، یا خلیفۃ المسلمین، اس جماعت کے
نزدیک واجب الاحترام اور واجب العقیدت ہوتے ہیں۔ جذبات
کی رو میں بہہ کر کسی فرد یا طبقے کو بدنیتی کا ہدف بنانا، حدود شرعیہ سے
بے پرواہ ہو کر مدح و ذم کرنا اس جماعت کے مسلک میں جائز نہیں۔

یہی وہ جامع مسلک ہے، جس کو اپنا کر دارالعلوم نے اپنی
خدمات سے سائبیریا سے لے کر جاوا، سماٹرا اور بنگال سے لے کر عرب
اور افریقہ تک علوم نبویہ کی روشنی پھیلائی۔ ایک طرف پاکیزہ اخلاق کی
شاہراہ کو واضح اور منور کیا تو دوسری طرف سیاسی خدمات سرانجام
دیں۔ چنانچہ ۱۸۰۳ سے ۱۹۴۷ء تک اس جماعت کے افراد نے اپنے
اپنے رنگ میں بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں۔ یہ قربانیاں تاریخ
کی پیشانی پر ثبت ہیں اور ان بزرگوں کی سیاسی اور مجاہدانہ خدمات پر
پردہ ڈالنا ناممکن ہے۔

تیرھویں صدی ہجری میں خصوصاً مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت
خصوصیت سے، مولانا امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی سرپرستی میں مولانا
محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد گنگوہی نیز ان کے متوسلین کی انقلاب
کے لیے کوشش اور آزادی و استحکام کے لیے جدوجہد اور گرفتاریں،
حالانکہ اور قید و بند و جلا وطنی کی صعوبتیں، وہ تاریخی حقائق ہیں جنہیں نہ
تو جھٹلایا جا سکتا ہے، نہ بھلایا جا سکتا ہے۔ جو لوگ ان حالات پر محض اس
لیے پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہ خود اس راہ سرفروشی میں شامل نہ
تھے، تو اس سے ان کی نامقبولیت تو ظاہر ہوتی ہے، صداقت کا نور
پھر نہیں چھپتا۔

اس بارے میں ہندوستان کی تاریخ سے باخبر اور ارباب
تحقیق کے نزدیک ایسی تحریریں خواہ وہ دیوبندی النسب کی ہوں یا غیر
دیوبندی نسبت کی، جن سے ان حضرات کی خدمات کی نفی ہوتی ہو، ناقابل
اعتبار و التفات ہیں۔ اگر حسن ظن سے کام لیا جائے، تو ان تحریروں کی
زیادہ سے زیادہ یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ ایسی تحریریں وقت کے
مرتب کن عوامل کے نتیجے میں محض ذاتی حد تک احتیاط کے مظاہرے ہیں
ورنہ تاریخی اور بدیہی شواہد کے پیش نظر نہ ان کی کوئی اہمیت ہے
اور نہ وہ قابلِ التفات ہیں۔ ان خدمات کا سلسلہ مسلسل آگے تک چلا
اور انہیں جذبات کے ساتھ ان بزرگوں کے اخلاف بھی سرفروشانہ ولولے
سے قومی اور ملی خدمات کے سلسلے میں آگے بڑھتے رہے، وہ تحریک خلافت
ہو، یا آزادیٔ وطن ہر ہر تحریک میں ہر ہر فرد نے حسب استطاعت
حصہ لیا۔

مختصر یہ کہ علم و اخلاق کی جامعیت اس جماعت کا طرۂ امتیاز رہا
ہے اور وسعت نظری، روشن ضمیری اور رواداری کے ساتھ دین و ملت
اور قوم و وطن کی خدمت اس کا مخصوص شعار، لیکن ان تمام شعبہ ہائے
زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اس جماعت میں مسند تعلیم ہی کو
حاصل رہی ہے۔ جب کہ یہ تمام شعبے علم کی روشنی میں صحیح طریقے پر بروئے
کار آ سکتے ہیں اور اسی پہلو کو اس نے نمایاں رکھا ہے۔ اسی لیے اس
سلسلۂ مسلک کی جامعیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جامع علم و معرفت
جامع عقل و عشق، جامع عمل و اخلاق، جامع مجاہدہ و جہاد، جامع دیانت و

سیاست، جامع روایت و درایت، جامع عزلت و جلوت، جامع عبادت و مدنیت، جامع علم و حکمت، جامع ظاہر و باطن اور جامع حال و قال ہے یہ مسلک جو سلف و خلف کی نسبت سے حاصل شدہ ہے کہ اصولاً مسلم فرقے کے لحاظ سے اہلِ سنت والجماعت، مذہب کے لحاظ سے حنفی، مشرب کے لحاظ سے صوفی، کلام کے اعتبار سے اشعری، سلوک کے اعتبار سے چشتی، فکر کے اعتبار سے ولی اللّٰہی، اصول کے اعتبار سے قاسمی، فروع کے اعتبار سے رشیدی اور نسبت کے لحاظ سے دیوبندی ہے۔

دارالعلوم کا مجموعی مذاق اور تربیت

۱۸۵۷ء کے بعد کے دور میں جب ہندوستان سے مسلمانوں کی شوکت پامال ہو چکی تھی اور حالات میں یکسر انقلاب اور تبدیلی آ چکی تھی — دارالعلوم نے سب سے بڑا یہ کام کیا کہ مسلمانوں میں بلحاظ دین و مذہب اور بالحاظ معاشرت تبدیلی نہیں ہونے دی۔ حالات کے دھارے میں بہنے سے روکا۔ پختگی اور عزم کے ساتھ انہیں اسلامی سادگی اور دینی فعالیت کے زاہدانہ اور متوکلانہ اخلاق پر قائم رکھا، مگر اس حکمت و دانائی کے ساتھ کہ عوام کی حد تک اندرونِ حدود جائز توسعات سے گریز نہیں کیا جو بدلتے ہوئے تمدن و معاشرت میں طبعی طور پر ضروری تھا، مگر خواص کی حد تک دائرہ وسیع نہیں ہونے دیا، جس سے عام مسلمانوں میں اسلامی ذہنیت کا سادہ نقشہ قائم رہا۔ جدید تمدن و معاشرت اغیار کی نقالی کا غلبہ نہیں ہو سکا اور اسلامی حمیت و عزیمت باقی رہ گئی۔ مرعوبیت اور احساسِ کمتری قلوب میں نہ جم سکی۔ ضمیر کی حریت و آزادی کا پورا پورا تحفظ ہوتا اور اتباعِ مغرب سے بچا کے سنت کو معیارِ زندگی بنانے کے جذبات قلوب میں ابھارے، جس سے عام تمدن اور معاشرت میں پرہیزگاری اور تقویٰ و طہارت کے تصور اجاگر رہے۔

بلحاظِ حقیقت یہ سب کچھ اس کا ثمرہ تھا کہ دارالعلوم اور اس کے پروردوں کے مسلک اور زندگی کے معاملات کی اساس جذباتِ عشق اور حقائقِ حسن پر رکھی، بجانب انبیاء علیہم السلام کے اسوۂ حسنہ سے اپنے عشق و محبت پر تھی، جو ایمان کا سرچشمہ ہو ہر اور قالب ہے۔ فلسفہ اختراعات اور آزادیٔ فکر کی راہ سے جاتا ہے اور عشق و محبت، اتباع و ادب کی راہ چلاتا ہے۔ فلسفہ کی بنیاد چونکہ عقلی اختراعات ہیں، اس لیے اگلے پچھلوں کی تحقیر و تذلیل کو اپنا واجبی حق سمجھتا ہے اور محبت کی بنیاد چونکہ دین اور عشق و محبت خداوندی پر ہے، اس لیے ہر اگلے پچھلے کی عظمت و محبت کو جزوِ ایمان بناتی ہے۔ اندرونی جذبات کا یہی فرق فلسفہ اور انبیاء کے متبعین میں بھی ہے۔ بس دارالعلوم کے طرزِ تربیت اور تعلیم و تمدن کا اہم جزو چونکہ ولی اللّٰہی کے ساتھ جزوِ فنی شغل کا اشتغال اور قال اللّٰہ اور قال الرسول ہی کا مشغلہ تھا۔ اس لیے طبعی طور پر اس کے حلقوں میں ادب و اتباع اور عشق و محبت کی بنیادیں استوار ہوئیں اور اُن کا اثر اُوپر کی تعبیر یعنی دیانت، معاشرت اور عادت و عبادت میں آنا ناگزیر تھا اس لیے اس نے بدلتے ہوئے حالات پر پچھلوں کے نقشِ قدم کو برقرار رکھا اور زمانے کی رَو میں بہہ کر عوام کو نقال بننے نہ دیا اور اس کی اس خوبی کی عظمت دوستوں اور مخالفوں سب نے تسلیم کی ہے۔

لیکن جن بزرگوں نے اس دور میں اپنے حسنِ نیت و اخلاق سے ہندوستانی مسلمانوں کی عزتِ نفس اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان کی مادی سربلندی کے لیے مساعی سرانجام دیں۔ اپنے سے کبھی آویزش نہ کی البتہ ان کے کسی اقدام سے اگر دین یا دینی ذوق اور دین کے کسی حصہ کو مل کر تا ہوا دیکھا تو اس کا مقابلہ کرتا رہا اور اس طرح امکانی حد تک دین میں آزادیٔ فکر، آزاد روشی اور بے قیدی کی مداخلت کے راستے روکے۔

دارالعلوم کی مجالس

دارالعلوم میں تین ذمہ دار مجالس ہیں۔

۱. مجلس شوریٰ   ۲. مجلس عاملہ   ۳. مجلس تعلیمیہ

مجلس شوریٰ دارالعلوم کی سب سے بڑی بااختیار مجلس ہے۔ دارالعلوم کا تمام تر نظم ونسق اسی جماعت کے ہاتھوں میں ہے۔ انتظام و تعلیم کے سلسلہ میں اس کی تجاویز... کارکنوں کے لیے واجب التعمیل ہوتی ہیں۔ اس مجلس کے ارکان کی تعداد ۲۱ ہوتی ہے جن میں سے علمائے کرام کم از کم گیارہ ہوتے ہیں۔ باقی ارکان مسلمانوں کے دیگر طبقات سے منتخب ہوسکتے ہیں، اگرچہ ۱۰ ارکان، دو ممبر باشندگان دیوبند میں سے لیے جاتے ہیں، مہتمم اور صدر مدرس باعتبار عہدہ اس کے مستقل رکن ہوتے ہیں۔ بقیہ سات ممبر مجلس شوریٰ میں سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ اس مجلس کا انتخاب سالانہ ہوتا ہے اور اس کے سال بھر میں چار جلسے ہوتے ہیں۔ پہلا ربیع الاول میں دوسرا جمادی الاول، تیسرا شعبان اور چوتھا ذی قعدہ میں۔ مجلس عاملہ کا کورم پانچ ہے۔

مجلس تعلیمیہ کا کام تمام درجات عربی، فارسی، اردو، دینیات اور تجوید وغیرہ کے تعلیمی کاموں میں صدر المدرسین کو مشورہ دینا ہے۔ اس کے ممبران میں صدر مدرسین مہتمم دارالعلوم اور طبقۂ اعلیٰ کے اساتذہ شامل ہوتے ہیں۔

دارالعلوم کے شعبہ جات

دارالعلوم میں تین قسم کے شعبہ جات موجود ہیں۔

تعلیمی شعبہ جات۔ انتظامی شعبہ جات۔ مالی شعبہ جات

تعلیمی شعبہ جات کے تحت مندرجہ ذیل ۱۲ شعبے آتے ہیں

۱. شعبہ تعلیم عربی

اس شعبے میں میزان الصرف سے لے کر دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ اگرچہ کتب تمام تر عربی میں ہیں، مگر ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ نصاب کی تکمیل کی مدت گیارہ سال ہے

۲. شعبہ تعلیم فارسی

اس شعبے میں فارسی کی ابتدائی تعلیم سے لے کر مثنوی مولانا روم تک کے پڑھانے کا انتظام ہے۔ یہاں بھی ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ فارسی کے علاوہ حساب، اقلیدس، جغرافیہ، ہندی اور تاریخ وغیرہ بھی نصاب میں شامل ہے۔ شعبے کا نصاب ۵ سال کا ہے۔

۳. شعبہ تجوید وقرأت

اس شعبے میں تمام طلبہ کو لازمی مضمون کے طور پر پارہ عم کی مشق قواعد تجوید کے تحت کرائی جاتی ہے۔ اس کے بغیر طالب علم کو سند الفراغ نہیں دی جاتی، اور جو طلبہ باقاعدہ فن تجوید کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں، انھیں تجوید کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور عملی مشق کے بعد باقاعدہ سند دی جاتی ہے۔

۴. شعبہ تعلیم قرآن ناظرہ

گو اس شعبے میں ناظرہ قرآن کا بندوبست ہے، مگر جو طلبہ حفظ کرنا چاہیں وہ حفظ بھی کرسکتے ہیں۔

۵. شعبہ ابتدائی دینیات وتعلیم القرآن

اس شعبے میں چھوٹے بچوں کو قرآن شریف ناظرہ پڑھایا جاتا ہے اس کے ساتھ اردو زبان، دینیات، ہندی، حساب، جغرافیہ، تاریخ جیسے اہم مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ نصاب کی تکمیل ۴ سال میں ہوتی ہے۔

۶. صحف عربی

اس شعبے میں طلبہ کو جدید عربی میں تقریر و تحریر کی مشق کرائی جاتی ہے۔

۷۔ صنف انگریزی

اس شعبے میں طلبہ کو انگریزی زبان پڑھانے کا انتظام کیا گیا ہے جس کے تحت وہ دینی علوم و مسائل کی انگریزی زبان میں تشریح و توضیح کے قابل ہو جاتے ہیں۔

۸۔ شعبۂ خوشنویسی

اس شعبے میں تمام طلبا کو خوشنویسی کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس شعبے کے دو درجے ہیں۔ ایک درجہ محض خط کی صفائی کا ہے تاکہ طالب علم بدخطی کے عیب سے محفوظ ہو جائے اور دوسرا فنِ کتابت کی فنی تکمیل کا ہے جس کے لیے طلبا کو وظائف بھی دیئے جاتے ہیں اور اس درجہ کی مدتِ نصاب پوری کر کے وہ اس فن کی سند کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جو طلبا فنِ کتابت سیکھنا چاہتے ہیں، انھیں کتابت سکھائی جاتی ہے لیکن یہ درجہ لازمی مضمون کا نہیں ہے۔

۹۔ جامعہ طبیہ

اس شعبے میں طلبہ کو طبِ قدیم و جدید معہ سرجری وغیرہ پڑھائی جاتی ہے اور اس کی تکمیل پر باقاعدہ سند دی جاتی ہے، جو حکومت کی طرف سے تسلیم شدہ ہے۔

۱۰۔ دارالصنائع

اس شعبے میں طلبا کو ابتدائی درجہ کی کچھ دستکاریاں سکھائی جاتی ہیں اور اس کی تکمیل پر باقاعدہ سند دی جاتی ہے۔ تاکہ طلبا حسبِ ضرورت کسبِ معاش کر سکیں، مثلاً لیدر و کس، خیاطی اور جلد سازی کی تعلیم دی جاتی ہے۔

۱۱۔ شعبۂ مطالعہ علوم قرآنی

اس شعبے میں قرآن پر ریسرچ کا انتظام ہے۔

۱۲۔ شعبۂ تعلیم الافتاء

منتخب طلبہ کو فتویٰ نویسی کی مشق کرانے کے لیے یہ شعبہ دارالافتاء کی نگرانی میں قائم ہے، جس میں ہر سال اعلیٰ استعداد کے طلبا کی ایک مختصر جماعت افتاء نویسی کے لیے منتخب کی جاتی ہے جس کے لیے ایک کمیٹی زیرِ نگرانی مہتمم دارالعلوم انتخاب کا کام انجام دیتی ہے اور فارغ شدہ طلبا کو افتاء کی سند دی جاتی ہے۔

۱۳۔ مجلس معارف القرآن

یہ ایک تحقیقی ادارہ ہے، جو اپنے نظم اور کاموں میں مستقل اور آزاد ہے، مگر دارالعلوم کی سرپرستی میں قائم ہے۔ اس کی مجلس منتظمہ الگ ہے۔ اس کا مقصد قرآنی علوم کی ریسرچ اور تحقیق کے ساتھ وقت کے ابھرے ہوئے مسائل کو قرآن کی روشنی میں حل کر کے اس طرح پیش کرنا ہے کہ قرآن حکیم دنیا کا راہنما اور امام ثابت ہو اور دنیا کو قرآن حکیم کی روشنی میں عمل کرنے کی رغبت اور امنگ پیدا ہو۔

۱۴۔ دارالافتاء

اس شعبے سے ملک اور بیرونِ ملک سے آنے والے سوالات پر فتوے دیئے جاتے ہیں۔ یہ شعبہ درحقیقت اسلامی عدلیہ کا شعبہ ہے جس کے ماتحت مسلمانوں کا پرسنل لا ان کے ذاتی خانگی اور اجتماعی معاملات میں ان کے سامنے رکھا جاتا ہے جس سے اسلام کی حد تک محفوظ ہے۔ اس کے شعبے تعلیم سے الگ ہیں اور یہ شعبہ تعلیم عوام کا ہے۔

[illegible] میں حسب ذیل چند شعبے ہیں۔

۱. کتب خانہ

اس شعبے میں درسی، غیر درسی کتب اور مخطوطات کے عظیم ذخیرے محفوظ ہیں، جن سے طلباء اور اساتذہ کو مطلوبہ کتب فراہم کی جاتی ہیں اور جو حضرات باہر سے تحقیق کرنے آتے ہیں ان کو بھی مطالعہ کی سہولت دی جاتی ہے۔

۲. مطبخ

یہ شعبہ کھانے سے متعلق ہے۔ تقریباً دو وقت اوقات میں ۲۰۰۰ طلباء کا کھانا تیار کیا جاتا ہے۔ عموماً طلبہ کو کھانا مفت ملتا ہے۔ مگر صاحب استطاعت طلباء اگر کھانے کی قیمت ادا کرنا چاہیں، تو صرف اصل لاگت وصول کی جاتی ہے، نفع وغیرہ نہیں لیا جاتا۔

۳. تعمیرات

یہ ایک مستقل شعبہ ہے جس کا کام بارہ مہینے جاری رہتا ہے۔ چنانچہ پرانی عمارتوں کی مرمت، ترمیم و تنسیخ اور حسب ضرورت نئی عمارتوں کی تعمیر وغیرہ کے کام اس شعبے کے تحت ہیں۔

۴. دارالمطالعہ

اس شعبے میں طلبا کے مطالعے کے لیے اخبارات رسائل اور ضروری کتب کا انتظام ہے۔ یہ ایک ذمہ دار نگران کی نگرانی میں ہر وقت کھلا رہتا ہے اور طلبا جب چاہیں یہاں آکر مطالعہ میں مصروف ہو سکتے ہیں۔

۵. دارالتربیت :-

یہ ایک مستقل شعبہ ہے اس شعبے میں کم عمر طلبا کی تربیت اور اخلاقی نگرانی کا انتظام ہے۔

۶. ترتیب فتاوے

اس شعبے میں دارالعلوم کے دارالافتا سے جو فتوے صادر کیے گئے ہیں، انکا باقاعدہ ریکارڈ رکھا گیا ہے۔ انھیں ترتیب دینا اور کتابی صورت میں شائع کرنا اسی شعبے کا فرض ہے۔ اب تک یہ شعبہ کئی کتب شائع کر چکا ہے۔

۷. دارالاقامہ

یہ شعبہ بورڈنگ سے متعلق ہے۔ چنانچہ دارالاقامہ میں رہنے والے طلبا کی جائے رہائش اور اسی سے متعلق سید اشور اسی شعبے کے تحت آتے ہیں۔

۸. شعبہ تنظیم ابنائے قدیم

اس شعبے کے ذریعے ابتدا سے اب تک جتنے طلبا فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں۔ ان کی ضبط و تنظیم کی جاتی ہے اور ان خدمات کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے جو مختلف دائروں میں سر انجام دے رہے ہیں۔ اس ادارے کی رپورٹ وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہے۔

۹. شعبہ برقیات و متفرقات

اس شعبے کے ذمہ دارالعلوم کی صفائی، آب رسانی، حوائج ضروریہ، ضروریات مسجد، احاطوں کی چمن بندی، دارالعلوم میں روشنی کا انتظام ہے۔

۱۰. محافظ خانہ :-

اس شعبے میں دارالعلوم کی ابتداء سے آج تک کے تمام شعبہ جات کا ریکارڈ محفوظ ہے۔

۱۱۔ شعبہ امورِ خارجہ

اس شعبے میں بیرونی طلباء کے پاسپورٹ، ویزا کے سلسلہ میں ضروری تحفظات اور اندراجات اور عام طلبہ کے ریلوے کنسیشن وغیرہ کے انتظام وغیرہ کا کام ہوتا ہے۔

۱۲۔ شعبہ نشریاتِ دارالعلوم

اس شعبے سے دارالعلوم کا ماہوار رسالہ شائع ہوتا ہے — دارالعلوم کے سلسلے میں وقتہ وقتاً اعلانات نیز اس کی ضروریات کے اظہار وغیرہ کی نشر و اشاعت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس رسالے کے علاوہ دینی مضامین اور مطبوعات پر تبصرے مشتمل ہیں۔ ایک رسالہ دعوت الحق کے نام سے عربی میں شائع ہوتا ہے۔ تاکہ اکابر دارالعلوم کے خیالات عرب دنیا تک بھی پہنچ جائیں اور اُن سے نہ صرف یہ کہ عرب دنیا واقف ہو، بلکہ انھیں دارالعلوم کی خدمات اور کارناموں کا بھی علم ہو سکے۔

۱۳۔ شعبہ تبلیغ

اس شعبے سے ملک کے مختلف حصوں میں مبلغین روانہ کئے جاتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے روشناس کرائیں۔ اجتماعی تبلیغ کے لیے الگ اور عام اصلاحی جلسوں کے لیے الگ مبلغ نامزد کئے جاتے ہیں، جو باقاعدہ اور منظم پروگرام کے تحت بھیجے جاتے ہیں۔

۱۴۔ شعبہ ورزش

اس شعبے کا تعلق طلباء کی جسمانی صحت سے ہے۔ ورزش کا باقاعدہ انتظام ہے۔ تاکہ ۔۔۔ [illegible]

۱۵۔ جمعیۃ الطلبہ

یہ طلباء دارالعلوم کی انجمن ہے۔ جس کے تحت طلبا تقریر، تحریر اور مناظرے کی مشق کرتے ہیں۔

٭

مالی شعبہ جات میں مندرجہ ذیل چار شعبے آتے ہیں۔

۱۔ محاسبی

اس شعبے میں دارالعلوم کی آمدنی و خرچ کا تفصیلی حساب رکھا جاتا ہے۔ تمام بنیادی کاغذات و کھاتہ روزنامچہ اور رسید وغیرہ کے گوشوارے مرتب کیے جاتے ہیں۔ حساب کتاب ہر سال سرکاری آڈیٹروں کے ذریعے آڈٹ کرائے جاتے ہیں۔

۲۔ شعبہ اوقاف

اس دفتر کے ذمہ دارالعلوم کے نام جس قدر جائیداد از قسم زراعتی و سکنائی وقف ہیں۔ ان کا حساب رکھنا ہے۔ تحصیل و وصول کا باقاعدہ منظم دفتر ہے جو آمدنی اور خرچ اور وارد و ستہ کا باقاعدہ حساب رکھتا ہے۔

۳۔ شعبہ تنظیم و ترقی

اس شعبے کے تحت تحصیل چندہ کے لیے سفیروں کا تقرر ہے جو ملک کے مختلف حصوں میں حلقہ وار پھیل کر دارالعلوم کے لیے چندہ فراہم کرتے ہیں نیز مقررہ چندوں کی وصولیابی کرتے ہیں۔

۴۔ ادارہ اہتمام:

یہ سب سے پہلا اور مرکزی ادارہ قائم ہے۔ جس سے ہر شعبہ کے بارے میں خط و کتابت ہوتی ہے، وہ انتظامی تجاویز اور احکام نافذ ہوتے ہیں

دار العلوم کا نصاب تعلیم

دار العلوم کا قیام مدرسہ کی شکل میں ۔۔۔ عمل میں آیا تھا۔ اس سلسلہ میں وہی نصاب تعلیم باقی ہے۔ جو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تجویز فرمایا تھا۔ اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس نصاب کی مختصر تاریخ پر ایک نظر ڈالیں۔

مدرسہ نظامیہ بغداد

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ درس نظامی نظام الملک یا نصیر الدین محقق طوسی کا وضع کردہ ہے جو انہوں نے مدرسہ نظامیہ بغداد کے لیے تیار کیا تھا۔

مدرسہ نظامیہ بغداد کا سنہ تاسیس ۴۵۷ھ مطابق ۱۰۶۴ء ہے۔ اور ذوالقعدہ ۴۵۹ھ مطابق ۱۰۶۸ء بروز شنبہ اس کا افتتاح عمل میں آیا۔ مورخین کا بیان ہے کہ مدرسہ نظامیہ بغداد کی رسم افتتاح نہایت تزک و احتشام سے انجام پائی۔ افتتاح کے وقت سارا بغداد امڈ آیا تھا۔

محقق طوسی نے اس دار العلوم کے لیے دو لاکھ دینار کی رقم خطیر وقف کی موجودہ سکے کے اعتبار سے دس لاکھ روپے ہوتی ہے۔ سالانہ اخراجات کے لیے پندرہ ہزار دینار یعنی ۷۵ ہزار روپیہ منظور کیا۔ اس دار العلوم میں بیک وقت چھ ہزار طلبہ کی تعلیم و تدریس کا انتظام تھا۔ طلباء میں غریب اور نادار بچوں سے لے کر امراء و رؤسا کے صاحبزادے تک شامل ہوتے تھے۔ علامہ ابو اسحاق شیرازی مدرسہ کے صدر مہتمم تھے۔ طلبہ کے لیے نقد وظائف اور اساتذہ کے بیش قرار مشاہرے مقرر تھے۔

(ملاحظہ ہو رسالہ شبلی اسلامی مدارس، ص ۲۴۹/۲۵۰۔)

قدیم نصاب میں اصلاح

محقق طوسی کے وضع کردہ نصاب میں سب سے قابل قدر اضافے سکندر لودھی کے عہد میں شیخ عزیز اللہ اور شیخ عبد اللہ نے کیے۔ انہوں نے قاضی عبد الملک کی تصانیف مطالع اور مواقف اور سکاکی کی مفتاح العلوم کو داخل نصاب کیا۔ علامہ بدایونی کے قول کے مطابق علم منطق کو ہند میں انہیں حضرات کے ذریعے فروغ ہوا۔ ورنہ ان کے آنے سے قبل اس علم کی صرف دو کتابیں رائج تھیں۔

اس کے بعد سید شریف جرجانی کے تلامذہ اور علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے اپنے اساتذہ کی شروح کو نصاب میں داخل کیا۔ (ہندوستان کی قدیم درسگاہیں، صفحہ ۹۳۔ ۹۵)

بعد ازاں اکبری عہد میں عضد الملک، مولانا فتح اللہ شیرازی نے نصاب میں کچھ اور اضافے کیے اور علماء نے انہیں بصد خوشی قبول کر لیا۔ عہد عالمگیری کے بعد مولانا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۷۴ھ مطابق ۔۔۔) نے اس نصاب میں اہم ترمیمات کیں اور کتابوں کی ترتیب کو بھی بہت حد تک بدل ڈالا۔ آپ نے اپنے رسالہ الجزء اللطیف میں اپنی درسیات کو اس ترتیب سے لکھا ہے۔

ولی اللہی نصاب

نحو میں :—— کافیہ، شرح جامی

منطق میں —— شرح شمسیہ، شرح مطالع

فلسفہ میں :—— شرح ہدایۃ الحکمۃ

کلام میں :—— شرح عقائد نسفی مع حاشیہ خیالی و شرح مواقف

فقہ میں :—— شرح وقایہ ہدایہ (کامل)

اصول فقہ میں :—— حسامی اور کسی قدر توضیح تلویح

بلاغت میں : ——— مختصر و مطول

طب میں : ——— موجز القانون

حدیث میں : ——— مشکوٰۃ المصابیح کامل، ترمذی کامل، کسی قدر صحیح بخاری

تفسیر میں : ——— جلالین، بیضاوی

سلوک تصوف میں : ——— عوارف و رسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات جامی

مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص

درس نظامی میں اصلاح

ہمارے پیش نظر محقق طوسی کا وضع کردہ نصاب نہیں، بلکہ ملا نظام الدین سہالوی (متوفی ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۷ء) کا تیار کردہ نصاب زیر بحث ہے۔ ہم اس وقت اس کا مختصر خاکہ پیش کر رہے ہیں۔

سہالوی مرحوم کا یہ نصاب مدرسہ عالیہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ ہی نے نہیں اپنایا، بلکہ پاک و ہند کی ہر دینی درسگاہ نے اس نصاب کو قبول کیا۔ کچھ عرصے بعد غالباً سب سے پہلے مدرسہ نظامیہ فرنگی محل کے شیخ الجامعہ مولانا قطب الدین عبدالولی صاحب نے اس نصاب میں متعدد اصلاحات کیں۔ انہوں نے بعض کتب اور مضامین میں رد و بدل بھی کیا۔ یہی درس نظامی معمولی تبدیلی کے ساتھ دارالعلوم دیوبند اور بلا تخصیص مسلک پاک و ہند کے جملہ مدارس عربیہ اسلامیہ میں تاحال رائج ہے۔ اگر مختلف مسالک کے نصاب میں کچھ فرق ہے تو صرف فقہ و عقائد اور تفسیر و حدیث کی کتب میں ہے۔

گزشتہ دو صدیوں کے اندر نصاب میں تبدیلی کی متعدد کوششیں ہوئیں مثلاً علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابوالمحاسن سجادؒ، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادیؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا سید سلیمان ندوی، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اور متعدد دیگر علمائے کرام نے اس کے لیے مساعی کیں۔ خصوصاً اہل حدیث مکتب فکر کے مدارس میں انتخاب حدیث اور تفسیر قرآن کے سلسلے میں نمایاں اضافہ ہوئے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ترمیم شدہ جدید نصاب رائج بھی ہو گئے۔ جامعہ عباسیہ بہاولپور (جامعہ اسلامیہ بہاولپور) میں جدید نصاب رائج ہوا۔ وفاق المدارس العربیہ ملتان نے بھی نصاب میں تبدیلیاں کیں۔

ہند و پاک میں درس نظامی سے مختلف نصاب اور نظام تعلیم کی جو منظم کوششیں معرض وجود میں آئیں اور مستقل درسگاہیں قائم ہوئیں۔ ان میں نمایاں ترین حسب ذیل ہیں۔

مدرسہ عالیہ (کلکتہ)، مدرسۃ العلوم (مسلم یونیورسٹی) علیگڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعہ عباسیہ بہاولپور، جامعہ حنفیہ ڈابھیل۔

ان تمام درسگاہوں کا نظم، طریق کار، مزاج، نصاب اور مقصد تعلیم جداگانہ اور بعض صورتوں میں ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ تفصیلات میں داخل ہوئے بغیر ان کا اجمالی تعارف ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ

وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۱ء میں ذاتی طور پر کلکتہ میں درسگاہ کی بنیاد رکھی۔ ۵۶۴۱۷/- روپے اس کی تعمیر پر خرچ ہوئے اور ۶۲۵ روپے ماہانہ کے اخراجات منظور ہوئے۔ چند سال بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے اپنی تحویل میں لیا اور اس کے لیے ۳۰۱۴۲ روپے سالانہ بجٹ منظور کیا۔ ۱۸۲۴ء میں مدرسہ عالیہ اپنی موجودہ عمارت ولزلی چوک میں منتقل ہو گیا۔

قیام پاکستان کے بعد ڈھاکہ شہر (مشرقی پاکستان) میں بھی مدرسہ عالیہ کے نام سے ایک عظیم درسگاہ قائم ہوئی۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ، حکومت بنگال کی طرف سے مشرقی زبانوں اور دینی تعلیم دینے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس نصاب میں فلسفہ و ریاضی

تھ، علم حیات، ریاضی، منطق، صرف و نحو اور عروض کے مضامین شامل تھے۔ ۱۸۸۵ء میں شعبہ عربی کے ساتھ شعبہ اینگلو عربی، شعبہ انگریزی اور شعبہ بنگالی کا بھی اضافہ ہو گیا۔

مدرسۃ العلوم علیگڑھ

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے اندر انگریزی تعلیم کے اوّلین داعی اوّل سرسید نے علیگڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا۔ یہی مدرسہ آگے چل کر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ بنا اور مسلمانوں کے لیے ہندوستان و پاک میں انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کے مرکزی جامعہ کی صورت اختیار کر گیا۔ سرسید نے تبلیغ دین کے جس نصب العین کا بار بار ذکر کیا اور اپنی زندگی میں جس کیلئے انہوں نے مخلصانہ مساعی بھی کی تھیں، وہ اس جامعہ سے پورا نہ ہو سکا۔ شیعہ اور سنی دینیات کا مضمون ضرور شامل نصاب رہا، لیکن ضمنی سی صورت میں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

تحریک ترک موالات کے دوران علیگڑھ میں چند خیموں کے اندر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد پڑی۔ کچھ عرصے بعد دہلی کے اندر اوکھلے میں یہ درسگاہ اپنی موجودہ مستقل عمارات میں منتقل ہو گئی۔ چند ہی سالوں میں اوکھلے کا ویرانہ جیتی جاگتی زندگی کی شکل اختیار کر گیا اور جامعہ نے ایک مستقل یونیورسٹی کی حیثیت اختیار کر لی۔

جامعہ کے اساتذہ میں ڈاکٹر سید ذاکر حسین صاحب، خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی، مولانا محمد اسلم جیراجپوری جیسے بلند پایہ اصحاب شامل تھے۔ حدیث و تفسیر اور فقہ و دینیات کے مضامین نصاب میں شامل رہے، لیکن جامعہ کے پیش نظر دیندار گریجویٹ پیدا کرنا تھا نہ کہ دین کے مبلغ اور عالم، چنانچہ عرصے بعد اس عظیم ادارے کا نام بھی صرف جامعہ ملیہ رہ گیا۔

★

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۰ء میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس جامعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا ہے۔ ہر علم و فن کی اہم اور معیاری کتابوں کے اُردو میں ترجمے کرائے گئے ہیں۔ لیکن مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور جامعہ ملیہ دہلی کی طرح یہاں بھی، مثلاً ایف اے اور بی اے، ایم اے کے نصابات زیر تدریس آئے۔ ان امتحانات میں دینیات کے دو دو اور تین تین پرچے مقرر کیے گئے؛ لیکن علما اور مبلغ پیدا کرنا کبھی ان کا نصب العین اور منشا نہ ہوا۔

جامعہ کے نصاب میٹرک میں عقائد، منطق، فقہ اور حدیث کی چند کتابیں، ایف اے میں فقہ، اصول فقہ، تفسیر اور حدیث کی کچھ کتابیں یا ان کے منتخب حصے اور اسی طرح بی اے کے نصاب میں فقہ، اصول فقہ، تفسیر، حدیث اور علم الکلام کی چند کتابیں شامل کی گئیں۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء میں دارالعلوم لکھنؤ قائم ہوا۔ یہ درسگاہ متقدمین علیگڑھ اور دارالعلوم دیوبند، فرنگی محل کی درمیانی کڑی ثابت ہوئی۔ گومتی ندی کے کنارے لکھنؤ یونیورسٹی کے ساتھ وہ اپنی شاندار عمارات میں قائم ہے۔ ان درسگاہوں اور دارالاقامہ کی عمارات کے درمیان عالی شان مسجد ہے۔

علامہ شبلی نعمانی، نواب علی حسن خان، مولانا حکیم عبدالحی مرحوم اور ان کے رفقاء اس کے ابتدائی مؤسس اور محرک تھے۔ ندوۃ العلماء کے تعلیمی نصاب کو مندرجہ ذیل شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

درجہ ابتدائیہ:

اُردو زبان میں ابتدائی تعلیم اور دینیات کا چار سالہ نصاب۔

عربی میں کمزور طلبا کے لیے ایک سالہ نصاب

درجہ ثانیہ :

عربی زبان اور علوم اسلامیہ کا چار سالہ نصاب

اس درجے سے ذریعہ تعلیم عربی ہو جاتا ہے۔ ادب عربی اور ترجمے پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

درجہ عالیہ :

علوم اسلامیہ کا سہ سالہ نصاب، ان جماعتوں میں حدیث اور تفسیر کے علاوہ علوم حاضرہ اور بقدر ضرورت انگریزی زبان کی تدریس بھی نصاب میں شامل ہے۔

درجہ فضیلت :

تفسیر، اصول تفسیر، حدیث و اصول حدیث اور دوسرے متعلقہ علوم پر مشتمل دو سالہ نصاب۔

درجہ تخصص :

عربی ادب اور ادبیات کا دو سالہ کورس۔

اس درس گاہ اور اس کے نصاب کے تعین سے ارباب بست و کشاد کے پیش نظر جو اصلاحات تھیں، ان کا خلاصہ یہ ہے :

۱. علوم میں کتابی مہارت کی بجائے فنی مہارت پیدا کی جائے۔
۲. علوم حاضرہ کو بقدر ضرورت رکھا جائے اور جدید تحقیقات سے واقفیت پیدا کی جائے۔
۳. عربی ادب خصوصاً دور جاہلیت کے شعرا اور ادبا وغیرہ کو شامل نصاب کیا جائے۔
۴. تاریخ اور جغرافیہ کے ابواب کا اضافہ کیا جائے۔
۵. انگریزی کو بحیثیت زبان داخل نصاب کیا جائے۔
۶. تقابل ادیان کی طرف خصوصی توجہ دی جائے
۷. تدریس و تعلیم جامع حیثیت سے یکسر پاک ہو۔

ندوۃ کے طلباء قدیم میں مولانا سلیمان ندوی، مسعود عالم ندوی، عبدالسلام ندوی صاحب خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ اس ادارے سے بعض مستند مصنف، مؤلف اور عظیم افراد پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی مثال اور کسی ادارے میں نہیں ملتی۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر

۱۹۱۰ء میں مولانا محمد شفیع مرحوم نے اس ادارے کی بنیاد رکھی۔ بعد ایک وقت یہ بھی آیا کہ شبلی مرحوم نے ندوۃ العلماء کو اپنے عزائم کی تکمیل کے سلسلے میں غیر مکتفی پایا تو اس ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ مولانا فراہی بھی اس سے وابستہ ہوئے اور دم آخر تک خدمت قوم کرتے رہے۔ اس مدرسے میں ابتدائی اور عربی دونوں طرح کا نصاب رائج ہے۔ ابتدائی درجات کا نصاب ۵ سالہ اور عربی ۸ سالہ ہے۔ اس سلسلے کے مدرسے تک انگریزی زبان بھی سکھائی جاتی ہے۔ مدرسہ کے مقاصد کے سلسلے میں مؤسسین کے الفاظ یہ ہیں۔

۱. علوم کو خدام قرآن کے لحاظ سے اخذ کیا جائے
۲. قرآن فہمی کے لیے عربی ادب پر عبور حاصل کیا جائے۔
۳. فقہ بطور تفقہ سکھایا جائے۔
۴. اساتذہ اور طلباء سادگی اور مذہبیت کے رنگ کو اپنائیں۔
۵. یہ مدرسہ اہل سنت والجماعت کے چاروں فرقوں کا سنگم ہو۔
۶. مدرسہ سرکاری اثر سے ہر طرح آزاد رہے۔
قدیم تقریری طریقہ جاری رکھا جائے۔

جامعہ عباسیہ بہاولپور

۱۹۲۵ء میں ادارے کی بنیاد پڑی اور نواب صاحب نے

اس کی سرپرستی قبول کی۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ فرسٹ مستقل طور پر یونیورسٹی میں بدل جائے۔ چنانچہ ایک جامع نصاب بنایا گیا، مگر بوجوہ اس پر عمل نہ ہوسکا۔

دارالعلوم کا طرزِ تعلیم

دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبا کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ علومِ اسلامی کی تعلیم مجسم عبادت ہے۔ اسی عقیدے کی بدولت یہاں تعلیم کے جتنے عنوان ہیں سب میں عبدیت فروتنی اور سنجیدگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہاں گو مختلف الخیال اور مکاتبِ فکر کے طلبا علم حاصل کرتے ہیں، مگر کیا مجال کہ اساتذہ کے احترام میں فرق آئے۔ طلبا عموماً اساتذہ کی آمد پر احتراماً کھڑے ہوجاتے ہیں، بلکہ درس کی کتب یا جوتے تھام لینا سعادت میں شامل ہے۔ گو اساتذہ کی نشست ممتاز ہوتی ہے، مگر کمال سادگی اور فروتنی کا مرقع ہوتی ہے۔

سبق کی ابتدا بسم اللہ سے ہوتی ہے اور عموماً طلبا اور اساتذہ کی زبان پر ترتیب یسّرو لا تعسّر و تمّم بالخیر کے الفاظ جاری ہوتے ہیں۔ اساتذہ لیکچر کا انداز اپناتے ہیں۔ مطالعہ پر زور ہے اور خلاصہ یا کلید کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ہر نئے سبق سے پہلے گزشتہ اسباق کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ استاد یہ بھی اندازہ کرتا رہتا ہے کہ طلبہ رات کا مطالعہ کر رہے ہیں یا نہیں۔

امتحانات کا سہ ماہی، ششماہی، نہ ماہی اور سالانہ نظام ہے۔ یہ امتحانات تحریری بھی ہوتے ہیں اور زبانی بھی۔ امتحان میں کامیابی کے لیے کم از کم ۵۰ نمبر لینے ضروری ہوتے ہیں۔ امتحان کے بعد سند ملتی ہے جو درجات کے مطابق ہوتی ہے۔ ہر سال فارغ التحصیل طلبہ کو دستارِ فضیلت عنایت ہوتی ہے۔

دارالعلوم کی اسناد :

دارالعلوم میں درجاتِ عربیہ سے فارغ ہونے والوں کو ۳ سندیں دی جاتی ہیں۔

۱۔ سند العالم : یہ سند دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد دی جاتی ہے۔

۲۔ سند الفاضل : اس کے لیے دورۂ حدیث اور دورۂ تفسیر دونوں کی تکمیل ضروری ہے۔

۳۔ سند الکامل : یہ سند اس طالب علم کو دی جاتی ہے۔ جو درجۂ تکمیل کے علوم و فنون کو پڑھ چکا ہو۔ پھر مذکورہ بالا تینوں سندیں طالب علم کی استعداد اور اخلاقی حالت کے اعتبار سے ۳ درجے کی ہوتی ہیں۔ اعلیٰ، اوسط، ادنیٰ، جن میں یہ تفاوت الفاظ و عنوان اختیار رکھا گیا ہے۔ سب سندیں عربی میں ہوتی ہیں اور انہیں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، جامعہ ازہر قاہرہ اور مدینہ یونیورسٹی تسلیم کرتی ہے۔

مندرجہ بالا سندوں کے علاوہ مندرجہ ذیل سندیں بھی دی جاتی ہیں :

۱۔ درجاتِ فارسی سے فارغ ہونے والوں کی سند

۲۔ درجۂ تجوید سے فارغ ہونیوالوں کی سند

۳۔ ابتدائی دینیات سے فارغ ہونیوالوں کی سند

۴۔ تکمیل سے قبل چھوڑ جانے والوں کو سرٹیفکیٹ۔

حصہ اوّل

تنقید ــــ بر ــــ تحقیقی مقالہ

حصہ دوم

مفروضہ کی جانچ اور سفارشات

تنقید بر تحقیقی مقالہ : تحقیق میں تنقید کی بڑی اہمیت ہوا کرتی ہے کیونکہ یہی وہ کسوٹی

ہے۔ جو تحقیق کو پرکھ کر اس کی حقیقت تک پہنچاتی ہے۔ محقق جو مواد حاصل کرتا ہے جہاں سے مرتب اور باقاعدہ انداز میں تحریر کرتا ہے، وہیں اس کا جواز پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ مواد محصلہ کس حد تک معتبر ہے۔

تحقیق کی تنقید کے دو طریقے ہوتے ہیں، یعنی داخلی اور خارجی تنقید۔ داخلی تنقید میں مواد محصلہ کا معنوی جواز اعتباریت جانی جاتی ہے۔ اسباب، علل اور ان کی نوعیت سے بحث ہوتی ہے اور مدلل بحث سے وضاحت کی جاتی ہے جب کہ خارجی تحقیق میں محقق یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جن مسائل اور دستاویزات کو تحقیق کا ماخذ بنایا گیا، وہ کب اور کن حالات میں وقوع پذیر ہوئے، ان کی لسانی و صوری معتبری کا کیا حال ہے۔

تنقیدی مواد سے تحقیق کے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں اور انہیں نتائج کی روشنی میں محقق اپنی سفارشات پیش کرتا ہے۔

زیر نظر تحقیقی مقالہ میں دونوں طریقے اپنائے گئے ہیں۔ باب دوم اور سوم میں جو کچھ درج کیا گیا ہے، اس کے ہر ہر پہلو پر باب چہارم میں خاطر خواہ تبصرہ کر کے سفارشات پیش کی گئی ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کی تحریک اور خدمات کو سمجھنے کے لیے اس دور کو ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے کے دور کو سمجھنا ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر دارالعلوم کی اہمیت کا اندازہ ہو ہی نہیں سکتا۔

مولانا محمد قاسمؒ اور ان کے رفقاء نے جس زمانہ میں مسلمانوں کی خدمت کا بیڑا اٹھایا، وہ ہندوستانی مسلمانوں کا سخت ترین دور تھا۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد جو سیاسی زوال ہوا، اس نے زندگی کے ہر ہر شعبے کو رُو بہ انحطاط کر دیا تھا۔ مسلمان سماجی، علمی، تہذیبی، اقتصادی غرض کہ ہر ہر شعبے میں ناگفتہ بہ حالت کا شکار بن چکے تھے۔ انگریز جو سات سمندر پار سے بطور تاجر اس ملک میں آئے تھے، اب حاکم تھے۔ ان پر سیاسی اور تبلیغی دونوں طرح ذمہ داریاں آن پڑی تھیں، جہاں تک ہو سکا انھوں نے سیاسی فوائد سے فائدہ اٹھایا، مگر سماجی فرائض سے کنارہ کش ہی رہے۔ مگر

تھا کہ کچھ تو تاریخی شہادت کہ حکومت وقت مذہبی و فلاحی امور کی ذمہ دار رہا کرتی ہے، کچھ چند حقیقت پسند انگلستان کی ہمدردانہ پالیسیوں کے اصرار پر وہ مجبور ہو گئے کہ کم از کم تعلیمی میدان میں کچھ نہ کچھ کام کریں۔

کام کی ابتداء پرانے تعلیمی نظام کی چھان بین سے ہوئی جو بہار، بمبئی اور بنگال کی رسمی تعلیم پر تحقیق ہوئی۔ یہ تحقیق گو پوری طرح یقینی نہیں کہلا سکتی، مگر اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مقامی حالات اور ضروریات کی روشنی میں پرانا طریقہ کم خرچ اور بالا نشین والا تھا۔ آدم کی رپورٹ میں تو واضح الفاظ میں سفارش ملتی ہے کہ جدید تعلیم کی بنیاد قدیم اداروں پر قائم کی جائے، تاکہ ایک طرف اہل ہند راضی رہیں تو دوسری طرف حکومت کو بھی زیادہ مالی بار اٹھانا پڑے۔

مگر کمپنی کے ناخداؤں کو یہ سفارش پسند نہ آئی۔ ان کے پیش نظر تعلیم پھیلانے کی نسبت اپنا منفرد مقصد حاصل کرنا زیادہ اہم تھا۔ بقول ایف ای لا، وہ تو ایسی تعلیم کے حق میں تھے، جو عیسائیت کے فروغ میں مدد ثابت ہو سکے۔ اسی لئے ۱۶۱۴ء میں ایسے اقدامات کیے گئے کہ کمپنی کے خرچ پر پادری وہ علم پھیلائیں جو ان کے عقیدے اور کمپنی کے مقاصد کے شایان شان ہو۔ اسی طرح ۱۶۵۹ء میں کورٹ آف ڈائریکٹرز نے فیصلہ کیا کہ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں عیسائی مذہب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔ پادری صاحبان کو بھی احساس تھا کہ عوام تک رسائی کا مؤثر ترین ذریعہ مدارس ہی ہیں، اس لیے انھوں نے کمپنی کی آواز پر لبیک کہا۔ اس طرح کمپنی اپنے طور پر تعلیم کے فرض سے سبکدوش ہو گئی اور مشنریز نے بطور مبلغ یہ کام شروع کر دیا۔

۱۷۶۵ء میں کمپنی کو ہر طرح سے سیاسی بالادستی حاصل ہو گئی، تو اس نے رویہ بدلا اور یہ ظاہر کیا جانے لگا کہ حکومت لادینی نظریات کی حامل ہے۔ مشن والے بھلا یہ تبدیلی کس طرح گوارا کرتے۔ اس لیے ولبرفورس نے ۱۷۹۳ء میں چارٹر کی توثیق کے وقت ہندوستانیوں کی اخلاق

اور مذہبی اصلاح کی طرف خصوصی توجہ دینے کا مطالبہ کیا، اس سلسلے میں سیاسی مصالح کا لحاظ بھی ضروری تھا اس لیے انھوں نے صرف یہ مطالبہ کیا کہ ایسے قابل افراد کی خدمات حاصل کی جائیں جو بطور معلم یا مشنری کام کرتے رہیں۔ کمپنی کی طرف سے اس تجویز کی سخت مخالفت ہوئی اور یہ تجویز رد ہو گئی، مگر مشنریز حد درجہ سیخ پا ہو گئے۔ انھوں نے تقریر کا وہ سلسلہ شروع کیا، جو ذاتی حملوں تک پہنچ گیا۔ مشنریوں کا سب سے بڑا نمائندہ چارلس گرانٹ تھا جس کا طویل مضمون حد درجہ نفرت اور تضحیک کا مظہر تھا، اس نے انگریزوں کو ہندوستانیوں سے متنفر کرنے کے لیے ان کے کردار کو زیادہ سے زیادہ گھناؤنا کرکے دکھایا اور پھر ان کی اصلاح کے لیے واحد علاج یہ تجویز کیا۔ کہ مغربی ادب اور فلسفۂ حیات کو اس طرح پھیلایا جائے کہ رفتہ رفتہ پورا ہندوستان مسیح کا پیرو بن جائے۔

اس مضمون کے چھپتے ہی گرانٹ کے دوستوں نے ایک طوفان سا کھڑا کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۱۳ء کا ایکٹ پاس ہوا۔ اور مشنریوں کو نئے سرے سے جان مل گئی۔

مشنریوں نے نئے سرے سے کام شروع کیا تو اب ان کا رہبر میکالے تھا جو ہر طرح سے گرانٹ کا جانشین تھا، اس نے سب سے پہلے مطالبہ یہ کیا کہ کمپنی ہر سال جو ایک لاکھ روپیہ دینے پر مجبور ہے۔ اسے مشنری کر دیا جائے تاکہ مغربی علوم کو ترویج دی جاسکے، گو لارڈ منٹو مشرقی علوم کا طرفدار تھا مگر راجا رام موہن رائے کی درخواست کی وجہ سے لارڈ میکالے کو کافی تقویت ملی اور اس نے ہندوستانی السنہ پر دل کھول کر طعن و تشنیع کیا، وہ اس حد تک غلو کا شکار ہو گیا کہ مشرقی تہذیب اور مذاہب تک کا مذاق اڑانے لگا۔ اس کی چرب زبانی رنگ لائی اور وائسرائے نے ۱۸۲۵ء میں اس کی تمام تجاویز کو مانتے ہوئے جملہ رقوم انگریزی علم و ادب کی ترویج کے لیے وقف کر دی، اس طرح ہندوستانیوں کو وہ تعلیم دی جانے لگی، جو بقول لارڈ میکالے ایسے نوجوان پیدا کرنے کے قابل تھی، جو رنگ اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں، مگر دل و دماغ کے اعتبار سے فرنگی ہوں اور جس کا واحد مقصد یہ تھا۔ کہ ہندوستان کو ایسی سرزمین میں بدل دے جس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عیسیٰ مسیح کا جھنڈا لہرا رہا ہو

عام کہاوت ہے کہ شامت اور بدنصیبی کبھی تنہا نہیں آتی یہی صورت حال ہندوستانی مسلمانوں کو پیش آئی۔ انگریز اپنے اقتدار کے نشے میں مست ہو رہا تھا۔ اور بھولے بھالے مشکوک الحال افراد کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا اس کی شہ پر ہندوؤں کو بھی یہ جرأت ہوئی کہ مسلمانوں سے الجھیں اور اپنے مذہب کا پرچار کریں، چنانچہ شاہجہاں پور میں منشی پیارے لال کبیر پنتھی نے ایک مذہبی جلسہ منعقد کرایا اور اس میں مسلمانوں عیسائیوں اور ہندوؤں کے مناظرہ کا بندوبست کرا دیا۔ ہندوؤں نے تو سرسری سی بات کرکے جان چھڑالی۔ مگر پادریوں اور علما میں خاصی ٹکر ہوئی۔

اسی قسم کا دوسرا جلسہ شاہجہانپور میں ہوا جس میں دیانند سرسوتی اندرمن وغیرہ نے خاصی ہرزہ سرائی کی۔ پادری تارا چند پادری کارل فنڈر وغیرہ کا زہر اگلنا بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں

آریہ فتنہ دو ہاتھ اور آگے بڑھ گیا ان کے کرتا دھرتا دیانند سرسوتی نے انگریزوں کی شہ پر مسلمانوں کو مرتد بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی ان کے سیکڑوں چیلے بھی میدان میں آگئے۔ رڑکی میرٹھ وغیرہ میں اس نے خاصے عرصے طوفان برپا کیے رکھا۔

جابر حکومت پادری اور آریا سماجی فتنے ہی کیا کم تھے کہ گلشن اسلام کو ویران کرنے کے لیے کچھ دوست نما دشمن بھی شریک ہو گئے۔ ادھر عوام کا یہ حال کہ بھولے بھالے مسلمان رسوم و رواج کو اپنا چکے تھے بجائے اس کے کہ سنت نبوی پر کاربند ہوتے۔ ان کے دلوں کی کایا کچھ اس طرح پلٹ چکی تھی کہ بربادی کا شادی، جہل کا نام علم اور مشرکانہ رسوم کا نام اسلام رکھ دیا تھا۔ معصیت اور جہالت کی گھنگھور گھٹائیں امنڈ امنڈ کر ہندوستان پر محیط ہو رہی تھی۔ ہر چہار جانب سے جہالت ضلالت اور گمراہی کا طوفان رشد و ہدایت سے

بڑھاتا تھا، سرسید کی تحریر اور سنت نبوی کی توہین روز بروز بڑھ رہی تھی، عوام خود کو
علماء حق سے مستغنی تصور کرنے لگے تھے، کہیں رفض و تشیع کا زور تھا، تو کہیں عام
تقلید جمود سے رہی تھی، طبلہ سارنگی، گھر گھر قوالی ہوتی، بازاری عورتوں کے
گانوں پر وجد و حال ہوتا، گور پرستی، تعزیہ پرستی، حب جاہ، حب مال وغیرہ
کا یہ حال کہ بے ساختہ دل سے یہ شعر نکلتا۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

یہ تھے وہ دل گداز اور صبر آزما حالات جن کی وجہ سے علماء وقت
یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ اگر فوری طور پر دینی اور مذہبی طور پر مسلمانوں کی حفاظت
اور تربیت کا سامان نہ کیا گیا تو سخت خطرہ ہے کہ مسلمان ارتداد کا شکار ہو جائیں
گے۔ ان کے خیال میں سب سے مقدم یہ ضرورت تھی کہ قرآن و حدیث، فقہ
تاریخ، سلف صالحین کے کارنامے اور اقدار کو مسلمانوں تک پہنچایا جائے۔
یہ فیصلہ کسی ایک فرد کا نہ تھا، بلکہ کئی سینوں دلوں کا فیصلہ تھا۔ یہ حضرات مستقبل
بعید کو اپنے تدبر اور فکر کے آئینے میں حال کی طرح دیکھ رہے تھے، اور
متلاشیان حق کو پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء بروز جمعرات تاریخ کا وہ مبارک
دن ہے جس میں پیغمبر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی امانت کا چشمۂ علم
سرزمین دیوبند سے پھوٹا اور رشد و ہدایت کا پودا شجرۂ طوبیٰ بن کر پھیلا جس
کے لذیذ پھل سے دنیائے اسلام کی علمی بھوک ختم ہونے لگی اور جس کی سرسبز
شاداب شاخوں کے سائے کے نیچے جہالت اور غفلت کی باد سموم میں
تھکے ماروں کو چین اور اطمینان نصیب ہوا اور اس صاف اور شفاف چشمہ
سے نہریں اور ندیاں پھوٹ پھوٹ کر نکلیں اور ایشیا بھر کے مردہ دلوں
کو زندہ اور اجڑے قلب کو لہلہاتا ہوا چمن بنا دیا، اس مبارک تقریب میں
بہت سے باخدا بزرگ جمع ہوئے اور دارالعلوم کی موجودہ عالیشان عمارت
کی شمال جنوب کی طرف محلہ چھتہ میں انار کے درخت کے نیچے مدرسے کے
اس مدرسے کا افتتاح ہوا۔ سب سے پہلے معلم حضرت ملا محمود صاحب
اور سب سے پہلے متعلم حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قرار پائے
اس مبارک مدرسے کے آغاز کی خبر جب بتانے والوں نے مکہ
مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ تعالیٰ کو پہنچائی اور
دعا کی درخواست کی تو موصوف نے فرمایا

سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم
کیا ہے، یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سر
بسجدہ ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا ہندوستان میں
بقائے اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر! یہ
مدرسہ ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔

بلاشبہ دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں تحفظ اور بقائے اسلام کا ذریعہ
ہے اور اس کی وجہ سے ہزاروں پیاسوں کو سیرابی نصیب ہوتی ہے۔

پینے میں آگئیں، کہاں بیٹھی ہیں مستیاں
اتنی ہے تشنگی، یہاں مست ہوا ہی نہیں

لارڈ میکالے نے تعلیم کی اسکیم پیش کرتے ہوئے نعرہ بلند کیا تھا کہ
ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے
ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں۔ یہ آواز ایک
فاتح اور برسر اقتدار قوم کی آواز تھی اور اس نے اس آواز کو حقیقت بنانے
کے لیے بھی تعلیم کو ذریعہ بنایا تھا جو فاتحین کا انقلاب آفریں حربہ ہے۔ یہ
حربہ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی کارگر رہا تھا۔ اس تعلیم سے ایسی نسلیں ابھریں اور شائع
ہو گئیں جو گوشت پوست کے لحاظ سے بیشک ہندوستانی تھیں، لیکن اپنے
طرز فکر اور سوچنے کے ڈھنگ سے خالص انگریز ہو چکی تھیں۔ اس خطرناک
انقلاب کو دیکھ کر مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم قائم کیا

... نعرہ لگایا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے مسلمان ہوں، جن میں اسلامی تہذیب و تمدن کے جذبات بیدار ہوں اور دین و سیاست کے اعتبار سے ان میں اسلامی شعور زندہ ہو۔

اس مدرسہ کے قیام کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مغربیت کے ہمہ گیر اثرات کی راہ میں بند کھڑا ہو گیا۔ اب تک بات یک طرفہ تھی مگر اب یکطرفہ نہ رہی، بلکہ ایک طرف اگر مغربیت کے پرستار طبقے نے پھیلنا شروع کیا تو دوسری طرف مشرقیت نواز اور اسلامیت طراز طبقہ بھی بیدار ہونے لگا۔ اب یہ خطرہ باقی نہ رہا کہ مغربی سیلاب سارے ملک و ملت کو بہا لے جائے گا۔ بلکہ یہ خیال ہونے لگا کہ اس کی تند کاری بہاؤ پر کسی کا تو استحکام بند باندھ سکتے ہیں کہ یہ ریلا آزادی سے بڑھ نہ سکے گا۔ بلکہ اس کے راستے میں مدافعتی بند موجود ہوں گے جو اسے آزادی سے آگے بڑھنے نہ دیں گے۔ بہرحال وہ نیک ساعت آ گئی کہ مدرسہ کا کام شروع ہوا۔ محمود دیوبندی نے اپنے سامنے ایک شاگرد کو کہ جو خود بھی محمود (محمود الحسن شیخ الہند) تھے۔ بٹھا کر چھتہ کی مسجد کے کھلے صحن میں انار کے درخت کے زیر سایہ دارالعلوم کا افتتاح کیا۔ نہ کوئی مظاہرہ تھا، نہ شہرت پسندی یا نام و نمود کا سلسلہ۔ بس ایک شاگرد تھا اور ایک استاد۔ شاگرد بھی محمود تھا اور استاد بھی محمود تھا۔ ان نفوس کے اجتماع سے لاکھوں افراد کے ایمان کی حفاظت کی اسکیم معرض وجود میں آ گئی اور قسمت ایمانی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

نتائج قیام دارالعلوم

دارالعلوم کی جماعت اپنے مسلک کی ہمہ گیری کی وجہ سے ہر فتنہ کی مدافعت کے لیے سینہ سپر رہی ہے، خواہ فتنہ نقل و روایت کی راہ سے آیا ہو۔ یا عقلیت پسندی کی بنیاد سے اٹھا ہو۔ اس جماعت نے ہر دور میں اعلائے کلمۃ الحق اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ادا کیا ہے۔ اور اسی اسلوب اور اسی رنگ میں جس رنگ ڈھنگ سے فتنہ نے سر اٹھایا مثلاً جب فتنہ نے تصوف کی جانب سے بدعات، محدثات اور شرکیہ حرکات کا فتنہ روایتی انداز میں ابھرا، تو اس کا روایتی طور پر ہی مقابلہ کیا۔ اصل فتنہ کے سب سے بڑے اسباب پسند روایتوں کی قلعی کھول کر شریعت، طریقت کی مستند نقل سے اس کا استیصال کیا اور مقابلہ میں نقل و روایات کا بڑا ذخیرہ پیش کر دیا۔ درمیان عقل و اجتہاد کی طرف سے آزادی فکر، عدم اتباع سلف اور نیچریت کا فتنہ عقل محض کا سہارا لے کر دین میں داخل ہونے لگا، تو اس نے عقلی دلائل پیش کر کے کامیاب مدافعت کی اور جس کے حضرت بانی دارالعلوم قدس سرہ نے ایک مستقل حکمت کلام مدون فرما دی جس کے سامنے فلسفہ کسی بھی روپ میں آیا، تو اس نے فلسفہ کے انداز کو پہچان کر اس کے راستے روک دیے۔

مفروضہ کی جانچ

دارالعلوم کے منافع

دارالعلوم نے اس نوعیت کے بے شمار افراد پیدا کیے۔ جنہوں نے تعلیم، درس، تصنیف، افتاء، مناظرہ، صحافت، خطابت، تبلیغ، حکمت اور طب میں بیش بہا خدمات سر انجام دیں۔ ان افراد نے مخصوص حصے میں نہیں بلکہ ہند و پاک کے ہر ہر شعبے اور بیرونی ممالک میں قابل قدر کارنامے سر انجام دیے ہیں۔ آج جب کہ قیام کو سو سال ہو چکے ہیں ہم اس قابل ہیں کہ اس کی خدمت کا سرسری جائزہ لیں مگر یہ کام خاصا طویل اور صبر آزما ہے۔ اس مقالہ کی گنجائش اسے سمونے سے قاصر ہے۔ اس لیے صرف مغربی پاکستان کا سرسری ذکر کر کے ہم صرف گوشواروں کی مدد سے اپنے جائزے کو محدود اور مختصر کریں گے۔

دارالعلوم دیوبند اور مغربی پاکستان

تحریک احیائے دین کو لے کر چلا تھا۔ اللہ کے فضل اور اس کے بانیوں کی نیک نیتی کی بنا پر وہ روز بروز آگے بڑھتا گیا تفصیل کی گنجائش نہیں، ہم مختصر اس کی ترقی کا حال درج کئے دے رہے ہیں۔

پنجاب

پنجاب میں ۱۹۷۱ء تک ۵۸۰ مدارس عربیہ کام کر رہے تھے۔ ان مدارس میں دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل طلبا میں سے ۲۵۵ طلبا بطور اساتذہ خدمات سرانجام دے رہے تھے ۱۷۱ اساتذہ ان ہی مدارس کے فارغ التحصیل تھے اور ۳۷۱ اساتذہ سرکاری سندات کے حامل تھے۔ جہاں تک طلبا کا تعلق ہے، ان مدارس میں ۱۹۷۱ء میں ۲۹۰۹۹ طلبا زیر تعلیم تھے، جن میں سے ۴۵۵۰ طلبا مدارس کے دارالاقامہ میں تھے، اور ان پر اس سال خرچ کا میزان ۴۴،۳۴،۵۸۴،۱۱،۱۷ روپے ہوا تھا۔

سندھ

سندھ میں ۱۹۷۱ء میں ۱۲۰ مدارس عربیہ کام کر رہے تھے۔ ان مدارس میں فارغ التحصیل طلبا میں سے ۲۱۰ طلبا مدرس تھے۔ ۵۰ اساتذہ انہیں مدارس کے فارغ التحصیل تھے اور ۳۴ اساتذہ سرکاری سندات کے حامل تھے جہاں تک طلبا کا تعلق ہے۔ ان مدارس میں ۱۹۷۱ء میں ۵۴۳۱ طلبا زیر تعلیم تھے جن میں سے ۲۲۳۴ طلبا دارالاقامہ میں مقیم تھے اور ان پر اس سال کا خرچہ ۶۲۴۸۷۵،۰۳۶ روپے تھا۔

صوبہ سرحد

صوبہ سرحد میں ۱۹۷۱ء میں ۱۴۹ مدارس عربیہ کام کر رہے تھے ان مدارس میں دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل طلبا میں سے ۲۴۵ مدرس ہیں، ۵۲ مدرس ان ہی مدارس کے فارغ التحصیل ہیں اور ۷۳ مدرس سرکاری سند رکھتے ہیں، طلبا کی تعداد ۹۵۰۹ ہے جن میں سے ۱۶۹۹ طلبا دارالاقامہ میں مقیم تھے اور ۱۹۷۱ء میں ان کا صرفہ ۵۰۰۰۰۰،۱۱،۱ روپے تھا۔

بلوچستان

بلوچستان میں ۱۹۷۱ء تک ۴۴ مدارس عربیہ کام کر رہے تھے۔ ان مدارس میں دارالعلوم کے فارغ التحصیل ۴۷ اساتذہ مقامی مدارس کے فارغ التحصیل ۱۲ اساتذہ ہیں۔ سرکاری سندات کے حامل ۵ اساتذہ تھے، طلبا کی تعداد ۱۲۰۰ تھی۔ جن میں سے ۴۲۰ طلبہ دارالاقامہ میں رہتے تھے۔ ان کا اس سال کا خرچہ ۴۰۰ء ۴۵۳۵۶ روپے تھا۔

مدارس کی صوبہ وار تقسیم

مغربی پاکستان میں مدارس عربیہ کی، مسلک کے اعتبار سے تقسیم اس طرح ہے

نام صوبہ	تعداد مدارس	دیوبندی	بریلوی	متفرق
پنجاب	۵۸۰	۱۷۳	۹۳	۳۱۴
سندھ	۱۲۰	۴۶	۱۵	۵۹
بلوچستان	۴۴	۱۸	۱	۲۵
سرحد	۱۴۹	۹۸	۱۱	۴۰

اس سرسری جائزہ کے بعد ہم خصوصیت سے چارٹ نمبر ۱ تا نمبر ۱۰ شامل کر رہے ہیں، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ یہ خیر جاری کس حد تک جاری اور مؤثر ثابت ہوتی ہے۔

۱۔ **فارغ التحصیل طلبا۔** دارالعلوم سے گزشتہ سو سال میں ہزاروں طلبا،

تعلیم پا رہے تھے۔ یہ طلبا ہندوستان کے باشندوں میں سے بھی تھے، اور غیر ممالک سے آئے ہوئے بھی تھے۔ گوشوارہ نمبر ۱ میں ان طلبا کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔

۲۔ مصنفین دارالعلوم

درج بالا ہزاروں فضلا میں سے بے شمار نے عملی زندگی میں مسلمانوں کی خدمت اور دین متین کی حمایت کو اپنا شعار بنایا۔ ہر ہر فرد نے عوام کی دینی خدمت کی۔ مگر چند ہستیاں ایسی ہیں جن کے قلم سے مسلمانوں کی اصلاح کا خصوصی التزام ہوا۔ گوشوارہ نمبر ۲ میں چند معروف مصنفین کے اسمائے گرامی اور ان کی تحریر کا رنگ بتایا گیا ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم نے جانے پہچانے حضرات کے نام درج کیے ہیں، ورنہ فہرست بہت طویل ہو جاتی ہے۔

۳۔ مغربی پاکستان کے عربی مدارس

جیسا کہ ہم نے درج بالا سطور میں عرض کیا تھا، دارالعلوم سے فارغ التحصیل عالم نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنایا تھا کہ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائے گا۔ عموماً ان کی رائے بھی یہی تھی کہ اشاعت اس کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ جو حضرات دارالعلوم سے فیضیاب ہو کر نکلے انھوں نے جگہ جگہ دینی مدارس قائم کیے۔ گوشوارہ نمبر ۳ اور ۴ میں مغربی پاکستان کے دینی مدارس کی تعداد کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ اسی طرح گوشوارہ نمبر ۵ میں چند مشہور مدارس کے ۱۹۷۱ء کے کوائف کی نشاندہی کی گئی ہے۔

درج بالا حقائق کے پیش نظر ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ بلا شبہ دارالعلوم دیوبند نے مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی راہ میں سب سے مضبوط بند کھڑا کیا۔ اور آج ہم ہندوستان و پاکستان میں مشرق نواز اور اسلام طراز طبقہ کا جو وجود پاتے ہیں، وہ اسی کی طفیل ہے، کہنے کو تو کم و

بیش اسی قسم کے مقاصد لے کر مدرسہ عالیہ کلکتہ، مدرسۃ العلوم علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ندوۃ العلما لکھنؤ، اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر بھی قائم کیے گئے تھے مگر ان میں سے ہر ایک حکومت برطانیہ اپنے مزاج کے مطابق پالیسی کو پھر ان کے فارغ التحصیل طلبا کا مقصد اول اپنے علم کے ذریعے طلب زر ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبا میں سے الا ماشاء اللہ ایک نے بھی مسلمانوں کی فلاح کے لیے نمایاں کام سرانجام نہیں دیا، ممکن ہے بعض حضرات قیام پاکستان کو اپنے ثبوت کے طور پر پیش کریں۔ مگر یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اسلام کی آڑ لے کر سیاسی مفاد کا حصول ان کے پیش نظر رہا ہے۔ اسلام یا مسلمانوں کی خدمت کسی کے ہاں بھی نہ تھی اور اس کا ثبوت وہ حالات اور واقعات ہیں جن کا عملی مظاہرہ گزشتہ ۲۲ سال میں ہوا۔ کاش یہ افراد صحیح خطوط پر تربیت پائے ہوئے ہوتے کاش: ان کے دلوں میں خوف خدا، خدمت اسلام اور فلاح مسلمان کا جذبہ پیدا کر دیا جاتا تاکہ پاکستان کی تقدیر اس سے مختلف ہوتی جو آج نظر آ رہی ہے۔ اگر ان مدارس کے قیام کا مقصد بھی سرکاری ملازمتوں کے لیے کلرک افسر یا اسی قسم کی کوئی اور شخصیت پیدا کرنا تھا، تو میکالے کے قائم کردہ مدارس کیا برے تھے۔ اگر ان فارغ التحصیل طلبا کی دینی معلومات کا دائرہ بھی اسی قدر محدود اور تنگ رہنا تھا کہ یہ نہ کلمہ طیبہ جانتے ہوں، نہ نماز روزہ کے قیام کا التزام کر سکتے ہوں، تو ان میں دینیات (نظری)، وغیرہ پڑھانے اور اس طرح ان کا اسلامی نام رکھنے کا جواز نکال لینے کی کیا ضرورت تھی۔

اندکے با تو گفتم و بدل ترسیدم
کہ آزردہ خاطر شوی ورنہ سخن بسیار است

والسلام خیر ختام
رقیمہ نیاز
پیرزادہ احمد حسن جامی ایم ایڈ

از قلم مولانا محمد اسحاق خان کشمیری : متعلم الجامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ

یہ ان دنوں کی بات ہے، جب راقم الحروف نے معقولات کی کتابیں حضرت علامہ کشمیری صاحب مدظلہ العالی سے پڑھنے کے لیے مدرسہ خیرالمدارس ملتان میں درجۂ تکمیل میں داخلہ لیا۔ ۱۹۷۶ء کا یہ سال حضرت علامہ موصوف برکاتہم سے استفادہ میں گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور خیرالمدارس کا سہ روزہ سالانہ اجلاس مدرسہ کے گراؤنڈ میں ہو رہا تھا، آخری نشست تھی جو نسبتاً زیادہ اہتمام سے منعقد کی جاتی ہے۔ وسیع و عریض پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سٹیج پر استاذ الاساتذہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب نور اللہ مرقدہ کا نورانی چہرہ لاٹیں مار رہا تھا۔ شیخ التفسیر حضرت مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ جیسی شخصیات بھی سٹیج پر تشریف فرما تھیں۔ سکون و اطمینان اور زہد و وقار کی ایک نورانی چادر ساری جلسہ گاہ پر تنی ہوئی معلوم ہو رہی تھی اور پاکستان کے ایک ممتاز و معروف خطیب جو اب تک بقید حیات ہیں، اپنے مخصوص و مؤثر انداز خطابت سے سامعین کو محظوظ فرما رہے تھے۔

ایک عجیب واقعہ

خطیب صاحب نے اپنے خطاب کے دوران ارشاد فرمایا کہ ۵۲ء میں ہمیں ایک گروپ کے طور پر چین کے مختلف علاقوں کے دورہ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس دوران ہم ایک دور دراز علاقے میں پہنچے، جہاں ہم سے معلومات حاصل کرنے کے لیے کسی بڑی عمر کے شخص کے بارے میں پوچھا، تو بتایا گیا کہ یہاں قریب ہی ایک بڑی عمر کے شیخ موجود ہیں۔ ہم نے ایک شخص کو بھیجا کہ جا کر ان سے کہو کہ پاکستان سے آئے ہوئے چند آدمی آپ سے ملنا چاہتے ہیں، تو ان بڑے میاں نے کہا کہ پاکستان کیا اور کہاں ہے۔ جب اس شخص نے واپس آکر بڑے میاں کا یہ جواب سنایا تو ہم نے اسے سمجھایا کہ ہندوستان جو ایک بڑا ملک تھا، آج سے کوئی ۵ سال قبل (۱۹۴۷ء) میں تقسیم ہو گیا ہے ایک حصے کو بھارت کہتے ہیں اور دوسرے کو پاکستان، جو دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ لیکن اس پر بھی بڑے میاں کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا اور اس شخص سے کہلوا بھیجا کہ ان سے جا کر پوچھو کہ دیوبند کو جانتے ہو۔ اس شخص نے جب واپس آکر بڑے میاں کا یہ جواب ہمیں سنایا تو باعث تعجب کی انتہا نہ رہی کہ ایک شخص جو پاکستان جیسے عظیم ملک کو اس کے ۵ سال بعد بھی نہیں جانتا، حالانکہ اس کی تشہیر و نشر و اشاعت کے بیسیوں ذرائع ہیں۔ وہ دیوبند کے ایک چھوٹے سے قصبہ کو کیونکر جانتا ہے۔ خیر ہم نے استعجاب کے ان جذبات کے ساتھ اس شخص سے کہا

کہ ہاں ہم دیوبند جانتے ہیں۔ اس کے بعد جدی ملاقات ہوئی۔ مبادلۂ خیالات کے دوران ہم نے ان سے پوچھا کہ میاں آپ جو پاکستان جیسے بڑے ملک کو نہیں جانتے۔ دیوبند کو کیونکر جانتے ہیں، تو انھوں نے بتایا کہ میں نے ۱۳۲۲ھ میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث پڑھا ہے۔ سبحان اللہ آپ اندازہ فرمائیے۔ سلسلۂ کوہ ہمالیہ کے اس پار رہنے والے اس گوشہ نشین اور دُنیا سے بے خبر انسان کو دیوبند کے قصبے کا پتہ کیونکر چلا اور وہ کس طرح اپنی علمی پیاس بجھانے وہاں پہنچ گیا۔

ایک اور واقعہ

آج سے کوئی تین چار سال قبل راقم الحروف مظفرآباد (آزاد کشمیر کے دارالحکومت) کی سیکرٹریٹ کی مسجد میں نمازِ فجر کے بعد قرآن پاک کا درس دے رہا تھا۔ سامنے ایک سادہ قسم کے پہاڑی دیہاتی بیٹھے ہوئے تھے جن کی عمر تو کافی تھی، لیکن پہاڑی آب و ہوا کے سبب ان کی صحت بہت اچھی تھی، دورانِ کلام ایک علمی بات پر وہ بڑے میاں بولے جس سے ان کے شعور علمی ذوق و ادراک کا پتہ چلا۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ کے اس درس سے فراغت کے بعد دُوسرے ملنے والے دوست احباب کے جھرمٹ میں وہ بزرگ بھی ملنے بیٹھ گئے۔ تعارف کے لیے عرض کیا تو معلوم ہوا کہ وہ مظفرآباد کے دُور دراز پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں۔ ۸۰ سال سے متجاوز عمر ہے اور ۱۳۴۲ھ یعنی اس وقت سے ٹھیک ۵۰ سال قبل محقق المحدثین حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث شریف پڑھا ہے۔ ویسے بھی بحمد للہ دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتگان بڑی تعداد میں آزاد کشمیر کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں اور مختلف مقامات پر مختلف خدمات میں مصروف و منہمک ہیں۔

ایک اور واقعہ

خود راقم الحروف ایک مرتبہ مظفرآباد جانے کے لیے راولپنڈی سے

ایک بس میں سوار تھا، شورش کی وجہ سے درمیان میں کھڑا بیٹھ دیکھنے لگا اتنے میں بس کی پچھلی سیٹوں سے ایک ادھیڑ عمر کے معزز بزرگ نے بلاکر اپنے پاس بٹھا لیا تھوڑی سی دیر کے بعد باہمی کا تعارف ہونے پر پتہ چلا کہ صاحب دیوبند کے فیض یافتہ ایک بزرگ ہیں جو ایک محکمہ میں اعلیٰ درجہ کے ملازم ہیں۔ مجھے جو انھوں نے اپنے انداز میں بلایا۔ جیسے پرانے واقف کار اور جاننے والے ہوں تو اس پر راقم نے تعجب آمیز لہجے میں ان سے پوچھا کہ حضرت آپ نے مجھے کس طرح پہچان کر بلایا تو جواباً فرمایا : بس آپ کو دیکھ کر دیوبند کی خوشبو محسوس ہوئی تو بلالیا۔ پھر انھوں نے دیوبند کے بارے میں کافی کچھ سُنایا، اپنے گھر واقع مری میں مجھے دعوت دی اور حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب سے متعلق ایسا ایک منظوم کلام بھی اپنی عمدہ و دیدہ زیب تحریر میں مجھے عنایت فرمایا۔ پھر ایک عرصے تک ہماری باہمی خط و کتابت بھی رہی لیکن حوادث زمانہ نے زیادہ عرصہ تک اسے جاری نہ رہنے دیا۔ یہاں تک کہ وہ سرورس کی جگر بندیوں میں خدا جانے کہاں گئے اور ہم آب و دانہ کے ہیر پھیر سے کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے ؎

او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

آزاد کشمیر میں دیوبند کی نُورانی شعاعیں

دیوبند کے آفتاب عالمتاب نے جہاں ایک دُنیا کو منور کیا اور ہمارے پاکستان کو بھی نُور نُور کیا، وہاں اس نے کشمیر کے بلند و بالا برف پوش پہاڑوں حسین مرغزاروں اور دل رُبا لالہ زاروں کو بھی محروم نہیں کیا، وہاں تعلیم القرآن کے بیسیوں مدارس چپے چپے پر فرزندانِ دارالعلوم نے قائم فرماکر نونہالانِ ملک و ملت کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام و انتظام فرمایا اور سب سے بڑا دینی مدرسہ دارالعلوم تعلیم القرآن پلندری پونچھ آزاد کشمیر جیسا ایک مرکزی علمی و دینی ادارہ دارالعلوم دیوبند ہی کے تعلیم یافتہ حضرت مولانا محمد یوسف خان صاحب مدظلہم نے قائم فرمایا اور جو ان ہی کی نگرانی میں جہالت کی تاریکیوں کے خلاف جہاد مسلسل

میں معروف ہے اور اس کے بزرگ صفت جواں ہمت مدیر و مہتمم دین و علم دین کی خدمت کے ساتھ ساتھ سماجی و سیاسی میدانوں میں بھی خدمت خلق کے لیے رواں دواں ہیں، جس وہاں کے عوام نے قدر شناسی کے طور پر انھیں کابل کا ممبر منتخب کر کے نئی آرزوؤں و تمناؤں کے ساتھ آگے بھیجا ہے۔ اس دور افتادہ پہاڑی علاقے میں علم و عمل کی یہ سوزش و تمازت دیوبندی کے وجود باجود کی ضیاپاشیوں کا نتیجہ ہے۔ خاص کر دیوبند کے ایک عظیم و بے مثیل حیثم و چراغ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا السید حسین احمد المدنی رحمہ اللہ کی تربیت و صحبت کیمیا اثر کا نتیجہ و ثمرہ ہے۔ اس طرح دیوبند کے منبع فیض کی ضیاپاشیاں وہاں رنگ لا رہی ہیں۔

دیوبند کے اثرات حجاز مقدس میں

دارالعلوم دیوبند کی اس ہمہ گیر فیض رسانی کے اثرات منبع و مرکز اسلام (حجاز مقدس) میں بھی اپنی گرمی دکھاتے رہے۔ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ ترک وطن کر کے حجاز مقدس تشریف لائے اور یہاں بیت الحرام کے جوار رحمت میں رہ کر اطراف و اکناف عالم میں فیض رسانی شروع کی، مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ جو ہندوستان کے ہی ایک عظیم فرزند حضرت مولانا رحمت اللہ رحمہ کے ایمانی جذبے اور نورانی سعی کا ثمرہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ نے اپنا مسکن و مرکز بنایا اور حضرت بانیٔ مدرسہ رحمہ اللہ کی رحلت کے بعد اس کی سرپرستی بھی فرمانے لگے اور حضرت کی سکونت کا کمرہ انبیاؤ مشیرخ دارالعلوم دیوبند کے لیے ایک مقدس و متبرک مقام کے طور پر اب تک محل استفادہ ہے اور مدرسہ صولتیہ جو بانیان دیوبند ہی کے ایک قافلہ سالار (حضرت مولانا رحمت اللہ) کی مقدس یادگار ہے، جو انھوں نے ہندوستان میں پادری فنڈر جیسے وند ناتے عیسائیوں کو شکست فاش اور دیس نکالا دینے کے بعد یہاں آکر بہ ابتداء میں قائم فرمایا تھا، مستقل ایک تاریخ رکھتا ہے جس پر الگ اور مستقل مقالہ لکھنے کی ضرورت ہے، بہرکیف اس طرح علماء دیوبند (کثر اللہ سوادہم) کی یہاں حاضری اور دنیا میں دیوبند کے تعارف کی طرح پڑ گئی

شیخ الاسلام حضرت مدنی کا درس مسجد نبوی میں

یہاں تک کہ مادر علمی دیوبند کے ایک مایہ ناز فرزند جانشین شیخ الہند حضرت مولانا السید حسین احمد المدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان سے یہاں تشریف لاکر مسجد نبوی میں قرآن و حدیث کا درس دینا شروع کیا۔ حدیث پڑھانے اور قال اللہ و قال رسول اللہ کہنے کی سعادت تو الحمد للہ آج بھی بہت سے خوش نصیب بندگان دین کو ملتی ہے، لیکن "قال صاحب ہذا الروضۃ" کہہ کر اور مدفن رسول پر بیٹھ کر حدیث رسول پڑھانے کا جو شرف و اعزاز حضرت مدنی کو حاصل ہوا، وہ کسی کسی ہی کو نصیب ہو سکتا ہے، زہے نصیب۔ اٹھارہ سال تک مسجد نبوی میں روضۂ رسول کے سامنے حضرت مدنی نے علوم قرآن و حدیث کی تدریس فرمائی اور اس دوران برصغیر ہند و پاک کے علاوہ افغانستان، ترکی، سمرقند، تاشقند، بخارا، جاوا، سماٹرا، ہند چینی اور تبت سے عرب ممالک کے طلبہ نے حضرت سے استفادہ کیا اور دیوبند کا فیض ان تک پہنچا، اور حضرت کے مستفیدین و متوسلین اور دیوبند کے بالواسطہ فیض یافتگان اب تک موجود ہیں۔

مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ

اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ حضرت شیخ الاسلام مدنی کے حقیقی بھائی حضرت مولانا محمود احمد المدنی رحمہ اللہ نے مسجد نبوی کے بالکل جوار میں ایک باضابطہ دینی مدرسہ "مدرسۃ العلوم الشرعیہ" کے نام سے قائم کی جو آج سے ٹھیک ۵۵ سال قبل ۱۳۴۰ھ میں قائم کی گئی تھی۔ اور حرم شریف کے باب الملک کے بالکل جوار میں اب تک موجود و فیض رساں ہے، اس کے بانی دیوبند ہی کے ایک تربیت یافتہ و متخرج متبحر عالم تھے۔ اس مدرسہ سے اب تک سینکڑوں علماء نے اکتساب علم و فضل کی سعادت حاصل کی جن میں سے بعض سعودیہ میں اور بعض دوسرے

ممالک میں معروف و مستعمل ہیں اور اس کا دینی کتب خانہ جو عظیم و ضخیم مجلدات
کتب پر مشتمل ہے، آج تک بھی متعلقین کے لیے موجود ہے اور بقیۃ السلف
شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا سہارنپوری دامت برکاتہم مقیم مدینہ منورہ اس
مدرسہ مظاہر علوم میں اقامت پذیر ہیں اور مشرق و مغرب کے عوام و خواص کیلئے
مرجع بنے ہوئے ہیں، سب کی علمی پیاس بجھاتے اور روحانی و باطنی تربیت
فرماتے ہیں، اللہ ان کا سایہ سلامت رکھے۔

ایک عام نظر

غرضیکہ برصغیر ایشیا کی اس عظیم بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں اپنی نوعیت کی
واحد و بے مثال یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند، کا فیض ایشیا سے علاوہ
یورپ، افریقہ وغیرہ پوری ربع مسکون پر پھیلا، پہلے بھی یہ سنتے سناتے آئے
تھے۔ لیکن مرکز اسلام حرمین شریفین، راقم کے دو تین سال قیام کے دوران دنیا
کے جو حالات سننے دیکھنے کا اتفاق زیادہ وسیع پیمانے پر ہوا۔ اس سے راقم
نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ روئے زمین پر انسانی آبادی کا شاید ہی کوئی ایسا حصہ و خطہ
ہو جہاں بالواسطہ یا بلاواسطہ دیوبند کا فیض نہ پہنچا ہو۔ اور ہندوستان میں
جہالت کی دبیز تاریکیوں، شرک و بدعت کے گھٹاٹوپ اندھیاروں اور غیر ملکی سامراج
کے خلاف جہاد میں علمی و عملی میدان میں جو قربانیاں دیوبند نے پیش کیں، اس کا تو
ایک زمانہ شاہد ہے۔ اور اس کا انکار یا اس میں انگشت نمائی تو سورج پر تھوکنے
کے مترادف ہوگی، جس کا ارتکاب شاید کوئی احمق سے احمق اور انتہائی متعصب
اور سرپھرا ہی کر سکے گا۔

دیوبند کا علمی فیض عربی زبان میں

یوں تو دیوبند نے عربی زبان و بیان کی بھی جو ٹھوس اور وقیع خدمت
کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے، کتنے علماء، فضلا اور شعراء دیوبند نے پیدا کیے
اس سب کی تفصیل کے لیے تو ایک مستقل دفتر چاہیے، راقم صرف چند نمونے اس
کے پیش کرنا چاہتا ہے کہ دیوبند کے علم خصوصاً خدمت حدیث سے عرب
کس قدر مستفید ہو رہے ہیں، اس سلسلے میں صرف چند ہی علمی کتابوں کے نام پیش
کرتا ہوں۔ (۱) بذل المجہود فی حل سنن ابی داؤد جو حضرت العلامہ خلیل احمد سہارنپوری
کی دس سالہ محنت و عرق ریزی کا نتیجہ ہے، سنن ابی داؤد کی عظیم و بے مثال شرح
حال ہی میں قاہرہ مصر میں بیس جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، خود عربوں کے
لیے باعث حیرت و استعجاب ہے۔ (۲) اوجز المسالک الی موطا امام مالک کی یہ
اتنی ضخیم اور وقیع شرح جو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا سہارنپوری کی تالیف
ہے، سولہ جلدوں میں بیروت میں چھپ رہی ہے۔ (۳) لامع الدراری علی
جامع البخاری جو شیخ الحدیث مدظلہ کی تعلیقات کے ساتھ دس جلدوں میں
قاہرہ میں چھپ رہی ہے (۴) معارف السنن فی شرح سنن الترمذی جو شیخ الحدیث
حضرت مولانا محمد یوسف البنوری دامت برکاتہم کے علمی جواہر پاروں کا مجموعہ ہے
دس ضخیم جلدوں میں مکمل ہو رہی ہے جس میں سے چھ چھپ کر اور شائع ہو کر شرح
حدیث کے علاوہ عربیت کے بھی ایک شاہکار کے طور پر قبول عام حاصل کر چکی ہیں
یہ تو بطور نمونہ ان چند عظیم کتابوں کا ذکر ہے، جن سے عرب دنیا بھی دیوبند
کی خدمت حدیث و فیض رسانی سے مستفید ہو رہی ہے، ورنہ اس سلسلے کا
احصار تو بڑے طویل بیان اور وسیع فرصت کا متقاضی ہے۔

بے مثال جامعیت

غرضیکہ دارالعلوم دیوبند کو جو جامعیت نصیب ہوئی، اس کی مثال تاریخ
کے صفحات میں بھی شاید ہی کہیں مل سکے، اگر آپ دیوبند کی خدمت تفسیر سے
مستفید ہونا چاہیں، تو بیان القرآن للشیخ التھانویؒ فوائد عثمانیہ للشیخ العثمانیؒ
اور معارف القرآن للشیخ الدیوبندی مدظلہ وغیرہ وغیرہ ابنائے دیوبند کے علمی فن پاروں
سے اپنی پیاس بجھائیے، اگر آپ حدیث رسول ﷺ کو سمجھنا چاہتے ہیں، تو بذل المجہود
(کی ۲۰ جلدوں)، اوجز المسالک کی (۱۶ جلدوں)، معارف السنن (کی دس جلدوں)
لامع الدراری علی جامع البخاری کی (دس جلدوں)، فیض الباری فی شرح البخاری (کی

چار جلدوں) فضل الباری فی حل البخاری (کی دو جلدوں) اور انوار الباری فی شرح صحیح البخاری وغیرہ وغیرہ دیوبند کے نادرۂ روزگار علمی جواہر پاروں سے اپنے ذوق کی تسکین کا سامان کریں، علیٰ ہذا القیاس فقہ، ادب، معانی، بیان وغیرہ جس فن اور جس علم کو دیکھیں گے، وہاں آپ کو دیوبند کی خدمات چمکتی نظر آئیں گی۔ اگر علماء ربانیین کے تذکرے پڑھنے کا ذوق رکھتے ہوں، تو شیخ الاسلام علامہ عثمانی، خاتم المحدثین علامہ کشمیریؒ، حکیم الامت حضرت تھانویؒ، ابوحنیفۂ وقت علامہ مفتی کفایت اللہؒ، شیخ العرب والعجم حضرت مدنیؒ وغیرہ جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ آفتاب و ماہتاب کی حیثیت رکھتا تھا اور زاق ابراہیم کان امۃ کا مصداق تھا اور ان سب کے شیخ و مربی شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ کی کردار ساز زندگی سے اپنے لیے علم و عمل کی راہیں استوار کریں۔ اگر آپ زہد و تصوف اور تقویٰ و طہارت کے معیار پرکھنا چاہیں تو آپ کو تربیت گاہ دیوبند میں ایسے نجوم نظر آئیں گے، جو اپنے اپنے دور کے شبلی و بغدادی تھے، اگر عربی اُردو اور فارسی زبانوں کی ادبی خدمات کے بارے میں جاننا چاہیں گے، تو اس میں بھی یہی اساطین امت پیش پیش نظر آئیں گے۔ اگر آپ انگریزی سامراج اور غیر ملکی استعمار کے خلاف جہاد حریت کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیں گے، تو اس میں دیوبند کے پروردہ سربکف اور کفن بدوش مجاہدوں کی داستانیں ایک ایک ورق پر موتیوں کی طرح بکھری نظر آئیں گی، اگر آپ عیسائیت، قادیانیت، پرویزیت، رافضیت اور الحاد و دہریت جیسے اندرونی و بیرونی فتنوں اور سازشوں کی سرکوبی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں گے، تو اس میں علمی قلمی اور عملی ہر میدان میں دیوبند کے مایۂ ناز سپوت ہر محاذ پر سینہ سپر نظر آئیں گے خطباء و ادباء کے اوصاف و کمالات جاننے کا شوق رکھتے ہوں تو سلسلۂ دیوبند کے ایسے اساطین نظر آئیں گے، جن کے زبان و بیان کے سحر کے سامنے پہاڑ بھی وجد میں آجائیں، سمندروں کی لہروں میں جوش آجائے اور ہواؤں کے رُخ مُڑ جائیں، غرضیکہ کوئی گوشہ و زاویہ اور کوئی کنارہ و پہلو ایسا نہ پا سکیں گے، جہاں فیض دیوبند کی کرشمہ سازیاں جھلمل جھلمل کرتی نہ نظر آتی ہوں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں قدرتی طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ دیوبند کے اس ادارے کو یہ ہمہ گیر، وسیع اور ہمہ پہلو نفوذ اور مقام و مرتبہ کس طرح حاصل ہو گیا۔ ایک ایسا ادارہ جو عام دُنیاوی اداروں کی شان و باٹھ اور آن بان و ٹھاٹھ باٹھ کے برعکس انار کے ایک درخت کے نیچے ایک استاذ اور ایک شاگرد کے مٹی پر بیٹھ کر درس و تدریس کے آغاز سے اپنا سفر شروع کرتا ہے، جو وقت کی جابر و قاہر حکومت سے معاونت و مساعدت کی بجائے اس کی مخالفت اور اس کو دیس نکالا دینے کو اپنا نصب العین و مقصد قرار دیتا ہو، جو حکومت سے امداد طلب درخواست کرنے کی بجائے اس کی از خود ملنے والی کسی امداد کو بھی بہت برا نہ رکھتا ہو اور بطور خاص یہ اصول بنا رکھا ہو کہ حکومت کی کسی قسم کی کوئی امداد قبول نہیں کرنی ہے جو نشر و اشاعت اور پروپیگنڈے کے معروف ذرائع کو نہ صرف یہ کہ اختیار نہیں کرتا، بلکہ نمود و نمائش کے اس کاروبار کو جائز ہی نہیں سمجھتا، وہ کس طرح ایک صدی سے زیادہ عرصے تک نہ صرف یہ کہ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے، بلکہ ہمیشہ رو بہ ترقی رہا، شرق و غرب کی دنیا کو علم کی روشنی سے منور کر رہا ہے۔ ہر میدان میں قائدانہ کردار ادا کیا، ہر جابر و طاغوتی طاقت سے ٹکرایا، ہر ظالم حکومت کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کی مشرق و مغرب میں اس کا آوازہ بلند ہوا، اطراف و اکناف عالم سے تشنگان علم و حکمت اپنی اپنی پیاس بجھانے کے لیے کھچے کھچے وہاں پہنچے۔ ایک استاذ و ایک شاگرد کے مختصر ترین قافلے سے شروع ہونے والے اس گروہ --- میں ہزاروں علماء، فضلاء کی جماعت کیونکر جمع ہو گئی۔ چند روپوں کی معمولی پونجی سے اپنے منصوبے کا آغاز کرنے والے یہ گہوارۂ دانش و بینش لاکھوں کے مصارف کہاں سے اور کیسے برداشت کر سکا وغیرہ وغیرہ اس انتہائی سنجیدہ اور مشکل سوال کا جواب بھی نہایت واضح اور انتہائی آسان ہے کہ یہ اس قادر مطلق کی بے پایاں قدرت کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے، جو کُن فیکون کا مالک ہے اور یہ اسلیے

کہ اس کے بانیوں کے بے انتہا اخلاص و للّٰہیت کا ثمرہ و نتیجہ ہے۔

ایک مقدس مشابہت

ایک روز راقم الحروف بیت اللہ کے سامنے حجر اسود و ملتزم کے عین مقابل کعبہ دالان میں کچھ ہٹ کے نیچے بیٹھا بیت الحرام کے گرد طواف اور اس سے چمٹنے والے فدائی شاعرین کو دیکھ رہا تھا کہ بیت اللہ کو دیکھنا بھی عبادت ہے، تو یکایک ہزاروں سال پہلے کے اس منظر و ماحول میں کھو گیا، جہاں جد الانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک بے آب و گیاہ ویرانے میں اپنے اہل خانہ کو تنہا چھوڑ کر واپس ہوتے وقت اپنے رب سے اس طرح مخاطب ہو رہے ہیں "اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد کو ایک بے آب و گیاہ بستی میں تیرے مقدس گھر کے پاس عبادت کے لیے بسا دیا ہے، میرے رب! پس تو ان کی طرف لوگوں کے دل پھیر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عنایت فرما تاکہ تیرا شکریہ ادا کر سکیں۔" حضرت ابراہیم علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا کو اس کے غایت اخلاص کے سبب اس قدر بے مثال قبولیت سے نوازا کہ ان ہزاروں سالوں میں کروڑہا لوگ جو مشرق و مغرب کے مختلف ملکوں اور قوموں سے تعلق رکھنے والے، مختلف زبانیں اور معاشرے رکھنے والے مختلف رنگ و روپ اور مختلف قد و قامت رکھنے والے سب ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس گھر کا طواف کر چکے ہیں، اور دن رات کا کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا، جب اس گھر کا طواف نہ ہو رہا ہو اور دنیا کا کوئی پھل ایسا نہیں جو ہر موسم میں یہاں نہ ملتا ہو۔ یہ قبولیت سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غایت اخلاص کے سبب تھی۔ اگرچہ کسی امتی کی کسی نبی کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی، لیکن عرض صرف اس قدر کرنا ہے کہ دعائے ابراہیمی کی طرح بانیان دارالعلوم دیوبند کی مساعی جمیلہ کو بھی خصوصی عنایت و قبولیت سے جو ان کے بے مثال اخلاص کی وجہ سے قدرت نے نوازا، تو دیوبند کے اس ادارے نے امت مسلمہ کو اس قدر فیض پہنچایا...

.... خداوند قدوس محض اپنی عنایت سے اسے ہمیشہ قائم و دائم رکھے آمین

ایک حقیقت اور خاتمہ کلام

یہ ایک حقیقت ہے کہ دارالعلوم کی خدمات کے بارے میں کچھ لکھنا کسی فرد کا کام نہیں بلکہ اس جامع المجددین مجموعۂ رشد و ہدایت پر لکھنے کے لیے مستقل اکاڈمیاں درکار ہیں خدائے تعالیٰ کسی کو اس کی توفیق دے۔

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گل چیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ اس کے لیے
کوئی سرمایہ، بھروسہ کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ
یہ سمجھ لینا کہ بے نور و ضیا ہو جائے گا
ہے توکل پر بنا اس کی تو بس اس کا معین
ایک اگر جائے گا، پیدا دوسرا ہو جائے گا

مدارس کے قیام کا مقصد

اپنے موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھتے چلیں کہ ہندوستان میں عربی مدارس کے قیام کے پس منظر میں کیا جذبہ کارفرما تھا۔ ۱۸۵۷ء کی شکست و ریخت کے بعد دینی، مذہبی تعلیم کے لیے قوم کے سرمائے سے چلنے والا سب سے پہلا مدرسہ دارالعلوم تھا۔ انگریزوں نے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو زبردست نقصان پہنچایا تھا، دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان گجرات لکھنؤ، خیرآباد، بنگال، مدراس، اور بہار وغیرہ کے ہزاروں مدارس ہندوستان کے سلاطین اور امرا کی وقف کردہ جائدادوں سے چل رہے تھے، مسلمانوں کی تعلیم کا تمام تر دار و مدار انہی جائدادوں پر تھا۔ ۱۸۲۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے ان تمام اوقاف کو بحق سرکار ضبط کرلیا۔ ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر کے بقول، "مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ۱۸ سال کی لوٹ کھسوٹ کے بعد یکسر مٹ گئے" (ہمارے ہندوستانی مسلمان" اردو ترجمہ ص۲۰۱)

دوسری جگہ وہ صاف صاف لفظوں میں اوقاف کی تباہی کا اعتراف کرتا ہے "مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جا سکتا کہ ہم نے ان کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا۔ اس حقیقت کو چھپانے سے کیا فائدہ؟ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائداد کو جو اس مصرف کے لیے ہمارے قبضے میں دی گئی تھی، ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے، تو بنگال میں آج بھی ان کے پاس اعلیٰ اور شاندار ادارے موجود ہوتے (حوالۂ سابق ص۲۰۷)

اس زمانے کی تعلیمی حالت کا اندازہ مہاتما گاندھی کی اس تقریر سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو ۱۹۲۰ء میں انھوں نے بنارس میں کی تھی اور جس میں انھوں نے کہا تھا: "برٹش گورنمنٹ سے قبل ملک میں ۸۰ ہزار مکتب تھے، جن میں دو لاکھ طلبا تعلیم پاتے تھے۔ آج حکومت دفتری بمشکل چھ ہزار مدرسوں کا حوالہ دے سکتی ہے (اخبار مسافر آگرہ ۳ دسمبر ۱۹۲۰ء)

ایک طرف مسلمانوں کی مذہبی تعلیم پر کاری ضرب لگائی گئی اور مدارس کے سلسلے کو مٹا کر رکھ دیا، دوسری طرف ملک میں ایسی تعلیم کو رواج دیا گیا، جو اپنے نتائج کے اعتبار سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ تھی۔ سرکاری تعلیم گاہیں درحقیقت وہ کارخانے تھے جہاں سے مسلمان بچے الحاد و لادینیت کے سانچوں میں ڈھل ڈھل کر نکلتے تھے۔

لارڈ ولیم بینٹنک (۱۸۲۸ء / ۱۸۳۵ء) کے عہد حکومت میں جب وسیع پیمانے پر سرکاری مدارس قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تو شروع میں انگریزوں کا خیال یہ تھا کہ یہ تعلیم مشرقی زبانوں میں ہونی چاہیئے لیکن تحریر کے انتہا پسند طبقوں نے جن میں پادری بھی شامل تھے، اس کی مخالفت کی اور انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے پر زور دیا، ان کا یہ مطالبہ منظور کیا گیا اس کا یہ اثر ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان اور ہندو عیسائیت سے قریب تر ہونے لگے۔ فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے یہ بات تسلیم کرتے ہوئے اپنے خطبات میں ایک جگہ لکھتا ہے: "ہندوستان میں یورپین علوم کا جس قدر چرچا بڑھتا جاتا ہے اسی قدر وہ ہماری تہذیب و تمدن اور ہمارے طرز مذہب سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں"

(ترجمہ خطبات گارساں دتاسی ص۲۹۸)

اس صورت حال میں ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے ایک اہم سوال آیا کہ جو مذہب ایک ہزار برس تک اس ملک کے ہر شعبۂ زندگی پر چھایا رہا جس ملک کی زلف سنوارنے میں ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے عمر بھر جدوجہد کی، جس ملک نے صدیوں اسلام اور اسلامی علوم و فنون کی خدمت انجام دی، ان میں اضافے کئے لاتعداد دانش گاہیں دیں درسگاہیں دیں، کیا یہ ملک مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو جائے؟ اس سوال نے یہاں کے اہل فکر کو متاثر کیا، ۱۸۵۷ء کی شکست نے یہ تسلیم کر لینے پر مجبور کر دیا کہ ہم اپنی آزادی فنا کر چکے ہیں اور ایک ایسی قوم کو ہم پر مسلط کر دیا گیا ہے، جو ہماری سیاست ہی پر اثر انداز نہیں ہوگی، بلکہ ہمارے مذہب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوں گے ہماری تعلیم بھی متاثر ہوگی، ہمارے سوچنے کے ڈھنگ میں بھی اسی طرز کے مطابق تبدیلی ناگزیر ہے، ذہنوں میں یہ احساس جاگزیں ہو گیا کہ ہم ایک شکست یافتہ قوم ہیں، تنزل نصیب ہیں مفتوح کی حیثیت سے ہمیں زندہ رہنا ہے فاتح کی حیثیت سے نہیں، اس احساس نے وقت کا سب سے اہم مسئلہ پیدا کیا کیا ہم اپنے آپ کو اس قوم کے زیر اثر رہنے دیں، اپنی تہذیب ثقافت اور تعلیم کو اس اجنبی قوم کی تہذیب ثقافت اور تعلیم میں تحلیل کر دیں۔ اس سوال کے دو جواب اور مسئلے کے دو حل سوچے گئے۔ ایک علیگڑھ میں اور دوسرا دیوبند میں۔ علیگڑھ حل کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم پر ایک قوم تسلط حاصل کر چکی ہے دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے حاکم کے علوم اور اس کی زبان سیکھیں تاکہ اجنبیت کی یہ خلیج پٹ سکے۔ اسی طرز فکر نے اس دانش گاہ کی بنیاد رکھوائی، جسے آج مسلم یونیورسٹی کہا جاتا ہے۔ سرسید مرحوم نے ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۶ء کے سالانہ اجلاس علیگڑھ میں فرمایا تھا:

"اس وقت ہمیں ضرورت ہے کہ جس قدر ہو سکے
ایک کثیر تعداد میں ایسے نوجوانوں کو پیدا کریں، جو
ان علوم میں جو زمانے کی حاجتوں کے لیے ضروری ہیں
سر برآوردہ ہوں" (رو داد ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۶ء علیگڑھ)

دیوبند میں جو حل تجویز ہوا، اس کا ماحصل یہ تھا کہ ہمیں حاکم وقت کی زبان اور اس کے علوم کے بجائے اپنے مذہب اور اپنی زبان و علوم کی بقاء و تحفظ کے لیے کوشش کرنی چاہیئے۔ یہی فکر دارالعلوم کی بنیاد کا سبب بنا۔ دارالعلوم کے بانیوں کا مقصد اسلام کی حفاظت کے لیے مضبوط اور مستحکم قلعوں کی تعمیر کرنا تھا تاکہ اسلام کو ہر خطرے سے بچایا جا سکے۔ اور جو چراغ ہزار برس تک ہندوستان میں جلتا رہا وہ لادینیت کی تیز ہواؤں سے گل نہ ہونے پائے۔ قوم کے نونہال الحاد و تشکیک کے کارخانوں میں جانے کے بجائے ان اداروں میں جائیں، پڑھیں اور پروان چڑھیں، جہاں ان کے مذہب کے بارے میں بتلایا جا سکے۔ ان کا ذہن، ان کا دماغ ان کا کردار، سب کچھ اسلام کے مطابق بنایا جا سکے، حجاز میں دارالعلوم کے قیام کی اطلاع جب مولانا امداد اللہ مہاجر مکی کو دی گئی تو آپ کی زبان مبارک سے بے اختیار نکلا کہ۔

"اے اللہ! اس ادارے کو اسلام اور علم دین کی
حفاظت کا ذریعہ بنا" (سوانح قاسمی ص۲۲۳ ج ۲)

یہ کہنا کہ دارالعلوم صرف نصابی کتابوں کو پڑھنے پڑھانے کا ادارہ تھا میرے خیال میں اس سے بڑھ کر دارالعلوم کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو سکتی۔۔۔ دارالعلوم تو ایک ایسا کارخانہ تھا جہاں اسلام کے مجاہد اور جاں نثار ڈھلا کرتے تھے۔

مجموعی طور سے دیوبند تحریک نے اس وقت مایوس کن حالات میں امید کے چراغ جلائے اور اس خوفناک ماحول میں اپنی جدوجہد کا آغاز کیا، جس نے مسلمانوں کی کمرہمت توڑ کر رکھ دی تھی اور بہت سے لوگ حالات کے ساتھ مصالحت پر زور دینے لگے تھے۔ دیوبند نے ان حالات کا رخ موڑا، ہندوستان کے مایوس و مجبور مسلمانوں کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑایا، نئے عزائم کی روح پھونکی اور اس طرح اسلام کے خلاف سازشوں پر سخت پہرے بٹھا دیئے۔

دارالعلوم کا قیام

اس الہامی تحریک کی ابتداء ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو ہوئی، یہ تحریک اپنی نوعیت اور افادیت کے لحاظ سے بالکل مختلف تھی؛ ہندوستان میں عربی مدارس اور دینی درسگاہوں کی کبھی کمی نہیں رہی، لیکن یہ مدرسہ عربی علوم وفنون کی تعلیم سے زیادہ اسلام کی اشاعت اور اس کی دعوت و تبلیغ کے لیے جدوجہد کا عظیم مرکز بن رہا تھا، ابتداء میں اس کی نہ کوئی مستقل عمارت تھی اور نہ ایسی کوئی باقاعدہ جگہ جہاں اس کا تعلیمی سلسلہ شروع ہو سکتا تھا۔ ایک چھوٹی سی قدیم مسجد تھی؛ جو یہاں مسجد چھتہ کے نام سے مشہور رہے۔ یہی مسجد اس مدرسے کی سب سے پہلی عمارت تھی؛ درسگاہ کے نام پر ایک درخت انار کا موجود تھا، جو آج بھی موجود ہے۔ یہیں سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک شاگرد اور ایک استاذ، قصبے کے ملا جی محمد محمود نے سب سے پہلا سبق پڑھایا۔ اور دیوبند ہی کے ایک طالب علم محمود حسن نے سب سے پہلا حرف پڑھا

بعد میں یہی طالب علم وقت کا شیخ الحدیث اور مسند تدریس بنا کر شیخ الہند کہلایا۔ ہندوستان کی دینی، علمی، سیاسی تاریخ آج بھی اس کی عظمت کے احترام میں سرنگوں ہے جن لوگوں نے اس عظیم جدوجہد کا آغاز کیا، اور جن مبارک ہاتھوں سے اس عظیم ادارے کی داغ بیل ڈالی گئی، ان میں حاجی سید عابد حسینؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا ذوالفقار علیؒ، مولانا فضل الرحمٰن جیسی مقدس اور عظیم شخصیتیں تھیں۔

ابتداء میں یہ ایک مقامی ادارہ تھا، مگر قیام کے پہلے روز ہی سے اس میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی، قرب وجوار کے شہروں سے طلبا اس مدرسے میں تعلیم کی غرض سے جمع ہو گئے؛ پہلے تعلیمی سال کے اختتام کے موقع پر جو رپورٹ مدرسہ عربی دیوبند کی طرف سے جاری کی گئی تھی اس میں کہا گیا تھا:

> "ابتدائے محرم ۱۲۸۳ھ میں تعداد طلبہ ۲۱ تھی اور آخر ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ میں ۷۸ ہو گئے، منجملہ ان کے ۵۸ طلبا بیرونجات کے ہیں؛ جن میں سے ۵۲ طلبا کو اہل قصبہ کی طرف سے کھانا ملتا ہے اور ۶ طلبا اپنے پاس سے کھاتے ہیں۔"
>
> (روداد ۱۲۸۳ھ ص ۱۲ بحوالہ تاریخ دیوبند مصنفہ سید محبوب رضوی ص ۲۲۴/۲۲۵)

مدرسہ عربی سے دارالعلوم تک

دارالعلوم قائم ہوا تو اس کا نام بزرگوں نے مدرسہ عربی، فارسی اور ریاضی رکھا، مگر اس نے مختصر سی مدت میں حیرت انگیز ترقی کی اور تیرہ برس ابھی گزرنے نہیں پایا تھا کہ ذمہ داران مدرسہ کے ذہنوں میں یہ احساس جاگزیں ہو گیا کہ اب یہ مدرسہ صرف عربی فارسی اور ریاضی کا مدرسہ نہیں ہے، بلکہ تمام علوم وفنون کا مرکز ہے اور ایسے مدرسے کیلئے مدرسے کی تعبیر

سے بہتر دارالعلوم کی تعمیر ہے۔

دارالعلوم نے بہت کم وقت میں ہندوستانی مسلمانوں کے مرکزی ادارے کی حیثیت اختیار کرلی، جلدوں کی تعداد میں ایسے علماء تیار کیے جنھوں نے ہندوستان میں نہیں بیرونِ ہند میں بھی دینی جدوجہد میں قائدانہ حیثیت سے شرکت کی اور جگہ جگہ مستحکم دینی قلعوں کی تعمیری مہم شروع کر دی، یہ ایک زبردست امتیاز تھا اور غیر معمولی ترقی تھی، جو دارالعلوم کو حاصل ہوئی، سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ یہ مدرسہ صرف ان چندوں پر چل رہا تھا جو لوگ وقتاً فوقتاً دیا کرتے تھے۔ اتنے کم پیسوں پر اتنا زبردست کام ایک اعجاز ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے پہلے اس طرح کی نظیریں موجود نہیں ہیں سلطنتوں اور امراء و حکام کی نگرانی میں مدارس اور دینی گاہیں ہوتیں تمام مصارف اور اخراجات برداشت کیے جاتے، لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا، معمولی چندوں پر گزر بسر تھی اور تعلیمی سے لے کر انتظامی امور تک کے لیے اخراجات کا انتظام ان ہی چندوں سے ہوتا تھا، تعلیم مفت کھانا مفت، رہائش مفت، کتابیں مفت، سب کچھ مفت تھا اور اس پر وظائف بھی دیئے جاتے تھے۔ آج بھی دارالعلوم ان ہی بنیادوں پر قائم ہے۔ اب بھی یہاں طالب علم ہر فکر سے آزاد اور ہر پریشانی سے یکسو ہو کر تعلیم حاصل کرسکتا ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اساسی اصول ہشتگانہ میں اس پر زور دیا ہے کہ اخراجات کا یہی نہج باقی رہے، چندوں کی تکثیر پر نظر رہے، خود بھی کوشش کریں اور دوسروں سے بھی اس کی کوشش کرائیں، طلباء کے کھانے کو نہ صرف باقی رکھا جائے، بلکہ ہمیشہ اسے بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ کرنے کی کوشش کی جائے، حکومتِ وقت اور امراء کی شرکت بہت زیادہ مضر ہے، چندوں پر اکتفا کیا جائے، اس لیے کہ ایسے لوگوں کا چندہ موجبِ برکت معلوم ہوتا ہے، جن کو اپنے چندوں سے ناموری مقصود نہ ہو، جب تک اس مدرسے کی کوئی مستقل آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے، اس وقت تک یہ مدرسہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر ایسی سبیل نکل آئی تو پھر توجہ ... نظر آتی ہے کہ امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہمی نزاع پیدا ہو جائے گا۔

مختصر یہ کہ آمدن اور تعمیر میں ایک نوع کی بے سر و سامانی ضروری ہے۔
(تفصیل کے لیے دیکھیے "دارالعلوم کی صد سالہ زندگی" ص ۱۵–۱۹ مصنفہ مولانا محمد طیب صاحب)

بحمد اللہ آج بھی دارالعلوم ان ہی اساسی اصولوں کی رہنمائی میں اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہے، ابھی حکومت یوپی (ہند) نے ایک لاکھ روپے کی گرانٹ دارالعلوم کو دینا چاہی تھی مگر دارالعلوم نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی توکل اور اعتماد علی اللہ کا نتیجہ ہے کہ دارالعلوم کا بجٹ برابر بڑھ رہا ہے اور کوئی ضرورت ایسی نہیں ہے جو پوری نہیں ہو جاتی۔

دارالعلوم کی جدوجہد

دارالعلوم نے اپنی تاریخ کے ہر دور میں ان بلند تر مقاصد کو پیشِ نظر رکھا جن کے لیے وہ قائم کیا گیا تھا، اس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اس ادارے سے ایسی نسل تیار کی جائے جو ہر اعتبار سے مکمل ہو، ہر پہلو سے مسلمانوں کی قیادت کا نازک فریضہ انجام دے سکتی ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ دارالعلوم اپنے اس بلند تر مقصد میں کامیاب رہا۔ تو ایسی بات ہوگی، جس کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہے، لوگوں نے اس کا اعتراف کیا ہے اور آج بھی کر رہے ہیں، دارالعلوم کے متعلق ایک انگریز مفکر نے یہ رائے دی تھی:

> "دیوبند اسلام کی حدود کی نگہداشت میں بہت سخت ہے، لیکن ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، وہ حقیقت پسند بھی ہے، وہ گمراہی، نفاق اور ذہنی کاہلی کو شکست دینے کے لیے برابر کوشاں ہے، اس کا دینی ماحول مکمل طور پر مسلمانہ ہے، عملی میدان میں دیوبندی علماء عزمِ راسخ کے ساتھ، اس غلط کاری، اوہام پرستی اور لوازمِ جہالت کے خلاف کمربستہ ہیں، جو پسماندہ ...

سوسائٹی کے رگ و ریشے میں سرایت کئے ہوئے ہے ان کا نقطۂ نظر روایتی اسلام ہے، جو اپنی خالص ترین شکل میں ہو وہ سختی کے ساتھ شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں، اسلامی تاریخ کے بارے میں ان کا تخیل تھا کہ ہے، بخیال آزاد خیال طبقے کے، جو اگرچہ زمانۂ ماضی میں ایک مثالی دور کا بہت خوشنما اور رنگین نقشہ پیش کرتا ہے، مگر اس نقشے میں تعلیماتِ اسلامی کی مہذب معلومات کا رنگ بھرنے کے بجائے وہ موجودہ زمانے کے آزادانہ خیالات و نظریات کا رنگ بھر دیتا ہے۔

معاشرتی اعتبار سے دیوبند اس حد تک ترقی پسند ہے کہ وہ توہمانہ خیالات کے امتزاج کو ختم کرنے کی کوشش میں بہت شدت سے مصروف ہے (ماڈرن اسلام ان انڈیا مصنفہ ڈاکٹر کانٹویل اسمتھ ڈائرکٹر اسلامک اسٹڈیز میک گل یونیورسٹی کناڈا۔ صفحہ ۳۲۰ و ۳۲۱ بحوالہ تاریخ دیوبند (صفحہ ۲۶۷)

یہاں سے جو نسل تیار ہوئی، اس نے عام مسلمانوں کے دلوں میں اپنا اعتبار قائم کیا ہے، ہندوستان کے اسلامی معاشرے نے اس صحیح الفکر گروہ کی رہنمائی قبول کی، اس گروہ میں بڑے بڑے علماء مشائخ، فقیہ، مدرسین، مبلغین، مناظرین، اہلِ قلم اور اربابِ تصانیف نظر آتے ہیں، ان لوگوں نے جو دینی خدمت انجام دی ہے، اس کی ایک طویل تاریخ ہے، مختصر لفظوں میں اس کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔

دارالعلوم نے اس وقت دین کی حفاظت کی، جب کہ اس کا چراغ گل ہو رہا تھا اسے دین آذر الحاد کے بت تراش رہے تھے، ایسے جاں گسل دور میں دارالعلوم نے اسلام کی حفاظت کی اس کا دفاع کیا، ہر داخلی اور خارجی فتنے سے نمٹنے کی کوشش کی اس وقت کی دو مشہور تحریکیں، عیسائیت اور آریہ سماج سے برسوں تک کشی رہی، مناظرے ہوئے اور جیت ہمیشہ دیوبند کی ہوئی۔ یہ دونوں تحریکیں مسلمانوں کا تشخص مجروح کرنے کے لیے کوشاں تھیں۔ اس مقصد کیلئے بڑے پیمانے پر جد و جہد جاری تھی، جگہ جگہ عیسائی مشن اور آریہ سماجی سبھائیں قائم کی جا رہی تھیں وہ انتہائی سخت اور صبر آزما دور تھا، مسلمانوں کا شیرازہ بکھر رہا تھا سید ین کی تحریک کی ناکامی نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ مسلمان اعتقادی طور پر بڑے مضمحل اور کمزور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ صحیح فکر ختم ہو رہا تھا۔ غلط خیالات جڑ پکڑ رہے تھے۔

اگر دارالعلوم نے ایسے موقع پر ہمت نہ کی ہوتی، تو یہاں کا سیاسی اور مذہبی نقشہ بڑی حد تک مختلف ہوتا، دیوبند کی جد و جہد نے ان تحریکوں کا اثر و رسوخ ختم کیا، ان کے غلط معتقدات کے پردے چاک کئے اور ان سازشوں کے چہرے سے نقاب اٹھا جو اسلام کے خلاف کی جا رہی تھیں یہ انگریزوں کی زبردست شکست تھی۔ اس سے متاثر ہو کر انھوں نے مسلمانوں میں نئے فتنوں کا بیج بویا، قادیان سے مرزا غلام احمد قادیانی اور ملک کے مختلف حصوں سے مختلف علماء سو کو کھڑا کیا گیا۔ ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی طاقت کمزور کریں۔ ان کے خیالات تبدیل کر دیں اور اسلام کے بنیادی عقیدوں پر تیشہ زنی کریں اس موقع پر بھی علماء دیوبند میدان میں آئے۔ انھوں نے اپنی تحریری اور تقریری کوششوں سے ان دونوں تحریکوں کا زور ختم کیا، ہزاروں گمراہوں کو صحیح راستہ دکھایا۔ اور لاکھوں کروڑوں کو حق کے راستے پر نہایت، استقلال اور عزیمت کے ساتھ ڈٹے رہنے کا طریقہ سکھلایا۔

دارالعلوم نے اپنی سو سال سے زیادہ پرانی تاریخ میں ہزاروں کتابوں پر مشتمل لٹریچر مسلمانوں کو دیا ہے۔ یہ لٹریچر ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ علمی موضوعات

پرانی کتب کتابیں یہاں سے نکلیں حدیث، تفسیر، فقہ اور دوسرے علوم فنون پر اردو، عربی اور فارسی وغیرہ میں زبردست ذخیرہ فراہم کیا گیا۔

درس نظامیہ کی شرحات اور حواشی و تراجم تیار کیے گئے، مثلاً لٹریچر مرتب کیا گیا۔ دارالعلوم کی تحریری خدمت کے لیے صرف حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا اسم گرامی کافی ہے جنھوں نے ایک ہزار سے زائد کتابیں لکھ کر وسعت مطالعہ و وقت تحریر کی ناقابل فراموش نظیر پیش کی ہے۔ اور اس زبردست خدمت پر اخلاص وایثار کا یہ عالم کہ کسی بھی کتاب کی رائلٹی اپنے نام اپنے وارثوں کے نام محفوظ نہیں کی اور نہ کسی ورق پر کوئی معاوضہ قبول کیا۔ دارالعلوم کا لٹریچر ایک مستند حیثیت رکھتا ہے اور اعتبار کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

دارالعلوم نے علمی اور تدریسی میدانوں میں بھی زبردست ترقی کی ہے علمی دنیا کو تدریس کا وہ رنگ بخشا ہے جو عقل نقل وجدان تینوں پر صحیح اترتا ہے تعلیم کو تربیت کے ساتھ وابستہ رکھتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تبلیغ و دعوت کا کام بھی برابر جاری رہا ہے، سیاسی جدوجہد میں بھی دارالعلوم کی شرکت رہی ہے۔ اگرچہ من حیث الجماعت دارالعلوم کا نہ پہلے کوئی سیاسی نقطۂ نظر تھا اور نہ آج ہے، مگر دارالعلوم کے تمام اہم افراد کار کسی نہ کسی صورت سیاسی تحریکوں سے وابستہ رہے ہیں۔

دارالعلوم کا حال

یہ تو ماضی کی ایک مختصر سی جھلک تھی۔ اس عظیم ادارے پر ایک سو تیرہ برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے، مگر یہ آج بھی عالم اسلام کے دلوں کی دھڑکن ہے آج بھی لوگ اس کے اتباع کو فخر سمجھتے ہیں اور اس کی رہنمائی کو باعث نجات تصور کرتے ہیں، اس کے فیوض آج بھی جاری ہیں اور اپنے موجودہ سرپرست حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی قیادت اور رہنمائی میں برابر ترقی کر رہا ہے۔

آج بھی دارالعلوم کو مختلف داخلی فتنوں کی سرکوبی کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے، بریلی اور قادیانی فتنوں کی سرکوبی کے لیے اس نے مسلسل جدوجہد کی ہے اور آج بھی اسے یہ امتحان درپیش ہے، دوسری طرف یہ بات ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کی ذمہ داری بھی عظیم تر ہے، موجودہ حالات میں دارالعلوم نے مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں ہمہ گیر جدوجہد کا آغاز کر کے اپنی قائدانہ صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا ہے دارالعلوم کے سربراہ کی سربراہی میں دو سال پہلے اس مقصد کیلئے جو ادارہ تشکیل دیا گیا تھا، وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ دارالعلوم پر ہر مکتب فکر کو مکمل اعتماد ہے۔

دارالعلوم کا طرۂ امتیاز یہ رہا ہے کہ یہاں کے اساتذہ میں باہمی یگانگت اور اخلاص قائم رہا ہے۔ طلبا کے ساتھ مشفقانہ روابط رہے ہیں۔ اس وجہ میں نہ ہی کسی نہ کسی صورت آج بھی یہ امتیاز قائم ہے اور دارالعلوم کے بیشتر اساتذہ نہایت اخلاص کے ساتھ اس کی خدمت میں مصروف ہیں۔ دارالعلوم جن اصولوں پر قائم کیا گیا تھا، آج بھی ان ہی اصولوں پہ قائم ہے تعلیم کا معیار بھی بلند ہے۔ نصاب میں بھی عصری تقاضوں کے مطابق ترمیم کی جا رہی ہے ضرورت ہے کہ یہ ترمیم ہمہ جہتی ہو، اور ہر اعتبار سے مفید ثابت ہو۔ ہمارا طریقۂ تعلیم اگرچہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، مگر اس میں بھی بعض تبدیلیاں ضروری ہیں، طریقۂ تعلیم میں ایسی اصلاحات ہونی چاہئیں جن سے تعلیم مشکل اور پیچیدہ ہونے کے بجائے سہل اور مفید تر بن جائے۔

سب سے بڑی کمی تحریر کے میدان میں محسوس ہو رہی ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب کہ دارالعلوم کا ہر فرد صاحب قلم تھا، مگر آج اس میدان میں بڑا خلا ہے، کتابیں لکھنے کا سلسلہ تو نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے، خود اکابر کی کتابیں بھی دوبارہ تصحیح و ترتیب کے ساتھ چھاپنے کا انتظام نہیں ہو پا رہا ہے۔ اس میدان کے لیے بھروسے کی نسل تیار نہیں ہو رہی ہے، جو لوگ از خود اس میدان میں آنا چاہتے ہیں ان کے پاس وسائل نہیں ہیں۔ دارالعلوم کو اللہ نے سہولتیں دی ہیں، وہ چاہے تو ایسی نسل تیار کرنا مشکل نہیں ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

اکابرِ دیوبند کیا تھے؟

(مولانا محمد تقی عثمانی - ایم اے - ایل - ایل - بی - مدیر "البلاغ" دارالعلوم کراچی)

اکابرِ دیوبند کیا تھے؟ اس کا جواب مختصر لفظوں میں یوں بھی دیا جاسکتا ہے کہ وہ خیر القرون کی یادگار تھے، سلف صالحین کا نمونہ تھے، اسلامی مزاج ومذاق کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ لیکن ان مختصر جملوں کی تشریح وتفصیل کرنے بیٹھیں تو اس کے لیے دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہیں، اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی خصوصیات کو لفظوں میں سمیٹنا مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔ اس لیے کہ ان کی خصوصیات کا تعلق درحقیقت اس مزاج ومذاق سے ہے جو صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم) کی سیرتوں اور ان کے طرزِ زندگی سے مستنیر تھا اور مزاج ومذاق وہ چیز ہے جسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن الفاظ کے ذریعے ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح گلاب کی خوشبو کو سونگھا تو جاسکتا ہے لیکن اس کی پوری کیفیت کو الفاظ میں ڈھالنا ممکن نہیں۔ اسی طرح ان حضرات کے مزاج ومذاق کو ان کی صحبتوں اور ان کے واقعات سے سمجھا جاسکتا ہے مگر اس کی منطقی تعبیر ناممکن ہے۔

لہٰذا اس مضمون میں اکابرِ دیوبند کی خصوصیات وامتیازات کو نظری طور سے بیان کرنے کے بجائے ان کے چند متفرق واقعات سنانے مقصود ہیں جن سے ان کی خصوصیات زیادہ واضح اور آسان طریقے سے سمجھ میں آسکیں گی....

وباللہ التوفیق!

علم وفضل اور اس کے ساتھ تواضع وللّٰہیت

اگر صرف وسعتِ مطالعہ، قوتِ استعداد اور کثرتِ معلومات کا نام ہو تو یہ صفت آج بھی ایسی کمیاب نہیں لیکن اکابرِ دیوبند کی خصوصیت یہ ہے کہ علم وفضل کے سمندر سینے میں جذب کر لینے کے باوجود ان کی تواضع، فنائیت اور للّٰہیت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہ محاورہ زبان زدِ عام ہے کہ "پھلوں سے لدی ہوئی شاخ ہمیشہ جھکتی ہے" لیکن ہمارے زمانے میں اس محاورے کا عملی مظاہرہ جتنا اکابرِ دیوبند کی زندگی میں نظر آتا ہے اور کہیں نہیں ملتا۔ چند واقعات ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ بانیٔ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم بحرِ ناپیدا کنار تھے۔ ان کی تصانیف آبِ حیات، تقریرِ دلپذیر، قاسم العلوم اور مباحثہ شاہجہانپور وغیرہ سے ان کے مقام بلند کا کچھ اندازہ ہوتا ہے اور ان میں سے بعض تصانیف تو ایسی ہیں کہ اچھے اچھے علماء کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ حد یہ ہے کہ ان کے ہم عصر بزرگ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کا، جو دارالعلوم میں معروف تھا کہ "میں نے آبِ حیات کا چھ مرتبہ مطالعہ کیا ہے۔ اب وہ کچھ کچھ سمجھ میں آئی ہے"

اور حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی فرماتے ہیں کہ:

"اب بھی مولانا (نانوتویؒ) کی تحریریں پوری سمجھ میں نہیں آتیں اور بدون غور و خوض کی مشقت مجھ سے برداشت ہوتی نہیں، اس لیے مستفید ہونے سے معذور رہتا ہوں اور اپنے دل کو یوں سمجھا لیتا ہوں کہ ضروریات کا علم حاصل کرنے کے لیے اور سہل سہل کتابیں موجود ہیں پھر کیوں مشقت اٹھائی جائے"۔ [1]

ایسے وسیع و عمیق علم کے بعد، بالخصوص جب کہ اس پر تصنیفات کا غلبہ ہو، عموماً علم و فضل کا زبردست پندار پیدا ہو جایا کرتا ہے لیکن حضرت نانوتویؒ کا حال یہ تھا کہ خود فرماتے ہیں:

"جس طرح صوفیوں میں بدنام ہوں اسی طرح مولویت کا دھبہ بھی مجھ پر لگا ہوا ہے۔ اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ اگر یہ مولویت کی قید نہ ہوتی تو قاسم کی خاک کا بھی پتہ نہ چلتا"۔ [2]

چنانچہ اُن کی بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ بقول مولانا احمد حسن صاحب امروہوی رحمۃ اللہ علیہ:

"حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ جس طالب علم کے اندر تکبر دیکھتے تھے اُس سے کبھی کبھی جوتے اُٹھوایا کرتے تھے اور جس کے اندر تواضع دیکھتے تھے اُس کے جوتے خود اُٹھا لیا کرتے تھے"۔ [3]

۲ - یہی حال حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ جنہیں ان کے تفقہ کے مقامِ بلند کی بنا پر حضرت مولانا نانوتویؒ نے "ابوحنیفۂ عصر" کا لقب دیا تھا اور وہ اپنے عہد میں اسی لقب سے معروف تھے۔ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ جیسے بلند پایہ محقق جو علامہ شامیؒ کو "فقیہ النفس" کا مرتبہ دینے کے لیے تیار نہ تھے، حضرت گنگوہیؒ کو "فقیہ النفس" فرمایا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ واقعہ سناتے ہیں کہ:

"حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے کہ بارش آگئی۔ سب طلبا کتابیں لے لے کر اندر کو بھاگے مگر مولانا سب طلبا کی جوتیاں جمع کر رہے تھے کہ اُٹھا کر لے چلیں۔ لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو کٹ گئے"۔ [4]

۳ - شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کے علم و فضل کا کیا ٹھکانا، لیکن حضرت تھانویؒ راوی ہیں کہ "ایک مرتبہ مراد آباد تشریف لے گئے تو وہاں کے لوگوں نے وعظ کہنے کے لیے اصرار کیا۔ مولانا نے عذر فرمایا کہ مجھے عادت نہیں ہے مگر لوگ نہ مانے۔ آخر وعظ کے لیے کھڑے ہو گئے اور حدیث فقیه واحد أشد على الشيطان من ألف عابد" پڑھی اور اس کا ترجمہ کیا کہ:

"ایک عالم شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ بھاری ہے"۔

مجمع میں ایک مشہور عالم موجود تھے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ:

"یہ ترجمہ غلط ہے اور جس کو ترجمہ بھی صحیح کرنا نہ آوے اس کو وعظ کہنا جائز نہیں"۔

حضرت شیخ الہندؒ کا جوابی ردعمل معلوم کرنے سے پہلے ہمیں چاہیے کہ ذرا دیر گریبان میں منہ ڈال کر سوچیں کہ اگر اُن کی جگہ ہم ہوتے تو کیا کرتے؟ ترجمہ صحیح تھا اور اُن صاحب کا اندازِ بیان توہین آمیز ہی نہیں، اشتعال انگیز بھی تھا۔ لیکن اس شیخ وقت کا طرزِ عمل سنیے، حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر:

"مولانا فوراً بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ مجھے وعظ کی لیاقت نہیں ہے مگر ان لوگوں نے نہیں مانا۔ خیر اب میرے پاس عذر کی دلیل بھی ہو گئی یعنی آپ کی شہادت"۔

چنانچہ وعظ تو پہلے ہی مرحلے پر ختم فرما دیا۔ اس کے بعد اُن عالم صاحب سے بطرزِ استفادہ پوچھا کہ "غلطی کیا ہے؟ تاکہ آئندہ بچوں"۔ انھوں نے فرمایا کہ

---

[1] اشرف السوانح ص ۱۳۶، ۱۳۷ ج ۱ — [2] ارواحِ ثلاثہ ص ۱۷۶ نمبر ۲۳۰ — [3] ایضاً ص ۲۰۹ نمبر ۲۸۸
[4] ایضاً ص ۲۲۷ نمبر ۳۳۸

أشدّ کا ترجمہ أثقل (زیادہ بھاری) نہیں بلکہ أضرّ (زیادہ نقصان دہ) کا آیا ہے تو مولانا نے برجستہ فرمایا کہ حدیث وحی میں ہے یاتینی مثل صلصلۃ الجرس وھو أشدّ علیّ " (کبھی مجھ پر وحی گھنٹیوں کی آواز کی طرح آتی ہے اور وہ مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہے) کیا یہاں بھی أضرّ (زیادہ نقصان دہ) کے معنی ہیں ؟ اس پر وہ صاحب مبہوت ہو کر رہ گئے [1]

۴۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ جب کانپور میں مدرس تھے، انھوں نے مدرسہ کے جلسے کے موقع پر اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کو بھی مدعو کیا۔ کانپور میں بعض اہلِ علم معقولات کی مہارت میں معروف تھے اور کچھ بدعات کی طرف بھی مائل تھے۔ ادھر علمائے دیوبند کی زیادہ توجہ چونکہ خالص دینی علوم کی طرف رہتی تھی، اس لیے یہ حضرات یوں سمجھتے تھے کہ علمائے دیوبند کو معقولات میں کوئی درک نہیں ہے۔ حضرت تھانویؒ اس وقت نوجوان تھے اور اُن کے دل میں حضرت شیخ الہندؒ کو مدعو کرنے کا ایک داعیہ یہ بھی تھا کہ یہاں حضرتؒ کی تقریر ہوگی تو کانپور کے ان علماء کو پتہ چلے گا کہ علمائے دیوبند کا علمی مقام کیا ہے ؟ اور وہ منقولات و معقولات دونوں میں کیسی کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ جلسہ منعقد ہوا اور حضرت شیخ الہندؒ کی تقریر شروع ہوئی حُسنِ اتفاق سے تقریر کے دوران کوئی معقولی مسئلہ زیرِ بحث آگیا۔ اس وقت تک وہ علماء جن کو حضرت تھانویؒ شیخ الہندؒ کی تقریر سنانا چاہتے تھے، جلسہ میں نہیں آئے تھے جب حضرتؒ کی تقریر شباب پر پہنچی اور اُس معقولی مسئلہ کا انتہائی فاضلانہ بیان ہونے لگا تو وہ علماء تشریف لے آئے جن کا حضرت تھانویؒ کو انتظار تھا۔ حضرت تھانویؒ اس موقع پر بہت مسرور ہوئے کہ اب ان حضرات کو شیخ الہندؒ کے علمی مقام کا اندازہ ہوگا لیکن ہوا یہ کہ جونہی حضرت شیخ الہندؒ نے اُن علماء کو دیکھا، تقریر کو مختصر کر کے فوراً ختم کر دیا اور بیٹھ گئے حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ موجود تھے، انھوں نے یہ دیکھا تو تعجب سے پوچھا کہ :

"حضرت ! اب تو تقریر کا اصل وقت آیا تھا، آپ بیٹھ کیوں گئے ؟"

شیخ الہندؒ نے جواب دیا : " ہاں ! دراصل یہی خیال مجھے بھی آ گیا تھا :"

حضرت علیؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ کسی یہودی نے ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی گستاخی کر دی تھی تو وہ اس پر جھپٹ پڑے اور اُسے زمین پر گرا کر اس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ یہودی نے جب اپنے آپ کو بے بس پایا تو کھسیانا ہو کر اُس نے حضرت علیؓ کے رُخِ مبارک پر تھوک دیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حضرت علیؓ اُس کو چھوڑ کر فوراً الگ ہو گئے اور پوچھنے پر بتایا کہ میں پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی بنا پر اس یہودی سے اُلجھا تھا۔ اگر تھوکنے کے بعد کوئی اور کارروائی کرتا تو یہ اپنے نفس کی مدافعت ہوتی۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے اس عمل سے حضرت علیؓ کی یہ سُنّت تازہ فرما دی مطلب یہی تھا کہ اب تک تو تقریر نیک نیتی سے خالص اللہ کے لیے ہو رہی تھی لیکن یہ خیال آنے کے بعد اپنا علم جتانے کے لیے ہوتی، اس لیے اسے روک دیا [2]

۵۔ مدرسہ معینیہ اجمیر کے معروف عالم حضرت مولانا محمد معین الدین صاحب معقولات کے مسلّم عالم تھے۔ انھوں نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کی شہرت سُن رکھی تھی، ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا تو ایک مرتبہ دیوبند تشریف لائے اور حضرت شیخ الہندؒ کے مکان پر پہنچ گئے گرمی کا موسم تھا۔ وہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو صرف بنیان اور تہبند پہنے ہوئے تھے۔ مولانا

---

[1] ارواح ثلاثہ ص ۲۸۶ تا ۴۳۶

[2] یہ واقعہ مذکورہ تفصیل کے ساتھ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سُنا ہے اور انھوں نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ سے اور اس کا خلاصہ حضرت میاں صاحبؒ نے حیات شیخ الہند ص ۱۹۷ میں بھی کیا ہے۔

معین الدین صاحب نے اُن سے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ مجھے حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ سے ملنا ہے" وہ صاحب بڑے تپاک سے مولانا اجمیریؒ کو اندر لے گئے، آرام سے بٹھایا اور کہا کہ "ابھی ملاقات ہو جاتی ہے" مولانا اجمیریؒ منتظر رہے، اتنے میں وہ شربت لے آئے اور مولانا کو پلایا، اس کے بعد مولانا اجمیری نے کہا کہ "حضرت مولانا محمود حسن صاحب کو اطلاع دیجئے" اُن صاحب نے فرمایا "آپ جلنے فکر رہیں اور آرام سے تشریف رکھیں" تھوڑی دیر بعد وہ صاحب کھانا لے آئے اور کھانے پر اصرار کیا، مولانا اجمیریؒ نے کہا کہ "میں مولانا محمود حسن صاحب سے ملنے آیا ہوں، آپ انھیں اطلاع کر دیجیے"۔ اُن صاحب نے فرمایا "انھیں اطلاع ہو گئی ہے آپ کھانا تناول فرمائیں ابھی ملاقات ہو جاتی ہے"۔ مولانا اجمیریؒ نے کھانا کھا لیا تو اُن صاحب نے انھیں پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ جب دیر گذر گئی تو مولانا اجمیریؒ برہم ہو گئے اور فرمایا کہ آپ میرا وقت ضائع کر رہے ہیں، میں مولانا سے ملنے آیا تھا اور اتنی دیر ہو چکی ہے، ابھی تک آپ نے اُن سے ملاقات نہیں کرائی۔ اس پر وہ صاحب بولے کہ:

"دراصل بات یہ ہے کہ یہاں مولانا تو کوئی نہیں، البتہ محمود خاکسار ہی کا نام ہے"

مولانا معین الدین صاحب یہ سُن کر ہکا بکا رہ گئے اور پتہ چل گیا کہ حضرت شیخ الہندؒ کیا چیز ہیں۔[1]

۶۔ امام العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اپنی ایک مجلس میں نقل کیا کہ ایک عیسائی فیلسوف نے لکھا ہے کہ "اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ غزالیؒ جیسا محقق اور مدقق اسلام کو حق سمجھتا ہے"۔ یہ واقعہ بیان کر کے حکیم الامتؒ نے فرمایا:

"میں کہتا ہوں کہ ہمارے زمانہ میں مولانا انور شاہ صاحب کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے کہ ایسا محقق اور مدقق عالم اسلام کو حق سمجھتا ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہے"۔[2]

انہی حضرت شاہ صاحبؒ کا واقعہ حضرت مولانا محمد انوری صاحبؒ بیان فرماتے ہیں کہ مقدمہ بہاولپور کے موقع پر جب حضرت شاہ صاحبؒ نے قادیانیوں کے کفر پر بے نظیر تقریر فرمائی اور اس میں یہ بھی فرمایا کہ "جو چیز دین میں تواتر سے ثابت ہو اس کا منکر کافر ہے" تو قادیانیوں کے گواہ نے اس پر اعتراض کیا:

"آپ کو چاہیے کہ امام رازیؒ پر کفر کا فتویٰ دیں کیونکہ فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت میں علامہ بحر العلومؒ نے لکھا ہے کہ امام رازیؒ نے متواتر معنوی کا انکار کیا ہے"۔

اس وقت بڑے بڑے علماء کا مجمع تھا، سب کو پریشانی ہوئی کہ فواتح الرحموت اس وقت پاس نہیں ہے، اس اعتراض کا جواب کس طرح دیا جائے؟ مولانا محمد انوریؒ جو اس واقعے کے وقت موجود تھے، فرماتے ہیں:

"ہمارے پاس اتفاق سے وہ کتاب نہ تھی، مولانا عبد اللطیف صاحب ناظم مظاہر العلوم سہارنپور اور مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ حیران تھے کہ کیا جواب دیں گے؟"

لیکن اسی حیرانی کے عالم میں حضرت شاہ صاحبؒ کی آواز گونجی:

"جج صاحب! لکھیے، میں نے تئیس سال ہوئے، یہ کتاب

---

[1] یہ واقعہ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سُنا ہے اور انھوں نے اپنے ایک ہم سبق عالم مولانا مغیث الدین صاحب سے سُنا تھا جو دیوبند سے فارغ ہو کر معقولات پڑھنے کے لیے اجمیر چلے گئے تھے اور آخر میں مدینہ طیبہ ہجرت کر گئے لیکن چونکہ واقعہ سُنے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ اس لیے چند سال پہلے حضرت والد صاحب مدظلہم نے ان سے حرم نبویؐ میں اس کی تصدیق فرمائی۔

[2] حیات انور ص ۱۱۹ بروایت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ

دیکھی تھی، اب ہمارے پاس یہ کتاب نہیں ہے۔ امام رازیؒ دراصل یہ فرماتے ہیں کہ حدیث لا تجتمع امتی علی الضلالۃ تواترِ معنوی کے رتبے کو نہیں پہنچی، لہٰذا انھوں نے اس حدیث کے متواتر معنوی ہونے کا انکار فرمایا ہے۔ نہ کہ تواترِ معنوی کے حجت ہونے کا۔ ان صاحب نے حوالہ پیش کرنے میں دھوکے سے کام لیا ہے۔ ان کو کہو کہ عبارت پڑھیں۔ ورنہ میں ان سے کتاب لے کر عبارت پڑھتا ہوں"

چنانچہ قادیانی شاہد نے عبارت پڑھی۔ واقعی اس کا مفہوم وہی تھا جو حضرت شاہ صاحبؒ نے بیان فرمایا۔ مجمع پر سکتہ طاری ہو گیا اور حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:

"جج صاحب! یہ صاحب ہمیں مُفحَم (لاجواب) کرنا چاہتے ہیں۔ میں چونکہ طالب علم ہوں، میں نے دو چار کتابیں دیکھ رکھی ہیں، میں ان شاء اللہ مُفحَم نہیں ہونے کا"۔ [1]

ایک طرف علم و فضل اور قوّت حافظہ کا یہ محیر العقول کارنامہ دیکھیے کہ تیس سال پہلے دیکھی ہوئی کتاب کا ایک جزوی حوالہ کتنی جزرسی کے ساتھ یاد رہا، دوسری طرف اس موقع پر کوئی اور ہوتا تو نہ جانے کتنے بلند بانگ دعوے کرتا، لیکن خط کشیدہ جملہ ملاحظہ فرمائیے کہ وہ تواضع کے کس مقام کی غمازی کرتا ہے؟ اور یہ محض لفظ ہی نہیں ہیں وہ واقعۃً اپنے تمام کمالات کے باوصف اپنے آپ کو ایک معمولی طالب علم سمجھتے تھے اور اس دعائے نبوی کے مظہر تھے کہ اللّٰھم اجعلنی فی عینی صغیرا و فی اعین الناس کبیرا

۶۔ حضرت مولانا محمد انوریؒ ہی راوی ہیں کہ ایک دفعہ حضرت شاہ صاحبؒ کشمیر تشریف لے جا رہے تھے، بس کے انتظار میں سیالکوٹ اڈے پر تشریف فرما تھے۔ ایک پادری آیا اور کہنے لگا کہ آپ کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کے بڑے عالم دین ہیں۔ فرمایا "نہیں، میں طالبعلم ہوں"۔ اس نے کہا آپ کو اسلام کے متعلق علم ہے؟ فرمایا "کچھ کچھ"۔ پھر اُن کی صلیب کے متعلق فرمایا کہ "تم غلط سمجھے ہو۔ اس کی یہ شکل نہیں ہے"۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر چالیس دلائل دیئے۔ دس قرآن سے، دس تورات سے، دس انجیل سے اور دس عقلی۔ وہ پادری آپ کی تقریر سن کر کہنے لگا کہ اگر مجھے اپنے مفادات کا خیال نہ ہوتا تو میں مسلمان ہو جاتا نیز یہ کہ مجھے خود اپنے مذہب کی بہت سی باتیں آپ سے معلوم ہوئی ہیں"۔ [2]

۷۔ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم نے بارہا یہ واقعہ بیان فرمایا کہ جب میں دارالعلوم دیوبند میں ملا حسن پڑھتا تھا تو ایک روز اس کی عبارت پر کچھ شبہ ہوا جو حل نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ حضرت شاہ صاحبؒ سے اس کے بارے میں استفسار کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں کتاب لے کر ان کی تلاش میں نکلا، وہ اپنی جگہ پر نہیں تھے اور جب اپنی جگہ پر نہ ہوں تو ان کا کتب خانہ میں ہونا متعین تھا۔ میں کتب خانہ میں پہنچا تو وہ کتب خانے کی بالائی گیلری میں بیٹھے مطالعہ میں مشغول تھے۔ میں ابھی نیچے ہی تھا کہ انھوں نے مجھے دیکھ لیا اور اوپر ہی سے میرے آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے عرض کیا کہ "ملا حسن کے ایک مقام پر کچھ اشکال ہے وہ سمجھنا تھا"۔ وہیں بیٹھے بیٹھے فرمایا "عبارت پڑھیے"۔ میں نے عبارت پڑھنی شروع کی تو بیچ ہی میں روک کر فرمایا: "اچھا! میاں آپ کو یہ شبہ ہوا ہوگا" اور پھر بعینہ وہی اشکال دُہرا دیا جو میرے دل میں تھا۔ میں نے تصدیق کی کہ واقعی یہی شبہ ہے، اس پر انھوں نے اس کے جواب میں وہیں سے ایسی تقریر فرمائی کہ تمام اشکال کافور ہو گئے۔

اب ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ عرصہ دراز سے حدیث کی تدریس میں مصروف تھے اور منطق کی کتابوں سے واسطہ تقریباً ختم ہو گیا تھا

---

[1] انوار الوری، مؤلفہ مولانا محمد انوری ص ۳۲ [2] ایضاً ص ۳۶

لیکن اس کے بعد یہ حافظہ اور یہ استحضار گزشتہ [illegible]

۸۔ [illegible] بھی شاہد ہے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہم کہتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ۱۳۱۱ھ میں فقیہ ابن الہمام رحمۃ اللہ کی مشہور شرح ہدایہ "فتح القدیر" اور اس کے تکملہ کا مطالعہ بیس سے کچھ زائد ایام میں کیا تھا اور کتاب الحج تک اس کی تلخیص لکھی تھی اور ابن ہمام نے صاحب ہدایہ پر جو اعتراضات کیے ہیں اُن کا جواب بھی لکھا تھا۔ اس کے بعد تمام عمر فتح القدیر کی مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی اور کسی تازہ مطالعہ کے بغیر اس کی نہ صرف باتیں بلکہ طویل عبارتوں تک کا حوالہ سبق میں دیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا بنوری مدظلہم فرماتے ہیں کہ انھوں نے ۱۳۴۸ھ میں ہم سے یہ واقعہ بیان کیا اور فرمایا:

"چھتیس سال ہوئے پھر مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی
اور جو مضمون اس کا بیان کروں گا، اگر مراجعت کرو گے
تفاوت کم پاؤ گے۔" [1]

۹۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہم حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگرد ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مدرسہ سے فراغت کے بعد میں جب بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو پہلے سے لکھے ہوئے متعدد سوالات کے جواب ان سے معلوم کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کی حاضری میں ترمذی شریف کی ایک عبارت کا حوالہ میں نے دیا اور عرض کیا کہ اس عبارت میں یہ اشکال ہے، بہت غور کیا لیکن حل نہیں ہو سکا۔ فرمایا "مولوی صاحب! آپ کو یاد نہیں رہا، مجھے خوب یاد ہے کہ جس سال آپ دورہ میں تھے اس موقع پر میں نے بتایا تھا کہ یہاں ترمذی کے اکثر نسخوں میں ایک غلطی واقع ہو گئی ہے لیکن لوگ سرسری طور پر گزر جاتے ہیں لوگوں کو پتہ نہیں چلتا۔ ورنہ یہ اشکال سب کو پیش آنا چاہیے" پھر فرمایا کہ "صحیح عبارت اس طرح ہے" مولانا نعمانی مدظلہم لکھتے ہیں:

"سبحان اللہ! یہ بات بھی یاد رہتی تھی کہ فلاں سال اس موقع پر سبق میں یہ بات فرمائی تھی۔" [2]

۱۰۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم فرماتے ہیں کہ مجھے اپنی ایک تصنیف کے سلسلہ میں ابوالحسن کذاب کے حالات کی ضرورت تھی۔ مجھے ان کی تاریخ نہ ملی۔ چنانچہ میں حسب معمول حضرت شاہ صاحبؒ کے در دولت پر پہنچ گیا۔ اس وقت مرض وفات اپنی آخری حد پر پہنچ چکا تھا اور دو تین ہفتے بعد وصال ہونے والا تھا۔ گو بے حد ضعیف ہو چکے تھے۔ ابتدائی گفتگو کے بعد میں نے آنے کی غرض بتائی تو انھوں نے فرمایا کہ ادب و تاریخ کی کتابوں میں فلاں فلاں مواقع کا مطالعہ کر لیجیے اور تقریباً آٹھ دس کتابوں کے نام لے دیے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے تو کتابوں کے اتنے اسماء یاد بھی نہ رہیں گے۔ نیز انتظامی مہمات کے کھیڑوں میں اتنی فرصت بھی نہیں کہ چند جزوی مثالوں کے لیے اتنا طویل و عریض مطالعہ کروں۔ بس آپ ہی اس شخص کی دروغ گوئی کے متعلق واقعات کی دو چار مثالیں بیان فرما دیں، میں انہی کو آپ کے حوالے سے جزو کتاب بنا دوں گا۔ اس پر مسکرا کر ابوالحسن کذاب کی تاریخ، اس کے سن ولادت سے سن وار بیان فرمانی شروع کر دی جس میں اس کے جھوٹ کے عجیب و غریب واقعات بیان فرماتے رہے۔ آخر میں سن وفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شخص مرتے مرتے بھی جھوٹ بول گیا۔ پھر اس جھوٹ کی تفصیل بیان فرمائی۔

حیرانی یہ تھی کہ یہ بیان اس طرز سے ہو رہا تھا کہ گویا حضرت ممدوح نے آج کی شب ہی مستقلاً اسی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے جو اس بسط سے سن وار واقعات بیان فرما رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے تعجب آمیز لہجے میں عرض کیا کہ حضرت! شاید کسی قریبی زمانے ہی میں اس کی تاریخ دیکھنے کی نوبت آئی ہوگی؟ تو سادگی سے فرمایا "جی نہیں! آج سے تقریباً چالیس سال کا عرصہ ہوتا ہے جب میں مصر گیا ہوا تھا۔ خدیوی کتب خانہ میں مطالعہ کے لیے پہنچا تو

[1] نفحۃ العنبر ص ۲۷ طبع مجلس علمی کراچی [2] حیات انور ص ۱۳۹

اتفاقاً اسی ابوالحسن کذاب کا ترجمہ سامنے آگیا اور اس کا مطالعہ دیر تک جاری رہا، بس اسی وقت جو باتیں کتاب میں دیکھیں حافظہ میں محفوظ ہو گئیں اور آج آپ کے سوال پر مستحضر ہو گئیں جن کا میں نے اس وقت تذکرہ کیا۔" [۱]

۱۱۔ یہی حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم فرماتے ہیں کہ تحریک خلافت کے دور میں جب امارت شرعیہ (عوام کی طرف سے قاضی مقرر کرنے) کا مسئلہ چھڑا تو مولوی سبحان اللہ خاں صاحب گورکھپوری نے اپنے بعض نقاطِ نظر کی تائید میں بعض سلف کی عبارت پیش کی جو ان کے نقطۂ نظر کی تو مؤید تھی مگر مسلکِ جمہور کے خلاف تھی یہ عبارت وہ لے کر خود دیوبند تشریف لائے اور مجمعِ علماء میں اُسے پیش کیا۔ تمام اکابرِ دار العلوم حضرت شاہ صاحبؒ کے کمرے میں جمع تھے۔ حیرانی یہ تھی کہ نہ اس عبارت کو رد ہی کر سکتے تھے کہ وہ سلف میں سے ایک بڑی شخصیت کی عبارت تھی اور نہ اُسے قبول ہی کر سکتے تھے کہ مسلکِ جمہور کے صریحاً خلاف تھی۔ یہ عبارت اتنی واضح اور صاف تھی کہ اُسے کسی تاویل و توجیہ سے بھی مسلکِ جمہور کے مطابق نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ استنجا کے لیے تشریف لے گئے ہوئے تھے وضو کر کے واپس ہوئے تو اکابر نے عبارت اور مسلک کے تعارض کا تذکرہ کیا اور یہ کہ ان دونوں باتوں میں تطبیق بن نہیں پڑتی۔ حضرت ممدوح "حسبنا اللہ" کہتے ہوئے بیٹھ گئے اور عبارت کو ذرا غور سے دیکھ کر فرمایا کہ اس عبارت میں جعل اور تصرف کیا گیا ہے اور دو سطروں کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہے۔ درمیان کی ایک سطر چھوڑ دی گئی ہے۔ اُسی وقت کتب خانہ سے کتاب منگائی گئی۔ دیکھا تو واقعی اصل عبارت میں سے پوری ایک سطر درمیان سے حذف ہوئی تھی۔ جونہی اس سطر کو عبارت میں شامل کیا گیا عبارت کا مطلب مسلکِ جمہور کے موافق ہو گیا اور سب کا تحیر رفع ہو گیا۔ [۲]

۱۲۔ حضرت مولانا محمد یوسف بنوری مدظلہم فرماتے ہیں کہ طلاق کے ایک مسئلہ میں کشمیر کے علماء میں اختلاف ہو گیا۔ فریقین نے حضرت شاہ صاحبؒ کو حَکَم بنایا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے دونوں کے دلائل سنے۔ اُن میں سے ایک فریق اپنے موقف پر فتاویٰ حمادیہ کی ایک عبارت سے استدلال کر رہا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:

"میں نے دار العلوم کے کتب خانے میں فتاویٰ حمادیہ کے ایک صحیح قلمی نسخہ کا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں یہ عبارت ہرگز نہیں ہے لہٰذا یا تو ان کا نسخہ غلط ہے یا یہ لوگ کوئی مغالطہ انگیزی کر رہے ہیں۔" [۳]

ایسے علم و فضل اور ایسے حافظہ کا شخص اگر بلند بانگ دعوے کرے تو کسی درجہ میں اس کو حق پہنچ سکتا ہے لیکن حضرت شاہ صاحبؒ اُس قافلۂ رشد و ہدایت کے فرد تھے جس نے مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ کی حدیث کا عملی پیکر بن کر دکھایا تھا۔ چنانچہ اسی واقعہ میں جب انھوں نے حضرت مولانا بنوری مدظلہم کو اپنا فیصلہ لکھنے کا حکم دیا تو انھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے نام کے ساتھ "الحبر البحر" (عالم متبحر) کے دو تعظیمی لفظ لکھ دیے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے دیکھا تو قلم ہاتھ سے لے کر زبردستی خود یہ الفاظ شائے اور غصہ کے لہجہ میں مولانا بنوری سے فرمایا:

"آپ کو صرف مولانا محمد انور شاہ لکھنے کی اجازت ہے۔" [۴]

پھر ایسا شخص جو ہمہ وقت کتابوں ہی میں مستغرق رہتا ہو، اس کا یہ جملہ ادب و تعظیمِ کتب کے کس مقام کی نشان دہی کرتا ہے کہ:

"میں مطالعہ میں کتاب کو اپنا تابع کبھی نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ خود کتاب کے تابع ہو کر مطالعہ کرتا ہوں۔"

چنانچہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم فرماتے ہیں:

---

[۱] حیاتِ انور ص ۲۲۵ تا ۲۲۸ [۲] حیاتِ انور ص ۲۲۹، ۲۳۰ [۳] نفحۃ العنبر ص ۲۷

[۴] حیاتِ انور ص ۲۳۳

"سفر و حضر میں ہم لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ لیٹ کر مطالعہ کر رہے ہوں یا کتاب پر کہنی ٹیک کر مطالعہ میں مشغول ہوں بلکہ کتاب کے سامنے مؤدب انداز سے بیٹھے گویا کسی شیخ کے آگے بیٹھے ہوئے استفادہ کر رہے ہوں :

اور یہ بھی فرمایا کہ :

"میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک دینیات کی کسی کتاب کا مطالعہ بے وضو نہیں کیا۔" [1]

۱۳۔ دارالعلوم کی تاریخ میں یہ جملہ بہت معروف ہے کہ دارالعلوم کی ابتداء دو ایسے بزرگوں سے ہوئی جن دونوں کا نام محمود تھا اور دونوں قصبہ دیوبند کے باشندے تھے۔ ان میں شاگرد تو وہ محمود تھے جو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے نام سے معروف ہوئے اور استاد حضرت ملا محمود صاحبؒ تھے۔ راقم الحروف کے جد امجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب نور اللہ مرقدہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ملا محمود صاحبؒ نے فرمایا کہ سنن ابن ماجہ پر جو حاشیہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ محدث دہلوی کے نام سے چھپا ہوا ہے اس کا بڑا حصہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے مجھ سے لکھوایا ہے۔ ان کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ طلباء نے اس پر تعجب کا اظہار کیا۔ وجہ یہ تھی کہ علم کے دعوے اور نام و نمود کی خواہشات سے اللہ تعالیٰ نے اس فرشتہ خصلت بندے کو ایسا پاک رکھا تھا کہ عام آدمی کو یہ پہچاننا بھی مشکل تھا کہ یہ کوئی بڑے عالم ہیں۔

اپنا گھر کا سودا سلف اور گوشت ترکاری خود بازار سے خرید کر لاتے اور گھر میں عام آدمیوں کی طرح زندگی گذارتے تھے مگر علوم کے استحضار اور حفظ کا عالم یہ تھا کہ راقم کے جد امجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ کی ایک بڑی کتاب (جو غالباً منطق یا اصول فقہ کی کتاب تھی) اتفاقاً درس سے رہ گئی تھی، انھیں یہ فکر تھی کہ دورۂ حدیث شروع ہونے سے پہلے یہ کتاب پوری ہو جائے چنانچہ انھوں نے ملا محمود صاحبؒ سے درخواست کی۔ ملا صاحبؒ نے فرمایا کہ اوقاتِ مدرسہ کے علاوہ بھی میرے تمام اوقات اسباق سے بھرے ہوئے ہیں، صرف ایک وقت ہے کہ جب میں گھر کا گوشت ترکاری لینے کے لیے بازار جاتا ہوں، یہ وقت خالی گزرتا ہے، تم ساتھ ہو جاؤ تو اس وقفے میں سبق پڑھا دوں گا۔ احقر کے والد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ فرماتے تھے کہ کتاب نری اور مشکل تھی جس کو دوسرے علماء خود مطالعہ کے بعد بھی مشکل سے پڑھا سکتے تھے۔ مگر ملا محمود صاحبؒ نے کچھ راستے میں کچھ قصاب کی دوکان پر یہ تمام کتاب ہمیں اس طرح پڑھا دی کہ کوئی مشکل پیش نظر نہ آئی۔ [2]

۱۴۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے علم و فضل کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ حضرت طالب علمی کے زمانے ہی سے اپنی قوتِ استعداد، ذہانت و فطانت اور علم و عمل میں معروف تھے لیکن جب سنہ ۱۳۰۰ھ میں آپ دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے، اور دستار بندی کے لیے دیوبند میں بہت بڑا اور شاندار جلسہ منعقد کرنے کی تجویز ہوئی تو حضرت تھانویؒ اپنے ہم سبقوں کو لے کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ "حضرت! ہم نے سنا ہے کہ ہم لوگوں کی دستار بندی کی جائے گی اور سند فراغ دی جائے گی۔ حالانکہ ہم اس قابل ہرگز نہیں لہٰذا اس تجویز کو منسوخ فرما دیا جائے ورنہ اگر ایسا کیا گیا تو مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی کہ ایسے نا اہلوں کو سند دی گئی۔" حضرت نانوتویؒ کو یہ سن کر جوش آ گیا اور فرمایا کہ تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے، یہاں چونکہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں اس لیے ان کے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نظر نہیں آتی اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ باہر جاؤ گے تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی، جہاں جاؤ گے بس تم ہی تم ہو گے۔ [3]

---

[1] حیاتِ انور ص ۲۳۳ — [2] "میرے والد ماجد" مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم : ص ۵۴، ۵۵

[3] اشرف السوانح۔ ج ۱ ص ۳۲

سادگی اور مخلوق خدا کا خیال

۱۵۔ حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بھی اکابر دیوبند میں ہے۔ ان کے علم و فضل کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بلاواسطہ شاگرد اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی کے ہم سبق ہیں۔ وہ ایک مرتبہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک بڑھا ملا جو بوجھ لیے جا رہا تھا، بوجھ زیادہ تھا اور وہ بمشکل چل رہا تھا۔ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب نے یہ حال دیکھا تو اس سے وہ بوجھ لے لیا اور جہاں وہ لے جانا چاہتا تھا وہاں پہنچا دیا۔ اس بڑھے نے ان سے پوچھا: "اجی! تم کہاں رہتے ہو؟" انھوں نے کہا: "بھائی! میں کاندھلہ میں رہتا ہوں۔" اس نے کہا: "وہاں مولوی مظفر حسین بڑے ولی ہیں" اور یہ کہہ کر ان کی بڑی تعریفیں کیں، مگر مولانا نے فرمایا: "اور تو اس میں کوئی بات نہیں ہے، ہاں نماز تو پڑھ لے ہے۔" اس نے کہا: "واہ میاں! تم ایسے بزرگ کو ایسا کہو؟" مولانا نے فرمایا: "میں ٹھیک کہتا ہوں" وہ بڑھا ان کے سر ہو گیا، اتنے میں ایک اور شخص آ گیا جو مولانا کو جانتا تھا، اس نے بڑھے سے کہا: "بھلے مانس! مولوی مظفر حسین یہی ہیں" اس پر وہ بڑھا مولانا سے لپٹ کر رونے لگا۔ [1]

۱۶۔ انہی مولانا مظفر حسین صاحب کی عادت یہ تھی کہ اشراق کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا کرتے تھے اور اپنے تمام رشتہ داروں کے گھر تشریف لے جاتے جس کسی کو بازار سے کچھ منگانا ہوتا اس سے پوچھ کر لا دیتے اور طرہ یہ کہ اس زمانے میں لوگوں کے پاس پیسے کم ہوتے تھے، عموماً چیزیں غلہ کے عوض خریدی جاتی تھیں چنانچہ آپ گھروں سے غلہ باندھ کر لے جاتے اور اس سے اشیاء ضرورت خرید کر لاتے تھے۔ [2]

۱۷۔ یہی حال دیوبند کے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کا تھا۔ علم و فضل کا تو یہ عالم کہ آج ان کے "عزیز الفتاویٰ" مجموعۂ فتاویٰ کے نام سے مطبوعہ) کے لیے ماخذ بنی ہوئی ہے اور فتاویٰ کے ساتھ شغف کا یہ عالم تھا کہ وفات کے وقت بھی ایک استفتاء ہاتھ میں تھا جس کا جواب دینے سے پہلے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا گیا تھا [4] لیکن سادگی، تواضع اور ضبط نفس کا یہ عالم تھا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم تحریر فرماتے ہیں:

> "کوئی کیسے سمجھے کہ یہ کوئی بڑے عالم یا صاحب کرامت مفتی اور صاحب نسبت شیخ ہیں جب کہ غایت تواضع کا یہ عالم ہو کہ بازار کا سودا سلف خود اپنے گھر کا بلکہ محلے کی بیواؤں اور ضرورت مندوں کا بھی خود لاتے۔ بوجھ زیادہ ہو جاتا تو بغل میں گٹھڑی دبا لیتے اور پھر ہر ایک کے گھر کا سودا صحیح حساب کے ساتھ پہنچاتے۔" [3]

راقم الحروف نے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم ہی سے زبانی سنا کہ اس سودا سلف لانے میں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جب حضرت مفتی صاحب کسی عورت کو سودا دینے کے لیے جاتے تو وہ دیکھ کر کہتی: "مولوی صاحب! یہ تو آپ غلط لے آئے ہیں، میں نے یہ چیز اتنی نہیں اتنی منگائی تھی" چنانچہ فرشتہ صفت انسان دوبارہ بازار جاتا اور اس عورت کی شکایت دور کرتا۔

۱۸۔ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دیوبند میں حضرت میاں صاحب کے لقب سے معروف تھے، دارالعلوم دیوبند کے درجۂ علیا کے استاذ تھے، ان سے ابوداؤد پڑھنے والے اب بھی برصغیر میں ہزاروں ہوں گے، علوم قرآن و سنت کے بہت بڑے ماہر اور جملہ علوم و فنون کے کامل محقق مگر بہت کم گو، حدیث کے درس میں نہایت مختصر مگر جامع تقریر ایسی ہوتی تھی کہ حدیث کا مفہوم دل میں اتر جائے اور شبہات خود بخود کافور ہو جائیں۔

انہی کا واقعہ ہے کہ آپ کا ذاتی مکان اور نشست گاہ کچی مٹی کی بنی

---

[1] ارواح ثلاثہ ص ۱۲۸ ف ۱۸۵ [2] ارواح ثلاثہ ص ۱۵۳ ف ۱۹۷ [3] نقوش و تاثرات، مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم ص ۳۴

[4] مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند۔ ج ۱ ص ۴۳

ہوتی تھیں، بہرحال پھلوں کے متعلق یہ اس کی پہلی تنبیہ تھی گویا تجربہ یکانی ہے
سے دقت ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ راقم الحروف کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی
محمد شفیع صاحب مدظلہم نے حضرت میاں صاحب سے کہا کہ "حضرت! جتنا
خرچ سالانہ اس کی لپائی پر کرتے ہیں اگر ایک مرتبہ پختہ اینٹوں سے بنا لیں
خرچ کر لیں تو دو تین سال ہی میں یہ خرچ برابر ہو جائے اور ہمیشہ کے لیے اس محنت
سے نجات ہو۔"

یہ سن کر پہلے تو فرمایا: "ماشاءاللہ بات تو بہت عقل کی کہی، ہم بڈھے
ہو گئے اور یہ دھیان ہی نہ آیا۔" پھر کچھ توقف کے بعد جو حقیقت حال تھی وہ
بتائی اور تب پتہ چلا کہ یہ حضرات کس سطح سے سوچتے تھے، فرمایا کہ:

"میرے پڑوس میں سب غریبوں کے کچے مکان ہیں، اگر
میں اپنا مکان پکا بنواؤں تو غریب پڑوسیوں کو حسرت
ہو گی اور اتنی وسعت نہیں کہ سب کے مکان پکے بنوا دوں۔"

حضرت والد صاحب مدظلہم تحریر فرماتے ہیں:

"اس وقت معلوم ہوا کہ یہ حضرات جو کچھ سوچتے ہیں اس
تک ہر ایک کی رسائی نہیں ہو سکتی، چنانچہ انہوں نے
اس وقت تک اپنے مکان کو پختہ نہیں کیا جب تک
پڑوسیوں کے مکان پکے نہیں ہو گئے۔" [1]

۱۹۔ انہی حضرت میاں صاحب کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت والد صاحب مدظلہم ان کے گھر تشریف لے گئے تو انہوں نے آموں سے تواضع کی۔ جب آم چوس کر فارغ ہو گئے تو والد صاحب مدظلہم گٹھلیوں اور چھلکوں سے بھری ہوئی ٹوکری اٹھا کر باہر پھینکنے کے لیے چلے، حضرت میاں صاحب نے دیکھا تو پوچھا: "یہ ٹوکری کہاں لے کر چلے؟" عرض کیا: "چھلکے باہر پھینکنے جا رہا ہوں" فرمایا: "تمہیں پھینکنے آتے ہیں یا نہیں؟" والد صاحب نے کہا کہ "حضرت! یہ چھلکے پھینکنا کون سا مشکل فن ہے جس کے سیکھنے کی ضرورت ہو؟" فرمایا: "ہاں! تم اس فن سے واقف نہیں، لاؤ، مجھے دو۔" خود ٹوکری اٹھا کر پہلے چھلکے گٹھلیوں سے الگ کیے، اس کے بعد باہر تشریف لے گئے اور سڑک کے کنارے متفرق فاصلے سے تین جگہوں پر چھلکے رکھ دیے اور ایک خاص جگہ گٹھلیاں ڈال دیں۔ والد صاحب کے استفسار پر ارشاد ہوا کہ: "ہمارے مکان کے قرب و جوار میں تمام غربا رہتے ہیں، زیادہ تر وہ لوگ ایسی چیز ان جیسوں کو بمشکل ہی میسر آتی ہے، اگر وہ ہمارے یہاں کے چھلکے دیکھیں گے تو ان کو اپنی غریبی کا شدت سے احساس ہوگا اور بے مائیگی کی وجہ سے حسرت ہو گی اور اس ایذا دہی کا باعث ہم بنیں گے، اس لیے متفرق کر کے ڈالے ہیں اور وہ بھی ایسے مقامات پر جہاں جانوروں کے گلے گزرتے ہیں، یہ چھلکے ان کے کام آ جاتے ہیں اور گٹھلیاں ایسی جگہ رکھی ہیں جہاں بچے کھیلا کرتے ہیں، وہ ان گٹھلیوں کو بھون کر کھا لیتے ہیں، یہ چھلکے اور گٹھلیاں بھی بہرحال ایک نعمت ہیں، ان کو بھی ضائع کرنا مناسب نہیں۔" راقم الحروف کے برادر مرحوم مولانا محمد زکی کیفی صاحب جو اس واقعہ کے وقت موجود تھے تحریر فرماتے ہیں:

"یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنے کی ہے کہ میاں صاحب
خود تو شاید ہی کبھی کوئی آم چکھ لیتے ہوں، عموماً مہمانوں ہی
کے لیے ہوتے تھے اور محلے کے غریب بچوں کو بلا بلا کر
کھلانے میں استعمال ہوتے تھے، اس کے باوجود چھلکے
گٹھلیوں کا یکجا ڈھیر کر دینے سے گریز فرماتے تھے کہ غریبوں
کی حسرت کا سبب نہ بن جائیں" [2]

۲۰۔ انہی حضرت میاں صاحب کا معمول تھا کہ جو کھانا گھر سے آتا تھا، خود تو بہت کم خوراک کھاتے تھے، باقی کھانا محلے کے بچوں کو کھلا دیتے تھے، جو روٹی بچ جاتی اس کو بلی کے لیے دیوار پر رکھ دیتے اور جو ٹکڑے بچ جاتے ان کو چڑیا

---

[1] نقوش و تاثرات ص ۳۰

[2] ماہنامہ البلاغ کراچی، ربیع الثانی ۱۳۸۵ھ ص ۳۸، ۳۹، ۱۵ مضمون "حضرت میاں صاحب"

پھرتا کہ کے چڑیوں کے لیے اور دسترخوان کے ریزوں کو بھی ایسی جگہ جھاڑتے تھے جہاں چیونٹیوں کا بل ہو۔[1]

۲۱ ۔ شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے ان اساتذہ میں سے ہیں جن کے عشاق اب بھی شاید لاکھوں سے کم نہ ہوں گے ان کے رعب اور دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ طلباء ان کے نام سے تھرتھراتے تھے حالانکہ انہیں پیٹنے کا کوئی معمول نہ تھا۔ والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم بھی ان کے شاگرد ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کے ساتھ ہم چند آدمی سفر پر روانہ ہوئے، سفر کے آغاز میں مولانا نے فرمایا کہ کسی کو اپنا امیر بنا لو۔ ہم نے عرض کیا کہ "امیر تو متعین ہے" مولانا نے فرمایا: "تب مجھے امیر بنانا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے لیکن امیر کی اطاعت کرنی ہوگی"۔ ہم نے عرض کیا "انشاء اللہ ضرور"! اب جو روانگی ہوئی تو مولانا نے اپنا اور ساتھیوں کا سامان خود اٹھالیا۔ ہم نے دوڑ کر سامان لینا چاہا تو فرمایا "نہیں! امیر کی اطاعت ضروری ہے"۔ پھر سفر کے ہر مرحلے میں مشقت کا ہر کام خود کرنے کے لیے آگے بڑھتے اور کوئی کچھ کہتا تو اطاعت امیر کا حکم سناتے۔

۲۲ ۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم مہتمم دارالعلوم دیوبند کے خسر محترم جناب مولانا محمود صاحب رامپوری رامپور کے ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو اپنے دینی شغف اور دنیوی وجاہت و ریاست دونوں کے اعتبار سے ممتاز تھا، اور تمام اکابر دیوبند سے اس کے تعلقات تھے جب یہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے دیوبند آئے تو ان کا قیام دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد کے حجرے میں ہوا جو چھوٹی مسجد ہی کے نام سے معروف تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم سے آتے جاتے ادھر ہی سے گذرا کرتے تھے ایک روز وہاں سے گذرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں مولانا محمود صاحب رامپوری کھڑے تھے۔ حضرت شیخ الہند کو ان کے دیوبند آنے کا حال معلوم نہ تھا، اس لیے ان سے پوچھا کہ کب آئے؟ کیسے آئے؟ پھر ان سے تفصیلات کی اور بتایا کہ اسی مسجد کے ایک حجرے میں مقیم ہیں۔ حضرت ان کے حجرے کے اندر تشریف لے گئے اور ان کے سونے کی جگہ دیکھی۔ معلوم ہوا کہ سونے کے لیے ایک بستر فرش ہی پر بچھا ہوا تھا۔ اس وقت تو حضرت واپس تشریف لے آئے لیکن یہ خیال رہا کہ مولانا محمود صاحب رامپور کے متمول زادے ہیں، انہیں زمین پر سونے کی عادت نہیں ہوگی اور یہاں تکلیف اٹھاتے ہوں گے۔ چنانچہ گھر جا کر ایک چارپائی خود اٹھائی اور اسے لے کر چھوٹی مسجد کی طرف چلے۔ وہاں سے فاصلہ کافی تھا لیکن حضرت اسی حالت میں گلیوں اور بازار سے گذرتے ہوئے چھوٹی مسجد پہنچ گئے۔ اس وقت مولانا محمود صاحب مسجد سے نکل رہے تھے۔ یہاں پہنچ کر حضرت شیخ الہند کو خیال آیا کہ اگر انہوں نے چارپائی اٹھاتے ہوئے دیکھ لیا تو انہیں ندامت ہوگی کہ میری خاطر شیخ الہند نے اتنی تکلیف اٹھائی۔ چنانچہ انہیں دیکھتے ہی چارپائی نیچے رکھ دی اور فرمایا:

"لو میاں! یہ اپنی چارپائی خود اندر لے جاؤ، میں بھی شیخ زادہ ہوں کسی کا نوکر نہیں"[2]

انابت و تقویٰ

۲۳ ۔ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو انابت و تقویٰ کے ایسے سانچوں میں ڈھالا تھا کہ "سیماھم فی وجوھھم" کی مثال بن گئے تھے، اور لوگ ان کے چہرے دیکھ کر اسلام قبول کرتے تھے۔ مولانا محمد انوری فرماتے ہیں کہ مظفر گڑھ کے سفر میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، ملتان چھاؤنی کے اسٹیشن پر ظہر کی نماز سے قبل حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری گاڑی کے انتظار میں تشریف فرما تھے، اور گرد خدام کا مجمع تھا، ریلوے کے ایک ہندو بابو صاحب لیمپ ہاتھ میں لیے آرہے تھے۔ حضرت شاہ صاحب کا منور چہرہ دیکھ کر

---

[1] ماہنامہ البلاغ کراچی۔ ربیع الثانی ۱۳۸۶ھ ص ۳۹، ۴۰

[2] یہ واقعہ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے اور ان کو خود حضرت مولانا محمود صاحب رامپوری رحمۃ اللہ نے سنایا تھا۔

سامنے گذرے ہوئے لوگ ہوا کرتے تھے اور جن پر نیابت ہی کی ہے ایسا اندازہ ہو گئی، وہ سمجھتے تھے کہ ان بزرگوں کا روشن چہرہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام سچا مذہب ہے۔ [1]

۲۴ - تمام اکابر دیوبند کا مشترک رنگ یہ تھا کہ وہ حروف و نقوش کے کتابی علم کو اس وقت تک لبیب نہیں سمجھتے تھے جب تک اس کے ساتھ انابت الی اللہ اور صلاح و تقویٰ نہ ہو۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے جب خانقاہ تھانہ بھون میں مدرسہ امدادیہ قائم فرمایا تو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ کو اس کی اطلاع دی، حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا:

"اچھا ہے بھائی، مگر خوشی تو جب ہوگی جب میاں اللہ اللہ کرنے والے جمع ہو جاویں گے۔" [2]

۲۵ - چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد یہاں انابت الی اللہ پر تھی، راقم الحروف کے جد امجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ:

"ہم نے دارالعلوم کا وہ وقت دیکھا ہے جس میں صدر مدرس سے کر ادنیٰ مدرس تک اور مہتمم سے لے کر دربان اور چپراسی تک سب کے سب صاحب نسبت بزرگ اور اولیاء اللہ تھے۔ دارالعلوم اس زمانہ میں دن کو دارالعلوم اور رات کو خانقاہ معلوم ہوتا تھا کہ اکثر حجروں سے آخر شب میں تلاوت اور ذکر کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور درحقیقت یہی اس دارالعلوم کا طرۂ امتیاز تھا۔" [3]

۲۶ - دارالعلوم دیوبند کے دوسرے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ اگرچہ ضابطے کے عالم نہ تھے لیکن حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلویؒ کے خلیفہ اور اس درجے کے بزرگ تھے کہ حضرت نانوتویؒ نے ایک موقع پر فرمایا:

"مولانا رفیع الدین صاحبؒ اور حضرت مولانا گنگوہیؒ میں سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ مولانا گنگوہیؒ عالم ہیں اور وہ عالم نہیں، ورنہ نسبت باطنی کے لحاظ سے دونوں ایک درجے کے ہیں۔" [4]

ان کا واقعہ ہے کہ انہوں نے ایک گائے پال رکھی تھی جس کی دیکھ بھال ایک خادم کے سپرد تھی۔ ایک روز اتفاقاً وہ خادم کسی وجہ سے گائے کو مدرسے کے صحن میں باندھ کر کسی کام چلا گیا۔ دیوبند کے باشندے کوئی صاحب ادھر آ نکلے مولانا کی گائے کو مدرسے کے صحن میں دیکھا تو مولانا سے شکایت کی کہ کیا مدرسے کا صحن آپ کی گائے باندھنے کے لیے ہے؟ مولانا نے ان سے کوئی عذر بیان کرنے کے بجائے یہ گائے دارالعلوم ہی کو دے دی اور قصہ ختم کر دیا حالانکہ مولانا کا عذر بالکل واضح اور ظاہر تھا مگر یہ حضرات اپنے نفس کی طرف سے مدافعت کا پہلو اختیار ہی نہ کرتے تھے۔ [5]

۲۷ - حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے اس دور کے مہتمم تھے جب دارالعلوم کا کام بہت زیادہ پھیل گیا تھا، طلباء کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز تھی، بہت سے نئے شعبے قائم ہو چکے تھے اور ان کا انتظام شبانہ روز مصروفیت کے بغیر ممکن نہ تھا لیکن احقر نے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے کہ اس دور میں بھی نماز اور تلاوت کے دیگر معمولات کے علاوہ روزانہ سوا لاکھ اسم ذات کا معمول کبھی قضا نہیں ہوتا تھا اور اللہ پر توکل کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ دارالعلوم کی انتظامیہ کے خلاف ایک شدید طوفان اٹھا اور بعض لوگ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کی جان کے بھی دشمن ہو گئے۔ ایسی حالت میں وہ رات کو دارالعلوم کی کھلی چھت پر ہی تنہا سوتے تھے۔ بعض بہی خواہوں نے عرض کیا کہ ایسے

---

[1] انوار انوری، ص ۴۰ [2] امداد ثلاثہ، ص ۲۲۴ [3] ۳۲۷ "میرے والد ماجد" از حضرت مفتی محمد شفیع مدظلہم ص ۵۲ [4] اشرف السوانح ۱/ص ۱۳۹ [5] "میرے والد ماجد" ص ۴۰

حالات میں آپ کو اس طرح نہ سونا چاہیے بلکہ احتیاط کے پیش نظر کمرے کے اندر سونا چاہیے۔ مولانا نے جواب میں فرمایا کہ: میں تو اس باپ (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کا بیٹا ہوں جس کے جنازے کو جو اٹھانے والے بھی میسر نہ آسکے اور جسے رات کے اندھیرے میں بقیع کی نذر کیا گیا لہٰذا مجھے موت کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔[1]

یہ دیوبند کے وہ بزرگ ہیں جو خاص انتظامی کاموں میں مصروف تھے اور جیسا کہ انتظامی امور کا خاصہ ہے وہ بعض مرتبہ مورد اعتراض بھی بنے اور عموماً اولیاء اللہ کی فہرست میں ان کا شمار نہیں ہوتا لیکن قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

۲۸۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ سارا دن تعلیم و تدریس کی محنت اٹھانے کے باوجود رات کو وہ بہت بیدار رہ جاتے اور فجر تک نوافل و ذکر میں مشغول رہتے تھے اور رمضان المبارک میں تو تمام رات جاگنے کا معمول تھا۔ حضرت کے یہاں تراویح سحری سے ذرا پہلے تک جاری رہتی تھی اور مختلف حفاظ کئی کئی پارے سناتے تھے، یہاں تک کہ حضرت کے پاؤں پر ورم آجاتا اور حتّٰی تورّمت قدماہ کی سنّت نبویہ نصیب ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ خوراک اور نیند کی کمی اور طویل قیام کے اثر سے حضرت کا ضعف بہت زیادہ ہوگیا۔ اس کے باوجود رات بھر کی تراویح کا یہ معمول ترک نہیں فرمایا۔ آخر مجبور ہو کر گھر کی خواتین نے تراویح کے امام مولوی کفایت اللہ صاحب سے کہلایا کہ آج کسی بہانے سے تھوڑا سا پڑھ کر اپنی طبیعت کے کسل اور گرانی کا عذر کر دیجئے۔ حضرت کو دوسروں کی راحت کا بہت خیال رہتا تھا اس لیے خوشی سے منظور کر لیا۔ تراویح ختم ہوگئی اور حافظ صاحب لیٹ گئے اور ادھر حضرت شیخ الہند لیکن تھوڑی دیر بعد حافظ صاحب نے محسوس کیا کہ کوئی شخص آہستہ آہستہ پاؤں دبا رہا ہے۔ انھوں نے ہوشیار ہو کر دیکھا تو خود حضرت شیخ الہند تھے۔ ان کی حیرت و ندامت کا کچھ ٹھکانا نہ رہا وہ اٹھ کھڑے ہوگئے لیکن مولانا فرمانے لگے کہ: "نہیں بھائی، کیا حرج ہے؟ تھک جاتے ہو، کچھ نہیں تو ذرا راحت آجائے گی۔"[2]

۲۹۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے واقعات پہلے بھی آچکے ہیں۔ ان کا علم و فضل اور حیرت انگیز حافظہ اس قدر مشہور ہوا کہ ان کی دوسری خوبیاں اس میں گم ہوگئیں مثلاً انابت و تقویٰ اور سلوک و تصوف میں بھی انھیں خاص مقام حاصل تھا۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہم سے انھوں نے خود بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ میں کشمیر سے آرہا تھا، راستہ میں ایک صاحب مل گئے جو پنجاب کے ایک مشہور پیر کے مرید تھے، ان کی خواہش اور ترغیب یہ تھی کہ میں بھی ان کے پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اتفاق سے وہ مقام بھی راستہ میں پڑتا تھا، اس لیے میں نے بھی ارادہ کر لیا۔ ہم پیر صاحب کے پاس پہنچے تو وہ بڑے اکرام سے پیش آئے، کچھ باتیں ہوئیں، پھر وہ مریدوں کی طرف متوجہ ہو گئے اور ان پر توجہ ڈالنی شروع کی جس سے وہ بے ہوش ہو ہو کر گرنے اور تڑپنے لگے۔ میں یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا میرا جی چاہتا ہے کہ اگر مجھ پر بھی یہ حالت طاری ہو سکے تو مجھ پر آپ توجہ فرمائیں۔ انھوں نے توجہ دینی شروع کی اور میں اللہ تعالیٰ کے ایک اسم پاک کا مراقبہ کر کے بیٹھ گیا۔ سب جتنوں نے بہت زور لگایا لیکن مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا، کچھ دیر کے بعد انھوں نے خود فرمایا کہ آپ پر اثر نہیں پڑ سکتا۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی بتاتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب نے یہ واقعہ سنا کر غیر معمولی جوش کے ساتھ فرمایا:

"کچھ نہیں ہے، لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے ایک کرشمہ ہے۔ ان باتوں کا خدا رسیدگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو ان شاء اللہ تین دن میں یہ بات پیدا ہو سکتی ہے کہ قلب سے اللہ اللہ کی آواز سنائی دینے

---

[1] یہ واقعہ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے (م ت ع)

[2] حیات شیخ الہند از مولانا سید اصغر حسین صاحب ص ۱۸۹

کے لیکن یہ پہلو بھی، اصل چیز دینی و ایمانی کیفیت
اور سیرت و سنت پر استقامت ہے۔ [1]

تبلیغ و دعوت کا انداز

۳۰ - اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو جہاں تبلیغ و دعوت دین کا جذبہ عطا فرمایا تھا وہاں اسے حکمت اور موعظہ حسنہ کے اصول پر انجام دینے کی توفیق بھی عطا فرمائی تھی۔ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کا تذکرہ پہلے بھی آچکا ہے۔ ایک مرتبہ سفر کے دوران آپ کا گزر جلال آباد یا شاملی سے ہوا، وہاں ایک مسجد ویران پڑی تھی۔ آپ نے پانی کھینچ کر وضو کیا، مسجد میں جھاڑو دی اور مسجد میں ایک شخص سے پوچھا کہ یہاں کوئی نمازی نہیں؟ اس نے کہا کہ سامنے خان صاحب کا مکان ہے جو شرابی بھی ہیں، رنڈی باز ہیں، اگر وہ نماز پڑھنے لگیں تو یہاں اور بھی دو چار نمازی ہو جائیں۔

مولانا یہ سن کر خان صاحب کے پاس تشریف لے گئے، وہ نشہ میں مست تھے اور رنڈی پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ مولانا نے ان سے فرمایا: بھائی خان صاحب! اگر تم نماز پڑھ لیا کرو تو دو چار آدمی اور جمع ہو جایا کریں اور یہ مسجد آباد ہو جائے۔ خان صاحب نے کہا کہ مجھ سے وضو نہیں ہوتی اور یہ دو بُری عادتیں چھٹتی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بے وضو ہی پڑھ لیا کرو اور شراب نہیں چھٹتی تو وہ بھی پی لیا کرو۔ اس نے عہد کیا کہ میں بغیر وضو ہی پڑھ لیا کروں گا۔ آپ وہاں سے تشریف لے گئے، کچھ فاصلہ پر نماز پڑھی اور سجدے میں خوب روئے۔ ایک شخص نے دریافت کیا کہ حضرت! آپ سے دو باتیں ایسی سرزد ہوئیں جو کبھی نہ ہوئی تھیں، ایک یہ کہ آپ نے شراب اور زنا کی اجازت دے دی، دوسرے یہ کہ آپ سجدے میں بہت روئے۔ فرمایا کہ سجدے میں میں نے جناب باری سے التجا کی تھی کہ اے رب العزت! اگرچہ میں نے کہہ دیا، اب دل جس کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ ان خان صاحب کا یہ حال ہوا کہ جب رنڈیاں پاس سے چلی گئیں تو ظہر کا وقت تھا، اپنا عہد یاد کیا، پھر خیال آیا کہ آج پہلا دن ہے، لاؤ غسل کر لیں، کل سے بے وضو پڑھ لیا کریں گے۔ چنانچہ غسل کیا، پاک کپڑے پہنے، نماز پڑھی۔ نماز کے بعد باغ کو چلے گئے۔ عصر اور مغرب باغ میں با وضو پڑھی، مغرب کے بعد گھر پہنچے تو ایک طائفہ موجود تھی، پہلے کھانا کھانے گھر میں گئے، وہاں جو بیوی پر نظر پڑی تو فریفتہ ہو گئے۔ باہر آکر رنڈی سے کہا کہ آئندہ میرے مکان پر نہ آنا۔ [2]

۳۱ - امیر شاہ خان صاحب مرحوم راوی ہیں کہ جب منشی ممتاز علی کا مطبع میرٹھ میں تھا، اس زمانے میں ان کے مطبع میں مولانا نانوتوی بھی ملازم تھے اور ایک حافظ جی بھی نوکر تھے۔ یہ حافظ جی بالکل آزاد تھے، رندانہ وضع تھی، چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے، داڑھی چڑھاتے تھے، نماز کبھی نہ پڑھتے تھے، مگر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے ان کی نہایت گہری دوستی تھی۔ وہ مولانا کو ستاتے اور چھیڑتے تھے اور مولانا ان کو ستاتے اور چھیڑتے تھے۔ مولانا ان کے کنگھا کرتے تھے اور وہ مولانا کے کنگھا کرتے تھے۔ اگر کبھی مٹھائی وغیرہ مولانا کے پاس آتی تو ان کا حصہ ضرور رکھتے تھے۔ غرض بہت گہرے تعلقات تھے۔ مولانا کے مقدس دوست ایسے آزاد شخص کے ساتھ مولانا کی دوستی سے ناخوش تھے، مگر وہ اس کی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے۔

ایک مرتبہ جمعہ کا دن تھا، حسب معمول مولانا نے حافظ جی کو نہلایا اور حافظ جی نے مولانا کو۔ جب نہا چکے تو مولانا نے فرمایا، حافظ جی! مجھ میں اور تم میں دوستی ہے اور یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ تمہارا رنگ اور ہو اور میرا رنگ اور، اس لیے میں بھی تمہاری ہی وضع اختیار کر لیتا ہوں۔ تم اپنے کپڑے لاؤ، میں بھی وہی کپڑے پہنوں گا اور میری یہ داڑھی موجود ہے تم اس کو بھی چڑھا دو اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ نہ کپڑے اتاروں گا نہ داڑھی۔ وہ یہ سن کر آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔

[1] حیات القدس ص ۱۵۵ تا ۱۵۷

[2] ارواح ثلاثہ ص ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۹۱

اور کہا کہ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ مجھے اپنے کپڑے دے دیجیے، میں آپ کے کپڑے پہنوں گا اور یہ ڈاڑھی جو جبہ ہے اس کو آپ اُتار دیں۔" چنانچہ مولانا نے ان کو کپڑے پہنائے اور ڈاڑھی اُتار دی اور وہ اس روز سے پکے نمازی اور نیک بن گئے۔ [۱]

۳۲۔ دارالعلوم دیوبند کے دوسرے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے محسوس کیا کہ بعض حضرات مدرسین دارالعلوم کے مقررہ وقت سے کچھ دیر میں آتے ہیں تو آپ نے حاکمانہ محاسبہ کے بجائے یہ معمول بنا لیا کہ روزانہ صبح کو دارالعلوم کا وقت شروع ہونے پر اسلام کے دروازے کے قریب ایک چارپائی ڈال کر اس پر بیٹھ جاتے اور جب کوئی استاد آتے تو سلام و مصافحہ اور دریافتِ خیریت پر اکتفا فرماتے۔ زبان سے کچھ نہ کہتے کہ آپ دیر سے کیوں آتے ہیں؟ اس بے زبان سرزنش نے تمام مدرسین کو وقت کا پابند بنا دیا۔

البتہ صرف ایک مدرس اس کے بعد بھی کچھ دیر سے آتے تھے۔ ایک روز جب وہ وقتِ مقررہ کے کافی بعد مدرسہ میں داخل ہوئے تو سلام اور دریافتِ خیریت کے بعد انھیں پاس بٹھا کر فرمایا:

"مولانا! میں جانتا ہوں کہ آپ کے مشاغل بہت ہیں، ان کی وجہ سے دارالعلوم پہنچنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ ماشاء اللہ آپ کا وقت بڑا قیمتی ہے اور میں ایک بے کار آدمی ہوں خالی بیٹھا رہتا ہوں۔ آپ ایسا کریں کہ اپنے گھر کا کام مجھے بتلا دیا کریں، میں خود جا کر ان کو انجام دے دیا کروں گا تاکہ آپ کا وقت تعلیم کے لیے فارغ ہو جائے۔"

اس یگانہ طرزِ خطاب کا جو اثر ہونا تھا وہ ہوا اور وہ مدرس بھی آئندہ ہمیشہ کے لیے وقت کے پابند ہو گئے۔ [۲]

۳۳۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کو اللہ تعالیٰ نے اس صدی میں اصلاحِ خلق کی توفیقِ خاص دی اور اس کا انتہائی حکیمانہ اسلوب عطا فرمایا تھا۔ اردو کے مشہور شاعر جناب جگر مراد آبادی مرحوم کا واقعہ ہے کہ ایک مجلس میں حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانویؒ سے ذکر کیا کہ "جگر مراد آبادی سے ایک مرتبہ میری ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ میرا بھی جانے اور زیارت کرنے کو بہت دل چاہتا ہے مگر میں اس مصیبت میں مبتلا ہوں کہ شراب نہیں چھوڑ سکتا، اس لیے مجبور ہوں کہ کیا منہ لے کر جاؤں؟" حضرت نے خواجہ صاحبؒ سے پوچھا "پھر آپ نے کیا جواب دیا؟" خواجہ صاحبؒ نے عرض کیا کہ میں نے کہہ دیا "ہاں! یہ تو صحیح ہے، ایسی حالت میں حکیم الامت کے پاس جانا کیسے مناسب ہو سکتا ہے؟" حضرت نے فرمایا: "واہ! خواجہ صاحب آپ تو سمجھے تھے کہ اب آپ طریق کو سمجھ گئے ہیں، مجھے معلوم ہوا کہ ابھی آپ کا خیال غلط تھا۔" خواجہ صاحبؒ کے تعجب پر حکیم الامت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ "آپ کہہ دیتے کہ جس حال میں ہو اسی میں چلے جاؤ، ممکن ہے کہ یہ ملاقات ہی اس بلا سے نجات کا ذریعہ بن جائے۔"

چنانچہ خواجہ صاحبؒ یہاں سے واپس گئے تو پھر اتفاقاً جگر صاحب سے ملاقات ہو گئی اور یہ سارا واقعہ جگر صاحب کو سنا دیا۔ انھوں نے حضرت کے یہ کلمات سن کر زار زار رونا شروع کر دیا اور بالآخر یہ عہد کر لیا کہ اب مر بھی جاؤں تو اس خبیث چیز کے پاس نہ جاؤں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ شراب چھوڑنے سے بیمار پڑ گئے، حالت نازک ہو گئی، اس وقت لوگوں نے کہا کہ آپ کو اس حالت میں بقدرِ ضرورت پینے کی تو شریعت بھی اجازت دے گی لیکن یہ جگر صاحب کا جگر تھا کہ اس کے باوجود انھوں نے اس اُم الخبائث کو ہاتھ نہ لگایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو مقاماتِ جنت کی مدد فرماتے ہیں، اس وقت بھی حق تعالیٰ کی مدد سے چند روز میں شفاء کامل حاصل ہوئی۔ اس کے بعد وہ تھانہ بھون تشریف لے گئے اور حضرت سے بیعت کی درخواست کی۔ [۳]

۱ ارواحِ ثلاثہ ص ۱۷۴ ، ۲۳۶ ۲ "میرے والد ماجد" از حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ص ۵۹

۳ مجالس حکیم الامت، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ص ۵۸

۳۴ - غالباً شملہ کے کسی کالج میں حضرت تھانویؒ کا بیان ہوا، وہاں آپ نے فرمایا کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کو جو شبہات پیدا ہوتے ہیں وہ صرف غلط تعلیم ہی کا نقصان نہیں بلکہ اس کا بڑا سبب وہ لادینی ماحول ہے جس میں یہ کارروائی مسلسل پنپ رہی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ بزرگ اللہ والوں کی مجلسیں کم ہیں تاہم کچھ نہ کچھ قائم ہیں، کچھ دن اس ماحول میں رہنے کی عادت ڈالیں۔

غالباً اسی مجلس میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ کو انگریزی پڑھنے والوں سے نفرت ہے؟ حضرتؒ نے فرمایا کہ "ہرگز نہیں، ان لوگوں سے کوئی نفرت نہیں، البتہ ان کے بعض اعمال و افعال سے نفرت ہے جو شریعت کے خلاف ہیں" یہ صاحب بولے "وہ اعمال و افعال کیا ہیں؟" حضرتؒ نے فرمایا کہ "مختلف لوگوں کے مختلف اعمال ہیں، سب یکساں نہیں" یہ صاحب بھی خوب آزاد آدمی تھے، کہنے لگے کہ "مثلاً مجھ میں کیا ہیں؟" آجکل کے عام وضع طلباء کی طرح ان کی بھی ڈاڑھی صاف تھی، حضرتؒ نے فرمایا: "بعض چیزیں تو ظاہر ہیں، مگر مجمع میں اس کا اظہار کرنے سے حیا مانع ہے اور آپ کے باقی حالات و معاملات مجھے معلوم نہیں جن پر کوئی رائے ظاہر کر سکوں۔"

یہ جلسہ ختم ہوا، حضرتؒ تھانہ بھون واپس آگئے پھر اتفاقاً کالج کی تعطیل ہوئی تو ایک طالب علم کا خط آیا، خط میں لکھا تھا کہ ہماری اس وقت تعطیل ہے، میں آپ کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق کچھ دن آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا ہوں مگر میری ظاہری صورت بھی شریعت کے مطابق نہیں اور اعمال و افعال میں بھی بہت گڑبڑ ہے۔ ان حالات میں حاضری کی اجازت ہو تو حاضر ہو جاؤں۔ حضرت نے تحریر فرمایا "جس حالت میں ہیں، چلے آئیں، کوئی فکر نہ کریں"۔ یہ صاحب آگئے اور عرض کیا کہ مجھے بہت سے شبہات و اشکالات ہیں، ان کو حل کرنا چاہتا ہوں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ مناسب ہے مگر اس کی صورت یہ کرنی ہوگی کہ آپ کے جتنے شبہات ہیں ان سب کو لکھ لیں اور آپ مجلس میں خاموش رہا کریں، باتیں سنیں، کوئی سوال نہ کریں۔ جب آپ کی مدت قیام کے تین دن رہ جائیں اس وقت یاد دلائیں تو میں آپ کو سوالات کا مستقل وقت دوں گا اور یہ بھی فرمایا کہ سوالات آپ لکھ کر رکھیں گے، اس عرصے میں کسی سوال کا جواب سمجھ میں آجائے تو اس کو کاٹ دیں۔

ان صاحب نے ایسا ہی کیا اور جب رخصت سے تین روز پہلے حضرتؒ نے سوالات کا وقت دیا تو عرض کیا کہ میرے سوالات کی بہت طویل فہرست تھی مگر دوران قیام اکثر سوالات کے جواب خود سمجھ میں آگئے، ان کو کاٹتا رہا، اب صرف چند سوال باقی ہیں چنانچہ یہ سوالات انہوں نے پیش کیے اور حضرتؒ سے ان کے جوابات پاکر ہمیشہ کے لیے مطمئن ہوگئے۔ [1]

مخالفین سے سلوک

۳۵ اکابر دیوبند کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے مخالف مسلک والوں سے بھی بداخلاقی کا برتاؤ نہیں کرتے تھے، نہ ان کی تردید میں دل آزار اسلوب کو پسند کرتے تھے اور نہ طعن آمیز القاب سے یاد کرنا پسند کرتے تھے بلکہ جہاں تک ہو سکتا بداخلاقی کا جواب خوش خلقی سے دیتے اور مخالفین کی دینی ہمدردی و خیرخواہی کو پیش نظر رکھتے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خادم خاص حضرت امیر شاہ خان صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مولاناؒ خورجہ تشریف لے گئے اور وہاں ایک مجلس میں مولوی فضل رسول بدایونی کا تذکرہ چل گیا (چونکہ وہ مخالف مسلک کے تھے اس لیے) میری زبان سے (طنز کے طور پر) بجائے فضل رسول کے فصل رسول نکل گیا۔ مولاناؒ نے ناخوش ہو کر فرمایا کہ "لوگ ان کو کیا کہتے ہیں؟" میں نے کہا "فضل رسول" آپ نے فرمایا "تم فصل رسول کیوں کہتے ہو؟" حضرت تھانویؒ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"یہ حضرات تھے جو لا تلمزوا انفسکم ولا

---

[1] مجالس حکیم الامت، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ص ۹۰ - ۹۲

تنابزوا بالالقاب کے پورے عامل
تھے حتیٰ کہ مخالفین کے معاملہ میں بھی"۔ [1]

۳۶ - بریلی کے مولوی احمد رضا خاں صاحب نے اکابر دیوبند کی تکفیر اور ان پر سب وشتم کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ ہر پڑھے لکھے انسان کو معلوم ہے۔ ان فرشتہ خصلت اکابر پر گالیوں کی بوچھاڑ کرنے میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس دشنام طرازی کا سب سے بڑا نشانہ تھے، ایک روز اپنے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ اُن کی تصنیفیں ہمیں سُنا دو۔ حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ نے عرض کیا کہ "حضرت! ان میں تو گالیاں ہیں"۔ اس پر حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا:

"اجی دور کی گالیوں کا کیا ہے؟ پڑی (یعنی بلا سے) گالیاں ہوں، تم سناؤ۔ آخر اس کے دلائل تو دیکھیں شاید کوئی معقول بات ہی لکھی ہو تو ہم ہی رجوع کرلیں"۔ [2]

اللہ اکبر! یہ ہے حق پرستوں کا شیوہ، کہ مخالفین بلکہ دشمنوں کی باتیں بھی، اُن کی دشنام طرازیوں سے قطع نظر، اس نیت سے سُن جائیں کہ اگر اس سے اپنی کوئی غلطی معلوم ہو تو اس سے رجوع کر لیا جائے۔

۳۷ - مولانا محمود صاحب رام پوریؒ (جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے) فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میں اور ایک ہندو تحصیل دیوبند میں کسی کام کو گئے میں حضرت شیخ الہندؒ کے یہاں مہمان ہوا اور وہ ہندو بھی اپنے بھائیوں کے گھر کھانا کھا کر میرے پاس آگیا کہ میں بھی یہاں ہی رہوں گا، اس کو ایک چارپائی دے دی گئی۔ جب سب سو گئے تو رات کو میں نے دیکھا کہ مولاناؒ زنانہ میں سے تشریف لائے، میں لیٹا رہا اور یہ سمجھا تھا کہ اگر کوئی مشقت کا کام کریں گے تو میں امداد کروں گا ورنہ خواہ مخواہ اپنے جاگنے کا اظہار کر کے کیوں پریشان کروں میں نے دیکھا کہ مولاناؒ اس ہندو کی طرف بڑھے اور اس کی چارپائی پر بیٹھ کر اس کے پاؤں دبانے شروع کیے۔ وہ خراٹے لے کر خوب سوتا رہا۔ مولانا صاحب کہتے ہیں کہ میں اٹھا اور عرض کیا کہ حضرت! آپ تکلیف نہ کریں میں دبا دوں گا۔ مولانا نے فرمایا کہ تم جا کر سو رہو، یہ میرا مہمان ہے، میں ہی اس خدمت کا انجام دوں گا۔ مجبوراً میں چپ ہو گیا اور مولاناؒ اس ہندو کے پاؤں دباتے رہے۔ [3]

۳۸ - مولانا احمد حسن صاحب پنجابی مقدس کانپوری نے "ابطال اغلاط مکذب" میں ایک مبسوط رسالہ تحریر کر کے شائع کیا جس میں حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہم عقیدہ حضرات کو فرقۂ ضالہ مزداریہ میں (جو معتزلہ میں سے ایک گروہ ہے) داخل کر دیا اور اس پر تقریظ لکھنے والوں نے تو اکابر دین کی نسبت زبان درازی کی انتہا کر دی۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ رسالہ دیکھ کر طیش تو بہت آیا لیکن حلم و تقویٰ کا مقام بلند ملاحظہ فرمائیے کہ غیظ و غضب کے جذبات کو پی کر ارشاد فرمایا:

"ان گستاخ لوگوں کو برا کہنے سے تو اکابر کا انتقام پورا نہیں لیا جا سکتا، اور ان کے اکابر کی نسبت کچھ کہہ کر اگر دل ٹھنڈا کیا جائے تو وہ لوگ معذور، بے قصور ہیں"۔ [4]

۳۹ - حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے مواعظ سے اُمت کو جو بے مثال نفع پہنچا وہ محتاج بیان نہیں۔ حضرتؒ کے مواعظ کا فیض آج تک جاری ہے اور جن حضرات نے ان کا مطالعہ کیا ہو وہ جانتے ہیں کہ یہ مواعظ دین کی بیشتر ضروریات پر حاوی ہیں اور اصلاح و تربیت کے لیے بے نظیر تاثیر رکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ جونپور میں آپ کا ایک وعظ ہوا تھا۔ وہاں بریلوی حضرات کا خاصا مجمع تھا، آپ کے پاس ایک بے ہودہ خط پہنچا جس میں چار باتیں کہی گئی تھیں ایک تو یہ کہ تم نجاست ہو، دوسرے یہ کہ جاہل ہو، تیسرے یہ کہ کافر ہو، اور

[1] ارواح ثلاثہ ص ۱۷۵، ۲۲۸ [2] ارواح ثلاثہ ص ۱۱۲، ۳۱۸ [3] ارواح ثلاثہ ص ۲۸۵، ۲۳۳
[4] حیات شیخ الہندؒ از حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ ص ۱۸۲

پڑھتے یہ کہ سنبھل کر بیان کرنا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے وعظ شروع کرنے سے پہلے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس قسم کا ایک خط میرے پاس آیا ہے پھر وہ خط سب کے سامنے پڑھ کر سنایا اور فرمایا کہ "یہ جو لکھا ہے کہ تم جولاہے ہو، تو اگر میں جولاہا ہوں بھی تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ میں یہاں کوئی رشتہ ناطہ کرنے تو آیا نہیں، احکام الٰہی سنانے کے لیے حاضر ہوا ہوں، سو اس کو قومیت سے کیا علاقہ؟ دوسرے یہ جولاہا ہونا اختیاری بھی نہیں، اللہ تعالیٰ نے جس کو جس قوم میں چاہا پیدا فرما دیا، سب قومیں اللہ تعالیٰ ہی کی بنائی ہوئی ہیں اور سب ہی اچھی ہیں اگر اعمال و اخلاق اچھے ہوں۔ یہ تو مسئلہ کی تحقیق تھی۔ رہی واقعہ کی تحقیق سو مسئلہ کی تحقیق کے بعد واقعہ کی تحقیق کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی لیکن پھر بھی اگر کسی کو تحقیق واقعہ کا شوق ہی ہو تو میں آپ کو اپنے وطن کے حکام کے نام اور پتے لکھوائے دیتا ہوں، ان سے تحقیق کر لیجیے، معلوم ہو جائے گا کہ میں جولاہا ہوں یا کس قوم کا؟ اور اگر مجھ پر اطمینان ہو تو میں مطلع کرتا ہوں کہ میں جولاہا نہیں ہوں —— رہا جاہل ہونا، اس کا البتہ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں جاہل بلکہ اجہل ہوں لیکن جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا ہے اور کتابوں میں دیکھا ہے اس کو نقل کر دیتا ہوں۔ اگر کسی کو کسی بات کے غلط ہونے کا شبہ ہو اس پر عمل نہ کرے —— اور کافر ہونے کو جو لکھا تو اس میں زیادہ قیل و قال کی حاجت نہیں، میں آپ صاحبوں کے سامنے پڑھتا ہوں:

أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن

محمد رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم)

اگر میں نعوذ باللہ کافر تھا بھی تو لیجیے اب نہیں رہا —— آخر میں سنبھل کر بیان کرنے کی دھمکی دی گئی ہے، اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ وعظ گوئی کوئی میرا پیشہ نہیں ہے، جب کوئی بہت اصرار کرتا ہے تو جیسا کچھ مجھے بیان کرنا آتا ہے بیان کر دیتا ہوں، اگر آپ صاحبان نہ چاہیں گے تو میں ہرگز بیان نہ کروں گا۔ رہا سنبھل کر بیان کرنا تو اس کے متعلق صاف صاف عرض کیے دیتا ہوں کہ میری عادت خود ہی چھیڑ چھاڑ کی نہیں ہے۔ قصداً کبھی کوئی ایسی بات نہیں بیان کرتا جس میں کسی گروہ کی دل آزاری ہو یا فساد پیدا ہو، لیکن اگر مسائل شرعیہ کی تحقیق کے ضمن میں کسی ایسے مسئلے کے ذکر کی ضرورت ہی پیش آجاتی ہے جس کا رسوم و بدعت سے تعلق ہے تو پھر میں رکتا بھی نہیں۔ اس لیے کہ یہ تبلیغ دین میں خیانت ہے —— سب باتیں سننے کے بعد اب بیان کے متعلق جو آپ صاحبوں کی رائے ہو اس سے مطلع کر دیا جائے۔ اگر اس وقت کوئی بات کسی کے خلاف طبع بیان کرنے لگوں تو فوراً مجھ کو روک دیا جائے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کوئی ادنیٰ شخص بھی مجھے روک دے گا تو میں اپنے بیان کو فوراً منقطع کر دوں گا اور بیٹھ جاؤں گا۔ بہتر یہ ہے کہ وہی صاحب روک دیں جنہوں نے یہ خط بھیجا ہے یا اگر خود کہتے ہوئے انہیں شرم آئے یا ہمت نہ ہو تو چپکے سے کسی لڑکے کو سکھا پڑھا دیں، ان کی طرف سے وہ مجھے روک دیں۔

یہ سن کر ایک مقامی مولوی صاحب جو بدعتی خیال کے تھے اور جن کا وہاں بہت اثر تھا، کڑک کر بولے: "یہ خط لکھنے والا کوئی حرامزادہ ہے۔ آپ فرمائیے آپ کیسے فاروقی ہیں؟" حضرت نے فرمایا: "میں ایسی جگہ کا فاروقی ہوں جہاں کے فاروقیوں کو یہاں کے لوگ جولاہے کہتے ہیں۔"

جب سارا مجمع خط لکھنے والے کو برا بھلا کہنے لگا، خاص طور سے وہ مولوی صاحب فحش فحش گالیاں دینے لگے تو حضرت والا نے روکا کہ گالیاں نہ دیجیے، مسجد کا تو احترام کیجیے —— پھر حضرت والا کا وعظ ہوا اور بڑے زور شور کا وعظ ہوا۔ اتفاق سے دوران وعظ میں بلا قصد کسی علمی تحقیق کے ضمن میں کچھ رسوم و بدعات کا بھی ذکر چھڑ گیا پھر تو حضرت والا نے بلا خوف لومۃ لائم خوب ہی رد کیا۔ لوگوں کو یہ اختیار دے چکے تھے کہ وہ چاہیں تو وعظ کو روک دیں، لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی۔

وہ مقامی مولوی صاحب شروع شروع میں تو بہت تحسین کرتے رہے اور بار بار سبحان اللہ سبحان اللہ کے نعرے بلند کرتے رہے، کیونکہ اس وقت تصوف کے رنگ پر بیان ہو رہا تھا لیکن جب رد بدعات ہونے لگا تو پھر چپ ہو گئے

سنکر بیٹھے سنتے رہے۔ یہ بھی خدا کا بڑا فضل تھا کیونکہ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ ایسے کٹر اور سخت ہیں کہ جہاں کسی واعظ نے کوئی بات خلاف طبع کہی، انھوں نے وہیں ہاتھ پکڑ کر منبر سے اتار دیا، لیکن اس وقت انھوں نے دم نہیں مارا، چپکے بیٹھے سنتے رہے۔ لیکن جب وعظ ختم ہوا اور مجمع رخصت ہونے کے لیے کھڑا ہو گیا تو اس وقت اُن مولوی صاحب نے حضرت والا سے کہا کہ "ان مسائل کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی"! اس پر ایک دوسرے ذی اثر مولوی صاحب (جو خود بدعتی خیال کے تھے) بڑھے اور جواب دینا چاہا لیکن حضرت والا نے انھیں روک دیا کہ خطاب مجھ سے ہے، آپ جواب نہ دیں، مجھے عرض کرنے دیں پھر حضرت والا نے اُن معترض مولوی صاحب سے فرمایا کہ "آپ نے یہ بات پہلے مجھ سے نہ فرمائی، ورنہ میں احتیاط کرتا، میں نے تو جو کچھ بیان کیا ضروری ہی سمجھ کر کیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟ اب تو بیان ہو چکا۔ ہاں! ایک صورت اب بھی ہو سکتی ہے وہ یہ کہ ابھی تو مجمع موجود ہے، آپ پکار کر کہہ دیجیے کہ صاحبو! اس بیان کی کوئی ضرورت نہ تھی، پھر میں آپ کی تکذیب نہ کروں گا اور آپ ہی کی بات اخیر رہے گی"۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور مولوی صاحب اُن سے رخصت ہو گئے۔

اُن کے چلے جانے کے بعد سب لوگ اُن کو بُرا بھلا کہنے لگے، جب بہت شور و غل ہوا تو حضرت والا نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ "صاحبو! ایک پردیسی کی وجہ سے آپ مقامی علماء کو ہرگز نہ چھیڑیں، میں آج پچھلی شہر جا رہا ہوں۔ اب آپ صاحبان یہ کریں اور میں ان صاحب کو بالخصوص خطاب کرتا ہوں جنھوں نے خط بھیجا ہے کہ وہ میرے بیان کا رد کرا دیں پھر دونوں راہیں سب کے سامنے ہوں گی جو جس کو چاہے اختیار کرے، فساد کی ہرگز ضرورت نہیں۔

پھر ان دوسرے مولوی صاحب نے (جو بدعتی خیال کے ہونے کے باوجود بڑا تک دیکھتے رہے تھے) کھڑے ہو کر فرمایا کہ:

"صاحبو! آپ جانتے ہیں کہ میں مولود بھی ہوں، قیامی بھی ہوں مگر انصاف اور حق یہ ہے کہ جو تحقیق آج مولوی صاحب نے بیان فرمائی ہے وہ صحیح وہی ہے"[1]

۴۰۔ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے سنا ہے کہ حضرت شیخ الہند کے متعلقین میں سے کسی صاحب نے اہل بدعت کی تردید میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ اہل بدعت نے اس کا جواب لکھا، اس میں انھیں کافر قرار دیا۔ اس عمل کے جواب میں ان صاحب نے دو شعر لکھے:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست   چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش   دروغے را جزا باشد دروغے[2]

انھوں نے حضرت شیخ الہند کو یہ شعر سنائے تو آپ نے شعروں کی لطافت کی تو تعریف فرمائی لیکن ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ "تم نے ان کو لطافت کے ساتھ ہی، کافر تو کہہ دیا حالانکہ فقہی رو سے وہ کافر نہیں ہیں اس لیے ان اشعار میں اس طرح ترمیم کر لو:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دہم شکر بجائے تلخ دوغے
اگر تو مومنی فبہا، و الا
دروغے را جزا باشد دروغے[3]

---

[1] اشرف السوانح ج ۱ ص ۶۸ - ۶۲

[2] "تم نے مجھے کافر کہا مجھے اس کا غم نہیں کیونکہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا۔ میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہوں گا، کیونکہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہو سکتی ہے"

[3] "تم نے مجھے کافر کہا، مجھے اس کا غم نہیں کیونکہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا، میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہوں گا اور کڑوی لسّی کا جواب شیرینی سے دوں گا، اگر تم واقعی مومن ہو تو خیر ورنہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہو سکتی ہے"

یہ چند واقعات ہیں جو کسی خاص اہتمام تحقیق و جستجو کے بغیر زیرِ قلم آ گئے۔ اس مختصر مضمون میں اس قسم کے واقعات کا احاطہ مقصود نہیں، مگر کوئی بندۂ خدا تحقیق و جستجو اور مطالعہ کے بعد ان حضرات کے ایسے واقعات کو یکجا کر دے تو علم و دین کی بڑی خدمت ہو لیکن کم از کم چند واقعات اکابر دیوبند کے حسن و جمال کی ایک جھلک دکھانے کے لیے، اُمید ہے کافی ہوں گے۔ واللہ الموفق و هو المستعان

از حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ

ہر جلوہ پُر ضیا رُخِ انور کا نور ہے　　　شانوں میں کیا بلند یہ شانِ حضورؐ ہے

جو جلوہ ہے وہ رشکِ تماشائے طُور ہے　　　واللہ کیا بلند یہ شانِ حضورؐ ہے

مکّہ کے تاجدار، مدینہ کے حکمراں　　　عالم کے رہنما ہیں یہ شانِ حضورؐ ہے

بے چین دل کا چین ہیں، آنکھوں کا نور ہیں　　　منزل ہیں عاشقوں کی، یہ شانِ حضورؐ ہے

عفو و کرم کا ابر ہیں، بخشش کی ہیں گھٹا　　　بارش ہیں رحمتوں کی یہ شانِ حضورؐ ہے

بحرِ سخا ہیں اور سمندر ہیں جود کا　　　لطف و کرم کی موج یہ شانِ حضورؐ ہے

شافع ہیں روزِ حشر کے سب کے ہیں پیشوا　　　محبوبِ کبریا ہیں، یہ شانِ حضورؐ ہے

مرکز ہیں دائرہ کے یگانۂ روزگار　　　بے مثل و بے نظیر یہ شانِ حضورؐ ہے

مخزن ہیں حکمتوں کے ہدایت کے آفتاب　　　خاتم ہیں انبیاء کے یہ شانِ حضورؐ ہے

ضرب المثل ہیں، حلم میں، کوہِ وقار ہیں　　　انسانیت کے تاج یہ شانِ حضورؐ ہے

وعدہ کے کیسے سچے، صدوق و امین بھی　　　اخلاق کیا شگفتہ یہ شانِ حضورؐ ہے

بازعب بھی کمال کے اس پر وہ مہربان — سب میں گھلے ملے ہیں یہ شانِ حضورؐ ہے

حسن و ادائے غضب کے تو مجھ سے کچھ نہ پوچھ — شمس و قمر ہیں ماند یہ شانِ حضورؐ ہے

خود نازنین ہیں اس پہ جائیں جہان کی — کس شوق سے اٹھائیں یہ شانِ حضورؐ ہے

سب پر حریص اور رؤف و رحیم ہیں — سب میں عزیز تر ہیں یہ شانِ حضورؐ ہے

حاصل ہے زندگی کا اک ان کا وجود پاک — جیسے ثمر شجر کا یہ شانِ حضورؐ ہے

منشاء ہیں خلق و امر کا مبدا ہیں منتہیٰ — منبع وجود کا ہیں یہ شانِ حضورؐ ہے

قرآن نے خود ہی آپ کو پیارا لقب دیا — سب نے کہا کہ خوب یہ شانِ حضورؐ ہے

ساقی ہیں صرف آپ ہی کوثر کے روزِ حشر — سب کو بلا بلا کے یہ شانِ حضورؐ ہے

کیا کیا لکھوں صفات کہ ہر شان ہے نئی — لکھ لکھ کے تھک رہا ہوں یہ شانِ حضورؐ ہے

مجھ سے سیاہ رو کی جو بخشش بھی ہو گئی — یہ شانِ حضرت ہے یہ شانِ حضورؐ ہے

میں نعت کیا کہوں گا کہ عاصی ہوں شرمسار — جو کچھ بھی کہہ گیا ہوں یہ شانِ حضورؐ ہے

ہر چند خستہ حال ہوں درماندہ اور تباہ — اس پر بھی مطمئن ہوں یہ شانِ حضورؐ ہے

جز ناز ان کے در کا میرے پاس کچھ نہیں — ایک آسرا یہی ہے، یہ شانِ حضورؐ ہے

مہمانِ بے نوا کو معزز بنا لیا — خدمت میں اپنی رکھ کے یہ شانِ حضورؐ ہے

نسبت ہے ایک شیخ سے جن کے طفیل ہیں

مجھ کو بنا لیا ہے، یہ شانِ حضورؐ ہے

دارالعلوم دیوبند کی صدارتِ تدریس

ابن انور مرحوم سید محمد ازہر شاہ قیصر
مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

یہ مضمون حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد لکھا گیا تھا جیسا کہ اس مضمون ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت مدنیؒ کے بعد صدر مدرسی کیلئے حضرت مولانا فخرالدین رحمۃ اللہ علیہ کا انتخاب ہوا اور مرحوم نے تاحیات کامیابی کے ساتھ دارالعلوم میں بخاری شریف کا درس دیا۔ مولانا فخرالدین کے بعد ضابطہ کے صدر مدرس مولانا فخرالحسن صاحب اور مولانا شریف حسن صاحب دیوبندی بخاری شریف پڑھاتے ہیں۔ بحمداللہ دارالعلوم میں بخاری شریف اور صحاح ستہ کا درس امتیازی خصوصیت کے ساتھ جاری ہے۔

گزشتہ ایک صدی سے دارالعلوم دیوبند کی صدارتِ تدریس کی مسند کو جو درحقیقت پورے دارالعلوم کی صدارت و سیادت کی مسند عظیم ہے، قدرتی طور پر یہ شرف و فخر حاصل رہا ہے کہ اپنے وقت کے جلیل القدر عالم، بے مثال محدث، عارف باللہ اور اپنے کردار کی خصوصیات کے لحاظ سے سرآمد روزگار انسانوں نے اس مسند پر بیٹھ کر پورے ہندوستان اور پورے عالم اسلامی کو اپنے علم و عمل زہد و تقوے، سادہ زندگی، توکل و استغنا، خدا خواہی اور خدا ترسی، نیک مشاغل اور اعمال کے فیوض سے مستفید فرمایا۔ یہ خود قدرت الٰہیہ کا ایک انتظام ہے کہ اب تک دارالعلوم کو صدر مدرس اور شیخ الحدیث ایسے میسر آتے رہے جنھوں نے اندرونی طور پر دارالعلوم کی دینی خصوصیات اور بیرونی طور پر دارالعلوم کی عظیم شہرت کو باقی رکھا اور آگے بڑھایا۔ دارالعلوم کے کمالات اور کارناموں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ بلاشبہ ان میں سے ہر شخص کے حالات پر الگ الگ کتابیں لکھی جاسکتی ہیں اور لکھی گئی ہیں۔ میں اپنی اس تحریر میں اختصار کی شرط کے ساتھ، ان بزرگوں کے حالات پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ صرف اجمالی طور پر ان بزرگوں کا ذکر کرتا ہوں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ

یہ دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں، رشتہ داری اور معاصرت میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نانوتوی قدس سرہ کے ساتھ شریک تھے، متبحر عالم، فاضل مصر، عارف باللہ اور مجذوب قسم کے انسان تھے، بڑی سادہ زندگی رکھتے تھے، مکاشفات و مراقبات کا آپ کی زندگی میں خاص حصہ تھا، اکثر اپنے مکاشفات اپنے دوستوں سے بیان کر دیتے تھے، جس

زمانے میں انگریز یہاں آباد کر رہے تھے، آپ نے اس وقت پیشن گوئی فرمائی تھی کہ انگریز اپنی پسپائی ہوئی ان بستیوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے اور ہندوستان میں بہت جلد ان کے عروج کا آفتاب گہن میں آجائے گا یہ پیشگوئی اپنے وقت پر پوری ہوئی، انتقال سے کچھ دن پہلے دیوبند سے اپنے وطن نانوتہ تشریف لے گئے، دیوبند سے جاتے وقت سب ملنے جلنے والوں سے مل کر کہا سنا معاف کرا گئے، وطن میں جس دن انتقال ہوا، اس دن اپنی مسجد کے ملّا سے کہہ بھی دیا کہ آج ہمارا سفر ہے اور اسی دن انتقال فرمایا، نانوتہ میں آپ کے مزار پر مجھے حاضری کا موقع ملا ہے، صاف طور پر یہ محسوس ہوا کہ اس تودۂ خاک کے نیچے وقت کا شیخ کامل آسودہ اور محوِ خواب ہے بڑے کمالات کے انسان تھے، ہمارے بزرگ حضرت علامۃ العصر مولانا شبیر احمد عثمانی رح ہیں اکثر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رح کے حالات سنایا کرتے تھے۔ آپ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کے استاذ تھے، حضرت تھانوی رح کی مجلسوں اور ملفوظات میں بھی آپکا ذکر بکثرت و مرات ملتا ہے۔

مولانا سید احمد دہلوی رح

دارالعلوم کے دوسرے صدر مدرس ریاضی کے بہت بڑے عالم تھے بزرگوں سے سُنا ہے کہ آپ کا علم بے حد، پختہ اور زندگی بڑی متوکلانہ تھی۔ دارالعلوم کے لیے آپ کی دینی اور علمی خدمات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

حضرت شیخ الہند رح

دارالعلوم کے اساطین میں حدیث و تفسیر کے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رح نے دارالعلوم کی مسند پر قدم رکھا تو چار سو شور مچ گیا کہ برات کا دولہا آگیا ہے، نحیف و نزار بدن میں عزم و حوصلہ، نیکی و دینداری کی ایک بڑی مضبوط روح تھی جس نے عالم اسلامی میں ہنگامہ مچا دیا، مرشدِ کامل اور شیخ وقت، خلوتوں میں خدا کی اطاعت گزار بندے اور سیاسی میدان میں محمد علی، شوکت علی، حکیم اجمل خاں، حاجی عبدالغفار خاں، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا... جیسے مشہور لیڈر رہنما کے رہنما، ان کے نفس میں اللہ نے برکت و سعادت بخشی تھی، حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری رح اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ رح، مولانا عبید اللہ سندھی رح، مولانا اعزاز علی رح، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا فخر الدین مراد آبادی اور مولانا محمد ابراہیم بلیاوی جیسے شاگرد، اگر کسی اور استاذ کو میسر آئے ہوں تو نام لیجیے۔ شیخ الہند رح کی صحبت ایک نعمت تھی، کہ جسے حاصل ہوئی وہ سچا مسلمان اور بڑا انسان بن گیا۔ علم و شریعت کی دنیا میں ان کے شاگردوں نے اپنے اپنے وقت پر حکمرانی کی ہے۔ دارالعلوم میں حضرت شیخ الہند رح نے علوم و معارف کے دریا بہائے۔ آزادیٔ وطن کی طرف توجہ کی تو ہندوستان، آزاد قبائل، افغانستان اور ترکی کو انگریزوں کے مقابلے میں لاکھڑا کیا۔ آزادیٔ وطن کے لیے انھوں نے ایک آگ لگائی تھی۔ اس آگ نے آگے چل کر انگریزوں کے اقتدار کی ساری کائنات کو جلا دیا۔ مالٹا کا وہ قلعہ جہاں حضرت شیخ رح نے اپنی اسارت کا زمانہ گزارا ہے جب تک باقی ہے، اس مردِ مومن کی شرافت، عزم و ہمت اور بزرگانہ اوصاف کی شہادت دے گا۔ دیوبند کی زندگی کے قدم قدم پر شیخ الہند رح کی علمی اور عملی خصوصیات کا ایک ایک نقش ابھرا ہوا ہے۔

حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری رح

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے لائق شاگرد حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری رح کی صدارتِ تدریس کی سفارش فرمائی، علما کا متفقہ فیصلہ ہے کہ گزشتہ پانچ چھ صدی میں اس شان کا عالم منصۂ شہود پر نہیں آیا، قوتِ حافظہ، ذکاوت، ذہانت، علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت، مضامین حدیث و تفسیر میں نئے نئے، استنباط علمی شغف

علوم زندگی، تبحر و جامعیت اور وسعت معلومات کے لحاظ سے ان کی ذات
بے مثال تھی۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے ان کے جلسہ تعزیت میں تقریر کرتے ہوئے
سچ کہا تھا کہ:

"سات صدی میں ایسا جامع عالم اور کوئی نہیں آیا۔"

قوت حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جس کتاب کو ایک دفعہ پڑھا، چالیس سال
بعد بھی اس کے مضامین محفوظ رہے اور ضرورت کے وقت ۳۰ سال اور تیس
سال پہلے پڑھی ہوئی اس کتاب کے صفحے کے صفحے پڑھ دیتے۔ ان کا درس حدیث
امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ آج پورے ہندوستان میں درس حدیث
میں تحقیقات علمیہ اور دلائل عقلیہ کا جو رواج ہے۔ اس کے موجد حضرت
شاہ صاحبؒ ہیں۔ آپ کے شاگردوں میں مولانا اعزاز علی صاحب
مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، مولانا فخر الدین صاحب، مولانا محمد حفظ
الرحمن صاحب سیوہاروی، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی، مولانا محمد یوسف
صاحب بنوری، مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا میرک شاہ کشمیری
مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ، مولانا سعید
احمد اکبر آبادی، مولانا حمید الدین صاحب فیض آبادی، مولانا شمس الحق صاحب
افغانی، مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی، مولانا محمد انوری صاحب
لائلپوری، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، مولانا محمود احمد نانوتوی، مولانا
حبیب الرحمن صاحب اعظمی، مولانا محمد چراغ گوجرانوالہ اور مولانا محمد یوسف
میر اعظم جیسے سیکڑوں علماء ہیں۔ ممالک اسلامیہ کے علماء نے آپ کی تصانیف
دیکھ کر آپ کی عظمت کا اعتراف کیا۔ سید رشید رضا مرحوم اور علامہ
زاہد کوثری کے مضمون جو حضرت شاہ صاحب رح کے متعلق لکھے گئے ہیں
اس کے شاہد ہیں۔ بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کا دورِ صدارت
دارالعلوم کی علمی اور عملی زندگی کا دورِ شباب تھا۔ آج درس و تدریس، تصانیف
و تالیفات، قومی اور سیاسی تحریکات اور تقریر و مواعظ کے میدانوں میں
آپ کے شاگرد نمایاں خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ
کی بہت سی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ بہت سا ذخیرہ ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ آپ
کے نامور شاگرد اور عالم مولانا محمد میاں اور ... آپ کی تصانیف کی طباعت
و اشاعت پر لاکھوں روپے خرچ کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ
ان کی عمر دراز کرے اور علمی مقاصد کے لیے ان کی ... بنائے۔ ...
اشاعت علوم کے سلسلے میں ... خدمات ...
ہیں۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب ... کی ...
اپنی طرف کھینچ لیا تو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس
سرہٗ مسند صدارت پر جلوہ افروز ہوئے۔ عبادت، دین، جوش جہاد، استقلال،
فداکاری، عزیمت و جانبازی، سادگی و تواضع، علم و عمل، زہد، تقویٰ، تحمل،
بہادری، نیکی و پرہیزگاری۔ سعادت دنیا کا یہ ایک خزانہ تھا، جسے ۵ دسمبر
۱۹۵۷ء کی شب میں ہم سب نے زمین میں دفن کر دیا۔ وہ دیوبند کی عظمت کے
جامع اور دیوبندی کمالات کے مظہر تھے۔ حق تعالیٰ نے بڑی سعادت
کے ساتھ انھیں عظمت شخصیت، مقبولیت اور مرکزیت عنایت فرمائی
تھی۔ جتنی مصروف اور سخت زندگی آپ گزار گئے، ہم جیسے ناکاروں
کے لیے اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ۲۴ گھنٹے میں صرف تین
گھنٹے آپ سوتے تھے۔ بقیہ سارا وقت درس و تدریس اور دینی خدمات میں
صرف ہوتا تھا۔ آخر وقت تک اپنے معمولات کے پابند رہے۔ انگریز کے مقابلے
میں پہاڑ تھے۔ ایسا پہاڑ جو ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹا۔ اپنے عقائد و مسلک
میں ناقابلِ جنبش تھے۔ اپنی زندگی کے دسیوں سال جیلوں میں گزار دیئے۔ کوئی
تکلیف ایسی نہ تھی جو اپنے عقیدے کے لیے انھوں نے برداشت نہیں کی۔
خوف، طمع و حرص آپ کو چھو کر بھی نہیں گیا، دین کے معاملے میں بے حد
متشدد اور متعصب ——— ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد

پچاس سال تن من اور دھن سے مصروف رہے، آزادی مل گئی، تو ایوان حکومت کی طرف نظر بھی اُٹھا کر نہیں دیکھا، اُن کے قدموں میں بیٹھنے والے وزیر و مشیر بن گئے، مگر اُنھوں نے اپنے بوریئے سے باہر قدم نہیں نکالا زندگی کے آخری دس سال حضرت مرحوم کی مقبولیت اور محبوبیت کے شعل تھے، جدھر سے نکل گئے، ہزاروں مسلمان حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ تصوف و طریقت میں شیخ الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے علوم عقلیہ میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے اور علم حدیث و فقہ میں شیخ العصر مولانا رشید احمد گنگوہی کے اور اخلاق و کردار میں اپنے اُستاد حضرت مولانا شیخ الہندؒ کے صحیح جانشین تھے۔

میخانہ چشت کا کشادہ دل ساقی، تصوف و طریقت کا امام وقت حدیث و تفسیر کا عالم باعمل، سخاوت و فیاضی میں فاتح دوراں، جرأت و شجاعت میں خالد بن ولیدؓ، عزم و استقلال میں اپنی مثال آپ دارالعلوم کی عظمت، جمعیۃ علماء کی شان، اپنے شاگردوں کے امام اپنے مریدوں کے شیخ اور معتقدین کے محبوب۔

حق تعالیٰ کارساز حقیقی ہیں، شخصیتیں بنانا اور انھیں ختم کر دینا ان کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں، وہ چاہیں تو دارالعلوم کو پھر حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جیسا شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماء ہند کو آپ سا صدر مل سکتا ہے۔ ورنہ بظاہر اسباب و بحالات موجودہ ان کی مثال دور دور تک کہیں نہیں ملتی اور علم و دیانت کی جو مسندیں وہ خالی کر گئے۔ اُن کا پھر آباد ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے۔

مولانا فخر الدین مرادآبادی

سبھوں کو معلوم ہے کہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے معتمد خاص اور حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری کے شاگرد حضرت مولانا فخر الدین صاحب کو اپنے جانشین کی حیثیت سے بخاری شریف کے درس میں دارالعلوم میں مامور فرمایا۔ اس کی توقع کی جاتی ہے کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے اس تقرر و انتخاب کو باقی رکھے گی۔ مولانا فخر الدین حدیث کے مشہور استاذ اور علمی خصوصیات میں منفرد ہیں۔ علمی دنیا آپ کے کمالات علمی پر اعتماد کرتی ہے۔ دارالعلوم کے وہ کثیر طلبا جنھوں نے اس سال کے شروع میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بخاری شریف کا درس شروع کیا تھا۔ اب حضرت کی وفات کے بعد مولانا فخر الدین صاحب ہی سے اپنی علمی توقعات رکھتے ہیں۔

حرفِ آخر

آج ملک، بیرون ملک میں حضرت مدنیؒ کے انتقال پر ملال کے گہرے جذبات چھائے ہوئے ہیں، میں دیوبند کی پوری علمی برادری کو ایک بہت بڑے فرض کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، وہ فرض ہے ہمارے سب بزرگوں اور حضرت مدنیؒ کی زندہ یادگار دارالعلوم کے تحفظ و بقا کیلئے اس نازک مرحلے پر ہم سب کی پُرخلوص جدوجہد کا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے تمام شاگردوں اور معتقدین کو سمجھ لینا چاہیے، کہ حضرت مرحوم کی حقیقی یادگار دارالعلوم ہے۔ دارالعلوم اگر زندہ ہے، تو ہندوستان میں اسلامی علوم کا چراغ روشن ہے، دارالعلوم اگر زندہ ہے تو آپ کے سامنے بزرگوں اور حضرت مدنیؒ کی یادگار زندہ ہے، جو شخص جہاں بھی ہے، اُسے دارالعلوم کی خیرخواہی کو اپنا مشن بنا لینا چاہیئے حضرت مدنیؒ کے بعد دارالعلوم کے سلسلے میں ہم سب کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں، ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی ذمہ داریوں سے غافل رہیں۔

انگریزی دور کے علماءِ ہند کی تاریخ بہت روشن ہے، اگر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتے، تو آج سے بہت پہلے نہ محض ہند بلکہ افریقہ اور ایشیا کے دیگر ممالک بھی استعماریت کے چنگل سے آزاد ہو گئے ہوتے۔

علماءِ ہند اپنے آپ کو اسلامی احکام کی بقا اور ترقی کے لیے ذمہ دار سمجھتے تھے، چنانچہ بقاءِ دین اور محافظتِ اسلام کے لیے نئی نئی تحریکیں اٹھاتے اور انھیں کامیاب بنانے کے لیے رات اور دن ایک کر دیا کرتے تھے۔ شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے جب دیکھا کہ دہلی میں اسلامی احکام کی جڑیں کمزور ہو رہی ہیں اور دینِ اسلام خطرے میں ہے، تو بعض مؤرخین کے قول کے مطابق شاہِ ایران کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی، تاکہ عصمتِ اسلام سے کھیلنے والے استعماری عناصر سے ہندوستان محفوظ رہ سکے۔

آخر وہی ہوا جسے شاہ صاحب کی دور رس نظروں نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا، آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانے میں (ایسٹ انڈیا) کمپنی نے ہندوستان پر ناجائز دباؤ ڈال کر اسے اپنا تابع بنا لیا۔ ۱۷۶۳ء میں بکسر کے میدان میں اسلامی جمعیت کو شکست دینے کے بعد تو ان کے لیے میدان بالکل ہی صاف ہو گیا۔ عوام و خواص پر مظالم توڑنے کے ساتھ ساتھ سلطنتِ مغلیہ کا بھی مذاق اُڑانے لگے، حتیٰ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے منیجر نے ۱۲۱۸ھ میں ارکانِ سلطنت پر دباؤ ڈالا کہ ہماری اس قرارداد کو منظور کر دو۔ جس کے ۳ جز ہیں۔

۱۔ مخلوق خدا کی ہوگی — ۲۔ ملک بادشاہ کے قبضے میں ہوگا۔ ۳۔ اور حکم ایسٹ انڈیا کمپنی کا جاری کیا جائے گا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز کو اس کی خبر ہوئی تو بادشاہ کی حمایت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس مطالبے کی تردید کے لیے آپ نے عوام۔ لیکن جب اس میں ناکامی ہوئی تو ۱۲۲۱ھ میں ہندوستان کے دارالحرب ہو جانے کا فتوے دے دیا اور اعلان کر دیا کہ تمام مسلمانوں پر انگریز دشمن سے جہاد کرنا ضروری ہے۔ یہ فتوے آج بھی فتاوائے عزیزیہ کے نام سے مشہور فارسی زبان کا یہ رسالہ ۱۰/۱۷ صفحات پر دہلی سے شائع کیا جا چکا ہے۔ عوام نے علماء کے دوش بدوش چل کر انگریزوں کے خلاف جہاد کیا اور تحریک

آزادی کو کامیاب بنانے کے لیے ہر ممکن امداد کی۔ اس جنگ آزادی کا ہر ہر سپاہی اپنے دین کا پرستار اور مذہب کا فدائی تھا۔ بیک وقت اسلامی احکام اور کمپنی کے فرمان کا بجا لانا محال تھا۔ جس وقت سید احمد بریلوی نے ہندوستان کو انگریزوں کے چنگل سے چھڑانے کی آواز اٹھائی، تو تقریباً دس ہزار ہندو اور مسلمانوں نے آپ کی آواز پر لبیک کہا، آپ نے اس ہندوستانی مہم کا رخ پنجاب کی طرف پھیر دیا، کیونکہ فرقہ پرست اور تنگ نظر قوتوں کی سرکوبی کے بغیر انگریزوں کی غلامی سے نجات محال تھی۔ پنجاب کی مہم سے فراغت اور مفتوحہ بلاد میں احکام الٰہی کے نفاذ کے بعد ابھی آپ نے اطمینان کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ انگریزوں کے جوڑ استعداد کا خاتمہ بڑھا اور مسلمانوں کی ایک بڑی جمعیت کے سرپرست اور دست راست شاہ اسمٰعیل شہید نے بھی جام شہادت نوش کیا۔ اس کے بعد بھی علماء ہند کی تحریک آزادی اندر ہی اندر زور پکڑتی رہی۔ چنانچہ انقلاب ۱۲۷۴ھ، ۱۸۵۷ء میں علماء کا گروہ سب سے آگے تھا۔ جو نہ تو قواعد حرب کا حقہ واقف تھا، نہ اس کے پاس جدید آلات حرب کی فراوانی تھی، اس کے باوجود بھی نہ صرف میدان میں اترا، بلکہ مجاہدین آزادی کی قیادت بھی کی۔ تاریخ انقلاب نے علماء ہند کو ایک اور مخصوص موقع دیا۔ وہ تھا تھانہ بھون اور شاملی (جو دہلی سے [illegible] میل کے فاصلے پر جانب شمال واقع ہیں) کا حادثہ، جس سے روح رواں حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی تھے۔ میسرہ اور میمنہ پر دوسرے علماء مقرر کئے گئے۔ جن کے علم کے نیچے مجاہدین کی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی، جو بھی آتا اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی قدیم آلہ حرب ضرور لاتا۔ لیکن ایمان کی روشنی انگریزوں کے اسلحہ جات جدیدہ اور مجاہدین کے آلات قدیمہ کے ساتھ مساوات قائم کر دیتی۔ آخر مجاہدین آزادی نے تھانہ بھون پر قبضہ کر لیا اور انگریزوں کو شکست فاش دے کر پیچھے ہٹا دیا اور تھانہ بھون میں ایک آزاد اسلامی حکومت قائم کر لی

اس کے بعد سہارنپور سے انگریزی فوج مجاہدین کی سرکوبی کے لیے شاملی روانہ ہوئی۔ ادھر راستے میں ہی شاملی کے پاس مجاہدین نے اپنی کمین گاہ بنائی جس کی قیادت حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی فرما رہے تھے۔ درختوں کی آڑ میں چھپ کر انگریزی فوج کا انتظار کرنے لگے۔ اب کی دفعہ بھی میدان مجاہدین کے ہاتھ لگا اور جس کے نتیجے میں بہت سے ہتھیار اور مال غنیمت ہاتھ آئے اور مجاہدین نے آگے بڑھ کر شاملی پر قبضہ کر لیا۔ اب مجاہدین کے حوصلے بڑھ گئے اور انگریزی فوج کو شکست دینے کیلئے ہر اس چیز کا استعمال کیا جو وقت پر ہاتھ آگئی حتیٰ کہ مشین گن اور برستی ہوئی گولیوں کا کامیاب جواب لاٹھی اور پتھر سے دیا۔ اسی اثناء میں دہلی کی جنگ ناکام ہو گئی اور مجاہدین پسپا ہو گئے، جیسے ہی کہ جوش ٹھنڈے پڑنے لگے۔ علماء نے جنگ کا جاری رکھنا خلاف مصلحت سمجھا اور میدان چھوڑ دیا، بہت سے مجاہدین شہید ہوئے، بہت سے روپوش ہو گئے۔ انگریزوں کو مولانا رشید احمد گنگوہی کو گرفتار کرنے میں کامیابی ہوئی جنہیں چھ ماہ کے بعد رہا کر دیا گیا۔ لیکن حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کو نہ پا سکے، آپ اس وقت ظاہر ہوئے جب انگریزوں نے باغیوں کو عام معافی دے دی۔ تاکہ اب جہاد کی ابتداء دوسرے کامیاب طریقے سے کی جائے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ایک جید عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مرد مجاہد بھی تھے، جنھوں نے مجاہدین کی قیادت بھی کی۔ انگریزوں سے مقابلہ بھی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی لیے پیدا کیا تھا کہ جنگ و جدل کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں بھی مسلمانوں کی قیادت کریں، اور صلح و امان کے زمانے میں بھی۔ انقلاب کی ناکامی کے بعد آپ نے اپنی بقیہ عمر دیوبند میں گزاری، جہاں آپ کے اعزا و اقارب بھی موجود تھے۔ اسی قصبے میں آپ نے ایک دینی مدرسے کی داغ بیل بھی ڈالی۔

اس زمانے کے عام علماء کی عام پالیسی یہی تھی کہ جہاں تک

ہوسکے، دینی تعلیم پر زور دیا جائے اور اسے عام کیا جائے، جو مغربی تعلیم سے الگ تھلگ فقط علوم عربیہ کی حامل ہو۔ اس نظریئے پر سختی سے عمل کیا گیا اور مغربی نظریئے کو ٹھکرا دیا گیا، علماء کی نظر میں ہر وہ چیز جو انگریز پیش کرتے اور ہر اس شے کو شبہ کی نظر سے دیکھتے جسے سامراج یورپ کی منڈیوں سے خرید لاتے، تعلیم، تعلیم، لباس کے علاوہ ہر اس چیز سے نفرت کرتے جس میں مغربیت کی ذرا سی بو محسوس ہوتی، جو ان کے تمدن و معاشرت، تہذیب و کلچر سے مشابہ ہوتی، ان کا عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ انگریزوں سے بالکل کنارہ کش رہیں۔ تاکہ ان کو اس کا موقع ہی نہ ملے کہ اسلام اور مسلمانوں میں اپنے خیالات و افکار ڈال کر ایمان کو متزلزل کر سکیں۔

یہی نظریئے کو لے کر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ اور ان کے ہم خیال علماء نے دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جو آج بھی موجود ہے اور مسجد چھتہ کے نام سے مشہور ہے۔ ایک انار کے درخت کے نیچے جو دروازے سے متصل مسجد کے صحن میں اب تک موجود ہے۔ ایک دینی مدرسہ کی رسم افتتاح ادا کی۔ جس کا کل سرمایہ ایک مدرس ملا محمود اور ایک طالب علم محمود حسن تھا، یہی طالب علم آگے چل کر شیخ الہند کے لقب سے مشہور ہوا۔ انھوں نے پہلی عالمگیر جنگ سے کچھ پہلے ہندوستان کو آزاد کرانے کی تحریک بڑے اونچے پیمانے پر اٹھائی تھی جس کی وجہ سے انگریزوں نے انھیں قید کر کے مالٹا بھیجا، آپ وہاں سے جنگ ختم ہونے کے بعد ہندوستان واپس آئے، اس کی عظمت و شخصیت کا تقاضا ہے کہ اس کا نام آتے تو تھوڑی دیر اپنی جبائی مشینری کو روک کر اس کے ان آثار علمیہ اور دینیہ پر نظر کریں جو سرزمین ہند پر بکھرے ہوئے ہیں اور جب تک مسلمان رہیں گے انھیں باقی رکھیں گے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ ۱۲۴۸ھ ۱۸۳۲ء میں نانوتہ نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اسی لیے اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، جیسا کہ ہندوستان میں عام ہے کہ کوئی شخص اپنے نام سے اتنا زیادہ متعارف نہیں ہوتا، جتنا کہ اپنے گاؤں قصبے، شہر یا شیخ کی نسبت سے مشہور ہوتا ہے۔ نانوتہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اور سہارنپور کی مغربی حدود میں واقع ہے اور دہلی سے جانب شمال ۱۰۰ میل کی دوری پر واقع ہے۔ بچپن ہی سے علومیت اور رفعت شان کے خطوط پیشانی پر ابھرے ہوئے تھے، حصول علم کے لیے آپ دہلی تشریف لے گئے اور وہاں سے علوم شرعیہ میں مہارت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے افکار و خیالات سے بھی خوب واقفیت حاصل کی۔ تکمیل تعلیم کے بعد ۲۵ برس کی عمر میں انگریزی حکومت کے خلاف جنگ میں شریک ہو کر باغیوں کی قیادت کی انقلاب آزادی کے ناکام ہونے کے بعد آپ روپوش ہو گئے۔ پھر دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھنے کے لیے منظر عام پر آئے۔ اس مبارک کام میں مخلصوں نے آپ کا ہاتھ بٹایا۔ آپ نے محض دارالعلوم دیوبند ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے ہم مشرب ساتھیوں کو لے کر ہر ہر شہر میں دینی مدارس قائم کرنے کی کوشش کی، آپ کے نام سے ہندوستان میں دو مدرسے بہت مشہور ہیں، مدرسہ دارالعلوم دیوبند، مدرسہ قاسمیہ مراد آباد۔ آپ تمام مسلمانوں میں افکار اسلامیہ کے مجدد کی حیثیت رکھتے تھے، چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء اپنے آپ کو آپ کی ذات کی طرف منسوب کرتے ہیں، جیسے محمد قاسمی، عبداللہ قاسمی۔

ان آثار علمیہ کے علاوہ آپ نے بہت سی قیمتی کتابیں چھوڑی ہیں جن کے مضامین ادق اور جملے بہت اونچے ہیں، بڑے بڑے علماء عرق ریزی کے بعد بھی مشکل ہی سے ان کے مطالب کی تہہ تک پہنچتے ہوں گے۔ آپ کے خلف رشید حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند، ہندوستان کے مشہور ترین علماء و خطباء میں

شمار کئے جاتے ہیں، ہندوستان کی صحافت اسلامیہ نے آپ کو حکیم الاسلام
کا خطاب دیا ہے، جیسے کہ آپ کے دادا کو حجۃ الاسلام کا خطاب دیا گیا
تھا۔

۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء میں مولانا نانوتوی کی وفات ہوئی۔ اس وقت
آپ کی عمر پچاس سال سے بھی کم تھی۔ آپ دارالعلوم کے قریب جانب شمال
ومغرب ایک بسیط مقبرے میں مدفون ہیں، جہاں آپ کے پہلو میں آپ
کے بعد دو عظیم عالم ومجاہد، حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ (شیخ الہند)
اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (شیخ الاسلام) جن کا وصال دسمبر ۱۹۵۷
میں ہوا ہے، آرام فرما رہے ہیں۔ وہ مکتب جس کی بنیاد حضرت مولانا
محمد قاسم نانوتوی نے رکھی تھی، آج ایک صدی گزرنے سے پہلے ہی
ایک یونیورسٹی کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ مسجد چھتہ سے متصل ۲۰ فدان (ایک
فدان چار سو گز کا ہوتا ہے) کی لمبائی چوڑائی میں پھیلی ہوئی جامعہ کی عمارت
اپنی عظمت کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء میں اس جامعہ کا تعمیری کام شروع ہوا۔ مختلف
ادوار سے گزرتا ہوا، آج وسعت کے اس مرتبے پر پہنچ چکا ہے کہ اس
کے اندر خود اپنی درسگاہیں بھی ہیں، طلبہ کے قیام کے لیے کمرے بھی، صنعت
وحرفت کے مختلف ادارے بھی ہیں، مطبخ کے لیے عمارتیں بھی۔

۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء میں طلباء کی تعداد ۱۳۰۰ سو تھی جن میں سے
۹۰۰ طلباء علوم دینیہ عربیہ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور بقیہ ابتدائی
اور فارسی تعلیم پا رہے تھے، جن میں فارسی زبان، حفظ ناظرہ اور تجوید کی تعلیم
ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثر وبیشتر طلباء کی ضروریات زندگی مثلاً طعام، لباس،
کتابیں، علاج اور سکونت کا کفیل دارالعلوم ہی ہے۔

گزشتہ برس مدرسہ کا بجٹ چھ لاکھ روپے تھا۔ ایک سو چالیس
ماہرین فن جامعہ کی مختلف خدمات انجام دے رہے ہیں، جن میں اکتالیس
ماہرین فن اساتذہ اور بقیہ دوسرے مختلف دفاتر کے سرگرم اور مستعد کارکن
حضرات ان کی نگرانی، وقت اور ضرورت کے لحاظ سے [illegible]
سے تنگ اصلاحات نہیں کر کے اس پر قناعت کرتے ہیں کہ [illegible]
رقم مسلمانوں کے چندے سے جمع ہوتی ہے۔ دارالعلوم کو ہندوستان
کے تمام مدارس دینیہ انہیں مسلمانوں کی نظر عنایت سے چلتے ہیں۔ دارالعلوم
دیوبند کو اپنی دینی وعلمی شہرت، امتیازات اور کثرت طلبہ سے تمام مدارس
دینیہ پر فوقیت حاصل ہے۔ دارالعلوم کی امداد واعانت میں امیر و
غریب، فقیر ومالدار سبھی برابر کے شریک ہوتے ہیں، روپیہ پیسہ کپڑا لتہ
حتیٰ کہ وہ لکڑی جو مطبخ میں جلانے کے کام آتی ہے، وہ بھی کبھی کبھی
ارباب خیر ہی مہیا کرتے ہیں اور کتابیں کچھ تو مختلف مطبوعات اور کتب خانوں
سے آتی ہیں اور کچھ مدرسہ خرید لیتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ہندوستان کے
مسلمانوں کے کارنامے ایسے ہیں (جن کی بنا پر وہ تحسین کے مستحق ہیں)
کہ بلاد اسلامیہ میں بھی ان کی مثال ملنی مشکل ہے، کیونکہ وہ ان مدارس دینیہ کی
دیکھ بھال کے ساتھ مساجد کی تجدید وتزئینات بھی کرتے ہیں۔ ناانصافی
ہوگی اگر اس بات کی طرف اشارہ نہ کیا جائے کہ برما اور جنوبی افریقہ کے
علاوہ ایشیا کے دوسرے ممالک کے مسلمان بھی دل کھول کر اس کار خیر
میں شریک ہوتے ہیں۔ دارالعلوم کے ساتھ ساتھ دوسرے مدارس
کی بھی امداد کرتے ہیں۔ دارالعلوم کا طریقہ تعلیم وہی ہے جو ہندوستان کے
عام دینی مدارس کا ہے۔ جب کہ دارالعلوم ان تمام مدارس میں مقتدا اور
پیش رو کی حیثیت رکھتا ہے، جو درس نظامی میں تغیر وتبدل پر آمادہ ہوتا
پہلے دارالعلوم کو دیکھتا ہے۔ اس جامعہ کے بعض مجلس شوریٰ اور
ماہرین تعلیم حضرات نصاب میں تبدیلی کے حامی نظر آتے ہیں، لیکن وہ سمجھتے
ہیں کہ کہیں تعلیمی نصاب میں تبدیلی سے پہلے دارالعلوم میں ہی تغیر وتبدل نہ
کرنا پڑ جائے۔

دارالعلوم کے نصاب کی بنیاد محافظت دین اور مغربیت
کی مخالفت پر قائم ہے۔ اسی لیے درس نظامی ان کے لیے کافی ہے کیونکہ

اس نصاب میں منطق و فلسفہ و دینیات کی کثرت ہے اور علوم عربیہ کی کتابیں عربی ادب، منطق، فلسفہ قدیم کے ساتھ ساتھ تفسیر، حدیث، فقہ ہی مانی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں قدیم دارالعلوم کا نصاب مرتب ہے جو مصر و دیگر بلاد اسلامیہ میں رائج تھا اور ازہر کا شیخ محمد عبدہ کے زمانے سے کچھ قبل تک تھا۔ میں جب سے دارالعلوم دیوبند گیا، وہاں کے علماء سے تبادلۂ خیالات کرتا اور اپنا خیال ظاہر کرتا رہا کہ آج کے ماحول کا تقاضا ہے کہ جدید تعلیم کو بھی علوم دینیہ و عربیہ کے دوش بدوش لے چلنا چاہیے۔ اس سلسلے میں مجھے بڑی بڑی رکاوٹیں پیش آئیں، لیکن میں نے صبر و ضبط سے کام لے کر مجلس شوریٰ کے ممبروں سے تعلق پیدا کیا، جن میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم جمعیت العلماء ہند و ممبر پارلیمنٹ، مولانا محمد میاں صاحب سیکرٹری جمعیت علماء ہند، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مدیر ندوۃ المصنفین قابل ذکر ہیں۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کے ہم خیال ہیں[1] جو نصاب میں تبدیلی کے قائل ہیں، لیکن قدامت پسندوں کی بغاوت سے ڈرتے ہیں۔

میری دو سالہ جد و جہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ممبران مجلس شوریٰ عربی کی جدید علمی کتابوں کے داخل کرنے پر آمادہ ہو گئے اور مؤتمر اسلامی اور جامعۃ الازہر کی ان کتابوں کے بارے میں لکھا، جسے مجلس شوریٰ نے پاس کیا۔ جامعۃ ازہر اور مؤتمر سے میری گزارش ہے کہ دارالعلوم کی اس دعوت پر لبیک کہیں اور جلد از جلد مطبوعہ کتابیں روانہ کرائیں۔ مجھے ہند اور بلاد اسلامیہ کے ایک شہرت یافتہ عالم استاذ ابوالحسن علی ندوی نے بتلایا کہ ہندوستان کے مدارس دینیہ اور آثار علمیہ کی تاریخ میں یہ تغیر و تبدل ایک عظیم حادثہ ہوگا۔

دارالعلوم دیوبند ہند و پاک اور بلاد شرقیہ کا سب سے بڑا دینی مدرسہ ہے۔ اس میں ہندوستان کے علاوہ، پاکستان، افغانستان، برما، سیلون، ملایا، تبت اور مشرقی افریقہ کے طلبا کی ایک بڑی جماعت تعلیم پاتی ہے۔

۱۹۵۵ء میں سید انور السادات جب ہندوستان کے دورے پر گئے تھے، تو دارالعلوم بھی تشریف لے گئے تھے۔ تو مؤتمر کی جانب سے ۲۰ ہزار روپے کا عطیہ بھی دارالعلوم کو پیش کیا گیا۔ میرے قیام دیوبند کے زمانے میں ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند نے دارالعلوم کے علمی و دینی کاموں سے متاثر ہو کر طواف زیارت کیا۔ ۱۹۵۰ء میں میں نے مؤتمر کے نام سے مصر ازہر اور مؤتمر اسلامی سے متعلق انگریزی اردو کی کتابیں صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کیں۔ فروری ۱۹۵۸ء میں شاہ افغانستان محمد ظاہر شاہ نے دورۂ ہند کے وقت دارالعلوم کی زیارت کی، میں نے ان کی خدمت میں عربی میں سپاسنامہ پیش کیا اور قرآن حکیم کا ایک نہایت خوبصورت نسخہ اور مصر و اسلام سے متعلق انگریزی کتب بطور ہدیہ پیش کیں۔ شاہ صاحب نے قرآن حکیم کو گود میں لے کر سر پر رکھا اور بوسہ دیا۔

دارالعلوم سے متعلق ظاہر شاہ کا ایک اور بہت بڑا کارنامہ ہے ۱۳۵۰ھ میں مہتمم دارالعلوم جب افغانستان تشریف لے گئے تھے، تو ایک خطیر رقم شاہ افغانستان نے عنایت کی تھی جس کے صرف سے دارالعلوم کا سنہری پھاٹک بنایا گیا، جو باب الظاہر کے نام سے موسوم ہے۔ اسی میں مصر عربیہ کے نام سے جدید عربی ادب کا شعبہ کھولا گیا، جس میں مؤتمر اسلامی کی عنایت کی ہوئی جدید علمی ادبی، تاریخی، ثقافتی کتابیں ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

---

[1] شیخ عبدالمنعم صاحب کے اس خیال سے ہم اتفاق نہیں کر سکتے، کہ حضرات قدامت پسندوں کی مخالفت سے ڈرتے ہیں، بلکہ ہمارا خیال بالتجربہ یہ ہے کہ یہ حضرات ہی جن کا حوالہ اس مقام پر دیا گیا ہے، اگرچہ تبدیلی اصلاح و ترمیم نصاب کے حامی ہیں لیکن یہ نہیں چاہتے کہ نصاب میں کوئی ایسا تغیر ہو جس سے دارالعلوم کی اصل روح متاثر ہو جائے، یہ جدید ضرورتوں کے ساتھ قدیم محاسن کو بھی نصاب میں باقی رکھنے کے خواہش مند ہیں اور اس کے لیے برابر کوشش کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

۱۸۵۷ء کے بعد

دینی تعلیم کے لیے

حضرت نانوتویؒ کا لائحہ عمل

مولانا عبدالحق غازی پوری
دارالعلوم دیوبند

انیسویں صدی عیسوی کا ابتدائی زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑا نازک دور تھا۔ برطانوی اقتدار ہندوستان کے طول و عرض میں اپنی بنیادیں مستحکم کرنے میں ہمہ تن مصروف تھا، انگریزوں نے قدیم تہذیب و تمدن اور اسلامی علوم و فنون کو مٹا کر ایک نئی تہذیب کی بنیاد قائم کی اور قدیم تعلیم کے بجائے انگریزی تعلیمی اسکیم سرکاری طور پر رائج کر دی گئی، ان حالات میں سخت اندیشہ تھا کہ اسلامی حکومت کے ساتھ ساتھ خدانخواستہ کہیں اسلامی علوم بھی رخصت نہ ہو جائیں۔ علمائے وقت میں اس خطرے کی شدت کا سب سے زیادہ احساس حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کو تھا۔ حضرت نانوتویؒ، ۵۷ء کی جنگ آزادی میں برطانوی اقتدار پر ایک زبردست ضرب لگا چکے تھے جو معرکہ شاملی کے نام سے تاریخ کا ایک روشن عنوان ہے۔ انگریز کی زبردست قوت کے مقابلے میں اگرچہ یہ مہم ناکامی پر منتج ہوئی اور ہندوستان کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال دیا گیا، مگر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دل و دماغ اور فکر و نظر نے ہمت نہ ہاری، انھوں نے اس سپاہی کی طرح جو میدان جنگ سے ہٹ کر نئے مورچے کی تیاری میں مصروف ہو جاتا ہے۔ آپ نے مقاصد کی تکمیل کے لیے تعلیمی میدان کا انتخاب کیا۔ اس انتخاب میں دو مقصد پیش نظر تھے، پہلا مقصد برطانوی سامراج کا ہندوستان سے انخلاء، دوسرا مقصد مسلمانوں کو دینی مدرسے ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء دیوبند میں قائم ہوا، جو آج دارالعلوم دیوبند کے نام سے ایشیا کا جامعہ ازہر سمجھا جاتا ہے۔ اور جس سے ہزاروں تشنگان علوم سیراب ہو کر نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا اور افریقہ میں مسلمانوں کی دینی رہنمائی کے فرائض انجام دے رہے ہیں، درس و تدریس، وعظ و تقریر، تصنیف و تالیف، رشد و ہدایت، سیاست، خطابت اور حکمت و صحافت کا کوئی میدان ایسا نہیں ہے، جس میں فضلائے دارالعلوم دیوبند کی خدمات نمایاں ترین ہوں۔

دیوبند کی طرح حضرت نانوتویؒ نے مراد آباد اور گلاؤٹھی وغیرہ مختلف مقامات میں مدارس عربیہ قائم فرمائے۔ ان مدارس سے بھی ان کے فضلاء کی ایک بڑی تعداد اطراف ملک میں پھیلی ہوئی ہمہ تن دینی خدمات کی انجام دہی میں مشغول ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ مدارس اوقاف کے بجائے عوامی چندوں پر قائم کیے گئے تھے۔ اس لیے تاکید تھی کہ مدارس کے چلانے نقشے میں نئے رنگ بھرے جائیں جو وقتی حالات کے مطابق اور ان سے

ہم آہنگ ہیں۔ اس کے بعد حضرت نانوتویؒ نے جو دستور العمل تجویز فرمایا ہے، وہ درحقیقت تعلیمی اداروں کے لیے بنیادی دستور العمل کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ یہی وہ دستور العمل ہے، جس کے محور پر آج ہندو پاک کے تمام مذہبی ادارے گردش کر رہے ہیں، تو غلط نہ ہوگا۔ یہ دستور العمل آٹھ دفعات پر مشتمل ہے۔

۱۔ پہلی دفعہ میں زیادہ سے زیادہ چندے کی فراہمی پر زور دیا گیا۔

۲۔ دوسری دفعہ میں اس امر پر توجہ دلائی گئی ہے کہ طلباء کے خورد و نوش کے مسئلے کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے۔

۳۔ تیسری دفعہ مدارس کے انتظامی امور سے متعلق ہے۔ اس میں منتظمین کے باہمی اتحاد و یکجہتی اور اخلاص کی تلقین کرتے ہوئے تنبیہ کی گئی ہے کہ دوسروں کے مخلصانہ مشورے کو محض اپنی بات کی پچ کے لیے رد نہ کیا جائے۔ اگر اس امر پر عمل نہ کیا گیا تو مدرسے کا بقاء اور ان کی زندگی دشوار ہو جائے گی۔

۴۔ چوتھی دفعہ میں اساتذہ کے متفق المشرب ہونے پر زور دیا گیا ہے اور ساتھ ہی نصیحت بھی کی گئی ہے کہ اساتذہ کو خود بینی اور دوسروں کے درپے آزار نہ ہونا چاہیے، ورنہ مدارس کے لیے یہ چیز موت کا پیغام ثابت ہوگی۔

۵۔ پانچویں دفعہ میں کتابوں کی مقررہ خواندگی پر زور دیا گیا ہے، اور تنبیہ کی گئی ہے، کہ اگر اس پر عمل نہ کیا گیا تو مدارس کی تعلیمی ترقی مختل ہو جائے گی،

۶۔ چھٹی دفعہ چندے سے متعلق ہے، اس میں بطور خاص اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ دولت مندوں کے چندوں کے بجائے غریبوں کے چندے کو زیادہ اہمیت دی جائے، مستقل آمدنی کے بجائے ایک قسم کی بے سر و سامانی زیادہ مفید ہوگی، اس میں خدا کا خوف و رجاء اور رجوع الی اللہ کا سلیقہ جو اہل دولت سے، ہاتھ سے جانے نہیں پاتا

۷۔ ساتویں دفعہ میں حکومت کی امداد سے اجتناب کی تنبیہ کی گئی ہے۔

۸۔ آٹھویں دفعہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت ہے جو اپنے چندے سے شہرت اور ناموری کے امیدوار نہ ہوں

ذیل میں اس دستور العمل کا [illegible] ملاحظہ فرمائیں۔

دارالعلوم دیوبند و دیگر مدارس عربیہ کے متعلق
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے خاص دستِ مبارک
کے لکھے ہوئے چند اصولوں کے عکس کی نقل

وہ اصول
جن پر یہ مدرسہ اور نیز
اور مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں

۱۔ اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں، خیراندیشانِ مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

۲۔ ابقائے طعام طلبہ بلکہ افزائش طعام طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

۳۔ مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسے کی خوبی اور اسلوبی ہو ...... اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہلِ مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو اس مدرسے کی بنا میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبیٔ مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو۔ اور اس لیے ضرور ہے کہ اہلِ مشورہ اظہارِ رائے میں کسی وجہ سے شامل

تا اَبَد اُونچا رہے گا ان کی عظمت کا نشاں

آشناؤں میں سمجھے ان ہستیوں کی داستاں ۔۔۔ کی جنہوں نے دین کی تبلیغ میں ہے وقف جاں
گلشن ہستی میں تھے یہ ایک سے ایک کامراں ۔۔۔ عالمانِ دین میں یہ رنگ سے تھے ذی ہوشیار

سب کے سب تھے نیک سیرت اور تھے عالی دماغ
جل رہے ہیں، اب بھی جن کے علم کے روشن چراغ

ان کے سینوں میں نہاں تھا، عشق ختم المرسلینؐ ۔۔۔ ان کے چہروں سے عیاں تھا، جذبہ صدق و یقیں
ان پہ تھا اللہ راضی اور شفیع المذنبینؐ ۔۔۔ شک نہیں اس میں ٹھکانا ان کا ہے خلد بریں

قریہ قریہ جا کے یہ تبلیغ دیں کرتے رہے
عمر بھر سینوں میں دین حق کا دم بھرتے رہے

نورِ ایمانی سے ان کا دل سدا روشن رہا ۔۔۔ ہر گھڑی اللہ کا ان پر رہا لطف و کرم
جب تلک زندہ رہے ان کا یہی شیوہ رہا ۔۔۔ چار سو پھیلے جہاں میں دین مجتبیٰ

ان کے زریں کارناموں کی ہے شاہد کائنات
خدمت دین نبیؐ میں ان کی گزری ہے حیات

راہِ حق میں اہل باطل کے ستم سہتے رہے ۔۔۔ کوہ استقلال بن کر بات حق کہتے رہے
دردِ ملت کا سدا قالب میں دم بھرتے رہے ۔۔۔ دین قیم پر فدا یہ دل و جاں کرتے رہے

پرچم توحید کو ہر آن رکھ کر سر بلند
دونوں عالم میں یہی حضرات ٹھہرے ارجمند

قاسمؒ و محمودؒ و احمد اور انور شاہ بھی ۔۔۔ حاجی امداد بھی الیاس و اشرف شاہ بھی
یوسف و احمد علی بھی اور بخاری شاہ بھی ۔۔۔ حضرت رائے پوری بھی جد عبدالسلام شاہ بھی

دین و ملت کے بلاشک تھے حقیقی پاسباں
تا اَبَد اونچا رہے گا ان کی عظمت کا نشاں

سرخرو ہو کر ہوئے سب راہیٔ ملکِ عدم ۔۔۔ ان پر ہر لمحہ رہا ہے حق تعالیٰ کا کرم
قبر میں ان کو نہ پہنچے گا گزند حق کی قسم ۔۔۔ ان کو خوفِ آخرت کا کوئی نہیں ہے غم

عالم دین خدا تھے، عاشق خیر الانامؐ
ان کی ارواح مبارک کو ہزاروں ہوں سلام

تاریخ کے ذہب وباب

○ سقوطِ بغداد سے قیام دارالعلوم تک

از حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب مدظلہ

بعد الحمد والصلوٰۃ

اهيم بليلى ما حييت وان امت
اوكل بليلى من يهيم بها بعدى

میں نے دیکھی ہیں نزاروں کی نگاہیں
نہیں جلوہ نشینوں کی نظر کا قاتل

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی کسی کتاب میں ایک سوال اُٹھایا ہے اور پھر اس کا جواب بھی دیا ہے۔ جس کا خلاصہ میرے لفظوں میں یہ ہے۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ساتویں آٹھویں صدی ہجری میں مرشدانِ طریقت اور اربابِ معرفت مشائخ کی ایک بڑی کھیپ میدان میں آگئی تھی، حضرات صوفیائے کرام کثیر تعداد میں سامنے آئے اور اسی دور سے مشہور سلاسلِ طریقت کا آغاز ہوا۔

جواب: انسان کی فطری خصوصیت ہے کہ مصیبت کے وقت اسے خدا بہت یاد آتا ہے۔ اس میں تضرع اور انابت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ واذا مسه الشر فذو دعاء عريض۔ یہی معاملہ اُمتِ مسلمہ کے ساتھ ساتویں صدی ہجری میں پیش آیا۔ تاتاریوں کی چیرہ دستیوں اور تباہ کاریوں کے نتیجہ میں مسلمانوں میں بالعموم خشیتِ الٰہی انابت اور خشوع خضوع کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اور پھر قدرت نے اپنے اقبالِ مجرم مخلوق کی خطاؤں اور غلطیوں سے درگزر فرماتے ہوئے اس کی اشکِ شوئی اس شکل میں کی کہ رشد و ہدایت کے درخشندہ تارے اور علم و معرفت کے نیر تاباں پیدا کر دیئے۔

علامہ شبلی خود کوئے طریقت کے راہی نہیں ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس منزل کے کوئی سالک ان کی رائے سے سو فی صد اتفاق نہ کر سکیں، لیکن بہر حال اسے غلط بھی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اگر واقعات اور حقائق کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو اسے تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ آیئے ایک سرسری نظر تاریخ کے اس باب پر ڈال لیجئے

فتنۂ تاتار

چھٹی صدی ہجری تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کا طوفان سر اُٹھا صحرائے گوبی سے اُٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ابرِ سیاہ کی مانند ترکستان سے لے کر چین اور روس تک پھیل گیا، چنگیز خان جہاں سے اپنی فوج لے کر

گزرتا تھا، خون کی ندیاں بہاتے چلا جاتا تھا، وہ ظالم ہرات کے شہر میں پہنچا تو اس کی ایک لاکھ آبادی میں سے سب ۴۰ ہزار کو اس نے تہ تیغ کیا۔ بلخ اور سمرقند کی پوری آبادی کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا۔

مشہور محدث امام مسلمؒ کے مولد و مسکن شہر نیشاپور کی کیفیت سنئے۔ اس کے محاصرے کے دوران منگول سردار کا ایک بیٹا مارا گیا۔ بس پھر کیا تھا، نیشاپور پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ تمام انسانوں کو قتل کر دیا گیا۔ جانوروں کو ذبح کر دیا گیا۔ پورے شہر کا اثاثہ جمع کر کے اسے آگ لگا دی، حتیٰ کہ عمارتوں کی بنیادیں تک کھود ڈالیں، مکانوں کو ڈھا کر وہاں ہل چلا دیئے۔

عروس البلاد بغداد جو اس وقت عباسی سلطنت کا پایہ تخت تھا ۶۵۵ھ میں چنگیز کے پوتے اور جانشین ہلاکو خان نے اس کا محاصرہ کیا۔ بدقسمتی سے بغداد کے آخری عباسی خلیفہ مستعصم کا بدطینت اور بدنہاد وزیر ابن علقمی ہلاکو خان سے مل گیا[1] مرتا کیا نہ کرتا، حالات سے مجبور ہو کر خلیفہ نے اپنی فوج اور شہریوں کو ہتھیار ڈال دینے کا حکم دیا۔ ہلاکو کے حکم سے منگولوں نے شہر کو تاخت و تاراج کیا۔ انسان نما درندوں نے کئی روز تک شہری آبادی کا قتل عام جاری رکھا، بغداد کی سڑکیں اور گلیاں خون کی ندیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ہسپتالوں میں مریضوں کو اور مدارس میں علماء و طلباء تک کو قتل کیا گیا، قبروں سے علماء و رؤسا کی ہڈیاں تک نکال کر جلا دی گئیں۔

خود خلیفہ کو آہنی سلاخوں سے پٹوایا گیا اور پھر لاتوں سے کچلتے ہوئے چونسے کے تھار میں ڈال کر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ خلافت سے پہلی عباسی مخدرات کو بازاروں سے پکڑ کر سڑکوں پر گھسیٹا گیا اور ان میں سے بعض کا مثلہ کیا گیا، خلفائے بغداد کے صدیوں کے جمع کئے ہوئے علمی ذخائر کو نذر آتش یا دریا برد کر دیا گیا۔

وہ رحمٰن و رحیم اللہ جس کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے جو توبہ و استغفار کے بعد گنہگار بندوں کی سیئات کو حسنات سے بدل دیتا ہے، جو فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی بستیوں پر گناہوں کی پاداش میں وبائی امراض مسلط کر دیتا ہے، لیکن پھر مرنے والوں کی موت کو شہادت کا درجہ دے دیتا ہے۔ (المطعون شہید۔ حدیث)۔ اگر وہ مہربان خدا ایسے روح فرسا حادثات اور محشر خیز سانحے کے بعد سسکتی ہوئی انسانیت اور جاں بلب مخلوق کو اپنی آغوشِ رحمت میں لے لے، تو کونسی تعجب کی بات ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اصحابِ خرقہ و خلافت کی شکلوں میں امّۃ البیضاء کی ایک بڑی جماعت منصۂ شہود پر آئی۔ ان کے فیوض و برکات نے شکستہ خاطر اور رنجیدہ انسانوں کو مومیائی مہیا کی۔ ان کی تربیت باطنی نے اجڑے دلوں کی دنیا کو پھر سے آباد کیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں مندرجہ بالا تلاطم خیز واقعات قارئین کو سنائے گئے ہیں۔ وہاں کچھ مقبولانِ حق آگاہ کے حالات بھی بطور نمونہ ان کی خدمت میں پیش کر دیئے جائیں۔

(۱) حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ

(وفات — ۶۳۲ھ)

آپ سلسلۂ سہروردیہ کے بانی ہیں۔ نسباً صدیقی ہیں۔ بغداد میں حدیث و فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ جامعہ نظامیہ بغداد میں تدریس کی خدمت سرانجام دیتے رہے۔ پھر بغداد ہی میں ان کا افادۂ باطنی کا سلسلہ شروع ہوا۔ دربار خلافت میں ان کا بڑا احترام تھا۔ ان کے علم و فضل اور رشد و ہدایت کا شہرہ دور دور

[1] ابن علقمی نے خلیفہ کو یہ کہہ کر دھوکا دیا کہ: ہلاکو خان سے صلح کر لیجئے، وہ اپنی لڑکی آپ کے عقد میں دینا چاہتا ہے۔ اس سے آپ کا تعلق ایسا ہی رہیگا جیسا کہ سلجوقیوں سے رہا ہے۔ آپ چل کر اس سے بات کیجئے۔ چنانچہ خلیفہ اعیانِ مملکت، علماء و مشائخ وقت کو ہمراہ لے کر گیا۔ ہلاکو نے سب کی گردنیں کٹوا دیں۔

(حیاۃ الحیوان کبریٰ ص ۹۹/ ۱ج)

نام پہلی بار شیخ الاسلام بہاؤالدین زکریا ملتانی، فقہ کے جلیل شاگرد شیخ سعدی، چہنامہ کے مصنف سلطان شیخ فریدالدین عطار، خواجہ حافظ شیرازی کے پیر طریقت شیخ نجم الدین کبری، سید جلال الدین تبریزی، قاضی حمیدالدین ناگوریؒ اور بابا فرید گنج شکر جیسے کبار مشائخ آپ کے خلفاء یا مستفادہ کرنے والوں میں شامل ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے ہر ایک نے ایک دنیا کو بدل ڈالا

۲ خواجۂ خواجگان حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ

وفات: ۶۳۳ ھجری

سجز میں ولادت ہوئی، سمرقند اور بغداد وغیرہ میں ظاہری اور باطنی علوم حاصل کئے۔ حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوکر اپنے شیخ کے حکم کے مطابق ہند کے کفرستان میں پہنچے، ملتان، لاہور اور دہلی سے ہوتے ہوئے اجمیر پہنچے اور یہاں اسلام کا چراغ روشن کرکے بیٹھ گئے۔ راجپوتانہ میں حضرت شیخؒ کا اسلام کی تبلیغ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، راجپوت راجہ اور ہندو ٹھاکروں نے مخالفت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جادو منتر سے بھی کام لیا لیکن حضرت خواجہ استقامت کا پہاڑ بن کر ڈٹ گئے۔ کفر کو شکست ہوئی اور اسلام کو فتح، لاکھوں ہندو آپ کے دست حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور راجپوتانہ کا علاقہ کلمۂ توحید سے گونج اٹھا۔ اگر برصغیر کے باشندگان پر ایک طرف محمد بن قاسم کا احسان ہے جو اموی دور سلطنت میں اسلام کا پرچم لے کر سندھ کے راستے سے داخل ہوا اور وسط پنجاب تک اسلام کا کلمہ پہنچا دیا تو دوسری طرف سلسلۂ چشتیہ کے سید الطائفہ حضرت اجمیریؒ کا یہاں کے مسلمانوں پر احسان عظیم ہے کہ اقلیم روحانیت کے اس تاجدار نے کایا ہی پلٹ دی۔ پھر آگے ان سے وہ سلسلۃ الذہب چلا، جس کا ایک ایک دانہ گوہر آبدار اور دُرِ بے بہا تھا۔ آپ کے خلیفۂ ارشد حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۶۳۴ھ) نے آپ ہی کے حکم سے دہلی میں قیام فرمایا اور تزکیۂ و اصلاح کا فریضہ انجام دیا۔ ان کے بعد ان کے خلیفۂ اجل حضرت بابا فرید گنج شکرؒ (وفات ۶۶۴ھ) نے اجودھن کو اپنا مسکن بنایا اور یہاں کے باسیوں کو توحید کا گیت سنایا۔ بابا صاحبؒ کے سب سے بڑے خلیفہ سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۷۲۵ھ) ہیں ..... ان بزرگوں کے علاوہ ملتان اور اوچ کی سرزمین جن کبار اولیاء سے اٹی پڑی ہے، ان کے تذکرے اور حالات تو بجائے خود ان کے ناموں کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ بہرصورت اگر کوئی چاہے تو سوانح اور تذکروں کے سمندر میں گھس کر ان جواہر ریزوں کا پتہ لگا سکے۔ جو تاتاریوں کے ہاتھوں ہونے والے قیامت خیز مظالم کے بعد امت مسلمہ کو قدرت کی طرف سے عطا ہوئے۔

دوسرا باب

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ آپ تاریخی صحیفوں کو الٹ پلٹ کر دیکھیں، نیکی کے بعد بدی، بدی کے بعد نیکی، خوشحالی کے بعد بدحالی اور جبر و استبداد کے بعد عدل و انصاف کی داستانیں بارہا آپ کے سامنے آئیں گی۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلام دو طرف سے آیا۔ مغرب سے مسلمان جرنیل محمد بن قاسم کے ذریعے اور مشرق سے مسلمان تاجروں کے ذریعے۔ ۱۰۰۱ء میں سلطان محمود غزنوی نے پہلی مرتبہ لاہور پر حملہ کیا، اس کے بعد شہاب الدین محمد غوری نے فوج کشی کی اور تراوڑی کے میدان میں راجپوت راجہ رائے پتھورا سے مقابلہ کیا۔ پہلی بار شکست کھا گیا، غیرت مند مسلمان تھا، قسم کھائی کہ جب تک شکست کا داغ نہیں دھو ڈالوں گا، اس وقت تک غسل نہیں کروں گا ایک سال تک تیاری میں مصروف رہا، اگلے سال پھر آکر لڑائی کی اور فتح یاب ہوا، اس کے بعد مختلف خاندان یکے بعد دیگرے برصغیر میں حکومت کرتے

حتیٰ کہ ایک وقت تھا کہ کابل سے لے کر آسام کی پہاڑیوں اور کراچی سے مدراس تک دہلی کے مسلمان تاجداروں کا فرمان چل رہا تھا۔ مغل فرمانرواؤں میں جہانگیر ایک مدبر، دلیر اور نہایت با انصاف بادشاہ تھا۔ شاہ جہاں ایک تنظیم اور عبقری ذہن رکھنے والا فرمانروا تھا۔ عالمگیر ہوشیار اور بہادر ہونے کے ساتھ دیندار اور صاحب علم بھی تھا۔ اُس کا انتقال ۱۷۰۰ء میں ہوا۔ اس کے بعد جو لوگ تخت نشین ہوئے، اُن کی اکثریت نہ صرف یہ کہ نااہل تھی، بلکہ بد عمل اور عیاش بھی، عالمگیر کے پوتے جہاندار شاہ نے تخت سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اپنی ایک منظورِ نظر طوائف کے بھائی کو دہلی کا افسر مقرر کیا۔ پھر جہاندار شاہ کے پڑپوتے محمد شاہ رنگیلے نے تو کمال ہی کر دیا۔ اس نے لال قلعے کے اندر حوضوں میں شراب بھروائی۔ ابن علقمی کے جانشین اندر ہی اندر مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو گھن کی طرح چاٹ رہے تھے۔ ۱۷۵۷ء میں بنگال کے نواب سراج الدولہ نے انگریزوں کا قلع قمع کرنا چاہا تو میر جعفر نے غداری کر کے اسے شہید کرا دیا۔ بنگال پر عملاً انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری لڑائی ہوئی جس میں غازی احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ یہ لڑائی امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ایماء پر ہوئی۔ انھیں کے نامۂ گرامی کا احترام کرتے ہوئے غازی احمد شاہ نے لڑائی کی۔ سلطنت دہلی کے ایک بڑے عہدے دار نجف خاں ایرانی کو شاہ ولی اللہ سے اختلاف تھا، ابن علقمی کے اس روحانی فرزند نے شاہ صاحب کے پہونچے نکلوا دیئے اور بعد میں ان کے نابغۂ روزگار فرزندوں کے ساتھ بھی اس نے ظالمانہ برتاؤ کیا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کے بدن پر زہریلی چھپکلی کا اُبٹنا لگوایا جس سے انھیں برص ہو گیا۔ چاروں بھائیوں کو شہر بدر کیا۔ جنوبی ہند میں حیدر علی خاں اور پھر اس کے بیٹے سلطان ٹیپو نے انگریزوں کے استیصال کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی، یہاں بھی انگریزوں کو میر صادق جیسے غدار میسّر آ گئے۔ نتیجۃً ٹیپو شہید ہوا اور سرنگا پٹم پر انگریزوں کا پرچم لہرانے لگا۔

قدرت کا اٹل قانون ہے: [illegible] یعنی تم جب بھی سرکشی دکھاؤ گے۔ اور احکامِ خداوندی سے بغاوت کرو گے تمہارے سروں پر جوتے برسیں گے۔

چنانچہ یہی ہوا کہ مغلوں کی سلطنت کمزور ہو جانے کے بعد کہیں صوبیداروں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا، کہیں مرہٹے حکمرانی کے خواب دیکھنے لگے کہیں سات سمندر پار سے آئے ہوئے انگریزوں نے راجدھانی قائم کر لی اور پھر رفتہ رفتہ پورے برصغیر پر چھا گئے قدرت کی انتقامی کارروائی اسی پر ختم نہ ہو گئی، بلکہ ۱۸۵۷ء کا معرکہ اپنے جلو میں حوادث کا ایک نہ رکنے والا سیلاب اور مصائب کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ لیے ہوئے وقوع میں آیا۔ مؤرخ کا قلم جس طرح یورشِ بغداد کے واقعۂ ہائلہ کا ذکر کرتے ہوئے خون کے چھینٹے برساتا ہے، اسی طرح ۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت کا ذکر کرتے ہوئے بھی وہ خون کے آنسو صفحۂ قرطاس پر چھوڑتا ہے۔

یہ واقعہ کیونکر پیش آیا؟ اس کے اسباب و علل کی تفصیل کیا ہے؟ یہاں اس کے ذکر کا موقع نہیں۔ البتہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کے نتائج کن صورتوں میں رونما ہوئے۔

معرکہ ۱۸۵۷ء کے تلخ نتائج

جب کہ ۱۸۵۷ء میں اپنوں کی بے وفائیوں اور غداریوں اور دشمن کی فریب کارانہ چالوں کی وجہ سے مسلمانوں کو ناکامی ہوئی اور دہلی پر انگریزوں کا پورا قبضہ ہو گیا، تو اب انھوں نے دل کھول کر انتقامی کارروائیاں کیں ۵ لاکھ ہندوستانی موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ دہلی میں جہاں کوئی مقامی باشندہ نظر آتا، اُسے گولی کا نشانہ بنایا جاتا۔

صرف ایک دن میں ۲۴ مغل شہزادوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا

چادروں کو توپ کے دہانے سے باندھ کر ان کے پرخچے اڑا دیے جاتے جن لوگوں کو سزا کی کالا پانی کی سزا دی گئی وہ دریا میں پھینک دیے گئے۔ لال قلعہ کے قریب شاندار عمارتیں اور بازار کو مسمار کر کے چٹیل میدان بنا دیا گیا۔ دہلی کے علاوہ بھی ہر بڑے شہر میں علماء پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔ پانچ سو علماء تختۂ دار پر لٹکا دیے گئے۔ پاکباز خواتین کی آبرو اس طرح برباد ہوئی جیسے قصاب کی دکان کے آگے کتے چھیچھڑوں کو زچے پھرتے ہیں۔ مسجدیں میں جس کے بجائے سلاطین جو پہلے عالی فرما نے آگ کی نذر ہونے یا دینے جنائی۔

۱۸۵۷ء کے بعد مذہبی اکھاڑ پچھاڑ

بات ادھوری نہ رہ جائے۔ یہاں پر یہ بھی بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب ۱۸۵۷ء مسلمانوں کی حکومت کا کلی خاتمہ ہو گیا، اسلامی سطوت خاک میں مل گئی، باد صرصر کے تیز و تند جھونکوں نے چمن کو اجاڑ کے رکھ دیا، تو حرماں نصیبی اور بدبختی کی داستان یہیں ختم نہیں ہو جاتی، مسلمانانِ ہند کو "عشق کے ابھی اور امتحانی مراحل" سے گزرنا تھا — اہل علم کو ایک جلیل القدر انصاری صحابی حضرت کعبؓ بن مالک کا واقعہ یاد ہوگا۔ جسے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں پورے ۳ صفحات پر نقل کیا ہے — حضرت کعبؓ کی ایک لغزش کی بنا پر بارگاہِ رسالتؐ سے پچاس دن کے بائیکاٹ کا حکم صادر ہوا۔ حضرات صحابہؓ کی پوری جماعت حتیٰ کہ تمام خویش و اقارب بیوی، بچوں کی طرف سے مکمل بائیکاٹ تھا۔ یہ شوقِ دید میں نماز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کھڑے ہو کر پڑھتے — نماز کے دوران کن انکھیوں سے دیکھنے کی کوشش کرتے کہ کیا حضورؐ ان کی طرف دیکھتے ہیں، یا نہیں۔ وہ نماز میں ہوتے تو حضورؐ بھی ان کی طرف نظر فرما لیتے، فارغ ہوتے تو حضورؐ اپنا رخ پھیر لیتے۔ اندازہ لگائیے کہ عاشقِ صادق پہ کیا گزری ہوگی، کوئی حد ہوگی بے قراری اور اضطراب کی؟

تڑپ تڑپ کے گزر رہی ہیں ہجر کی راتیں
گواہ ہیں شکنیں، ہیں جو قلب بستر پر

کعبؓ کا ایک ایک لمحہ، یوم الحساب کی طرح گزر رہا ہوگا۔ اس دوران میں شام کا ایک نبطی کاروبار کے بہانے سے مدینہ منورہ آیا کعبؓ بازار گئے تو وہ لوگوں سے ان کا نام پوچھتا پھر رہا تھا، انھوں نے اشارے سے رہنمائی کی۔ واللہ، اللہ!! کس قدر یاس ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا، زبان سے پتہ بھی نہیں دیتے۔ بہرحال کعب رضی اللہ عنہ کی اس سے ملاقات ہوئی، تو اس نے بادشاہ غسان کا ریشم پر لکھا ہوا خط انھیں دیا، جس میں لکھا تھا "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے صاحب نے تم پر زیادتی کی ہے، تم ہمارے پاس آجاؤ، ہم تمہاری قدردانی کریں گے۔"

کعبؓ فرماتے ہیں! میں نے سوچا یہ میرے لیے کڑی آزمائش ہے اور فوراً ہی خط کو تنور میں جھونک دیا۔

حضرت کعبؓ تو بدری صحابی ہیں، صحابہؓ کی تو پوری جماعت کا یہ حال ہے کہ انھوں نے جان و مال، عزیز و اقارب گویا سب کچھ اسلام کی خاطر داؤں پر لگا دیا تھا۔ نعلمنا الایمان ثم تعلمنا القرآن، اسلام کے قدردان وہ نہ ہوتے تو اور کون ہوتا؟ کعبؓ سے تو توقع ہی یہی ہو سکتی ہے کہ وہ شاہِ غسان کے نامہ سے بھی بیزار کرتے۔ لیکن ہند کے لٹے پٹے، ضعیف البنیان اور ضعیف الایمان باشندوں کے بارے میں کیا سوچا جا سکتا ہے؟

بیچاروں سے حکومت تو گئی ہی تھی، اب ان کے دین و ایمان پر ڈاکے پڑنے لگے، دو طرف سے ان پر کفر کی یلغار شروع ہوئی۔ ایک طرف انگریز کی حکومت قاہرہ کی سرپرستی میں عیسائیت کا فتنہ اٹھا، وہ ڈنڈے کے زور سے عیسائیت پھیلا رہی تھی، انگلینڈ سے پادری درآمد کیے۔ دیسی اور بدیسی پادریوں سے مکمل تعاون کیا۔ نئے نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم میں اس بات کا خاص خیال رکھا۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے ۱۸۵۷ء میں

میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا :

"خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے، کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیر نگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے، ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنا چاہیے اور اس میں کسی طرح تساہل نہ کرنا چاہیے۔"

انگریز ماہر تعلیم میکالے نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا :

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے، جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، مگر مذاق اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو"

بے دینی کا سیلاب یہیں نہیں رکا۔ مغربی قوم حکمران بنی تو یورپ کی مغربی تہذیب اپنے تمام آثار و عواقب ہمراہ لائی، عریانی، فحاشی، شراب خوری اور تمام وہ غلاظتیں جو یورپ کی گندی تہذیب کے اجزاء لازمہ ہیں، پھیلنے لگیں۔ الغرض مسلمان سیاست سے محروم ہو گئے، ان کا مذہب خطرے میں پڑا۔ ان کی معیشت متاثر ہوئی، آداب معاشرت بدلے اور یہ وہ پرآشوب حالات تھے، جو معرکہ ۱۸۵۷ء کے بعد رونما ہوئے۔

تصویر کا دوسرا رُخ

آئیے، اب تصویر کا دوسرا رُخ دیکھئے، جب دیارِ ہند میں ملت مسلمہ اس طرح پر چکی کے دو پاٹوں میں پس رہی تھی، پے در پے مصائب اور فتن نے اس کا کس بل نکال کے رکھ دیا تھا تو قدرت کی طرف سے مظلوم و مقہور بندوں کی اشک شوئی کا کیا بندوبست ہوا وہ کرنا گروہ تھا جو آیۂ رحمت بن کر ان کی دستگیری کے لیے آگے بڑھا اللہ تعالیٰ اکابر دیوبند کی قبروں کو ہمیشہ ٹھنڈا رکھے کہ ابتلاء و آزمائش کے دور میں قلندروں کا یہی گروہ آگے بڑھا، اور اس کشتگانِ نیم جان امت مسلمہ کے لیے مسیحائی کا کام دیا، فتاں بلب ملت کا وہ کونسا درد تھا جس کی دوا اس نے مہیا نہ کی اور کونسا زخم تھا، جس کی اس نے تدبیر کی ... بے گناہ کرنے والے یہ مردانِ سبک نوا، فقر و غنا کے خیال سے بے نیاز ہو کر میدان میں کود پڑے، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ کے نفوس قدسیہ کے فرزند اور خواجگانِ چشت و نقشبند کے جانشین دور دور کے ...

ؔ اکابر دیوبند میں سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی

اٹھاتے، جیسا کہ حضرت الامام مولانا قاسم نانوتوی نے نمونہ پیش
کر دیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو یہ نصیحت سینہ بہ سینہ کی۔ ہی
حق کا سوال پیدا ہوا کہ سب سے بڑھ کر ... وقت کے
حالات سے ... دینی علوم کی حفاظت کا سوال آیا تو اللہ کا نام
لے کر انہوں نے مدارس و مدارس کی ہزاروں مسندیں بچھا دیں، ہزاروں
سینوں کو قرآن و حدیث سے منور کر دیا، سیکڑوں بلند پایہ مفسر، محدث
اور فقیہ نکال دیئے۔ تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کا شعبہ
سامنے آیا تو بیسیوں تفسیریں اور سیکڑوں حدیث کی شرحیں لکھیں،
کتابوں کے حواشی اور شروح لکھ کر بلادِ اسلامیہ سے بازی جیت لی۔ رشد و
ہدایت، افادہ و افاضہ، تزکیہ و اصلاح کا کام ہاتھ میں لیا، تو ایک
عالم کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

ہے کوئی ماں کا لعل، جو گزشتہ ایک صدی میں پورے عالم
اسلام میں حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتوی جیسا مجتہد، علامہ انور شاہؒ جیسا عالم،
حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی جیسا مصنف اور شیخ طریقت
شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی جیسا جامع صفات بزرگ پیش کر سکے؟
ان حضرات کے مناقب و مراتب بیان کرنے کے لیے ایک دفتر
چاہیئے، مدعا یہ ہے کہ بیان کی فرصت، نہ آپ میں سننے کا یارا۔

؎ بیرو تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی

ائمہ سلف میں سے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد رشید
امام عبداللہ بن مبارک کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ علمی و عملی کمالات
کے ایک ایسے گلدستہ سدا بہار تھے کہ ان کی جس کسی صفت کو دیکھا
جاتا، نگاہ تجسس محوِ حیرت ہو کر رہ جاتی تھی۔

ابن مبارکؒ حدیث، فقہ، ایام، رجال، بہادری، سخاوت، تجارت
اور عزیزوں ان تمام کے جامع تھے... ان کی ذات ستودہ صفات میں علم،
فقہ، ادب، نحو، لغت، شعر، فصاحت، زہد، تقویٰ، خوش قیام
لیل، عبادت، حج، غزوہ، شہسواری، شجاعت، تندرستی، فضول اور لغو
باتوں سے اجتناب، اپنے ساتھیوں سے اختلاف کم کرنا، یہ تمام صفات
جمع تھیں۔

ابن عیینہ فرماتے ہیں میں نے صحابۂ کرامؓ کے حالات میں غور
کیا ہے اور ادھر عبداللہ بن مبارک کے حالات بھی دیکھے ہیں، میں اس
نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ حضرات صحابہ کو ابن مبارک پر اس وجہ سے فضیلت ہے
کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف پایا ہے اور
آپ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے رہے ہیں۔[1]

انصاف سے کہیئے کہ امام عبداللہ بن مبارکؒ کا کونسا وصفِ کمال
ہے جو مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمود حسن
شیخ الہندؒ، سید حسین احمد مدنیؒ وغیرہم کو قدرت نے نہیں عطا کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ گنہگار راقم السطور کو دیوبند کے دارالعلوم سے
براہِ راست تلمذ کا تعلق بھی نہیں ہے، اور جو کچھ لکھا جا رہا ہے، کسی ذہنی
عقیدت کی بنا پر نہیں، بلکہ جس طرح امام نوویؒ نے امام عبداللہ بن مبارک
کے بارے میں فرمایا ہے:

"ان کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی ہے اور ان کی
محبت کی وجہ سے بخشش کی توقع کی جاتی ہے"

بڑے تفحص اور تتبع کے بعد یہی رائے اس گنہگار نے اکابر دیوبند
کے متعلق قائم کی ہے، اور یہ چند سطور صفحۂ قرطاس پر آگئی ہیں۔ اب اس
فتنہ و فساد کے دور کو سمیٹنے سے پہلے مناسب سمجھتا ہوں کہ ایک مختصر حکایت
اس سلسلہ میں اور بھی ہدیۂ قارئین کر دوں۔

نسبت میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت گنگوہیؒ اور حضرت
تھانوی فاروقی ہیں۔ حضرت شیخ الہند عثمانی ہیں، حضرت مدنیؒ اور بعض
دوسرے حضرات سید ہیں۔ اور یہ سب حضرات سلسلۂ چشتیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

[1] نقوشِ اسلام مصنفہ مولانا سلیمان اکبرآبادی بحوالہ تہذیب التہذیب

دارالعلوم دیوبند کی خدمات

دورِ جاہلیت میں فنِ قیافہ[1] عربوں میں بہت مروج تھا اور بنو مدلج کا قبیلہ اس میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہؓ رنگ کے لحاظ سے گورے چٹے تھے۔ ان کی شادی ایک سیاہ فام عورت سے ہوئی اور ان کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ بھی سیاہ فام تھے۔ منافق بہانے ڈھونڈتے تھے، وہ حضرت اسامہؓ کے نسب پر اعتراض کرنے لگے۔ ایک روز اتفاق ایسا ہوا کہ حضرت زیدؓ اور ان کے صاحبزادے اکٹھے سو رہے تھے، ان کے سر ڈھکے ہوئے تھے، لیکن پاؤں کھلے ہوئے تھے۔ بنو مدلج کا ایک آدمی مجزز نامی ان کے پاس سے گزرا، اس نے پاؤں کو دیکھ کر کہا،

"یہ پاؤں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔"

شرعی لحاظ سے خواہ قیافہ کی کوئی حیثیت نہ ہو، بہرحال ایک ماہرِ فن کی حیثیت سے عربوں کے نزدیک اس شخص کی رائے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ بدگوؤں کے منہ پر چپت لگی، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طبعاً خوشی ہوئی، جس کا اظہار آپؐ نے اپنی زوجۂ مطہرہ سیدہ عائشہ صدیقہؓ کے سامنے فرمایا اور وہی اس واقعہ کی راوی ہیں۔

جاہلیتِ جدیدہ بہت حد تک جاہلیتِ قدیمہ سے مماثلت رکھتی ہے، وہی اندازِ فکر اور وہی طور طریق۔۔۔ دین کی کوئی بات بھی اس وقت سنی اور مانی جاتی ہے، جبکہ "یورپ کے بنیے" دین اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیں۔ ذیل کا واقعہ دینی حلقوں میں شاید زیادہ اہمیت نہ رکھتا ہو، لیکن مغربیت زدہ ذہنوں کے لیے یقیناً جاذبِ توجہ ہو گا۔

تقسیم ملک کے بعد سابق ریاست [illegible] کر ما[illegible] حفیظ الرحمٰن یہاں کے وزیر تعلیم تھے۔ [illegible] جامعہ عباسیہ و جامعہ اسلامیہ بہاولپور کی شکل [illegible] کے بڑے بڑے [illegible] میں ماہرینِ تعلیم اور بڑے بڑے [illegible] القرآن کا [illegible] میں حضرت مولانا محمد صادق صاحب ناظم امور مذہبیہ اور مولانا [illegible] صاحب [illegible] شیخ الجامعہ اور دیگر حضرات کے علاوہ سید حسین [illegible] شاہ صاحب مرحوم چیف انجینئر بھی موجود تھے۔ شاہ صاحب نے اپنا ایک واقعہ سنایا کہ میں تقسیم سے پہلے ایک سفر امریکہ گیا۔ وہاں کے ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا کہ اونچے طبقہ کے دو امریکی وہاں آکے نشستیں سنبھالنے کے بعد ادھر اُدھر خورد و نوش میں مشغول ہو گئے۔ انہوں نے ایک موضوع چھیڑ دیا، جو میرے لیے بڑا دلچسپ تھا، ان میں حسبِ ذیل گفتگو ہوئی۔

ایک بولا: "کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں مذہب کا اثر و رسوخ زیادہ پایا جاتا ہے، حتیٰ کہ مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک بھی ہندوستان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

دوسرے نے جواب دیا: "مشرقِ وسطیٰ جغرافیائی لحاظ سے یورپ کے قریب تر ہے۔ اس لیے یہاں یورپ کے اثرات زیادہ پہنچے ہیں، ہندوستان دور رہ جاتا ہے۔"

پہلا: "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ ہندوستان مکمل طور پر [illegible] حکومت کے زیرِ تسلط ہے اور اس تسلط کو تقریباً ایک صدی کا عرصہ گزر چکا ہے، پھر بھی فاتح قوم وہاں کے مسلمانوں سے مذہب کا دامن نہیں چھڑوا سکی۔"

دوسرا: "شاید یہ بات ہو کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے، اس لیے تہذیب [illegible] وہاں قدم نہیں جما سکی۔"

پہلا: "یہ بات بھی نہیں ہے، اوّل تو ہندوستان [illegible]

---

[1] یعنی علامات اور خط و خال سے شخص پہچان لینا۔

علمائے دیوبند سرحدؒ کی تصنیفی خدماتؒ

از: حافظ قاری فیوض الرحمٰن جدون، ایم اے (عربی، علوم اسلامیہ، اُردو، فارسی) ایم۔ او۔ ایل، صدر شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد

صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے اکثر علمائے دیوبند کی زندگیاں زیادہ تر درس و تدریس، وعظ و تبلیغ اور جہاد میں گزری ہیں، مگر ان خدمات کے باوجود تصنیف کے میدان میں بھی ان کی گرانقدر کوششیں اس لحاظ سے قابلِ قدر ہیں کہ یہاں انھیں ایسے وسائل حاصل نہیں تھے۔ عام طور پر ان کے بارے میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تصنیف کے میدان میں کوئی کام نہیں کیا، اس مضمون سے اندازہ ہوگا کہ یہ درست نہیں ہے۔

تذکرہ میں کسی بھی خاص ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا؛ کیف ما اتفق مؤلف و مصنف حضرات کی فہرست بنادی ہے....

ہمارا خیال تھا کہ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے تمام مصنف حضرات کا تراجم علمائے دیوبند کے عنوان سے مختصر تعارف کرایا جائے، لیکن جب اعداد و شمار کرکے دیکھا تو معلوم ہوا کہ صرف اس عنوان کے لیے دو ہزار صفحات درکار ہیں۔ لہٰذا اس ارادے کی تکمیل کے لیے آئندہ سال کا انتخاب کیا کہ ایک مستقل نمبر اس عنوان سے نکالا جائے، تاہم مثال کے طور پر صرف علمائے سرحد کا تعارف پیشِ خدمت ہے، اس سے ایک سرسری اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اکنافِ عالم میں علمائے دیوبند نے جو تصنیفی تالیفی کام کیا ہے، وہ کس قدر ہوگا، (جب کہ یہ بھی تمام علمائے سرحد کا احاطہ نہیں) (ادارہ)

مولانا حافظ قاری فیوض الرحمٰن صاحب جنھوں نے یہ مضمون مرتب کیا ہے، ماشاء اللہ خوب کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے بڑی محنت سے یہ مضمون تیار کیا ہے۔ ضروری ہے کہ شروع میں قارئین ان سے متعارف ہوں۔ ولادت ۲۰ مئی [illegible] کو تحصیل ایبٹ آباد کے ایک گاؤں ڈھیری کیمال میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم والد مکرم سے حاصل کی۔ درس نظامی کی کتابیں برادرِ بزرگ مولانا قاری محمد عارف صاحب مدظلہم فاضل جامعہ اشرفیہ سے پڑھیں۔ [illegible] میں پنجاب کے تعلیمی بورڈ سے ادیب عربی کا امتحان پاس کیا اور [illegible] میں میٹرک کا۔ حفظ اور روایت حفص کی تکمیل مدرسہ

ملاستبہ' لکھا جو ان کی زندگی میں طبع ہوا، اسی طرح قصیدہ بردہ اور نظام سیکھیے" کی شرحیں بھی لکھیں۔ مگر مؤخر الذکر دونوں شروح کے بارے میں یہ علم نہ ہو سکا کہ مطبوعہ ہیں، یا غیر مطبوعہ۔

مولانا عبداللہ قطب شاہ عباسی مردانی ۱۸۵۰ - ۱۹۲۲ء

آپ ۱۸۵۰ء کو حبیب شاہ صاحب کے گھر طورو ضلع مردان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ کے علماء سے حاصل کی، پھر بھوپال میں تکمیل کر کے سند حاصل کی۔ سعودی عرب بھی گئے۔ وہاں کے علماء سے بھی استفادہ کیا، واپسی پر میرٹھ آئے اور وہاں تدریس اور تصنیف کرتے رہے، پھر وطن میں آئے، صاحبزادہ عبدالقیوم صاحب کے ساتھ گہرے مراسم تھے، اسلامیہ کالج کی تحریک کے دوران ان کے دست و بازو بنے۔ ۱۹۱۲ء میں جب اسلامیہ کالج پشاور کی تاسیس ہوئی، تو آپ اس کے پہلے دینی (اسلامیات) معلم مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۲ء تک تدریس کرتے رہے، اسی دوران نمونیہ کے حملے سے آپ کا ۱۳۴۲ھ میں انتقال ہوا اور موضع "معیار" میں "مزار چند دبابا" میں آپ کی تدفین ہوئی۔

تصانیف: (۱) اسماء القرآن ۲۲/۱۸ سائز کے ۲۴ صفحات ۱۸۹۰ء کو مطبع ادام میرٹھ میں طبع ہوئی۔ اس کتاب میں کلام اللہ کے ۹۰ ناموں کی تشریح کی گئی ہے۔

(۲) رسالہ حدیث عرفان: اس میں ایمان کے ۷۰ شعبوں کا بیان ہے۔

(۳) نجوم الفرقان فی اطراف القرآن کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

(۴) شرح شعب الایمان۔ (۵) ہدیۃ القراء ۲۲/۱۸ سائز کے ۵۲ صفحات، علم تجوید کی منظوم کتاب مقدمہ جزری کی فارسی نظم میں شرح ہے۔ ان میں سے اکثر تصانیف آپ کے پوتے جناب الحاج رشید احمد باچا پرنسپل گورنمنٹ کالج مردان کے پاس ہیں۔

مولانا قاضی میر احمد ہزاروی ۱۹۶۳ء

آپ کے تصانیف میں ایک کتاب ہے کہ قاضی صاحب شمالی سرحد میں اردو زبان کے پہلے مؤرخ ہیں۔ آپ ۱۸۶۲ء میں بمقام ایبٹ آباد پیدا ہوئے اور ۱۹۳۹ء میں وفات پائی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد دیوبند چلے گئے جہاں فقہ، حدیث، اور تفسیر کی تکمیل کی واپسی پر مدرس مقرر ہوئے اور ملاکنڈ ایجنسی میں تبادلہ ہو گیا جہاں آخر عمر تک قیام رہا۔

علم و ادب سے فطری شغف تھا لیکن ایک اردو فارسی کتابیں یادگار چھوڑیں، تاریخ کی طرف طبعی میلان تھا۔ "تاریخ سرحد" دو ضخیم جلدوں میں لکھ کر ۱۹۱۲ء میں طبع کرائی، طرز تحریر قدیم ہے، جس میں الجھاؤ یا گنجلک پن نہیں پایا جاتا۔

(فارغ بخاری، ادبیات سرحد، ص ۱۹۵ (زیر عنوان تاریخ))

مولانا عبداللہ چھوار ہزاروی ۱۸۹۶ - ۱۹۷۰ء

آپ مہار نزد حویلیاں ضلع ایبٹ آباد، ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ دینیات کی تکمیل حضرت مولانا سکندر شاہ فاضل دارالعلوم دیوبند سے کی، چند سال ہری پور سکول میں عربی کے استاد رہے، پھر مدرسہ رحمانیہ ہری پور ہزارہ میں چھ سال اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آخری وقت تک تدریس کرتے رہے۔ آپ کی صرف ایک تصنیف "قرع اللبیب علی سمع الخطیب" ہی کا علم ہوا ہے، جو مولوی فضل الرحمٰن خطیب جامع مسجد اہلحدیث ہری پور ہزارہ کے رد میں لکھی گئی، مطبوعہ ہے۔ مولوی عبداللہ صاحب کی کتاب "تفریح الجنان فی تفہیم القرآن" پر آپ کی تقریظ بہ زبان عربی مع اردو شائع ہوئی ہے۔

مولانا مفتاح الدین محدث سواتی ۱۳۰۹ھ/۱۸۸۸ء - ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء

آپ "کنی" سوات میں فراش الدین بن فاضل الدین کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء کو امام العصر حضرت انور شاہ کشمیری

مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب جیسے حضرات سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی

فراغت کے بعد کئی مدارس میں تدریس کی۔ آخر میں جودۃ سوات میں ۱۸ سال تک [illegible] کتب کے علاوہ کتب حدیث کی تدریس کی۔ آپ سوات کے قاضی بھی رہے مگر مشغولیات بہت تھے۔ تاکہ تدریس میں فرق نہ آئے۔

تصانیف: (۱) اصلاح الاقوام، سلیس پشتو زبان کا پشتو ادب کا ایک شاہکار ہے۔ (۲) جمال القرآن: مولانا اشرف علی تھانوی کی اس کتاب تجوید کا پشتو میں ترجمہ کیا ہے۔ (۳) تحقیق حرف ضاد: مذکورہ دونوں کتابیں قلمی ہیں

وصال: ۱۲ محرم الحرام ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء بروز جمعۃ المبارک بوقت نماز جمعہ ۹۰ سال میں وصال ہوا اور جودہ میں سپرد خاک کیے گئے۔

مولانا قاضی عبدالسلام سلیم ہزاروی ۱۸۹۸ء / ۱۹۴۶ء

آپ ریاست امب دربند، ہزارہ میں مولانا قاضی ..... محمد اسمٰعیل بن قاضی مولانا سید علی کے گھر پیدا ہوئے۔ درس نظامی کی تکمیل اپنے والد صاحب سے کی، پھر مدرسہ عالیہ رامپور سے سند الفراغ اور دہلی سے علوم شرقیہ کی سندات حاصل کی۔

فراغت کے بعد ہائی گورنمنٹ ہائی سکول پشاور میں اسلامیات کی تدریس کرتے رہے۔ پھر وہاں سے مستعفی ہو کر حجاز کا قصد کیا، وہاں مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ اور مظاہر مدینہ منورہ میں ادب عربی کی تدریس کرتے رہے۔

حجاز سے واپسی کے بعد ٹیچرز ٹریننگ سکول ہیڈ [illegible] میں عربی ادب کے استاذ رہے اور آخری وقت تک تدریس کرتے رہے۔ وہیں ۱۹۴۶ء میں فوت ہوئے۔

آپ چاروں زبانوں، عربی، فارسی، اُردو اور پشتو کے شاعر تھے۔ آپ کے ۳ مجموعے روض الازہار، نالہ درد اور الجذبۃ الشرقیۃ الی المعرۃ الحجازیۃ۔ آخری مجموعہ نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک حسین مجموعہ ہے سب مطبوعہ ہیں۔

آپ قاضی سیف اللہ فضل حکیم استاذ اردو، گورنمنٹ کالج، ہزارہ کے چچا تھے۔

مولانا عبدالرحمن ہزاروی ۱۹۰۰ء / ۱۹۴۷ء

آپ دوبندی، خانپور، تحصیل ہری پور، ہزارہ میں بیان الدین صاحب کے گھر ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم علاقے کے علماء سے حاصل کرنے کے بعد [illegible] مدرسہ نعمانیہ میں پڑھتے رہے، پھر وہاں سے امرتسر چلے گئے، جہاں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ سے چند کتابیں پڑھیں، اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، دو سال میں موقوف علیہ کی تکمیل کی اور تیسرے سال ۱۳۴۴ھ میں امام العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔

فراغت کے بعد ۴ سال تک مدرسہ "نصرۃ الحق" امرتسر میں تدریس کی، پھر مدرسہ نعمانیہ امرتسر میں مدرس اول کے طور پر تقسیم ملک تک اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۷ء کو وہاں سے بیمار ہو کر واپس وطن آگئے اور ۲۱ رمضان ۱۳۶۶ھ/ ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو آپ کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور دوبندی میں تدفین ہوئی

تصانیف: آپ کی تصانیف میں ۱۔ الطلاق الدفعی فی الطلاق الرجعی، احکام الاحباد باحکام الاخیار اور رفع الملام عن شیخ الاسلام۔ یہ تینوں کتابیں

کریمُ السجایا جمیلُ الشیم
نبیُّ البرایا شفیعُ الاُمم
امامِ رُسُل پیشوائے سبیل
امینِ خدا مہبطِ جبرئیل
سعدیؒ

مطبوعہ ہیں۔ (آپ مولانا عبدالحق صاحب امام و خطیب جامع مسجد اسلامیہ کالج پشاور کے والد تھے۔ آخری کتاب حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے رد میں لکھی تھی۔ ...)

مولانا فضل حق ہزاروی : ۱۸۶۲ء / ۱۹۴۷ء

آپ شیری، تحصیل ایبٹ آباد، ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء کو شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ صاحب سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی، فراغت کے بعد واپس وطن آئے۔ مجاہدین کے مرکز دربند ہزارہ میں دو سال تک کام کیا، پھر شیری سے نقل مکانی کرکے سلطان پور، حویلیاں ضلع ہزارہ چلے گئے، پھر شاہی جامع مسجد چنیوٹ میں امام و خطیب مقرر ہوئے اور ۳۰ سال تک خدمات انجام دیتے رہے۔ تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا، وہیں سے بیمار ہو کر واپس وطن آئے اور ایک ڈیڑھ ماہ کی علالت کے بعد ۱۹۴۹ء کو انتقال ہوا۔

تصنیف: قادیانیت اور رافضیت کے رد میں الفلاح والفوز نامی کتاب ۶۰ ضخیم جلدوں میں لکھی، جو کہ پانچ ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ جس پر آپ مولانا قاضی غلام جیلانی و مولانا قاضی محمد ابراہیم سلطانپوری کے تقریظ ہیں۔ عمر نے وفا نہ کی، اس لیے یہ کتاب غیر مطبوعہ ان کے عزیزوں کے ہاں پڑی ہے۔

مولانا نقیب احمد اچھوی ۱۸۹۸ء / ۱۹۶۹ء

آپ ۱۸۹۸ء کو اچھو ضلع دیر میں صاحبزادہ شریف احمد کے گھر پیدا ہوئے۔ قومیت کے لحاظ سے صدیقی تھے۔

ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۶ء کو امام العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ، علامہ محمد رسول خان ہزاروی، مولانا میاں اصغر حسین سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔

علم ادب اور شعر و شاعری میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحب سے استفادہ کرتے رہے۔ ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء کو تھانہ بھون حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں پہنچے۔ ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ پھر ان کے مدرسہ امدادالعلوم میں تین چار سال تک پڑھاتے رہے۔

۱۹۳۰ء کو وطن واپس آگئے۔ اور پھر اپنے وطن میں آخری وقت تک تدریس کرتے رہے۔ آپ عربی، فارسی اور پشتو کے قادر الکلام شاعر تھے۔ ۱۹۶۲ء میں حج بیت اللہ کی سعادت ملی۔

اکتوبر ۱۹۶۹ء کو اچھو میں آپ کا انتقال ہوا۔

آپ نے جن کتابوں پر پشتو اور فارسی میں حاشیے اور شرحیں لکھی ہیں، ان کے نام درج ذیل ہیں۔

گلستان سعدی، بوستان سعدی، سکندرنامہ، انشائے ملا غنی، زلیخا، شمہ وغیرہ کل ۱۲ کتابوں پر آپ نے حواشی لکھے، جو ۱۹۳۵ء تا ۱۹۵۰ء کے عرصے میں لکھے گئے اور پھر شائع ہوئے۔

مولانا حیدر زمان صدیقی ہزاروی ۱۹۰۰ء / ۱۹۵۲ء

آپ ۲۲ جنوری ۱۹۰۰ء کو احمد دین صاحب کے گھر بہتل، متصل ریحانہ، ہری پور، ہزارہ میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی، دورۂ حدیث کی تکمیل ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء میں دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے کی۔

۱۹۴۰ء میں مسجد قاضیاں پٹھان کوٹ میں خطیب رہے۔ ۲۲ جنوری ۱۹۵۲ء کو ہری پور میں آپ کا انتقال ہوا۔

تصانیف: (۱) اسلامی نظریہ اجتماع مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی، دکن صفحات ۲۴۲

آپ بفہ، تحصیل مانسہرہ ہزارہ میں جناب لطف اللہ خان صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم کے حصول کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر اول سے آخر تک تمام کتب پڑھیں، ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء کو شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ پھر مختلف مدارس میں تدریس کرتے رہے۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۲۱ء کو گورنمنٹ مدرسہ عالیہ سلہٹ میں تدریس پر مامور ہوئے اور ۲۰ سال تک اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دیں، آخر میں ۹ ماہ تک وہاں کے مدیر بھی رہے، ۱۹۴۰ء کو وہاں سے واپس وطن آ گئے۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۶۲ء کو بفہ میں انتقال ہوا، بیعت کا تعلق حضرت شیخ الہندؒ سے تھا۔

تصانیف: (۱) انتباہ الرقود فی حل سنن ابی داؤد وعرف کتاب الصلوٰۃ، صفحات ۲۶۰ (قلمی)

(۲) فرحت القاری علی صحیح البخاری صفحات ۱۶۸ (قلمی)

آپ عزیز الرحمٰن، سعید الاسلام، امین الاسلام اور ولی اللہ خان صاحبان کے والد محترم تھے

مولانا قاضی عبدالرب پشاوری ۱۸۸۹ء / ۱۹۷۲ء

آپ مولانا قاضی مدکنوں صاحب کے گھر زیارت کاکا صاحب، تحصیل نوشہرہ ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی اور متوسط تعلیم مولانا محمد اسرائیل [illegible] مردانی سے حاصل کر کے مدرسہ عبدالرب دہلی میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء کو حضرت مولانا عبدالعلیؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ مختلف مقامات پر تدریس کرنے کے بعد جبرود، پشاور میں خطیب مقرر ہوئے اور ایک عرصہ تک خطابت کرتے رہے

جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ/ ۳۰ جون ۱۹۷۲ء کو آپ کا وصال ہوا۔

آپ کی تصانیف میں ایک **قصص القرآن** (بزبان پشتو) قلمی ہے جو آپ کے فرزند مولانا عبدالقدوس صاحب سابق صدر شعبہ اسلامیات پشاور یونیورسٹی کے پاس محفوظ ہے۔

پیغمبر اسلام کے نام سے سید [illegible] شائع شدہ کتاب کا ترجمہ کیا جو شائع ہو چکا ہے۔

مولانا مفتی محمود حسن ہزاروی ۱۸۹۲ء-۱۹۷۳ء

آپ ۵ ذی الحجہ ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء کو "دیول کلہائی" علاقہ [illegible] ہزارہ میں مولانا حاجی احمد خان صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی، پھر کچھ عرصہ حضرت علامہ [illegible] صاحب لاہوریؒ سے سندھ میں پڑھتے رہے۔ تکمیل مدرسہ حنفیہ اجمیر شریف میں مولانا معین الدین صاحب سے کی۔ پھر اسی مدرسہ "امداد صوفیہ" میں کچھ عرصہ تدریس کرنے کے بعد جامعہ حنفیہ [illegible] میں پہلے بطور صدر مدرس اور شیخ الحدیث ۲۰ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ تقسیم ملک کے باعث وطن آ گئے اور پھر "مطلع العلوم" برودی روڈ کوئٹہ میں تدریس کی۔

۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء میں جامعہ عربیہ اسلامیہ نزد عیدگاہ کوئٹہ کی بنیاد رکھی اور ایک مسجد بھی اس میں بنوائی، آخری وقت تک یہاں تدریس و افتاء کے کام میں لگے رہے۔ یکم ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء کو آپ کا وصال ہوا اور اسی مدرسہ کے احاطہ میں دفن کئے گئے۔

تصانیف: آپ کی تصانیف میں معین الفقہ صفحات ۹۰ مطبوعہ حیدرآباد دکن، ۱۹۴۰ء

(۲) "معین الحکمت" صفحات ۱۰۴، مطبوعہ حیدرآباد دکن۔

(۳) "معین الفرائض" مطبوعہ دہلی، صفحات ۱۲۶۔

(۴) "معین المنطق اول و دوم" صفحات حصہ اول ۶۴ اور حصہ دوم ۱۴۴ بار دوم کراچی۔

(۵) "التذکرۃ المرضیۃ" اپنا مختصر سوانحی تذکرہ بزبان عربی مطبوعہ [illegible]

(آپ پیر سید غلام مصطفیٰ قاسمی کیمبل پور کے خلیفہ مجاز بھی تھے)

مولانا عبدالعزیز ہزاروی ۱۹۶۷ء

آپ ۱۹۰۰ء کو ضلع تحصیل ہری پور ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن کے علماء سے حاصل کی۔ ۱۹۱۵ء میں مدرسہ عالیہ فتح پوری میں داخلہ لیا اور وہیں سے سند فراغ حاصل کی، پھر کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے حدیث پڑھتے رہے۔

مزید براں پنجاب سے مولوی، عالم، فاضل اور پنجاب سے مولوی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ فراغت کے بعد لاہور آئے اور پھر وہاں سے کوئٹہ پہنچے، وہاں اسلامیہ ہائی سکول میں مدرس دینیات مقرر ہوئے اور سالہا سال مطلع العلوم میں تدریس کرتے رہے۔ پھر دارالارشاد کی بنیاد رکھی جامع مسجد چمن گیٹ میں امام و خطیب تھے۔ ۱۱ اپریل ۱۹۶۷ء کو وہیں آپ کا وصال ہوا۔ اور وہیں دفن کئے گئے۔

تصنیفات: (۱) احکام القرآن (اردو ترجمہ) (۲) تنظیم اور دین و مذہب (۳) سورۃ بقرہ (تفسیر) (۴) سید قطب کی تفسیر فی ظلال القرآن کے بعض اجزاء کا ناتمام ترجمہ۔

مولانا عبدالحق نافع پشاوری ۱۳۱۲ھ - ۱۳۹۳ھ / ۱۸۹۵ء - ۱۹۷۴ء

آپ ۹ محرم الحرام ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۵ء کو میاں شاہ گل صاحب کے ہاں زیارت کاکا صاحب، نوشہرہ، پشاور میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے کی۔ تکمیل دورۂ حدیث علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے دارالعلوم دیوبند میں کی۔ فراغت کے بعد کچھ عرصہ ناکھل بنگال میں تدریس کی، پھر ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء کو دارالعلوم دیوبند میں استاذ درجہ علیا کے منصب پر فائز ہوئے اور ۱۵ سال تک اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دیں۔

تقسیم ملک کی وجہ سے وطن آئے، پھر مظہر العلوم کھڈہ کراچی میں ۲ سال، دارالعلوم چارسدہ پشاور میں دو سال، مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی میں دو سال تک شیخ الحدیث رہے۔ ۷ ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ / ۰ جنوری ۷۴ء بوقت ۱۲ بجے شام سکونت مردان، میانگان نکلے میں وصال ہوا۔

تصانیف: آپ کی تصانیف میں نفع المسلم اور مفتاح فتاوی۔ دونوں کتابیں مطبوعہ ہیں۔

آپ مولانا سید عبداللہ صاحب کاکا خیل، فاضل مدینہ یونیورسٹی، استاذ مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کے والد محترم تھے۔

مولانا غلام ربانی لودھی ہزاروی ۱۸۹۹ء

آپ ۱۸۹۹ء کو سرائے صالح ہری پور ہزارہ میں مولوی برکت اللہ صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول ایبٹ آباد سے پاس کیا۔ ۱۹۱۸ء میں انٹر کا امتحان اسلامیہ کالج پشاور سے پاس کر کے بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ ۱۹۲۰ء میں بی۔ اے کے امتحان کے رزلٹ نکلنے والے تھے کہ عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہو کر جامعہ ملیہ دہلی چلے گئے۔ وہاں مولانا محمد علی جوہر، خواجہ عبدالحی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔

تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لینے پر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، صحافت کے میدان میں آئے، تو یہاں بھی جرأت و مردانگی کے ساتھ اس پیشے کے وقار کو قائم رکھا۔ روزنامہ وکیل امرتسر، روزنامہ زمیندار لاہور، انقلاب لاہور، احسان لاہور اور مساوات لاہور میں دو، دو سال تک بطور مدیر معاون کام کیا، ہفت روزہ شہاب راولپنڈی کے دو سال تک مدیر رہے، اسی طرح ماہنامہ ترجمان سرائے صالح کے ۳ سال تک مدیر رہے، پشاور کے سہ روزہ "رفیق خدائی خدمت گار" میں بھی کچھ عرصہ بطور مدیر کام کیا۔

۱۹۴۷ء میں مولانا میرواعظ محمد یوسف کی دعوت پر نصرۃ الاسلام کالج سری نگر میں دو سال تک تدریس کی، اسی دوران بی اے کا وہ امتحان جو ۱۹۲۰ء کو دینا تھا، ۱۹۴۱ء میں دیا اور پاس ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء میں انگلو عربک

خاص تعلق [illegible] حضرت [illegible] سے [illegible]
میں سے [illegible] کہا جا سکتا ہے۔

جناب مولانا سید بادشاہ گل صاحب

شیخ الحدیث جامعہ [illegible] اکوڑہ خٹک پشاور

آپ [illegible] کو جناب سید [illegible] شاہ بن سید حبیب شاہ بخاری کے گھر اکوڑہ خٹک تحصیل نوشہرہ ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل کی، پھر [illegible] پشاور کے [illegible] سے صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں۔ پھر مولانا [illegible] صاحب آف شہید [illegible] سے شرح جامی، منطق اور اصول کی کتب پڑھیں۔ اس کے بعد مسجد [illegible] پشاور کے مدرسہ تعلیم القرآن میں مولانا عبدالحنان صاحب فاضل دیوبند سے فنون کی تمام کتابیں پڑھیں۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۴۵ھ میں بخاری و ترمذی حضرت مدنیؒ سے، مسلم مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی سے، ابوداؤد مولانا میاں اصغر حسین صاحب سے، موطا امام مالک مفتی محمد شفیع صاحب سے اور طحاوی مولانا شمس الحق صاحب افغانی سے پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔

تدریسی خدمات: فراغت کے بعد اکوڑہ واپس آکر جامعہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی، ابتداءً مسجد [illegible] صاحب میں تدریس شروع کی، پھر [illegible] اپنی زمین میں عظیم الشان عمارت میں تدریس کا کام شروع ہوا۔ آپ کے ساتھ آپ کے استاذ مولانا عبدالحنان صاحب بھی تدریس پر فائز ہوئے۔

بیعت کا تعلق اپنے والد صاحب سے رہا۔ انہوں نے آپ کو سلسلہ قادریہ اور نقشبندیہ میں خلافت دی۔ ان کے بعد آپ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور انہوں نے بھی آپ کو خوب نوازا اور بہت سے طلبہ کو اجازت بھی دی۔

تصنیفی خدمات:

۱۔ "فیوضات حسینیہ" حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی تقریر ثبت ہے۔

۲۔ "ذوصوت الحق" چار سو صفحات کا ذکر اور مفصل جواب رسالہ [illegible] القبور [illegible] میں ہے۔

۳۔ "زیارۃ القبور" دو سو صفحات کی کتاب ہے۔

۴۔ "کتاب الوسیلہ" تین سو صفحات۔

۵۔ "[illegible]" ۲۰۰ صفحات۔

۶۔ احقاق الحق من سنن النبی المصطفیٰ المعروف بہ سنن [illegible] صفحات ۴۰۰ (مطبوعہ)

ان کے علاوہ "تحفۃ التسہیل فی تراجم الجامع البخاری" (عربی) جلد اول کا مسودہ تیار ہو چکا ہے۔

مشکوٰۃ ترمذی (عربی) کے بھی تین سو کے قریب صفحات ہو چکے ہیں۔

شرح ایساغوجی، ہدایۃ النحو (پشتو میں) شرح و خلاصۃ النحو ۵۰۰ کے قریب، زاد الذاکرین، ارشاد السالک الی اعلام المالک، کافیہ کی مکمل ترکیب چار پانچ سو صفحات — یہ سب غیر مطبوعہ ہیں۔

اولاد میں چھ فرزند سید محمد قاسم، محمد طاہر علی شاہ، سید اطہر علی شاہ، انور علی شاہ، سید حسین احمد، طیب علی شاہ ثانی اور دو بچیاں ہیں۔

حضرت مولانا سید شمس الحق صاحب افغانی مدظلہ

آپ قصبہ ترنگزئی تحصیل چارسدہ ضلع پشاور کے ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل عالم ہیں۔ آپ پاکستان کے چوٹی کے صاحب سواد اور استعداد علماء میں سے ہیں۔ گیارہ سال تک ریاست ہائے متحدہ بلوچستان، قلات، خاران، مکران اور لس بیلہ کے وزیر معارف

تحریر (دفتر تعلیم) رہ چکے ہیں۔ بیسیوں مدرسوں میں اعلیٰ تدریسی فرائض انجام دے چکے ہیں۔ صاحب نسبت بزرگ ہیں۔ تینوں سلسلوں میں مجاز بیعت ہیں۔ جید عالم اور بہترین مصنف ہیں۔ آپ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔

اکابر علمائے دیوبند کی یادگار ہیں۔ اس پیرانہ سالی اور معروفیت کے باوجود درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں۔ ہم آئندہ سطور میں ان کی زندگی کی ایک جھلک پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں اور اللہ رب العزت سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ پاک انہیں تادیر سلامت رکھیں اور مزید علمی خدمات کی توفیق بخشیں اور ہم مسلمانوں کو ان کی برکات سے محروم نہ فرمائیں (آمین ثم آمین)

قمری سن کے مطابق آپ ۸ رمضان المبارک ۱۳۱۶ھ اور سکول کے ریکارڈ کے مطابق آپ ۸ ستمبر ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔

نام و نسب: نام شمس الحق رکھا گیا۔ آپ سید جلال الدین حیدر کی اولاد سے ہیں جن کا سلسلہ حسینی مولانا اعجاز الحق صاحب قدوسی کی کتاب صوفیائے پنجاب کے صفحہ ۵۱۵ پر درج ہے۔ مختصر سلسلہ نسب یہ ہے:

شمس الحق ابن مولانا غلام حیدر ابن مولانا خان عالم ابن مولانا سعد اللہ

آپ کے والد بزرگوار مولانا غلام حیدر، مولانا عبدالحلیم لکھنوی کے شاگرد تھے۔ علوم دینیہ میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ پشتو اور فارسی زبان کے بلند پایہ اور صاحب طرز شاعر تھے۔ ان کے کلام میں عالمانہ شان اور صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ آپ کے پردادا مولوی سعد اللہ صاحب مجاہد کبیر حضرت مولانا سید احمد شہید بریلوی کے خلیفہ تھے۔ انہی کی امارت میں جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا تھا۔ مشہور سوانح نگار جناب غلام رسول مہر نے اپنی کتاب سیرت احمد شہید میں خلفاء کی فہرست میں چھتے نمبر پر

ان کا نام نامی تحریر فرمایا ہے۔ ابتدائی تعلیم [illegible] کی۔ ۲۸ جولائی ۱۹۱۹ء کو پرائمری سکول میں [illegible] ہوئے۔ بعد ازاں سرحد افغانستان کے [illegible] کی تحصیل کر کے تکمیل حدیث کے لئے امام العصر حضرت علامہ [illegible] کشمیری کی خدمت میں پہنچے۔ ۱۳۳۸ھ میں دارالعلوم دیوبند [illegible] اور ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں سند فراغ حاصل کی۔ حدیث کے علاوہ دارالعلوم دیوبند میں علم طب کی بھی تحصیل کی۔

تبلیغی خدمات: جون ۱۹۲۲ء میں حج بیت اللہ [illegible] سے مشرف ہو کر واپس ہندوستان تشریف لائے۔ اس مبارک سفر سے واپس آئے تو ہندوستان میں شدھی تحریک زوروں پر تھی۔ دارالعلوم دیوبند نے شروع ہی سے فتنہ ارتداد اور شدھی تحریک کی روک تھام کے لئے جو پچاس مبلغین راجپوتانہ بھیجے، ان کی قیادت و سرپرستی آپ کے سپرد کی گئی۔ تبلیغ کا مرکز آریہ سماج کے خلاف شہر آگرہ محلہ [illegible] میں قائم کیا گیا۔ یہ تبلیغی کوششیں اس قدر کامیاب ہوئیں کہ راجپوتانہ کے ہزاروں برائے نام مسلمانوں کو پختہ مسلمان بنا کر ارتداد سے بچا لیا۔ آپ کی مخلصانہ [illegible] تبلیغی مساعی کی وجہ سے ہزاروں ہندو حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ انہوں نے چوٹی کٹوائی۔ یہ سیروں بال بطور یادگار دارالعلوم دیوبند بھیجے گئے۔ آریوں کے مختلف مشہور مناظرین کو عام جلسوں میں عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پنڈت رام چندر، دلیپ سنگھ اور خود شردھانند میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جب فتنہ ارتداد کے خاتمہ پر کامیابی کے ساتھ واپسی ہوئی تو دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں علامہ انور شاہ کشمیری اور علامہ شبیر احمد عثمانی تشریف فرما تھے۔ ان کے ارشاد پر آپ نے تبلیغی حالات و کوائف پر ایسی جامع تقریر فرمائی کہ ان بزرگوں نے دل کھول کر داد دی۔

کم و بیش ایک سال تک دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں مختلف کتب کے مطالعہ میں مصروف رہے۔ اسی طرح حج کے موقع پر آپ [illegible]

[illegible] کتب کے مطالعہ میں صرف فرمایا۔

تدریسی خدمات: آپ کی اس احتیاط پسندی کا اکثر مشاہدہ ہوتا رہا ہے۔ اس سے آپ کی علمی ثقاہت کا پتہ ملتا ہے۔

- صدر مدرس مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی ۱۹۲۱ء
- صدر مدرس مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور ۱۹۲۳ء
- صدر مدرس مدرسہ الرشاد جھنگ صدر
- وزیر معارف ریاست قلات ۱۹۳۹ء
- دوبارہ وزیر معارف قلات ۱۹۴۰ء
- صدر شعبہ تفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور ۱۹۶۳ء
- صدر مدرس مدرسہ رشاد العلوم قلعہ گل خان اللہ آباد سندھ ۱۹۳۱ء
- صدر مدرس دار الفیوض الہاشمیہ سجاول سندھ ۱۹۳۵ء
- مدرس اعلیٰ و شیخ التفسیر دار العلوم دیوبند ۱۹۳۶ء
- صدر مدرس جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ۱۹۴۳ء
- شیخ التفسیر والحدیث اکیڈمی علوم اسلامیہ کراچی ۱۹۶۶ء

وزارتِ تعلیم: ۱۹۵۱ء میں آپ کو ریاست ہائے متحدہ بلوچستان قلات کے والی کی طرف سے وزارتِ تعلیم کی پیشکش کی گئی چنانچہ اکابر دیوبند کے مشورہ پر آپ نے یہ پیشکش قبول فرمالی اور اسی سال آپ نے قلمدانِ وزارت سنبھالا۔ آپ کے وزارت میں آنے سے ریاست کے شعبہ ہائے قضا میں جان پڑ گئی۔

تمام تنازعات کا فیصلہ جلد از جلد قرآن و حدیث کی روشنی میں کیا جاتا تھا۔ ریاست کے عوام کو خوشحالی و اطمینان کی زندگی ملی۔ اس ذمہ دارانہ منصب پر آپ ۱۹۳۸ء اور بعد از پاکستان ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک پورے گیارہ سال فائز رہے۔ ان سالوں میں آپ نے قوم و ملت کی جی بھر کر خدمت کی۔ اسی دوران میں آپ نے قضا اسلامیہ کے متعلق فقہ اسلامی سے چیدہ چیدہ اصول منتخب کرکے ایک کتاب معین القضاۃ والمفتین عربی زبان میں لکھی اور اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اس میں اسلامی قوانین کو بحوالہ کتب جدید طرز پر بشکل دفعات مرتب کیا ہے۔ اس کتاب پر آپ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند نے قرارداد کے ذریعہ مبارکباد بھیجی جو اخبار الجمعیۃ مورخہ [illegible] میں چھپی۔ یہ کتاب افغانستان، ترکی، عراق، مصر، لبنان اور شام والوں نے طلب کی اور بغداد شارع الشیخ میں اس کی ایجنسی قائم ہوئی۔

وزارت سے استعفیٰ: ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ بن جانے کے بعد جبکہ شاہی منصب بدستور قائم تھا، لیکن وزارت کا عہدہ قانوناً حکمیہ تھا اور شرعی فیصلہ پر ہائی کورٹ و سپریم کورٹ میں اپیل کی گنجائش باقی رہ سکتی تھی اور جس کے ارکان شرعی قانون کی پوری واقفیت نہ رکھتے تھے، اس لئے آپ نے استعفیٰ دے دیا، حالانکہ استعفیٰ نہ دینے کی صورت میں بڑی تنخواہ اور بڑی پنشن سے آپ مستفید ہوسکتے تھے، لیکن آپ نے غیر عالم دین کو عالم دین کے فیصلہ پر حق اپیل دینے کو شان و وقارِ شریعت کے خلاف سمجھ کر مالی فائدہ کو نظر انداز فرمادیا، بقول شاعر ؎

اس کے سوا جہاد کے معنی ہیں اور کیا
اسلام کا وقار بڑھاتے ہوئے چلو

تصنیفی خدمات: ۱۔ آپ کی ایک عربی کتاب معین القضاۃ والمفتین کا تذکرہ پہلے ہوچکا ہے۔

۲۔ شرعی ضابطۂ دیوانی: یہ اردو زبان میں ہے۔ اس میں اسلامی فقہ کے تمام دیوانی قوانین دفعات کی صورت میں جمع کئے گئے ہیں۔ ملک کے مشہور قانون داں اے کے بروہی نے اسے بہت پسند کیا اور طلب فرمائی۔ مذکورہ بالا دونوں کتابیں مکتبہ صدیقیہ ملتان سے مل سکتی ہیں۔

۳۔ علوم القرآن: اردو زبان میں ہے۔ مہتمم مدرسہ فاروقیہ

[illegible] .. .. بخط مصنف

[illegible] .. .. ..

[illegible] .. ..

[illegible] صفحات ۴۰

۱۱۔ [illegible]

۱۲۔ [illegible] علی البخاری

۱۳۔ مرشد الحیران الی فہم القرآن

۱۴۔ العرفان فی اصول القرآن .. مخطوطات

۱۵۔ تفسیر القرآن الکریم ترجمۃ الافغانیۃ

۱۶۔ البرہان فی اصول القرآن

مولانا خان زمان ہزاروی ۱۸۸۵ — ۱۹۶۰ء

آپ ۱۸۸۵ء کے قریب مانسہرہ، ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے جامع العلوم، کانپور کے صدر مدرس حضرت مولانا غلام یحییٰ صاحب ہزاروی سے مروجہ علوم کی تکمیل کر کے سند فراغ حاصل کی۔

تدریس: فراغت کے بعد اپنے استاذ محترم کی معیت میں تدریس کا آغاز کیا۔ ابھی پانچ سال ہی پڑھانے پائے تھے کہ آپ کے استاذ جامع العلوم سے علیحدہ ہو گئے۔ ان کی علیحدگی کے بعد ایک عرصہ تک آپ نے بحیثیت صدر مدرس اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دیں۔

تصانیف: آپ کی تصانیف میں سے صرف ایک کتاب حل المطول فی شرح التلخیص (عربی) ہی کا نام معلوم ہو سکا ہے۔

شادی: کانپور کے مشہور طبیب اور سیاسی رہنما ڈاکٹر عبدالصمد کی بہن آپ کے نکاح میں آئیں مگر اولاد نہیں ہوئی۔

آپ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ کانپور کے مشہور طبیب اور سیاسی رہنما ڈاکٹر عبدالصمد جو ایک زمانے میں یوپی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر اور کانپور مسلم لیگ کے صدر تھے کے بہنوئی مولانا خان زمان صاحب بھی مدرسہ جامع العلوم کانپور کے صدر مدرس رہے ہیں۔ مرزا صاحب نے ان کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کی شکل کا مجھ پر اب تک اثر ہے، کبھی نہیں ہنستے تھے صرف مسکرا دیتے تھے۔[1]

وصال: ۱۹۶۰ء اس کے کچھ بعد آپ کا کانپور ہی میں وصال ہوا اور وہیں دفن کئے گئے۔[2]

علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ

شیخ الحدیث مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی

آپ حضرت مولانا سید محمد زکریا بن میر مزمل شاہ بن میر احمد شاہ بنوری کے گھر ۶ ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء شب جمعرات بوقت سحر پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب، ماموں اور علاقہ کے علماء کے علاوہ علماء کابل سے حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا حافظ عبداللہ بن خیر اللہ پشاوری (متوفی ۱۳۳۲ھ)، مولانا عبدالقدیر قاضی القضاۃ جلال آباد کابل اور شیخ محمد صالح قیلغوی افغانی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ دو سال میں موقوف علیہ کی تکمیل کر کے امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری

---

[1] اشتیاق اظہر، عبدالرحمن خان صاحب مالک مطبع نظامی کانپور، البلاغ (ماہنامہ) کراچی ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ ص ۹۲

[2] سوانحی تذکرہ کا اکثر حصہ مولانا محمد اسماعیل ذبیح صاحب بن حضرت مولانا غلام یحییٰ صاحب ہزاروی، نمبر یونین صدر پشاور اور کچھ مولانا حکیم قاضی محمد یونس صاحب نعمانی مانسہرہ سے لیا گیا۔

[3] آپ کا مفصل سوانحی تذکرہ سرحد کے علمائے دین میں ملاحظہ کیا جائے۔

۱۳۵۰ھ میں سند حاصل کی۔ انہی کے ارشاد پر مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا اور ۱۳۵۱ھ میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔ آپ کی سند کا نمبر ۹۲ ہے۔

دارالعلوم دیوبند بھی گئے اور وہاں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے درسِ بخاری میں شریک رہے۔ مولانا اعزاز علی صاحب سے حماسہ، متنبی پڑھی۔ سالہا سال سے پائلٹ ہائی سکول مانسہرہ میں معلم دینیات رہے ہیں۔ علم طب پیشہ خاندانی ہے اس لئے مطب کر رہے ہیں۔ ایک مدت تک ٹاؤن کمیٹی مانسہرہ کے ممبر بھی رہے ہیں۔ شاعرانہ ذوق بھی رکھتے ہیں۔ ملک کے کئی رسائل میں آپ کے مضامین اور نظمیں شائع ہو چکی ہیں۔

تصانیف: (۱) کواکبِ توحید (۲) کوکبِ رسالت (۳) فتاویٰ ابوالفیض (غیر مطبوعہ) (۴) کوکبِ ہدایت (دینی مسائل پر مشتمل ہے) (۵) تفسیر فاتحہ (۶) ذکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم (نعتیہ کلام) (۷) شکوۂ امیر خسرو (نظم) (۸) گلزار عاشقانہ (غیر مطبوعہ) (۹) دیوارِ چین (نظم) (۱۰) مکالمہ خدا و شیطان (۱۱) معراجِ طریقت (غیر مطبوعہ) (۱۲) یوم الحساب (غیر مطبوعہ) (۱۳) رہنما تحقیقات (۱۴) تجلیات امیر خسرو (نظم) غیر مطبوعہ (۱۵) قصیدۂ اشعری (عربی اشعار) وغیرہ کتب و رسائل ہیں۔

مولانا قاضی شمس الدین ہزاروی

آپ ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۶ء کو کوٹ نجیب اللہ ہری پور ہزارہ میں مولانا فیروز الدین صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی مولانا صدر الدین اور علاقہ کے علماء سے حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لئے مدرسہ امینیہ دہلی میں داخلہ لیا اور ۱۳۵۵ھ میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ فراغت کے بعد ۴ سال تک درویش ہری پور ہزارہ میں تدریس کی۔

۱۳۶۰ھ میں حضرت مولانا عبداللہ صاحب خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف ضلع میانوالی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور مجازِ طریقت قرار پائے۔

تصانیف: (۱) دارالحرب کی اسلامی حیثیت صفحات ۸۶ اُمعوہ عربی ترجمہ غیر مطبوعہ (۲) سیرۃ خلفائے اسلام ۱۸۶ صفحات مطبوعہ مکتبہ اعزاز اسلام ملتان (۳) مسئلہ رویت ہلال (۴) بے باک محاسبہ (۵) مصنوعی آواز کی کہانی (۶) عیسائی تبلیغ کے خفیہ گوشے شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا مفتی سیاح الدین پشاوری

صدر مدرس اشاعۃ العلوم جامع، لائل پور

آپ ۵ شوال ۱۳۳۴ھ / ۵ اگست ۱۹۱۶ء کو مولانا حافظ اسد گل صاحب کے گھر زیارت کاکا صاحب تحصیل نوشہرہ ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔

مولانا محمد ابراہیم سواتی

آپ تازہ گئی بونیر ضلع سوات میں مولانا عبدالمجید بن سیا محمد کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد صاحب اور دیگر درسگاہوں میں حاصل کی۔ ۱۵ سال کی عمر میں موقوف علیہ کی تکمیل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں داخلہ لیا اور دورۂ حدیث کے امتحان میں اول آئے۔ مزید تعلیم کے لئے اجمیر گئے، وہاں مولانا عبداللہ قندھاری سے افق المبین، شرح اشارات، شرح مطالع، ریاضی کا درس لیا۔ پھر اسی مدرسہ میں بطورِ مدرس آپ کا تقرر ہوا۔ اور ساتھ ہی جامع کے خطیب بھی مقرر ہوئے۔ وہاں تدریس و خطابت کی اعلیٰ خدمات انجام دیں۔ وہاں سے والیٔ ریاست بادشاہ صاحب نے آپ کو بلا لیا۔ چند سال دارالعلوم سیدو شریف سوات

میں تدریس کی۔ پھر بادشاہ صاحب نے آپ کو بلالیا، تاکہ ان کے فرزند شہزادہ سلطان روم کو علم دین پڑھائیں۔ وہاں بادشاہ صاحب خود اور اس کے فرزند آپ سے پڑھتے رہے۔ اچانک ٹی بی کا شکار ہو گئے بادشاہ صاحب نے بھی علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑی، مگر بے سود [illegible]ء میں آپ کا وصال ہوا، اپنے آبائی قبرستان "بانارگئی" میں دفن کئے گئے

تصانیف: (۱) خیرالکلام فی شہر صیام۔ اردو مطبوعہ، اجمیر شریف کے قیام کے دوران لکھی۔ (۲) علم العروض میں کتاب العروض جو مدرسہ چار باغ سوات میں داخل نصاب ہے (۳) علم ریاضی میں "اشکال ریاضی" مطبوعہ (۴) خطبہ جمعہ (۵) فتاویٰ دو دو جلد اول و دوم مطبوعہ۔

آپ ایک اچھے شاعر بھی تھے، افسوس کہ بہت تھوڑی عمر لے کر آئے اور جلد چلے گئے۔

مولانا عبدالشکور پشاوری

استاد اسلامیات جامعہ پشاور

آپ ۱۱ ستمبر سنہ ۱۹۲۳ء کو زیڑہ تحصیل چارسدہ پشاور میں سید مبارک شاہ صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد صاحب اور دارالعلوم رجڑ کے مولانا مغیث الدین صاحب سے حاصل کر کے سنہ ۱۹۳۶ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے دورۂ حدیث پڑھا۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ مارچ سنہ ۱۹۴۸ء کو اسلامیہ کالجیٹ سکول پشاور میں اسسٹنٹ ڈین مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں اسلامیہ کالج اور سنہ [illegible]ء میں شعبۂ اسلامیات پشاور یونیورسٹی میں تدریس پر مامور ہوئے۔ اب تک پڑھا رہے ہیں

تصانیف: (۱) علوم اسلامیہ میں فلسفۂ عقائد و عبادات

آپ کے قلم سے ہے۔

حدیث کی تشریحات بھی آپ کی ہیں اور مقالے غیر مطبوعہ ہیں

مولانا سید عبدالرحمن ہزاروی

ایم۔ اے، پی ایچ ڈی (الازہر)

آپ ۱۰ اکتوبر سنہ [illegible]ء کو کلکئی علاقہ تورغار تحصیل بٹگرام ہزارہ میں جناب شاہ ولی صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ سنہ [illegible]ء میں جامعہ فتحیہ اچھرہ لاہور میں مولانا حافظ مہر محمد صاحب سے پڑھتے رہے۔ سنہ [illegible]ء، سنہ ۱۹۵۵ء میں جامعہ اشرفیہ لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ سنہ [illegible]ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور سنہ [illegible]ء میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ بعض کتابوں کے امتحانی نتیجہ پر چند کتب انعام میں ملیں۔

فراغت کے بعد دارالعلوم اسلامیہ ڈگری سندھ میں دو سال تک بطور صدر مدرس تدریس کی۔ سنہ ۱۹۵۹ء میں مزید تعلیم کے لئے مصر گئے۔ وہاں جامعۃ الازہر میں ایم۔ اے فلسفہ میں داخلہ لیا ساتھ ہی قاہرہ یونیورسٹی میں بی۔ اے (ادب عربی) میں کامیاب ہو گئے اور جامعۃ الازہر کے التخصص فی علوم العقیدۃ والفلسفۃ (ایم۔ اے فلسفہ) کے امتحان میں ایک ہزار میں سے ۸۰۲ نمبر لے کر پوری یونیورسٹی میں اول آئے۔

جز وقتی ملازمت بھی کر رکھی تھی کہ جو خطوط جمال عبدالناصر مرحوم کی طرف اردو، فارسی اور پشتو میں آتے تھے۔ ان کا آپ عربی میں ترجمہ کرتے تھے۔ پھر قاہرہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے (ادب عربی) کا امتحان بھی پاس کر لیا۔

سنہ [illegible]ء میں آپ نے الازہر میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھا جس کا عنوان "الکندی وآراؤہ الفلسفیہ" (کندی اور ان کے فلسفیانہ افکار)

جلد ۵۰ صفحات کے اس مقالہ پر ۱۹۷۵ء میں آپ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی۔ پھر پاکستان آ گئے۔ پہلے ادارہ تحقیقات اسلامی میں فیلو اور اب جامعہ اسلامیہ یونیورسٹی اسلام آباد میں شعبہ عربی کے انچارج ہیں۔

تصانیف: (۱) الکندی و آراؤہ الفلسفیہ۔ (عربی)

(۲) الحیاۃ الاجتماعیہ عند نجم الدین الطوفی (عربی) / شائع

مولانا محمد اجمل صاحب ہزاروی

خطیب جامع رحمانیہ محلہ گوجر سنگھ۔ لاہور

آپ جنوری ۱۹۳۲ء کو جناب مولانا غلام ربانی صاحب کے گھر نانسر تحصیل ہری پور ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم رحمانیہ ہری پور ہزارہ کے صدر مدرس استاذ العلماء حضرت مولانا خلیل الرحمن صاحب فاضل دیوبند سے تکمیل کی پھر اسی میں تین سال تدریس کی۔

۱۹۵۵ء میں مولوی فاضل کا امتحان دینے لاہور جانا ہوا کامیابی کے بعد مدرسہ رحیمیہ نیلا گنبد لاہور میں بطور ثالث مدرس تین سال تک پڑھاتے رہے۔ پھر مغل پورہ ہائی سکول میں بطور عربک ٹیچر ۹ سال تک پڑھاتے رہے۔

عبدالکریم روڈ جہاں آج مسجد کی سہ منزلہ عمارت کھڑی ہے۔ یہاں قد آدم گڑھے تھے، درس قرآن کی برکت سے یہ عظیم الشان مسجد تعمیر ہوئی۔ اس میں مدرسہ بھی ہے۔

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علیؒ کے ساتھ کئی تقریریں کیں۔ آپ کا انداز تکلم بڑا پیارا، موثر اور دلچسپ ہوتا ہے۔ اچھی تقریر کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اچھی تحریر کا بھی ملکہ عطا فرما رکھا ہے۔ (بیعت کا تعلق مرشدی مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے ہے۔

تصانیف: (۱) آداب القرآن — موضوع نام سے شائع ہوئی ہے۔ مکتبہ اشاعت الاسلام اردو بازار لاہور۔ نومبر ۱۹۶۸ء بار اول صفحات ۱۹۶، کتابی سائز مجلد بڑی عمدہ اور پیاری کتاب ہے۔

(۲) تدریس القرآن، لاہور۔ مئی ۱۹۶۳ء، ۲۲x۱۸ سائز کے صفحات

(۳) تدریس القرآن حصہ اول بے شمار اضافوں کے ساتھ ۱۹۶۷ء بڑے سائز کے ۱۰۴ صفحات۔

(۴) آداب دعا: ۲۲x۱۸/۸ سائز کے ۱۴۴ صفحات
(۵) قربانی (۶) لغات القرآن (عربی) (۷) آداب المساجد
] سر دست یہاں بعض زیر طبع ہیں

(۸) [illegible] خواب ۲۲x۱۸/۸ سائز کے ۹۶ صفحات مطبوعہ

ان میں لغات القرآن (عربی) آپ کی ایک عظیم علمی خدمت ہے

مولانا سمیع الحق اکوڑوی

آپ شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب کے فرزند ہیں۔ دارالعلوم حقانیہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ ماہنامہ الحق کے مدیر ہیں۔ دارالعلوم حقانیہ کے مدرس ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں دارالعلوم حقانیہ میں تدریس پر مامور ہوئے اب تک پڑھا رہے ہیں۔ آپ کی تصانیف میں ایک کتاب قرآن مجید اور تعمیر اخلاق طبع ہو چکی ہے۔

مولانا محمد طاسین صاحب ہزاروی

ناظم مجلس علمی، کراچی

آپ ۱۹۲۳ء کو "دند گراں" تحصیل ہری پور ہزارہ میں جناب عبدالرحمن صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے حسن پور ضلع مرادآباد میں مولانا ولی محمد صاحب ہزاروی کیمبلپوری سے درس لیا ۱۹۴۳ء میں تکمیل جامعہ اسلامیہ امروہہ میں حضرت مولانا حافظ عبدالرحمن صاحب تلمیذ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے کی۔ انہی سے بیعت کا تعلق بھی ہے۔

فراغت کے بعد اسی مدرسہ میں ۵ سال تک اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۳ء میں رباط العلوم الاسلامیہ کراچی کے ناظم رہے پھر دارالعلوم کراچی میں ایک سال تدریس کی، ۱۹۵۵ء میں مجلس علمی کراچی سے منسلک ہو گئے۔

تصانیف: (۱) خطبات ماثورہ — مجلس علمی مع اردو ترجمہ (۲) اسلامی معاشیات اور (۳) اسلامی نظام حیات پر مسودے تیار ہیں۔ آپ کے علمی مقالات اکثر علمی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

مولانا قاری محمد امین صاحب ہزاروی

ضلعی خطیب شیخوپورہ

آپ یکم جمادی الاخریٰ ۱۳۴۶ھ / اکتوبر ۱۹۲۷ء کو مولانا عبدالرحیم صاحب کے گھر سری کوٹ، ہری پور ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ رحمانیہ ہری پور میں مولانا خلیل الرحمٰن صاحب، مولانا عبداللہ اور مولانا سکندر علی صاحب سے حاصل کی۔

۱۳۶۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۶۳ھ میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی، انعام میں کتابیں ملیں۔

فراغت کے بعد جامع شیخوپورہ میں خطیب مقرر ہوئے۔ خطابت کے ساتھ تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔ ۱۹۶۰ء میں مسجد محکمہ اوقاف کی تحویل میں چلی گئی۔ آپ ضلعی خطیب ہیں۔

تصانیف: (۱) میلاد النبیؐ (۲) مسلمان اور شہری دفاع (۳) جہاد شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا لطافت الرحمٰن سواتی

انچارج فقہ و قانون جامعہ اسلامیہ بہاولپور

ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کے مطابق آپ کا سن ولادت ۱۹۲۵ء ہے۔ تورنیال ضلع سوات میں مولانا قاضی فضل علی صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد صاحب اور مولانا مفتاح الدین صاحب سے حاصل کی۔ ۱۳۶۳ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا [illegible] حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے دورۂ حدیث پڑھا۔ نمایاں کامیابی حاصل کی اور کتب انعام میں حاصل کیں۔ فراغت کے بعد [illegible] تدریس کی۔ ۱۹۵۱ء میں جامعہ پنجاب سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۷ء سے جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں تدریس پر مامور ہوئے ہیں۔ آپ شاعر بھی ہیں۔

تصانیف: (۱) اشرف المقال فی مسئلۃ رویۃ الہلال بار دوم (۲) پشتو ترجمہ فتاویٰ رشیدیہ کتب خانہ اسلامیہ قصہ خوانی پشاور سے (۳) رجال التوحید (۴) درس التوحید (۵) منظوم کلام — موخر الذکر تینوں کتابیں ابھی زیر طباعت سے آراستہ نہیں ہوئیں۔

مولانا قاضی عبدالسلام صاحب نوشہروی

آپ ۲ محرم الحرام ۱۳۲۱ھ / مارچ ۱۹۰۳ء کو قاضی عصمت اللہ کے گھر زیارت کاکا صاحبؒ تحصیل نوشہرہ ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد اور دادا — مولانا قاضی قدرت مکنون صاحب سے حاصل کی۔ ۱۳۴۲ھ میں حضرت مولانا عبدالعلی صاحب سے مدرسہ عالیہ دہلی میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی، انہی سے مدارج سلوک طے کر کے ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ کو خلافت حاصل کی۔ واپسی پر تدریس کا آغاز کیا۔ ایک عرصہ تک پڑھاتے رہے۔ اب جامع مسجد نوشہرہ صدر کے خطیب ہیں۔

تصانیف: آپ کی تصانیف میں (۱) سبیل المومنین (۲) صراط مستقیم (۳) شرح دیوان حافظ الہدیٰ (۴) شرح دیوان علی [illegible]

یہ دونوں کتابیں پشتو فاضل کے نصاب میں داخل رہی ہیں (۵) دلیل صوفیانہ صفحات ۲۹۲ - یہ ایف ایس سی اور انٹر پشتو کے نصاب میں رہی ہے - ان کے علاوہ الصلام اور مسئلہ تحریک سیر کتابچے بھی شائع ہو چکے ہیں - شاعری کا ذوق بھی رکھتے ہیں۔

مولانا سید امین الحق صاحب مردانی

آپ ۱۹۰۹ء کو ظہور دضلع مردان میں محمد اسحاق کے گھر پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی - اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۵۴ھ میں امام العصر مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا اعزاز حسین، مولانا محمد رسول خان صاحب ہزاروی وغیرہم حضرات سے دورہ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔

فراغت کے بعد مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں آج کل جامع مسجد شیخوپورہ کے خطیب مولانا احمد علی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور تکمیل اسباق کے بعد ۱۹۶۱ء میں خلافت سے سرفراز کئے گئے۔

تفصیلی حالات کے لئے راقم کی مرتبہ "شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی اور ان کے خلفاء" کا مطالعہ فرمایئے۔

تصانیف: (۱) "بصائر السنۃ" دو حصوں میں ۵۰۰ کے قریب صفحات، حجیت حدیث کے موضوع پر ہے۔

(۲) السہم الصدید فی نحر العنید نتائج التقلید کے جواب میں (۳) تنبیہ الاغبیاء علی حیوٰۃ الانبیاء، مولوی محمد اسماعیل گوجرانوالہ کے جواب میں (۴) عجالہ نافعہ (۵) بائیبل اور قرآن — عیسائی مبلغ ایس ایم پال کے رسالہ قرآن کے جواب میں (۶) صحابہ معیار حق ہیں۔ (۷) تذکرۃ الرسول (۸) زمینداری کا شرعی نظام (۹) اسلام کا معاشی نظام (۱۰) اسلام اور قربانی۔

مولانا عزیز الرحمٰن صاحب ہزاروی

مہتمم امداد العلوم ، ملک پورہ ، ایبٹ آباد

آپ دہنڈ، ہری پور ہزارہ کے ایک گاؤں سوکال میں مولانا عبدالحکیم صاحب[1] کے گھر ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے - ابتدائی و متوسط درجہ کی تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل کی - پھر مدرسہ نصرۃ الحق امرتسر میں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۹ شوال ۱۳۴۱ھ / مئی ۱۹۲۳ء کو دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا - پہلے سال موقوف علیہ کی تکمیل اور دوسرے سال بخاری اور ترمذی امام العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے، مسلم شریف مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے، نسائی شریف و بیضاوی علامہ محمد رسول خان ہزارویؒ، ابوداؤد مولانا میاں اصغر حسین سے پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔

فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک دینی مدارس میں تدریس کی - اسی اثناء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا - بطور مدرس عربی تدریس کرتے رہے اور آخر میں ۱۹۶۲ء گورنمنٹ ہائی سکول ایبٹ آباد سے ریٹائر ہوئے۔ آجکل مدرسہ امداد العلوم، نوتر ملک پورہ ایبٹ آباد، ہزارہ کے مہتمم ہیں۔

بیعت کا تعلق حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے تھا تکمیل سلوک ان کے خلیفہ اجل حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ بانی جامعہ اشرفیہ لاہور سے کی۔

تصانیف: (۱) فیوض الرحمٰن (حضرت تھانوی کے مواعظ کا مجموعہ)

---

[1] آپ کے والد بھی ایک اچھے عالم تھے، عمر بھر تدریس کرتے رہے۔ ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ / ۱۴ اگست ۱۹۲۱ء کو ان کا وصال ہوا اور اپنے گاؤں سوکال میں دفن کئے گئے (ان کا تفصیلی تذکرہ "علمائے ہزارہ" میں مطالعہ کیا جائے)

[illegible] دارالعلوم تعلیم القرآن
[illegible] میں
[illegible]
[illegible]
[illegible] اور آپ وہاں
سے [illegible]

۱۹۸۲ء میں پروفیسر خورشید احمد کی دعوت پر ادارہ معارف اسلامی کراچی کی رفاقت قبول کر لی ۱۹۸۶ء تک رفیق رہے۔

ادارہ میں دو سال آپ نے سہ ماہی مجلہ کے قرآن نمبر کی ترتیب و تدوین کا کام کیا۔ قرآن نمبر کی پہلی دو جلدوں کا اکثر کام آپ نے کیا۔ پھر سیرۃ النبی کی طرز پر قرآن کریم پر سات آٹھ جلدوں میں مفصل تحقیقی کام کرنے کا پروگرام بنایا اور اس سلسلہ کی پہلی کتاب "نزول قرآن" مرتب کی مگر پروفیسر خورشید صاحب کی اس تجویز کردہ اور آپ کا لکھا ہوا اور مرتب ان کی ہو۔ جب آپ نے رد کر دیا تو ان کا طرز عمل آپ کے ساتھ ہمدردانہ نہ رہا جس کی وجہ سے آپ نے ادارہ کی رفاقت چھوڑ دی۔

تصانیف: (۱) ادارہ کی رفاقت کے دوران آپ نے سید قطب مرحوم کی مشہور کتاب "معالم فی الطریق" کا ترجمہ کیا۔ آپ کا یہ ترجمہ انگریزی میں [illegible] صاحب کا ترجمہ شائع ہو گیا۔

(۲) مصطفیٰ السباعی مرحوم کی کتاب کا ترجمہ "ہماری تہذیب کے درخشاں پہلو" کے نام سے اسلامک پبلیکیشنز لاہور سے شائع ہوا۔

(۳) ڈاکٹر عامر کی کتاب کا ترجمہ "اسلام کا نظام تعزیرات" کے نام سے شروع کیا جو ساتھ ساتھ ترجمان القرآن لاہور میں شائع ہو کر مکمل ہوا۔ ۱۹۹۸ء میں آپ واپس آئے اور پریکٹس کر رہے ہیں۔

مولانا محمد موسیٰ صاحب روحانی بازی

استاذ حدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

آپ ککڑ خیل تحصیل و ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں پیدا ہوئے سید احمد شہیدؒ کی اولاد سے ہیں، آگے یہ سلسلہ حضرت امام زین العابدینؒ تک جا پہنچتا ہے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ پھر دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ، پشاور میں ۲ سال تک مولانا عبدالحق شیخ الحدیث مولانا عبدالغفور سواتی، مولانا قاضی حبیب الرحمٰن، مولانا محمد فیاض اور مولانا لطافت الرحمٰن سواتی سے مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں۔ دارالعلوم حقانیہ کے ہر امتحان میں اول آتے رہے۔ دارالعلوم حقانیہ کے بعد مدرسہ قاسم العلوم ملتان شہر میں داخلہ لیا اور موقوف علیہ کی تکمیل کے بعد تیسرے سال ۱۳۸۳ھ میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔ امتحان میں آپ نے اول نمبر پر ریکارڈ قائم کیا، وہ اب تک قائم ہے۔ یہاں کے اساتذہ میں مولانا عبدالخالق صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند، مولانا علی محمد صاحب، مولانا محمود اختر صاحب تفسیر قرآن کی سند شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب سے دارالعلوم تعلیم القرآن راولپنڈی سے حاصل کی۔

فراغت کے بعد کچھ عرصہ "قاسم العلوم" میں افتاء کا کام کرنے کے بعد حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ کے مدرسہ مطلع العلوم کوئٹہ میں بطور صدر مدرس آپ کا تقرر ہوا۔ تین سال کے بعد وہاں سے [illegible] کے مدرسہ میں ایک سال تدریس کی، پھر مدرسہ قاسم العلوم میں بطور مدرس آپ کا تقرر ہوا۔ چند سال وہاں اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۷۷ء میں جامعہ اشرفیہ لاہور میں برائے تدریس لائے گئے۔ اب وہاں تدریس اور نیو کیمپس جامعہ پنجاب کی جامع مسجد میں خطابت کرتے ہیں۔ عربی، اردو، فارسی اور پشتو چاروں زبانوں کے ادیب اور شاعر ہیں۔

تصانیف: آپ نے موضوعات پر لکھتے ہیں، آپؒ کی تصانیف کی تعداد کوئی ساٹھ کے قریب ہے جن میں سے بیس تو فلسفۂ سائنس اور جدید و قدیم ہیئت پر ہیں جن کی زبان اردو، عربی، فارسی ہے۔ ان میں سے فلکیات جدیدہ و سیر القمر و عید الفطر، ہفت سموٰت کے متعلق اسلام، ادیان عالم اور فلاسفہ کے نظریات" شرح جامع صحیح للترمذی، شرح مشکوٰۃ المصابیح جلد اوّل۔ "الفوائد اللکوتیہ فی أن الاحادیث حجۃ فی العربیۃ" (عربی ضخیم جلد)، "الینابع الجنی فی التفریق بین الرسول والنبی (عربی)" رسالہ مباحث مقدمۃ الکتب (عربی)، رسالہ اقسام الشفاعۃ الثلاثون" شرح تصریح (عربی، علم ہیئت)، تعلیقات شرح حنفی دیوان اشعار (عربی، فارسی)، "بیان المذاہب فی حقیقۃ الحرف" (عربی)، "نور کی حقیقت (اُردو)" کتاب التاریخ الکبیر" (اردو)، "کتاب الاعیان والکبراء (عربی دو ضخیم جلدوں میں)، تلخص الہیئۃ الجدیدۃ (اُردو)، "کتاب الہیئۃ الجدیدہ (عربی ضخیم جلد)" "النجم السعد فی مباحث اما بعد (عربی)، وغیرہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ ہیں۔ آپ کی تصانیف اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ ان موضوعات پر لکھتے ہیں جن پر عموماً علماء نے کم لکھا ہے، یہی وجہ ہے جامعہ پنجاب نے "فلکیاتِ جدیدہ" کو بہت سراہا ہے۔

مولانا محمد امین صاحب مردانی

شیخ الحدیث دارالعلوم اسلامیہ شیر گڑھ۔ مردان

آپ ۱۹۰۸ء کو کھوئی برمول" ضلع مردان میں جناب شاہ جی گل صاحب علوی کے گھر پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب محمد بن علی (محمد ابن حنفیہ) کی وساطت سے قریش ہاشمی علوی سادات تک پہنچتا ہے۔ آپ کی والدہ محترمہ ثابت باباؒ کی دختر نیک اختر تھیں جو شیخ کبیر صاحب المعروف ثابت باباؒ کی اولاد میں سے تھے اور اپنے وقت کے بہت بڑے ولی اللہ تھے، ان کا مزار ستھانہ مالاکنڈ ایجنسی میں واقع ہے اور مرجع خاص و عام ہے۔ والدہ ماجدہ کی طرف سے آپ کا سلسلہ نسب حضرت عبداللہ بن عمرؓ تک جا پہنچتا ہے، اس لحاظ سے آپ فاروقی قریشی بھی ہیں۔

ابتدائی تعلیم: چھ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد صاحب سے قرآن پاک پڑھا، ابتدائی کتب علاقہ کے علماء سے پڑھیں۔ مقامی سکول سے پرائمری پاس کر کے ہمہ تن درس نظامی کی طرف متوجہ ہوئے۔

مولانا عبدالحنان خلف مولانا عبدالحکیم صاحب سے شرح ملا، اور مولانا عبدالرحمٰن فاروقی ساکن سنگا ہو، مردان سے صرف، منطق، "ہدایہ اولین" وغیرہ کتب پڑھیں۔

اعلیٰ تعلیم: ۱۹۲۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے "مظاہر العلوم" سہارنپور میں داخلہ لیا اور "مسجد عیدی شاہ" میں مقیم ہوئے۔ آپ کے رفیق درس مولانا غلام نبی فاروقی مردانی بھی ہمراہ تھے۔ چند دن بعد مکمل داخلہ لے لیا اور ۱۹۲۷ء تک "مظاہر العلوم" کے فاضل اساتذہ سے پڑھتے رہے۔ پھر "مظاہر العلوم" "مدرسہ نعمانیہ" فراش خانہ دہلی میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا عبدالحنان ساکن چھچھ سے مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں۔

۱۹۳۰ء میں مدرسہ حسین بخش دہلی میں دورۂ حدیث پڑھنے کے لئے داخلہ لیا اور حضرت مولانا نور الحسن دیوبندی تلمیذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی، دورۂ حدیث کے امتحان میں اوّل رہے۔ استاذ مکرم نے آپ کو اپنی معیت میں تدریس کی دعوت دی، مگر گھریلو مجبوریوں کے باعث آپ کو واپس آنا پڑا۔

تدریسی خدمات: اپنے محلہ بالا میاں گان" کھوئی برمول" مردان میں تدریس کا آغاز کیا، جس میں دور دور سے طلبہ آکر تحصیل علم کرتے

ہ راقم کی مرتبہ "سوانح حضرت مولانا محمد رسول خانؒ" میں آپ کا تعارف اور نمونہ کلام موجود ہے۔

رہے۔ آپ نے متعدد علوم و فنون کی کتابوں کے علاوہ ایک سال یہاں صحاح حدیث بھی پڑھایا۔

احمد آباد میں: پھر احمد آباد (انڈیا) میں دو سال کے قریب تدریس کی۔ اسی دوران ملک تقسیم ہوا اور آپ محمد آباد سے واپس وطن آ گئے۔

کوہاٹ میں: ۲۵ دسمبر ۱۹۵۹ء کو دارالعلوم عربیہ اسلامیہ تل ضلع کوہاٹ میں بحیثیت صدر مدرس و شیخ الحدیث آپ کا تقرر ہوا۔ آپ نے دس سال تک اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۹ء میں حج بیت اللہ کی سعادت ملی، دارالعلوم عربیہ سے استعفیٰ دے کر واپس گھر آ گئے۔

یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک پشاور میں بحیثیت استاذ حدیث اور مفتی کے منصب پر فائز ہوئے۔ ابھی تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ ارباب جمعیۃ کے شدید اصرار پر جمعیۃ علمائے اسلام کی طرف سے انتخاب میں حصہ لیا۔ جامعہ اسلامیہ سے مستعفی ہو کر میدانِ انتخاب میں نکل آئے۔ آپ صرف چند ووٹوں سے رہ گئے۔

مردان میں: مولانا محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم اسلامیہ عربیہ شیر گڑھ مردان کے اصرار پر ان کے مدرسہ میں بحیثیت صدر مدرس و شیخ الحدیث تقرر ہوا۔ ۱۹۷۲ء سے اسی مدرسہ میں تدریس حدیث میں مشغول ہیں۔

صوفیانہ مسلک: پہلی بیعت مجاہد کبیر حضرت حاجی فضل واحد صاحب المعروف بہ "حاجی ترنگزئی" کے ہاتھ پر سلسلہ قادریہ میں ہوئی۔ پھر حضرت مولانا عبدالغفور مدنی نقشبندی سے رجوع کیا اور پھر انہی کے ہو رہے۔

سیاسی مسلک: پہلے جمعیۃ علماء ہند سے منسلک رہے، مئی ۱۹۴۵ء کو سہارنپور کے اجتماع میں جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی امیر کی حیثیت [illegible] شریعت کی قیام پاکستان کے بعد جمعیۃ علماء اسلام سے وابستہ ہیں۔

اولاد: اولاد میں آپ کے دو فرزند مولوی رُوح الامین صاحب اور پروفیسر محمد امین گورنمنٹ کالج مردان ہیں۔

تصانیف: (۱) نعلِ رسول (دو حصے) — مولانا حبیب الرحمٰن دیوبندی کی لامیۃ المعجزات کی جو شرح مولانا اعزاز علی صاحب نے نفحات کے نام سے کی تھی، اس کا پشتو میں آپ نے ترجمہ کیا اور مزید شرح بھی لکھی۔ جلد دوم ۱۳۸۲ھ میں شائع ہوئی تھی۔

(۲) سیرۃ الرسول (پشتو) پشتو بائی پرائمری کے نصاب میں داخل ہے۔

(۳) شاہ ولی اللہ (پشتو) غیر مطبوعہ۔

(۴) ابین الکلام فیما یتعلق بہ بین الحلال والحرام (اردو) غیر مطبوعہ

(۵) تاریخ تدوین فقہ — غیر مطبوعہ ہیں۔

مولانا سید محمد زکریا بنوری ۱۲۹۵ھ — ۱۳۹۵ھ

آپ ۱۲۹۵ھ کے لگ بھگ پشاور میں مولانا سید مزمل شاہ بنوری کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی و درستانی تعلیم کے اساتذہ کا علم نہیں ہو سکا اور نہ سالِ فراغت معلوم ہو سکا ہے۔ ذریعہ معاش تجارت رہا۔ آخر عمر کے تیس سال یادِ خدا میں گزارے۔

علمی مقام: آپ کے بارے میں مولانا سید محمد یوسف بنوری تحریر فرماتے ہیں کہ "ایک دفعہ ۱۳۴۶ھ میں حضرت امام العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی زیارت کی غرض سے تشریف لائے۔ ان دنوں حضرت شیخ مجھے اپنی کتاب "ضرب الخاتم علی حدوث العالم" پڑھاتے تھے۔ درس میں بیٹھ گئے اور تقریر سنتے رہے۔ اس وقت اتفاق سے علم کلام کا مسئلہ خلق افعال عباد جو مشکل ترین مسئلہ ہے، زیر بحث آیا۔ شیخ نے تقریر فرمائی اور مشکلات سلجھاتے رہے۔ درمیان میں حضرت والد صاحب سوالات کرتے رہے۔ حضرت شیخ جوابات دیتے رہے۔ فراغتِ درس کے بعد حضرت

شیخ نے دریافت فرمایا حضرت! علمی شغلہ کب سے متروک ہے؟ فرمایا پچیس برس ہوئے۔ حضرت شیخ نے بہت تعجب سے سُنا اور پھر مختلف مجالس میں بارہا فرمایا کہ ان کے والد کا علمی شغلہ پچیس سال سے متروک ہے لیکن معلومات عمدہ اور تازہ ہیں۔ امام العصر جیسے علمی سند کی یہ داد کتنی وزنی ہے۔

تصنیفی خدمات: عربی، فارسی، اُردو تینوں زبانوں میں عمدہ مصنف تھے؛ "سواطع الانوار فی فضائل اہل بیت النبی المختار" عربی میں اور ایضاح المشکلات اردو میں جس میں وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود وغیرہ مشکلات تصوف اور مشکلات کلام پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ دو جلدوں میں تحریر فرمائی۔ اپنے خوابوں کو جمع کیا ہے "البشرات" نام رکھا ہے اور تعلیقات میں ان کی تعبیرات "تعبیر المسرات" کے نام سے لکھی ہیں۔ مسئلہ روح و نفس کا مقالہ مجلس علمی (کراچی) نے طبع کرادیا ہے۔

تین چیزوں سے محبت: فرماتے تھے کہ مجھے تین چیزوں سے محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اپنی خوابوں سے ۔۔ ۱۴ سال کی عمر سے بیس سال کی عمر تک ۱۰۰ مرتبہ سے زیادہ رسولِ پاکؐ کی خواب میں زیارت بابرکت سے شرفیابی ہوئی اور آخر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

وصال: ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۵ھ / ۵ جون ۱۹۷۵ء دن کے پونے دس بجے بروز جمعرات آپ کا کراچی میں وصال ہوا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ بصائر وعبر میں لکھتے ہیں کہ والد مکرم کی وفات حسرت آیات صرف ایک والد کی مرثیہ خوانی نہیں بلکہ علم و عرفان کا مرثیہ ہے۔ ایک صاحب کرامات و خوارق عارف باللہ کا ماتم ہے کہ ایک محقق روزگار کا نوحہ ہے، ایک فیلسوف عصر کا غم ہے۔ ایک اولوالعزم وجود کی جدائی پر اظہار حزن ہے۔ مجاہدات اریاضیات میں مصروف رہنے والے حکیم شخصیت کا فقدان ہے، ایک باکمال مفسر کا نوحہ ہے۔ ایک باخدا صاحب مکارم اخلاق ۔۔۔ شخصیت کا نالہ و شیون ہے۔ ایک گوشہ نشین صوفی صاحب ۔۔۔ کے فراق کا سوز غم ہے۔ ایک عاشق رسول کا درد و اضطراب ہے ۔۔۔ معارف کے عالم کی مرثیہ خوانی ہے۔ شریعت اسلامیہ کے ۔۔۔ فاضل کے لئے نالہ و فریاد ہے۔ طریقت و حقیقت کے واقف رموز کا حزن و غم ہے۔ والد ماجد کیا تھے۔ ایک گمنام ہستی جس نے ایک عالم اپنے اندر سمیٹ رکھا تھا۔[1]

تاریخہائے وصال: مولانا محمد احمد تھانوی نے چند تاریخہائے وصال لکھی ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

(۱) تاریخہائے وصال مولوی حاجی زکریا بنوری

۱۹۷۵ء

(۲) ماہر علوم عقلیہ و نقلیہ مولانا محمد زکریا بنوری رحمۃ اللہ جل مجدہ لابد۔

۱۹۷۵ء

(۳) وقال اللہ جل جلالہٗ وحیہ
فوقاھم اللہ شر ذالک الیوم [2]

۱۹۷۵ء

---

[1] مولانا محمد یوسف بنوری: بصائر وعبر، بینات کراچی رجب ۱۳۹۵ھ ص ۲ تا ۱۱

[2] مولانا محمد احمد تھانوی مہتمم مدرسہ اسعد فیہ سکھر، تاریخ ہائے وصال، بینات کراچی شعبان ۱۳۹۵ھ ص ۱۴

مولانا قاضی عبداللطیف صاحب ہاشمی ہزاروی

آپ ۱۹ ستمبر ۱۹۳۳ء کو مولانا قاضی عبدالقادر صاحب کے گھر زجیہ تحصیل ایبٹ آباد ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا مولانا قاضی عبدالاحد صاحب سے حاصل کی، پھر جامعہ فتحیہ اچھرہ لاہور میں مولانا حافظ محمد صاحب سے پڑھتے رہے۔

دورۂ حدیث کی سند جامعہ عربیہ مفتاح العلوم گوجرانوالہ (کیمبل پور) کے حضرت مولانا نذیر محمد صاحب تلمیذ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ سے حاصل کی۔ فراغت کے بعد مدرسہ احیاء العلوم جامع مسجد کوہلیاں جہلم میں بطور صدر مدرس کئی سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔

۱۹۵۸ء میں مرکزی جامع مسجد کوہلیاں سٹیشن کے امام و خطیب مقرر ہوئے اور اب تک یہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ اس علاقہ کے قاضی بھی ہیں۔ جنوری ۱۹۶۳ء کو اکیڈمی علوم اسلامیہ کوئٹہ میں ۲۵ علماء نے برائے تربیت شرکت کی تھی، ان سب میں آپ اول آئے، پھر وہاں آپ کو بطور مشیر لے لیا گیا، اسی عرصہ اشغال میں آپ نے

تصانیف: ۱۔ اسلامی تعلیمات: نامی کتاب لکھی جو بعد میں جامعہ اسلامیہ بہاولپور سے نہایت خوبصورتی کے ساتھ شائع ہوئی۔ ۲۲×۱۸/۸ کے سائز پر اس کے ۲۴۴ صفحات ہیں۔

۲۔ العروۃ الوثقیٰ: احادیث و دعاؤں کا مجموعہ ناشر تعلیم القرآن ٹرسٹ راہوالی ضلع گوجرانوالہ۔ تعداد ۱۵ ہزار۔ ۳۔ مسائل نماز۔ ۴۔ ترجمہ پارہ اول (حافظ نذیر احمد) مولانا عنایت اللہ صاحب کے ساتھ آپ بھی شریک رہے ہیں۔ مریدی ناشر بیعت کا تعلق آخر میں حضرت مولانا مفتی جمیل احمد پسروریؒ سے رہا اور ۱۹۶۵ء میں ان کی طرف سے مجاز بھی ہوئے۔

لہ بعد میں آپ کو لیکچرر لے لیا گیا اور جامعہ اسلامیہ میں علماء کو پڑھاتے رہے، عوام کے شدید اصرار پر واپس کوہلیاں آگئے، اب تبلیغی اصلاحی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔

مولانا عبدالرزاق سکندر ہزاروی

آپ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو بروز جمعہ جناب سکندر خان بن فتح خان صاحب کے گھر کولی تحصیل ایبٹ آباد ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کر کے پھر مدرسہ رحمانیہ ہری پور ہزارہ میں حضرت مولانا خلیل الرحمن صاحب سے پڑھتے رہے۔ جب آپ کے استاذ رحمانیہ سے احمد المدارس سکندر پور ہری پور ہزارہ میں منتقل ہوئے تو آپ بھی ساتھ چلے گئے، وہاں دو سال تک پڑھتے رہے۔ ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم کراچی میں موقوف علیہ کی تکمیل کی۔ ۱۹۵۳ء میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۶ء میں علامہ سید محمد یوسف بنوری سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ ۱۹۵۷ء میں یہیں درجہ تکمیل و تخصص کی تکمیل کی۔ ۱۹۶۲ء میں یہیں سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۶ء میں چار سالہ کورس کی تکمیل کر کے سند حاصل کی۔ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے جن چار طلبہ نے امتیازی نمبر حاصل کیے تھے، ان میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ اسی دوران جامعہ اسلامیہ کی سند کی بنیاد پر آپ نے کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے عربی کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ ۱۹۶۷ء کو "المجلس الاعلیٰ لشئون الاسلامیہ" کے وظیفہ پر علامہ بنوری کی معیت میں قاہرہ پہنچا اور مارچ ۱۹۶۷ء کو باقاعدہ پی ایچ ڈی کا داخلہ قاہرہ یونیورسٹی میں لیا جس کا موضوع ہے: عبداللہ بن مسعودؓ — امام الفقہ العراق۔ ۱۹۷۲ء میں آپ نے مقالہ کو مکمل کیا، مگر نگران کے انتقال کی وجہ سے ابھی تک آپ کا فیصلہ

لہ اسی موضوع پر ڈاکٹر حنیف ندوی نے علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ کی ہے جسے بعد میں ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا ہے۔

نسیم ہدایت، مقالہ دو مسودے ملتان کے پاس ہے۔

تصانیف: طریقۃ العصریۃ لتعلیم العربیۃ، حصہ اول مطبوعہ مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی۔

۲۔ ملتِ اسلامیہ کا موقف کا عربی ترجمہ موقف الامۃ الاسلامیۃ من القادیانیۃ کے نام سے بڑے سائز پر ۲۰۰ صفحات میں کیا ہے، جسے مرکزی مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان نے شائع کیا ہے۔ تقدیم علامہ بنوری کے قلم سے ہے۔

مولانا قاضی سید عبدالمعز جیلانی

آپ ۱۰ محرم ۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۳ء کو جناب مولانا غلام قادر صاحب کے گھر کالوچ ڈاکخانہ دیر ڈی، تحصیل کبل ضلع سوات میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب اور چچاؤں سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے مدرسہ امینیہ دہلی میں ۱۳۵۵ھ کو داخلہ لیا اور ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۹ء کو حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا عبدالغفور ہزاروی مدنی سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ جامعہ طبیہ قرول باغ دہلی سے "مستند الاطباء" کا کورس مکمل کرکے سند حاصل کی۔ مختلف مدارس جامع اعظم دہلی، جامع مسجد کرنال اور مدرسہ رحمانیہ دہلی میں تدریس کرتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں جامعہ پنجاب سے مولوی فاضل، اور ۱۹۵۰ء میں منشی فاضل، ۱۹۵۱ء میں پشاور یونیورسٹی سے پشتو فاضل کیا

۱۹۵۰ء میں بطور عربی استاذ گورنمنٹ ہائی سکول نوشہرہ میں آپ کا تقرر ہوا۔ اب بھی وہیں پڑھا رہے ہیں۔ ۲۰ سال تک مسجد تقویٰ نوشہرہ میں درس قرآن دیا۔

تصانیف: ۱۔ سراج القواعد ۲۲×۱۸/۸ سائز کے ۱۰۰ صفحات مطبوعہ ۱۹۶۹ء لاہور۔

۲۔ دروس الصرف۔ ۳۔ دروس النحو۔ تینوں مطبوعہ ہیں۔

مولانا عبدالشکور طوروی

خطیب مرکزی جامع مسجد کوئٹہ

آپ ۱۸ مئی ۱۹۱۹ء کو جناب مولانا حکیم غلام رسول صاحب کے گھر طورو ضلع مردان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی، اعلیٰ تعلیم مظاہر العلوم سہارنپور میں حاصل کی۔ ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء کو دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ امتحان میں نمایاں کامیابی پر کچھ کتابیں انعام میں ملیں۔ مئی ۱۹۳۶ء میں جامعہ پنجاب سے مولوی فاضل، ۱۹۳۸ء میں منشی فاضل اور ۱۹۴۲ء میں پشتو فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ پشتو فاضل کے امتحان میں اول آئے۔ ۱۲ اپریل ۱۹۳۹ء کو اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ میں بطور عربی و اسلامیات آپ کا تقرر ہوا۔ ۱۹۴۱ء میں جامعہ پنجاب سے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۴۲ء میں میٹرک کا۔ ۱۹۴۳ء میں آپ کا مرکزی جامع مسجد کوئٹہ میں بطور خطیب تقرر ہوا۔ اب تک وہیں ہیں۔

تصانیف: ۱۔ پارہ اول مع ترجمہ و تشریح بزبان پشتو۔

۲۔ دین کی باتیں حصہ اول، دوم، سوم

۳۔ تیسری چوتھی اور پانچویں جماعت کے لئے احکام الاسلام حصہ اول، دوم و سوم منظور ہوکر شامل نصاب رہی ہیں۔

۴۔ اردو القواعد — اردو گرامر کی کتاب، کئی بار شائع ہوئی۔

قرآن مجید کی تفسیر کے چند پارے اور احکام الاسلام چہارم، پنجم و ششم غیر مطبوعہ ہیں۔

مولانا قاری محمد عارف ہزاروی

ایم اے، ایم او ایل خطیب مسجد ہاسٹل کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور

آپ ۱۹۳۶ء کو ڈھیری کیہال تحصیل ایبٹ آباد ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ قومیت کے لحاظ سے پٹھان ہیں۔ [illegible] سے لوئر مڈل کا امتحان پاس کرکے

[illegible] ۱۹۴۷ء میں حفظ قرآن [illegible] میں حافظ لیا اور اس
کے بعد [illegible] صاحب سے عربی صرف و
نحو [illegible] پھر جامعہ [illegible] میں مولانا
[illegible] صاحب فاضل دیوبند سے پڑھتے رہے۔ اسی دوران جامعہ
پنجاب سے منشی، مولوی عالم میٹرک اور فاضل عربی کے امتحانات
پاس کئے۔ فاضل عربی اور منشی کالج سے کیا۔ جب یہاں سے حضرت مولانا
محمد رسول خان صاحب جامعہ اشرفیہ منتقل ہوئے تو آپ نے
بھی وہاں داخلہ لے لیا۔ دورۂ حدیث کا سماع دو بار کیا، پھر جامعہ اشرفیہ
کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔

فراغت کے بعد جامعہ فتحیہ اچھرہ میں پانچ سال تک مختلف علوم و
فنون کی کتابیں زیر درس رہیں۔ اسی دوران انٹر اور بی۔ اے کے امتحانات
پاس کئے۔

۱۹۶۲ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں بطور امام و
خطیب آپ کا تقرر ہوا۔ ہاسٹل کی اس مسجد میں درس قرآن کا آغاز کیا جو
اب تک جاری ہے۔

اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں باقاعدہ داخلہ لے کر ایم اے
عربی کا امتحان ۱۹۶۶ء میں، ایم اے اسلامیات ۱۹۶۷ء میں، ایم اے
اردو ۱۹۶۹ء میں ایم۔ اے فارسی ۱۹۷۰ء میں پاس کئے، ۱۹۷۳ء میں
یونیورسٹی نے ایم، او، ایل کی ڈگری عطا کی۔ روایت حفصؒ کا نصاب قاری
محمد شاکر القدر، قاری عطاء اللہ اور قاری عبدالرحمٰن ڈیروی صاحبان سے
مکمل کیا۔

اولاً علم طب کی تحصیل حضرت مولانا حکیم عبدالحکیم صاحب فاضل
دیوبند سے کی۔ پھر باقاعدہ طبیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اب "فاضل
الطب والجراحۃ" کے آخری سال میں ہیں۔

آپ ایک اچھے خطیب اور اچھے مصنف ہیں۔ راقم کے بڑے
بھائی ہیں۔

تصانیف: ۱۔ الهمزیۃ النبویۃ — مصر کے قومی شاعر احمد شوقی
کے نعتیہ قصیدہ کا اردو ترجمہ و تشریح میں راقم کے ساتھ ان کا تعاون ہے
۲۔ قصائد حسانؓ: شاعر رسول حضرت حسانؓ کی زندگی اور
شاعری اور ان پانچ قصیدوں کا اردو ترجمہ و تشریح جو ایم۔ اے عربی پنجاب
یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہیں۔
۳۔ اربعین نووی: ترجمہ و تشریح مع مقدمہ تدوین حدیث حجیت
حدیث، ۲۸۰ صفحات مجلد۔
۴۔ جواہر الحدیث: برائے انٹرمیڈیٹ ۴۰ حدیثوں کا اردو ترجمہ و
تشریح۔ پاکستان بک سینٹر اردو بازار لاہور۔
۵۔ فلسفہ اسلامی عقائد و عبادات: بڑی عجیب کتاب ہے۔
۶۔ قدوری (کتاب الصلوٰۃ) ترجمہ و تشریح۔
۷۔ سورۃ البقرہ ترجمہ و تشریح زیر طبع

مولانا حافظ محمد حسن جان مدنی پشاوری

آپ مولانا علی اکبر جان صاحب قریشی کے گھر یکم ذوالقعدہ
۱۳۵۳ھ / ۷ جنوری ۱۹۳۵ء بمقام پڑانگ "محلہ میاں کلے" تحصیل چارسدہ
ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم اپنے گھر اور علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ اعلیٰ
تعلیم کے لئے جامعہ اشرفیہ لاہور میں داخلہ لیا اور ۱۳۷۸ھ میں حضرت مولانا محمد
رسول خان ہزارویؒ اور مولانا حافظ محمد ادریس کاندھلویؒ سے دورۂ حدیث
پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔ جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک سے فاضل
دینیات کا امتحان پاس کیا۔ پشاور یونیورسٹی سے مولوی عالم اور فاضل کے
امتحانات تمام امیدواروں میں اول آکر اور منشی فاضل کا دوم آکر پاس کئے
۷ محرم ۱۳۸۲ھ / ۱۱ جون ۱۹۶۲ء کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

میں سعودی حکومت کے وظیفہ پر قسم عالی میں داخلہ لیا۔ جامعہ کے امتحان میں دوم آتے رہے۔ اور چوتھے سال کے آخری امتحان — اعتبار الشہادۃ النہائیۃ العالمیۃ میں ۱۰۰ نمبر میں سے ۹۱ نمبر حاصل کرکے پوری یونیورسٹی میں اول آئے اور آخری ڈگری (الیسانس) امتیاز بمرتبۃ الشرف الاولیٰ حاصل کی۔ مدینہ منورہ کے عرصہ قیام میں الشیخ عبدالفتاح القاری اور الشیخ محمود البخاری سے ۱۳۸۱ھ میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اگست ۱۹۶۲ء کو واپس آئے۔

دارالعلوم نعمانیہ اتمان زئی چارسدہ پشاور میں بطور صدر مدرس آپ کا تقرر ہوا اور ۱۳۹۲ھ تک پڑھاتے رہے۔

۱۳۹۲ھ میں دارالعلوم عربیہ ٹل کوہاٹ میں شیخ الحدیث ہوکر چلے گئے۔ اب بھی وہیں ہیں۔ دوران تدریس پرائیویٹ طور پر ۱۹۷۱ء میں ایم اے اسلامیات کا امتحان پشاور یونیورسٹی سے دیا اور ۸۰۰ میں سے ۶۶۱ نمبر حاصل کرکے یونیورسٹی میں اول آئے۔ طلائی تمغہ کے ساتھ صلاتی انعام بھی حاصل کیا۔

آپ کے کئی مقالات المجتمع اللبنانی رسالے میں شائع ہوئے۔

تصانیف: ۱۔ النظم الاقتصادیۃ فی الدولۃ الاسلامیۃ

۲۔ احسن الخبر فی مبادی علم الاثر

۳۔ مقدمہ فی علوم القرآن

(زیور طباعت سے آراستہ ہونے والی ہیں)

مولانا محمد زمان جیلون

آپ ۱۹۰۶ء کو ڈھیری کیال تحصیل ایبٹ آباد ہزارہ میں جناب فیض اللہ خان صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ پیدائشی نام کرم خان ہے مگر محمد زمان کے نام سے شہرت پائی۔ نسباً پٹھان (جدون) ہیں۔ دورۂ حدیث حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے مظاہر العلوم سہارنپور میں پڑھا۔

علم طب کی تحصیل و تکمیل مولانا حکیم ... سے کی۔ بیعت کا تعلق حضرت مولانا ... شریف سے ہے۔

ایک عرصہ تک جامع ... بلوچستان میں خطیب رہے ہیں۔

تصانیف: ۱۔ گلدستہ وعظ (کافی ضخیم اور معلوماتی مسودہ ہے)

۲۔ کتاب روحانی عملیات

۳۔ طبی مجربات، آپ کی قلمی تصانیف ہیں۔

مولانا عبدالدیان کلیم

آپ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو جناب شجاعت خان صاحب کے گھر میٹھا خیل اکوڑہ کلاں ضلع پشاور میں پیدا ہوئے۔

۱۹۵۳ء میں جامعہ اشرفیہ لاہور میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ امتحان میں دوسری پوزیشن حاصل کرکے انعام حاصل کیا۔

۱۹۵۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور پھر منشی فاضل .... اور میٹرک کے امتحانات پاس کئے۔ آجکل آپ اسلامیہ کالجئیٹ سکول پشاور یونیورسٹی میں اسسٹنٹ ٹیچر ہیں۔ آپ ہی کی کوشش سے دارالعلوم دیوبند کی سند ایم۔ اے کے برابر قرار دی گئی ہے۔ آپ کی تصانیف میں تدریس اردو گرامر، صفحات ۱۲۸ ہے۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب بالاکوٹی ہزاروی

آپ ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء کو بالاکوٹ، تحصیل مانسہرہ ہزارہ میں قاضی محمد اسماعیل صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ دورۂ حدیث مدرسہ امینیہ دہلی میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سے پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔

۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۳ء مدرسہ رحمانیہ اہل حدیث میں پڑھاتے رہے۔ اسی دوران آپ نے علم طب کی تحصیل کی۔ پھر مدرسہ ضیاء الاسلام کراچی، حبیب اللہ، مانسہرہ ہزارہ میں پڑھاتے رہے۔ ماہ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے دارالعلوم محمدیہ [illegible] بالاکوٹ کی بانی مہتمم [illegible] ہے۔ تدریس پر مامور ہیں۔ علاقہ کے اکثر علماء آپ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

تصانیف: علامہ [illegible] کی شہرۂ آفاق کتاب [illegible] پر آپ نے حواشی لکھے جو شیخ محمد نذیر تاجر کتب مانسہرہ نے شائع کی تھی۔

مولانا عبدالرؤف صاحب ہزاروی

آپ ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء کو نمبریاں تحصیل ہری پور ہزارہ میں .... مولانا عبدالکریم صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ میں حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۳ھ میں امام العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔ فراغت کے بعد مختلف دینی اداروں میں آج تک اعلیٰ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

آپ کی تصانیف میں ایک فضل الباری فی فقہ البخاری ہے جو چار ضخیم جلدوں میں ہے یہ طباعت کی منزل سے گذر رہی ہے۔

مولانا غلام غوث ہزاروی

آپ محرم ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء کو بفہ تحصیل مانسہرہ، ہزارہ میں حکیم سید گل صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۵ء میں امام العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔ امتحان میں مولانا محمد اسحاق کانپوری اول اور آپ دوم آئے تھے۔

آپ کی تصانیف میں (۱) ایمان (۲) کانگریس ایمان (۳) سیرۃ النبی ﷺ (۴) مجاہدانہ تقریریں (۵) اور جواب لغز نامہ سکندر [illegible] کاغذ ہیں۔ صفحات ۲۰۰، سب مطبوعہ ہیں۔

آپ اس سے قبل صوبائی اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں۔ آج کل قومی اسمبلی کے ممبر ہیں۔ الجمعیۃ راولپنڈی کے مدیر اعلیٰ ہیں۔

مولانا عبدالقادر حامی ہزاروی

آپ نمبر [illegible] کندی، تحصیل ہری پور، ہزارہ میں سید احمد [illegible] (۱۹۰۵ء) بن شرف دین کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد صاحب اور علاقہ کے علماء سے حاصل کی۔ پھر ۱۹۲۸ء میں امرتسر میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی خدمت میں رہ کر ان سے تفسیر پڑھ کر سند التفسیر حاصل کی۔

مختلف مدارس میں تدریس کی، آج کل اپنے گاؤں میں امام ہیں۔ شاعرانہ ذوق بھی رکھتے ہیں۔

تصانیف: "تفسیر جامع البیان فی تفسیر ام القرآن" بڑے سائز کے ۱۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جن میں ۱۲۶ صفحات تو سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے اور باقی مع بیت اللہ کے اسرار پر ہے۔ اس کتاب پر حضرت مولانا محمد رسول خان، حضرت مولانا احمد علی اور عبداللہ [illegible] کی تقاریظ ہیں۔ ۱۳۵۸ھ میں یہ لاہور سے شائع ہوئی۔

۲۔ عمدۃ الفکر فی تفسیر سورۃ العصر اس کے ۴۴ صفحات ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں امرتسر سے شائع ہوئی۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب مردانی

دارالتصنیف رستم، مردان

آپ مولانا محمد الحسن صاحب کے گھر جمادی ۱۳۲۸ھ کو تربان [illegible] شیر بہادر خان علاقہ سدوم میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم اپنے ماموں محمود الحسن صاحب فاضل مظاہر العلوم سہارنپور سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے سنہ ۱۹۱۶ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھ کر سنہ ۱۹۲۲ء میں علامہ سید محمد انور شاہؒ سے دورہ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔

سنہ ۱۹۲۶ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کر کے مردان کے ایک قومی سکول میں مدرس ہو گئے۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور گورنمنٹ ہائی سکولوں میں مدرس عربی کے طور پر تدریس کرتے رہے۔

ساتھ ہی جمعہ کی تقریر اور درس قرآن کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

سنہ ۱۹۴۱ء میں صوبہ سرحد کے مدرسین کے صدر منتخب ہوئے۔

سنہ ۱۹۴۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ قیام پاکستان کی تحریک میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ ۱۴ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو تھانہ ردستم پر پاکستانی جھنڈا آپ کے ہاتھوں سے لگایا گیا۔

سنہ ۱۹۴۴ء میں بستی نظام الدین جانا ہوا، وہاں سے تبلیغی جماعت کے ساتھ تعلق قائم ہوا اور سنہ ۱۹۵۵ء میں چھ ماہ کے لئے عرب گئے اور تبلیغی کام کرتے رہے۔

تصانیف: ۱۔ تفسیر حبیبی مکمل (پشتو) دراصل تفسیر مناز (عربی) کا ترجمہ ہے۔ (الگ الگ پاروں میں) مطبوعہ

۲۔ تشریح بخاری (پشتو) ″ ″ ″ ″ ″

۳۔ تبلیغی نصاب (پشتو) مکمل، ۴۔ تحفہ حج۔ ان کے علاوہ سیر صحابہ، بنات الرسولؐ، امہات المومنین، مہاجرین، انصار وغیرہ زیر طبع ہیں۔

جذبات حبیب
بدیار حبیب ﷺ

فاضل رشیدی

میں آج دیارِ پاک میں ہوں	دامانِ شہِ لولاک میں ہوں
سرخم ہے مقدر سے اس جا	بیٹھے تھے جہاں محبوبِ خدا
اے شاہ تیرا اک ادنیٰ گدا	ہے فرقت کا تڑپایا ہوا
بے حد عاصی، اشرار ملا ہوا	کل دنیا کا ٹھکرایا ہوا
ہے بوجھ گناہوں کا سر پہ	آتے ہی گرا تیرے در پہ
دنیا میں حسن وفا دے دے	آخر میں اپنی رضا دے دے
بیکس ہوں، غم کا مارا ہوں	میں عاجز ہوں بے چارہ ہوں
اعمال سے دامن خالی ہے	یہ حال ہے یہ بدحالی ہے
میں اشکِ ندامت لایا ہوں	امیدِ شفاعت لایا ہوں
بیٹھا ہوں، تصور عرش پہ ہے	ایسا ہے کہ عرش اس فرش پہ ہے
جذبات مرے سرشار ہوئے	احساس حسین بیدار ہوئے
جنت کی فضائیں پاس مرے	مدینے کی ہوائیں پاس مرے
یہ باغِ ارم کا ہے نقشہ	یہ گنبدِ خضرا کا جلوہ
جلووں میں طور کا عالم ہے	اک نور میں نور کا عالم ہے
مسرور ہے دل، آباد ہے دل	سرمست فضا ہے شاد ہے دل
دل رنج و محن کو بھول گیا	میں یادِ وطن کو بھول گیا
یہ قربِ محمد کی عظمت	اللہ کی بندے سے یہ رحمت

یہ کون ہیں میرے پیشِ نظر
اے وقت ذرا آہستہ گذر

فرمودہ حضرت مدنیؒ

محبوب حقیقی ہر چیز کو جانتا ہے، ہر چیز کو دیکھتا ہے، ہر چیز کو سنتا ہے۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ وہ شدید الغیرت ہے۔ اس کے سامنے بجز خشوع و خضوع اور راز ہائے عبدیت کے اخفا اور اظہار محبوبیت کا اور اتباع سید العشاق (علیہ السلام) کوئی چیز کارآمد نہیں ہے۔ (مجموعہ مکاتیب صفحہ ۲۵)

مسئلۂ تکفیر

— اور —

اکابرِ دارالعلوم

(علامہ خالد محمود ۔ ایم اے ۔ پی ایچ ڈی (مانچسٹر))

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی والعاقبۃ خیر لاہل التقویٰ۔ اما بعد
بیسویں صدی کے افسوسناک واقعات میں تکفیر بین المسلمین کی سازش بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ تکفیر مسلم کی تحریک نے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر گہرے اثرات ڈالے اور اسلام کی کشتی وقت کے ہر موڑ پر اس کے ہچکولوں سے ہمکنار ہوئی۔ معلوم نہیں مسلم مفادات کی کتنی لاشیں اس کے نیچے دفن ہو گئیں۔ افسوس کہ تکفیر مسلمین کی یہ تحریک ابھی تک جاری ہے اور مسلمانوں کا ایک طبقہ دوسروں پر بے دریغ کفر کے گولے برسا رہا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے بجا شکایت کی تھی ؎

مشغلہ اُن کا ہے تکفیرِ مسلمانانِ ہند
ہے وہ کافر جس کو ہو ان سے ذرا بھی اختلاف

جو لوگ علمائے دین سے دور تھے انہیں اچھا خاصا بہانہ مل گیا۔ وہ دین کی ہر دعوت پر ہنسنے لگے۔ کس کی بات مانیں اور کس کی نہ مانیں۔ قرآن و حدیث کا نام ہر فریق لے رہا ہے ؎

کس کا یقین کیجیے کس کا یقین نہ کیجیے
لائے ہیں بزمِ یار سے لوگ خبر الگ الگ

دونوں کی بات مان لی جائے تو باقی کون بچا اور پھر لائحہ عمل کیا رہا؟ حق کے پرستار تو یہاں بھی کوئی راہ نکال لیں گے لیکن جن کے ذہن کی پرواز اتنی اونچی نہیں ان کا دل دین کے درد میں وہ کروٹ نہیں رکھتا جو اس وقت کی اہم ضرورت تھی۔ وہ لوگ کنارے کھڑے کفر کی اس گولہ باری کا نظارہ کر رہے ہیں اور جس نے سب سے پہلے یہ تکفیر جاری کی تھی دن رات اس کے بارِ گناہ میں اضافہ ہو رہا ہے ؎

اے موجِ بلا ذرا ان کو بھی دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

ہو سکتا ہے کہ تکفیر بین المسلمین سے زخمی دل کچھ اس طرح بھی سوچتے ہوں کہ شاید ہر مدرسہ اور دارالعلوم اس میں برابر کا شریک ہے۔ یہ ہرگز صحیح نہیں۔ یہ صرف انہی لوگوں کا خیال ہو سکتا ہے جو ان مدارس علمیہ کے قریب سے واقف نہیں اور انہیں ان مراکز دینیہ کے بزرگوں کی مجلس میں بیٹھنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔

مسلمانوں پر ایک ایسا وقت آگیا ہے کہ وہ دینی اور علمی مراکز جہاں واقعی رشد و یقین کے چشمے پھوٹتے رہے اور صبر و رضا و سکون و للّٰہیت کی دولت پاتا رہا وہ بھی اس بدنامی کی زد میں آنے لگے ہیں اور کئی لوگوں کو غلط فہمی ہونے لگی کہ شاید یہاں بھی تکفیر بین المسلمین کی کوئی مشین چل رہی ہو۔ ان حالات میں عزیزم مولانا عبدالرشید ارشد کی خواہش ہوئی کہ علمائے دیوبند کا موقف اس سلسلے میں واضح کر دیا جائے

راقم الحروف ملک سے دور ایسی جگہ مقیم ہے جہاں وہ کتابیں اور
تحریرات موجود نہیں جن میں موضوع زیرِ عنوان کی جزئیات مل سکتی ہیں، ان تحریرات
اور اکابر کے ارشادات کے جو نقوش ذہن میں باقی ہیں ان کے ساتھ اس اہم موضوع
سے عہدہ برآ ہونا یہ بھی ممکن نہیں تاہم تعمیلِ ارشاد اور حصولِ ثواب کے لیے کچھ باتیں
پیشِ خدمت ہیں۔ واللہ المستعان — بہتر اس کے کہ زیرِ بحث عنوان پر براہِ راست کچھ
کہا جائے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اکابرِ دارالعلوم کے اصل عمل پر کچھ تبصرہ ہو جائے۔
اس سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آنے لگے گی کہ جس دارالعلوم کی اساس علوم و فنون کی ترویج و
اشاعت اور اسلام کی عملاً دعوت دینے پر ہو جس کے اکابر مسلمانوں کو تزکیہ دل کی صفائی اور
غیر مسلموں کو اسلام کا سکون بخشنے کے لیے دن رات کوشاں ہوں وہ مسلمانوں کو کافر
بنانے کے لیے کیسے آمادہ ہوں گے، غور کیجیے اور ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ ان
بزرگوں کا مزاج عمل تکفیر بین المسلمین جیسے ملت کش عمل سے کیسے لگا کھا سکتا ہے۔

اکابرِ دارالعلوم کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ یہ بزرگ مسلمانوں کو
کافر بنانے کے لیے نہیں کافروں کو اسلام میں لانے کی علمی، فکری اور عملی
جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ تکفیرِ مسلمین کا مشغلہ اساسی طور پر ان کے فکر و عمل سے
ٹکراتا ہے۔ دارالعلوم کے شاندار ماضی اس کی عالمی شہرت کی تصنیفات اس کی
خداداد ترقیات اور اس کے اکابر کی تزکیہ پسند سیرت پر نظر رکھیے ان کے ارشادات
و مواعظ کا تجزیہ کیجیے اور پھر کہیے کہ دارالعلوم اسلام کا مرکز رہا ہے یا تکفیر کا؟ اس
نے غلط فہمی کا شکار ہونے والوں کو اصلاح کی دعوت دی یا ان سے ایک فرقے
کے طور پر تفریق قائم کی؟ اپنے حلقۂ ارشاد میں ان سے امتیازات قائم کیے۔ یا
سب کو ایک ہی شجرِ ہدایت کے نیچے آنے کی تلقین کی؟ بھائیوں کو گلے لگانے
کے لیے آگے بڑھے یا اپنے سے اختلاف کرنے والوں پر کفر کے گولے برسائے؟
یقین کیجیے دارالعلوم کی تاریخ لکھنے والا مورخ اس باب میں اکابرِ دارالعلوم کو
آفرین کہے بغیر آگے نہ جا سکے گا۔

دارالعلوم کا اپنے اسلاف سے رشتہ

پچھلے دور میں مسلمانوں کے دینی مراکز، تحریکِ اسلام اور تعلیمِ شریعت
کے گہوارے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمیعہ
رشد و ہدایت کے روشن ستارے اور ساری امت کے لیے قابلِ تقلید رہے
تھے۔ ان کے بعد تابعین کرام اور مجتہدین عظام نے مسندِ علم کو سنبھالا۔ امام مالک
حجاز میں، امام ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ عراق میں، امام اوزاعیؒ شام میں اور امام مالکؒ
کے تلامذہ مغرب میں قرآنی علوم اور فقہ و حدیث کا سرچشمہ تھے انہی مراکز علمی
سے پورے عالم میں اسلام کی ضیا پاشیاں تھیں۔

سقوطِ بغداد میں جہاں مسلمانوں کی سیاسی شوکت چھنی۔ اقتدارِ دینی مرکز
بھی پامال ہوئے، ایوانِ کتب خانے برباد ہوئے، بغداد کی نظامیہ یونیورسٹی
جہاں کبھی امام الحرمینؒ اور امام غزالیؒ درس دیتے تھے تاراج ہوئی۔ علوم و فنون
کے موتی کچھ دریا برد ہوئے اور کچھ یورپ کی یونیورسٹیوں کی زینت بنے بس
المیہ پر اقبال کی آہ بڑی دردناک ہے ؎

کہاں وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

عالمِ اسلام میں صرف مصر کی شوکتِ علمی باقی تھی اور ازہر یونیورسٹی کے حوض
تشنگانِ علوم کو سیراب کرتے تھے، یہیں علوم و فنون کا مرکز تھا اور یہیں قرآن و
حدیث کی سند تھی، اس سے انکار نہیں کہ اسلام کی دوسری عظیم شخصیتیں بھی اقطارِ
ارض اور اکنافِ عالم میں اپنی اپنی جگہ علم و فن کی خدمت کر رہی تھیں لیکن یہ حضرات
خود علم و عرفان کا مرکز تھے، ازہر جیسے کسی مرکزی نظام سے وابستہ نہ تھے مصر
کی روشنی عہدِ اسلام سے پہلے بھی علم و فن میں معروف تھی، اسلام کے بعد یہ سرزمین
اسلامی علوم و فنون کا مرکز بن گئی۔ حالی مرحوم نے ایک تذکرہ میں کہا تھا ؎

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی
نہ یونان کے علم و فن کی خبر تھی

جب مسلمان بیدار تھے یورپ تاریخ کی تاریکیوں میں سویا تھا۔ جب
یورپ بیدار ہوا تو اس نے علم و فن کے ہتھیاروں سے نہیں، سیاست کی
شاطرانہ چالوں سے مسلمانوں سے شوکت چھینی۔ یورپ کا مردِ بیمار آخر دم تک

اسلام کی مرکزیت کے بعد شاہ اسماعیل شہید و ولی عہد شیخ اکمل ستاروں کی تابانی ماند تھی۔ وہ قلبی احساس زبان نہیں، روشن مستقبل کی امید تھی۔ اقبال مرحوم بجا کہہ گئے ہے

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

ہندوستان سے جب مسلمانوں کی شوکت چھن چکی تو ملک بعض دساور حکیم مطلق نے سیاسی انقلاب کے ہنگامی کشمکشات میں کچھ علوم و فنون کے مربی تیار کیے تھے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ مع اپنی اولاد و احفاد کے اسلامی تہذیب کو بچانے کے لیے لگے ہوئے تھے اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ پہلے مرد ہیں جنہوں نے انگریز ہندوستان کو دارالحرب کہا تھا

اس مرکزِ علمی کے سامنے دو منزلیں تھیں۔ مسلمانوں کی چھنی شوکت کیسے واپس لی جائے اور سیاسی تنزل کے دور میں مسلمانوں کی گرتی دیوار کو کس طرح سہارا دیا جائے۔ پہلی منزل تک پہنچنے کے لیے شاہ صاحب نے معاشی انقلاب، ہنی کل انحلال، اور مساوات سے انتساب کا فلسفہ پیش کیا اور قوم کو جہاد اور فک کل نظام (یعنی نظام باطل کے توڑنے) کی راہ دکھائی۔ ان تین لائنوں پر حجۃ اللہ البالغہ، ہمعات اور سطعات اور ازالۃ الخفاء جیسی بلند پایہ کتابیں لکھیں۔ ان کے پوتے شاہ اسمٰعیل محدث دہلوی، حضرت شاہ سید احمد بریلویؒ کے ساتھ عملاً جہاد میں نکلے۔

دوسری منزل تک پہنچنے کے لیے ان محدثینِ دہلی نے قرآن و حدیث کے درس اور اسلامی علوم و فنون کی تعلیم و اشاعت سے مسلمانوں کی گرتی دیوار کو سہارا دیا۔ جب شاہ اسمٰعیل میدانِ جہاد میں سرکف تھے، شاہ محمد اسحٰق دہلی کی مسندِ حدیث پر قال اللہ اور قال الرسول کا درس دے رہے تھے۔ محدثینِ دہلی نے ظلمت کدہ ہند میں مسلمانوں کو مسلمان رکھنے اور ان کے ذہن و فکر کو غیر اسلامی تہذیب سے بچانے کے لیے علم و عمل کے چراغ روشن کیے۔ تربیتِ اخلاق کے پھول چنے، جہاد تک کے فیصلے کیے اور خونِ شہادت میں غسل کر سکے۔ ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن   خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

دارالعلوم دیوبند کے بانی اسی علم و فکر کے وارث اور محدثینِ دہلی کے اسی خاندان سے وابستہ تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں اہل السنت والجماعت کا مرکز یہی حضرات تھے اور آج بھی علم و عمل کے چراغ اور سلوک و تربیت کی شمعیں انہی حضرات کے رسوخ و خلوص سے روشن ہیں۔ یہ مدرسہ اپنے منظر سند و تقی شہادت کے پیش ملتِ اسلامیہ کی خیر و نصرت میں مصروف اور تفریق بین المسلمین سے کوسوں دور ہے۔

علم کا مرکز ولی اللہ محدث دہلویؒ
ان کے بیٹے چار علم و عمل کے ہیں تاجدار

ساقی دہلی کے مستوں نے ارضِ دیوبند
جب رکھی بنیاد مے خانہ بطرزِ یادگار

دور دورہ مے خانے صہبائے طیبہ کا ہوا
جرعہ رشادِ ازل آنے لگا قطار اندر قطار

اکابرِ دیوبند کے سامنے وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ مسلمانوں کو غیر مسلم ہونے سے بچایا جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ہر اس محاذ کو بچایا جہاں سے مسلمانوں پر فکری اور عملی یلغار ہو سکتی تھی اور پھر اپنی بساط کے مطابق ہر محاذ پر روک تھام کے بند باندھے اور ہر محاذ پر پوری طرح دفاع کیا۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔

ہندوستان میں اسلام کے خلاف فکری محاذ

پہلا محاذ: انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں اقتدار ہندو اکثریت کے باوجود مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ مسلمان زیادہ تر وہی تھے جو پہلے ہندو رہے تھے اور اسلام کی توحید کی دعوت میں فطری کشش تھی۔ انگریزی سیاست نے ہندوؤں کو اس طرف لگا دیا کہ تمہاری قوم کٹ رہی ہے اسے بچاؤ اور مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنانے کے لیے کام کرو۔ سناتن دھرم کے دائرہ میں یہ کام مشکل تھا۔ ہندوؤں نے اپنے مذہب میں تجدید کی اور آریہ سماج کو ترتیب دیا۔ اس محاذ پر آریہ سماج سے علمی اور فکری جنگ ناگزیر تھی۔ اکابر دیوبند نے تحریر، تقریر، مناظرہ اور روحانی اثر و نفوذ سے اس سیلاب کے آگے پوری قوت سے بند باندھے۔ ہندوؤں نے شدھی اور سنگھٹن جیسی تحریکیں بھی چلائیں مگر خدا کا فضل ہے کہ مسلمان بڑے

مستقل سے اپنے عقائد پر ثابت قدم رہے۔

دوسرا محاذ: انگریزی عملداری میں عیسائی مشنری اس نظم سے داخل ہوئے کہ وہ ایک فاتح قوم ہیں، مفتوح قومیں فاتح قوم کے تہذیب و اثرات کو آسانی سے قبول کر لیتی ہیں۔ انھوں نے پہلے کوشش کی کہ مسلمانوں کے دل و دماغ سے اسلام کے تہذیبی اثرات ختم یا کمزور کر دیے جائیں اور پھر آہستہ آہستہ انھیں اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔ اگر وہ عیسائی نہ بن سکیں تو کم از کم یہ ہو کہ وہ مسلمان بھی نہ رہیں۔ اس محاذ پر اکابر دیوبند نے عیسائی مشنریوں اور مسیحی مستشرقین سے پوری علمی قوت سے ٹکر لی۔ علم و استدلال سے ان کے حملے پسپا کیے، عیسائی تہذیب پر کھلی تنقید کی، اسلام کا ہر طرف سے دفاع کیا اور جدید مذہبی تصورات کی پوری حوصلہ شکنی کی۔

تیسرا محاذ: انگریزی مدارس کے سہارے عربی مدارس کو کمزور کیا جانے لگا۔ عربی مدارس کے لیے دنیوی ترقی کی تمام راہیں بند کر دی گئیں۔ اس محاذ پر ضروری تھا کہ قرآن و حدیث کی صحیح تعلیم اور اسلام کے آبرو مندانہ احوال کیلیے عربی مدارس کو پوری قوت اور قربانی سے باقی رکھا جائے اور مدارس قائم کیے جائیں اور کوئی بات اسلام کے نام پر اسلام میں گھسنے نہ دی جاسکے۔ جدید عصری نظریات سلف صالحین کے اسلام کو کمزور نہ کر سکیں اور اسلام کے چشمہ صافی کو شرک و بدعت کی آلائش سے بچایا جاسکے۔ اکابر دیوبند نے اس محاذ پر پوری ذمہ داری ادا کی اور اسلام کو اس کی اصل شکل و صورت میں باقی رکھا، اسے کسی طرف سے گدلا نہ ہونے دیا۔

چوتھا محاذ: جو مسلمان دینی تعلیم کے لیے باقاعدہ عربی مدارس سے مستفید نہ ہو سکتے تھے، انھیں اپنے اسلاف سے بیگانہ کرنے کی سازش کی گئی، کوشش کی گئی کہ ان کے دینی ذوق کو بگاڑ دیا جائے اور وہ اسلام کے اس ذوقِ متوارث سے محروم ہو جائیں جس کے سہارے دنیوی تعلیم رکھنے والے تمام مسلمان صحیح مسلمان رہ سکتے تھے۔ اس کام کے لیے حکام نے اپنے انگریزی مدارس میں دینی تعلیم کے لیے نئے نقشے داخل کیے۔

اس محاذ پر لادینی نظریاتِ حیات اور دین سے غافل کر دینے والے فلسفیات سے جنگ ناگزیر تھی۔ اکابر دیوبند نے اپنے علمی اور فکری سرمایہ سے اس طبقہ میں بھی اسلام کی اپنی حفاظت کی

پانچواں محاذ: ہندوستان میں [illegible] طرح ترتیب دیے گئی کہ دور دراز آبادیوں کے [illegible] رہ جائیں اور ان کی اولادوں کو ہندو بنانا آسان ہو جائے [illegible] لوگ ان کی بات بھی نہ سن سکیں اور خود انھیں [illegible] کی رغبت نہ رہے انھیں ہندو تہذیب میں [illegible] ہندو اکثریت میں ضم ہوتے جائیں۔ اس محاذ پر اپنے تبلیغی [illegible] کہ مسلمان جماعتیں دور دراز کی آبادیوں میں پہنچیں۔ یہ جماعتیں صرف علما کی نہ ہوں، عام مسلمان بھی ان میں شامل ہوں اور یہ لوگ ان مسلمانوں کو اپنے ساتھ لا کر اس دینی محنت پر لا سکیں جس کے لیے وہ خود نکلے تھے اور اس طرح ان دور دراز کی آبادیوں میں بھی اسلام کی آواز پہنچتی رہے اور جماعتیں گشت کرتی رہیں۔

پہلے اور دوسرے محاذ پر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے آریوں و عیسائیوں کا پوری قوت اور کامیابی سے مقابلہ کیا اور سامنے آنے والے ہر شخص اور ہر [illegible] کو شکست پر شکست دی۔ ان کے متوسلین میں کتابیں لکھیں اور مسلمانوں کو اس وقت ہر طرح کے علمی ہتھیاروں سے مسلح کیا۔ تیسرے محاذ پر قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ نے کام کیا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے جدید عصری نظریات سے اسلام کے تحفظ کا پہرہ دیا اور وہ شاگرد تیار کیے جو اپنے اپنے حلقہ میں علم و عرفان کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ چوتھے محاذ پر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے مواعظ اور ارشادات سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں سلف سے وابستگی کی نئی روح پھونکی، راسخ العقیدہ مسلمان انھیں بنانے میں عجیب ربانی خدمات سرانجام دیں۔ پانچویں محاذ پر حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ کے شاگرد حضرت مولانا محمد الیاس میدان میں نکلے اور لاکھوں مسلمانوں کو ارتداد کی آغوش میں جانے سے بچا لیا۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔

جو جماعت ان پانچ محاذوں پر اسلام کے خلاف چلنے والی ہر تحریک سے ٹکر لے رہی ہو اس سے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ خود مسلمانوں کے خلاف تکفیری مہم چلا دے اور ملت اسلامی کو دو حصوں میں تقسیم کر دے۔ مسلمانوں کو آپس

میں شاذ و نادر تکفیر بھی پہلیوں کی مہم چلانا انہیں افراد اور جماعتوں کا کام ہے جن کے سامنے کوئی تعمیری کام نہ ہو۔ جن کی غیر مسلم تحریکات پر نظر ہو جو اکابر فرنگ کے اسلام کا سکون غارت کرنا چاہتے ہیں، وہ مسلمانوں کے رشتۂ اتحاد کو کیا تار تار دیکھنا چاہیں گے۔ یہاں سے یہ کہ جتنے ہو کہ مسلمانوں کے ہی ایک طبقہ پر جاتی کفر کا حکم لگائیں اور مسلمانوں کو ہی غیر مسلموں کی صف میں کھڑا کریں۔ اس سے زیادہ ملت کش حرکت اور کیا ہوگی؟ ؎

اُمت کو مار ڈالا کافر بنا بنا کر
اسلام ہے شریعے ممنوں بہت تمہارا

اس تفصیل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دارالعلوم کے بزرگوں کا مزاج مسلمانوں کی تعمیر کا داعی رہا ہے۔ تخریب کا نہیں اتحاد کا رہا ہے تفریق کا نہیں ان کا طریق کار دائرہ اسلام کو وسعت دینا تھا۔ مسلمانوں کی تکفیر نہیں اور ان کا موضوع علم و دانش کو فروغ دینا تھا۔ محض تشدد نہیں علم و عمل کے ان دیوانوں میں تکفیر مسلم کا مشغلہ کسی حد راہ نہیں پا سکتا۔ یہاں صہبائے مدینہ کے جرعہ کش اپنی اپنی بساط کے مطابق سیراب ہوتے رہے۔

دور دورہ ساغر صہبائے طیبہ کا ہوا
جرعہ نوشان ازل آئے قطار اندر قطار
قاسم و محمود و انور نے لنڈھائے خم کے خم
اپنی وسعت کے مطابق پی گیا ہر بادہ خوار
چشمہ جاری تھا رشید و اشرف و شبیر کا
پھر حسین احمد کی مسند سلف کی تھی یادگار

احقاقِ حق اور اصلاح علمی

تکفیر سے کنارہ کشی کا یہ مقصد نہیں کہ غلط کو غلط نہ کہا جائے۔ تعلیم و تحقیق کی راہ میں جو غلطی راہ پائے اس کی نشاندہی اور اصلاح لازمی ہے۔ علم کا مقصد طالب علم کو خلاق اکمل سے ملانا ہے۔ علماء دیوبند نے ایسے تمام مواقع پر غلط کو غلط کہا اور اپنی ہمت کے مطابق اس غلطی کی پوری نشاندہی کی لیکن ان کا طریق اصلاح اور غلطیوں کا ازالہ رہا ہے۔ محاذ آرائی نہیں۔ کتاب و سنت کی صحیح ترجمانی تھی کسی طبقے کی تکفیر نہیں۔

حضرات کے دور میں سرسید احمد خان کی بعض تعلیمات مسلک اہل السنت والجماعت کے خلاف تھیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اس پر سرسید احمد خان سے خط و کتابت کی اور افہام و تفہیم کی پوری کوشش کی۔ یہ تحریرات تصفیۃ العقائد کے نام سے چھپ چکی ہیں۔

کتاب و سنت کی صحیح مرادات معلوم کرنے اور ان کی تدریس و اشاعت میں بزرگان دیوبند خدا کے فضل سے اپنی ذمہ داریوں سے پورے باخبر رہے ہیں اور انہیں پوری فکر سے ادا کرتے رہے ہیں۔ غلط تعبیر اور فاسد تشریح کے ہر موڑ پر ان بزرگوں نے بروقت نوٹس لیا ہے لیکن کسی طبقے کے خلاف تکفیر کی کوئی مہم نہیں چلائی۔

ندوہ سے اختلاف

اکابر دیوبند اور مولانا شبلی نعمانی کا کئی باتوں میں شدید اختلاف تھا۔ بزرگان دیوبند مسلک اہل السنت والجماعت کے پوری طرح پابند تھے اور مولانا شبلی کی فکر بعض تعبیرات میں معتزلہ کے قریب جا رہی تھی۔ علماء دیوبند نے یہاں تساہل سے کام نہیں لیا۔ اپنی پوری ذمہ داری ادا کی۔ یہ اختلاف بھی علمی اور قلمی حد میں رہا۔ جماعتی سطح پر کبھی تکفیر کا میدان نہ بنا۔ اس نے کبھی دو مستقل فرقوں کی شکل اختیار نہ کی۔ پھر علماء دیوبند کی حق پسندی کا یہ ثمرہ بھی دنیا نے آنکھوں سے دیکھا کہ مولانا شبلی کے جانشین علامہ سید سلیمان ندوی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقہ ارشاد میں داخل ہوئے اور سلوک و تربیت میں ان سے خلافت پائی۔ اس کے بعد یہ دونوں علمی درسگاہیں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئیں۔ اگر پہلے مرحلہ میں ضد اور نفرت کی فضا قائم کر دی جاتی تو معلوم نہیں کتنے مسلم مفادات اس ملبے کے نیچے دب جاتے۔

مرزائیوں کی تکفیر

جب اختلاف ضروریات دین تک جا پہنچے۔ ضروریات دین میں سے

کسی کا انکار ہو یا کسی ضروریِ دین میں اس طرح کی تاویل ہو جو مستلزم انکار ہو تو یہ انکار اور الحاد انسان کو کفر کی سرحد میں داخل کر دیتا ہے۔ کسی عقیدہ کی ایسی تاویل کی جائے جو اس کے یقینی اور متواتر معنی کے خلاف ہو، دیگر نصوص کے بھی خلاف ہو اور اجماعِ امت بھی اس کے برعکس ہو تو اس تاویل کو کوئی رعایت نہ ملے گی اور یہ ضروریِ دین کا کھلا انکار شمار ہوگا۔

اسلام جملہ ضروریاتِ دین کو تسلیم کرنا ہے۔ کفر کے لیے ضروری نہیں کہ جملہ ضروریاتِ دین کا انکار ہو۔ ایک ضروریِ دین کا انکار بھی کفر ہے۔ یہ صریح انکار ہو یا کسی تاویل سے انکار ہو۔ انکار بہرحال انکار ہے جب کفر ثابت ہو جائے اور اس عقیدۂ کفر کا ملزم خود بھی اقبال کرے تو لزوم اور التزام دونوں کا تحقق ہو جاتا ہے ایسے حال میں کفر کو کفر نہ کہنا کفر کو اسلام تسلیم کرنا ہے اور یہ خود کفر ہے۔ ایسے موقع پر تکفیر سے گریز ممکن نہیں۔ اب اس سے احتراز خُدّیں میں تحریف ہے۔ یہاں اہلِ حق خاموش نہ رہ سکیں گے ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

مرزائیوں نے ختمِ نبوت کی ایسی تاویل کی جس سے وہ معنی قائم نہ رہے جو دوسری آیات، صحیح روایات اور فہمِ امت کی روشنی میں قطعی اور یقینی رہ سکتے تھے۔ پھر مرزائیوں نے ختمِ نبوت کے اسلامی معنی کا انکار ہی نہیں کیا، مرزا غلام احمد قادیانی کو نیا نبی تسلیم کیا۔ نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اس کے انکار کو کفر کہا۔ قادیانی اسے حقیقی نبی سمجھتے رہے اور لاہوری جماعت اسے ظلی نبی قرار دیتی رہی اور حوزۂ اسلام سے اس طرح دونوں فریق باہر آ گئے۔ یہ صورتِ حال ایسی تھی کہ علماءِ دیوبند کے لیے مرزائیوں کی تکفیر سے گریز ممکن نہ تھا۔

دارالعلوم دیوبند نے مرزائیوں کی تکفیر کا فیصلہ نہیں کیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا تعارف زیادہ تر پنجاب میں تھا اور پنجاب کے علماء ہی مرزائیت سے صحیح طور پر آشنا تھے۔ علماءِ لدھیانہ نے سب سے پہلے مرزائیوں پر فتویٰ کفر دیا۔ علماءِ امرتسر نے اس کی تصدیق کی۔ چلتے چلتے یہ معاملہ علماءِ دیوبند تک پہنچا۔ انھوں نے پوری چھان بین کے بعد علماءِ پنجاب کے موقف کو صحیح پایا اور اس کی تصدیق کی۔ مرزائیوں کی تکفیر میں بھی علماءِ دیوبند کی پہل نہیں، [illegible] پنجاب میں پہلے لگ چکا تھا پھر علماءِ دیوبند نے مرزائیوں کی تکفیر محض جذباتی سطح تک ہی نہیں کی اسے اصولی طور پر پیش کیا اس کے قواعد علمی بتلائے اور ان قواعد پر مختلف تصدیقات پیش کیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے کفریہ عقائد اس کی ایک دو جگہ سے نہیں، متعدد عبارات اور مختلف تعبیرات سے سامنے لائے۔ جب اس کے عقائد میں کسی احتمالِ ثانی کا دخل نہ رہا اور مرزائیوں نے التزاماً ان عقائد کو تسلیم کر لیا تو علماءِ دیوبند، علماءِ پنجاب کی تصدیق میں بالکل حق بجانب تھے۔

مرزائیوں پر یہ حکمِ کفر اپنی جگہ اتنا واضح اور صریح تھا کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم جیسے مفکرین نے ان کے غیر مسلم اقلیت ہونے کی تجویز پیش کر دی۔ نہ ان کی مسلمانوں کے جنازے میں شرکت رہی، نہ مسلمان ان سے رشتہ نکاح میں منسلک رہے۔ عدالتیں فسخِ نکاح کے فیصلے کرتی رہیں اور چوہدری ظفر اللہ خاں وزیرِ خارجہ پاکستان نے قائدِ اعظم کی نمازِ جنازہ میں شرکت نہ کر کے اس اصولی اختلاف کو اور زیادہ واضح کر دیا۔ یہ صورتِ حال ۱۹۷۳ء تک قائم رہی یہاں تک کہ رابطہ عالمِ اسلامی نے اپنے اجتماعِ عام میں اور پاکستان کی قومی اسمبلی نے اپنے تاریخی فیصلے میں مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔

اس تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ علماءِ دیوبند اگر کسی تکفیر میں آگے بڑھے تو وہ کفر اپنی جگہ اتنا قطعی اور صریح تھا کہ آخر کار حکومتوں کو بھی اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا اور اس سے پہلے بھی مسلمان اپنے معاشرتی اور سماجی امور میں اپنے سب اختلافات کے باوجود ان سے دور اور ان کے کفر پر پختہ العقیدہ تھے۔

تکفیر کی مہم بندگانِ دین کے عام مزاجِ عمل کے خلاف تھی اور دارالعلوم کی تاریخ میں یہ ایک نیا باب تھا۔ اس لیے انھوں نے ضرورت سمجھی کہ مسئلہ کفر و اسلام کو اصولی طور پر منقح کر دیا جائے اور اہلِ علم کے ہاتھ میں ایک ایسی دستاویزی چیز ہو جو ہمیشہ کفر و اسلام کے اس اصولی فرق کو علمی بنیادوں پر قائم رکھ سکے۔

امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ محدث کشمیری نے اکفار الملحدین فی

...بغاوت سے متعلق ایک کتاب عربی زبان میں تحریر فرمائی جس پر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے دستخط فرمائے۔ اور اہل علم کو حیرت کے بجائے اس باب میں مزید تلاش سے مستغنی کر دیا۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے "وصول الافکار الی اصول الاکفار" کے نام سے اردو زبان میں ایک رسالہ لکھا اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے "مسلمان کون ہے اور کافر کون" کے نام سے مسلمانوں کے سامنے ایک اصولی یادداشت پیش کی۔ حکومت افغانستان نے دو مرزائیوں پر ارتداد کی حد جاری کی تو مرزائیوں نے ہندوستان میں بہت شور مچایا۔ جب مرزائی محمدیوں کو مشتعل کر کے افغانستان کو بدنام بنانے کی مہم چلا رہے تھے اور یہ [illegible] تحریک تھا تو حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے رسالہ "الشہاب لرجم الخاطف المرتاب" تحریر فرما کر مرزائیوں پر اسلام کی حجت تمام کر دی اور افغانستان کے خلاف تحریک رک گئی۔

واعظانہ تکفیر اور فرقہ وارانہ تکفیر

ترک عمل یا شعائر اسلام سے بے اعتنائی برتنے پر کسی مسلمان کو پند و نصائح کے طور پر کافر کہہ دینا واعظانہ تکفیر ہے اور اختلاف عقیدہ کے عنوان سے مخالفین کو کافر قرار دینا فرقہ وارانہ تکفیر ہے۔ اکابر دارالعلوم تکفیر میں اس قدر محتاط رہے کہ انہوں نے دائرہ اسلام میں نہ کسی کی واعظانہ تکفیر کی نہ فرقہ وارانہ۔ حتیٰ کہ جنہوں نے انہیں کافر کہا انہوں نے ان پر بھی محبت کے پھول برسائے۔

واعظانہ تکفیر کی تاریخ

واعظانہ تکفیر کی تاریخ خوارج سے شروع ہوتی ہے۔ خوارج نماز اور روزہ کے پابند اور گناہوں سے بہت گریزاں تھے۔ ان کی راتیں یاد الٰہی میں گزرتی تھیں لیکن وہ دین کی صحیح مرادات معلوم کرنے میں غلطی کھا چکے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے سوا تقریباً سب صحابہ اور اہل بیت کے خلاف تھے۔ انہوں نے پہلے مسلمانوں کو پند و نصائح کے طور پر بات بات پر کافر کہا پھر یہی ان کا عقیدہ ہو گیا کہ انسان گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے اسلام سے نکل جاتا ہے۔ وہ آیات جو کفار کے حق میں نازل ہوئی تھیں انہیں یہ مسلمانوں پر منطبق کرتے اور ارتکاب معصیت کو کفر سمجھتے تھے۔ امام بخاری لکھتے ہیں۔ انطلقوا الی آیات نزلت فی الکفار فجعلوها علی المؤمنین (صحیح بخاری ج [illegible] مصر)

قرآن کریم کی حج کے سلسلہ میں یہ آیت ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین (پ ۴) جو انکار کرے تو اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں بھی جو حج کی فضیلت سے انکار کریں ظاہر ہے کہ وہ کافر ہو سکتے ہیں۔ اب اس آیت کو ان مسلمانوں پر جو باوجود استطاعت کے حج نہیں کرتے منطبق کرنا خوارج کے حالات کو مسلمانوں پر منطبق کرنا ہے۔ حضرت مجاہد اور عطاء جیسے ائمہ تفسیر اس آیت کو انہی لوگوں کے حق میں پیش کرتے ہیں جو حج کے عبادت ہونے سے انکار کریں اور اس کے ترک کو گناہ نہ سمجھیں (دیکھیے سنن کبریٰ امام بیہقی جلد ۴ ص ۳۲۴) پس کفر سے مراد نیست حج کا انکار ہے (تفسیر مظہری ص ۲) ترک عمل پر کسی کو اسلام کے دائرہ سے باہر بتلانا ہرگز صحیح نہیں۔ ہاں اسلام میں پند و نصائح کے طور پر کسی مسلمان کو کافر کہنے کا جواز ہے۔

عقیدہ کے لحاظ سے خوارج اہل حق میں سے نہیں۔ علماء دیوبند نے ان پر سخت مواخذے کیے ہیں۔ ان کی واعظانہ تکفیر کی مشین ہر وقت حرکت میں رہتی تھی۔ علماء دیوبند اس قدر محتاط ہیں کہ انہوں نے کبھی کسی مسلمان کی واعظانہ تکفیر نہیں کی۔

واعظانہ تکفیر پر علماء دیوبند کی گرفت

جو لوگ باوجود قدرت کے حج نہیں کرتے۔ حجاز کے پاس سے بھی گزرتے ہیں مگر حج کا ارادہ تک ان کے دلوں میں نہیں گزرتا۔ ان کے بارے میں مولانا مودودی لکھتے ہیں:

"وہ لوگ جن کو عمر بھر کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ حج بھی کوئی فرض ان کے ذمہ ہے، دنیا بھر کے سفر کرتے پھرتے ہیں کعبہ یورپ کو آتے جاتے حجاز کے ساحل سے بھی گزر جاتے ہیں جہاں سے مکہ صرف چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے اور پھر بھی حج کا ارادہ تک ان کے دل میں نہیں گزرتا وہ قطعاً مسلمان

نہیں، جھوٹ کہتے ہیں اگر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں
اور قرآن سے جاہل ہے جو انہیں مسلمان سمجھتا ہے (خطبات ص ۳۹)

حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے اس واعظانہ تکفیر کی پُر زور تردید فرمائی ہے۔ مولانا مودودی نے ایسے لوگوں کو اسلام سے خارج کرنے میں جو داخل ہیں، حضرت مدنی نے ان کے ضعف کو واضح فرمایا ہے اور بتلایا ہے کہ ترکِ عمل سے مسلمان گنہگار تو بن جاتا ہے لیکن کافر نہیں ہوتا۔ علماء دیوبند کا مزاج عمل کچھ اس طرح واقع ہوا ہے کہ کسی مسلمان کے بارے میں گو وہ کتنا گنہگار کیوں نہ ہو یہ کسی قسم کی تکفیر جائز نہیں سمجھتے۔

مولانا احمد رضا اور مسئلہ تکفیر

عام طور پر مشہور ہے کہ مولانا احمد رضا نے علماء دیوبند پر کفر کا فتویٰ دیا تھا۔ یہ درست نہیں۔ نہ کسی شخص نے اس سلسلہ میں ان سے استفتار کیا، نہ مولوی صاحب نے فتویٰ دیا بلکہ مولانا احمد رضا ان علماء کے خلاف خود سائل بن کر علماء حرمین سے فتوے لینے گئے تھے۔ مولوی صاحب کی اپنی شخصیت اور شہرت ان دنوں ایسی نہ تھی کہ کوئی ان سے فتوے پوچھا کرتا۔ مولوی صاحب نے خود سوال مرتب کیے۔ علماء دیوبند کی اردو عبارات کا خود عربی میں ترجمہ کیا اور خود ہی سائل بن کر علماء حرمین شریفین سے فتوے لینے گئے اور خود ہی حسام الحرمین (حرمین کی تلوار) شائع کیا۔ وہ حرم پاک جہاں تلوار اٹھانا حرام تھا اسی نام سے مولوی صاحب نے تلوار چلا دی۔

اس صورت حال میں ایک غیر جانبدار شخص یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ

۱۔ مولوی صاحب کو کیا ضرورت در پیش ہوئی تھی کہ وہ خود مستفتی ہوئے
۲۔ ان کا استفتار کرنا کیا واقعی حقیقت معلوم کرنے کے لیے تھا یا ان کے پیش نظر ایک تحریک چلانی تھی۔
۳۔ کیا مصلحت تھی کہ علماء دیوبند کی اردو عبارات کا عربی ترجمہ انہوں نے خود کیا، علماء دیوبند سے ذکر نہ آ کہ ان کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔
۴۔ ان تراجم پر انہوں نے کسی غیر جانبدار عربی دان سے تصدیق کیوں نہ کرائی۔
۵۔ جن الزامات پر فتوے لینا تھا ان کی فرد جرم علماء دیوبند پر لگا کر اور ان کے جوابات لے کر یہ فرد جرم اور جوابات علماء حرمین کے سامنے کیوں نہ رکھے تاکہ یکطرفہ کارروائی عمل میں نہ آتی۔
۶۔ علماء دیوبند کے خلاف یہ سوالات علماء دیوبند تک کے کیوں نہ پہنچے، ان میں مرزا غلام احمد کو شامل کرنے میں کیا حکمت تھی
۷۔ مولانا احمد رضا کی تحریرات میں یہ بات ساتھ ساتھ کیوں چلتی رہی کہ انگریزی حکومت میں ہندوستان دارالاسلام ہے۔

ہمیں اس وقت ان سوالات کے جوابات میں نہیں جانا۔ تکفیر کا یہ طومار جس انداز میں پھیلایا گیا یہ خود منہ بولتی تصویر ہے کہ تکفیر بین المسلمین کی اس تحریک کے محرکات کیا تھے۔ ہم یہاں صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مولوی احمد رضا خاں نے ان علماء حرمین سے جو اردو اچھی طرح نہ جانتے تھے، علماء دیوبند کے خلاف فتوے حاصل کر لیے پھر جب علماء دیوبند کو اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے اصل صورت حال سے علماء حرمین کو مطلع کر دیا اور مولانا احمد رضا کی سازش ناکام ہو گئی۔ ہندوستان کے چند جہلا رہ گئے جو اس دام فریب میں مبتلا رہے اور انہی کی ذریت باقی ہے جو اب بھی اس تکفیر کی گردان کر کے مولانا احمد رضا کے آخرت کے بوجھ میں دن رات اضافہ کر رہی ہے۔

جب مولوی صاحب نے ہندوستان میں یہ تکفیری مہم چلائی تو ان دنوں مولانا احمد رضا کی اپنی اہمیت اتنی نہ تھی کہ خود ان کے بارے میں علماء دیوبند سے پوچھا جاتا کہ یہ خود کیا ہیں مسلمان یا کافر؟ دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ کے ذخیرہ میں ۱۳۲۵ھ تک اس قسم کا کوئی سوال نہیں ملتا۔ مولوی صاحب کی وفات کے بعد جب انہیں کچھ شہرت ہوئی تو علماء دیوبند سے ان کے پیروؤں کے بارے میں استفسار ہوا کہ یہ لوگ مسلمان ہیں یا کافر؟ مفتی مسعود احمد صاحب نے اس کا جواب لکھا اور محدث جلیل حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب نے اس پر دستخط فرمائے۔

علماء دیوبند اگر جوابی کارروائی کرتے اور انتقامی جذبہ سے جواب دیتے تو ظاہر ہے کہ کیا جواب ہوتا مگر علماء دیوبند نے اپنی پوری عالمانہ ذمہ داری اٹھائی اور وہ موقف اختیار کیا جو اہل حق کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حرفوں سے لکھا جائیگا

صورت حال یہ تھی کہ علماء دیوبند کے عقائد ہیں وہ باآخر ہرگز موجود
نہ تھی جس پر فتویٰ کفر دیا گیا تھا اور جو عبارات اس سلسلے میں پیش کی گئی تھیں۔
علماء دیوبند کے ایمان کے وہ معنی مراد نہ تھے بلکہ ان معنی کردہ خود بھی کفر سمجھتے
تھے۔

عقل کی مدد کو نظر انداز کر کے کسی جماعت پر حکم کفر لگانا بہتان اور الزام
تراشی پر مشتمل ہے یا جہالت اور کم فہمی۔ ظاہر ہے کہ بہتان باندھنا فسق و معصیت
ہے، کفر نہیں اور جہالت تو معصیت بھی نہیں۔ ہاں جہالت کے ساتھ دینی مسائل
میں دخل دینا اور مسلمانوں کو کافر کہنا یہ سخت گناہ اور فسق ہے مگر کم فہمی کی تاویل
کے باعث اس پر حکم کفر نہ دیا جائے گا۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی دوسری جلد
میں مولوی احمد رضا کے متعلقین کے متعلق یہ حکم مرقوم ہے

مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے متعلقین کو کافر کہنا صحیح نہیں
ہے بلکہ ان کے کلام میں تاویل ہو سکتی ہے اور تکفیر مسلم میں فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ
نے بہت احتیاط فرمائی ہے اور یہ لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کے کلام میں ننانوے
وجوہ (احتمالات) کفر کے ہوں اور ایک وجہ ضعیف اسلام کی ہو تو مفتی کو اس
ضعیف وجہ (احتمال) کی بناء پر فتویٰ دینا چاہیے یعنی اس کو مسلمان کہنا چاہیے
اگر وہ فی الواقع عقیدہ کے اعتبار سے مسلمان ہے تو فبہا ورنہ مفتی کا فتویٰ اس کو
نفع نہ دے گا۔ بناءً علیہ تکفیر کرنا صحیح نہیں بلکہ وہ مسلمان ہے لیکن فاسق فاجر کیونکہ
اس کے عقائد مذکورہ سراسر خلاف شرع ہیں اور وہ ایک ایسے شخص کا مرید اور معتقد
ہو گیا ہے جو ہرگز مقتدا بنانے کے قابل نہیں ہے۔ (جلد دوم ص ۵۵ مطبوعہ کراچی)

دارالعلوم کے مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"علماء دیوبند کی مشرک و مبتدع جماعت کو کافر مرتد وغیرہ کہہ
کر لکھنے والے نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ اس کا جواب
تو صرف یہ ہے۔ فصبر جمیل واللہ المستعان
علیٰ ما تصفون (اب صبر ہی بن آسے اور اللہ ہی
فریاد ہے) وسیعلم الذین ظلموا ای
منقلب ینقلبون (اور عنقریب جان لیں گے
ظلم کرنے والے کہ کس کروٹ بیٹھتے ہیں) اگر کسی کو ان
حضرات کی کسی خاص عبارت کے متعلق شبہ ہے یا ان بزرگوں
کے مخالفین سے پیدا ہو جائے تو اس کا مفصل جواب شائع
ہو چکا ہے ان کو دیکھا جاوے تو انشاء اللہ آفتاب کی
طرح روشن ہو جائے گا کہ ان حضرات پر جو کچھ الزامات لگائے
گئے ہیں وہ سب کم فہمی کا نتیجہ ہیں یا افتراء و بہتان ہیں"
(فتاویٰ دارالعلوم جلد ص ۹۲)

مفتی صاحب ایک دوسرے مقام پر حضرت مولانا خلیل احمد محدث
سہارنپوری اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی عبارات پیش کرتے ہوئے
رقمطراز ہیں:

"حضرات علماء دیوبند اکابر سے کہ اصاغر تک اپنی تمام
تصانیف اور تقریر و تحریر میں ہمیشہ اس کا اعلان کرتے رہے
ہیں کہ ہمارے عقائد وہی ہیں جو کہ صحابہ کرام و تابعین اور
ائمہ دین کے رہے ہیں۔ تمام علمائے حنفیہ رحمہم اللہ کے
عقائد میں کوئی عقیدہ ان کے خلاف نہیں اور یہی سبق دارالعلوم
دیوبند میں تمام طلبہ کو دیا جاتا ہے اور وہی کتب عقائد اہل السنۃ
والجماعۃ کی پڑھائی جاتی ہیں اور جس کسی نے اس کے خلاف ہماری
طرف منسوب کیا ہے یا ہماری عبارتوں میں تحریف کر کے
اس پر الزام کیا ہے وہ سب افتراء محض ہے۔ ہم اور ہمارے
اکابر اس سے بری ہیں" (فتاویٰ دارالعلوم جلد ۲ ص ۳۴)

مولوی احمد رضا خاں نے حضرت مولانا خلیل احمدؒ کے ذمہ یہ عقیدہ لگایا تھا
کہ وہ شیطان کے علم کو (معاذ اللہ) حضورؐ کے علم سے زیادہ جانتے ہیں اور مولانا
اشرف علی تھانویؒ کے ذمہ یہ بات لگائی کہ وہ حضور پاکؐ کے علم کو (معاذ اللہ)
جانوروں کے علم کے برابر کہتے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند

میں مفتی صاحب نے ان حضرات کی یہ عبارتیں نقل کی ہیں :

" مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے جو بندہ پر الزام لگایا ہے بالکل باطل اور افتراء ہے۔ میں اور میرے اساتذہ ایسے شخص کو کافر مرتد اور ملعون کہتے ہیں جو کہ شیطان علیہ اللعن کو کیا بلکہ کسی مخلوق کو بھی جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے علم میں زیادہ کہے۔ غرض خاں صاحب بریلوی نے محض اتہام اور کذب اس بندہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ مجھ کو تو حق تعالیٰ اس کا وسوسہ بھی نہیں ہوا کہ شیطان تو کیا کوئی ولی اور فرشتہ بھی آپ کے علوم کی برابری کر سکے چہ جائیکہ علم میں زیادہ ہو یہ عقیدہ جو خاں صاحب نے بندہ کی طرف منسوب کیا ہے اس کا مطالبہ خاں صاحب سے روز جزا ہوگا۔ میں اس سے بالکل بری ہوں اور پاک۔ وکفیٰ باللہ شہیدا اور اس پر خدا گواہ ہے، فقط۔ (حررہ خلیل احمد عفا اللہ عنہ)

خط حضرت مولانا اشرف علی تھانوی بنام مولانا مرتضیٰ حسن صاحب۔ ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند۔

مشفق مکرم سلمہم اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ !

آپ کے خط کے جواب میں یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ خبیث مضمون میں نے کسی کتاب میں نہیں لکھا اور لکھنا تو درکنار میرے قلب میں بھی اس مضمون کا خطرہ نہیں گزرا۔

۲۔ میری کسی عبارت سے یہ مضمون لازم نہیں آتا۔

۳۔ جو شخص ایسا اعتقاد رکھے یا بلا اعتقاد صراحۃً یا اشارۃً یہ بات کہے میں اس کو خارج از اسلام سمجھتا ہوں۔ میرا اور میرے سب بزرگوں کا عقیدہ ہمیشہ سے آپ کے افضل المخلوقات فی جمیع الکمالات العلمیہ والعملیہ ہونے کے باب میں یہ ہے۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر (فتاویٰ دارالعلوم جلد ۱ ص ۱۴۹)

اس خط کو نقل کرنے کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ارشاد فرماتے ہیں :

اور حضرت فقہاء کرام کا یہ ارشاد کہ اگر کسی شخص کے کلام میں ننانوے وجہ کفر کا مضمون ثابت ہو اور ایک وجہ سے اسلام کی جہت نکلتی ہو تو اسی پہلو کو ترجیح دے کر اس کو مسلمان کہا جائے گا اور اسی حقیقت کی اس تحقیقات اور صریح تحریروں اور ان کفریہ مضامین سے تبری ظاہر کی تھی۔ اس کے باوجود کوئی مسلمان اس کی جرأت نہیں کر سکتا کہ ان قدسی صفت انسانوں پر الزام کفر عائد کرے بجز عناد و تعصب کے اللہ تعالیٰ نجات عطا فرمائیں۔ ان حضرات کے حالات و مقامات کا کوئی شخص تھوڑا سا بھی مطالعہ کرے تو معلوم ہوگا کہ اگر یہ لوگ مسلمان نہیں تو زمانہ میں کوئی مسلمان نہیں۔ ان کی تکفیر جمہوریت کی تکفیر ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم جلد اول)

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا عقیدہ :

مولوی احمد رضا خاں نے مولانا محمد قاسم صاحب کی کتاب تحذیر الناس کے تین مختلف مقامات سے عبارتوں کو جوڑ کر ایک مسلسل عبارت بنا دی پھر اس کا عربی میں ترجمہ کیا۔ ترجمہ میں بھی کچھ خیانت کر دی۔ وہ عبارات اپنی ترتیب سے غلط ترجمے سے ختم نبوت کے خلاف ایک مضمون بن گیا۔ ایک عبارت ص ۳ سے دوسری ص سے اور تیسری ص سے لے کر ایک جگہ جوڑی گئی تھیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم پر جب ختم نبوت کے انکار کا الزام قائم کیا گیا تو آپ نے فرمایا

" خاتمیت زمانی اپنا دین و ایمان ہے ناحق تہمت کا البتہ کچھ علاج نہیں۔" (جوابات محذورات ص ۳۹)

" اپنا دین و ایمان ہے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور نبی کے ہونے کا احتمال نہیں جو اس میں تامل کرے اس کو کافر سمجھتا ہوں۔" (مکتوبات مولانا محمد قاسم ص ۱۰۳)

اب اس کے باوجود کوئی شخص ضد کی لکیر پیٹتا ہے اور ان اہل اللہ پر کفر کے الزامات لگاتا ہے تو بے شک ایک بڑا گناہ اور سخت قومی جرم ہے۔

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا عقیدہ :

مولوی احمد رضا خاں صاحب نے حضرت قطب الارشاد پر تہمت لگائی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا ہے اور اس غلط بیانی سے عوام

سے اُن کے خلاف فتوے حاصل کر لیا۔ ہم نے اس سلسلے میں اس مسئلے کو
فتاویٰ رشیدیہ میں بھی تلاش کیا۔ اس میں اس کے برعکس یہ عبارت ملی۔

"عقائد اسلامی کتب میں منع کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے
اس کے خلاف پر وہ قادر ہے مگر باختیار خود اس کو نہ کرے گا۔ یہ
عقیدہ بندہ کا ہے اور اس عقیدہ پر قرآن شریف اور احادیث صحاح
شاہد ہیں اور علمائے امت کا بھی یہی عقیدہ ہے مثلاً فرعون پر
اور خلود نار کی وعید ہے مگر اور قادر جنت فرعون پر بھی قادر
ہے اگرچہ ہرگز جنت اس کو نہ دے گا اور یہی مسئلہ بصورت
اس وقت میں بعض بندہ کے جدا جواب ہیں کہتے ہیں اس کو
اعلاء نے دوسری طرح پر بیان کیا ہوگا۔ اس قسمت اور
عدم وقوع کو امکان ذاتی ممتنع بالغیر سے تعبیر کرتے ہیں"

فقط والسلام رشید احمد عفی عنہ

(فتاویٰ رشیدیہ ص ۱۲/۱ مطبوعہ دہلی ۱۳۲۸ھ)

ان سب تہمتوں اور الزام تراشیوں کے باوجود بزرگان دیوبند نے مخالف
علماء کے متعلقین پر کفر کا حکم نہیں لگایا۔ وہ یہی کہتے رہے کہ خان صاحب کے الزامات
بدگمانی کی بنا، بہتان اور الزام تراشی پر ہے یا جہالت اور کج فہمی پر۔ اس کے
علاوہ اس سلسلہ میں تکفیر کی۔ اگر کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو وہ انگریزی سیاست ہے جس کی
بنیاد مسلمانوں کی تفریق میں اور جس کا استحکام مسلمانوں کی فرقہ بندی میں تھا۔

انگریزوں کے اشارے پر قوم کے دو ٹکڑے کرنا فسق و فتنہ کی انتہا
ہے لیکن کفر نہیں۔ کفر کا تعلق عقیدے سے ہے مصلحت اور مفاد سے نہیں۔ علماء
دیوبند جواباً کفر کی گولہ باری کرتے تو انگریزوں کی سکیم اور کامیاب ہو جاتی۔ لیکن یہ حضرات
ان ہتھکنڈوں پر رحمت ہوتے۔ یہ شرعی حدود سے باہر نہیں نکلے لیکن کافر کہنے والوں
کو کافر نہیں کہا اور انگریزی سیاست کے لیے استعمال نہیں ہوئے۔ انھوں نے
شیرازۂ ملت کو یکجا رکھنے کی آخری حد تک کوشش کی اور یہ علماء دیوبند کا تاریخی
کارنامہ ہے کہ مسلمان اب تک قومی سطح پر سب ایک ہیں اور ہر ضرورت کے ہر
موقع پر سب ایک ہو جاتے رہے ہیں۔ تحریک پاکستان ہو کہ تحریک ختم
نبوت تک تاریخ کا ہر دَور علماء دیوبند کی اعتدال پسندی اور وسعت ظرفی پر شاہد
رہا ہے۔ مولانا احمد رضا کی تکفیر بین المسلمین کی تحریک عالمی سطح پر ناکام ہو
چکی ہے اور پاک و ہند کے مجموع کرام میں ایک فیصدی سے زیادہ لوگ نہ ہوں
گے جو وہاں کے اماموں کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور انھیں کافر سمجھتے ہیں۔ جمہور
مسلمانوں کا اب تک یہ عقیدہ ہے کہ حرم مکہ اور مدینہ منورہ کا امام کافر نہیں
ہو سکتا اور اگر پورے حالات پر نظر کی جائے تو یہ علماء دیوبند کی عالمی سطح پر ایک
فتح عظیم ہے۔

اب بعض بریلوی یہی کہنے لگے ہیں کہ علماء دیوبند کی متنازع عبارات
میں مرادِ کلام اگر واقعی وہ نہ ہو جس پر مولانا احمد رضا نے تکفیر کی تھی تو پھر ان پر حکم
کفر نہیں دیا جا سکتا اور جو شخص اب بھی ان عبارات کا وہ مطلب سمجھے جو کفر نہیں
تو وہ کافر شمار نہ ہوگا۔ بریلویوں کے مفتی مظہر اللہ صاحب ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"تمام اہل سنت کے نزدیک یہی علاقائی ہے کہ جس کی
سمجھ میں کسی عبارت کے ایسے ظاہر معنی نہیں آتے جو
موجب کفر ہیں تو ایسے شخص کی دیانۃً تکفیر نہیں کی جا سکتی کہ وہ
ایسے معنی کا قائل نہیں جو موجب تکفیر ہیں۔

(فتاویٰ مظہری ص ۳۴۰)

سب بریلوی لوگ اگر اس اصول کو تسلیم کریں کہ تصنیف کی مراد وہی معتبر
سمجھی جائے جو مصنف بتائے اور ان عبارات کے وہ معنی مراد نہ لیں جنھیں علماء دیوبند
بھی کفر کہتے ہیں بلکہ ان کے وہی معنی مراد لیے جائیں جو علماء دیوبند نے بیان کیے ہیں
تصنیف را مصنف نیکو کند بیان۔ تو آج بھی ملت اسلامی راہ اتحاد میں امن کی شرکت
کا آغاز کر سکتی ہے۔ علماء دیوبند کی حق پرستی، اعتدال پسندی اور عدم تکفیر انشاء اللہ
ایک دن رنگ لائے گی اور سب مسلمان فرقہ بندی کے بندھن توڑ کر کتاب و سنت
اور سلف صالحین کی شاہراہ اتحاد پر گامزن ہوں گے۔ اللہ والوں کی قربانیاں ضائع
نہیں ہوتیں۔ دیر تو ہو سکتی ہے مگر اندھیر نہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ اختلاف کے

سارے بال چھٹ جاتے ہیں۔

علماء دیوبند پر مداہنت کا الزام :

علماء دیوبند کی اس اعتدال پسندی کو بعض لوگوں نے مصلحت کیشی اور بعض نے مداہنت سمجھا ہے، یہ درست نہیں۔ علماء دیوبند کا عدم تکفیر کا فیصلہ حق پسندی اور دلائل شرعی پر مبنی ہے۔ اہل حق کے ہاں مصلحت سے فتوے نہیں بدلتے۔

علماء دیوبند نے جو مولانا احمد رضا اور ان کے متعلقین کی تکفیر نہیں کی تو اس میں ان حضرات کا منشاء حکم معلوم کرنا چاہیے۔ پھر فیصلہ کریں کہ ان کا حکم تکفیر نہ کرنا ازراہِ حقیقت تھا یا ازراہِ مصلحت۔ ان بزرگوں کی عدم تکفیر سے مراد یہ تھی کہ ان لوگوں پر علماء دیوبند کو کافر کہنے، ان اکابر پر بہتان باندھنے اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی فردِ جرم سے شرعاً حکم کفر ثابت نہیں ہوتا۔ یہ امور بڑے گناہ اور سخت قومی جرم ہیں لیکن کفر نہیں۔

اس عدم تکفیر سے یہ مُراد نہ تھی کہ یہ لوگ اپنے غلط عقائد میں واقعی حدِ کفر تک نہیں پہنچے۔ اکابر دیوبند کے سامنے مولانا احمد رضا کے عقائد پوری تفصیل سے نہ کسی نے پیش کیے۔ نہ علماء دیوبند نے ان کے بارے میں تکفیر یا عدم تکفیر کا کوئی فیصلہ کیا اور نہ کبھی کسی نے اس کی ضرورت محسوس کی۔ ان دنوں مولانا احمد رضا کی اتنی اہمیت نہ تھی کہ خود ان کے عقائد پر کوئی بحث کی جاتی۔ ان کی جتنی شہرت ہوئی وہ اس بنا پر تھی کہ انھوں نے اکابر دیوبند کے خلاف ایک زبردست مہم چلائی تھی ؎

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

علماء دیوبند کا ان پر حکم کفر نہ کرنا محض ان کی الزام تراشیوں کے مقابل ہے ان کے تفصیلی عقائد کے مقابل نہیں۔ ان لوگوں کے کلام عقائد یا عمل میں اگر واقعی کوئی کفر کی بات ہو تو علماء دیوبند اس کے بارے میں حکم شرعی بیان کرنے سے قطعاً گریز نہ کریں گے۔ اہل حق میں مداہنت نہیں ہوتی لیکن یہ حکم ان افراد کا ہوگا جو واقعی اس کفر کے اس کی پوری تفصیل سے مرتکب ہوں۔ جماعتی سطح پر سب بریلویوں پر کفر کا فتوے نہ دیا جائے گا عام بریلوی خاص طور پر خطہ پنجاب کے مولانا احمد رضا کے عقائد سے تفصیلاً واقف نہیں بعض ہم معاملگی کی پچ سے انہیں بریلوی کہا جاتا ہے انہیں مولانا احمد رضا کے عقائد سے مجرم ٹھہرانا ہرگز ہرگز درست نہیں۔ یہ قومی سطح پر ایک ظلم ہوگا۔

جہاں تک مولانا احمد رضا کے اپنے عقائد کا تعلق ہے۔ اگر کوئی کہ ان کی تحریرات میں شرک وکفر کی باتیں معلوم ہوں اور وہ ازروئے شرع یقین ان پر مواخذہ کرے تو علماء دیوبند کو اس تعرض نہ ہوگا انھوں نے نہ ان کے عقائد کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ نہ اس کی ضرورت سمجھی اور نہ ان پر کوئی حکم لگایا ہے۔ ان کی عدم تکفیر محض ان کی الزام تراشی کے مقابل تھی۔ ان کے پورے عقائد پر عدم تکفیر کا فیصلہ نہ تھا۔ پس ان اہل حق پر مداہنت کا الزام درست نہیں۔ جو لوگ ہر باطل کے سامنے تیغ براں ہو کر چمکتے رہے اور زندگی بھر انھوں نے عزم و ہمت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کفر و اسلام جیسے امتیازات میں وہ کسی مصلحت کے دھارے میں بہہ جائیں۔

عام بریلوی پوری ملت کے ساتھ برابر کے مسلمان ہیں۔ جوں جوں ان لوگوں کو مولانا احمد رضا کا تعارف ہو جائے گا یہ بریلوی کہلانے سے خود پیچھے ہٹتے جائیں گے۔ جمہور مسلمان پسند نہیں کرتے کہ مولانا احمد رضا کے نام پر کوئی فرقہ بندی کی جائے۔

یہ بات لائق تحسین ہے کہ علماء دیوبند مسئلہ تکفیر میں بہت محتاط واقع ہوئے ہیں۔ فقہاء اسلام اس سلسلے میں جتنی احتیاط کا حکم دے گئے۔ علماء دیوبند اس احتیاط کا پورا عملی نمونہ ہیں یہ حضرات ایک ایک بات میں کئی پہلوؤں سے سوچتے ہیں اور ایک پہلو بھی اسلام کے مطابق ہو تو یہ وہی معنی مراد لے کر باقی سب کفریہ احتمالات کو نظر انداز کر دیں گے مسلمان کے بارے میں نیک گمان اس بات میں اصل الاصول ہے اور یہی سلف صالحین کی روش ہے اور یہی شریعت کا حکم ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نے فتاویٰ دارالعلوم جلد اوّل ص۳ پر فقہاء اسلام کے اس موقف کو بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔

ممالکِ اسلامیہ سے دینی روابط :

پوری دُنیا کے مسلمان ایک ملّت واحدہ ہیں کسی سرحد جغرافیائی حالات میں علیحدگی تربیت میں ملحوظ نہیں سب مسلمان آپس میں بھائی ہیں انما المومنون اخوۃ ۔ ممالکِ اسلامیہ کی علمی بین الاقوامی تقریبات میں ہمیشہ علماء دیوبند برصغیر پاک و ہند کے اسلامی نمائندوں کے طور پر شامل ہوتے ہیں ۔ جیسے یونیورسٹی مدینہ، جامع ازہر، موتمر عالم اسلامی، رابطہ عالم اسلامی، مجلس اسلامی وغیرہ کی تاریخی مجلس مذاکرہ ہوا دنیا کے کسی خطے میں مسلمانوں کا کوئی علمی ادارہ دیوبند سے نسبت رکھنے والے اہلِ علم ہر ایسے موقع پر علم کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے ہیں اور اس وقت مشرق میں علماء دیوبند کی عظیم علمی شہرت کے ساتھ ساتھ ان کی اعتدال پسندی، فرقہ وارانہ رجحانات سے دوری اور سب دنیا کے مسلمانوں کو ملت واحدہ سمجھنے کے عظیم قومی احساس کو بڑا دخل ہے ۔ برصغیر پاک و ہند میں اہلِ علم کا یہ ایک ایسا طبقہ ہے جو قدیم و جدید تمام علوم و معقول اور معاشی مسئلوں پر نظر رکھتے ہوئے سلف صالحین سے پوری طرح وابستہ ہے ۔ ان کے ہاں علمی تحقیق کے چراغ پوری تابانی سے روشن ہیں اور سلوک و طریقت کی راہوں سے بھی گذر جاری ہے ۔ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے ساتھ ساتھ تزکیہ و تہذیب کے عظیم جماعتی مقاصد پر بھی ان کی نظر رہتی ہے ۔ یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں اس میدان میں بنایا ہے کہ مسلکِ حق میں یہ طبقہ افراط و تفریط سے محفوظ رہ کر حق و اعتدال کی راہ پر گامزن ہے ۔

ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

ولو کرہ الاعداء من کل حاسد

مولانا ابوالکلام

علم خدا کی ایک امانت ہے

ہندوستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائص و اعمال کو پہنچائے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ نقصان یہ ہے کہ تحصیلِ علم کا مقصد اعلیٰ ہماری نظروں سے غائب ہو گیا ہے ۔۔۔ علم خدا کی ایک امانت ہے اور اس کو صرف اس لیے ڈھونڈنا چاہیے کہ وہ علم ہے لیکن سرکاری یونیورسٹیوں نے ہم کو ایک دُوسری راہ بتلائی ہے ۔ وہ علم کا شوق اس لیے دلاتی ہے کہ بلا اس کے سرکاری نوکری نہیں مل سکتی ۔ پس اب ہندوستان میں علم کو علم کے لیے نہیں بلکہ معیشت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے ۔ یہ بڑی بڑی تعلیمی عمارتیں جو انگریزی تعلیم کی نوآبادیاں ہیں، کس مخلوق سے بھری ہوئی ہیں ۔ مشتاقانِ علم و شیفتگانِ حقیقت سے ؟ نہیں ایک مٹھی کیسوں اور ایک پیالہ چاول کے پرستاروں سے جن کو یقین دلایا گیا ہے کہ بجز حصولِ تعلیم کے وہ اپنی غذا حاصل نہیں کر سکتے ۔ لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ علم کی اس عدم توہین و تذلیل کی تاریکی میں سچی علم پرستی کی روشنی برابر چمکتی رہی ہے ۔ یہ ملت کے طالبانِ علم کی وہ جماعتیں ہیں جو اسلام کے قدیم مذہبی علوم اور مذہبی زبان کے فنون مختلف عربی مدارس میں حاصل کر رہی ہیں ۔۔۔ آپ یقین کیجئے کہ بجا طور پر آج صرف یہی ایک جماعت علم کی سچی پرستار کہی جا سکتی ہے ۔ ان لوگوں کو معلوم ہے کہ انگریزی تعلیم کی ڈگریاں لے کر بڑے بڑے عہدوں اور نوکریوں کے دروازے میں قدم رکھ سکتے ہیں اور ایک کلرک سے لے کر ڈاکٹر تک کی نوکری تک صرف انگریزی کی تعلیم ہی سے مل سکتی ہے ، ان کو پوری طرح یقین ہے کہ عربی تعلیم کو آج کوئی نہیں پوچھتا ۔ حتیٰ کہ روٹی بھی اس کے ذریعے نہیں مل سکتی ۔ پھر بھی ان کے دلوں میں ایک مخفی مگر طاقت ور جذبہ موجود ہے ، جو انگریزی تعلیم کی طرف سے جانے نہیں دیتا اور اس کس مپرسی میں عربی تعلیم ہی کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دیتے ہیں ، یہ جذبہ بجز علم پرستی اور رضائے الٰہی کے اور کوئی دنیاوی غرض نہیں رکھتا اور اس لیے دُنیا بھر میں علم کو علم کے لیے اگر پڑھنے والی جماعت ہے تو وہ عربی مدارس ہی کی جماعت ہے ۔۔۔۔۔۔

(تحریکِ خلافت کے دور کے ایک خطبے سے مقتبس)

برصغیر جو اس وقت کئی حصوں میں بٹا ہوا ہے تاریخی اعتبار سے بڑی خصوصیات کا حامل ہے مجلہ ترجمان کے فاضل مصنف نے ان خصوصیات کا مفصل تذکرہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں مستند شہادتیں پیش کی ہیں ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام جو سب سے پہلے انسان، خلیفۃ اللہ اور پیغمبر ہیں کی جنت سے جب زمین پر آمد ہوئی تو اسی خطہ میں وہ سب سے پہلے تشریف لائے اور ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اس خطہ کو ساری دنیا سے ممتاز کرتی ہے

جب سلسلہ نبوت اپنے کمال و اتمام کو پہنچا اور حضور ختمی مرتبت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تو یہ خطہ بھی دوسرے خطوں کی طرح ضلالت و گمراہی کا شکار تھا لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے فضل خصوصی سے جن خطوں کو بالکل ابتداء میں نور اسلام سے منور فرمایا ان میں یہ خطہ بھی ہے یعنی یہ کہ حضرات صحابہ کرام سلام اللہ علیہم و رضوانہ کے عہد سعادت میں ہی یہاں نور ہدایت کی کرنیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں، عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نوجوان غازی محمد بن قاسم رحمۃ اللہ تعالیٰ کی جہادی مہم اس ملک میں ابتداء اسلام کا باعث بنی لیکن یہ بات صحیح نہیں کیونکہ ایسا تو دور صحابہ میں ہو چکا تھا، اور مشرقی اطراف نور اسلام سے منور ہو چکی تھیں اس کے بعد یہاں قدرت شعل اسلام کو فروزاں رکھنے کا ہمیشہ اہتمام فرماتی رہی اور اس اہتمام کا سب سے اہم حصہ حضرات صوفیائے کرام علیہم الرحمہ اسی طرح کے اصحاب فضل و کمال ہیں جن کی سعی و جہد سے گلشن اسلام چپتا پھولتا رہا اور ہوا کی تیزی اور تندی کے باوصف اس کی رونق اب بھی قائم ہے۔

ابتدائی دور میں جن بزرگوں کا نام لیا جا سکتا ہے ان میں شیخ اسماعیل محدث لاہوری، الشیخ سید علی ہجویری، خواجہ معین الدین اجمیری قدس اللہ اسرارہم جیسے بزرگان سلف بہت اہم حیثیتوں کے مالک ہیں۔

برصغیر کی پوری تاریخ میں جن بادشاہوں اور سلاطین و ملوک کا نام خادم دین کی حیثیت سے زیادہ اہتمام سے لیا جاتا ہے مثلاً سلطان محمود غزنوی، اس کے بیٹے سلطان مسعود غزنوی، غازی اورنگ زیب عالمگیر رحمہم اللہ وغیرہ تو ان کی پشت پر بھی اصحاب علم و طریقت کا سلسلہ آپ کو نظر آئے گا۔

اور جب کبھی گلشن اسلام کو پامال کرنے کی کوئی کوشش ہوئی تو جو لوگ سینہ سپر ہو کر سامنے آئے اور اندرونی و بیرونی فتنوں کو دبا کر گلشن اسلام کی تازگی کو قائم رکھا وہ بھی یہی بوریہ نشین مسند نشینان علم و فقر تھے۔

ہندی تاریخ میں اکبر کا دین الٰہی بہت مشہور ہے اور اس کا موجد اکبر اپنی بے راہ روی اسلام سے دوری وغیرہ میں اپنی مثال

آپ سے پہلے تک کئی خاندان اس طرح ساختہ ہو چکے تھے اور جہاں خلفائے اسلامی
میں بھی بڑے بلند مقام تھے وہیں ملک کو عزت و حرمت کی دنیا میں نمایاں
کارنامے انجام دیا وہ بھی ایک گزشتہ پرکشش اور فقر و فخر سے
مالک تھے:

میری مراد حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ سے ہے جو
صدی کے نہیں بلکہ الف ثانی کے مجدد ہیں اور جنہیں عصر حاضر کے
معروف اسکالر و حکیم امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ جیسے
صاحب بصیرت فرد اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا باعث قرار دیتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مجدد صاحب کے جاں نثار کردار و طرز عمل
نے "اکبری گریٹ" کے طرز فکر کا یہ سارا رخ بدل کر رکھ دیا جس کے متعلق
خدشہ ہو چلا تھا کہ یہ اسلام کو اس ملک سے دیس نکالا دے دیں گے وہ اسلام
کے خادم بن گئے جن میں اورنگ زیب کو تو بڑی اہمیت حاصل ہے جو حضرت
مجدد صاحب قدس سرہ کے صاحبزادہ حضرت خواجہ محمد معصوم قدس
سرہ کا خادم اور تربیت یافتہ تھا اور ملا جیون علیہ الرحمہ جیسی عظیم
شخصیت کا شاگرد و خادم! غالباً یہی وجہ ہے کہ امام سندھی عالمگیر مرحوم
کو سلطان مجدد کہتے ہیں کہ انہوں نے مجدد صاحب قدس سرہ کی متعین کردہ
راہ پر نظام کو چلایا اور اس طرح خدمت اسلام کی۔

ہندوستان میں اسلام بیزار قوتوں کی کمی نہیں رہی جنہیں بت پرست
طبقہ سب سے آگے ہے، لیکن اسلام کے لئے سب سے زیادہ جو نازک موڑ
آئے وہ دو تھے

پہلا تو یہی اکبری دور جس کا ابھی اشارہ کیا جسکو حضرت مجدد
صاحب نے بہت جلد بفضل الٰہی دبا دیا اور اس طرح وہ سازش ناکام ہوئی
دوسرا فتنہ جو اپنے اثرات کے اعتبار سے انتہائی مضر و نقصان رساں تھا،
وہ تھا انگریزی راج! یہ واقعہ ہے کہ جس طرح یہاں ہر دور میں نمودار ہونے
والے فتنوں کا علمائے حق نے قلع قمع کیا اسی طرح اس فتنہ کی بیخ کنی بھی علماء
کے سر ہے۔

بعد میں جب قوتوں کے مرکز مغل حکمرانوں کی ابتدائی آمد کا دور اکبری
زیادہ پست چلا ہے جب وہ مغل عیش و طرب میں دنیا طرح متعاملوں
مغلیوں اور اس قماش کے لوگوں کو جیا گیا تو ہندو پارٹی اس مخلوق کو
بھی چڑ گیا۔

شاطر یورپینوں نے یہاں آکر معلوم کیا جادو کیا کہ بادشاہ سلامت
ان پر فریفتہ ہو گئے اور اس دور کے خصوصی مصاحب ابوالفضل کو انجیل
کا ترجمہ کرنے اور اپنے بیٹے شہزادہ خرم کو چند اسباق تبرکاً پڑھنے کا
حکم دیا۔

• حضرت مجدد صاحب قدس سرہ اکبری فکر و نظریات کو اسلام کے لئے
زہر قاتل سمجھتے ہی تھے پھر انہوں نے خاص طور پر جس طرف توجہ دلائی وہ تھا
"کافرانہ رنگ" کا منشا کافرانہ رنگ کے کفر اور اس کی عیاری و فریب کاری
پر ان کی رگ فاروقیت پھڑک اٹھتی ہے اور ان کے قلم سے انگارے نکلنا
شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد کے مغل بادشاہوں نے روایتی ہمدردی
کے چکر میں ان لوگوں پر احسان کیا تجارت وغیرہ کی کھلی اجازت دیدی تو یہ
لوگ بے جا جرأت یا بالفاظ دیگر فریب کاری و مکاری کے حربوں سے ملک
پر قابض ہونے کی سوچنے لگے۔

فرماں روا طبقہ میں سے جس نے سب سے پہلے ان کی فریبکاریوں
پر توجہ دی وہ سلطان ٹیپو شہید ہیں جن کا تعلق حضرت الامام السید شہید
بریلوی کے بزرگوں سے تھا۔ لیکن مرحوم ٹیپو کی ساری کوششیں اس لئے بار آور
نہ ہوئیں کہ انگریز کو تحفظ دینے کی خاطر کئی اور گماشتے موجود تھے جنہوں نے مسلم
کاز سے غداری کی۔

اورنگ زیب کے بعد بے چین اور مضطرب ماحول میں قدرت نے
حضرت فیلسوف اسلام حکیم الامت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کو کھڑا کر دیا، انہوں
نے جہاں ملکی حالات کی بہتری کے لئے احمد شاہ ابدالی سے رابطہ قائم کیا

وہاں علمی و فکری بنیاد پر خوب کام کیا اور مت کرمجموعہ علیگڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر جناب رشید احمد نے "مکتوب شاہ بنام شاہ" میں حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی اس دعوت کا پورا پس منظر بیان کر دیا ہے جو آپ نے احمد شاہ ابدالی کو دی۔ یہ دعوت قبول ہوئی ابدالی آئے اور مرہٹوں کی طاقت ختم کر دی۔ اس کے بعد ابدالی واپس چلے گئے۔ اگر وہ اس موقع پر یہاں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیتے تو صورت حال تبدیل ہو سکتی تھی۔

شاہ صاحب نے سب سے اہم کام جو کیا وہ ہے فکری محاذ پر قوم کی صحیح رہنمائی۔ قرآن عزیز کا ملکی زبان میں ترجمہ کرنا ان کا مجددانہ اور شالی کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ سیاست و اقتصاد کے مسائل پر سیر حاصل بحث اور ان شعبہ ہائے حیات میں رونما ہونے والی بے اعتدالیوں کی نشاندہی سے ان کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ، بدور بازغہ، تفہیمات الٰہیہ، ازالۃ الخفاء وغیرہ کتابیں آپ پڑھیں تو ان مسائل حیات کے ساتھ آپ کو تاریخی حقائق کا ایک بحر بے کنار نظر آئے گا۔

اس ساری جدوجہد کا اصل مقصد یہ تھا کہ دنیا میں تمام نظام ہائے باطلہ کو مٹا کر "اسلام کے نظام عدل و مساوات" کے اجراء و نفاذ کی کوششیں کی جائیں۔

دراصل آپ چونکہ مجدد تھے اور مقام تجدید موہبت الٰہی ہے جیسا کہ حضور علیہ السلام کے ارشاد سے مترشح ہوتا ہے ان اللہ یبعث الحدیث کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ مقام تجدید کے لئے انتخاب بھی منجانب اللہ ہوتا ہے اور قدرت کی خاموش رہنمائی اس سلسلہ میں انسانیت کی رہنما ہوتی ہے اس لئے آپ نے مجدد ہونے کی حیثیت سے حالات پر نظر ڈالی اس مرض پران کی جو رہنمائی کی گئی اس پروگرام کا نام آپ نے فک کل نظام رکھا یعنی نظام ہائے باطلہ کی بیخ کنی۔

آج دنیا میں انقلاب فرانس، مغربی جمہوریت اور روسی بلاک کے کیمونزم وغیرہ کا بڑا چرچا ہے اور دنیا کا ایک طبقہ سیاسی استحکام اور معاشی مساوات کے لئے اس قسم کے نظاموں کو [illegible] بہ حیثیت یہ ہے کہ اس نظام نے دنیا کے مسائل سلجھانے کے بجائے الجھا دیئے ہیں، لیکن شاہ صاحب قدس سرہ نے انقلاب فرانس سے نصف صدی سے زائد عرصہ پیشتر اور کیمونزم کے بانی کارل مارکس کی پیدائش سے ایک صدی قبل قرآن و سنت کی روشنی میں جو پروگرام مرتب فرمایا تھا اس کی اہمیت کو کیمونسٹ انقلاب کے رہنماؤں نے انسانی مسائل کے حل کا شافی نسخہ قرار دیا اور اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ یہ پیغام اس وقت ہمیں پہنچا جب روس وغیرہ میں کیمونزم کے نام پر انقلاب آ چکا ہے۔

امام انقلاب مولانا سندھی قدس سرہ اپنے شیخ و مربی شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کے حکم سے جب افغانستان گئے اور سات سال قیام کے بعد انہیں روس جانا پڑا تو اس وقت کے زعماء سے اسی قسم کی گفتگو ہوئی۔

شاہ صاحب اپنے اس دینی پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے انقلابی جماعت بنانے کا ارادہ رکھتے تھے اور مقصد سے والہانہ لگاؤ رکھنے والے رضاکاروں کے واسطے سے یہ کام لینا چاہتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا اور بالکل صحیح کہ تنخواہ دار اور ملازم پیشہ لوگ وہ کام نہیں کر سکتے جو مخلص رضاکار کر سکتے ہیں۔

انقلابی جماعت بنانے اور قوت کے ساتھ حالات کا نقشہ پلٹنے کی تجویز ذہنی ہیں اس لئے آئی کہ آپ کی نظر حالات پر تھی اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت بچوں کا کھیل بن چکی ہے شیعہ اور دوسرے عناصر کے ہاتھوں میں حکمران کٹھ پتلی ہیں آئے دن انقلاب آتے ہیں اور پوری قوم افراتفری کا شکار ہے، انتظامیہ بدکردار ہے، فوجی پیشہ ور بے راہرو ہو چکے ہیں اور ظلم و ناانصافی اپنے جوبن پر ہے۔

لیکن آپ کو مہلت نہ ملی اور آپ پروگرام وضع کرنے کے بعد عملی جامہ پہنانے سے قبل دنیا سے رخصت ہو گئے تو آپ کے فرزند رشید سراج الہند

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ نے اس کام کو اپنے
ہاتھ میں لیا۔ سلطنت مغلیہ سے تحریک کو منظم کرنے کی غرض سے سب سے پہلا
کام تو یہ کیا کہ ہندوستان کی ایک حیثیت متعین کردی۔ اب تک لوگوں کے
ذہن حالات کے مطابق اطمینان سے خالی تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا
تھا کہ اس ملک کو دارالاسلام کہا جائے یا دارالحرب یا دارالامن؟

شاہ صاحب نے کمال جرأت و دیانت سے صورت کا جائزہ
لیا اور ایک مفصل فتویٰ جاری فرمایا جس میں ہندوستان کے دارالحرب
ہونے کا اعلان فرمایا آپ نے ہندوستان کے حالات کے ضمن میں انگریز
نصاریٰ کی دھاندلیوں اور مکر و فریب کا بالخصوص اپنے فتویٰ میں ذکر فرمایا

چونکہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ کے والد بزرگوار
حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بہت بڑے مدرسہ
رحیمیہ قائم فرمایا تھا جس کے علمی فرزند ملک کے گوشہ گوشہ میں موجود تھے
اس لئے خاندان رحیمی و ولی اللہی کے وارث و جانشین کی یہ صدائے حق
بڑی سرعت کے ساتھ ملک کے چپے چپے میں پھیل گئی۔

فتویٰ جاری فرمانے کے ساتھ ساتھ آپ نے مجاہدین کی تیاری
کے لئے بھرپور کوشش جاری رکھی اس سلسلہ میں حسن اتفاق سے رائے بریلی
کے قدیم بزرگوں کی اولاد کا ایک ہونہار فرزند انہیں مل گیا جس کی تعلیم
تربیت آپ نے اور آپ کے بھائی شاہ عبدالقادر صاحب علیہ الرحمۃ
نے کی۔ تعلیم کے بجائے اس صاحبزادے کا زیادہ رجحان اس طرف تھا کہ
جہادی مہم میں حصہ لیا جائے اور پھر اس نے انتظامی معاملات کا وسیع
تجربہ بھی حاصل کر لیا تھا اس لئے شاہ صاحب نے اس صاحبزادے
حضرت الامام الامیر السید احمد بریلوی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کو
تحریک مجاہدین کا سربراہ بنا دیا اور اپنے مخصوص عزیزوں
یعنی مولانا عبدالحی بڈھانوی اور مولانا محمد اسماعیل قدس سرہما کو ان سے
متعلق کردیا اور ان کی ان سے بیعت کروادی باوجودیکہ دونوں بزرگ
عمر اور علم میں سید بریلوی سے بڑے تھے۔

اس تحریک کا باضابطہ آغاز ہونا تھا کہ ایک تہلکہ مچ گئی سید
صاحب نے پہلے نقل و حرکت دعوت سے شروع کردی۔ ان دوروں میں
جس شدت سے لوگ ان کے ساتھ شامل ہوئے اور جانی و مالی قربانی دی
اس کا اندازہ ایک متعصب انگریز دشمن لارڈ ہنٹر کی کتاب "ہمارے
ہندوستانی مسلمان" سے ہو سکتا ہے۔ لوگوں کے جذبات کا یہ عالم تھا کہ
لوگ اپنی تنخواہوں کا ایک حصہ اور سالانہ چھٹیاں اس مقدس مہم میں خرچ
کرتے تھے۔ اسی دوران سفر حج بھی پیش آیا اس کا مقصد بھی دراصل
جہاد کے معاملہ میں تیاری ہی تھا۔ بعض لوگوں نے سید صاحب کے سفر حج
کے متعلق عجیب عجیب باتیں کیں اور مشہور کر دیا کہ مکہ معظمہ میں ان کی
ملاقاتیں محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کے زعماء سے ہوئیں جہاں سے وہ
نجدی وہابی عقائد سے متاثر ہوئے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ انگریز مورخین
خود تسلیم کرتے ہیں کہ سید صاحب کے وہاں پہنچنے سے کئی سال قبل
نجدی تحریک اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی لیکن دروغ گو را حافظہ نباشد
کے مصداق یہ تسلیم کرنے والے انہی کی کتابوں کے دوسرے صفحہ پر سید
صاحب اور نجدیوں کی ملاقاتوں کے افسانے تراشنا شروع کر دیتے ہیں۔

بہرحال سید صاحب نے جب جہاد کا سلسلہ شروع کیا تو ابتداء
میں خاطر خواہ کامیابیاں ہوئیں جو دو طرف پھیلی ہوئی تھیں ایک طرف سرحد میں
آپ خود نبرد آزما تھے تو دوسری طرف بنگال میں حاجی شریعت اللہ، تیتو میر
وغیرہ سرگرم عمل۔ لیکن خدا کو ایسا ہی منظور تھا کہ کچھ بدبخت عناصر آڑے
آگئے اور ۱۸۳۱ء کے وسط میں آپ اور آپ کے اہم رفقاء شہید کر دیئے گئے

ہر چند کہ اس سے تحریک کو نقصان پہنچا لیکن مسٹر ہنٹر کے
مطابق یہ تحریک قائدین کی موت و حیات سے بے نیاز ہو چکی تھی۔

اس لئے سلسلہ چلتا رہا پھر کچھ حضرات نے سرحد میں ستھانہ کے
مقام پر کیمپ قائم کر کے انگریز بہادر کو مسلسل پریشان کئے رکھا اور تھوڑے

ہنگامہ برپا ہوا یعنی ۱۸۵۷ء میں ایک بار پھر پورے ملک میں آگ بھڑک اٹھی

اس اشاراتی مضمون میں تفصیلات کا موقع نہیں ورنہ اس بات کے ثبوت پیش کئے جا سکتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا سہرا بھی انہی لوگوں کے سر ہے جو تحریک ولی اللّٰہی سے نسلاً بعد نسل منسلک تھے اور اسی نہج پر تربیت یافتہ تھے۔

اس تحریک کے ابتدائی دنوں میں محسوس ہوتا تھا کہ انگریز راج ختم ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن اندرونی غداروں کی سازشوں اور بیہم قوم فروشیوں نے ملت کے کاز کو سخت نقصان پہنچایا۔

اس مرحلہ پر جو لوگ توپ و تفنگ اور جذبات صادقہ لیکر میدان میں آئے اُن میں سید الطائفہ، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ بھی تھے۔ جو علماً عملاً ہر طرح ولی اللّٰہی سلسلہ کے وارث تھے اور جن کا روحانی تعلق بھی اس تحریک کے بزرگوں سے تھا۔ حاجی صاحب اپنے رفقاء سمیت جہاد و قتال کے میدان میں آئے اور ایک وقت میں ایک حصہ اپنے قبضہ میں لیکر "اسلامی حکومت" کی بنیاد بھی رکھدی لیکن ابھی آزمائشی دور ختم نہیں ہوا تھا اس لئے آخری نتیجہ انگریز کے حق میں نکلا۔

آزادی کی اس تحریک کی ناکامی کے بعد انگریز نے ظلم و جبر کے تمام روایتی طریقے اپنائے، انسانیت کے بے پناہ قتل کے ساتھ مساجد و مدارس کی بربادی میں بھی خوب خوب ہاتھ رنگے اور اپنے طور پر ملت اور اس کے آثار و نشان مٹانے کی خاطر تمام ممکنہ تدابیر اختیار کیں، یہی وہ دور ہے جب ملت اسلامیہ اپنے مستقبل کے بارے میں بالکل مایوس ہو چکی تھی اور دشمن مطمئن تھا کہ اس نے ہندوستان کو مسلمانوں کے وجود سے پاک کرا لیا لیکن جو خطہ ارضی ابتداء سے آسمانی رشد و ہدایت سے نوازا گیا ہو اس سے آثار دینی مٹانا کسی کے بس میں نہ تھا اور قدرت انھیں کی ریشہ دوانیوں پر مسکرا رہی تھی۔

وہ مجاہدین حریت جنہوں نے اب تک "جہاد بالسیف" کے ذریعہ خدمت اسلام کی تھی اور ملت کی بقا کا فریضہ سرانجام دیا تھا قدرت نے پھر ان کی رہنمائی کی اور اب وہ مسلح تیاریوں سے لیس ہو کر میدان میں آئے۔ اس مقصد کی خاطر جو بنیادی میدان تجویز ہوا وہ تھا "مسلم کا میدان"۔

ظاہر ہے کہ ایک تو پہلے ہی خدائے بزرگ و برتر نے علم کی بڑی اہمیت بیان کی ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ قولی اور عملی سطح پر ہر اعتبار سے "علم" کا مطلوب احساس ہوتا ہے، انگریز نے بھی یہی میدان تجویز کیا تھا۔ اور اسی تجویز کی روشنی میں اس نے مدارس کا قلع قمع کر کے اپنا خود ساختہ نظام تعلیم رائج کیا تاکہ ساری دھرتی کو "خداوند یسوع مسیح" کی بادشاہت میں شامل کیا جائے۔

مستقبل میں تحفظ و احیاء اسلام کی خاطر جد و جہد کے لئے "علمی میدان" حقیقت میں کسی نے تجویز نہ کیا تھا بلکہ القاء ربانی نے ارباب قلوب کو اس تجویز پر متفق کیا تھا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ سمیت وہ سب بانیان دارالعلوم نے جب مل بیٹھ کر اپنی اپنی رائے بیان کی تو نتیجہ یہ نکلا کہ قدرت نے ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کے تحفظ کے لئے جو راہ سجھائی ہے وہ ہے "علمی تحریک"۔

چنانچہ اس رہنمائی کے مطابق مدرسہ کا کام شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا اور جگہ وہ تجویز کی گئی جو شہری شور و غوغا سے دور تھی یعنی دیوبند کا قصبہ!

اس قصبہ کی تجویز کی وجوہات میں ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ برصغیر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے پہلے علمبردار حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ اور بعد میں تحریک مجاہدین کے سربراہ حضرت السید بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس جگہ سے بوئے علم آرہی ہے۔

مدرسہ کی ابتداء کے لئے کسی اشتہار و منادی کا کوئی مسئلہ نہ تھا، بس سادہ طریقے سے چند باخدا لوگوں نے ملا محمود صاحب قدس سرہ کو میرٹھ سے

اور چند یا مسجد چھتہ کے چار فٹ لمبے دالان سے کام شروع کر
درس کی ابتدا کر دی۔ مدرسہ شروع ہوا تو امیر ملت سید الطائفہ
حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کو مکہ معظمہ میں اطلاع دی گئی، آپ
نے فرمایا:

"سبحان اللہ! لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے مدرسہ
بنایا، معلوم نہیں کتنی پیشانیاں سحری کے وقت
اس مقصد کے لئے بارگاہ ربوبیت میں سجدہ
ریز ہوتی رہی ہیں۔"

ان تفصیلات سے مدرسہ بنانے یا علمی تحریک جاری کرنے کا پس منظر اور اس سلسلہ کی سوچ کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے اور جب بعد کے نتائج کو دیکھا جاتا ہے تو پھر معاملہ اور بھی زیادہ نکھر جاتا ہے۔

تفصیلی گفتگو کا تو وقت نہیں مختصراً یوں سمجھیں،

کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکام ہوئی تو مسلمانوں کی جمعیت پارہ پارہ ہو گئی، مایوسیوں نے گھیر لیا اور سوچا یہ جانے لگا کہ یہ قوم اب کبھی انگڑائی نہ لے سکے گی لیکن اس علمی تحریک کی داغ بیل سے جس کی پہلی کڑی دارالعلوم دیوبند کا قیام تھا۔ افراتفری کا شکار بکھرے مسلمانوں کے لئے ایک پلیٹ فارم مہیا کر دیا اور نئے سرے سے ایک مرکز وحدت میسر آ گیا۔

یہی مرکز وحدت ہے جو آج ایک سو سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اپنی اسی حیثیت میں موجود ہے اور ملت کی ہر نوع کی رہنمائی اس کے دم قدم سے ہے۔

۱۸۵۷ء سے پہلے بھی مختلف النوع فتنے اسلامی عقائد کے خلاف سامنے آ چکے تھے لیکن اس کے بعد جس طرح چاروں طرف سے تابڑ توڑ حملے شروع ہوئے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

تاتاریوں کا ظلم و ستم بہت مشہور ہے اور اندلس کا خونی ڈرامہ اپنی مثال آپ ہے لیکن آج تو مکر و فریب کے ہر ممکن طریق سے متاع حیات لوٹی جا رہی تھی اور عیسائی مشنریز کے ساتھ ساتھ آریہ سماجی وغیرہ اور پھر بعد کے ادوار میں انکار ختم نبوت، انکار حدیث و معجزات نبوی اور بدعات و رسوم جاہلیت کا جو عہد و دور ہوا اس نے انتہائی خطرناک صورت پیدا کر دی۔

ساتھ ہی "تعلیم جدید" کے فتنہ کو بھی شامل کر لیں جس کا ظاہری عنوان تو مرغوب تھا لیکن فی الحقیقت لارڈ میکالے کی تعلیمی سکیم کو خود نام نہاد مسلمانوں کے ہاتھوں پروان چڑھانے کی ایک گہری سازش تھی۔

اس موقع پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ جدید علوم و فنون وغیرہ کے متعلق علماء پر جو طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کی جاتی ہے وہ سرتاپا غلط ہے، علماء تنگ نظر نہیں کہ وہ اس قسم کے کردار کا مظاہرہ کریں، انہوں نے تمام علوم و فنون کی اجازت دی جیسا کہ خود سرسید احمد خان نے اپنی کتاب "اسباب بغاوت ہند" میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حوالہ سے تسلیم کیا ہے اور حضرت مولانا گنگوہی اور علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ کے فتوے بھی موجود ہیں۔ البتہ علماء کو جس بات سے اختلاف تھا وہ یہ تھی کہ مذہب و دینیات سے الگ رہ کر جو تعلیمی کھڑاگ رچایا جائے گا اس کے برگ و بار انتہائی نقصان دہ ہوں گے۔ اور قوم اپنے مرکز سے دور ہو جائے گی۔

تعصب و ہٹ دھرمی سے الگ تھلگ ہو کر اگر علماء کی اس بات کو دیکھا جائے تو آج وہ سو فیصد درست ثابت ہو گی۔

بہر حال بات ان فتنوں کی ہو رہی تھی جو متاع ایمان و اسلام کو شانے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے، لیکن دیوبند اور اس کے فرزندوں نے جس طرح ایک ایک فتنہ کے سامنے بند باندھا وہ تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جسے جھٹلانا کسی کے بس میں نہیں۔

انگریز مشنری، آریہ سماجی، مرزائی، منکرین حدیث، دشمنان صحابہ اور اہل بدعت کی تمام ترکتازیوں کے جواب میں قلمی اور لسانی جہاد اسی تحریک

کے خدام سے ٹکرایا اور ہر ایک کو منہ کی کھانی پڑی۔ والحمد للہ

بانی دارالعلوم کے وہ مناظرے اور علمی کاوشیں جو آریہ سماج کے خلاف ہوئیں ایک ریکارڈ ہے جسے تاریخ نے محفوظ کر دیا ہے۔ عیسائیت کی بات آئی ہے تو مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر آغا، مولانا ابوالمنصور وغیرہ کی خدمات سنہری حروف سے لکھی جائیں گی۔

مرزائیت کے خلاف مولانا رشید احمد گنگوہی کا فتویٰ ہے۔ اس کے بعد حضرت العلام السید محمد انور شاہ کاشمیری کا علمی جہاد، پھر آپ نے اپنے شاگردوں مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور مولانا محمد یوسف بنوری کو تصنیفی میدان میں لگا دیا۔

مجلس احرار اسلام جس کے وارث کے طور پر آج مجلس تحفظ ختم نبوت موجود ہے، کو حضرت شاہ صاحب نے اس محاذ پر کھڑا کیا پھر مجلس کے خدام نے جنہیں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا قاضی احسان احمد، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین، مولانا لال حسین اختر اور مولانا محمد حیات فاتح قادیان وغیرہ شامل ہیں نے اس محاذ پر جو کام کیا وہ تاریخ کے انمٹ نقوش ہیں۔

۵۳ء کی تحریک ختم نبوت ہو یا ۷۴ء کی تحریک ختم نبوت اسی مادر علمی کے فرزندوں نے ان میں ہراول دستے کی حیثیت سے کام کیا۔ آج مجلس تحفظ ختم نبوت نے اپنے امیر مولانا محمد یوسف بنوری کی قیادت میں مجلس عمل کے پلیٹ فارم پر ساری دنیا کو اکٹھا کر کے تحریک منظم کی، اسمبلی کے باہر حالات پر کنٹرول کیا تو یہ انہی مرحوم بزرگوں کی قربانیوں کا ثمر تھا اور اسمبلی کے اندر مجھ جیسے ناچیز سے جو کام ہوا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل اور اپنے اسلاف کی توجہات کی برکت سے تھا۔

علاوہ ازیں مجلس کا بیرون ملک یورپ، افریقہ، مشرق وسطیٰ انڈونیشیا اور دوسرے مقامات پر مجلس کا کام جاری ہے اور الحمد للہ خاطر خواہ نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔

اس مرحلہ پر یہ گذارش بھی ضروری ہے کہ حضرت مولانا احمد علی مرحوم نے مرزائیت کے خلاف جو آواز بلند کی تو وہ بھی حضرت سید محمد انور شاہ صاحب کی نظر کرم کا صدقہ تھی اور مقدمہ بہاولپور میں اہل اسلام کو مرزائیوں کے مقابلے میں کامیابی بھی محدث کاشمیری کی وجہ سے ہوئی۔ منکرین حدیث و معجزات کا فتنہ ہے تو سرسید سے لیکر غلام احمد پرویز تک ایک ایک علمبردار فتنہ کو اپنی موت آپ سلا دینے والے بھی اکابر ہیں دیال سنگھ کالج کے جلسہ میں قطب الاقطاب حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ کی پرویزیت کے قلعے پر بمباری اور پھر تمام اکابر کا متفقہ فتویٰ کہ پرویز کافر ہے، کل کی بات ہے۔

ملک کے ایک معقول حصے میں سبائیت کے اثرات کا قلع قمع کرنا اور لکھنؤ میں حق صحابہ کو منوانا مجلس احرار کی قربانی کا نتیجہ ہے جو اس تحریک طیبہ کی ایک شاخ تھی اور آج بھی اس میدان میں جو افراد اور جماعتیں سرگرم عمل ہیں اور سبائیت کے اثرات سے ملت کو بچانے کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں وہ بھی حضرت نانوتوی اور دوسرے اکابرین دیوبند کی معنوی اولاد ہیں۔

اہل بدعت جو ایک طرف بدعات و رسومات جاہلیت کی وجہ سے اسلام کے چشمہ صافی کو گدلا کر رہے تھے تو دوسری طرف "اعلام الاعلام بان ہندوستان دار الاسلام" جیسی کتابیں لکھ کر اور انگریزی فوج میں شامل فوجیوں کو ترکوں کے مقابلہ میں تعویذ دے کر ملت سے غداری کر رہے تھے، کا مقابلہ کیا اور اب تک کیا جا رہا ہے، جدید تعلیم کے نام پر جو تحریک چلائی گئی اور جس کے لئے ملک بھر کے وڈیروں نے دورے کئے اور انجمن ہائے اسلامیہ قائم کیں یا دوسرے ناموں سے انجمنیں قائم کیں ان کے مضر اور منفی اثرات سے خلق خدا کو آگاہ کیا اور دینی علوم کی اشاعت عقائد اسلامیہ کے تحفظ کے لئے وسیع پیمانے پر مدارس قائم کئے جنہیں ابتدائی،

[illegible] خدا کو [illegible]
کیا۔ اس [illegible] حرکت سے آزاد ہو کر [illegible]
نوعیت کے [illegible] مدارس کو بھی پایا اور طلبہ کو
ہر قسم کی [illegible] کی روشنی سے منور کیا گیا اور اب تک
کیا جا رہا ہے۔ اس وقت [illegible] جہاں جہاں بھی [illegible] مدارس
ہیں [illegible] اس کے [illegible] دیوبند [illegible] سب
بڑا کام کیا وہ ہے ملک کی سیاسی [illegible] آزاد کرانا۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ جب سے انگریز نے اس ملک
میں قدم رکھا اس وقت سے جو حضرات اور طبقہ انگریز کے خلاف سرگرم
عمل تھا وہ یہی طبقہ تھا اور اسی طبقہ نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں
بھرپور حصہ لیا۔ جیسے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت نانوتوی اور
حضرت گنگوہی رحمہم اللہ سرفہرست ہیں۔ حضرت نانوتوی مدرسہ دیوبند اور
حضرت گنگوہی سرپرست تھے اور ان کے محبوب ترین شاگرد حضرت شیخ
الہند قدس سرہ تھے جو دیوبند کے پہلے طالب علم تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ
نے فراغت علم کے بعد مدرسہ میں تدریس اختیار کر لی اور ابتداء میں جب
آپ مدرس ہوئے تو آپ کی حیثیت یہ تھی کہ آپ مدرس چہارم تھے اور
بڑھتے بڑھتے سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ آپ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی
قدس سرہ کے بعد مدرس اول ہو گئے۔ آپ کا طویل دور تدریس امتیازی
شان کا مالک ہے اور یہ حقیقت ہے کہ تاریخ میں حضرت امام اعظم امام
ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو شاگرد ملے اور پھر آپ کو۔ فہرست دیکھیں تو عقل
دنگ رہ جاتی ہے۔ حضرت مدنی، حضرت سید محمد انور شاہ کاشمیری، مولانا
سندھی، حضرت مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا منصور
انصاری، مولانا محمد سہول بھاگلپوری، مولانا فضل ربی افغانستان، مولانا
عزیز الرحمن عثمانی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی
مولانا رسول خان صاحب، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد الیاس کاندھلوی،
میاں اصغر حسین صاحب، مولانا محمد صادق کراچوی رحمہم اللہ تعالیٰ اور
مولانا عزیر گل وغیرہ جیسی نامور شخصیتیں آپ کو نظر آئیں گی۔ اور یہ
فہرست مکمل کا دسواں حصہ بھی نہیں۔

شاگردوں میں چند بزرگ جو میدان عمل میں سامنے نہیں آئے لیکن
انہوں نے اور دوسرے اعتبارات سے جو خدمت کی وہ اپنی مثال آپ
ہے۔ مثلاً ہزاروں کتابوں سے زائد کے مصنف حضرت تھانوی قرآن کے
مفسر اور حدیث کے شارح مولانا عثمانی امام المعقولیین مولانا محمد
ابراہیم اور مولانا رسول خان صاحب وغیرہ باقی اکثر حضرات حضرت کے
مشورے کے مطابق میدان عمل میں آئے اور شیخ کی ہدایات کے مطابق خوب
کام کیا۔

ان حضرات کو حضرت نے جہاں اور جس ڈیوٹی پر متعین کیا انہوں
نے وہاں کام کرنا سعادت سمجھا۔ مولانا مدنی قدس سرہ جو حدیث کے بہترین
اسکالر اور مجاہد انسان تھے حضرت کے مشن کے لئے ایک عرصہ تک
مدینہ طیبہ میں مقیم رہے جیسا کہ دلیت کے شیخ الاسلام نمبر کے ایک مضمون
کے مطابق علامہ سید انور شاہ کاشمیری کے سوال کے جواب میں حضرت کا
ارشاد مذکور ہے۔

مولانا سندھی ہیں تو ربع صدی تک بادیہ پیمائی کرتے رہے
اور تحریک شیخ الہند کو خوب پروان چڑھایا۔ مولانا منصور انصاری اور مولانا
فضل ربی جیسے بزرگ ہیں تو وہ مسافرت و مہاجرت کی زندگی میں خدا کو پیارے
ہو گئے، علامہ انور شاہ ہیں تو آپ نے پشاور جمعیت کے عظیم الشان اجلاس
میں خطبۂ صدارت میں جس طرح تحریک شیخ الہند کے مقاصد کی وضاحت
کی اور ترک موالات پر دلائل و براہین کے انبار لگائے وہ انہی کا حصہ تھا۔
حضرت مفتی کفایت اللہ ایک مدت تک تحریک کی مرکزی قوت
رہے، حضرت لاہوری ہیں تو وہ دہلی اور پھر دہلی کے بعد لاہور میں مشن کے
ایک داعی رہے۔

ساتھ ہی حضرت شیخ الہند نے دوسرے معروف لوگوں سے رابطہ قائم کیا جو تحریک میں مؤثر کردار ادا کرسکتے تھے ان میں حضرت قطب الاقطاب مولانا تاج محمود امروٹی، حضرت قطب زمان دین پوری رحمہم اللہ تعالیٰ قابل ذکر ہیں جنہوں نے اپنی خانقاہوں کو فوجی چھاؤنیوں میں بدل ڈالا اور انگریز کو ناک چنے چبوا دیئے۔

ادھر مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی جوہر جیسے لوگ ہیں جو حضرت شیخ الہند کے شاگرد تو نہ تھے لیکن آپ کی تحریک سے وابستہ ہوئے اور آخر تک شامل رہے اور خوب سے خوب تر کام کیا۔

اس تحریک کا ابتدائی مرحلہ تو باقاعدہ مسلح جنگ تھی جس کے لئے حکومت ترکی و افغانستان وغیرہ سے رابطہ قائم کیا گیا لیکن جب یہاں کامیابی نہ ہوئی تو مالٹا کی قید سے رہائی کے بعد عدم تشدد اور عدم تعاون کی راہ اپنائی اور اس کے لئے حضرت شیخ الہندؒ نے جمعیۃ علمائے ہند کے پلیٹ فارم کو مضبوط کرنے پر زور دیا جس کی ابتدا آپ کی رہائی سے ایک سال پہلے آپ ہی کے خدام کر چکے تھے۔

جمعیۃ علمائے ہند نے جو قابل فخر کردار ادا کیا اس کا مقابلہ کوئی تحریک نہیں کرسکتی، مسلم لیگ کو تو چھوڑیں کہ جدوجہد کا لفظ اس کی لغت میں ہی نہ تھا، کانگریس بھی ابھی تک پوری طرح بیداری کے موڑ پر نہ آئی تھی کہ بیسوی صدی کے پہلے ربع کے اختتام پر جمعیۃ نے کامل آزادی کا نعرہ لگا کر جدوجہد کو نیا رنگ دیا

اس موقع پر جمعیۃ علمائے ہند کی خدمات کا سرسری خلاصہ بیان کرنا بیجا نہ ہوگا۔

(۱) عدم تعاون کا فتویٰ جو پہلی جنگ عظیم کے موقع پر دیا گیا اور اسی کی بنیاد پر کانگریس و خلافت کے کارکن بھی میدان میں آئے یہ فتویٰ ضبط ہوا اور ہزارہا علماء کو بے پناہ مصائب برداشت کرنا پڑیں جن میں علمائے [illegible] استقامت کا مظاہرہ کیا۔

(۲) حجاز میں شریف حسین کے بعد ابن سعود کی حکومت بنی تو جمعیۃ نے مؤتمر مکہ میں اپنا وفد بھیجا جس سے خاطر خواہ دینی فائدہ ہوا۔

(۳) فلسطینیوں پر مظالم کا سلسلہ شروع ہوا تو جمعیۃ نے ملک بھر میں فلسطین ریلیف فنڈ کا اہتمام کیا ان کے مطالبات کو تحریک کی شکل دی اور دنیا بھر کے نمائندوں کی کانفرنس منعقدہ مصر میں صدر جمعیۃ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کی قیادت میں وفد بھیجا۔

(۴) اسی دور میں شیعہ بل کابل اسمبلی میں آیا جس کے پس پردہ برطانوی سازشیں کارفرما تھیں، جمعیۃ نے پیہم جدوجہد سے اس سازش کو ناکام کر دیا۔

(۵) ۱۹۲۸ء میں کانگریس کی رہنمائی میں آل پارٹیز کانفرنس میں جب ہندوستان کے لئے دستوری خاکہ تیار ہوا تو واحد جماعت جمعیۃ تھی جس نے اسلامی نظام و مفاد کے پیش نظر تنقیدی رپورٹ تیار کرکے کانگریس کا دُم چھلا ہونے کے احمقانہ الزام کی عملی تردید کی۔

(۶) ۱۹۲۹ء میں یوپی میں تمام اسلامی جماعتوں نے جلسہ کرکے مسلمانوں کے قومی و ملی حقوق کے لئے ایک متفقہ فارمولا تیار کرنے کا پروگرام بنایا تو جمعیۃ کے نمائندے اس میں شریک ہوئے اور بالخصوص حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کی جدوجہد اور خلوص نے کامیابی کی منزل آسان کر دی یہ الگ بات ہے کہ گول میز کانفرنس میں جانے والے خود غرض مسلم نمائندے اپنی کوتاہی کے پیش نظر اس مسودہ کو دستور میں شامل نہ کرا سکے۔

(۷) ساردا ایکٹ جو اس دور کا گویا پاکستانی عائلی قوانین تھا ۱۹۲۹ء میں اسمبلی میں پاس ہوا۔ جمعیۃ نے سول نافرمانی کا فیصلہ کیا اور

حکومت کے اس سوال کا دو ٹوک مخالفت میں دی گئی

(۸) اسی دور میں پارلیمنٹ سے شاردا قانون منظور ہوا جس سے ذرائع
مرعیوں کے لئے مشکلات پیدا ہو گئیں جمعیۃ نے بے پناہ جدوجہد
سے کچھ ترامیم منظور کرائیں۔

(۹) بعض صوبوں شمال سرحد وغیرہ میں شریعت اسلامیہ کو رواج
پر ترجیح دینے اور عملاً اس کے نفاذ میں جمعیۃ کی بھی کوشش
شامل ہے۔ بدقسمتی سے مرکزی اسمبلی میں یہ کوشش رنگ محاذ
نے پروان نہ چڑھنے دی۔

(۱۰) ۱۹۳۱ء کے کانگریس کے دستوری فارمولے کے مقابلہ میں
صرف جمعیۃ نے اپنا فارمولا مرتب کیا جبکہ کانگریس نے کہا تھا
کہ اس سے بہتر فارمولا ہو تو پیش کیا جائے۔

(۱۱) ۱۹۳۲ء کے کمیونل ایوارڈ فرقہ وارانہ مسائل کا فیصلہ شائع
ہوا اور وزیر اعظم نے خود شائع کیا تو قوم پرور مسلمانوں کو جمعیۃ
کا ساتھ تو تیک شامل نہ ہوں لیکن دفعہ تعداد کی حالت شامل
ہوئی اور ایکٹ ۱۹۳۵ء میں صرف اور بنیادی باتیں شامل
کر لی گئیں۔

(۱۲) اسلامی اوقاف کی حفاظت کے لئے جمعیۃ علماء نے اپنے
ممبران اسمبلی کی وساطت سے مسودہ بل اسمبلی میں پیش کر دیا تو اس
سے اسلامی اوقاف کی حفاظت کا انتظام درست ہو گیا۔

(۱۳) کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے زمانہ میں [illegible]
تجویز ہوئی تو جمعیۃ علماء [illegible] ریاست [illegible]
آخر [illegible] کانگریس حکومت کو [illegible]
[illegible] جمعیۃ کے اقدام کو صحیح قرار دیا۔

(۱۴) علماء کو ایک مرکز پر جمع کرنا ایک بہت بڑی دینی خدمت ہے
اور یہ فخر جمعیۃ کو حاصل ہے کہ اس نے دیوبندی بریلوی اہل حدیث
شیعہ علماء کو ایک مرکز پر اکٹھا کیا۔ جمعیۃ کی مجالس میں ہر طرح کے
لوگ موجود تھے اور کوئی اختلاف آپس میں نہ تھا۔

(۱۵) امارت شرعیہ فی الہند کا اہتمام کر کے مسلمانوں کے لئے دینی
وحدت کا استحکام کیا۔ یہ پروگرام بہار میں سب سے زیادہ کامیاب ہوا
اور اب تک ہے۔

(۱۶) مکمل آزادی کا نصب العین سب سے پہلے جمعیۃ نے اختیار کیا
اس کے بعد کانگریس نے مسلم لیگ نے تو ۱۹۴۰ء میں ایسا کیا وہ بھی با امر
مجبوری۔

(۱۷) ۱۹۲۸ء کے سائمن کمیشن کے سلسلہ میں سب سے پہلے جمعیۃ نے
اپنے اجلاس پشاور میں امام العصر محدث کاشمیری کی زیر صدارت
بائیکاٹ کیا۔

(۱۸) ۱۹۳۰ء کے خونی حادثہ قصہ خوانی پشاور کے متعلق حضرت مفتی کفایت اللہ
صاحب اور حضرت مفتی محمد نعیم صاحب پر مشتمل جمعیۃ نے تحقیقاتی کمیٹی
بھیجی جسے پشاور جانے نہ دیا گیا تو راولپنڈی میں بیٹھ کر اس نے کام کیا۔
رپورٹ مرتب کی جسے حکومت نے ضبط کر لیا۔ یہ وہ وقت تھا جب
سرحد کے مظلوم عوام مسلم لیگ سمیت سب کے دروازے پر گئے لیکن
کسی نے کوئی تحریک نہ کیا۔

(۱۹) ۱۹۳۱ء میں سرحد کے مظلوموں کے لئے فنڈ اکٹھا کیا اور ہر طرح
امداد و اعانت کی۔

(۲۰) اردو زبان کی خدمت میں جمعیۃ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بہار میں
اس کے زیر اثر حکومت ۱۹۳۸ء میں بنی تو اس نے دفتری زبان بھی قرار دیا
بعد میں کانگریسی حکومت نے اس فیصلہ کو بحال رکھا۔

(۲۱) ۱۹۲۲ء کے شدھی سنگٹھن کے فتنوں کا مقابلہ جمعیۃ نے اس طرح
کیا کہ لاکھوں مسلمانوں کے ایمان محفوظ ہو گئے شعبہ تبلیغ و حفاظت اسلام
کی داستان ایک سنہری داستان ہے۔

(۲۲) کانگریس کی واردھا تعلیمی اسکیم پر تنقیدی رپورٹ مرتب کرکے ۲۹ء میں شائع کی۔ اس کمیٹی میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا احمد سعید اور مولانا نورالدین بہاری قدس سرہم شامل تھے۔

(۲۳) ہندو مسلم فسادات اس ملک کا المیہ رہے ہیں لیکن جمعیۃ نے ہمیشہ مظلوم کی حمایت میں آواز اٹھائی اور کسی تعصب کا شکار نہ ہوئی کہ منشائے اسلام یہی تھا۔

(۲۴) مدراس اسمبلی میں ذبیحہ گاؤ کی مخالفت کا بل مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ کی مداخلت پر رد کیا گیا۔ نیز بمبئی حکومت نے رنگیلا رسول جیسی ناپاک کتاب شائع کرنے کی اجازت دی تو مولانا موصوف کی ہی کوشش سے اس کی اشاعت رکی۔

(۲۵) دوسرے ممالک کے مسلم برادران کی جمعیت نے جس طرح خدمت کی اور مختلف علاقوں میں باقاعدہ جماعتی نظم قائم کیا وہ ایک مستقل داستان ہے۔

(۲۶) شرعی حدود میں رہ کر برصغیر کے تمام لوگوں کو حصول حقوق کے لئے متحد کرنے کی بھرپور جدوجہد کی۔

یہ چند نمبرات ہیں جو اصل خدمات کے مقابلہ میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے ہر ہر نمبر پر ایک مستقل مقالہ لکھا جا سکتا ہے، ہم نے محض تعارف کرانے کی غرض سے یہ چند جملے لکھ دیئے ہیں تاکہ نسلِ نو کو دیوبند کے سپوتوں کا پتہ چل سکے۔

نہ تو میرے پاس اتنا وقت ہے اور نہ ہی شاید الرشید کے صفحات میں اتنی وسعت ہو کہ وہ اتنی طویل تاریخ شامل کر سکے۔ ضرورت یہ ہے کہ کوئی مستقل ادارہ دیوبند کے ایک ایک شعبہ پر مستقل کام کرے اور آئندہ نسلوں کے لئے وہ تمام دستاویزات مرتب کر دے۔

حضرت شیخ الہند کے ان خدام و متعلقین کی صبر آزما جدوجہد بالآخر رنگ لائی اور آزادی کا سورج طلوع ہوا [illegible] طلوع ہوئی کہ برصغیر پاک و ہند میں [illegible] زبوں حالی کا شکار تھی۔ اس موڑ پر تقسیم شدہ ملک کے [illegible] مولانا آزاد، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا حفظ الرحمٰن [illegible] میاں اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمہم اللہ جیسے لوگوں نے [illegible] بچایا تو ادھر حضرت لاہوری قدس سرہ اور حضرت امیر شریعت [illegible] کام آئے جنہوں نے تحریک کے لئے بے بہا قربانیاں دیں۔

اور یہ حقیقت ہے کہ جس مقصد کی خاطر پاکستان معرض وجود میں آیا تھا اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اسی قافلہ نے خدمت کی اور آج تک خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ حضرت لاہوری قدس سرہ کے بعد حضرت درخواستی زید مجدہم قافلہ سالار ہونے کی حیثیت سے معروف مسلم ہیں جن کی قیادت میں جمعیۃ علماء اسلام سرگرم عمل ہے۔ ملک بھر کے [illegible] جماعت سے وابستہ ہیں۔ جن میں حضرت دین پوری، مولانا سید محمد شاہ امروٹی، مولانا عبدالکریم بیر شریف مدظلہ، مولانا عبیداللہ انور، مولانا محمد کندیاں، مولانا عبداللہ بہلوی جیسے سراپا علم و عمل لوگ شامل ہیں تو مولانا عبدالحق اکوڑوی، مولانا محمد ایوب جان بنوری، مولانا محمد شریف جالندھری، مولانا مفتی محمد عبداللہ ملتانی جیسے ارباب علم و فضل بھی ہیں۔

جمعیۃ کی پشت پر پہلے کی طرح قربانیوں کا ایک سلسلہ آج بھی ہے جن میں عزیزان گرامی مولانا سید شمس الدین اور منیر شہید امروٹی کی شہادت تو تازہ واقعات ہیں۔ پھر ملک میں کوئی تحریک ہو یہی قافلہ ہے جو سب سے آگے ہوتا ہے۔

جمعیۃ کو خدا نے کچھ دن اقتدار کا موقع دیا تو اس نے ثابت کر دیا کہ اللہ اس ذمہ داری کو سنبھالا اور اس طریق سے سنبھالا کہ باید و شاید۔ دنیا کا ذہن اسلامی نظام کے متعلق یہ تھا کہ یہ نظام معاذاللہ اس دور میں ناقابل عمل ہے۔ اس ژولیدگی اور ژاژخائی کے اثرات اس طرح ختم ہوئے کہ نوواردوں کے حق میں

و بیچارہ و مشتاق ہی سعادت حاصل کر ہی نہیں اٹھا کر سکتا۔ یہی وجہ ہے بہت بڑا حصہ حضرت تھانوی کے خلفاء خصوصی اور ممتاز کارکنوں کے نرمی و تعلق کا فرض و تقاضا مظاہر جمعیۃ علماء اسلام کے متعلق اس سے زیادہ کچھ اس سلسلے میں لکھنا اس کی خوبیاں تازہ ہیں اور ہم کے سامنے ہیں۔

یہ تو ہوا پاکستان کا ذکر کہ اس میں دیوبندی مکتب فکر کے وہ تعداد مدارس اور جامعات معروف کام ہیں تو سابقہ مشرقی پاکستان موجودہ بنگلہ دیش، میں بھی حضرت مدنی، حضرت تھانوی، رحمہما اللہ تعالیٰ کے وسیلہ بیشمار سینکڑوں مدارس کام کر رہے ہیں اور وہاں کے دینی ذہن کا ادارہ اور یہاں لوگوں پر ہے حقیقت یہ ہے کہ اسلامی اخوت و مساوات کے سنہری اصولوں پر عمل ہوتا تو علیحدگی و تفریق کا یہ دن ہمیں نہ دیکھنا پڑتا۔

اور موجودہ ہندوستان کی بات ہے تو دارالعلوم دیوبند تو ابھی وہاں موجود ہے ہزاروں طلباء سینکڑوں کا عملہ اساتذہ کا خرچ ہے، پھر سہارنپور، دہلی، مراد آباد، امروہہ، کلکتہ وغیرہ کے مدارس ہیں ساتھ ہی دینی تنظیم کے طور پر جمعیۃ علماء ہے جس کا اپنا پریس ہے اخبار الجمعیۃ بھی نکلتا ہے مسلمانوں کی جو خدمت کی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہزاروں مساجد کی آبادی کا اہتمام کیا اور لاتعداد شبینہ مدارس کھولے، مسلم اوقاف، مسلم پرسنل لاء وغیرہ اب بھی محفوظ ہے وغیر ذالک۔۔ اس خدمت عظیم تو یکسر معنی کا ہے صرف انہی بزرگوں کا، مدینہ میں کام درسگاہ ان کا۔ جس کے بانی حضرت مدنیؒ کے بھائی تھے اور جو آج بھی معروف عمل ہے، پھر آپ افریقہ، یورپ مشرق وسطیٰ حتیٰ کہ کیمونسٹ ممالک میں روس وغیرہ جائیں تو دینی رونق ہوگی وہ ان بزرگوں اور تحریک کے کارکنوں کے صدقہ ہوگی۔

مستحق تبریک ہے ادارہ الرشید جس نے اس تحریک ولولہ کی خدمات سے دنیا کو متعارف کرانے کے لئے یہ بیڑا اٹھایا اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوصف حصول سعادت کی غرض سے یہ مسعود کام کیا اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

دینی و مذہبی مدارس کے متعلق

ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کی رائے گرامی

حکیم احمد شجاع اپنی کتاب خوں بہا حصہ اول صفحہ ۴۳۹ پر رقم طراز ہیں: ۔۔۔ واپس آکر میں نے پاکپتن شریف (منٹگمری) کے مسلمانوں کی یہ نفسیاتی کیفیت اور اپنے ان احساسات کی روداد ڈاکٹر محمد اقبال کو سنائی۔ وہ پہلے تو حسب عادت میری باتیں غور سے سنتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں میرے احساسات سے ہمدردی ہے۔ پھر آنکھیں بند کر کے سوچنے لگے، جب میں اپنی کہانی سنا چکا۔ تو فرمایا: جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی، میں بھی وہی کچھ چاہتا تھا جو تم چاہتے ہو۔ انقلاب، ایک ایسا انقلاب جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذب اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کر دے۔ علامہ اقبال نے فرمایا، ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہی مکتبوں میں پڑھنے دو۔ اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا، جو کچھ ہوگا میں انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ان مکتبوں کے اثر سے محروم ہوگئے، تو بالکل اسی طرح جس طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈرات اور الحمراء اور باب الاخوتین کے نشانات کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا" (انتہیٰ کلام اقبال)

برصغیر میں
مسیحی مشنریوں کی سرگرمیاں
— اور —
علمائے دیوبند

— اختر راہی ایم اے —

○

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کا ایک سبب ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی میں عیسائی پادریوں کی جارحانہ سرگرمیاں تھیں۔ بعض ضلعوں میں یہ رواج بن گیا تھا کہ جب پادری منادی کے لیے روانہ ہوتا تو تھانے کا چپراسی اس کے ساتھ رہتا۔ اہل ہند کی غربت و افلاس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے پادریوں نے مالی منفعت اور تعلیم کا لالچ دے کر انھیں دام عیسائیت میں پھانسنا شروع کیا۔ ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں یتیم ہونے والے بچوں کو کفالت کے نام پر عیسائی بنا لیا گیا تھا۔ انگریز افسروں کا طرز عمل یہ تھا کہ "بعض صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی پر آن کر پادری کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا۔"[1]

۱۸۵۵ء میں پادری اے۔ ایڈمنڈ (A-ADMOND) نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیاں بھیجیں جن کا مطلب یہ تھا کہ "اب تمام ہندوستان میں ایک عمل داری ہو گئی ہے۔ تاربرقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی۔ ریلوے سڑک سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی۔ مذہب بھی ایک چاہیے۔ اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ عیسائی ہو جاؤ۔"[2]

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے بارے میں عوام کا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ "ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو کیا ہندو اور کیا مسلمان عیسائی مذہب اور اپنے ملک کے رسم و رواج پر لا ڈالے۔"[3]

نواب قیصر جہاں بیگم نے اپنے روزنامچے میں ۲۱ مئی ۱۸۵۷ء کو لکھا:

"ریاستی الحاق (اودھ) کے علاوہ کمپنی نے علی الاعلان تبلیغ نصرانیت شروع کر دی اور اس کے قول کے مطابق جامع مسجد دہلی کو کلیسا میں تبدیل کرنے کے لیے مشن اور عیسائی دنیا کوشش میں ہے کہ جامع ایاصوفیہ کا بدلہ لیا جائے۔ مسیحی پادریوں کی ہمت اس حد تک بڑھ چکی ہے

[1] اسباب بغاوت ہند ص ۱۲۴ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۱۲۰

کردہ مسلمانوں سے مقابلے پر اتر آئے ہیں۔ تقریباً عہد
انگریزی میں مقابلوں کے سبب جنگ بھی شروع ہو چکی
ہیں۔ کمپنی نے ہندوؤں کو عیسائی بنانے کی ہر ممکن کوشش
شروع کر دی ہے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کو اس خطرے
سے آگاہ کیا ہے۔ ہندوؤں نے بھی مذہبی جذبات کے تحت
بغاوت شروع کر دی۔ سیدہ النساء بیگم نے
اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ اب عیسائی پادری ہر طرح
مذہب اسلام کی مذمت کرنے لگے ہیں جس سے شبہ
امکان تھا کہ مذہبی شورش و فتنہ بپا ہو۔ بہادر شاہ ظفر
سے میں نے ایک مرتبہ عرض کیا۔ انھوں نے فرنگی حاکم
سے شکایت کرنے کا وعدہ کیا اور عیسائیوں کی اس
جرأت پر ملال خاطر پایا۔ کشمیری دروازے کا بڑا گرجا
آج کل نصرانیوں کا مرکز ہے اور عام لوگ کہتے ہیں۔ لو
ابھی اب دین کی خیر نہیں۔[1]

بیگم موصوف کے روزنامچہ کا ایک دوسرا صفحہ ملاحظہ ہو:

"دہلی میں قتل عام کا حکم دے دیا گیا ہے۔ بے گناہ شہریوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ہزاروں نوجوانوں، بوڑھوں، عورتوں، اور معصوم بچوں کو مکان میں بند کر کے خاکستر کر دیا گیا۔ انگریز جنرل غضبناک ہے۔ اس نے میجر رینالڈ (RENARD) کو حکم دیا ہے کہ تمام قصبہ فتح پور کی آبادی کو تہ تیغ کر دیا جائے کیوں کہ اس جگہ ایک عیسائی گرجا کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالی گئی تھی اور نصاریٰ کے پادریوں نے اس کی جنرل سے شکایت کی تھی۔"[2]

کمپنی کی حکومت کو چاہیے تھا کہ وہ امن و امان کی خاطر عیسائی پادریوں کی سرگرمیوں کو ختم کر دیتی مگر اہل اقتدار کا منشا مندرجہ ذیل بیانات سے معلوم ہو سکتا ہے:

سر چارلس ٹریویلین آئی سی ایس نے جو کونسل کا ممبر تھا اور بعد میں گورنر ہوا، ایک موقع پر ان خیالات کا اظہار کیا:

"میرا یقین ہے کہ جس طرح جابلس کے کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے اسی طرح یہاں بھی سب کے سب ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے۔ کیونکہ ہمیں مذہب عیسوی کی تعلیم، عمدہ کتابوں، اخباروں اور دیگر ذریعوں سے بات چیت وغیرہ کے ذریعہ نفوذ کرنے کی حتیٰ کہ عیسوی علوم سوسائٹی میں اثر کر جائیں گے تب برہمنوں کی تعداد میں عیسائی ترا کریں گے۔"[3]

برطانوی دارالعوام کے رکن میگلس نے ۱۸۵۷ء کے آغاز میں ایوان میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن اس لیے دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت ہندوستان کے زیر نگین رہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیے اور اس میں کسی طرح تساہل نہ ہونا چاہیے۔"[4]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے عیسائی پادریوں کی مساعی کو نقصان پہنچا اور وقتی طور پر ان کی مہم میں پہلی سی تیزی اور سرگرمی نہ رہی۔ برطانوی حکومت سوچنے لگی کہ مذہب کے معاملے میں غیر جانبدار رہا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ

[1] ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء ص ۱۰۵، ۱۰۶ [2] ایضاً ص ۱۰۶ [3] بحوالہ سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص ۳۸
[4] PUNJAB AND SIND MISSONS P. 294

ہندوستان کی حکومت ہی ہاتھ سے نکل جائے چنانچہ یکم اکتوبر ۱۸۵۸ء کو الٰہ آباد کے دربار عام میں ملکہ وکٹوریہ نے اعلان کیا:

"دین عیسائیت پر پختہ ایمان رکھتے ہوئے اور مذہب کی طمانیت کا جذبات تشکر سے اقرار کرتے ہوئے ہم اعلان کرتے ہیں کہ نہ تو یہ ہمارا حق ہے اور نہ ہماری خواہش ہی کہ ہم اپنے عقائد کو اپنی رعایا کے کسی حصے پر ٹھونسنے کی کوشش کریں۔ ہمارا شاہانہ ارادہ اور خوشی یہ ہے کہ ہماری رعایا میں کسی شخص کو اس کے مذہبی عقیدہ اور رسوم کی بنا پر نہ تو کسی رعایت کا مستحق سمجھا جائے اور نہ تنگ کیا جائے۔ نہ کسی کا سکون چھینا جائے بلکہ قانون کی نظر میں تمام لوگ مساوی طور پر غیر جانبدارانہ رنگ میں پوری حفاظت کے حقدار ہوں۔"

ملکہ وکٹوریہ کے اس اعلان کے باوجود عیسائیت کے علمبرداروں کی رائے یہ تھی کہ ہنگامہ کا سبب عیسائیت کی تبلیغ میں کوتاہی ہے۔ پادری فانڈر کہا کرتا تھا کہ "خدا نے یہ ہولناک دن ہماری گذشت پر اس لیے بھیجے ہیں کہ وہ ہندوستان میں بت پرستی کی معاون اور مسیحیت کی مددگار ہونے سے گریزاں رہی ہے۔"[1]

سر ہربرٹ ایڈورڈ کہتا تھا کہ غدر برپا ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ عیسائیت کی تبلیغ کی گئی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ عیسائیت کی تبلیغ نہ کی گئی۔[2]

ملکہ وکٹوریہ کا اعلان لفظی جمع خرچ ثابت ہوا۔ پادریوں کی سرگرمیاں پہلے سے بڑھ گئیں۔ سرکاری اہلکاروں نے مشنریوں کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور صلیب کی علمبرداری کے لیے روپیہ پانی کی طرح بہایا۔

۱۸۵۸ء میں انگلستان میں ایک انجمن اس غرض سے قائم کی گئی کہ ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کے [illegible]

(CHRISTIAN LITERARY SOCIETY FOR INDIA)

نے ۱۸۶۰ء میں اپنی کوشش کو پراثر بنانے اور مساعی کو منظم کرنے کے لیے "اوپل" میں پیغمبروں کی [illegible] کو وسیع پیمانے پر ہندوستانیوں کو بپتسمہ دینے کا پروگرام [illegible]

۱۸۶۲ء میں انگلستان کے وزیر اعظم لارڈ پامرسٹن [illegible] سے ایک وفد نے ملاقات کی۔ وفد کا سربراہ بشپ آف [illegible] تھا۔ وفد نے ہندوستان میں مشنری سرگرمیوں کی طرف توجہ دلائی تو پامرسٹن نے کہا:

"میرا ایمان ہے کہ وہ نیا عیسائی جو ہندوستان میں عیسائیت قبول کرتا ہے وہ انگلستان سے نئے رابطہ کا باعث بنتا ہے اور حکومت کے استحکام کا ذریعہ ہے۔"[3]

وزیر اعظم لارڈ پامرسٹن نے اس موقع پر کہا:

"میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب اپنے مقصد میں متحد ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہی نہیں بلکہ خود ہمارا مفاد بھی اس امر سے وابستہ ہے کہ ہم عیسائیت کو ہندوستان کے کونے کونے تک پھیلا دیں۔"[4]

لارڈ لارنس (وائسرائے ہند ۱۸۶۴ء – ۱۸۶۹ء) نے ایک موقع پر کہا تھا:

"کوئی چیز بھی ہماری سلطنت کے استحکام کا اس سے بڑھ کر سبب نہیں ہو سکتی کہ ہم عیسائیت کو ہندوستان میں پھیلا دیں۔"[5]

۱۸۶۴ء میں کشمیر میں مشن قائم ہوا تو لیفٹیننٹ گورنر سر رابرٹ منٹگمری نے ایک ہزار روپیہ چندہ دیا۔ چنانچہ تعمیر ہوتے رہے اور مشنریوں کی تعداد میں

---

[1] عیسائیت کے علمبردار ص ۲۵ [2] حکومت خود اختیاری [3] THE MISSIONS P. 234 [4] THE MISSIONS P. 234 [5] LORD LAWRENCE'S LIFE P. 313

[illegible]

۱۸۶۶ء میں گارساں دتاسی نے "دی بنگال کرسچن ایجوکیشن سوسائٹی" کی کارکردگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے:

"سوسائٹی کی تیسری رپورٹ میرے پیش نظر ہے۔ اس انجمن نے بھی بڑا مسیحیت کی تبلیغ کے لیے کتابیں چھپوائی ہیں۔ یہ کتابیں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہیں، جو وہاں کے باشندوں میں سے اکثر اہل ہند بولتے ہیں، طبع ہوئی ہیں۔ ان کتابوں کے نسخوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ ہے۔ یہ کتابیں [illegible] ہیں۔ اس انجمن میں اس وقت ستر مدارس چل رہے ہیں جن میں ۶۲۲۰ طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔ ان مدارس میں عیسائی مدرس دنیوی اور مذہبی تعلیم دیتے ہیں۔" [1]

انگریز مشنریوں کے علاوہ سکاٹ لینڈ، جرمنی، بلجیم، فرانس اور امریکہ کے مشنری بھی اس کوشش میں شریک تھے۔ مختلف فرقوں سے متعلق مشنوں نے اپنے اختلافات کو بھلا کر کام جاری رکھا اور تصادم سے بچنے کی خاطر انہوں نے ملک کے مختلف حصوں کو آپس میں بانٹ لیا۔

جرمن مبلغوں کی کوششوں پر گارساں دتاسی نے روشنی ڈالی ہے:

"جرمن مبلغین بھی ہندوستان میں مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت میں منہمک ہیں۔ ان کا مرکز برلن کا گوسنر (۱۸۵۰ء – ۱۸۵۸ء) ہے۔ اس نے کول لوگوں میں مسیحیت کی تبلیغ کی۔ (کول لوگ بنگال کے اس ضلع میں آباد ہیں جو چھوٹا ناگپور ہے)۔ اس وقت اس علاقے میں ۱۲ ہزار سے ۱۴ ہزار تک عیسائی ہیں۔ چونکہ جرمن مبلغین کا تعلق حاکم قوم سے نہیں، اس واسطے غالباً دیسی لوگوں میں زیادہ مقبول ہیں ...... ۱۸۷۰ء میں صرف آگرہ کے جرمن مشن سے ۱۷۹۰۴ نسخے ہندی رسائل کے ۲۵۰۰۲ نسخے اردو کے شائع کیے۔" [2]

۱۸۶۲ء میں غیر انگریز مبلغین کے علاوہ چار سو انگریز مبلغین مشنری کام کرتے تھے جنہوں نے بائیس سو مقامات پر مشن قائم کیے۔ [3]

پادریوں کے علاوہ گورنروں اور دوسرے اہل کاروں نے بھی تبلیغی مساعی جاری رکھیں۔ پنجاب کے گورنر سر ڈونلڈ میکلوڈ نے کانگڑہ مشن کی بنیاد رکھی تھی اور کہتا تھا کہ ہم سرزمین ہند پر اپنی سلطنت کا استحکام جب ہی کر سکتے ہیں کہ یہ ملک عیسائی ہو جائے۔ پنجاب کے دوسرے گورنر چارلس ایچی سن کا مذہبی جذبہ تو پادریوں کے لیے بھی نمونہ تھا۔ ۲۱ نومبر ۱۸۸۳ء کو ایچی سن نے مشن چرچ بٹالہ کا سنگ بنیاد رکھا تو ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کو ضروری قرار دیا۔ پنجاب میں مشنری سرگرمیوں میں سرکاری افسران لارنس، منٹگمری، ایڈورڈس، میکلوڈ، رنیل اور ٹیلر کا حصہ غالباً پادری حضرات سے کم نہیں۔

راولپنڈی اور امرتسر کا کمشنر ای۔ اے۔ پرکنز تیس سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۹۶ء میں باقاعدہ مبلغ بن گیا تھا۔

عیسائی مشنری تحریک سے مسلمانوں کا ایک طبقہ متاثر ہوا جس نے اسلام کو بزعم خویش "دین فطرت" ثابت کرنے کے لیے معجزات کی عجیب و غریب تاویلیں کیں۔ ملائکہ اور جنوں کے الگ وجود سے انکار کر دیا۔ جنت اور دوزخ کو دنیوی زندگی کی خوشحالی اور افلاس پر محمول کیا۔ اس طبقے کے سرخیل سر سید احمد خاں، سید امیر علی اور مولوی چراغ علی جیسے لوگ تھے۔ اسلام کے بارے میں ان حضرات کا رویہ معذرت آمیز رہا۔ انہوں نے جہاد کی اصل روح مسخ کر دی اور جہاد کو صرف دفاعی جنگ تک محدود کر دیا۔ معراج نبی کو روحانی قرار دیا۔ تعدد ازدواج کے بارے میں معذرت کی اور حیات عیسیٰ کا انکار کر دیا۔

---

[1] مقالات گارساں دتاسی ص ۱۴۸ [2] مقالات گارساں دتاسی ص ۱۵۰، ۱۵۱ [3] ایضاً ص ۳۸۴

یہ جتنا سیاسی طور پر جدید تہذیب و تمدن اور نظامِ تعلیم اپنا لینے میں کوئی نقصان نہیں خیال کرتا تھا، انگریزوں سے اپنے تعلقات استوار کرنے کے لیے اس طبقہ نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ممکن ہے سیاسی سطح پر اس رویہ سے مسلمان قوم کو فائدہ پہنچا ہو مگر مذہبی میدان میں اس سے فتنہ برپا ہوا۔ اسی اندازِ فکر کا اظہار مرزا غلام احمد قادیانی اور منکرینِ سنت کی صورت میں ہوا

ہندو بھی مشنری تحریک سے اثر پذیر ہوتے۔ ان میں بھی مذہب کی تبلیغ کا جذبہ پیدا ہوا۔ مسلمان تجدد پسندوں کی طرح ہندوؤں کے جدید تعلیم یافتہ گروہ نے ویدوں کی تعلیمات کو سائنس کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ویدوں کے احیاء کے لیے آریہ سماج کی تحریک اٹھی۔ ہندو مذہب جو کسی زمانے میں بھی تبلیغی نہیں رہا۔ اس میں ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جو اپنے مذہب کو ہندوستان کے حدود سے باہر پھیلانا چاہتے تھے۔ آریہ سماج جو مشنری تحریک کے ردِ عمل میں قائم ہوا۔ کچھ عرصہ تو اس کا رُخ عیسائیت کے خلاف رہا مگر آخر میں اس کی تمام طاقت اسلام کے خلاف خرچ ہونے لگی۔

ان حالات میں ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔ دارالعلوم کی روحِ رواں مولانا محمد قاسم نانوتوی کی ذات تھی۔ شیخ اکرام مرحوم لکھتے ہیں "مولانا محمد قاسم نانوتوی مدرسہ دارالعلوم کے اصل بانی نہ تھے لیکن مدرسہ کو ایک شاندار دارالعلوم بنانے کا خیال آپ کا تھا۔ حضرت بزرگوں نے اس مدرسے کو شروع کیا۔ شاید ان کا منتہائے مقصود ایک مکتب سے زیادہ نہ تھا جو جامع مسجد کی سہ دریوں میں جاری رہ سکتا ہو لیکن مولانا محمد قاسم نے شروع ہی سے اپنا تخیل بلند رکھا اور مدرسے کی بنیادیں اس قدر وسیع اور بلند رکھیں کہ ان پر دارالعلوم کی عالیشان عمارت تعمیر ہو سکی"[1]

دارالعلوم دیوبند ایک مدرسے سے تحریک بن گیا۔ زندگی کے ہر شعبے میں اس تحریک کے اثرات مرتب ہوئے۔ سیاسی میدان میں اس کا ایک نظریہ تھی۔ مذہبی میدان میں اس کا ایک ڈھنگ تھا۔ مثبت انداز میں دارالعلوم نے اسلامی علوم و تمدن کی حفاظت کی [illegible] کوشش کی۔ ہزاروں افراد ہر سال اکتسابِ فیض کے لیے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک سے دارالعلوم آتے رہے اور اس سے [illegible] وابستہ رہے [illegible] دست و بازو بنتے رہے۔ اسلامی علوم و تہذیب کی [illegible] کے ساتھ ساتھ علمائے دیوبند نے ان عملوں کو بھی [illegible] اسلامی [illegible] تہذیب کو تباہ کرنے کیلیے جاری تھے۔ عیسائی مشنری ہوں یا آریہ سماجی، قادیانی یا منکرینِ حدیث، ہر گروہ کے حملوں کا جواب دینے کے لیے علمائے دیوبند ہمیشہ پیش پیش رہے۔

ایک مختصر مضمون میں (جو نہایت قلیل وقت میں لکھا گیا ہو) علمائے دیوبند کی ان تمام کوششوں کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس مضمون میں دیوبند کے چند فرزندوں کی صرف ان سرگرمیوں کا کچھ ذکر کیا جائے گا جو انہوں نے عیسائی مشنری تحریک کی روک تھام کے لیے کیں۔

تحریک دیوبند کے سابقین الاولین میں سے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے عیسائی پادریوں کا مقابلہ کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد روپوش چلے گئے۔ واپس آئے تو منشی ممتاز علی کے مطبع مجتبائی میں تصحیح کا کام کرنے لگے۔ اس عرصے میں انھوں نے پادریوں کے ہجوم وعظ و تبلیغ کا جائزہ لیا اور اسی انداز میں ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے تدارک کا کام بنایا۔ اپنے شاگردوں کو اس کام کے لیے تیار کیا کہ وہ بازاروں اور چوراہوں میں کھڑے ہو کر پادریوں کا جواب دیں اور اسلام کی حقانیت دلائل و براہین سے ثابت کریں۔

ایک روز خود بھی بازار میں بغرض تبلیغ پہنچے تو وہاں وعظ کرتے ہوئے پادری تارا چند سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ پادری تارا چند کو برسرِ عام لاجواب کیا۔ یہ واقعہ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ تا جمادی الثانی ۱۲۹۲ھ کے درمیان کا ہے۔[2]

اگلے سال ۱۲۹۳ھ، ۱۸۷۶ء میں قصبہ چاند پور (شاہجہانپور سے پانچ میل کی مسافت پر یہ قصبہ ہے) کے ہندو رئیس منشی پیارے لال کبیر پنتھی نے ایک مذہبی مباحثہ کا اہتمام کیا اور "میلہ خدا شناسی" اس کا نام رکھا۔

[1] موجِ کوثر ص ۲۰۰ — [2] محمد احسن نانوتوی ص ۲۱۹

۱. فریبِ جاوید — عیسائیوں کے مختلف اعتراضات کے جوابات۔

۲. عقوبت الضالین — پادری عماد الدین کی کتاب "ہدایت المسلمین" کا جواب ہے۔

۳. کجی واقعی — پادری عماد الدین کی کتاب "نغمۂ طنبوری" پر تبصرہ و تنقید ہے۔

۴. تصحیح التاویل — پادری عماد الدین کی "تفسیر مکاشفات" کا جائزہ ہے۔

۵. استیصال — پادری رام چند کے رسالہ "مسیح الدجال" کا جواب ہے۔

۶. اعجاز قرآن — پادری رام چند کے ایک دوسرے رسالہ "اعجاز قرآن" کا جائزہ ہے اور قرآن کے اعجاز بلاغت پر گفتگو کی ہے۔

۷. انعام عام — امریکن مشن لکھنؤ کے پادری سموئیل جانسن اور پادری رجب علی نے "آئینہ اسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھی اس کے جواب میں "انعام عام" تالیف ہوئی۔ گارساں دتاسی نے ایک اخبار "پنجابی" سے اس کتاب پر تبصرہ نقل کیا ہے ——

تبصرہ نگار لکھتا ہے:

"آئینہ اسلام میں مشنریوں نے مسلمانوں میں ۲۵۰ فرقے گنائے ہیں اور لکھا ہے کہ شروع اسلام ہی سے یہ حال تھا اور اُن کا دعویٰ ہے کہ عیسائی فرقوں کا یہ حال نہیں۔ مصنف نے ان اعتراضات کا مکمل اور فیصلہ کن جواب دیا ہے۔ مشنریوں نے غلط طور پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان فرقوں میں سے آٹھ خدا کو نہیں مانتے۔ ۱۴ رسول اور ۱۵ قرآن کو نہیں مانتے اور ۲۷ حلقۂ اسلام سے بالکل خارج ہیں۔

مولوی صاحب نے جواب میں دلائل سے ثابت کیا ہے کہ عیسائیوں میں اٹھاسی فرقے ہیں جن میں سے بعض روح القدس کو نہیں مانتے، بعض حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے قائل نہیں۔ آٹھ مسلمانوں کی طرح حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کے قائل نہیں، سولہ عہد نامہ جدید و قدیم کے آسمانی کتاب ہونے پر ایمان نہیں لاتے اور باقی فرقے ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ مصنف نے ان کتابوں کے حوالے دیے ہیں جن کا مستند ہونا مسلّم ہے۔ مصنف نے جو محنت برداشت کی ہے۔ اس کی تحسین ہمارا فرض ہے کیوں کہ اس کتاب کے لیے انھوں نے مختلف زبانوں کی کتابوں کے حوالے جمع کیے ہیں۔ برخلاف اس کے "آئینہ اسلام" میں جن کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں صفحات و سطور کی وضاحت نہیں کی گئی لیکن ابو المنصور کی تصنیف میں صفحہ، سطر اور جس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی اشاعت اور مقام کی بھی تشریح کی گئی ہے جس سے اس کتاب کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے۔" [1]

۸ انجام الصمصام — پادری راجرس کی تصنیف "تفتیش الاسلام" کا جواب ہے۔

۹. میزان المیزان — پادری فانڈر کی کتاب "میزان الحق" کا جواب ہے۔

۱۰. مصباح الاسرار — پادری فانڈر کی کتاب "مفتاح الاسرار" کا جواب ہے جس میں "الوہیت مسیح" اور "تثلیث" پر بحث کی گئی ہے۔

[1] مقالات گارساں دتاسی جلد اوّل

۱۱. تحفۃ الہند

۱۲. مرزا جان کا کتاب الطیب قرآن

۱۳. تبیان ——— اہل طیب کے بعد سوالوں کے جواب ہیں۔

مولانا نانوتوی کے ساتھیوں میں سے ایک جنگ مراد بیگ بھی ہوئے تھے ان کا اصلی نام عبادی البشر تھا وہ عیسائیت میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ شاہجہانپور کے مباحثہ میں انھوں ہی نے مولانا نانوتوی کو بلوایا تھا۔ فرمایا کر رہی پادریوں کے مقالات نہیں چلتے۔[۱]

دارالعلوم دیوبند کے منتظمین میں مولانا رشید احمد گنگوہی کا اسم بہت نمایاں ہے۔ وہ فاضل وسیع، حلیم اور خدا رسیدہ بلند پایہ عالم دین تھے وہ حدیث کا درس دیتے تھے اور تزکیہ نفس اور عبادات سے بھی گزرتے تھے۔ تردید عیسائیت میں ان کی تحریر نہیں ملتی البتہ ان کے مریدوں میں مولوی شرف الحق دہلوی کا نام بہت نمایاں ہے جنھوں نے زندگی بھر مشنری تحریک کے خلاف جہد کیا۔

مولانا شرف الحق دہلوی ۱۸۶۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد حافظ جلال الدین نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا چنانچہ کمپنی بہادر نے انھیں گرفتار کر لیا۔ والدہ، مولانا رحیم بخش دہلوی سے ارادت رکھتی تھیں اس لیے مولانا شرف الحق کی پرورش مولانا رحیم بخش نے کی۔ ابتدائی تعلیم ان ہی سے حاصل کی۔ ۱۸۷۷ء میں اینگلو عربک سکول میں داخلہ لیا۔ ۱۸۸۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی کامل کیا۔ مدرسہ اسلامیہ فتح پوری دہلی میں عربی زبان و ادب کی تعلیم پائی اور ایک ہندو پنڈت درگا پرشاد سے سنسکرت کی تکمیل کی۔

اسلامی مدارس میں نصرانیت کا مطالعہ ہونے لگا تھا۔ مولانا شرف الحق بھی نصرانیت کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ایک روز گھنٹہ گھر دہلی میں ایک پادری کا وعظ سنا۔ اس نے عوام پر رعب جمانے کے لیے کہا کہ مسلمان اپنے نبی کو حبیب اللہ کہتے ہیں لیکن جب ان کے نواسے حضرت حسینؓ شہید کیے جا رہے تھے تو اس وقت (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خدا سے فریاد کی۔ اگر مسلمانوں کا نبی خدا کا محبوب ہوتا تو وہ ضرور فریاد کو سنتا اور اپنے نواسے کی جان بچا لیتا۔

پادری کی اس عامیانہ گفتگو سے مجمع پر سکوت طاری تھا۔ مولانا شرف الحق جو ابھی طالب علم تھے۔ اُٹھے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے الفاظ میں کہا کہ ہمارے نبی نے خدا سے فریاد کی تھی مگر خدا تعالیٰ نے جواب دیا کہ تم اپنے نواسے کی جان بچانا چاہتے ہو لیکن ظالموں نے تو میرے اکلوتے بیٹے مسیح کو صلیب پر چڑھا دیا اور اس کا غم مجھے بے چین کیے ہوئے ہے۔ ہمارے نبی نے یہ جواب سُن کر محسوس کیا کہ جب خدا کا اکلوتا نہ بچ سکا تو میرا نواسہ کس شمار قطار میں ہے۔

مولانا شرف الحق کے اس جواب پر پادری اپنی ساری منطق بھول گیا اور اسے راہ فرار اختیار کرتے ہی بنی۔

اس واقعہ کے بعد مناظرہ کا شغل بڑھتا گیا مگر بزرگوں کے مشورہ پر تکمیل تعلیم کو اہمیت دی۔ دہلی سے دیوبند گئے۔ پھر مدت قیام اور حصول تعلیم کے بعد گنگوہ میں مولانا گنگوہی کے حضور حاضر ہوئے۔ مولانا گنگوہی نے ان کے رجحان طبع کے مطابق تردید عیسائیت پر مامور کر دیا۔

اس مقصد کے لیے عبرانی اور یونانی زبانیں سیکھیں تاکہ بائبل کا اصل زبانوں میں مطالعہ کیا جا سکے۔ دوسری زبانوں میں سے پشتو، مولانا عبدالحکیم افغانی سے اور ترکی مولانا ابوالخیر سے سیکھی۔ ۱۳۰۵ھ۔ ۱۸۸۸ء میں بغرض حج حجاز گئے اور مولانا کیرانوی کی خدمت میں تین ماہ گزارے۔ مولانا کیرانوی نے تردید نصرانیت کی سند دی اور اپنی تصانیف بطور تحفہ عنایت کیں۔

مولانا کی شہرت ایک مناظر کی حیثیت سے برصغیر کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ انھوں نے کئی پادریوں سے تبادلہ خیالات کیا اور عوامی مناظرے کیے۔ ان پادریوں میں والپی فنگ، لیفرائے، ہومر اور گولڈ سمتھ کے نام نمایاں

---

[۱] محمد احسن نانوتوی ص ۹۱

ہیں۔ مولانا کے بیسیوں مناظروں میں سے دو کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۸۹۱ء میں مسجد فتح پوری دہلی میں پادری لیفرائے سے مناظرہ ہوا۔ موضوع "تحریف اناجیل" تھا۔ اس مناظرہ سے دہلی اور گرد و نواح کے مسلمانوں اور عیسائیوں میں ہلچل مچ گئی کیونکہ مناظرین کے درمیان طے ہو گیا تھا کہ شکست خوردہ فریق مجمع عام میں اپنی شکست کے اعتراف میں شکست نامہ لکھ کر دے گا۔ اس مجلس میں حکیم محمد اجمل خاں، مولانا عبدالحق حقانی (مؤلف تفسیر حقانی) حافظ نذیر احمد اور کئی دوسرے اہلِ علم موجود تھے۔ مناظرہ دو دن جاری رہا۔ پہلے روز چھ سات گھنٹے بحث رہی لیکن ناتمام دوسرے روز بحث ختم ہوئی اور پادری لیفرائے لاجواب ہو گیا۔ پادری نے درج ذیل شکست نامہ لکھ دیا :

"میں اقرار کرتا ہوں کہ لوقائی انجیل شریف کے ترجمے اور علاوہ اس کے اصلی نسخوں میں جو اس وقت موجود ہیں، چند آیتیں غلط ہیں اور بھول سے داخل کی گئی ہیں۔ یہ بات سب سے قدیم نسخوں اور ترجموں کے ملانے سے معلوم ظاہر ہوئی۔ وہ آیتیں ان میں نہیں لہٰذا میں وہی اصل انجیل کی باتیں سچی مانتا ہوں۔ چند مستشرقین شعراء کے قول انجیل میں ملے ہوتے ہیں۔"

دستخط جی۔ اے۔ لیفرائے[1]

بحث و مباحثہ کس ماحول میں ہوا۔ خود پادری لیفرائے کہتا ہے :

"میں اس ہفتہ دو دفعہ ایک مسجد میں گیا ہوں۔ جہاں چار گھنٹے تک میں نے علماء سے بات چیت کی ہے۔ انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے گفتگو کی ہے اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ بغیر کسی تعصب اور ہٹ دھرمی کے وہ بحث کرتے ہیں۔"[2]

دسمبر ۱۸۹۱ء میں پادری ایم۔ جی۔ گولڈ سمتھ سے حیدر آباد (دکن) میں مناظرہ ہوا۔ اسی طرح ۱۵ فروری ۱۸۹۲ء کو [illegible] سے پٹنہ میں مناظرہ کیا اور پادری صاحب کو مبہوت کیا۔

مولانا شرف الحق مناظرہ میں مخالف فریق کو مسکت جوابات سے دلائل دیتے اور اس کے نتیجہ سے اُن کے مخالف لاجواب ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ اُن کی گفتگو جاہلانہ نہیں بلکہ عالمانہ اور متانت سے بھری ہوتی تھی کہ کسی کو ان سے نفرت نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے لیکچروں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بکثرت شریک ہوتے تھے۔

مولانا منصور یو۔ پی کے گاؤں گاؤں میں مناظرے کیے اور عیسائی پادریوں کی تحریک ناکام کر دی۔ ستر برس کی عمر میں ۲۸ فروری ۱۹۳۹ء / ۳۰ ذیقعدہ ۱۲۳۵ھ کو انتقال کیا۔ تردید عیسائیت میں مولانا نے مندرجہ ذیل تالیفات یادگار چھوڑیں :

۱۔ دافع البہتان بہ تنزیہ الرحمان (دو حصے)
۲۔ استیصال مذہب عیسوی
۳۔ مناظرہ خانپور
۴۔ مناظرہ حیدر آباد دکن
۵۔ مناظرہ کالکا
۶۔ دینی مناظرہ ہنکنڈہ
۷۔ مناظرہ دہلی
۸۔ مناظرہ پٹنہ
۹۔ لیکچر امریکہ

مفتی کفایت اللہ اپنے دور کے مسلم مفتی اور فقیہ تھے۔ حضرت شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ تدریس و افتاء اور سیاسی مصروفیات نے انہیں تردید عیسائیت کا کام نہ کرنے دیا مگر مشنری سرگرمیوں پر ان کی کڑی نظر تھی۔

مولانا اعزاز علیؒ لکھتے ہیں :

"میں آپ (مفتی صاحب) سے شاہجہانپور میں سکندر نامہ

---

[1] فرنگیوں کا جال ص ۲۵۲ [2] صلیب کے علمبردار ص ۱۹۹

پتا تھا کہ سیشن ہوا کر ہندی مشنری پادریوں نے
اسلام اور بانیٔ اسلام کی مذمت کرنی شروع کر
دی ہے۔ اس پر حضرت مفتی صاحب اور مولانا
کلام اللہ خاں صاحب لیڈر کانفرنس گورنمنٹ دہلی کالج،
کو ساتھ لے کر گئے وہاں جا کر مسلمان چند نوجوانوں پر حرف
شروع کر دیتے۔ ان کو معلوم تھا کہ کوئی ناواقف ہوں گا
ہے جو کہ ان حضرات کی اہمیت سے جب ان کو بتایا کہ
معترض معمولی انسان نہیں ہے تو مناظرے سے انکار کر
کے سب نے بھاگنا شروع کیا۔ حضرت مفتی صاحب نے
تقریباً دس منٹ کے فاصلے پر کھڑے ہو کر ان اعتراضات
کے جواب دیئے اور پھر خود ان کے مسلمات سے ان پر
اعتراضات شروع کر دیئے۔ ؎۱

یہ سلسلہ ایک ہفتہ جاری رہا۔ مولانا مسلسل پادریوں کے اسٹیج پر جا کر اعتراضات کا جواب دیتے رہے اور اسلام کے اصول و عقائد کی سچائی ثابت کرتے رہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک ہفتہ بعد پادریوں کا وعظ سننے کوئی متنفس نہ گیا البتہ مولانا اعزاز علی اور ان کے ساتھی پادریوں کے وعظ کے وقت پہنچ جاتے تھے۔ مولانا اعزاز علی صاحب ایک دوسرا واقعہ لکھتے ہیں:

" اس کے غالباً دو ایک سال بعد امریکن مشن کے ایک مشہور مبلغ پادری ہولا پرشاد نے رمضان المبارک (شدید گرما کے موسم میں) جلسہ کا اعلان کیا اور اشتہار میں شائع کیا کہ آریوں اور اہلِ اسلام کو بھی رفع شبہات کا موقع دیا جائے گا۔

یہ اجلاس مشن اسکول کے وسیع ہال میں ہوا۔ حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا عبدالکریم لغوی طلبہ کے بستے موجود تھے پادری صاحب تین گھنٹے سے دو گھنٹے بعد تشریف لائے تقریر شروع کی بحث کا وقت آگیا۔ حضرت مفتی صاحب اور مولانا عبدالحکیم کے ساتھ جو نئے مسجد میں پانی کے ساتھ روزہ افطار کیا مگر اب بھوک زیادہ تھی۔ مجھے یہی خیال آیا کہ مجھے قرآن شریف تراویح میں پڑھنا ہے میں چلا آیا مگر یہ حضرات وہاں شب کے بارہ بجے تک رہے۔ یہ جلسہ کس وقت ختم ہوا؟ مجھے معلوم نہ ہوا کہ صبح کو ہر کسی کی زبان پر یہ تھا کہ دیوبندی مولویوں نے اسلام کی فتح کر دی خدا جانے یہ کہاں سے آگئے تھے (ان مولوی صاحبان سے شاہجہانپور کے لوگ ناواقف تھے) میں بہادر گنج کے بازار میں پہنچا تو مسلمانوں کی ٹولیاں اس کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ ایک شخص نے کہا:

مجمع میں جو دبلا پتلا سوکھا سا آدمی تھا تم نے دیکھا وہ شیر کی طرح غُراتا تھا اور اس کی ہر بات پر پادری صاحب کو پسینہ آجاتا تھا۔" ؎۲

مشہور اہلِ حدیث عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے اور مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں تھے۔ گو کہ یہ کہنا ہے کہ ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں دارالعلوم اور وہاں کے بزرگوں کا حصہ نہیں لیکن ان کے ذوقِ مناظرہ کی داغ بیل دارالعلوم میں پڑی اور بجا طور پر فرقِ باطلہ کی تردید میں وہ اُمتِ مسلمہ کے لیے مایۂ ناز عالم تھے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب نے پادریوں سے ان گنت مناظرے کیے اور برصغیر کے طول و عرض میں اسلام کی حقانیت کا ڈنکا بجایا۔ ذیل میں حیاتِ ثنائی سے چند مناظرہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

؎۱ مفتی اعظم کی یاد میں ص ۱۱۲ بحوالہ "بیس بڑے مسلمان"
؎۲ مفتی اعظم کی یاد میں ص ۱۱۱ بحوالہ "بیس بڑے مسلمان"

۱۔ ۱۹۱۰ء کی بات ہے کہ امرتسر میں پادری جوالا سنگھ سے مولانا کا مناظرہ ہوا۔ موضوع "الوہیتِ مسیح" تھا۔ پادری صاحب جو دلیل دیتے مولانا بدلائل قویہ اُسے کاٹ دیتے۔ آخر پادری صاحب جھلا کر بولے کہ مولانا میری کسی دلیل کو تو رہنے دیجیے۔ سامعین پادری صاحب کی اس التجا پر خوب محظوظ ہوئے اور ایک عیسائی خاندان حلقۂ اسلام میں شامل ہو گیا۔

۲۔ پادری عبدالحق عیسائی حلقوں میں اپنی منطق اور قرآن و حدیث کے مطالعہ کی وجہ سے مشہور تھے۔ مولانا ثناء اللہ نے پادری صاحب سے کئی مناظرے کیے۔

۳۔ ۲۷، ۲۸ فروری ۱۹۳۶ء کو انجمن اہلحدیث گوجرانوالہ کے سالانہ جلسہ میں اہلِ صلیب سے مناظرہ ہوا۔ مولانا نے توحید کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے اہلِ صلیب کو دعوت دی کہ وہ بالمشافہ گفتگو کریں۔ ان کی طرف سے پادری محمد سلطان پال تشریف لائے۔ آٹھ دس ہزار کے مجمع میں شکست کھائی اور ایک مسیحی نوجوان نے اسلام قبول کیا۔

۴۔ ۶ ستمبر ۱۹۱۶ء کو پادری جوالا سنگھ سے ہوشیارپور میں مناظرہ ہوا۔

۵۔ ۲، ۳ ستمبر ۱۹۲۸ء کو حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ میں "اسلامی توحید اور الوہیتِ مسیح" پر پادری سلطان محمد پال، پروفیسر [illegible] سے مناظرہ ہوا۔ پادری صاحبان بے بس ہو گئے۔ اہالیانِ حافظ آباد کی جانب سے مناظرے کی رپورٹ شائع ہوئی جس پر حافظ آباد کے غیر جانبدار ہندوؤں اور سکھوں نے بھی دستخط کیے اور پادری صاحبان کی شکست کی گواہی دی۔

مولانا موصوف نے تردیدِ عیسائیت میں قلم سے خوب کام لیا۔ ہفت روزہ "اہلحدیث" (امرتسر) میں ان کے قلم سے بیسیوں مضامین شائع ہوئے جن کا احاطہ مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ مستقل بالذات تردیدِ عیسائیت میں مندرجہ ذیل تین کتابیں ملتی ہیں۔

۱۔ تقابلِ ثلاثہ — پادری ٹھاکر دت نے ایک کتاب "عدمِ ضرورتِ قرآن" لکھی جس کے جواب میں مولانا ثناء اللہ نے "تقابلِ ثلاثہ" (یعنی قرآن، توراۃ اور انجیل کا مقابلہ) لکھی۔ یہ کتاب اس موضوع پر جامع اور بہت اچھی ہے۔ کتاب کا انگریزی ترجمہ ایک [illegible] نامی نے کیا مگر مترجم نے مولانا ثناء اللہ کا نام ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

۲۔ اسلام اور عیسائیت — پادری برکت اللہ کی تین کتابوں (۱) [illegible] اسلام سچا ہے یا عیسائیت (ب) دینِ فطرت اسلام ہے یا عیسائیت۔ (ج) اصول البیان فی توضیح القرآن کا جواب ہے۔ اس کتاب میں غیر مسلموں کی طرف سے عام طور پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

۳۔ توحید و تثلیث — اثباتِ توحید کے موضوع پر ایک اچھی تحریر ہے۔

علمائے دیوبند میں سے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے "قصص القرآن" میں بائبل اور قرآن کے تقابلی مطالعہ کا اعلیٰ معیار پیش کیا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالحق حقانی اور دوسرے بزرگوں نے اپنی تالیفات میں بالواسطہ تردیدِ عیسائیت کا جائزہ پیش کیا۔ دارالعلوم دیوبند اور اس مکتبِ فکر کے رسائل و جرائد میں باضابطہ سینکڑوں مقالات تردیدِ عیسائیت میں شائع ہو چکے ہیں۔

— ماخذ —

کتاب	مصنف	ناشر
۱۔ اسبابِ بغاوتِ ہند	سرسید احمد خاں	اردو اکیڈمی سندھ کراچی
۲۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد	امداد صابری	مکتبہ شاہراہ۔ دہلی
۳۔ بیس بڑے مسلمان	عبدالرشید ارشد	مکتبہ رشیدیہ۔ لاہور
۴۔ تاریخ صحافت اردو (حصہ دوم)	امداد صابری	مطبوعہ دہلی
۵۔ ترجمان الحدیث (ماہنامہ) (مشنری سرگرمیاں اور مسلمان علماء)	اختر راہی	دفتر ترجمان الحدیث
۶۔ حکومتِ خود اختیاری	طفیل احمد منگلوری	
۷۔ دارالعلوم دیوبند	قاری محمد طیب	دارالعلوم دیوبند
۸۔ سیرتِ ثنائی	عبدالمجید خادم	دفتر اہلحدیث سوہدرہ
۹۔ سیرت مولانا محمد علی مونگیری	محمد حسنی	ندوۃ العلماء لکھنؤ

(بقیہ: صفحہ ۴۸۹)

دارالعلوم دیوبند

دلِ افرنگ کا کانٹا

یہ بھی حق ہے جو تجھے علم کا دریا کہہ دوں — یہ بھی سچ ہے کہ تجھے گلشن تقویٰ کہہ دوں

ایشیا ہے جو انگوٹھی تو پھر اس میں تجھ کو — کیوں نہ میں ایک چمکتا ہوا ہیرا کہہ دوں

جتنے دل والے ہیں وہ تجھ پہ ہیں شیدا دل سے — کیوں نہ دل والوں کی میں تجھ کو تمنا کہہ دوں

تو نے پیدا کیے، محمودؒ و رشیدؒ و انورؒ — زیب دیتا ہے انھیں جس قدر اچھا کہہ دوں

ہاں بجا ہوگا! کہ میں تیرے حسینؒ احمد کو — پیکرِ عشق کہوں، علم سراپا کہہ دوں

ہاں تیرے اشرفؒ و عثمانیؒ و طیبؒ کو میں — جھوٹ کیا ہوگا، اگر فخرِ زمانا کہہ دوں

ایک دو چار جو ہوتے تو گنا دیتا میں — حق ہے یہ، تجھ کو نوادر کا خزانا کہہ دوں

بار بار آتا ہے گیلانی کے دل میں کہ تجھے
دلِ افرنگ میں اٹکا ہوا کانٹا کہہ دوں

سید امین گیلانی شیخوپورہ

مولانا ابو سلمان شاہجہانپوری

دارالعلوم دیوبند

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ عام معنوں میں تو عملی آدمی نہیں تھے، اگرچہ انھوں نے مسلمانوں کے وقار و سطوت کی گرتی ہوئی عمارت کو بچانے، اس کی بنیادوں کو خرابیوں سے محفوظ اور مستحکم کرنے کی عملی طور پر بھی کوشش کی اور اس کے نتائج نہایت دور رس نکلے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک مفکر اور مصنف تھے اور ان کا اصلی کارنامہ عملی نہیں علمی اور فکری ہے۔

شاہ صاحبؒ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے چار سال قبل دارالسلطنت دہلی میں پیدا ہوئے، شاہ عالم ثانی کے زمانے میں وفات پائی اس ساٹھ سال کی مدت میں دس بادشاہ تخت حکومت پر بیٹھے اور مختلف اسباب کی بنا پر تخت سے اترے، عام نگاہیں تو شاید صرف سیاسی فساد و اقتدار کی جنگ پر تھیں، لیکن شاہ ولی اللہؒ کی عمیق و دور بین نظریں مسلمانوں کے ذہنی، فکری، اخلاقی انحطاط پر اشک ریز اور زبان مسلمانوں کے انتشار ملی پر ماتم کناں تھی، شاہ صاحبؒ نے حالات کو سنبھالنے کی اپنی سی کوشش کی، لیکن انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ سررشتہ حکم و عمل مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکا ہے اور حکمرانوں میں نہ تو حالات کی سنگینی اور اپنے زوال و انحطاط کا احساس ہے نہ ان میں اصلاح کی کوئی تحریک موجود ہے۔

ان حالات میں شاہ ولی اللہ نے اپنی جو ذمہ داری محسوس کی، وہ یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسی فکر مرتب کر دیں کہ جب مسلمانوں کو اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور وقار کی بحالی کا خیال پیدا ہو اور جب ان میں احیائے اسلام اور تجدید ملت کا احساس بیدار ہو جائے تو وہ اس فکر کی بنیاد پر اپنے مستقبل کی عظمت کی عمارت تعمیر کر سکیں۔ اس رہنمائے عظیم نے اس سلسلے میں ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اس کی تعلیم و اشاعت سے مسلمانوں میں ایک جماعت پیدا کر دی جو شاہ ولی اللہ کی فکر کی اہمیت اور ضرورت کی اندازہ شناس تھی اسی سلسلے میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے ایما اور مشورے سے سید احمد شہیدؒ نے عملی بنیادوں پر ایک جماعت تشکیل دی جس کے رکن رکین مولانا عبدالحیؒ (داماد شاہ عبدالعزیزؒ) اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ (برادرزادہ شاہ عبدالعزیزؒ) تھے۔

ان حضرات نے مسلمانوں میں اصلاح احوال و رسوم کی ایک زبردست تحریک شروع کی جس کے نتائج نہایت شاندار نکلے، لیکن شاہ ولی اللہ کے انتقال کے بعد ۳۵، ۴۰ سال کی مدت میں مسلمانوں کا سیاسی زوال اپنی آخری حدوں کو پہنچ چکا تھا اور مسلمانوں کی دشمن قوتوں نے پورے اسلامی ہند کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ برٹش استعمار کے پنجے ہندوستان کے سیاسی نظام میں پوری طرح گڑ چکے تھے، اور استعمار کے اس عفریت سے ملک و ملت کو نجات دلانے کے لیے ایک زبردست انقلابی اقدام کی ضرورت تھی حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان

کے رفقاء نے حالات و وقت کا نہایت سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیا اور خود
ملک کے سیاسی، دعوت تجدید و احیاء اسلام کا رخ تحریک جہاد کی طرف موڑ دیا
اور رفتہ رفتہ مجاہدین کی ایک جمعیت فراہم کرکے سرحد کو
اپنی تحریک کا مرکز بنا کر احیاء ملت کی سعی شروع کر دی، لیکن مسلمانوں کی بد
قسمتی کہ دن ابھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ یہ تحریک بیگانوں کی ریشہ دوانیوں
اور اپنوں کی عاقبت نااندیشیوں کی بدولت مئی ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے
مقام پر ناکام ہو گئی۔ سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل اس معرکے میں شہید ہو گئے
اور مجاہدین کی جمعیت و قوت منتشر ہو گئی، لیکن اس سلسلے کے بزرگوں نے
ہمت نہ ہاری۔ وہ اپنی منتشر جمعیت کی فراہمی اور پامال قوتوں کی بحالی میں مصروف
ہو گئے اور ۲۰، ۲۵ سال کی کوششوں کے نتیجے میں، وہ پھر اس قابل ہو گئے کہ کسی
معرکۂ کرب و بلا میں اپنا سر و سینہ آزمائیں لیکن وہ ابھی کسی معرکے میں حصہ لینے
کے لیے پوری طرح منظم نہیں ہو سکے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے مبادیات شروع ہو گئے
اور چند دنوں میں حالات اس درجے خراب ہو گئے کہ اب ان کے لیے صبر کرنا
ناممکن اور میدانِ حریت و جہاد میں کود پڑنا ناگزیر ہو گیا، وہ خاک و خون میں
تڑپے اور اسلام کے عشق اور ملت کی غمخواری کی آزمائش میں پورے اترے
لیکن ان کا یہ خاک و خون میں تڑپنا ملت کی قسمت کو نہ بدل سکا

ہزارہا مجاہدین ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں کام آئے۔ یہ ہنگامہ
ختم ہوا تو دار و رسن اور طوق و سلاسل کی آزمائش کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ملک
کی جیلوں کو آزمائش گاہ عشق و ملت اور بیرونِ ملک جزائر انڈمان کو نمائش گاہ
جذبۂ حریت میں تبدیل کر دیا گیا، لیکن افسوس کہ مسلمانوں کی قسمت کا ستارہ ایک
نئی گردش میں مبتلا ہو گیا۔ افسوس یہ نہیں کہ مجاہدین نے میدانِ جنگ میں
شکست کھائی اور جذبۂ حریت کے امتحان میں پورے نہ اترے، ملت سے
ان کا عشق خام تھا یا سر و سینہ کی آزمائش میں وہ ناکام رہے، شکست وہ نہیں
جو دشمن نے میدانِ جنگ میں دی، اصل شکست یہ تھی کہ اس نے ہمارے ذہن و
فکر کو مغلوب کر لیا۔ اگر جنگ میں ایک سپاہی کی تلوار ٹوٹ جائے تو دوسری
تلوار اسے مل سکتی ہے، لیکن جذبۂ حریت فنا اور سرفروشی کی تمناؤں کا قافلہ
لٹ جائے تو دوسرا سپاہی کہاں سے آ سکتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی شکست کا
سب سے المناک اور غم انگیز پہلو یہی تھا کہ سپاہی کی تلوار نہیں ٹوٹی تھی بلکہ
اس کا جذبۂ حریت فنا ہو گیا تھا اور اس کی سرفروشی کی تمناؤں کا قافلہ لٹ
گیا تھا۔

ایک بہت بڑا سانحہ یہ تھا کہ ولی اللّٰہی جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی
ایک گروہ نے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اقتدار کے دربار
سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرکے کاسہ لیسی کی زندگی کو اپنا شعار بنا لیا
دوسرا گروہ حق کی اسی جادۂ قویمہ پر استوار رہا، جو امام الہند شاہ ولی اللّٰہ
محدث دہلوی کی حکمتِ بالغہ نے مسلمانانِ ہند کے لیے متعین کیا تھا۔ اس گروہ
کے رہنما حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللّٰہ علیہ تھے۔

دیوبند کا امتیاز دوسرے مکاتبِ فکر کے مقابلے میں یہی تھا
وہ اسی قافلۂ سخت جان کے مسافر تھے۔ جو ہندوستان کی سیاسی کربلا میں
کئی بار لٹ چکا تھا، ان کے ذوق و عزم سفر کو کئی بار آزمایا جا چکا تھا اور وہ اس
امتحان میں پورے اترے تھے۔ اگرچہ حالات نے ان سے مساعدت نہ کی تھی
لیکن ان کی حق پرستی نے اس کی تلافی کب کی تھی، انھوں نے کانٹوں پر زندگی
بسر کرنا سیکھ لیا تھا، خدمتِ حق میں انھوں نے صرف فرض کی ادائیگی
کا سبق سیکھا تھا، دنیا کی مرجعیت کے تصور سے ان کا ذہن ناآشنا تھا۔
ناکامیوں کے بعد انھیں کسی بات کا خیال آیا تو فرائض کی ادائیگی میں صرف
سعی و عمل کی کوتاہی کا آیا اور جان دے کر بھی کوئی حسرت پیدا ہوئی، تو صرف
یہ کہ ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

دارالعلوم دیوبند کا قیام حضرت شاہ ولی اللّٰہ کی انقلابی فکر کے سلسلے ہی کا
ایک اقدام تھا، جو حالات و مصالح وقت کے پیشِ
نظر اٹھایا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء تک اس تحریک کے قائدین کا خیال تھا کہ وہ

طاقت اور قوت کے زور سے مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کی جستجو
میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد انھوں نے سمجھ لیا
کہ کسی انقلابی تحریک کے لیے حالات سازگار نہیں۔ اور وقت کی سب سے
بڑی اور اہم ضرورت فکر کے تحفظ کی ہے، گویا کہ صدی کی جدوجہد کے بعد
تحریک پھر اسی مقام پر آگئی تھی جہاں سے اس نے سفر شروع کیا تھا اور اب
پھر اس کے سامنے نئے حالات میں فکر کے تحفظ و تدوین، اشاعت، مجاہدین
کی تیاری اور پھر عملی میدان میں مصروف سعی و جہد ہونے کے مراحل تھے۔ پہلے
مرحلے کا آغاز دارالعلوم دیوبند کے قیام سے ہوتا ہے۔ اس مرحلے کے رہنما
وہی حضرات تھے جو گزشتہ دور میں آخری مرحلے کے قافلے کے سالار تھے
یا صاحب عزیمت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے
دیگر رفقائے کرام رحمہم اللہ اجمعین تھے۔ ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو ضلع سہارنپور کے ایک
قصبے دیوبند میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی، عام طور پر دنیا نے اس کو
علوم اسلامی کی ایک درس گاہ کی حیثیت میں نظر ڈالی ہے اور بلاشبہ
علوم اسلامی کی درس و تدریس ہی اس کا سب سے بڑا امتیاز تسلیم کیا گیا۔
مولانا سید محمد میاں لکھتے ہیں:

• ہندوستان میں گیارہ سو برس مسلمانوں کی شاندار حکومت
قائم رہی۔ مگر کیا کوئی درسگاہ ملتی ہے جس میں اہتمام
کے ساتھ حدیث و تفسیر کی تعلیم ہوتی ہو۔ بے شک
مدارس لاکھوں تھے، چپے چپے پر اسکول تھے، مگر افسوس
ہندوستان کے طول و عرض میں دارالحدیث یا دارالتفسیر
ایک بھی نہ تھا، ہاں بے شک مصر و بغداد میں بڑی
بڑی درسگاہیں قائم ہوئیں جامعہ ازہر آج بھی
اپنی جامعیت میں شہرہ آفاق ہے۔ لیکن ان تمام کا
قیام و بقا حکومت کے خزانوں پر تھا۔ سوال تو یہ ہے
کہ بے کس و بے دست و پا مفلس قوم کا مدرسہ جو اپنی خدمات
میں جامعہ ازہر و جامعہ نظامیہ اور قرویین کی ہمسری بلکہ ان
سے بازی لے جائے، کیا اسلامی ممالک میں اس سے
پہلے کہیں دیکھنے میں آیا تھا۔ بلاشبہ یہ دارالعلوم کا ایک
معجزہ ہے جو سرزمین ہند میں ظاہر ہوا اور جس نے
تمام عالم اسلامی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

لیکن دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد حدیث و قرآن کی درس و
تدریس اور علوم اسلامی کے تحفظ و بقا کے انتظام سے کچھ آگے بھی تھا۔ مولانا
محمد قاسم نانوتویؒ نے اس کے لیے جو آٹھ اصول تحریر فرمائے تھے ان
اصولوں میں جن نکات کو بیان کر کے ان پر زبان و بیان کے لطیف غلاف
کا پردہ ڈال دیا تھا، مولانا محمد میاں نے اس پردے کو اٹھا دیا ہے۔ دار
العلوم اور اس کے ہم صنف دیگر مدارس کے مندرجہ ذیل مقاصد کی
طرف توجہ دلائی ہے:

الف: آزادئ ضمیر کے ساتھ ہر موقع پر کلمۃ الحق کا اعلان
ہو، کوئی سنہری طمع، مربیانہ دباؤ، یا سرپرستانہ
مراعات اس میں حائل نہ ہو سکے۔

ب: اس کا تعلق عام مسلمانوں کے ساتھ نا صرف قائم
تاکہ یہ خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کر دے۔ جو
ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل پر قائم رکھنے
میں معین ہو اور اس طرح اسلامی عقائد اور اسلامی تہذیب
ہمیشہ کے لیے ورنہ کم از کم اس وقت کے لیے محفوظ
ہو جائے، جب تک یہ مرکز اپنے صحیح اصول پر
قائم ہے۔ نیز توکل علی اللہ اور عوام کی طرف احتیاج
خود کارکنان مدرسہ کو اسلامی شان پر باقی رکھے
اور جابرانہ استبداد یا ریاست کا شائبہ ان میں قطعاً
نہ پیدا ہو۔ بلکہ ایک ہمدردی کا تعلق ہو، جو ایک کو دوسرے کا

متعینہ مسلک اور اس طرح آپس میں خود ایک دُوسرے کی اصلاح ہوتی ہے۔

۵: کارکنان، خدام اور متوسلین کی جماعت جملہ افراط و تفریط سے محفوظ اور ساتھ ہی ساتھ ولی اللّٰہی مسلک پر شدت سے عمل پیرا ہے جس کے متعلق تمام عالمِ اسلام کا اتفاق ہے کہ وُہ ملت مفید ہے، مسلک سلف کے عین مطابق ہے، افراط و تفریط سے پاک، صراطِ مستقیم اور معیارِ صحیح ہے۔

۶: خود رائی اور استبداد جو شرعی نیز تاریخی حیثیت سے بربادیٔ مسلم کا واحد ذمہ دار ہے، اس کے خلاف باہمی مشاورت سے اجتماعی اور جمہوری حیثیت کے ساتھ کام کرنے کا نمونہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

ان اصول و مقاصد کو ذہن میں رکھ کر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تعلیم و تربیت سے آراستہ شخصیت یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کے سیاسی و دینی افکار، سیرت اور خدمات پر نظر ڈالیے اور پھر اُن کی قائم کردہ جمعیتوں ثمرۃ الترتیب (۱۸۷۹) جمعیۃ الانصار (۱۹۱۰) اور پھر نظارۃ المعارف (۱۹۱۳) کے اغراض و مقاصد اور اُن کے کاموں پر نظر ڈالیے تو فوراً اندازہ ہو جاتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند علومِ اسلامی کی ایک قدیم طرز کی درسگاہ نہیں بلکہ احیائے اسلام و تعلیمِ ملت کی ایک عظیم الشان تحریک کا نام ہے، دارالعلوم دیوبند انقلاب کا مرکز اور سیاسی تربیت گاہ تھی۔

اس نے اسلام کے جاں نثاروں اور ملت کے غمگساروں کی ایک ایسی جماعت تیار کر دی جو ملت کے غم میں خود بھی روتے اور دُوسروں کو بھی رُلایا، جو اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کے وقار کی بحالی کے لیے خود بھی تڑپے اور دُوسروں کو بھی تڑپایا، انھوں نے آبرومندانہ زندگی کے حصول کے لیے خود بھی اپنی جانیں قربان کیں اور دُوسروں کو بھی جاں نثاری اور ایثار پیشگی کا سبق دیا۔ انھوں نے مسلمانوں کے ذہنی جمود کو توڑا، برٹش استعمار کے سحر کو توڑا۔ انھوں نے وقت کی استبدادی قوتوں سے پنجہ آزمائی کی اور ملک کے ذہنوں سے خوف و ہراس کو دُور کیا، اتنا ہی نہیں انھوں نے ملک کے سیاسی ویرانے میں آزادی کی شمع روشن کی۔ نصب العین کی پستی سے نکال کر مقصد کی بلندیت کا احساس پیدا کیا اور اس محفل میں جہاں زباں بندی کا دستور نافذ تھا، جہاں بات کرنے پر زبان کٹتی تھی اور ذہنوں پر پہرے بٹھائے جاتے تھے، وہاں انقلاب کا صور پھونکا اور نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت کو کاسہ لیسانہ زندگی کی غلاظت سے نکال کر ملک کی آزادی کی جدوجہد میں جانبازی کے منصب پر فائز کیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بیسویں صدی کے شروع میں علیگڑھ میں جو سیاسی بیداری پیدا ہوئی، وُہ دیوبند یا ملک کی دُوسری انقلابی و سیاسی تحریکات کی رہینِ منت تھی اور جو انقلابی اور حریت پسند اُٹھے، وُہ دیوبند کے سرچشمۂ فکر کا فیضان تھا۔

دیوبند کے اکابر نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں بیش از بیش حصہ لیا، اس راستے کی تمام صعوبتوں کو برداشت کیا اور ہر آزمائش پورے اُترے۔ دارالعلوم کے قیام کے بعد سیاست میں حصہ لینے کا دور حضرت شیخ الہندؒ سے شروع ہوتا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے حضرت شیخ الہند کی زندگی کو تحریک ولی اللّٰہی کا ایک مستقل عہد تسلیم کیا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی سرکردگی میں، اصحابِ عزیمت کا جو قافلہ تیار ہوا تھا اس میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ، مفتی محمد کفایت اللہؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، فضل ربیؒ (رکن ہیئت تمیز افغانستان) مولانا سیف الرحمٰن، مولانا حافظ محمد صادقؒ اور دُوسرے بہت سے اکابر شامل تھے۔ آج بھی ہندوستان سے پاکستان تک دارالعلوم دیوبند کے فضلا سیاسی میدان میں ملک و ملت کی رہنمائی کر رہے ہیں، دیوبند کے نامور عالم اور صوفی مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بعض مسائل میں جو روش اختیار کی، اس سے تحریک پاکستان کے رہنماؤں نے فائدہ اٹھایا، مولانا شبیر احمد عثمانی تو تحریک پاکستان کے رہنماؤں میں شامل تھے اور انھوں نے اپنی بہتر

عالمانہ صلاحیتوں سے مسلم لیگ کو اسلامی ریاست کے نصب العین پر مستحکم کرنے اور استوار رکھنے کی کوشش کی، پھر قیام پاکستان کے بعد دیوبند کے ہندوستانی رہنماؤں نے نہایت خراب حالات میں مسلمانوں کی رہنمائی کی اور ان کے حوصلوں کو بلند رکھا اور پاکستان میں اس سلسلے کے بزرگوں نے ملک وملت کی تعمیر و خدمت کے ایک نئے عزم کے ساتھ بیڑا اٹھایا اور پاکستان کی زندگی کے ہر گوشے میں اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے ملت کی رہبری کی۔

دارالعلوم دیوبند کے اکابر اور اس کے فرزند علمی و ادبی خدمت کے میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اس کے بانیوں میں حاجی امداد اللہ اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ اردو کے بہترین ادیب اور صاحب تصنیف و تالیف بزرگ تھے، حضرت شیخ الہند دیوبند کے نامور سپوت اور اس کے رہنماؤں میں تھے، بہت بڑے صاحب قلم بزرگ تھے، ان کا ترجمہ قرآن مجید اردو ادب کا شاہکار ہے۔ ان کے علاوہ علامہ انور شاہ کاشمیری، شبیر احمد عثمانیؒ، بدر عالم میرٹھی، مولانا سید محمد میاںؒ، مناظر احسن گیلانی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا قاری محمد طیب صاحب کی تحریریں عالمانہ اور محققانہ ہی نہیں، زبان و بیان اور اسلوب کے لحاظ سے بھی وقت کی بہترین ادبی تحریریں ہوتی ہیں۔ تاجور نجیب آبادی، مظہر الدین بجنوری، حامد انصاری غازی، شائق احمد عثمانی تو ادب و شعر کی دنیا میں معروف ہی ادبی حیثیت سے ہیں، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ اور بہت سے اکابر دیوبند اگرچہ ادبی حیثیت سے مشہور نہیں ہو سکے، لیکن وہ اپنی تصانیف کی کثرت یا تصانیف کی علمی، تاریخی، سیاسی حیثیت کی بنا پر علمی و ادبی دنیا کی ایک معروف شخصیت ہیں، ان کی خدمات سے ہر شخص واقف ہے۔ اگر ندوۃ العلماء لکھنؤ کو اس امر کا حق پہنچتا ہے کہ وہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے مرکز علمی میں ہونے والے کام کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھے تو دارالعلوم دیوبند کو بھی اس کا حق ہے کہ اس کے عظیم فرزندوں نے ندوۃ المصنفین دہلی میں بیٹھ کر علم و ادب اور تصنیف و تحقیق کے جو ہفت خواں طے کیے ہیں، وہ ان پر فخر کرے یا کم کے فرزندوں نے علم و ادب کے جس میدان میں اور کبھی کسی ادارے کے گوشۂ خلوت میں یا کسی مجلہ و اخبار میں کوئی علمی و صحافتی اسلامی خدمت انجام دی ہے، وہ اسے اپنی تاریخ و تذکرے میں بیان کرے۔

دارالعلوم دیوبند کے اہتمام سے مختلف اوقات میں مختلف رسائل نکلے۔ "القاسم" "الرشید" اس کے مشہور علمی و دینی جرائد ہیں۔ آج کل "دارالعلوم" کے نام سے ایک بلند پایہ دینی مجلہ نکل رہا ہے۔ ان رسائل میں بلند پایہ علمی تحقیقی، دینی، اصلاحی اور اسلامی ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں اور اسلامی علوم و فنون کی مختلف شاخوں کے بارے میں بیش بہا ذخیرہ اس کے دامن میں جمع ہو گیا ہے، وقت کے سیاسی، سماجی اور جدید مسائل میں ان رسائل نے مسلمانوں کی اسلامی رہنمائی کی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے مستفیدین نے دورِ جدید کے فتنوں کے اثرات سے مسلمانوں کے ذہن و دماغ کو بچانے اور اسلام کے دفاع کی بہترین خدمات انجام دی ہیں۔

دارالعلوم دیوبند نے اپنے قیام سے سو سال کی مدت میں تقریباً ۱۰ مشائخ طریقت، مدرس، خطیب، مبلغ، مفتی، مناظر، مصنف، صحافی، طبیب اور ماہرین صنعت و حرفت پیدا کیے ہیں، ان میں سے اعلیٰ درجے کے اصحاب علم و فن کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد بھی ڈھائی ہزار کے لگ بھگ ہوتی ہے تاریخ دارالعلوم دیوبند میں ۱۹۶۵ء تک کے ایک جائزے کے مطابق تفصیل حسب ذیل ہے۔

عالم و مدرس	۴۴۸	مصنف	۲۷۶
مفتی	۱۶۴	مناظر	۱۱۲
صحافی	۱۰۸	خطیب و مبلغ	۲۸۸
طبیب	۱۶۴	صناع و اہل حرفہ	۷۴۸

اس جائزے سے درس و تدریس، تصنیف و تالیف، صحافت و طباعت وغیرہ کے میدانوں میں فرزندان دارالعلوم دیوبند کی خدمات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، درس و تدریس کے میدان میں دیوبند کی عظیم الشان خدمات کا

اندازہ اس سے کیجئے کہ سو سال کی مدت میں ابنائے دیوبند نے تقریباً ۹ ہزار مدارس ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش تک قائم کئے ہیں

دارالعلوم دیوبند کا دینی فیضان ہندوستان، پاکستان سے گزر کر افغانستان، ترکستان، چین، برما، ملائشیا، انڈونیشیا، عراق، کویت، ایران، سیلون، جنوبی افریقہ، سعودی عرب، سیام، یمن وغیرہ تک جا پہنچا۔ اس وقت پورے عالم اسلامی میں دارالعلوم دیوبند کے تقریباً ۰۰ ہزار فارغ التحصیل علماء موجود ہیں، جو اسلام اور مسلمانوں کی مختلف اطراف سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند خالص ایک قدیم طرز کی اسلامی درسگاہ ہے جس میں اسلامی علوم و فنون کی ایک مخصوص انداز سے تعلیم دی جاتی ہے ہمیں اس کی تعلیم اور اس کے نتائج کو کسی جدید علمی درسگاہ کے معیار پر نہیں جانچنا چاہیے، لیکن دارالعلوم دیوبند کی اس خصوصیت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس کے فارغ التحصیل ذہن و فکر اور اخلاق و سیرت کے ان پیمانوں سے بہت بلند ہیں جن کا تصور کیا جا سکتا ہے، ان میں دوسرے دینی مدارس اور مکاتب فکر کے لوگوں کی نسبت وسعت قلبی، بلند نظری، اعلیٰ ظرفی اور اخلاص عمل کی زیادہ صلاحیتیں ہوتی ہیں دوسرے مکاتب فکر کے علماء کے مقابلے میں وہ ہمیشہ اور ہر دور میں زیادہ بیدار مغز ثابت ہوئے ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ دیوبند کے نصاب تعلیم میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور حالات و وقت کے مطابق دیوبند کے اکابر نے اپنے طلبہ کو جدید علوم و فنون کے مطالعہ و غور و فکر کی زیادہ آزادی دی اور اُن کی رہنمائی کی۔ اور غیر نصابی مضامین کی حیثیت سے جدید علم ہیئت، فلسفہ، سائنس، اقتصادیات، معاشیات، سیاسیات، سماجیات وغیرہ مضامین کے مطالعے کی دعوت دی، یہ مرحلہ اس وجہ سے اور زیادہ آسان ہو گیا کہ اس کے بعض نامور فضلاء نے مختلف موضوعات پر نہایت احتیاط کے ساتھ قلم اُٹھایا، ایسی تصانیف پیش کیں جو اگر ایک طرف اسلامی فکر کی حامل تھیں، تو دوسری طرف اُن کا علمی و فنی پایہ بھی بہت بلند تھا

ابنائے دارالعلوم کے ظرف کی بلندی کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ علمائے کرام نے اپنے طلبہ کو محض قوت لایموت یا دو رکعت کے امام بننے کی تعلیم نہیں دی تعلیم میں انھوں نے مقصد کی پستی کو کبھی گوارا نہیں کیا۔ ساتھ ہی مختلف صنعتوں کی تعلیم و تربیت کے اہتمام و انتظام سے طلبہ کے بہت سے مادی و معاشی مسائل حل ہو گئے۔ جبکہ بروقت حل نہ ہونا انسان کو اخلاق و کردار کی پستی میں دھکیل دیتا ہے۔ شیخ محمد اکرام دارالعلوم کی مذہبی و علمی خدمات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"گزشتہ پچاس سال کے حالات دیکھتے ہوئے یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں کہ دیوبند نے قوم کی بڑی مذہبی اور علمی خدمت کی ہے۔ دیوبند کا نصاب ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ناکافی سہی اور علماء دیوبند کو حالات زمانہ اور مغربی مستشرقین یا دور حاضر کے مصری علماء کی تصنیفات سے اتنی واقفیت نہیں جتنی علماء ندوۃ العلماء کو ہے لیکن دیوبند کا پیمانہ بہت وسیع ہے، وہاں سے ہزاروں علماء اور طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں، جنھوں نے ملک کے کونے کونے میں اسلامی علوم کے چراغ روشن کئے، مذہب کی اشاعت کی، بدعتوں اور بعض اخلاق خرابیوں کی اصلاح کی، یہ درست ہے کہ وہ جدید ضروریات کے لحاظ سے کئی باتوں میں باخبر نہیں لیکن آخر ان میں تقویٰ، پرہیزگاری اور روحانیت دوسروں سے زیادہ ہے اور صرف اسی کا فیض ملک کے دور دراز حصوں میں پہنچانا ملک اور قوم کی قابل قدر خدمت ہے۔ دارالعلوم دیوبند نے بغیر کسی شور و غل کے تھوڑی ہی مدت میں جو اعتبار اور مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔ وہ اس کے منتظمین کی قابلیت اور نیک نیتی کا واضح ثبوت ہے اور انھیں اس پر فخر کا

جائزہ حق ہے:

اگرچہ ہم ندوہ اور دارالعلوم کے موازنے اور جدید ضروریات سے ناواقفیت کے سلسلے میں اکرام صاحب مرحوم کے خیالات سے پوری طرح متفق نہیں ہیں لیکن ہم اس پر تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس دائرے میں شیخ اکرام کے اخلاص سے انکار نہیں کیا جا سکتا، وہ یہاں پر دارالعلوم دیوبند کو ایک ایسے معیار پر جانچنے کی کوشش کرتے ہیں جس کا وہ خود مدعی نہیں، یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے کہ دارالعلوم دیوبند اسلامی علوم کی ایک قدیم درسگاہ ہے، وہ موجودہ دور کی یونیورسٹی نہیں ہے۔ ۱۹۱۲ء میں علامہ رشید رضا مصری ہندوستان آئے تو دیوبند بھی تشریف لے گئے تھے۔ آپ نے دارالعلوم کے معائنے کے بعد فرمایا کہ اگر میں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہو کر واپس جاتا۔ اس دارالعلوم نے مجھ کو بتلا دیا ہے کہ ہندوستان میں ابھی علوم عربیہ اور تعلیمات مذہبی اعلیٰ پیمانے پر ہیں:

کتابیات

تاریخ دارالعلوم دیوبند (مولانا محمد طیب صاحب)، علماء حق (مولانا سید محمد میاں)، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک (مولانا عبیداللہ سندھی)، الفرقان بریلی شاہ ولی اللہ نمبر (مولانا محمد منظور نعمانی)، موج کوثر (شیخ محمد اکرم)، فرنگیوں کا جال (امداد صابری)، مسلمانوں کا روشن مستقبل (سید طفیل احمد منگلوری)، سر سید احمد خان بحیثیت ولی اللہی (ابوسلمان شاہجہان پوری)، تذکرہ خانوادہ ولی اللہی (ابوسلمان شاہجہان پوری)،

بشکریہ: "علم و آگہی" کراچی

حمد و غزل

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب

الٰہی یہ عالم ہے گلزار تیرا
عجب نقش قدرت نمودار تیرا
خوشی غم میں رکھی ہے اور غم خوشی میں
عجب تیری قدرت عجب کار تیرا
الٰہی عطا فرما درد دل ہو
کہ ترا سچا ہے درد بیمار تیرا
کوئی تجھ سے کچھ کوئی کچھ چاہتا ہے
میں تجھ سے ہوں یارب طلبگار تیرا
نہیں دو جہاں سے کچھ مجھ کو مطلوب
تو مطلوب، میں ہوں طلب گار تیرا
اٹھا غم، رکھ امید، امداد حق سے
تجھے غم ہے کیا رب ہے غم خوار تیرا

بقیہ: مسیحی مشنریاں

۱۰۔ صلیب کے علمبردار	پادری برکت اللہ	پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی لاہور
۱۱۔ فرنگیوں کا جال	امداد صابری	مطبوعہ دہلی
۱۲۔ نامرس الکتب	مفتی انتظام اللہ شہابی	انجمن ترقی اردو
۱۳۔ مباحثہ شاہجہانپور	مولانا محمد قاسم نانوتوی	مطبع مجتبائی دہلی
۱۴۔ محمد حسن نانوتوی	محمد ایوب قادری	روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی کراچی
۱۵۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات (جلد اول)	[illegible]	انجمن ترقی اردو کراچی
۱۶۔ موج کوثر	شیخ محمد اکرام	فیروز سنز لاہور

THE MISSIONS .14

دار العلوم دیوبند

ایک ادارہ۔ ایک تحریک

— پروفیسر محمد ایوب قادری —

شاہ ولی اللہ (م ۱۱۷۶ھ) اور ان کے خاندان نے برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی اصلاح اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک شروع کی اور اس خاندان نے اکناف و اطراف پاک و ہند میں علماء کی ایک ایسی جماعت تیار کر دی جس نے مسلمانوں کے نظریں و فکری میلانات اور عملی و سیاسی رجحانات کو ہموار ان میں جہاد و عمل کی روح پھونکی۔ شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے لائق فرزندان شاہ عبدالعزیز (م ۱۲۳۹ھ) شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر نیز ان کے پوتے شاہ محمد اسماعیل اور نواسے شاہ محمد اسحاق (م ۱۲۶۲ھ) نے علوم و فضائل اللّٰہی کی خوب نشر و اشاعت کی۔ اصلاح عقائد و معاشرت کے سلسلے میں شاہ اسماعیل کی کتاب تقویۃ الایمان معروف ہے۔ شاہ اسماعیل سکھوں سے جہاد کرتے کرتے بالاکوٹ کے میدان میں ۱۸۳۱ء میں شہید ہوئے۔

شاہ عبدالعزیز کے انتقال کے بعد ان کے جانشین شاہ محمد اسحاق ہوئے انہوں نے علم حدیث اور اصلاح معاشرت کی بہت کوشش کی۔ وہ تحریک جہاد کے معین و مددگار تھے جب شاہ محمد اسحاق نے برصغیر پاک و ہند میں حالات موافق نہ دیکھے تو ۱۲۵۸ھ میں حجاز کو ہجرت کر گئے۔ شاہ محمد اسحاق نے اصلاح عقائد و معاشرت سے متعلق دو کتابیں مسائل اربعین اور مائۃ مسائل مرتب کیں۔ پہلی کتاب محمد زمان خاں شروانی رئیس جیکم پور کی تحریک پر ۱۲۴۸ھ میں اور دوسری کتاب ۱۲۵۲ھ میں قلعہ معلی دہلی کے بعض شہزادوں اور بیگمات کی فرمائش پر مرتب ہوئی۔ یہ کتابیں اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان میں مسلمانوں کی معاشرتی و سماجی ترقی کا خاص طور سے خیال رکھا گیا۔ اس طرح بالواسطہ ان کی اقتصادی و معاشی اصلاح کی کوشش کی گئی۔

شاہ محمد اسحاق کے شاگرد اس زمانے کے مشہور علماء تھے۔ جنہوں نے علم حدیث اور اصلاح معاشرت کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ اس سلسلے میں مفتی عنایت احمد کاکوروی، نواب قطب الدین دہلوی (م ۱۲۸۹ھ)، مولانا احمد علی سہارنپوری اور شاہ عبدالغنی مجددی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر دونوں حضرات نے اردو زبان میں عام فہم اردو لٹریچر شائع کیا اور اس طرح مسلم معاشرے کی بڑی خدمات انجام دیں۔ نواب قطب الدین خاں نے اردو زبان میں متعدد اصلاحی کتابیں لکھیں۔ حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح کا اردو ترجمہ کیا، اردو زبان میں قرآن کریم کی ایک تفسیر جامع التفاسیر کے نام سے لکھی۔ شاہ محمد اسحاق صاحب کے آخر الذکر دونوں شاگردوں مولانا احمد علی سہارنپوری اور شاہ عبدالغنی مجددی نے علم حدیث کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ مولانا احمد علی سہارنپوری نے دہلی میں ایک پریس مطبع احمدی کے نام سے قائم کر کے حدیث کی مشہور کتب جامع ترمذی ۱۲۶۵ھ میں اور صحیح بخاری ۱۲۷۰ھ

میں شائع کیں۔

شاہ عبدالغنی مجددی، شاہ محمد اسحاق کے ہجرت کرنے کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ وہ حدیث کے بڑے عالم اور شاہ مجدد الف ثانی کی اولاد میں تھے۔ انہوں نے حدیث کی خوب نشر و اشاعت کی۔ دیوبند کے نامور علماء ان کے شاگرد ہیں۔ حدیث کی مشہور کتاب سنن ابن ماجہ کا ایک ذیل لکھا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو وہ حجاز کو ہجرت کر گئے۔

شاہ محمد اسحاق کے علاوہ خاندان عزیزی کے فیض یافتگان میں مفتی صدر الدین آزردہ اور مولانا مملوک علی نانوتوی بھی قابل ذکر ہیں۔ مفتی صدر الدین نامور عالم اور سرکار انگریزی کی طرف سے دہلی میں مفتی کے عہدے پر سرفراز تھے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں معتوب و مقید ہوئے۔ اور مولانا مملوک علی، دہلی کالج کے صدر مدرس تھے جو اپنے استاد مولانا رشید الدین خاں کے انتقال ۱۲۴۹ھ کے بعد دہلی کالج میں شعبہ مشرقی کے صدر مدرس بنے۔ علم و فضل کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ مدرسے کے علاوہ گھر پر بھی طلبہ کو درس دیتے تھے اور طلباء ان سے بہت مطمئن تھے۔ مولانا مملوک علی کی تصنیفات میں دو کتابیں تحریر اقلیدس اور تاریخ یمینی قابل ذکر ہیں۔ مولانا مملوک علی کے نامور شاگردوں میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی وغیرہ مشہور و معروف ہیں اور یہ تمام حضرات کسی نہ کسی طرح دارالعلوم کی تاسیس و قیام و انتظام میں شریک و ممد رہے۔

مذکورہ بالا تمام علماء علم حدیث میں شاہ عبدالغنی مجددی کے شاگرد ہیں۔ ان میں سے مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا احمد علی سہارنپوری کے علاوہ تمام علماء دہلی کالج کے تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ تمام حضرات تعلیم و تدریس سے وابستہ رہے۔ مولانا محمد یعقوب پہلے اجمیر کالج میں اور پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔ مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰن ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔ مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی اور مولانا محمد منیر نانوتوی اجمیر، بنارس اور بریلی کالج میں پروفیسر رہے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی کی تباہی و بربادی کے بعد برصغیر پاک و ہند میں نہ صرف مسلمانوں کی سیاسی برتری ختم ہوئی بلکہ ان کے تعلیمی ادارے بھی تباہ و برباد ہو گئے۔ چونکہ برصغیر کی حکومت انگریزوں نے مسلمانوں سے لی تھی اور وہی ان کے سیاسی حریف تھے اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بھی انہی نے قیادت کے فرائض انجام دیئے تھے۔ لہٰذا انتقام میں انگریزوں نے انہی کو سب سے زیادہ نشانہ بنایا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد شاہ محمد اسحاق کے جانشین شاہ عبدالغنی مجددی اور حاجی امداد اللہ ہجرت کر کے حجاز چلے گئے اور ان کے فیض یافتگان نے دہلی سے علمی تدریسی مرکز کو دوبارہ بحال ہوتے نہ دیکھا تو انہوں نے اس مقصد کے لیے ضلع سہارنپور کے قصبہ دیوبند کو انتخاب کیا تاکہ وہاں ایک درسگاہ قائم کر کے ولی اللہی فکر کی اشاعت کر سکیں اور ملک گیر پیمانے پر ان نظریات کو پھیلا سکیں۔

مولانا فضل الرحمٰن، مولانا ذوالفقار علی اور ایک صوفی بزرگ حاجی عابد حسین نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں چنانچہ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ (۳۰ مئی ۱۸۶۶ء) کو دیوبند کی مشہور چھتہ والی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے کھلے صحن میں اس تاریخی درسگاہ کا آغاز ہوا جس کی سرپرستی اور رہنمائی مولانا محمد قاسم نانوتوی نے کی اور درحقیقت وہی اس مدرسے کے بانی تھے۔ اس درسگاہ کے سب سے پہلے طالب علم محمود (شیخ الہند محمود الحسن) اور پہلے استاد ملا محمود تھے۔

جس نے سب سے پہلے چندہ دیا وہ حاجی عابد حسین تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں تقریباً چار سو روپے جمع ہو گئے۔ ۱۹ محرم ۱۲۸۳ھ (۳ جون ۱۸۶۶ء) کو ایک اشتہار کے ذریعے قیام مدرسہ کا اعلان کیا گیا۔ پہلے سال کے اختتام تک طلبہ کی تعداد اٹھتر ہو گئی جس میں بیرون ہند کے طلبہ بھی شامل تھے۔ طلبہ کے اضافے کے ساتھ مدرسین میں بھی اضافہ ہوا اور اس مدرسے کے مہتمم شاہ رفیع الدین مقرر ہوئے جو شاہ عبدالغنی مجددی کے خلیفہ مجاز تھے اور صدر مدرسین مولانا محمد یعقوب نانوتوی مقرر ہوئے جو [illegible]

سے مسجد چھتہ میں پڑھانے لگے۔ انھوں نے صرف تین سو چھپن روپیہ ماہوار [illegible]
اس مدرسہ کی شہرت دور دور تک پھیلی۔ اس سے [illegible]
گئی اور طلبہ کی تعداد میں بھی رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ [illegible]
مدرسے کے لیے ناکافی ثابت ہوئی اور مدرسہ ۱۲۸۴ھ میں مسجد چھتہ سے جامع مسجد میں منتقل کر دیا گیا جس کے دالان اور حجرے طلبہ کی ضروریات کے لیے مختص کیے گئے۔ مگر جلد ہی یہ جگہ بھی ناکافی ثابت ہوئی۔ پھر مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مدرسے کے لیے آبادی کے باہر ایک کشادہ اور وسیع جگہ منتخب کی۔ [illegible] وسیع قطعہ اراضی خریدنے کے بعد ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ کو جمعہ کے دن موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی عابد حسین اور مولانا مظفر حسین کاندھلوی نے بالترتیب ایک ایک اینٹ رکھی۔ اس مدرسے نے بتدریج خوب ترقی کی۔ اہتمام و انتظام کے لحاظ سے دارالعلوم کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) ۱۸۶۶ء تا ۱۸۹۵ء

(۲) ۱۸۹۶ء تا ۱۹۲۹ء

(۳) ۱۹۳۰ء تا حال

دوسرا دور اہتمام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے صاحبزادے شمس العلماء حافظ محمد احمد کا ہے۔ ان کے طویل دور اہتمام میں مدرسے نے بہت ترقی کی اور ان ہی کے زمانے میں یہ درس گاہ مدرسے کے درجے سے دارالعلوم بنی۔ ان کے فرزند مولانا محمد طیب لکھتے ہیں۔

> "مالی امداد میں، بڑی بڑی عمارتیں، دارالطلبہ قدیم دارالطلبہ جدید کا کچھ حصہ، دارالحدیث تحتانی، مسجد دارالعلوم کتب خانہ، دارالمشورہ، قدیم صدر دفتر اور مختلف احاطے ارض دارالعلوم پر نمایاں ہوئے۔ کارکنوں میں اضافہ ہوا حاصل یہ کہ اس درسگاہ نے مدرسے سے دارالعلوم اور دارالعلوم سے ایک جامعہ کی صورت اس زمانے میں اختیار کی۔"

موجودہ مہتمم مولانا محمد طیب کے زمانے میں دارالعلوم نے ان کے والد کے زمانے سے بھی زیادہ ترقی کی۔ آج دارالعلوم دیوبند ایشیا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی درسگاہ ہے اور بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دارالعلوم کا نظام جمہوری بنیادوں پر رکھا ہے۔ دارالعلوم کی سب سے بڑی با اختیار جماعت مجلس شوریٰ ہے۔ دارالعلوم کا تمام نظم و نسق اسی جماعت کے ہاتھ میں ہے اور اس کے تحت ایک مجلس عاملہ ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے آٹھ اساسی اصول مقرر کیے ہیں۔ انھوں نے عام مسلمانوں اہل علم و عقل کے مشورے کو بھی قبول کرنے کی راہ کھلی رکھی۔ مولانا نانوتوی نے سرکار اور امراء کی شرکت کو بھی مدرسے کے لیے مضر بتایا ہے۔ اور عوام کے چندے پر زیادہ زور دیا ہے تاکہ یہ درسگاہ جمہوری و عوامی ادارہ بنے اور حکومت کے تسلط و اثر سے بھی آزاد رہے۔

برصغیر پاک و ہند میں عربی مدارس میں درس نظامی مروج ہے۔ اس نصاب میں معقولات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے مگر دارالعلوم دیوبند نے ولی اللّٰہی نصاب کو اپنایا جس میں علوم منقول تفسیر و حدیث و فقہ پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علوم حدیث پر دارالعلوم دیوبند میں بہت کام ہوا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا بدر عالم، مولانا یوسف بنوری، مولانا منظور احمد نعمانی اور مولانا ظفر احمد تھانوی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا اشرف علی کی تو ساری عمر ہی حدیث کی خدمت میں گزری۔ مولانا کشمیری نے جامع ترمذی کی شرح العرف الشذی، مولانا عثمانی نے صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم، مولانا ظفر احمد تھانوی نے اعلاء السنن اور مولانا بنوری نے معارف السنن جیسی ضخیم کتابیں لکھیں یہ تمام کام عربی زبان میں ہوا ہے۔ اردو زبان میں مولانا بدر عالم کی ترجمان السنہ، مولانا منظور احمد نعمانی کی معارف الحدیث، مولانا فخر الدین کی ایضاح البخاری احادیث کی مشہور و معروف کتب ہیں۔

قرآن کریم کے اردو تراجم و تفاسیر میں مولانا محمود الحسن کا ترجمہ قرآن

مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر بیان القرآن اور مفتی محمد شفیع کی معارف القرآن بھی قابل ذکر ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کی نمایاں خصوصیت قرآن و حدیث کی خدمت ہے۔ حسب ضرورت علم معقول کی کتابیں بھی داخل نصاب ہیں۔ نصاب کی تکمیل کی مدت ۸ سال ہے۔ جس میں دو سال درجہ تکمیل کے ہیں۔ ذریعہ تعلیم اردو ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی کو عصری تقاضوں کا پورا پورا احساس تھا۔ انہوں نے یہ بھی رائے ظاہر کی کہ دارالعلوم میں انگریزی زبان اور سائنس وغیرہ کی بھی تعلیم دی جائے بلکہ مولانا نانوتوی نے خود بھی انگریزی پڑھنے کی خواہش ظاہر کی جو پوری نہ ہو سکی۔ طلبا کو معاشی اعتبار سے خود کفیل بنانے کے لیے دارالعلوم میں چھوٹی چھوٹی صنعتیں مثلاً کتابت، جلد سازی، خیاطی، پارچہ بافی اور جفت سازی وغیرہ کا بھی اجراء کیا گیا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہندوؤں کو ہر شعبہ حیات میں آگے بڑھایا۔ مسلمان ان سے پیچھے رہ گئے۔ گو اس سے پہلے مسلمان ہر شعبہ حیات میں ہندوؤں سے برتر اور ممتاز تھے۔ انگریزوں کی شہ پر ہندوؤں میں مذہبی و سماجی بیداری بھی پیدا ہوئی۔ برہمو سماج اور آریہ سماج اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ آریہ سماج نے غیر ہندوؤں کو ہندو مذہب میں شامل کرنا شروع کر دیا۔ پادریوں نے انگریزی حکومت کے زیر سایہ عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ غرض مسلمانوں کے لیے نصرانیت اور آریہ دو بڑے فتنے تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دہلی کے قیام کے زمانے (۱۸۷۶ء) میں جب یہ صورت حال دیکھی کہ پادری بازاروں، میلوں اور عام مجمعوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام پر اعتراضات کرتے ہیں تو انہوں نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ وہ بھی اسی طرح کھڑے ہو کر بازاروں میں وعظ کیا کریں اور پادریوں کا رد کریں اور ایک روز خود بھی بغیر تعارف اور اظہار نام مجمع میں پہنچ گئے اور ایک پادری تارا چند سے مناظرہ کیا اور اس کو شکست دی۔ اسی زمانے میں مولانا محمد قاسم نانوتوی ضلع شاہجہان پور (یوپی) کے قریب چاندا پور میں ایک زمیندار پیارے لال کبیر پنتھی کی سرپرستی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ رابرٹ جارج کی تائید سے مئی ۱۸۷۶ء کو ایک میلہ خدا شناسی منعقد ہوا۔ جس میں عیسائی، ہندو اور مسلمان تینوں مذاہب کے نمائندوں کو بذریعہ اشتہارات دعوت دی گئی کہ اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کریں۔ مولانا محمد منیر نانوتوی اور مولوی الٰہی بخش رنگین بریلوی کی تحریک پر مولانا محمود الحسن، مولانا فخر الحسن اور مولوی رحیم اللہ بجنوری کے ہمراہ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ابطال تثلیث و شرک، اور اثبات توحید میں ایسا بیان کیا کہ حاضرین جلسہ موافق و مخالف دنگ رہ گئے۔

دوسرے سال مارچ ۱۸۷۷ء میں یہ میلہ پھر منعقد ہوا۔ اس مرتبہ بھی مولانا محمد قاسم نانوتوی پہنچے۔ اس مرتبہ آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی (م ۱۸۸۳ء) اور اس علاقے کے مشہور پنڈت منشی اندرمن مرادآبادی بھی آئے۔ عیسائی پادریوں اور دیانند سرسوتی نے بھی تقریریں کیں۔ مولانا محمد قاسم کی تقاریر اثبات توحید اور تحریف انجیل پر ہوئیں، مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دونوں سال شریک ہو کر عیسائیوں اور ہندوؤں کی سازش کو ناکام بنا دیا۔

مولانا محمد قاسم کے بعد دوسرے اکابر علمائے عیسائیت اور آریہ سماج کا خاص طور سے رد کیا۔ اس سلسلے میں مولانا محمد الیاس کا ذکر بھی ضروری ہے جنہوں نے میوات میں تبلیغ کا کام نہایت استقلال اور صبر سے انجام دیا اور اس علاقے کو اسلام سے روشناس کرایا۔

مولانا محمد الیاس بن مولوی محمد اسماعیل ۱۸۸۵ء میں کاندھلہ میں پیدا ہوئے اپنے بھائی محمد یحییٰ (ف ۱۹۱۵ء) اور مولانا خلیل احمد انبیٹھوی سے تحصیل علم کی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے مرید ہوئے۔ تبلیغ کا آغاز ان کے والد مولوی محمد اسماعیل کر چکے تھے۔ مولانا محمد الیاس نے اس کو باقاعدہ تحریک کی شکل دی اور اس کا مرکز درگاہ نظام الدین اولیاء دہلی کو بنایا۔ مولانا الیاس نے میواتیوں کو خاص طور سے تبلیغ کا اور ان کو پکا مسلمان بنایا۔ ورنہ وہ لوگ غیر اسلامی زندگی گزارتے تھے۔ انہوں نے

تبلیغ کے لیے معروف جماعت کا پروگرام بنایا۔ تبلیغی گشت شروع کیے۔ نماز اور اسلام کے اصول و ارکان کی تبلیغ شروع کی۔ آہستہ آہستہ یہ تحریک میوات کے علاقے سے نکل کر ملک کے دوسرے حصوں میں آگئی۔ اس تحریک کی کامیابی کے متعلق مولانا ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں۔

"جس علاقے میں کوسوں مسجد نظر نہیں آتی تھی۔ وہاں گاؤں گاؤں مسجدیں بن گئیں اور دیکھتے دیکھتے اس علاقہ میوات میں ہزاروں مسجدیں پکی کھڑی ہو گئیں۔ سینکڑوں مکتب اور متعدد عربی مدرسے قائم ہو گئے۔ حفاظ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز پہنچی فارغ التحصیل علماء کی ایک خاص بڑی تعداد پیدا ہو گئی۔"

مولانا محمد الیاس کے انتقال (۱۳ جولائی ۱۹۴۴ء) کے بعد ان کے جانشین ان کے بیٹے مولانا محمد یوسف ہوئے۔ مولانا محمد یوسف ۱۹۱۷ء میں کاندھلہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے والد اور دوسرے علماء سے تحصیل علم کی۔ مولانا محمد یوسف کے زمانے میں تبلیغ کی تحریک برصغیر پاک و ہند سے نکل کر بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گئی اور اس کے چرچے دنیا کے کونے کونے میں ہونے لگے اور مولانا محمد یوسف نے مختصر سی مدت میں اتنی زبردست کامیابی حاصل کی کہ وہ تحریک جو میوات کے ان پڑھ مسلمانوں کو صرف نماز سکھانے کی تحریک کے نام سے مشہور تھی اس کو پہلے ملکی اور پھر ایک بین الاقوامی تحریک بنا دیا۔ ۲ اپریل ۱۹۶۵ء کو مولانا محمد یوسف کا انتقال ہوا۔ وہ ایک مبلغ کے علاوہ بلند پایہ مصنف بھی تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے انداز پر پورے برصغیر پاک و ہند میں بہت سے مدارس جاری ہوئے۔ جن کی تفاصیل کی یہاں گنجائش نہیں بلکہ ان میں سے بعض خود مرکزی حیثیت کے حامل ہو گئے۔ ایسے مدارس میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ امینیہ دہلی، دارالعلوم کراچی، مدرسہ عربیہ اسلامیہ (نیو ٹاؤن) کراچی، خیر المدارس ملتان، مدرسہ اشرفیہ لاہور، مدرسہ حقانیہ اکوڑہ خٹک خاص طور سے قابل ذکر ہیں بلکہ دارالعلوم کے زیر اثر مدارس برما، نیپال اور مشرق وسطیٰ میں قائم ہوئے۔ مکہ کی مشہور درس گاہ مدرسہ صولتیہ دارالعلوم دیوبند کا SISTER INSTITUTION ہے۔ اس کے بانی و سرپرست مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی دیوبند کے اکابر میں تھے۔ مدینہ منورہ میں مدرسہ علوم شرعیہ قائم ہوا جو مولانا حسین احمد مدنی کے بھائی نے قائم کیا۔

مکہ اور مدینہ میں اس تحریک کے نامور علماء نے انفرادی حیثیت سے کام یعنی تبلیغ کے فرائض انجام دیئے۔ اس طرح ان کے افکار و خیالات تمام دنیا کے مسلمانوں تک پہنچے۔ ان علماء میں شاہ عبدالغنی مجددی، حاجی امداد اللہ کے علاوہ مولانا محمد عالم حسنی، مولانا حسین احمد مدنی، مولوی سراج احمد، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا بدر عالم، عبدالغفور عباسی وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل علماء نے نہ صرف درس و تدریس، تصنیف و تالیف، تبلیغ و تذکیر اور افتاء و مناظرہ کے فرائض انجام دیئے بلکہ صحافت و ادب کے میدان میں بھی قابل قدر کارنامے انجام دیئے۔ مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی (ادبی دنیا لاہور)، مولانا منظر الدین (الامان، وحدت، دہلی)، مولانا شائق احمد عثمانی (عصر جدید کلکتہ)، مولانا حامد الانصاری (مدینہ بجنور)، مولانا سعید احمد اکبر آبادی (برہان دہلی) کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے اثرات سے دینی اور مذہبی صحافت کی بنیاد مضبوط ہوئی۔ خاص طور دارالعلوم دیوبند اور اس کے حلقے سے "القاسم" "الرشید" "المحمود" "الامداد" اور "ہادی" وغیرہ مؤقر رسالے جاری ہوئے۔ آج بھی دارالعلوم دیوبند سے دو ماہنامے "دارالعلوم" (اردو) اور "دعوۃ الحق" (عربی) شائع ہوتے ہیں۔ اس فہرست میں البلاغ (کراچی)، الحق (اکوڑہ خٹک)، بینات (کراچی)، تعلیم القرآن (راولپنڈی)، [illegible] (جھنگ) اور الرشید (ساہیوال) کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ پرچے دینی صحافت کے قابل قدر آثار ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں چونکہ ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ لہٰذا یہ اردو کی نشر و اشاعت کا بہت بڑا مرکز ہے۔ یہاں کے فارغ التحصیل علماء بنگال، برما، قبائلی علاقے، سرحد اور افغانستان وغیرہ میں اردو کو متعارف کراتے ہیں۔

— —

مرقعِ عقیدت

از حضرت مولانا قاری محمد عبدالعزیز شوقی استاذ دارالعلوم رحمۃ اللہ علیہ بخدمت عالی جناب حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مدظلہ

اے حکیمِ عالمِ اسلام ! اے شیخ جلیل — ذوقِ علم و فن کی رونق ہے تیرا ذکرِ جمیل

اے خطیبِ ملک ! اے ملت کے سحبانِ کبیر — حسنِ رازیؒ و غزالیؒ زینتِ ابن کثیرؒ

اے مجاہد، اے زعیمِ قوم، دانائے عظیم! — زیب دیتا ہے اگر تجھ کو کہیں فخرِ کلیم

اے علومِ قاسمی کے شارحِ شیریں اَدا — ندرتِ انشا تری کلکِ ازل کی ہم نوا

اے سریر آرائے بزمِ مرشد، اے قطبِ زماں — تیرے فیضِ خاص سے سیراب ہے سارا جہاں

ثانیٔ قاسمؒ ہے، احمدؒ کا جگرپارہ ہے تو — ہاں رشیدؒ و اشرفؒ و محمودؒ کا پیارا ہے تو

تو صلاح و خیر کی اقلیم کا ہے تاجدار — شوکتِ تقوائے تری ہر ہر اَدا سے آشکار

تو نے رکھا پرچمِ اسلام دُنیا میں بلند — تجھ پہ نازاں کیوں نہ ہو دارالعلوم دیوبند

تیرے اخلاقِ کریمانہ کا ہر خاطر اسیر — نورِ باطن سے ترے ہر ذرّۂ دل مستنیر

نطق کو تیرے میسر قوتِ رُوح الامیں — فکر تیرا لامکانی سطوتوں کا ہے مکیں

صورتِ طیب تری آوازۂ طوبیٰ نصیب — سیرتِ اکمل میں ہے اسلاف کا رنگِ عجیب

تیری ایمانی فراست روکشِ اعجاز ہے — تیری آنکھوں میں خدا والوں کا ہر انداز ہے

علم تیرا بے نظیر اعمال تیرے بے مثال
شوقیٔ ناکارہ کو تعریف کی ہے کب مجال

بشکریہ قاری حبیب الرحمٰن
تعمیذ و تلمیذ حضرت شوقی

کی

مشرف علی تھانوی
خطیب
جامع مسجد
واپڈا کالونی
ابرپال لاہور

بھول کر بھی نہ آئیں گے یہ لوگ　　　جا کے واپس نہ آئیں گے یہ لوگ

سرمدی ہو گیا ہے ان کا سفر　　　اب کہاں پائے جائیں گے یہ لوگ

اپنے حق میں وسیع و بے پایاں　　　رحمت حق کو پائیں گے یہ لوگ

اب تو فردوس خلد میں جا کر　　　اپنی محفل سجائیں گے یہ لوگ

بے حجابانہ ہوگا نظارہ　　　جلوہ حق کو پائیں گے یہ لوگ

کون ملک عدم سے داعی سے　　　کس کی مجلس میں جائیں گے یہ لوگ

بستیاں کر کے چل دیے ویراں　　　اپنی دنیا بسائیں گے یہ لوگ

ایک ہی راہ کے تو سالک تھے　　　ایک منزل پہ جائیں گے یہ لوگ

جا رہے ہیں جو آج کر کے حجاب　　　چھپ کے پھر دل میں آئیں گے یہ لوگ

کون پھر اس نظر میں جچتا ہے　　　جس نظر میں سمائیں گے یہ لوگ

ہم انھیں آج تک نہیں بھولے　　　کیا ہمیں بھول جائیں گے یہ لوگ؟

دل کی گہرائیوں میں بستے ہیں　　　کیوں نہ پھر یاد آئیں گے یہ لوگ

جتنی مدت گزرتی جائے گی　　　اور بھی یاد آئیں گے یہ لوگ

ہم بھلا بھول جائیں کیسے انھیں　　　جب نہ ہم کو بھلائیں گے یہ لوگ

محفل لامکاں میں اے عارف
ہم کو کس دن بلائیں گے یہ لوگ

نعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

از حضرت مولانا محمد اسعد اللہ اسعدؔ استاذ مظاہر العلوم سہارنپور

مجھے کیا علم کیا تم ہو، خدا جانے کہ کیا تم ہو
کسی کی آرزو کچھ ہو! کسی کا مدعا کچھ ہو
زمانہ جانتا ہے صاحب لولاکلما تم ہو
نہ یہ قدرت زباں میں ہے نہ یہ طاقت بیاں میں ہے
رسالت کو شرف ہے ذات اقدس کے تعلق سے
کہاں ممکن تمہاری نعت حضرت مختصر یہ ہے
گروہ رازداں "نظم فطرت" پر نہیں مخفی
نہیں شرمندۂ اظہار، اوصاف گرامی قدر
فصاحت کو تحیر ہے، بلاغت کو پریشانی
گناہگاران امت کا سہارا ذات والا ہے
یہ ربط باہمی امت کو وجہ صد تفاخر ہے

بس اتنا جانتا ہوں محترم بعد از خدا تم ہو
ہماری آرزو تم ہو، ہمارا مدعا تم ہو
جہاں کی ابتداء تم ہو جہاں کی انتہا تم ہو
خدا جانے تو جانے! کوئی کیا جانے کہ کیا تم ہو
نبوت ناز کرتی ہے کہ ختم الانبیاء تم ہو
دو عالم مل کے جو کچھ بھی کہیں اس سے سوا تم ہو
یہ سب ہنگامۂ دنیا خبر ہے، مبتدا تم ہو
بتاؤں کیا کہ کیا تم ہو، سناؤں کیا کہ کیا تم ہو
کہ لفظوں سے بہت بالا جناب مصطفیٰ تم ہو
خوشا قسمت کہ حضرت شافع روز جزا تم ہو
تمہارا ہے خدا محبوب! محبوب خدا تم ہو

تمہارے واسطے اسعدؔ کہیں بہتر ہے شاہی سے
کہ اک ادنیٰ غلام بارگاہ مصطفیٰ تم ہو

حضرت احسان دانش

اکابرِ دیوبند

(جہانِ دانش جلد دوم زیرِ طبع)

جب میں دیوبند ایک مشاعرے میں گیا تو میرا قیام مولانا ازہر شاہ صاحب قیصر کے یہاں ہوا۔ مولانا ازہر شاہ، حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے بڑے صاحبزادے ہیں نثر اور نظم پر دسترس ہے اور دارالعلوم کے رسالہ "دارالعلوم" کو مرتب کرتے ہیں۔ اس سے ان کے قلم کی جولانی اور فکر کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بحیثیت انسان نہایت خوش خلق، حلیم، سخی اور انسان دوست واقع ہوئے ہیں۔ ان سے میرے تعلقات آج تک اسی ایک انداز پر چلے آ رہے ہیں۔ وہ دن دور نہیں کہ وہ بھی حضرت سید انور شاہ صاحب کی طرح اپنا مقام پیدا کر لیں گے۔ خدا انہیں اس دور کے فتنوں اور مصائب سے محفوظ رکھے۔ آمین

میں لگے ہاتھ ان کے والد مولانا سید انور شاہ کشمیری علیہ الرحمۃ کا ذکر بھی کرتا چلوں، تو مناسب ہوگا

مولانا سید انور شاہ کشمیری:

موصوف دارالعلوم دیوبند میں صدر المدرسین تھے اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص شاگرد۔ وہ ذہن اور حافظے کے اعتبار سے ایک چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ جہاں مناظرے کو جاتے حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ ہمراہ ہوتے۔ اس وقت دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں قریب قریب ذخیرہ لاکھ کتب تھیں۔ اور مولانا موصوف کے ذہن میں وہ اس طرح تھیں جیسے آئینے میں عکس اگر کبھی ایسا ہوتا تھا کہ شیخ الہندؒ کے ساتھ مولانا انور شاہ صاحب نہ ہوتے تو شیخ الہندؒ فرماتے کتاب خانہ میرے ساتھ نہیں، حوالوں کے وقت دقت پیش آئے گی کیونکہ جب مناظرے میں کتاب کے حوالے کی ضرورت پڑتی، کتاب کا نام، صفحے کا نمبر اور مصنف کی نشاندہی مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا کام تھا۔

ویسے بھی انہیں تمام علوم معقولات و منقولات میں دستگاہ تھی شاید یہی سبب تھا کہ آپ کے دور کا درس حدیث یا دگار درس حدیث کہا جاتا ہے جو بیان و عرفان کے علاوہ ابلاغ میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ آپ نے اپنی خداداد ذہانت اور حافظے کے کمال سے درس حدیث کو جامع علوم و فنون بنا رکھا تھا اور آپ کے درس نے اسلامی دنیا میں باہر کے فتنوں کے راستے بند کر رکھے تھے۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی جو علماء علمی اور تعلیمی مسندیں سنبھالے بیٹھے ہیں وہ زیادہ تر آپ ہی کے تلامذہ نظر آتے ہیں۔ مولانا انور شاہ صاحب کو رد قادیانیت میں شغف تھا۔ وہ اس تحریک کو اعظم الفتن کہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی کتنی معرکۃ الآرا کتابیں ہیں اور انہوں نے اپنی استعداد کے مطابق تصنیف و تالیف میں رد قادیانیت پر اصرار کیا ہے۔ مولانا کے سامنے جب کوئی رد قادیانیت پر کوئی تحریر لاتا تو آپ سنتے اور اصلاح

فرماتے. اور اس کے ساتھ دعائیں بھی دیتے۔ آپ نے گیارہ بارہ سال دارالعلوم دیوبند میں درس دیا۔ اور آپ کے دورِ صدارت میں آٹھ نو سو طلباء نے علمِ حدیث پڑھا۔ اور اس فن کو تقریر و تحریر سے دور دور تک پہنچا دیا۔

ان کے دریائے فیض سے علامہ اقبال بھی فیضیاب ہوئے اور میں سمجھتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ نے انہیں کے طفیل تبلیغِ دین کی ہے۔ کیونکہ حقیقت خواہ کسی بھی مقام پر کیوں نہ ہو۔ پرخلوص نگاہیں اور جہد و جستجو کے علاوہ تحریر و گداز سے مالا مال دل اُسے پہچان لیتے ہیں۔ اور جب تک وہ اپنی لگن میں کامیاب نہیں ہوتے بے اطمینانی کا شکار رہتے ہیں خصوصاً ایسے لوگوں کی نیکی، خلوص، سخاوت اور محبت ہی سرمایہ انہیں لوگوں سے دستیاب ہوتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں سے وجدان کی روشنی خود بخود آدمی کا ساتھ دینے لگتی ہے۔ اور عشق خود حیرت کی طرف مڑ جاتا ہے۔

مولانا انظر شاہ کشمیری:

یہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ نہایت ذہین اور فطین نوجوان زہد و اتقاء کے معاملے میں اپنے والد بزرگوار کے قدم بقدم چل رہے ہیں خدا انہیں علم کی دولت سے مالا مال کرے۔ اور کامیاب زندگی عطا فرمائے۔ میں اپنے قیافہ کی رو سے ان میں خوبیاں دیکھ رہا ہوں خدا کرے وہ ایسے ہی نکلیں۔ جو میرا قیافہ ہے۔ آمین

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ:

حضرت نانوتویؒ دارالعلوم کے بانی تھے اور جماعت کی حیثیت سے اس گروہ کے سربراہ جن کی کوششوں اور محنتوں نے مختصر عرصہ میں ایسے ایسے جید علماء پیدا ہوئے۔ جنہوں نے علوم القرآن اور تفہیم حدیث پر دن رات محنت کر کے فقہ، حدیث، تفسیر اور درایت سے خدا پرستی اخلاق اور اصلاح کے ساتھ ساتھ قومی و ملکی امور کے قائد تیار کئے۔

عیسائیوں اور آریوں سے مناظرے کر کے دینِ حق کے راستے کانٹے صاف کئے اور راہروانِ حق کے لئے جگہ جگہ شاہراہیں بنائیں۔ اصول اسلامیہ اور اساسی عقائد کو عقلی دلائل سے صاف اور نکھار کر کے تبلیغ اشاعت کی چار دیواری کو بلندی اور وسعت دی۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں شاملی کے مقام پر جو جنگ ہوئی اس میں سپاہیانہ حیثیت سے حصہ لیا۔ معاشرے سے غلط رسم و رواج سے پھیلی ہوئی ابتری کو ختم کیا۔ جس کی تفصیل سوانح قاسمی میں درج ہے۔

آپ سے ہزاروں انسانوں نے دینی مسائل اور تصوف کے رموز عرفان پایا۔ تصنیف و تالیف میں بھی کئی کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ:

آپ بھی دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے ہیں۔ اور سرپرست کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ سے سیکڑوں ہزاروں تشنگانِ علم نے استفادہ کیا۔ آپ کو علم فقہ، حدیث اور تصوف سے شغف تھا۔ اس راہ کے مسافروں کو انہوں نے راہ راست پر لا کر ایک اسلامی خدمت انجام دی ہے بلکہ آپ سے اس دور کے علماء نے بھی تربیت پائی ہے۔ اور انہیں دین کے معاملے میں اس قدر راسخ العقیدہ کر دیا کہ ان پر زمانے کی فتنہ پردازی کا کوئی اثر نہ ہوا گویا کفر و الحاد کے راستے بند کر دیئے گئے تھے۔

۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب میں آپؒ نے حضرت نانوتوی کے دوش بدوش کام کیا اور نظر بند بھی رہے مگر ان کا اتقاء و تقویٰ ایک ایسا شعلہ تھا جو بجھنے کی بجائے مشتعل ہوتا چلا گیا اور آخر ان کا مشن کامیاب ہوا۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ

موصوف معروف عالم دین، فقیہ، محدث اور عارف باللہ تھے جہاں تک دین کا تعلق ہے مولانا ہر شعبہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ آپ نے چودہ

بڑی کاوش کے بعد دارالعلوم میں ترجمۂ قرآن مجید کا درس جاری کیا۔ اور آپ کے تلامذہ ہندوستان میں تبلیغ کرتے رہے۔ خود مولانا تھانویؒ نے بھی ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل کر اطراف دنیا کو مستفیض کیا۔ اور جہاں تک تصنیف و تالیف کا تعلق ہے آپ نے اپنی زندگی میں ایک ہزار سے زیادہ تصانیف و تالیفات چھوڑیں۔ جو مختلف علوم و فنون پر ہیں۔ آخر میں خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں مقیم ہوگئے اور وہیں سے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رہا۔ اور ہزاروں آدمی ان سے بیعت ہوئے۔

آپ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے مستفید تھے آپ کے خلفاء ملک بھر میں اپنی اپنی جگہ اصلاح و تربیت میں مشغول رہے اور ہیں۔

آپ تفسیری مسائل اور مسائل حدیث کے بعض رموز و نکات میں حضرت نانوتویؒ ہی سے رجوع کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکیم الامت کا لقب آپ ہی کی ذات بابرکات کو زیب دیتا ہے۔ آپ کی تبلیغ و تلقین اور تصنیفات و تالیفات سے ہزاروں بندگانِ خدا کو نیکی کا راستہ ملا۔ اور باطن میں اُجالے ہوئے۔ آپ جب حصول علم کے لئے دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اُسی سال حضرت نانوتویؒ کا وصال ہوگیا۔ اور موصوف حسب دلخواہ استفادہ نہیں کرسکے مگر حضرت نانوتویؒ کے تلامذہ۔ مثلاً مولانا محمد یعقوب شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا عبدالعلی سے کسب کمال کیا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی

آپ حضرت نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے حضرت کے بعد قاسمی علوم کی تبلیغ و ترسیع آپ ہی کی بدولت سے ہوئی درس و تدریس کے علاوہ ارشاد و تلقین اور جہاد کی تبلیغ کا بے مثال کام آپ نے کیا اور نانوتویؒ علوم کو امانت خیال کرتے تھے اس لئے زندگی بھر اس کی ترسیع و اشاعت اور تفہیم و وضاحت میں لگے رہے۔ حضرت نانوتویؒ کی کتابوں کی اصل طباعت میں جو آپ ہی کی سعی و محنت ہے حضرت نانوتویؒ کی تصانیف بھی انہی کی نگرانی میں چھپیں۔ حجۃ الاسلام کو آپ ہی نے عنوانات دئیے۔ اور قرآن پاک کا ترجمہ بھی کیا بخاری شریف کے ابواب و تراجم پر ایک جامع رسالہ لکھا اس کے علاوہ متعدد مناظرانہ رسائل تصنیف کئے جن سے مسلمانوں کو دینی فائدہ پہنچا جیسے ادلۂ کاملہ –

آپ نے دیوبند میں چالیس سال درس حدیث دیا اور وہیں کی کوشش سے کہ آپ کے سو سے زائد اعلیٰ استعداد کے صاحبانِ علم و فن اور علماء دیوبند رشد و ہدایت سے مسلح کر کے اطراف و جوانب میں پھیلائے اور خود بھی مناظرے کر کے لاکھوں کو گمراہی سے بچایا۔

آپ کو علماء نے محدث عصر تسلیم کیا۔ اور آپ نے بیعت و ارشاد سے سیکڑوں تشنگانِ معرفت و طریقت کو عارف باللہ کر دیا اور یہ سلسلہ ہندوستان سے لے کر افغانستان اور عرب تک پھیلا ہوا تھا۔

ہندوستان کو انگریز کی غلامی سے آزاد کرانے کے لئے آپ نے تحریک چلائی جسے رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے موسوم کیا گیا اگرچہ یہ تحریک راز نہ رہ سکی اور اس میں کام کرنے والے مجاہدوں سے ہندوستان کی جیلیں بھر دی گئیں لیکن جن کے سینوں میں یہ شعلے بھڑک رہے تھے انہوں نے آئندہ کام کرکے ہندوستان کو آزاد کرا کے چھوڑا۔ موصوف پانچ سال مالٹا میں اسیر رہے۔ مگر وہاں بھی زبان و قلم تبلیغ و تحریر سے باز نہ رہے اور آپ نے کئی ایک تصانیف چھوڑیں۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ

موصوف سکھ مت سے دائرہ اسلام میں آئے تھے اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص شاگردوں میں سے تھے۔ دیوبند سے فضیلت کے بعد جمعیت الانصار دیوبند کے ناظم بھی رہے۔ ذکاوت و ذہانت اور بلا کا حافظہ پایا تھا۔ دماغ فطری طور پر سیاسی تھا۔ یورپ اور ایشیا کے کئی انقلاب مشاہدے کئے تھے۔ یہ سبب تھا کہ سیاسی حالات کی ساخت و پرداخت اور اصول و ضوابط متعین کرنے میں

عثمانی کا اثر تھا۔ دیوبند سے دستار فضیلت حاصل کئے ہوئے انہیں ایک مدت ہو چکی تھی مگر وہ مجلس شوریٰ کے رکن اور خاص خاص مشوروں میں شامل و شریک رہے۔

خدا مغفرت کرے عجیب شخصیت تھی ان کی

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ان لوگوں میں سے تھے جن کی انسانی عظمت اور بلندی کی بنیاد اعتماد نفس اور عزت نفس پر تھی۔ ایسے لوگوں کی زینت و آرائش قدرت خود اپنے غیر مرئی ہاتھوں سے کرتی ہے۔ اور اظہار صداقت کے ساتھ جرأت بیان اور افسون زبان سے نواز کر اپنے پیغامات کی توسیع و حصول کا شعور عطا کرتی ہے۔ اور اس قسم کے لوگ قدرت کی نشان دہی سے وعدۂ محمودیت کی یاد دہانی کرلیتے ہیں۔ ایسے لوگ خود کو نظر انداز کر کے اپنی حق رسی کو پس پشت ڈال کر مستحق لوگوں کے حقوق دلوانے میں زیادہ چوکس رہتے۔ اور اطمینان محسوس کرتے ہیں ان کا یہی اطمینان کچھ روز کے بعد ان کے لئے ابدی طمانیت ہو جاتا ہے۔

اس طبقے کے تمام افراد دنیاوی مفادات اور ذاتی اعزازات کے مقابلے میں ترویج صداقت اور خدمت خلق کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ خود کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے اجر و انعام کی ذمہ داری قدرت پر آ جاتی ہے۔ انہیں حیات کے لمحات کی غلطیوں کا اعتراف شکوہ و شکایت تک نہیں آنے دیتا۔ وہ ہر مشکل پر خاموش اور ہر مصیبت پر شکر کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اور ایسی لذت ہے جو بڑے سے بڑے نشے اور حسین سے حسین خد و خال میں بھی نہیں ملتی۔ ان کی آنکھوں کے آنسو تو خشک نہیں ہوتے۔ مگر ہونٹوں کا تبسم بھی نہیں مرجھاتا۔

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ:

مولانا محمد ادریس کاندھلوی صاحبؒ دیوبند کے معتمد علیہ اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ صاحب کے خاص شاگرد تھے۔ مولانا محمد ادریس کا حدیث، فقہ اور تفسیر میں ایک خاص مقام ہے۔ جو بہت کم علماء کو نصیب ہوتا ہے۔ آپ نے بڑا کمال حاصل کیا تھا۔ یوں کہئے کہ علوم و کتب کا استحضار انہیں ہر وقت رہتا تھا۔ کہ آپ بلند و برتر سمجھا جاتا تو تدریس میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ فضیلت سے فراغت کے بعد بعض مدارس میں درس و تدریس سے منسلک رہے اور بالآخر دارالعلوم دیوبند میں شیخ التفسیر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے۔ کتب تفسیر کے ساتھ دورہ کی کتب حدیث بالخصوص ابوداؤد شریف اکثر و بیشتر انہیں کے درس میں رہتی تھی۔ میرے ہم عصر تھے اس لئے گاہے گاہے ان سے ملتا رہتا تھا۔ میرے خیال میں مولانا محمد ادریس کا اتقاء بہت کم علماء میں ملے گا۔ اتباع سنت کا شغف اپنی حد سے تجاوز تھا۔ اور عظمت سلف کا خاص خیال رکھتے تھے۔ علوم شرعیہ کی نشر و اشاعت اور رد مذاہب باطلہ پر توجہ مرکوز رہتی تھی۔ اس سلسلے میں ان کی کئی تصانیف موجود ہیں۔ جن میں انہوں نے محققانہ انداز اختیار کیا ہے۔ ان کتب کا مطالعہ قاری کو ایسا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ جو چند کتب سے نہیں ملتا۔ ان کی کتاب "مشکوٰۃ المصابیح" کی شرح "التعلیق الصبیح" پانچ جلدوں میں ہے۔ جو ان کا کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ آپ نے ممالک اسلامیہ کے سفر بھی کئے۔ اور بیروت جاکر اپنی کتاب شرح مشکوٰۃ کو طبع کرایا۔ اس کے علاوہ سیرت المصطفیٰ کے نام سے ایک محققانہ سیرت کئی جلدوں میں لکھی ہے۔ جس میں آزاد خیال مصنفین پر آزادی سے تنقید بھی کی ہے۔ میرے خیال میں ان کا یہ شاہکار سیرت کی کئی کتب پر بھاری ہے اس کے مطالعہ سے کئی شکوک و شبہات بھی دور ہو جاتے ہیں۔

شاعری کا مشغلہ کے لوگوں کا حصہ ہے۔ چنانچہ مولانا محمد ادریس صاحب بھی عربی اور فارسی میں بے تکلف شعر کہتے تھے۔ پاکستان بننے پر آپ نے پاکستانی سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور یہ اس ملک کی خوش نصیبی تھی کہ یہاں ایسا عالم بے بدل آکر آباد ہو گیا تھا۔ ایک مدت جامعہ اشرفیہ میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔ ہر جمعہ کو نیلا گنبد والی مسجد میں وعظ فرماتے رہے۔ اور سینکڑوں تشنگان علم دور دور سے آکر مستفید ہوئے۔ مولانا کی حق شناسی انہیں حق گوئی سے نہیں روکتی تھی اس لئے وہ بڑی دانائی سے بڑے بڑے پیچیدہ مسائل سمجھا

مدنی ؒ کی شخصیت سے قریب ہونے کے باوصف ان سے گھبراتا تھا کیونکہ ان کی شخصیت تقویٰ، وقار اگرچہ انہیں عظمت دیتے تھے لیکن جو گرمی وہ ... اس کا گداز دل کی جھلک سے رہی تھی۔ ان کے فکر کی بلندی اور کلام کی متانت صوفیانہ بے غرضی سے دل کو متاثر کرتی چلی جاتی تھی ان کی بے عیب سادہ زبان کا لب و لہجہ صداقت میں شرابور اور فقروں کے تانے بانے ربط سے شاہد سے پہلے دکھائی دیتے تھے۔ جب وہ معاشرے کی کمزوری کو دور کر کے بیان کرتے تو ان کا آہنگ موثر کا پیرایہ اختیار کرتا جس سے ان کی سماعت والوں کے بند دروازوں پر دستک دیتا محسوس ہوتا تھا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ

حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور علم منقول و معقول دونوں سے مالا مال تھے علم کلام اور فلسفے کے علاوہ منطق اور دیگر علوم عقلیہ سے بھی بہرہ ور تھے۔ اپنی غیر معمولی ذہانت کے بل پر حکمت قاسمیہ کے شارح ہونے کی فضیلت پر شیخ التفسیر کے منصب پر فائز ہوئے۔ فتح الملہم مسلم کی شرح کی جو اہل علم میں نادر الوجود کتاب ہے۔ حضرت شیخ الہند نے تفسیری فوائد کو ترجمے کے ساتھ شروع کیا تھا جس کی مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ نے تکمیل کی۔ بے مثال خطیب اور بے بدل مبلغ تھے۔
تبلیغ اور خطابت میں مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ کے علوم کو شرح و بسط سے بیان فرماتے تھے۔ سیاسی شعور بلند اور قوت فیصلہ نہایت متوازن تھی ملکی معاملات کے اتار چڑھاؤ ان کی نظر میں تھے کیونکہ حضرت شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال میں بھی سرگرم کارکن تھے یہی سبب تھا کہ سیاست کے معاملات میں بے تکلف رائے رکھتے تھے جمعیۃ علماء ہند کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ اور آخر میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے دیوبند میں مدرس اور مسجد فتح پوری دہلی میں صدر مدرس کے فرائض انجام دیئے۔ اور پھر اسی دارالعلوم میں صدر مدرس ہو کر خدمات انجام دیں۔

آزادی ملک کے بعد ترک وطن کر کے پاکستان آگئے۔ اور پارلیمنٹ کے ممبر ہو گئے۔ اسلامی قانون کے نفاذ میں سعی بلیغ کی اور قرارداد مقاصد پاس کرائی پاکستان انہیں باتفاق شیخ الاسلام کے لقب سے یاد کرتا تھا۔

ایک عرصے کے بعد میں ساہیوال ہی کے مقام پر ملاقات پائی اور کراچی میں ملنے ہونے تک علم و خواص ان کا سوگ مناتے رہے۔ اور اب تک ان کے خلوص کے قرض تلے ہیں بلکہ مجھ کو کئی جلسوں میں شریک ہونے کا فخر حاصل ہے۔ وہ میرے اشعار کو پسند فرماتے اور دعائیں دیتے تھے۔ خدا انہیں غریق رحمت کرے آمین ثم آمین۔

مولانا شبیر احمد جیسے عالم روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ کانگرس میں سے مسلم لیگ میں آئے تھے لیکن یہ تو انہی کی اپنی بصیرت ہے دنیا میں ہر انسان خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اور بمقدار ذوق ہر شخص کی منزل و رستہ اور طریق جستجو جدا ہے۔ اور اسی طرح تمام کائنات میں یہ فطرت کے تانے اور قدرت کے ہیولے پھیلے ہوئے ہیں۔ جن کو حسن شعر حیات کی تلاش ہے۔ وہ اسی کا شارح اور ترجمان بھی ہے۔ اور اسی شعبے کی فلاح بھی اسے میسر آ جاتی ہے۔

ایسے لوگوں کے ہاں اعتراف علم و کمال بھی ہوتا ہے اور عجز و انکساری بھی کیونکہ اپنے سے عظیم قوت کے آگے جھکنا۔ احترام کرنا۔ اور عقیدت مند ہو جانا ایک فطری جذبہ ہے جس کا مرکزی نقطہ حق بینی اور حق پسندی ہے۔ ہر چند کہ اسکی اعتراف و احترام کے نام جدا جدا ہیں لیکن ان تمام صورتوں کے پیچھے وہی ایک جذبہ کار فرما ہوتا ہے جسے ہم کہیں دردمندی کا نام دیتے ہیں کہیں حق پسندی کا لقب مگر بات ایک ہی ہے۔ اور نقطہ نظر وہی فطرت واحد اور اس کی تحسین ہوتی۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی ؒ

مولانا موصوف حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ کے خلیفہ مجاز اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن ؒ صاحب کے عظیم تلامذہ میں سے تھے۔ علم و فضل کے ساتھ ساتھ ذہانت اور تخلیقی دماغ پایا تھا۔ علوم سے فراغت کے بعد اپنے والد محترم کے ساتھ مدینہ طیبہ چلے گئے۔ اور اٹھارہ برس وہیں علم حدیث اور دیگر

[illegible] صاحب خود بھی بہترین مقرر بھی ہیں بعض اصلاحات کی دستگیری و ارشاد کے مالک ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے سلسلۂ تعلیم میں شامل ہوتے ہیں۔ آپ [illegible] کے بانی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہیں۔

دارالعلوم کے ذمہ دار کارکنان میں آپ کی پہلی شخصیت ہے جنہوں نے بیرونی ممالک کے سفر کئے اور دارالعلوم کے لئے بیرونی ذرائع یا وسعت کا سامان بہم پہنچایا۔ ان کے زمانے میں دارالعلوم نے جو ترقی کی ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ تعلیمی اور تعمیری شعبوں میں ترقی سے شعبوں اور شعبہ داروں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

مولانا طیب صاحب حضرت شیخ الہند سے بیعت اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ مجاز ہیں ان کی بیعت کا سلسلہ ہند اور بیرون ہند دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اتنی مصروفیات کے باوجود درس و تدریس کا مشغلہ بھی برابر جاری ہے۔ دیوبند میں آپ کی ایک باقاعدہ مجلس ذاکرہ قائم ہے جس میں مدرسے کے طلباء اور شہر کے علاوہ بیرون شہر کے تشنگان علم پیاس بجھاتے ہیں۔

اصل میں جب کوئی عالم اپنے جنوں کا سے روحانیت کی حدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس وقت ربانی قوتیں اپنی عادلانہ قوت و جولانی کے ساتھ اس کے خون میں گردش کرنے لگتی ہیں۔ دوسری تعلیمات و منہیات کی الجھنوں سے دوچار نہیں ہوتا۔ اس کا رخ خود بخود روحانیت کی طرف پھر جاتا ہے۔ اور اسے زمین و آسمان کی درمیانی مسافتیں چاند سورج کا فاصلہ معلوم نہیں تو بھی وہ اپنے اندر جھانک کر خود پر حقیقت و فرائض کو آشکار کر لیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس پر گمراہ معاشرے کی اصلاح اور بھٹکے قدم مسافروں کی راہنمائی فرض ہو جاتی ہے اس وقت وہ اس خدمت خلق اور فرض کی ادائیگی کے لئے بیتاب ہونے لگتا ہے اور قدرت اسے راستہ دکھانے اور پگڈنڈیاں روشن کرنے کے لئے رنگ برنگ روشنیاں لئے آگے آگے چلنے لگتی ہے۔ جس سے نئے نئے مقاصد تخلیق ہوتے ہیں۔ اس وقت زندگی کے عمل کی تیز رفتاری کا مشاہدہ عالم کے واقعات کی چلیوں کو خیال کی رفتار سے تیز ہونے لگتی ہے۔ اور قوت عمل پر انسان کسی غیر مرئی طاقت کا سایہ محسوس کرتا ہے اور کبھی تھکن نہیں ہونے پاتا۔ اس میں روحانی قوتوں کے ساتھ جسمانی قدرتیں بھی قدرت اس کے ساتھ کر دیتی ہے۔ اور اس وقت وہ قدرت کا دست راست ہوتا ہے۔

مولانا محمد شفیع صاحب:

مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کے ان علماء میں سے ہیں جن پر دارالعلوم بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ قوی الاستعداد اور وسیع المعلومات معروف خواص و عام ہیں۔ یہ منزل بمنزل طبقہ وسطی سے طبقہ اوّل میں آئے ہیں اور فقہ و حدیث میں امتیازی مقام رکھتے ہیں اسی علمی بلندی کی بناء پر حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن مفتی دارالعلوم کے حلقہ افتاء میں شامل ہوئے۔ اور چونکہ ممتاز فتویٰ نویس ثابت ہوئے کے باعث مفتی اعظم کی وفات کے بعد دارالعلوم کے عہدۂ افتاء پر مفتی دارالعلوم کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔

حضرت شیخ الہند کے اسارت مالٹہ سے رہائی کے بعد مفتی محمد شفیع صاحب حضرت شیخ الہند سے بیعت ہوئے اور حضرت کے وصال کے بعد مولانا تھانویؒ سے رجوع کیا۔ اور بہت کم عرصہ میں ان سے بھی خلافت حاصل کر لی اور تعلیم ظاہر کے ساتھ ساتھ تعلیم باطن میں مشغول ہو گئے۔

تصنیف و تالیف کا ذوق و شوق اوّل سے تھا۔ چنانچہ فقہ و حدیث اور فن مناظرہ میں کئی کتابیں ان کی مرہون قلم ہیں۔ مفتی صاحب شعر و شاعری میں بھی کم استعداد نہیں رکھتے۔ انہوں نے واقعاتی نظمیں مراثی اور قصائد کہے ہیں جن کا ایک مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔

آزادیٔ ملک کے بعد آپ نے پاکستان میں سکونت اختیار کر لی اور آج وہ ملک کے مشہور علماء اور مفتیوں کی صف میں نمایاں ہیں۔ گورنمنٹ پاکستان نے جو اسلامی قانون کی تدوین کے لئے کمیٹی بنائی اس میں آپ رکن رکھے گئے ہیں

جو آپ نے ملک کے گوشے گوشے میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی ہے۔ آج کل اس دور کے
ممتاز دارالعلوموں میں اپنے طرز و معیار کی وجہ سے درس گاہ ہے۔ میں جب بھی ملتا
سے ملا ہوں، میں نے انہیں ہمہ جہتی انداز کا عالم پایا ہے۔

ہر چند کہ انہیں دارالعلوم اور حکومت کے علاوہ عوام اور اپنے خانگی
مسائل سے بھی بے حد مصروفیت رہتی ہے۔ لیکن یہ تو حرکت کائنات کی فطرت کی گردش
ہے۔ جو ازل سے ہے کہ ابد تک اختتام پذیر نہیں ہوگی۔ اور یہ جمال کائنات
یا مقصد کائنات کی نو بہ نو ساختیں یا رنگ و صوت کا نزول و صعود مختلف صورتوں
سے ہوتا رہے گا۔ اور یہ حرکت اور تقسیم علم کی ہی جگہ ہے۔ اس کا نہایت سے
کوئی رشتہ نہیں۔ بلکہ تغیرات تو انقلاب کی زنجیروں کی کڑیاں ہیں۔ یہ نو بہ نو
عالم اور مصروفیات انسانی کا تواتر ابد تک کی فصیلوں تک کہیں رکنے کا نام
نہیں لے گا۔ یہ آثار چڑھاؤ کے اصول عالم قائم اسی طرح اور چلتے بدلتے رہیں گے۔

مولانا زکی کیفیؒ

یہ مفتی محمد شفیعؒ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ مفتی صاحب کے
دوسرے بچوں کی طرح یہ بھی زیور علم سے آراستہ تھے۔ لاہور میں ادارہ
اسلامیات کے مالک و مہتمم تھے جو دینی کتابوں کا بڑا ادارہ ہے۔ کیفی نہایت
اچھے اور پُرگو شاعر تھے۔ غزل اور نظم دونوں پر انہیں عبور تھا۔ اور دونوں
میں یکساں رفتار۔ گذشتہ تین چار سال سے ان کا کلام ایسا شستہ اور منجھا
ہوا آ رہا تھا کہ بعض اوقات سب حیران رہ جاتے تھے کہ زکی صاحب نے
بڑی ترقی کر لی ہے۔ جہاں تک غزل گوئی کا سوال ہے۔ وہ اس رفتار سے
چل رہے تھے کہ اگر عمر وفا کرتی تو اس دور کے بڑے شاعر ہوتے مگر شاید
قدرت کو منظور نہ تھا چنانچہ زیادہ عمر نہیں [illegible] ہوگئے۔ اور
ہم سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اب ادارہ [illegible] کو ان کے بیٹے [illegible]
ہوئے ہیں۔ خدا انہیں کامیاب کرے اور [illegible] عطا فرمائے آمین

مولانا سید محمد میاںؒ:

آپ حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کے تلامذہ رشیدہ میں سے ہیں۔ دار
العلوم سے فراغت پا کر مدرسہ شاہی مراد آباد میں مدرسی اور مفتی کے منصب پر رہے
ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند کے رکن تو پہلے ہی سے تھے۔ حضرت مدنیؒ کے حکم پر جمعیۃ کے ناظم بنے
اور مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ کی وفات کے بعد جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ بنے۔
جمعیت کے سپاہی تھے۔ اور کانگرس کے نوواردوں میں سے تھے۔ کیونکہ یہ جماعت کی
جو لیڈری کے لئے ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کئی معیاری اور مفید کتب کے
مصنف ہیں۔ جن میں علماء ہند کا شاندار ماضی اور تاریخ اسلام معروف و مشہور
ہیں۔ آپ کو بچوں کی دینی اور اسلامی تعلیم سے شغف رہا اور اسی شغف نے تاریخ اسلام
جواب و سوال کی صورت میں لکھ کر طالب علموں کے لئے تاریخ اسلام کو آسان کر
دیا۔ میرے کتب خانہ میں یہ کتاب موجود ہے اور میں نے اسے بہت مفید پایا۔

مولانا مفتی محمود صاحب:

موصوف بھی فاضل دیوبند ہیں۔ اور صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بھی رہ
چکے ہیں۔ لیکن ان کی وزارت کو ان کی علمی بلندی و استعداد کے سامنے پر کاہ کے
برابر بھی خیال نہیں کرتا۔ ان کے علمی اقتدار کے سامنے تو تاج شاہی بھی جچتا
نہیں رہتا مگر اس اقتدار کو بھی علمی حلقے ہی جانتے ہیں۔ ان کے سینے میں تفقہ اور
قرآنی سرمایہ کے ساتھ موجودہ دور کی معلومات کا ذخیرہ قابل رشک ہے۔

ان کی تقریروں میں جہاں شرعی مسائل اتفاقی انکشاف ہوتے ہیں وہاں
تاریخ کی بیش بہا معلومات بھی ملتی ہیں۔ اور وہ ملک کے صاحب [illegible]
وسعت کی اور اعتماد کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ میں نے ان کے [illegible] کو

> فروتنی است دلیل رسیدگان کمال
> کہ چوں سوار بہ منزل رسد پیادہ شود

کی [illegible] نہیں ہوتی۔

مولانا غلام غوث ہزاروی:

مولانا دارالعلوم دیوبند کے فضلاء میں سے شمار ہوتے ہیں۔ علمی استعداد کے اعتبار سے مشہور اور تقریر کے لحاظ سے افضل خاص تر ہیں۔ رہنے والے ہزارہ کے ہیں لیکن آپ کی حق گوئی اور حق پسندی کے باعث ہمیشہ علماء کے ناظم مقرر ہوتے تھے۔ فضیلت اور شہرت کے ساتھ ان کے اعلیٰ اشغال اعتماد و اعتقاد کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اسی علمی دینی تخصیص کی بنا پر مصر میں آپ کو بطور نمائندہ جمعیت علماء اسلام پاکستان کی حیثیت سے دعوت دی گئی تھی اور وہاں عالمی مؤتمر میں آپ نے علماء عالم کو خطاب کیا۔

مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

قصبہ کاندھلہ ضلع مظفرنگر کے رہنے والے اور تبلیغی جماعت کے عالم ہیں۔ انہوں نے اپنی سوانح "یاد ایام" کے نام سے لکھی ہے۔ جو مطالعہ کے قابل ہے۔ تبلیغی جماعت کے نصاب کی تمام کتب انہیں کے قلم کی مرہون منت ہیں۔ جو کئی کئی لاکھ چھپ چکی ہیں۔ مولانا صاحب ایک عالم باعمل ہیں جو کاندھلہ کے علماء کا طرۂ امتیاز ہے۔

مولانا زکریا کاندھلوی کی تحریروں میں ایسا سلجھاؤ ہے۔ کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی مستفید ہو سکتا ہے۔ اور یہی تحریروں کی خوبی ہے۔ یہ خوبی صرف تحریر میں نہیں تقریر میں بھی کامیاب رہتی ہے۔ اور حضرت اپنے دل کی بات کو عوام کے سینوں میں منتقل کر دیتا ہے۔ علمی گفتگو اور منطق الفاظ تبلیغ دین کے سلسلے میں کند ہتھیار ثابت ہوتے ہیں۔ مولانا کا طرز تحریر قابل تقلید ہے۔ خدا انہیں تندرستی کے ساتھ تبلیغ کے لئے عمر طویل عطا فرمائے۔ وہ لاہور تشریف لائے تو میں کوشش کے باوجود ان سے نہیں مل سکا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ مستقل طور پر مکہ یا مدینہ چلے گئے انشاءاللہ وہاں ہی ملاقات ہوگی۔

مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی:

مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور سے فیض یاب ہیں وہیں ایک عرصہ درس و تدریس میں منہمک رہے۔ تقسیم ملک کے بعد لاہور آگئے۔ جامعہ اشرفیہ میں مفتی کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ وہ فقہ بھی پڑھاتے ہیں اور حدیث بھی دونوں میں ان کا طرز کلام گنجلک نہیں ہوتا۔ بلکہ جہاں عقدہ ہوتا ہے وہیں اپنے طرز بیان سے شگفتگی اور سلجھاؤ پیدا کر دیتے ہیں محبت اور احترام کے قابل بزرگ ہیں۔

قاری عبدالعزیز شوقی انبالوی:

شوقی صاحب خود مظاہری لکھتے تھے غالباً وہ بھی مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے تربیت یافتہ تھے بڑے خلیق اور ملنسار انسان تھے۔ انہیں آزادی ملک سے پہلے سے جانتا ہوں۔ اور ان کے اخلاق کا گرویدہ تھا۔ نہایت اچھے شعر کہتے تھے۔ لیکن چھپوانے میں حجاب محسوس کرتے تھے۔ نہ جانے ان کا کلام کہاں اور کس کی تحویل میں ہوگا۔

فرمودۂ حضرت لاہوریؒ

اگر کوئی شخص ہوا میں اڑتا آئے اور لاکھوں مُردے جِلا دے مگر سُنّتِ نبوی ﷺ کا مخالف ہو تو اس کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھنا جائز نہیں اس کی بیعت کرنا حرام اور اگر کوئی کر چکا ہو تو توڑنا فرض عین ہے۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

بحیثیت

مناظرِ اسلام

مولانا مشرف علی تھانوی

١٨٥٧ء میں سرزمین ہند پر انگریز کے تسلط اور اہل اسلام کے ہاتھوں سے زمام اقتدار کے زوال کے بعد باطل کی طرف سے اسلام پر جس جس راہ سے حملے ہونے شروع ہوئے اس کا اندازہ اس وقت کے حالات کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص بخوبی لگا سکتا ہے۔ اسلام کا آفتاب طلوع ہونے کے بعد سے ١٢ سو سال تک مسلسل عیسائیت پر زوال آتا رہا اہل اسلام کے ہاتھوں طاقت کے مقابلہ میں شکست کھا کر یہود و نصاریٰ کو قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں سے لیکر ہندوستان تک ہزاروں میل کا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں دینا پڑا تو اقتصادی میدان میں بھی مسلمان تاجروں نے ہر محاذ پر انکو شکست دی، اخلاقی برتری کا ڈھونگ بھی مسلمانوں کے مقابلہ میں عالم پر اثر انداز نہ ہو سکا۔ مذہبی اور نظریاتی اعتبار سے تو عیسائیت اور یہودیت کے مینار پہلے ہی مسمار ہو چکے تھے، اس ہمہ گیر زوال کے دور رس اثرات و نتائج سے گھبرا کر بالآخر عیسائی مفکر یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ ان اسباب پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور قوم کو اس سے آگاہ کیا جائے چنانچہ ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے "پریچنگ آف اسلام" کے نام سے کتاب لکھی جس میں دنیا سے عیسائیت کے زوال اور اسلام کے عروج پر علاوہ وار مفصل روشنی ڈالی گئی، شاید مصنف کا مقصد اس کتاب سے یہ ہوگا کہ عیسائی اہل اسلام کو آئندہ ایسے مواقع فراہم نہ کریں گے اور اس طرح اسلام کی علاقائی وسعت محدود ہو جائے گی لیکن اس کی نظر یہاں تک نہیں پہنچ سکی کہ اسلام کے بارے میں اللہ رب العالمین نے قرآن پاک میں اعلان فرمایا ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ، وہ اللہ تعالیٰ جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دیکر بھیجا تاکہ اس کے دین کو تمام ادیان عالم پر غالب کر دے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علیہ، اسلام سربلند و غالب ہوگا اس پر کوئی دین غالب نہیں آسکتا، جس دین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے پہلے سے غالب آنے ہی کا ارادہ کر لیا ہو اس کے لئے نہ کسی کے مواقع فراہم کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ کسی کی ذاتی جد و جہد پر اس کا انحصار ہوتا ہے۔ جس دین کا مقدر ہی غالب آنا ہو اسے ایک زمانہ تک غلبہ حاصل ہونے والے ذرائع و وسائل کو زمانہ مستقبل میں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

حق تعالیٰ اسلام کی سربلندی کے لئے ہر دور میں نئے ہادی و رہنما بھیجتا رہتا ہے جو نت نئے اسلوب بیان اور انوکھے انداز تبلیغ کے ذریعے قوم کو ہدایت

حق کی راہ دکھا سکتے ہیں۔

ہندوستان پر غلبہ حاصل ہو جانے کے بعد انگریزنے یہ کہ اب مسلمانوں کے دین کے راستے مسدود کرنا ہمارے لئے آسان ہوگا مگر شاید اس نے کسی کتاب میں یہ نہیں پڑھا تھا کہ مسلمان قوم جان و مال عزت و آبرو کے لئے مرنا کوئی فخر نہیں جانتی بلکہ دین و مذہب کے لئے کٹ مرنا اور سینہ سپر ہونا اس کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ بہر حال انگریز نے جس راہ سے دین میں کھوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی اہل اسلام نے اسی راستہ سے ہر طرح مقابلہ کیا۔

یہاں یہ اعتراف قابل ذکر ہے کہ انگریز حکومت نے حکمرانی تسلط کے باوجود اہل اسلام پر تبلیغی پابندی نہیں لگائی بلکہ دلائل و براہین سے غلبہ حاصل کرنا چاہا۔

ظاہر ہے کہ اس راہ کے شہسواروں سے مقابلہ کرنا عیسائیوں کے بس میں نہیں تھا۔ ہندوستان میں انگریز کے حربوں کا مختلف انداز سے جواب دیا گیا اور متفرق تدابیر سے اسلام کی حفاظت کی گئی۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "انگریزی اقتدار کے بعد تمام عیسائی حکومتوں نے عیسائیت کی تبلیغ کا جال بچھا دیا ہندوستان سے اسلامی حکومت کے زوال کے بعد انگریزی اقتدار آیا انگریزی حکومت کیونکہ مذہباً عیسائی تھی اس طرح سے عیسائیت کی تبلیغ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا مگر علمائے دین پر بھی کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ علماء دین تبلیغ کے لئے کھڑے ہوگئے اور تقریر و تحریر سے رد عیسائیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی بلکہ باوجود بے سروسامانی کے علماء دین کا پلہ بھاری رہا۔ اور انگریزی حکومت نے تبلیغ اسلام اور عیسائیت میں علماء پر کوئی پابندی نہیں لگائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بحمد اللہ تعالیٰ ہندوستان میں دین اسلام محفوظ رہا اور لاکھوں غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اگر علماء دین ہندوستان میں دینی مدارس قائم نہ کرتے اور عیسائیوں سے مناظرے اور عیسائیت کا رد نہ کرتے تو پھر اسلام و اسلام کا کیا حال ہوتا اور اس وقت مسلمانوں کی تعداد کتنی ہوتی۔ ہندوستان سے اسلامی حکومت کے خاتمے کے بعد جب انگریزی حکومت شروع ہوا تو سرسید نے علی گڑھ کالج قائم کیا تاکہ مسلمان انگریزی پڑھ کر موجودہ حکومت میں عہدے حاصل کرسکیں۔ اور حضرت مولانا نانوتوی نے خالص دین کی تعلیم کے لئے دیوبند میں دارالعلوم قائم کیا اور اسی کے قریب سہارنپور میں حضرت مولانا مظہر نانوتوی نے مظاہر علوم کے نام سے ایک دینی مدرسہ قائم کیا ان حضرات نے دنیا سے قطع نظر کی اور حکومت کے عہدوں کے خیال کو دل سے نکال دیا اور دینی تعلیم کو زندگی کا منصب[1] بنالیا اور دین کے تحفظ کے لئے دینی مدارس قائم کئے

اکابر اسلاف متقدمین میں حق کی حمایت میں سینہ سپر ہونے والوں کی جماعت نظر آتی ہے تو بالکل اسلاف متاخرین میں بھی جذبہ جانثاری اور ہمت بے پایاں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسلام کے فرزندوں میں اگر ایک دور جوش حبشی اور خالد بن ولید کا گزرا۔ محمد بن قاسم اور محمود غزنوی پیدا ہوئے۔ غزالی اور رازی نے جنم لیا تو اس کے فرزندوں میں یہ لوگ بھی پیدا ہوئے جنہیں مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی مدظلہم العالی اس طرح پیش کرتے ہیں۔

علمائے اجتماعی جدوجہد

آج سے کم و بیش سو سال پہلے بھی ہندوستان پر عیسائی مشنریوں کا طوفان مسلط ہوا تھا اس وقت یہ فتنہ آج سے کہیں زیادہ شدید تھا اور اس کو توپ اور بندوق کی پشت پناہی بھی حاصل تھی، اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے علماء حق کی ایک بڑی جماعت کو کھڑا کر دیا تھا جس نے اپنی جان و مال پر کھیل کر اس فتنہ کا مقابلہ کیا دلیل و حجت کے ہر

---

[1] دستور اسلام مولانا ادریس صاحب صفحہ ۱۰۸ مطبوعہ مقبول پریس لاہور

میدان میں عیسائیت کو شکست فاش دیکر یہ ثابت کردیا کہ اسلام اور علماء اسلام وقت کے ہر چیلنج کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

ان علمائے حق میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی متوفی ۱۳۰۸ھ، جناب ڈاکٹر وزیر خان صاحب مرحوم، مولانا سید آل حسن متوفی ۱۲۸۷ھ، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی متوفی ۱۳۱۷ھ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی متوفی ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء، مولانا اشرف الحق صاحب صدیقی متوفی ۱۳۰۴ھ، مولانا محمد علی صاحب مونگیری متوفی ۱۳۴۶ھ، مولانا سید امیر حسن صاحب، مولانا سید عبدالباری متوفی ۱۳۰۲ھ، مولانا سید ابوالمنصور ناصر علی صاحب متوفی ۱۳۲۰ھ کے اسماء گرامی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔[1]

مناظرین اسلام کی اس مستعدی نے ایک طرف اگر ہندوستان میں اسلام کی حفاظت کی تو دوسری طرف ہندوستان میں بھرپور طاقت مل جانے کے باوجود عیسائیت کے قدم اکھاڑ کر رکھ دیئے اور بالآخر انگریز کو ہندوستان چھوڑ کر جانا پڑا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی عیسائیت کی تبلیغ میں سرگرم رہی اور بعد میں کیونکہ حکومت ہی ان کے ہاتھ میں آگئی تھی اس لئے جتنی بھی کوشش ہوتی اور جو بھی طریقہ اختیار کیا جاتا وہ ممکن تھا۔ مگر اسلام کے فرزندوں میں اگر ظاہری شکست کے بعد کسی نے عیسائیت کے مقابلہ سے ہمت نہیں ہاری تو ظاہر ہے کہ شکست سے پہلے تو کیسے ممکن تھا کہ مسلمان عیسائیوں کی برہانی بالادستی قبول کر لیتے۔ چنانچہ الحمداللہ مذکورہ علماء نے ۱۸۵۷ء سے قبل عیسائیوں کو ہر میدان میں ایسا ذلیل کیا کہ عوام کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء کو مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا پادری فنڈر سے مناظرہ ہوا اس میں فنڈر کو اس قدر شرمندگی ہوئی کہ اس کے بعد جب بھی اس نے مولانا کا نام سنا اور وہ بھاگا۔

اس کے بعد ۱۸۹۱ء میں مولانا شریف ... [illegible] ... رحمت اللہ کے شاگرد تھے پادری ... [illegible] ... مناظرہ میں شکست فاش دیکر اسلام کی سربلندی کا ... [illegible]۔

حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی کا دور مناظرہ

اس دور کے بعد حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ اس مجاہد جلیل نے اگر ۱۸۵۷ء میں اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے ہمراہ عیسائیت، یہودیت اور ہر کفر و شرک کے خلاف سیف و سنان سے جہاد کیا تو عمر کے آخری دور میں قلم و لسان کے جہاد کا فریضہ بھی اس خوبی کے ساتھ ادا کیا کہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک حجت اور امانت ہے۔

حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہ ایک صاحب نسبت مرد قلندر تھے انہیں حق تعالیٰ نے اصلاح و تبلیغ ہی کے لئے مامور فرمایا تھا۔ خود فرماتے ہیں کہ اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔[1]

چنانچہ اس علم کی خدمت سے ہی حضرت کے ذریعہ احقاق حق کی جو صورت نکلی تھی اہل تشیع سے مباحثے ہوئے ہنود سے برسرِ مناظرہ دیکھے گئے اہل بدعت حضرات کو ہر طرح کی فہمائش کی بریلوی مکتب فکر کے طبقہ کی سمجھ کے لئے سنت و بدعت کی حقیقت واضح فرمائی اس سلسلہ کا ایک واقعہ قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی زبانی نقل کرنا مناسب ہوگا جو انہوں نے اپنے والد محترم سے اور انہوں نے مولانا محمد یٰسین سے سنا۔

عــلـہ :۔ ارواح ثلاثہ حضرت تھانوی۔ صفحہ ۲۶۱

عــلـہ پیش لفظ کتاب بائیبل سے قرآن تک صفحہ ۱۸

قاضی پور کے شیعوں کا فرار

مولانا محمد منیر صاحب مرحوم نے فرمایا کہ قاضی پور میں جب حضرت نانوتوی تشریف لے گئے تو عشرۂ محرم تھا۔ ایک رافضی نے حضرت مولانا کو اپنی مجلس میں آنے کی دعوت دی۔ حضرت نے فرمایا منظور ہے مگر اس شرط سے کہ جب آپ اس مجلس میں بیٹھ کر کچھ کہیں گے تو ہم بھی کچھ کہیں گے وہ اس پر آمادہ نہیں ہوئے اور وہیں کچھ مذہبی گفتگو کرتے ہوئے ان سب روافض نے کہا کہ اگر آپ بیداری میں ہم کو حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرا دیں اور حضورؐ اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرما دیں کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں تو ہم اہل سنت والجماعت میں داخل ہو جائیں گے۔ فرمایا تم سب اس پر پختہ رہو تو میں بیداری میں زیارت کرانے کے لئے تیار ہوں۔ مگر یہ روافض کچھ کچے ہو گئے۔[1]

اس قسم کے واقعات ہر مرحلہ پر ملیں گے جو یقیناً اس حدیث کا مصداق ہیں:

رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ
لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ۔

(بہت سے پھٹے پرانے لباس والے غبار آلود جنہیں دروازوں سے دھکے دیئے جائیں، ایسے بھی ہیں کہ اگر اللہ پر بھروسہ کر کے قسم کھا لیں تو حق تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کر دیں)

عیسائیت کے خلاف مناظرانہ جہاد

اسلام کے اس جرنیل نے دہلی کے دوران قیام ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں پادری تارا چند سے مناظرہ کر کے عیسائیت کے خلاف مناظرانہ جہاد کا آغاز کیا۔

پادری تارا چند دہلی کے مشہور مذہبی پادریوں میں سے تھا اور عیسائیت کی تبلیغ میں سرگرم تھا۔ مارچ ۱۸۷۴ء کے مناظرہ میں تارا چند کے مکان پر پادری تارا چند سے مسلمان طالب علم فوری باتوں کا جواب بن نہ پڑا تو تارا چند پادری نے مسلمانوں سے کہا کہ آپ اس وقت ملاقات کرنے آئے ہیں یا مباحثہ کرنے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا تارا چند سے مناظرہ ۱۲۹۲ھ میں ہوا جس میں تارا چند سے حضرت کے اعتراضات کا جواب بن نہ پڑا اور بالآخر وہ بند ہو گیا۔[1]

اس کے بعد سے مسلسل زندگی مناظرانہ گزری بعض سفروں میں میلوں پیدل چلنا پڑا مگر حضرت کے جذبۂ جہاد کے سامنے اس قسم کی تکالیف اور مشقتوں کی کیا حیثیت تھی۔

چندا پور کے مذہبی اجتماعات

چندا پور ضلع شاہجہاں پور میں ہے، شاہجہاں پور سے چھ سات میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ہندوستان میں عیسائیت کی وسیع پیمانہ پر تبلیغ کو دیکھ کر ہندوؤں اور آریہ سماج کو جرأت ہوئی کہ اپنے مذہب کا کھلے بندوں دعوت تبلیغ کے انداز سے پرچار کریں اور عیسائیوں کی طرح مذہبی امور میں مسلمانوں سے باقاعدہ مباحثے و مناظرے کریں دلیل و برہان سے اپنے مذہب کی برتری ثابت کریں۔

چنانچہ چندا پور ضلع شاہجہاں پور میں ایک ہندو رئیس منشی پیارے لال کبیر پنتھی نے ۱۲۹۳ھ ۷ ربیع الاول مطابق ۸ مئی ۱۸۷۶ء میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا جس میں مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کا مناظرہ طے پایا اس جلسہ کا نام میلہ خدا شناسی رکھا گیا۔ اس جلسہ میں ہندوؤں کی طرف سے منشی پیارے لال

---

[1] ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۶۵، حکایت ۲۹۰

[1] انوار قاسمی صفحہ ۱۹۶

کیرچنتی اور عیسائیوں کی طرف سے پادری نولس انگلستانی شریک ہوئے۔

منشی محمد پیر صاحب مدرس مدرسہ سرکاری بریلی نے جو غالباً حضرت نانوتوی کے رشتہ میں بھائی بھی تھے۔ مولوی الٰہی بخش صاحب حضرت مولوی رنگین بریلوی کی طرف سے جو رد نصاریٰ میں سرگرم تھے،) اس اشتہار کی اطلاع حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو دی اور اس جلسہ میں شرکت کی دعوت بھی پیش کر دی۔ اس پر حضرت نے انہیں جواب لکھا کہ اس مناظرہ کی تفصیلات لکھیں۔ ابھی جواب آ نہ سکا تھا کہ چندا پور سے تار آ گیا کہ فوراً پہنچیں۔ حضرت نانوتوی مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی، مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند اور مولانا رحیم اللہ صاحب بجنوری کے ہمراہ ۵ مئی ۱۸۷۶ء کو روانہ ہو گئے۔

شاہجہاں پور پہنچنے کے بعد رات کو قیام کیا اور صبح نماز کے بعد وہاں سے پیدل چندا پور پہنچے۔[۹]

مناظرہ اگرچہ تینوں فریقوں کے مابین تھا مگر اصل گفتگو مسلمانوں میں اور عیسائیوں میں رہی ہندو ایک کتھا کہہ کر علیحدہ ہو گئے۔

اس جلسہ میں مقرر کے لئے وقت پندرہ منٹ مقرر ہوا تھا۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے تقریر میں سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ دنیا میں جتنے کافر و مشرک ہیں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح توحید کے سب ہی قائل ہیں اس سے کسی کو مفر نہیں۔ توحید کے بارے میں تمام مذاہب کا اشتراک بیان فرما کر نتیجہ ان الفاظ میں نکالتے ہیں: "اس سے معلوم ہوا کہ توحید سے کسی کو انکار نہیں بلکہ اصل اصول سب کے نزدیک توحید ہی ہے اور توحید مسلّم اور اصل ٹھہری تو پھر جو باتیں مخالف توحید ہوں گی وہ خود غلط ہوں گی یعنی شرک اور بت پرستی اور کثرتِ معبوداں اپنے آپ غلط ہوں گی۔"[۱۰]

اسی تقریر میں وجود باری کا مسئلہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا۔ حضرت کی تقریر ایک بحرِ بےکنار کی طرح جاری تھی کہ جلسہ کا وقت ختم ہو گیا۔ اس لئے یہ تقریر حضرت کو درمیان میں چھوڑنی پڑی جس پر اہلِ اسلام کو کافی افسوس رہا۔

اس کے بعد اسی روز حضرت نانوتوی کی تقریر صبح ۹ بجے شروع ہو کر ۲ بجے یہ جلسہ ختم ہوا۔ آخری وقت میں عیسائی کاموں پر اُتر آئے جس سے عوام میں نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ہندوؤں اور عیسائیوں نے بھی برا بھلا کہا۔ اس جلسہ میں آخری تقریر مولوی ابو المنصور دہلوی کی ہوئی جنہوں نے بائیبل سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت ثابت کی۔ اس جلسہ میں تین روز تک نشستیں ہوتی رہیں۔ حضرت نانوتوی کی مختلف تقاریر ہوئیں جن سے ہر شخص بے حد متاثر ہوا۔ روداد میلہ خداشناسی کے آخر میں یہ تاثر درج ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

غرض بعد مباحثہ مولوی عبدالوہاب کا اور پادری ریک کا اتفاق ملاقات ہوا تو مولوی صاحب نے پادری صاحب سے جلسہ کی کیفیت پوچھی۔ پادری صاحب نے فرمایا: "کیا پوچھتے ہو ہم کو بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا اور بہت سے علماء اسلام سے اتفاق گفتگو ہوا پر نہ یہ تقریریں سنیں نہ ایسا عالم دیکھا۔ ایک پتلا دبلا سا آدمی میلے سے کپڑے، یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کچھ عالم ہیں۔ ہم جی میں کہتے تھے کہ یہ کیا بیان کریں گے۔ پر ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ حق کہتے تھے پر اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے۔"[۱۱]

شاہجہاں پور کے کمشنر حضرت کے بارے میں تصور کرتے رہے کہ یہ کوئی اوتار ہے اور اسی طرح لاجواب تقریریں کرتا ہے۔

[۹] روداد میلہ خداشناسی، صفحہ ۴

[۱۰] ،، ،، ،، ۱۱

[۱۱] رسالہ میلہ خداشناسی صفحہ ۴۰

شاہجہاں پور کا دوسرا مناظرہ

دوسرے سال کا یہ مناظرہ بھی ضلع شاہجہاں پور میں ۱۲۹۴ھ
میں ہوا۔ یہ بھی اسی جلسہ کا نام جو ہر سال میلہ خدا شناسی ہی
کہا جاتا تھا۔ اس جلسہ میں بھی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ
علیہ نے مجلس میں تقریر فرمائی یہ تقریر حجۃ الاسلام کے نام سے
طبع ہو چکی ہے مگر افسوس ہے کہ اس میں ... آنکھیں ...
تقریر دستیاب نہیں ہوئی تمام مجلس ... موجود ہے وہ اپنی شان ...
... ہے معلوم ہوتا ہے کہ حرف حرف
ضبط کر لیا گیا۔

تیسرا مناظرہ

۱۲۹۵ھ میں پھر اسی مقام پر مناظرہ ہوا اس مناظرہ کی تاریخ ۲۰
مارچ طے ہوئی۔ گذشتہ سالوں کی مسلسل جد و جہد اور عیسائیوں کے لاجواب
ہو چکنے کے باوجود کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور
مولوی ابو المنصور صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارادہ کیا کہ اس مرتبہ
اسمیں شرکت نہ کی جائے کیونکہ سوائے نشستند و گفتند و برخاستند کے کوئی
فائدہ نہیں مگر ساتھ ہی یہ خیال ہوا کہ اگر ہم لوگ شریک نہ ہوئے تو لوگ طرح طرح
دینا سمجھیں گے اور اہل اسلام کو زبکی ہوگی اس لئے دونوں حضرات بعض دوسرے
رفقاء کے ساتھ شاہجہاں پور روانہ ہوئے اور ۱۸ مارچ کو وہاں پہنچ گئے
۱۰. کو آرام کیا ۱۹، مارچ کو آخر شب میں اٹھ کر پیدل چاندا پور کے لئے روانہ
ہو گئے راستے میں ندی کے کنارے حضرت نانوتوی نے نوافل ادا کر کے خوب
خشوع و خضوع سے دعا مانگی اور آگے روانہ ہو کر چاندا پور پہنچ گئے۔

شرائط مباحثہ طے کرنے کے لئے مسلمانوں میں سے مولانا قاسم صاحب
مولوی عبدالمجید صاحب۔ پادریوں میں سے پادری نولس اور پادری والز صاحبان
اور ہندوؤں میں سے پنڈت دیانند صاحب سرستی اور منشی اندرمن صاحب
منتخب ہوئے اور منشی پیارے لال صاحب مہتمم جلسہ بھی شریک ہوئے پچھلے سالوں کے
جلسوں سے کیونکہ پادری گھبرائے ہوئے تھے اس لئے اس مرتبہ ہندوؤں اور
پادریوں نے ملی بھگت کر کے یہ طے کیا کہ ہر مقرر کی تقریر کا وقت صرف ۵ منٹ
رکھا جائے، غالباً اس میں یہ چال پوشیدہ تھی کہ ہم اعتراض کریں گے اور
مسلمان جواب دیں گے اور ظاہر ہے کہ ۵ منٹ میں اعتراض تو بآسانی ہو سکتا ہے
مگر جواب دینے والا ۵ منٹ میں کیا جواب دے سکیگا۔ اس طرح مسلمان
عاجز ہو کر شکست کھا لیں گے۔ لیکن علماء اسلام نے کہا کہ ہم اس سے کم
وقت پر بھی تیار ہیں۔ بالآخر یہ جلسہ شروع ہوا سب سے پہلے منشی پیارے
لال نے ایک کاغذ نکالا جس میں ۵ سوال تھے۔ کہ ہماری طرف سے یہ سوال ہیں
پہلے ان کا جواب دیا جائے گا۔

(۱) دنیا کو پرمیشر نے کس چیز سے بنایا اور کس وقت اور کس واسطے؟

(۲) پرمیشر کی ذات محیط کل ہے یا نہیں؟

(۳) پرمیشر عادل ہے اور رحیم ہے دونوں کس طرح ہے؟

(۴) وید اور بائبل اور قرآن کے کلام الہی ہونے میں کیا دلیل ہے؟

(۵) نجات کیا چیز ہے اور کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟

کیونکہ یہ سوالات بانی جلسہ کی طرف سے تھے اس لئے ان کا جواب
پنڈت عیسائی اور مسلمان سب کو دینا تھا۔ عیسائی تو لیت و لعل کرتے رہے
سب سے پہلے ان کے جوابات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے دیئے
اور ایسی تقریر فرمائی کہ سامعین پر ایک سکتہ کا عالم تھا۔ ظاہر ہے کہ ۵ منٹ میں!
منٹ میں کتنا کچھ کہا جا سکتا ہے؟ مگر اس دو روزہ جلسوں میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ
علیہ نے توحید، رسالت، ضرورت نبوت، وحی، عصمت انبیاء، معجزات انبیاء میں
فرق غرض بنیادی مباحث پر مسکت تقریر فرما کر اسلام کی فتح و نصرت

کا جھنڈا گاڑ دیا۔

اس مناظرہ کی کامیابی کی سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی نیلی لنگی کی فتح ایک نعرۂ حق بن گیا۔

اس مناظرہ کے بارے میں قاری محمد طیب صاحب نے اپنے والد ماجد کے حوالے سے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا ارشاد نقل فرمایا ہے "اب مجھے ان کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو ان سے جو کام لینا تھا وہ پورا ہو چکا اور وہ یہ تھا کہ تمام مذاہب کے جتھے میں اسلام کی ایک منادی ہو جائے اور خدا کی حجت اس کے بندوں پر پوری ہو جائے سو وہ اس میلۂ خدا شناسی و مباحثۂ شاہجہان پور میں ہو چکی۔ چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ وفات ہو گئی"[5] (کیونکہ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ میں حضرت کی وفات ہو گئی) ویسے تو مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ عام حالات میں بھی بہت سادے رہتے تھے مگر اجتماعات کے موقع پر اہتمام لباس نہیں ہوتا تھا بلکہ اسی سادہ لباس میں شرکت فرماتے تھے۔ اسی شاہجہان پور کے مناظرہ میں شرکت کا ایک نقشہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ نے ایک وعظ میں بیان فرمایا تھا۔ فرماتے ہیں: حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ حالت تھی کہ لباس ایسا پہنتے تھے جس سے کوئی نہ سمجھ سکے کہ یہ عالم ہیں، نہ عبا پہنتے تھے نہ چوغہ نہ ململ پہنتے تھے نہ تن زیب بلکہ گاڑھا گزی آپ کا لباس تھا اور اسی لباس سے آپ بڑے بڑے مجمعوں میں تشریف لے جاتے تھے مگر آپ کے سامنے سارے جبہ وقبے والے دھرے رہ جاتے تھے آپ ہی کا نام چمکتا تھا اور کسی کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا، چنانچہ مباحثہ شاہجہان پور میں جو مخالفین اسلام کے مقابلہ میں بڑا عظیم الشان مناظرہ تھا بڑے بڑے جبہ وقبہ والے موجود تھے اور حضرت مولانا اسی معمولی کپڑے اور لنگی میں تھے مگر جب آپ نے تقریر کی ہے تو عوام پر اتنا اثر تھا کہ سہارنپور کے ہندو مہاجن اور بنئے یہ کہتے تھے کہ نیلی لنگی والا مولوی جیت گیا اس کی تقریر کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں آیا۔[6]

حضرت کا معمول تھا کہ راستے میں کسی کو اپنا نام [illegible] بتاتے تھے بلکہ تاریخی نام جو قطعاً غیر معروف تھا وہ بتا دیا کرتے تھے کہ میرا نام خورشید حسن ہے مقصد یہ تھا کہ لوگ آپ کو ایک معمولی آدمی سمجھیں اور اگر کبھی کوئی وطن کا بھی پوچھتا تو فرماتے "اللہ آباد" [illegible] ایک مرتبہ عرض کیا کہ اللہ آباد تو وطن نہیں پھر بات کیسے سچ ہو گی تو فرماتے بھائی ہر شہر خدا ہی کا آباد کیا ہوا ہے۔ مناظرہ میں شرکت کے وقت اپنے علم اور اپنی لیاقت پر قطعاً بھروسہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ہر آن خدائے قادر کی قدرت پر نظر رہتی تھی اس سے دعائیں کرتے رہتے اسی مباحثہ شاہجہان پور کا قصہ نقل کرتے ہوئے مولانا فخر الحسن گنگوہی لکھتے ہیں: "مولوی محمد قاسم صاحب نے ندی پر استنجے سے فراغت حاصل کر کے وضو کیا اور نوافل ادا کئے اور نہایت خشوع وخضوع سے دعا مانگی یا الٰہی وہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہو گی کیونکہ مولوی صاحب وہاں سے برابر یہی ہر شخص سے فرماتے تھے کہ اس بے نیاز سے دعا کرو کہ کلمۂ حق غالب آئے۔"[7]

مناظرہ رڑکی

۱۹ شعبان ۱۲۹۵ھ مطابق ۲۰ اگست ۱۸۷۸ء پنڈت دیانند نے رڑکی میں آکر سربازار مذہب اسلام پر اعتراضات کئے اسی سال کے شروع میں مارچ میں شاہجہان پور کا مشہور مناظرہ عیسائیوں سے ہو چکا تھا۔ اب پنڈت جی کو خباثت سوجھی اور وہ اوباشوں کی طرح بازاروں میں مجمع لگا کر مذہب پر اعتراضات شروع کئے۔ بعض احباب نے حضرت حجۃ الاسلام مولانا

[5] ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۳۵

[6] وعظ الفاظ القرآن صفحہ ۱۸ مطبوعہ اشرف العلوم گوجرانوالہ۔ [7] قصص الاکابر ۲۸ صفحہ ۱۵ - ۸ مباحثہ شاہجہان پور مطبوعہ مطبع قاسمی صفحہ ۵

تو ہم نے نانوتوی نور اللہ مرقدہ سے درخواست کی کہ آپ تشریف لے چلیں کہ اس کے جوابات دیں چنانچہ حضرت نانوتوی اپنے رفقاء کو ساتھ لیکر تشریف لے گئے اس مناظرہ کا کچھ نقشہ بڑنگ حکایت و بڑنگ لطائف حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے پیش کیا ہے وہ درج کرتا ہوں۔

فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحب رڑکی دیانند سے مناظرہ کے لئے گئے اور بھی چند آدمی ساتھ ہوگئے۔ مناسب کہ مولانا ایک جگہ ٹھہر گئے اور ساتھ والوں سے کہہ دیا کہ کھانا بازار میں کھاویں، مجسٹریٹ انگریز تھا تو اول وہ سمجھا کہ یہ دعوت کو سے آئے ہوں گے مگر جب واقعی بات کی خبر ہوئی کہ وہ اس طرح کے لوگ ہیں تو اس کے دل میں بڑی قدر ہوئی اور اس نے بلا کر بلایا اور اشتیاق ظاہر کیا مولانا کی عادت تھی کہ کبھی بڑے آدمی سے نہ ملتے تھے۔ ایک دفعہ رامپور گئے نواب صاحب کو خبر ہوئی تو مولانا کو بلایا مگر مولانا نہیں گئے اور یہ حیلہ کیا کہ ہم دیہاتی لوگ آداب شاہی سے واقف نہیں خدا جانے کیا بے ادبی ہو جائے۔ نواب صاحب نے کہا آپ کو آداب وغیرہ سب معاف ہیں آپ تشریف لائیے ہم کو آپ سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ مولانا نے جواب دیا کہ تعجب کی بات ہے کہ اشتیاق آپ کو ہو چلنے کا موزوں میں غرض نہ گئے۔ باوجود ایسی آزادی کے رڑکی میں مجسٹریٹ سے ملنے سے انکار نہیں کیا کیونکہ اس سے ملنے میں دینی مصلحت تھی۔ اس نے مولانا سے بارش کی کمی کی وجہ پوچھی تو مولانا نے دلائل عقلیہ سے ثابت کردیا کہ گناہ سبب ہیں کمی بارش کے، وہ بہت ہی محظوظ ہوا اور مولانا کے علم کا قائل ہوگیا اور بہت ہی اچھی طرح پیش آیا۔ پھر مولانا سے رڑکی آنے کی وجہ پوچھی، فرمایا دیانند سے مناظرہ کے لئے آیا ہوں مگر وہ پہلے تو مناظرہ کی دعوت دیتا پھرتا تھا اب جو میں آگیا تو پیچھے ہٹتا ہے، مجسٹریٹ نے کہا ہم اس کو بلاتے ہیں، چنانچہ بلایا اور پوچھا کیوں مناظرہ نہیں کرتے کہا فساد کا خوف ہے مجسٹریٹ نے کہا فساد کے ہم ذمہ دار ہیں، دیانند نے کہا اس ارادہ سے نہیں آیا ہوں۔ مولانا نے کہا ارادہ فعل اختیاری ہے اب ارادہ کر لیجئے مگر وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوا آخر بھاگ گیا[1]

اس مناظرہ میں بھی حضرت کے ہمراہ کچھ رفقا تھے امیر شاہ خان صاحب جو ان حضرات کے بڑے شیدائی تھے اور ان کی حکایات و قصے انہیں حرف حرف ازبر یاد تھے۔ ان سے سن کر یہ ایک حکایت حضرت تھانوی نے نقل کی ہے۔

خان صاحب نے فرمایا کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جب دیانند سرسوتی کے مناظرہ میں رڑکی تشریف لے گئے تو علاوہ اور خدام کے منشی نہال احمد دیوبندی اور شاہ جی عاشق علی بھی ہمراہ تھے۔ منشی نہال احمد کو جو نہایت ذکی تھے دیانند کے پاس شرائط مناظرہ طے کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ منشی صاحب اس کی قیامگاہ پر موجود تھے کہ اس کے کھانے کا وقت آگیا اور اس کے لئے کھانا لایا گیا کئی بڑی بڑی تھالیں پوریوں کی تھیں اور سیروں مٹھائی تھی جسکو کئی آدمیوں کا کھانا سمجھے مگر وہ اس اکیلے کے لئے آیا تھا اور اس تنہا نے سب تھالیں صاف کردیں۔

منشی صاحب نے اپنی ایک بے تکلف مجلس میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے بطور مزاح کہا کہ اگر ہمارے مولانا سے علم و فضل میں مناظرہ ہوا تو ان شاء اللہ مولانا غالب آئیں گے ہی لیکن اگر کہیں کھانے میں مناظرہ کی ٹھن گئی تو کیا ہوگا کیونکہ حضرت بہت ہی کم کھانے والے تھے۔ یہ مقولہ حضرت تک پہنچا تو منشی نہال احمد صاحب بلائے گئے۔ حضرت نانوتوی قیامگاہ کی چوکھٹ پکڑے ہوئے کھڑے تھے کہ یہ حاضر ہوئے اور دل میں سمجھے ہوئے تھے کہ دیکھئے اب کیا سوال ہوگا اور کہیں وہی بات نہ پہنچ گئی ہو تو دیکھئے کیسی ڈانٹ پڑتی ہے۔ حضرت نے فرمایا منشی جی تم نے کیا کہا تھا میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ انہوں نے وہی مقولہ دہرا دیا۔

فرمایا کہ اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو تم ساتھ ہو (اس کا جواب تم دو گے) اور دوسری بات و حقیقت ہے

---

[1] قصص الاکابر ۲۴۰، صفحہ ۸

ترجیح مسائل وغیرہ موضوعات پر اسلام کی برتری ثابت کی اور علوم و
بالشرطی ... قریب ... شریعت یا مذہب کی گنجائش نہ تھی، ایک
جلسہ میں ... اعتراضوں کے جواب نہ آسکے جو سب میں شامل تھے اور دو
جلسوں میں ... مباحث کا ذکر کرکے شب بست و ہفتم ماہ شعبان سے رڑکی
... ایک ... شکل اور دوسرے دن دیوبند تشریف لائے کر اس تقریر
دیوان میں پیدا ہیں کہ ... کہتے ہیں اور اس خاکسار کا وطن بھی یہی ہے

اس سے واضح ہے معلوم ہو گیا کہ رڑکی میں پنڈت صاحب مع حضرت
کا ... کر یہ حضرت کے جلال روحانی سے مغلوب ہو کر بھاگ گئے اس کے
بعد حضرت نے اس پنڈت کے تمام اعتراضات کا جواب لکھ کر پیش کیا جو کتابی
شکل میں کتب خانہ اعزازیہ دیوبند سے شائع ہوا ہے۔

سرزمین دیوبند کا بچہ بچہ مناظر پیدا ہوا

بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ
علیہ کے اس جذبۂ جہاد نے دارالعلوم کو ایسا سانچہ بنا دیا ہے کہ اب جو بھی وہاں سے نکلتا ہے
وہ محمد قاسم بن کر ہی نکلتا ہے

بانی دارالعلوم نے انگریز کے خلاف بیج بو کر جس پودے کی بنیاد رکھی تھی
آج وہ ایک تناور درخت ہے جس کے پتے پتے سے عیسائیت و یہودیت کے خلاف
جہاد کی بو آتی ہے۔

اگر بانی دارالعلوم کی ذات جامع صفات و کمالات تھی تو گویا اس مادر
علمی کا وجود ہی سراپا صفات بن گیا۔

فرزندان دارالعلوم میں اگر سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کا جذبۂ
جہاد ہے تو شاہ ولی اللہ کی فراست ہے، شاہ عبدالعزیز کا تفقہ ہے تو حاجی امداد اللہ
مہاجر مکی کا تقویٰ ہے ان کی امدرشی اور بصیرت عالیہ بھی موجود ہے، کفر و شرک
الحاد و زندقہ جس عنوان و تعبیر سے دنیا میں نمودار ہوا فرزندان دارالعلوم پہلے ہی
سے خوب نمٹا۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

دارالعلوم کا دفاع عن الدین

مولانا قاری محمد طیب صاحب فرماتے ہیں دارالعلوم کی جماعت اپنے
مسلک کی ہمہ گیری کی وجہ سے ہر فتنہ کی مدافعت کے لئے سینہ سپر رہی خواہ وہ فتنہ
نقل و روایت کی راہوں سے آیا یا عقلیت پسندی کی بنیادوں سے اٹھا اس
جماعت نے ہمیشہ اعلاء کلمۃ اللہ اور امر بالمعروف کا فرض ادا کیا اور اسی اسلوب
اور اسی رنگ پر جس رنگ ڈھنگ میں کسی دینی فتنہ نے سر اٹھایا

اخر میں دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ ہمیں بھی اس مرد حق پرست کی
روحانی اولاد میں شامل فرمائے اور والحقنا بہم ذریتہم کا مصداق بنا دے
آمین و ما علینا الا البلاغ ۔ ناچیز اشرف علی تھانوی۔

پیکر زہد و تقدس، جانشین انبیاء
شان تقدیس امم، ناصر دین مصطفےٰ
رہنمائے عالم اسلام، فخر ایشیاء
یعنی مولانا حسین احمد اسیر مالٹا
جن کے اٹھتے ہی جبین حلقۂ خود جھک گئی
ایک ساعت کے لیے نبض دو عالم رک گئی

علہ رسالہ قبلہ نامہ، مطبوعہ دیوبند

علہ تاریخ دارالعلوم از قاری محمد طیب صاحب صفحہ ۵۰ مطبع دیوبند

عشقِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم

اور

اکابرِ دیوبند

حضرت مولانا محمد اجمل خطیب لاہور

حضرت مولانا نانوتوی ؒ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ والہانہ عشق و محبت اور اخلاص و عقیدت تھی اور آپ کی سنتوں کے شیدائی اور فدائی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عقیدت اُن کے گوشت پوست میں سرایت کیے ہوئے تھی مدینہ منورہ کی گلیوں اور کوچوں کے ذرات پر جان نثار کرتے تھے۔ ذیل کے واقعات و حالات مندرجہ بالا دعاوی کی تصدیق و تائید کرتے ہیں۔

حضرتؒ جب حج کیلئے تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ سے کئی میل دور ہی سے پابرہنہ چلتے رہے آپ کے دل اور ضمیر نے یہ اجازت نہ دی کہ دیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میں جوتا پہن کر چلیں حالانکہ وہاں سخت نوکدار پتھر اور چبھنے والے سنگریزے بہت ہوتے ہیں چنانچہ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم، جناب مولانا حکیم منصور علی خان حیدرآبادیؒ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں جو اس سفرِ حج میں حجۃ الاسلام کے رفیقِ سفر تھے کہ مولانا مرحوم مدینہ منورہ تک کئی میل آخر شب تاریک میں اسی طرح چل کر برہنہ پہنچ گئے (سوانح قاسمی جلد ۳ صفحہ...)

نیز حکیم صاحب مرحوم کے حوالے سے ارقام فرماتے ہیں کہ جب منزل بہ منزل مدینہ شریف کے قریب ہمارا قافلہ پہنچا جہاں روضہ پاک صاحب لولاک نظر آتا تھا۔ فوراً جناب مولانا محمد قاسم صاحبؒ مرحوم نے اپنے جوتے اتار کر بغل میں دبا لئے اور پابرہنہ چلنا شروع کیا۔ (صفحہ ۱۰، ۱۱)

مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر مدظلہ اصل واقعہ کو نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں ملاحظہ فرمایئے کہ حضرت نانوتویؒ کو مدینہ طیبہ اور گنبدِ خضراء کے ساتھ کس قدر عقیدت اور کیسی وارفتگی تھی اور دیکھئے کہ تاقدمِ مس کا کیا ہی بہترین طریقہ اختیار فرما کر اپنی فرطِ محبت کا اظہار فرمایا اور یہ ساری عقیدت و محبت محض امام الانبیاء خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے ورنہ یہ ایک سنگلاخ رقبہ اور پتھریلی زمین ہے جو کچھ بھی ہے اور جتنا کچھ بھی ہے وہ حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی بدولت ہے اور آپ ہی کے واسطے سے ہے اور ایسے ہی موقع کے لیے کسی کشتہ عشق نے یہ کہا ہے ؎

وما حب الدیار شغفن قلبی
ولکن حب من سکن الدیار

میرا اور میرے تمام اکابر کا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کا وہ حصہ جو آپ کے جسد اطہر سے لگ چکا ہے وہ عرشِ عظیم سے

ہے کہ جو حصہ مرقد اطہر قیمت رکھتا ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو وفاء الوفاء (جلد ۱ ص ...) بہجت علمیہ جلد ۲ ص ...) اور روح المعانی جلد ۵ ص ۲۲)
اسی لئے تو یہ مشہور اور معروف ہے کہ ؎

عرش پہ گر فرش بھاری ہے تو ہے اس خاک سے
جس میں محو خواب ہے کون و مکاں کا تاجدار

ہندوستان میں بعض حضرات کیمخت (سبز رنگ) کا جوتا بڑے شوق سے پہنتے تھے اور اب بھی پہنتے ہیں لیکن حضرت نانوتویؒ نے ایسا جوتا مدت العمر کبھی نہیں پہنا۔ اور اگر کوئی تحفۃً لا دیتا تو اس کے پہننے سے اجتناب و گریز کرتے اور کسی اور کو ہدیہ دے دیتے۔ سبز رنگ کا جوتا پہننے سے محض اس لئے گریز کرتے کہ سرورِ دو جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گنبدِ خضراء کا رنگ سبز ہے۔ پھر بھلا ایسے رنگ کے جوتے پاؤں میں کیسے اور کیونکر استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحبؒ حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کے حالات بیان کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ: "تمام عمر کیمخت کا جوتا اس وجہ سے کہ قبہ مبارک سبز رنگ کا ہے نہ پہنا۔ اگر کوئی ہدیہ لے گیا تو کسی دوسرے کو دے دیا" (الشہاب الثاقب صفحہ ۸۴) اندازہ کیجئے اس نظرِ بصیرت اور زیرکی کا کہ گنبدِ خضراء کے ظاہری رنگ کے ساتھ کس قدر عقیدت و الفت ہے جس کے اندر عظیم المرتبت مکین صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں جن کا نظیر اور جن کی مثال اور جن کا ثانی خدا تعالیٰ کی ساری مخلوق میں نہ آج تک وجود میں آیا اور نہ قیامت تک آ سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ مرحوم نے شاید اسی کی ترجمانی کی ہے ؎

رخِ مصطفےٰؐ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزمِ خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

حضرت حجۃ الاسلامؒ نے نظم و نثر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تعریف و توصیف بیان کی ہے اور جس خلوص و عقیدت سے اس کا اظہار کیا ہے ان کی کتابوں (مثلاً آب حیات، قبلہ نما، اجوبہ اربعین، تحذیر الناس وغیرہ) کو پڑھنے اور دیکھنے والا بجز کسی تعصب کے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمام کتابوں کی عبارتیں جو نظم و نثر میں آپ نے سرورِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف میں بیان فرمائی ہیں سب کا نقل کرنا تو کارے دارد صرف بطور نمونہ ہم قصائد قاسمی کے پہلے قصیدہ سے (جو ایک سو اکاون[151] اشعار پر مشتمل ہے) چند اشعار بلا رعایت ترتیب پیش کرتے ہیں ؎

تو فخرِ کون و مکاں زبدۂ زمین و زماں
امیرِ لشکرِ پیغمبراں شہِ ابرار
جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں
تیرے کمال کسی میں نہیں مگر دو چار
لگاتا ہاتھ نہ پتلے کو ابو البشر کے خدا
اگر وجود نہ ہوتا تمہارا آخر کار
کہاں بلندی طور اور کہاں تیری معراج
کہیں ہوئے ہیں زمین اور آسمان ہموار
جو تو ہی ہم کو نہ پوچھے تو کون پوچھے گا
بنے گا کون ہمارا ترے سوا غم خوار
جمال کو ترے کب پہنچے حسن یوسفؑ کا
وہ دلربائے زلیخا تو شاہدِ ستار
دیا ہے حق نے تجھے سب سے مرتبہ عالی
کیا ہے سارے بڑے چھوٹوں کا سردار

حضرت مولانا شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ "الشہاب الثاقب" میں لکھتے ہیں کہ حضرت نانوتویؒ کو کس قدر عقیدت و محبت ذاتِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اور کس قدر تعظیم آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کے قلب انور میں بھری ہوئی ہے۔

[illegible] ہر قسم کی تعجب سے زیادہ بزرگی کی بندش [illegible] اور جلد [illegible] دین کی طرف سے جب شیعہ [illegible] حضرت [illegible] کے پیچھے پڑ گئے تو دو روپوش ہو جائیں۔ [illegible] کی وجہ سے تین دن روپوش رہے۔ اور کہتے ہے: تین دن سے [illegible] ایک دم باہر نکل آئے اور کھلے بندوں پھرنے لگے۔ لوگوں نے جب روپوشی کے لئے عرض کیا تو فرمایا تین دن سے زیادہ روپوش ہونا سنت سے ثابت نہیں۔ کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غار ثور میں تین دن روپوش رہے ہیں۔ (سوانح قاسمی جلد ۲ صفحہ ۱۰۲، ۱۰۳ از مولانا گیلانی)

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند

(ضیاء القلوب مصنفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ۔) کلمات چند در وصیت نیز کہ از فقیر محبت وعقیدت وارادت دارند مولوی رشید احمد صاحب سلمہ ومولوی محمد قاسم صاحب سلمہ کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری وباطنی اند بجائے من فقیر راقم اوراق بلکہ بمدارج فوق از من شمرند اگرچہ بظاہر معاملہ برعکس شد کہ ایشان بجائے من ومن بمقام ایشان شدم وصحبت ایشان را غنیمت دانند کہ این چنین کسان دریں زمان نایاب اند واز خدمت بابرکت ایشان فیضیاب بودہ باشند و طریق سلوک کہ دریں رسالہ نوشتہ شد در نظر شان تحصیل نمایند انشاء اللہ تعالیٰ [illegible] اللہ تعالیٰ در عمر شان برکت دہد واز تمام نعمائے عرفانی وکمالات [illegible] بمراتب [illegible] رساند ز نور ہدایت شان عالم را منور [illegible] فیض ایشان جاری دارد بحرمۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [illegible]

[illegible] حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب نے فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کہ حضرت مولینا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بکثرت ظاہر فرمایا ہے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ ہر ایک بزرگ کو ایک خاص لسان دی جاتی ہے۔ میری لسان مولوی محمد قاسم صاحبؒ ہیں۔

حضرت قطب العالم مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی شخصیت اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ (جو جنت المعلیٰ مکہ مکرمہ میں مدفون ہیں) کی نظر میں:

حضرت حاجی صاحبؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو مکہ مکرمہ سے خطوط تحریر فرماتے ہیں کہ جن میں سے بعض کے مضامین اور القاب مندرجہ ذیل ہیں۔

از فقیر امداد اللہ عفی عنہ۔ بخدمت فیض درجت منبع علوم شریعت وطریقت عزیزم مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مکروہات دارین سے محفوظ رکھ کر قرب مراتب ودرجات عالیات عطا فرماوے اور آپ کی ذات بابرکات کو ذریعہ ہدایت خلق فرماوے آمین

الحمد للہ آپ کی کیفیت باطنی وحالات مندرجہ سن کر کروڑ کروڑ شکر اللہ کا بجا لایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات اور قرب کو ترقی بالائے ترقی بخشے اور ہم سے بہروں کی نجات کا وسیلہ بنائے۔

ایک اور خط میں تحریر فرمایا: از مکہ معظمہ حارۃ الباب ۳۰ رجب ۱۳۰۷ھ ایک ضروری اطلاع یہ ہے کہ فقیر آپ کی محبت کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اور الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی محبت کو میرے دل میں ایسا مستحکم کر دیا ہے کہ کوئی شے اس کو ہلا نہیں سکتی اور جو کوئی فقیر کو دوست رکھتا ہے وہ ضرور آپ سے محبت رکھتا ہے

از مکہ مکرمہ ۲۳ رمضان شریف ۱۳۱۰ھ از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت فیض درجت، سراپا خیر و برکت، سرسر خلوص محبت

عزیزم مولانا مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہٗ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
الحمد للہ فقیر خیریت سے ہے آپ کے واسطے دعا خیر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ
آپ کو اپنے عشق و محبت، رضا و تسلیم میں رکھ کر آپ کا فیض جاری کر کے
حسن خاتمہ نصیب فرمائے۔

ایک دوسرے خط میں عارف باللہ کے مبارک لقب سے یاد فرما
رہے ہیں۔ از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہٗ۔ بخدمت فیضدرجت، سراپا خیر و
برکت عارف باللہ عزیزم جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہٗ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ الحمد للہ فقیر خیریت سے ہے اور آپ کی
صحت و سلامتی خدا تعالیٰ کی جناب سے مطلوب۔ تذکرہ مورخہ ۱۲ جمادی الاول ۱۳۱۰ھ

خط نمبر ۵ ماخوذ ہو۔ از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہٗ۔ بخدمت فیضدرجت
جامع شریعت و طریقت عزیزم مولانا مولوی رشید احمد صاحب محدث گنگوہی
دام اللہ فیوضہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ذات
بابرکات کو باعثِ استفاضت خلق و وسیلہ ہدایت کرے۔ اللہ تعالیٰ ہم
سب کو اپنی مرضیات پر چلاوے اور ہمارے اور فقیر کا بھی وقت
قریب ہے دعا حسن خاتمہ سے مدد فرماویں۔

از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ۔ بخدمت بابرکت و فیضدرجت
عزیزم مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہٗ۔

سلام علیکم چو در خاطری۔ گر از چشم دوری بدل حاضری۔

عرض داشت از مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ بخدمت مرشد
برحق قدوۃ السالکین اعلیٰ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ۔

حضرت نے جو بندہ ناکارہ کے حالات سے استفسار فرمایا ہے
میرے ماہمائے دارین! اس ناکس کے کیا حالات اور کس درجہ کی کوئی خوبی
ہے جو آفتاب کمالات کے روبرو عرض کروں۔ بخدا سخت شرمندہ ہوں
کچھ نہیں ہوں، مگر جو ارشاد حضرت ہے تو کیا کروں، بناچاری کچھ لکھنا پڑتا
ہے۔ حضرت مرشدی! علم ظاہری کا تو یہ حال ہے کہ آپ کی خدمت سے
دور ہوئے غالباً مدت بیس سال سے کچھ زیادہ ہو گئی ہے۔ اس سال تک
دو سو سے چند عدد زیادہ آدمی سند حدیث حاصل کر کے گئے ہیں۔
اکثر ان میں وہ ہیں کہ انہوں نے درس یا وعظ کا اور سنت کے اور
میں سرگرم ہوئے اور اشاعت دین ان سے ہوئی اور بدعت سے زہد۔
کوئی شرف نہیں اگر قبول ہو جاوے اور حضرت کے ہاں حاضری کے نہ
کا یہ خلاصہ ہے کہ چند رتعب (علم کی گہرائی) بے فکری حق تعالیٰ سے تنبع دفتر
کا اتفاق نہیں واللہ بعض اوقات اپنے مشائخ کی طرف سے علیحدگی
ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کسی کے مدح و ذم کی پروا نہیں رہی۔ معصیت کی طبعی
نفرت اور طاعت کی طبعاً رغبت پیدا ہو گئی ہے اور یہ اثر اسی نسبت
یادداشت بیرنگ کا ہے جو مشکوٰۃ انوار حضرت سے پہنچا ہے۔ میں زیادہ عرض
کرنا گستاخی اور شوخ چشمی ہے۔ یا اللہ معاف فرمانا کہ حضرت کے ارشاد سے
تحریر ہوا ہے۔ والسلام ۱۳۰۶ھ۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ اپنی کتاب
"الشہاب الثاقب" میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ
سرہ العزیز کے حالات جس نے مشاہدہ کئے ہیں وہ بیشک آپ کا اتباعِ سنتِ نبویہ
اور تعظیم احمدی کا اندازہ کر سکتا ہے۔ ہم چند باتیں چشم دید کرتے ہیں جن سے
اکثر حضرات واقف ہوں گے بیان کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے یہاں تبرکات میں حجرہ مطہرہ نبویہ کے غلاف
کا ایک سبز ٹکڑا بھی تھا۔ بروز جمعہ کبھی کبھی حاضرین و خدام کو جب
ان تبرکات کی زیارت خود کرایا کرتے تھے، تو صندوقچہ خود اپنے
دستِ مبارک سے کھولتے اور غلاف کو نکال کر اول اپنی آنکھوں
سے لگاتے اور منہ سے چومتے تھے پھر اوروں کی آنکھوں سے لگاتے
اور ان کے سروں پر رکھتے۔

۲۔ مدینہ منورہ کی کھجوریں آتیں تو نہایت عظمت و حفاظت سے رکھی جاتیں
اور اوقات مبارکہ متعددہ میں خود بھی استعمال فرماتے اور حضار پر ارکان

ملتی کو [illegible] تمام صاحب ایسے تقسیم فرماتے کہ گویا نعمت غیر مترقبہ اسے ملتی [illegible] ہیں۔ وہ کھجور اور سندھ وغیرہ کی کھجوریں ہمیشہ آتی [illegible] مگر ان کی وقعت اس سے زیادہ ہرگز نہ تھی کہ بازاروں میں بکتی ہے۔

۳؎ مدینہ منورہ کی کھجوروں کی گٹھلیاں نہایت حفاظت سے رکھتے۔ لوگوں کو پھینکنے نہ دیتے اور خود پھینکتے تھے۔ ان کو پاس رکھتے، کوٹ کر نوش فرماتے بشکل چھالیوں کے کوٹ کر لوگوں کو استعمال کرنے کی ہدایت فرماتے تھے۔

۴؎ احقر نے ربیع الاول ۱۳۱۹ھ میں ہمراہی بھائی محمد صدیق صاحب جب حاضر خدمت ہوا تھا۔ تو بھائی صاحب سے پہلے ہی حاضری میں حضرت قدس اللہ سرہ العزیز نے دریافت فرمایا کہ حجرہ شریف علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی خاک بھی لائے ہو یا نہیں۔ چونکہ وہ احقر کے پاس موجود تھی، اس لئے با ادب ایستادہ پیشکش خدمت اقدس کیا، تو نہایت وقعت و عظمت سے قبول فرما کر سرمہ میں ڈلوایا اور روزانہ بعد نماز عشاء بوقت استراحت فرماتے وقت آنکھوں میں اس سرمہ کو آخر وقت تک استعمال کرتے رہے۔ اس قصہ سے عام خدام واقف ہیں۔

۵؎ بعض مخلصین نے کچھ کپڑے مدینہ منورہ سے خدمت اقدس میں تبرکاً ارسال کئے۔ حضرت نے نہایت تعظیم اور وقعت کی نظر سے ان کو دیکھا۔ بعض طلبہ اور حاضرین مجلس نے عرض کیا کہ حضرت اس کپڑے میں کیا برکت حاصل ہوئی۔ یہ یورپ کا بنا ہوا ہے۔ تاجر مدینہ میں لائے، وہاں سے دوسرے لوگ خرید لائے اس میں تو کوئی وجہ تبرک ہونے کی معلوم نہیں ہوتی۔ حضرت نے شبہ کو رد فرمایا اور یوں ارشاد فرمایا کہ مدینہ منورہ کی اس کو ہوا لگی ہے۔ اس وجہ سے اس کو یہ اعزاز اور برکت حاصل ہوئی۔ پس خیال کرنے کی بات ہے کہ جس شخص کو محبت نبوی میں یہ حال ہو کہ دیار محبوب کی گٹھلیاں اور وہ گرد و غبار جو محبوب کے روضہ کے در و دیوار پر جمع ہو گیا ہو کیسے تبرک ہے۔ یہ در و دیواروں کے جملہ اشیاء کا یہی حال ہے) اس خلعت کا کیا پوچھنا۔ اور وہ چیزیں جن کو مقدس [illegible] نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہو ـــــ محبوب کی چند روز استعمال کرنے کی وجہ سے تبرک عظیم بن جاتی ہیں۔ خود احقر (حضرت مدنیؒ) کا مشاہدہ ہے کہ جب [illegible] کے کچھ خاص [illegible] اسی سال لاکر حضرت اعلیٰ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ ان کی حضرت نے اس قدر وقعت فرمائی کہ نہایت اہتمام سے ان کے ستر سے کچھ زائد حصے فرما کر اپنے اقرباء و متعلقین و منتسبین میں تقسیم فرمائے اور اپنا بھی ان میں ایک حصہ قرار دیا۔ صاحبو! بزرگوں میں محبت ہے، احقر کو ملاقات کی نوبت آئی اور وہ خاص مجوزین ان کو دی گئیں، لیکن کسی کو اس اخلاص و عظمت کے ساتھ لیتے ہوئے نہیں دیکھا

۶؎ حجرۂ مطہرۂ نبویہ کا جلا ہوا زیتون کا تیل وہاں سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعض مخلصین نے ارسال کیا تھا۔ حضرت نے (باوجود نزاکت طبع کے جس کی عادت عام لوگوں میں ظاہر ہے) اس کو پی لیا۔ حالانکہ اولاً زیتون کا تیل خود بے مزہ ہوتا ہے۔ ثانیاً بعد جلنے کے اس میں اور بھی تیزی ہو جاتی ہے۔ مگر دلدادہ عاشق سید الرسل و شیدائے خاتم الانبیاء علیہم السلام باوجود اس نزاکت و لطافت کے، اسے بلا تامل خوشگوار لذیذ چیز کی طرح نوش فرمایا اور اسے بجائے اس کے کہ مل کر جزو بدن بناتے، پی کر جزو بدن بنا لیا۔

۷؎ حضرت گنگوہیؒ کا سنتِ مصطفویہ کے ساتھ عشق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ آپ کو عربی مہینے چھوڑ کر بلا ضرورت انگریزی مہینوں کا استعمال بھی گراں گزرتا تھا۔ مولوی اسمٰعیل صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر تھے کہ کسی شخص نے پوچھا کہ گوالیار کب جاؤ گے۔ انہوں نے جواب دیا جولائی کی فلاں تاریخ کو۔ حضرت مولانا نے تاسف کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ

۱؎ (حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ)

اور ماہ و تاریخ عربی میں جو انگریزی مہینوں کا استعمال کیا جاوے، یہی وجہ ہے کہ حضرت کی تحریرات میں کہیں انگریزی یا ہندی مہینوں کا نام نہیں۔

۵ حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز زبدۃ المناسک میں فرماتے ہیں۔
اور جب مدینہ منورہ کو چلے تو کثرت درود شریف کی راہ میں بہت کرتا رہے پھر جب درخت وہاں کے نظر پڑیں تو اور زیادہ کثرت کرے، جب عمارت وہاں کی نظر آوے، تو درود پڑھ کر کہے۔

اللھم ھذا حرم نبیک فاجعلہ وقایۃ لی من النار وامانا من العذاب وسوء الحساب۔

اور مستحب ہے کہ غسل کرے یا وضو اور کپڑا پاک صاف اچھا لباس پہنے اور نئے کپڑے ہوں تو بہتر۔ اور خوشبو لگانے اور پہلے سے تیار ہولے اور خشوع اور خضوع جس قدر ہوسکے فروگذاشت نہ کرے، اور عظمت مکان کی خیال کرتے درود شریف پڑھتا ہوا چلے۔ جب مدینہ منورہ میں داخل ہوکے رب ادخلنی الخ اور ادب اور حضور قلب کے ساتھ دعا کرتا رہے اور درود شریف بہت پڑھے۔ وہاں جا بجا موضع قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ میں سوار نہیں ہوتے تھے۔ فرماتے تھے کہ مجھ کو حیا آتی ہے کہ سواری کے کھروں سے اس سرزمین کو پامال کروں کہ جس میں حبیب اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چلے پھرے ہوں اور بعد تحیۃ المسجد کے سجدہ کرے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت اس کے نصیب کی ہو پھر روضہ کے پاس حاضر ہو اور باادب تمام خشوع کھڑا ہو اور زیادہ قریب نہ ہو اور دیوار کو ہاتھ نہ لگاوے کہ محل ادب اور ہیبت ہے اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لحد شریف میں آنجناب کو قبلہ کی طرف چہرہ مبارک کئے ہوئے تصور کرے اور کہے السلام علیک یا رسول اللہ الخ اور بہت پکار کر نہ بولے آہستہ خضوع سے ادب سے بنرمی عرض کرے۔ اور پھر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے دعا کرے اور شفاعت چاہے کہے، یا رسول اللہ اسئلک الشفاعۃ واتوسل بک الی اللہ فی ان اموت مسلما علی ملتک وسنتک اور ان الفاظ [illegible] یاد کرے۔ مگر ادب اور [illegible] کی رعایت [illegible] غافل نہ ہو۔ جس قدر کثرت ہوسکے بہتر ہے۔ اور [illegible] مسجد میں بہت تلاوت اور ذکر کرتا رہے اور صلوٰۃ وسلام [illegible] رہے، راتوں میں بہت جاگے اور وقت ضائع نہ کرے۔

۶ حضرت مولانا گنگوہی چونکہ بہت متبع سنت تھے [illegible] محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] ایک مرتبہ لوگوں نے کہا کہ مسجد سے بایاں پاؤں نکالنا اور جوتا سیدھے پاؤں میں پہننا سنت ہے دیکھیں حضرت ان دونوں سنتوں کو کیسے جمع فرماتے ہیں۔ لوگوں نے اس کا انتظار کیا جب حضرت مسجد سے نکلنے لگے تو آپ نے پہلے بایاں پاؤں نکال کر کھڑاؤں [illegible] پر رکھا پھر سیدھا پاؤں نکالا، کھڑاؤں کی گھنڈی انگوٹھے میں ڈالی۔ اس کے بعد بایاں پاؤں میں کھڑاؤں پہنی۔ سبحان اللہ کیسا دونوں سنتوں کو کیا جمع فرمایا ہے (تذکرۃ الرشید)

حضرت گنگوہی سے کسی نے سوال کیا کہ
بر تصویر روضہ منورہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم و نقشہ مدینہ منورہ و مکہ معظمہ و نقشہ مکہ مکرمہ کہ در دلائل الخیرات واقع است بوسہ دادن و چشم مالیدن از روئے شرع جائز است یا نہ؟

الجواب بوسہ دادن و چشم مالیدن بریں نقشہا ثابت نیست و اگر از غایت شوق سر زند ملامت ہم بر جا نباشد۔ کتبہ الاحقر رشید احمد گنگوہی عفی عنہ۔

الجواب صحیح، اشرف علی عفی عنہ ۲ محرم ۱۳۲۲ھ امداد الفتاوی۔
جلد ۴۔ صفحہ ۲۶۵۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو دیکھا ہے کہ ہر وقت درود شریف کا ورد رہتا تھا اور بات چیت بہت کم کرتے تھے مگر افسوس ہے کہ جو لوگ سال بھر میں صرف ربیع الاول میں یکسر [illegible] آگئی

صاحب عاشق ہیں اور یہ حرکت مشاہدہ ہے۔ اس کو حکم سمجھ جانے کی غضب ہے۔ صاحبو! کہاں گیا انصاف اور تدین۔ (ماخوذ از ملفوظات صفحہ ۲۰۶)

حضرت حکیم الامتؒ نے ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ کتنے غضب اور ظلم کی بات ہے کہ ہمارے بزرگوں کو بدنام کرتے ہیں اور انہی کے نقشے سے یاد کرتے ہیں۔ ہمارے قریب ہی ایک قصبہ ہے جلال آباد، وہاں پر ایک جبہ شریف ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے۔ اس کی زیارت حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کیا کرتے تھے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے اس کے متعلق میرے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ اگر منکرات سے خالی وقت میں زیارت میسر آنا ممکن ہو تو ہرگز دریغ نہ کریں۔ بتلائیے یہ ہی وہابیت کا یہ

(ملفوظ صفحہ ۲۴۰، حصہ چہارم الافاضات الیومیہ)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ

ولادت سنہ ۱۲۴۹ھ
متوفی سنہ ۱۳۰۲ھ

مولانا محمد یعقوب صاحب کے والد محترم کا نام مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہے جو عربی کالج دہلی کے صدر تھے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی اور دیگر اکابر ہند کے استاد تھے اپنے زمانہ کے زبردست عالم اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔ نیز مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب صاحب دونوں ہم زلف ہیں۔ مولانا آخری عمر تک دارالعلوم دیوبند میں پڑھاتے رہے اور دارالعلوم کے سب سے پہلے صدر مدرس ہوئے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کیؒ سے بیعت کی۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ جیسے آپ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

قصیدہ میمیہ در نعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کہاں کہاں پھرانے گی گردشِ ایام
کبھی تو لانے کہیں خاطر حزیں آرام
رسول ایسا کہ مرسل ہیں امتی اس کے
وہ بادشاہ سب بادشاہ اس کے غلام
خدا ہے عارف و مداح ذاتِ عالی کا
جو کوئی مدح کا دعویٰ کرے خیال ہے خام
جو کوئی آپ کی الفت میں ہووے دیوانہ
نہیں ہے اس کو جنون اور نہیں اسے برسام
جو دیکھے آپ کو دیکھا ہے اس نے بے شک حق
وہ خواب تو نہیں اضغاث ہے نہ وہ احلام
تمہارے حق میں زمیں مسجد و طہور ہوئی
ہوا ہے رعب سے مفتوح روم سے تا شام
یبایعونک انما یبایعون اللہ
تمہارے ہاتھ پہ بیعت کا یہ ہوا اکرام
اطاعت آپ کی بالکل اطاعت حق ہے
وَمَنْ یُطِع ہے نہیں کسی نوع کا جس میں ابہام
کہا نہ آپ کا مانے وہ کیوں نہ ہو کافر
کلام آپ کا ہے وحی اور خدا کا کلام
شرف ہے آپ سے آبا اور ابنا کو
کرم آپ سے اخوال اور سب اعمام
وہ کون ہے کہ نہیں ذات پاک کا خادم
مقام غار میں حاجب ہیں عنکبوت و حمام

[illegible] صاحب کے پاس گئے اور [illegible] مکہ معظمہ
فرائض مناسک حج سے فارغ ہو کر آپ نے مدینہ منورہ جانے کا
قصد کیا اور چاروں طرف یہ افواہ پھیلی کہ راستہ مامون نہیں ہے اور جان
مال کا ہر وقت خطرہ ہے تو حضرت حاجی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ مولوی خلیل احمد
کہو اب کیا ارادہ ہے؟ سنتا ہوں کہ مدینہ منورہ کے راستہ میں امن نہیں ہے
اور راستے سے حجاج بکثرت واپس وطن جا رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت
میرا قصد تو مدینہ منورہ کا پختہ ہے۔ کہ موت کے لئے جو وقت مقرر اور مقدر
ہو چکا ہے وہ کہیں بھی نہیں ٹل سکتا ہے اور اس راستہ میں اگر موت آ جائے
تو زہے نصیب

میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں

اب اگر موت کے ڈر سے مدینہ طیبہ کا سفر چھوڑ دوں تو مجھ سے زیادہ بدنصیب
کون ہے؟ یہ سن کر حضرت کا چہرہ خوشی کے مارے دمکنے لگا اور فرمایا تم ضرور
جاؤ اور ان شاء اللہ تعالیٰ با امن و امان پہنچو گے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بخیریت
آستانہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر پہنچا دیا۔

پہلی دعا کی قبولیت: الحمد للہ کہ شریف میں شرعی احکام کا اجراء اور راستہ
میں امن و امان آنکھوں سے دیکھ لیا۔

دوسری دعا ابوداؤد شریف کی شرح بذل المجہود ۱۱ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ
شروع کی ۲۱ شعبان ۱۳۴۵ھ پورے دس برس پانچ ماہ دس دن میں
بڑی تقطیع کے تقریباً دو ہزار صفحات پر مشتمل پانچ جلدوں میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔
(بذل المجہود کی خصوصیات) (۱) ہر مسئلہ میں ائمہ اربعہ کے مذاہب کی تشریح اور
باہمی محاکمہ کیا گیا ہے۔ (۲) مذہب حنفیہ کی تحقیق اور کافی دلائل کے بعد دوسرے
مذاہب کے دلائل کے بہترین اور متعدد جوابات دئے گئے ہیں۔ (۳) ہر راوی
کے متعلق پوری جرح و تعدیل کی گئی۔ (۴) جو روایات ترجمۃ الباب کے موافق
نہیں ان کی نہایت عمدہ توجیہ اور موافقت ظاہر کی گئی ہے۔ (۵) مصنف نے
جن روایات کو تعلیقاً بیان کیا ہے دوسری کتابوں سے ان کی سند اتصال لکھی
گئی ہے۔ (۶) جو روایتیں یہاں مختصر آئی ہیں۔ دوسری کتب میں مفصل آئی
ہیں ان کا حوالہ دیا گیا ہے۔ (۷) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا
منشاء مبارک کے وہ محاسن و حقائق بیان فرماتے ہیں جن کا اخذ و حفظ بھی
انہی کا حصہ ہے جس کو فن حدیث سے مناسبت اور صاحب حدیث سے عشق
و محبت ہو۔

۲۳ سہارنپور سے آئے ہوئے خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ اب میرا
پختہ ارادہ ہے کہ شرح ابی داؤد کی تکمیل کے لئے مدینہ منورہ میں اگلے سال
بھی قیام کروں گا اور حج کے لئے بھی مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ نہیں کروں
گا۔ یہ بات بالکل صحیح اور سچی ہے کہ یثرب کی مٹی میں ملنے کی خواہش اور
محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں اشتغال اور شرح ابی داؤد کی
تکمیل تعلق مجھے بہت زیادہ پیاری چیز ہے

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آں جا دلبر است

۲۴ عرب کے آدمی ہی نہیں بلکہ ہر چیز بالخصوص مدینہ منورہ کی مٹی تک
آپ کو بہت پیاری تھی زائرین کو آپ سات کنوؤں کا پانی اور تراب
مدینہ منورہ لے جانے کی ترغیب دیا کرتے اور فرماتے کہ ان میں شفا ہے
مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی تذکرۃ الخلیل میں لکھتے ہیں کہ بندہ
حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی معیت میں تھا اور میرے ساتھ
چچا صاحب تھے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر سخت بیماری میں مبتلا ہو گئے
طبیب نے حرکت کرنا اور ہوا لگنا سخت مضر بتایا اور تاکید کی کہ منہ پر
ہر وقت رومال لپیٹے رہے کہ ہوا نہ لگنے پائے ورنہ جان کا خطرہ ہے حضرت
مولانا صاحب نے فرمایا کہ آستانہ شریفہ کی مٹی لے لو اور وہ چچا صاحب
کے منہ پر ملو میں نے کہا حضرت وہاں مٹی کہاں؟ فرمایا قالین کے نیچے
زمین پر جو کچھ گرد و غبار ہو وہ اپنے ہاتھ کو مل لو چنانچہ میں نے ایسا
ہی کیا ان کے چہرے پر ہاتھ مل کر رومال لپیٹ دی شفاء کی [illegible]

چچا صاحب کی دوا ہو چکی تو چچا صاحب نے مسرت کے ساتھ فرمایا کہ ذرا
میرا منہ کھول کر دیکھو مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے اب نہ وہ سوزش ہے
نہ بے چینی یہ خاک مبارک تو اکسیر ثابت ہوئی دوائیں سب پھینک دو پھر
وہی تھوڑی سی مٹی لے آؤ مجھے انتہائی فرحت ومسرت ہوئی پھر جا کر
قالینوں کے نیچے سے خاک آستانہ عالیہ کافی مقدار میں فراہم کر کے ساتھ
لیا حسب سابق خاک شفا استعمال کی مرض ختم ہو گیا سارے مسوڑے والے
مرجھا کر بیٹھ چکے تھے اب بجز ضعف اور نقاہت کے کوئی مرض نہ تھا۔

۵ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ روضہ مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام
میں روشن ہونے والا موم خدام روضہ سے تبرکاً لینا کیسا ہے؟ فرمایا بڑا
موجب برکت ہے مگر مال وقف ہے کہ یہیں کے استعمال کے لئے بھیجا جاتا
ہے اس لئے یوں کرو کہ اپنے طور پر بازار سے موم بتی خرید کر خدام کو دے
دو کہ وہ روشن کریں پھر اس کو لے لو۔

۶ روضہ اطہر پر حاضری کے وقت حضرت مولانا کی عجیب کیفیت ہوتی تھی آواز
نکلنا تو کیا مواجہہ شریف کے قریب یا مقابل بھی آپ کھڑے نہیں ہوتے
تھے خوفزدہ مؤدبانہ دبے پاؤں آتے دور کھڑے ہوتے بکمال خشوع صلوٰۃ
وسلام عرض کرتے اور چلے آتے تھے زائرین جو اونچی آواز سے صلوٰۃ وسلام
پڑھتے اس سے آپ کو بہت کوفت اور تکلیف ہوتی اور فرمایا کرتے کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں اور ایسی آواز سے سلام عرض کرنا
بے ادبی اور آپ کی ایذاء کا سبب ہے لہٰذا پست آواز سے سلام عرض
کرنا چاہئے۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۵۲ھ)

آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کے مخصوص شاگردوں
میں سے ہیں علم کا چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ آپ جملہ علوم عقلیات ونقلیات
میں کامل مہارت رکھتے تھے قوت حافظہ میں یگانہ روزگار تھے۔ آپ کا درس
حدیث اپنے دور کا مشہور درس تھا آپ کے تبحر علمی نے درس حدیث کا جامع
علوم وفنون بنادیا تھا آپ کے یہاں رد قادیانیت کا خاص اہتمام تھا اور
اس فتنہ کو اعظم الفتن شمار کرتے تھے اس سلسلہ میں کئی معرکۃ الآراء کتابیں خود
بھی تصنیف فرمائیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے تلامذہ سے بھی لکھوائیں
بخاری شریف کے درس کی تقریر فیض الباری چار ضخیم جلدوں میں مصر میں طبع ہو
چکی ہے جامع ترمذی کی تقریر العرف الشذی دو جلدوں میں جبکہ ابوداؤد
کی تقریر دو جلدوں میں ہے۔ علاوہ ازیں بہت سی کتب عربی، فارسی میں تصنیف
فرمائیں۔ حضرت شیخ الاسلام پاکستان مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی فرمایا کرتے
تھے کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تو نے شیخ تقی الدین بن دقیق العید، علامہ حافظ
ابن حجر عسقلانی کو دیکھا ہے تو میں استعارۃً کہوں گا کہ ہاں! میں نے دیکھا ہے
کیونکہ حضرت شاہ صاحب کو دیکھا تو گویا ان کو دیکھا۔ حضرت میاں شیر محمد صاحب
شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو نورانی وجود والا فرمایا ہے۔ (تحریر مسرت)

حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ جب بہاولپور
کے مشہور ومعروف مقدمہ میں دارالعلوم دیوبند سے فریق مقدمہ کی شہادت دینے آئے تھے
تقریر کے دوران فرمایا تھا کہ ہمارا نامۂ اعمال تو سیاہ ہے شاید یہی بات مغفرت
کا سبب بن جائے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانبدار
ہو کر بہاولپور چلا آیا تھا نیز یہ کہ بڑے بڑوں کا لحاظ نہیں کیا ان شاء اللہ یہ ذریعہ نجات بنے
گا۔ یہ بات مولانا محمد صادق صاحب بہاولپوری نے حضرت اقدس مولانا شاہ عبد القادر
صاحب رائے پوری کی مجلس میں بیان کی تو اس واقعہ کو سن کر حضرت رائے پوری
پر رقت طاری ہوئی فرمایا کہ واقعی حضرت شاہ صاحب تو آیۃ من آیات
اللہ تھے۔

نوٹ، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ عرصہ سے بیمار تھے اور جسم مبارک
بہت کمزور اور ناتواں ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ

وسلم کی فرمودہ دعائیں ... تقریباً پانچ پانچ گھنٹے یہ
حالت میں ... ہوتا ہے ... مرزائیت کے رد
ارتداد اور [illegible] کے تمام پہلوؤں اور گوشوں پر خوب روشنی ڈالی۔

(دارالعلوم رسالہ)

حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری فرماتے تھے کہ جس روز حضرت شاہ صاحب کا وصال ہوا ہے صبح سویرے خلاف معمول بچوں کے ساتھ پیار کرنے لگے سب اہل خانہ خوش تھے کہ آج بفضلہ تعالیٰ طبیعت اچھی ہے لیکن تھوڑی دیر بعد طبیعت اچھی رہی پھر اچانک خراب ہو گئی پانی طلب فرمایا خادم نے پانی دیا فرمایا کہ مجھے اٹھا دیجئے۔ لیٹ کر کھانا پینا خلاف سنت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے پانی پی کر لیٹ گئے اور خود قبلہ رُخ ہو گئے اور کلمہ پڑھنے لگے مولانا حکیم سید محفوظ علی صاحب کو جو (شاہ صاحب کے برادر نسبتی ہیں) اطلاع دی گئی جب وہ آئے تو حضرت شاہ صاحب حسبنا اللہ ونعم الوکیل پڑھ رہے تھے اسی کے ساتھ روح مبارک ملأ اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی۔

(رسالہ دارالعلوم) یہ تھے عاشق صادق کہ آخری وقت نزع کے عالم میں محبوب خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے اتباع کا خیال دامنگیر رہا اور اسے کر کے دکھایا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں واضح فرما دیا ہے آپ کا ارشاد ہے من احب سنتی فقد احبنی وَمَنْ اَحَبَّنِیْ کَانَ مَعِیَ فِی الْجَنَّۃِ (مشکوٰۃ) جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ اس حدیث سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ آپ سے محبت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کی سنت کے ساتھ محبت کی جائے کیونکہ محبت بلا اطاعت و اتباع کے بدعت ہے اسی بات کو حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے اپنی ایک رباعی میں خوب بیان فرمایا ہے۔

تعصی الرسول وانت تظہر حبہ
رسول کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ان کی محبت کا اظہار

ہذا لعمری فی الفعال بدیع
بھی کرتا ہے یہ بات بالکل انوکھی ہے

لو کان حبک صادقا لاطعتہ
اگر تیری محبت سچی ہوتی تو ان کی اطاعت کرتا

ان المحب لمن یحب مطیع
عاشق جو ہوتا ہے محبوب کا مطیع ہوتا ہے

سعدی شیرازی نے بھی خوب نقشہ کھینچا ہے:

خلاف پیمبر کسے راہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید
محال است سعدی کہ راہ صفا — تواں رفت جز در پئے مصطفیٰ

قصیدہ مدحیہ انوریہ

شَفِیْعٌ مُطَاعٌ نَبِیٌّ کَرِیْمٌ
آپ شفیع ہیں اور آپ کی ہستی قابل اطاعت ہے اور آپ نبی کریم ہیں

قَسِیْمٌ جَسِیْمٌ نَسِیْمٌ وَسِیْمٌ
اور آپ صاحب جمال ہیں خوش قامت ہیں مسکرانے والے ہیں اور خوبصورت ہیں

شَفِیْعُ الْاَنَامِ مُطَاعُ الْمَقَامِ
سارے عالم کے بخشوانے والے اور آپ کا مرتبہ واجب الاطاعت

کَرِیْمُ الْکِرَامِ نَبِیُّ الْاُمَمِ
سخیوں کے سخی اور ساری کائنات کے نبی ہیں

اَسِیْلٌ رَزِیْنٌ کَحِیْلٌ جَمِیْلٌ
چہرہ مبارک آپ کا کتابی ہے اور قد میانہ اور آنکھیں سرمگیں و جمیل ہیں

صَبِیْحٌ مَلِیْحٌ عَطِیْبُ الشِّیَمِ
چہرہ مبارک سفید مائل بسرخی ہے اور آپ ملیح ہیں اور خوشبو پھیلانے والے

هُوَ الْقُدْوَةُ الْأُسْوَةُ الْمُسْتَقِيمُ

اور آپ ہی قابل اقتداء اسوۂ حق اور راہ حق پر قائم ہیں

نَبِيُّ النَّبِيِّينَ وَالْمُرْسَلِينَ

آپ تمام انبیاء و مرسلین کے نبی ہیں،

وَذُو الدِّينِ فَيْضٌ عَمِيمٌ

اور ذو دین ہیں اور آپ کا فیض عام ہے

نَبِيُّ الْوَرٰى سَيِّدُ الْأَنْبِيَاءِ

آپ ساری مخلوق کے نبی اور سید الانبیاء ہیں

نَجِيُّ الْإِلٰهِ جَلِيلٌ فَخِيمٌ

اللہ کے ساتھ سرگوشی کرنے والے اور جلیل القدر وعظیم المرتبت ہیں

إِمَامُ الْهُدٰى رَحْمَةُ الْعَالَمِينَ

امام الہدیٰ و رحمۃ للعالمین ہیں

غِيَاثُ الْوَرٰى مُسْتَغَاثُ الْمَضِيمِ

عالم کی فریاد رسی کرنے والے اور ستم زادوں کی داد خواہی کرنے والے ہیں

أَجِيدٌ وَحِيدٌ مَجِيدٌ حَمِيدٌ

آپ عدیم المثال و یگانہ ہیں اور بزرگ و ستودہ صفات ہیں

وَخَيْرُ الْبَرَايَا بِفَضْلٍ جَسِيمٍ

اپنی عظیم الشان بزرگیوں میں افضل ترین عالم ہیں

وَأَسْرٰى بِهِ رَبُّهُ فِي السَّمَاءِ

آپ کے رب نے راتوں رات آسمان کی سیر کرائی

كَنُورٍ تَجَلّٰى بِلَيْلٍ بَهِيمٍ

مثل چمکنے والے نور کے رات کی تاریکی میں

وَآتَاهُ مَا شَاءَهُ مِنْ عُلَاءٍ

آپ کا اللہ تعالےٰ نے جس قدر چاہا مرتبہ بلند فرمایا

وَأَوْحٰى إِلَيْهِ بِوَحْيٍ رَقِيمٍ

اور نازل فرمائی آپ کی طرف وحی مکتوب

فَأَكْرِمْ بِشَأْوٍ سَنِيٍّ بَهِيٍّ

پس کس قدر بلند و دلکش ہے مرتبہ آپ کا

وَجَاهٍ عَزِيزٍ وَحَبَاءٍ قَوِيمٍ

اور آپ کس قدر صاحب عزت و بلند مرتبہ ہیں

فَيَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَيْهِ

پس اے رب کریم آنحضرتؐ پر درود و سلام نازل فرما

مَتٰى فَاحَ طِيبٌ وَوَافٰى نَسِيمٌ

جب تک کہ عالم میں خوشبو پھیلے اور باد نسیم چلے

وَأَنْ عَافِنِي وَاعْفِنِي مِنْ آثَامٍ

الٰہی مجھے عافیت بخشئے اور گناہوں سے درگزر فرمائیے

إِلٰهِي بِجَاهِ النَّبِيِّ الْكَرِيمِ

تصدق سے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

حکیم الامت تھانویؒ — اپنی نظر میں

میں نہ صاحب کرامت ہوں اور نہ صاحب کشف. نہ صاحب تصرف ہوں اور نہ عامل. صرف اللہ اور رسولؐ کے احکام پر مطلع کرتا رہتا ہوں اپنے دوستوں سے کسی قسم کا تکلف نہیں کرتا. نہ اپنی حالت. نہ اپنی کوئی تعلیم. نہ تعویذ وغیرہ کے متعلق کوئی شے چھپانا چاہتا ہوں. عمل کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کرتا. البتہ عمل کرتا دیکھ کر خوش اور عمل سے دور دیکھ کر رنجیدہ ضرور ہوتا ہوں۔

اسم بامسمّٰی

تحریر
سید اکبر شاہ فیصل
جامعہ رشیدیہ ساہیوال

قرآن و حدیث میں جہاں لفظ علم آیا ہے، اس سے مراد محض اور فقط علم دین ہے نہ کہ دنیوی علوم و فنون وغیرہ، آج کل بعض اسکولوں اور کالجوں کی نمایاں دیواروں پر حدیث، طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ لکھی جاتی ہے میرے استاذ و مربی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک اس حدیث کو اسکولوں اور کالجوں پر لکھنا اور اس سے دنیوی علوم کا مراد لینا اندیشۂ کفر ہے۔

علم دین ایک امانت خداوندی ہے، جو کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی وراثت ہے اور یہ ورثہ علماء عظام کو ملا، حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "العلماء ورثۃ الانبیاء" میں تو علماء ہی کو انبیاء کا ورثہ قرار دیا گیا ہے۔ صرف اس لیے کہ علماء کرام علم دین کی اشاعت و تبلیغ میں ہمہ تن کوشاں مصروف رہتے ہیں، اشاعت دین، تقریر، تحریر یا عام وعظ و نصیحت کے ذریعے ہو یا خانقاہوں اور مدارس میں دینی طلبہ کو علوم دینیہ کی تعلیم و تربیت کے ذریعے ہو، بہرکیف اشاعت دین ضروری ہے، کیونکہ حفاظت دین کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اگر دین کی اشاعت منقطع ہو گئی تو دین ہی ختم ہو جانے کا اندیشہ قیامت کی علامات میں مذکور ہے۔

تیرھویں صدی ہجری کے اواخر میں دہلی کا تخت مسلم حکمرانوں کے اقتدار سے خالی ہوا، تو دینی شعور بھی ختم ہونے لگا، دینی درسگاہوں کی حیثیت بھی

پشت پناہ ختم ہو جانے کی وجہ سے انتہائی ناگفتہ بہ ہوگئی، اسلامی شعائر خطرناک اور شدید زوال ہوئے۔ مغربی تہذیب کے پجاریوں نے الحاد و زندقہ کے فلسفے کچھ اس طرح مسلمانوں میں اسلام سے ناواقف ہو کر اپنا ادھورا کشن اور تہذیب سکھنے لگے۔ ان ہی نامساعد حالات میں اشاعت دین کی خاطر دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ کیونکہ دارالعلوم کے قیام کو نشانہ بنا کر چند اولیاء اللہ رحمہم اللہ کرنے لگے بعثت و الہام منجانب اللہ ہوئی تھی کہ دینی ادارے کے قیام ہی سے ہندوستان میں دین اسلام محفوظ رہ سکتا ہے، چنانچہ آج بحمد اللہ و توفیقہ دارالعلوم کو قائم ہوئے بھی ایک صدی اوپر چودہ سال بیت گئے ہیں۔ مگر دارالعلوم سال بسال منازل ترقی طے کرتا ہوا ہی نظر آتا ہے۔

کوئی آنکھوں سے اندھی اور نام سے نور بھری ہو، یا کوئی دین اسلام سے قطعی کورا ہو اور نام فخر الاسلام ہو تو بات کچھ جچتی نہیں اور یہ کوئی مجذوب کی بڑ نہیں بلکہ حقائق پر مبنی ہے کہ دارالعلوم (دیوبند) اسم بامسمّٰی دارالعلوم ہے یعنی علوم جو علوم و فنون کی غمازی کرتا ہے۔ دارالعلوم میں ان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ دینی علوم کی خدمت و اشاعت جتنی اس ادارے نے کی ہے، دنیا کی سابقہ و موجودہ کوئی بھی یونیورسٹی یا دارالعلوم اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ دارالعلوم کے اسم بامسمّٰی ہونے کی واضح دلیل یہی ہے کہ اس کے نام اور کام میں کوئی فرق نہیں اور اس نے اپنی عظیم کارکردگی کا لوہا اغیار سے بھی منوایا۔ دارالعلوم سے بلاشک ایسے جید اور متبحر علماء تیار ہوئے کہ جو آیت ربانی۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء کے صحیح مصداق ثابت ہوئے اور علوم نبویہ و دینیہ کے ہر ہر علم کا ایسا مدرس پیدا ہوا کہ گویا اُسے وہ علم، علم لدنی کے طور پر حاصل ہے۔ مزید کمال یہ کہ جو حضرات دارالعلوم کے اکابر یا فیض یافتہ ہوئے وہ بھی اسم بامسمّٰی ثابت ہوئے، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی مرحوم علوم الہیہ کے خزانے میں انما انا قاسم واللہ یعطی کا مصداق تھے۔ مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مرحوم، ان تنصروا اللہ ینصرکم کی عملی تفسیر تھے۔ علامہ انور شاہ صاحب کاشمیری مرحوم نے انوار الباری میں بنظیر ہو باقتدار کا ملنا ہو گیا۔

مولانا محمود حسن صاحب مرحوم قرآن پاک کی مختصر مگر جامع تفسیر لکھ کر رہتی دنیا تک محمود قرار پائے۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے سیاسیات میں قدم رنجہ فرمایا تو، اک ضرب ید اللّٰہی، ورا کے سجدہ شبیری کا درس دیا۔ دیگر سینکڑوں اشخاص صرف طوالت مضمون کے خوف سے حذف کرنے پر مجبور ہوں۔ کسی ہستی یا ادارے کا اسم بامسمّٰی ہونا بھی خدا تعالیٰ کے نزدیک اس کے افعال کے مقبول ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ دنیا میں ایسی بھی اسلامی یونیورسٹیاں اور دارالعلوم ہیں، جو کہ ثبت تسلیم اور معروف ہیں۔ مگر کسی میں طلبہ کی تربیت کے خصوصی انتظام کی بجائے انہیں مکمل آزادی دی جاتی ہے، بعض میں احادیث شریف کی کتب کے صرف خلاصے پڑھانے پر اکتفا کیا جاتا ہے اور بعض میں نظر بد دور، اساتذہ ہی فیشن پرست ہیں۔ انگریزی بال اور انگریزی لباس میں رہتے ہیں اور ان کے چہرے بھی سنت رسولؐ سے عاری ہیں۔ ہمیں تو یہاں تک روایت ملی ہے کہ اساتذہ کرام دوران اسباق حدیث، سگریٹ نوشی کرتے ہیں (دروغ برگردن راوی)

بہرکیف دارالعلوم نے اسم بامسمّٰی کا لقب حاصل ہونے کی وجہ سے انتہائی نامساعد حالات میں بھی اسلامی علوم و فنون کی جو گرانقدر خدمات سرانجام دی ہیں، تاریخ کو ان پر فخر ہے۔ دنیا بھر کے طلبہ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں استفادہ کرتے ہیں اور ان کی سہولت کی خاطر ہر زبان میں اسباق پڑھائے جاتے ہیں، حتیٰ کہ ہندی اور انگریزی زبان میں بھی اسلامی علوم کی تدریس کا انتظام ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، منطق، فلسفہ، ریاضی اور میراث و ہندسہ وغیرہ کے عظیم علوم کے عظیم عالم تیار ہو کر پوری دنیا میں پھیلے اور دیوبند ہی کہلوا کر روشناس عالم ہوتے ہیں، کیونکہ دارالعلوم کی برکات نے دیوبند شہر کو بھی چار دانگ عالم میں زد عام و خاص کر دیا ہے۔

دارالعلوم میں طلبہ کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام ہے، اسی لیے

پوری دنیا میں فاضل دارالعلوم کو مقبول نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، طلبہ کو عربی و انگریزی زبان میں تقریر و تحریر کے علاوہ خطاطی و جلد سازی اور شعبہ دارالصنائع میں دستکاریاں سکھانے کا بھی خاطر خواہ انتظام ہے مثلاً جلد و درک (سوٹ کیس) ہولڈال وغیرہ۔ شعبہ طب میں طب قدیم و جدید مع سرجری، شعبہ افتاء میں فتویٰ نویسی، شعبہ ورزش میں طلبہ کی جسمانی ورزش اور شعبہ مطالعہ علوم قرآنی میں قرآن پاک پر ریسرچ کا کام سکھایا جاتا ہے، اساتذہ کرام شفیق و خلیق اور مجسمۂ عجز و انکسار ہیں۔ علوم عالیہ اور علوم آلیہ کی کتب کی جتنی تفاسیر و تصانیف دارالعلوم سے وابستگان و فیض یافتگان نے کیں۔ وہ غالباً ۵۰ فیصد سے امام اعظم سیدنا ابو حنیفہؒ کے دور سے ۱۰۰ھ تک کے تمام فقہا و متکلمین و محدثین کی تصنیفی خدمات سے کم نہ ہوں گی — دارالعلوم (دیوبند) نے اعلیٰ درجہ کے مصنفین کے علاوہ سینکڑوں جلیل القدر مشائخ طریقت، متبحر عالم دقیق النظر مدرسین، محقق مفتی، عظیم المرتبت صحافی، شعلہ بیان خطیب، بہترین طبیب اور روحانی معلمین قوم و ملت پیدا کیے یہ سب کچھ دارالعلوم کے علقب بہ لقب اسم باسمیٰ اور عنداللہ مقبول و مسلم ہونے کی دلیل ہے۔

درس گاہِ عظیم مدرسہ دیوبند

جانباز مرزا

دیوبند ہے انوارِ مدینہ کی تجلی
توحید کی اس شمع سے روشن ہے زمانہ

اس مکتبۂ فکر کے ممنون ولی ہیں
مذہب کی حقیقت ہے یہ، باقی ہے فسانہ

کاشانۂ رحمت ہے زمانے کی نظر میں
بیٹھا تھا جہاں تنہا اللہ کا دیوانہ

محمودؒ جہاں سوئے مدنیؒ جہاں لیٹے
اس خاک میں محفوظ ہے ملت کا خزانہ

ایمان ہے آئینِ فرنگی سے بغاوت
بخشا ہے اسی خاک نے ملت کو ترانہ

نکلے ہیں اسی ساز سے توحید کے نغمے
قائل ہیں اسی بات کے اغیار و یگانہ

اُبھرے نہ کبھی ہند میں دیوبند کا سورج
ڈھونڈا ہے کئی بار فرنگی نے بہانہ

اللہ کرے ہند میں خود اس کی حفاظت
مرکز ہے یہ جانباز کے ایماں کا یگانہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

اور

دارالعلوم دیوبند

از: سید نسیم احمد فریدی

ساقیٔ دہلی کے مستوں نے بارضِ دیوبند
جب رکھی بنیادِ مے خانہ بطرزِ یادگار

دور دورہ ساغرِ صہبائے طیبہ کا ہوا
جرعہ نوشانِ ازل آئے قطار اندر قطار

قاسم و محمود و انور نے لنڈھائے خم کے خم
اپنی وسعت کے مطابق پی گیا ہر بادہ خوار

آج بھی ساقی کی چشمِ خاص کی تاثیر دیکھ
بادۂ مغرب کے متوالوں کا ٹوٹا ہے خمار

آج بھی آفاق میں اس میکدہ کی دھوم ہے
چار جانب سے سمٹ کر آرہے ہیں بادہ خوار

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
یہ خصوصیت یہاں ہر فرد میں ہے آشکار

اس کے ہر مے خوار کو پیرِ مغاں کا حکم ہے
باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

کاش اے ساقیٔ دہلی تو بھی آکر دیکھتا
اپنے مے خانے کی رونق اپنے رندوں کی بہار

تیرا دورِ جام دورِ چرخ سے بھی تیز تر
تیرا مستقبل تیرے ماضی سے بڑھ کر شاندار

یا الٰہی حشر تک باقی رہے یہ مے کدہ
دور میں ساغر رہے تا گردشِ لیل و نہار

اس کی ہر ہر اینٹ میں تاریخِ ماضی ثبت ہے
ہند میں بزمِ ولی کی ہے یہ واحد یادگار

مسلمِ ہندی اگرچہ مفلس و نادار ہے
پھر بھی اس سرمایۂ ملت کا ہے سرمایہ دار

شوکتیں جب دہلیٔ مرحوم کی آتی ہیں یاد
دیکھ کر اس کو بہل جاتا ہے قلبِ سوگوار

جن کی کوشش سے چلا ہے دورِ صہبائے حجاز
نور سے معمور کردے اے خدا ان کے مزار

آ فریدی تو بھی ہر ساغر بکف مینا بدوش
طالب جوشِ عمل ہے، ساقیٔ ابرِ بہار

دارالعلوم دیوبند

برِصغیر میں آزادی حریت کی درسگاہ

جانباز مرزا

تاریخ جیسے جیسے اپنے عروج و زوال سے گذرتی ہے قوموں کے خدوخال میں اسی انداز سے تغیر آتا چلا جاتا ہے واقعات کو سنبھالنا مورخ کی دیانت پر ہے۔ ورنہ رائی کا پہاڑ اور پہاڑ کا نقطہ میں تبدیل ہو کر بکھر جانا کوئی دشوار نہیں۔ اس طرح کا تماشہ کبھی کبھار اقتدار کے سہارے بھی کھیلا جاتا ہے اور یہی وہ موڑ ہے جہاں سے تاریخ اپنا رخ تبدیل کرتی ہے۔ اگر مورخ اپنے ضمیر سے غداری نہ کرے تو آندھیوں کے ہزاروں طوفان بھی راستوں کی حقیقی پگڈنڈیوں کو بگاڑ نہیں سکتے۔ ۱۸۵۷ء کے حالات نے غیر ملکی حکمرانوں کا اس طرح ساتھ دیا کہ وقت کے بگاڑ میں دیر نہ لگ سکی۔ خصوصاً ہندوستان کا مسلمان جس نے ہنوز گذرے ہوئے کل ہندوستان کی اٹھارہ لاکھ مربع میل زمین پر اپنے اقتدار کے گھوڑوں کی چاپ سنی تھی۔ برطانوی پرچم کی اڑانوں سے سر دھننے لگا۔ خیرات بانٹنے والے ہاتھ دہلی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بھیک مانگنے لگے۔ جو پاؤں مخملی فرش پر زخمی ہو جاتے تھے وہ لوہے کی زنجیروں میں جکڑے گئے۔ اذانوں کی جگہ گرجوں کے گھڑیال بجنے لگے اور غلامی کی زنجیریں مضبوط تر ہوتی چلی گئیں۔ نہ صرف دہلی کا لال قلعہ اپنے مکینوں کے لئے جیل خانہ بن گیا۔ بلکہ سارا ہندوستان فرنگی سلطنت کے زیر اقتدار آگیا۔ یونین جیک کے سائے جوں جوں پھیلتے گئے۔ ہندوستان کا تمدن سکڑتا چلا گیا۔ اسلام کے اصول عیسائی سلطنت کے تابع نظر آنے لگے۔ مسلمان اپنے ہی گھر اجنبی دکھائی دینے لگا۔ انسانیت کی دیواریں آہستہ آہستہ گرنے لگیں۔ ایمان متزلزل ہونے کے خدشات بڑھنے لگے۔ ایسے ہی منحوس دن تھے جب ان لوگوں کے جذبات و احساسات نے پھر انگڑائی لی جو ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں شاملی کے مقام پر انگریزوں سے نبرد آزما ہو چکے تھے۔ ہنوز ان کی ہمتوں میں فرنگی کے خلاف وہی آگ سلگ رہی تھی جس نے انہیں ایمان کی پختگی کے تحت میدانِ کارزار میں لا کھڑا کیا تھا۔ لیکن آج کے حالات اس سے مختلف تھے۔ غیر ملکی طاقت کا مقابلہ تشدد یا فوج سے ہی ممکن تھا۔ مگر اب یہ سب چیزیں مفقود ہو چکی تھیں۔ ملک غلام ہو چکا تھا۔ اپنے بھی غیر نظروں سے دیکھ رہے تھے تاہم ہندوستانی تمدن طرزِ معاشرت اور اسلام کی گرتی ہوئی قدروں کا تقاضا تھا کہ یہ وقت تن آسانی کا نہیں ہمت ہار کر بیٹھ جانے سے ایمان کی رہی سہی پونجی بھی ضائع ہو جانے کا احتمال تھا لہٰذا وہ لوگ پھر اٹھے ایک دوسرے رخ سے فرنگی پر حملے کا انداز سوچا۔ ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء میں دیوبند کی ایک ویران مگر تاریخی مسجد چھتہ میں ایک معمولی عربی مدرسے کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسہ کے سب سے پہلے طالب علم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ اور سب سے پہلے

میں حضرت مولانا محمد محمود مقرر ہوئے ۔ یہ مختصر قافلہ جس کے سالار حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا اس کی صفوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا ۔ پھر اس قافلے سے جدا یا فارغ ہونے والا ہر طالب علم انگریز کے خلاف جہاد کے جذبات سے معمور ہوکر نکلا ۔ اس کے دل میں ایمان کی وہی شمع روشن ہوتی جو اس مدرسہ کے بانیوں کے دلوں میں کارفرما تھی ۔

مسجد چھتہ دیوبند کی سرزمین ۔۔ ابتداء سے مشائخ و اکابر اہل اللہ کا مسکن اور قیامگاہ رہی ہے ۔ یہ روایت بھی ہے کہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس مسجد میں چلہ کشی کی ہے ۔ دیوبند کے مشہور بزرگ حضرت حاجی عابد حسین کا قیام بھی اس مسجد میں تھا ۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور دیگر احباب جو دارالعلوم کے سب سے پہلے مدرس تھے اسی مسجد میں مدتوں قیام پذیر رہے ۔ مسجد کے صحن میں شاندار انار کا بوٹا اب بھی ہے جس کے سائے میں دارالعلوم کا مبارک آغاز ہوا تھا ۔

دیوبند — ایک تاریخی بستی ہے جو اپنے دامن میں ایک تاریخ کا گراں سرمایہ رکھتی ہے ۔ اس کی ایک ایک اینٹ پر ہزاروں سالوں کی جیتی داستان کندہ ہے ۔ انقلابات زمانہ کے کئی دور اس پر سے گذرے ہیں کہ اس شہر کی خستہ عمارتوں کو بھی یاد نہیں ۔ شہنشاہ اکبر کے نورتنوں میں معروف ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں اس بستی کا ذکر کیا ہے ۔ مہاراجہ بکرماجیت کے عہد میں بھی دیوبند کا نام آیا ہے علاؤ خان لودھی کے متصل دور میں بھی اس بستی کے نشان ملتے ہیں ۔ سنسکرت کے مصنفین نے کورو پانڈو کے عہد میں بھی دیوبند کا ذکر کیا ہے مغل سلطنت تو ابھی کل کی بات ہے ؎

ابھی اس راہ سے گذرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

دیوبند مغل شہنشاہوں کے راستے کی ایک منزل اور عارضی حکمرانوں کا اکثر کیمپ رہا ہے ۔ اگر موجودہ آبادی سے تقریباً دو میل مشرق کی جانب دیکھیں تو یہاں کی پختہ عمارتوں کے اکثر نشان ملیں گے جن سے معلوم ہوگا کہ ہزاروں سال پہلے دیوبند کی اصل آبادی یہیں تھی ۔

شہر میں ایک بلند عمارت ہے جس میں اب سرکاری دفاتر ہیں ۔ آئین اکبری جلد دوم میں اسے ایک قلعہ لکھا گیا ہے مگر اب اس قلعہ کا کوئی نشان نہیں ۔ اس قلعہ کے ایک کنوئیں کے متعلق یہ روایت مشہور رہی ہے کہ

" اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے
زمانے میں دیوؤں کو قید کیا گیا تھا "

بہرحال تلاش کرنے پر کھنڈرات میں سے بہت کچھ دستیاب ہو سکتا ہے ۔ مگر مضمون اس طوالت کا متحمل نہیں ۔ مختصر یہ کہ اس صحرا سے وہ پھول کھلے ہیں کہ جن کی مہک عرب و عجم تک پہنچی اور انہیں پھولوں کی پتیوں سے بکھر کر عالم انسانیت کو توحید کے نغمے سنائے ۔ بات دور نکل گئی ۔

انگریز دیوبند کے اس دارالعلوم سے غافل نہیں تھا ۔ اس کی نگاہیں دل، دماغ اپنے باغی گروہ کے کارناموں سے شب و روز متفکر تھا ۔ لیکن فرد جرم کوئی ثبوت مہیا نہ کر سکی ۔ لیکن فرنگی دزدیدہ نگاہوں سے اس قافلے کی نقل و حرکت دیکھتا رہا ۔ تا آنکہ ۲۲ مئی ۱۸۷۵ء کو علیگڑھ سے ایک آواز نکلی ۔

مسلمانو! انگریزی تعلیم حاصل کرو ۔
مسلمانو! انگریزی تعلیم حاصل کرو

اس مسلسل اور پیہم آواز کے پس منظر میں ۱۸۵۷ء کا فرنگی ظلم و جور دکھائی دے رہا تھا ۔ انگریز کی دہشت گردی اور بربریت

خوف سے لرزہ براندام مسلمان علیگڑھ کی طرف دوڑنے لگا - ہنوز علیگڑھ کی آواز مدہم نہ ہونے پائی تھی کہ پنجاب کے ایک قصبہ قادیان کے دہقان نے انگریز کو اولی الامر کا خطاب دے کر مسلمان کے ایمان کو نیلام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حاکمِ وقت کا ہر فعل حکم اور فیشن کا درجہ رکھتا ہے۔ نیکی اور بدی اس ترازو میں ہم وزن قرار پاتی ہیں۔ طرزِ تعلیم سے لباس کی کتر بیونت تک میں حاکم کی رضا شامل ہوتی ہے -

اجنبی حکمرانوں کی گرفت، علیگڑھ کا تعلیمی کھونا اور قادیان کا فتویٰ، ان سب نے ہندوستانی مسلمانوں کی فکر کے تمام دروازے بند کر دیئے اور قریب تھا کہ ہندوستان میں اسلام پر عیسائیت کی چھاپ پختہ ہو جاتی۔ دیو بند دارالعلوم سے پھر ایک صدا بلند ہوئی

- زمین اللہ کی ہے اور حاکمیت بھی اسی کی
رہے گی۔ قرآن کے بغیر ہر تعلیم باطل کی تعلیم ہے۔

یہ آواز کفر کے سینے میں تیر کی طرح پیوست ہو گئی۔ وہ اپنی تمام حشر سامانیوں سے لیس ہو کر اس آواز کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ لوہے کی زنجیریں، جیل خانے، بندوق اور توپوں کے دہانے وحشی کتوں کی طرح اس آواز پر بھونکنے لگے۔ لیکن یہ آواز ایک مردِ درویش کی صدا تھی - جو ماسوا اللہ کے اپنے دل سے تمام خوف مٹا چکا تھا۔ جو حرم ہوا - کے تمام بتوں کو توڑ کر توحید کا یہ پجاری بتکدۂ ہند میں دنیاوی طاقتوں سے بے نیاز تھا۔ میدان شاملی کی جنگ کا نسل حضرت مولانا محمود حسن اس مرتبہ جہاد بالسیف نہیں۔ بلکہ قلم کے جہاد کا اعلان کر رہا تھا۔ اور تلوار کی بجائے قلم لیکر فرنگی کے سامنے آنکلا۔

غلام ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کے لئے یہ دور نہایت پرآشوب دور تھا۔ اگر ایک طرف سرسید لارڈ میکالے کا پرچم اٹھائے ہوئے تھا تو دوسری طرف انگریز نے ہم رنگِ زمین دام بچھا دیئے تھے۔ مسئلہ ختم نبوت جو اسلام کا بنیادی پتھر تھا۔ اس کی بیخ کنی کے منصوبے باندھے جا رہے تھے۔ قادیانی ٹولہ بظاہر اسلام کی نمائندگی کے لئے آریہ سماج سے مناظرے کرتا سنائی دینے لگا۔ دہشت و بربریت کے اس دور میں علمائے دیو بند نے حالات کی نزاکت سے ماوری ہو کر حضرت مولانا محمد لدھیانوی دادا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے فتویٰ کی تصدیق کرتے ہوئے قادیانی ٹولے کے کفر پر مہر لگا دی۔ اس سے پیشتر علیگڑھ کے تعلیمی کھونے کو بھی بان کردہ توڑ چکا تھا اور سرسید کی برطانوی مہاکر اس بڑی طرح تار تار کیا کہ فرنگی منصوبے خاک میں مل گئے۔

اس طرح اس محاذ پر بھی انگریز کو منہ کی کھانی پڑی - اس شکست کے بعد فرنگی اور مکتبۂ فکر دیو بند کے درمیان ایک لکیر کھینچ دی گئی اور لمبی لکیر ــــ انگریز کا منشا تھا کہ ہندوستان سیاست سے اس ذہن کو جیسے کیسے ہو ختم کیا جائے چنانچہ مالٹا سے ہندوستان کے جیل خانوں تک کوئی سنگلاخ وادی ایسی نہیں جہاں سے دیوبندی علماء کو پابجولاں گزرنا نہ پڑا ہو اور کوئی بازار اور گلی ایسی نہیں جہاں سے یہ لوگ گزرے ہوں تو فرنگی ایجنٹوں نے انہیں گالیاں نہ دی ہوں اس پر بھی تقریباً ایک صدی تک ان تمام مصائب و آلام کے باوجود یہ قافلہ رواں دواں رہا۔ آخر فرنگی برصغیر کو چھوڑ کر سمندر کی ان اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ جہاں کبھی اس کا سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دیو بند کا یہ قافلہ جس کی کمان حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، پھر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ اور آخر کو شیخ عرب و عجم حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے ہاتھ رہی چلتا رہا اور چلتا رہے گا۔ انشاء اللہ العزیز ــ

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا

دارالعلوم دیوبند کے نامور سپوت

حضرت مولانا عزیر گل صاحب مدظلہ

قاری فیوض الرحمن ایم اے

آپ ۱۳۰[illegible]ھ ۱۸۹۲ء کے قریب زیارت کاکا صاحب تحصیل نوشہرہ پشاور میں جناب مولانا[illegible] گل صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ مشہور بزرگ حضرت رحمکار (کاکا صاحب) کی اولاد سے ہیں۔ [1]

ابتدائی تعلیم علاقہ میں حاصل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کیلئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور موقوف علیہ کی تکمیل کر کے ۱۳۲۲ھ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند حاصل کی۔

آغاز تعلیم دیوبند ہی سے حضرت شیخ الہندؒ آپ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔

تدریسی خدمات

آپ نے تین چار سال تک راندیر کے عربی مدرسہ میں تدریس کی اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی خواہش پر اتنی ہی مدت زاکس (مشرقی پاکستان) میں تدریسی فرائض انجام دیئے۔ مدرسہ عربیہ رورکی میں آٹھ سال تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ [2]

حضرت شیخ الہندؒ کی رفاقت میں

[illegible] ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ کو حضرت شیخ الہند کی رفاقت میں سفر حج پر روانہ ہوئے۔ بمبئی سے اسی تاریخ کو بحری جہاز کے ذریعہ روانہ ہوئے تھے اور [illegible] ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ کو جدہ سے بذریعہ اونٹوں کی سواری کو معظمہ کیلئے روانہ ہوئے اور [illegible] صفر کی شب کو وہاں پہنچے۔ حج کی سعادت حضرت شیخ الہندؒ کی رفاقت میں حاصل ہوئی۔

فرنگی حکومت کے ایماء پر شریف مکہ نے حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء کو گرفتار کرا کے بروز جمعہ ۱۰ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو جدہ سے برطانوی سویز خدیوی آگبوٹ پر آپ کو سوار کرا دیا گیا۔ ۱۷ جنوری کو سویز پہنچے، اٹھارہ بیس گورے بندوق لئے آپ حضرت پر متعین تھے۔ وہاں سے ۲۱ جنوری کو بذریعہ ریل قاہرہ پہنچے اور پھر وہاں سے جیزہ لے جائے گئے۔ وہاں آپ سے اور حضرت شیخ الہندؒ و دیگر رفقاء کے بیانات لئے گئے۔ آپ کے بیان کی بابت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (اسیر مالٹا، ص۵۹) پر یوں لکھتے ہیں: "عزیر گل صاحب نے نہایت استقلال سے اپنے ولایتی انگریز بننے سے سب کا جواب دیا اور بہت ہی متین جواب دیا۔"

---

[1] تذکرہ شیخ رحمکار، از مولانا مفتی سراج الدین صاحب کاکاخیل کے صفحہ ۱۹۱ پر آپ کا مکمل شجرہ نسب موجود ہے۔

[2] یہ کل مدت تدریس ہے جو میں نے یکجا کر دی ہے۔ اس میں اسارت مالٹا کے دوران وقفہ بھی یقینی امر ہے۔

وہاں سے ۲۶ فروری ۱۹۱۷ء کو بذریعہ بحری جہاز آپ کو مالٹا بھیجا گیا
۲۱ فروری ۱۹۱۷ء کو دس بجے صبح یہ جہاز مالٹا میں لنگر انداز ہوا مگر ۴ بجے
شام تک آپ کو جہاز سے نہ اتارا گیا۔ ساڑھے ۴ بجے شام حضرت شیخ الہندؒ کو انگریز
افسر اپنے ساتھ تانگے پر بٹھا کر لے گیا اور آپ چاروں (مولانا عزیز گل صاحب
حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حکیم نصرت حسین صاحب اور وحید احمد
صاحب) کو پیدل کیمپ تک لے جایا گیا۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
تحریر فرماتے ہیں کہ: شام کے وقت ہم سب اتارے گئے تاکہ اہل شہر
کو خبر ہو جائے اور وہ تماشا دیکھنے کے لئے راستہ میں آ جائیں۔ جس سے
ان کے دلوں میں انگریزی حکومت کا دبدبہ اور مسلمانوں اور ان کے متعلق
حکومتوں کا ضعف ظاہر ہو۔ مسلمانوں کی بری طرح تذلیل ہو۔ مصر میں بھی
اسی قسم کا معاملہ ہوتا تھا۔ الغرض جب ایسی صورت ہوتی تھی تو مجھ کو
حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (امداد اللہ) کا شعر یاد آ جاتا تھا ؎

بڑا اک کھیل خلقت نے بنایا
تماشے کو بھی تو لیکن نہ آیا

تھوڑا پہلے لکھتے ہیں۔ راستہ میں اہل شہر اور ان کے لڑکے اور عورتیں ہماری
اسارت پر خوشیاں مناتے تھے۔ مذاق اڑاتے تھے اور جھنڈ کے جھنڈ پرے
باندھے ہوئے تماشا دیکھتے تھے کیونکہ سب کے سب عیسائی تھے ان کو
مسلمانوں کے اسیر ہونے کی نہایت زیادہ خوشی ہوتی تھی۔ (۱۷۴، ۱۷۵) کیمپ
کے نمبر (مالٹا) میں یہ تھے: مولوی عزیز گل صاحب ۲۲۱۵، حکیم نصرت حسین
صاحب ۲۲۱۶، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ۲۲۱۷، وحید احمد
۲۲۱۸، حضرت شیخ الہندؒ ۲۲۱۹۔ ۱۹۱۸ء میں مسٹر بیل چیف سیکرٹری
مسٹن گورنر یوپی نے مالٹا آفس میں بلا کر آپ سے جو بیان لیا، حضرت
مدنیؒ کے الفاظ میں پڑھیئے: ۔۔ مولوی عزیز گل صاحب کا بھی بیان لیا
اور ان سے سرحدی اخبار وغیرہ پوچھیں مگر انہوں نے حسب عادت
سختی ہی سے جواب دیا۔ اس نے جہاد کی نسبت بھی ان سے پوچھا انہوں
نے جواب دیا کہ آپ مجھ کو مسلمان سمجھتے ہیں یا نہیں۔ اس نے کہا
ہاں۔ کہا کہ پھر آپ کا کیا خیال ہے کہ کوئی شخص بغیر قرآن کی تصدیق
کئے ہوئے اور اس کے تمام حصوں کو مانے ہوئے مسلمان ہو سکتا ہے
اس نے کہا کہ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ پھر اس کے کیا معنی کہ آپ مجھ سے
ایسی بات پوچھ رہے ہیں جس کو آپ خود جانتے ہیں کہ قرآن میں
مذکور ہے۔ اسی طرح کی بہت سی باتیں ہوئیں۔ (ص ۱۹۱)

ص ۱۹۱ پر حضرت مدنیؒ اسارت مالٹا کے دوران آپ کے مشاغل
کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں:

مولوی عزیز گل صاحب کا اشتغال

مولوی عزیز گل صاحب مختلف اوقات میں اعمال
سلوک تعلیم کردہ مولانا مرحوم (شیخ الہندؒ) میں مشغول رہتے تھے اور جس قدر
وقت قرآن شریف کے یاد کرنے میں بھی صرف کرتے تھے۔ انہوں نے
زبان ترکی کے سیکھنے کی طرف بھی توجہ کی اور تھوڑے ہی دنوں میں
بحمداللہ اچھی خاصی ترکی بولنے لگے۔ اس کے بعد انگریزی زبان کی
طرف متوجہ ہوئے۔ مگر سوئے بخت یا خوش نصیبی نے اس میں دستگیری
نہ کی۔ ان کو حسب خواہش کوئی استاد نہ ملا اور کچھ طبعی عدم استقلال
بھی اس فن کے کمال سے مانع ہوئی۔ قرآن شریف کی طرف توجہ بہت
کی مگر ضعف حافظہ اور عدم استقلال طبع سد راہ ہوتا رہا۔ موصوف کو اس
کا شوق بہت ہے یاد بھی جلد کر لیتے ہیں مگر بھول بھی جلد جاتے ہیں۔
مولانا رحمۃ اللہ علیہ (شیخ الہندؒ) کی نظر عنایت ان پر بہت زیادہ تھی۔
اور بہت بے تکلفی سے ان سے رہتے تھے جو بے تکلفی ان سے برتتے
رہے وہ کسی اور کے ساتھ عمل میں نہیں آئی ۔۔۔۔۔ (اسیر مالٹا ص [illegible])

۲۲ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ / ۱۲ مارچ ۱۹۲۰ء بروز جمعہ بوقت دس
بجے صبح آپ کو مالٹا سے اگیرٹ پر سوار کر دیا گیا۔ ۱۲ مارچ کو یہ اگیرٹ
اسکندریہ پہنچا۔ وہاں سے ٹرین میں سوار کر کے سیدھے بلاد کیمپ لے گئے

کیمپ ہی سے جانے لگے اسلام پاشاؤں کے کیمپ میں رکھا گیا حضرت مدنی لکھتے ہیں کہ: ہم پر اسی طرح سخت پہرہ کر دیا جیسا کہ ان لوگوں پر تھا [illegible] اشتباہ دلوں کے بعد ۲۰ رجب ۱۳۳۸ھ/۱۲ اپریل ۱۹۲۰ء کو وہاں سے سویز کے لئے روانگی ہوئی اور اسی طرح جیلوں کے بیچ میں آپ سٹیشن پر پہنچا دیے گئے۔ آگبوٹ تیار نہ ہونے کی وجہ سے پھر قیدیوں کے کیمپ میں ڈال دیئے گئے۔

سویز سے روانگی ۵ رمضان ۱۳۳۸ھ/۲۳ مئی ۱۹۲۰ء اتوار کے دن دس بجے صبح کیمپ سے سویز پہنچائے گئے اور اسی شام آگبوٹ پر آپ کو سوار کر دیا گیا۔ ۱۷ رمضان المبارک کو اتوار ہی کے دن آگبوٹ عدن پہنچا اور پھر ۲۰ رمضان المبارک کو پیر کے دن بمبئی پہنچا تھا۔ حضرت مدنی لکھتے ہیں کہ: میں اور مولوی عزیر گل صاحب اکثر اسباب لے کر کنارہ پہنچے اور ہوڑی کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور وحید کے لینے کے لئے روانہ کیا۔ اتنی ہی دیر میں بارش ہو گئی، دریا میں طوفان آ گیا جس کی وجہ سے اس روز مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور وحید نہ آ سکے ؎۔ اگلے دن بمشکل تمام مولانا کو اتارا گیا۔ بمبئی پہنچنے پر

؎ اس مبارک قافلہ کے ایک قیمتی فرد جناب حکیم نصرت حسین صاحب کا واپسی میں ذکر اس لئے نہیں کہ ان کا اسارتِ مالٹا کے دوران مالٹا ہی میں نمونیہ سے انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی قبر مالٹا میں ان عظیم مجاہدوں کی عظیم قربانیوں کا آج بھی پتہ دیتی ہے۔ حضرت مدنیؒ آپ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: "مولوی حکیم نصرت حسین صاحب نہایت سلیم الطبع، ذکی الفہم، مستقیم الاوقات تھے۔ انہوں نے علم حدیث وغیرہ دیوبند میں پڑھا تھا، باقی کتابیں لاہور، کانپور، دہلی وغیرہ میں پڑھی تھیں۔ دیوبند سے تکمیل کے بعد لکھنؤ وغیرہ میں طب کی تکمیل کی۔ جلسۂ دستار بندی دیوبند میں ان کی دستار بندی ہوئی۔ مولانا شبیر احمد صاحب کے ساتھ دورہ میں شریک تھے۔ اسی زمانہ طالب علمی میں مولانا شیخ الہند مرحوم سے بیعت بھی ہوئے تھے۔ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے مگر پھر بھی جاگیر زمینداری کے تعلقات اور مطب میں مشغول رہے۔ اسی زمانہ میں انگریزی بھی کچھ پڑھ لی مگر مشق پوری نہ تھی۔ اس سفر میں بولتے رہتے اچھی طرح کام چلانے لگے تھے۔ تقویٰ طبیعت میں ابتداء ہی سے تھا۔ اس لئے نمازوں کو ہمیشہ اول وقت پر پڑھتے تھے۔ تہجد کا بہت ہی زیادہ خیال تھا۔ فضولیات کی طرف طبیعت کو رغبت نہ تھی۔ اسلام کا درد اور وطن اور قوم کی محبت نہایت زیادہ تھی۔ سیاسی امور میں پوری دلچسپی رکھتے تھے۔ ہندوستان کی آزادی کی ہمیشہ دھن لگی رہتی تھی۔ نہایت معزز خاندان کے نونہال تھے۔ کوڑا جہان آباد ضلع فتح پور ہسوہ، ان کا آبائی وطن ہے۔ جب یہ نظر بند ہو گئے تو ان کو جدہ ہی سے خیال ہوا کہ اس وقت کو رائیگاں نہ جانا چاہیے۔ انہوں نے مولانا مرحوم سے اس کی درخواست کی۔ مولانا نے کوئی ذکر مناسب تعلیم فرمایا، چنانچہ انہوں نے نہایت پابندی سے جملہ امور تعلیم کردہ مولانا مرحوم پر عمل کرنا شروع کیا۔ عموماً ہر وقت ذکر اسم ذات جاری رہتا تھا اور اوقات معینہ میں مراقبہ وغیرہ بھی کیا کرتے تھے۔ وہ اسی طرح اپنے کام میں مشغول رہتے اور اپنی جملہ کیفیات مولانا مرحوم سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔ بعد مولانا مرحوم کے ہماری جماعت میں کوئی بھی بالوقت شب خیز تہجد گذار ان سے زیادہ نہ تھا۔ بلکہ تمام کیمپ کا سرشتہ مالٹا میں بھی کوئی ایسا نہ تھا۔ مولانا کی توجہات بھی ان پر بہت تھی۔ ان کو ضعفِ معدہ کی شکایت بھی تھی اور ہمیشہ گھر پر بھی بخار وغیرہ میں مبتلا رہا کرتے تھے۔ یہ اپنے اوقات قرآن شریف، دلائل الخیرات، ذکر، مراقبہ وغیرہ میں صرف کرتے تھے۔ خود اپنی خواہش سے ایک مدت تک کھانا بھی پکاتے تھے۔ ان کی طبیعت کچھ عرصہ کے بعد مالٹا میں خوب سنبھل گئی تھی۔ مگر رجب ۱۳۳۶ھ سے ان کو پھر تپ و لرزہ کے دورے شروع ہوئے۔ رمضان آنے پر انہوں نے روزے بھی رکھے، ڈاکٹری دوائیں شب کو استعمال فرماتے تھے۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔

معلوم ہوتا کہ ہم بالکل آزاد ہیں۔ کسی قسم کی روک ٹوک ہم کو نہیں ۔؎
(صلاتا ، اسیر مالٹا)

مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری "تذکرہ شیخ الہند" میں یوں لکھتے ہیں :-

مولانا عزیز گل صاحب آپ زیارت کاکا صاحب ضلع پشاور کے باشندے ہیں اور حضرت شیخ الہند کے معتمد خاص اور جان نثار شاگرد ہیں۔ آپ ابتداء ہی سے تحریک ریشمی

مہینے کے بعد (ڈاکٹر کے کہنے پر) ہسپتال داخل کئے گئے، ہر تیسرے دن دو بجے کے بعد مل سکنے کی اجازت تھی (ہر روز کی اجازت دیر سے ملی اور وہ بھی کاغذی) نویں تاریخ ذیقعدہ کو جب ہم اجازت لینے گئے تو ہم کو خبر دی گئی کہ ان کا شب کو صبح کے قریب انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انہوں نے جب جب جانا ہوا تو کہا کہ ذکر میرا جاری ہے اور تعلق خداوند ذوالجلال سے بندھا ہوا ہے : بڑی مشکل سے تیمم کرا کے کفنانے گئے اور مقبرہ تک ۲۰ آدمیوں کی اجازت لی۔ کمانڈر نے اجازت دو سے دی۔ ایسا اجتماع کسی شخص کے جنازہ میں وہاں نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر مولانا مرحوم نے بادل غمگین نماز پڑھائی اور دروازہ کے قریب ہی ان کی قبر کھدی ہوئی تیار تھی۔ اس میں دفن کر دیئے گئے۔ لوح قبر کی عبارت ایک پتھر پر یوں کندہ ہے :-

هذا قبر الحكيم السيد نصرت حسين من اهل كوٹ جهان آباد الهند. أسر بمكة المكرمة مع حضرة العلامة مولانا الشيخ محمود حسن صدر المدرسين بكلية ديوبند في الحرب العموي وتوفى أسيرا في تاسع ذي القعده ١٣٣٧ هجرة النبي سيدنا محمد صلى الله عليه وسلم رحمة الله رحمة واسعة وله الفاتحة ۔

اس پتھر کو کرنیل اشرف بیگ نے کندہ کرایا تھا۔ (صفحہ ۱۹۸)

خطوط کے رکن خاص رہے ہیں۔ چنانچہ صفحہ [illegible] میں خیر مقدم اور وہاں پر تحریک کرنے سے چونکہ آپ کے ذمہ تھا اس خدمت کو انجام دینے کے لئے دیوں مرتبہ جانی خطروں میں مبتلا ہوئے مگر بفضلہٖ تعالیٰ بچ گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ گرفتار ہو کر مالٹا بھی گئے تھے۔ وہاں بھی حضرت کی دل و جان سے خدمات انجام دیں۔ مالٹا سے آنے پر دیوبند کی خلافت کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے چونکہ پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے حضرت شیخ الہندؒ کی بھانجی کی لڑکی سے نکاح کر لیا تھا اور دیوبند میں کھڈیوں کی ایک دکان ذریعہ معاش کے لئے کر لی تھی۔ اس بیوی کے انتقال کے بعد سکھر تشریف لے گئے اور وہاں مدرسہ رحمانیہ میں صدر مدرس ہو گئے اور ایک میم (نو مسلم) سے اس کی خواہش پر نکاح کر لیا۔ اس کے بعد اپنے وطن تشریف لے گئے (تذکرہ شیخ الہند مطبوعہ بجنور ۱۹۶۵ء صفحہ ۱۹۰، ۱۹۱)۔

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند "حیات شیخ الہند" میں آپ کے بارے میں یوں لکھتے ہیں :-

مولانا حاجی عزیز گل صاحب کاکاخیل - ساکن زیارت

؎ اس کتاب کے صفحہ ۸۲، ۱۸۴، ۱۸۶، ۱۹۰، ۱۹۱، ۲۰۹، ۲۳۹، ۲۹۶، اور ۲۹۸ پر آپ کا تذکرہ کیا گیا ہے" اسیر مالٹا" میں حضرت مدنیؒ نے صفحہ ۱۸، ۳۰، ۴۵، ۴۴، ۶۴، ۷۹، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۶، ۱۲۴، ۱۲۸، ۱۳۸، ۱۴۴، ۱۵۳، ۱۵۹، ۱۶۶، ۱۷۶، ۱۷۸، ۱۸۹، ۱۸۶، ۱۹۱، ۱۹۹، ۲۰۲ اور ۲۰۵ پر آپ کا تذکرہ فرمایا ہے (مطبوعہ دیوبند) اسی طرح سفرنامہ شیخ الہند کے نام سے یہ کتاب جامعہ مدینہ کریم پارک لاہور سے نہایت خوبصورتی کے ساتھ ۱۳۹۹ھ میں پاکستان میں شائع ہوئی ہے اسمیں بھی اتنے ہی مقامات پر آپ کا ذکر کیا گیا ہے۔

کا وطن ضلع پشاور ہے ۱۳۲۹ھ میں وطن سے تحصیل علوم دین ہندوستان تشریف لائے پہلے میرٹھ پہنچے کچھ عرصہ کے بعد خوش قسمتی نے دارالعلوم دیوبند کی طرف ہدایت کی۔ یہاں پہنچ کر عرصہ میں جب باقاعدہ ابتدائً امتحان داخلہ ہوا حضرت مولانا شیخ الہند نے لیا تو خصوصی توجہ اور شفقت کے اثر نے مولوی صاحب کے قلب میں حضرت شیخ سے ایک باطنی تعلق پیدا کر کے بندۂ بے درم بنا دیا اور اس امتحان کی کامیابی آئندہ امتحانات کے لئے نیک شگون اور فال حسن بھی گئی۔ دو سال میں مختلف اساتذہ دارالعلوم سے تحصیل علوم کر کے مشکوٰۃ شریف تک پہنچے، باطنی عظمت و عقیدت کا تو یہ حال تھا کہ جب تک حضرت مولانا کہیں درس تک بھی نظر کے سامنے رہتے غایت ادب سے بیٹھنا حرام سمجھتے مگر حاضری خدمت اور کسی عرض و معروض کی نوبت نہ آئی تھی۔

۱۳۳۰ھ میں ولایتی مشہور بزرگ الحاج ملا صاحب کے در خلفاء دیوبند تشریف لائے زحسن اتفاق سے مولوی صاحب کو حضرت کی مخصوص ملاقات کے لئے واسطہ بنایا۔ حضرت نے ملاقات منظور فرما کر ان بزرگ مہمانوں کے ہمراہ براہ شفقت ان کو بھی مدعو فرمایا واقع میں ان کی عقیدت او نظاہر میں یہ دعوت ان کے لئے باعث ہزار سعادت ہوگئی۔ آمد و رفت کی جرأت ہوئی۔ رفتہ رفتہ بمقتضائے اذا خالطہ الحب" ترقی عقیدت سے باضابطہ حلقہ خدام میں شامل ہو گئے اور فیوض ظاہری و باطنی حاصل کرتے رہے۔ تین مرتبہ حضرت سے بخاری شریف پڑھی اور چار مرتبہ ترمذی شریف۔

دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۳۲ھ تک تکمیل علوم کر کے فارغ التحصیل ہوئے اور ۱۳۳۳ھ میں جب حضرت نے قصد سفر فرمایا تو ان کے دیندار و بزرگ والد ماجد نے باوجود اپنی ضرورتوں کے ان کے لئے فلاح دارین سمجھ کر ان کو معیت و خدمت کی اجازت دے دی۔ اور سفر حرمین شریفین اور اسیری میں پورے شریک حال و خادم رہے کے ساتھ تحصیل فیوض باطنی اور ذکر و شغل سے بھی غافل نہ رہے (اور حضرت کی صحبت فیض خود ہزاروں شغلوں سے بڑھ کر ایک شغل تھا) ہی، آخر دم تک خدمت میں حاضر رہے۔ ان کو حضرت کے مزاج میں بہت دخل تھا اور مقتضائے بشریت جب تو اکثر گستاخ، بعض مواقع پر حضرت کے سامنے ایسی جرأت سے کلام کرتے تھے کہ حاضرین حیران رہ جاتے تھے۔ مگر حضرت ان کے اس طرز سے مانوس تھے۔ کبھی کبیدہ خاطر نہیں ہوتے تھے اور مثل اولاد کے ان پر شفقت رکھتے تھے۔ لیکن مناسب مواقع پر سختی سے تنبیہ و عتاب فرماتے تھے لیکن یہ ہر حالت میں سر تسلیم خم کئے ہوئے خدمت میں حاضر رہتے تھے ایسے دیانتدار و جاں نثار خادم بہت کم بزرگوں کو میسر آتے ہیں۔ بالفعل دیوبند میں مقیم ہیں اور بعد وفات حضرت کی بہترین خدمت سمجھ کر تحریک خلافت اور اصلاح المسلمین میں خاطر خواہ مساعی جمیلہ دکھلا رہے ہیں۔ بڑے جوشیلے مسلمان اور قوی الایمان جوان ہیں۔ زادہ اللہ تعالیٰ برکاتہم (حیات شیخ الہند ص ۱۷۱، ۱۷۲ مطبوعہ دیوبند ۱۹۳۸ء)

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نقش حیات ج ۲ مطبوعہ ۱۹۵۳ء دیوبند انڈیا) میں تحریر فرماتے ہیں۔

(۵) مولانا عزیز گل صاحب قصبہ زیارت کاکا صاحب ضلع پشاور کے باشندہ اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہندؒ کے خادم خاص ہیں۔ مشن کے ابتداء سے برابر بے انتہا اہتمام بالشان اور خطرناک کاموں کو انجام دیتے رہے۔ صوبہ سرحد اور آزاد علاقہ (یاغستان) میں سفارت کی خدمات عظیمہ انہوں نے بہت انجام دی ہیں۔ عموماً شیخ الہندؒ ان پہاڑی علاقوں میں اپنے ہم خیال اور ہم نوا لوگوں کے پاس انہیں کو بھیجا کرتے تھے۔ دشوار گزار اور خطرناک راستوں کو طے کر کے نہایت رازداری اور محنت و استقلال کے ساتھ یہ بار بار آتے جاتے رہے ہیں۔ پہاڑی علاقوں اور ہولناک جنگلوں کو

رات دن پیدل قطع کرتے رہے۔ حاجی ترنگ زئی صاحب اور علائے سرحد و یاغستان اور دیگر خوانین کو مشن کا ممبر بنانا اور ان کے پاس پیغام اور خطوط پہنچانا اور ان کو ہموار کرنا، ان کا اور مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کا فریضہ خاص تھا جس کو ان دونوں حضرات نے اوقاتِ مختلفہ میں انجام دیا۔ باوجودیکہ سی آئی ڈی ان کے پیچھے لگی رہی۔ مگر انہوں نے کبھی پاس کو پتہ چلنے نہیں دیا۔ بار بار ان کو بھیس بدلنا اور ان جان علاقوں میں گذرنا پڑا۔ مگر نڈر ہو کر ان کو قطع کیا۔ ہر قسم کے خطرات میں بلا خوف و خطر اپنے آپ کو ڈالتے رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے نہایت مخلص فدائی ہیں۔ کسی قسم کی طمع اور غرض نفسانی نہیں رکھی نہ حضرت سے جدا ہوئے۔ لوگوں نے بہت کوششیں کیں کہ یہ جدا ہو جائیں مگر انہوں نے گوارا نہ کیا اور ہمیشہ عاشقانہ ولولوں کے ساتھ خدمت میں حاضر رہے حتیٰ کہ مالٹا کی اسارت میں بھی انتہائی دلچسپی سے شریک اور رفیق رہے۔ ہر قسم کی خدمت کو اپنے لئے خوش نصیبی سمجھا گئے۔ لوگوں نے ان کو سی آئی ڈی مشہور کیا۔ آوازے کسے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بھڑکایا اور بدظن کرنے کی کوششیں کیں۔ مگر حضرت مرحوم شناس دماغ اور قلب رکھتے تھے ان کی طرف سے اخیر تک بدظن نہ ہوئے اور آخر وقت تک ان کو ساتھ رکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے راز دار اور مالی سرمایہ کے خزانچی اور معتمد علیہ رہے۔ حضرت کی وفات کے بعد بھی عرصۂ دراز تک حضرت کے مکان ہی پر قیام پذیر رہے۔ چونکہ ایام اسارت مالٹا میں اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا تھا اس لئے بعض احباب کی کوششوں سے حضرت کی بھانجی کی لڑکی سے نکاح بھی ہو گیا۔ اس سے ان کے دو لڑکے اور لڑکیاں بھی ہوئیں جو کہ ماشاءاللہ اب جوان ہو گئے ہیں۔ ایام تحریک خلافت میں دیوبند خلافت کمیٹی کی صدارت کی خدمات انجام دیتے رہے مفلوکیات معاشیہ کی بنا پر سوختہ (جلانی لکڑی) کی تجارت بھی کرتے رہے۔ پھر مدرسہ رحمانیہ رڑکی میں صدر مدرس ہو گئے۔ وہاں ہی ایک بیوہ سے اس کی خواہش پر دوسری اہلیہ محترمہ کی وفات کے بعد نکاح کر لیا۔ پھر اپنے بچوں اور تیسری اہلیہ کو لے کر وطن ضلع پشاور میں چلے گئے۔ اب وہاں ہی اقامت گزیں ہیں (نقش حیات صلاۃ) ۱۹۴۲ فروری ۱۹۴۵ء کو واپس وطن آئے اور پھر سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو کر گوشہ میں سکونت اختیار کر کے زندگی ذکر و فکر اور مطالعہ میں گزار رہے ہیں۔

۱۹۷۳ء کی ملاقات میں آپ نے راقم کو ان مجاہدانہ کارناموں کی کچھ تفصیل سنائی تھی۔

ایک ضروری وضاحت

"تحریک ریشمی رومال" نامی کتاب کلاسیک ۴۲ دی مال لاہور نے دین محمدی پریس سے ۱۹۷۶ء میں حضرت مولانا حسین احمد کی تصنیف کے طور پر شائع کی جس میں ترتیب مولانا عبدالرحمٰن ہزاروی کی ہے یہ کتاب مجاہدین آزادی کی لا زوال مجاہدانہ سرگرمیوں کو چھپانے پردہ ڈالنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ یہ سرے سے حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی تصنیف ہی نہیں بلکہ عبدالرحمٰن ہزاروی صاحب کی روایات پر مبنی ہے۔

حضرت مدنی کے فرزند ارجمند مولانا اسعد مدنی تحریر فرماتے ہیں۔

---

[1] آپ کی یہ اہلیہ محترمہ نہایت صالحہ تھیں۔ انہوں نے آپ کے تعاون سے حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن کا انگریزی میں ترجمہ کیا جسے بعد میں مولانا سلیمان ندوی نے دیکھا تو بہت پسند کیا۔ فیروز سنز پبلشرز نے برائے اشاعت لیکن نامعلوم کہاں رکھ دیا ہے؟ اسلام کی حقانیت اور دیگر مذاہب کے ساتھ اس کا موازنہ بنام (BALANCE WAY) بھی لکھا ہے۔ انگریز کا خاندان چیف لارڈ کچنر کے خاندان سے تھیں۔ راہ حق کی تلاش میں سب کچھ قربان کر کے حضرت مولانا مدنیؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور ۱۹۴۱ء کے لگ بھگ آپ کے نکاح میں آئیں اور ۱۹۲۲ء میں رحلت فرما گئیں۔

... مولوی عبدالرحمٰن ہزاروی کی تصنیف شیخ الاسلام
حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کی طرف منسوب کرنا
... تصنیف مولوی عبدالرحمٰن صاحب ہزاروی کی طبع
زاد ہے جس میں تاریخی واقعات کو مسخ کر کے انتہائی مکروہ صورت
میں ... حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات سے
بعض اقتباسات پیش کر کے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے
کہ یہ کتاب حضرت قدس سرہٗ کی تصنیف ہے اس میں خاص طور پر وہ حصہ
انتہائی مکروہ افتراء ہے جس میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے
مخلص خادم و جاں نثار سابق رفیق اسارت اور حضرت شیخ الاسلام مولانا
حسین احمد مدنیؒ کے مخلص ترین رفیق حضرت مولانا عزیر گل اسیر مالٹا کو ریشمی
خطوط کی تحریک میں انگریزوں کا آلۂ کار ثابت کرنے کی کوشش کی
گئی ہے۔ میں مولوی عبدالرحمٰن ہزاروی کی اس قسم کی تمام افترا پردازیوں
کی پرزور تردید کرتا ہوں جو انہوں نے حضرت مولانا عزیر گل صاحب
کے متعلق اس کتاب میں کی ہیں اور اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ
حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کے تعلقات
حضرت مولانا عزیر گل صاحب مدظلہ سے انتہائی یگانگت اور اخلاص کے
ساتھ قائم رہے ہیں اور والد محترم کے انہیں تعلقات کے احترام میں
انتہائی علیم الفرصتی کے باوجود میں نے ان کی زیارت کی برسوں سالہ تمنا کے
حصول کے لئے ان کے دیہاتی خام مکان پر حاضر ہونے کی آج ہی سعادت
حاصل کی ہے۔ جہاں وہ اسی درویشانہ اور تنگی کی زندگی گزار رہے
ہیں جو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے مخلصین کا طرۂ امتیاز اور حضرت
مولانا عزیر گل صاحب مدظلہ کی طویل تاریخی زندگی کی سب سے زیادہ
نمایاں خصوصیت رہی ہے۔"

(بیان مطبوعہ الحق، ۱۷ر جولائی ۱۹۶۹ء
پشاور صفحہ ۔ بابت اگست ۱۹۶۹ء)

سی۔آئی۔ڈی کی شہادت بعنوان ریشمی خطوط کی ڈائریکٹری

آپ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ ۲۲۔ عزیر گل ۔ پسر رشید گل
کاکاخیل پٹھان، ورگوتی کمال عنبرا سرحدی صوبہ میں رہتا ہے بڑا آتشیں ذہن
ہے جب وہ دیوبند میں طالب علم تھا اسی وقت سے مولانا محمود الحسن کا
پکا مرید ہو گیا تھا۔ بڑا اہم سازشی ہے ہجرت کا بڑا خواہشمند ہے۔ ان
لوگوں میں سے ایک ہے جنہوں نے ہمیشہ مولانا کو اکسایا ہے کہ وہ جہاد کے
لئے ہجرت کر جائیں۔

وہ دیوبند میں خفیہ جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا اور ستمبر ۱۹۱۵ء
میں مولانا محمود الحسن کے ہمراہ عرب گیا تھا اس کے سفر حجاز سے قبل مولانا
محمود الحسن نے اس کو آزاد علاقہ میں بھیجا تھا تاکہ حاجی صاحب سیف الرحمٰن
اور دوسرے منحرف لوگوں کو مطلع کر سکے کہ حضرت مولانا کا ارادہ ہندوستان
سے ہجرت کرنے کا ہے۔ نیز وہاں کا اور جہاد کی تیاریوں کا مشاہدہ کر سکے۔
وہ حضرت مولانا کے ہمراہ اس وقت بھی ٹھہرا رہا جب کہ ان کے اکثر مرید
اور مریدین ہندوستان کو واپس کرائے گئے۔ یہ کہا جاتا تھا کہ عزیر گل
انور پاشا اور جمال پاشا کے فرمان لے کر عنقریب ہندوستان آئے گا۔
اور اس فرمان کو افغانستان لے جانا ہوگا لیکن بعد کی تحقیقات سے معلوم
ہوتا ہے کہ اس کو مکہ میں شریف مکہ کے حکم سے — دسمبر کو یا اس کے لگ

لہ آپ حضرت شیخ رحمہ اللہ کی اولاد سے ہیں۔ کاکاخیل یہ قومیت کے
لحاظ سے پٹھان نہیں ہیں بلکہ پشتو بولنے کی وجہ سے شاید پٹھان لکھ دیا گیا
ہے جو قومیت کے اعتبار سے درست نہیں ہے۔ آپ کے والد صاحب
کا نام شاہد گل ہے نہ کہ رشید گل۔

ٹہ ۔ یہ ذرگئی ہے۔ ورگوتی۔ نہیں۔ آپ کے دادا کا وہاں
قیام رہا۔

ٹہ حاجی فضل واحد المعروف بہ حاجی ترنگ زئی مراد ہیں۔

جنگ گرفتار کر لیا گیا اور جیل بھیج دیا گیا۔ جہاں سے ۱۶ جنوری ۱۹۱۷ء
کو اسے مصر روانہ کر دیا گیا۔ مجوزہ ربانیہ کی فہرست میں مولوی عزیر گل کا نام
لفٹنٹ کرنل دکھایا گیا ہے۔ [1]

سی آئی ڈی کی اس شہادت سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے
کہ یہ اس تحریک کے اہم سازشی تھے۔ الزام لگانے والوں کو اب ترجیحاً آنی
چاہیئے کہ حضرت مولانا عزیر گل صاحب نے اس تحریک کا کوئی راز افشا
نہیں کیا، ورنہ انگریزی سرکار انہیں "آتشیں مزاج" اور "اہم سازشی"
کے القاب سے نہ نوازتی۔

مولانا سید اسعد مدنی لکھتے ہیں کہ "اس جماعت کے ارکان کی
مدح و ستائش یا ان کی سفارش کرنا ان سطور کا موضوع نہیں ہے جو
پیش لفظ کے طور پر لکھی جا رہی ہیں، نہ ان میں اس کی گنجائش ہے۔ البتہ
اس جماعت کے ایک رکن مولانا عزیر گل صاحب کے متعلق چند کلمات
لکھنے ضروری ہیں۔

پاکستان میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ بنام "تحریک ریشمی
رومال مولانا حسین احمد" کتاب کے مصنف ہیں۔ مولانا عبدالرحمٰن، اس
کتاب میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے یہ گل افشانی کی ہے کہ مولانا
عزیر گل صاحب جاسوسی کیا کرتے تھے۔

اس نفرت انگیز الزام کے ثبوت کے لئے صرف ایک غیر مستند
بیان پیش کیا ہے باقی خود ساختہ قرائن درج فرمائے ہیں۔ کتاب کی تحریر
کا ایسا انداز ہے کہ گویا حضرت والد صاحب (حضرت مولانا سید حسین احمد
صاحب رحمۃ اللہ) نے خاص مجلسوں میں [illegible]
اور عبدالرحمٰن صاحب نے ان کو قلم بند فرما لیا تھا [illegible]
اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں جو تحریر [illegible]
ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت والد صاحب [illegible]
ملتی تھی اور نہ یہ عادت تھی کہ طلباء کے ساتھ خاص مجلسیں کریں۔ وہ
چشمۂ فیض اور علم کے دریا تھے۔ حلقۂ درس میں یہ دریا موجزن ہوتا تھا۔
تشنگانِ علوم وہیں سیراب ہوتے تھے۔ طلبہ کی موجودگی میں مجلس جمانا
یہ ان کا طریقہ نہیں تھا۔ عبدالرحمٰن صاحب کو جاننے والے جانتے ہیں
کہ وہ باوزن تو کیا ہوتے ایسے بھی نہیں ہیں کہ کسی سنجیدہ مجلس میں ان
کا تذکرہ کیا جائے۔ ان کا نام بھی "رسوائے زمانہ" جیسے کتابی تمیز طلب
کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ طلبہ کے حلقہ میں بہت سی باتیں پھیلتی ہیں جو اکثر خود ساختہ
ہوتی ہیں۔ جن سے گرمی مجلس کا کام لیا جاتا ہے۔ عبدالرحمٰن صاحب نے انہیں
ہفوات کو جمع کر کے جاذب توجہ نام رکھ دیا ہے۔ "تحریک ریشمی رومال" بہر حال
نہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب کی شخصیت قابل اعتنا ہے۔ نہ وہ قرائن قابل التفات
ہیں جن پر مولوی عبدالرحمٰن صاحب نے اس الزام کی بنیاد رکھی ہے۔ مگر تعجب
بھی ہے اور افسوس بھی کہ ایک صاحب جنہوں نے حضرت شیخ الہند پر تحقیقی
مقالہ لکھا ہے۔ جس پر ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی ہے۔ انہوں نے
تقریباً دو صفحے ان ہفوات کو نقل کرنے میں لگائے ہیں۔ اور ان قرائن کے
متعلق فرمایا ہے "محل غور" ہیں۔

غالباً مقالہ نگار صاحب کے نزدیک تحقیق کے معنی یہی ہیں۔
کہ متضاد قسم کے رطب و یابس جمع کر کے اپنی طرف سے مستند فیصلہ
کرنے کے بجائے بار تحقیق پڑھنے والوں پر ڈال دیں اور فریضۂ [illegible]
اپنے بجائے ناظرین کے ذمہ کر دیں۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے پیش کردہ
قرائن میں سب سے قوی قرینہ یہ ہے کہ مولانا عزیر گل صاحب نے آخر
میں ایک میم سے شادی کر لی تھی اب فرماتے ہیں کیا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ

---

[1] مولانا سید محمد میاں، تحریک شیخ الہند: انگریزی سرکار کی زبان میں:
ریشمی خطوط سازش کیس اور کون کیا تھا۔
(انڈیا آفس لندن میں محفوظ ریکارڈ کا اردو ترجمہ)، لاہور نومبر ۱۹۷۵ء
مکتبہ رشیدیہ۔ ص ۲۱۵، ۱۶۔

[illegible] ہو سکتا ہے اس کی ایک جدید ب
[illegible] ایک بیم کا تعلق پیدا ہو سکتا ہے ... [illegible] ... ہیں اور مولانا صاحب اس کو نقل [illegible] صاحب کو علم نہیں۔ لیکن انہوں نے خود اس [illegible] میں درج کر دیا ہے کہ یہ نکاح مولانا عزیر گل صاحب کی خواہش پر نہیں بلکہ خود بیم صاحب کی خواہش[1] پر ہوا تھا۔

یہ بیم صاحبہ نکاح کے بعد زندگی بھر دیوبند میں رہیں کئی سال تک دیوبند میں رہیں۔ کہا جاتا تھا کہ ان کا تعلق لندن کے معزز خاندان سے تھا۔ ذی علم اور صاحب مطالعہ تھیں۔ بیوہ تھیں۔ ان کے پہلے شوہر ہندوستان میں اونچے عہدے پر رہے تھے لیکن جب اسلام سے مشرف ہوئیں تو زاہدانہ زندگی اختیار کر لی۔ یورپین لندن کے بجائے دیوبند اور زندگی کا قصبانی تمدن اپنایا۔ شریعت کے پردہ کی پابند ہو گئیں۔ صوم و صلوٰۃ اور اوراد و وظائف اور تلاوت قرآن کریم ان کا مشغلہ تھا۔ تفسیر کا مطالعہ کیا۔ قرآن پاک کا ترجمہ بھی انگریزی میں کیا مگر افسوس طباعت کا انتظام نہیں ہو سکا۔ ایسی خاتون کے متعلق بدظنی گناہِ عظیم اور کسی خود ساختہ قرینہ کے لئے ایسی واجب الاحترام خاتون کا نام لینا "وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ" کے تحت حرام ہے۔

مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے سامنے کوئی خیالی عزیر گل ہیں جن کی زندگی بلند پایہ دولت مندی کی سی رہی کیونکہ شیخ الہند رحمۃ اللہ کے رفیق اسیر مالٹا عزیر گل جن کا تعلق والد صاحب رحمۃ اللہ سے برادرانہ تھا اور بڑے بھائی کی طرح حضرت بھی ان پر شفقت فرماتے اور ضرورت کے وقت تکفل بھی فرماتے تھے۔ ان کی زندگی تو ہمیشہ مولویانہ بلکہ طالب علمانہ رہی نہایت سادہ، بے تکلف۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کی نشست گاہ میں رہا کرتے تھے پھر مسجد یا مدرسہ کے حجرہ یا کرایہ کے مکان میں زندگی بسر کی۔ کوٹھی یا پختہ مکان تو کیا اپنے لئے جھونپڑی بھی نہیں بنائی۔

مالٹا سے پہلے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے خادم خاص تھے۔ واپس ہوئے تو زمانہ تحریک میں۔ خلافت کمیٹی دیوبند کے صدر رہے کچھ معمولی سی تجارت بھی کرتے رہے، تنہا تھے۔ کسی کا خرچ ان کے ذمہ نہیں تھا۔ ایک دفعہ کپڑوں کی شال بھی کر لی۔ اس میں اپنا اثاثہ ختم کر دیا تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ نے رڑکی کے مدرسہ رحمانیہ میں تقرر کرا دیا۔ عرصہ تک اسی مدرسہ کے صدر مدرس رہے۔ اسی زمانہ میں بیم صاحبہ کی مجتہدانہ نظر نے آپ کو اپنی زوجیت کے لئے منتخب کر لیا۔ چند سال بعد آپ اپنے وطن تشریف لے گئے۔

عجیب بات یہ ہے کہ نکاح کا زمانہ ۱۹۳۴ء کے قریب کا ہے جبکہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کی تحریک کا زمانہ جس میں جاسوسی ہو سکتی تھی اس سے تقریباً ۲۰ سال پہلے یعنی ۱۵-۱۹۱۴ء کا تھا۔

قرآن کے سلسلہ میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب نے دو مجلسوں کا ذکر کیا ہے کہ ان کی گفتگو کی خبر حکومت کو ہو گئی اور آپ کا خیال یہ ہے کہ شرکائے مجلس میں صرف مولانا عزیر گل صاحب ہی ایسے تھے جن کے ذریعہ خبر پہنچ سکتی تھی۔ سوال یہ ہے کہ جن کا سوانحوں میں مولانا عزیر گل صاحب نہیں تھے اور حکومت کے پاس ان کا بھی ریکارڈ تھا ان کی خبر کس نے پہنچائی؟ حقیقت یہ ہے کہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب کو کسی وجہ سے ذاتی طور پر حضرت مولانا عزیر گل صاحب سے کاوش ہے۔ اسی لئے توہمات کو قرائن و قرار دے رہے ہیں اور اس میں خود اپنی ناتجربہ کاری اور ناواقفیت کی دلیل بھی پیش کر رہے ہیں۔ خبر پہنچانے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ مجلس کا کوئی شریک ہی خبر پہنچائے۔ شرکائے مجلس کے دوسرے لوگوں سے بھی ذاتی تعلقات اس درجہ کے ہوتے ہیں کہ وہ ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ حالانکہ فی الحقیقت وہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتے۔ ان کے سامنے کوئی

[1] شیخ الہند مولانا محمود حسن از اقبال حسن خان [illegible]۔

مغلوں کے زوال اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد مسلمانانِ ہند ذلیل و رسوا ہو گئے تھے۔ لیکن اس خاکستر مردہ میں ابھی زندگی کی چنگاری باقی تھی۔ اسے شعلۂ جوالہ بنانے کے لیے بے شمار افراد آگے آئے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے شمشیر و سناں سے کام لیا، بعض نے ایک طاقت ور تحفظ سے قوم میں ایک نیا ولولہ پیدا کرنا چاہا۔ بعض نے عوام کو اپنی تند و تیز تقریروں سے اور شعروں سے گرمایا۔ اور بعض نے بڑی بڑی درس گاہیں قائم کیں۔ جن میں علیگڑھ کی یونیورسٹی لکھنؤ کا ندوۃ العلماء اور دیوبند کا دارالعلوم سرفہرست ہیں۔ علی گڑھ کا مطمح نظر قوم کو نئے افکار سے روشناس کرانا اور نئی تعلیم و فکر انگریز کے تحت جدید مناصب کا اہل بنانا تھا۔ اہل دیوبند کا مقصد مسلمانوں کے لیے ایک ملی دینی اور روحانی مرکز قائم کرنا تھا اور ندوہ قدیم درس نظامی کی اصلاح اور علماء دین کو جدید افکار اور نئے اسلوب تحقیق و تحریر سے متعارف کرانے کے لیے قائم ہوا تھا۔

سرسید (۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸ء) کو چند ممتاز شخصیتوں کا تعاون حاصل تھا یعنی نواب محسن الملک (۱۸۳۷ء - ۱۹۰۰ء) نواب وقار الملک (۱۸۳۹ء - ۱۹۱۷ء) نواب اعظم یار جنگ، مولوی چراغ علی (۱۸۴۴ء-۹۴ء ڈپٹی نذیر احمد دہلوی (۱۸۳۱ء-۱۹۱۲ء) مولانا حالی (۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء) علامہ شبلی (۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء) مولوی ذکاء اللہ دہلوی (۱۸۳۲ء — ۱۹۱۰ء) وغیرہ۔

ندوۃ العلماء کے محرک ایک سرکاری ملازم مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر لکھنؤ تھے۔ کانپور کے ایک عالم مولوی محمد علی اس کے پہلے ناظم تھے مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق صاحب تفسیر حقانی نے قواعد و ضوابط مرتب کئے۔ بیگم بھوپال، سر آغا خاں، اور نواب وقار الملک نے مالی امداد کی اور ۱۸۹۸ء میں اس ادارے نے کام شروع کر دیا۔ ۱۹۰۴ء میں شبلی بھی اس کے رکن ہو گئے۔

ندوہ نے چند ایسے علماء پیدا کئے ہیں، جن کے کارنامے ملت کا

قیمتی سرمایہ ہیں۔ اگر علمائے ندوہ کا ادب اردو سے چھین لیا جائے تو پیچھے کچھ نہیں رہتا۔ چند علما کے نام یہ ہیں:

سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، ابوالحسن ندوی، مسعود عالم ندوی، شاہ معین الدین ندوی، سید ریاست علی ندوی، محمد اویس ندوی، سید ابوظفر ندوی، مسعود علی ندوی اور کئی دیگر۔ ان کی علمی تحقیقات کی فہرست کافی طویل ہے۔ مثلاً سیرت سید احمد شہید، سیرت محمد بن عبدالوہاب، سیرت النبی، تاریخ اخلاقِ اسلام، یونانی فلسفہ کے تاریخی ماخذ، وغیرہ وغیرہ۔

دارالعلوم دیوبند

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے ۱۰ سال بعد ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء (۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ) کو چند اہلِ ہمت نے چندہ جمع کر کے دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جو چھتہ مسجد کے نام سے مشہور تھی، ایک مدرسے کی بنا ڈال دی۔ اس کارِ خیر کے اصل محرک مولانا فضل الرحمن[۱]، مولوی ذوالفقار علی[۲] اور ملا محمود[۳] تھے۔ آخر الذکر کو ۱۵ روپے ماہانہ پر مدرس مقرر کر دیا۔ پہلے ہی دن طلبہ کی تعداد سولہ تک پہنچ گئی اور پھر بڑھتے بڑھتے ۱۳۴۲ھ (۱۹۲۵ء) میں ۸۳۰ ہو گئی۔

ان تمام کے قیام، طعام اور دیگر ضروریات کا انتظام کرنا آسان نہ تھا، لیکن دیوبند کے اہلِ ہمت نے اس بارِ گراں کو یوں اٹھایا کہ زمین و آسمان نے ان پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے۔ سنا ہے کہ آجکل طلبہ کی تعداد دو ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اس مہنگے زمانے میں اتنی بڑی تعداد کو دو وقت روٹی دینا، ان کی کتابیں [illegible] مہیا کرنا اور [illegible] کا انتظام کرنا کوئی کھیل نہیں ہے، لیکن وہ لوگ اس فرض کو [illegible] انجام دے رہے ہیں۔

تعمیری مراحل

مدرسے کی باقاعدہ عمارت کا آغاز ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں ہوا تھا۔ خشتِ اول سہارنپور کے نامور محدث مولانا احمد علی صاحب[illegible] نے رکھی۔ دوسری حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) نے اور تیسری حضرت رشید احمد گنگوہیؒ (۱۳۲۳ھ/۱۹۰۴ء) نے۔

اس وقت اس میں ۲۳۰ کمرے، آٹھ ہاسٹل، چار بڑے ہال کمرے اور ایک شاندار کتب خانہ ہے۔

انتظامیہ

پہلی مجلسِ انتظامیہ سات ارکان پر مشتمل تھی، یعنی

سرپرست : مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

مہتمم : حاجی عابد حسین دیوبندی

ارکانِ شوریٰ : (ا) مولانا مہتاب علی دیوبندی (ب) مولانا ذوالفقار علی والد شیخ الہندؒ (ج) مولانا فضل الرحمن مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد۔ (د) شیخ نہال احمد دیوبندی (ہ) منشی فضل حق دیوبندی۔

ایک سال بعد، حاجی عابد حسین صاحب حج پر چلے گئے اور [illegible] اہتمام مولانا نانوتویؒ نے سنبھال لیے۔ آپ کی وفات ۱۸۸۰ء کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اس منصب کے لیے منتخب ہوئے۔ پھر مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے فرزند مولانا محمد یعقوب، بعد ازاں شیخ الہندؒ

---

۱ مولانا فضل الرحمن، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا عزیز الرحمن سابق مفتی دیوبند اور مولانا حبیب الرحمن مہتمم دارالعلوم کے والد تھے۔

۲ مولانا ذوالفقار علی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے والد تھے۔

۳ ملا محمود مدرسہ دیوبند کے پہلے مدرس تھے اور شیخ الہندؒ، پہلا طالب علم تھا جس نے ملا صاحب سے پہلا سبق لیا تھا۔

[illegible] تھانوی۔ تقسیم ہند کے وقت مولانا محمد طیب مہتمم تھے۔ [illegible] کو اشتباہ ہوا ہے۔ [1]

[illegible]

دارالعلوم کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب تھے۔ دوسرے مولانا [illegible] صاحب، تیسرے شیخ الہند۔ چوتھے سید انور شاہ کاشمیری، پانچویں ———— مولانا سید حسین احمد مدنی۔ یہ حضرات صدر مدرس کے ساتھ شیخ الحدیث بھی ہے۔

دستار بندی

۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء سے انتظامیہ نے دستار بندی و عطائے سند کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دارالعلوم کے سرپرست، فارغ التحصیل طلبہ کے سر پر اپنے ہاتھ سے سبز دستار باندھتے اور سند عطا فرماتے تھے۔

انعامات

باقی طلبہ میں انعامات تقسیم ہوتے تھے۔ دارالعلوم کے جریدے قاسم العلوم کی ایک پرانی اشاعت میں انعامات کی شرح حسب ذیل درج ہے:

۱۔ اوّل درجہ کے حفاظ کو	ایک روپیہ
۱۔ اوّل درجہ کے طلبائے فارسی کو	"
۲۔ اوّل درجہ کے طلبائے عربی کو	"
۳۔ طلبائے درجۂ دوم	سات آنے فی انعام
۵۔ طلبائے درجۂ سوم	پانچ آنے فی انعام

دارالعلوم کی اہم شخصیتیں

دارالعلوم کی تاسیس، تعمیر، تنظیم، اور تکمیل میں جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، ان میں سے چند ایک کا مختصر سا تعارف ضروری ہے

مولانا محمد قاسم نانوتوی

نانوتہ ایک قصبے کا نام ہے، جو دیوبند سے بارہ کوس مغرب میں واقع ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحب کا مولد یہی قصبہ ہے۔ آپ کی ولادت ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی اور پھر مختلف علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان میں سے ایک مولانا مملوک علی نانوتوی (م ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) تھے۔ یہ بعد میں انگلو عربک کالج میں پروفیسر ہو گئے اور اپنے شاگرد کو ساتھ لے گئے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی

۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء

حضرت گنگوہی کے حالات و مکاتیب کو مولوی عاشق الٰہی میرٹھی نے مرتب کیا ہے۔ یہ بڑے پائے کے عالم اور صوفی تھے۔ گنگوہ ہی میں درس دیتے تھے۔ مولانا انور شاہ صاحب نہ صرف ان کے شاگرد تھے، بلکہ ان کی صفات کا عکس بھی۔ بھوپال کی فرمانروا نواب سلطان جہاں بیگم آپ کی نسبت عقیدت مند تھی۔

---

[1] ڈاکٹر صاحب کو سہو ہو گیا ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت گنگوہیؒ، حضرت تھانوی سرپرست رہے ہیں، مہتمم نہیں۔ اسی طرح حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور حضرت شیخ الہند سرپرست اور صدر مدرس رہے ہیں، مہتمم نہیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ حضرت مولانا مملوک علیؒ کے فرزند ارجمند تھے۔

———— ادارہ

مسلک دیوبند	۵۰۵
میزان	۶۲۱

(حافظ نذر احمد)

(جائزہ مدارس عربیہ ۹۶۰ء)

ان میں سے چند مشہور مدارس یہ ہیں:

۱ـــــــ جامعہ اشرفیہ پشاور
۲ـــــــ دارالعلوم حقانیہ۔ اکوڑہ
۳ـــــــ تعلیم الاسلام جہلم
۴ـــــــ جامعہ عربیہ چنیوٹ
۵ـــــــ مدرسہ عربیہ۔ رحیم یار خان
۶ـــــــ سراج العلوم۔ سرگودھا
۷ـــــــ ام المدارس۔ ٹنڈو الٰہ یار
۸ـــــــ مظہر الاسلام۔ کراچی
۹ـــــــ جامعہ زینب۔ کیمبلپور
۱۰ـــــــ نصرۃ العلوم۔ گوجرانوالہ
۱۱ـــــــ اشاعۃ العلوم۔ لائلپور
۱۲ـــــــ جامعہ اشرفیہ۔ لاہور
۱۳ـــــــ قاسم العلوم۔ ملتان
۱۴ـــــــ مدرسہ عربیہ۔ کراچی
۱۵ـــــــ خیرالمدارس۔ ملتان
۱۶ـــــــ جامعہ رشیدیہ ساہیوال
۱۷ـــــــ دارالعلوم۔ کراچی
۱۸ـــــــ مدرسہ تفہیم القرآن۔ نواب شاہ
۱۹ـــــــ جامعہ عباسیہ۔ بہاولپور

دیوبندی مسلک کے تمام مدارس کو، جن کی تعداد برصغیر میں پانچ ہزار سے کم نہیں ہوگی، دارالعلوم دیوبند ہی کی شاخیں تصور فرمائیے اور ان کے فارغ التحصیل طلباء کو فکری لحاظ سے دیوبندی ہی سمجھئے۔ اگر ہر مدرسے سے سال میں ۱۰ ہی طلباء تعلیم پاکر نکلے ہوں تو یہ سال میں ایک لاکھ اور سو سال میں ایک کروڑ بنتے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں مسلمانان ہند کا متاثر ہونا یقینی تھا۔

میرے دو بزرگ استاد

گھر میں ایم اے اور ڈاکٹریٹ کے بعد انگریزی تعلیم یافتوں میں شمار ہوتا ہوں، لیکن بنیادی طور پر میں دیوبندی کا ایک طالب علم ہوں میرے دو بڑے بھائی دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں

اوّل: محمد زاہد الحق: ولادت ۱۸۰۰ء، ضلع اٹک کے مختلف مدارس عربیہ میں تعلیم پانے کے بعد دورۂ حدیث کے لیے دیوبند تشریف لے گئے۔

فارغ ہوئے تو وہیں معلم بن گئے ۱۹۱۵ء تک کام کیا اور پھر واپس آگئے۔ یہاں آکر تین جگہ کام کیا۔ پہلے ضلع جہلم کے ایک مدرسے میں جو تحصیل پنڈ دادن خاں کے ایک قصبے ڈریالہ جالپ میں قائم ہوا تھا۔ ۷/۸ سال رہے۔ پھر پیر جھنڈا، سندھ کے دارالعلوم میں صدر مدرس بن کر چلے گئے۔ ۱۹۲۷ء میں وہاں سے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر بن کر آگئے۔ وہاں سے ۱۹۴۵ء میں ریٹائر ہوئے اور ۱۹۵۰ء میں وفات پاگئے۔

آپ اسلامی تاریخ، عربی ادب، رجال، حدیث اور تفسیر کے بہت بڑے عالم تھے۔ عربی زبان عام عربوں سے بہتر جانتے اور لکھتے تھے میں ان سے برسوں پڑھتا رہا اور بعد میں ان سے علمی مشکلات میں مدد لیتا رہا۔ میرے پاس ان کے چند طویل علمی خطوط محفوظ ہیں۔ ان کی صرف ایک ہی تصنیف طبع ہوئی تھی، یعنی شرح الکامل للمبرد

دوم: پروفیسر غلام ربانی عزیز۔ ایم اے۔ عربی و فارسی۔ مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل، جو پڑھے تیس برس تک کالجوں

میں پروفیسر اور پرنسپل رہے۔ فاضل دیوبند بھی ہیں۔

[illegible] میں وہ اور میں ۱۱/۱۲ برس تک مختلف درس گاہوں میں درس نظامی کی منزلیں طے کرتے رہے۔ وہ باقاعدہ دورۂ حدیث کے لیے ۱۹۱۰ء میں دیوبند چلے گئے اور میں یہیں رہ کر مستقل فقہ اور عربی ادب کی تکمیل کرتا رہا۔

پروفیسر عزیز کئی کتابوں کے مصنف، مترجم اور ... ان کی تاریخ خوارزم شاہی کے اردو اور انگریزی ایڈیشن زیر طبع ہیں۔ سیرت النبیؐ بھی ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے زیر غور ہے۔ آپ آفرین لاہوری، دلشاد پسروری، غنیمت کنجاہی اور واقف کے دیوان ایڈٹ کر چکے ہیں۔ بڑی محنت سے کام کرتے ہیں اور بہت ادیبانہ اسلوب تحریر کے مالک ہیں۔ آپ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے تھے اور تاحال (۱۹۷۰ء) ان کی صحت بہت عمدہ ہے۔ اللہ انھیں خدمت علم کے لیے دیر تک باقی رکھے

درس نظامی کی تکمیل [illegible] اور

۳- حیات

پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل کرنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں ہائی سکول ماسٹر ہو گیا اور انگریزی تعلیم شروع کر دی۔ ۱۹۲۲ء میں میٹرک کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ایم اے عربی، ۱۹۳۳ء میں ایم اے فارسی اور ۱۹۴۰ء میں عربی کی ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ مقالہ کا موضوع تھا "امام ابن تیمیہ"۔

ولادت ۲۹ اکتوبر ۱۹۰۱ء اور وفات کا منتظر

میرے اساتذہ

میرے اساتذہ درس نظامی میں سے درج ذیل حضرات دیوبندی تھے:

نام	سکونت	امتیاز	وفات
مولانا عبدالرؤف	رنگ آباد ضلع اٹک	فقہ، گرامر اور منطق میں مہارت	۱۹۵۱ء کے قریب
مولانا عبدالرحمٰن	پنڈی سرال " "	منطق، ادب اور فقہ میں مہارت	۱۹۵۴ء " "
مولانا قطب الدین	موز غشتی " "	منطق میں بہت قابل	۱۹۴۶ء " "
مولانا محمد حسن	گوجر خان	" " " "	۱۹۳۰ء " "
مولانا نجم الدین	ڈریالہ جالپ، ضلع جہلم	تفسیر، حدیث، ادب	۱۹۵۲ء " "
مولانا غلام مرشد	ڈنگہ، ضلع سرگودھا	خطیب، منطق، ادیب	ابھی بقید حیات ہیں

نوٹ: مولانا غلام مرشد صاحب کے بارے میں مجھے پورا یقین نہیں کہ وہ دیوبندی تھے، لیکن خیالات، عقائد اور فکر و نظر سے دیوبندی معلوم ہوتے تھے۔

★

جب ۱۹۱۲ء میں مصر کے شہرہ آفاق، مفکر و فلسفی علامہ رشید رضا ندوہ کے سالانہ جلسے میں شامل ہونے کے لیے تشریف لائے۔ تو انھوں نے دارالعلوم دیوبند کا بھی معائنہ فرمایا اور کہا:
"اگر میں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہو کر واپس جاتا۔"

(محمد اکرام: موج کوثر ص ۲۷۰)

★

کون ہے، جو علامہ کی اس رائے سے اختلاف کرے؟

کرامات اولیائے دیوبند

محمد دین شوق

کرامات اولیاء دیوبند کے بیان سے پہلے "نفس کرامت" کے متعلق حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک مختصر نوٹ پیش قارئین ہے۔

عقیدہ اہلسنت

علماء احناف کا یہ معروف مسلم عقیدہ ہے کہ جس طرح خداوند قدوس وحی کے ذریعے انبیاء علیہم السلام کو بہت سی غیبی اور مخفی حقائق سے مطلع فرماتا ہے اسی طرح ان کے سچے متبعین عباد اللہ الصالحین کو جن کو اولیاء اللہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے کشف الہام اور رویائے صالحہ صادقہ وغیرہ سے پوشیدہ امور کی اطلاع کبھی کبھی منجانب اللہ ہو جاتی ہے۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی جن حقائق و رموز سے آگاہ کیا جاتا ہے وہ مبنی بر حقیقت یقینی اور قطعی ہوتی ہیں اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی اور اولیاء اللہ کرام کا کشف یا الہام ایسا قطعی اور یقینی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں خود ان کو بھی کبھی غلطی اور خطا فہمی ہو سکتی ہے

تعریف کرامت

جس طرح باری تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کی صداقت ظاہر کرنے کے لیے ان کے ہاتھوں پر خوارق کا اظہار فرماتا ہے۔ جن کو معجزات کے نام سے پکارا جاتا ہے بالکل اسی طرح کبھی کبھار ان کے سچے عاشقین اولیاء اللہ کی مقبولیت و قرب کو ظاہر کرنے کے لیے ان کے ہاتھوں پر بھی خوارق ظاہر فرماتے ہیں۔ اور ان کو کرامت کہا جاتا ہے۔

باطل نظریات والے اگر ان خوارق کو علم غیب یا استمداد عن غیر اللہ کہیں یا سمجھیں تو یا سوائے جہالت کے کیا کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بات روز روشن کی طرح واضح اور ظاہر ہے کہ کسی ولی کے ہاتھ پر جو کرامت ظاہر ہوتی ہے۔ دراصل وہ اس ولی کا فعل اور تصرف نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل اور تصرف ہے ولی صرف اس کا مظہر ہوتا ہے۔

(انہی اولیاء کرام کی صفوں میں سے علماء دیوبند کا ایک خاص حصہ ہے اس سے پہلے کہ اولیاء دیوبند کی کرامات نقل کروں کرامت کی اقسام کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ کرامت دو قسم کی ہوا کرتی ہیں)

کرامت معنوی

آدمی کا کوئی فعل خلاف شرع واقع نہ ہو۔ کبیرہ کو بجائے صغیرہ سے بھی احتراز کرے اور متبع رسالت کا نمونہ ہو۔

کرامت حسی

یعنی مافی الضمیر سے مطلع ہونا۔ پانی پر چلنا۔ ہوا پر اڑنا اشیاء

خوردنی کا بڑھنا۔ آواز کا دور تک پہنچنا اور رستہ وغیرہ عوام لوگ اسی کو کمال شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت کمال کرامت معنوی ہے۔ یعنی شریعت مستقیم پر رہنا، علوم و اخلاق کا خوگر ہونا، نیک کاموں کا پابندی اور بے تکلفی سے صادر ہونا، حسد و کینہ اور دیگر صفات مذمومہ سے قلب کا ظاہر ہونا۔

حدِ کرامت

بعض علماء نے کرامت کی قوت ایک خاص حد تک معین کی ہے اور جو امور نہایت عظیم ہیں۔ جیسے بدون والد کے اولاد پیدا ہونا یا کسی جماد کا حیوان بن جانا یا ملائکہ کا باتیں کرنا اس کا صدور کرامت سے ممتنع قرار دیا ہے۔ مگر محققین کے نزدیک کوئی حد نہیں۔ کیونکہ جو فعل پیدا ہوا ہے وہ منجانب اللہ ہے۔ صرف ولی اللہ اس کا مظہر ہے تاکہ ولی کا قرب معلوم ہو اور مقبولیت خداوندی ظاہر ہو۔ جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کوئی حد متعین نہیں پھر حد کرامت کیسے متعین ہو سکتی ہے۔

یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ معجزہ کے ساتھ مساوات لازم آئے گی۔ اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب صاحب کرامت خود یہ کہتا ہے کہ میں نبی کا غلام و خادم ہوں تو جو کچھ اس سے ظاہر ہوا ہے بہ تبعیت اس نبی کے ہے استقلالاً تو نہیں لہٰذا یہ احتمال بالکل ہیچ ہے۔ ہاں البتہ جس خرق عادت کی نسبت پیغمبر خدا کا ارشاد ہو کہ اس کا صدور و ظہور مطلقاً محال ہے۔ وہ بطور کرامت کے بھی سرزد نہیں ہو سکتا۔ جیسے قرآن مجید کا مثل لانا۔

اظہارِ کرامت

اکابر نے فرمایا ہے کہ اپنی کرامت کا اخفاء پوشیدہ رکھنا واجب ہے مگر جہاں اظہار کی ضرورت ہو یا غیب سے اذن ہو یا حالت اس قدر غالب ہو کہ اس میں قصد و اختیار باقی نہ رہے یا کسی طالب حق و مرید کے یقین کی تقویت مقصود ہو وہاں پر اظہار جائز ہے۔

ہاں البتہ بعض اولیاء کا مقام تفویض و عبودیت و فنا کا ہوتا ہے اس لیے کسی شے میں وہ تصرف نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے ان کی کرامتیں کم معلوم ہوتی ہیں۔ اور بعضوں کو تو سرے سے تصرف ہی عنایت نہیں ہوتی۔ تسلیم و تفویض ہی ان کی کرامت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ولایت کے لیے کرامت کا وجود لازمی نہیں۔"

علمِ کرامت

کرامت کے لیے نہ اس ولی کو اس کا علم ہونا ضروری ہے اور نہ اس کے قصد و ارادہ کا متعلق ہونا ضروری ہے۔ کبھی علم ہوتا ہے اور قصد نہیں۔ اور کبھی علم و قصد دونوں امر ہوتے ہیں۔

بنا بریں کرامت کی تین قسمیں ہوتی ہیں

نمبر ۱: جس کا علم بھی ہو اور قصد بھی ہو۔ جیسے حضرت فاروق اعظمؓ کے فرمان مبارک سے نیل کا جاری ہونا۔

نمبر ۲: جس کا علم ہو قصد نہ ہو۔ جیسے مریم علیہا السلام کے پاس بے فصل میووں کا آجانا۔

نمبر ۳: جہاں علم و قصد دونوں نہ ہوں۔ جیسے ابوبکر صدیقؓ کا مہمانوں کے ساتھ کھانا کھانا اور کھانے کے وقت کھانے کا دو چند اور زیادہ ہو جانا۔ چنانچہ خود حضرت ابوبکر صدیقؓ کو تعجب ہوا جس سے ان کے علم و قصد کا متعلق نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

پہلی قسم پر لفظ تصرف و ہمت کا اطلاق ہوتا ہے اور دوسری و تیسری پر برکت و کرامت کا اس کو تصرف نہیں کہا جاتا (منقول از کرامات امدادیہ حضرت تھانویؒ)

حرفِ مطلب

اب اولیاء و صلحاء دیوبند کی چند کرامات نمونہ مشتے از خروارے نقل کی جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے برصغیر میں کتاب و سنت کی تعلیم عام ہوئی مگر

وہ جہالت کی تاریک گھاٹیوں سے عوام الناس کو نکال کر صراط مستقیم پر آئے ہیں پھر سید الطائفہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کا نام نامی آتا ہے جن کی وجہ سے یہ شمع روشن ہوئی اور کروڑوں انسانوں نے دیوبند کے فیض سے اپنی سوئی ہوئی قسمت کو جگایا۔ علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا۔

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں
تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

کرامات حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ مرقدہ

آؤ ذرا سیر کریں (مدینے کی)

مولوی محمد اسماعیل صاحب روایت کرتے ہیں کہ حضرت مولانا احمد حسن صاحب نے فرمایا کہ اب جو میں حج کے لیے بیت اللہ شریف گیا تھا تو ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنا قصہ سرگذشت بیان کیا کہ میں جب مدینہ منورہ میں گیا۔ وہاں چند روز تک رہا۔ چند روز کے بعد حضرت سرور کائنات ختم الرسل محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو طواف میں دیکھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم خاندان صابریہ کے مرید ہو جاؤ یہ ناچیز حسب ارشاد مکہ معظمہ میں ایک بزرگ سے مرید ہوا اور حاجی صاحب کی خدمت میں آیا کرتا تھا۔ ایک روز چونکہ بہت بے تکلفی ہو گئی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ مکہ معظمہ سے ایک ایسا راستہ ہے کہ اگر انسان ظہر کی نماز پڑھ کر چلے تو مدینہ منورہ میں عصر کی نماز پڑھ کر مغرب کی نماز مکہ معظمہ میں واپس آکر پڑھ سکتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے تو معلوم نہیں چونکہ میں بہت بے تکلف تھا عرض کیا کہ جب آپ کو یہ معلوم نہیں تو یہاں مکہ معظمہ میں رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کہہ کر چلا آیا۔

چند روز کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ آؤ ذرا سیر کر آئیں۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ مبارک میں لے کر باہر چلے ایک پہاڑ پر چڑھے اور اس سے اترتے ہی مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ وہاں نماز پڑھ کر تیسری نماز مکہ معظمہ میں واپس آکر پڑھی۔ میں نے اپنے جی میں خیال خام کیا کہ اب تو راستہ معلوم ہی ہو گیا ہے۔ ہمیشہ جایا کریں گے حاجی صاحب کی کیا ضرورت ہے جب وہ اپنے خیال خام کے اس راستے سے جانا چاہا تو اس پہاڑ پر چڑھا ہی نہ جا سکا مولوی احمد حسن صاحب نے کہا کہ بھئی ہم تو تنا روپیہ خرچ کر کے مدینہ طیبہ گئے اگر ہم کو پہلے معلوم ہوتا تو ہم بھی حضرت حاجی صاحب سے عرض کرتے۔

(ماخوذ از کرامات امدادیہ)

آسیب دور

ایک روز نصف شب کے قریب ایک سفید باف آیا اور آپ کو جگا کر عرض کیا کہ حضرت میری لڑکی کو آسیب کی خلش سے بہت تکلیف ہے آپ تشریف لے چلیں اور اس کا علاج فرما دیں۔ اسی وقت آپ اس کے ہمراہ گئے وہاں جا کر دیکھا کہ میاں اللہ بخش اس کے سر پر موجود ہیں۔ انہوں نے آپ کو سلام کیا اور کہا کہ آج اس نے اپنی زبان سے ایسے ایسے کلمات ہماری نسبت کہے تھے۔ اس لیے ہم یہاں آ گئے تھے۔ آپ تشریف لے آئے ہیں ہم جاتے ہیں اور پھر کبھی یہاں نہ آویں گے۔ آئندہ آپ کسی کی درخواست پر ایسے وقت تشریف نہ لایا کریں۔ صرف ایک پرچہ اس کے ہاتھ بھیج دیا کریں میں اس کی تعمیل کیا کروں گا۔ مجھ سے آپ کی یہ تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ پھر جب کبھی ایسی شکایت ہوتی۔ آپ ایک پرچے پر اپنا نام نامی لکھ کر دے دیتے وہ شکایت رفع ہو جاتی تھی۔

مفرور کی واپسی

بعض لڑکے بلا اطلاع کہیں چلے جاتے اور ان کے رشتہ دار پریشان ہوتے

حضرت سے دو پہر جس وقت کسی لڑکے کے چلے جانے کا ذکر آتا حضرت اسی وقت دستک دے دیتے، وہ لڑکا جس جگہ اس وقت ہوتا تھا اس سے آگے نہ بڑھتا۔ وہاں سے واپس اپنے گھر چلا آتا۔ آپ فرمایا کرتے کہ جس وقت فرار کا حال معلوم ہوا کرے فوراً بیان کر دیا کریں، جس قدر جلدی بیان کر دیا جاوے گا اتنا ہی جلدی وہ لڑکا واپس آجاوے گا اور جس قدر دیر کی جائے گی اتنی ہی دیر سے واپس آوے گا۔ (ایضاً)

کیا خط نہیں آیا؟

ایام حج میں حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ مولوی اشرف علی صاحب کا خط نہیں آیا۔ احقر نے جواب دیا کہ حضور اس وقت تک تو نہیں آیا۔ آپ نے فرمایا کہ آنا چاہتا ہے یا آیا۔ اسی وقت جب حرم محترم میں بندہ پہنچا ڈاک والا حضرت تھانوی کا خط لے کر آیا۔ (ایضاً)

طعام میں برکت

ایک دفعہ شیخ احمد مجاہد نے حضرت حاجی صاحب اور چند معززین مشائخ کی جمعہ کے روز دعوت کی حضرت نے قبول فرمالی۔ جب حضرت اعلیٰ مدعو تشریف فرما ہوئے تو بہت سے لوگ آپ سے ملنے کی غرض سے جمع ہو گئے۔ مجاہد صاحب نے دروازہ مکان کا بند کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس جلسہ میں مولوی محمد اسماعیل والد ماجد نواب صاحب مرحوم اور مولوی محمد سعید صاحب اور قاری عبداللہ صاحب وغیرہم شامل تھے۔ انبوہ کثیر کو دیکھ کر مجاہد صاحب بہت پریشان ہوئے اور دوسری دفعہ کھانا پکانے کا ارادہ کیا۔ حضرت اعلیٰ نے احقر سے ارشاد فرمایا کہ مجاہد صاحب کو بلا دو وہ حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ کھانا پکانے کی حاجت نہیں جو ہے اس وقت اہل دعوت کو کھلا دو۔ اور اس مجلس کو آخر میں رکھو۔ مجاہد صاحب قدموں پر گر پڑے اور کہا یا حضرت یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سے پہلے لوگوں کو کھانا کھلاؤں۔ آپ نے فرمایا کچھ مضائقہ نہیں اور اسی میں میری خوشی ہے: بموجب حکم (ولا عطر فوق العروس) مجاہد صاحب نے ایسا ہی کیا۔ ستر آدمی تک کھانا تین سو آدمی نے کھایا۔ لیکن مجاہد صاحب نے آخر میں گھر جا کر دیکھا [illegible] آخر میں دو ہی روٹیاں بچ گئیں۔ (روایت مولوی قاری اسحٰق، از کرامات امدادیہ)

درد دور ہوگیا

میں ایک بار رام پور میں حضرت حاجی صاحب کے ہمراہ تھا وہاں میری ٹانگوں میں شدت سے درد پیدا ہو گیا کہ کسی طرح قرار نہ ہوتا تھا اور درجہ بیتاب ہو گیا۔ میری یہ حالت دیکھ کر حضرت میرے پاس تشریف لائے اور باصرار مجھ کو چت لٹا کر ایک ٹانگ میری حضرت نے اپنے ہاتھوں میں لے کر اور دوسری ٹانگ حضرت مولانا ممدوح نے دبانا شروع کی۔ میں اس وقت لیٹے دل میں بہت شرمندہ ہوا اور اسی وقت درد بالکل جاتا رہا۔ (ایضاً)

زیارت کرنا

حضرت حاجی صاحب کبھی کبھی جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب کی ملاقات کے لیے جنگل میں تشریف لے جاتے اور پہلے سے بہت آدمی حافظ صاحب کی تلاش میں جمع ہو کر منتظر بیٹھے رہتے اور آپ کسی سے نہ ملتے۔ جس وقت حاجی صاحب وہاں پہنچتے فوراً کسی جھاڑی میں سے نکل آتے اور ملاقات کرتے اور بہت نرمی اور ہنسی مذاق کی باتیں کرتے اور پھر رخصت ہو جاتے۔

(منقول از کرامات امدادیہ)

کرامات حضرت گنگوہیؒ

ہاتھ جھٹک دیئے

ایک دفعہ ایک نابینا شخص پا پیادہ میرٹھ سے گنگوہ پہنچا اور کہا کہ السلام

بیٹھتا ہے۔ اہلِ خانقاہ اس کے عاشقانہ شوق سے بہت متاثر ہوئے اور خوب خاطر مدارات کی۔ حضرت مسجد میں تشریف لائے۔ اس نے مصافحہ کرنا چاہا تو آپ نے ہاتھ کھینچ لیا اور بڑی لاپروائی سے علیحدہ کر دیا۔ ہر چند کہ اپنی طلب کا سچا ہونا اور مسافت دراز سے زیارت کا مشتاق آنا ظاہر تھا مگر حضرت نے مطلق التفات نہ فرمایا۔ اہلِ خانقاہ کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ کیا ہو رہا ہے مگر کسی کو کچھ پوچھنے یا کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بعض مخصوصین نے بالآخر سفارش کر ہی دی تو آپ کو یہ بات ناگوار گزری اور غصے سے فرمایا۔

" جب تمہیں دخل نہیں تو اس کام میں بولا کیوں کرتے ہو۔ اس کے قلب کو تو دیکھو دنیا بھری پڑی ہے "

خیر وہ نابینا چلا گیا۔ دس بارہ روز کے بعد عرس تھا۔ کسی نے دیکھا قوالی میں خوب حال کھیل رہا ہے۔ جس نے خانقاہ میں اس کا اور شوق حضرت کے متعلق دیکھا تھا پوچھا کہ میاں حضرت کے ساتھ شوق و ولولہ کہاں گیا" وہ نابینا بیچ آنکھ اٹھا کہنے لگا ـــ بھلا وہ تو بارہ دن کے دھندے میں خیال تھا تمہارے میاں صاحب پر سکہ جم جائے گا تو خوب آؤ بھگت ہوگی عرس تک دن نکال لوں گا۔ پھر عرس میں حال قال میں برم بندھے گا۔ باقی کیسا شوق اور کیسی تمنائے زیارت "ہم تو سیلانی قسم کے آدمی ہیں یوں ہی دن گزارتے پھرتے ہیں۔

نے خادم نہ کسی نہ مخدوم کسے
گر شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

(بیس بڑے مسلمان) ص ۲۲۱

اچھا جلدی کیا ہے

افسر الاطباء حکیم احمد سعید امروہی بیعت ہونا چاہتے تھے مگر کسی جگہ نظر نہ جمی اسی خیال سے گنگوہ حاضر ہوئے۔ حضرت کے کمال اتباع سنت کو دیکھ کر عقیدت پیدا ہوئی مگر پھر خیال یہ ہوا کہ جب تک ادھر ہی سے طلب

کی کشش نہ ہو بیعت نہ کروں گا کئی دن کے قیام میں مروت پسندیدہ اور اخلاق حمیدہ دیکھ کر ارادہ کر ہی لیا۔ بعض خدام کے واسطے سے درخواست کی حضرت نے صاف انکار کر دیا کہ نہیں بیعت نہیں کروں گا۔ بڑے لوگوں کو مرید بنا کر جان کو آفت میں ڈالنا ہے۔ کوئی سفارش کراتا ہے۔ کوئی الزام لگاتا ہے۔ غرض ٹھیک نہیں۔

حکیم صاحب بڑے افسردہ ہوئے کہ مجھ میں یہ قابلیت نہیں کہ مرجع خلائق اور کامل رہبر کی دست بوسی نصیب ہو۔ اب اسی افسوس میں کئی دن گزر گئے آخر ایک دن حضرت کو حجرہ میں تنہا دیکھ کر اندر چلے گئے۔ اور عرض کیا کہ حضرت مجھ کو محرومی کی امید نہ تھی۔ گو میں ناقابل ہوں مگر حضرت تو سب قابل ہیں حضرت نے ہنس کر فرمایا: "اچھا جلدی کیا ہے۔ ابھی اپنے قلب کا اطمینان کر لو" حکیم صاحب اپنے وسوسہ پر بہت نادم ہوئے اور معذرت کی۔ آپ نے فرمایا نہیں نہیں بیعت سے پہلے انسان کو ہر طرح سے قلب مطمئن کر ہی لینا چاہیے۔

اے بسا ابلیس آدم روئے است
پس بہر دستے نباید داد دست

بالفعل تم واپس جاؤ اور اپنا کام شروع کرو۔ حق تعالیٰ برکت دے گا۔ وہ واپس گئے تو قلب پُر سکون، بے چینی دور اور افسر الاطباء اور دینا و دین کی برکات سے مالامال۔ (ایضاً) ص ۲۲۳

دو رکعت پڑھو

ایک مرتبہ دو اجنبی شخص آئے سلام و مصافحہ کے بعد بیعت کی تمنا ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا: "دو رکعت پڑھو" حضرت کے اس ارشاد پر تھوڑی دیر تو دونوں صاحب گردن جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر چپکے سے اٹھ کر چلے گئے۔ جب دروازے سے باہر ہوئے تو حضرت نے فرمایا دونوں شیعہ تھے۔ میرا امتحان لینے آئے تھے۔ حاضرین میں سے بعض آدمی اس کی تحقیق کو ان کے پیچھے گئے اور معلوم کیا تو واقعی رافضی تھے (ایضاً) ص ۲۲۳

جائے میں برکت

مولوی شریف حسین دہلوی جو حضرت کے شاگرد تھے

حضرت کے دربار تشریف لانے پر ایک ساہوکار میں بڑی عمدہ چائے بنا کر بڑے شوق سے لائے۔ دیکھا تو بیٹھک اشخاص سے بھری ہوئی تھی۔ سوچتے رہے کہ کس کو دوں اور کس کو نہ دوں۔ آخر یہ سوچ کر کہ خاص خاص حضرات کو پلا دیتا ہوں دہلیز پر بیٹھ کر پلانے لگا تو حضرت نے ارشاد فرمایا مولوی شریف حسین ایک طرف سے پلانا شروع کر دو۔ وہ پریشان تو ہوئے لیکن تعمیل ارشاد میں دائیں ہاتھ سے تقسیم کرنا شروع کر دی۔ تقریباً پچیس آدمی کا مجمع موجود تھا۔ سب نے چائے پی لی تو ساہوکار کھول کر دیکھا تو اس میں ابھی چائے موجود تھی۔ حالانکہ برتن صرف چھ پیالی کا تھا۔

(ایضاً) ص۲۲۲

بادل کا پھٹنا

حضرت کا معمول تھا کہ ہر روز ۱۲ بجے دوپہر کو حجرہ کی گھڑیاں دھوپ گھڑی سے ملاتے تھے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ متواتر کئی دن ابر محیط رہا اور دھوپ نہ نکلی ایک دن دھوپ نکلی تو اس طرح کہ کبھی دھوپ کبھی بادل۔ حضرت بارہ بجے سے کچھ قبل گھر سے تشریف لائے اور مولوی علی رضا سے کہا کہ جب بارہ بجیں مجھے خبر کرنا۔ اور خود قریب ہی ایک جگہ لیٹ گئے۔ جب آئے تو دھوپ تھی۔ لیکن جس وقت سایہ خط کے قریب (۱۲ کے خط کے قریب) پہنچنے لگا تو دفعتاً ایک بہت بڑا بادل سورج پر چھا گیا۔ گھبرا کر عرض کیا گیا کہ حضرت دھوپ چھپ گئی ہے۔ آپ اٹھ کر دھوپ گھڑی کے پاس آگئے۔ آپ کا آنا تھا کہ بادل درمیان سے پھٹ گئے۔ آپ نے گھڑی ملائی اور حجرہ میں تشریف لے گئے۔ یا تو ایسا تھا کہ ابھی دس بارہ منٹ آفتاب نہ نکلے گا۔ یا آپ کے آتے ہی آفتاب کے منہ پر سے ابر کھل گیا اور ایسا ہو گیا جیسے کوئی بقوت منہ کو نکال کر جھروکے سے جھانکنے لگے۔ (ایضاً) ص۲۲۲

مرزا قادیانی کی گمراہی کی خبر

مرزا غلام احمد قادیانی جس زمانے میں براہین لکھ رہا تھا اس کا اخبارات میں چرچا ہو رہا تھا۔ اس وقت تک ان کو حضرت امام ربانیؒ سے عقیدت تھی۔ اس طرف جانے والوں کو پوچھا کرتے تھے کہ مولانا اچھی طرح ہیں! دہلی سے گنگوہ کتنے فاصلے پر ہے وہ راستہ کیسا ہے وغیرہ۔ اسی زمانے میں حضرت نے ایک سفر ارشاد فرمایا کہ کام تو یہ شخص اچھا کر رہا ہے، مگر پیر کی ضرورت ہے ورنہ گمراہی کا احتمال ہے۔ اس کے بعد ہی مجددیت، مہدویت، عیسویت کے خیالات ظاہر ہونے شروع ہو گئے اور نبوت کا دعویٰ کیا۔ (ایضاً) ص۲۲۳

"ہمارا اسلام کہہ دینا"

مولوی عبدالسبحان صاحب انسپکٹر پولیس گرفتار ہوکے ایک تحصیلدار کے دست برخاست کرا دیئے گئے۔ خاصی کوشش کی دوبارہ تقرری ہو مگر ناکامی ہوئی۔ بالآخر دعا کے لیے گنگوہ پہنچے۔ حضرت نے فرمایا۔ تمہارے وطن کے قریب جو ریلوے اسٹیشن ہے وہاں ایک مجذوب فقیر رہتے ہیں۔ ان سے ہمارا سلام کہہ دینا۔ تحصیلدار صاحب کچھ کشل دیا۔ دل برداشتہ ہوکر واپس ہو گئے اور فقیر کے پاس بھی نہ گئے۔ کچھ دنوں کے بعد اتفاقیہ ادھر سے گزر ہوا تو فقیر مجذوب بیٹھا ہوا تھا۔ دور ہی سے ان کو دیکھ کر فقیر نے کہنا شروع کیا "بابا مولوی صاحب نے بھیجا ہے۔ جا جا پہاڑ پر چڑھ جا" یہ سن کر انہوں نے حضرت کا سلام تو پہنچا دیا۔ مگر رنجیدہ و مغموم یہ سوچتے ہوئے مکان کو واپس ہوئے کہ مولانا نے یوں ٹالا اور فقیر نے اس طرح ٹالا۔ کام کچھ بھی نہ ہوا۔ اسی کشمکش میں تحصیلدار صاحب مکان پر پہنچے تو حکم آیا ہوا تھا کہ تم بحال کئے گئے۔ اور نینی تال کا تبادلہ ہوا۔ (ایضاً ص۲۲۳)

شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کے حکم سے بیعت

حضرت منشی علی صاحب جالندھری خلیفہ ارشد حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ حضرت گنگوہیؒ کے بیعت ہوئے تھے۔ ان کو جب شیخ کی تلاش ہوئی تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی خواب میں زیارت ہوئی اور انہوں نے فرمایا کہ گنگوہ جاؤ اور مولوی رشید احمد سے بیعت کرو۔ چنانچہ حضرت منشی صاحب حضرت کے بیعت ہوگئے (ایضاً ص۲۲۳)

کرامات حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سہارنپوری

کی وجہ سے درد رہتا جس کی وجہ سے کل دن اور رات بھر تکلیف ہی اور اس وقت تو درد اور کرب کا ٹھکانا ہی نہیں۔ حضرت کو کچھ بتا دیں فرمایا بھائی مجھے کچھ نہیں آتا نہیں معلوم اللہ کا نام آتا ہے۔ پھر تو پڑھ دوں درد کسی حال کو تکلیف کرو انہوں نے معافی مانگی اور عرض کیا حضرت عجلت میں زبان سے نکل گیا مقصود صرف دعا کرانا تھا۔ آپ نے پانی منگا کر اس پر دم کیا اور ان کو دے دیا۔ وہ کہتے تھے کہ وہ پانی دفتر کے پاس سے مریضہ کی تکلیف رفع دفع ہوگئی اور وہ آرام سے ہوگیا۔ پانی پر دم کرنے کے بعد آپ اس میں سے ایک گھونٹ خود پی لیا کرتے تھے تاکہ شور زیں جانے جس کو آنحضرت نے شفا فرمایا ہے۔ (تذکرۃ الخلیل)

مفرور واپس آگیا

حافظ فخر الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ ایک نوجوان لڑکا اپنے والدین سے بیزار ہو کر گھر سے نکل گیا اور مدت سے پتہ نہ تھا کہ کہاں ہے۔ اس کی ماں بیحد پریشان تھی۔ میں نے حضرت کی خدمت میں لکھا تو آپ نے ایک آیت تحریر فرمادی کہ اس کو مکان میں کسی اونچی جگہ لٹکا دیں یا رکھ دیں۔ چنانچہ ایسا کیا گیا اور دوسرے تیسرے دن لڑکا آگیا اور کہنے لگا دو روز سے طبیعت بے چین تھی کہ کسی طرح گھر چلا کر ماں سے ملوں۔ آج بازار میں کسی ضرورت کی غرض سے نکلا تھا کہ بے اختیار اسٹیشن کی طرف کو ہولیا اسی وجہ سے نہ کوئی سامان سفر ساتھ ہے نہ کپڑے بدل سکا۔ (تذکرۃ الخلیلؒ)

کرامات حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمۃ اللہ علیہ

کھانے میں برکت

مولانا عبد السمیع صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند نے مشکوٰۃ شریف کے درس کے دوران حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا ایک واقعہ سنایا تھا کہ میں نے ایک دن حضرت مدنیؒ کی دعوت کی تھی۔ اتفاق سے اس وقت مہمان متوقع تھے۔ حضرت شیخ نے دعوت قبول فرمالی۔ جب کھانے کا وقت قریب آیا تو مہمان زیادہ آگئے۔ حضرت مدنی تمام مہمانوں کے ساتھ ... مولانا عبد السمیع صاحب کے مکان پر تشریف لے آئے۔ مہمانوں کی کثرت دیکھ کر میں پریشان ہوا۔ جس کو حضرت نے محسوس فرمالیا اور مجھے علیحدہ لے گئے میں نے تمام صورت حال حضرت کے سامنے رکھ دی اور گذارش کی کہ اتنی دیر ٹھہریں کہ کھانے کا انتظام کرلوں۔ حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ یہی کھانا کافی ہو جائے گا۔ چنانچہ آپ کے ارشاد کے مطابق تمام روٹی و ترکاری آپ کے پاس لاکر رکھ دی گئی۔ مگر ان پر ایک کپڑا ڈھک دیا گیا۔ اب حضرت شیخ اپنے ہاتھ سے کھانا نکال نکال کر دیتے رہے۔ مولانا عبد السمیع صاحب قسم کھا کر فرماتے تھے کہ دو بھی کھانا سب کو کافی ہوگیا گھر والوں نے بھی کھا لیا اور کچھ بچ بھی رہا۔ (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص۲۱۲)

پھولوں میں تروتازگی

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے داماد مولانا رشید الدین صاحب حمیدی روایت کرتے ہیں کہ مولوی شوکت علی مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے پٹنہ کے پھول لائے۔ ایک بوتل میں پانی بھر کر پھول اس میں ڈال دیئے گئے۔ اس طرح خوشنما بھی معلوم ہوتے ہیں اور ان کی عمر بھی چند ماہ ہو جاتی ہے۔ یعنی چار ماہ تک پژمردہ نہیں ہوتے۔

حضرت نے اس ہدیہ کو مسرت سے قبول فرمایا اور حکم دیا کہ بوتل اُن کے کمرے میں میز پر رکھ دی جائے۔ چار ماہ کی بجائے تین سال اور تین ماہ گزر گئے تھے پھول اسی طرح تروتازہ تھے۔ ان کی تازگی و شگفتگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا مگر افسوس ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء[1] کے حادثہ جانکاہ کی تاب وہ بھی نہ لاسکے اور دفعۃً ان کی تازگی پژمردگی سے بدل گئی۔ وہ سارے پھول سیاہ ہوگئے حتیٰ کہ پانی میں بھی سیاہی کا اثر ہوگیا۔ (ایضاً ص۱۹۵)

[1] وفات کا دن

سر پر بادل کا سایہ اور بارش میں سوکھے

حضرت مولانا سید الیاس صاحب مدظلہ صدر شیخ الحدیث مدرسہ ... نے فرمایا کہ ریاست علی خاں صاحب مرحوم ساکن ... ضلع ... آباد نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں اور مولانا ... پر ضلع ... جا رہے تھے۔ تینوں گھوڑوں پر سوار تھے۔ گرمی کی شدت زوروں پر تھی۔ اسی پریشانی کی حالت میں میں نے حضرت مولانا سے عرض کیا کہ حضرت دھوپ کی شدت سے سخت پریشانی ہے۔ حضرت مولانا خاموش رہے۔ تھوڑی دیر میں میں نے دیکھا کہ ایک ٹکڑا ابر کا آیا اور چلتے چلتے ہم لوگوں پر سایہ فگن ہو گیا۔ اور نہایت آرام سے ہم لوگ چلنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ دور سے بادل آ رہا ہے۔ میں نے حضرت مولانا سے عرض کیا کہ حضرت وہ دھوپ ہی اچھی تھی اب تو بھیگتے ہوئے سسرال پہنچیں گے۔ حضرت مولانا پھر خاموش رہے یہاں تک کہ بادل سر پر آ گیا لیکن خدا کی قدرت سے چاروں طرف پانی برس رہا تھا۔ گھوڑے سہانی میں چل رہے تھے لیکن ہم لوگوں پر پانی کا کوئی قطرہ نہیں پڑ رہا تھا۔

(حکایات و عملیات صفحہ ۴)

ضرور کوئی بات ہے

مولانا متین احمد صاحب ناظم جامعہ رشیدیہ ساہیوال والے فرماتے ہیں کہ میرے طالب علمی کے زمانے میں ہی ایک دن مجھے حضرت اقدس رائپوری کا ارشاد ملا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب ... کہ حضرت کا ... لانے والے ہیں۔ مگر خواہش یہ ہے کہ حضرت مدنی کو ہمارے آنے سے قبل اطلاع نہ ہو اور یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ حضرت مدنی اس جمعہ کو دیوبند تشریف فرما ہوں گے یا نہیں۔ آپ چپکے سے معلوم کر کے جواب دیں۔ اس خط کے بعد میں حسب معمول نماز عصر کے بعد حضرت مدنی کی خدمت میں گیا۔ جب مجلس برخاست ہونے لگی تو میں نے عرض کیا۔ حضرت آپ اس جمعہ کو قیام رکھیں گے یا سفر پر ہوں گے فرمایا کیوں بھائی۔ میں تو نہیں ہوں عرض کیا۔ حضرت ... اللہ ... پوچھ رہا ہوں، مگر حضرت نے فرمایا نہیں "ضرور کوئی بات ہے" مجھے خیال ہوا کہ حضرت کو ضرور کوئی بات کھٹک رہی ہے اسی لیے خلاف عادت اصرار فرما رہے ہیں۔ مجبوراً حضرت رائپوری کا خط سامنے کر دیا۔ حضرت مدنی نے خط کو پڑھ کر نہایت ادب و احترام سے آنکھوں سے لگایا پیشانی پر لگایا پھر فرمایا میں خود جواب تحریر کروں گا۔ میں نے عرض کیا حضرت وہ تو سوال فرمائیں گے کہ ... سے کام نہ لیا۔ اس پر حضرت مدنی نے فرمایا۔ اچھا لکھ دو کہ اس جمعہ کو قیام ہوگا۔ اور پھر مجھے فرمایا اگر جانا بھی ہوا تو نہیں جاؤں گا۔

(از چند علماء حق: سید امین گیلانی)

کرامات حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری

کھانا پھر بھی بچ گیا

حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی نے ایک مجلس میں واقعہ سنایا کہ حضرت اقدس ایک دفعہ شجاع آباد تشریف لائے۔ حضرت کے ہمراہ کچھ اور حضرات بھی تھے۔ میں نے مہمانوں کے اندازے کے مطابق کھانا پکوایا۔ مگر کھانے کے وقت تک بہت سے احباب جمع ہو گئے۔ اب مجھے پریشانی لاحق ہوئی کہ طعام کم اور انام زیادہ۔ حضرت پر میری پریشانی منکشف ہو گئی۔ مجھے بلا کر فرمایا پھر اپنا رومال دے کر فرمایا کہ کھانے کے برتن کے منہ پر ڈال دو اور بسم اللہ پڑھ کر کھانا تقسیم کرنا شروع کر دو۔ اللہ میاں برکت دیں گے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں میں نے ایسا ہی کیا۔ تمام حاضرین کو کھانا کھلا دیا گیا لیکن کھانا پھر بھی بچ گیا۔ (چند علماء حق)

حق بحقدار رسید

رانا نور محمد صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ رائپور حضرت کی خدمت میں گیا۔ وہاں میری رقم گم ہو گئی۔ مسافر تھا پریشانی لاحق ہوئی۔ مگر خاموش رہا لیکن ایک صاحب نے حضرت سے کہا کہ کسی کی رقم ملی ہے۔ میں ابھی چپ تھا کہ حضرت نے فرمایا۔ نور محمد کو دے دو جس کی ہو گی اسے دے دیں گے۔ ان صاحب نے رقم

نکلے تھے وہی۔ پھر میں نے کہا میری ہی ہے۔ (چند علماء حق، سید امین گیلانی)

کیلے کھانے کا شوق

حاجی محمد الشفیع صاحب انبالوی (جو قصبہ منچ پار تحصیل شکر گڑھ میں مقیم ہیں) نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ان کے ایک رشتہ دار کسی اللہ والے کی تلاش میں تھے۔ جس شخص کی شہرت سنتے وہ اسے دیکھنے کے لیے جاتے۔ انہوں نے اللہ والے کی پہچان کا ایک خود ساختہ معیار بنا رکھا تھا۔ اس لیے ہر جگہ سے مایوس لوٹتے۔ میں نے حضرت رائے پوری کا ذکر کیا تو کہا چلو ان کو بھی دیکھ لیں۔ اگر میرے نظریے کے مطابق بات ہوئی تو مان لیں گے کہ اللہ کے ولی ہیں اور بیعت کر لیں گے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم کس نظریہ پر پرکھو گے۔ کہا جب تک کوئی کرامت نہ دیکھ لوں طبیعت مطمئن نہیں۔ میں نے کہا کیسی کرامت دیکھنا چاہتے ہو۔ کہنے لگا آج کل کیلے کا موسم نہیں ہے۔ اگر آپ کے حضرت کیلے کھلا دیں تو مان جائیں۔ یہ بات سن کر میں نے اسے سمجھانا چاہا، مگر وہ اپنی بات پر بضد رہا۔ خیر جب حضرت کے ہاں پہنچے ابھی تھوڑی دیر بیٹھے ہوں گے کہ ایک صاحب تحفۃً کیلوں کا ایک گچھا لیے ہوئے آ گئے اور حضرت کی نذر کیے۔ حضرت نے فرمایا بھئی مجھے تو شوق نہیں۔ اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا انہیں دے دو۔ انہیں کیلے کھانے کا شوق ہے۔ چنانچہ حضرت نے وہ کیلے انہیں دے کر فرمایا۔ لو بھئی کھاؤ۔ جو بچیں وہ ساتھ لے جانا۔ یہ واقعہ دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے اور سرِ عقیدت جھکانا ہی پڑا۔ (ایضاً)

غالیچہ

جناب سعید الرحمن صاحب لدھیانوی ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ نے ایک واقعہ بتایا کہ [illegible] میں جب حضرت پاکستان تشریف لائے تو مولانا غلام رسول صاحب جو حضرت کے اجل خلفاء میں سے تھے کی خواہش اور اصرار پر شیخوپورہ تشریف لے آئے اور خوش قسمتی سے ہمارے مکان پر ہی قیام فرمایا۔ جب حضرت ہمارے غریب خانہ پر تشریف لائے۔ اس وقت ہم بے سروسامانی کے عالم میں تھے کچھ عرصہ قبل ہی لدھیانہ سے ہجرت کر کے [illegible] آئے ہوئے تھے۔ میں کسٹوڈین کے دفتر میں کلرک تھا۔ وہاں کچھ سامان نیلام ہوا تو میں نے بھی خرید لیا۔ سامان خرید چکنے کے بعد کسٹوڈین صاحب نے ایک [illegible] یونہی مفت دے دیا۔ میں سب سامان گھر لے گیا۔ حضرت جب تشریف لائے تو والد صاحب نے وہ غالیچہ حضرت کے لیے بچھا دیا۔ حضرت نے بیٹھنے سے انکار فرما دیا [illegible] ورثہ کا مال ہے۔ میں اس پر نہیں بیٹھوں گا۔ والد صاحب کو چونکہ [illegible] نہیں تھا۔ انہوں نے کہا حضرت یہ تو نیلام میں خریدا ہوا ہے۔ مگر حضرت نے اٹھوا دیا اور ایک معمولی سی تائی بچھا دی۔ حضرت اس پر بیٹھ گئے۔ (ایضاً)

کرامات حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ

حلال حرام کی پہچان

——— مولانا عبد اللطیف صاحب خطیب [illegible]

سیہ جہلم فرماتے ہیں ایک روز لاہور حضرت کی خدمت میں حاضر تھا۔ ایک شخص ایک برتن میں دودھ اور دوسرے برتن میں دہی لے کر آیا اور عرض کیا حضرت دم کر دیں۔ حضرت نے دیکھا اور فرمایا: اوہو! ان کو تو اٹھا لیں یہ حرام ہیں۔ حضرت کشف و توجہ سے حلت اور حرمت معلوم کر لیا کرتے تھے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ واقعی وہ دونوں اشیاء حرام طریقے سے حاصل کی گئی تھیں۔

(علماء حق، مصنف سید امین گیلانی)

کھانڈ درست نہیں

چودھری محمد اکبر صاحب خیر پور [illegible] ضلع [illegible] نے یہ واقعہ بیان کیا کہ [illegible] کا مہینہ تھا۔ میں نے اپنے گنے کی تقریباً چھ من کھانڈ تیار کی۔ اس میں سے کچھ کھانڈ لے کر حضرت کی خدمت میں گیا۔ کھانڈ پیش کی تو حضرت نے فرمایا کھانڈ درست نہیں۔ میں نے پھر اصرار کیا۔ لیکن آپ نے یہی فرما کر لینے سے انکار کر دیا۔ میں حیران

ہوا۔ [illegible] اگر سو چا تو دو باتیں ذہن میں آئیں۔ ایک تو میں نے ابھی تک شیر [illegible] ادا نہیں کیا تھا۔ دوسرا میں نے ابھی تک بیوی کا عشر ادا کیا تھا [illegible] معلوم ہے کہ عشر بھی نکالا اور مشین کا کرایہ بھی مشین والے کو [illegible]۔

[illegible] کے بعد میں اپنی بیوی کے ہمراہ پھر حضرت کی خدمت میں گیا کیونکہ میری بیوی بھی حضرت کی بیعت تھی۔ اسے سبق سنانا تھا۔ حاضر ہونے پر میں نے عرض کیا کہ حضرت جی چاہتا تھا کہ تھوڑا سا گھی آپ کے لیے لیتا آؤں۔ مگر گھانڈی کی واپسی کے باعث جرأت نہ پڑی۔ ڈرتا تھا آپ کہیں خفا نہ ہوں۔ حضرت نے فرمایا گھی کہاں پڑا ہے۔ میری بیوی نے بتایا گھر کی فلاں سمت کے کمرہ میں چارپائی کے اندر برتن میں ہے۔ حضرت نے سر مبارک کو دو منٹ تک سینے کی طرف جھکایا۔ پھر فرمایا گھی تو پاکیزہ ہے۔ پھر فرمایا چاول کہاں پڑے ہیں۔ میں نے بتا دیا تو حضرت نے پھر توجہ کی اور بعد میں فرمایا۔ اب تو چاول بھی پاکیزہ ہے چودھری محمد اکبر کہتے ہیں میں سمجھ گیا کہ واقعی عشر اور کرایہ ادا نہ کرنے کے باعث حضرت نے واپس کر دی تھی۔ (ایضاً)

اچھا یہ ٹھیک نہیں ہوتا

حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحبؒ شجاع آبادی فرماتے تھے۔ پانچ سال ہوئے میرا بایاں بازو ٹوٹ گیا تھا۔ جوڑنے کے بعد وہ تقریباً سیدھا رہتا تھا۔ اس میں لچک نہ تھی تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ میں بھی ملتان جیل میں تھا۔ ایک روز حضرت نے فرمایا۔ قاضی صاحب نماز آپ پڑھایا کریں۔ میں نے معذرت کی کہ حضرت میرا بازو خم نہیں کھاتا۔ وضو میں بھی مشکل پڑتی ہے اور ہاتھ باندھنے میں بھی۔ حضرت نے میرا بازو تھام کر ٹوٹی ہوئی جگہ پر دست مبارک پھیر کر دو تین مرتبہ یہ جملہ فرمایا "اچھا یہ ٹھیک نہیں ہوتا" پھر فرمایا اللہ تعالیٰ بہتر کریں گے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے بعد نماز کا وقت آیا۔ میں وضو کرنے بیٹھا تو بالکل بے دھیانی میں ناک صاف کرنے کے لیے میرا بایاں ہاتھ بے تکلف ناک تک پہنچ گیا۔ یکدم میرے ذہن میں آیا کہ آج میرا ہاتھ صحیح کام کرنے لگ گیا ہے۔ میں نے ہلا جلا کر دیکھا تو وہ صحیح کام کر رہا تھا یقین ہو گیا کہ یہ حضرت کی توجہ کی برکت اور کرامت ہے۔ (ایضاً)

مدینہ کا حال

قاضی مظہر حسین صاحب چکوال فرماتے ہیں کہ حضرت نے ایک مرتبہ مجھے فرمایا مولوی حبیب اللہ صاحب (حضرت کے صاحبزادے) مدینہ منورہ میں رہتا ہے۔ جب کبھی خط کو دیر ہو جاتی ہے تو اس کی والدہ پریشان ہو جاتی ہے اور مجھ سے پوچھتی ہے۔ اس کا کیا حال ہے تو میں اللہ کے فضل و کرم سے پانچ منٹ میں بتا دیتا ہوں کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔

مینار پر حرام کا مال

قاضی صاحب محترم فرماتے ہیں ایک دفعہ گفتگو میں حضرت نے فرمایا میں اور میرا لڑکا مولوی عبیداللہ انور تانگے میں جا رہے تھے۔ ایک نئی مسجد راہ میں دیکھی۔ میں نے دیکھتے ہی کہا کہ اس مینار پر حرام کا مال لگا ہوا ہے۔ (ایضاً)

زنا کی بو

بشیر احمد صاحب چوہان موضع میاں علی خانقاہ ڈوگراں ضلع شیخوپورہ کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے بتایا حضرت میاں علی تشریف لائے۔ حضرت کے پاس کافی لوگ جمع ہو گئے کہ حضرت نے اچانک فرمایا مجھے زنا کی بو آ رہی ہے۔ لہٰذا آپ سب حضرات تشریف لے جائیں۔ تمام مجمع رخصت ہو گیا بعد ازاں موقع پا کر وہ شخص حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اقرار کے بعد توبہ کی اور حضرت کی بیعت ہوا۔ حج ادا کیا بقایا عمر شریعت کے مطابق بسر کرنے لگا۔ تادم تحریر وہ صاحب حیات ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو توبہ کی اور شریعت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

(ایضاً)

بارش رک گئی

مولانا [illegible] صاحب [illegible] فرماتے ہیں۔ ایک روز شاہ جی [illegible] میں [illegible] تھے [illegible] ایک بارش شروع ہوگئی۔ بعض لوگ حرکت کرنے لگے۔ شاہ جی نے [illegible] گرج کر فرمایا۔ [illegible] میں [illegible] نہیں [illegible] سکتے۔ خدا کی شان دیکھئے۔ ادھر شاہ جی نے یہ الفاظ فرمائے۔ ادھر بارش رک گئی۔ بادل چھٹ گئے۔ اور چاند اپنی نورانی صورت دکھانے لگا۔ بخاری اپنی تقریر کے جوہر دکھانے لگا۔

(ایضاً)

پان میں زہر

قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ اکثر یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ شجاع آباد میں تقریر کرتے ہوئے شاہ صاحب نے پان مانگا۔ میں نے پان منگوایا پان لانے والے کو کسی اور نے کہہ دیا کہ میں پان لاتا ہوں۔ پان آیا تو میں نے شاہ جی کو دے دیا۔ شاہ جی نے پان کو منہ میں ڈالتے ہی جلدی سے کہا۔ کیوں قاضی جی مجھے مارنے کا ارادہ ہے۔ یہ کہہ کر میرے ہاتھ پر پان اُگل دیا۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ پان کے لگنے سے میرا ہاتھ سیاہ ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ پان میں زہر ڈال دیا گیا تھا۔ شاہ جی کئی روز تک دہیں صاحب فراش رہے۔

(ایضاً)

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

> کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
> ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

مراکز ھدایت

نظام شمسی کی طرح نظام انسانی کے بھی مرکز و کرہ ہیں مگر تم کو ان کا حال نہیں معلوم۔ تم کو اجرام سماویہ کا مرکز معلوم کرنے میں جب ہزاروں برس لگ گئے تو نہیں معلوم عالم انسانیت کے نظام و مرکز کے کشف کے لیے کتنا زمانہ درکار ہوگا؟ تاہم اتنا معلوم رہے کہ ہر دور میں خدا کے چند بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا وجود ستاروں کے مرکز شمسی کی طرح تمام انسانوں کا مرکز محبت اور کعبۂ انجذاب ہوتا ہے اور جس طرح نظام شمسی کا ہر متحرک ستارہ صرف اس لیے ہے کہ کعبۂ شمس کا طواف کرے۔ اسی طرح انسانوں کے گروہ اور آبادیوں کے ہجوم بھی صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ اس مرکز انسانیت اور کعبۂ ہدایت کا طواف کریں۔ زمین والوں پر ہی موقوف نہیں آسمانوں میں بھی صرف انہی کے کارناموں کی پکار ہوتی ہے۔ (ابوالکلام آزاد۔ تذکرہ)

پُرامن راہ

"توفیق الٰہی کی سینکڑوں راہیں ہیں۔ ہدایت و تربیت غیبی کے ہزاروں بھیس ہیں۔ سب سے زیادہ آسان و پُرامن راہ یہ ہے کہ رہنمایانِ طریق میں سے کسی صاحب ارشاد کی معیت و صحبت حاصل ہو جائے" (تذکرہ ابوالکلام آزاد)

جوہر احساس ہمت الرشید — جلوۂ حسن جبلت الرشید

رہبر امداد حق بر حق جلا — شہپر ارشاد، عدم شق روا

جلوۂ رشد و ہدایت بر مقام — جلوۂ رزم شہادت پیش گام

مخزن تدریس از علم فوق — شیوۂ تدریس روشن حق رشوخ

جوہر تدریس کامل حق بجام — درس برحق جلوۂ حق انعام

جذبۂ تعبیر روشن نظم قوم — نظم برحق برملا از حزم قوم

رہبر نظم سعادت حق روا — ہادیٔ نظم کرامت حق رہنما

جوہر تہذیب مسلم حق شنید — جلوۂ حزب معلم چشم دید

برملا تہذیب کامل از ادب — حق روا تدریس ناقص حق رطب

نغمۂ تدریس حق، برحق شرود — شیوۂ تقریب لاحق، حق درود

جاذب تدریس روشن الرشید — جوہر تعمیر فن از الرشید

جلوت تدریس حق یارب بجام
خلوت تدریس حق جم صبح و شام

الرشید

مولانا حکیم انیس احمد صدیقی

دارالعلوم کی تفسیری خدمات

تفسیر کے سلسلہ میں اکابر علماء دیوبند کا مسلک

علمائے دیوبند کا حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے صاحبزادگان ذی احتشام سے تلمذ اور نیازمندی کا تعلق ہے اس لیے اکابر علمائے دیوبند و مظاہر العلوم سہارنپور وغیرہ مدارس عربیہ میں قرآن حکیم کے درس، ترجمہ اور تفسیر میں حضرت شاہ صاحب ان کے صاحبزادگان ذی احتشام کے فکر و نظر کو اپنے لیے مشعل راہ سمجھتے ہیں اور حضرت شاہ ولی اللہ کے علمی سلسلے سے وابستگی کو اپنے لیے باعث سعادت دارین سمجھتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا سلسلہ علمی دنیا میں سلسلۃ الذہب (خالص سونے کی زنجیر) کے نام سے موسوم ہے۔ اس سلسلہ کی کڑیاں اور کڑیاں سلسلہ در سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہیں۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا محمود حسنؒ درس میں اگر کوئی بات کسی مشہور عالم مفسر یا محدث کی تردید میں فرماتے تو ارشاد فرماتے کہ محققین کی رائے اس مسئلہ میں یہ ہے۔ مدتوں کے بعد معلوم ہوا کہ محققین سے مراد حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے صاحبزادگان ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ترجمہ اور مختصر تفسیر جس کا نام فتح الرحمن ہے فارسی زبان میں موجود ہے اور حقیقت میں فہم کلام اللہ کے لیے مفتاح کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے بعد حضرت شاہ عبد القادرؒ بن حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ترجمہ اور تفسیر اردو زبان میں موضح قرآن کے نام سے ہے۔ جو اس ترجمہ کا تاریخی نام ہے۔ یہ ترجمہ سلیس اردو میں ہے۔

نیز حضرت شاہ رفیع الدینؒ بن حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ترجمہ تحت اللفظ ہے۔ یہ تراجم ہی علمائے دیوبند کے تراجم و تفاسیر کی بنیاد و اساس ہیں۔ بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ ان بزرگوں کے تراجم و حواشی اور تفسیری نوٹ موجود نہ رہتے تو قرآن شریف کا ترجمہ کرنا کسی بڑے سے بڑے عالم کے لیے بھی آسان کام نہ رہتا۔ ان بزرگوں کے بعد جس شخص نے بھی ترجمہ کیا ہے وہ ان تینوں تراجم سے یا دو ترجموں سے یا کسی ایک ترجمے سے ضرور مستفیض ہوا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم میں ترجمہ قرآن شریف مکمل تفسیر جلالین شریف، دورہ حدیث شریف کے لیے موقوف علیہ ہیں ان کے بغیر دورہ حدیث میں داخلہ نہیں دیا جا سکتا۔

دورۂ تفسیر میں تفسیر ابن کثیر اور تفسیر بیضاوی شریف داخل نصاب ہیں۔

تفسیر القرآن بالقرآن

تفسیر میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے۔ القرآن یفسر بعضہ بعضاً اور عقلاً و نقلاً سب سے زیادہ معتبر اور مستند تفسیر یہی ہے۔

تفسیر بالحدیث

چونکہ تفسیر ابن کثیر میں وہ تمام احادیث جمع کر دی گئی ہیں جو تفسیر قرآن سے متعلق ہیں، اس لیے احادیث کی روشنی میں قرآن حکیم کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ابن کثیر کو داخل نصاب کیا ہے۔

اکابر دار العلوم دیوبند ضعیف سے ضعیف حدیث کو بھی ذاتی رائے کے مقابلے میں قابل ترجیح سمجھتے ہیں، اور ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ آیات کا مطلب احادیث کی روشنی میں حل کیا جائے اور اگر بظاہر متضاد روایات موجود ہیں تو ان میں تطبیق پیدا کر دی جائے۔

امام ابن کثیر کا ۷۷۴ھ میں وصال ہوا ہے، تفسیر ابن کثیر میں احادیث کے علاوہ آثار صحابہ و تابعین بھی موجود ہیں، اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

تفسیر بیضاوی قاضی بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ کی تالیف ہے، قاضی صاحب شافعی المسلک ہیں، اس تفسیر میں تفسیر بالماثور کے علاوہ بعض اور چیزوں کو بھی شامل کر دیا گیا ہے، فصاحت و بلاغت میں علامہ جار اللہ زمخشری متوفی ۵۳۸ھ کی تفسیر کشاف سے استفادہ کیا ہے، اور اسرار و رموز میں امام رازی کی تفسیر کبیر سے اخذ کیا ہے،

تفسیر بیضاوی کی شرح و حاشیہ شیخزادہ بہت خوب ہے، شیخزادہ حنفی المسلک ہے اور نہایت وسیع علم والا محقق ہے۔

قاضی بیضاوی نے صاحب کشاف کے اتباع میں بعض چیزیں ایسی لکھی ہیں جو اہل علم کے طبع سلیم پر ناگوار گزرتی ہیں، آئندہ اس کی مثال تحریر کی جائے گی۔

حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہٗ

بانی دار العلوم دیوبند وفات ۱۲۹۷ھ

حضرت مولانا نانوتوی نے قرآن حکیم کی بعض سورتوں اور آیات کی تفسیر لکھی ہے مثلاً معوذتین کی تفسیر ماہنامہ القاسم دار العلوم دیوبند میں شائع ہو چکی ہے، اور حضرت کے بعض رسائل میں بھی موجود ہے اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس کا اختصار اپنی تفسیر کے حاشیہ میں نقل فرمایا ہے، اسی طرح بعض دوسری آیات کی تفسیر آپ کے مطبوعہ رسائل میں موجود ہے، آیت خاتم النبیین کی حکیمانہ اور محققانہ تفسیر رسالہ تحذیر الناس میں موجود ہے،

حضرت نانوتوی فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین زمانی یعنی نبی آخر الزمان ہیں اور آپ کے بعد کوئی شخص نبی نہیں ہوگا، لیکن آپ خاتم النبیین رتبی بھی ہیں یعنی آپ کی ذات بابرکات پر نبوت و رسالت کی انتہا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت خاتم النبیین اس درجہ اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں کہ تمام مراتب کمال آپ کی ذات اقدس پر ختم ہیں۔

محمد مصطفیٰ صدر نشین است — کہ فخر اولین و آخرین است
سریر آرا ختم المرسلین است — بمنصب رحمۃ للعالمین است

انتہیٰ

حضرت اپنے شاگردوں کو قرآن حکیم کی تفسیر اسی انداز سے پڑھاتے تھے، ناچیز راقم الحروف نے آپ کے ایک شاگرد حضرت مولانا حافظ عبد الرحمن امروہوی سے ۱۳۲۳ھ میں چند اسباق تبرکاً پڑھے ہیں اور وہ

وسعت معلومات کا ہے جس کو شاید کسی طرح سے فراموش نہیں کر سکتا۔

لیکن افسوس ہے کہ تفسیر عثمانی پوری تحریر میں نہیں آسکی ہمارے سامنے جو آیات اور سورتوں کی تفسیر موجود ہے ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آپ پورے قرآن حکیم کی تفسیر لکھتے تو تفسیر کبیر اور تفسیر کشاف سے زیادہ مفید اور بہتر و برتر ہوتی۔

بہرحال جن آیات اور سورتوں کی تفسیر ہمارے سامنے ہے اس میں علماء اور طلباء مفسرین و محققین کے لیے بہت زیادہ رہنمائی موجود ہے۔

بقول سرسید بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ حضرت نانوتوی علم و فضل تقویٰ و طہارت سادگی میں حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت شاہ اسحٰق دہلوی کا نمونہ تھے اور وسعت مطالعہ میں اگر زیادہ نہ تھے تو اپنی دوسری خوبیوں کے اعتبار سے کم بھی نہ تھے بلکہ نادر روزگار تھے (مقالات سرسید)

والفضل ما شهدت به الاعداء

حضرت نانوتوی نے ایک مصری قرآن شریف جو منشی ممتاز علی کا کتابت شدہ ہے تصحیح فرمائی تھی، یہ قرآن شریف کتابت کے اعتبار سے بھی معیاری ہے اور تصحیح کے اعتبار سے اصح ترین مصری قرآن شریف ہے، حال میں اس قرآن شریف کا عکس کراچی کے ایک ادارہ نے شائع کیا ہے

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہٗ وفات ۱۳۳۹ھ
شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہٗ وفات ۱۹۴۹ء

حضرت علامہ عثمانی علم تفسیر، علم حدیث اور علم کلام میں یگانہ روزگار شخصیت و حیثیت کے مالک تھے حضرت علامہ سید انور شاہ صاحبؒ کے زمانہ میں مسلم شریف کا درس دیتے تھے، فتح الملہم شرح مسلم کی تالیف کا علمی کارنامہ اہل علم کے سامنے ہے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی مرحوم نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں حضرت عثمانی کو لکھا ہے کہ شیخ علم و فضل میں آپ کے شاگردوں کے برابر بھی نہیں ہوں اور شیخ الحدیث کے عہدہ کے لیے آپ سب سے زیادہ مناسب ہیں (مزار عثمانی) حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن شریف کا ترجمہ کیا اور فوائد لکھنے شروع کیے ابھی سورۂ نساء تک فوائد لکھے تھے کہ حضرت کا ۱۳۳۹ھ میں وصال ہو گیا، ترجمہ کرنے میں حضرتؒ نے حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ کے ترجمہ کو اصل قرار دیا اور ایک صدی کی مدت میں اردو زبان میں جو غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں ان کی روشنی میں شاہ صاحبؒ کے ترجمہ کی زبان میں جدت پیدا کر دی اور اس ترجمہ حضرت شاہ صاحب کا برقرار رکھا۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے قرآن کریم کا ترجمہ کرنے سے قبل ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے حضرت اس مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ کئی احباب اور معززین نے قرآن شریف کا سلیس ترجمہ کرنے کی فرمائش کی لیکن میں نے اپنی بے بضاعتی کے علاوہ یہ عرض کیا کہ متقدمین اکابر کے فارسی اردو تراجم موجود ہیں اور علمائے متاخرین زمانہ حال کے تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی سلمہٗ اور مولانا اشرف علی تھانوی سلمہٗ کے ترجموں کو احقر نے تفصیل سے دیکھا ہے جو آزاد و پسند مترجمین کے تراجم کی غلطیوں سے پاک و صاف ہیں اور عمدہ ترجمے ہیں پھر اب کسی جدید ترجمہ کی کیا ضرورت ہے بجز اس کے کہ مترجمین کی فہرست میں ایک نام کا اضافہ ہو، احباب نے پھر بھی اصرار جاری رکھا مجبور ہو کر میں نے عرض کیا کہ میں تراجم قدیمہ اور جدیدہ کو غور سے دیکھتا ہوں اس کے بعد اگر کوئی نفع سمجھ میں آیا تو اس کے بعد آپ حضرات کے فرمانے کی تعمیل کروں گا ورنہ معذور ہوں، اس کے بعد میں نے حضرت مولانا شاہ ولی اللہ کا فارسی ترجمہ اور حضرت مولانا شاہ رفیع الدین اور مولانا شاہ عبدالقادر قدس اللہ اسرارہم کو غور سے دیکھا تو یہ امر بداہتاً معلوم ہوگیا کہ اگر یہ متقدمین

اکابر قرآن شریف کی اس ضروری خدمت کو انجام نہ دیتے تو اس شدید ضرورت کے وقت ترجمہ کرنا بہت دشوار ہو جاتا۔
حضرت شاہ ولی اللہؒ نے جو احسانات شمار کئے ہیں ان میں ترجمہ فتح الرحمٰن کو بھی شمار کیا ہے

حضرت شاہ عبدالقادرؒ بامحاورہ ترجمہ کے بانی اور امام ہیں اور اس کے بعد جس نے ترجمہ کیا ہے وہ بامحاورہ ہی ترجمہ کیا ہے چونکہ بامحاورہ ترجمہ سے قرآن شریف کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اور یہی ترجموں کا مقصد اصلی ہے حضرت شاہ عبدالقادرؒ کا کمال یہ ہے کہ بامحاورہ ترجمہ کا پورا پابند ہو کر پھر نظم و ترتیب کلمات قرآنی اور معانی لغویہ کو اس حد تک نبھایا ہے کہ ہم جیسے لوگوں سے نہیں ہو سکتا۔ ہم ان کے کلام کی خوبیوں کا ان اغراض و اشارات کو جو ان کے سیدھے سادے مختصر الفاظ میں ہیں سمجھ جائیں تو ہم جیسے لوگوں کے لیے فخر کی بات ہے۔

حضرت شاہ رفیع الدینؒ کا کمال یہ ہے کہ تحت لفظی ترجمہ کا التزام کر کے ایک ضروری حد تک سہولت اور مطلب خیزی کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان ترجموں کی بے انتہا خوبیوں کے باوجود ہمارا جدید ترجمہ کرنا خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے کے مترادف ہے۔

اس لیے کہ نہ ہمارے ترجمہ میں کوئی خوبی اور منفعت زائد ہے جس کی وجہ سے جدید ترجمہ کی حاجت ہو یا سابقہ ترجموں میں کوئی نقص یا خلل ہو جس کا تدارک کیا جائے، حاشا وکلا یہ تراجم ان مقدسین نے ایسے کیے ہیں کہ ان جیسا یا ان سے بہتر ترجمہ کرنا تو ممکن نہیں ہے بلکہ ان کا پوری طرح سمجھ لینا ہی ہمارے لیے باعثِ افتخار ہے۔

اس چھان بین میں ایک بات دل میں بیٹھ گئی کہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کا افضل و مقبول اور مفید ترجمہ رفتہ رفتہ تقویم پارینہ نہ ہو جائے یہ کس قدر ناقدردانی ہے اور بدقسمتی بلکہ کفرانِ نعمت ہوگا جس میں قصور بھی ترجمہ کا نہیں ہوگا بلکہ لوگوں کی طلب کا قصور ہوگا۔

اس لیے حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ کی خدمت اس طرح کی جائے کہ جو الفاظ اور محاورے متروک ہو گئے ہیں ان کو تبدیل کر دیا جائے اور بعض مواقع میں ترجمہ کے مختصر الفاظ جو دراصل ترجمہ کی خوبی ہے، لیکن اب اس کے زیادہ سہولت پسندی اور مذاق طبیعت کی بدولت اب یہاں تک نوبت آگئی ہے کہ جس کی وجہ سے ایسے مفید اور قابل قدر ترجمہ کے متروک ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے ایسی جگہ کوئی مختصر لفظ زائد کر کے کچھ کھول دیا جائے۔ پھر انشاء اللہ شاہ صاحبؒ کا یہ صدقہ جاریہ جاری رہے گا اور اس طرح سے اس ملا نے بنام خدا دو سال میں کمال سے ملاحظہ کرنے کا ارادہ کر لیا ——— ۱۹۳۶ء میں یہ ترجمہ چھپا ہوا۔

حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں:

یادگار شہ عبدالقادرؒ ترجمۂ فتح القرآن مجید
وہ کہ آں معدن صد خوبی را سال او فرقان حمید
۱۳۳۶ھ
بے شش و پنج بگفتہ محمود کرد ترمیم اقل العبید

آخر میں فرماتے ہیں: ہماری غرض صرف یہ ہے کہ یہ عمدہ اور مفید ترجمہ جو اہل علم اور عوام دونوں کو مفید ہے، ایک تھوڑے سے بہانے سے نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے اور ہم اس کے فیض سے محروم نہ ہو جائیں اس لیے ہم نے حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ میں ترمیم و اضافہ کیا ہے حضرت شاہ صاحبؒ کے اصل ترجمہ کی خوبیوں پر بھی آپ نے کافی روشنی ڈالی ہے

سورۂ نساء کے بعد جو فوائد ہیں وہ حضرت علامہ عثمانیؒ کے تحریر کردہ ہیں حضرت نے سورہ بقرہ اور سورہ نساء کے فوائد میں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کرنا اس لیے مناسب نہ سمجھا کہ یہ حضرت شیخؒ کے تحریر فرمودہ ہیں اور ان میں کچھ ترمیم و اضافہ میں سوءِ ادبی کا احتمال ہے حضرت مولانا عثمانیؒ نے اپنے فوائد میں محققانہ انداز میں مطالبِ کلام اللہ کی تشریح فرمائی ہے۔ لطائف و معارف کا ایک سمندر ان فوائد میں جمع کر دیا ہے بہت سے اشکالات جو زائغین اور ملحدین نے پھیلا رکھے تھے ان کو حل کرنے

کے بعد پڑھنے پڑھانے والا ترجمہ کی کفایت نہ کرتے وہ حضرت نے اس زمانہ میں کچھ فرمائے ہیں۔

خاص طور سے فرق مرزائیہ اور ملحدین کے اوہام کا قلع قمع فرمایا ہے چونکہ اس زمانہ کی بہت بڑی ضرورت تھی۔ وہ حضرت کے اس زمانہ سے پیدا ہو گئے تھے حضرت کے زمانہ میں آپ کا مخصوص رنگ ، عقائد ، مفسرانہ اور محققانہ پوری طرح موجود ہے آپ نے روح المعانی تفسیر ابن کثیر وغیرہ تفاسیر کو پیش نظر رکھا ہے اس مختصر فوائد کو کئی بڑی بڑی تفاسیر پر فوقیت حاصل ہے۔ جس کا صحیح اندازہ اس کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔

یہ ترجمہ اور فوائد ہند و پاک میں بار بار چھپ چکے ہیں تاج کمپنی نے بھی شائع کیا ہے ، کراچی کی انجمن اشاعت قرآن نے نہایت عمدہ طور پر ہانگ کانگ سے چھپوا کر کئی ہزار نسخے مفت تقسیم کیے ہیں۔
جزاهم الله تعالیٰ

یہ ترجمہ اور فوائد فارسی زبان میں منتقل کر کے حکومت افغانستان نے نہایت اہتمام سے ۱۳۶۳ھ میں طبع کر کے شائع کیا

حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ نے عام مسلمانوں میں قرآن حکیم کے درس کا سلسلہ شروع فرمایا اور اپنے تلامذہ کو حکم دیا کہ وہ اس سلسلہ کو پھیلائیں۔

حضرت نے جو سلسلہ درس جاری فرمایا تھا اس میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ، حضرت مولانا محمد شفیع مفتی صاحب وغیرہ آپ کے درس میں شریک ہوتے ، لیکن آپ کا وصال ہو جانے سے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا ، بہر صورت ملک کے گوشہ گوشہ میں جو درس قرآن جاری ہوا اس کے محرک حضرتؒ تھے ، حضرت علامہ عثمانیؒ کی ایک تصنیف اعجاز القرآن بھی ہے

حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولینا محمد اشرف علی اعلی اللہ مقامہٗ

وفات رجب ۱۳۶۲ھ

حضرت حکیم الامت نے قرآن کریم کے دو ترجمے کیے ہیں ، ایک ترجمہ علیحدہ شائع ہوا ہے

دوسرا ترجمہ تفسیر بیان القرآن کی تالیف کے ساتھ لکھا ہے حضرت حکیم الامت کی چھوٹی بڑی کتابیں ملا کر تالیفات و تصنیفات کی تعداد تقریباً ایک ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔

حضرت نے ایک بار خواب میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت کی اس وقت سے حضرت کے ذوق قرآن فہمی میں نمایاں جلا محسوس ہوا ، اور اس کے انوار و برکات تفسیری کتب میں موجود ہیں

البیان فی علوم القرآن

حضرت کے عزیز ہمشیر زادہ مولنا سعید احمد مرحوم نے حضرت سے تفسیر پڑھنے کے وقت حضرت کی تقاریر کو ضبط کر لیا تھا ، اس کتاب کا نام البیان ہے ، یہ مسودہ مرحوم مولنا سعید احمد کی وفات کے باعث مکمل نہ ہو سکا ، اور غالباً شائع بھی نہ ہوا ، بیان القرآن کے حاشیہ میں اس کا ذکر ہے۔

اشرف البیان فی علوم الحدیث والقرآن

حضرت نے قرآن و حدیث کے متعلق بعض اوقات تحریر و تقریر میں کچھ رموز و نکات بیان فرمائے ، ان کو ایک جگہ کر دیا گیا ہے

بیان القرآن

حضرت نے بیان القرآن میں اختصار اور ایجاز کے ساتھ آیات کے معانی اور مطالب بیان فرماتے ہیں جس شخص کا علم تفسیر کے متعلق گہرا مطالعہ ہے اور اس کو تفاسیر کے پڑھنے سے کچھ اشکالات اس کے

علم میں ہیں یہ وہ مشکلات قرآن سے واقف ہے اور وہ ضخیم و عظیم تفاسیر کا مطالعہ کر کے قرآن حکیم کی اصل مراد متعین کرنا چاہتا ہے اور علمی طور پر اشکال و شبہات کو دفع کرنا چاہتا ہے، وہ بیان القرآن سے استفادہ کر سکتا ہے اور ایسا شخص ہی بیان القرآن کی صحیح عظمت اور اس کی قدر و قیمت کو سمجھ سکتا ہے، حضرت مفتی صاحب نے بیان القرآن کی جو تسہیل فرمائی ہے، اس سے بیان القرآن کا سمجھنا کم علم لوگوں کے لیے سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔

بیان القرآن کے متعلق حضرت مولانا سید سلیمان ندوی ؒ کی روایت ہے کہ تفسیر بیان القرآن کا مطالعہ حضرت علامہ مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری ؒ نے کیا تو فرمایا کہ میں یہ سمجھتا تھا کہ تفسیر بیان القرآن عوام الناس کے لیے لکھی گئی ہے لیکن تفسیر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس سے علماء بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ حضرت تھانوی نے یہ ترجمہ و تفسیر ربیع الاول سنہ ۱۳۲۰ھ میں شروع فرمائی تھی اور بقول حضرت تھانوی ؒ اس میں سات چیزوں کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے۔

۱۔ ترجمہ آسان زبان میں ہو تاکہ آسانی سے سمجھ میں آ جائے۔ اور تحت لفظی کی رعایت بھی رہے۔

۲۔ ترجمہ میں محاورات استعمال نہ کیے جائیں چونکہ محاورات ہر علاقہ کے جدا جدا ہوتے ہیں، اس لیے کتابی زبان اختیار کی ہے تاکہ فصاحت کے ساتھ سلاست بھی رہے۔

۳۔ حل قرآن اس تفسیر و ترجمہ کا مقصد ہے۔ اگرچہ ترجمہ میں کسی توضیح کی ضرورت پیش آتی یا کوئی شبہ قرآن کے مضمون سے پیدا ہوا اس کو ف، بنا کر لکھ دیا ہے۔ لطائف و نکات سے تفسیر کو طویل نہیں کیا گیا۔

۴۔ اگر کسی آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال منقول ہیں تو اس میں سے جس کو ترجیح معلوم ہوتی صرف اس کو نقل کیا۔

۵۔ مطالب آیات کی تقریر اس طرح کی گئی ہے کہ ربط ما بعد خود معلوم ہو جاتا ہے اور کہیں ربط کی شرح الگ لکھ کر اس کی تقریر لکھ دی ہے۔

۶۔ چاروں فقہوں میں سے مذہب اہل سنت و جماعت حنفی مسلک کو لیا ہے، دوسرے مذاہب بقدر ضرورت حاشیہ میں لکھ دیئے ہیں۔

۷۔ افادہ خواص کے لیے عربی حاشیہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس میں مکی، مدنی سورتوں اور آیات کی تفصیل، غیر مشہور لغات کا حل، وجوہ بلاغت کا بیان اور متعلق ترکیب و حنفی الاحکام فقہیات و کلامیات اور اسباب نزول و روایات و اختلاف قرات مغیرہ ترکیب یا حکم یا توجیہ ترجمہ و تفسیر ایجاز کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ یہ عربی حاشیہ در اصل عربی تفسیر ہے تو طلباء اور علماء کے لیے بڑے کام کی چیز ہے۔ بیان القرآن کی سابقہ طباعت میں یہ حاشیہ موجود ہے، لیکن تاج کمپنی نے اس حاشیہ کو علیحدہ کر دیا ہے بقول ناشر اس حاشیہ کے ساتھ ضخامت ڈیڑھ گنا ہو جاتی۔

حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ اگر اہل علم صرف قرآن کا مطالعہ کر کے بطور خود غور کریں اور اس میں جو امور ذہن میں مجمل رہیں یا اشکالات واقع ہوں ان کو مستحضر کر کے اس تفسیر کا مطالعہ کریں تو انشاء اللہ وہ بالا لطف اور حظ حاصل ہو۔

حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ سات امور کے علاوہ اس تفسیر میں حسب ذیل بھی امور کا التزام ہے۔

۱۔ تفسیر لکھنے کے وقت میرے پاس بیضاوی، جلالین، کلا تیر رحمانی، اتقان، معالم التنزیل، روح المعانی، مدارک، خازن، فتح المنان، ابن کثیر، لباب، در منثور، کشاف اور بعض تراجم قرآن موجود تھے۔ بعض کتابیں کچھ لکھنے کے بعد آئیں اور بعض بالکل نہیں حوالوں سے اس کی تعیین

چکا ہے۔

۲۔ متعلقہ آیات کا ربط اور سورتوں کا خلاصہ بھی لکھا ہے،

۳۔ جن آیات کی تفسیر اتحاد یا اتصال معانی کی وجہ سے ایک جگہ لکھی گئی ہے اس کا عنوان الگ کر کے لکھ دیا ہے۔

۴۔ جن روایات پر تفسیر کی بنیاد رکھی گئی ہے ان کا التزام کیا گیا ہے کہ وہ روایات صحیح ہوں، لیکن آیات جن کے الفاظ سے ایک مضمون ثابت یا ظاہر ہو تو اس کی تائید میں احادیث صحیحہ کے علاوہ حسن اور غریب احادیث بھی بیان کر دی گئی ہیں۔

۵۔ شبہات کے جواب میں صرف ان شبہات کا جواب دیا ہے جن کا منشا کوئی دلیل صحیح موجود تھا۔

۶۔ غیر لازم مضمون سے اکثر احتراز کیا ہے۔

۷۔ ترجمہ میں محاورے کے بجائے ترکیب کی رعایت زیادہ کی ہے۔

۸۔ کتب سماویہ سابقہ کے متعلق تمام مضامین تفسیر حقانی سے منقول ہیں۔

۹۔ تمام تفسیر میں دو تین مقامات ہیں جہاں جیسا جی چاہتا تھا شرح صدر نہ ہوا، اس موقع پر تصریح کر دی ہے کہ اگر کسی کو اس سے اچھی تقریر میسر ہو تو اس کو راجح سمجھے،

۱۰۔ مسائل فقہیہ و کلامیہ پر اس قدر کلام کیا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں جس قدر ضرورت تھی۔

۱۱۔ جو مضامین مفصل لکھنے کے قابل تھے ان کو ایک جگہ لکھ کر دوسری جگہ حوالہ دے دیا گیا ہے۔

۱۲۔ تفسیر میں سلف صالحین کا مکمل اتباع کیا ہے، متاخرین کے اقوال جو سلف کے خلاف تھے ان کو نہیں لیا۔

۱۳۔ مفسرین کے مختلف اقوال میں جو قول عربیت یا روایت کے اعتبار سے راجح تھا اس کو نقل کر دیا، اگر دو وجہیں برابر نظر آئیں تو دونوں کو بیان کر دیا ہے۔

۱۴۔ تقریر و اس میں قواعد میزانیہ منطقیہ کی پوری رعایت موجود ہے، جس کا لطف علماء ہی محسوس کرتے ہیں۔

۱۵۔ کسی کسی جگہ تقریر قدرے تنگ ہے لیکن وہ کفایت میں خلل پیدا نہیں کرتی، اس لیے بعض مضامین ایسے بھی آگئے ہیں جن کو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں یا سمجھا سکتے ہیں، اس تفسیر سے پوری طرح مستفیض ہونے کے لیے علوم متعارفہ میں مہارت اور کتب تفسیر کے مطالعہ و مراجعت میں تجربہ پیدا ہونے کے بعد اس تفسیر کو ملاحظہ کرنا ہے۔

ناچیز نے حضرت کا معمول دیکھا ہے کہ مشکلات قرآن میں کئی تفاسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد بیان القرآن کی طرف رجوع فرماتے تھے اور بے حد مسرور اور محظوظ ہوتے، ایک بار سورہ احزاب میں ربط آیات پر تفاسیر کا مطالعہ فرماتے رہے کہ جن آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچانے کا ذکر ہے ان کے ساتھ امہات المومنین کے ذکر والی آیات کا آپس میں کیا ربط ہے۔

کئی تفاسیر روح المعانی، تفسیر کبیر، کشاف، تفسیر مظہری کے بعد بیان القرآن کا مطالعہ کیا تو بہت مسرور ہوئے اور مجھے پڑھ کر سنایا اور فرمایا کہ جو مضامین کئی صفحات کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوئے وہ حضرت کی چند سطروں میں آجاتے ہیں۔

۱۶۔ کئی امور ضروریہ، لطائف تفسیر و ترجمہ بیان میں نہیں آسکتے مطالعہ سے محسوس ہوں گے۔

۱۷۔ جو لطائف و نکات حل آیات اور مضامین قرآنیہ سے متعلق نہ تھے، ان کو بالکل حذف کر دیا ہے۔

۱۸۔ جن احادیث کی تفسیر میں کوئی حدیث مروی ہے اس کے مقابلہ میں کسی کا قول نہیں لیا ہے۔

۱۸۔ التزامات مذکورہ کی صورت مدنظر آتی رہی اس لیے اول اجزا میں التزام پورا نہ ہو سکا۔

۴۔ عربی حاشیہ کے مضامین خاص اہل علم کے لیے ہیں، ان کے التزامات متنبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ نے بعض تراجم قرآنیہ پر تنقید بھی فرمائی ہے اور ان کی اغلاط پر متنبہ فرمایا ہے۔ ان تراجم میں ایک ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ہے، شمس العلماء نذیر احمد سرسید احمد خاں کے رفقاء میں سے تھے۔ اس لیے ان کے ترجمہ میں بعض چیزیں ایسی آگئی ہیں، جو سلف صالحین کے مسلک کے خلاف ہیں، یہ ترجمہ اگرچہ بہت بامحاورہ ہے لیکن معانی اور مطالب کی وجہ سے حضرت تھانوی صاحب نے ایک کتاب "اصلاح ترجمہ دہلویہ" تالیف فرمائی۔

پھر مرزا حیرت دہلوی نے ایک ترجمہ شائع کیا۔ جس میں ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ پر اعتراضات بھی کیے، اور خود ایک ترجمہ پیش کیا۔ حضرت تھانویؒ نے اس ترجمہ کی اصلاح کے لیے "اصلاح ترجمہ حیرت" کے نام سے ایک کتاب لکھی اسی طرح بعض دوسرے حضرات کے تراجم میں کوئی خامی یا نقص محسوس ہوا تو اس کی اصلاح کی طرف فوراً متوجہ فرمایا۔

حضرت تھانویؒ مسلک میں صحابہؓ و تابعینؒ اور دیگر سلف صالحینؒ کے نہایت سختی سے پابند تھے۔ جدت پسندی جو جادہ مستقیم سے انحراف کا باعث ہو، ہرگز پسند نہ فرماتے، حضرتؒ اپنے اور غیر کی تنبیہ بھی اس سلسلہ میں روا رکھتے تھے۔

خود اپنے لیے اپنے متعلقین بالخصوص علماء سے فرماتے کہ میری کوئی تحریر یا تقریر غلط نظر آئے، سلف صالحین کے مسلک کے خلاف محسوس ہو تو مجھے مطلع کردیں۔ چنانچہ ترجیح راجح کی سلسلہ اشاعت فرماتے یعنی جن مسائل میں رجوع فرماتے ان کی اشاعت ضروری سمجھتے تاکہ صائب الرائے دوسروں کو بھی معلوم ہو جائے حضرت کے متعلقین و منتسبین میں بھی یہ اثر موجود ہے

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبیؐ کے بہت سے مضامین سے رجوع کیا ہے حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں اگر کوئی مجھے میری غلطی سے مطلع کرتا ہے تو میرا دل یہی کہتا ہے کہ میں نے ضرور غلطی کی ہوگی اور جس نے مجھے غلطی پر متنبہ کیا ہے اس نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ اس کے بعد میں غور کرتا ہوں کہ کیا لکھا ہے۔ اگر اصول و قواعد کے مطابق میری غلطی ہوتی ہے تو میں ضرور تسلیم کر لیتا ہوں ورنہ جوابات میری سمجھ میں آتی ہے۔ اس کا اظہار کر دیتا ہوں۔

مسائل السلوک

حضرت تھانویؒ نے تفسیر بیان القرآن کے حاشیہ میں مسائل سلوک کے نام سے قرآنی آیات سے مسائل طریقت یعنی تصوف کے اصول بیان فرمائے ہیں۔ مضامین کتابی صورت میں مستقل کتاب کے طور پر بھی شائع ہو چکے ہیں، اہل طریقت پر حضرت کا احسان عظیم ہے۔

معارف قرآنی اور مواعظ حسنہ

حضرت تھانویؒ کا وعظ و تقریر کے سلسلہ میں یہ طریقہ تھا کہ جب مضمون اور آیت کو مناسب حال سمجھا بیان فرما دیا۔ اور وعظ کے مضامین القاء و آمد کا حصہ زیادہ ہوتا تھا۔ چونکہ آپ وعظ فرمانے سے قبل مطالعہ کرنے کے عادی نہ تھے۔ حضرت کاندھلویؒ فرماتے ہیں کہ میں نے مدتوں دیکھا ہے کہ جمعہ کے روز مختلف موضوعات پر تقریر فرماتے اور کبھی تقریر یا وعظ کے لیے پہلے سے تیاری نہ کرتے۔

وعظ میں مضامین کی آمد اور القاء کا سلسلہ رہتا تھا۔ اس لیے بہت سے وہ مضامین جو آپ کے مواعظ میں پائے جاتے ہیں وہ تفسیر بیان القرآن میں نہیں ہیں حضرت کاندھلویؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت کے مواعظ سے تمام آیات کی حکیمانہ تفاسیر اور معارف و اسرار جو حضرت القاء ربانی سے بیان

[illegible] کی ضرورت ہے بعض القرآن میں کہا ہے وہ کتابوں [illegible] ہیں کی تائید و تصدیب مقتضیات سے ہوئی وہ بات [illegible]۔ [illegible] اس کے برعکس تھا نہیں و تقاد و تقریب کے [illegible] کا صرف زیادہ اہتمام کیا ہے۔ باقی اور علوم معانی کی روانی [illegible]۔ مواعظ حسنہ میں متعلقہ آیت کی تفسیر بیان کی گئی ہے اور جو اسرار و معارف حضرت نے وعظ کے دوران بیان فرمائے ہیں ان کو مدون کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ علوم و معارف حضرت والا وعظ کی زیادات کے برکات وانوار ہیں۔

جمال القرآن

یہ فن تجوید و قرأت میں ایک نہایت جامع اور مختصر کتاب ہے جو اکثر اسلامی اور عربی مدارس میں داخل نصاب ہے۔

اعمال قرآنی

قرآن شریف کی آیات سے عملیات اور وظائف بیان کئے ہیں۔

خواص قرآنی

قرآنی آیات کے خواص جو عملیات کے شائقین کے لئے مفید ہے۔

احسن الاثاث فی النظر فی التفسیر المقامات الثلاث

سورہ بقرہ کی تین آیات پر نظر کرنے کے بعد تفسیر تالیف فرمائی ہے۔

تقریر بعض البنات فی تفسیر بعض الآیات

خاندان کی چند لڑکیاں جو قرآن شریف کی تفسیر حضرت سے پڑھتی تھیں ان کے تحریر کردہ تفسیری نوٹ ہیں۔

اصلاح ترجمہ حیرت

مرزا حیرت دہلوی کے ترجمے کی اصلاح کے متعلق ہے۔

التقصیر فی التفسیر

وہ ہر سکے ایک ترجمے میں جو تفاسیری نوٹ ہیں ان میں بعض تسامح کی نشاندہی کی ہے۔

احکام القرآن یا دلائل القرآن علے مسائل النعمان

۱۳۴۸ھ میں حضرت نے فقہ حنفی کی تائید میں اعلاء السنن کی تکمیل کے بعد قرآنی آیات سے مسلک حنفیہ کی تائید میں جو آیات ہیں ان کو جمع کرانے کے لئے منصوبہ کا انتخاب فرمایا۔ حسب ذیل علماء کرام کو حکم دیا کہ یہ کام آپ کے سپرد ہے (۱) حضرت مولینا ظفر احمد عثمانی مرحوم (۲) حضرت مولینا محمد ادریس کاندھلوی مرحوم (۳) حضرت مولینا مفتی محمد شفیع صاحب دامت ظلہ (۴) حضرت مولینا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مدظلہ۔ الحمد للہ یہ کتاب مسودات کی صورت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کتاب جلد شائع ہو جائے۔

الہادی للحیران فی وادی تفصیل البیان

تفصیل البیان فی علوم القرآن کئی جلدوں میں شائع ہوئی ہے مصنف نے حضرت سے درخواست کی کہ اس پر استمام نظر کرکے ان سے اطلاع فرمائیں۔ حضرت نے مصنف کی خواہش کے مطابق یہ کتاب تالیف فرمائی ہے۔

سبق الغایات فی نسق الآیات

یہ عربی زبان میں ہے آیات کے ربط و ضبط اور نظم پر روشنی ڈالی ہے ۱۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

آداب القرآن

قرآن کریم کی تلاوت کے آداب اور قرآن حکیم کے آداب پر مستقل تالیف ہے۔

حضرت استاذی حافظ عبدالرحمان صاحب امروہوی مرحوم

تلمیذ حضرت قاسم العلوم والخیرات

حضرت حافظ صاحب مرحوم حضرت مولانا نانوتوی کے شاگرد تھے حضرت نانوتوی سے قرآن حکیم کا ترجمہ و تفسیر پڑھنے کا شرف آپ کو حاصل تھا۔

حضرت امروہوی کے درس کا طریقہ متاخرین کے درس سے بالکل مختلف تھا، متقدمین کے طرز پر جو طلبا، مطالعہ کتب اور علم کے شائق ہوتے تھے اور مختصرات کو خوب سمجھتے تھے خود کتاب کی عبارت سے نفس معانی آسانی سے حل کر لیتے تھے، استاد ان کو صرف اہم اور خاص چیزیں بتاتے تھے یعنی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ طلبا کو انہیں پڑھایا جارہا بلکہ اساتذہ اور علماء کو درس دیا جارہا ہے۔ آپ کے درس کی چند باتیں بطور تبریک اور یادگار تحریر کرتا ہوں جو مجھے یاد رہ گئی ہیں اگر الفاظ و بیان میں کچھ نقص محسوس ہو وہ میری طرف منسوب کریں اور جو علمی لطافت و حلاوت محسوس کریں وہ حضرت مرحوم کا حصہ ہے۔

ایصال ثواب

حضرت نے فرمایا مردوں کو ایصال ثواب میں اختلاف ہے، بعض علماء فرماتے ہیں کہ قرآن شریف پڑھ کر، یا صدقہ یا خیرات وغیرہ کسی قسم کا ایصال ثواب اگر کئی مردوں کو کیا جائے تو برابر تقسیم ہو کر پہنچے گا، اور بعض علماء کی تحقیق یہ ہے کہ ایصال ثواب جو متعدد مردوں کو کیا جاتا ہے اسمیں تقسیم نہیں ہوتی پورا پورا سب کو پہنچ جاتا ہے۔ فرمایا یہی حق اور نقل زیادہ صحیح اور چار سے لئے

زیادہ انفع ہے۔ مثلاً جس طرح صحیح کہ مرنے کے بعد ارواح عالم روحانی میں پہنچ جاتے ہیں اور وہ عالم معانی ہے عالم مادی نہیں ہے۔ عالم مادی میں ایک روپیہ چار آدمیوں کو تقسیم ہو کر ہی پہنچ سکتا ہے لیکن عالم معانی اور روحانی میں پورا پورا پہنچ سکتا ہے۔ ایک استاد کے درس طالب علم شاگرد ہیں وہ ایک مسئلہ سب کو سمجھاتا ہے تمام طالب علم مسئلہ سمجھنے کے لئے مستعد ہیں اور صلاحیت فہم توجہ موجود ہے وہ سب اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھ گئے وہ مسئلہ ہر ایک شاگرد کو پورا پورا بغیر تقسیم کے پہنچ جائے گا، اسمیں تقسیم نہ ہوگی۔ استاد جس نے وہ مسئلہ بیان کیا ہے اس کے پاس بھی وہ باقی رہے گا۔ بلکہ تازگی اور نکھار کے ساتھ ذہن میں آجائے گا، کسی طرح کی کمی نہ ہوگی بلکہ اضافہ ہی ہوگا، علم بھی معنوی چیز ہے، عالم روحانی اور عالم معانی سے متعلق ہے اس لئے بغیر تقسیم کے پہنچ جاتا ہے۔

اسی طرح عید الاضحیٰ میں مردوں کی طرف سے قربانی میں ایک کے بجائے کئی مردے شامل کئے جاسکتے ہیں، حالانکہ زندوں میں ایک حصہ صرف ایک شخص کے لئے ہوگا خواہ جانور کتنا ہی قوی الجثہ ہو، فربہ ہو لیکن شرعی حکم کے مطابق ایک شخص کا حصہ ممکن ہے۔ لیکن اس کے برعکس اموات میں خواہ ایک حصہ دس بیس آدمی شریک کر دیں چونکہ مرنے کے بعد عالم معانی اور روحانی میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں مادی دنیا کی طرح تقسیم نہیں ہے، ناچیز عرض کرتا ہے کہ ایک حدیث نبوی میں بھی اموات کے لئے غیر منقسم ثواب تقسیم ہونے کا ذکر موجود ہے، حضرت تھانوی نے بہشتی زیور میں بھی یہ مسئلہ بیان کیا ہے اور وہ حدیثیں بھی نقل کی ہیں۔

طہارت کا فلسفہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ پیشاب و پاخانہ کی وجہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور وضو دوبارہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے یہ بات بظاہر غلط نظر آتی ہے اس لئے کہ پیشاب اور پاخانہ کے خارج ہونے سے جسم میں طہارت پیدا ہوتی ہے۔

نجاست کے نکلنے سے طہارت کیسے باطل ہوتی ہے لیکن شریعت نے ان چیزوں کو ناقض وضو قرار دیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پیشاب اور پاخانہ کے خارج ہونے سے نجاست جسم سے کلی خارج نہیں ہوتی بلکہ جسم میں یہ غلاظت اور نجاست ہنوز موجود ہے۔ پیشاب اور پاخانہ کے خارج ہونے سے جسم میں اسی کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے یعنی ہمارے جسم کے اندر جو نالی بھری پڑی ہے اس کی نالیاں [illegible] ہو کر برتن میں ہوتا ہے برتن سے وہی کچھ نکلتا ہے۔ چونکہ ہمارے جسم سے غلاظت اور نجاست بول و براز کا اخراج ہوا ہے اور جسم سے ان چیزوں کو کلیتہً پاک و صاف کرنا ممکن نہیں ہے' اس لئے ان کے نکلنے سے طبیعت پر جو مکدر ہوا ہے اور روحانی لطافت و نظافت میں کمی آئی ہے وہ وضو سے دوبارہ کرکے حاصل کر لی جائے اور وضو سے یقینی طور پر ایک خاص نظافت اور طلاوت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے وضو کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر جسم کو نجاست سے پوری طرح پاک صاف کرنے کا حکم دیا جاتا تو یہ ناممکن اور ناقابل عمل تھا اور شریعت میں تکلیف مالا یطاق کا حکم نہیں دیتی اس لئے امور عادیہ بمنزل امر حقیقی سمجھا گیا اور اس پر حکم لگا دیا گیا فافہم۔

غسل اور وضو کی حکمت

بظاہر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جسم انسانی سے بول و براز کافی مقدار میں خارج ہوتا ہے اور ان کی گندگی اور نجاست محسوس بھی ہوتی ہے لیکن ان کے خارج ہونے سے صرف مقام نجاست کو صاف کرنے اور وضو کا حکم ہے لیکن احتلام یا مباشرت میں صرف چند قطرے منی کے خارج ہوتے ہیں جس کی نجاست بھی متفق علیہ نہیں ہے بلکہ بعض ائمہ نے اس کو پاک کہا ہے۔ لیکن اس کے خارج ہونے پر تمام جسم کو پاک کرنے یعنی غسل کا حکم دیا جاتا ہے' یہ حکم عجیب اور خلاف عقل معلوم ہوتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ بول و براز یا پاخانہ اور پیشاب کا خارج ہونا اکل و شرب کھانے پینے کی طرح ایک لازمہ زندگی ہے اگر ان امور میں غسل کا حکم دیا جاتا تو طہارت کا حاصل کرنا بے حد دشوار ہو جاتا۔ علاوہ ازیں بول و براز کے خارج ہونے کے بعد طبیعت انسانی پر خوشگوار اثر ہوتا ہے صرف ان کے اخراج کے وقت ایک قسم کا تکدر پیدا ہوتا ہے جو نجاست کی جگہ صاف کرکے اور وضو کرکے نظافت اور طلاوت سے تبدیل ہو جاتی ہے۔

لیکن احتلام اور مباشرت میں نفسانی اور حیوانی قوتوں میں اشتعال پیدا ہوتا ہے اور مادہ منوی کا تعلق جسم کے تمام اعضاء سے ہے ایک قطرۂ آب میں تمام انسانی صفات عادات اور اشکال کا خلاصہ موجود ہوتا ہے جو نشوونما کے بعد محسوس ہوتا ہے اس لئے قوت حیوانی اور نفسانی کے اشتعال' استعمال کے بعد ضروری ہوا کہ تمام جسم کو دھونے یعنی غسل کرنے کا حکم دیا جائے بلکہ مباشرت کے مبادیات یعنی مرد اور عورت کی شرمگاہ کے اتصال پر غسل کا حکم واجب کر دیا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ غسل کا حکم در اصل قوت حیوانی اور قوت نفسانی و شہوانی کے اشتعال کی وجہ سے ہے اور ان قوتوں کو ضبط اور اعتدال کے ساتھ استعمال کرنے کے متعلق ہے' شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ قوت ملکوتی اور روحانی کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے اور حیوانیت اور شہوانیت کے پیچھے پڑ کر انسان حیوان سے بھی بدتر ہو جائے۔

حضرت فخر المحدثین والمفسرین

مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ

شیخ الحدیث و صدر مدرسین دارالعلوم دیوبند' وفات ۱۹۳۲ء

حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ علوم قرآنی و معارف ربانی کے سمندر تھے' آپ نے اپنے دست مبارک سے بہت کم لکھا ہے اور تلامذہ کو ایسا پڑھایا ہے کہ ان کو زندہ کتب خانہ بنا دیا۔ حضرت مولانا

محمد ادریس کاندھلوی مرحوم، حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہ، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری مدظلہ وغیرہ وغیرہ بے شمار علماء اور مفتی آپ کے ارشد تلامذہ میں شامل ہیں اور ان بزرگوں سے جو خدمت کتاب و سنت کی فرمائی ہے وہ حضرت شاہ صاحب کا فیض ہے۔

مشکلات القرآن

حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہ نے قرآن حکیم کی تفسیری مشکلات کو حل کرنے کے لئے تالیف فرمائی ہے اس کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس میں قرآنی مشکلات و مبہمات کا حل موجود ہے اہل علم اور مفسرین کے لئے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ اگرچہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین تھے لیکن آپ کو علم حدیث کے ساتھ قرآنی علوم سے خاص شغف تھا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کے تلامذہ بحیثیت محدث کے بھی مشہور ہیں اور بحیثیت مفسر کے بھی فائق و لائق ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ ہی آپ کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے بلکہ آپ کے معاصرین بھی اہم اور مشکل مسائل میں آپ کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولینا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے قرآن و حدیث کے کئی مسائل مشکلہ اور امور مبہمہ میں آپ کی طرف رجوع کیا اور پھر کتابوں میں بھی آپ کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے۔

مولینا حفظ الرحمٰن صاحب قصص القرآن میں فرماتے ہیں کہ سورۂ نجم کے اسرار و معارف حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب نے مشکلات القرآن میں بیان فرمائے ہیں وہ قابل مراجعت ہیں علمائے کرام کو ان کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

اسی طرح حضرت علامہ عثمانی نے فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں وہ اسرار و معارف نقل فرمائے ہیں۔

حضرت مولینا محمد طاہر قاسمی نبیرہ حضرت قاسم العلوم والخیرات مولینا نانوتویؒ

مولینا محمد طاہر قاسمی، حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب کے حقیقی بھائی اور پاکستان کے مشہور و معروف قاری طاہر قاسمی کے والد بزرگوار تھے۔

آپ نے عقائد کے سلسلہ میں عقائد اسلام کتاب تالیف فرمائی ہے۔ اور تفسیر موضوعی، حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہ کے اسرار و معارف کو قلم بند فرمایا ہے اس کا نام القصور علی الاسلام ہے۔ تفسیر سورۂ یوسف بھی آپ کی تالیف ہے۔

حضرت مولینا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی مرحوم و مغفور

حضرت مولانا عاشق الٰہی مرحوم بڑے علم دوست اور وسیع المطالعہ اور کثیر التالیف والتراجم بزرگ تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کی سوانح "تذکرۃ الرشید" اور حضرت سہارنپوری کی سوانح "تذکرۃ الخلیل" کے مؤلف ہیں۔
مولینا نے بہت سی کتابیں تالیف فرمائی ہیں ہیں اور بہت سے ترجمے بھی کئے ہیں۔ قرآن حکیم ترجمہ اور اس کے فوائد بھی تحریر کئے ہیں جو کئی بار شائع ہو چکے ہیں

اس ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ حضرت مولینا محمود حسن قدس اللہ سرہ کی نظر سے گزرا ہے اور اس کے فوائد و حواشی میں مولف علام نے بہت سی مستند تفاسیر کا خلاصہ پیش کیا ہے وہاں آپ نے ایک عظیم کارنامہ یہ سرانجام دیا ہے کہ قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر، مولد حضرت شاہ ولی اللہ مولد و مرقد حضرت شاہ اہل اللہ علام تشریف لے گئے اور وہاں سے جناب منشی رحمت اللہ صاحب سے خاندان ولی اللہ کا ایک

کی تردید میں [illegible] دیا پر ترجمہ قرآن میں لکھتے ہیں ۔

[illegible] کا سمجھنا اسباب نزول پر موقوف ہے کہ آیت کب اور کس مقصد کیلئے نازل ہوئی اور اس کلام الٰہی کو کلام مجید یا تفسیر میں نظر سے نہیں گزرا ہے کہ سمجھا جاتا کہ اس کی مدد سے پورے طور پر کامل ہو جائے۔ چنانچہ سب اول حضرت [illegible] ترجمہ کی طرف توجہ کی تو اسی کا زیادہ اہتمام کیا اور الحمد للہ کامیابی کے سامان پیدا ہونے لگے۔ ایک قلمی حمائل شریف قصبہ پھلت ضلع مظفرنگر میں منشی رحمت اللہ صاحب سے دستیاب ہو گئی جو منشی صاحب کو شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ کے پوتے مولوی محمد حسین بن مولوی شاہ رفیع الدین صاحب سے حاصل ہوئی تھی جس کے حواشی پر شان نزول کا جز بزبان فارسی کافی ذخیرہ موجود تھا۔ حاشیہ کردیں قلمی نسخہ کا رمز کی طرف کیا ہے ۔

(ص ۳ - ۵ مطبوعہ ۱۳۰۰ھ گلشن ابراہیمی پریس لکھنؤ)

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب (مرحوم) بانی جامعہ اشرفیہ لاہور
وصال ۱۹۶۱ء [illegible]

حضرت نے قرآن حکیم کی تفسیر تحریر نہیں فرمائی لیکن برسوں قرآن حکیم کی تفسیر بیان فرمائی ہے اور ہزاروں لوگوں نے آپ کے علوم و معارف سے استفادہ کیا ہے ۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ مصنف معارف القرآن فرماتے ہیں ۔

یہ ما بجز بہ فیض و فضل مولانا حسن دیکھا
کرامت تیری ہم نے آج اک تھانہ بھون دیکھا
سنا وہ درس قرآں دل کی آنکھیں کھل گئیں جس سے
معارف ہائے قرآنی کا دریا موجزن دیکھا
الٰہی پھر مسلمانوں میں پیدا ذوق قرآں ہو
اسی میں ان کا جینا ہو اسی میں ان کا مرنا ہو

قرآن حکیم کے درس کا سلسلہ آپ کے صاحبزادہ مولانا عبد الرحمٰن صاحب نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ نے جامعہ اشرفیہ میں شروع کیا ہے اللہ تعالیٰ جاری و ساری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے ۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جامع مسجد نیلا گنبد میں بھی درس دیا کرتے تھے ۔

بتاؤں آپ کو کیا درس مولانا حسن دیکھا
موا نیلا گنبد میں نیا تھانہ بھون دیکھا
حکیم دین حضرت اشرف علی تھانوی دیکھے
وہاں پر گلستاں دیکھا یہاں پر بھی چمن دیکھا

([illegible])

حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب
مہتمم دار العلوم دیوبند

حضرت قاری طیب صاحب بانی دارالعلوم دیوبند کے پوتے ہیں اور علوم و معارف میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قاسم العلوم والخیرات کے روحانی و علمی وارث ہیں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تصنیفات صرف اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں ۔ قاری صاحب مدظلہ کو اللہ تعالیٰ نے تفہیم و تقریر کا یہ مادہ و ملکہ عطا فرمایا ہے کہ آپ بڑے سے بڑے علمی نکات اور اسرار و رموز کو نہایت آسان الفاظ میں بیان فرما دیتے ہیں ۔ آپ نے [illegible] میں علم دین کے متعلق تقریر فرمائی مثلاً روح کا بیان بھی ایسا آسان معلوم ہوتا تھا کہ روح کا مسئلہ نہایت آسان اور سہل ہے آپ کی تقاریر میں حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہ کے علوم و معارف کی تفہیم و تفسیر ہوتی ہے ۔

دیوبند کی جامع مسجد میں ہر جمعہ کو کسی آیت کی تفسیر بیان کرنے کا معمول رہا ہے ۔

معلوم ہوا ہے کہ آپ قرآن کریم کی ایک تفسیر تالیف فرما رہے ہیں

لیکن دارالاہتمام کے انتظام و انصرام کی مشغولیت و مصروفیت کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کا وقت کم ملتا ہے۔ کاش حضرت قاری صاحب قرآن کریم کی تفسیر مکمل فرمائیں۔ حضرت نانوتوی کے علوم و معارف کا بے بہا خزانہ عام فہم زبان میں پیش کرنا ایک عظیم سعادت کے علاوہ زمانہ کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ حضرت قاری صاحب کے صاحب زادہ مولانا محمد سالم صاحب اس سلسلہ میں خاص توجہ کریں اور حضرت قاری صاحب کا ہاتھ بٹائیں، حضرت قاری صاحب صاحبزادہ صاحب یا تلامذہ میں سے کسی کو معاون خاص بناکر اس اہم کام کی تکمیل فرمائیں۔

مقدمۃ القرآن

حضرت قاری صاحب مدظلہ نے ایک نہایت مفصل اور جامع مقالہ "مقدمۃ القرآن" کے نام سے تالیف فرمایا ہے، یہ مقالہ بعض تفاسیر کے ساتھ اور مستقل کتاب کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

مجلس معارف القرآن (اکاڈمی قرآن عظیم) دارالعلوم دیوبند کا ایک تالیفی ادارہ ہے جو حضرت قاری صاحب کی زیر نگرانی و صدارت کام کر رہا ہے۔ اس کی مجلس منتظمہ علیحدہ ہے۔

اس ادارہ کا مقصد قرآنی علوم کی ریسرچ اور تحقیق ہے۔

وقت کے الجھے ہوئے مسائل کو قرآن حکیم کی روشنی میں حل کرکے اس طرح پیش کیا جائے کہ قرآن حکیم کو دنیا کا رہنما اور امام ثابت کیا جائے اور دنیا کو قرآن حکیم کی روشنی سے رغبت پیدا اور معارف ربانی سے فیوض و برکات حاصل کرنے کی امنگ پیدا ہو۔

حضرت شیخ التفسیر والحدیث
مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت کاندھلوی دارالعلوم دیوبند میں شیخ التفسیر کے منصب پر فائز تھے اور جامعہ اشرفیہ لاہور میں تا [illegible] شیخ الحدیث رہے۔

دارالعلوم دیوبند میں دورہ تفسیر کے [illegible] درس آپ دیا کرتے تھے۔ دورہ تفسیر کے طلباء کے [illegible] دوسرے طالب علم بھی کہ قرآنی علوم سے خاص شغف [illegible] ہو جاتے۔

دورہ تفسیر میں بیضاوی شریف ثلث اول از ربع ثانی پارہ سیقول تا سورہ [illegible]

" " ثلث ثانی از سورہ یونس تا سورہ [illegible]

" " ثلث ثالث از سورہ ق تا ختم قرآن شریف

تفسیر ابن کثیر " ثلث اول از سورہ آل عمران تا سورہ [illegible]

" " ثلث ثانی از سورہ رعد تا سورہ روم

" " ثلث ثالث از سورہ روم تا سورہ [illegible]

دورہ تفسیر سال نہم میں پڑھایا جاتا ہے۔ بیضاوی شریف سورہ بقرہ الم پارہ ساتویں سال میں دورہ حدیث سے قبل پڑھایا جاتا ہے۔ قرآن شریف کے پندرہ پارے چہارم میں اور پندرہ پارے پنجم میں پڑھائے جاتے ہیں۔ جلالین شریف مکمل سال ششم میں اور اس کے ساتھ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر از حضرت حکیم الامت مجدد الملت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ پڑھائی جاتی ہے اور قرآن شریف کا ترجمہ، جلالین شریف اور الفوز الکبیر موقوف علیہ دورہ ہیں۔ یعنی ان کے بغیر پڑھے دورہ حدیث میں شرکت نہیں ہو سکتی۔

دارالعلوم میں حضرت شیخ التفسیر کے عہدہ پر فائز رہے لیکن علم حدیث کے درس سے بھی تعلق قائم رکھا۔ اکثر آپ ابوداؤد شریف پڑھایا کرتے تھے۔ قرآن شریف کے درس کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت نے قرآن کا ترجمہ اور ضروری تفسیر کے علاوہ آسان زبان میں ایسا درس دیا کرتے تھے کہ درس میں بے شمار طلباء اور دوسرے حضرات شریک ہونے لگے۔ [illegible]

طلبہ سے بھری ہوتی تھی بلکہ بعض اصحاب باہر کھڑے ہوتے تھے کسی
اور درس [illegible] میں نہیں پائی جاتی تھی جو آپ کے درس کی شان تھی ۔
آسان زبان میں بیضاوی شریف، کشاف، تفسیر کبیر اور ابن کثیر کا خلاصہ
اردو میں پیش کر دیتے تھے ۔ آپ کے درس قرآن کے بعد جلالین شریف
کا سبق بہت ہی آسان معلوم ہوتا تھا بلکہ یوں کہہ کر جلالین میں کچھ پڑھایا
جاتا تھا درس قرآن کے طلباء اس سے زیادہ بہرہ ور ہوتے ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پر حضرت کئی روز تک درس فرماتے
آپ نے فرمایا کہ بسم اللہ میں ب استعانت کے لئے ، قاضی بیضاوی
نے اس کو مصاحبت کے لئے قرار دیا ہے ۔

حضرت نے فرمایا کہ ب استعانت کے لئے بھی ہو سکتی ہے اور مصاحبت
کے لئے بھی لیکن علامہ زمخشری نے کشاف میں ب کو مصاحبت کے لئے
قرار دیا ہے اور اس انداز سے کلام کیا ہے کہ قاضی بیضاوی اس سے
متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے بھی مصاحبت ہی کے لئے قرار
دے دیا ۔

فرمایا چونکہ علامہ زمخشری صاحب کشاف معتزلی ہیں اور ان کے
ب کو مصاحبت کے لئے قرار دینے میں ب کو استعانت سے دور رکھنا
مقصود ہے معتزلہ کے عقیدہ میں یہ بات ہے کہ انسان اپنے اعمال و
افعال کا خود خالق ہے ۔ اگر ب کو استعانت کے لئے قرار دیا جائے تو
اس عقیدہ پر زد آتی ہے اس لئے علامہ زمخشری نے استعانت کے
بجائے مصاحبت کے لئے قرار دیا اور مجھے ایسی اعتزال کا رائحہ محسوس
ہوا اس لئے میں کہتا ہوں کہ ب استعانت کے لئے ہے نہ کہ مصاحبت
کے لئے اور بندہ استعانت کے بغیر کوئی کام کرنے کے لائق نہیں ہے ۔
سورہ فاتحہ میں صاف طور پر آ رہا ہے وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۔

حضرت نے فرمایا کہ قاضی بیضاوی اپنی تفسیر میں علامہ زمخشری
کی تفسیر کشاف اور علامہ رازی کی تفسیر کبیر سے استفادہ کرتے ہیں
اور ان دونوں تفاسیر کے علوم کی تلخیص نہایت جامع الفاظ میں کرتے ہیں
لیکن بعض مقامات پر علامہ جار اللہ زمخشری کی فصاحت و بلاغت سے
متاثر ہو کر ایسا قول اختیار کر لیتے ہیں جس میں مسلک حقہ اہل السنت والجماعت
کے خلاف رائحہ اعتزال موجود ہوتا ہے ۔

حضرت اپنی تفسیر معارف القرآن میں فرماتے ہیں

بسم اللہ کے شروع میں جو باء ہے بعض علماء کے نزدیک مصاحبت
اور الصاق کے لئے ہے اور بعض علماء کے نزدیک استعانت کے لئے ہے
اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اس صورت میں ابتداء ہی سے
اپنی عبودیت اور عجز و استعانت کا اظہار ہوگا اور اول وہلہ میں اپنی حول و
قوت سے تبری کا اعلان ہو جائے گا یعنی اسی کی اعانت و توفیق سے
شروع کرتے ہیں ، حاشا اپنی حول و قوت سے نہیں لاحول ولا قوۃ الا باللہ
اور بارگاہ الوہیت کا ادب بھی اسی کا مقتضی ہے کہ وہاں عبودیت اور
تذلل کا ہی اظہار ہو ۔ اور عام مصاحبت نہ ہو تعالیٰ جد ربنا ما اتخذ صاحبة
اور یہی معنی ایاک نستعین کے مناسب اور قریب ہیں اور
لاحول ولا قوۃ کے مترادف ہو جانے کی وجہ سے کنز من کنوز الجنۃ
یعنی جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ کہلانے کا مصداق ہو گا ۔ (معارف)

راقم آثم نے زمانہ طالب علمی میں حضرت کا [illegible] کے درس قرآن
میں تفسیری نوٹ قلم بند کئے تھے جن کو میں بہت عزیز رکھتا تھا لیکن
حضرت کی تفسیر معارف القرآن شائع ہونے اور مطالعہ کرنے کے بعد میرے تحریر
کردہ نوٹ کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی ، حضرت کا [illegible] فرماتے ہیں ۔

تفسیر قرآن کا پہلا سنگ بنیاد وہ ترجمہ ہے جو قواعد عربیت اور قوانین
شریعت کے پورا پورا مطابق ہو ، تفسیر قرآن کا یہ سنگ میل یعنی ترجمہ قرآن شاہ ولی اللہ
اور ان کے دونوں بیٹوں شاہ عبد القادر اور شاہ رفیع الدین کے ہاتھوں رکھا گیا
اور ہند و پاک میں یہ خیر کثیر اسی مبارک باپ اور مبارک بیٹوں کے ہاتھوں

جاری ہوئی اور یہی تینوں ترجمے اردو زبان میں تفسیر قرآن کے سنگ بنیاد ہیں اور ہندوستان میں کوئی عالم ان ترجموں سے بہتر ترجمہ نہ کر سکا ۔ رحمہم اللہ تعالیٰ ۔

غرض یہ حضرات ترجمہ قرآن کے بانی اور امام ہیں اور علوم دینیہ میں تمام ہند و پاک کے استاد ہیں اور حق تو یہ ہے کہ اگر یہ تین ترجمے نہ ہوتے تو ہر کس و ناکس کو ترجمے کا حوصلہ بھی نہ ہوتا اس لئے کہ کسی کے کلام اور مطلب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ادا کرنے کا نام ترجمہ ہے اور یہ کام نہایت دشوار ہے جب تک کہ مترجم دونوں زبان کے لغات، محاورات اور استعارات و کنایات اور حقیقت و مجاز اور اسالیب کلام سے پوری طرح واقف نہ ہو یہ تراجم نہ ہوتے تو بڑے بڑے علماء کو ترجمہ کرنا دشوار ہو جاتا اور شاید بڑی بڑی تفاسیر کے مطالعہ کے بعد بھی ایسا ترجمہ نہ کر سکتے۔ ان حضرات جیسا زہد، فہم اور نور تقویٰ کس کے پاس ہے جو ایسا ترجمہ کر سکے ۔

بحمدہ تعالیٰ جب قرآن کی یہ پہلی منزل یعنی ترجمہ کی منزل گزر گئی تو اس کے بعد ضرورت اس امر کی تھی کہ اردو زبان میں قرآن کریم کی کوئی مختصر اور جامع تفسیر لکھی جائے جس میں فقط حل مطالب اور ربط آیات کا خاص اہتمام کیا جائے اور شیخ جلال الدین سیوطی کی طرح اقوال مختلفہ میں سے ارجح الاقوال پر اکتفا کیا جائے اور لطائف و نکات اور مذاہب باطلہ کی تفصیلی تردید سے گریز کیا جائے ۔

یہ خدمت اور سعادت حضرت حکیم الامت مولینا حافظ محمد اشرف علی صاحب تھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ قدس اللہ سرہ کے حصہ میں آئی آپ نے ۱۹۲۵ء میں بیان القرآن کے نام سے ایک تفسیر لکھی جو افادیت اور جامعیت میں ثریٰ (زمین) سے ثریا (فلک) تک پہنچ گئی ہے ۔

اور اسی طرز پر ایک نہایت مختصر اور جامع تفسیر جو جدید شبہات کے لئے کافی و شافی ہے شیخ الاسلام حضرت مولینا شبیر احمد عثمانی دیوبندی قدس اللہ سرہ نے لکھی جو نہایت مقبول ہوئی یہ تفسیر فصاحت و بلاغت اور حسن تعبیر کے اشتباہ سے بھی پاک تفسیر ہے ۔

معارف القرآن

فہم قرآن کی دو منزلیں اول لفظی ترجمہ دوم [illegible] تفسیر [illegible]

ضرورت اس بات کی تھی کہ بیان القرآن کے طرز پر ایک [illegible] تفسیر لکھی جائے جو مطالب قرآنیہ کی توضیح و تشریح اور ربط آیات کے علاوہ احادیث سیر اور اقوال صحابہ و تابعین پر مشتمل ہو بقدر ضرورت لطائف و معارف اور نکات اور مسائل مشکلہ کی تحقیقات اور عقائد [illegible] کی تردید اور [illegible] کے شبہات و اعتراضات کے جوابات پر حاوی ہو تاکہ کلام خداوندی کی عظمت و شوکت اور اس کی جامعیت اور اس کے اعجاز کا کچھ نمونہ سامنے آ جائے اور تفسیر جمہور صالحین کے مسلک سے ذرہ برابر بھی ہٹی ہوئی نہ ہو بلکہ [illegible] و تابعین سے لیکر اس وقت تک امت کے علماء ربانیین اور راسخین فی العلم نے جس طرح قرآن کریم کا مطلب سمجھا ہے۔ اسی طرح اس امانت کو بلا کسی خیانت کے مسلمانوں تک پہنچا دی جائے اور کسی جگہ بھی اپنی رائے اور خیال یا نظریہ کو قرآن کے بہانے سے پیش کر کے مسلمانوں کو دھوکہ اور فریب نہ دیا جائے جیسا کہ آجکل آزاد خیالوں کا یہ طریقہ ہے۔ آزاد مفسروں کی یہ تمنا یہ کوشش ہوتی ہے کہ [illegible] یہودیوں اور مسیحی مغربیوں اور یورپ کے ملحدوں کے خیالات باطلہ کو قرآن کے نام سے مسلمانوں میں پھیلا دیا جائے ۔

اس فتنہ سے بچنے کے لئے یہ تفسیر لکھی جا رہی ہے ۔ ناچیز سلف صالحین کے اتباع کو سعادت سمجھتا ہے اور سلف کے مسلک سے ہٹ کر تفسیر کرنے کو ضلالت اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت سمجھتا ہے ۔

حضرت رأس المفسرین والمحدثین مولینا شاہ عبد العزیز صاحب قدس اللہ سرہ کی تفسیر فتح العزیز یا تفسیر عزیزی جو ہمارے پاس نا تمام پہنچی ہے، پارہ الم اور سیقول کے پارہ کی آیت ولن تصوموا خیر لکم اور پارہ عم اور تبارک الذی دستیاب ہے بقول مولانا کاندھلوی اگر یہ تفسیر مکمل ہو جاتی تو بے نظیر

پاکستان کی خوش قسمتی تھی کہ حضرت کاندھلوی نے وہاں کے بعد تفسیر معارف القرآن لکھ کر تفسیر عزیزی کی تکمیل فرمائی ہے۔

اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ اگر اس تفسیر کو ملاحظہ فرمائیں تو انتہائی مسرور ہوں کہ میری روحانی اولاد نے میرا کام اور مشن پورا کر دیا۔

اگرچہ پدر نتواند پسر تمام کند

حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ کے شاگرد خاص حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی جنہوں نے مثنوی مولانا روم کی تکمیل کی ہے معروف و مشہور شخصیت ہیں مولانا کاندھلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ان ہی کی اولاد میں سے ہیں۔

معارف القرآن جلد اول سائز کلاں ۶۴۴ صفحات پر مشتمل ہے پہلی جلد میں سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی تفسیر ہے۔

معارف القرآن جلد دوم سائز کلاں ۸۰۲ صفحات تفسیر سورۃ النساء پر مشتمل ہے۔

معارف القرآن جلد سوم سائز کلاں ۶۷۲ صفحات تفسیر سورہ نساء پر مشتمل ہے۔

" " جلد چہارم ۶۱۰ صفحات سائز کلاں پر مشتمل ہے سورہ مائدہ اور سورہ انعام کی تفسیر ہے۔

" " جلد پنجم ۶۳۶ صفحات سائز کلاں پر مشتمل ہے اس میں سورہ اعراف سورہ انفال اور سورہ توبہ کی تفسیر ہے۔

" " جلد ششم سائز کلاں ۶۱۱ صفحات پر مشتمل ہے سورہ یونس تا سورہ حجر کی تفسیر ہے۔

حضرت کاندھلوی نے اپنی تفسیر میں خود ترجمہ اپنی طرف سے نہیں کیا۔ بلکہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادرؒ خلف الرشید حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ کا ترجمہ جو اپنی خوبیوں کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے نقل کر دیا ہے۔

حضرت مولانا کاندھلوی کی تفسیر متقدمین و متاخرین کی کتب تفسیر کا عطر و لباب ہے۔ حقائق و معارف قرآنی حکم میں یہ تفسیر حضرت امام رازی کی تفسیر کبیر اور ابوحیان کی تفسیر البحر المحیط اور سید محمود آلوسی کی روح المعانی اور قاضی ابوبکر بن العربی کی تفسیر احکام القرآن اور تفسیر ابوالسعود کا انتخاب ہے اور حقائق و اسرار اور باطنی لطائف میں ملا مخدوم مہائمی کی تفسیر قاضی بیضاوی کی تلخیص ہے۔ بیان احکام میں احکام القرآن للجصاص اور تفسیر مظہری مولانا ثناء اللہ پانی پتی ان کی بنیاد ہے۔ تحقیق مفردات میں امام راغب کی مفردات اس کا اہم ترین ماخذ ہے جگہ جگہ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ اور حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہما کے اسرار و معارف اس تفسیر میں شامل فرمائے ہیں یہ تفسیر ابھی زیر تالیف تھی کہ رجب ۱۳۹۴ھ کو حضرت کا وصال ہو گیا۔ حضرت نے سورہ طٰہٰ تک مکمل تفسیر تحریر فرمائی ہے۔

اور پورے قرآن حکیم کے مشکل اور اہم مقامات کی مکمل تفسیر دست مبارک سے تحریر فرما چکے ہیں۔

چنانچہ حضرت کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادہ اور جانشین حضرت مولانا محمد مالک شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ نے شائع کیا ہے امید ہے کہ دوسرے حصص بھی انشاء اللہ جلد شائع ہو جائیں گے، تفسیر میں جو کمی رہ گئی ہے وہ بھی انشاء اللہ حضرت حافظ مولانا محمد مالک صاحب باحسن وجوہ پوری کر دیں گے، اور یہاں پھر وہ مصرعہ لکھتا ہوں:

اگرچہ پدر نتواند پسر تمام کند

آپ کے صاحبزادہ حضرت مولانا محمد مالک صاحب حضرت کے جانشین اور شیخ الحدیث کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں وہ بالکل حضرت کے ثانی نظر آتے ہیں الولد سر لابیہ کے صحیح مصداق ہیں۔

حضرت کاندھلوی کی اس تفسیر معارف القرآن کے علاوہ جامع مسجد نیلا گنبد میں ہر جمعہ کو کسی ایک آیت کی تفسیر بیان فرمائی ہے اور تقریباً بیس سال

تک حضرت کے مواعظ حسنہ کا سلسلہ جاری رہا ہے اس درسِ قرآن سے بلا مبالغہ ہزاروں لوگوں نے استفادہ کیا ہے۔ لاہور کے علاوہ دوسرے شہروں گوجرانوالہ، گکھڑ، شیخوپورہ وغیرہ شہروں سے حضرت کا وعظ یا درس قرآن سننے کے لئے آتے تھے، افسوس کہ جامع مسجد نیلا گنبد کا سلسلہ تو جاری نہ رہ سکا۔ اب جو اسی خطیب ہیں وہ بھی حضرت کے تلمیذ ہیں حضرت الحاج مولینا محمد مالک صاحب کاندھلوی نے درس قرآن کا سلسلہ مکی جمیل جامع مسجد سمن آباد میں شروع کیا ہے روزانہ مغرب کے بعد درس دیتے ہیں، ماشاء اللہ سمن آباد کی کھی پڑھی آبادی میں درس کی طرف اچھی خاصی رجوعات ہے اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ لوگوں کو شرکت کرنے اور فیوض و برکات حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ حضرت مولینا کاندھلوی کا ایک مقالہ مفسر و مترجم بھی ہے جو شائع ہو چکا ہے اور آپ نے تفسیر بیضاوی کی شرح بھی تالیف فرمائی ہے اور غیر مطبوعہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے علماء اور مفسرین کے لئے یہ تالیف بڑی گرانقدر رہے۔

التحریر فی اصول التفسیر

حضرت مولینا محمد مالک شیخ الحدیث

جامعہ اشرفیہ لاہور

قرآن حکیم کی حقیقی عظمتوں اس کے مقاصد عالیہ اعجاز و احکام فصاحت بلاغت کو سمجھنے کے لئے اصول التفسیر کا مطالعہ ضروری ہے فاضل مؤلف نے اس کتاب میں الفوز الکبیر فی اصول التفسیر اور الاتقان فی علوم القرآن شیخ جلال الدین سیوطی اور التبیان فی علوم القرآن العلامۃ الجزائری، تفسیر ابن کثیر، روح المعانی اور کتب احادیث سے پوری طرح استفادہ کیا ہے فاضل مؤلف کو اپنے والد ماجدؒ کے علاوہ حضرت شیخ الاسلام مولینا شبیر احمد عثمانی مرحوم و مغفور سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ حضرت عثمانی نے مولینا محمد مالک کو بخاری شریف پڑھانے کے لئے اپنے دولت کدہ پر بخاری شریف کا درس دینا شروع فرمایا تھا۔ فاضل مؤلف پر دونوں بزرگوں کا رنگ نمایاں ہے۔ یہ کتاب التحریر فی اصول التفسیر کراچی یونیورسٹی اور حیدرآباد سندھ میں ایم اے اسلامیات ایم اے عربی کے نصاب میں شامل ہے بڑے سائز کے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اصول التفسیر کے موضوع پر ایک بلند پایہ تالیف ہے۔ جس میں اصول و قواعد تفسیر نہایت تحقیق و جستجو اور تفصیل کے ساتھ درج کئے ہیں۔ قرآن محل کراچی نے یہ کتاب شائع کی ہے۔

حضرت مولینا محمد مالک صاحب نے قرآنی علوم پر ایک عظیم و ضخیم کتاب بھی تالیف فرمائی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب جو مطالب قرآن پر نہایت جامع اور مفید تالیف ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی شائع ہو جائے گی۔ یہ کتاب مکتبہ ناشران قرآن شائع کر رہے ہیں تقریباً ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگی اس کا نام منازل العرفان فی علوم القرآن ہے۔

حضرت مولینا حفظ الرحمٰن

سیوہاروی مرحوم و مغفور

قصص القرآن چہار جلد

حضرت مولینا حفظ الرحمٰن سیوہاروی جمعیت العلماء ہند کی روح رواں اور دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت اور جانبازی اور حکومت وقت کے سامنے ان کے مطالبات پیش کرنے کا کام جو مرحوم نے کیا ہے وہ کسی اور کا حصہ نہیں۔

موصوف تحریر و تقریر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ حضرت انور شاہ کشمیری کے خاص تلامذہ میں سے تھے آپ نے قرآن شریف کی تفسیر تو تالیف نہیں کی ہے لیکن قرآن شریف میں جن انبیاء کا ذکر ہے ان کے تفصیلی حالات و واقعات معتبر کتابوں سے اخذ نقل کر کے تحریر کئے ہیں یہ کتاب چار

مشتمل ہے۔

قصص القرآن حصہ اول ۲۰۰ صفحات حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت ہارون علیہ السلام تک قصص و واقعات پر مشتمل ہے۔

قصص القرآن حصہ دوم صفحات

" " " سوم "

" " " چہارم ۲۹۲ صفحات حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت محمد مصطفےٰ خاتم النبیین رحمت للعالمین کے حالات پر مشتمل ہے قرآن حکیم کا تفصیلی مطالعہ کرنے اور اسلامی علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے قصص القرآن ایک بہترین کتاب ہے جس میں رطب و یابس روایات وحکایات سے احتراز کیا گیا ہے مولینا سیوہاروی نے کئی کتابیں تالیف فرمائی ہیں، اسلام کا اقتصادی نظام بھی مولینا کی ایک اہم تالیف ہے یہ کتاب حضرت شاہ ولی اللہ کے فلسفے اور اور حکمت کی روشنی میں لکھی گئی ہے، اس سلسلہ میں ابھی اور کام کرنے کی ضرورت ہے مولینا سیوہاروی کو شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور ان کے خاندان سے جو روحانی نسبت اور تعلق تھا غالباً یہ اس ہی کا اثر ہے کہ انتقال کے بعد آپ کو حضرت شاہ صاحب کے قبرستان میں دفن کیا گیا ہے

شیخ المفسرین حضرت مولینا حسین علی صاحب مرحوم ومغفور

حضرت نہایت سادہ مزاج بزرگ تھے، اپنے ہاتھ سے کام کرتے مزدوروں کی طرح کام کرنے میں کوئی عار محسوس نہ فرماتے۔ ہمیشہ موٹا جھوٹا لباس پہنتے پنجاب کے اطراف غلط قسم کے لوگوں نے عوام الناس کے عقائد کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ عام آدمی بزرگوں کے مزاروں پر حاضر ہو کر شرعی حدود قائم نہیں رکھتا۔ بزرگوں سے عقیدت بہت جلد افراط کا شکار ہو کر عبادت تک پہنچ جاتی ہے۔ حضرتؒ نے ماحول کا پوری طرح جائزہ لے کر اپنے اکثر مواعظ اور اسباق میں توحید کو موضوع قرار دیا، توحید کے عنوان پر آپ نے عوام الناس کو بھی خطاب فرمایا، طلبا اور علما کو بھی متوجہ کیا۔ حضرت کا اوڑھنا بچھونا مسئلہ توحید تھا۔ حضرت مولینا قاضی شمس الدین صاحب مدظلہ جو آجکل گوجرانوالہ میں دینی خدمات میں مصروف ہیں۔ حضرت مولینا حسین علی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، حضرت قاضی صاحب کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں مدرس رہے ہیں، آپ نے قرآن شریف نصف آخر کا درس دارالعلوم دیوبند میں دیا تھا، احقر بھی درس میں شریک ہوتا تھا۔

حضرت کے تلامذہ میں مولینا غلام اللہ خاں وغیرہ بھی شامل ہیں۔

حضرت کے ملفوظات وارشادات کی روشنی میں آپ کے شاگرد رشید نے جواہر القرآن تالیف فرمائی ہے جو قابل مطالعہ تالیف ہے اور بلغۃ الحیران فی تفسیر القرآن بھی آپ کے ارشادات وملفوظات پر مشتمل ہے۔

حضرت مولینا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی مدظلہ العالی بانی دارالعلوم کورنگی کراچی

حضرت مفتی صاحب مدظلہ دارالعلوم دیوبند میں مفتی اعظم اور حدیث کے استاد تھے قیام پاکستان تحریک میں بڑی جدوجہد فرمائی اور دیوبند سے ہجرت کرنے کے بعد کراچی میں رہائش اختیار کر لی۔ علم وفضل میں حضرت کا مقام بہت بلند ہے۔ حضرت مولینا محمد ادریس کاندھلوی مرحوم کے معاصر اور خاص احباب میں تھے۔ آپ میں ایکدوسرے کے ساتھ جو محبت اور خلوص تھا وہ معاصرین میں مفقود ہے حضرت مفتی صاحب کے علم اور وسعت مطالعہ کی قدر حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ بھی کرتے تھے اور حضرت مدنی بھی۔

حضرت مولینا مفتی عزیز الرحمٰن علم وفضل اور تقویٰ وطہارت

کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھے، علامہ مولینا عثمانی کے بڑے بھائی تھے، مولینا عثمانی ان کے بوسے سیدھے کیا کرتے تھے، حضرت مفتی صاحب کا انتقال ہوا تو حضرت انتقال کے وقت تک فتوے لکھتے رہے، مولینا عثمانی نے اس خیال سے شدت مرض وفات کے وقت کہ کوئی بات بغیر سوچے کچھ غلط نہ لکھی گئی، وہ تمام فتاویٰ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کو دیکھنے کے لئے فرمایا۔

علامہ عثمانی کی نظروں میں مفتی محمد شفیع صاحب کی کیا عظمت تھی کہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن جیسے فرشتہ صفت انسان اور اپنے مربی اور استاد کے فتویٰ پر نظر ثانی کرنے کا اعزاز دیا جا رہا ہے، حضرت مفتی صاحب نے بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف فرمائی ہیں خاص طور سے معارف القرآن جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے نہایت عظیم تالیف ہے۔ اسی نام سے حضرت مولینا کاندھلوی نے تفسیر تالیف فرمائی ہے اور اسی نام سے حضرت مفتی صاحب نے دونوں بزرگوں کی تفسیریں چھپنے کے بعد معلوم ہوا کہ نام میں توارد ہو گیا۔

حضرت مولینا کاندھلوی فرماتے تھے کہ نام دونوں تفاسیر کا ایک ہے تو کیا ہے ہم بھی تو ایک ہی ہیں۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ حضرت کاندھلوی کی تفسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد حضرت مفتی صاحب کی تفسیر کا مطالعہ کیا جائے تو تکرار مضامین کے بجائے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نے آپس میں طے کر لیا ہے کہ آپ فلاں امور کی وضاحت کریں میں فلاں امور کی تشریح کروں گا۔ قرآن فہمی کے لئے مولینا کاندھلوی کی تفسیر اہم و انفع ہے اور مسائل حاضرہ کو قرآن کی روشنی میں حل کرنے کے لئے مفتی صاحب کی تفسیر اکمل و انفع ہے۔ واصل حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے معارف القرآن میں حضرت حکیم الامت کی تفسیر بیان القرآن کی تسہیل و تشریح فرمائی ہے، معارف القرآن کے مطالعہ سے بیان القرآن کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے، سرسری نظر سے بیان القرآن میں جو جمال و جلال ہے وہ نظر نہیں آتا۔ حضرت مفتی صاحب کا یہ کمال و فن ہے آپ نے معارف القرآن میں اس کو واضح اور نمایاں کر کے دکھا دیا ہے۔

ایک مرتبہ ناچیز اور حضرت مولینا کاندھلوی کے چھوٹے صاحبزادے نے حضرت سے عرض کیا کہ بیان القرآن کے مقابلہ میں مولینا عثمانی کے فوائد زیادہ مفید ہیں، حضرت کاندھلوی نے فرمایا کہ تم لوگ حضرت عثمانی کے فوائد کو کچھ سمجھ لیتے ہو اور حضرت کے بیان القرآن کی رفعت تک تمہاری رسائی نہیں ہوئی، حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے اس کی رسائی کا ذریعہ بتا دیا ہے جس کا دل چاہے وہ بیان القرآن اور قرآن کی عظمت تک رسائی حاصل کر سکے۔

میرے دار العلوم دیوبند کے ساتھیوں میں میاں مولانا تقی الحق صاحب کاکا خیل پشاور کے رہنے والے بھی شامل ہیں موصوف مولوی فاضل وغیرہ علوم شرقیہ کے امتحان دینے کے بعد ایم اے اور دوسرے امتحانات میں امتیازی کامیابی حاصل کی اور آجکل آپ گورنمنٹ کالج کراچی میں پرنسپل ہیں آپ نے معارف القرآن کے متعلق بتایا کہ میں آجکل اس کا مطالعہ کر رہا ہوں اس تفسیر کے متعلق میرا تاثر یہ ہے کہ دور حاضر کی سب سے بہتر اور جامع تفسیر ہے اور اس تفسیر سے حکیم الامت مولینا تھانوی کی تفسیر بیان القرآن کی عظمت اور رفعت دلنشیں ہو جاتی ہے۔ آپ نے کہا کہ میں اس تفسیر کو روح المعانی اور تفسیر مظہری یا تفسیر عزیزی کی طرح کم درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوں بلکہ یہ تفسیر ان تفاسیر سے کچھ زیادہ ہی نافع اور جامع ہے۔

جلد اول سائز کلاں ۷۰۰ صفحات، جلد دوم ۶۲۸ صفحات جلد سوم ۶۳۰ صفحات، جلد چہارم ۹۸۰، جلد پنجم ۶۵۲ صفحات جلد ششم ۵۶ صفحات، جلد ہفتم ۸۱۹ صفحات جلد ہشتم ۸۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی بعض خصوصیات درج ذیل ہیں۔ کتابت و طباعت معیاری

[illegible] ہے ۔

(۱) ترجمہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ جو اصل میں حضرت شاہ عبدالقادر قدس اللہ سرہ کا ترجمہ ہے اور حضرت شیخ الہند نے [illegible] تسہیل فرمائی ہے نقل کیا گیا ہے

(۲) خلاصہ تفسیر کے تحت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی بیان القرآن کے شروع میں خلاصہ تفسیر مختصر الفاظ میں پیش کیا گیا ہے اس کو پورا کا پورا لے لیا گیا ہے البتہ اس خلاصہ میں جو مشکل الفاظ ہیں ان کی تشریح اپنی عبارت میں کر دی ہے ۔

(۳) حضرت تھانوی نے اس خلاصہ تفسیر میں ترجمہ قرآن کے ساتھ ہی کچھ الفاظ تفسیر کے بڑھا کر مختصر جامع تفسیر اس طرح لکھی ہے کہ اصل ترجمہ خط کھینچ کر ممتاز کر دیا ہے اور تفسیری زائد کو بغیر خط کے قوسین کے درمیان لکھا ہے اس طرح تفسیر میں حکیم الامت کا پورا ترجمہ اور ضروری تفسیر بھی آگئی اور دو مستند تراجم مستقل سامنے آگئے ۔

(۴) معارف ومسائل کے عنوان سے حضرت مفتی صاحب نے عصر حاضر کی بہترین اور نہایت مفید بلکہ شاہکار تفسیر تالیف فرمائی ہے حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ احقر کی صرف اردو عبارت ہے مضامین سب علماء سلف کی تفاسیر سے لئے گئے ہیں جن کے حوالے لکھ دیئے گئے ہیں یہ معارف ومسائل اس تفسیر کی جان ہیں ۔ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کو تا دیر سلامت رکھے اور ان کے فیوض وبرکات سے ہم کو مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے ۔ معارف ومسائل کے تحت حضرت نے بے شمار عصری مسائل پر عالمانہ اور محققانہ بحث فرمائی ہے ۔

(۵) حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اس تفسیر میں حل لغات اور فن بلاغت کے نکات اور اختلاف قرائت جو عالموں کے لئے مفید ہے لیکن عوام کے لئے تفسیر سمجھنے میں دشواری کا باعث ہو جاتے ہیں اس لئے صرف قول راجح کو نقل کر دینے پر اکتفا کیا ہے ۔ کیونکہ قرآن حکیم میں اللہ نے ارشاد فرمایا ہے ولقد یسرنا القرآن للذکر ہم نے قرآن کو آسان کر دیا نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے ۔ اس لئے اس تفسیر میں عوام الناس کی سہولت اور ان کو قرآن حکیم سے ذوق وشوق پیدا کرنے کے لئے حتی الامکان ہر طرح آسانی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

(۶) مستند اور معتبر تفاسیر سے ان مضامین کو نقل کیا ہے جو انسان کے دل میں قرآن کی عظمت اور محبت پیدا کرنے کا باعث ہوں اللہ تعالیٰ کی محبت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور پیروی کا شوق پیدا کریں ۔

(۷) اس زمانہ کے مشینی دور نے جو نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں ۔ سلف صالحین کے ارشادات کی روشنی میں قرآن حکیم کے ذریعہ ان مسائل کو حل کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے علماء بعض علماء عصر سے مشورے بھی کئے ہیں اور سلف کے طریقے پر قائم رہتے ہوئے ان مسائل کا حل تلاش کیا ہے جس میں الحمد للہ بڑی کامیابی ہوئی ہے بلکہ اس کے ساتھ ملحدانہ خیالات شکوک وشبہات کے ازالہ میں بھی پوری اور کامیاب کوشش کی گئی ہے ۔ اسلامی مسائل میں ادنیٰ ترمیم کو قبول نہیں کیا گیا اور نہ ہی جدید معترضین سے ڈر کر اسلامی مسائل کی تاویلیں کی گئی ہیں ۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہ العالی اس تفسیر کے متعلق فرماتے ہیں

احقر ناکارہ نہ اس کا اہل تھا کہ تفسیر قرآن لکھنے کی جرأت کرے نہ کبھی اس خیال کی ہمت کرتا تھا البتہ اپنے مرشد حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن کو جو اس زمانہ میں بے نظیر متوسط تفسیر ہے نہ بہت مختصر کہ مضمون قرآن سمجھنا دشوار نہ بہت طویل کہ پڑھنا مشکل ہو پھر خداداد علم وذکاوت اور تقویٰ وطہارت کی برکت سے اقوال مختلفہ میں ایک کو ترجیح دیکر لکھتے جو خاص ذوق حق تعالیٰ نے موصوف کو فرمایا تھا وہ بڑی تفسیروں سے بھی حاصل کرنا مشکل تھا ۔ مگر یہ تفسیر حضرت نے اہل علم کے لئے انہی کی زبان اور علمی اصطلاحوں میں لکھی ہے ، عوام خصوصاً اس زمانے کے عوام جو عربی زبان اور اس کی اصطلاحات

سے بہت دور ہو چکے ہیں ان کے لئے اس تفسیر سے استفادہ مشکل تھا اس لئے یہ خیال ظاہر کیا کرتا تھا کہ اس کے مضامین عجیبہ کو آج کل کی آسان زبان میں لکھا جائے۔

قضاء و قدر کی طرف سے اس تفسیر کی تالیف کا سبب یہ ہوا کہ ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر نے حضرت مفتی صاحب سے معارف قرآن کا سلسلہ جاری کرنے کی خواہش کا اظہار کیا حضرت مفتی صاحب نے محض لوجہ اللہ یہ خدمت قبول فرمائی اور ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۴ء تک یہ سلسلہ معارف قرآن جاری رہا۔ اس کے متعلق محکمہ نے اپنی پالیسی کی وجہ سے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ لیکن اس دوران جو اس سلسلہ سے مستفیض ہوئے پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں مثلاً افریقہ میں اس سلسلہ کو ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے محفوظ کر کے تبلیغی مجالس میں بار بار سنانے کا پروگرام جاری ہوا اور سب طرف سے اس تفسیر کی تدوین اور اشاعت کا تقاضا شروع ہوا بہرحال اللہ تعالیٰ نے مفتی صاحب سے یہ کام لینا تھا اور یقیناً مفتی صاحب اس کام کے لئے نہایت موزوں اور منتخب شخصیت ہیں۔ اللہ نے انکو قرآن حکیم کی مکمل تفسیر لکھنے کی سعادت فرمائی۔ حضرت مفتی صاحب بار بار یہی فرماتے ہیں کہ میرا اس تفسیر میں کچھ نہیں ہے۔ سب بزرگوں کا برکت ہے۔ میں نے بزرگوں کی تفاسیر کو آسان کر کے پیش کیا ہے۔

آج کل مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بانی جماعت اسلامی کی بہت شہرت ہے لیکن چند اہل علم دوستوں نے جو علوم عربیہ عقلیہ و نقلیہ کے علاوہ علوم جدیدہ سے واقف اور انگریزی زبان میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے دونوں تفاسیر کا مقابلہ کیا ہے۔ ان کا یہ بیان ہے کہ معارف القرآن مولانا مودودی کی تفسیر کے مقابلہ میں بہت اعلیٰ و ارفع ہے اور مسلک حقہ اہل سنت والجماعت کے عقائد کے مطابق ہے۔ ایک خاص بات حضرت مفتی صاحب کی تفسیر میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ مفتی صاحب عاجزی اور انکساری میں انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں اور اپنے متعلق یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ وہ کوئی تفسیر تصنیف کریں۔ جیسا کہ حضرت مفتی صاحب کی عبارت نقل کی گئی ہے لیکن مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اپنی رائے اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ سلف صالحین کی رائے سے بالکل جداگانہ کچھ کم نہیں ہے اور اکثر ایسا لگتا ہے کہ ان سے لغزش ہو گئی ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں جو عاجزی انکساری اور تواضع پائی جاتی ہے مثلاً حضرت شیخ الہند کی عبارت نقل کی گئی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں قرآن کریم کا نیا ترجمہ کرنے کے لئے تیار نہ تھا اس لئے کہ صرف نام کے لئے کوئی کام کرنا بے سود ہے بالآخر حضرت شاہ عبدالقادر صاحب قدس اللہ سرہ کے ترجمہ کو آسان کرنا منظور فرمایا۔ حضرت شیخ الہند نے اس ترجمہ کا کچھ حاشیہ لکھ دیا ہے باقی جس علامہ عثمانی نے اضافہ کرنا گستاخی سمجھا۔ اور کسی ترمیم و اضافہ سے احتراز کیا اکابر کا یہ ادب و احترام جو ان بزرگوں میں تھا وہ دوسروں میں ناپید ہے

حضرت مفتی صاحب کے معارف القرآن حصہ اول کی طباعت دوم میں ترمیم و اضافہ کے علاوہ ایک مقدمہ جو طویل مقالہ (علوم قرآن) کا خلاصہ ہے اور بڑے سائز کے تقریباً ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ حضرت مفتی صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدرس دارالعلوم کراچی نے تحریر کیا ہے، علوم قرآن کے نام سے علیحدہ شائع ہو چکا ہے۔

مفکر اسلام قائد حریت حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ

وصال ۱۔ رمضان ۱۳۶۳ھ

حضرت استاذی مولانا عبیداللہ سندھی حضرت شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں شامل تھے۔ جذبہ آزادی اور تحریک حریت کی روح رواں ہونے کی وجہ سے قائد حریت کے مصداق تھے۔ آپ نے حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولانا شاہ ولی اللہ اعلی اللہ مقامہ کی کتابوں کا نہایت غور سے مطالعہ کیا اور حضرت شاہ صاحب کی بیان فرمودہ حکمت اور وحدت انقلاب یا اسلامی انقلاب کے خود داعی و مبلغ کی حیثیت سے کام کیا۔

حضرت مولانا سندھیؒ نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی کتاب پڑھا کر تحقیق
اور ریسرچ کی اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی دعوت دی۔
حضرت مولانا سندھیؒ نے حضرت شاہ صاحب کی کتابوں سے
جو سمجھا ہے وہ آج کے مسائل کو مرتب انداز میں ہم کرکے پیش کیا۔
حضرت مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ اگر حضرت شاہ صاحبؒ کی تعلیمات
پر عمل کیا جاتا۔ تو کمیونزم میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں جو باقی ہو ساری
دنیا کو لائے جو آج کارل مارکس اور اس کے نظریہ کو کوئی جانتا۔ سوشلزم
اور کمیونزم کا جو پروگرام ہے وہ اسلام کے نظریہ اور حکمت و تعلیم میں وہ سب چیزیں موجود
ہیں۔ جن کی دنیا کو ضرورت ہے اور ان کے ذریعے دنیا کے پیچیدہ مسائل کا صحیح
حل کیا جا سکتا ہے چونکہ آپ نے کارل مارکس کی پیدائش سے ایک صدی قبل
بین الاقوامی فکر و عمل پیش کیا ہے اس سلسلہ میں فلسفہ، نظریات و مذہب
کا مطالعہ کیا جاسکے۔

حضرت شاہ صاحب نے صرف نماز اور روزہ کے مسائل بیان نہیں
کیے ہیں بلکہ اسلام کو ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ جس
میں روحانیت کے علاوہ مادیات پر بھی پوری بحث کی گئی ہے۔ اور تمام
اقتصادی مسائل، معاشرتی، تجارتی، اجیر و مالیاتی اور نظام اراضی، ملکیت و
دولت وغیرہ مسائل پر مکمل روشنی ڈالی ہے۔ اگر حضرت شاہ صاحب کو
اپنی حکمت اسلام اور دعوت انقلاب کے لیے ابلاغ کے ذرائع حاصل
ہو جاتے اور لوگ ان کو قبول کرکے ان پر عمل پیرا ہو جاتے تو آج دنیا کا نقشہ
ہی دوسرا ہوتا۔

سوشلزم اور کمیونزم، عمل اور ردعمل کے نتیجہ میں عالم وجود میں
آئے ہیں اور ناشناس خدا لوگوں بلکہ مذہب کے باغیوں اور دشمنوں کے ذہن
اور فکر سے نکلا ہوا فلسفہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو رب العالمین اور احکم الحاکمین ہے
اور تمام کائنات میں اس کا قانون اور دستور جاری و ساری ہے کوئی چیز
کائنات قدرت اور آئین فطرت کے خلاف کوئی حرکت نہیں کر سکتی، سورج
کے طلوع و غروب، چاند کے گھٹنے بڑھنے پیدا ہونے اور گھٹنے کا جو دستور
حق تعالیٰ نے بنایا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ جو اس میں فرق کرے۔
انسان بہت سی چیزوں میں مجبور محض ہے، خود پیدا ہونا، مرنا، کھانا
کھانے کے بعد اس کا ہضم ہونا، خون اور نطفہ بننا یہ تمام امور ایسے ہیں کہ انسان
کو ان کی کوئی خبر نہیں کس طرح انجام پاتے ہیں۔ لیکن کچھ امور اختیاری ہیں۔ جو
انسان کے کسب و اختیار میں ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کو کوشش کرنی
چاہیے کہ اس سرزمین پر جہاں ہم بستے ہیں اور رہتے ہیں بلکہ تمام جہان
میں اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا قانون فطرت، اور آئین حکمت جاری و ساری کیا جائے
یہی وہ بار امانت ہے جو حضرت انسان نے اٹھایا اور خلافت ربانی کا
مستحق ہوا۔

حضرت شاہ صاحب کی دعوت کو سمجھانے کے لیے حضرت
استاذی مولانا سندھیؒ نے اپنی پوری زندگی ختم کر دی۔ اعلی اللہ مقامہ، حجۃ
اللہ البالغہ،

حضرت نے قرآن حکیم کی کئی سورتوں کی تفسیر لکھائی ہے۔ سورۂ معوذ
تین اور سورۂ اخلاص کی تفسیر قرآنی فکر انقلاب کے عنوان سے اور سورۂ
مزمل و سورۂ مدثر کی تفسیر قرآنی دستور انقلاب کے نام سے اور سورۂ قتال
قتال کی تفسیر جنگ انقلاب سے موسوم ہے۔
دارالعلوم دیوبند میں اعلیٰ کلاسوں کے طلباء کو دارالحدیث میں
خطاب فرمایا اور سورۂ کوثر کی عجیب و غریب حکیمانہ تفسیر بیان فرمائی۔ ناچیز نے
یہ تفسیر قلم بند کرکے شائع کر دی ہے۔ طبع دوم ترمیم و اضافہ کے ساتھ شائع
کی جائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ تفسیر سورۂ نبا، تمدن عرب، قرآن حکیم کا مقدمہ
اور تفسیر سورۂ فاتحہ، قرآن کریم کا مطالعہ کیسے کیا جائے۔ حضرت مولانا سندھیؒ
کو قرآن حکیم سے بہت زیادہ شغف تھا اور شاہ ولی اللہ کی حکمت کے بڑے
مفسر اور مبلغ ہیں۔ آپ نے قرآن شریف کی انقلابی تفسیر تحریر اور تقریر کے

درس قرآن

حضرت مولانا کو درس قرآن کے سلسلہ میں جو شغف تھا اور جس قدر پابندی سے درس کے متعلق کرتے تھے حیرت انگیز اور نصیحت آمیز ہے حضرت اگر شہر میں موجود ہوتے تو درس کا ناغہ ہو جاتا اور کسی وجہ سے آپ ہرگز درس کا ناغہ نہ فرماتے۔

ایک بار حضرت کی ایک بچی بیمار تھی، حضرت درس قرآن میں مصروف تھے کہ گھر سے پیغام آیا کہ لڑکی کی طبیعت سخت علیل ہے۔ آپ نے پرچہ پڑھا اور درس جاری رکھا۔ دوسرا پرچہ آیا کہ بچی کی بے چینی بڑھ رہی ہے۔ حالت نزع طاری ہو گیا ہے۔ آپ نے پرچہ پڑھا اور درس جاری رکھا بالآخر تیسرا پرچہ آیا کہ لڑکی کا انتقال ہو گیا ہے۔ آپ نے انا للہ و انا الیہ راجعون کہا۔ اور درس کو دستور کے مطابق ختم کیا اور درس کے بعد گھر گئے اور فرمایا کہ بچی اللہ تعالیٰ کی امانت تھی اس نے اپنی امانت واپس لے لی۔ میں اسی ہی کا کلام اور فرمان آپ تک پہنچا رہا تھا۔ اس لیے درس کا درمیان سے بند کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

پنجاب میں دورۂ تفسیر یا باقاعدہ درس قرآن کا سلسلہ حضرت لاہوریؒ نے شروع فرمایا تھا۔ آج یہ درس کا سلسلہ ملک کے طول و عرض میں جاری ہے اور سالانہ ہزاروں طلبا۔ قرآن حکیم کے درس میں شریک ہو کر مستفیض ہو رہے ہیں۔

اہلیہ صاحبہ حضرت میاں مولانا عزیز گل صاحب اسیر مالٹا

حضرت مولانا عزیز گل حضرت مولانا شیخ الہندؒ کے ممتاز شاگرد ہیں اور آپ نے جہاد حریت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا حضرت شیخ الہندؒ کی معیت میں گرفتار ہوتے جیل گئے مصائب اور تکالیف برداشت کیں، آپ نے ایک جوان عورت کو مسلمان کر لیا تھا اور اس کو قرآن حکیم کی تفسیر خود پڑھاتے تھے، یہ عورت بڑی قابلیت والی عورت تھی اس نے حضرت سے قرآن کریم کی تفسیر پڑھنے کے بعد اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے۔

مولانا میاں تقویم الحق صاحب کاکاخیل فاضل دیوبند ایم اے پرنسپل گورنمنٹ کالج کوہاٹ اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ فیروز سنز لاہور نے لندن سے شائع کیا تھا۔ پاکستان میں یہ ترجمہ نایاب ہے مکتوب ۲۰.۱.۸۰

جناب علامہ موسیٰ جار اللہ مرحوم

علامہ موسیٰ جار اللہ مرحوم دنیائے اسلام کے مشہور علمی انسان تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے بعد روس میں آپ کی بہت عزت کی جاتی تھی لیکن اشتراکیت کے دور میں آپ روس سے جلاوطن کیے گئے پھر ترکی اور ہند و پاک میں بھی رہے۔

علامہ دراصل حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے شاگرد خاص ہیں۔ جبکہ آپ نے علامہ سندھی سے ۱۹۳۰ء و ۱۹۳۰ء میں مکہ معظمہ کے قیام کے دوران میں قرآن حکیم کی تفسیر پڑھی تھی یہ امالی تفسیر القرآن عربی زبان میں ہے، اس کا نام الہام الرحمان ہے۔

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب قاسمی فاضل دیوبند نے اس تفسیر کو از سر نو مرتب کیا ہے اور ان امالی کے ابتدائی حصہ کا ترجمہ مولانا ابو العلاء محمد اسمٰعیل گودھروی مرحوم نے کیا ہے علامہ جار اللہؒ کی تصانیف فارسی، عربی اور ترکی زبانوں میں ہیں اور ان کی تالیفات کو اسلامی دنیا میں بڑی قدر و منزلت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اور اعلیٰ علمی حلقوں میں ان کا بلند مقام سمجھا جاتا ہے[1] (بحوالہ مولانا سندھی کے امالی تفسیر القرآن الرحیم حیدرآباد نومبر ۱۹۶۳ء)

---

[1] حضرت سندھیؒ کے بہت سے متبعین کی تحریروں میں اہل حق کے مسلک کے خلاف ایسی چیزیں پائی گئی ہیں، جن کو دارالعلوم دیوبند کی طرف نسبت نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اکابر دارالعلوم دیوبند اس سے برأت کا اظہار کر چکے ہیں۔ الرشید

حضرت شیخ الحدیث مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری

دارالعلوم کراچی

حضرت مولانا بنوری مدظلہ حضرت فخر المحدثین مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس اللہ سرہ کے شاگرد خاص اور تحریک تحفظ ختم نبوت کے مرکزی امیر ہیں۔

آپ کی ایک کتاب یتیمۃ القرآن فی مشکلات القرآن دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔

جناب مولانا حبیب احمد صاحب کیرانوی

آپ نے قرآن شریف کا ترجمہ اور تفسیر ۳۰ جلد میں تالیف کی ہے۔ مرتب سیارہ ڈائجسٹ قرآن نمبر لکھتے ہیں، اس تفسیر کو حرفاً حرفاً حضرت حکیم الامت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی نے پڑھا ہے اور کئی جگہ مفید حواشی کا اضافہ فرمایا ہے۔ مکتب خانہ امدادیہ دیوبند سے مولوی محمد اسحٰق صاحب نے اس کو شائع کیا ہے۔

مولانا فضل ودود و مولانا گل رحیم اسماری فاضل دیوبند

مولانا فضل ودود نے ۱۵ پاروں کی تفسیر اور ترجمہ پشتو زبان میں کیا ہے اور ۱۵ پاروں کی تفسیر مولانا گل رحیم اسماری نے کی ہے۔ اس کی تفسیر میں خازن، معالم التنزیل، جمل، روح البیان وغیرہ تفاسیر اور دوسرے تراجم سے بہتر ہے اور مستند ہے اور اس تفسیر و ترجمہ کے دونوں مصنفین خود اعلیٰ درجہ کے خوش نویس دونوں حضرات عالم و فاضل ہونے کے ساتھ فن کتابت کو بطور پیشہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ سلف کے حالات میں تو ایسی مثالیں بہت ہیں لیکن اس دور میں یہ نوادرات سے ہے۔

جناب مولانا سید ممتاز علی دیوبندی بانی دار [illegible]

آپ نے قرآن کریم کا انگریزی [illegible] اس کے علوم کی ضروری تفصیل [illegible] فی علوم القرآن برسوں محنت و مشقت کر کے ترتیب دیا اور [illegible] گیلانی پریس سے ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا ہے۔ ترجمہ ابھی نامکمل [illegible] کا انتقال ہو گیا۔ باقی مولانا نجم الدین صاحب [illegible] یہ کتاب ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور قرآنی انڈکس ہونے کے اعتبار سے بہت ہی کارآمد اور مفید ہے۔ بعض روایات کے مطابق اس کتاب سے مولانا ابوالکلام آزاد اور بعض دوسرے علماء بھی استفادہ کرتے رہے ہیں۔

مولف نے حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی سے درخواست کی تھی کہ اس کتاب میں جو خامیاں اور نقائص نظر آئیں ان کی اصلاح فرما دیں تاکہ آئندہ طباعت میں ان کی اصلاح کی جائے۔ حضرت تھانوی نے اس سلسلہ میں ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے، غالباً مولف کی وفات کی وجہ سے نئے ایڈیشن کی طباعت اور اس کی اصلاح کا موقع نہیں آیا۔ ضرورت ہے کہ ایسی مفید اور جامع تالیف نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کی جائے۔ مولف کے وارثوں میں سے یا کوئی پبلشر صاحب یا محکمہ اوقاف اس مفید کام کی طرف توجہ کرے تو اہل علم حضرات کو قرآنی حوالوں کی تلاش میں بہت سہولت ہو جائے گی۔

صاحبزادہ جناب مولانا سید محمد انظر شاہ مدرس دارالعلوم دیوبند

مولانا انظر شاہ صاحب حضرت علامہ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس اللہ سرہ کے صاحبزادے ہیں۔ آپ نے مشہور تفسیر مدارک التنزیل از عبداللہ نسفی ۷۱۰ھ کا اردو ترجمہ کیا ہے جو مکتبہ خضر راہ دیوبند سے شائع ہوا ہے۔ مترجم نے حاشیہ کا اضافہ بھی کیا ہے۔

نیز معلوم ہوا ہے کہ فاضل مولف نے تفسیر حقانی پر بھی حاشیہ

کی جامع تفسیر ہے۔ ساتھ اصول کا ترجمہ اور حواشی ہے۔ قبل مقدمۃ القرآن نہایت مفید ہے جس میں قرآن فہمی کے لیے بنیادی ضروریات کا بیان درج ہے۔ یہ مستقل کتاب کے طور پر علیحدہ شائع ہوا ہے۔

مترجم نے چاہا کہ نوٹس میں متعلقہ مقامات کی مکمل تشریح بھی کر دی جائے چونکہ تفسیر میں اختصار سے کام لے کر صاحب مدارک نے مختصر کلام کیا تھا جہاں کوئی ضعیف قول پیش کیا گیا اور یہ امر درست نہ تھا وہ سامنے آ سکیں، ان حواشی میں متعدد و مشہور تفاسیر کے حوالے بھی ملیں گے صاحب تفسیر نے فقہی جزئیات پر زیادہ توجہ نہیں فرمائی تھی مترجم نے حواشی میں احکام القرآن جصاص سے اور ابن عربی سے مرتب بہ موضع اس طرح کے احکام کی تعیین و نشاندہی کی ہے۔

اس سے قبل فاضل مترجم تفسیر ابن کثیر کا ترجمہ بھی کر چکے ہیں۔

فاضل مترجم کا یہ علمی اور قرآنی کام دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے، امید ہے کہ آپ انشاء اللہ تعالیٰ اپنے والد ماجد حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہ کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ،

جناب مولانا خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی فاضل دیوبند

سابق استاذ تفسیر جامعہ ملیہ دہلی

کے زیر نگرانی ان کے رفقاء اور معاونین میں جناب حافظ نذر احمد صاحب، حافظ مرغوب احمد صاحب، حاجی عبدالواحد صاحب شامل ہیں ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلیا بلڈنگ لاہور کے تحت قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر شائع ہوئی ہے۔ جس کا نام درس قرآن مع ترجمہ ہے، ہر آیت کے دو ترجمے ہیں ایک لفظی ترجمہ ہے دوسرا محاورے کے مطابق ہے، ہر آیت کی تفسیر نیچے تحریر کر دی گئی ہے اکثر مساجد میں جو آج کل درس مروج ہے وہ اس ہی درس قرآن مع ترجمہ سے ماخوذ ہے۔

خواجہ صاحب نے تفسیر سورہ بقرہ خلافۃ الکبریٰ کے نام سے اور بیان تفسیر سورہ آل عمران الصراط المستقیم انفال و توبہ کی تفسیر ... سورہ یوسف کی تفسیر ... سورہ نور کی تفسیر سبیل الارشاد، سورہ حجرات کی تفسیر ذکریٰ، تفسیر پارہ عم سبل السلام تفسیر سورہ مجادلہ تا تحریم تالیف فرمائی ہیں۔ تفسیر العنوان فی معارف القرآن کے متفرق حصے ہیں۔

جناب پروفیسر مولانا حکیم عبدالصمد صاحب صارم الازہری فاضل دیوبند

آپ کثیر التالیف ہیں، انداز بیان ممتاز اور دلنواز ہے تفسیر میں آپ نے الدر المکنون فی تفسیر الماعون تالیف فرمائی ہے۔

اور آپ کی ایک تصنیف تاریخ القرآن ہے، یہ کتاب قرآن حکیم کی تاریخ پر نہایت مستند اور معیاری تصنیف ہے علماء مصر اور علماء شام وغیرہ نے بھی اس کو بہت پسند کیا ہے اور اس سے استفادہ کیا ہے اپنی کتابوں میں اس کے حوالے دیئے ہیں، یورپ کے مصنفین نے بھی اس کے حوالے نقل کیے ہیں، مولانا نے قیام مصر کے زمانہ میں یہ کتاب تالیف کی ہے اور اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا نے ایک عجیب و غریب واقعہ بیان کیا ہے کہ زمانہ میں سر سید احمد خان کی تالیفات انکار معجزات وغیرہ کے مضامین پڑھنے کی وجہ سے میرے دل میں قرآن کی وہ عظمت باقی نہ رہی جو مسلمان کے دل میں ہونی چاہیے اور مجھ سے ایک بہت بڑی گستاخی صادر ہوئی، اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے مجھے اس گستاخی کرنے پر فوراً سزا نہ دی عتاب اور عذاب نازل نہ ہوا بلکہ میرے پیر میں تکلیف رہنے لگی جو کسی علاج اور پرہیز سے ٹھیک نہ ہوئی۔ بالآخر میرے خیالات درست ہونے قرآن سے محبت اور اس کی عظمت دل میں لوٹ آئی اور میں نے سچے دل سے قرآن شریف کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کیا اور میں اس ہی روز سے بالکل ہی تندرست ہو گیا۔

حضرت مولانا حکیم مولوی علاؤ الدین صدیقی پھلتی اعلی اللہ مقامہ

حضرت مولانا [illegible] قصبہ پھلت ضلع مظفرنگر جو حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ کا مولد اور حضرت مولانا حکیم شاہ اہل اللہؒ اور حضرت شاہ محمد عاشقؒ خلیفہ اعظم و جانشین حضرت شاہ ولی اللہؒ کا مولد و مرقد ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ کے جد مادری حضرت شاہ محمد اور بہت سے دوسرے اکابر کا مسکن و مدفن ہے اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کے لیے عملی کام کرنے کا مقام آغاز ہے، اس متبرک قصبہ میں ۱۳۰۹ھ میں پیدا ہوئے اور حضرت مولانا حکیم شاہ اہل اللہؒ اور حضرت شاہ محمد عاشقؒ کے جانشین کی حیثیت سے قصبہ پھلت میں نصف صدی سے زیادہ مدت تک قرآن و حدیث کا درس دیتے رہے۔ راقم الحروف ناچیز امین احمد صدیقی حضرت سے قرآن شریف کا ترجمہ اور تفسیر اور مشکوٰۃ شریف پڑھی، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں جا کر تکمیل کی اور میرے علاوہ بہت سے طلباء نے اسی طرح حضرت سے علم قرآن اور حدیث حاصل کیا۔

آپ نے قرآن حکیم کی روشنی میں کئی کتابیں تالیف فرمائی ہیں ان کتابوں میں حضرت نے قرآن حکیم کی آیات جمع فرمائی ہیں، ترجمہ و تفسیر حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی نقل فرمائی ہے اور بہت مختصر الفاظ میں اپنی طرف سے وضاحت فرمائی ہے۔

حضرت مولانا موصوف نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ سے منہاج سنت کے مطابق بیعت کی تھی، مروجہ طریقہ کے مطابق آپ مرید نہیں ہوتے۔ حالات اس کے گواہ ہیں آپ مراد تھے ۱۲ صفر المظفر ۱۳۹۱ھ بروز یک شنبہ لاہور (صدیقی نگر) میں وصال ہوا، حضرت نے عالم سکرات میں نماز صبح ادا کی اور آخری لفظ آپ کی زبان مبارک پر نماز کا آیا، اشاروں سے نماز ادا کر کے واصل بحق ہو گئے۔

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کی تالیفات حسب ذیل ہیں:

۱۔ آیات محکمات۔ حضرت فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے [illegible] طالب العلم کے لیے ضروری ہے کہ آیات محکمات پر پورا عبور حاصل کرے جن کو قرآن نے ام الکتاب فرمایا ہے۔

۲۔ صفات المؤمنین مع القرآن ترجمہ و تفسیر حکیم الامت تھانوی کا انتخاب کیا ہے

۳۔ صفات المتقین ۔ 〃 〃 〃 〃

۴۔ صفات الذاکرین 〃 〃 〃 〃

۵۔ صفات المستغفرین والتوابین 〃 〃 〃 〃

۶۔ صفات المسبحین مع آیات تسبیح 〃 〃 〃 〃

۷۔ صفات الخاشعین 〃 〃 〃 〃

۸۔ صفات المقربین 〃 〃 〃 〃

۹۔ صفات المتصدقین 〃 〃 〃 〃

۱۰۔ صفات اہل جنت 〃 〃 〃 〃

۱۱۔ صفات المجاہدین 〃 〃 〃 〃

۱۲۔ صفات الضالین المغضوبین یا اہل دوزخ کی صفات 〃 〃 〃 〃

۱۳۔ صفات المنافقین 〃 〃 〃 〃

وغیرہ وغیرہ

آپ کی سوانح حیات صدیق امت کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

لے کر تو در عالم سکرات کردی بندگی کردی ثابت کہ ہر بندگی است زندگی

امین

حافظ الحدیث حضرت مولانا عبداللہ صاحب درخواستی

سابق امیر جمعیت علماء اسلام و مدرسہ مخزن العلوم خانپور

آپ کے کئی سال سے ہر سال قرآن حکیم کا دورہ تفسیر پڑھایا جاتا ہے درحقیقت یہ ایک مختصر دورہ تفسیر ہے جو مدارس عربیہ کے فاضل اور منتہی طلباء کے لیے جاری کیا گیا ہے

اس دورہ تفسیر میں قرآن حکیم کے علوم و معارف پر خاص زور دیا جاتا ہے اور قرآن کریم سے جو علوم حاصل کیے جاتے ہیں ان پر بحث کی جاتی ہے۔ اور قرآن فہمی کے طریقے بتائے جاتے ہیں حضرت درخواستی نے اگرچہ قرآن حکیم کی تفسیر تحریری طور پر نہیں فرمائی ہے لیکن آپ کے درس میں قرآن حکیم کے نسخہ پیدا کیے جاتے ہیں

حضرت علامہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم

حضرت سید صاحب اگرچہ ندوہ کے اکابر میں سے تھے لیکن حضرت تھانوی سے بیعت و نسبت کے بعد حضرت سید صاحب کا شمار بھی سلسلہ اشرفیہ میں کیا جانے لگا۔ آپ نے مشہور کتاب سیرۃ النبی تصنیف فرمائی ہے اور ایک کتاب ارض القرآن تالیف فرمائی ہے، یہ کتاب قرآن شریف میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے حالات سمجھنے کے لیے نہایت مستند تالیف ہے۔ اس میں تاریخی جغرافیائی اور دیگر امور پر بحث کی گئی ہے اور مستشرقین کے جوابات محققانہ اور عالمانہ انداز میں دیئے ہیں۔

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی مرحوم

مولانا احمد سعید صاحب مرحوم ہندوستان کے بہترین مقررین اور واعظین میں سے تھے، آپ کے بہت سے مضامین مقالے اور کتابیں، جنت کی کنجی، دوزخ کا کھٹکا وغیرہ بہت مقبول ہیں۔

آپ نے قرآن کریم کی تفسیر "کشف الرحمٰن" کے نام سے تالیف فرمائی ہے جو بیان کی سلاست اور مضامین کی نفاست کے اعتبار سے بہت مقبول ہوئی ہے یہ تفسیر دہلی میں شائع ہوئی تھی پھر نسخے لاہور میں بھی کسی تاجر نے چھاپے تھے۔ اس فقیر نے اس کو اچھی طرح پڑھا ہے۔ یہ تفسیر آپ کی ۳۰ سالہ مطالعہ کا خلاصہ ہے۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا مقدمہ القرآن دیوبند تفسیر کے ابتداء میں درج ہے۔

آپ کی ایک تالیف "تفسیر فاتحۃ الکتاب" بھی ...... ہے جو ۱۳۵۰ھ میں دہلی سے شائع ہوئی تھی۔

قرآن حکیم میں سورہ فاتحہ کے الفاظ جس جس جگہ آئے ہیں ان کو جمع کیا ہے اور ان کی تشریح کی ہے تفسیر کے سوا مولانا کے مضامین مختلف موضوعات پر مقالات مولانا احمد سعید کے نام سے شائع ہو چکے ہیں جنت اور دوزخ کے عنوان پر آپ کی دو مشہور کتابیں ہیں، جنت کی کنجی اور دوزخ کا کھٹکا، چونکہ جنت اور دوزخ کے عنوان بھی قرآنی عنوان ہیں اس لیے ان کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے

خصوصیات

۱۔ آپ نے اس کا اہتمام کیا ہے کہ فاعل اور مفعول کی تمام ضمیروں کا ترجمہ بجائے اس نے اور اس پر اور اس کو کرنے کے ضمیر کا اصل مرجع ظاہر کر دیا ہے

۲۔ ترجمہ کی ترکیب عربی کی لفظی ترتیب کی رعایت سے نہیں کی بلکہ اردو ترکیب کی رعایت رکھی ہے مثلاً عربی میں جزا مقدم اور شرط مؤخر ہو تو ترجمہ میں شرط کو مقدم اور جزا کو مؤخر کیا ہے

۳۔ اگر اس تفصیل کے باوجود بھی کسی لفظ کو واضح کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے تو اس کو واضح کر دیا ہے اور یہ طریقہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ علیہ نے بھی اپنے ترجمہ میں اختیار فرمایا ہے جیسا کہ سورہ ہود

میں علامت کے آگے نمبرت کا اضافہ بڑھا دیا ہے۔

۴۔ یعنی کا لفظ آیت کے ختم پر استعمال کیا ہے کہیں مجبوراً درمیان آیت میں بھی استعمال کیا ہے۔

۵۔ دراصل یہ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کے اردو تراجم کو مروجہ اردو زبان تبدیل کیا ہے تاکہ زبان آسان اور سلیس ہو جائے اور قرآن کا سمجھنا آسان ہو جائے۔

۶۔ اس ترجمہ کے الفاظ یا تحقیقات کا مرجع پانچ بزرگ ہیں دو بزرگوں کا نام تو اس سے قبل آچکا ہے تیسرے بزرگ ان دونوں بزرگوں کے والد ماجد حضرت حکیم الامت مجدد ملت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ ہیں اور چوتھے بزرگ حضرت استاذی و مرشدی مولانا محمود حسن شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اور پانچویں بزرگ حضرت حکیم الامت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

مولانا احمد سعید صاحب لکھتے ہیں۔ میں نے ان اکابر کی اردو کو محض صاف سلیس اور شستہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ قرآن کے مطالب عام طور پر مسلمان آسانی سے سمجھ سکیں۔

۷۔ اختلاف مطالب میں یا خواص کے اختلاف میں عام طور پر حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کو ترجیح دی ہے، پھر حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو پھر حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے قول کو اختیار کیا ہے اور ان کے بعد رئیس المحققین راس المتاخرین حضرت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ کی تحقیق کو اختیار کیا ہے۔ بعض مقامات ایسے ہیں کہ جن میں اکابر اربعہ کے بجائے حضرت تھانوی کی تحقیق کو اختیار کیا ہے۔

۸۔ مولانا احمد سعید صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ جو لفظی ترجمہ ہے، وہ دراصل حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فارسی ترجمہ کا اردو جامہ ہے، اس لیے دونوں کے مختارات ایک ہیں، حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ نے بامحاورہ ترجمہ میں بعض دوسری تحقیقات کو اختیار کیا ہے۔ اور حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ نے حضرت شاہ صاحب کا اتباع فرمایا ہے اس لیے دونوں ترجموں کا رجحان اور میلان بھی ایک ہے۔

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ نے روح المعانی پر زیادہ اعتماد فرمایا ہے اس لیے بہت سے مقامات پر حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ کی رائے کو چھوڑ دیا ہے۔ اور کہیں کہیں حضرت تھانوی نے اپنے ذوق کو اختیار کیا ہے۔

۹۔ قرآن مجید کا یہ ترجمہ خواہ تحت اللفظ نہ ہو لیکن قرآنی ترکیب اور قرآنی بندش کو بالکل نظر انداز نہیں کیا ہے۔ پڑھنے والا محسوس کرے کہ وہ قرآن مجید کا ترجمہ پڑھ رہا ہے۔ کوئی اردو کی مستقل ادبی کتاب زیر مطالعہ نہیں ہے۔

۱۰۔ جہاں تک ممکن ہوا ہے، بریکٹ میں عبارت لکھنے سے اجتناب کیا ہے کیونکہ بریکٹ کی عبارت کو قاری سمجھتا ہے کہ قرآن سے خارج ہے۔ اور پھر بغیر بریکٹ کے عبارت کو پڑھ کر قرآن سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور مطلب و معانی میں الجھ جاتا ہے یعنی بریکٹ سے مفہوم اور مطلب سمجھنے کی بجائے اور الجھ جاتا ہے۔

۱۱۔ بین السطور ترجمہ کے علاوہ ایک اور ترجمہ بھی اس کے ساتھ حاشیہ پر لکھا ہے، یہ ترجمہ بین السطور کے ترجمہ کا حاصل ترجمہ ہے، اس کے ساتھ آیات کی تفسیر اور تشریح تحریر کی گئی ہے۔

حضرت مولانا قاضی زاہد الحسینی مدظلہٗ دارالارشاد کیمبل پور

قاضی صاحب کو علوم قرآنی سے خاص شغف ہے، آپ کئی سال سے قرآن حکیم کا درس دے رہے ہیں اور الحمد للہ آپ کے درس سے بے شمار آدمی فائدہ حاصل کر رہے ہیں، آپ نے حال میں ایک کتاب "معارف القرآن" کے نام سے تالیف کی ہے۔

قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے مطالب القرآن کا مطالعہ بہت فائدہ مند ہے جیسا کہ اس کا طبع سوم ۱۹۹۶ء کا نسخہ ہے ۷۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے چند ابواب یہ ہیں: مثلاً قرآن سورت اور آیت کی تشریح، علم قرآن کا ماحصل، آیات اور سورتیں، مقاصد قرآن حکیم (توحید، نبوت اور رسالت، ختم نبوت، قیامت، معاد، مباحث قرآن، محاورات قرآن، مماثلت قرآنی میں تدبر، محاورات قرآن، الفاظ قرآن باعتبار معنی و مراد، تفسیر بالرائے پر تبصرہ کے عنوان سے جو مضمون تحریر ہے وہ بھی بہت مفید ہے۔ سرسید احمد خان بانی یونیورسٹی علی گڑھ کے متعلق سرسید احمد خان کے اسباب کی آراء بتائی گئی ہیں۔

آپ قرآن کریم کا جو درس دیتے ہیں اس کو قلم بند کر کے رسالہ الارشاد میں شائع کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح آپ تحریر و تقریر کے ذریعہ قرآن کی اشاعت میں مصروف ہیں۔

آپ نے تعلیم القرآن کے نام سے ایک تفسیر لکھی ہے سورہ بقرہ سورہ آل عمران اور سورہ نساء تک شائع ہو چکی ہے باقی غیر مطبوعہ ہے اللہ تعالیٰ اشاعت کا موقع عطا فرمائے۔

لغات القرآن

یہ لغت قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے کلید ہے۔ اس کی جلد اول حرف ش تک ہے جو مطبوعہ موجود ہے

تذکرۃ المفسرین

اس کی جلد اول شائع ہو کر نایاب ہو چکی ہے، اب فاضل مؤلف نے مکمل کتاب پر نظر ثانی فرمائی ہے جس میں تقریباً سات سو مفسرین قرآن کا ذکر ہے کتاب کی تصویر آخری مراحل میں ہے۔

درس قرآن

آپ قرآن حکیم کا درس واہ کینٹ کی مسجد میں تقریباً ۱۰ سال سے دے رہے ہیں۔ اس درس کے چار حصے شائع ہو چکے ہیں اور رسالہ خدام الدین میں بھی شائع ہوتا رہا ہے اور کئی بار رسالہ فاران لندن میں بھی شائع ہوا ہے اب خود ایک رسالہ ماہنامہ "الارشاد" کے نام سے شائع کرتے ہیں جس میں قرآن حکیم کا درس اور درس حدیث شائع کیا جاتا ہے۔

شیرِ پنجاب فاتح قادیان مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم

مولانا مرحوم دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہند کے تلامذہ میں سے تھے، اکابر دارالعلوم دیوبند سے محبت اور خلوص رکھتے تھے آپ نے مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی سے مناظرے، مباحثے اور مقابلے کیے۔ اس لیے آپ کو شیر پنجاب کہا جاتا ہے اور مرزا غلام احمد قادیانی نے آخری عمر میں اعلان کیا تھا کہ میں اگر سچا ہوں تو میری زندگی میں مولوی ثناء اللہ کسی وبائی مرض میں مبتلا ہو کر مر جائیں گے اور اگر وہ سچے ہیں تو میں ان کی زندگی میں مر جاؤں گا۔ الحمد للہ حضرت مولانا ثناء اللہ کی زندگی میں مرزا غلام احمد ہیضہ جو ایک وبائی مرض ہے اس کا شکار ہو کر آنجہانی ہو گیا۔ اس لیے آپ کو فاتح قادیان کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کا رجحان طبع اہل حدیث مسلک کی طرف تھا۔

آپ نے قرآن حکیم کی تفسیر لکھی ہے جس کا نام "تفسیر ثنائی" ہے اور اس میں فرق باطلہ کا رد اور ادیان کاذبہ بالخصوص نیچری، چکڑالوی، مرزائی اور بدعتی عقائد کی بڑی کامیابی سے تردید کی ہے اور ہندوؤں، عیسائیوں اور دیگر غیر مذاہب کے اعتراضات کا معقول طریقہ اور مدلل انداز سے جواب دیا ہے۔ فجزاہم..... اللہ تعالیٰ عنا و عن سائر المسلمین یہ تفسیر مطبع ثنائی سرگودھا سے شائع ہوئی ہے۔

آپ نے عربی میں ایک "تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" بھی تالیف فرمائی ہے اور سورہ یوسف کی تفسیر بھی تالیف فرمائی ہے جو امرتسر سے شائع ہو

چکی ہے بعض تذکرہ نگاروں نے آپ کی چار تفسیروں کا ذکر کیا ہے غالباً دوسری تفسیریں مکمل نہیں ہوئیں۔

حضرت مولانا مولوی احتشام الحق صاحب تھانوی مہتمم کراچی

حضرت مولانا احتشام الحق صاحب کو اللہ تعالیٰ نے حسن صورت اور حسن بیان کا وہ ملکہ عطا فرمایا ہے جو بہت کم لوگوں کا حصہ ہے حضرت علامہ عثمانی مرحوم نے ایک بار مولانا احتشام کی تقریر سن کر فرمایا تھا کہ اب مجھے مرنے کا کوئی فکر نہیں ہے میرے بعد میرا جانشین پیدا ہو گیا ہے۔

مولانا موصوف تحریر و تقریر میں ید طولیٰ رکھتے ہیں آپ قرآن حکیم کی ایک تفسیر تالیف فرما رہے ہیں جو پاکستان کے سب سے کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ جنگ میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے۔ قرآنی آیات کے مطالب و تشریح کا اور اسرار و معارف کا بہترین مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تفسیر کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت شیخ الحدیث والتفسیر مولانا شمس الحق صاحب افغانی مدظلہ العالی

حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی علماء و فضلاء دیوبند میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ پاکستان میں جن علماء کے علم پر اعتماد کیا جاتا ہے اور جن کو عوام و خواص میں عزت و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ان میں آپ بھی سرفہرست ہیں۔ آپ جامعہ عباسیہ بہاولپور میں شیخ الجامعہ کے منصب جلیلہ پر فائز رہ چکے ہیں۔

"علوم القرآن" کے نام سے ایک جامع کتاب تالیف فرمائی ہے۔ یہ کتاب پشاور یونیورسٹی میں ایم اے کے نصاب میں شامل کرلی گئی ہے۔

"عالمی مشکلات اور ان کا قرآنی حل" جامعہ اسلامیہ بہاولپور سے شائع ہوئی ہے۔

"احکام القرآن" "مفردات القرآن" "مشکلات القرآن"

غیر مطبوعہ ہے۔

حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب سابق استاذ دارالعلوم دیوبند گوجرانوالہ

آپ دارالعلوم دیوبند میں مدرس تھے اور فریضہ تدریس انجام دیتے تھے۔ آپ نے حضرت مولانا حسین علی مرحوم سے درس قرآن حاصل کیا ہے آپ کا انداز درس عجیب ہے۔ خلاصہ آیات، ربط پر خاص زور دیتے ہیں آپ نے پورے قرآن کی تفسیر تالیف فرمائی تھی لیکن وہ کوئی صاحب مستعار لے گئے اور واپس نہ کی۔

تفسیر القرآن

پارہ الم کی تفسیر جلد اول شائع ہو چکی ہے یہ تفسیر دوبارہ مکمل ہے۔ تسنیم کمپنی نے شائع کی ہے۔ تفسیر علمی مضامین کا خزانہ ہے زبان عالمانہ ہے۔

مولانا مظہر الدین صاحب شیرکوٹی شہید پاکستان

فاضل دیوبند ۱۹۳۹ء بانی اخبار سہ روزہ "الامان" روزنامہ وحدت دہلی

آپ مسلم لیگ اور پاکستان کے بہت بڑے حامی پرجوش مقرر تھے آپ نے ہندوؤں کی شدھی کے خلاف تحریک تبلیغ اسلام میں بھی بہت زیادہ کام کیا تھا۔ مسلم لیگ اور پاکستان کی حمایت کی وجہ سے آپ کو شہید کر دیا گیا تھا آپ نے ایک مختصر تفسیر "قول المتین" فی تفسیر سورۃ التین تالیف فرمائی اس کے ساتھ شاہ عبدالعزیز کی تفسیر اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر بھی شامل ہے۔

شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب

مہتمم دارالعلوم تعلیم القرآن راولپنڈی

حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب مشہور مفسر قرآن ہیں آپ

آپ علماء اکاڈمی محکمہ اوقاف میں ڈائریکٹر رہے ہیں۔ آپ نے شیخ العرب و العجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مختصر اور نہایت مفید رسالہ بحث مسئلہ موصوف کے زمانہ میں کئی بار ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوا، اور علم دوست حضرات میں مفت تقسیم کیا گیا۔ علماء اہل سنت و الجماعت دیوبند کا اور بریلوی مسلک کے لوگوں کے لیے اس رسالہ میں بہت سی مفید باتیں لکھی ہیں۔ اور افتراق امت سے بچنے کی نصیحت فرمائی ہے۔ آپ کو علوم قرآنی اور تصوف سے خاص شغف ہے۔

آپ نے سہ ماہی دین و دانش میں جو علماء اکاڈمی محکمہ اوقاف کی طرف سے شائع ہوتا ہے، اس میں علم تفسیر اور مفسرین کے عنوان سے ایک نہایت مفید مقالہ تحریر کیا ہے۔ یہ مقالہ $\frac{20 \times 30}{16}$ سائز ۱۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ پر اس مقالہ کے حواشی و حوالہ جات ۲۴۰ لکھے ہیں۔ اس مقالہ میں صوفیا کی عجیب و غریب تفاسیر کی کچھ مثالیں لکھی ہیں۔ مثلاً

حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ سے دریافت کیا گیا وضو اور نماز کے معنی کیا ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ اوّل الذکر فصل اور دوسرا وصل ہے۔ جب آدمی وضو کرتا ہے تو وہ دنیا سے علیحدگی اختیار کرتا ہے۔ یہ فصل ہے اور جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ تو وہ اللہ کے حضور میں حاضر ہوتا ہے اور یہ وصل ہے (ص ۱۵۷) جلد ۱ شمارہ ۱ ماہ اکتوبر ۱۹۸۱ء۔

ڈاکٹر رشید صاحب کے خلاف جو غلط پروپیگنڈہ کرتے تھے ان میں سے بعض نے آپ کو معتزلی قرار دیا۔ حالانکہ موصوف اس مقالہ میں لکھتے ہیں۔

یہ نقطہ نظر کہ آدمی اللہ کو دیکھنے کی خواہش بھی رکھنا معتزلہ کے سخت اور اکثر خیالات۔ آراء کا نتیجہ ہے۔ سچ پوچھو تو معتزلہ آدمی کو ایک مشین سمجھتے ہیں اور تفسیر کشاف کا شمار تفسیر بالرائے میں کیا جا سکتا ہے (ص ۴۳)

پروفیسر علامہ مولانا نور الحسن خان صاحب ایم اے نظر ۹۸۴

علامہ صاحب پنجاب یونیورسٹی لاہور علوم مشرقیہ کے پروفیسر ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں لاہور کا علاقہ ماڈل ٹاؤن کے علاقہ میں ایک مسجد ہے اس میں علامہ صاحب بہ سہولت سے درس قرآن دے رہے ہیں۔ آپ کا درس بفضلہ اللہ تعالیٰ جاری ہے اور بے شمار لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ درس قرآن کے ساتھ کبھی کبھار درس حدیث بھی ہوتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے ابنائے قدیم میں سے ایک فرزند ارجمند کا یہ تبلیغی کام اور درس بارہ سال سے مسلسل اس کو قائم رکھنا مولانا کے خلوص نیت اور دل میں اللہ تعالیٰ کی خشیت کی علامت ہے۔ علامہ صاحب کے درس میں ہر مسلک اور عقیدے کے لوگ آتے ہیں اور فیض یاب ہوتے ہیں۔ علامہ درس میں نہ کسی پر طنز کرتے ہیں اور نہ فرقہ بازی کو پسند کرتے ہیں۔ الحمد للہ صراط مستقیم پر اعتدال کے ساتھ گامزن ہیں۔ یونیورسٹی میں آپ کے تلامذہ آپ کے تقویٰ اور خلوص سے متاثر ہیں۔ علمائے اور فضلائے دارالعلوم دیوبند قرآن حکیم کا درس بے شمار جگہوں پر دے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس اعداد و شمار نہیں ہیں۔ ورنہ ہند و پاک بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی یہ سلسلہ جاری و ساری ہے حضرت قاسم العلوم والخیرات کے اس خواب کی تعبیر ہمارے سامنے ہے جو حضرت نے دیکھا تھا کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر ہوں۔ اور میرے جسم سے پانی کے چشمے نکل کر بہہ رہے ہیں۔ حضرت نانوتوی کی مساعی جمیلہ سے خدا جانے کہاں کہاں آب حیات کے یہ چشمے ابل رہے ہیں، نکل رہے ہیں اور کہاں سے کہاں تک جا رہے ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب و عندہ ام الکتاب

ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے عظیم تفسیری کارناموں میں سے چند حضرات کا ذکر اور ان کے تفسیری کام پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن کا ذکر نہیں کیا گیا وہ یقیناً مذکورین سے زیادہ ہیں۔ لیکن ہمارے پاس ذرائع نہیں ہیں

یہ ہم سب کا اپنا بیان تحریر کر سکیں۔ دارالعلوم دیوبند کے ابنائے قدیم نے جو گو
کتاب بیٹ کی طبع و اشاعت کرا کے نصب العین بنا یا اہتمام ... کی
اسی کی مقصد کے پیش نظر کرائی ہے حضرت تفسیر قرآن کے سلسلہ میں کسی
قسم کی تحریر یا تقریر کا کام کر رہے ہیں۔ وہ ہم کو تفصیلات سے آگاہ فرمائیں
تاکہ ان کی خدمات تفسیر کی اشاعت میں شامل کی جائیں۔ چنانچہ راقم الحروف کو اس کا
اعتراف ہے کہ یہ مختصر تحریر دارالعلوم دیوبند کی تفسیری خدمات کا ایک
مختصر سرسری اور اجمالی جائزہ ہے۔

حضرت مولانا محمد علی صدیقی صاحب کاندھلوی زید مجدہم

حضرت مولانا محمد علی صاحب حضرت شیخ الحدیث و التفسیر مولانا
محمد ادریس کاندھلوی مرحوم کے خواہر زادہ ہیں اور خود بھی اپنے خال مکرم کی
طرح جامع زیادہ وسیع المطالعہ ہیں۔

آپ کی زیر نگرانی ماہنامہ "رشاد" سیالکوٹ سے شائع ہوتا ہے
آپ قرآن کریم کی ایک نہایت ضخیم اور عظیم تفسیر تالیف فرما رہے ہیں یہ تفسیر
درحقیقت تمام مستند اور معتبر قدیم و جدید تفاسیر کا خلاصہ ہے۔ اس کی تیس جلدیں
ہوں گی۔ جلد اول ضخامت ۶۳۰ جلد دوم ضخامت ۰۰ شائع ہو چکی ہیں۔ اس
تفسیر کا نام معالم التنزیل ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو مکمل کرنے کی توفیق
عطا فرمائے۔

اس تفسیر کی زبان اور انداز بیان سلیس اور نفیس ہے۔

حضرت مولانا محمد طاہر صاحب مدظلہ پنج پیر مردان

آپ حضرت مولانا حسین علی شیخ المفسرین کے تلمیذ رشید ہیں
آپ کے یہاں قرآن حکیم کا دورہ تفسیر میں پڑھایا جاتا ہے۔
آپ کی تالیفات میں حسب ذیل قرآن حکیم سے متعلق ہیں۔
ا۔ مرشد الحیران الی فہم القرآن قرآن فہمی

کے لیے رہنما ہے
۲۔ العرفان فی اصول القرآن ۲۰۰
صفحات میں اصول تفسیر ہے۔
۳۔ البرہان فی اصول القرآن یہ بھی
اصول تفسیر کے موضوع پر ہے
۴۔ تبیان القرآن الکریم یہ بھی
اصول تفسیر کے موضوع پر ہے۔ اور
۵۔ افغانی زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ۔

حضرت مولانا عبد الشکور صاحب طوردی مدظلہ

آپ مظاہر العلوم سہارنپور کے فاضل ہیں
ا۔ پارہ اول مع ترجمہ و تفسیر بزبان پشتو مطبوعہ
۲۔ قرآن حکیم کے چند پارے تفسیر و ترجمہ غیر مطبوعہ

خطیب اسلام جناب مولانا محمد اجمل خان صاحب

قلعہ گوجر سنگھ لاہور

آپ مشہور مقرر اور مبلغ اسلام ہیں۔ انداز بیان بہی دلچسپ اور موثر ہے
ا۔ تدریس القرآن طبع اول ۹۲ صفحات پر ۱۹۶۳ء میں شائع
ہوا تھا۔ طبع دوم ۱۹۶۷ء باضافات جدیدہ و مفیدہ ۱۸ صفحات پر
مشتمل ہے۔
۲۔ آداب القرآن مکتبہ اشاعت اسلام اردو بازار نے شائع
کیا ہے ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔
۳۔ لغات القرآن کے موضوع پر مولانا نے مستند اور معتبر کتابوں
سے استفادہ کیا ہے اور قرآن کریم کے لغات کو حل کیا ہے درس قرآن اور
تفسیر کے طلباء کے لیے یہ لغت بہت مفید ہے

۲۔ جامع مسجد رحمانیہ میں جمعہ کے روز تفسیر قرآن کا درس کئی سال سے دیتے ہیں اور ہزاروں لوگ مستفیض ہوتے ہیں

جناب مولانا حافظ عبدالواحد صاحب علوی ہزاروی

۱۔ تفسیر سورہ فیل منظوم
۲۔ تفسیر آیات قرآنی حافظ علوی کی زبانی
۳۔ سورہ مزمل کی تفسیر

آپ کی یہ تینوں تفاسیر ہمارے علم میں آئی ہیں۔

مولانا سید عبداللہ قطب شاہ عباسی مرزاقی

۱۔ "اسماء القرآن" مطبوعہ میرٹھ انڈیا
۲۔ "نجم القرآن" فی اطراف القرآن" کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

مولانا عزیز الرحمٰن المعروف صاحبزادہ محمد امیر خسرو ہزاروی

۱۔ تفسیر سورہ فاتحہ تالیف کی ہے

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب زید مجدہم (اکوڑہ خٹک)

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق ممبر پاکستان دستور ساز اسمبلی بانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے صاحبزادے ہیں ماہنامہ "الحق" آپ کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ قرآن حکیم سے متعلق آپ کی تالیف

۱۔ قرآن اور تعمیر اخلاق بہترین کتاب ہے۔

جناب مولانا ساجد الرحمٰن صدیقی صاحب

سید قطب شہید اخوان المسلمون کے مشہور و معروف قائد تھے اور علوم قرآنی پر آپ کی خاص نظر تھی۔ سید قطب شہید کی مشہور تالیف فی ظلال القرآن

سید قطب شہید اکیڈمی [illegible]
اردو ترجمہ قرآن کے زیر سایہ لکھ رہے ہیں۔

حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب ہزاروی [illegible]

آپ کی تالیفات میں

۱۔ احکام القرآن اردو ترجمہ
۲۔ تفسیر سورہ بقرہ
۳۔ تفسیر قرآن فی ظلال القرآن سید قطب شہید کا اردو ترجمہ۔ یہ ترجمہ ابھی نامکمل ہے۔

جناب مولانا عبدالقادر صاحب جامی ہزاروی فاضل دیوبند [illegible]

قرآن حکیم کی تفسیری خدمات میں آپ کی حسب ذیل تالیفات قابل ذکر ہیں۔

۱۔ تفریح الجنان فی تفسیر ام القرآن (۱۱ صفحات پر مشتمل ہے)
۲۔ عمدۃ الفکر فی تفسیر سورۃ العصر

جناب حافظ حکیم مولانا قاری محمد عارف صاحب

ایم اے فارسی عربی اسلامیات ایم او ایل
آپ جامعہ اشرفیہ لاہور کے فاضل ہیں۔

۱۔ تفسیر سورۃ البقرۃ ترجمہ و تفسیر [illegible] ہے۔
۲۔ تفسیر سورہ لقمان، ترجمہ و تفسیر [illegible] کے طلباء کے لیے ہے

جناب حافظ مولانا قاری فیوض الرحمان صاحب

ایم اے عربی اسلامیات فارسی صدر شعبہ اسلامیات گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد
[illegible] صفحہ ۶۰۷ پر

ڈاکٹر سید عبداللہ

دار العلوم دیوبندؒ

دار العلوم دیوبند کہنے کو ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو چھتہ کی مسجد میں، انار کے ایک درخت کے نیچے "محمودین" (یعنی دو محمود نامی افراد ایک استاد مولانا محمودؒ دیوبندیؒ اور ایک شاگرد محمود جو بعد میں شیخ الہند محمود حسن کے نام سے مشہور ہوئے) کے ذریعے وجود میں آیا لیکن درحقیقت اس کی ضرورت کا احساس اس سے بہت عرصہ قبل، شمالی ہندوستان کی طرف انگریزوں کی پیش قدمی اور تدریجی طور پر مختلف علاقوں پر قبضے کے اثرات سے پیدا ہوا۔ اسے آپ محمد شاہ کے فوراً بعد کا زمانہ کہہ سکتے ہیں جس میں شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خاندان کے افراد نے سلطنت کے زوال اور غیر اسلامی غیر ملکی طاقتوں کے بڑھتے ہوئے رسوخ کے اسباب پر غور کیا اور زوال کی اس لہر کو روکنے کی کوشش کی جو ہزار کوشش کے باوجود نہ رک سکی اور ۱۸۵۷ء کے حادثے پر ختم ہوئی۔

انگریزوں کے عروج کے اسباب دو طرح کے تھے (۱) داخلی اور (۲) خارجی۔ داخلی سے مراد باشندگانِ ہند خصوصاً مسلمانانِ ہند کی معاشرتی و اخلاقی کمزوریاں ہیں اور خارجی سے مراد مغربی اقوام کی اپنی استعداد، ان کا اپنا سازوسامان اور ان کی اپنی بہتر تنظیم ہے۔

داخلی طور سے مسلمان اس بات سے غافل ہو چکے تھے کہ انہوں نے ایک غیر مسلم اکثریت پر سلطنت کی عمارت کھڑی کی ہوئی ہے جو کسی وقت بھی نازک موقعہ پر حکمران مسلم اقلیت کا تختہ الٹ سکتی ہے! انہوں نے عالمِ غفلت میں اپنی قوت کو مجتمع نہ رکھا اور گروہوں اور فرقوں کی صورت میں آپس میں لڑائی کی اور کمزور ہوتے گئے اس کے نتیجے میں ایک طرف وہ ہندوستان کے اندر کی غیر مسلم طاقتوں کے سامنے مغلوب ہوتے گئے اور دوسری طرف کبھی غیر ملکی طاقت سے آلۂ کار بنے اور کبھی اس کے سامنے مغلوب ہوتے گئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی بصیرت سے اس زوال علم کے اسباب پر غور کر کے چند نتیجے نکالے جو کم و بیش یہ تھے۔

(الف) تعلیم میں قرآن و حدیث سے زیادہ دوسرے علوم معقولات پر بے جا زور دینا۔

(ب) دینِ اسلام کے رکنِ عظیم جہاد کے بجائے اور جنگی ریاضتوں کے بجائے عرسوں اور میلوں اور تہواروں سے زیادہ دلچسپی، رزم کے مشاغل سے زیادہ بزم کے مشاغل (مشاعرہ وغیرہ) میں وقت صرف کرنا۔

(ج) طریقت کو محض خانقاہی مشغلہ بنا کر اسے شریعت کے متوازی بلکہ شاید اس سے بھی بالا کی شکل قرار دینا۔

(د) اس فرمانِ خداوندی کو فراموش کر دینا کہ یہود اور نصاریٰ کبھی مسلمان کے دوست نہیں ہو سکتے۔

(ہ) فرقے کے اختلاف کو اتنی اہمیت دینا کہ کافر کو اختلاف رکھنے والے کلمہ گو پر ترجیح دینا اور کافر کی امداد کرنا۔

ـــــــــــ

ؒ دیوبند کے رہنے والے تھے میرٹھ میں مدرس تھے۔

(۵) اس امر کو فراموش کر دیا کہ خداوند تعالیٰ نے مسلمانوں کو جب بھی تمکین فی الارض کی نعمت سے نوازا تو اس کا سبب قیام شریعت تھا اور قیام شریعت کا عمل ابھی ہندوستان میں مکمل نہ ہوا تھا کہ مسلمانوں نے ترک کر دیا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے زمانے میں ان سب اسباب پر غور کر کے اس بیماری کے علاج کی کوشش کی۔ قرآن و سنت کی ترویج پر زور دیا۔ اور زمانہ کی معقولاتی فضا میں علم اسرار دین کی بنیاد رکھ کر دین کے اثبات کے لئے عقل اور تمدنی تجربوں سے بھی استشہاد کیا۔

فرقوں کے اختلاف کو رفع کرنے کے لئے الانصاف جیسے رسالے لکھے۔ شریعت و طریقت کے مابین فاصلوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور سب سے زیادہ یہ کہ جہاد بالسیف کے فریضے کی طرف متوجہ ہو کر کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیافت کے لئے مسلمانوں کی بکھری ہوئی طاقتوں کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ یہ تحریک آہستہ آہستہ مستحکم ہوتی جا رہی تھی کہ انگریزوں نے شاہ عالم ثانی اور شاہانِ اودھ کے ساتھ سمجھوتے کر کے دیوانی حقوق حاصل کر کے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی پر غلبہ حاصل کر لیا جس کا سب سے بڑا حملہ شعبۂ تعلیم پر ہوا چنانچہ ۱۸۵۷ء کے حادثے کے وقوع میں آنے تک انگریزوں نے ملک میں مغربی طریقے کے مدرسوں کے جال بچھا دیئے۔

ادھر اندر ہی اندر مناظروں کی حوصلہ افزائی کی تاکہ بظاہر سب کو مگر فی الحقیقت مشنری پادریوں کو تشکیک پھیلانے کا موقع مل جاتے، پھر اس کے ہمراہ انگریزی ڈگریوں کے بلانے سے، تشکیک میں مبتلا عنصر کو اونچے عہدے دلوائے تاکہ وہ معاشرہ کے اس عنصر کو دبا سکیں جو کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیافت کا ذرا بھی خیال رکھتا ہو۔ جب ملازمت کا معیار انگریزی سرٹیفکیٹ قرار پایا تو قدرتی طور سے ہندوؤں کو تعلیم کی زیادہ سہولتیں دیں تاکہ مسلمانوں کو بھی ترغیب ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ انگریزی مدرسوں میں داخل ہوں اس سے انہیں ایک یہ فائدہ مدنظر تھا کہ دین کے بارے میں تشکیک زیادہ سے زیادہ پھیلے اور دوسرا یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ملازمتوں کے سلسلے پر جھگڑے پیدا ہوں۔

انگریزوں کی طرف سے اس صدی میں مناظرے کی حوصلہ افزائی بامقصد تھی۔ اس کے ذریعے جہاں پادریوں اور آریا سماجیوں کو تبلیغ دین کی اجازت ملی وہاں ان فرقوں کی سرکاری سرپرستی، اگرچہ خفیہ، ہوئی جو جہاد پسند گروہوں کے خلاف تھے (یہ سب کو معلوم ہے کہ پہلی صدی کے آخر اور اس صدی کے ربع اول تک وہابی کا لفظ گالی بن چکا تھا۔)

غرض ۱۸۵۷ء کے بعد صورتِ حال یہ ہو چکی تھی کہ دینی ادارے بالکل ضعیف اور عقیم ہو چکے تھے، نئی تعلیم ملازمتوں کی ترغیب کی وجہ سے پھیل چکی تھی، اور مغرب کی پر معاشرت کی تقویت کا باعث ہو گئی تھی۔ انگریز مسلمانوں کو معاشی طور پر ختم کرنے کی ہر کوشش کر رہے تھے مگر اس سے زیادہ تعلیم کے ذریعے ضعفِ یقین پیدا کرنے کی طرف خاص طور سے متوجہ تھے قدیم علوم اسلامیہ کی سرپرستی کے بدلنے سے انگریزوں نے علوم مغربی کے نئے ادارے قائم کئے جن کے فارغ التحصیل حضرات کو ساری تعلیمی دسترس کے باوجود دوسرے درجے کا تعلیم یافتہ آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گویا ملتِ اسلامیہ ہند ایک طرف سلطنت و شوکت سے کاملاً محروم ہو چکی تھی تو دوسری طرف مسلمانوں کے شاندار ماضی اور اسلاف کے علمی کارناموں کی تذلیل و تحقیر کا بندوبست کر کے ان کی عزتِ نفس اور شعورِ خودی کو بالکل پامال کر دیا گیا۔

ان حالات میں چند دردمند اہلِ ایمان نے اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا اور یہ تدبیر سوچی کہ ان تمام پسپائیوں اور ناکامیوں کا علاج تعلیم ہی کے ذریعے کیا جائے چنانچہ مدرسہ دیوبند کا قیام عمل میں آیا جس نے اشاعتِ دین سے لے کر استعماری طاقتوں کے جلد تک ہر شعبے میں استحکام کی تحریک میں حصہ لیا۔ ایک حد تک یہ انہیں مساعی کا ثمرہ تھا کہ ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی اور یہ انہیں کی مساعی کا نتیجہ ہے کہ تحریک پاکستان کو دینی طاقتوں کی امداد حاصل ہوئی۔ بلاشبہ یہ درست ہے کہ اس حادثے میں دیوبند

کے علما و طلبہ حریت فکر رکھتے ہیں لیکن اگر بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے
اور سنجیدگی سے تجزیہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ علمائے دیوبند کا ایک گروہ
آزادیٔ ہند علما کے بغیر پاکستان کا مخالف اور قوم دیگر بحث متعلقہ آزادی پر
زیادہ زور دیتا رہا۔ راقم الحروف ہر گروہ کے علما کا احترام اور معتقد ہے لیکن
میری معلومات میں جو اہمیت دیوبند کے اہل علم میں ہے وہ کسی دوسری جگہ نہیں
ملا یعنی تالیف و تصنیف، سرفروشی خلق، ایک خاص قسم کی حریت
اور آزادی کی جو ترتیب علمائے دیوبند میں نظر آئی اس پر گزشتہ ایک سو
سال کی تاریخ شہادت دے رہی ہے۔

مجھے معلوم نہیں اس وقت دارالعلوم دیوبند کے واقعی حالات
کیا ہیں لیکن مجھے دیوبند کے اساسی
اصولوں کی ایک شق نے ہمیشہ متاثر کر دیا ہے اور وہ یہ ہے:

"اس مدرسے میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل
یقینی نہیں تب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ تعالیٰ بشرط
توجہ الی اللہ چلے گا۔

اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت
یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ، تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ خوف و رجا جو سرمایۂ رجوع
الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی بھی موقوف ہو جائے گی،
اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں
ایک نوع کی بے سروسامانی رہے۔ سرکار کی شرکت اور امرا کی شرکت بھی زیادہ
مضر معلوم ہوتی ہے۔ البتہ تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجب برکت
معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسنِ نیت
اہلِ چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔"

یہ دارالعلوم دیوبند کے دستورِ اساسی کی شق نمبر ۸ ہے، اس کے
مندرجات میں جو استغنا، توکل علی اللہ، رجوع الی اللہ، بے نیازی،
عزتِ نفس اور وقار پایا جاتا ہے اس کی مثال شاذ و نادر ہی ملے گی۔ یہ
اسی دستور کا نتیجہ ہے کہ علمائے دیوبند مزاجاً حکام کی دہلیز پر جھکنے سے
مجتنب رہے۔ خصوصاً برطانوی دور میں استعماری طاقتوں کا حلیف بننے
سے گریزاں رہے۔

دیوبند کا مدرسہ دو مانی ترتیب اپنے طلبہ کے ذہن پر یہ نقش اچھی
طرح بٹھا دیتا تھا کہ انگریز ہی دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں،
انگریزوں نے ہی سلطنت مغلیہ کو ختم کیا اور یہ انگریز ہی ہیں جو ساری دنیا سے
دینِ اسلام کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نقش محکم تھا مگر اس کے ساتھ
ہی اسے کلیۃً وہی سمجھ لیا جائے تو منافقوں نہ ہوگا کیونکہ بالآخر حقیقت یہی نکلی
ہے کہ "الکفر ملۃ" واحدۃ، بہرحال یہ ماضی کی باتیں ہیں اب ان پر گفتگو فضول
بھی ہے اور بے سود بھی۔

اب دیوبند ہندوستان میں ہے اور اگرچہ میں ہندوستان کے
حالاتِ حاضرہ سے بے خبر ہوں تاہم میرا خیال ہے کہ یہ مدرسہ اب بھی اس
ملک میں ایک مؤثر قوت ہے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ کئی مشکلات
کے باوجود جو ہندی مسلمانوں کو درپیش ہیں، یہ مدرسہ اسلام اور مسلمانوں کی
حقیقی خدمت انجام دے رہا ہے۔

آپ نے دورہ حدیث شریف جامعہ اشرفیہ میں پڑھا ہے۔

۱۔ تعارفِ قرآن ۔ صفحات کا مختصر لیکن جامع تعارف،
۲۔ سورہ حجرات ترجمہ و تفسیر
۳۔ سورہ لقمان ترجمہ و تشریح مولانا عارف باللہ بزرگوار
کی معیت میں

دارالعلوم اور فتنۂ تکفیر

اکرام القادری، ایڈیٹر ترجمان اسلام لاہور

دارالعلوم دیوبند کی ہر جہت، ہمہ گیر اور ہمہ نوع خدمات جو دو قومی کا صحیح اعتراف کیا جانا بھی ایسے فرد یا فرد علم و عمل کے لئے بالکل ناممکن ہے۔ دارالعلوم کی خدمات کو کسی رسالے کے ضخیم ترین نمبر اور کسی ضخیم ترین کتاب میں بیان کردینے سے بھی اس بارگراں سے سبکدوش نہیں ہوا جا سکتا۔ یہ ایک ادنیٰ سی کوشش ہے جو ہر دور میں اصحاب علم و فضل کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ دارالعلوم دیوبند کی فقید المثال خدمات دینی و قومی پردہ اخفا سے منصہ شہود پر لانے کے لئے ایک ایسے ادارے کی ضرورت ہے جو جید علماء اور جدید تعلیم سے بہرہ ور افراد پر مشتمل ہو۔ اپنے قیام تا ایں دم تک دارالعلوم کے مایہ ناز فرزندان ذی وقار نے جو عدیم النظیر خدمات انجام دی ہیں وہ اپنے اندر اس قدر تابانیاں رکھتی ہیں کہ ان کا تذکرہ کئے بغیر برصغیر کی دیانتدارانہ اور غیر جانبدارانہ تاریخ لکھنے والا مورخ اپنی رقم کردہ تاریخ کے ہر باب کو نامکمل پائے گا۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی آفتاب نصف النہار سے زیادہ روشن خدمات کو فراموش اور نظر انداز کر کے لکھی جانے والی تاریخ، تاریخ نہیں ہوگی۔ بلکہ تاریخ کے منہ پر بدنما داغ ہوگی۔ بعض نام نہاد متعصب مورخین نے اس قسم کی سعی ناتمام کی ہے۔ ان مورخین کی اس مبنی بر کذب بات کی حیثیت اصحاب علم و فن اور غیر جانبدار و غیر متعصب مورخین کی نظر میں پرکاہ سے زیادہ نہیں۔ ان بزعم خویش مورخین نے حب علی کی بجائے بغض معاویہ سے کام لیتے ہوئے فرزندان دارالعلوم کی سیاسی خدمات پر پردہ ڈالنے کی جسارت کی ہے جس کا جواب اہل علم نے ہر دور میں دے کر ان کے مزعومات کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا محمد میاں صاحبؒ، مولانا غلام رسول مہر اور مولانا حامد الانصاری کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مولانا محمد میاں صاحب نے "علماء ہند کا شاندار ماضی"، "علماء حق کے کارنامے" اور اب آخر میں "تحریک شیخ الہند" ایسی اچھی کتابیں لکھ کر اہل علم سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے بھی "سیرت سید احمد شہید" اور "سرگزشت مجاہدین" میں بہت سے مخفی گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے جو متعصب تاریخ نگار مورخین کی طرف سے پھیلائی ہوئی رطب و یابس روایات کے مدلل و مسکت جوابات دیتے ہیں۔ مولانا حامد الانصاری کے بعض کتابچے بھی اس سلسلہ کی کڑی ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ابنائے دارالعلوم دیوبند ہی نے شکست خوردہ، ہزیمت زدہ اور ہراساں قوم کی عروق مردہ میں حریت فکر اور آزادی رائے کا خون دوڑا دیا۔ دارالعلوم دیوبند کے مؤسسین نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ہی

سے اس منصوبے سے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ فی الحال بدیشی ظالم حکمرانوں سے براہ راست نبرد آزما ہونے کی بجائے بالواسطہ جنگ کیلئے میدان تلاش کیا جائے مسلسل سوچ بچار اور اشارات غیبی کے بعد یہ میدان کارزار دارالعلوم دیوبند کی شکل میں نمودار ہوا۔

دنیا جانتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند علم و آگہی کا بحر بیکران اور تعلیمات اسلامیہ کے خادم و ناشر کی حیثیت ہی سے نہیں ابھرا بلکہ اسے ملت اسلامیہ کی عظیم چھاؤنی کا منصب بلند بھی ملا۔ ایسا ہونا کوئی ایسا مستبعد بھی نہیں تھا کیونکہ اس کے مؤسسین، سرپرست اور اساتذہ اشہب علم کے شہسوار اور شب زندہ دار ہی نہ تھے۔ وہ تیغ جوہردار کے دھنی اور مجاہدین صف شکن بھی تھے۔

دارالعلوم کے قیام سے دس سال قبل ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی قیادت میں اپنی جانبازی و جاں سپاری کے جوہر دکھا چکے تھے۔ شاملی کا میدان انہی مردان کارزار کے جاں نثار ساتھیوں کے مقدس خون سے لالہ زار بنا تھا۔ یہی تھے وہ مردان حق آگاہ جو تحریک آزادی وطن کے "جرم" میں قید و بند اور روپوشی کی صعوبتیں برداشت کر چکے تھے۔

یہ امر۔۔۔ بدیہی ہے کہ ان جامع الصفات، کثیر الکمالات اور مجموعۂ محامد اکابرین کے تربیت یافتگان میں ایسے نابغہ و عبقری اٹھے جو [illegible] جو بیک وقت [illegible] اور امیر لشکر بھی۔ ان اکابرین کے تلامذہ میں جہاں محدث، مفسر، متکلم، فقیہ، منطقی، مبلغ، مصنف اور مجاہد ہوئے ہیں وہیں ایسے فرید روزگار بھی ہوئے جو ہر فن کے گوہر یکدانہ ثابت ہوئے۔ جن کی جامعیت کبریٰ کا ایک زمانے میں لوہا مانا گیا۔ جو سجادہ و دلق کے ساتھ ساتھ شمشیر و سناں میں بھی نامور تھے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور ان کے پروردگان، علامہ انور شاہ [illegible] مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبید اللہ سندھی [illegible] نے اتحاد عالم اسلام اور آزادئ وطن کے سلسلے میں جو [illegible] ادا کیا اور جس طرح جلاوطنی، اسارت مالٹا اور مصائب و شدائد کو برداشت کئے وہ برصغیر کی صاف ستھری تاریخ کا [illegible] کے سلسلے میں علامہ شبیر احمد عثمانی اور ان کے دیگر رفقاء کی [illegible] سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تمام حضرات سیاسیات ہند میں مختلف روشوں پر چلنے کے باوجود "درجانان" پر آتے تھے [illegible] سے ہر ایک کو اس بات پر فخر تھا کہ ان کا تعلق اس مادر علمی سے ہے جسے دنیا دارالعلوم دیوبند کے نام سے جانتی ہے اور جس کی بنیادوں میں ان اکابرین کا ہوکار فرما تھا جن کا تعلق براہ راست شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے جاں باز خانوادہ حریت سے تھا۔ وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کی نسبی و نسبتی ذریت پر جان و دل سے فدا رہتے انہیں بالاکوٹ کے شہیدوں سے معنوی نسبت تھی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ شیخ الہند اور ان کے فرزندان اکابرین اس قافلۂ حریت کے مشن کی تکمیل کے لئے میدان کارزار میں سرگرم تھے۔ جس نے امیر المؤمنین سید احمد شہیدؒ کی قیادت میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے قیام اور فرنگی سامراج کو ملک بدر کرنے کے لئے داد شجاعت دیتے ہوئے غریب الوطنی کے عالم میں بالاکوٹ کی پہاڑیوں میں جان جان آفریں کے سپرد کی تھی۔

مقام افسوس ہے کہ آج بعض نام نہاد مفکرین سرزمین افرنگ میں بیٹھ کر اپنے آبا کی سنت کے مطابق تفریق بین المسلمین کی دبی ہوئی چنگاری کو شعلۂ جوالہ بنانے کے درپے ہیں۔ ان دنوں اس گروہ نا ہنجار کی قیادت کا شرف ہندوستان کے ایک "علامہ" کو حاصل ہے جو انگلینڈ کی مسموم فضاؤں میں پلا جان ہی سابنہ کے [illegible] ان کے پاکستانی ایڈیشن چھاپ رہے ہیں۔ یہ حضرات [illegible]

اور ان کے مخالف مصنفین کے چند کتابچے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں دیوبندی بزرگوں کی تحریروں میں وہ چیزیں بھی ہیں جو آج سے تقریباً پون صدی قبل اس دارالعلوم کے بعض حضرات سے منسوب کی گئی ہیں۔ ان مصنفین کا مقصد صرف ان تمام بزرگوں کو بدنام کر کے تکفیری فتنہ کو پھر سے ہوا دینا ہے۔ جو ان کے عام ناظرین پر ظاہر ہو کہ علماء حق اور علماء حریت کے پیرووں کے خلاف اپنی مزعومہ اغراض کے پیش نظر پیدا کیا تھا اور جسے اہل علم نے بڑی احتیاط سے ٹھکرا دیا تھا اور تکفیری فتنہ کے اس سرخیل کی شبانہ روز کوششوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے جانشینوں پر الزام اتہام اور دشنام کے باوجود اس "مجدد مائۃ حاضرہ" کو عام مسلمانوں میں پذیرائی نہ ہو سکی تھی۔ ہندوستانی علماء اور عوام میں تکفیری فتنہ کی کمی ناکامی کے بعد اس "مجدد و امام" نے حرمین شریفین کا رخ کیا اور وہاں علماء کے سامنے آزادی ہند کے متوالوں اور شمع رسالت کے پروانوں کی اردو کتابوں سے عبارات لے کر اپنی منشاء کے مطابق عربی ترجمہ کرتے ہوئے کچھ اس قسم کی ملاوٹ اور فن کاری سے کام لیا جس سے مصنف کی تحریر میں خود ساختہ معنی ڈالے جا سکیں۔ اس مجدد و امام نے مختلف صفحات سے عبارات کے ٹکڑے لے کر یکجا کئے اور ایک عبارت بنا دی۔ ساتھ ہی مرزا غلام احمد قادیانی کی صریح کفریہ عبارات کو بھی ان اکابرین کی خود تراشیدہ عبارات کے ساتھ رکھا تاکہ علماء حرمین کو فریب دینے میں آسانی ہو۔

ان محافظ علماء نے اس قدر مخالفت کے باوجود احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور صریح طور پر مصنفین کی تکفیر سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے یہ لکھا کہ اگر ان مصنفین کا یہ عقیدہ ہے تو یہ کافر ہیں ظاہر ہے اکابرین دیوبند کا وہ عقیدہ تھا ہی نہیں جو اس "مجدد و امام" نے عربی عبارات کے ذریعہ علماء حرمین کی خدمت میں پیش کیا تھا اس کے باوجود علماء حرمین نے انداز تحقیق و احتیاط علماء دیوبند کی طرف مراجعت کرتے ہوئے ان کے اصل عقائد معلوم کئے۔ جس کے جواب میں علامہ خلیل احمد محدث سہارنپوری نے المہند کے نام سے آپ اور اپنے اکابرین کے صحیح عقائد تحریر فرمائے۔ جس کی تصدیق علماء حرمین اور علماء ہندوستان نے کی۔

یہ ایک واضح امر ہے کہ اگر اس "مجدد و امام" کو ہندوستان کے علماء میں پذیرائی ہوتی تو حرمین شریفین میں تواریں چلاتا نہ ہی اسے حسام الحرمین لکھنے کی نوبت آتی۔ علماء حرمین سے اپنی خود ساختہ عبارت پر دستخط کرانے کے بعد اس "مجدد و امام" اور اس کے چند حواریوں نے غیر ضرورت سادہ لوح ہندوستانی علماء کو اپنے دام تزویر میں پھنسا کر چند فتوے حاصل کئے اور انہیں الصوارم الہندیہ کے نام سے چھپوایا۔ مقام غور ہے کہ یہ "مجدد و امام" کے چند چیلے ان علماء اکابرین پر تلواریں چلاتے تھے جو براہ راست فرنگی سے برسرپیکار تھے۔ جن کی تلواریں انگریز کے خلاف چل رہی تھیں یہ انہی پر تلواروں کی مشق کر رہے تھے مگر کون نہیں جانتا کہ ان کی یہ کاغذی تلواریں ہباءً منثوراً ہو کر رہ گئیں اور یہ لوگ نہ تو یہ جنگ برطانیہ ایسی جابر و ظالم حکومت کی تلواریں، توپیں، گولیاں ان حق پرستوں کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔

ایک قابل غور نکتہ یہ ہے کہ یہ طائفہ قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کو ولی اللہ اور بریلوی عقائد کا حامل بتاتا ہے۔ اس تکفیری گروہ کے غزالی دوراں، رازی زماں علامہ سید احمد شاہ کاظمی اپنی کتاب الحق المبین کے ص۱۲ پر تحریر فرماتے ہیں۔ لیکن علماء اہلسنت برابر اس فتنہ کے خلاف نبرد آزما رہے۔ ان علماء حق میں مذکورین صدر علماء کے علاوہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی حضرت مولانا عبدالسمیع رامپوری، حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب رامپوری، حضرت مولانا احمد رضا صاحب بریلوی، حضرت مولانا انوار اللہ صاحب حیدرآبادی اور حضرت مولانا عبدالقدیر صاحب بدایونی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب اس دور کے تمام علماء کے سرخیل حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اس عہد و امام کے دور میں بقید حیات تھے تو پھر اکابرین دیوبند کی طرف منسوب عبارات کے سلسلے میں ان سے رجوع کیوں نہیں کیا گیا۔ جبکہ حاجی صاحب تمام علماء دیوبند کے مرشد و مربی بھی تھے اور حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی اور حضرت تھانوی تو ان کے مرید و مجاز بھی تھے۔ سب سے موزوں دیانت دارانہ صورت اس کی یہی تھی کہ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں پیش ہو کر ان کے مریدوں اور خلفا کے خلاف ان سے شکایت کی جاتی اور عبارات مذکورہ اگر واقعی کفریہ ہوتیں تو وہ خود ان پر کفر کا فتویٰ دیتے۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا آخر کیوں؟ قارئین سوچ سکتے ہیں۔

ممکن ہے کوئی کم سواد یہ کہے کہ حاجی صاحب کی وفات کے بعد ان علماء نے یہ عبارات تحریر کیں جیسا کہ بعض جہلا نا واقفوں کے سامنے کہہ دیا کرتے ہیں تو گزارش یہ ہے کہ مولانا قاسم نانوتوی کے وصال کے بعد حضرت حاجی صاحب ۲۰ سال تک زندہ رہے اور حضرت نانوتوی کے انتقال کے بعد دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کے نام جو تعزیت نامہ لکھا اس کا ایک ایک لفظ حزن ملال اور غم واندوہ کا مرقع ہے۔ دیکھئے بیس بڑے مسلمان صفحہ۔

حضرت گنگوہی کی فتاویٰ رشیدیہ کی عبارت اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی براہین قاطعہ کی عبارت بھی حضرت حاجی صاحب کی زندگی میں ہی لکھی گئیں۔ یہ وہی عبارتیں ہیں جن کی بنیاد پر اس تکفیری گروہ کے امام ان علماء پر یہ اتہام لگاتے ہیں کہ مولانا گنگوہی اور مولانا سہارنپوری خدا کے جھوٹ بولنے کے قائل تھے۔ معاذ اللہ۔

نہ صرف یہ کہ ان دونوں عبارتوں کا علم حضرت حاجی صاحب کو تھا بلکہ ہندوستان کے مولوی نذیر احمد صاحب کے استفسار پر حاجی صاحب قبلہ نے ان عبارات کی حقیقت علماء و عوام کو سمجھائی آپ نے قرآن و حدیث اور علماء متقدمین کی عبارات سے حضرت گنگوہی اور حضرت سہارنپوری کی فتاویٰ رشیدیہ اور براہین قاطعہ کی مدعم تہمت والی عبارات کی تائید و تصویب کی ہے۔ طوالت کی خاطر ہم وہ عبارت نقل نہیں کرتے جو حاجی صاحب نے حضرت گنگوہی اور حضرت سہارنپوری کی حمایت میں تحریر فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو ہفت مسئلہ صفحہ مطبوعہ جامعہ ضیاء العلوم لاہور۔ حضرت حاجی صاحب قبلہ کی وہ عبارت ملاحظہ فرمایئے جو انہوں نے ان عبارات کے سامنے آ جانے کے بعد تحریر کی۔ جن عبارات علیہ کو یہ طائفہ اور ان کا امام کفریہ عبارات کہتے ہیں۔ حاجی صاحب قبلہ ارشاد فرماتے ہیں۔

اور یہ بھی یاد رکھیں کہ جو شخص اس فقیر سے محبت و عقیدت اور مریدی کا تعلق رکھتے ہیں وہ مولوی رشید احمد صاحب اور مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ کو جو کہ تمام علوم ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع ہیں بجائے مجھ راقم کے بلکہ مجھ سے بہت درجہ اوپر شمار کریں۔ اگرچہ ظاہر میں معاملہ اس کے الٹ ہو رہا ہے کہ وہ میری جگہ اور میں ان کی جگہ ہو گیا ہوں (یعنی وہ مرید اور میں پیر ہوں) اور ان کی صحبت کو غنیمت جانیں کہ اس زمانے میں ایسے لوگ نایاب ہیں اور ان کی بابرکت خدمت سے فیض حاصل کرنے والے ہوتے ہیں اور سلوک کا طریقہ جو اس رسالہ (ضیاء القلوب) میں لکھا گیا ہے ان کی نگرانی میں حاصل کریں۔ انشاء اللہ محروم نہ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ ان دونوں کی عمر میں برکت دے اور تمام عرفانی نعمتوں اور اپنے قرب کے کمالات سے مشرف فرمائیں اور اونچے اونچے مرتبوں پر پہنچائیں اور ان کی ہدایت کے نور سے سارے عالم کو نورانی بنا دیں اور قیامت تک ان دونوں کا فیض جاری رکھیں بحرمت نبی پاک و آل پاک۔

حضرت حاجی صاحب کے حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی کی

صورت میں کفریات عبارات کو پڑھنے کے بعد ایک مرتبہ پھر علامہ کاظمی شاہ صاحب کی عبارات ملاحظہ فرمائیں۔

لیکن علماء اہلسنت بنا بر اس فتنہ کے خلاف شمشیر آزما رہے اور علماء حق مذکورین صدر کے علاوہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی۔ ارج ص۔

اس کے بعد اس طائفہ کے امام کی عبارت پڑھ لیجئے اور داد دیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے :-

"رشید احمد اور جو اس کے پیرو ہوں
جیسے خلیل احمد انبیٹھوی اور اشرف علی وغیرہ ان
کے کفر میں کوئی شبہ نہیں نہ شک کی مجال،
بلکہ جو ان کے کفر میں شک کرے بلکہ کسی طرح کسی
حال میں انہیں کافر کہنے میں توقف کرے اس کے
کفر میں بھی شبہ نہیں :"

کاظمی صاحب فرماتے ہیں حاجی صاحب، علماء حق اہلسنت میں سے ہیں۔ امام احمد رضا کہتے ہیں رشید احمد، خلیل احمد اور اشرف علی کے کفر میں شک کرنا یا کسی طرح ان کے کفر میں تامل کرنا بھی کفر ہے۔ جبکہ حضرت حاجی صاحب حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی کو اپنی جگہ خود ان کی جگہ کہتے ہیں ان کی صحبت کو بابرکت فرماتے ہیں۔ ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعا گو ہیں۔ ان کے ذریعہ تاقیام قیامت ہدایت پھیلنے کی تمنا کر رہے ہیں۔ ان کی عبارات کی تصویب و تائید کر رہے ہیں۔ خدا جانے علامہ کاظمی شاہ صاحب، حضرت حاجی صاحب کو اپنے امام کے فتوے کی زد سے کیسے بچائیں گے۔ اور اس صریح کفر کو ان سے کیسے مندفع کر کے انہیں علماء حق اہلسنت ہونے کا مرتبہ بلند بخشیں گے۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

رہی حضرت تھانوی کی حفظ الایمان والی عبارت تو اس سے متعلق عرض یہ ہے کہ وہ یقیناً حاجی صاحب قدس سرہ کی وفات کے دو سال بعد تحریر کی گئی۔ حاجی صاحبؒ کا وصال ۱۸۹۹ء میں ہو گیا تھا جبکہ حفظ الایمان کی عبارت ۱۹۰۱ء میں منظر عام پر آئی۔ مگر اس کا کیا جواب کہ اس طائفہ کے عقائد میں بزرگوں کو آنے والے حالات کا قبل از وقت علم ہوتا ہے اس عقیدے کی بنیاد پر تو حاجی صاحب قبلہ کو یہ علم ہونا چاہیئے تھا کہ میری وفات کے بعد مولانا اشرف علی تھانویؒ کفریہ عبارت تحریر کریں گے۔ لہذا انہیں قبل از وقت ان کے کفر سے آگاہ کردیں اور تائب نہ ہونے کی صورت میں بریلوی امام کی پیروی کرتے ہوئے ان کے کفر کا اعلان کر دیں یا کم از کم اپنی مریدی سے خارج کر دیں یہ بھی نہیں خلافت ہی منقطع کر دیں۔ واہ رے مذہب حق اہلسنت۔

شیشے کے گھر میں بیٹھ کے پتھر ہیں پھینکتے
دیوار آہنی پہ حماقت تو دیکھئے

یہ ہیں چند نمونے اس تحقیق انیق کے اور اس امام کی خدمات دینیہ دملیہ کے جس کو پوری صدی بعد اہل علم میں متعارف کرانے کی غرض سے چند محقق و مدقق پاپڑ بیل رہے ہیں۔ اب جبکہ پورے عالم اسلام کے اتحاد کی ضرورت پہلے سے سوگنا زیادہ ہو گئی ہے، تفریق بین المسلمین کا فریضہ انگلینڈ کی فضاؤں میں بیٹھ کر انجام دیا جا رہا ہے اور ایک ایسے شخص کو جنگ آزادی کا مجاہد بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ جس کی تمام عمر اسلام، وطن اور ملت کی سرفرازی میں جینے والوں کو دشنام دینے میں گزری۔ جس کا سرمایہ حیات مسلمانوں کو کافر بنانا رہا۔ جس نے ہندوستان کے دارالاسلام ہونے کا فتویٰ اس وقت دیا جب کہ راہ حق کے مسلمان انگریز کے مقابلے میں حق کی حمایت میں سرفروشی و جاں سپاری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ہم ببانگ دہل کہتے ہیں کہ ان بے جوڑ بے راہ اور بھونڈی تحریروں سے بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ تاریخ گواہ ہے اس

قسم کی کوششیں ہر دور میں ہوتی رہیں مگر نتیجہ صفر ہی رہا۔ آج بھی خدمت دین کے ہر محاذ پر فرزندان دارالعلوم سرگرم عمل ہیں اور کل بھی ان شاء اللہ انہی کا چراغ جلتا رہے گا۔ نہ پہلے کسی کی دال ان کے سامنے گلی ہے نہ اب گلتی ہے اور نہ آئندہ گلنے کی امید ہے۔ دارالعلوم کے فیض یافتہ پاک و ہند ہی میں نہیں اکناف عالم کے گوشے گوشے میں متانت و سنجیدگی کے ساتھ خدمت دین متین کر رہے ہیں۔

پاکستان ہی میں دیکھئے ملک کے کونے کونے میں مدارس دینیہ کا جال بچھا ہوا ہے۔ جن سے ہزاروں تشنگانِ علوم اسلامیہ سیراب ہو رہے ہیں۔ کون سا ایسا ملک اور کونسا ایسا شہر ہے جہاں اس طوبیٰ کے درخت کی شاخیں نہیں پہنچیں۔ یہ سب ان اکابرین کی للّٰہیت و اخلاص کا اثر ہے۔ جنہوں نے اپنی زندگیاں علوم نبویہ کی نشر و اشاعت میں کھپا دیں۔

ختم نبوت کی حفاظت کا محاذ ہو یا صحابہ کرام کی عظمت و صحابیت کا دارالعلوم ہی کے فرزند سینہ تانے ہوئے نظر آئیں گے۔ مرزائیت کا فتنہ ہو یا تجدد پسندی کا خدائے قدوس نے انہی ابنائے دارالعلوم کو شرف بخشا ہے کہ وہ ان فتنوں کا علمی و تحریکی پوسٹ مارٹم کریں۔

سیاسیات کے خارزار میدان میں بغیر اغیار کے سہارے اور بیساکھیوں کے اگر کھڑے ہیں تو یہی کھڑے ہیں۔ یہی وہ دیوبند کے ناز سپوت جن کی للکار سے آمریت و سلطانیت کے پرستار لرزہ براندام ہیں۔ آخر میں ہم مولانا ظفر علی خان مرحوم کے شعر پر اپنی گذارشات ختم کرتے ہیں۔

شاد باد و شاد زی اے سرزمین دیو بند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

مسئلہ تکفیر اور اکابرِ دیوبند

حضرت العلامہ مولانا شمس الحق افغانی سابق وزیر معارف ریاست قلات و
سابق شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند و جامعہ اسلامیہ بہاولپور

کافر بنانا عام علمائے اسلام کے متعلق جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں مشہور کیا گیا ہے کہ علماء کافر بناتے ہیں، حالانکہ یہ غلط ہے کہ علماء کافر بناتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ علماء کافر بتاتے ہیں بنانا اور بات ہے اور بتانا اور۔

اگر ایک آدمی اپنی عادت بد کی وجہ سے چوری اختیار کرے تو وہ خود اپنے قصد و ارادہ سے چور بن گیا، یہ ہوا بنانا، لیکن اگر وہ چور مسلمانوں کی بھیڑ میں گھس جائے تاکہ چوری کرے اور کوئی اسے جانتا ہو پھر ایک واقف حال شخص مسلمانوں کو کہے، کہ خبردار یہ چور ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالو اور احتیاط کرو تو یہ چور بتانا ہوا بنانا نہیں، چور بنانا تو بُرا ہے لیکن چور بتانا ہمدردی اور احسان ہے کہ تحفظ مال ہو، اسی طرح عادت بد یا صحبت بد سے اگر کوئی شخص پیشہ ور گمراہ تحریر و تقریر سے کسی کا اسلامی عقیدہ بگاڑ دے اور عقیدہ حقہ چرا کر اس کے بدلے میں کافرانہ عقیدہ اس کے دل میں مضبوط کرے جیسے کسی کی جیب سے اصلی نوٹوں کا بنڈل نکال کر جعلی نوٹ ڈال دے، جس کی وجہ سے وہ اپنے قصد و ارادے کے تحت کفر کو اسلام کے نام سے موسوم کر دے اور اسلام کو کفر کے نام سے ملقب کرے، تو یہ کافر بنانا نہیں، کافر تو تبدیل عقیدہ کی وجہ سے وہ خود بن گیا، علماء نے صرف بغرض ہمدردی مسلمانوں کو آگاہ کر دیا کہ اس سے بچیں۔

وسیع اسلام یہ درست ہے کہ اسلام ایک وسیع مذہب ہے، لیکن جدید تعلیم یافتہ طبقہ ناواقفیت کی وجہ سے اس وسعت کی رو میں ایسا بہہ گیا کہ چاہے کوئی کچھ عقیدہ رکھے، لیکن جب وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو تو اس کو مسلمان سمجھا جائے، کافر نہ کہا جائے، یہ رائے غلط ہے، اسلام وسیع ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کو اپنی ضد تک وسیع کیا جائے کہ اس کی مقابل چیز بھی اس کے دائرے میں آجائے، سورج کی روشنی وسیع ہے لیکن پھر بھی اپنی ضد یا مقابل جو تاریکی ہے سے جدا اور ممتاز ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تاریکی بھی روشنی سے موسوم ہو کر روشنی کہلائے، بہرحال وسیع چیز بھی لامحدود نہیں ہوتی، جس کی حد بندی نہ ہو سکے اور اپنی ضد تک اس کا دائرہ وسیع ہو، یہی وجہ ہے کہ چونکہ ایمان و کفر کے ثمرات و نتائج اور حدود ایک دوسرے سے ممتاز ہیں اور انسانی زندگی کے لئے ان کا تعین انتہائی اہم ہے۔

ایمان کا امتیاز نعمت عظیمہ ہے

انسانی زندگی کا اہم ترین مقصد دائمی حیات و راحت اور تمام تکلیفات و آلام سے تحفظ ہے، جس کا اصطلاحی نام جنت و سعادت ہے اور انسانی حیات کے لئے مضر ترین چیز دائمی آلام و مصائب اور راحت و لذت سے محرومی ہے جس کا اصطلاحی نام دوزخ ہے۔

اول الذکر کے حصول کا واحد یقینی ذریعہ ایمان ہے اور دوسرے کا واحد سبب کفر ہے۔ اس لئے نافع ترین چیز ایمان اور مضر ترین چیز یعنی کفر کی معرفت انسان کے لئے سب سے زیادہ اہم ہے تاکہ انسان سرچشمہ انعامات الٰہی سے بہرہ مند ہو اور سرچشمہ آلام و مصائب سے محفوظ رہے، ان دونوں کی معرفت تک عقل و حواس کی رسائی آسان نہ تھی اس لئے ارحم الراحمین نے بعثت انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری کیا اور کتب اللہ نازل فرمائیں، تاکہ دریافت حقیقت ایمان و کفر میں کوئی دقت پیش نہ آئے اور آسانی کے ساتھ دونوں کے حدود متعین ہو سکیں، تاکہ ایمان کو کفر اور کفر کو ایمان سمجھ کر انسان برباد و تباہ نہ ہو، کفر و ایمان کے حدود کا تعین انسان کی حقیقی ہمدردی ہے اور دونوں کو خلط ملط کرنا انسانیت پر ظلم عظیم ہے۔

اس موضوع پر کتاب و سنت اور اقوال فقہاء و متکلمین کی تحقیقات کا لب لباب و نچوڑ ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری امام العصرؒ کی کتاب "اکفار الملحدین فی ضروریات الدین" میں درج ہے جو مولانا خلیل احمد مصنفؒ "بذل المجہود شرح ابی داؤد" حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صدر جمعیت علماء ہند، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی مفتی دارالعلوم دیوبند و مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب فتح الملہم کی تصدیق و تصویب کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

تمہید:— تمام انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور جملہ کتب سماویہ کے نزول کا اصلی اور اہم مقصد، ایمان و کفر کی حد بندی اور امتیاز ہے، تاکہ خلط ملط اور افراط و تفریط سے دونوں کا مفہوم محفوظ رکھ کر دونوں کے مفہوم کی مکمل حد بندی کی جائے، تاکہ نہ اس شخص کو جو عقیدۃً تعلیمات نبوت و ہدایات کتب سماویہ کے بموجب مومن ہو، اس کو کفر میں داخل کیا جائے اور اسی طرح وہ شخص جو عقیدۃً کافر ہو، اس کو ایمان اور ملت اسلامیہ میں داخل کیا جائے مقدم الذکر غلط تنگی اور مؤخر الذکر نامعقول توسیع ہے اور دونوں جرم عظیم ہیں۔ پہلی صورت میں ایمان کو کفر سمجھنا اور دوسری صورت میں کفر کو ایمان سمجھنے کا ارتکاب لازم آتا ہے جو بعثت انبیاء علیہم السلام اور انزال کتب سماویہ کے مقصد کو فنا کرنا ہے۔

اکفار الملحدین صفحہ ۲ پر امام ابو المعالی سے نقل ہے

ادخال الكافر فى الملة واخراج عنها عظيم فى الدين.

کافر کو اسلام میں داخل کرنا اور مومن کو ملت سے نکالنا اسلام میں جرم ہے۔

دونوں کی حد بندی کیلئے ایمان و کفر کے مفہوم کی وضاحت ضروری ہے

ایمان شرعی اقرار و تصدیق و تسلیم کا نام ہے اور کفر انکار کا۔ جو دونوں کے لغوی معنی کے مطابق ہے۔ ایمان — امن سے ماخوذ ہے اور جب کسی امر یا کسی ذات کی بات کی تصدیق و تسلیم کی جائے تو تصدیق کنندہ نے اس امر اور قائل کو انکار و تکذیب سے مامون و محفوظ سمجھا اور جو انکار کرے، اس نے امر حق اور قائل حق کو چھپایا

پہلی گزارش ہے کہ وہ امور ہیں جن کے ماننے کا نام ایمان ہے اور ان سے متعلق ضروریات دین ہیں یعنی جن سب کے ماننے کا نام ایمان اور ان میں سے کسی ایک کے انکار کا نام کفر ہے۔ ایمان کل ضروریات دین ماننے کا نام ہے اور کفر بعض یا ایک کے نہ ماننے کا یا انکار کا نام ہے۔

مثل موجبہ کلیہ کے جس کی نقیض سالبہ جزئیہ ہے، موجبہ کلیہ کل ضروریات کی تسلیم و تصدیق اور ایمان ہے کہ اس میں حق لغۃً انکار و تکذیب سے مامون ہوتا ہے اور سالبہ جزئیہ بعض ضروریات دین کا انکار جو لغۃً کفر یعنی سر الحق ہے اور حق کی تکذیب ہے۔

ضروریات دین کیا ہیں؟ ضروریات دین جن سب کے ماننے پر ایمان اور کسی کے انکار پر کفر کا مدار ہے۔ وہ امور ہیں جن کا دین رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں سے ہونا عملی، بدیہی اور واضح ہو اور علماء اور متدین عام مسلمانوں کو بھی ان کا دین اسلام میں سے ہونا سب کو معلوم ہو، اگرچہ دین سے بے خبر اور جاہل لوگوں میں سے بعض کو معلوم نہ ہو، مثلاً توحید باری تعالیٰ ذات و صفات، افعال باری، نبوت، ختم نبوت، حشر نشر، حساب کتاب، جنت، دوزخ، ارکان اسلام، نماز روزہ حج زکوٰۃ، حرمت خنزیر و شراب و سود یا قربانی بمساک وغیرہ کہ ہر واقف اسلام ان امور کو اسلامی امور سمجھتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا انکار کہ یہ امور اسلام میں سے نہیں، حالانکہ یہ امور تواتر سے ثابت ہیں، اگرچہ بعض ان میں سے فرض ہیں بعض فرض نہیں۔ جیسے قربانی یا داڑھی رکھنا۔ لہٰذا ان کا انکار کہ یہ اسلام میں نہیں کفر ہے۔ اگر کوئی مانتا ہو لیکن عمل نہ کرتا ہو یہ کفر کی حد میں داخل نہیں ہوتا۔

من ضروریات الدین لانہ کل واحد یعلم ان ھذا من دین النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ولابد منہ

فکونها من الدین ضروری وتدخل فی الایمان لابد من ان الاتیان بها بالجوارح [illegible] کما یتوهم فقد یکون استحبابها [illegible] ضروریا یکفر جاحده وذلک یجب الایمان به (اکفار الملحدین ص ۲)

ضروریات دین کا نام اس بنا پر ہے کہ ہر مسلمان متدین جانتا ہے کہ یہ امور دین رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں سے ہیں۔ اس لئے ان کا ثبوت دین میں سے ہونا ضروری ہے اگرچہ عمل ضروری نہ ہو۔ یہاں تک کہ مستحبات و مباحات وغیرہ بھی ضروریات دین میں داخل ہیں جب ان کا ثبوت متواتر ہو اور ان کے انکار سے کفر لازم آتا ہے۔ اور مثلاً قربانی، داڑھی رکھنا، عورتوں کا پردہ اسلام میں بالغہ شخص کی قربانی کی بابت، ان میں سے کسی کا نہ کرنا کفر نہیں لیکن نہ ماننا کفر ہے کیونکہ یہ انکار شریعت اور تکذیب شارع ہے جو کلمہ طیبہ کے مفہوم کے خلاف ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو مامورات یا منہیات یعنی کتاب اللہ، سنت متواترہ اور تعامل مستمرہ اہل دین سے ثابت ہوں، کہ ان کے جاننے میں علما اور عوام یعنی دیندار مسلمان سب شریک ہوں، تو ان کا ماننا ایمان ہے اور کسی ایک کا انکار کفر ہے۔

پہلی صورت میں ضروریات دین کی کلیۃً تصدیق و تسلیم ہے اور دوسری صورت میں بعض کی تکذیب اور انکار ہے، یہ کفر ہے کیونکہ کل ضروریات دین کے ماننے کا نام ایمان ہے، اگر بعض سے بھی کفر و انکار ہو، تو وہ ایمان نہیں بلکہ کفر ہے۔ قرآن میں ہے

افتؤمنون ببعض الکتب وتکفرون ببعض

کیا تم کتاب کے بعض حصے مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو۔

ایمان کے لئے تین امور کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ ضروریات دین میں اللہ اور رسول کے فیصلے کو حرف آخر جاننا

۲۔ ان پر اختیاری تصدیق، انشراح صدر کے ساتھ یقین کرنا

۳۔ التزام شریعہ وتسلیم کہ عملاً ان کو ماننا

سورۂ نساء میں ارشاد ہے۔

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم

تیرے پروردگار کی قسم کہ مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ آپ کو (رسول کو) فیصل نہ مانیں ان جھگڑوں میں جو انہیں اٹھیں۔

اس سے امر اول ثابت ہوا کہ نزاع میں رسول اللہ کو منصف نہ ماننا ایمان کے خلاف ہے۔

ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت

پھر نہ پاویں تنگی اپنے جی میں تیرے فیصلے سے

اس سے امر دوم ثابت ہوا کہ آپ کے حکم وفیصلہ کو انشراح صدر اور دل کی خوشی سے یقین کرے، یہ تصدیق اختیاری ہے۔

ویسلموا تسلیما اور قبول کرے دل کی خوشی سے یعنی اس پر عمل کرنا قبول کرے اس سے امر سوم ثابت ہوا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ضروریات دین کا علم ویقین ہو، لیکن ان پر اختیاری تصدیق ویقین کرنا مقصود ہو، جیسے بعض اہل کتاب کہ

یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم

پہچانتے ہیں وہ آپ کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو

بعض اہل کتب اپنی کتاب کی خبر کی وجہ سے صداقت نبوت کا یقین رکھتے تھے۔ جیسے ہرقل، بعض ارکان وفد بخاری اور موجودہ دور کے بعض مستشرقین عیسائی، لیکن شرح صدر اور التزام شریعت وتعلیم عملی سے ان کے قلوب خالی تھے۔ اس سے بھی ایمان حاصل نہیں ہوتا

ان تین امور کی عقلی توضیح

جب تک ضروریات یعنی احکام قطعی الوہیت ورسالت پر یقین نہ ہو بلکہ شک وتردد ہو تو یہ ایمان نہیں، کیونکہ تمام عدالتوں میں شک کرنے والے کا بیان قابل اعتبار نہیں، نہ اس سے دعوی ثابت ہو سکتا ہے

اس طرح با تصدیق و یقین کے اگر اس شخص کو بھی تصدیق و یقین سے خالی ہو، اللہ اور رسول کا مصدق نہیں کہا جا سکتا اور نہ مومن ہو سکتا ہے۔

۲۔ تصدیق کے دو درجے ہیں۔ ایک علمی و اضطراری وہ جو اپنی مسلم کتب اور عقلی دلائل سے مجبور ہو کر ضروریات واحکام بہت کو صحیح یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن انشراح قلب اور خوشی سے یقین نہیں کرتا، یہ تصدیق بھی وہ ایمان نہیں، جس پر جزاء نجات وسعادت اخروی مرتب ہوتا ہے۔ کیونکہ جزا کا تعلق افعال اختیاریہ کے ساتھ ہے جو قلب کے فعل اختیاری کا نام ہے۔ جس کے لوازمات میں یہ بھی ہے کہ ایمان خاتم الانبیاء علیہم السلام اور اس کی شریعت محبوب قلبی ہو اور پرانے دین سے قلب میں بیزاری ہو، قدیم وجدید زمانے میں بہت سے افراد صداقت نبوت کے اعلان کے باوجود نہ اسلام ان کے لئے محبوب بنتا ہے اور نہ اپنے سابق دین سے بیزاری کا اثر ان میں پایا جاتا ہے

مستشرقین یورپ مثلاً لیبان، سرولیم میور، ڈاکٹر مارلس، جان ڈیون، ملکہ مانگانی اور گاندھی تک نے ایسی تصدیق کا اعلان تحریراً کیا جو میری کتاب علوم القرآن میں کسی قدر درج ہے، اپنے دین کے جو احکام خلاف اسلام ہیں، ان کو بھی ملتفے سب خواہ مذہب جدید عیسائیت ہو یا ہندو دھرم یا الحاد وکمیونزم کیونکہ ان کو اختیاری تصدیق حاصل نہ تھی جو ایمان کے لئے ضروری ہے اور اس غیر اختیاری تصدیق کا اسلام میں اعتبار نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اسلام کے بہت احکام عقائد واعمال دین مسیحیت وہندو مذہب کے خلاف اور نقیض ہیں، لہذا صحیح اختیاری تصدیق اس کا نام ہے کہ اسلام کی تصدیق کے ساتھ اس کے خلاف نقیض احکام کا بھی انکار کیا جائے لیکن ان مصدقین نے ایسا نہیں کیا، لہذا ایمان کے لئے

وہ انقیادی تصدیق ہے جس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ سابق دین
جس کے وہ احکام جو خلاف اسلام ہیں ان کا بھی انکار کیا جائے،
ورنہ تحقیق حق نہیں ہوسکے اور دونوں متضاد و متناقض احکام
کی تصدیق ایمانی بیک وقت ممکن ہے۔

سوال:۔ اگر کوئی ضروریات دین کا منکر نہیں، بلکہ ان میں
تاویل کرتا ہو، تو وہ مومن کہلائے گا؟

جواب:۔ مومن نہیں کہلائے گا کیونکہ کتاب و سنت متواتر
و سلف و خلف امت سے جو ضروریات دین اور ان کے معانی و مقاصد
بالتواتر ثابت ہیں۔ ان کے معانی و مقاصد کی تبدیلی درحقیقت تاویل
کی آڑ میں ضروریات کا انکار ہے جو مانع تکفیر نہیں ورنہ دین حق کا
تشخص ختم ہو جائے گا اور ایمان و کفر میں امتیاز ختم ہو کر مقصد ارسال
انبیاء علیہم السلام و انزال کتب سماویہ ختم ہو جائے گا۔ بالخصوص
کردہ ضروریات سب محکمات ہیں متشابہات نہیں۔ متشابہات
کی دیگر نصوص کتاب و سنت سے خیر القرون میں اگر صحیح تاویل منقول
ہو تو وہ درحقیقت مراد الٰہی کا تعین ہے اور خلاف تواترات نہیں
اور نہ وہ ضروریات دین میں تاویل ہے بلکہ غیر ضروریات دین سے
ایمان کے مسئلے میں ضروریات کے سلسلے میں غیر ضروریات کی بحث
لانا بے فائدہ ہے۔ ضروریات دین کی بحث گزر چکی ہے۔

ایثار الحق علی الخلق للحافظ محمد بن ابراہیم الیمانی ص ۴۱۲

لان الکفر جحد الضروریات او تاویلها

یعنی کفر ضروریات دین کا انکار یا انہیں تاویل کرنا ہے۔

اکفار الملحدین ص ۱۱۶ میں ہے۔

والتاویل فی ضروریات الدین لا یدفع الکفر

ضروریات دین کی تاویل کفر سے نہیں بچاتی۔

خیالی و حاشیہ العلامہ زکریا الکبری فی الفتوحات المکیۃ باب ص ۲۹۵ میں ہے

التاویل الفاسد کالکفر

ضروریات دین میں فاسد تاویل کفر ہے۔

اکفار الملحدین ص ۱۹ میں ہے۔

اجماع الامۃ علی تکفیر من خالف الدین المعلوم بالضرورۃ

دین کی ضروریات کی مخالفت کے کفر ہونے پر اجماع امت ہے ص ۹۵
بر نقل عن ایثار الحق علی الخلق ص ۴۱۱ و انظر فی اکفار الملحدین عن ایثار الحق
علی الخلق ص ۴۱۵

لا خلاف فی کفر من جحد ذلک المعلوم بالضرورۃ للجمیع
و تستر بالتاویل فیما لا یمکن بالتاویل کالملاحدۃ

جمیع امت کا اس میں اختلاف نہیں کہ جو معلوم بالضرورت ہو اس کا
انکار کفر ہے، اگرچہ یہ انکار تاویل کے پردے میں جبکہ یہ تاویل ایسی
کھلی چیزوں میں ناممکن ہے جیسے ملاحدہ کی تاویل اکفار ص ۹۵

سوال:۔ اگر اسلام کی کھلی چیزوں سے کوئی انکار کرے، اگرچہ
تاویل کر کے ایسا کرے، لیکن اگر وہ شخص کفر کا التزام نہ کرے۔ بلکہ
اپنے کو مسلمان کہے، اگرچہ قانون اسلام سے کفر لازم آتا ہو تو کیا التزام
کفر نہ کرنے سے وہ شخص کفر سے بچ سکتا ہے۔

جواب:۔ کفر سے نہیں بچ سکتا کیونکہ جس عقیدہ سے بوجہ
انکار ضروریات دین کفر لازم آتا ہو، خواہ وہ التزام کفر نہ کرے جب
بھی وہ کافر ہے۔ کیونکہ لزوم کفر کافر ہونے کے لئے کافی ہے۔ التزام
کی ضرورت نہیں، اگرچہ عناد کی وجہ سے التزام کفر نہ کرے۔

فی الکلیات ولزوم الکفر المعلوم کفر، اذا کان بینا فهو فی
حکم الالتزام لا اللزوم مع عدم العلم فلیس
فی عبارۃ المواقف التقیید بان یعلم ان اللزوم
کفر انما فیه ان یعلم اللزوم

کلیات ابی البقاء میں ہے کہ کفر کا لزوم جب معلوم ہو جبکہ وہ کھلا ہو

تو وہ التزام کفر کے حکم میں ہے نہ کفر نا معلوم اللزوم مواقف میں یہ قید مذکور نہیں بلکہ جب کسی قاعدہ سے قانون شرع کے مطابق کفر لازم آتا ہو وہ کفر کا التزام ہے چاہے اس لازم کا کفر ہونا اس کو معلوم نہ ہو (اکفار الملحدین ص[illegible]) میں کہتا ہوں

کہ لزوم کفر اسکو معلوم نہ ہو تو ایسے جاہل کو جب عالم بتلادے تو پھر یقیناً لزوم اور التزام میں فرق نہ رہے گا۔ یواقیت شعرانی کی عبارت سے منضبط یہی معلوم ہوتا ہے دیکھو اکفار الملحدین ص۹۲ یعنی التزام بایں معنی کہ اس منکر ضروریات دین کی زبان سے یہ اقرار کرایا جائے کہ میں اس عقیدہ کے لازم کو مانتا ہوں، ضروری نہیں۔ بلکہ نفس الامر میں اس کا کفر ہونا کافی ہے۔ ورنہ تو روئے زمین پر کوئی کافر اپنی زبان سے اپنے کو خود کافر ہونے یا اپنے عقیدہ کے کفر ہونے کا اقرار نہیں کرتا۔ تو کافر کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔

سوال:- اہل سنت کا یہ قول کہ:

لا نکفر احداً من اهل القبلة سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ اس کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبلہ رخ نماز پڑھنے والا خواہ کوئی عقیدہ رکھے اس کو کافر نہیں سمجھا جائے گا۔ جو قطعاً باطل ہے۔

الجواب:- اہل قبلہ سے فن علم العقائد و علم الکلام میں وہ لوگ مراد ہیں جو ضروریات اسلام کے معتقد ہوں، منکر نہ ہوں ورنہ وہ اہل قبلہ سے خارج ہیں۔

نبراس ص۵۷۲ میں ہے۔

"متکلمین کی اصطلاح میں اہل قبلہ وہ ہیں جو ضروریات دین کی تصدیق کرے یعنی وہ امور جن کا شریعت میں ثبوت ہو اور مشہور یہ ہے کہ جس نے ضروریات دین یعنی حدوث عالم اور حشر اجساد اور علم باری تعالیٰ فی الجزئیات نماز، روزہ، کی فرضیت وغیرہ کا انکار کرے

وہ اہل قبلہ نہیں ہے۔

اور عدم تکفیر کا مطلب یہ ہے کہ معاصی کے ارتکاب سے غیر مشہورہ امور خفیہ کے انکار سے کافر نہ ہوگا جیسا کہ بعض محققین نے تحقیق کی ہے" (ترجمہ)

رد المحتار جلد نمبر ۳ باب الامامۃ ص[illegible]

لا خلاف فی کفر المخالف فی ضروریات الاسلام وان کان من اهل القبلة المواظب طول عمره علی الطاعات کما فی الشرح التحریر ومعنی عدم تکفیر اهل القبلة عدم تکفیرهم بارتکاب المعاصی ومن لیس معلوم ضروری [illegible] سیدنا [illegible] کفر [illegible].

(والتفصیل فی اکفار الملحدین ص[illegible] تا ص[illegible])

بہرحال مذکورہ حوالہ جات اور ایسے بے شمار حوالہ جات کا مقصد یہ ہے کہ اہل قبلہ سے مراد ضروریات اسلام کے ماننے والے ہیں کیونکہ ضروریات دین کا منکر اسلام سے اور اہل قبلہ سے خارج ہے۔

شرح تحریر اصول ص۳۱۴ ج۳ میں امام اعظمؒ کا لفظ یہ ہے

عن ابی حنیفة لا نکفر اهل القبلة بذنب فقید بذنب۔

پس مراد یہ ہے کہ اہل قبلہ کی تکفیر گناہ کے سبب درست نہیں جیسے معتزلہ اور خوارج کا خیال ہے نہ یہ کہ منکر ضروریات اسلام ہونے پر تکفیر ہوگی۔ کیونکہ تکفیر منکر ضروریات دین پر اجماع امت ہے نیز خود لا نکفر احداً من اهل القبلة کے لفظ میں بھی دلالت موجود ہے کہ اہل قبلہ سے مراد معتقد ضروریات دین ہے، کیونکہ لا نکفر میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اہل قبلہ ہونا اور کافر ہونا دو مقابل چیزیں ہیں۔

کفر چونکہ ضروریات اسلام کے انکار کا نام ہے تو اہل قبلہ معتقد ضروریات دین کا نام ہوگا۔ ورنہ تقابل غلط رہے گا

باقی ص[illegible] پر

اولئک آبائی فجئنی بمثلھم   اذا جمعتنا یا جریر المجامع

اکابرِ دارالعلوم تحقیق و تدقیق کے آئینے میں

مولانا حافظ مقبول احمد (برطانیہ)

اللہ کریم نے دین متین کی جس خدمت کے لئے خاندانِ ولی اللّٰہی کو منتخب فرمایا تھا ٹھیک اسی طرح اکابرِ دارالعلوم دیوبند ان کے وارث و جانشین ثابت ہوئے۔ اکابرِ دارالعلوم کی للہیت، علم و عمل کی وسعت اور اسلامی خدمات کی ایک دنیا معترف ہے۔ بحمداللہ اس خاندان کا ہر فرد پیکرِ خلوص و للہیت، مجسمۂ تقویٰ و طہارت اور آسمانِ علم و عمل کا درخشندہ ستارہ بن کر چمکا۔ ظلم و جہالت اور ضلالت و گمراہی میں ڈوبی ہوئی دنیا کو ان حضرات نے کتاب و سنت اور معارفِ نبوت کے انوار سے منور فرما کر ساحلِ مراد پر پہنچایا۔

کتاب و سنت کے احکامات ظاہرہ ہوں یا اسرار و رموز باطنیہ، سب ان کا حصہ تھے۔ اکابرِ دیوبند کا علمی و عملی مقام تو صاحبِ بصیرت حضرات ہی معلوم کر سکتے ہیں ایک طالب علم ان کے مقاماتِ رفیعہ کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ اکابر کے علمی، تحقیقی اور عرفانی کمالوں کی چند جھلکیاں ہدیۂ ناظرین کی جا رہی ہیں۔

۱۔ حضرت مولانا حکیم الاسلام قاری محمد طیب صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی اول حضرت مولانا عزیز الرحمٰن رح نے جنہیں گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس منصبِ افتاء پر متمکن فرمایا تھا۔ ایک رات سونے سے قبل یہ سوچنے لگے کہ قرآن کریم میں بالتصریح یہ آرہا ہے لیس للانسان الا ما سعیٰ کہ آدمی کو اپنا عمل اور اپنی کوشش ہی کا ثمرہ ملے گا۔ اس کے برعکس احادیث و آثار صحابہ سے ایصال ثواب کا مؤثر ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ یہ بظاہر ایک ایسا تعارض ہے جو رفع نہیں ہو پاتا۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ بہت سوچتے رہے اور مختلف کتب کی طرف مراجعت فرماتے رہے۔ مگر تشفی نہ ہوئی۔ بستر پر دراز ہوئے تو نیند نہیں آرہی۔ یہ فکر دامن گیر ہے کہ اگر اسی حالت میں موت واقع ہو گئی تو قرآن کریم کی ایک آیت میں متردد ہونے کی حالت میں مروں گا جو سراسر محرومی ہے۔ بستر سے اٹھے اور اس تردد و تشکک کو اور آیت و احادیث کے تعارض کو اپنے شیخ، مرشد اور شفیق استاذ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے حل کروانے کے لئے رات کی تاریکی میں دیوبند سے گنگوہ شریف کی طرف پیدل چل دیئے۔ رات بھر چل کر تہجد کے وقت گنگوہ پہنچے۔ حضرت گنگوہی رح تہجد کا وضو فرما رہے تھے کہ تاریکی میں ایک آنے والے مہمان کو محسوس فرما کر گویا ہوئے کون؟ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نے عرض کیا حضرت عزیز الرحمٰن۔ فرمایا اس وقت کیوں اور کیسے؟ اس پر ماجرا کہہ سنایا کہ حضرت ابتدائے شب ہی سے لیس للانسان الا ما سعیٰ کی آیت اور ایصال ثواب کی روایات جن سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ ایک کی نیکی اور اس کا

اجر دوسرے بھائی کو مل سکتا ہے۔ اللہ قرآن میں اس کی نفی کر رہا ہے کہ ہر ایک کو اپنی محنت ہی کا اجر و ثمر ملے گا۔ الغرض تضاد جیسا پیچیدہ مسئلہ جو بڑے بڑے مطالعہ کتب اور مراجعت سے مسئلہ حل نہ ہوا تو شرف یاریاں نے کھینچ کر حاضر خدمت کر دیا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے بلا تامل و توقف فرمایا کہ مولانا ایسی الفاظ اور اسی میں سعی سے سعی ایمانی مراد ہے کہ ایمان تو ہر ایک کے اپنا ہی کام آئے گا اور روایات و احادیث میں جن سے ایصال ثواب ثابت ہو رہا ہے وہاں سعی ایمانی نہیں بلکہ سعی عملی ہے تو حاصل یہ ہوا کہ ایمان تو اپنا کام آئے گا جس کی تصریح مذکورہ آیت میں ہے۔ البتہ اعمال ایک کے دوسرے کو منتقل ہو سکتے ہیں۔ جس کا ذکر احادیث و روایات میں آ رہا ہے

حضرت کا یہ جواب سن کر بے ساختہ زبان پر یہ شعر آ رہا ہے ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال
مشکل ست و حل شود بے قیل و قال

۲۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ جب ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہوئے۔ اس وقت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا عہدِ سلطنت تھا۔ سلطان موصوف نہایت ہی دیندار، خدا ترس اور خدا پرست تھے۔ دینی امور میں ذاتی دلچسپی لیتے رہنا ان کا شیوہ تھا۔ سعودی علماء میں یہ بات شہرت پا چکی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درود شریف میں حضور علیہ السلام کے نام کے ساتھ سیدنا کا اضافہ بدعت ہے اور ناجائز ہے۔ چنانچہ زائرین کے مواجہہ شریفہ پر صلوٰۃ و سلام پڑھتے وقت اس کی نگرانی رکھی جاتی کہ کوئی شخص درود و سلام کے صیغوں میں سیدنا کا استعمال نہ کر سکے۔ حضرت مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ کو اس بات کی سخت تکلیف تھی اور لفظ سیدنا کا استعمال حضرت کا اپنا معمول تھا۔ ایک دن آپ روضۂ مسجد نبوی میں حجاز کے قاضی القضاۃ امیر ابن بلیہد کے پاس بیٹھے تھے اور سلطان عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کہ برابر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے موقع غنیمت پا کر قاضی صاحب مذکور سے سوال فرمایا کہ آپ لفظ سیدنا کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ قاضی صاحب نے کچھ سکوت فرما کر جواب دیا کہ سیدنا کہیں نہیں آیا۔ حضرت نے جواباً فرمایا کہ اس حدیث میں آیا ہے۔ قاضی صاحب نے ہمہ تن گوش ہو کر حیرت کے ساتھ پوچھا کہاں آیا ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ انا سید ولد آدم ولا فخر۔ قاضی صاحب نے کہا ہاں ایسا تو آیا ہے۔ مگر نام مبارک کے ساتھ کہیں نہیں آیا۔ حضرت نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نام مبارک کے ساتھ جو لفظ تعالیٰ لگاتے ہیں کہیں قرآن شریف میں آیا ہے۔ قاضی صاحب نے کہا نہیں قرآن شریف میں کہیں نہیں آیا۔ حضرت نے فرمایا کہ کون کہا کرتا ہے کہ ہمارے نام کے ساتھ تعظیمی الفاظ استعمال کیے۔ ایک جگہ حدیث میں آ گیا بس کافی ہے۔ سلطان اس مناظرہ کو بغور سن رہے تھے۔ اب انہوں نے قاضی صاحب سے سوال کیا کہ کہیں ممانعت بھی آئی ہے کہ سیدنا کو میرے نام کے ساتھ استعمال نہ کیا کرو۔ جواب دیا ممانعت کہیں نہیں آئی۔ سلطان نے فرمایا کہ جب ایک جگہ آ گیا تو ممانعت کہیں نہیں آئی تو پھر اس کے استعمال پر اتنا تشدد و نکیر کیوں کیا جاتا ہے۔ جو شخص سیدنا حضور کے نام نامی کے ساتھ استعمال کرے۔ اسے مشرک اور بدعتی کے لقب سے یاد کیا جائے۔ یہ حضرت کی قاضی اور سلطان عبدالعزیز مرحوم سے پہلی ملاقات تھی۔ جس میں حضرت نے اپنا حق ادا فرما دیا۔ اگلے دن نجدیوں میں حضرت کی گفتگو کا شور برپا رہا۔ پھر شرک و بدعت کی صدا کانوں میں نہ آئی۔ اس واقعہ کا اثر یہ ہوا کہ قاضی مذکور اہم مسائل میں حضرت رحمۃ اللہ کی طرف رجوع کرنے لگے اور رفتہ رفتہ حضرت کے علم و فضل اور تقویٰ کا ایک مقام ان کے دل میں پیدا ہو گیا۔ اکثر و بیشتر حضرت کے مکان پر حاضری دیتے اور دیر دیر تک مصروف گفتگو رہتے۔

اس مضمون سے متعلق خاتم المحدثین حضرت مولانا محمد زکریا صاحب برکاتہم کی تحقیق انیق تو اس سلسلہ میں حرفِ آخر معلوم ہوتی ہے۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کے ساتھ سیدنا کا

شد پھیلا دینا مستحب ہے۔ چنانچہ درمختار میں لکھا ہے کہ سیدنا کا بڑھا دینا
مستحب ہے۔ جس طرح کہ ایسی چیز کی زیادتی جو واقع میں موجود ہو مستحب ہے
جیسا کہ رملی شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ الخ۔ یعنی
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سید ہونا ایک امر واقعی ہے۔ بنا اس کے بڑھانے
میں کوئی اشکال کی بات نہیں بلکہ ادب ہی ہے۔ لیکن بعض لوگ اس
سے منع کرتے ہیں۔ غالباً ان کو ابوداؤد شریف کی ایک حدیث سے
اشتباہ ہو رہا ہے۔ ابوداؤد شریف میں ایک صحابی ابو مطرف رضی اللہ عنہ
سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ میں ایک وفد کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا
انت سیدنا۔ آپ ہمارے سردار ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا۔ السید اللہ کہ حقیقی سید تو اللہ ہی ہیں اور یہ ارشاد عالی بالکل
صحیح ہے۔ یقیناً حقیقی سیادت اور کامل سیادت اللہ ہی کے لئے
ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم
کے نام پر سیدنا کا بڑھانا ناجائز ہے۔ بالخصوص جبکہ خود حضور
اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد جیسا کہ مشکوٰۃ شریف میں بروایت
شیخین (بخاری و مسلم) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے
انا سید الناس یوم القیامۃ الحدیث کہ میں قیامت کے دن لوگوں کا سردار
ہوں گا۔ اور دوسری حدیث میں مسلم کی روایت سے نقل ہے

سیدنا محمد کہتے ہیں۔ اور اس میں تحقیق ہے وہ یوں کہتے ہیں
کہ نماز میں تو ظاہر ہے کہ نہ کہنا چاہیئے۔ نماز کے علاوہ میں حضور اقدس صلی اللہ
علیہ وسلم نے اس شخص پر انکار کیا تھا جس نے آپ کو سیدنا سے
خطاب کیا تھا۔ جیسا کہ حدیث مشہور میں ہے وہی حدیث ابوداؤد کا
اوپر گذری ہے) لیکن حضور کا انکار احتمال رکھتا ہے کہ تواضع ہو یا منہ پر
تعریف کرنے کو پسند نہ کیا ہو یا اس وجہ سے کہ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا یا
اس وجہ سے کہ انہوں نے مبالغہ بہت کیا۔ چنانچہ انہوں نے کہا تھا کہ آپ
ہمارے سردار ہیں۔ آپ ہمارے باپ ہیں۔ آپ ہم سے فضیلت میں
بہت زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ آپ ہم پر بخشش کرنے میں سب سے
بڑھے ہوئے ہیں۔ اور آپ جفنۃ الغراء ہیں۔ یہ بھی زمانہ جاہلیت کا
ایک مشہور مقولہ ہے کہ وہ اپنے اس سردار کو جو بڑا کھلانے والا ہو اور
بڑے بڑے پیالوں میں لوگوں کو دنبوں کی چکتی اور گھی سے لبریز پیالوں
میں کھلاتا ہو اور آپ ایسے ہیں اور آپ ایسے ہیں تو ان سب باتوں کے
مجموعہ پر حضور نے انکار فرمایا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ شیطان تم کو مبالغہ
میں نہ ڈال دے۔ علاوہ کہ صحیح حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم
کا یہ ارشاد ثابت ہے انا سید ولد آدم کہ میں اولاد آدم کا سردار ہوں۔
نیز حضور کا قول ثابت ہے اپنے نواسے حسن رضی اللہ عنہ کے لئے ابنی ہذا سید
میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ اسی طرح سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا
حضرت سعد کے بارے میں ان کی قوم کو یہ کہنا قوموا الی سیدکم کہ کھڑے
ہو جاؤ اپنے سردار کے لئے اور امام نسائی کی کتاب عمل الیوم واللیلۃ
میں حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یا سیدی
کے ساتھ خطاب کرنا وارد ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے درود
میں اللّٰھم صل علی سید المرسلین کا لفظ وارد ہے۔ ان سب امور میں دلالت
واضح ہے اور روشن دلائل ہیں۔ اس لفظ کے جواز میں اور جو اس کا
انکار کرے وہ محتاج ہے اس بات کا کہ کوئی دلیل قائم کرے علاوہ
اس حدیث کے جو اوپر گذری۔ اس لئے کہ اس میں احتمالات مذکورہ ہونے
کی وجہ سے اس کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا الی آخر ما ذکرہ۔ یہ تو ظاہر ہے۔
جیسا کہ اوپر بھی ذکر کیا گیا کہ کامل سیادت اللہ ہی کے لئے ہے۔ لیکن
کوئی دلیل ایسی نہیں جس کی وجہ سے اس کا اطلاق غیر اللہ پر ناجائز معلوم
ہوتا ہو۔ قرآن پاک میں حضرت یحییٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے
بارے میں سیداً وحصوراً کا لفظ وارد ہے۔ بخاری شریف میں حضرت عمر
کا ارشاد منقول ہے وہ فرمایا کرتے تھے ابوبکر سیدنا واعتق سیدنا یعنی بلالاً

ابوبکرؓ ہمارے سردار ہیں اور ہمارے سردار یعنی بلالؓ کو آزاد کیا۔ علامہ عینیؒ شرح بخاری میں لکھتے ہیں کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو حضرت سعدؓ کے بارے میں قوموا الی سیدکم یعنی اپنے سردار کے سلام کو کھڑے ہو جاؤ، کہا تو اس سے استدلال کیا جاتا ہے اس بات پر کہ اگر کوئی شخص سیدی اور مولائی کہے تو اس کو نہیں روکا جائے گا۔ اس لئے کہ سیادت کا مرجع اور محل اپنے ماتحتوں پر بڑائی ہے اور ان کے لئے حسن تدبیر اسی لئے خاوند کو سید کہا جاتا ہے۔ جب قرآن پاک میں والفیا سیدہا فرمایا حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی شخص نے پوچھا تھا کہ کیا کوئی شخص مدینہ منورہ میں اس کو مکروہ سمجھتا ہے کہ اپنے سردار کو یا سیدی کہے؟ انہوں نے فرمایا کوئی نہیں الخ۔ امام بخاریؒ نے اس کے جواز پر حضورؐ کے ارشاد من سیدکم سے بھی استدلال کیا ہے جو ایک حدیث کا ٹکڑا ہے جس کو خود امام بخاریؒ نے ادب المفرد میں ذکر کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو سلمہ سے پوچھا من سیدکم کہ تمہارا سردار کون ہے؟ انہوں نے عرض کیا جد بن قیس حضورؐ نے فرمایا بل سیدکم عمرو بن جموح بلکہ تمہارا سردار عمرو بن جموح ہے۔ نیز اذا نصح العبد سیدہ مشہور حدیث ہے جو متعدد صحابہ کرام سے حدیث کی اکثر کتابوں بخاری شریف وغیرہ میں مذکور ہے۔ نیز حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث سے بخاری شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ کوئی شخص اطعم ربک وضی ربک نہ کہے یعنی اپنے آقا کو رب کے لفظ سے تعبیر نہ کرے۔ ولیقل سیدی ومولای بلکہ یوں کہے کہ میرا سید اور میرا مولیٰ کہنے کا حکم صاف ہے ٥

اسی کاروانِ شریعت و طریقت کے ایک قافلہ سالار حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ان کی ذاتِ گرامی حضراتِ صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین کا نمونہ بن کر ہی دنیا میں آئی تھی۔ شانِ تفویض کی مجسم تصویر، بحرِ توحید کی غواص، تسلیم و رضا میں غرق اور توکل و استغنا میں فنا، شریعت میں عالم متبحر تھے مگر طریقت کا آپ پر ایسا غلبہ تھا کہ دیکھنے والا آپ کو ملا اور عالم نہ کہتا بلکہ یکسوئی اور وحدت [illegible] آپ جس قدر دنیا سے بھاگتے مگر [illegible] کا تعاقب کرتی۔ لپکتی اور دامن پکڑتی تھی۔ [illegible] فیضانِ خاص سے وہ بادشاہی بہ مالِ [illegible] مثال بہت کم ملتی ہے۔

تذکرۃ الخلیل میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے مشاجرات و شاجرات صحابہ کی ایک ایسی عمدہ توجیہ منقول ہے جو صرف آپ ہی کا حصہ ہے۔ ایک مرتبہ بعد عصر آپ حسبِ معمول صحن باغ میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے اور چاروں طرف مونڈھوں پر خدام و حاضرین کا ایک کثیر مجمع حلقہ باندھا بیٹھا تھا کہ راؤ مراد علی خان صاحب نے حضراتِ صحابہ کی باہمی جنگ و رنجش کا تذکرہ شروع کر دیا اور اس پر رائے زنی ہونے لگی کہ فلاں نے غلطی کی اور فلاں کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا یہاں تک نوبت پہنچی تو دفعۃً حضرت کو جوش آگیا اور جبر سکوت ٹوٹ گئی اور جبر ہوئے کہ حضرت سنبھلے اور فرمایا کہ راؤ صاحب! ایک مختصر سی بات میری سن لیجئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں مخلوق کو قیامت تک پیش آنے والی تمام ضروریاتِ دین و دنیا سے باخبر کرنے کے لئے تشریف لائے تھے اور ظاہر ہے کہ وقت اتنی بڑی تعلیم کے لئے آپ کو بہت ہی تھوڑا دیا گیا تھا۔ اس تعلیم کی تکمیل کے لئے ہر قسم کے حوادث اور واقعات پیش آنے کی ضرورت تھی کہ ان پر حکم اور عمل مرتب ہو تو دنیا سیکھے کہ فلاں واقعہ میں یوں ہونا چاہئے۔ یہی اصول ہے کہ مسجد میں کوئی واقعہ بھی ایسا نہیں ملا۔ جو حضرت کے زمانہ بابرکت میں ملحق نہ ہو چکا ہو۔ اب واقعات تھے دو قسم کے ایک وہ جو منصب نبوت کے خلاف نہیں اور دوسرے وہ جو عظمت شان نبوت کے منافی ہیں۔ پس جو واقعات منصب نبوت کے خلاف نہ تھے وہ تو خود حضرت پر پیش آئے مثلاً تزویج اور اولاد کا پیدا ہونا ان کا مرنا وفات پانا،

کہ اتنے عرصہ میں وہ تمام نقشہ ذہن کے سامنے حضرت کے پیش آگئے اور
دنیا کو علم ہی نہ ہو سکا کہ عروج کے مرحلے پر ہم کو فلاں فلاں کام کرنے ہیں
پیدا ہونے والے نامناسب امور کس کی وراثت و خلافت نکاح وغیرہ کی
تفصیل کے ساتھ یہ باتیں جانی چاہئیں بطور نمونہ سنت ۔

مگر وہ واقعات باقی ہیں جو رسول پاک کو پیش آئیں تو خلعت
رسالت کو خلاف ہو اور وہ پیش آئیں تو تسلیم کرنی ناتمام ہے مثلاً
ننانوے یا سو وغیرہ ہوں تو اس کے عوض قصر پر ہونا چاہیئے اور باہم
جنگ و قتال یا اختلاف و اعتراض پیدا ہوں یا امور میں تنازع و رنجش ہو
تو اس طرح اصلاح ہونا چاہیئے۔ یہ امور ذات گرامی کو پیش آ کر کس
طرح مناسب دستور العمل کی صورت میں پیش آنے کی ۔

بنا حضرت صحابہؓ نے اپنے نفوس کو پیش کیا کہ ہم خدا کے
غلام آخر کس مصرف کے ہیں جو امور حضرت کی شان کے خلاف ہیں
وہ ہم پہ پیش آ رہے ہیں اور حکم ذخیرہ مرتب کیا جائے تا کہ دین کی تکمیل ہو
جائے۔ چنانچہ حضرات صحابہ پر وہ سب ہی کچھ پیش آگیا جو آئندہ
قیامت تک آنے والی مخلوق کے لئے رشد و ہدایت بنا اور دنیا کے
ہر بچے بچے کو معلوم ہو گیا کہ فلاں واقعہ میں یہ کرنا اور اس طرح
مناسب ہے اور یہ کرنا اور اس طرح کرنا نامناسب۔ پس کوئی بوالہوس
باہمت جاں نثار جو تکمیل دین محمدی کی خاطر ہر ذلت کو عزت اور
عیب کو ہنر سمجھ کر نشانۂ ملامت بننے پر فخر کرے اور بزبانِ حال
کہے کہ ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

شہرت و نیک نامی اور عزت و نام آوری سب چاہا کرتے
ہیں مگر اس کا مزہ کسی عاشق سے پوچھو کہ جاں نثاری میں کیا لطف ہے۔
اور کوچۂ معشوق کی ننگ و عار کیا لذیذ شئی ہے ؎

از ننگ چہ گوئی مرا نام ز ننگ است
وز نام چہ پرسی کہ مرا ننگ ز نام است

(شرم و عار کو کیا کہتے ہو مجھے تو اس عار سے ہی نام میسر ہے
اور نام آوری کو کیا پوچھتے ہو مجھے تو نام آوری سے ہی عار آتی ہے)

سچے عاشق تو اس طرح ہماری تمہاری اصلاح و تعلیم کی خاطر اپنی عزت
آبرو نثار کریں اور ہم ان کے منصف و ڈپٹی بن کر تیرہ سو برس بعد
ان کے مقدمات کا فیصلہ دینے کے لئے بیٹھیں اور نکتہ چینیاں کرکے
اپنی عاقبت گندی کریں اس سے کیا حاصل۔ اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذو
ھم من بعدی غرضا (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اللہ
سے ڈرو، میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق کہ ان کو میرے بعد
نشانۂ ملامت نہ بناؤ) دیر تک آپ نے یہ تقریر فرمائی کہ دہن مبارک
سے پھول جھڑتے اور سامعین کے مشام جان میں جگہ پکڑتے رہے۔
شریعت کے معارف و حقائق اکابر دارالعلوم کی جان تھے ۔

یہی حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ ایک مرتبہ سخت بیمار ہوئے ضعف
کی وجہ سے کروٹ بدلنا مشکل ہو گیا پھر مرض سے کچھ افاقہ ہو گیا مگر ضعف
کی وہی حالت رہی کہ دودھ پینے کے لئے کچھ ہاتھ میں تھامتے تو ہاتھ
کانپتا اور کچھ پکڑا نہ جاتا، ایک مزاج شناس خادم نے طبیب کو
رائے دی کہ ادویات مقویات اور مفرحات کا استعمال بے کار ہے
کوئی کتاب جس میں معارف و حقائق ہوں سنانا شروع کر دیجئے۔
کہ روز افزوں قوت بڑھتی رہے گی۔ چنانچہ غالباً حجۃ اللہ البالغہ کا اشراق
کے وقت سے سنانا حکیم صاحب نے معمول بنا لیا۔ حضرت بڑے شوق
سے سنتے اور بے اختیار سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے ہوئے بعض دفعہ
جوش میں اٹھ بیٹھتے ۔

حق باطل کی معرفت کا معیار

اسی زمانہ میں ایک دن
آپ کی مجلس میں گفتگو

سنت کے مسائل اختلافیہ کی بحث چل نکلی ۔ آپ دیر تک سنتے رہے اور آخر میں فرمایا کہ میرے نزدیک دلائل علمیہ کے علاوہ حق و باطل کو پہچاننے کا ایک معیار اور بھی ہے ۔ وہ یہ کہ قدرت نے ہر چیز میں اس کے ہم جنس کی طرف کشش کا مادہ رکھا ہے کہ ے

کبوتر با کبوتر باز با باز

اور قدرت کا یہ عطیہ جس کو فطرت کہنا چاہیئے ۔ اجسام ہوں یا اعراض سب ہی میں جاری و ساری ہے ۔ پس جس فعل سے متعلق یہ شبہ ہو کہ نہ معلوم حق ہے یا باطل اس میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کی طرف میلان کن قلوب کا ہوا ۔ اور کشش کس قسم کے لوگوں کی ہے ، پس اگر دیکھو کہ بددین ، فساق و فجار کو ابتداءً اس کی طرف حرکت ہوئی اور وہی قلوب جوش و خروش کے ساتھ اس کی طرف لپکتے ہیں تو سمجھ لو کہ اس فعل میں ضرور ظلمت ہے ۔ اگرچہ ظاہری صورت نورانی سے معلوم ہوتی ہو کیونکہ اس میں اگر نور ہوتا تو ظلمانی قلوب کو جذب نہ کرتا ۔ بلکہ وہ اس سے بھاگتے اور اولیاء صلحاء کے نورانی قلوب اس کی جانب کھینچتے ۔ اور اگر کسی فعل کو دیکھو کہ دیندار اہل قلوب اس کی طرف جاتے اور عوام و بازاری لوگ اس سے بھاگتے ہیں تو سمجھ لو کہ اس فعل میں نورانیت ہے کہ اہل نور کے قلوب کو اس کی طرف کشش ہوئی اور ظلمانی قلوب نے اس سے وحشت کھائی ۔ پس عوام کا کسی اختلافی مسئلہ میں یہ کہنا کہ ہم تو بے پڑھے ہیں اور دونوں طرف مولوی ہیں ۔ پھر ہم کیونکر سمجھیں کہ کون حق پر خدا کے نزدیک معتبر اور قابل قبول نہ ہوگا ۔ بالخصوص جبکہ وہ دونوں طرف علماء ہونے کے قائل ہو کر بھی ایک طرف جھکے ہوئے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ ایک شق کو ان کے نفوس نے ترجیح دے کر اختیار کیا اور اپنے اوپر سے الزام اتارنے کے لئے مولوی حضرات میں فیصلہ نہ کر سکنے کا عذر تراشا ہے ۔ اس طرح پر ذرا غور کر لینے پر جاہل پڑھے سے اَن پڑھ حق و باطل سمجھ سکتا ہے ۔ کیونکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ رسومات و بدعات مالجہ کی طرف یا وہ بازاری عوام جھکتے ہیں ۔ جن کو نماز روزہ تک سے وحشت اور بے تعلقی ہے یا وہ پہلے لکھے قابل ہو سکتے ہیں جن کی نورانیت قلوب کو حب جاہ و مال نے دبا رکھا ہے ۔ اور اگر کوئی دھوکہ کھا کر ادھر جا بھی گیا تو خود اپنے قلب کو ظلمانی محسوس کرے گا ۔ ہوگی جو ورد و وظائف نماز روزہ جیسی کمل اور صاف عبادات کی طرف سے محسوس ہوتی ہے اور اسی لئے امید ہے کہ انشاءاللہ کسی وقت کا قلب اس کی رہبری کرے گا اور وہ متنبہ ہو کر نور سنت کی طرف ضرور آ جائے گا ۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے اپنی طبعی زندگی میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں وہ رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے بندگان خدا کی تعلیم و تربیت کے اہم فریضہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ کتب کی تصنیف و تالیف حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندہ کرامت ہے ۔

نوشتہ بماند سیاہ بر سفید کے بمصداق

آپ کی یہ تالیفی و تصنیفی خدمات اور تحقیقی کوششیں اور کاوشیں امت مسلمہ کے لئے تا قیام قیامت رہبر و رہنما ثابت ہوں گی ۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک صاحب نے سوال کیا

حضرت ! اہل قبور سے اہل کشف ہی فیض حاصل کر سکتے ہیں یا عوام ؟

حضرت مرحوم نے جواباً فرمایا کہ فیض دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تعلیم کا اور ایک تقویت نسبت کا پھر کہیں ایک تو فیض ہے اور ایک اس کا ادراک یعنی معلوم کر لینا ہے ۔ پھر ادراک ایک فوری ہے اور ایک مستمر ۔ یہ کئی صورتیں ہو گئیں ۔ پس فیض تعلیم تو اہل کشف کے ساتھ خاص ہے مگر وہ فیض تعلیم و تربیت مریدین کے لئے کافی نہیں اور فیض کی قسم ثانی یعنی تقویت نسبت کا فیض یہ اہل کشف کے ساتھ خاص نہیں یہ فیض غیر اہل کشف کو بھی ہو جاتا ہے ۔ اتنا فرق ہے کہ اہل کشف کو اس کا ادراک فوری طور پر ہو جاتا ہے اور غیر اہل کشف کو تدریجاً ۔ لیکن بقا اس فیض کو بھی نہیں ہوتا تاوقتیکہ اعمال سے اس کی بقا کا اہتمام نہ کیا جائے

پھر اس تدبیر میں بھی تفاوت ہے بعض کو فوراً یا نادر طور اشغال سے جمعیت
خاطر و تقلیل انکا سے حاصل ہو جاتا ہے جو شیخ کامل ادراک ہوتا ہے اور طریق
اس کا سب کے لئے یہ ہے کہ جو ہر کے کچھ بے چیز کر اپنی طلب نیت کی مدح کشش
کرنے اور معمول میں اشغال کا خیال چھوڑنے اور یہ سمجھ کر اشغال سے
نور کیفیت مثلاً محبت یا خشیت وغیرہ بہت کی مدح سے میری مدح
پر ناظر ہو رہی ہے اگر ابتداءً دل گھبرائے تو تنگ دل نہ ہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ
اور جمعیت میسر ہوگی اور نفع حاصل ہوگا اور اس مراقبہ سے پہلے اشغال کو لب
شرط نہیں لیکن اگر ایسا ہی کرے تو اس میں اس نیت کا بھی نفع ہے جس
سے یہ خود مستفیض ہونا چاہتا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ هل جزاء الاحسان الا الاحسان
مگر یہ تب ہی ہوگا جب وہ نسبت پہلے سے حاصل ہو اس مراقبہ سے نسبت
کو تقویت حاصل ہوگی۔ باقی نفس نسبت یہ صرف اعمال و اشغال اور
صحبتِ اہل اللہ ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

یا تنگ نہ کر مجھے ناصح نادان اتنا
یا لاکر تو دکھا دے مجھے تو ویسی دہن ایسا

بقیہ از صفحہ ۶۲۰

خلاصہ کلام :- یہ ہے کہ ضروریات دین میں سے کسی ایک کا انکار کفر ہے کہ در اصل وہ اللہ و رسول کی تکذیب ہے جو منافی تصدیق ہے اور تاویل کے پردہ میں انکار وہ بھی کفر ہے۔ قبلہ کی طرف نماز پڑھنا اور ملازمت طاعت کے ساتھ جب کسی امر ضروریات دین سے انکار کرنے سے مانع تکفیر نہیں۔ بلکہ تکفیر لازم ہے اور وہ عقیدہ جو ضروریات دین سے ہو اس کے انکار سے جب کفر لازم آتا ہو تو اگرچہ التزام کفر نہ ہو جب وہ منکر خارج از ایمان ہوگا۔ اور انکار ضروریات دین پر کفر لازم کے لئے التزام کرنے کی ضرورت نہیں خواہ التزام کفر کرے یا نہ کرے۔

بریلوی اور دیوبندی نزاع

تصویر کا دوسرا رُخ

از شیخ نذیر حسین

مسلمانوں میں فقہی یا نظری اختلاف کوئی انوکھی چیز نہیں۔ خود صحابہ کرامؓ میں بعض فقہی مسائل کے بارے میں اختلاف رہا ہے امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں، امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے امام صاحب سے بعض مسائل کے بارے میں ان سے اختلاف کیا ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور ابن الجوزیؒ کی معاصرانہ چشمک کتابوں میں مذکور ہے۔ امام سخاویؒ اور امام سیوطیؒ کے اختلافات اہل علم سے پوشیدہ نہ ہوں گے۔ ہندوستان میں مولانا عبد الحی فرنگی محل اور نواب سید صدیق حسن کے اختلافات ابھی کل کی بات ہے۔ اسی طرح بریلوی اور دیوبندی بیش بہا علمی تاریخ کا کوئی انوکھا واقعہ نہیں یہ صرف اختلاف ذوق و فکر کا نتیجہ ہے۔ اس فکری اختلاف کا آغاز آج سے ڈیڑھ سو برس پیشتر مولانا سید اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے زمانے میں ہوا۔ مولانا خیر آبادی علوم عقلیہ کے امام، ادیب اور شعر و سخن کے ناقد تھے۔ مشہور شاعر غالب نے اپنا دیوان ان ہی کی اصلاح و مشورہ سے مرتب کیا تھا۔ مولانا شہید شاہ ولی اللہؒ کے پوتے، علوم نقلیہ کے متبحر عالم اور ذہین و فطین نوجوان تھے۔ اس وقت مسلم معاشرے میں ہندوؤں کے زیر اثر بہت سی بدعات و رسوم رائج تھیں۔ جن کے خلاف مولانا اسمٰعیل شہید نے آواز اٹھائی۔ اور مسلمانوں کو اصلاح کی دعوت دی۔ مولانا شہید کے بعض خیالات سے مولانا خیر آبادی کو اختلاف تھا۔ یہ اختلافات محفل میلاد میں قیام آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے علم غیب اور امتناع نظیر خاتم النبیین جیسے مسائل سے تھا۔ مولانا خیر آبادی دہلی میں ریذیڈنٹ دہلی کے سررشتہ دار تھے۔ انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر مولانا اسمٰعیل کا وعظ جامع مسجد دہلی میں بند کرا دیا۔

اس زمانے میں پنجاب پر سکھوں کی حکومت تھی جس نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ انہیں اذان کہنے کی اجازت نہ تھی بلکہ بعض مقامات پر تو نماز با جماعت پر بھی قدغن تھی۔ مزید برآں مسلمانوں کی عزت و ناموس بھی محفوظ نہ تھی۔ شاہ شہیدؒ نے یہ حالات سن کر سکھوں سے جہاد کا عزم کیا۔ سید احمد شہیدؒ کی رفاقت میں سارے ہندوستان کا دورہ کر کے مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا۔ جہاد کے لیے جماعت مجاہدین منظم کی اور صوبہ سرحد کے سکھوں سے نبرد آزما ہو گئے بالآخر پٹھانوں کی غداری سے راہ حق میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔ اگر یہ تحریک اپنوں کی غداری اور اغیار کی ریشہ دوانیوں سے ناکامی کی سمت نہ جاتی تو آج سے ڈیڑھ سو برس پیشتر ہی پاکستان قائم ہو گیا ہوتا۔ مولانا خیر آبادی نے انگریزوں کی ملازمت چھوڑ کر ۱۸۵۷ء میں تحریک پسندوں کا ساتھ دیا۔ بغاوت

کے انعام میں کاسۂ گدائی کی سزا پائی ہے۔ صداقت یہ ہے کہ جن اذیتوں میں مگر اس دنیا سے عالم نو کو سہارا ہے۔ جاہلیت کے سارے اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔

شاہ اسمٰعیل کی شہادت اور مولانا شاہ محمد اسحٰق کی ہجرت کے بعد خانوادۂ ولی اللّٰہی کے علوم و معارف کے وارث اور امین مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی ہوئے۔ انہوں نے دیوبند اور سہارنپور میں مدارس عربیہ قائم کر کے علوم اسلامیہ کی بقا کا سامان مہیا کر دیا۔ حضرت مولانا محمود حسنؒ اور مولانا سید محمد انور شاہ مرحوم و مغفور کے زمانۂ صدر مدرسی میں نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ افغانستان اور ترکستان تک کے طلبا دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے اور انہوں نے رد بدعات اور غیر اسلامی رسوم و رواجات کے استیصال میں قابل ستائش کام کیا۔ علمائے اکابر نے قومی تحریکات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور اپنی علمی فضیلت، اخلاص اور بے لوثی سے عوام کے دل میں گھر کر لیا۔ شیخ الہند کا ترجمہ قرآن پاک اور اس پر مولانا شبیر احمد عثمانی کے حواشی، مولانا تھانوی کی بیان القرآن، بہشتی زیور اور مواعظ گھر گھر پھیل گئے۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی بذل المجہود، مولانا انور شاہ کی فیض الباری اور مولانا محمد زکریا کی اوجز المسالک شرح موطا امام مالک نے عالم عرب کے فضلا سے بھی خراج تحسین وصول کیا۔ مولانا احمد علی (انجمن خدام الدین) نے لاہور میں قرآن پاک کا حلقہ درس قائم کر کے مسلمانان پنجاب میں قرآن مجید کے افہام و تفہیم کا ذوق پیدا کیا اور انگریزی تعلیم یافتگان کے عقائد اور اعمال کی اصلاح کی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے ساری عمر توحید و سنت کی ترویج اور فرق باطلہ کی تردید میں صرف کر دی۔ خاندان غزنویہ نے کتب حدیث کے تراجم شائع کیے۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے رحمۃ للعالمین لکھی، جو کتب سیرت میں امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں اور ان کے تلامذہ مہر و سالک کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے اردو کو مسلمانان پنجاب کی زبان بنا دیا، ورنہ یہاں بھی پنجابی اور اردو زبان کی حدیں قائم رہتیں۔ یہ سب حضرات اکابر دیوبند کی محبت سے سرشار تھے۔

مولانا خیر آبادی کے افکار کے امین اور مبلغ مولانا فضل رسول بدایونی اور ان کے شاگرد مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی ہوئے ہیں۔ انہوں نے مخالف سید الانبیاء صلوٰۃ و سلام کو اس زور شور سے جاری کیا کہ عوام نے اسلام اور ایمان کا دارومدار اسی چیز کو سمجھ لیا لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے خدا جانے کن وجوہات کی بنا پر بہت سے غیر ضروری نزاعی مسائل کو زندہ کر کے اکابر دیوبند کی تکفیر، تردید اور تنقیص میں بے حد دلچسپی کا اظہار کیا۔ ان کے خلف الصدق مولانا احمد رضا بریلوی نے لبلباب۔ ندوہ کو ایک مدت تک تضحیک اور تکفیر کا نشانہ بنائے رکھا۔ ان کے غیظ و غضب سے مولانا شبلی اور سید سلیمان ندوی مرحوم بھی نہ بچ سکے (دیکھئے سیرت مولانا محمد علی مونگیری از سید محمد الحسنی مطبوعہ لکھنؤ) پنجاب میں علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں بھی تکفیر کا نشانہ بنے رہے (ملاحظہ ہو سرگزشت اقبال از عبد المجید سالک، مطبوعہ لاہور)

بہرحال انصاف سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ارباب دیوبند اپنے اکابر کے مختلف فیہ خیالات اور نظریات کی توجیہ، تاویل اور وضاحت میں مصروف رہے اور انہوں نے اپنے دامن کو سب و شتم سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ ملک میں مختلف سیاسی تحریکیں ابھرتی رہیں، کبھی کبھی سیاسی ہنگاموں کی گرم بازاری بھی ہو جاتی، لیکن بریلوی مکتب فکر (بجز ایک دو عالموں) قومی تحریکوں سے علیحدہ ہی رہا۔ تا آنکہ ملک تقسیم ہو گیا۔ تقسیم ہند کے بعد بھی بعض پرجوش نوجوان شغل تکفیر کے نشے میں سرشار ہو کر اشتہار بازی سے دل تسکین حاصل کرتے رہے، آج سے پانچ چھ برس قبل تو اس لایعنی شغل نے خوفناک صورت اختیار کر لی تھی، جو بڑی مشکل سے ختم ہوئی۔

اتحاد بین المسلمین کو پیش نظر رکھتے ہوئے مولانا عبادالحق قاسمی نے لاہور کے ایک معروف اخبار میں اہل السنت والجماعت کے

ان دونوں مکاتب فکر کو دعوت دی کہ وہ اپنے مسلک پر قائم رہ کر دوسرے مشرب کے علماء کا احترام کریں اور باہمی رواداری اور وسعت قلب و نظر سے کام لیتے ہوئے تکفیر اور تفسیق سے احتراز کریں۔ جیسا کہ طرفین کے بعض اکابر کا دستور رہا ہے۔ لیکن اس اخبار کے ایک کالم نویس کو ان کا یہ مضمون پسند نہیں آیا اور اس نے تفریق بین المسلمین کا سارا الزام شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کی کتابوں پر ڈال دیا۔ اس نے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا اشرف علی تھانوی کی کتابوں سے وہ عبارتیں نکال دی جائیں جن سے حضورؐ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کا پہلو نکلتا ہے۔

مولانا تھانوی کی کتابیں ہم نے دیکھی ہیں۔ تفسیر بیان القرآن سے لے کر بہشتی زیور اور ان کے مواعظ تک۔ کیا نوائے وقت کے یہ مہربان مقالہ نویس مولانا تھانوی کی کسی کتاب کے قابل اعتراض فقروں کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ان کی عبارتوں کو سیاق و سباق سے علیحدہ نہ کیا جائے۔ رہی مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان، تو یہ کتاب ہمیشہ سے ارباب بریلی و بدایوں کے لیے سرگرانی اور شائقین توحید و سنت کے لیے کحل البصر بنی رہی ہے۔ اس لیے اس کی اثر انگیزی کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی کا دلآویز تبصرہ ملاحظہ ہو۔

"قرآن پاک کے بعد مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی کتاب "تقویۃ الایمان" میرے ہاتھ میں دی گئی۔ یہ پہلی کتاب ہے جس نے مجھے دین حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں، کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے، مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں، ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ علم کلام کے مسائل، اشاعرہ اور معتزلہ کے نزاعات، غزالی، رازی اور ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گزرے، مگر اسمٰعیل شہیدؒ کی تلقین اپنی جگہ قائم رہی۔"

(مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، ص ۸ ۔ ۹ [illegible])

مقالہ نویس اور ان کے ہم مسلک حضرات کو یہ کتابیں ناپسند ہیں تو ہوا کریں، وہ اور ان کے ہم مشرب یہ کتابیں نہ پڑھیں۔ کیونکہ ان کا پڑھنا فرض و فرض کفایہ نہیں ہے۔ لیکن وہ دوسروں کو ان کتابوں کے علمی فیض سے کیوں محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کل کلاں یہ نہ کہہ دیا جائے کہ حضرت علامہ اقبال چونکہ مولانا سید انور شاہ اور سید سلیمان ندوی کے علم و فضل کے مداح اور نیاز کیش تھے، لہٰذا ان (علامہ اقبال) کی کتابیں بھی نہ پڑھی جائیں۔

دوسری تجویز فاضل مقالہ نویس نے یہ پیش کی ہے کہ دیوبندی اہل حدیث فرض نمازوں کے بعد تین بار بلند آواز سے درود شریف پڑھنا شروع کر دیں۔ گزارش ہے کہ درود شریف کے فضائل کا کوئی بھی منکر نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دیوبندی بیٹھ کر آہستہ سے درود شریف پڑھ لیتے ہیں جب کہ بریلوی حضرات کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہیں۔ فاضل مقالہ نویس نے جس انداز اور زور و شور سے یہ تجویز پیش کی ہے کیا اس کی تائید میں کسی صحابی، کسی تابعی، کسی مجتہد، کسی مفسر یا کسی مصنف یا کسی محقق عالم کا کوئی قول پیش کیا جا سکتا ہے جس نے فرض نمازوں کے بعد بلند آواز سے درود شریف پڑھنے کو فرض یا ضروری قرار دیا ہو؟ ہندوستان میں فروغ اسلام کی مشعل مشائخ اہل چشت لائے ہیں، کیا ان میں سے کوئی شیخ طریقت فاضل مقالہ نگار کا ہم خیال اور مجوز رہا ہے؟ کیا اس بارے میں کسی تاریخ، کسی سوانح یا تذکرے کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

فاضل معترض کو یہ شکایت ہے کہ بریلوی حضرات کو مشرک اور بدعتی کہا جاتا ہے۔ لیکن خود اس نے مضمون مذکورہ بالا میں اکابر دیوبند کو گستاخ اور بے ادب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور

تعز تجہیز المسلمین کا سلسلہ الزام اُن کی کتابیں پڑھ کر دیا جا رہا ہے۔

حضرات دیوبند نے عشق رسول کا شعلہ روشن رکھے اور جہاں کہیں اس شعلہ سے کچھ بھی غافل دیکھا، سلام و صلوٰۃ پڑھ کر جذب کیا بلکہ ان اکابر نے بالاکوٹ کے میدانوں، لاہور، انبالہ، دہلی، پشاور کی جیلوں، کالا پانی کی کوٹھڑیوں اور جزائر انڈیمان اور مالٹا کے قید خانوں میں کھلے طور پر ثابت کیا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ درود شریف پڑھنا اور کتب مولد کی مزاولت سے متابعت رسول کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جس کا اعلیٰ ثبوت عشق صحیح ہے، ملت المسلمین کی صلاح و فلاح اور سیاست محمدیہ کی ہمدردی و خیر خواہی، غم خواری و غم گساری اور راہ حق میں جان فروشی اور جانبازی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر یہ نہیں تو ذات پاک رسالت مآب سے محبت اور عشق کا زبانی دعویٰ قبول نہ ہوگا۔

سودا قمار عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے رو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

حضرات دیوبند نے قیام پاکستان اور اس کے بعد ملک و ملت کی بیش گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ میں اس کے ثبوت میں تین چار مثالیں عرض کرتا ہوں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد تھانوی اور مفتی محمد شفیع (کراچی) نے صوبہ سرحد کے ریفرنڈم اور سلہٹ کے استصواب رائے میں جو مساعی فرمائی ہیں اور مسلم لیگ کی جس اخلاص، سرگرمی اور بے لوثی سے مدد کی ہے، تحریک پاکستان کا کوئی مورخ ان کے جانبازانہ کارناموں کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ صوبہ سرحد میں خان برادران کی جمہوریت کا طلسم ان کی کوششوں سے ٹوٹا، دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد ان کی سعی و کوشش اور اثر و رسوخ سے منظور ہوئی۔ مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا سید انور شاہ کے تلمیذ رشید اور دنیائے اسلام کے جلیل القدر مصنف اور ادیب ہیں، انہوں نے جس تدبر اور ہوشمندی سے تحریک ختم نبوت (جس میں تمام مکاتب فکر شامل تھے) کو کامیابی سے ہمکنار کردیا۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کی سرپرستی میں تبلیغی جماعت کے بستر بدوش مبلغ اسلام کا پیغام گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ میں پہنچا رہے ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے علمی اور اصلاحی کارناموں سے اہل پاکستان بے خبر نہیں ہیں، انہوں نے بھارت کے مسلمانوں کے قومی تشخص کے تحفظ اور علوم اسلامیہ کی بقا اور فروغ کے لیے خون اور پسینہ ایک کردیا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے متون احادیث کی نشر و اشاعت کو مقصد حیات بنا رکھا ہے۔ انہوں نے مصنف عبدالرزاق کو جس محنت و جانفشانی اور تصحیح و مراجعت کے بعد ایڈٹ کیا ہے۔ اس کا اعتراف عرب ممالک کے فضلاء کررہے ہیں۔

ایں سلسلۂ طلائے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

اب اہل علم حضرات یہ فیصلہ خود کرسکتے ہیں کہ کسی دوسرے مسلک و مشرب کے اکابر کو بھی اسلام، اسلامی علوم و فنون اور امت محمدیہ کی اس طرح خدمت کی توفیق ارزانی ہوئی ہے۔

آج سب سے بڑی قومی خدمت یہ ہے کہ نوجوانوں میں دینی شعور پیدا کیا جائے، اسلام کی اہمیت کو ذہن نشین کرایا جائے، اسلام کے معاشی و اقتصادی نظام کی اہمیت اور افادیت کو نئے ذوق کے مطابق خوش سلیقگی سے پیش کیا جائے۔ فروعی اختلافات کا زمانہ گزر چکا۔ اس پر بحث و مباحثہ اور مناظرہ و مجادلہ بے وقت کی راگنی ہے۔

فوارہ مارکہ
اعلیٰ قسم کا
سوتی دھاگہ
سنگل اور فولڈ
۱۰ کاؤنٹ سے ۴۰ کاؤنٹ تک ہینکس کے علاوہ کونز پر
بھی دستیاب ہے

ڈی۔ایم۔ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

دیوبند اور علیگڑھ ۔۔۔

دو تحریکیں دو مکتبِ فکر

جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ انور
امیر جمعیۃ علماء اسلام پنجاب

۱۸۵۷ء کا سال اقوام برصغیر بالخصوص مسلمانوں کے لئے اپنے جلو میں جو مصائب و آلام لے کر آیا اس کا دھندلا سا تصور بھی لرزا دینے کے لئے کافی ہے۔ مسلمانان ہند نے مئی کے مہینہ میں دوسری اقوام کے اشتراک سے میرٹھ سے ایک تحریک کا آغاز کیا جو دیکھتے دیکھتے پورے ملک میں پھیل گئی۔ اس تحریک کا مقصد فرنگی چنگل سے ملک کو آزاد کرانا اور اسلامی حکومت کے بقا و تحفظ کا اہتمام کرنا تھا لیکن ابھی مکمل کامیابی کا وقت شاید نہیں آیا تھا اس لئے نتائج مسلمانوں کے خلاف نکلے اور خاندان مغلیہ کی آخری نشانی بہادر شاہ ظفر رنگون کے قید خانہ میں نظر بند کر دیئے گئے۔ اس خاندان کے شہزادوں کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا اور علماء و صلحاء کا نشان مٹانے کے لئے انتہائی شرمناک اور وحشت ناک رویہ اختیار کیا گیا۔ اس دور میں ظلم و ناانصافی کا کونسا طریق تھا جو اپنایا نہ گیا ہو اور تشدد و بربریت کا یہ کھیل محض اس لئے کھیلا گیا کہ انگریز بہادر کے اقتدار کو دوام و استحکام نصیب ہو جائے۔

اس تحریک سے چند سال پہلے ایک تحریک بالاکوٹ میں ناکامی پر منتج ہو چکی تھی اور اس کی ناکامی کے بعد کمپنی کی حکومت کے اطوار زیادہ ہی کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ بقول امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

یہ واقعہ (واقعہ بالاکوٹ) ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو پیش آیا ایسٹ انڈیا کمپنی گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہندوستان میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے میں لگی ہوئی تھی مگر اب تک اس نے تجارتی لباس میں پردہ ستر رہنا ضروری سمجھا تھا۔ اس واقعے سے دو سال بعد ۱۸۳۳ء میں یہ یکسر تجارت کا لبادہ اتار کر حکومت کی مالک بن جاتی ہے فی ذالک لعبرۃ لاولی الالباب۔

شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۰۵/۱۰۶

اپنی اغراض میں کسی درجہ کامیابی کے بعد کمپنی کے ارباب حل و عقد نے ذہنی انقلاب کی غرض سے اس تحریک کی ناکامی کے صرف چار برس بعد ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی جس میں مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو تعلیم انگریزی زبان میں دی جائے یا فارسی سنسکرت میں! خوب لے دے ہوئی۔ ووٹنگ ہوئی تو ووٹ برابر تھے۔ کمیٹی کے سربراہ لارڈ میکالے نے کاسٹنگ ووٹ کے ذریعے انگریزی کا حق تسلیم کروالیا۔ اس موقع پر یہ الفاظ کہے گئے

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریزی ہو"

(تاریخ التعلیم از میجر باسو ص ۸۲ بحوالہ روشن مستقبل)

گویا انگریز بہادر نے ذہنی طور پر ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو مفلوج کرنے کی غرض سے اور انہیں اپنے سانچے میں ڈھالنے کے لئے قدیم نظام تعلیم کو ختم کرکے جدید نظام تعلیم کی بنا ڈالنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ یہ وہ دور تھا کہ ابھی دہلی کی مرکزیت اور اس کی علمی و تہذیبی بہاریں کسی نہ کسی درجہ میں قائم و باقی تھیں۔ فیلسوف اسلام حکیم الہند حضرت الامام الشاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس اللہ سرہ العزیز کے والد گرامی مرتبت حضرت الشاہ عبدالرحیم دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا مدرسہ رحیمیہ موجود تھا جس سے نہ صرف برصغیر بلکہ برصغیر سے باہر کی بھی دنیا مستفید ہوئی تھی۔ مولانا سندھی نے شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک میں کسی سیاح عالم کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:۔

"میں نے برصغیر کا چپہ چپہ چھان مارا، کوئی عالم مجھے ایسا نہ ملا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ مدرسہ رحیمیہ سے فیض یاب نہ ہوا ہو"

اس کے علاوہ بھی ملک کے اطراف و اکناف میں مدارس و تعلیم گاہوں کی کمی نہ تھی۔ سندھ کے مشہور شہر ٹھٹھہ کے متعلق کپتان ہملٹن کا قول ہے کہ:۔

"چار سو مختلف علوم و فنون کے کالج اس شہر میں موجود تھے اور یہ زمانہ سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ کا تھا"

(سفرنامہ بحوالہ الفرقان ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ)

تعلیمی ہندستانی رسالہ میں مختلف چیزیں اس ضمن میں ذکر کی گئی ہیں۔

مثلاً:۔ انڈیا ڈسٹرکٹ سکولوں سے بھرا ہوا ہے ہر ۳۱ لڑکوں پر ایک سکول ہے۔ (ص۲ بیان رپورٹ وارڈ ۱۸۲۱ء)

پروفیسر میکس میلر کا بیان ہے:۔

برطانوی حکومت سے قبل بنگال میں ۸۰ ہزار مدارس تھے (ص۲)

مسٹر لڈلو نے اپنی کتاب تاریخ برطانوی ہند میں ہندوستان کے گاؤں گاؤں کے سکول مدارس وغیرہ کی بڑی خوبی سے تعریف کی ہے (ص۲)

اور جان میٹن نے اعتراف کیا تھا کہ جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ جمایا تو اس میں عربی تعلیم کا سلسلہ بہت کافی مقدار پر موجود تھا (ص۱)

چنانچہ اس نظام کو درہم برہم کرنے کے لئے جس نئے نظام تعلیم کی تدوین و ترتیب کا سوچا گیا اور اس کی پشت پر چند در چند جو راز تھے، خلاصہ یہ کہ انگریز نے امریکہ میں تعلیم کا سلسلہ جاری کرکے دیکھ لیا تھا کہ ملک اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اب یہ خطرہ برصغیر میں مول لینا بہت مشکل تھا۔

اور دوسرے یہ کہ تعلیم اور غلامی کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں۔ تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ غلامی کا جوا اتار پھینکا جائے اور انگریز کو ملک سے نکال باہر کیا جائے جیسا کہ الفنسٹن نے اپنے بیان میں کہا تھا۔ دیکھیں تعلیمی ہند ص۸۸

گویا غلامی کی زنجیریں مضبوط کرنے کے لئے اور اپنے جبر و تشدد کی دستی کو دراز کرنے کے لئے انگریز نے پرانے نظام تعلیم یعنی مدارس و مساجد کی اینٹ سے اینٹ بجائی اور اس کی جگہ تعلیم کے نام پر جو نظام نافذ کیا اس کے نفاذ و اجراء میں یہ بات مضمر تھی کہ غلامی کے جراثیم ذہنوں میں سما جائیں کیونکہ

دل بدل جاتے ہیں تعلیم بدل جانے سے

یہ ۱۸۱۳ء کی سوچ تھی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں نے بھرپور انگڑائی لی۔ اس وقت بھی بخت نے ان کا ساتھ نہ دیا تو انگریز کے وار سے نیم جاں ہو گئے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ دور انتہائی وحشتناک تھا الامان۔

اقوام ہند بالخصوص مسلمان قوم کی جو حالت ہو چکی تھی اس کے بعد اس قوم کے دوبارہ پنپنے کا سوچنا بھی ایک مجنونانہ خواب تھا لیکن ناظر حق و صداقت کے بچے کھچے افراد جو ۱۸۵۷ء تک باقاعدہ جنگی میدان میں انگریز کا مقابلہ کر چکے تھے نے حالات کے پیش نظر رخ بدلا اور تباہ حال شکستہ حال قوم کی تعمیر نو کے لئے ایک نیا پروگرام بنایا۔

اس پروگرام کی بنیاد تعلیم پر رکھی گئی اور ایک باقاعدہ تعلیمی تحریک کا آغاز کیا گیا جس کی پہلی کڑی مادر علمی دارالعلوم دیوبند تھا۔ یہ دارالعلوم جس کا باقاعدہ افتتاح ۱۸۶۶ء میں دیوبند نامی ایک قصبہ میں ہوا۔ دراصل اس پرانے انداز فکر و عمل کی نئی صورت تھی جس کے بانی حضرت حکیم الامت امام ولی اللہ دہلوی قدس سرہ تھے بلکہ ان سے بھی پہلے جس کی بنیاد

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ سے ہو چکی تھی۔

حضرت حکیم الامت دہلوی مجدد سرہندی کے ساتھ اپنے تعلق کا اس جگہ اظہار فرماتے ہیں اور ان کے کام کو اپنے کام کی بنیاد فرماتے ہیں اسی طرح حضرت ولی اللہی مکتب سے شیخ سندھی امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی علیہ الرحمۃ شاہ صاحب دہلوی کو مجدد صاحب کے کام کی تکمیل کرنے والا فرماتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے بعد ان کے صاحبزادے سراج الہند شاہ عبد العزیز ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے اپنے اباء بزرگوار کے انقلابی پروگرام کی تکمیل کی خاطر بھرپور جدوجہد فرمائی۔ اس جدوجہد کا ایک حصہ سید احمد شہید اور حضرت الامام شاہ اسماعیل شہید کی تحریک جہاد تھی۔

شاہ عبد العزیز صاحب کے بعد حضرت الامام السید محمد اسحٰق نواسہ شاہ عبد العزیزؒ نے تحریک کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور آپ جب ۱۲۴۲ھ میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو استاذ الکل مولانا مملوک علی رحمۃ اللہ تعالیٰ ان کے نائب و جانشین قرار پائے۔

مولانا موصوف جس دور میں ولی اللہی میراث کو دنیا میں تقسیم کر رہے ہیں۔ وہ وقت سیاسی جدوجہد کا تھا لیکن اس زمانہ میں آپ کے حضور بعض ایسے شاگردوں نے زانوئے تلمذ تہہ کیا جنہوں نے آئندہ چل کر تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ ان شاگردوں میں قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند فقیہ العصر قطب وقت مولانا رشید احمد گنگوہی اور خود آپ کے صاحبزادہ گرامی مرتبت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ تھے۔ ان حضرات کی تربیت باطنی حضرت الامیر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کے زیر سایہ ہوئی جو امام زمن میاں جی نور محمد جھنجھانوی قدس سرہ کے خادم و خلیفہ اور جانشین برحق تھے حضرت میاں جی قدس سرہ شاہ عبد الرحیم ولایتی شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے جو تحریک ولی اللہی کے قائد محترم حضرت الامیر سید بریلوی کے اتباع خاص میں سے تھے۔ یہ تفصیل خود بتلاتی ہے کہ تحریک علمی یا بالفاظ دیگر تحریک دیوبند کے پس پردہ کیا عوامل کار فرما تھے! اور پھر یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ دیوبند کے لیے جو جگہ تجویز ہوئی۔ وہ وہی ہے جہاں سے حضرت الامیر سید بریلوی اور ان سے پہلے حضرت مجدد سرہندی کو بوئے علم آئی تھی۔

جناب سر سید احمد خان جو علی گڑھ کالج (بعد میں یونیورسٹی) کے بانی کی حیثیت سے متعارف ہوئے بھی اتفاق سے مولانا مملوک علی قدس سرہ کے شاگرد تھے لیکن موصوف نے اپنے اسلاف کی متعین کردہ راہوں سے الگ ہٹ کر ایک نئی راہ اختیار کی جسے مولانا سندھی قدس سرہ انگریز سے تعاون کی راہ ارشاد فرماتے جبکہ اہل جد کو عدم تعاون کا علمبردار کہتے ہیں ایک استاد کے شاگردوں میں یہ اختلاف کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی اختلافات کا سلسلہ انسانی تاریخ سے وابستہ ہے۔ اور اس تحریک ولی اللہی میں اس سے پہلے ایک اختلاف حادثہ بالاکوٹ کے بعد رونما ہو چکا تھا کیونکہ سید صاحب کے بعد شاہ محمد اسحاق صاحب کے داماد مولانا نصیر الدین امیر منتخب ہوئے تو پارٹی میں امارت و قیادت کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک دوسری وجہ سے اختلاف رونما ہوا۔ جس کی تفصیل یہ تھی کہ سید صاحب کی نعش مبارک نہ ملی تو ایک گروہ نے ان کی غیبوبت کا نظریہ قائم کر لیا جبکہ بیشتر حضرات شہادت کے قائل تھے۔ شاہ محمد اسحاق صاحب کا طبقہ شہادت کا قائل تھا اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی یعنی صادق پوری جماعت غیبوبت کی قائل تھی۔

اسی طرح اب مولانا نانوتوی اور سر سید کے درمیان اختلاف ہوا۔ اور جماعت میں اس قسم کے اختلافات دوسرے مواقع پر بھی ظاہر ہوئے۔ مثلاً عمل جہاد کے بارے میں حاجی امداد اللہ صاحب اور مولانا شیخ محمد تھانوی کا اختلاف کہ اول الذکر اس کے علمبردار تھے اور انہوں نے ایسا کیا تو ثانی الذکر شرائط کے موجود نہ ہونے کے سبب (اپنے خیالوں کے مطابق) قائل نہ تھے (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۲۴۹) اور اسی نوعیت کا اختلاف حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے خدام میں رونما ہوا، جبکہ مولانا سندھی۔ مولانا مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا لاہوری، مولانا منصور انصاری قدس اللہ اسرارہم

بیک وقت انگریز سے عدم تعاون کی پالیسی اپنائی اور جنگ جاری رکھی تو مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ نے بیک وقت شدید دلائل کے ساتھ اس موقف سے اختلاف کیا۔ حضرت مولانا نانوتوی نے عظمت و احیاء اسلام کی خاطر قدیم نظام تعلیم کو اپنایا مگر ان کے ہنگاموں سے انہیں بعد میں [illegible] سرسید احمد خان نے اس دور میں [illegible] جیسا کہ تہذیب الاخلاق کی متعدد جلدیں اس پر شاہد ہیں۔ مثلاً :-

"اس زمانہ میں پرانے طریق پر مسلمانوں نے کئی مدرسے تعلیم کے لئے جونپور، علی گڑھ، کانپور، سہارنپور، دیوبند، دہلی، لاہور میں جاری کئے ہیں، مگر میں نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ وہ محض بے فائدہ اور محض لغو ہیں۔"

(تہذیب الاخلاق ص ۲۹۶ جلد دوم)

اس طرح کے اور بھی "ارشادات" ان کے قلم سے نکلے جنہیں بخوف طوالت نقل کرنا مشکل ہے۔ لیکن حضرات دیوبند قدس اللہ اسرارہم نے جواباً اس قسم کی کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان کبھی استعمال نہیں کی۔ انہوں نے دائرہ تہذیب و شرافت میں رہ کر وہ انداز اختیار کیا جس کا اختیار کرنا ان کے لئے ضروری تھا اور جس کی خدا اور اس کی مخلوق کی طرف سے ان پر ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ ایک عرصہ سے دنیا اس پروپیگنڈے میں مصروف ہے کہ علماء دیوبند انتہائی تنگ دل و تنگ ظرف تھے اور انہوں نے قوم کی تعمیر نو کے کام میں بجائے سرسید کا ہاتھ بٹانے الٹا ان کو مطعون کیا اور جدید علوم کی مخالفت کی۔ جہاں تک جدید علوم اور زبان انگریزی وغیرہ کی مخالفت کا تعلق ہے ایک بھی ٹھوس دلیل اس سلسلہ میں پیش کرنی مشکل ہے۔ البتہ ہمارے پاس ایسے دلائل ہیں کہ ان حضرات نے بڑی فراخ دلی سے اس کی اجازت دی۔ مثلاً :-

شاہ عبدالعزیز قدس سرہ جو گویا تحریک کے بنیادی دور کے اہم رہنما ہیں ان کی اجازت پر شمس الفنون کو خود سرسید صاحب نے اپنی مشہور کتاب (اسباب بغاوت ہند کے ص ۵۸) پر نقل کیا ہے۔ حضرت [illegible] مولانا رشید احمد گنگوہی کا فتویٰ، فتاویٰ رشیدیہ میں [illegible] مجموعہ فتاویٰ ص ۱۱۱ ج ۱ پر اور مولانا اشرف علی تھانوی کا ارشاد [illegible] ص ۱۹۱ ج ۴ پر موجود ہے۔ حضرت نانوتوی قدس سرہ کی [illegible] انگریزی زبان سیکھنے سے متعلق ہے۔ ایک حدیث واضح ہے۔ اگر [illegible] آپ کو ہجرت نہ دی اور اس کے بعد ہمارے [illegible] ایسے تھے اور ہیں جنہوں نے نہ صرف انگریزی بلکہ دوسری علمی غیر ملکی زبانیں سیکھیں اور ان سے کام لیا۔ اور جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہود کا خط وغیرہ سیکھنے کا فرمایا تھا تو علماء جو ورثاء انبیاء ہیں کیسے مخالفانہ طرز عمل اختیار کر سکتے ہیں؟

ایک مزید شہادت عرض کروں۔ مسٹر غلام احمد پرویز جو منکرین حدیث کے قائد کی حیثیت سے معروف ہیں اور جو ایک مخصوص پروگرام کے پیش نظر ہوم ڈیپارٹمنٹ سے علیحدہ ہو کر دنیائے صحافت میں آئے، اپنے ایک مضمون بعنوان "نتائج کارواں" میں جو سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے رسالہ "ترجمان القرآن" ج ۱۸ عدد ۳ ص ۲۲۱ - ۲۲۲ میں شائع ہوا اعتراف کیا ہے کہ مولویوں پر اس قسم کا الزام کہ انہوں نے جدید علوم کی مخالفت کی بالکل غلط ہے (الفرقان بابت ماہ صفر ۱۳۵۹ھ ص ۵۵)

ان دلائل کے بعد یہ کہنا کہ صاحب مولوی تنگ نظر و متعصب تھے اور انہوں نے جدید علوم کی مخالفت کی بالکل غلط ہے۔ رہ جاتی ہے بات سرسید صاحب کے ارشادات و اقوال اور ان کے فکر و نظر کی، نیز کالج کے عملہ میں ان کی روح کی تو اس سلسلہ میں تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سرسید احمد خان عقل پرستی کا ایسا شکار ہوئے کہ انہوں نے بہت سارے مسائل دینی اور عقائد اسلامی کی نئی تعبیرات پیش کر کے ایک جدید علم کلام کی طرح ڈالی اور پھر جب انہیں اہل اسلام کی ترقی و تعمیر کا خیال آیا تو اس دھن میں اور تیزی آگئی

کہ گورنمنٹ کی درس گاہوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے،
مسلمان اس کے نہیں بلکہ نظام کے خلاف ہیں

سرسید احمد خان ابتداء میں اسی انداز کا نقطۂ نظر رکھتے تھے جس انداز کا نقطۂ نظر دوسرے حضرات کا تھا۔ چنانچہ آپ ان کی کتاب اسباب بغاوت ہند دیکھیں یا ان کے ارشادات بہ سلسلہ مسئلہ قومیت آپ کو ایک خاص سرسید نظر آئیں گے۔ وہ اسباب بغاوت ہند میں انگریزی کی تمام خرابیوں کا باعث قرار دیتے ہیں تو قومیت کے مسئلہ پر بعد میں بعض مسلم مفکروں کی رائے کے برعکس بالکل وہی رائے رکھتے ہیں جو اکابر علمائے حق کا مطمع نظر تھا۔ دیکھیں مسلمانوں کا روشن مستقبل (ص ۲۶۹) اور غالباً اسی وجہ سے سرسید کے قدیم رفیق جناب شبلی نعمانی نے مسلم گزٹ لکھنؤ میں لکھا۔

"وہ پر زور دست و قلم جس نے رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا تھا اور اس وقت لکھا تھا جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے۔ وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچ کی دھجیاں اڑا دی تھیں اور جو کچھ اس نے ان تینوں آرٹیکلوں میں لکھا کانگریس کا لٹریچر حقوق طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پر زور لٹریچر پیدا نہیں کر سکتا۔ وہ جانباز جو آگرہ کے دربار سے اس لئے برہم ہو کر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہ تھیں۔ وہ انصاف پرست جس نے بنگالیوں کی نسبت کہا تھا کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں صرف بنگالی ایسی قوم ہے جن پر ہم واجبی طور پر فخر کر سکتے ہیں اور یہ صرف انہی کی بدولت ہے کہ علم و آزادی اور حب الوطنی کو ہمارے ملک میں ترقی ہوئی۔ میں صحیح طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالیقین ہندوستان کی تمام قوموں کے سرتاج ہیں۔ حالات اور گردوپیش کے واقعات نے اس کو اس پر مجبور کیا کہ اس نے تمام اسلامی پبلک کو پالٹکس سے روک دیا۔ یہ کیوں ہوا اور کن اسباب سے ہوا اور کس چیز نے دفعۃً یہ انقلاب پیدا کر دیا۔ ان سوالات کا جواب اگرچہ نہایت دلچسپ ہے لیکن جرأت اور تقلید سے آزادی کا منتظر ہے۔"

(روشن مستقبل ص ۲۶۷)

ہمارے نزدیک اس انقلاب کی وجہ سرسید کا سفر یورپ ہے۔ وہ ۱۸۶۹ء میں یورپ تشریف لے گئے۔ خوب آؤ بھگت ہوئی۔ حتیٰ کہ ملکہ نے شرف باریابی بخشا۔ خیشش میں جکڑے گئے۔ وہاں سے آکر یورپین تہذیب کے حق میں مقالے لکھے۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج کی ابتدا ہوئی۔ اس میں مسٹر ماریسن، مسٹر بیک، مسٹر آرچبولڈ بالترتیب پرنسپل رہے۔ حالات پر ان کا کنٹرول تھا۔ انہی کی سیاست کارفرما تھی۔ آخر الذکر نے مشہور شملہ وفد کا اہتمام کیا جس نے وائسرائے بہادر سے مل کر حقوق چھیننے کی خودداری نہ راہ کی بجائے "مانگنے" کی بزدلانہ روش کی ابتدا کی۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو یہ وفد شملہ میں ملا۔ اگلے ہی دن لندن کے اخبارات خوشی سے اچھل پڑے۔ انہوں نے تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے اور اسی کے چند دن بعد ۹ نومبر ۱۹۰۶ء کو مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے اغراض و مقاصد اتنے افسوسناک تھے کہ معلوم ہوتا ہے سرکار کی کوئی ایجنسی ہے جو فرائض مخصوصہ سرانجام دینے کے لئے معرض وجود میں آئی ہے۔ اسی وجہ سے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے شمولیت مسلم لیگ کی دعوت پر فرمایا تھا

ہر چیز منظور ہے مسلم لیگ میں شمولیت منظور نہیں۔

بہرحال خیر یہی حد تک رہ کر علی گڑھ میں محض تعلیم کا سلسلہ ہوتا تو اختلاف نہ ہوتا لیکن انگریز پرنسپل حضرات کی کوشش سے جہاں عقائد و اعمال بگڑے، تہذیب کا جنازہ نکلا وہاں یہی چیز ایک مخصوص سیاسی جماعت کے جنم لینے کا باعث ہوئی جس نے لارڈ میکالے کی ۱۸۳۵ء کی سکیم کو عملاً کامیاب کرایا۔ فیا حسرتا۔

اس افسوسناک روش کے باوجود بھی علماء دیوبند کی کوشش رہی کہ

اس مقصد کو بڑی شدت سے محسوس کیا کہ جو اسکول و کالج اور دارالعلوم دیوبند
کے درمیان [illegible] حضرت گنگوہی کے تلمیذ رشید مولانا عبید اللہ سندھی
نے [illegible] سرپرست دارالعلوم حضرت شیخ الہند
نے قرب و اتصال کی کوشش کی اور ۱۹۱۳ء میں دیوبند کے [illegible] تعلیم یافتہ اور
فضلاء میں [illegible] استقلال [illegible] باہمی تبادلہ
کی ایک تحریک شروع ہوئی۔ اس پر [illegible]
[illegible] حضرت شیخ الہند کی
مشہور عالم تحریک ریشمی رومال کی بربادی کا باعث ہوگئے۔

تاہم خلاصہ اس کے ایک دور میں ایسا ہوا کہ علی گڑھ میں
کا [illegible] وہ شیخ الہند کی [illegible] سے مل گئے جن میں مولانا
محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری وغیرہ بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ انہی
حضرات کی کوششوں اور [illegible] کے تعاون سے جامعہ ملیہ دہلی میں قائم کیا گیا
یہ ادارہ [illegible] یونیورسٹی کے مقابلہ سے علی گڑھ میں قائم ہوا۔ شامیانوں کی چھتوں میں
اس کی ابتدا ہوئی۔ مقصد [illegible] طلبہ کی تعلیم کا انتظام تھا۔ حضرت شیخ الہند شدید
بیماری کے باوجود اس کے افتتاح کے لئے تشریف لائے لیکن بعد میں علی گڑھ
کی قدیم یونیورسٹی کو نقصان سے بچانے کے لئے اسے دہلی میں منتقل کر دیا گیا
اور یہ حضرت شیخ الہند اور آپ کے خدام کی وسعت قلبی کی دلیل ہے۔ اس
میں آپ کے مخصوص [illegible] کے ساتھ نواب وقار الملک، ڈاکٹر انصاری
حکیم اجمل خاں وغیرہ برابر کے شریک تھے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

بعد کے ادوار میں کئی مواقع آئے جب حالات نے تصادم کی
شکل اختیار کرلی۔ بالخصوص تحریک پاکستان کے دوران علی گڑھ کے عزیز طلبہ
نے خاصی افسوسناک روش اختیار کی۔ اس کے باوجود حضرات علماء کی کوشش
رہی کہ تصادم کی بجائے تطابق و توافق کی صورتیں پیدا ہوں چنانچہ جب کبھی
موقع ملا یہ حضرات وہاں گئے۔ حتیٰ کہ آل انڈیا ایجوکیشنل مسلم کانفرنس کے اجلاس
پنجاہ سالہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ نے ایک اجلاس کی
صدارت فرمائی۔ تحریری خطبہ ارشاد فرمایا جو شائع شدہ موجود ہے اور پھر
[illegible] بنا ہے کہ [illegible] وہاں جاتے رہے اور جوں جوں بادل چھٹے تو
قریب ہوتا گیا اور اب بحمد اللہ تعالیٰ دیوبند کے کئی فضلاء وہاں اعلیٰ درجہ کے
مدرس ہیں، کئی دیوبندی اکابر پر تحقیق و ریسرچ ہوئی اور طلبہ کو پی ایچ ڈی
کی ڈگری ملی۔ دیوبند کی حد تک وہاں اہمیت حاصل ہے اور یہ سب علماء کی
پرخلوص اور منصفانہ جدوجہد کا ثمرہ ہے کہ انہوں نے برائی سہی لیکن برائی کا
جواب بھلائی سے دیا۔ اگر سرسید احمد خاں شروع میں وہ طرز عمل اختیار نہ
کرتے جس کا اظہار کیا جا چکا ہے اور مولانا نانوتوی کی آراء تسلیم کر لیتے تو یہ
دونوں ادارے مل کر مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ میں موثر کردار ادا کر سکتے تھے
لیکن تقدیرات الٰہی کا لکھا ہوا کون ٹال سکتا ہے؟

ٹوبہ ٹیک سنگھ کی مرکزی دینی درسگاہ

مدرسہ اسلامیہ عزیزیہ رجسٹرڈ

مرکزی جامع مسجد ؛ ٹوبہ ٹیک سنگھ ؛ ضلع لائلپور

۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۶ء حضرت مولانا سید محمد اطہر الحق بتیل عباسی امروہوی مرحوم و مغفور کی مساعی سے اس مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس وقت اس پورے علاقے میں کوئی مدرسہ نہ تھا۔ نہ حفاظ تھے، نہ علماء۔ اب اس مدرسہ کی برکت سے یہ پورا علاقہ حفاظ و علماء سے معمور ہے۔ مدرسہ میں حسب ذیل شعبہ جات ہیں۔

۱۔ **شعبہ درس نظامی:** اس شعبہ میں موقوف علیہ و دورہ تک تعلیم کا انتظام ہے۔ سینکڑوں طلبہ یہاں سے تعلیم حاصل کر کے بشمول اس میں دورہ حدیث سے فارغ ہو چکے ہیں۔ اس شعبے کے صدر مدرس مہتمم مدرسہ مولانا سید سلطان احمد عباسی امروہوی حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مایۂ ناز شاگرد ہیں۔ تدریسی خدمات اور افتاء کا بیس سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ آپ مولوی فاضل، بی اے، ایم اے اسلامیات کے طلبہ کو تیاری بھی کراتے ہیں

۲۔ **شعبہ حفظ و ناظرہ قرآن مجید۔** اس درجہ میں قرآن مجید، حفظ و ناظرہ تعلیم کے لیے ماہر اساتذہ حافظ و قاری حبیب صاحب دھیانوی کے زیر نگرانی کام ہوتا ہے۔ تقریباً دو صد طلبہ اب تک حفظ سے فارغ ہوئے ہیں اور ناظرہ خواں طلبہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی ہے۔

۳۔ **شعبۂ افتاء۔** مستقل دارالافتاء موجود ہے اور یہ خدمت مولانا سید سلطان احمد عباسی انجام دیتے ہیں۔ پورا علاقہ اس سے مستفید ہو رہا ہے۔

۴۔ **کتب خانہ۔** مختلف علوم و فنون کی کتابوں پر مشتمل ایک قیمتی کتب خانہ ہے۔

۵۔ **مطبخ** طلبہ کو کھانا مدرسہ کے مطبخ سے دیا جاتا ہے۔ ایک باتنخواہ ماہر باورچی مقرر ہے۔

طلبہ کی رہائش، خوراک، لباس کا مدرسہ کفیل ہے، اور طلبہ کو وظیفہ بھی دیا جاتا ہے

مدرسہ کی کارکردگی کے متعلق اکابر علماء کی آراء

مدرسہ کے امتحانات کے لیے حضرات اکابر و علماء کرام وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہتے ہیں۔ کتاب الآراء میں ان حضرات کی آراء گرامی درج ہے۔ ان میں سے چند حضرات یہ ہیں۔

حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ — حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی

حضرت مولانا عبد الرشید صاحب شیخ الحدیث جامعہ رشیدیہ — حضرت مولانا عبید اللہ انور صاحب

المشتہر: چوہدری مختار احمد بھٹی، ناظم انجمن مدرسہ اسلامیہ عزیزیہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ

مولانا عبدالشکور دین پوری، مسئول جمعیت تحفظ حقوق اہل سنت

پورے ایشیا میں دارالعلوم دیوبند کی دینی، مذہبی، تبلیغی، تصنیفی، تعلیمی، قومی، ملکی، ملی، اصلاحی اور فنی خدمات بشمول ہر شعبہ، ہر جہات میں دو ماہ مسلم ہے۔

جب ہندوستان میں کفر کا طوفان تھا، شرک کا رجحان تھا، بدعات، رسومات، رواجات میں مبتلا انسان تھا۔ خرافات، جزئیات، اختلافات کا شکار مسلمان تھا، اسلام جلتے نام تھا، مذہب بدنام تھا، ہر غلط کام تھا، جہل عام تھا۔

جہالت کا اندھیرا تھا، ظلم کا بسیرا تھا، گمراہی کا ڈیرا تھا، انگریز کی حکمرانی تھی، حکومت شیطانی تھی، ہر طرف حیرانی و پریشانی تھی، ہر سو طغیانی تھی۔ جب علماء کو پھانسی پر لٹکایا گیا، دار و رسن پر چڑھایا گیا، دریا شور جبر کیا گیا، حق گو لوگوں کا سر اڑایا گیا۔ الحفیظ والامان کا سماں تھا

نقشہ الحفیظ والامان تھا۔ بڑے بڑے جاگیردار، سرمایہ دار اور زمیندار حکومت کے وفادار تھے۔ ملک کے غدار تھے، مذہب سے بیزار تھے۔ اعلیٰ عہدوں کے طلب گار تھے۔ اکثر عیار، مکار اور بدکار تھے، مناصب کے نشے میں سرشار تھے، مسلمان ذلیل و خوار تھے۔ قرآن کے نسخے جلائے گئے، اسلام کے نقشے مٹائے گئے، مجاہدوں پر مقدمے چلائے گئے۔ وہ درختوں پر لٹکائے گئے، کالجوں کی تعلیم تھی، مسلمانوں میں نہ تنظیم تھی اور نہ اسلامی تعلیم تھی

حق پرستوں کا گروہ برسرپیکار تھا، ہندوستان میدان کارزار تھا۔ سب سے بڑا دشمن انگریز تھا، جو بڑا شر انگیز تھا، چالاک تھا تیز تھا، پھر بھی مقابلہ مقاتلہ کا معاملہ کیا گیا۔ مسلمانوں کی دینی تنزلی دیکھ کر غیور جاگ اٹھے۔ بالآخر انگریز اس ملک سے بھاگ اٹھے

دارالعلوم نے ہزاروں مفسر، محدث، مفتی، متکلم، محقق، مدقق، مناظر، معلم، مبلغ، مصنف، مؤلف، مورخ، مدبر، مفکر، سیاستدان، صحافی، شاعر

ماہر تیار کئے اور ہزاروں خطباء، علماء فضلاء، فصحاء، بلغاء، ادباء، صلحاء اتقیاء، اذکیاء، اصفیاء، اکابر مشائخ پیدا کئے۔

ویسے تو دارالعلوم نے ہزارہا فرزند، ارجمند، سعادت مند سپوت پیدا کئے، مگر چند قدر بلند فاضل دیوبند، دل پسند اکابرین بہترین نیک ترین کا تذکرہ ضروری ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ ذوالمنن استاذ العلماء مفسر محدث سیاستدان تھے۔ محمود کی ہر صفت محمود تھی، جو ان میں موجود تھی۔ ان کا ہر شاگرد رشید تھا۔ قابل دید تھا، لائق تقلید تھا۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی انقلابی، مدبر، مفکر، سیاستدان مرد میدان تھے۔

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب محدث، فقیہ، مناظر، عالم باعمل کامل اکمل فاضل اجل تھے۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مفسر، خطیب، ادیب، مبلغ، کامل انسان تھے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی متصوف، مصنف، فقیہ، مبلغ ولی اللہ اہل اللہ تھے۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مجاہد، محدث، سیاستدان، عالم باعمل اور عاشق رسول آخر الزمان تھے۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند، فقیہ، مصنف، مجاہد فی سبیل اللہ، خلیق، شفیق آدمی تھے۔

حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی مفتی، فقیہ، لائق، فائق تھے۔

دارالعلوم نے اڑھائی ہزار عربی مدارس ہند میں اور ایک ہزار مکاتب پاکستان میں سے قائم کئے جو تعلیمی، تبلیغی، تدریسی کام بر سر عام صبح و شام ہر قدم ہر گام کر رہے ہیں

خدمات دارالعلوم ایک نظر میں

دارالعلوم نے ۵۳۶ شیخ ۵۸۸۸ مدرسین ۱۶۴ مصنفین مفتی ۱۵۴، مناظر ۶۸۴، صحافی ۲۲۸۸ خطیب مبلغ ۲۸۸ طبیب ۴۸، فضلا تیار کئے۔

عرب و عجم میں تبلیغ کا کام کیا، ہزاروں عیسائی ہندو اور مرزائی مسلمان کئے۔ فتنہ مرزائیت، فتنہ بہائیت، فتنہ عیسائیت، فتنہ چکڑالویت فتنہ سبائیت، فتنہ نیچریت، فتنہ اشتراکیت، فتنہ رضاخانیت، کا مقابلہ کیا

انشاء اللہ

قیامت تک یہ سلسلہ فیوضات بابرکات دن رات جاری ساری رہے گا۔

ان کی شاخیں لاکھوں در لاکھوں ہیں، ماشاء اللہ لیل و نہار مصروف کار مشغول حسب معمول و مقبول ہیں

اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ

رباعی

از حضرۃ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ

صدر المدرسین دار العلوم دیوبند

ماجرا آبلہ پائی کا مری اے مجنوں

خار سے پوچھو کہ سب نوک زباں ہے اسکو

ہم نے چاہا کہ اٹھیں دشت جنوں سے یعقوب

آبلے پاؤں پڑے، خار نے دامن پکڑا

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی

استاذ حضرۃ تھانوی و حضرۃ شیخ الہند

از مولانا سید عبدالمجید صاحب مدظلہم

دارالعلوم دیوبند اور تحفظ ناموسِ صحابہؓ

★ ✸ ★

دارالعلوم دیوبند گو بظاہر ایک تعلیمی ادارہ کا نام ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک ایسی تحریک ہے جس نے باطل کو ہر محاذ پر للکارا اور سچائیوں کا پرچم بلند کیا۔ یہ دراصل حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی آرزوؤں ...... اور تمناؤں کی زندہ تصویر ہے۔ اس ادارے نے ایسے شہ افراد پیدا کئے جنہوں نے علمی، تبلیغی، سیاسی خدمات اور تصنیف و تالیف سے احقاق حق و ابطال باطل کا فرض ادا کیا۔ باطل نے جس عنوان سے سر اٹھایا۔ اس کی سرکوبی کے لئے شاہ ولی اللہ مرحوم کے روحانی فرزند سربکف ہو کر میدان میں آئے۔ برصغیر میں جہاں مہدوی اور تثلیثی مشنریز کی یلغار کا نہایت جرأت و ہمت سے مقابلہ کر کے تبلیغ اسلام کا فرض ادا کیا گیا۔ وہاں برطانوی سیاست کے دجل و تلبیس کے تارو پود بکھیرنے کے لئے دارالعلوم دیوبند کے جرنیلوں نے ناقابل فراموش کارنامے انجام دیئے۔ تحریک آزادی میں ولی اللّٰہی مکتب فکر کی بے پناہ قربانیاں ایک ایسا روشن باب ہیں۔ جن سے رہتی دنیا تک انسانیت درس حریت لیتی رہے گی۔

دشمن اسلام انگریز ظالم نے اپنے افتراق المسلمین کے منصوبہ کی تکمیل کے لئے قادیان میں جھوٹی نبوت کا اجرا کرایا۔ اس کے تعاقب کے لئے بھی اکابرین دیوبند ہی کا لشکر جرار آگے بڑھا اور قادیانی دجال کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ یہی تو وجہ ہے کہ انگریز اور برطانیہ کے سیاسی گماشتے دیوبندی مکتب فکر اور انہی کا نام سنتے ہیں۔

شجر نبوت کے برگ و بار صحابہ کرام کی ناموس کے تحفظ اور دشمنان اسلام کے منہ پر طمانچہ مارنے اور کام بنانے کی سعادت بھی اکابرین دیوبند ہی کے حصہ میں آئی جنہوں نے تحریر و تقریر سے یاران نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کی حفاظت کر کے ملت پر احسان عظیم فرمایا حضور رحمت مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی تیار کردہ جماعت صحابہ کرامؓ کے خلاف یہودی سازش کے ایک تاریخی منصوبہ کے تحت زہر یلا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ جس استاد کے شاگرد ظالم ثابت ہو گئے۔ اس کی تعلیم از خود غیر معیاری کہلائے گی۔

اس فتنہ کے سدباب کے لئے متقدمین میں علامہ ابن تیمیہؒ نے "منہاج السنۃ فی رد اہل البدع ...... والاعتزال والشیعہ" لکھی جو چار جلد پر مشتمل نہایت علمی اور تحقیقی تصنیف ہے۔ اسی طرح قاضی ابو بکر مرحوم نے "العواصم" لکھ کر تاریخ پر احسان فرمایا۔

برصغیر میں سب سے پہلے حجۃ اللہ فی الارض حضرت امام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء اور قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین لکھیں۔ جن میں حقانیت مذہب اہلسنت والجماعت دلائل و براہین کی روشنی میں واضح کی گئی ہے اور دشمنانِ صحابہؓ پر ضرب کاری لگائی گئی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند شاہ عبدالعزیز قدس سرہ نے "تحفہ اثنا عشریہ" لکھ کر شیعیت و سبائیت کے حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ تحفہ اثنا عشریہ کی اشاعت .... روافض کے لئے ایک ایسا چیلنج تھا جس کا ان کے پاس کوئی علمی جواب نہیں تھا۔ حضرت شاہ صاحب پر روافض کے مظالم کا سلسلہ شروع کر دیا گیا اور اس راہ میں آپ کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

اس مضمون پر حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے مجاہد کبیر سید اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے "منصب امامت" فارسی میں لکھ کر تحریک تحفظ ناموس صحابہؓ کو آگے بڑھایا۔ خاندان ولی اللہ نے عظمت صحابہؓ کی جو شمع جلائی وہ تیز و تند آندھیوں کے باوجود روشن رہی۔ حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ میں سے مولانا حیدر علیؒ نے "ازالۃ الغین" اور "منتہی الکلام" جیسی بلند پایہ کتابیں لکھیں۔ انہی بلند پایہ اور معیاری تصانیف کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانان ہند کے علمی محسن نواب محسن الملک جیسے مدبر لوگ (جو علی گڑھ یونیورسٹی کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں-) شیعیت و سبائیت سے تائب ہو کر حلقہ بگوش اہلسنت والجماعت ہوئے۔ نواب صاحب موصوف نے علی گڑھ میں بیٹھ کر "آیات بینات" لکھی جو تین جلدوں میں نہایت عمدہ اور بلند پایہ تصنیف ہے۔

یہ سب خاندان ولی اللہ ہی کی فیض رسانیاں تھیں کہ تحریک تحفظ ناموس صحابہؓ روز بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی۔ جہاں تصنیفی محاذ پر اس عنوان کا حق ادا کیا جا رہا تھا ۔ وہاں تبلیغی میدان میں بھی برصغیر کا گوشہ گوشہ ناموس صحابہؓ زندہ باد اور خلافت راشدہ زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہا تھا۔

حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم نے "ہدیۃ الشیعہ" لکھی جس میں شیعی گروہ کے باطل عقائد و نظریات پر نہایت عالمانہ مگر عام فہم تبصرہ کیا گیا ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے "ہدایت الشیعہ" لکھی جو مختصر مگر مفید تصنیف ہے۔ جس میں اس فرقہ کے نقصان دہ معتقدات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کی "مطرقۃ الکرامۃ علی مرآۃ الامامۃ" اور "ہدایات الرشید الی افحام العنید" بھی اس عنوان پر بہترین کتابیں ہیں۔

پھر جب برصغیر میں تحریک مدح صحابہؓ چلی تو امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی مرحوم کے ساتھ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ بھی تحفظ ناموس صحابہؓ کے اس مقدس مشن میں پیش پیش رہے اور رفض و سبائیت کے عفریت کا علمی قوت سے مقابلہ کرنے کا جو بھی پروگرام بنا اس میں اکابرین دیوبند بالخصوص شیخ الاسلام حضرت سید مدنی کی سرپرستی حاصل رہی۔ تحریک مدح صحابہؓ میں رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحبؒ بخاری مرحوم جیسے جلیل القدر مجاہد ہراول دستے میں شامل رہے اور انہی بزرگوں کے والہانہ اخلاص کا نتیجہ تھا کہ مولانا ظفر علی اظہر جیسے شیعہ لیڈر بھی تحریک مدح صحابہؓ میں شامل ہوئے اور اسی تحریک میں لکھنؤ جانے والے زعمائے اہلسنت جیل بھی گئے اور اہلسنت والجماعت کے پلیٹ فارم پر صحابہؓ کرام کی مدح و منقبت بیان کی۔ امام الہند حجۃ اللہ فی الارض حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کی مساعی مشکورہ کا نتیجہ تھا کہ سبائیت کا جو سیلاب اپنی .... ہولناک بربریت کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ اس کا رخ پھیرنے کے لئے برصغیر میں علماء حق کا ایک لشکر جرار وجود میں آ گیا۔ جنہوں نے عظمت صحابہؓ کا پرچم لہرا کر مسلمانان اہلسنت والجماعت کے قلب و جگر کو حب صحابہ و اہلبیت کی آماجگاہ بنا دیا۔

انہی نفوس قدسیہ کے بے پناہ ایثار کی بدولت مخدوم القوم سردار احمد خان صاحب پتافی مرحوم جیسے حساس اور دردمند اہل ثروت حضرات نے تحفظ ناموس صحابہؓ کا مشن اپنا مقصد حیات بنا لیا۔ سردار صاحب مرحوم نے تنظیم اہلسنت والجماعت کی داغ بیل ڈالی اور اس پلیٹ فارم پر اکابرین دیوبند کو مدعو کر کے شیعیت و سبائیت کے خطرناک منصوبوں سے ملت کو آگاہ کیا۔ عظمت صحابہؓ کی اشاعت کے لئے سردار صاحب مرحوم نے

(بقیہ: صفحہ ۶۷۸)

علمائے دیوبند اور تحریک مدح صحابہؓ

از مولانا غلام مصطفےٰ ناظم اعلیٰ دارالعلوم مدنیہ بہاولپور

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو اگر تاریخ اسلام اور قرآن و حدیث کی روشنی سے صرف نظر کرتے ہوئے علیحدہ کیا جائے تو حضور سرورِ کائنات کی پونجی صرف چند گنتی کے افراد اور وہ بھی اپنے گھرانے کے رہ جاتے ہیں اس طرح درپردہ جہاں حضور کی شان رحمۃ اللعالمین سے دشمنی ہو گی وہاں آپؐ کی ختم رسالت پر بھی زبردست قدغن لگے گا کیونکہ اس طرح پوری دنیا کی ہدایت کے لئے کسی اور نبی کی ضرورت ہو گی۔

اگر حضور پاکؐ سے متعلق تعلیم اسلام سے بالاتر ہو کر یہ تصور کر لیا جائے کہ آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق خلافت کی وصیت فرمائی تھی اور حضرت علی خلیفہ بلا فصل اور وصی رسولؐ ہیں تو تقاضا یہ ہے کہ پوری دنیا جانتی ہے کہ معاملہ اس عقیدہ کے مطابق نہ ہوا اور خلافت بلا فصل حضرت صدیق اکبرؓ کے حصہ میں آئی تو لازماً درپردہ صداقتِ رسولؐ مطعون ہو گی کیونکہ آپؐ کے اعلان خلیفہ بلا فصل اور وصی کرنے کے باوجود حضرت علیؓ خلیفہ اول نہ بن سکے۔

اور پھر اگر یہ کہہ کر کے شیرِ خدا حضرت علی المرتضیٰؓ پر تقیہ کا ملمع کاری برپا کر دیا جائے اور تقیہ کو جزا اسلام قرار دیا جائے تو لازماً منافقین کو اسلام کا ہیرو قرار دیا جائے گا حالانکہ قرآنی شہادت ان کے متعلق صاف ہے کہ منافق جہنم کے نچلے درجے میں ہوں گے۔ اور اگر باغ فدک کی آڑ میں صحابہ کرام کو مطعون کیا جائے تو لازماً یہ بھی درپردہ نبوت پر بہت بڑا بہتان ہے کہ وہ دنیا میں رہ کر جائیداد بنانے کی بھی فکر میں تھے حیکہ آپ ایک بار نماز سے فارغ ہو کر فوراً اپنے حجرہ میں تشریف لے گئے اور واپس آنے پر استفسار کیا گیا کہ آپ نے آج جلدی کیوں فرمائی جواب یہ تھا کہ میرے گھر معمولی سا ٹکڑا سونے کا رکھا تھا اسے فی سبیل اللہ دے آیا ہوں کہیں ایسا نہ ہو میں اپنے رب سے اس حال میں جا ملوں کہ میرے گھر کچھ مال ہو!

اور اگر صحابہ کرام کی عداوت میں قرآن پاک کے دس پارے بکری کے حوالے کر دیئے جائیں اور قرآن پاک غائب رکھ دیا جائے تو تو اپنے خلق خدا آسمانی ہدایت و روشنی سے کس طرح فیضیاب ہو گی اور حفاظت قرآن کا وعدۂ خداوندی کا کیا حشر ہو گا! اور پھر آپ اس پر بھی غور کریں کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے محبوب سے صاف فرمایا: اگر کفارِ مکہ آپؐ کی نبوت کے انکاری ہیں تو ہم نے آپ کی نبوت کی پاسبانی کے لئے ایک قوم کو متعین کر رکھا ہے اور ساتھ ہی "لیسوا بہا بکافرین" فرما کر اس شک و شبہ کو بھی دور کر دیا کہ قیامت تک وہ کافر نہیں ہوں گے۔ بھلا جو پاسبانِ نبوت ہوں اور بااقتضاء ارشادِ الٰہی وہ کافر کبھی نہ ہوں گے انہیں وفات نبیؐ کے بعد صفِ ارتداد میں کھڑا کر دینا کہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی صداقت کو برباد کرنا تو مقصود نہیں ہے۔؟

ان دیں حالات رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کے مصداق " فان امنوا

بشل ما کتبتم بہ کے تحت اسلام کی کسوٹی اور "ان اجرکم فنی اجرکم دون البغضھم
نبغضھم ابغضھم" کا سرٹیفکیٹ پانے والوں سے کوئی بدبخت جو مسلمان ہو
کر کیا ان سے عداوت رکھے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی عاقبت خراب کرے

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اسلام کی اس عظیم جماعت اور
حضور اکرمؐ کی پوری زندگی اور محنت کی بیخ کنی کے خلاف بھی اعداء اسلام اپنی
ہرزہ سرائی سے باز نہ آئے چنانچہ ان لوگوں کی سلف صالحین نے خوب سرکوبی
کی اور دندان شکن جواب دیئے

علمائے دیوبند نے جہاں دیگر فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا وہاں اس کی
بھی سرکوبی کی

سب سے پہلے شاہان اودھ جو کہ شیعہ تھے کا تذکرہ کرتا ہوں کیونکہ
وہ ایک عرصہ لکھنؤ میں حکمران رہے ۱۹۰۵ء کے بعد مقبول احمد خاں شیعہ نے
وہاں فتنہ کھڑا کیا اور سنی شیعہ کشیدگی پیدا ہوئی یہاں تک کہ ۱۹۳۶ء میں باقاعدہ
تحریک مدح صحابہ چلی انجمن دارالعلوم دیوبند کے صدر اور اسلام کے عظیم تاج
شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مجلس احرار اسلام کے عظیم رہنما امیر شریعت
سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کے احباب نے باقاعدہ اس تحریک میں حصہ لیا
اور شان صحابہ کرامؓ کو اجاگر کر کے اپنے فرض منصبی سے عہدہ برآ ہوئے یہی وجہ
تھی کہ تحریک خلافت میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں برطانوی حکومت کے
ارکان تجویز کئے ہیں ان میں ایک بھی شیعہ نہیں ہے کیونکہ سیاسی طور پر یہ لوگ
تقیہ کا شکار ہو کر انتہائی کمزور ہوتے ہیں۔

اس سے قبل دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم
نانوتوی اور دارالعلوم کے سرپرست حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ہدایۃ الشیعہ
نامی کتابیں لکھ کر صحابہ کرامؓ کی عظمت اور اہل سنت کے موقف کو مضبوط کیا۔

حضرت نانوتویؒ نے تو ایک بار حد کر دی جبکہ آپ عشرہ محرم کے
موقع پر قاضی پور تشریف لے گئے اور وہاں کے شیعہ حضرات نے اپنی مجلس
میں شرکت کی حضرت کو دعوت دی اس پر حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ اس شرط
پر شرکت کروں گا جب آپ اپنی مجلس میں کہہ سکیں لیں تو ہم بھی کچھ کہیں گے مگر
وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے اور وہیں کچھ مذہبی گفتگو شروع ہو گئی اسی دوران ان
لوگوں نے کہا ہم اس شرط پر اہل سنت الجماعت میں داخل ہوں گے کہ آپ
حضور پاکؐ کی زیارت بیداری میں ہمیں کرا دیں چنانچہ حضرت نے جوش میں آکر
فرمایا اگر تم بچتے رہو تو اس طرح بھی ہو سکتا ہے اور میں بیداری میں حضور پاکؐ
کی زیارت کرانے کو تیار ہوں مگر یہ روافض پیچھے ہو گئے

ایک سید حضرت نانوتویؒ خواجہ تشریف فرما ہوئے اعظم خان شیعہ
نے حضرت کو دعوت دی اور اجازت کے ساتھ ایک سوال کیا کہ حضرت صدیق
اکبرؓ خلیفہ کس طرح ہو گئے جبکہ حضور پاکؐ نے انہیں خلیفہ نہیں بنایا اس پر حضرت
نانوتویؒ کا جواب پڑھیے اور سر دھنیئے۔

فرمایا ارکان اسلام کے چار ہیں نماز روزہ حج زکوٰۃ دو ان میں
اصل ہیں اور دو ان کے تابع ہیں نماز اصل ہے اور زکوٰۃ اس کے تابع ہے
کیونکہ نماز کا تعلق براہ راست حق تعالیٰ سے ہے اور اس کے دربار کی حاضری
اور اس کی تعظیم اور اس سے عرض و معروض کا نام ہے اور زکوٰۃ کا تعلق بالواسطہ
محتاجوں اور فقراء سے ہے پس نماز کے مقابلہ میں زکوٰۃ ایسی ہے جیسے کوئی
بادشاہ اہل دربار کو اپنے دربار میں پانچ وقت حاضری کا حکم دے اور یہ بھی
حکم دے کہ ہماری طرف سے جو انعامات و صلات تم کو وقتاً فوقتاً ملتے ہیں ان میں
سے کچھ ہماری غریب رعایا کو بھی جو دربار کے راستے میں خیرات کے موقع پر
بیٹھ جاتے ہیں دیدیا کرو ظاہر ہے کہ حاضری دربار مقصود ہے اور صدقہ خیرات
اس کے تابع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں زکوٰۃ کو نماز کے بعد ذکر فرمایا ہے۔

اسی طرح حج کا تعلق براہ راست حق تعالیٰ سے ہے کیونکہ اس میں محبوب
کے در دولت پر حاضر ہو کر اپنے عشق و محبت کا اظہار ہے اور روزہ میں خواہشات
نفسانی کا توڑ ہے جو مانع ہیں اس محبت و عشق سے اور نفس امارہ میں جو خامیاں
پیدا ہو جاتی ہیں روزہ ان کو دور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان کے
تیس روزوں کے بعد حج کا وقت شروع ہوتا ہے اور گر کو حذف کر کے

آخر وقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے دس دن پہلے ہی ہر مہینے
کے سلسلے میں رمضان سے جلوس بھی تجویز کئے گئے اور ان سب کو ایک عزیز نے
رمضان میں جمع کر دیا گیا تاکہ ان تیس روزوں کی برکت سے دس مہینے کی خامیاں
جو نفس میں پیدا ہو گئی تھیں وہ ختم ہو جائیں اور محبوب کے دربار پر حاضری
کے قابل ہو جائے اور اپنی محبت کا اظہار کر سکے چنانچہ رمضان کے بعد محبت
کے اظہار کی اجازت ہو گئی یعنی شوال کے مہینے سے حج کا وقت شروع ہو گیا غرضیکہ
رمضان میں شرکت حج کی تیاری کی گئی اور حج میں جو روحانی میں شریک ہو گئے
جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حاصل رکھتے ہیں اس کی امارت حضور پاکؐ نے تمام
صحابہؓ کی موجودگی میں حضرت صدیق اکبرؓ کے سپرد کی تو ایک رکن اسلام میں آپ
کا استخلاف ثابت ہوا اسی طرح مرض وفات میں بھی تمام صحابہؓ کی موجودگی میں
نماز کی امامت بھی حضور پاکؐ نے صرف صدیق اکبرؓ کے سپرد کی اور سترہ
نمازوں کی امامت صدیق اکبرؓ نے حضورؐ کی حیات میں فرمائی اس سے دوسرے
رکن اسلام میں آپ کا استخلاف ثابت ہوا۔ اب کون سی وجہ ہے کہ صدیق اکبرؓ
کو خلیفہ برحق نہ مانا جائے اور اس طرح کہا جائے کہ خلافت کی اہلیت ان
میں نہ تھی اور حضرت علیؓ ہی میں تھی غرضیکہ اس طرح آپ نے پُراثر تقریر
فرمائی کہ صاحب دعوت اعظم خان شیعہ تائب ہو کر اہلسنت میں داخل ہوا۔
افسوس کہ مضمون کا تقاضا اختصار کا نہ ہوتا تو میں اس مقام پر حضرت نانوتویؒ
کا وہ فارسی کا خط جس کا ترجمہ مولانا بدر عالم مرحوم نے ترجمان السنہ میں
کر دیا ہے نقل کرتا اور آپ کو صحابہ کرام کی عظمت کا پتہ چلتا۔

مولانا عبدالشکور صاحبؒ نے لکھنؤ میں بیٹھ کر مدرسہ قائم کیا اور
شیعہ حضرات کے تمام اعتراضات کے جواب دیئے اور رسالہ النجم جاری
کیا جس میں تمام مسلمانوں کو عظمت صحابہ سے روشناس کرایا اور پھر پاکستان
میں اس موضوع پر مستقلاً تنظیم اہل سنت والجماعت کے نام پر ایک جماعت
قائم ہوئی جس میں سید نور الحسن شاہ صاحب بخاری، مولانا عبدالستار صاحب
تونسوی اور علامہ دوست محمد قریشی مرحوم اور ان کے رفقاء کار نے
قابل قدر کام کیا جیسے سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ، مولانا محمد علی صاحب
جالندھری، قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی اور ان کے رفقاء کار
نے پورے ملک میں اپنی تقاریر کے ذریعہ مدح صحابہؓ کی اور چکوال
ضلع جہلم میں شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے خلیفہ مجاز مولانا قاضی مظہر حسین صاحب
نے پورا کا تحریک چلا رکھی ہے غرضیکہ علماء دیوبند نے پاک و ہند میں تحریک
مدح صحابہؓ میں زبردست کام کیا۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

بقیہ از صفحہ ٦٤٤

ایسے علماء کرام کی خدمات حاصل کیں جن کی خطابت و علمی صلاحیتوں نے
اس محاذ پر خاصی گہما گہمی پیدا کی۔ حضرت مولانا لال حسین صاحب اختر مرحوم
(جو بعد میں تحفظ ختم نبوت میں شامل ہو گئے) شہید فی سبیل اللہ حضرت
قاری لطف اللہ صاحب جالندھری مرحوم، مولانا علامہ دوست محمد قریشی
مرحوم اور مولانا خالد محمود صاحب جیسے مشاہیر علماء کرام کی خدمات ناقابل
فراموش ہیں۔

تاسف کہ سردار بیانی مرحوم کے ذوق و جذبہ کے مطابق کام پورا
نہ ہو سکا اور سردار صاحب دل گرفتہ اس دار فانی سے عالم جاودانی کو چل
بسے۔ تاہم تحفظ ناموس صحابہؓ کی یہ قندیل روشن رہی اور اس مشن پر تبلیغی
لحاظ سے کئی ناموں سے جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ مگر اس پلیٹ فارم پر عملی اور
تنظیمی طور پر کام کے جو تقاضے ہیں وہ تا ہنوز تشنۂ تکمیل ہیں۔ مجلس تحفظ
حقوق اہلسنت والجماعت پاکستان انہیں تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے
ایک مخلص جدوجہد کا آغاز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے اکابر کا سا جذبۂ
اخلاص اور حق و صداقت کی راہ میں استقامت سے نوازے (آمین)

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا

دارُالعلوم اور تجوید و قرأت

اظہار احمد تھانوی

علوم تجوید و قرأت، قرآن مجید کے لب و لہجہ اور طرز ادا کی حفاظت کرنے والے علوم ہیں، فتوحات اسلامی کا دائرہ وسیع ہوا اور عرب و عجم کا اختلاط ہوا تو عربیت کے خالص اور صاف ستھرے لب و لہجہ میں تنوع اور اور گوناگوں نقائص پیدا ہونے لگے، لغت عرب کے ماہرین متوجہ ہوئے تو ابوالاسود دؤلی، خلیل بن احمد فراہیدی، سیبویہ، اخفش، فراء اور جرمی وغیرہم نے محسوس کیا کہ صرف، نحو، لغت، عربی حرفوں کے مخارج، صفات لازمہ، صفات عارضہ اور ادغام و اظہار وغیرہ پر ایسی مکمل اور جامع تشریح اور اصول و ضوابط کی بنیاد رکھی جائے کہ عجم کے اختلاط سے عرب کی فصاحت و طرز ادا کسی حالت میں بھی مجروح نہ ہو، چنانچہ مذکورہ عنوانات پر مبسوط کتابیں تحریر ہوئیں اور انہیں مبارک مساعی کا نتیجہ ہے کہ آج فن ادا متفق علیہ اصولوں سے عبارت ہے اور اداء القرآن میں صحیح اور غلط لب و لہجہ کے امتیاز میں کوئی مشکل راہ حائل نہیں۔

تجوید جزء ہے یعنی عمدہ ادائیگی، متقدمین کے یہاں تجوید کے علم پر علیحدہ تصانیف کا رواج نہ تھا بلکہ تجوید علم الصرف کا ایک نہایت ضروری باب تھا جس کے بغیر علم الصرف ہرگز مکمل نہ تھا۔ متاخرین نے البتہ اس فن پر مستقل قدم اٹھائے اور مبسوط کتابیں لکھیں، چنانچہ الرعایۃ محمد بن مکی کی تالیف اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جو چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی

علم قرأت الفاظ وحی کے اس اختلافی طرز ادا کو کہتے ہیں جو کلمات قرآنیہ میں منجانب اللہ سات قراءتوں کی حد تک اختلاف طرز تکلم نقل فرمایا گیا۔

یہ ایک جداگانہ فن ہے، قرأت کے ائمہ مشہور ہیں اور اس فن پر ہر دور میں مبسوط و مختصر کتابوں کے انبار تصنیف ہوئے ہیں، اس فن کے محقق اور دور آخر کے مسلمہ خاتمۂ فن علامہ محمد بن محمد جزری (م ۸۳۳ھ) ہوئے ہیں۔

یہ ہے علم تجوید اور علم قرأت کی مختصر تاریخی حیثیت جس سے ان کو درسیات کے ایک اہم شعبے کی حیثیت سے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

دارالعلوم دیوبند تمام علوم اسلامی کی مرکزی درسگاہ کی حیثیت میں قائم ہوا، تجوید و قرأت کے پہلے استاد حضرت قاری عبدالوحید مرحوم تھے، حضرت قاری محمد طیب صاحب مدظلہم العالی کے چھوٹے بھائی مولانا قاری محمد طاہر مرحوم حضرت قاری صاحب ہی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔

حضرت قاری عبدالوحید صاحبؒ تجوید و قرأت کے ممتاز و ماہر شیخ القرأت تھے حسب دستور دارالعلوم کے طلبہ کو حفاظ اور حفاظ کو ایک ماہر استاد فن کے رنگ میں باکمال بنا دیتے تھے ان کی تصانیف میں ہدیۃ الوحید تجوید کے فن کی مبسوط مکمل اور جامع کتاب شمار کی جاتی ہے بعد کے مختلف رسائل تجوید جو برصغیر میں تصنیف ہوئے۔ کم و بیش سب میں مسائل کی صحت و ثقاہت کے لئے

نہ ہو ... ہوتا ہو، یہ شرف کہ استاذ الکل حضرت حافظ قاری مقری عبداللہ صاحب کی ... فن قرأت کے پہلے ... میں سے ہوئے ہیں مکہ معظمہ اور ... ہند و پاکستان کے شہرہ آفاق اساتذہ قریباً سبھی ان کے خوشہ چین ہیں، حضرت قاری عبدالوحید صاحب بھی ان ممتاز مستفیدین میں سے ہیں جنہوں نے قاری عبدالرحمن مرحوم سے استفادہ کیا۔ یہ درسگاہ الہ آباد میں تھی، حضرت قاری عبدالرحمن صاحب الہ آبادی مکہ سے واپس ہندوستان تشریف لائے اور مسند تدریس سنبھالی، الہ آباد میں احیاء العلوم کے نام سے یہ درسگاہ تھی جناب اشرف ... تو بجا ہے کہ اس شان کی اور کسی مسند تدریس و قرأت کے سلسلہ میں پورے ہندوستان میں حاصل نہ تھی جو احیاء العلوم کی اس مسند کو تھی، بڑے ماہر قراء و معاصرین کا سلسلہ حضرت قاری عبدالرحمن تک ہی پہنچتا ہے۔ بہرحال قاری عبدالوحید صاحب استاد شعبۂ تجوید و قرأت دارالعلوم دیوبند ان مایہ ناز فاضلین میں سے تھے جو احیاء العلوم الہ آباد کے اولین و سابقین میں ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند کی عظیم درسگاہ کے لئے ایک ایسے ہی ماہر و جامع فن استاد کی ضرورت تھی، عبارت ادا کا یہ عالم تھا کہ قاری عبدالوحید صاحب کی تلاوت تمام علماء و شیدا سن کر ایک چاشنی اور حلاوت محسوس کرتے، قاری صاحب مرحوم سے استفادہ کرنے والے سینکڑوں جید علماء و حفاظ ہوئے بلکہ یوں کہیے کہ حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری کے اکثر تلامذہ کو حضرت قاری صاحب سے استفادہ کا فخر حاصل ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ کی تفصیل اسی نمبر میں مزید آپ کو کسی مضمون میں ملے گی۔

دوسرے بزرگ استاد تجوید و قرأت کا حضرت قاری عبدالوحید صاحب کے بعد دارالعلوم کے شعبۂ تجوید و قرأت کی مسند صدارت پر فائز ہوئے حضرت قاری حفظ الرحمن صاحب رحمہ اللہ تھے، راقم الحروف نے ان کی تلاوت خوب سنی ہے، نہایت عمدہ پڑھتے تھے اور ادا بہت عمدہ تھی، لہجہ پر خوب عبور تھا اور مزید عطیۂ قدرت آواز بہت پرکشش تھی، حضرت قاری حفظ الرحمن صاحب کافی لمبی مدت دارالعلوم سے وابستہ رہے اور ان سے ہزاروں حضرات نے کلی یا جزوی طور پر استفادہ کیا تا آنکہ دارالعلوم سے وابستگی کے دور ہی میں انتقال فرمایا رحمہ اللہ، مرحوم بھی حضرت قاری عبدالرحمن صاحب الہ آبادی کے مستفیدین میں سے تھے فن کی تحصیل و تکمیل الہ آباد ہی میں فرمائی۔ حضرت قاری عبدالرحمن صاحب شاہی مزاج کے آدمی تھے جب طبیعت حاضر ہوتی پڑھاتے جب نہ ہوتی گھر پر ہی گوشہ کش رہ کر اپنے مطالعہ میں مشغول رہتے ان کے یہاں استفادہ کرنے والے بڑے ذہنی عزم و استقلال کے مالک ہونے ضروری تھے جو برسوں ان کے در استفادہ سے وابستہ پڑے رہتے تھے، ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو۔ طالب علم واقعی طالب علم ہوتے تھے، اسباق نہ ہونے پر کسی کے ماتھے پر شکن نہ پڑتی تھی، صبر و رضا کے پیکر تھے مگر برسہا برس پڑے رہنے میں ان کی بڑی برکت ہوتی جو بھی مستفید ہو کر نکلا اپنے وقت کا شیخ ہوا۔

ہمارے شیخ حضرت قاری عبدالمالک صاحب قدس سرہٗ حضرت قاری عبدالرحمن صاحب کے بڑے بھائی حضرت قاری عبداللہ صاحب مہاجر مکی کے روایت حفص میں شاگرد تھے آٹھ سال مدرسہ صولتیہ مکہ میں حضرت استاد کے پاس حاضر رہے، یہ اور ان کے برادر بزرگ حضرت قاری عبدالخالق صاحب خطیب جامع مسجد سہارنپور نے ایسی اعلیٰ تکمیل حاصل کی کہ جید اور ماہر استاد بن کر نکلے، یہ دونوں بھائی روایت حفص آٹھ سال میں مکمل فرما کر مراجعت فرمائے ہندوستان ہوئے، دارالعلوم دیوبند کا جلسۂ تقسیم اسناد تھا اور بڑے وسیع انتظامات کے تحت ہوا تھا دور دور سے علماء اور عامۃ المسلمین شریک ہوئے حتیٰ کہ تمام شہر دیوبند میں جگہ نہ رہی جلسہ میں تقاریر سے پہلے تلاوت کا پروگرام تھا، حضرت قاری عبدالمالک صاحب اور حضرت قاری عبدالخالق صاحب دونوں کو جلسہ میں تلاوت کے لئے مدعو کیا گیا تھا دونوں بھائی عربی جبہ و عمامہ میں وارد جلسہ ہوئے اور عربی لب و لہجہ میں ایسی نفاست سے تلاوت کی کہ تمام حاضرین جلسہ دم بخود ہو گئے۔ تمام حاضر علماء کرام نے اٹھ اٹھ کر سینے لگایا، بہرحال ان دونوں بھائیوں کا ارادہ ہوا کہ الہ آباد حاضر ہو کر سبعہ و عشرہ قرأت

کو تکمیل کی جائے، خود میں مناسبت تو پہلے ہی تھی مختصر مدت میں ہی الہ آباد میں تکمیل ہو گئی، حضرت قاری عبدالرحمن صاحب نے حضرت قاری عبدالمالک صاحب کو فرمایا کہ ہمارے یہاں یہ جتنے طلباء موجود ہیں ان سب کو تم ہی مشق کراؤ۔ اس وقت کے طلباء میں حضرت قاری حفظ الرحمن صاحب وغیرہ بہت سے اصحاب تھے۔

اس طرح یہ تمام حضرات حضرت قاری عبدالمالکؒ کے شاگرد ہو گئے اس تعلق سے حضرت قاری حفظ الرحمن صاحب حضرت قاری عبدالمالکؒ کا مثل استاد کے صد احترام فرماتے، لکھنؤ سے دیوبند کسی سفر میں راستہ میں پڑتا تو بااصرار حضرت قاری صاحب کو اتار کر دارالعلوم لے جاتے، دارالحدیث میں رات کو مجلس قرأت ہوتی، سننے والے محظوظ ہوتے، حضرت قاری حفظ الرحمن بڑے متواضع اور مسکین بزرگ تھے، اپنے شاگردوں کی موجودگی میں حضرت قاری صاحبؒ کے پاؤں دباتے اور مثل ادنیٰ شاگرد کے خدمت کرتے۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ سے بیعت ہو جانے کے بعد تو حضرت قاری حفظ الرحمن کی حالت استغنا باطنی کی طرف بہت بلند ہو چکی تھی تقسیم ہند کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے کسی موقع پر قاری صاحب کی پرحلاوت تلاوت سنی تو بیحد محظوظ ہوئے مولانا ہندوستان کے مرکزی وزیر تعلیم تھے پیشکش کی کہ آل انڈیا ریڈیو سے تلاوت نشر ہوا کرے گی ۔۔۔ روپیہ ماہانہ حکومت کی طرف سے پیش خدمت ہوگا، قبول فرمالیجئے، قاری صاحب نے معذرت کر لی، میں طالب علم ہوں درسگاہ میں بیٹھ کر پڑھتے پڑھاتے ہی میں زندگی گذاری ہے، یہاں سے نہیں اٹھ سکتا۔

تھانہ بھون میں حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے مخلص خدام میں ایک بزرگ قاری شاہ محمد صاحب ہوا کرتے تھے، حضرت علیہ الرحمہ کے سر میں تیل کی مالش کی خدمت انہیں کے سپرد تھی، نیک، پارسا بزرگ تھے خانقاہ کی مسجد میں نماز بھی پڑھایا کرتے تھے، آواز بڑی پرکشش تھی، راقم الحروف اتفاقیہ دیوبند حاضر ہوا، حضرت قاری حفظ الرحمن صاحب کی خدمت میں حاضری ہوئی تعارف کے بعد فرمایا کہ خانقاہ اشرفیہ میں قاری شاہ محمد صاحب کو [illegible] کرنا، میں نے عرض کیا حضرت! یہ قاری شاہ محمد صاحب کہاں [illegible] ہیں فرمایا ہمارے ساتھی ہیں، الہ آباد میں حضرت قاری عبدالرحمن صاحب ہی سے پڑھا ہے، میں نے عرض کی حضرت یہ مکی قاری [illegible] کسے کہتے ہیں؟ جواب: مکی قاری وہی ہے جو قرآن شریف [illegible] عمدہ پڑھ سکے، یہ کمال اکثر حاصل ہوا مکہ والوں کو [illegible] سب حضرت قاری عبدالرحمن صاحب مکی کی درسگاہ بڑی پر برکات درسگاہ تھی، اس درسگاہ سے تعلق رکھنے والے سبھی قاری تھے حتی کہ وہاں کے [illegible] ماشکی بھی قاری تھے، وہ بھی قرآن شریف پڑھنے کی مشق کرتے تھے، اس سے پتہ احساس ہوا کہ بابرکات ہستیاں کیسی ہوتی ہیں، آج ہم پڑھاتے ہیں مگر کسی کو نہیں بنا سکتے ایک وہ تھے کہ جو طالب علم نہیں تھے انہیں بھی قاری بنا [illegible] ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

متحدہ ہندوستان میں تجوید و قرأت کی دو درسگاہیں تھیں ایک دارالعلوم دیوبند، دوسرے مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ تیسرے پانی پت اول الذکر یعنی دارالعلوم دیوبند کو یہ امتیازی حیثیت حاصل رہی کہ وہاں تجوید و قرأت کے فنون سے علماء کو حریص کیا گیا، علوم عربیہ سے منسلک ہر قسم کے طلباء عربیہ کے لئے تجوید کے شعبہ میں استفادہ لازم رہا کیونکہ دارالعلوم میں پیشتر تجوید میں استفادہ لازم رہا ہے، چنانچہ حضرت قاری عبدالوحید صاحب رحمہ اللہ سے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم اور ان کے ہم عصر بزرگوں کے علاوہ نے تجوید میں استفادہ کیا اور حضرت خاں صاحب مرحوم کے بعد قاری حفظ الرحمن صاحب رحمہ اللہ سے استفادہ کرنے والوں میں حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی مدظلہ، جناب قاری عبدالعزیز شوقی اناوی رحمہ اللہ اور قاری ناہر قاسمی و دیگر ہم عصروں کے نام آتے ہیں، حضرت قاری عبدالخالق صاحبؒ مکی ہوتے تھے۔

پانی پت میں تجوید و قرأت پر علمی و تصنیفی کام [illegible]

[illegible] قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی فن قرأت کے امام تھے [illegible] پانی پت کے قاری عبدالسلام صاحب پانی پتی [illegible] کتاب [illegible] کاش قراء پانی پت اس کو پاکستان [illegible] کے شائقین فن پر احسان فرمائیں، معاصرین میں حضرت مولانا قاری شیخ محمد صاحب مد ظلہم قراء پانی پت کے تمام مخزن فن پر بہترین کتابوں کے مؤلف [illegible] ہیں۔ ان کے شاگرد جناب قاری رحیم بخش مد ظلہ، استاذ خیر المدارس کا وجود بھی دنیائے تجوید و قرأت میں بلا مشتبہ ہے، موصوف نے بڑا زبردست علمی کام کیا ہے۔ استاذ صاحب مد ظلہم کی طرح مدرسے والوں کو علوم تجوید و قرات سے خوب بھاری بھرکم کر دیا ہے۔ پانی پت میں اس تمام کام پر مستزاد وہاں حفظ کلام اللہ کا چرچا تھا نہایت جید اور عمدہ حفاظ کی ملا ملا مروج طغر مروج ہوتی تھی رمضان شریف میں ہر مسجد پانی پت میں پڑھنے والے حافظوں سے پر رونق ہوتی خصوصاً خیر عشرہ میں تو تمام راتیں عورتوں سے زندہ رہتی تھیں، حفظ قرآن مجید کا شغل جوانوں سے کر عورتوں میں بھی تھا، شرفاء کے گھرانوں میں بچیوں کو حفظ کرانے کا رواج [illegible] چلا آ رہا ہے ان کی مستورات میں مسلم گھرانوں میں دینداری قابل رشک تھی، کاندھلہ، تھانہ بھون، دیوبند اور پانی پت، پانی پت میں حافظ عورتوں کی وجہ سے اس کا چرچا بھاری تھا، کاندھلہ میں دینیات اور عربی کی عالم زیادہ تھیں۔

مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ تجوید و قرأت کا برصغیر میں سب سے مثالی ادارہ تھا، اس ادارہ کو بہرحال اللہ تعالیٰ نے عروج و ترقی سے مالا مال کیا تھا، اس ادارہ کے بانی حضرت مولانا عین القضاۃ صاحب مجددی قادری نقشبندی تھے جو اپنے وقت کے مرتاض قائم اللیل، صائم النہار عابد و زاہد بزرگ تھے، اپنی ذات کے لئے حضرت مرحوم نے کبھی کچھ نہیں کیا، غیر شادی زندگی گزاری، موٹے کاٹنے کے کپڑے زیب تن فرماتے، اکثر اوقات تنہائی و عبادت میں گزرتے، بڑے بڑے رؤسا اور متمول لوگ گھنٹوں دروازے پر ملاقات کی اجازت کے منتظر رہتے، مدرسہ عالیہ فرقانیہ بہت بڑا ادارہ تھا سینکڑوں طلباء اور درجنوں اساتذہ تھے۔ اس تمام خرچ کے واحد کفیل حضرت مولانا عین القضاۃ ہی تھے، ادارہ کا نہ کوئی باقاعدہ چندہ تھا، نہ سفیر جاتے تھے، نہ کسی امیر کی داد و دہش پر نظر، یہ راز پوشیدہ رہتا کہ حضرت موصوف کے پاس اتنے بڑے ادارے کے اخراجات کہاں سے آ رہے ہیں۔

ادارہ میں دیگر علوم مروجہ کے علاوہ بڑا اور بنیادی کام تجوید و قرأت کی تعلیم تھی جو ماہر اساتذہ مدرسین کا کام انجام دے رہے تھے حضرت قاری عبدالمالک صاحب رحمۃ اللہ علیہ کم و بیش پچیس سال پڑھاتے رہے جو اپنے وقت کے امام تھے، فن دوا فن قرأت کے ساتھ ان کو عربی لہجوں میں کمال مہارت حاصل تھی۔ موصوف کے علاوہ مولانا قاری نذر محمد صاحب، قاری محمد صدیق صاحب اور قاری عبدالمعبود صاحب، قاری ضیاء الدین صاحب سب کے سب یگانۂ روزگار تھے، یہ سب ہستیاں دار رحمت کی طرف منتقل ہو چکی ہیں اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے۔

فرقانیہ لکھنؤ میں خوش گلو، مد و ترتیل میں بے مثال خوبصورت آوازوں میں پڑھنے والے جس کثرت سے پیدا ہوئے پورے متحدہ ہندوستان کے لئے تاریخ میں سرمایۂ فخر ہیں۔ ان جوان قاریوں کے ہجوم تھے ایک سے ایک بڑھ کر عمدہ پڑھنے والے، پڑھتے تو بارش نور برستی، سننے والوں کے ٹھٹ لگ جاتے ہر سال بہت بڑی تعداد فارغین و کاملین کی ہوتی۔ حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب مکی الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ ممتحن ہوتے تھے۔

بہرحال دارالعلوم دیوبند اگر علوم دینیہ کی یونیورسٹی تھی تو فرقانیہ لکھنؤ اور مدارس پانی پت اس کے ساتھ ملحقہ کالج تھے۔ یہ سب علماء دیوبند ہی کی سرپرستیاں تھیں کہ جہاں عربی ادب فقہ حدیث اور تفسیر کی پورے برصغیر میں چہل پہل تھی، حفظ تجوید اور قرأت کی بھی زبردست گرم بازاری ہوئی۔

استاذنا حضرت قاری عبدالمالک صاحب نور اللہ مرقدہ علماء و قراء کے مخدوم و محترم تھے، حضرت مولانا تھانوی کے تجوید میں استاد بھائی تھے یعنی دونوں حضرات نے حضرت استاذ القراء قاری عبداللہ مہاجر مکی سے روایت حفص کی تکمیل کی۔ حضرت تھانوی کا رسالہ جمال القرآن منجانب اللہ مقبول خلائق ہوا

اس وقت پاک و ہند کے مدارس تجوید میں یہ رسالہ شریفہ داخل نصاب ہے اسی طرح فوائد مکیہ تصنیف حضرت قاری عبدالرحمن صاحب کی جو نصاب تجوید میں داخل ہے کا حاشیہ تعلیقات مالکیہ از حضرت قاری عبدالمالک صاحب رحمہ اللہ کر بے نظیر حاشیہ مانا گیا ہے۔ استاذنا حضرت قاری صاحب بزرگان دین کا ہمیشہ بے حد احترام فرماتے اور ان کی دعاؤں کو مغتنم جانتے۔ لاہور میں تشریف آوری پہلی تو حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت قاری صاحب کا یہاں تشریف لانا مسلمانان پاکستان کے لیے عموماً اور مسلمانان لاہور کے لیے خصوصاً خداوند تعالیٰ کی خاص رحمت ہے۔ واقعی حضرت کا وجود رحمت ثابت ہوا آج پاکستان میں جو جا بجا پڑھنے پڑھانے کے مرکز نظر آ رہے ہیں انہیں حضرت کا ہی بالواسطہ یا بلاواسطہ فیض کام کر رہا ہے ورنہ قاری خال خال ہی ہوتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند سے منسلک ان قراء کرام کے حالات و کارناموں کے لیے ایک دفتر چاہیے، تصنیفی میدان میں ان حضرات نے وہ کام کیا کہ شاید دنیا میں کسی ملک میں اتنا عظیم الشان کام نہ ہوا ہو: جمال القرآن، تجوید القرآن منظوم تنشیط الطبع فی اجراء السبع، لمولانا التھانوی، فوائد مکیہ، شرح عقیلہ رسم عثمانی میں از قاری عبدالرحمن صاحب کی، ہدیۃ الوحید از قاری عبدالوحید صاحب حاشیہ بر فوائد مکیہ، حاشیہ بر شاطبیہ از حضرت قاری عبدالمالک صاحب، حاشیہ بر جمال القرآن و حاشیہ بر فوائد مکیہ از حضرت قاری حفظ الرحمن صاحب، حاشیہ بر فوائد مکیہ از قاری محب الدین الہ آبادی، حاشیہ بر فوائد مکیہ از حضرت قاری محمد سعید مفتی مظاہر علوم سہارنپور، حاشیہ بر فوائد مکیہ، شرح جزری، معلم التجوید، زینۃ القرآن و رسالہ در تشریح حرف ضاد، از قاری محمد شریف صاحب مدظلہ، معلوم التجوید از قاری حبیب اللہ صاحب کراچی، تیسیر التجوید از حضرت قاری عبدالخالق صاحب سہارنپوری تنزیل الطبع فی اجراء السبع از قاری تاج محمد صاحب عبدالحکیم ضلع ملتان، تسہیل البیان فی رسم القرآن، از قاری نذر محمد صاحب لکھنوی، ضوابط منور التجوید از قاری عبدالمعبود صاحب لکھنؤ، شرح شاطبیہ از قاری محمد سلیمان صاحب مظاہر علوم سہارنپور، شرح شاطبیہ ... بر کتب از قاری ... بر کتب مختلف ... شرح شاطبیہ ... شرح ... شرح ... از مولانا قاری فتح محمد صاحب ... تیسیر ... ترجمہ ... رسم ... کتب بر روایات و قراءات از قاری رحیم بخش صاحب پانی پتی وغیرہ، تصنیف کی دنیا پر یہ حضرات ایک طائرانہ نظر ہے۔ تفصیل تذکرہ کی اس محدود مضمون میں گنجائش نہیں، التماس ہے کہ ناظرین ان اکابر کے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔

نظر پڑی جو کہیں بارگاہِ سلطانی
دماغِ معدلت نے کہا لا الٰہ الا اللہ

مولانا [illegible] سعید الرحمٰن علوی
مدیر ہفت روزہ خدام الدین لاہور

دارالعلوم دیوبند کا
پہلا طالب علم

" محمد میاں منصور انصاری حضرت مولانا بھی کہا جاتا ہے، ریشمی خطوط کا مکتوب الیہ مدرسہ اسلامیہ دیوبند کے مدرس، پارسائی اور تقدس کے لیے مشہور، ان کے مرید جن میں سرکردہ مسلمان بھی ہیں، ہندوستان بھر میں ہیں۔ جیسا کہ مولانا سندھی کے زیر اثر آنے سے ان کے خیالات تبدیل ہوئے، دیوبند میں ان کا مکان اتحاد اسلامی کے سازشیوں کا گڑھ تھا۔ اس شخص نے سیف الرحمٰن، فضل الٰہی، فضل محمود وغیرہ کو سرحدی قبائلیوں کو جہاد پر ابھارنے کے واسطے بھیجا۔ ایس ایس اکبر جہاز کے ذریعہ وہ خود بھی تیرہ معروف اشخاص کے ساتھ ۱۸ ستمبر ۱۹۱۶ء کو ہجرت کر کے عرب کو روانہ ہو گیا۔ عرب میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے [illegible] اس بات کی کوشش کی کہ ہندوستان میں جہاد کے مقصد کے لیے حکومت ترکی کی ہمدردیاں حاصل کریں۔ انور پاشا، جمال پاشا اور غالب پاشا سے ملاقاتیں کیں اپیلیں حاصل کیں۔ جن میں سے ایک فرمان محمد میاں عرف مولوی منصور کے ذریعہ ہندوستان اور آزاد علاقہ کے سازشیوں کو دکھائے جانے کے بعد کابل پہنچا دیا گیا۔

ہندوستان میں اتحاد اسلامی کی سازش میں مولانا کی رہنمایانہ حیثیت شخصیت بڑی سرکردہ ہے۔ جنود ربانیہ (حضرت شیخ الہندؒ کی فوج) کی فہرست میں وہ جنرل ہیں۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۱۶ء کو شریف مکہ کے حکام سے ان کو گرفتار کر لیا گیا اور جدہ بھیج دیا گیا۔ جہاں سے انہیں ۱۹ جنوری ۱۹۱۷ء کو مصر روانہ کر دیا گیا۔"

تحریک شیخ الہند رحمہ اللہ صفحہ ۲۲۲-۲۲۳

یہ اقتباس "تحریک شیخ الہندؒ" نامی کتاب کا ہے جو بر صغیر کے نامور مصنف حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی قدس سرہ کی آخری کتاب ہے۔ اصل میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے خلف الرشید مولانا اسعد مدنی مدظلہم نے حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ کی تحریک کے سلسلہ میں انگریزی سی آئی ڈی کے محفوظ ریکارڈ کو انڈیا آفس لندن سے حاصل کیا، جس کا ترجمہ الجمعیۃ دہلی کے ایڈیٹر صاحب نے کیا۔ بعد میں مولانا سید محمد میاںؒ نے اس ترجمہ کو مرتب فرمایا اور مفید اور معلوماتی حواشی کا اضافہ کر کے اس کا طویل مقدمہ جو تعارف پر مشتمل ہے ارقام فرمایا اور انگریز سی آئی ڈی کے حقیقت ناشناسوں نے جو غلط کہانیاں گھڑیں ان کی اصلاح فرمائی۔

ہم نے درج بالا اقتباس کو اپنے مضمون کا ابتدائیہ بنایا ہے، جس میں حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی زندگی کا خلاصہ اور نچوڑ آ گیا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ جو آج دنیا میں اس عجیب و غریب نام سے متعارف ہیں، یوپی کے مردم خیز خطہ دوآبہ کی اس بستی کے فرزند ہیں جو آج بر صغیر میں دارالعلوم کی نسبت سے پوری دنیا میں متعارف ہے۔

تاریخ نگار حضرات کی تحقیق کے مطابق اس قصبہ میں شیوخ، بکثرت آباد

محدث اکبر شیخ العلماء اور یہ کردار! یہ نصیب اللہ اکبر
وسعت کی جو سب سے۔ طلباء کی ضروریات کا خود انتظام کرنا، حتیٰ کہ گھر سے چیزیں
اپنے سر پر اٹھا کر لانا اور انہیں بیماروں کی جائز خواہشات کا احترام جیسے انہیں
تیز کھلوایا، آپ کی خصوصیات تھیں

بے نفسی کا یہ عالم کہ جامع العلوم کانپور کے مدرسہ میں تقریر ہو رہی ہے
ہیں ٹھاٹھیں مارتا ہوا مجمع اور مضمون کی روانی جوبن پر لیکن جونہی ایک صاحب پر
نظر پڑی جو مسائل میں اختلاف کرتے تو وعظ ختم کر دیا، احباب نے کہا اب تو
وقت تھا فرمایا اسی سے تو ختم کر دیا۔ (حیات شیخ الہندؒ)

یہ داستان تو اتنی طویل ہے کہ ایک مفصل مقالہ اس پر
لکھا جا سکتا ہے، مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ:

انہیں دیکھ کر صحابہ کرام یاد آجاتے

حضرت شیخ الہند کے جہاں باقی کمالات ہیں، وہاں آپ کا عظیم
کارنامہ انگریز راج کے خلاف منظم جدوجہد ہے جس میں تحریک ریشمی رومال
سب سے زیادہ اہم واقعہ ہے۔

الرشید کے اس عظیم نمبر کی مضامین یہ باتیں آچکی ہوں گی اسلئے
ہم تسلسل قائم رکھنے کے لئے اشارات کریں گے۔

یہ گزرا کہ آپ ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے ۱۸۵۷ء میں تحریک حریت نے
پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیا آپ کی عمر ۶ برس تھی، ذی فہم اور ذی شعور
بچے اتنی عمر میں حالات سے بے خبر نہیں ہوتے پھر آپ کا تعلق جن لوگوں سے علمی
اعتبار سے تھا وہ اس تحریک کا ہراول دستہ تھے، آپ نے ظلم و جبر کی
داستانیں سنی تھیں دیکھی بھی تھیں اور اساتذہ سے جو کچھ سنا اس نے ذہن
کی ساخت بنا دی کہ کوئی لمحہ چین سے نہ بیٹھے۔

دارالعلوم دیوبند بظاہر ایک تعلیمی تحریک تھی لیکن درحقیقت
اس کا مقصد صحیح ذہن سازی تھی تاکہ رجال کار تیار ہو سکیں اور ملک کو آزاد کرایا
جا سکے۔ شیخ الہند کے شیوخ اور اساتذہ مصائب و آلام کی دنیا سے گزر
چکے تھے، گزر رہے تھے ان حالات نے آپ کے قلب حساس کو متاثر کیا
اس کے ساتھ ہی برطانیہ کی وہ انسانیت سوز حرکات جن کا مظاہرہ بلقان وغیرہ
میں ہو رہا تھا اس سے آپ بے خبر نہ تھے۔ یہ صورت حال خلافت عثمانیہ کے خلاف
ایک خطرناک سازش تھی اور آپ اس موقع پر خاموش نہیں رہ سکتے تھے
کیونکہ خلافت ترکوں کی نہیں پوری ملت کی میراث تھی اور اس کا ضیاع ملت
کا عظیم نقصان تھا۔

۱۹۰۹ء میں پرانے خدام اور شاگردوں کو دیوبند میں جمع کر کے
جمعیۃ الانصار کی بنا ڈالی، نام سے کام کا اندازہ ہوتا ہے، آپ کے ذہن رسا
نے اس مقصد کے لئے مولانا سندھی کو نامزد کیا اور انجمن ان کے
سپرد کی۔

یہ انجمن محض طلباء قدیم (اولڈ بوائز) کی انجمن نہ تھی بلکہ اس کا
ایک بہت بڑی تحریک سے تعلق تھا جس کا دائرہ اثر مختلف اسلامی
ممالک میں پھیلا ہوا تھا۔ اپریل ۱۹۱۱ء کے وسط میں اس جمعیت کا عظیم الشان
اجتماع ہوا، یہاں اغراض و مقاصد کا اعلان ہوا۔

سرپرستان مدرسہ دیوبند کے دست و بازو بن کر کام کرنا۔
مدرسہ کے اغراض و مقاصد کی ترویج و اشاعت۔

تقسیم کار کا ایک نظام قائم ہوا پانچ شعبے تکمیل التعلیم، نظام التعلیم
الارشاد، التالیف والاشاعت اور جلسہ علمیہ قرار پائے پہلے شعبہ میں
حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ اور مولانا نانوتوی قدس سرہم کی
کتابوں کی تعلیم پیش نظر تھی اور بعض دوسرے علوم بھی شامل تھے۔

دوسرے شعبہ میں دیوبند کے طرز کے مدارس دیوبند کی نگرانی
میں، گویا نظام کو پھیلانا مقصود تھا۔

باقی شعبوں کا تعلق بھی دین کی نشر و اشاعت سے تھا۔
اس اجلاس میں بعض تجاویز سامنے آئیں جن کا خلاصہ یہ ہے۔

- انگریزی جامعات میں مسلم طلبہ کی معقول تعلیم کا اہتمام
- انگریزی مدارس کے طلبہ کے لئے جمعیتہ کے وظائف کا اجراء۔
- عرب طلبہ کے لئے اسکالرشپ
- مدرسہ دیوبند میں مخالفین کے اعتراضات کے جوابات کی تیاری۔
- تنظیم مساجد اور علماء کا اہتمام
- قرآن شریف اور کتابوں کی اشاعت بصورت تجارت۔
- ہلکا پھلکا لٹریچر وسیع پیمانے پر پھیلانا۔

برطانوی حکومت جو شکاری کتے کی طرح شکار سونگھنے کی عادی تھی اسے خطرات محسوس کئے اور فوراً صدر جلسہ مولانا احمد حسن محدث سے پوچھ گچھ کی گئی جبکہ مرد غیور شیخ الہند کی آمدنی پر ٹیکس لگا دیا۔

اس بوکھلاہٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسہ والے گھبرا گئے لیکن شیخ الہند نے مدرسہ کے تحفظ کی خاطر مولانا سندھی کو دہلی بھیج دیا، وہاں نظارۃ المعارف کی بنیاد رکھی جس کا مقصد ایک طرف قدیم و جدید کا آپس میں ملاپ تھا تو دوسری طرف مخصوص افراد کی تیاری۔

حضرت شیخ الہند مسلمان قوم کی باہمی لڑائی سے سخت پریشان رہتے۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ سلسلہ ختم ہو، تجویز جو سوچی وہ یہ تھی کہ باہمی ملاپ علمی اور فکری بنیادوں پر ہو، اس کیلئے نظارۃ المعارف میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، نواب وقار الملک جیسے لوگ موجود تھے جو جدید دنیا کے نمائندہ تھے۔ بعد میں انصاری صاحب قبلہ نے ہی مولانا آزاد اور مولانا محمد علی جوہر سے مولانا سندھی کو ملا دیا۔

اس کے ساتھ ۱۹۱۰ء میں دیوبند کا عظیم الشان جلسہ دستار بندی ہوا جس میں علی گڑھ کے وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب بلائے گئے، طلبہ کے تبادلہ کی تجویز منظور ہوئی لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی کیونکہ سرسید احمد خاں کی سوچ کے مطابق طلبہ مخصوص رنگ میں رنگے جا چکے تھے

اس کے بعد بھی مختلف مواقع پر حضرت شیخ الہند نے اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ کی ایک جماعت ٹوٹ کر شیخ الہند کے ساتھ آ ملی جس میں مولانا محمد علی جوہر جیسے لوگ موجود تھے جو شیخ الہند کے اتنے عاشق زار تھے کہ ان کی وفات پر رو رو کر فرماتے :

کہ مولانا کی وفات نے ہماری کمر توڑ دی

اور مالٹے سے واپسی پر حضرت شیخ الہند علی گڑھ کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے، مقصد یہ تھا کہ یہ یونیورسٹی سرکار کے زیر اثر سے آزاد یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اس مرحلہ پر مصلحت بیں حضرات نے خواہش ظاہر کی کہ آپ بیماری میں نہ جائیں لیکن فرمایا :

اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو ضرور شریک ہونگا۔ رئیس الاحرار مسلمان

پالکی میں بیٹھ کر گئے خواجہ عبد المجید کی کوٹھی پر قیام کیا اگلے دن جلسہ میں شرکت فرمائی کمزوری اتنی تھی کہ چلنا مشکل، دو آدمیوں کے سہارے تشریف لائے خطبہ میں فرمایا :

"میں نے اپنی اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں، بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر الٰہی کی روشنی جھلک رہی ہے لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا ہے، خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامان حرب و ضرب کا"

مزید فرمایا :

اے نونہالانِ وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے
اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں
مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں کالجوں میں زیادہ
ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم
علی گڑھ کی جانب بڑھایا اور اس طرح ہم نے دو
تاریخی مقاموں کا رشتہ جوڑا ۔

آگے چل کر آپ نے اس الزام کی تردید کی کہ علماء جدید علوم کے مخالف ہیں البتہ جو اثرات واضح طور پر سامنے ہیں ان کی نشاندہی کی اور آزاد یونیورسٹی کے قیام کا اعلان فرمایا ۔ شامیانوں کی چھت تلے افتتاح ہوا یہی یونیورسٹی بعد میں دہلی میں جامعہ ملیہ کے نام سے بنی اور اس طرح آپ نے علی گڑھ کو گرتا بچایا ۔

درمیان میں اصل ذکر تحریک ریشمی رومال کا تھا جس کی ابتدا یوں ہوئی کہ ۱۹۰۵ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے بیرونی محاذ پر کام شروع کیا اور مولانا سندھی کو کابل بھیج دیا اس وقت پروگرام نہیں بتایا لیکن مولانا خود فرماتے ہیں کہ کابل جانے پر معلوم ہوا کہ استاد مکرم اور ان کے شیوخ کی ۵۰ سالہ محنتوں کے اثرات سامنے ہیں اب ان کو سمیٹنا ہے، وہاں مولانا سندھی نے جو کام کیا اس کا کم از کم نتیجہ برطانوی چیرہ دستیوں سے افغانستان کا چھٹکارا تھا جس کا اظہار شاہ افغانستان ظاہر شاہ نے اس وقت کیا جب قاری محمد طیب صاحب وہاں تشریف لے گئے موصوف نے واضح کیا کہ ہماری آزادی آپ کے بزرگوں کی مرہونِ منت ہے ۔

افغانستان کے استخلاص اور آزادی کا مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن بعض برخود غلط عناصر کے سبب اصل مسئلہ یعنی آزادیٔ ہند حاصل نہ ہو سکا ۔

اس داستان درد کو پڑھنا ہو تو شیخ مدنی کی نقش حیات اسیر مالٹا اور مولانا محمد میاں کی تازہ کتاب تحریک شیخ الہندؒ پڑھیں

مختصر یہ کہ مولانا سندھی کا ایک خط جو ریشمی رومال پر لکھا گیا تھا انگریزوں کے ہتھے چڑھ گیا اسی کی وجہ سے تحریک کا نام تحریک ریشمی رومال پڑ گیا حضرت شیخ الہندؒ ترکی کے زعماء سے مل کر پروگرام بنا چکے تھے لیکن قدرت کو منظور نہ تھا اس لئے آپ اپنے رفقا سمیت مکہ معظمہ میں گرفتار ہو گئے اور مالٹا جیل میں ڈال دیئے گئے جبکہ برصغیر میں بے تعداد افراد پکڑے گئے اور مختلف قسم کی سزائیں پائیں ۔

تحریک شیخ الہندؒ کے اردو ایڈیشن کے مطابق متعلقہ لوگوں کی تعداد ۲۲۲ ہے ۔ جن کا ریکارڈ انڈیا آفس لندن میں ہے ان میں خلیفہ ترکی سلطان ایران اور امیر کابل مربی ہیں جبکہ انور پاشا، ولی عہد دولت عثمانیہ، وزیراعظم دولت عثمانیہ عباس علی، شریف مکہ، ابتدا میں، نائب سلطنت کابل، معین سلطنت کابل، نظام حیدرآباد، والیٔ بھوپال، نواب رام پور اور نظام بہاولپور مرکزی شخصیتیں تھیں ۔

فوجی لشکر جس کا نام جنود ربانیہ تھا کے سالار اعلیٰ حضرت شیخ جبکہ قائم مقام سالار مولانا سندھی، نائب سالاروں میں مولانا دین پوری، حضرت امروٹیؒ، حضرت مدنی، حاجی صاحب ترنگ زئی، ڈاکٹر انصاری ان کے بھائی حکیم عبدالرزاق، مُلا بابڑا، مُلا کوہستانی، جان باجوڑ، مولانا منصور انصاری، مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان جیسے لوگ شامل ہیں ۔ ان حضرات کو لیفٹیننٹ جنرل لکھا گیا ہے ۔

معین سالار یعنی میجر جنرل ۱۵ حضرات ہیں ان میں علامہ سید سلیمان ندوی، کاظم جادہ، مولانا محمد علی قصوری وغیرہ کے نام ہیں

کرنل حضرات کی فہرست میں ۴۴ کے قریب حضرات سے نام ہیں حضرت لاہوری، مولانا محمد صادق کراچی، مولانا عزیر گل، خواجہ عبدالحیٔ فاروقی ۔ مولانا فضل ربی ماہی زمرہ میں شامل ہیں ۔

ان کے ترتیب شدہ نقشہ جنگ اسی طرح کا تجزیہ اور کتابت وغیرہ علیحدہ
فہرست ہے۔

ان میں سے ہر ایک کا اصلاً (فوٹو کاپی) مع مشاہرہ جات اور دوسرے
اخراجات کی تفصیل تحریک شیخ الہند میں منقول ہے جسے طوالت کے
خوف سے چھوڑ رہا ہوں۔ (سن شاہ غلام جی)

مولانا سندھی نے کابل میں حکومت موقتہ بھی قائم فرمائی جس کا ذکرہ
رولٹ ایکٹ کمیٹی وغیرہ میں ہے اور خود ان کی ذاتی ڈائری کے علاوہ اس
سلسلہ کی دوسری کتابوں میں تفصیل سے درج ہے۔ اس حکومت میں راجہ
مہندر پرتاپ، مولانا برکت اللہ بھوپالی وغیرہ شامل تھے گویا یہ آزاد حکومت
تھی لیکن بدقسمتی سے بعض حضرات آڑے آئے مولانا سندھی کی چٹھی کا راز
افشا ہو گیا بات گرفتاری تک پہنچی اور پھر حضرت شیخ الہندؒ طویل عرصہ کے بعد
باہر سے تو عمر عزیز بیت چکی تھی اور چل چلاؤ کا دور تھا تاہم آپ واپس
آکر ۱۲ مارچ سنہ کو مالٹا سے روانگی راستہ کی منزلیں طے کر کے جون
سنہ میں بمبئی اترے، چین سے نہیں بیٹھے یہ مختصر مدت یعنی جون سے ۳۰ نومبر
سنہ یوم وفات تک اس طرح گزاری کہ اسی میں علی گڑھ تشریف لے گئے
جس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ جہاں آباد، مراد آباد، امروہہ، کلکتہ اور بجنور جانا
ہوا اور آخری پڑاؤ دہلی ڈاکٹر انصاری صاحب کا مکان تھا جہاں
وفات ہوئی۔

مالٹا سے واپسی پر عظیم الشان استقبال ہوئے، گاندھی جی ابوالکلام جیسے
لیڈر موجود تھے جلسہ خلافت نے شیخ الہند کا خطاب تجویز کیا جو نام کا
جزو اعظم بن گیا۔

مالٹا سے واپسی پر دو اہم کام ہوئے نیشنل یونیورسٹی علی گڑھ کا
افتتاح جس کے جانشین کے طور پر جامعہ ملیہ دہلی آج بھی موجود ہے، اور
دوسرا جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے اجلاس منعقدہ ۸، ۹، ۱۰ ربیع الاول
۱۳۳۹ھ بمقام دہلی کی صدارت۔

گزشتہ سال یعنی ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں جمعیۃ کا پلیٹ فارم بن
چکا تھا کیونکہ بدلے ہوئے حالات میں جنگ کا انداز بدلنا ضروری تھا۔ اب
عدم تشدد اور عدم تعاون کا آغاز ہوا جس کو باقاعدہ شکل اس اجلاس
میں دی گئی۔

ملک بھر کے پانصد جید علماء اس اجلاس میں موجود تھے مولانا
آزاد، مولانا عبدالباری لکھنوی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا آزاد سبحانی،
مولانا عبدالکافی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا
حبیب الرحمن عثمانی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا داؤد غزنوی رحمہم
اللہ تعالیٰ وغیرہ۔

اس اجلاس کی دوسری تجویز سب سے زیادہ اہم ہے جو گویا
آئندہ کے لیے لائن آف ایکشن کا درجہ رکھتی ہے اور جس کے مطابق آئندہ
سارا کام ہوا اس تجویز میں۔

خطابات اور اعزازی عہدے چھوڑنے۔
کونسلوں کی ممبری سے علیحدگی اور امیدواروں کے لیے
رائے نہ دینے۔
دشمنان دین کو تجارتی نفع نہ پہنچانے۔
کالجوں اسکولوں میں سرکاری امداد قبول نہ کرنے اور سرکاری یونیورسٹی
سے تعلق قائم نہ رکھنے۔
دشمنوں کی فوج میں بھرتی نہ ہونے۔
اور عدالتوں میں مقدمات نہ لے جانے
کا فیصلہ ہوا۔

ان تجاویز کے متعلق حضرت شیخ الہند کا خطبۂ صدارت اور آخر
میں ایک مفصل بیان پڑھا گیا جو جمعیۃ کیا ہے؛ نال کتابچہ میں دیکھا جاسکتا
ہے۔ اس خطبہ اور بیان میں حضرت شیخ الہندؒ نے قرآن و سنت اور
اور فقہ اسلامی کے متعدد حوالجات سے ترک موالات اور عدم تعاون

پر روشنی ڈالی اور گویا مجاہدین آزادی کے لئے ایک شاہراہ عمل متعین فرمادی جس پر چل کر بوڑھوں نے جوانوں سے زیادہ سال قربانیاں دیں تب ۱۹۴۷ء میں آزادی کا دور آیا۔

اس اجلاس کے چند دن بعد دہلی میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مکان پر بے چینی بڑھ گئی، حالت عجیب تھی، آنسو تھمتے نہ تھے، پوچھنے پر فرمایا:

خواہش تھی میدان میں مرتا جب یہ کام جاتا مگر افسوس!

یہ تھا اس مرد حق آگاہ کی زندگی کا مختصر خاکہ اور اس کے کارناموں کی ایک جھلک جس نے دارالعلوم کے پہلے مدرس کے سامنے سب سے پہلے کتاب کھولی لیکن اپنے سوز دروں، جذبات حریت اور تربیت باطنی سے نصف صدی میں ایک نیا جہان بسایا اور اس طرح ایک ایسی کھیپ تیار کی جو جب سے اب تک باطل و طاغوت کے خلاف سرگرم عمل ہے، جی چاہتا ہے چند رفقاء کا سرسری تذکرہ کر دوں جو اس وقت شریک بزم تھے۔

- حضرت مدنی بقول میاں اصغر حسین قدس سرہ مولانا مدنی کو حضرت شیخ الہند سے وہی نسبت ہے جو سیدنا صدیق اکبرؓ کو حضور نبی کریم علیہ السلام سے، حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے مدینہ میں قیام فرمایا پھر مالٹا میں ساتھ رہے حتیٰ کہ جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم پر حضرت کھڑا کر گئے تو وہیں جان قربان کر دی۔

- مولانا سندھی سکھ سے مسلمان ہوئے، حضرت بھرچونڈی، حضرت امروٹی اور حضرت دینپوری جیسے باخدا لوگوں کی تربیت تھی، آخر میں دیوبند گئے شیخ الہندؒ کے معتمد بن گئے۔ آپ نے پہلے داخلی طور پر پھر خارجی سطح پر نمائندہ بنایا سات سال کابل رہ کر روس ترکیہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ گئے ۲۵ سال بعد جلاوطنی کے بعد ۳۹ میں تشریف لائے، قوم کو ایک پیغام دیا ۴۴ء میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔

- حاجی ترنگ زئی صاحب مولانا سندھی اور مولانا عزیز گل کے ذریعے شیخ الہند نے انہیں یاغستان میں کام کرنے کا فرمایا انہوں نے جو جان کی بازی لگائی تو انگریز پریشان ہو کر رہ گیا بقول ایک مورخ:

ہم نے اس شخص کا غلط اندازہ لگایا تھا۔

مزید یہ کہ "اس وادی کے چپے چپے پر ہر طاقت حاجی صاحب کی تیر تھیں۔"

ان کے رفقاء میں مولانا سیف الرحمن صاحب تھے حضرت گنگوہی کے شاگرد مدرسہ فتح پوری کے استاد، شیخ الہندؒ کے حکم سے استعفیٰ دیکر میدان میں آ گئے۔

اسی طرح مولانا فضل ربی اور مولانا محمد اکبر نے یاغستان میں خوب کام کیا اور مولانا فضل محمود نے شاندار کام کیا۔

- مولانا منصور انصاری حضرت نانوتوی کے نواسے ہیں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ سفر حج میں گئے "غالب نامہ" (مشہور تحریر) لیکر ہند واپس آئے، تحریک کا افشا ہوگیا تو بھیس بدل کر مولانا سندھی سے جا ملے۔ افغانستان کے وزیر مختار رہے۔
- مولانا عزیز گل حضرت شیخ الہندؒ کے جانثار مالٹا کے رفیق ابھی بقید حیات ہیں، خدا سلامت رکھے۔
- مولانا احمد اللہ پانی پتی حضرت شیخ الہندؒ کے ڈاک کے نگران آپ کی عدم موجودگی میں تحریک کے متعلق تمام امور کے نگران و مختار، جبکہ اہم اور بڑے امور کے نگران حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری تھے۔ خلیفہ خاص حضرت گنگوہی اور ہزاروں بندگان خدا کے مربی و رہنما۔
- مولانا ظہور احمد سہارنپوری فراہمی چندہ کے نگران۔
- شیخ عبدالرحیم سندھی، آچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی اسلام

قبول کرلیا، مولانا سندھی کے گھرسے دوست منشہ میں خوب
تبلیغ کی، مدینہ شریف میں انتقال ہوا۔

حضرت مولانا غلام محمد دین پوری، حضرت بھرچونڈی کے خلیفہ
خاص، وقت کے قطب الاقطاب، مولانا سندھی کے مربی
بعد میں عزیز داری ہوگئی، انہی کے واسطے شیخ الہند سے رابطہ
ہوا، زبردست مجاہد اور انقلابی، انقلاب کا سامان خوب
اکٹھا کیا۔

مولانا محمد صادق کھڈہ کراچی، جنگ کے دوران لس بیلہ اور
بلوچستان میں کامیاب بغاوت کے ہیرو، انگریز کے ستر ہزار
سپاہی مارے گئے۔

حضرت امروٹی سید تاج محمد امروٹی یہ بھی حضرت بھرچونڈی
کے خلیفہ ہیں، مولانا سندھی اور حضرت لاہوری کے مربی زبردست
مجاہد اور انقلابی، تحریک خلافت کے سندھ میں سب سے
بڑے رہنما بعد میں جمعیۃ علماء کے رہنما رہے۔ ۵ ہزار غیر مسلموں کو
حلقہ بگوش اسلام کیا، جہاد کے شوقین، اس مقصد کے لئے
گھوڑے پالے، انگریز کی دستبرد سے مسجد کو بچایا، حکومت نے
خفیہ طریق سے زہر دیدیا

خان عبدالغفار خاں سرحد کا مظلوم رہنما، شیخ الہندؒ کے مرید
اور معتمد ساتھی۔ طویل عرصہ جیلوں میں گزرا اب بھی نظربند۔

ڈاکٹر انصاری مرحوم شیخ الہندؒ کے محبوب ترین مرید، ملکی سطح
پر قائم کی جانے والی انجمن اعانت نظر بنداں کے جنرل سیکرٹری
ہلال احمر کا وفد لیکر ترکی جانے والے اور قومی کارکنوں کے
زبردست خادم۔

شاہ عبدالرحیم رائے پوری ضلع انبالہ کے مردِ حق آگاہ حضرت
گنگوہی اور شاہ عبدالرحیم سہارنپوری کے مخلص مرید اور

باز عشق الٰہی کی بوتل میں اپنی مثال آپ حضرت شیخ الہندؒ کی عدم
موجودگی میں اہم امور کے نگران

مولانا حسین کیرانوی پہلے سے خادم شیخ تھے آپ کی عدم موجودگی میں
گھریلو نظم کے نگران

مولانا محمد نبیہ دیوبندی بیرونی مقامات سے قسم قسم کے وغیرہ
فراہمی چندہ کے نگران۔

مولانا محمد ابراہیم راندیر ضلع سورت کے فیروز دوست خوب مالی
امداد کی۔

حضرت لاہوری مولانا سندھی کے نائب اور معتمد خصوصی عام
گرفتاریوں میں گرفتار ہو کر لاہور لائے گئے تو شیخ کے مشن کے
لئے یہیں کے ہو کر رہ گئے اور بے بہا قربانیاں دیں۔

یہ چند سطریں ہیں ان جانثاروں کے متعلق جنہوں نے تحریک شیخ الہندؒ
میں نمایاں کام کیا ضرورت ہے کہ ان کا تذکرہ مفصل طریقے سے سامنے آئے
اور نسل نو کو پتہ چل سکے کہ آزادی کا مرحلہ کیونکر طے ہوا۔

آخر میں ایک بات عرض کر دوں تحریک شیخ الہندؒ کا اقتباس
جو شروع میں دیا اس سے شبہ ہوتا ہے کہ تحریک کے بانی مولانا سندھی
تھے اور بعض دوسرے مقامات پر مولانا سندھی اور مولانا آزاد دو بزرگوں
کا تذکرہ ہے اور شیخ الہندؒ کو ان کا تابع بتایا گیا ہے۔

یہ دراصل انگریزی سی آئی ڈی کی کم عقلی ہے حقیقت یہ ہے کہ مولانا سندھی
اور مولانا آزاد دونوں ہی شیخ الہندؒ کے خوشہ چیں تھے۔ شیخ الہندؒ کا ایک
مقولہ "آزادی کے مجاہد" کے فاضل مرتب نے نقل کیا ہے کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے
مولانا سندھی سے فرمایا:

"انگریزی حکومت کا اثر ہندوستان میں بڑھ
رہا ہے تم جتنی دیر میں دس بیس آدمیوں کو مسلمان بناؤ گے
(پڑھائی مراد ہے) اتنی مدت میں وہ ہزاروں مسلمانوں

کو گمراہ کر دیں گے۔ (صفحہ ۵۰)

اس پر مولانا سندھی نے عرض کیا تو حضرت نے انگریز حکومت سے مقابلے کا فرمایا اور اس کے لئے مجاہدین اسلحہ وغیرہ کا ذکر کیا۔ مرکز کی بات آئی شاگرد کے سوال پر مرکز کے متعلق فرمایا یاغستان کا علاقہ بہت مناسب ہے۔

چنانچہ اس کے لئے انہیں کابل بھیجا، مولانا سیف الرحمن وغیرہ کو حاجی ترنگ زئی کے پاس بھیجا خود ترکی حکومت سے بات کرنے حجاز گئے گو آپ فوری طور پر اپنے منصوبہ میں کامیاب نہ ہوئے لیکن انگریز دشمنی کا جو بیج بو گئے اس نے مستقبل میں قوم کی راہ سجھائی اس انگریز دشمنی کا پتہ چلانا ہو تو سر جیمس گورنر یوپی سے پوچھیں جس نے کہا تھا:

اس شخص کی بوٹی بوٹی کر دی جائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کے خلاف عداوت ٹپکے گی (آزادی کے مجاہد صفحہ ۵۵)

یہ عداوت نہ معلوم وہ کتنے مراکز کی طرف منتقل کر گیا جو بالآخر انگریزی ظلم و جبر کے خلاف استعمال ہوئے اور ملک کو آزادی نصیب ہوئی۔

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم، اللھم لک الحمد حمدًا دائمًا مع دوامک، ولک الحمد حمدًا خالدًا مع خلودک، ولک الحمد حمدًا لا یرید قائلہ الا رضاک، ولک الحمد عند طرفۃ عین وتنفس کل نفس۔ واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ، واشھد ان محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ لا نبی بعدہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ واتباعہ وسلم تسلیمًا کثیرًا کثیرًا دائمًا ابدًا۔ اما بعد:
تحفظ ختم نبوت کے سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کی خدمات پر کچھ لکھنے سے پہلے تمہید کے طور پر دارالعلوم دیوبند اور تحفظ ختم نبوت پر ایک تکمیلی مختصر کر دینا ضروری ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامدًا ومصلیًا ومسلمًا

اسلام حق تعالیٰ شانہ کا نازل کردہ آخری دین، آخری قانون سعادت اور آخری پیغام ہدایت ہے جو اس کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آخری امت، امت محمدیہ کو عطا کیا گیا۔ اسلام کو یہ شرف وفضیلت حاصل ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کی حفاظت اپنے ذمہ لی ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

اور بہت سے مردوں کو یہ اعزاز بخشا کہ وہ چوکیداروں کی حیثیت سے دین حنیف کی پاسبانی کا فریضہ انجام دیں اور جب کوئی فتنہ سر اٹھائے تو فورًا اس کی گوشمالی وسرکوبی کریں۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے۔

يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين۔

ہر آئندہ نسل میں اس علم دین کے حامل ایسے عادل اور ثقہ لوگ ہوں گے جو اسے غالیوں کی تحریف، باطل پرستوں کے غلط

دعوؤں اور جاہلوں کی تاویل سے پاک صاف کریں گے۔

گویا حق تعالیٰ نے صرف دین کی حفاظت کا وعدہ نہیں فرمایا بلکہ اس کے حسی حاملین دین وملت کی حفاظت کا بھی قطعی اور یقینی وعدہ کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلام پر نظر ڈالیں تو ہمیں ہر صدی میں اس کا ثبوت تابندہ دکھائی دے گا کہ کوئی نہ کوئی دستہ حفاظت دین کے محاذ پر اعداء اللہ سے معرکہ پیکار اور تحفظ دین کی تحریف و تاویل کے راستے میں آہنی دیوار نظر آتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان مجاہدین اسلام کی پوری تاریخ وعدہ الٰہی إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ کی عملی تفسیر ہے۔

گیارہویں سے چودھویں صدی تک زمانہ ہندوستان کا ہے۔ اس سوقہر پر ایک بات اہل نظر کو صاف نظر آئے گی کہ دینی قطبیت کا مرکز دوسرے اسلامی ملکوں سے ہندوستان کو منتقل ہوگیا، چنانچہ دینی و مذہبی خدمت، علوم و فنون کی خدمت، حدیث و تفسیر کی خدمت اور ہدایت خلق اور احیائے سنن و رد بدعات کے لحاظ سے ہندوستان تمام دوسرے اسلامی ملکوں پر سبقت لے گیا، کیوں کہ ان صدیوں میں ہندوستان میں جو ہستیاں نمایاں ہوئیں ان کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں ملتی، مثلاً گیارہویں صدی کے آغاز میں حضرت شیخ احمد سرہندی المتوفی ۱۰۳۴ھ اور بارہویں صدی کے وسط میں حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی المتوفی ۱۱۷۶ھ اور تیرھویں صدی کے وسط میں مولانا شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی اور مولانا سید احمد بریلوی شہید۔ (شہادت ۱۲۴۶ھ) (مقدمہ تجدیدی کارنامے از مورخ اسلام مولانا سید سلیمان ندوی)

حضرت سید شہیدؒ کے بعد (انہی متوسلین میں) ایک ایسی شخصیت نمایاں ہوئی جو عشق و معرفت، زہد و تقویٰ، اخلاص و ایمان، فہم و فراست، علم و عمل اور حال و قال میں اپنے اسلاف کی صحیح جانشین تھی اور جسے قدرت نے اس دور میں امت اسلامیہ کی اصلاح و تربیت کا مرکز و محور بنایا تھا۔ یعنی قطب العالم شیخ العرب والعجم مولانا شاہ امداد اللہ مہاجر مکی المتوفی ۱۳۱۷ھ کی ذات گرامی تھی۔ جو اکابر دیوبند کے مرشد و مربی اور ہندوستان میں تحریک مسلمانیت اور تحفظ دین کے مؤسس و بانی تھے۔ دارالعلوم دیوبند حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے سوز دروں کا مظہر اور ان کی سحرگاہی دعاؤں کا ثمرہ تھا۔ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی جا چکی تھی، کسی شخص نے مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی صاحبؒ سے عرض کیا کہ حضرت! ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے اس کے لئے دعا فرمائی جائے تو حضرت حاجی صاحب نے فرمایا:

سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا! ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر! یہ مدرسہ انہی سحرگاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔"

(علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے ص[illegible]، سوانح قاسمی ص[illegible] منقول از ہیں بڑے مسلمان ص۲۱ طبع سوم)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست و ناکامی کے بعد اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل نظر بظاہر تاریک تھا، انگریز کے منحوس قدم ہندوستان سے اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے پر تلے ہوئے تھے اور انگریز بڑے طمطراق سے یہ اعلان کر رہا تھا۔

"جس طرح کل ہمارے بزرگوں کے کل ایک ساتھ عیسائی ہوگئے تھے اسی طرح یہاں، ہندوستان میں، بھی (تمام لوگ) ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے"...

(مسلمانوں کا روشن مستقبل ص۱۲۱)

"خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیر نگین ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے، ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام

ہندوستان کا مسلمان بننے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں
صرف کرنا چاہیے۔" (حکومت خود اختیاری ص ۱۳۹
اور علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے ص ۳)
"ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم
سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے۔"
(علمائے ہند کا شاندار ماضی آخری حصہ ص ۳۰)
"میں اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں
کی قوم اصولاً ہماری دشمن ہے، اس لیے ہماری حقیقی
پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضا جوئی کرتے ہیں"....
(ان بیسٹ انڈیا ص ۲۲)
مسلمانوں کی بے کسی و بے بسی اور سفید طاغوت کی ان تعلیوں کے پیش نظر
علمی نظر کے لوگوں نے اگر یہ رائے قائم کی کہ:
"اب اسلام صرف چند سالوں کا مہمان ہے۔"
(ص ۲۶ موج کوثر شیخ محمد اکرام)
تو بلاشبہ وہ معذور تھے۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ یہی رائے
لوگوں نے اس وقت بھی قائم کی تھی جب وصال نبوی کے بعد پورا خطۂ عرب [illegible]
ارتداد کی لپیٹ میں آگیا تھا اور پھر گیارہویں صدی میں یہی رائے اس وقت بھی
(کم از کم ہندوستان کی حد تک) قائم کی گئی جب ہندوستان کا مطلق العنان
طاغوت اکبر جل جلالہ کا نعرہ لگاتے ہوئے دین الٰہی تصنیف کر رہا تھا۔ ان تمام
موقعوں پر حق تعالیٰ شانہ کا وعدہ "حفاظتِ دین" کبھی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
کی شکل میں نمودار ہوا اور کبھی اس نے امام ربانی مجدد الف ثانی کو کھڑا کیا۔ آج
وہی وعدہ "دارالعلوم دیوبند" کی شکل میں پورا کیا جا رہا ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ابوبکر صدیق
رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو اسلام فتنۂ ارتداد کی نذر ہو گیا ہوتا۔ اہل نظر آج
یہ کہتے ہیں کہ انگریز کے دورِ تسلط میں دارالعلوم دیوبند کا عطیۂ غیبی ظہور پذیر
نہ ہوتا... یا حضرت حاجی صاحب کے بقول اوقاتِ سحرگاہی میں پیشانیاں
رگڑ رگڑ کر گڑگڑانے سے ظہور پذیر ہوا... تو شاید انگریز کی مراد بر آتی۔ اور
اسلام ہندوستان سے رخصت ہو گیا ہوتا۔

دارالعلوم دیوبند نے مسلمانوں کو کیا دیا؟ اس پر بہت سے حضرات
بہت کچھ لکھیں گے۔ مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ تجدید و احیاءِ دین کی جو
تحریک گیارہویں صدی سے ہندوستان کو منتقل ہوئی تھی۔ اور پچھلے دور
میں مجدد الف ثانیؒ، محدث دہلویؒ اور شہید بالاکوٹ جس امانت کے حامل
تھے دارالعلوم اس وراثتِ امانت کا حامل تھا۔ لوگ "مدرسۂ عربی دیوبند"
کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں کوئی اسے علوم اسلامیہ کی یونیورسٹی
سمجھتا ہے۔ کوئی جہاد و حریت کے مجاہدین کی تربیت گاہ اسے قرار دیتا ہے۔
کوئی اسے دعوت و عزیمت اور سلوک و تصوف کا مرکز سمجھتا ہے۔ لیکن میں
حضرت حاجی صاحب کے لفظوں میں اسے بقائے اسلام اور تحفظ دین کا
ذریعہ سمجھتا ہوں۔

دوسرے لفظوں میں آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں مجددینِ امت کا جو
سلسلہ چلا آ رہا تھا دارالعلوم دیوبند ... اپنے دور کے لیے
مجددینِ امت کی تربیت گاہ تھی، یہیں سے مجددِ اسلام حکیم الامت تھانویؒ
نکلے، اسی سے دعوت و تبلیغ کی تجدیدی تحریک ابھری، جس کی شاخیں چار
دانگِ عالم میں پھیلی ہوئی ہیں، یہیں سے تحریکِ حریت کے داعی تیار ہوئے
یہیں سے فرقِ باطلہ کا توڑ کیا گیا۔ یہیں سے محدثین، مفسرین، فقہا اور متکلمین
کی کھیپ تیار ہوئی۔ مختصر یہ کہ دارالعلوم دیوبند نے نہ صرف یہ کہ نابغہ
شخصیتیں تیار کیں۔ بلکہ اسلام کی ہمہ پہلو تجدید و احیاء کے لیے عظیم الشان دانش
کو جنم دیا ـــــ اس لیے دارالعلوم کو اگر تجدید و احیاءِ دین کی یونیورسٹی کا
نام دیا جائے تو شاید یہ اس کی خدمات کا صحیح عنوان ہوگا۔ صفحات میں
صرف ایک پہلو یعنی عقیدۂ ختم نبوت کے متعلق دارالعلوم کی خدمات کا تذکرہ ہوگا آنے والے

لہ یہ تمام اقتباسات "بیس بڑے مسلمان" ص ۷۱۲ طبع سوم سے ماخوذ ہیں۔

نے دعویٰ نبوت کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بعثتوں کا نظریہ ایجاد کیا، جس کا خلاصہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار تو چھٹی صدی عیسوی میں مکہ میں مبعوث ہوئے تھے اور دوسری مرتبہ (نعوذ باللہ) مرزا غلام احمد قادیانی کی شکل میں قادیان کی گمنام بستی میں۔ مکی بعثت کا دور تیرھویں صدی ہجری پر ختم ہوگیا اور اب چودھویں صدی سے قیامت تک قادیانی بعثت و نبوت کا دور ہوگا۔ اس طرح مرزا غلام احمد قادیانی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو تیرھویں صدی کے بعد کالعدم قرار دیکر خاتم النبیین کا منصب خود سنبھال لیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کمالات مخصوصہ کو اپنی جانب منسوب کرنے کے لئے قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں بے دریغ تحریف کر ڈالی۔ اسلامی عقائد کا مذاق اڑایا۔ انبیاء علیہم السلام کو فحش گالیاں دیں، تمام امت مسلمہ کو گمراہ اور کافر و مشرک قرار دیا۔ قصر اسلام کو منہدم کرکے "جدید عیسائیت" کی بنیاد رکھی۔ انگریز کی ابدی غلامی کو مسلمانوں کے لئے فرض و واجب قرار دیا، مسئلہ جہاد کو حرام اور منسوخ ٹھہرایا اور مجاہدین اسلام کو منکرِ خدا قرار دیا۔ جن لوگوں کو قادیانیت کی گہرائی کا علم نہیں اور وہ اس کی حقیقت سے ناواقف ہیں انہیں اس فتنہ کی شدت کا احساس نہیں ہو سکتا، واقعہ یہ ہے کہ صدر اول سے لے کر آج تک جتنے فتنے پیدا ہوئے ان سب کی مجموعی فتنہ پردازی بھی فتنہ قادیانیت کے سامنے شرمندہ ہے۔ اگر ملاحدہ و زنادقہ اور مدعیانِ نبوت و مہدویت کی تحریفات کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں قادیانی کی تحریفات کو جگہ دی جائے تو یقین ہے کہ قادیانی تحریفات کا پلڑا بھاری رہے گا۔

طاقتِ برطانیہ نے اپنے خود کاشتہ پودے مرزا غلام احمد قادیانی سے نبوت کا دعویٰ ایسے دور میں کرایا جب کہ مسلمانوں کی تلوار ٹوٹ چکی تھی، جب ان کا تاج لٹ چکا تھا، جب ان کے لئے آزادی کا نام جرم تھا، جب جہاد اور بغاوت ہم معنی ہو گئے تھے، جب غلامانِ ہند کا اسلامیانِ عالم کا فیصلہ سفید آقاؤں کے رحم و کرم پر تھا۔ اگر مرزا صاحب نے حریم نبوت میں قدم رکھنے کی جرأت عہدِ صدیقی نہیں بلکہ عثمانی عہدِ خلافت ترکی ہی میں کی ہوتی تو ان کا انجام اسود کذاب اور مسیلمہ کذاب سے مختلف نہ ہوتا۔ خود مرزا صاحب کو بھی اس اسلامی غیرت کا جو مدعیانِ کذاب کے معاملے میں مسلمانوں میں پائی جاتی ہے، پورا پورا احساس تھا اس لئے اپنی جماعت کو گورنمنٹ برطانیہ کی اطاعت کرنے کا (جو ان کی زندگی کا مشن اور ان کے دعویٰ نبوت کی اصل غرض تھی۔ اور جس کے لئے انہیں بطور خاص مامور کیا گیا تھا) حکم دیتے ہوئے انہیں گورنمنٹ برطانیہ کی اصل قدر و قیمت کا احساس دلاتے ہیں:

> "خدا تعالیٰ کی حکمت و مصلحت ہے کہ اس نے اس گورنمنٹ کو اس بات کے لئے چن لیا کہ یہ فرقہ احمدیہ اس کے زیر سایہ ظالموں کے خونخوار حملوں سے اپنے تئیں بچاوے اور ترقی کرے۔ کیا تم یہ خیال کر سکتے ہو کہ تم سلطان روم (خلافت ترکیہ) کی عملداری میں رہ کر یا مکہ مدینہ میں اپنا گھر بنا کر شریر لوگوں (مسلمانوں) کے حملوں سے بچ سکتے ہو؟ نہیں! ہرگز نہیں!! بلکہ ایک ہفتہ میں ہی تم تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کئے جاؤ گے۔ تم سن چکے ہو کہ کس طرح صاحبزادہ عبداللطیف .... جب میری جماعت میں داخل ہوئے تو محض اس قصور سے کہ میری تعلیم کے موافق جہاد کے مخالف ہو گئے تھے، امیر حبیب اللہ خان نے نہایت بے رحمی سے ان کو سنگسار کروا دیا، پس کیا تمہیں توقع ہے کہ تمہیں اسلامی سلطنتوں کے ماتحت کوئی خوشی میسر آئیگی؟ بلکہ تم تمام اسلامی مخالف علماء کے فتوؤں کی رو سے واجب القتل ٹھہر چکے ہو" (تبلیغ رسالت ص۱۲۲ جلد ۱۰)

۵- سیاسی نبوت

ختم نبوت کے صریح اعلان اور امت اسلامیہ کے متواتر اجماعی عقیدہ

کے بعد بھی اگر کوئی شخص (جو عالم دین اور مفتی بھی ہو) منکر کی کے ساتھ کوئی
بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس سلسلہ میں ایک کتاب ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے
مدعی نبوت کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو ہر مدعی نبوت کے دعویٰ کا کوئی
نہ کوئی سیاسی یا معاشی سراغ مل جاتا ہے۔ واقعہ یہ کہ کوئی شخص اپنی ذاتی بنا پر
اور خلل دماغ سے مجبور ہو کر یہ دعویٰ کرے تو یہ چارہ مقصود ہے، مرزا
صاحب کی نبوت کے محرکات شاید پس منظر میں رہ جاتے لیکن بعض وجوہ،
اسباب ایسے پیش آئے کہ مرزا صاحب کو (اشاروں کنایوں میں) ان کی وضاحت
کی نشاندہی کرنا پڑی، ان محرکات میں سب سے قوی محرک سامراج مغرب کی
وہ ہستی تھی جس نے مرزا صاحب کو دعویٰ نبوت کے لئے آمادہ کیا تھا، اور یہی وہ
خفیہ ان کے پشت سے ابتدائی نبوت کی تشکیل کرتی تھی۔ عیار انگریز نے قادیانی
نبوت کا تخم سرزمین ہند (پنجاب) میں کیوں کاشت کیا؟ یہ سوال بڑی اہمیت
رکھتا ہے، مختصراً اس کے مقاصد حسب ذیل تھے۔

الف: ۱۸۵۷ء کے بعد اگرچہ انگریز کا پنجۂ استبداد ہندوستان پر پوری
طرح گڑ چکا تھا، اور غیور ابنائے ہند کے لئے پر پھڑپھڑانے کی گنجائش بھی
باقی نہیں رہنے دی گئی تھی، لیکن انگریز اس خطرے سے بے نیاز
نہیں تھا کہ یہ بے بال و پر اسیرانِ قفس کسی وقت پھر اپنی اسیری کے
خلاف پھر بغاوت کر ڈالیں۔ ان کے ذہنی "شغل" اور روحانی توجہ
کے لئے ضروری تھا کہ نہ صرف مذاہب عالم کو (جن کا مرکز بدقسمتی
سے اس وقت ہندوستان تھا) آپس میں ٹکرا دیا جائے بلکہ یہ
بھی قرین آئینِ جہانداری تھا کہ ہر مذہب میں نئے نئے فرقے پیدا
کئے جائیں اور پھر ہر فرقے میں نئی نئی تحریکیں لگا لگا کر ہندوستان
کو مذاہب و افکار کا نگار خانہ بنا دیا جائے۔ تاکہ آوازۂ حریت
بلند کرنے کی اول تو کسی کو فرصت ہی نہ ملے، اور اگر کسی گوشے
سے ایسی آواز اٹھے بھی تو اس افتراقی فتنہ کے شور میں دب
کر رہ جائے، اور پرستاران مذاہب کی نظر میں وہ آواز
علمائے بے لگام قرار دی جائے۔ "سفید آقا" کے جملہ فلسفہ نے
"اشاعت آزادی مذہب" کا نعرہ کہہ کر علمائے ہند کو عطا کیا تھا ___
اس دور میں جو مذہبی کشتیاں لڑی گئیں ___ یا یوں کہئے کہ
یوں کہئے کہ علمائے ہند کو اس پر مجبور کیا گیا ___ ان کی شکل کسی
قوم کے دور زوال میں ہی مل سکتی ہے، عروج و اقبال کا فقدان
سے تعبیر ہوتا ہے۔ اس دور میں کون کون سے فرقے وجود میں آئے،
اور انہوں نے کیا کردار ادا کیا؟ اور ان سے اسلام اور ملت اسلامیہ
کو کیا کیا نقصان پہنچا؟ ان سوالات سے پردہ اٹھانا اگرچہ ایک
تلخ فریضہ ہے۔ لیکن ہم آنے والے مورخ کے قلم کو اس سے نہیں
روک سکتے۔ یہاں صرف قادیانی نبوت کو لیجئے جو انگریز کے سایۂ
عاطفت میں پھل پھول رہی تھی۔ علمائے حق کی جتنی قوت اس ایک
فتنے کے استیصال میں خرچ ہوئی اگر یہ انگریز کا خود کاشتہ پودا ہندوستان میں پیدا نہ ہوتا
تو سوچئے کہ ہندوستان کی تاریخ کا نقشہ کیا ہوتا؟ ۱۸۵۷ء میں جو کچھ ہم سے غصب
کر لیا گیا تھا اس کی بازیابی میں کتنی آسانی ہو جاتی؟

ب: ایشیا، افریقہ بالخصوص برصغیر پر انگریزی تسلط کا مقصد صرف جسموں پر
حکمرانی اور یہاں کے مادی و اقتصادی فوائد کا استحصال نہیں تھا بلکہ
وہ اس سے بڑھ کر عالم اسلام کو ذہنی ارتداد کے عمیق گڑھے میں
دھکیلنا چاہتا تھا۔ اگرچہ لارڈ میکالے کی تعلیمی اسکیم (کہ ہندوستانیوں
کو اس نہج پر تعلیم دی جائے کہ اگر وہ عیسائی نہ بنیں تو کم از کم مسلمان
بھی نہ رہیں) اپنی جگہ کافی کامیاب تھی، بہت سے مسلم مفکرین اسلامی
عقائد و اعمال میں تشکیک پیدا کرنے کے لئے نئے نئے فلسفے اور نظریے
پیش کر رہے تھے۔ اور ان کو غذا مہیا کرنے کے لئے مستشرقین مغرب
کی ایک پوری فوج شب و روز محنت کر رہی تھی، لیکن یہ تمام تر
کوششیں ایک محدود حلقے پر اثر انداز تھیں۔ عوام پر ان کا اثر
بالواسطہ در بالواسطہ تھا، اور پھر جو لوگ ان نظریات کو پیش کر رہے تھے

اسلام کی بنیاد کلمہ طیبہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کے دو حرفی عہد پر رکھی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مدعی الوہیت کا وجود ناقابل برداشت ہے اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی مدعی نبوت کے بساط نبوت پر قدم رکھنے کی گستاخی بھی لائق تحمل نہیں۔ یہی عقیدہ ختم نبوت کا عقیدہ کہلاتا ہے جس پر صدر اول سے آج تک امت مسلمہ قائم رہی ہے۔

جو لوگ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ایمان و اقرار سے سرشار ہو کر اسلامی برادری میں شامل ہوں ان پر یہ فریضہ عائد کیا گیا کہ وہ باغیان رسول اللہ کے خلاف بھی سینہ سپر ہو جائیں اور جھوٹے مدعیان نبوت کے طلسم سامری کو بھی پاش پاش کر ڈالیں۔ اسی فریضہ کا نام "تحفظ ختم نبوت" ہے اور تاریخ شہادت دیتی ہے کہ امت مسلمہ نے کسی دور میں بھی اس فریضہ سے تغافل نہیں کیا۔

ختم نبوت کا سب سے پہلا باغی یمن میں عبہلہ نامی ایک شخص ہوا۔ جس کے سر میں دعوائے نبوت کا سودا سمایا اور اس نے چند دنوں میں یمن کے بیشتر علاقہ پر حکومت قائم کر لی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کو اس سے قتال و جہاد کا تحریری حکم صادر فرمایا۔ بالآخر حضرت فیروز کے خنجر نے اس کی جھوٹی نبوت کا آخری فیصلہ سنا دیا، تاریخ کے ریکارڈ میں اس کا افسانہ "اسود کذاب" کے نام سے محفوظ ہے۔

ختم نبوت کا دوسرا غدار مسیلمہ کذاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس نے نبوت محمدیہ میں شرکت کا دعویٰ کیا تھا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے "اللہ کی تلوار" خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس کی سرزنش کے لیے روانہ فرمایا، یہ کذاب اپنے چالیس ہزار لشکریوں کو لے کر حدیقۃ الموت[1] کے راستے سفر جہنم پر روانہ ہوا صرف اس ایک معرکہ میں مسلمانوں کو "تحفظ ختم نبوت" کے لیے اتنی بڑی قربانی دینا پڑی کہ گیارہ سو سے چودہ سو تک اشراف صحابہ شہید ہوئے۔ ان میں سات سو سے زیادہ وہ اصحاب تھے جو قرا کہلاتے تھے، یعنی قرآن کریم کے حافظ، قاری اور متخصص عالم۔ ــــ حضرت [illegible] حضرت عمر کے برادر اکبر زید بن خطاب [illegible] مدرسہ نبوت کے سب سے [illegible] سالم مولیٰ ابی حذیفہ [illegible] مرنی حضرت ابو حذیفہ [illegible] رضوان اللہ علیہم اجمعین — آفتاب نبوت کے ان درخشندہ ستاروں کے نام سے حدیث و تاریخ کی کتابوں کا ہر طالب واقف ہے؛ ان میں سے ایک ایک کا وجود [illegible] سکوں میں [illegible] خود امت [illegible] نبوت کے ان پروانوں نے ختم نبوت پر کٹ مرنے کا [illegible] منظور کیا، گویا حافظ شیرازی نے انہی کی زبان سے کہا تھا۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ختم نبوت کا تیسرا باغی طلیحہ اسدی تھا جس کے مقابلے کے لیے بھی اللہ کی تلوار گئی، لیکن بہت سے ناکامیوں کو مرد کے سامنے جلد ہی راہ فرار اختیار کرنے میں عافیت محسوس ہوئی، ملک شام پہنچ کر سانس لی اور ہمیشہ کے لیے دعویٰ نبوت سے توبہ کی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ[2] کہنا کم ان تینوں مدعیان نبوت کا انجام ہمارے سامنے ہے جنہوں نے دور نبوی میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ اور صحابہ کرام نے سیف و سنان سے ان کی تواضع کی۔ گویا صدر اول ہی سے امت مسلمہ کے لیے یہ اصول طے کر دیا گیا تھا کہ مدعیان نبوت کا فیصلہ مباحثہ و مناظرہ کی بزم آرائیوں سے نہیں ہوتا بلکہ تلوار کی نوک اور نیزے کی انی اس کا فیصلہ چکاتی ہے۔

چودہویں صدی ہجری میں اسلام کو جن فتنوں کا سامنا کرنا پڑا ان میں سب سے بدتر اور منحوس فتنہ وہ تھا جسے دنیا "فتنہ قادیانیت" کے نام سے جانتی ہے۔ اس فتنہ کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۳۲۶ھ)

---

[1] "حدیقۃ الموت" اس باغ کا نام ہے جہاں مسیلمہ کذاب قتل ہوا۔

[1] عمدۃ القاری صفحہ ۲۸۱/۱۸ [2] عمدۃ القاری صفحہ [illegible]

اس کے تحت کسی پر نیچریت کی اور کسی پر مغربیت کی چھاپ تھی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا بہت سے انگریز کو اس ذہنی ارتداد کے لئے دو اہم ترین فائدے حاصل ہوئے۔ اول یہ کہ یہ تحریک صرف خواص اور پڑھے لکھے طبقہ تک محدود نہیں رہے گی، بلکہ اس کو دائرہ کار عامہ کی سطح تک پھیل جائے گا۔ دوم یہ کہ جو نظریات محدود یورپ اسلام کے مشاغل ... نیچریت یا دہریت کی تہمت کی بنا پر مسلمانوں سے قبول کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے وہی نظریات "وحی و الہام" کی سند سے قادیانی نبوت پیش کرے گی، اور مسلمان اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں گے۔

مشرق و مغرب کے تمام ملاحدہ کے سارے الحاد و زندقہ کی تمام جدوجہد کا خلاصہ اگر نکالا جائے تو یہ ہے کہ اسلام اپنی موجودہ شکل میں ــــ جو اس وقت مسلمانوں کے سامنے ہے۔ وقیوده الشرعیة لا تقبل فی عصرنا الحدیث نہیں ــ اور جن لوگوں نے قادیانی اور اس کے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ٹھیک یہی خلاصہ قادیانی تحریک کے عقائد و افکار کا ہے کسی قادیانی کے سامنے مرزا صاحب کے الہام کے خلاف کوئی آیت پڑھیے کوئی حدیث پیش کیجئے، کسی صحابی کی سند لائیے، کسی امام و مجتہد کسی ولی و قطب کی تحریر پیش کیجئے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس کا ذہن ان میں سے کسی چیز پر بھی ایمان لانے یا اعتماد کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ــــ ظاہر ہے کہ ذہنی ارتداد اور مزاجی تشکیک کی یہ کیفیت انگریز اگر صرف مستشرقین کے حملوں اور لارڈ میکالے کے نظریۂ تعلیم کی پرورش کے ذریعہ پیدا کرنا چاہتا تو اسے کامیابی نہ ہوتی ـــــ یہی فلسفہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ افراد جو دہریت اور نیچریت کا شکار تھے، انہیں اپنے افکار و نظریات کے لئے جب الہامی سند مہیا ہوئی تو فوراً اس کی پناہ میں آگئے، حکیم نورالدین مولوی عبدالکریم سیالکوٹی، محمد احسن امروہوی اور مسٹر محمد علی لاہوری، یہ قادیانیت کا ہراول دستہ ہے۔ جو پہلے نیچری تھا پھر مرزائی ہوا۔

ج: ہندوستان کے سیاسی حالات کے پس منظر میں انگریز کو جس چیز نے سب سے زیادہ بے چین کر رکھا تھا وہ اسلام کا "جذبہ جہاد" تھا جس کی تلوار انگریزی جارحیت کے سر پر ہر وقت لٹک رہی تھی۔ اور انگریز اس تلوار کو ہمیشہ کے لئے توڑ دینا چاہتا تھا یورپ کے مستشرقین نے اسلامی جہاد کے مسئلہ کو نہایت گھناؤنی شکل میں پیش کرنے کے لئے اگرچہ بہت سے صفحات سیاہ کئے، جناب سرسید صاحب اور مولوی چراغ علی وغیرہ نے بھی اس کی تعبیرات اس انداز سے کیں کہ جہاد کا جذبہ اور اس کی گنجائش انگریز کے ذہن سے ختم ہو جائے۔ لیکن انگریز بدستور خائف رہا۔ اور جہاد کے عملی مظاہرے جو وقتاً فوقتاً مسلمانوں کی طرف سے دہرائے جاتے تھے، اسے بے چین کئے رکھا تاآنکہ مرزا غلام احمد صاحب نے وحی آسمانی کے ذریعہ اس کے آئندہ منسوخ ہونے کا اعلان کر دیا۔ ظاہر ہے مستشرقین کا واویلا اور سرسید کے انکار کا وہ وزن نہیں تھا جو مرزا صاحب کے "الہام" کا ہو سکتا تھا۔ مرزا صاحب کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشن، ان کے وجود کا سب سے بڑا مقصد، ان کی نبوت و مسیحیت کا سب سے بڑا کارنامہ اور ان کے الہامی تیر کا سب سے اہم نشانہ یہی مسئلہ جہاد ہے۔ باقی سب تمہید ہے ـــ اور یہی انگریز کو اس دور میں سب سے بڑی ضرورت تھی۔

انگریز کے پاس اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے سی۔ آئی۔ ڈی کا بہت مضبوط جال موجود تھا، اور پھر مخبری کے لئے "کالے انگریزوں" کی ایک فوج کی فوج بھی خفیہ خدمات پر مامور تھی۔ جن میں ہر طبقہ اور ہر سطح کے لوگ تھے۔ ان میں "امیر" بھی تھے اور "غریب" بھی

"شریعت" بھی اور "شاہ" بھی، نواب بھی تھے اور خان بہادر بھی۔ صوفی بھی تھے اور زاہد دین فروش بھی۔ علماء بھی تھے اور مشائخ بھی، طالب علم بھی تھے اور مریدانِ باصفا کیش بھی۔ الغرض رفقاء اہل ہند میں ہر سطح کے لوگ، جو وقتے وقتے "خدمات خاص" بجا لاتے اور سفید آقا کے دربار میں خلعت و خطابات سے نوازے جاتے۔

اس نازک دور میں سرکار کو بروقت اطلاع دے دینا کہ فلاں فرد یا فلاں جماعت حضور گورنمنٹ کے خلاف باغیانہ "خیالات" رکھتا ہے، معمولی خدمت نہ تھی، داد و دہش کے دہانے کھل جاتے انعام و اکرام کی بارش ہوتی، عزت و وجاہت کو چار چاند لگ جاتے، جاگیریں تقسیم کی جاتیں، ریشمی رومال پکڑ کر انگریز افسر کے حوالے کر دینے پر "خان بہادر" کا لقب اور کئی مربعے جاگیر مل جاتی ——— تاہم اب تک ایک "نبی"۱؎ کی نشست خالی تھی، اس کے لئے جناب مرزا غلام احمد قادیانی (جو آقایانِ فرنگ کے پشتینی وفادار اور یارِ غار تھے) سے بہتر اور کسی شخصیت کا انتخاب موزوں ہو سکتا تھا؟ مرزا صاحب ایک نبی کی حیثیت سے اپنی امت سمیت "مردانِ احرار" کی خفیہ رپورٹ کی خدمات انجام دینے کے لئے مامور ہوئے یا مرزا صاحب کی اصطلاح میں یوں کہئے کہ انہیں اس کارِ خیر کی "وحی" والہام ہوا۔ یہ کہانی خود مرزا صاحب کی زبان سے بھی معلوم ہوگی، وہ لکھتے ہیں:

"چونکہ قرینِ مصلحت ہے کہ سرکار انگریزی کی خیرخواہی کے لئے ایسے نافہم مسلمانوں کے نام بھی نقشہ جات میں درج کئے جائیں جو درپردہ اپنے دلوں میں برٹش انڈیا کو دارالحرب قرار دیتے ہیں ... لہٰذا یہ نقشہ اسی غرض کے لئے تجویز کیا گیا ہے تاکہ اس میں ان ناحق شناس لوگوں کے نام محفوظ رہیں جو ایسی باغیانہ سرشت کے آدمی ہیں۔ اگرچہ گورنمنٹ کی خوش قسمتی سے برٹش انڈیا کے مسلمانوں میں ایسے لوگ معلوم ہوتے ہیں جو ایسے ہیں کہ نہایت مخفی ارادہ گورنمنٹ کے خلاف ہیں۱؎۔ اس لئے ہم نے اپنی محسن گورنمنٹ کی پولیٹیکل خیرخواہی کی نیت سے اس مبارک تقریب پر یہ چاہا کہ جہاں تک ممکن ہو ان شریر لوگوں کے نام ضبط کئے جائیں جو اپنے عقیدہ سے اپنی مفسدانہ حالتیں ثابت کرتے ہیں ... لیکن ہم گورنمنٹ میں باادب اطلاع کرتے ہیں کہ ایسے نقشے ایک پولیٹیکل راز کی طرح اس وقت تک ہمارے پاس محفوظ رہیں گے جب تک گورنمنٹ ہم سے طلب کرے اور ہم امید رکھتے ہیں کہ ہماری گورنمنٹ حکیم مزاج بھی ان نقشوں کو ایک ملکی راز کی طرح اپنے کسی دفتر میں محفوظ رکھے گی۲؎۔ ایسے لوگوں کے نام مع پتہ و نشان کے یہ ہیں:"

(تبلیغ رسالت ص[illegible])

چونکہ مرزا صاحب کا زیر نقول ان کے نافہم، ناحق شناس، شریر، منکر مسلمانوں کے خلاف، اپنی محسن گورنمنٹ کی پولیٹیکل خیرخو

۱؎ ظاہر ہے کہ دلوں کی بات تو مرزا صاحب کو "وحی" کے ذریعہ ہی معلوم ہو سکتی تھی۔

۱؎ گورنمنٹ کی اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک نبی جبر[ئیل] سے پوچھ پوچھ کر لوگوں کے نہایت مخفی ارادوں کی گورنمنٹ کو اطلاع [دینے] کے لئے میسر ہو۔ ۲؎ کیوں نہیں۔ ایک نبی کی اطلاع ادارہ میں لوگوں کے عقیدوں کے بارے میں، گورنمنٹ کو اس سے بہتر خفیہ مواد اور کہاں [سے] مل سکتا تھا۔

کا ثبوت سب سے اہم ہے کیونکہ اس کے بغیر ان کی "سیاسی نبوت" کا سب سے اہم جزو یہ تھا کہ جہاد اور مسلمانوں کو مرزا صاحب نے اپنے خیالات سے نوازا ہے، اور ہم کو انگریزی حکومت پر کتنا ناز تھا اور لعنت کا حق ادا کرتے ہیں، یہ محتاج ذکر نہیں ہے۔ ان کا سب سے اہم جرم ہے کہ ان کا مادی ذہنی کاغذوں سے کر غلامی کی تمیز کیوں سمجھ سکتا ہے، اور ان کے حق آزادی وطن کے لئے کیوں جیتا ہے۔ اور مسلمانوں کی تحریک حریت جوش انقلاب ہیں میں اتمام جلیں رہ جاتی تھی، بلکہ سوا اس کے کیا تھا کہ قادیانی تبلیغ اسلام کا ابطال اور کہ تمام بلاد اسلامیہ میں پھیل جائیں، اور انگریزوں کی خدمات بجا لائیں، مرزا صاحب لکھتے ہیں،

"میں نے عربی اور فارسی میں بعض رسائل تصنیف کرکے بلاد شام و روم اور مصر اور بخارا وغیرہ کی طرف روانہ کئے، اور ان میں اس گورنمنٹ کے تمام اوصاف حمیدہ درج کئے، اور بخوبی ظاہر کر دیا کہ اس گورنمنٹ کے ساتھ جہاد قطعاً حرام ہے۔ اور ہزارہا روپیہ خرچ کرکے وہ کتابیں مفت تقسیم کیں، اور بعض شریف عربوں کو وہ کتابیں دیکر بلاد شام و روم کی طرف روانہ کیا، اور بعض کو مکہ اور مدینہ کی طرف بھیجا اور بعض بلاد فارس کی طرف بھیجے گئے، اور اسی طرح مصر میں بھی کتابیں بھیجیں، اور یہ ہزارہا روپیہ کا خرچ تھا جو محض نیک نیتی سے کیا گیا۔ (اس سے بڑھ کر یک جہتی کا ثبوت کیا ہوگا کہ جس کار خیر پر آدمی مامور ہو اسے بصد شوق و رغبت بجا لائے" (ناقل) (تبلیغ رسالت ص ۱۹۶)

قادیان کی سیاسی نبوت نے "تبلیغ اسلام" کے پردے میں عالم اسلام میں سازشوں کے کیا کیا جال پھیلائے، مسلمانوں میں منافرت پھیلانے کے لئے کیا کچھ کیا؟ اور کیا کیا مخصوص خدمات انجام دی گئیں؟ یہ تفصیل اس مقالہ کے احاطے سے باہر ہے۔

(۱) سب سے پہلا انکشاف

یوں تو رد قادیانیت اور تحفظ ناموس رسالت کا کام کم و بیش قریباً تمام اسلامی فرقوں نے کیا، اور سبھی کو کرنا بھی چاہئے تھا۔ مگر دارالعلوم دیوبند جو حضرت حاجی صاحبؒ کے بقول ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ دین کی خاطر وجود میں لایا گیا تھا، اسے اس سلسلہ میں چند ایسے امتیازات کا شرف حق تعالیٰ نے عطا فرمایا جو کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہو سکا۔ سب سے پہلی بات تو یہی کہ قادیانی فتنہ کا جرثومہ ابھی رونما نہیں ہوا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے مرشد و مربی حضرت قطب العالم حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ نے بطور کشف اس کے ظہور کی پیشگوئی فرمائی اور علمائے امت کو اس کی جانب متوجہ فرمایا۔ "تاریخ مشائخ چشت" میں حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی قدس سرہ کے "ملفوظات طیبہ" سے نقل کیا ہے کہ حضرت پیر صاحبؒ حج پر تشریف لے گئے اور حجاز میں قیام کا ارادہ فرمایا مگر حضرت قطب عالم حاجی صاحبؒ نے انہیں بااصرار و تاکید ہندوستان کی واپسی کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا:

در ہندوستان عنقریب یک فتنہ ظہور — ہندوستان میں عنقریب ایک فتنہ نکلنا
کند، شما ضرور در ملک خود واپس — ہوگا، آپ وطن واپس جائیے
بروید، و اگر بالفرض شما در ہند — بالفرض آپ وہاں خاموش بھی
خاموش نشستہ باشید تاہم — بیٹھے رہیں تب بھی وہ فتنہ ترقی
آن فتنہ ترقی نہ کند و در ملک — نہیں کرے گا، اور ملک میں سکون

آرام ظاہر شود۔　　ہو جائے گا۔

(بحوالہ بیس بڑے مسلمان، صفحہ ۹ طبع سوم)

اسی نوعیت کا واقعہ اس ناکارہ نے اپنے اکابر سے سنا تھا کہ حضرت اقدس مولانا عبدالرحیم رائپوری کے بارے میں بھی سنا تھا کہ قادیانیت کے نفسِ ناطقہ حکیم نورالدین صاحب (قادیانی دام میں پھنسنے سے پہلے) کسی ضرورت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حکیم جی کو بطور نصیحت فرمایا کہ قادیان سے ایک مدعی نبوت اٹھے گا، اس سے بحث و مناظرہ کی غرض سے بھی اس کے پاس نہ جائیو (الخ)

۴۔ حضرت نانوتویؒ کا فتویٰ

حضرت امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ قدس سرہ نے کسی جگہ ایک عجیب مضمون تحریر فرمایا ہے جس کا خلاصہ ذہن میں اس قدر محفوظ ہے کہ زمانہ نبوت میں تو حق تعالیٰ شانہ اپنی منشاء کا اظہار بذریعہ وحی فرماتے تھے لیکن وحی کا سلسلہ آنحضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ بند ہو چکا ہے اس لئے زمانہ وحی کے بعد اگر کوئی معاملہ کسی پر مشتبہ ہو جائے اور اسے یہ معلوم کرنا ہو کہ اس معاملہ میں منشاء خداوندی کیا ہے تو اسے یہ دیکھنا چاہئے کہ اولیاء اللہ اور عارفین کے قلوب کس جانب مائل ہیں، جس جانب اکابر کا رجحان ہو اسی کو منشاء الٰہی کے مطابق سمجھنا چاہئے۔

یہ حق تعالیٰ شانہ کی حکمت بالغہ تھی کہ قادیانی فتنہ کے ظہور سے قبل ہی اکابر اولیاء اللہ کے قلوب کو اس کے تدارک و تعاقب کی طرف متوجہ فرما دیا۔ قادیانی نبوت کا فتنہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۹۷ھ) بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے وصال کے بعد رونما ہوا، مگر حق تعالیٰ نے ایک تقریب ایسی پیدا کر دی کہ حضرت نانوتویؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت کبریٰ پر ایک رسالہ "تحذیر الناس" تحریر فرمایا جس میں مسئلہ ختم نبوت کو اس قدر مدلل فرمایا کہ قادیانی تحریفات کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ ختم نبوت پر ان کا استدلال کس قدر پختہ ہے، ارشاد فرماتے ہیں:

"الحاصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصفِ نبوت میں موصوف بالذات ہیں اور سوا آپ کے اور انبیاء موصوف بالعرض ——— اس صورت میں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء کرام کا آخر نہ کہیں بلکہ ان کے اول یا اوسط میں رکھئے تو انبیاء متاخرین کا دین اگر مخالف دین محمدی ہوتا تو اعلیٰ کا ادنیٰ سے منسوخ ہونا لازم آتا، حالانکہ خود فرماتے ہیں: ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نأت بخیر منہا او مثلہا... اور انبیاء متاخرین کا دین اگر مخالف نہ ہوتا تو یہ بات ضرور ہے کہ انبیاء متاخرین پر وحی آتی اور افاضہ علوم کیا جاتا ورنہ نبوت کے پھر کیا معنی؟ سو اس صورت میں اگر وہی علوم محمدی ہوتے تو بعد وعدۂ محکم انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون کیا ضرورت تھی، اور اگر علوم انبیاء متاخرین علوم محمدی کے علاوہ ہوتے تو اس کتاب کا تبیاناً لکل شیء ہونا غلط ہو جاتا۔"

(تحذیر الناس ص۸)

حضرت نانوتوی قدس سرہ آنحضرتؐ کی خاتمیت کبریٰ کی تین قسمیں قرار دیتے ہیں، زمانی، مکانی، مرتبی۔ ان کے نزدیک آیت کریمہ "خاتم النبیین" خاتمیت کی تینوں اقسام پر حاوی ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باعتبار شرف و منزلت کے بھی خاتم النبیین ہیں، باعتبار زمانہ کے بھی،

اسی بعید کا ہو سکتی
(مدلول مطابقی میں خاتمیت کے تینوں اقسام کا)
اطلاق اور عموم مراد) ہے تب تو ثبوت خاتمیت
زمانی ظاہر ہے، ورنہ (اگر ان تینوں اقسام میں
سے صرف ایک قسم مراد ہے تو صرف خاتمیت مرتبی ہو سکتی
ہے، اس میں صورت) تسلیم لزوم خاتمیت زمانی
بدلالت التزامی ضرور ثابت ہے۔ ادھر تصریحات
نبوی مثل: انت منی بمنزلۃ
ہارون من موسیٰ الا انہ
لا نبی بعدی۔ او کما قال۔ جو
بظاہر بطرز مذکور اسی لفظ خاتم النبیین سے ماخوذ
ہے، اس باب میں کافی ہے — کیونکہ یہ مضمون درجۂ
تواتر کو پہنچ گیا ہے، پھر اس پر اجماع بھی منعقد
ہو گیا، گو الفاظ مذکور بسند متواتر منقول نہ ہوں، سو
یہ عدم تواتر الفاظ باوجود تواتر معنوی یہاں ایسا
ہی ہوگا جیسا تواتر اعداد رکعات فرائض و وتر
وغیرہ باوجودیکہ الفاظ حدیث مشعر تعداد رکعات
متواتر نہیں، جیسا اس کا منکر کافر ہے ایسا ہی اس
کا (یعنی ختم نبوت زمانی کا) منکر بھی کافر ہوگا۔"
(تحذیر الناس صفحہ ۱۰)

اور "جوابات محذورات عشرہ" میں فرماتے ہیں کہ تحذیر الناس کے
صفحہ نہم کی سطر دہم سے لے کر صفحہ یازدہم کی سطر
ہفتم تک آیت خاتم النبیین کی وہ تقریر لکھی ہے
جس سے خاتمیت زمانی اور خاتمیت مکانی اور
خاتمیت مرتبی تینوں بدلالت مطابقی ثابت ہو
جائیں۔ اور اسی تقریر کو اپنا مختار قرار دیا ہے،
چنانچہ شروع تقریر سے واضح ہے سو پہلی
صورت میں تو (جب کہ آیت کا مدلول مطابقی
خاتمیت مرتبی کو قرار دیا جائے) تأخر زمانی
بدلالت التزامی ثابت ہوتا ہے ——— اور
دلالت التزامی اگر در بارۂ توجہ الی المطلوب
مطابقی سے کم ہو، مگر دلالت ثبوت اور دلنشینی
میں مدلول التزامی، مدلول مطابقی سے زیادہ
ہوتا ہے، اس لئے کہ کسی چیز کی خبر تحقیق اس کے
برابر نہیں ہو سکتی کہ اس کی وجہ اور علت بھی بیان
کی جائے، اگر کسی شخص کو کسی جدہ پر مسند فرمائیں
تو امیدوار قبول ظہور وجہ ترجیح بے شک خلجان میں
گے۔ اور بعد وضوح وجہ و علت پھر مجال دم زدن
نہیں رہی" (صفحہ)

"الغرض معنی مختار احقر سے کوئی عقیدہ باطل نہ
ہو گیا، بلکہ وہ رخنہ جو در صورت اختیار تأخر
زمانی وانکار و منع خاتمیت مرتبی پڑتا نظر آتا تھا،
بند ہو گیا، پھر تس پر خاتمیت زمانی بھی مدلول "خاتم النبیین"
رہی، البتہ دو شقوں میں سے ایک شق پر تو مدلول
التزامی، اور دوسری شق پر ... مدلول مطابقی"
(صفحہ ۵۱)

حضرت نانوتوی قدس سرہ کی اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین یعنی "آخری
نبی" ہونا قرآن کریم، احادیث متواترہ اور اجماع امت سے ثابت
ہے اور اس کا منکر اسی طرح کافر ہے جس طرح تعداد

مکالمات کا منکر کافر ہے اور یہ کہ آپ کی خاتمیت مرتبی، خاتمیت زمانی کو مستلزم ہے، اگر آپ مراتب نبوت کے خاتم ہیں تو بلاشبہ زمانی نبوت کے بھی خاتم ہیں ——— اس تقریر سے قادیانی نقشہ پردازوں کی ساری منطق غلط ہو جاتی ہے اور "خاتم النبیین" میں ان کی ساری تحریفات باطل ہو کر ثابت ہوتی ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو گی کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پہلے شخص تھے جنہوں نے قادیانی تحریفات کا رد کیا اور قادیانی طائفہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اجرائے نبوت کے قائل ہیں ان کو متواترات دین کا منکر قرار دے کر ان پر کفر کا فتویٰ صادر فرمایا۔

۳- فتویٰ تکفیر قادیانی:

اکابر دیوبند کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کا تعاقب سب سے پہلے شروع کیا اور ۱۳۰۱ھ میں جب مرزا قادیانی نے مجددیت کے پردے میں اپنے الہامات کو "وحی الہٰی" کی حیثیت سے براہین احمدیہ میں شائع کیا تو لدھیانہ کے علماء (مولانا محمد، مولانا عبداللہ، مولانا اسمٰعیل رحمہم اللہ نے جو حضرات دیوبند کے منتسبین میں سے تھے، فتویٰ صادر فرمایا کہ یہ شخص مسلمان نہیں بلکہ اپنے عقائد و نظریات کے اعتبار سے زندیق اور خارج از اسلام ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ دجال قادیان کے حالات سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ اس لئے بعض لوگوں نے جو مرزا قادیانی سے حسن ظن رکھتے تھے علمائے لدھیانہ کی مخالفت میں حضرت گنگوہی سے فتویٰ منگوا لیا۔ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۱ھ کو علمائے لدھیانہ دارالعلوم دیوبند کے جلسۂ سالانہ پر تشریف لے گئے اور قادیانی مسئلہ میں حضرت گنگوہی اور دیگر اکابر سے بالمشافہہ گفتگو فرمائی، رفع نزاع کے لئے دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کو جو صاحب کشف تھے حکم تسلیم کیا گیا اور انہوں نے حسب ذیل تحریری فیصلہ دیا:

"یہ شخص (مرزا غلام احمد قادیانی) میری دانست میں لا مذہب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص نے اہل اللہ کی صحبت میں رہ کر فیض باطنی حاصل نہیں کیا۔ معلوم نہیں اس کو کس کی روح سے اویسیت ہے (عزازیل کی روح سے ہو سکتی ہے) مگر اس کے الہامات اولیاء اللہ کے الہامات سے کچھ مناسبت اور علاقہ نہیں رکھتے۔"

اس تنقیح و تشریح کے بعد حضرت گنگوہیؒ نے بھی مرزا قادیانی اور اس کے پیروؤں کو زندیق اور خارج از اسلام قرار دیا حضرت گنگوہیؒ تمام اکابر دیوبند کے مقتدیٰ تھے۔ ان کا فتویٰ گویا پوری جماعت کا متفقہ فتویٰ تھا۔ یہی وجہ ہے مرزا غلام احمد قادیانی اس ضرب کی ٹیس کو آخری زندگی تک محسوس کرتا رہا۔

مکتوب عربی میں مرزا قادیانی نے ان اکابر امت کو مندرجہ ذیل الفاظ سے نوازا ہے۔

آخرهم شيطان الأعمى والغول الأغوى يقال له رشيد احمد الجنجوهي وهو شقي كالأمروهي ومن الملعونين۔ (۲۵۲)

ان میں سے آخری شخص وہ اندھا شیطان اور بہت گمراہ دیو ہے جس کو رشید احمد گنگوہی کہتے اور وہ (مولانا محمد حسن) امروہی کی طرح شقی اور ملعونوں میں سے ہے۔

(یہ تمام تفصیلات "رئیس قادیان" جلد دوم میں مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری میں ملاحظہ کی جائیں)

دوسرا فتویٰ :

صفر ۱۳۳۲ھ میں دارالعلوم دیوبند سے قادیانی کے خلاف ایک اور فتویٰ جاری ہوا۔ جس پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ رئیس المدرسین دیوبند، مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور دیگر تمام اکابر دیوبند نے دستخط فرمائے اور مشاہیر علمائے ہند کے دستخط ہیں۔ یہ فتویٰ مولانا محمد سہول صاحبؒ کے قلم سے ہے جس میں مرزا غلام احمد قادیانی کے افکار و نظریات اس کی کتابوں سے نقل کرنے کے بعد تحریر فرمایا:

"جس شخص کے ایسے عقائد و اقوال ہوں اس کے خارج از دائرہ اہل سنت والجماعت اور دائرہ اسلام سے خارج ہونے میں کسی مسلمان کو خواہ جاہل ہو یا عالم، تردد نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مرزا غلام احمد اور اس کے جملہ متبعین درجہ بدرجہ مرتد، زندیق، ملحد، کافر اور فرقۂ ضالہ میں یقیناً داخل ہیں ... الخ"

یہ طویل فتویٰ "القول الصحیح فی مکائد المسیح" کے نام سے شائع ہوا۔

تیسرا فتویٰ

۱۲ رجب ۱۳۴۲ھ کو ایک اور مبسوط فتویٰ دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے قلم سے صادر ہوا۔ اس پر بھی تمام مشاہیر علمائے ہند کے دستخط ہیں اور یہ "فتویٰ تکفیر قادیان" کے نام سے طبع ہوا۔

علمائے حرمین کا فتویٰ :-

مکہ و مدینہ (زادہما اللہ شرفاً و عظمۃً) اسلام کا مرکز و منبع ہیں۔ اور وہاں کے علمائے کرام کے فتاویٰ کو ہر دور میں عزت و عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ اکابر دیوبند میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی قدس سرہٗ نے قادیانی کے خلاف "کا فتویٰ صادر فرمایا جس پر دیگر علمائے حرمین کے دستخط ہیں (رئیس قادیان ص)

۴۔ مسئلہ تکفیر اور علمائے دیوبند کا امتیاز

مرزا غلام احمد قادیانی کے خلاف جو فتوے صادر کئے گئے ان میں علمائے دیوبند کا ایک اور خصوصی امتیاز بھی نمایاں ہوا۔ اور وہ تھا ان کا مسلک اعتدال۔ مسئلہ تکفیر بہت ہی نازک مسئلہ تھا۔ ایک مسلمان کو کافر کہنا بہت ہی سنگین جرم ہے اور دوسری طرف کسی کھلے کافر کو مسلمان کہنے پر اصرار کرنا بھی معمولی بات نہیں۔ بدقسمتی سے جس دور میں مرزا غلام احمد قادیانی نے کافرانہ دعوے کئے عام طور سے لوگ اس مسئلہ میں افراط و تفریط کا شکار تھے۔ ایک گروہ مرزا غلام احمد قادیانی کے صریح کفریات پر اسے کافر کہنے کو خلاف مصلحت سمجھتا تھا اور دوسرا گروہ وہ تھا جس نے کسوں کے ساتھ کھیل کھیلنے کا مشغلہ شروع کر رکھا تھا۔

پہلے گروہ کی تفریط قادیانی تحریک کو انگیز کر رہی تھی۔ اور قادیانی ملاحدہ بڑے طمطراق سے ایسے لوگوں کو پیش کر دیتے تھے جو انہیں کافر نہیں سمجھتے اور دوسرے گروہ کے افراط نے خود مسئلہ تکفیر کی مٹی پلید کر دی تھی۔ اور قادیانی ملاحدہ ان کے تکفیری فتووں کے طومار کو لوگوں کے سامنے پیش کر کے یہ کہہ دیتے تھے کہ مولویوں کے پاس کفر بڑا سستا ہے۔ یہ ہر شخص کو جو ان کے خیالات کے خلاف کوئی بات کہہ دے، فوراً کفر کا تحفہ پیش کر دیا کرتے ہیں۔

ان دونوں گروہوں کا طرز عمل نہ صرف افسوسناک تھا بلکہ اس سے خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ خدانخواستہ ان لوگوں کی بے احتیاطی

اور افراط و تفریط سے کفر و اسلام کی حدود ہی مٹ کر نہ رہ جائیں۔ حق تعالیٰ شانہ، علمائے دیوبند کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے آگے بڑھ کر اسلام اور کفر کے حدود کو متمیز کیا اور لوگوں کو بتایا کہ اسلام اور کفر کے درمیان خط فاصل کیا ہے اور وہ کون سی حد ہے جس کو عبور کر لینے کے بعد آدمی صریح اسلام سے خارج ہو کر کفر کے خارزار میں جا نکلتا ہے۔ اس موضوع پر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے "اکفار الملحدین فی شئ من ضروریات الدین" میں تحقیق و تفتیش کا حق ادا فرمایا۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مدظلہ صاحب نے اردو میں "وصول الافکار الی اصول الاکفار" نامی رسالہ تحریر فرمایا اور دیگر اکابر دیوبند نے بھی اس موضوع پر رسائل تحریر فرمائے۔ اس مسئلہ کو خوب منقح کر دیا۔ اصول تکفیر پر مفصل لکھنے کی ان سطور میں گنجائش نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ امور جن کا دین محمدی میں داخل ہونا تواتر یا شہرت سے ثابت ہے وہ "ضروریات دین" کہلاتے ہیں۔ ان سب کو ایک ایک کر کے تسلیم کرنا اسلام ہے اور ان میں سے کسی ایک کا انکار کر دینا یا تاویل کے ذریعہ ان میں سے کسی ایک کے مفہوم کو بدل ڈالنے کا نام کفر ہے۔

علمائے دیوبند نے مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروؤں کی تحریفات پیش کر کے واضح کیا کہ یہ لوگ "ضروریات دین" کے منکر ہیں۔ اس لئے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

بعض لوگوں نے اسلام اور کفر کے فیصلہ کے لئے ایک آسان سا اصول تلاش کر لیا ہے کہ جو شخص کلمہ پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو بس وہ مسلمان ہے۔ ورنہ کافر۔ ظاہر ہے کہ یہ اصول صریحاً غلط ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص کلمہ پڑھتا ہے، نماز روزے کا قائل ہے بہت سی عبادت و ریاضت بھی کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ نعوذ باللہ قرآن کی فلاں آیت ثابت نہیں، کیا ایسے شخص کو مسلمان تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اب ذرا غور کیجئے کہ قرآن کریم کا کلام الٰہی ہونا ہمیں کس ذریعے سے معلوم ہوا؟ ہر شخص اس کا جواب یہی دے گا کہ قرآن کا قرآن ہونا امت کے تواتر سے ثابت ہے۔ چودہ سو سال سے یہی قرآن مسلمانوں کے پاس تواتر سے چلا آتا ہے۔ یہی قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ اس لئے اس کے کسی ایک حرف میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ پس جس طرح قرآن کریم کے ہمارے تک پہنچنے کا ذریعہ امت اسلامیہ کا تواتر ہے اور اس تواتر کا منکر کافر ہے۔ اسی طرح دین محمدی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں سے جو چیزیں ہمیشہ سے مسلّم چلی آتی رہی ہیں ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ اور پھر صرف الفاظ کے تواتر کو تسلیم کر لینا کافی نہیں بلکہ قرآن کریم کی کسی آیت یا کسی متواتر عقیدہ کا جو مفہوم و معنی امت میں ہمیشہ سے مسلّم رہا ہے اس کا تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔ ورنہ اس کا انکار کر کے قرآن کریم یا احادیث متواترہ کو نئے معنی پہنانا کفر ہی کی ایک قسم ہے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک تمام مسلمان یہ تسلیم کرتے آئے ہیں کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے آخری زمانہ میں نازل ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ ان سے مراد وہی اسرائیلی پیغمبر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل مبعوث ہوئے تھے۔ اس کے برعکس مرزا غلام احمد اور مرزائی امت کا یہ دعویٰ ہے کہ عیسیٰ بن مریم سے مراد غلام احمد ہے۔ دمشق سے مراد قادیان ہے۔ مسجد اقصیٰ سے مراد قادیان کی مسجد ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان تمام مضحکہ خیز تاویلوں کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک کسی نے عیسیٰ بن مریم کا مطلب نہیں سمجھا اور نعوذ باللہ پوری کی پوری ملت اسلامیہ گمراہ اور کافر و مشرک رہی۔ کیا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح تکذیب اور امت کے کروڑوں اکابر کی تحمیق و تجہیل نہیں؟ اگر اس کے بعد بھی ایک شخص کو دائرہ اسلام میں پناہ مل سکتی ہے تو کہنا چاہیے کہ اسلام کا کوئی متعین مفہوم ہی سرے سے موجود نہیں

حاصل ہے کہ اسلام کے کسی ایک قطعی مسئلہ کا قطعی معنوی اعتقاد دامن پکڑے
رہ جاتا ہے۔

۵۔ علمائے دیوبند تحقیق کے میدان:

مرزا غلام احمد قادیانی جن نظریات و افکار کا اظہار کیا اور جس طرح اسلام کے مسلم امور میں قطع و برید کی، واقعہ یہ ہے کہ کوئی شخص امانت و دیانت کے ساتھ ان کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس کی توقع صرف اس شخص سے کی جا سکتی ہے جو خلل دماغ کے عارضہ میں مبتلا ہو یا دین و ایمان غارت کر کے اس نے اپنے اغراض مشئومہ کی تکمیل کی ٹھان لی ہو اسلئے غلام احمد قادیانی اور اس کے مخصوص حواریوں کے بارے میں علمائے دیوبند کی قطعی رائے یہ تھی کہ یہ لوگ اس حد کو عبور کر چکے ہیں جس سے واپسی ممکن ہے۔ یہ ظلی بروزی نبوت کا دعویٰ اور مسیحیت و مہدویت کے دعوے ایک سوچی سمجھی سکیم کا نتیجہ ہیں اور اس کے پردہ میں مخصوص اغراض و مقاصد کار فرما ہیں۔ البتہ عام لوگ جو کسی غلط فہمی سے قادیانیت کے دام فریب کا شکار ہیں ان کی اصلاح ضروری ہے۔ اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی اور دیگر مرزائی لیڈروں نے جو غلط فہمیاں امت میں پھیلا دی ہیں ان کا ازالہ بھی لازم ہے۔ اس مقصد کے لئے علمائے دیوبند نے رد قادیانیت پر قلم اٹھایا اور قادیانی فتنہ پردازوں کے تمام شبہات کا جواب لکھا۔ اس موضوع پر جس قدر کتابیں لکھی گئیں ہیں غالباً کسی مذہبی تحریک پر اتنا لٹریچر تیار نہیں ہوا ہوگا۔

اس سلسلہ میں امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ (المتوفی ۱۳۵۲ھ) اور حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ (المتوفی   ) کا کارنامہ ناقابل فراموش ہے۔ ان حضرات نے اور ان کے اصحاب و تلامذہ نے قادیانیت سے متعلق بیسیوں بیش قدر کتابیں تالیف فرمائیں۔ اور امت اسلامیہ کو قادیانی دجل و فریب سے آگاہ کرنے کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیں۔ یہاں اکابر دیوبند اور ان کے متوسلین کی تالیف کردہ کتابوں کی ایک مختصر سی فہرست پیش کی جاتی ہے۔

نمبر	کتاب	مصنف
۱	الشہاب	مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
۲	القادیانی والقادیانیہ	مولانا ابوالحسن علی ندویؒ
۳	ایمان وکفر	مفتی محمد شفیع دیوبندی
۴	آئینہ قادیانی	محمد عبدالرحمن مونگیر
۵	آئینہ کمالات مرزا	
۶	المتنبی القادیانی	مولانا مفتی محمود
۷	التصریح بما تواتر فی نزول المسیح	مولانا انور شاہ کشمیریؒ
۸	اکفار الملحدین	〃 〃 〃
۹	الاسس السیاسیہ للحرکۃ القادیانیۃ	سید عباسی
۱۰	الانکلیز والقادیانیۃ	محمد عمر
۱۱	الہامات مرزا	مولانا ثناء اللہ امرتسری
۱۲	القول المحکم	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۱۳	اسلام اور مرزائیت کا اصولی اختلاف	〃 〃 〃
۱۴	اطلاع رحمانی	مولانا محمد اسحاق رحمانی
۱۵	اغلاط ماجدیہ	مولانا عبداللطیف رحمانی
۱۶	اکھنڈ بھارت	مولانا محمد شریف جالندھری
۱۷	اسلامی تبلیغی انسائیکلوپیڈیا	مولانا مفتی محمد شفیع
۱۸	الکاویہ علی الغاویہ	مولانا محمد عالم آسی
۱۹	اثر ابلیس	مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری
۲۰	ایمان کے ڈاکو	〃 〃 〃
۲۱	اردو ترجمہ اکفار الملحدین	مولانا محمد ادریس میرٹھی
۲۲	اسلام اور مرزائیت	مولانا عتیق الرحمن
۲۳	انگریزی نبی	مولانا منظور احمد چنیوٹی
۲۴	مرزائیوں کا عبرتناک انجام	〃 〃 〃
۲۵	امین الملک جے سنگھ	
۲۶	ابالی گرگٹ	
۲۷	خدا کی تلاش	
۲۸	اسلام اور سائنسی معلومات	مرتضیٰ خان میکش
۲۹	اشد العذاب	مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری
۳۰	اول السبعین	〃 〃 〃
۳۱	صیحۃ الحق	
۳۲	ثانی السبعین	〃 〃
۳۳	قادیان میں زلزلہ	〃 〃 〃
۳۴	پاکستان میں مرزائیت	مرتضیٰ خان میکش
۳۵	پاکستان کا غدار	مولانا عبداللطیف
۳۶	ترک مرزائیت	مولانا لال حسین اختر
۳۷	تفسیر رحمانی	ابواحمد رحمانی
۳۸	تنبیہ رحمانی	〃 〃 〃
۳۹	تحیۃ الاسلام	مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ
۴۰	تازیانہ عبرت	مولانا کرم الدین جہلمی
۴۱	تحقیق لاثانی	محمد ایوب سنوری
۴۲	تکمیل دین اور ختم نبوت	چوہدری افضل حق
۴۳	چودھویں صدی کے مدعیان نبوت	مولانا محمد عالم آسی
۴۴	حقیقت مرزائیت	مولانا علم الدین
۴۵	حقیقت مرزائیت	مولانا عبدالکریم
۴۶	مسیح علیہ السلام مرزا قادیانی کی نظر میں	مولانا لال حسین اختر
۴۷	پانچ سوالوں کا جواب	فرزند توحید
۴۸	حقیقت مرزا	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۴۹	تحقیق ناقد	عبدالکریم ناقد
۵۰	حیات ونزول مسیح	ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

نمبر	کتاب	مصنف
۵۱	علم مرزا	مولانا لال حسین اختر
۵۲	حیات عیسیٰ علیہ السلام	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۵۳	خاتم النبیین	علامہ انور شاہ کشمیری
۵۴	ختم النبوت فی القرآن	مولانا محمد شفیع دیوبندی
۵۵	ختم نبوت فی الحدیث	۔ ۔ ۔
۵۶	ختم نبوت فی الآثار	۔ ۔ ۔
۵۷	ختم نبوت اور بزرگان امت	مولانا لال حسین اختر
۵۸	ختم نبوت اور نزول عیسیٰ علیہ السلام	مولانا عبد الرشید
۵۹	ختم نبوت	مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی
۶۰	خواجہ غلام فرید چشتی اور مرزا غلام احمد قادیانی	مولانا لال حسین اختر
۶۱	الخطاب الملیح فی تحقیق المہدی والمسیح	مولانا اشرف علی تھانویؒ
۶۲	دعاوی مرزا	مولانا مفتی محمد شفیع
۶۳	دعاوی مرزا	مولانا اللہ وسایا مبلغ ڈالپور
۶۴	دین مرزا کفر خالص	مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری
۶۵	دلچسپ داستان	مولانا منظور احمد چنیوٹی
۶۶	دوسری شہادت آسمانی	ابو احمد رحمانی
۶۷	دعاوی مرزا	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۶۸	رئیس قادیان	مولانا ابو القاسم رفیق دلاوری
۶۹	شرائط نبوت	مولانا محمد ادریس کاندھلوی ۔
۷۰	صاعقہ آسمانی بر فتنہ قادیانی	حکیم محمد یعقوب
۷۱	صحیفہ رحمانی	ابو احمد رحمانی
۷۲	صحیفہ رحمانی ۱۳	۔ ۔
۷۳	صحیفہ رحمانی ۱۵	۔ ۔
۷۴	صحیفہ رحمانی ۱۶	۔ ۔
۷۵	چیلنج محمدیہ بنام صحیفہ احمدیہ	ابو محمود محمد اسحاق
۷۶	صحیفہ رحمانی ۱۹	ابو محمود محمد اسحاق
۷۷	صحیفہ رحمانی ۲۳	۔ ۔ ۔
۷۸	نامہ حقانی کشف مسیح قادیانی ۲۴	۔ ۔ ۔
۷۹	صحیفہ ۳۴	۔ ۔ ۔
۸۰	صولت محمدیہ بر فرقہ احمدیہ	حافظ محمد عبد السلام
۸۱	صحیفہ رحمانیہ ۲۷	محمد اسحاق
۸۲	عقیدۃ الاسلام جلد ۲	مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ
۸۳	عشرہ کاملہ	جناب محمد یعقوب پٹیالوی
۸۴	عقیدۃ الامۃ فی معنی ختم النبوۃ	علامہ خالد محمود
۸۵	عبرت ناک موت	مولانا لال حسین اختر
۸۶	علامات قیامت اور نزول مسیح علیہ السلام	مولانا محمد رفیع عثمانی
۸۷	فتویٰ تکفیر قادیان	مختلف بیانات علماء اسلام کے
۸۸	فیصلہ آسمانی حصہ اول	مولانا ابو احمد رحمانی
۸۹	تتمہ فیصلہ آسمانی حصہ دوم	۔ ۔ ۔
۹۰	فیصلہ آسمانی حصہ دوم	۔ ۔ ۔
۹۱	فیصلہ آسمانی حصہ سوم	۔ ۔ ۔
۹۲	فتنہ مرزائیت	محمد امیر الزمان کشمیری
۹۳	فتنہ قادیانیت	مولانا بنوری
۹۴	فتنہ مرزائیت اور مسئلہ ختم نبوت	محمد اکرم زاہد
۹۵	قادیانی نبوت	ابو سیف عتیق الرحمن فاروقی
۹۶	قادیانی فتنہ	مولانا عتیق الرحمن
۹۷	قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ	مولانا محمد منظور نعمانی
۹۸	قادیانی نبوت کا خاتمہ	مفتی محمد نعیم لدھیانوی
۹۹	قادیانی مفتی کا جھوٹ اسہال میں وصال	مولانا لال حسین اختر
۱۰۰	قادیانیت	مولانا ابو الحسن علی ندوی

نمبر	کتاب	مصنف
۱۰۱	قادیانی دجل کا جواب	قاضی مظہر حسین چکوال
۱۰۲	قادیانی ریشہ دوانیاں	مولانا لال حسین اختر
۱۰۳	کشف الستار عن القادیانیہ نیز قلیۃ الاستتار	مولوی محمد عمر ملتانی
۱۰۴	کشف تلبیس	حافظ محمد اسحاق
۱۰۵	مرزائیوں کی سیاسی کارروائی (مولانا محمد علی جالندھری کی تقریر)	مرتبہ سعید الرحمن علوی
۱۰۶	کفر و اسلام کی حدود اور قادیانیت	مولانا محمد منظور نعمانی
۱۰۷	کذبات مرزا	ابوعبیدہ نظام الدین کراچی
۱۰۸	لطائف الحکم فی اسرار نزول عیسیٰ ابن مریم	مولانا محمد ادریس صاحب
۱۰۹	مرزا غلام احمد کی تصویر کے دو رُخ	جانباز مرزا
۱۱۰	مرزائیت کا سیاسی محاسبہ	" "
۱۱۱	مرزائیت سے اسلام تک	اللہ وسایا ڈیروی
۱۱۲	مسلمان کون ہے اور کافر کون	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۱۱۳	معیار صداقت	سید ابو احمد رحمانی
۱۱۴	مسلک الختام فی ختم نبوت خیر الانام	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۱۱۵	مسئلہ ختم نبوت علم و عقل کی روشنی میں	مولانا محمد اسحاق سندیلوی
۱۱۶	منکوحہ آسمانی	ابوعبیدہ
۱۱۷	مولانا نانوتوی پر مرزائیوں کا بہتان	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۱۱۸	مرزائیوں کے خطرناک ارادے	مرتبہ مولانا عبدالرحیم صاحب
۱۱۹	مرزائیت عدالت کے کٹہرے میں	جانباز مرزا
۱۲۰	مسلمانوں کو مرزائیت سے نفرت کیوں ہے؟ اور مرزا کے حسنات اقوال	حضرت مولانا احمد علی لاہوری
۱۲۱	میں نے مرزائیت کیوں چھوڑی	مرتبہ قاضی خلیل احمد
۱۲۲	مرزا غلام احمد کی آسان پہچان	مولانا عبدالرحیم اشعر
۱۲۳	مرزا قادیانی اور غیر محرم عورتیں	مجلس تحفظ ختم نبوت کوئٹہ
۱۲۴	مسلمانوں کی نسبت مرزائیوں کا عقیدہ مع تبصرہ	مولانا لال حسین اختر
۱۲۵	مرزا بشیر الدین (خلیفہ قادیانی جواب دیں)	مولانا محمد علی جالندھری
۱۲۶	نزول عیسیٰ	مولانا عبدالسلام صاحب
۱۲۷	نبوت قادیانی	انجمن تائید اسلام
۱۲۸	نصرت اسلام (مناظرہ مابین خادم محمد صادق فتح تدبیر)	
۱۲۹	وزیر خارجہ	جانباز مرزا
۱۳۰	ہدایۃ المقتدی عن غواۃ المفتری	مولانا محمد عبدالغنی خان
۱۳۱	مرزائی نامہ	مولانا مرتضیٰ احمد میکش

یہ معلوم کتابوں کی فہرست ہے ورنہ تلاش و جستجو کی جائے تو بہت سی کتابیں اور بھی ہوں گی، بیشتر نایاب ہو چکی ہیں۔

میدان مباحثہ

مرزا غلام احمد قادیانی کی ساری تگ و دو کاغذی پتنگ بازی تک محدود تھی، انہوں نے علمائے امت کو للکارنے اور پھر قادیان کی "بیت الفکر" کے گوشۂ عافیت میں پناہ گزیں ہو جانے کا فن بطور خاص ایجاد کیا تھا۔ مرزا صاحب کی اس حکمت عملی سے مباحثہ کی اول تو نوبت ہی نہ آتی، اگر مرزا صاحب کی بدقسمتی سے اس کا موقع آ ہی جاتا تو ان کی شکست و ناکامی ہی "فتح مبین" کا روپ اختیار کر لیتی تھی۔ یہاں بطور مثال چند واقعات کا مختصر تذکرہ کافی ہوگا

۳ رمئی ۱۸۹۱ء کو مرزا صاحب نے علمائے لدھیانہ کو مناظرہ کا چیلنج کیا کہ حیات مسیح پر مجھ سے مناظرہ کر لیں۔ علماء لدھیانہ نے جواب دیا کہ ہم آج سے آٹھ سال پہلے آنجناب کے کفر اور خروج از اسلام کا فتویٰ دے چکے ہیں۔ اس لئے کوئی جگہ تجویز کر کے ہمیں مطلع کیجئے ہم بلا تاخیر وہاں پہنچ جائیں گے۔ آنجناب پہلے اپنا اسلام ثابت کر کے دکھائیں۔ اس کے بعد حیات مسیح اور دیگر مسائل پر بھی گفتگو ہو جائے گی۔ لیکن مرزا صاحب نے اس کے جواب میں "خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید" پر عمل کیا۔ اور علماء لدھیانہ کا چیلنج آج تک قائم ہے کوئی قادیانی اس کا جواب نہیں دے سکا۔ نہ انشاء اللہ قیامت تک دے سکتا ہے (اس مباحثہ طلبی کی روئداد رئیس قادیان جلد دوم ص ۲۵

(مثلاً مباحثات ... ملاحظہ فرمائیے)

۲- مرزا صاحب کے بیٹے صاحبزادہ مرزا بشیر احمد ایم اے نے سیرت المہدی صفحہ ۲۲ جلد اول میں مرزا صاحب کے پانچ مباحثوں کا ذکر کیا ہے ایک سکھ سے، ایک عیسائی سے اور تین مسلمانوں سے۔ بدقسمتی سے اگر ان میں سے چاروں کی روداد پڑھ کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ مرزا صاحب میدان چھوڑ کر بھاگ گئے اور بعد میں ان کی شکست فتح مبین قرار پائی ——— اور پانچویں مباحثے میں تو مولانا عبدالحکیم کلانوری نے مرزا صاحب سے دعوائے نبوت سے توبہ کرائی، اور ان سے یہ تحریر لی کہ وہ آئندہ نبوت کا لفظ استعمال نہیں کیا کریں گے۔ یہ ان کی پہلی فتح مبین تھی۔ لیکن بعد میں مرزا صاحب نے توبہ توڑ ڈالی، اور اس تحریری توبہ نامے سے انحراف کیا۔ یہ ان کی دوسری فتح مبین تھی۔ (اس کی تفصیل مرزا صاحب کے اشتہارات میں موجود ہے)

۳- مرزا صاحب نے جب دیکھا کہ مباحثات کی وادی پرخار میں اُن کے پاؤں شل ہو چکے ہیں اور مباحثوں میں ان کی ذلت نما فتح دن بدن نمایاں ہو رہی ہے تو انہوں نے یہ الہامی اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ علماء سے مباحثہ نہیں کیا کریں گے (انجام آتھم ص۲۸۲) یہ مرزا صاحب کی فتح کا آخری اعلان تھا۔

۴- مرزا صاحب کے اس بہادرانہ اعلان کے بعد لازم تھا کہ قادیانی صاحبان کبھی مناظرہ و مباحثہ کا نام نہ لیتے، لیکن انہیں شاید یہ احساس تھا کہ وہ علم و فضل اور فہم و دانائی میں مرزا صاحب سے فائق ہیں، اس لئے اگر مرزا صاحب نے مناظروں اور مباحثوں سے توبہ کر لی ہے تو یہ حکم صرف انہی کی ذاتی لیاقت سے متعلق ہے ان کی امت پر اس کی تعمیل واجب نہیں۔ چنانچہ قادیانی مبلغ مرزا صاحب کے اس اعلان کے بعد بھی مناظرے کے چیلنج کرتے رہے (خود مرزا صاحب کی زندگی میں بھی، اور ان کے انتقال پرملال کے بعد بھی)، مناظروں کی نوبت اکثر پیش آئی نتیجہ وہی فتح بصورت شکست۔ مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری جو دارالعلوم دیوبند کے رئیس المناظرین تھے اور جنہیں قادیانی خاندان سے گفتگو اور مباحثہ کے بہت سے مواقع پیش آئے تھے، قادیانی مباحثوں پر بلیغ تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"علماء اسلام نے مرزا صاحب کی خرافات باطلہ کا پورا رد اور خود ان کا کذب و مفتری ہونا ایسا ثابت کر دیا کہ منصف کے لئے تو کافی ہی ہے، مرزائی ہٹ دھرموں کے بھی منہ بند کر دئے، اور قلم توڑ دئے، اور ان کو جواب کی تاب نہ رہی، البتہ اب نہ مناظرہ کی فرصت، نہ مباہلہ کی، فقط جاہل مریدوں کو جہنم تک پہنچانے کے لئے یہ راہ اختیار کی جاتی ہے کہ کہیں مناظرہ کا اشتہار، کہیں مباہلہ کا چیلنج۔ ورنہ وہ نہ مناظرہ کر سکیں، نہ مباہلہ

نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے
یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں

ہمیں عام مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ علماء اسلام اپنا فرض ادا فرما چکے، اور نہ ماننا اور نہ تسلیم کرنا یہ محض ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے ہے، ورنہ مناظرے بھی ہو چکے، اور جس کو فتح دینی تھی اور جس کو ذلیل کرنا تھا وہ بھی ہو چکا ——— سرور شاہ (قادیانی) امیر وفد مونگیر سے دریافت کر لو حافظ روشن علی صاحب، مختار احمد صاحب شاہجہانپوری غلام رسول پنجابی (قادیانی مناظر) ان میں سے جو زندہ ہوں ان سے دریافت کر لو ——— ضلع مونگیر و بھاگلپور کے رہنے والوں سے دریافت کر لو ——— مونگیر کے مناظرہ

میں) جب ذلت کی کوئی حد باقی نہ رہی تو امیر وفد نے
فرمایا کہ "یہ بھی حضرت کی پیشگوئی پوری ہوئی کہ ایک
جگہ تمہیں ذلت ہوگی" جی ہاں! کیوں نہیں۔ اگر اسی
بدعقیدہ پر مر گئے جب بھی خدا چاہے، پیشگوئی ہی
پوری ہوگی۔" (صحیفۃ الحق ص ۳۱۲)

۵۔ علمائے دیوبند کے جواب میں ۱۶ جولائی ۱۹۲۵ء کے "الفضل"
میں خاص مرزا محمود صاحب کے قلم سے قرآن دانی کے دو چیلنج
شائع ہوئے، مولانا سید مرتضیٰ حسن دیوبندیؒ نے "قادیان میں
قیامت خیز بھونچال" میں اس کا جواب تحریر فرمایا، اس کی تمہید
میں لکھتے ہیں:

"دونوں پرچوں کے مضامین کے جواب کا نام واقعہ
الواقعہ اور لقب عذاب اللہ الشدید
علی المنکر العنید ہے، جس میں ڈیڑھ سو سے
زائد قادیانیوں کی وہ شکستیں اور علمائے دیوبند کی وہ
صاف اور ظاہر فتحیں اور قیامت خیز نصرتیں بیان کی گئی
ہیں کہ مرزا محمود صاحب تو کیا اگر خود بالفرض مرزا صاحب
بھی بروز فرمائیں تو ان کو، خدا چاہے بجز اقرار یا سکوت
اور عدم بخود ہونے کے کوئی چارہ ہی نہ ہوگا، چونکہ وہ رسالہ
طویل ہو گیا ہے، طبع میں کچھ دیر ہوگی، بدیں وجہ صرف خلیفہ
صاحب کے چیلنج کے متعلق یہ "زلزلۃ الساعۃ" نمونے کے طور
پر شائع کیا جاتا ہے۔"

اس کے بعد حضرت نے مرزا محمود صاحب کے چیلنج کا ذکر کرتے ہوئے
انہیں تین ہفتے میں اس کا جواب لکھنے کی فرمائش کی، اس کے بعد حضرت نے
عمل کرتے ہوئے سکوت ہی اختیار فرمایا، اسی رسالہ میں خلیفہ صاحب کو خطاب
کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

صاحبزادہ صاحب! آپ اور معارف قرآنیہ بیان
فرمائیں؟ اور وہ بھی علمائے دیوبند کے مقابلہ؟

ع ہر زباں کا گفتہ داناؤں کے سامنے
ہے جیسے [illegible] کے مقابلے

سو دو ایک گھنٹہ میں فیصلہ ہوتا ہے! ہمارا خیال ہے
کہ معارف قرآنیہ تو درکنار، آپ تو علمائے مستقیم
کے دو چار ورق بھی صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ کر اس کی
عبارت کا صحیح مطلب بیان نہیں کر سکتے، مثلاً لاہور،
امرتسر، لدھیانہ، پشاور۔ اور قادیان جہاں چاہیں تو کوئی
بڑے بڑے محققین اسلام نے جو کتابیں لکھی ہیں اور جن میں معارف
الٰہیہ کو بیان کیا ہے، جو جگہ ہم تجویز کریں اسی جگہ سے کتاب
کے دو ورق کی صحیح عبارت مجمع عام میں پڑھ کر بالفاظ
ترجمہ کرنے کے بعد مطلب صحیح بیان کر دو، اگر مطلب
غلط بیان کیا تو اسی مجمع میں آپ پر اعتراض کیا جائے گا
آپ جواب دیں، اگر آپ نے صحیح عبارت پڑھ کر صحیح
مطلب بیان کر دیا تو ہم مجمع عام میں یہ اقرار کریں گے
کہ مرزا محمود صاحب کو عبارت پڑھنے کا سلیقہ ہے" (ص ۱۰)

مرزا محمود نے اس کے جواب میں ایسی چپ سادھی کہ "فبہت الذی
کفر" کا مضمون صادق آیا۔

۶۔ مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ نے ایک رسالہ "اقبل السبیین"
کے نام سے تحریر فرمایا، جس میں لاہوری جماعت کے امیر مسٹر
محمد علی صاحب اور قادیانی جماعت کے خلیفہ مرزا محمود صاحب
سے مسئلہ نبوت کے بارے میں ان کے مذہب کی وضاحت
طلب کرنے کے لئے ستر سوالات کئے، اور یہ بھی تحریر فرمایا
کہ جواب خواہ دونوں امیر صاحبان خود لکھیں، یا اپنے کسی

بات ہے کہ آئی مگر حضرات دونوں صاحبوں کے ہونے لازمی قادیانی امت کے خطاس سوال کے جواب سے عاجز ہے اب تک خاموش ہیں۔

- پہلے مونگیر کا تذکرہ مولانا مرتضیٰ حسنؒ کی جماعت میں ابھی اوپر گذر چکا ہے جس میں قادیانیوں کو ذلت آمیز شکست ہوئی اور مرزائیوں کے امیر مقدسرور شاہ کو بھی ذلت کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہ رہا۔ اسی نوعیت کا ایک مباحثہ فیروزپور میں ہوا جس میں قادیانیوں نے من مانی شرائط پر مناظرہ کیا لیکن علمائے دیوبند کے ہاتھوں ایسی شکست اٹھائی کہ انہیں مدت تک نہ بھولی۔ اس مباحثہ کا مختصر سا تذکرہ "بیس بڑے مسلمان" میں بالفاظ ذیل کیا گیا ہے:

"فیروزپور میں مرزائیوں کے ساتھ ایک مناظرہ طے پایا، اور عام مسلمانوں نے جو فن مناظرہ سے نا واقف تھے مرزائیوں کے ساتھ بعض ایسی شرائط پر مناظرہ طے کریں، جو مسلمان مناظرین کے لئے خاصی پریشانی کن ہو سکتی تھیں، دارالعلوم دیوبند کے اس وقت کے صدر مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت (مولانا محمد انورؒ) شاہ صاحب (کشمیری کے مشورے سے مناظرے کے لئے حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوریؒ، حضرت مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ تجویز ہوئے۔ یہ حضرات جب فیروزپور پہنچے تو مرزائیوں کی شرائط کا علم ہوا کہ انہوں نے کس دجل سے من مانی شرائط سے مسلمانوں کو جکڑ لیا ہے۔ اب دو ہی صورتیں تھیں کہ یا تو ان شرائط پر مناظرہ کیا جائے یا پھر انکار کر دیا جائے، پہلی صورت مضر تھی۔ دوسری صورت مسلمانوں کی فرنیقین کے لئے شکل کا باعث ہو سکتی تھی کہ دیکھو تمہارے مناظر بھاگ گئے۔ انجام کار انہی شرائط پر مناظرہ منظور کر لیا گیا، اور حضرت شاہ صاحبؒ کو تار دیا گیا۔ اگلے روز مقررہ وقت پر مناظرہ شروع ہو گیا، اور عین اسی وقت دیکھا گیا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بنفس نفیس حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں، انہوں نے آتے ہی اعلان فرما دیا کہ جائیے ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ تم نے جتنی شرائط مسلمانوں سے منوالی ہیں اتنی شرائط اور من مانی لگوالو۔ ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں، مناظرہ کرو اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو، چنانچہ اسی بات کا اعلان کر دیا گیا، اور مفتی صاحب مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور مولانا سید بدر عالم صاحب نے مناظرہ کیا، اس میں مرزائیوں کی جو درگت بنی اس کی گواہی آج بھی فیروزپور کے در و دیوار دے سکتے ہیں، مناظرے کے بعد شہر میں جلسہ عام ہوا، جس میں شاہ صاحبؒ اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے تقریریں کیں۔ یہ تقریریں فیروزپور کی تاریخ میں یادگار خاص کی نوعیت رکھتی ہیں، بہت سے لوگ جو قادیانی دجل کا شکار ہو چکے تھے۔ اس مناظرہ اور جلسہ کے بعد اسلام میں واپس لوٹ آئے۔"

(صفحہ ۲۹۴ طبع سوم)

خلاصہ یہ کہ مرزائیوں کے ساتھ علمائے دیوبند کے سینکڑوں تقریری

و تحریری مباحثے ہوئے اور بحمد اللہ ہر موقع پر قادیانیوں کو میدان ہارنا پڑا۔ اس سلسلہ میں علمائے دیوبند کی جانب سے متواتر ایک سال تک اشتہارات بھی نکلتے رہے مگر قادیانیوں نے جواب دینے سے توبہ کر لی۔

۷۔ عدالت کے کٹہرے میں

مرزا غلام احمد قادیانی ایک زمانہ میں سیالکوٹ کچہری میں محرری کے فرائض انجام دیتے تھے، نیز اسی زمانہ میں منصفی کے امتحان کی بھی تیاری کی تھی جس میں ناکامی ہوئی۔ اس لئے مرزا غلام احمد اور اس کی ذریت کو "مقدمہ بازی" کا خوب شوق تھا لیکن قسمت کا پھیر کچھ ایسا تھا کہ انہیں ہمیشہ ناکامی ہی ہوئی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے زمانہ میں جو مقدمہ بازی ہوئی اس کا تذکرہ قادیانی لٹریچر میں بھی موجود ہے، کچھ مقدموں کی روئداد محترم مرزا جانباز کی کتاب "مرزائیت عدالت کے کٹہرے میں" نیز مولانا ابو القاسم رفیق دلاوری کی "رئیس قادیان" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے — یہاں صرف دو مقدموں کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی طبعی جبلت کے مطابق حضرت مولانا کرم الدین صاحب سکنہ موضع بھیں جہلم (حضرت مولانا قاضی مظہر حسین چکوالی کے والد ماجد) کے حق میں ناشائستہ الفاظ استعمال کئے تھے، مولانا نوجوان تھے انہوں نے مرزا قادیانی کو عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا، اور جہلم میں ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر دیا قادیانی گروہ نے یہ مقدمہ جہلم سے گورداسپور منتقل کرا لیا بہرحال یہ مقدمہ ایک طویل مدت تک مرزا قادیانی اور ان کی ذریت کے لئے تماشا عبرت بنا رہا۔ بالآخر عدالت نے مرزا قادیانی کو مجرم قرار دیتے ہوئے اس پر جرمانہ عائد کیا۔ جو عدالت بالا میں قادیانی اپیل پر معاف کیا گیا — اس مقدمہ کی دلچسپ روداد اس زمانہ میں سراج الاخبار جہلم اور دیگر اخبارات میں شائع ہوتی رہی بعد ازاں "تازیانہ عبرت" کے نام سے مولانا کرم الدین کی شکل میں بھی شائع ہوئی، جو غالباً مولانا قاضی مظہر حسین صاحب سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

۲۔ دوسرا مقدمہ "بہاولپور" کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقدمہ کی تقریب یہ ہوئی کہ ایک مسلمان لڑکی مسماۃ عائشہ بنت مولوی الٰہی بخش کا شوہر مسمی عبدالرزاق ولد نظام محمد اسلام سے مرتد ہو کر مرزائی بن گیا تھا، زوجہ کی طرف سے ۲۴ جولائی ۱۹۲۶ء کو احمد پور شرقیہ کی عدالت میں دعویٰ کیا گیا کہ:

> "مدعیہ اب تک نابالغ رہی ہے۔ اب عرصہ دو سال سے بالغ ہوئی ہے مدعا علیہ ناکح مدعیہ نے مذہب اہلسنت والجماعت ترک کر کے قادیانی مذہب اختیار کر لیا ہے اور اس وجہ سے وہ مرتد ہو گیا ہے، اس کے مرتد ہو جانے کے باعث مدعیہ اب اس کی منکوحہ نہیں رہی کیونکہ وہ شرعاً کافر ہو گیا ہے اور بموجب احکام شرع شریف بوجہ ارتداد مدعا علیہ، مدعیہ مستحق انفراق زوجیت ہے اس لئے ڈگری تنسیخ نکاح بحق مدعیہ صادر کی جاوے۔ اور یہ قرار دیا جاوے کہ مدعیہ بوجہ مرزائی ہو جانے مدعا علیہ کے اس کی منکوحہ جائز نہیں رہی اور نکاح بوجہ ارتداد مدعا علیہ قائم نہیں رہا۔"
>
> (فیصلہ مقدمہ بہاولپور صفحہ طبع اوّل)

یہ مقدمہ ابتدائی عدالت سے دربار معلّٰی تک پہنچا اور وہاں سے باین حکم ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں واپس کر دیا گیا کہ "مستند مشاہیر علمائے ہند کی شہادت لے کر بروئے احکام شرع شریف فیصلہ کیا جاوے۔"

اگرچہ یہ مقدمہ سات سال سے چل رہا تھا اور مدعا علیہ قادیانی تھے نیز سارے ضلع کا قادیانیوں کا خاندان اور ہر جماعت اس کی پشت پر تھی مگر مسلمانوں نے اسے ایک شخص کا مقدمہ سمجھا اور مدعیہ کی مالی امداد کی طرف بھی توجہ نہ کی لیکن ڈسٹرکٹ عدالت نے جب اس مقدمہ کی سماعت کے لئے ریاست کے سربراہ نے علماء کمیشن مقرر کیا تو فریقین کو اپنے اپنے مسلک کے مستند اور مشاہیر علماء کو بغرض شہادت پیش کرنے کا حکم دیا تو مسلمانان بہاولپور کا احساس بیدار ہوا کہ کہیں مدعیہ کی کسمپرسی و ناداری کے سبب شہادت شرعی پیش کرنے سے قاصر رہ سکے۔ چنانچہ انجمن مؤید الاسلام بہاولپور نے مدعیہ کی جانب سے اس مقدمہ کی پیروی شروع کر دی۔ بالآخر دو سال کی کامل تحقیق و تنقیح کے بعد ۷ فروری ۱۹۳۵ء کو عالی جناب محمد اکبر ڈسٹرکٹ جج بہاولپور نے اس مقدمہ کا تاریخی فیصلہ مدعیہ کے حق میں صادر کر کے نکاح فسخ قرار دیا کہ،

"مدعیہ کی جانب سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مرزا صاحب کاذب مدعی نبوت تھے، اس لئے مدعا علیہ (عبدالرزاق قادیانی) بھی مرزا صاحب کو نبی تسلیم کرنے سے مرتد قرار دیا جائے گا .... لہٰذا ڈگری بدیں مضمون بحق مدعیہ جاری کی جاتی ہے کہ وہ تاریخ ارتداد مدعا علیہ سے اس کی زوجہ نہیں رہی، مدعیہ خرچۂ مقدمہ بھی از مدعا علیہ لینے کی حقدار ہوگی۔"

(فیصلہ مقدمہ بہاولپور صفحہ ۱۴۹)

یہ ایک مسلمان ریاست کے مسلمان جج کا تاریخی فیصلہ تھا جو اسلام اور مرزائیت کی پوری تحقیق کے بعد صادر کیا گیا، اور پھر ایک ایسی عدالت کی جانب سے تھا جس کی حیثیت عدالت خاص کی تھی اس لئے یہ فیصلہ آئندہ کے لئے نشانِ راہ ثابت ہوا، اور بحمداللہ آئندہ اس قسم کے تمام فیصلے اسی کے مطابق ہوئے۔ حضرات اکابر دیوبند نے اس مقدمہ میں جو کارنامہ انجام دیا اس کا تعارف کراتے ہوئے مولانا ابوالعباس محمد صادق نعمانی جن کی وساطت سے یہ فیصلہ شائع ہوا، تحریر فرماتے ہیں:

"مدعیہ کی طرف سے شہادت کے لئے شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن چاند پوری، حضرت مولانا محمد نجم الدین صاحب پروفیسر اورینٹل کالج لاہور اور مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند پیش ہوئے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری نے تمام ہندوستان کی توجہ کے لئے جذب مقناطیسی کا کام کیا، اسلامی ہند میں اس مقدمہ کو غیر فانی شہرت حاصل ہو گئی، حضرات علمائے کرام نے اپنی اپنی شہادتوں میں علم و عرفان کے دریا بہا دئیے اور فرقۂ ضالہ مرزائیہ کا کفر و ارتداد روزِ روشن کی طرح ظاہر کر دیا، اور فریق مخالف کی جرح کے نہایت مسکت جواب دئیے۔

خصوصاً حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہادت میں ایمان، کفر، نفاق، زندقہ، ارتداد، ختم نبوت، اجماع، تواتر، متواترات کے اقسام، وحی، کشف، الہام کی تعریفات اور ایسے اصول و قواعد بیان کئے جن کے مطالعہ سے ہر ایک انسان علی وجہ البصیرت بطلانِ مرزائیت کا یقین کامل حاصل کر سکتا ہے۔

پھر فریق ثانی کی شہادت شروع ہوئی، مقدمہ کی پیروی اور شہادت پر جرح کرنے اور قادیانی دجل و تزویر کو آشکارا کرنے کے لئے شہرۂ آفاق مناظر حضرت مولانا ابوالوفا صاحب نعمانی شاہجہانپوری تشریف

دیے، مولانا موصوف مختارِ مدعیہ ہو کر تقریباً ڈیڑھ سال مقدمہ کی پیروی فرماتے رہے، فریقِ ثانی کی شہادت پر ماہرانہ جرح فرمائی جس نے مرزائیت کی بنیادوں کو کھوکھلا اور مرزائی دجل و فریب کے تمام پرزوں کو پارہ پارہ کر کے فرقہ مرزائیہ ملعونہ کا ارتداد آشکارا کر دیا۔ فریقین کی شہادت کے ختم ہونے کے بعد مولانا موصوف نے مقدمہ پر بحث کی، اور فریق ثانی کی تحریری بحث کا تحریری جواب الجواب نہایت مفصل اور جامع پیش کیا۔"

(مقدمہ فیصلہ بہاولپور ص)

جہادِ مسلسل

تحفظ ختم نبوت کے سلسلہ میں اکابر دیوبند کا ایک خصوصی امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے قادیانی فتنہ کے آغاز سے لے کر آج تک ان کا تعاقب جاری رکھا، مسند احمد (ص۲۴۷ ج۲) میں بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے:

ما سالمناھن منذ حاربناھن یعنی الحیات — ہم نے ان سانپوں سے جب سے جنگ شروع کی ہے تب سے کبھی ان کے ساتھ صلح نہیں کی۔

قادیانی ٹولہ اسلام کے لئے مار آستین کی حیثیت رکھتا تھا، اس لئے ارشادِ نبویؐ کے مطابق اکابر دیوبند جب سے مرزائی ٹولے کے خلاف نبرد آزما ہوئے آج تک نہ صلح کی جانب مائل ہوئے اور نہ ہتھیار اتارے۔ بلکہ وہ پہلے دن سے لے کر آج تک بدستور محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں، اور جب تک یہ غدارانِ ناموسِ رسالت اپنے کیفر کردار کو نہیں پہنچ جاتے انشاء اللہ محاذ آرائی جاری رہے گی۔

خوش قسمتی سے اکابر دیوبند میں کوئی نہ کوئی ایسی شخصیت موجود رہی جو اپنے دور میں مرجع خلائق تھی، جس کے دل کی دھڑکنیں امت مسلمہ کے جذبۂ جہاد کو بیدار رکھتی تھیں، جسے علماء و مشائخ کی قطبیت کبریٰ کا مقام حاصل تھا، جس کا سینہ عشق رسالتؐ کے نور سے منور تھا، اور جس کے انفاس قدسیہ زندیقانِ قادیان کے کفر و ارتداد کے لئے آتش سوزاں کا حکم رکھتے تھے۔

گزشتہ سطور میں قطب عالم حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ اور ان کے خلیفہ ارشد حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ گزر چکا ہے، حضرت گنگوہیؒ کے بعد یہ قیادت و سیادت شیخ العالم حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے حصہ میں آئی، جن کا وجود ہی انگریز اور انگریزی نبوت سے بغاوت کا نام تھا، یوپی کے انگریز گورنر جیمس مسٹن کے بقول:

"اگر اس شخص کو جلا کر خاک بھی کر دیا جائے تب بھی وہ اس کوچے سے نہیں اڑے گی جس میں کوئی انگریز رہتا ہو۔"

"اگر اس شخص کی بوٹی بوٹی بھی کر دی جائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کے خلاف عداوت ٹپکے گی۔"

(بحوالہ "بیس بڑے مسلمان" صفحہ ۱۲ طبع سوم)

اور "ریشمی خطوط سازش کیس" کے مرتبین کے الفاظ میں:

(حضرت شیخ الہندؒ کو) "حضرت مولانا" بھی کہا جاتا ہے، ریشمی خطوط کے مکتوب الیہ۔ مدرسہ اسلامیہ دیوبند کے صدر مدرس، پارسائی اور تقدس کے لئے مشہور ان کے مریدین میں سرکردہ مسلمان بھی ہیں، ہندوستان بھر میں ہیں ..... ہندوستان میں "اتحاد اسلامی کی سازش" میں مولانا کی رہنمایانہ و قائدانہ شخصیت

بحوالہ تحریک ختم نبوت:

(تحریک شیخ الہندؒ، انگریزی سرکار کی فائلوں میں، ص۲۴۲

شائع کردہ مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ، مسلم مارکیٹ لاہور

حضرت شیخ الہندؒ قدس سرہٗ اگرچہ انگریز کی فدویت (قادیانی ذریت) سے نہیں بلکہ براہ راست قادیانی نبوت کے خالق (انگریز بہادر) سے لڑ رہے تھے۔ لیکن انہوں نے فدویت برطانیہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ "القول الصحیح فی مکائد المسیح" نامی فتویٰ کا تذکرہ اوپر کر چکا ہوں، جس میں کتاب قادیان کی عبارتیں درج کر کے اس کے کفر و ارتداد کا فتویٰ علماء دیوبند کی جانب سے مرتب کیا گیا ہے، حضرت شیخ الہندؒ اس پر تحریر فرماتے ہیں:

(کل جوابات صحیح ہیں)

"مرزا — علیہ ما یستحقہ — کے عقائد و اقوال کا کفریہ ہونا ایسا بدیہی مضمون ہے کہ جس کا انکار کوئی منصف فہیم نہیں کر سکتا۔ جس کی تفصیل جواب میں موجود ہے

(مہر)

(بندہ محمود عفی عنہ دیوبندی (صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند)

حضرت شیخ الہندؒ کے بعد آپ کے تلامذہ نے، جو آسمان علم و فضل اور تقدس و تقویٰ کے مہر و ماہ تھے۔ قادیانی نبوت کا تعاقب کیا، مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوریؒ اور دیگر اکابر نے اس تحریک کا علم بلند کیا۔

اس دور کے امام و مقتدا حضرات العلامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ تھے، فتنہ قادیانیت کی شدت نے حضرت کشمیریؒ کو ماہیٔ بے آب کی طرح بے چین اور مضطرب کر دیا تھا، حضرت العلامہ مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہ "نفحۃ العنبر فی ہدی الشیخ الانورؒ" میں حضرت کشمیریؒ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

"جب یہ تاریک فتنہ پھیلا تو مصیبت غلطی سے غم اور اضطراب کی ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ کسی کروٹ چین نہ آتا تھا، رات کی نیند حرام ہو گئی، مجھے قلق تھا کہ قادیانی نبوت سے دین میں ایسا رخنہ واقع ہو جائے گا جس کو بند کرنا دشوار ہو گا، اسی قلق و اضطراب اور بے چینی میں چھ مہینے گذر گئے۔ تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں القاء کیا کہ عنقریب اس فتنہ کا شور و شغب فنا ان شاء اللہ جاتا رہے گا۔ اور اس کی قوت و شوکت ٹوٹ جائے گی، چنانچہ ایک طویل مدت کے بعد میرا اضطراب رفع ہوا اور سکون قلب نصیب ہوا"

(ص۳۲ طبع جدید)

حضرت کشمیریؒ نے اس اضطراب و بے چینی کا اظہار اپنے بعض قصائد میں بھی کیا ہے، ایک طویل عربی قصیدہ میں، جو "اکفار الملحدین" میں طبع ہوا ہے آپ نے قادیانی فتنہ کی شدت و گمراہی کی طرف امت اسلامیہ کو متوجہ فرمایا ہے۔ اس قصیدہ کا زور بیان، قلق و اضطراب آج بھی امت اسلامیہ کا خون گرما دینے کی صلاحیت رکھتا ہے:

اَلَا یَاعِبَادَ اللّٰہِ قُوْمُوْا وَقَوِّمُوْا
خُطُوْبًا اَلَمَّتْ مَالَهُنَّ یَدَانِ

اے اللہ کے بندو! اٹھو اور ان فتنوں کے کس بل نکال دو، جو ہر جگہ چھا رہے ہیں اور جن کے برداشت کرنے کی تب و تاب نہیں رہی۔

وَقَدْ کَادَ یَنْقَضُّ الْهُدٰی وَمَنَارُهٗ
وَیَخْرُجُ خَیْرٌ مَالَدَیْكَ تُدَانِ

ان فتنوں کی شدت سے ہدایت کے نشانات مٹنا چاہتے ہیں، خیر و صلاح مٹ رہی ہے اور پھر اس کے تدارک کی کوئی صورت نہیں ہو رہی۔

یُسَبُّ رَسُوْلٌ مِّنْ اُولِی الْعَزْمِ فِیْکُمْ
تَکَادُ السَّمَاءُ وَالْاَرْضُ تَنْفَطِرَانِ

ایک اولوالعزم رسول (سیدنا عیسیٰ علیہ السلام) کو تمہارے سامنے گالیاں دی
جا رہی ہیں قریب ہے کہ قہر الٰہی سے زمین و آسمان پھٹ پڑیں۔

وَسَبَّتْ قَوْمٌ رَبَّهُمْ وَنَبِيَّهٗ
فَقُوْمُوْا لِنَصْرِ اللّٰهِ اِذْ هُوَ دَاعٍ

ایک ناہنجار قوم (مرزائیوں) نے اپنے رب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ
وسلم سے لڑائی چھیڑ رکھی ہے پس اللہ کی مدد کے لیے اٹھو کہ وہ بہت ہی قریب ہے

وَقَدْ حِيْلَ صَبْرِيْ فِي انْتِهَاكِ حُدُوْدِهٖ
فَهَلْ ثَمَّ دَاعٍ اَوْ مُجِيْبٌ اٰذَانِيْ

حدود اللہ کو ٹوٹتے دیکھ کر صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے پس کیا اس بھری
دنیا میں کوئی حدود الٰہی کے تحفظ کیلئے پکارنے والا یا میری دعوت پر لبیک کہنے والا ہے؟

وَاِذْ عَزَّ خَطْبٌ جِئْتُ مُسْتَنْصِرًا بِكُمْ
فَهَلْ ثَمَّ غَوْثٌ يَالَقَوْمِ يَدَانِيْ

اور جب مصیبت حد برداشت سے نکل گئی تو میں نے تمہارے دروازے پر دستک
دی ہے اے قوم! کیا کوئی فریادرس ہے جو آگے بڑھ کر میری مدد میں شریک ہو جائے

لَعَمْرِيْ لَقَدْ نَبَّهْتُ مَنْ كَانَ نَائِمًا
وَاَسْمَعْتُ مَنْ كَانَتْ لَهٗ اُذُنَانِ

بخدا میں ان لوگوں کو جو خواب غفلت میں مست تھے۔ بیدار کر چکا ہوں اور ہر
ایسے شخص کو جسے قدرت نے سننے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے سنا چکا ہوں۔

وَنَادَيْتُ قَوْمًا فِيْ فَرِيْضَةِ رَبِّهِمْ
فَهَلْ مِنْ نَصِيْرٍ لِّيْ مِنْ اَهْلِ زَمَانِ

اور میں قوم مسلم کو ان کے رب کی جانب سے عائد شدہ فریضہ کے سلسلہ میں
پکار چکا ہوں، پس کیا اہل زمانہ میں کوئی شخص میری مدد کو اٹھے گا۔؟

دَعُوْا كُلَّ اَمْرٍ وَّاسْتَقِيْمُوْا لِمَا دَهٰى
وَقَدْ عَادَ فَرْضَ الْعَيْنِ عِنْدَ عِيَانِ

سب کچھ چھوڑ کر اس فتنۂ عظمیٰ کے مقابلہ میں کمربستہ ہو جاؤ اس لئے کہ اب فتنہ کا
مشاہدہ ہو جانے کے بعد اس کا استیصال ہر شخص پر فرض عین ہو گیا ہے

اَلَا فَاسْتَقِيْمُوْا وَاسْتَهِيْنُوْا الْمَوْتَ بِكُمْ
فَمَوْتٌ عَلَيْهِ اَكْبَرُ الْحَيَوَانِ

اٹھو! اور اپنے دین کی حفاظت کے لئے دیوانہ وار جان کی بازی لگا
دو۔ یقیناً دین کی خاطر جان دے دینا ہی سب سے اعلیٰ وارفع زندگی ہے

وَعِنْدَ دُعَاءِ الرَّبِّ قُوْمُوْا وَشَمِّرُوْا
حَنَانًا عَلَيْكُمْ فِيْهِ اِثْرَ حَنَانِ

اور جب تمہارے دین کیلئے رب تعالیٰ کی طرف سے پکارا جا رہا ہے تو دیر کیوں کرتے ہو؟ اٹھو
کمر ہمت باندھو اس راستے میں تم پر رحمتوں پر رحمتیں نازل ہوں گی۔

حضرت کشمیریؒ کے قلب صافی پر اس فتنہ کی شدت کا جو اثر تھا
وہ ان اشعار سے نمایاں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس فتنہ کے استیصال
کے لئے مامور من اللہ تھے، اور ان کی تمام صلاحیتیں اس پر لگی ہوئی تھیں
کہ وہ قادیانیت کے قصر الحاد کو پیوند خاک کر ڈالیں۔ حضرت امام العصرؒ نے میدان
الحاد پر تابڑ توڑ حملے کئے۔ اور ان کے کفر وارتداد کو عالم آشکارا کرنے کیلئے
قلم اٹھایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، قادیانی قزاقوں کے سب سے بڑے حریف
تھے۔ مرزا اور مرزائی امت نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں
جس دریدہ دہنی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے ایک باغیرت وحمیت مسلمان
کا خون کھول جاتا ہے، اور جو شخص اس کے بعد بھی قادیانیوں کے بارے
میں کسی نرمی یا مصالحت کا روادار رہتا ہے اس کے بارے میں یہی کہا جاسکتا
ہے کہ وہ یا تو دین وایمان سے محروم ہے یا پھر اس کی غیرت وحمیت کو
دیمک چاٹ گئی ہے۔ امام العصر فرماتے ہیں:

فشانی شان الانبیاء مکفر
ومن شک قبل هذا الاول شان

انبیاء علیہم السلام کی شان میں گستاخی کرنے والا قطعاً کافر ہے، اور جو
شخص اس کے کفر میں شک کرے تو مطلقاً کہہ دو کہ یہ بھی پکا کافر ہے
حضرت امام العصرؒ نے قادیانیت کے تعاقب میں جو کارنامے
انجام دئے اس کی تفصیل کے لئے مقالہ کافی نہیں، مختصر یہ کہ:

الف: حضرتؒ نے خود بھی ان تمام مسائل پر قلم اٹھایا جو اسلام اور
قادیانیت کے درمیان زیر بحث تھے، مثلاً حیات عیسیٰ علیہ
السلام پر تین کتابیں تالیف فرمائیں "التصریح بما تواتر فی
نزول المسیح" "عقیدۃ الاسلام فی حیات عیسیٰ علیہ السلام"
"تحیۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام" یہ تینوں کتابیں اپنے رنگ
میں بے نظیر ہیں۔

ختم نبوت کے موضوع پر فارسی میں رسالہ "خاتم النبیین"
تالیف فرمایا جو آیت ختم نبوت کی تفسیر اور دقیق معارف کا ذخیرہ
ہے۔ ان تمام رسائل میں قادیانی دجل وفریب سے نقاب
کشائی فرمائی اور قادیانیوں کے کفر وارتداد کو ثابت کرنے کے
لئے "اکفار الملحدین" تالیف فرمائی۔

ب۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ میں مولانا سید بدر عالم میرٹھی،
مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا
محمد شفیع صاحب دیوبندی، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا
ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا محمد یوسف بنوری
مولانا محمد چراغ گوجرانوالہ اور دیگر بہت سی ایسی نابغہ شخصیتیں
موجود تھیں، جن کو حضرت شاہ صاحبؒ نے رد قادیانیت پر مامور
فرمایا۔ حضرت شاہ صاحبؒ اپنے تلامذہ سے عقیدۂ ختم نبوت کے
تحفظ اور رد قادیانیت کے لئے کام کرنے کا عہد لیتے تھے، اور ارشاد
فرماتے تھے کہ جو شخص قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے دامن شفاعت سے وابستہ ہونا چاہتا ہے وہ قادیانی درندوں
سے ناموس رسالت کو بچائے۔ ان حضرات نے حضرت شاہ صاحبؒ
کی وصیت کے مطابق فتنۂ قادیانیت کے تعاقب کو اپنی زندگی
کا مشن بنا لیا۔

ج قادیانی امت کا مذہبی و دینی سطح پر محاسبہ تو علماء نے مسلسل شروع
سے کرتے آ رہے تھے۔ لیکن جدید طبقہ میں قادیانیوں سے رواداری
کا مرض سرایت کئے ہوئے تھا، وہ سمجھتے تھے کہ قادیانیوں کے خلاف
جو کچھ مذہبی اسٹیج سے کہا جا رہا ہے وہ صرف ملاؤں کی تنگ دلی کا
نتیجہ ہے۔ حضرت امام العصرؒ نے قادیانیت کے خلاف جدید طبقہ
تک یہی آواز پہنچانے کے لئے مولانا ظفر علی خان، ایڈیٹر زمیندار
اور شاعر مشرق علامہ محمد اقبال مرحوم کو آمادہ کیا۔ مولانا سعید احمد
اکبر آبادی لکھتے ہیں:

> باخبر حضرات جانتے ہیں کہ پنجاب کے خصوصاً اور
> ہندوستان کے عموماً انگریزی تعلیم یافتہ حضرات میں
> قادیانی فتنہ کی شر انگیزی اور اسلام کشی کا جو احساس پایا
> جاتا ہے اس میں بڑا دخل ڈاکٹر اقبال مرحومؒ کے اس
> لکچر کا ہے جو ختم نبوت پر ہے، اور ساتھ ہی اس مقالے
> کا ہے جو انگریزی میں قادیانی تحریک کے خلاف شائع
> ہوا تھا لیکن یہ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ دونوں
> تحریروں کا اصل باعث حضرت الاستاذ مولانا سید
> محمد انور شاہ ہی تھے:
>
> ("تین بڑے مسلمان" ص ۳۰۰)

علامہ اقبال مرحوم نے اپنے خطبات و مقالات اور گفتگوئے مجالس
میں قادیانیت کا منطقی اور فلسفیانہ رنگ میں تجزیہ کیا، جس سے جدید طبقہ
کو یہ سمجھنے میں مدد ملی کہ قادیانیت کا پس منظر کیا ہے اور امت مسلمہ کے
حق میں اس کے نتائج کس قدر مہلک ہوں گے؟ ڈاکٹر صاحب کے ان مقالات

کا اردو ترجمہ حرف اقبال، اقبال اور قادیانی، ارمغانِ اقبال، اور دیگر کتب
و رسائل میں شائع ہو چکا ہے۔

مولانا ظفر علی خان مرحوم علی گڑھ کے گریجویٹ تھے، مگر اکابر دیوبند
سے تعلق و وابستگی نے انہیں واقعی "مولانا" بنا دیا تھا۔ موصوف نے ۱۹۱۰ء
سے "زمیندار" کی ادارت سنبھالی اور نازک ترین دور میں قادیانیت کے خلاف
برد آزما ہوئے، اور جب تک جسم میں توانائی رہی وہ اس محاذ پر لڑتے رہے،
آغا شورش کاشمیری مرحوم نے "تحریک ختم نبوت" کے صفحہ ۱۱ سے صفحہ ۱۴ تک
مولانا ظفر علی کی اس داستانِ وفا کی تفصیلات قلمبند کی ہیں، ۱۹۳۲ء کے ایک
مقدمہ کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے کہ:

"عدالت نے وہ نوٹس پڑھ کر سنایا، جو اس مقدمہ کی بنیاد تھا کہ
"تمہارے اور احمدی جماعت کے درمیان اختلاف ہے
تم نے اس کے عقائد اور اس کے مذہبی پیشواؤں پر حملے کئے
ہیں، جس سے نقضِ امن کا اندیشہ ہو گیا ہے۔ وجہ بیان کرو
کہ تم سے کیوں نہ نیک چلنی کی ضمانت طلب کی جائے۔"

مولانا نے عدالت کو جواب دیتے ہوئے کہا:

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں
مرزائیوں کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے گا۔ لیکن جہاں تک مرزا
غلام احمد کا تعلق ہے ہم اس کو ایک بار نہیں ہزار بار دجال
کہیں گے، اس نے حضورؐ کی ختم المرسلینی میں اپنی نبوت
کا ناپاک پیوند جوڑ کر ناموس رسالت پر کھلم کھلا حملہ کیا
ہے۔ اپنے اس عقیدے سے میں ایک منٹ کے کروڑویں
حصے کے لئے بھی دستکش ہونے کو تیار نہیں، اور مجھے یہ
کہنے میں کوئی باک نہیں کہ مرزا غلام احمد دجال تھا، دجال
تھا، دجال تھا، میں اس سلسلہ میں قانونِ انگریزی کا پابند
نہیں، میں قانونِ محمدی کا پابند ہوں۔"

(تحریک ختم نبوت، مؤلفہ آغا شورش مرحوم ص۹)

د۔ حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے تحریک ختم نبوت
کو باقاعدہ منظم کرنے کے لئے خطیب الامت حضرت مولانا سید
عطاء اللہ شاہ بخاری کو "امیر شریعت" مقرر کیا، اور انجمن خدام الدین
کے ایک عظیم الشان اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۳۰ء میں ان کے ہاتھ
پر باقاعدہ سے کر ہندوستان کے ممتاز ترین پانچ سو علماء کی بیعت
ان کے ہاتھ میں کرائی، لاہور کی نظریں دیکھ رہی تھیں، دارالعلوم
دیوبند کا صدر المدرسین، حجۃ الاسلام علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ امیر
شریعت کے ہاتھ پر بیعت کر رہا تھا، لیکن خود امیر شریعت کا تأثر
یہ تھا کہ،

"آپ یہ دیکھیں کہ حضرت (مولانا سید محمد انور شاہؒ) نے
میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے، بلکہ حضرت نے مجھے اپنی غلامی
میں قبول فرمایا ہے۔" یہ کہہ کر شاہ جیؒ زار و قطار رونے لگے
اور ان کا سارا جسم کانپنے لگا۔"

(حیات امیر شریعت مؤلفہ محترم مرزا جانباز ص۱۵۱)

بہر حال یہ بحث تو اپنی جگہ ہے کہ حضرت امام العصر کشمیریؒ حضرت
امیر شریعتؒ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے یا ان سے خلعتِ خلافت
کے استیصال کا عہد لے رہے تھے، مگر اس میں کیا شک ہے،
کہ حضرت امیر شریعتؒ اور ان کی جماعت نے قادیانیت کے محاذ
پر جو کام کیا وہ حضرت امام العصرؒ کی باطنی توجہ اور دعا ہائے سحری
کا ثمر تھا۔

حضرت امام العصرؒ کے وصال کے بعد امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ
بخاریؒ، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت
میں حاضر ہوئے، حضرت تھانویؒ نے نہایت شفقت سے حالات
سنے اور تشریف آوری کی غرض دریافت فرمائی شاہ جیؒ نے بہ شکستگی

سے کہ حضرت امام العصر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ ہمارے روحانی پیشوا تھے، انہوں نے ہمیں رد قادیانیت کے کام پر لگا دیا، چنانچہ مجلس احرار اسلام کا شعبہ تبلیغ اسی کے لئے وقف ہے، حضرت کشمیریؒ کے سانحۂ ارتحال کے بعد آپ سے دعائیں لینے کے لئے حاضر ہوا ہوں ـــــ حضرت حکیم الامت نے دریافت کیا کہ آپ کی جماعت کا رکن بننے کے لئے کیا کوئی شرط بھی ہے؟ عرض کیا کہ ایک روپیہ سالانہ رکنیت کی فیس ادا کرکے ہر مسلمان جماعت کا رکن ہو سکتا ہے، حضرت نے ارشاد فرمایا کہ یہ تو معلوم نہیں کہ زندگی کے کتنے دن باقی ہیں، تاہم مجھے پچیس سال کے لئے اپنی جماعت کا رکن بنا لیجئے اور اگر اس سے زیادہ جیتا رہا تو پھر رکنیت کی تجدید کرا لوں گا، یہ کہہ کر پچیس روپیہ عطا فرمائے اور پچیس سال کے لئے رکنیت قبول فرمالی۔

(روایت مولانا محمد علی جالندھریؒ)

بظاہر یہ ایک معمولی نوعیت کا واقعہ ہے، لیکن اس سے مسئلہ ختم نبوت کے ساتھ علمائے دیوبند کے غیر معمولی شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت امام العصرؒ مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ، مجلس احرار اسلام کا رخ فتنۂ قادیانیت کی طرف موڑنے کے لئے سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو "امیر شریعت" کے منصب پر کھڑا کرتے ہیں۔ اور خود بنفس نفیس ان کے ہاتھ پر بیعت کرکے ان پر کامل اعتماد کا اظہار فرماتے ہیں، ادھر حضرت حکیم الامت تھانویؒ مجلس احرار اسلام کے شعبۂ تبلیغ کی رکنیت قبول فرما کر گویا امیر شریعتؒ کی اس جہاد میں قیادت کو قبول فرماتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ جب تک حیات رہے ان کی توجہ اور دعا اور ہر قسم کی اعانت مجاہدین ختم نبوت کے شامل حال رہی، ان کے وصال کے بعد قطب العالم حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ اس قافلہ کے سالار بن گئے، "احرار اسلام" کے اکابر حضرت رائے پوریؒ کے حلقۂ ارادت میں منسلک اور حضرتؒ کی عنایات و توجہات سے مستفید تھے، جن لوگوں کو حضرت رائے پوریؒ کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا انہیں علم ہے کہ حضرتؒ قادیانی فتنہ کے بارے میں کس قدر گہرا احساس رکھتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی نسبت حضرت رائے پوریؒ کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ حضرتؒ، مجاہدین ختم نبوت کی سرپرستی فرماتے۔ ان کی مالی خدمت کرتے، انہیں مفید مشورے دیتے۔ ان سے کارگزاری کی باقاعدہ رپورٹ سنتے اور ان حضرات کی بھرپور قدردانی اور حوصلہ افزائی فرماتے۔

حضرت رائے پوریؒ کے حکم سے مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "القادیانی والقادیانیۃ" عربی میں تالیف فرمائی۔ اور پھر حضرت کے مکرر حکم سے اس کا اردو ایڈیشن "قادیانیت" کے نام سے مرتب فرمایا۔ دونوں کتابوں کا ایک ایک حرف حضرتؒ نے سنا، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کی کتاب "شہادۃ القرآن" کو بھی حرفاً حرفاً سن کر اس کی اشاعت کا حکم فرمایا۔ اس سلسلہ میں حضرت رائے پوریؒ کے عجیب و غریب واقعات ایسے ہیں جن کو یہاں ذکر کرنا افشائے راز کے زمرہ میں آئے گا۔

۹۔ تنظیم ملت اور علمائے دیوبند

علمائے امت قادیانی فتنہ کا تعاقب انفرادی طور پر اپنے اپنے رنگ میں شروع ہی سے کر رہے تھے، مگر علمائے دیوبند نے محسوس کیا کہ "تحفظ ختم نبوت" کے لئے مسلمانوں کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ایک ایسی مضبوط جماعت ہونی چاہئے جو ناموس رسالت کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کرے، اور وہ فتنۂ قادیانیت کے استیصال کو اپنا مشن بنائے۔ اس کے لئے حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی نظر انتخاب "مجلس احرار اسلام" پر پڑی، اور فتنۂ قادیانیت کا منظم مقابلہ کرنے کے لئے "احرار اسلام" کے صدر حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو "امیر شریعت" مقرر فرمایا۔

"احرار اسلام" کے سرفروش زندگی آمادہ سے نبرد آزما تھے، ادھر

قادیانی نبوت فرنگی اقتدار کی سیاسی شطرنج کا مذہبی مہرہ تھے۔ اس لئے "احرار اسلام" کو جس قدر نفرت انگریز اور انگریزی اقتدار سے تھی اس سے کئی گنا زیادہ قادیانی کی سیاسی نبوت سے تھی، جس نے اسلام کی تحریف و تکذیب اور برطانیہ کی خوشامد و چاپلوسی کو اپنا شعار بنا رکھا تھا "احرار اسلام" نے قادیانی نبوت کے مقابلہ میں جو کچھ کیا اس کا تذکرہ "تاریخ احرار" "حیات امیر شریعت" اور "تحریک ختم نبوت" میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، مختصراً چند امور کی جانب یہاں اشارہ کر دینا مناسب ہوگا۔

تحریک کشمیر

۱۹۳۱ء میں کشمیر کی ڈوگرہ حکومت کے خلاف مسلمانان کشمیر نے علم حریت بلند کیا، قادیانی خلیفہ مرزا محمود نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر "آل انڈیا کشمیر کمیٹی" کی تشکیل کی، جس کا صدر خود مرزا قادیانی تھا، اور سیکرٹری شپ بھی قادیانیوں کے ہاتھ میں تھی۔ ہندوستان کے بڑے نام آور لوگ اس کمیٹی کے رکن تھے۔ اس کمیٹی کا مقصد مسلمانان کشمیر کی دادرسی ظاہر کیا گیا، لیکن اندرونی مقاصد کچھ اور تھے ان میں سب سے بڑا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہندوستان کے چوٹی کے لیڈر مرزا محمود کی قیادت پر متحد ہیں، اور وہ انہیں اپنا قائد اور پیشوا تسلیم کرتے ہیں۔ یہ گویا ان مذہبی فتووں کا جواب تھا جو علمائے امت کی جانب سے قادیانیوں کے خلاف صادر ہو رہے تھے۔ "احرار اسلام" نے اس قادیانی سازش کا بروقت نوٹس لیا۔ اور قادیانی عزائم کو طشت از بام کیا، نتیجۃً "آل انڈیا کشمیر کمیٹی" اپنی موت آپ مر گئی، اور علامہ محمد اقبال مرحوم نے اپنے بیانات میں قادیانی ذہنیت کو، جو اس کمیٹی کے قیام میں کارفرما تھی۔ عالم آشکارا کر دیا

قادیان میں داخلہ

قادیانی خلیفہ (میرزا محمود) قادیان کی آبادی ریاست میں کوس

"لمن الملک الیوم" کا راگ تھا قادیان میں مرزائی جماعت کے علاوہ نہ کسی کی جان محفوظ تھی، نہ عزت، حتیٰ کہ لاقانونیت [illegible] ہو جاتے اور کوئی باز پرس نہ کر سکتا، غریب مظلوموں کا بائیکاٹ کر دیا جاتا دکانداروں سے عہد لیا جاتا کہ وہ خلیفہ صاحب کے خلاف نشا کسی کے ہاتھ خورد و نوش کی کوئی چیز فروخت نہیں کریں گے "احرار اسلام" نے قادیان کے اس بے پناہ ظلم کو توڑنے کے لئے ۱۹۳۴ء میں قادیان میں اپنا دفتر قائم کر دیا، اور مظلومان قادیان کی دادرسی کے لئے ایک ڈیفنس کمیٹی بنا دی گئی "احرار اسلام" کی اس جرأت نے خلیفہ قادیان کو چراغ پا کر دیا، اور ظلم و تشدد میں اضافہ ہونے لگا لیکن تابکے؟ بالآخر وہ وقت آیا کہ خلیفہ قادیان کے خلاف "احرار" کی شہادت دینے کے لئے پردہ نشینان قادیان عدالت میں پہنچیں۔ قادیان میں کیا کچھ ہوتا تھا؟ اور "احرار اسلام" کے جانفروشوں نے قادیانی مظالم کا کس جرأت و مردانگی سے مقابلہ کیا؟ یہ ایک طویل داستان ہے جو دردناک بھی ہے اور عبرت آموز بھی ـــــ مگر افسوس ہے کہ یہ فرصت اس کے لئے موزوں نہیں۔

احرار تبلیغ کانفرنس

قادیان کی بیخکنی توڑنے کے لئے "احرار اسلام" نے ۲۱، ۲۲، ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء کی تاریخوں میں "قادیان تبلیغ کانفرنس" منعقد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کا اعلان ہونا تھا کہ قادیان میں صف ماتم بچھ گئی، آقایان فرنگ کے دربدولت پر دستک دی گئی کہ "احرار" ہمارے مقدس شہر پر چڑھائی کر رہے ہیں، خلیفہ محمود نے ہر وقت صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے ایک محکمہ قائم کر دیا، ادھر میرزا محمود نے اپنے طویل طویل خطبوں میں اپنی مظلومیت دہرائیں اور خوف و ہراس کا صور پھونکنا شروع کیا، حکومت برطانیہ کب برداشت کر سکتی تھی کہ اس کے چہیتے خاندان اور ان کی سیاسی نبوت کو کوئی آنچ آئے، نتیجۃً قادیان کے حدود میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔

مجلس احرار کی تبلیغ کانفرنس قادیان کے مضافات میں منعقد کرنا پڑی، کانفرنس کی صدارت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے فرمائی۔ اور ہندوستان کے اطراف و اکناف سے مسلمان جوق در جوق تبلیغ کانفرنس میں شرکت کے لئے پہنچ گئے۔ شاہ جیؒ نے اس موقع پر معارف تقریر فرمائی جو عشاء کے بعد سے شروع ہو کر اذان فجر تک جاری رہی، اس میں قادیانیت کا پوسٹ مارٹم انداز میں ایسا تجزیہ کیا کہ قادیان میں کھلبلی مچ گئی، مرزائی گورنمنٹ کے دروازے پر فریاد لے کر پہنچے، اور گورنمنٹ نے شاہ جیؒ پر ۱۵۳ الف کے تحت مقدمہ بنا دیا۔ مقدمہ کی سماعت مسٹر کھا آنند سپیشل مجسٹریٹ گورداسپور نے کی۔ شاہ جیؒ نے شہادت کے لئے مرزائیوں کے بڑے بڑے لوگوں کے علاوہ مرزا محمود کو عدالت میں طلب کرنے کی درخواست کی چنانچہ میرزا محمود کی شہادت تین دن تک جاری رہی بالآخر عدالت نے شاہ جیؒ کو ۶ ماہ قید بامشقت کی سزا دی، اس فیصلہ کے خلاف مسٹر جی۔ ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداسپور میں اپیل کی گئی۔ مسٹر کھوسلہ نے ملزم کے جرم کو محض اصطلاحی قرار دیتے ہوئے تا برخاست عدالت سزا دی، اور ایک تاریخ ساز فیصلہ لکھا۔

مسٹر کھوسلہ کا فیصلہ

مرزائیوں نے "احرار" کی گوشمالی کے لئے شاہ جیؒ پر مقدمہ بنوایا تھا، لیکن خدا کی قدرت انہیں لینے کے دینے پڑ گئے، شاہ جیؒ کی تبلیغ کانفرنس کی تقریر سے مرزائیت کا جو اکھاڑ پچھاڑ ہوا تھا جو اس مقدمے سے اکھڑی، مسٹر کھوسلہ کا یہ تاریخی فیصلہ جو قادیانیت کے لئے پیغام موت کی حیثیت رکھتا ہے طبع ہو چکا ہے، اس کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

"مرافعہ گزار کے خلاف جو الزام عائد کیا گیا ہے، اس پر غور و خوض کرنے سے قبل چند ایسے حقائق و واقعات بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جن کا تعلق امور زیر بحث سے ہے، آج سے تقریباً پچاس سال قبل قادیان کے ایک باشندے مسمیٰ غلام احمد نے دنیا کے سامنے یہ دعویٰ پیش کیا کہ میں مسیح موعود ہوں، اس کے اعلان کے ساتھ ہی اس نے "ظل و بروزی نبی" کی حیثیت بھی اختیار کر لی۔ اور ایک نئے فرقے کی بنا ڈالی، جس کے ارکان اگرچہ مسلمان ہونے کے مدعی تھے، لیکن ان کے بعض عقائد و اصول عام عقائد اسلام سے بالکل متباین تھے۔ اس فرقہ میں شامل ہونے والے لوگ قادیانی یا مرزائی یا احمدی کہلاتے ہیں، اور ان کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ یہ لوگ فرقہ مرزائیہ کے بانی (میرزا غلام احمد) کی نبوت پر ایمان رکھتے ہیں:

"مسلمانوں کی اکثریت نے مرزائیوں کو جذبات گستاخی خصوصاً اس کے دینی تفوق کے دعوؤں پر بہت ناک منہ چڑھایا اور مرزائیوں نے ان پر کفر کا الزام لگایا، اس کے جواب میں ان لوگوں نے بھی سخت پہلو اختیار کیا، مگر قادیانی حصار میں رہنے والے اس سے کچھ بھی متاثر نہ ہوئے۔"

"قادیانی مقابلتاً محفوظ تھے، اس حالت نے ان میں متمردانہ غرور پیدا کر دیا۔ انہوں نے اپنے دلائل دوسرے سے منوانے اور اپنی جماعت کو ترقی دینے کے لئے ایسے حربوں کا استعمال شروع کر دیا جنہیں ناپسندیدہ کہا جائے گا، جن لوگوں نے قادیانیوں کی جماعت میں شامل ہونے سے انکار کیا انہیں بائیکاٹ، قادیان سے اخراج اور بعض اوقات اس سے بھی مکروہ تر مصائب کی دھمکیاں دے کر دہشت انگیزی کی فضا پیدا کی، بلکہ بسا اوقات انہوں نے ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنا کر اپنی

جماعت کے استحکام کی کوشش کی۔ قادیان میں رضاکاروں کا ایک دستہ مرتب ہوا اور اس کی ترتیب کا مقصد تھا بتایہ تھا کہ قادیان میں "لمن الملک الیوم" کا نعرہ بلند کرنے کے لئے طاقت پیدا کی جائے۔

"انہوں نے عدالتی اختیارات بھی اپنے ہاتھ میں لے لئے، دیوانی اور فوجداری مقدمات کی سماعت کی، دیوانی مقدمات میں ڈگریاں صادر کیں اور ان کی تعمیل کرائی گئی، کئی اشخاص کو قادیان سے نکالا گیا، یہ قصہ یہیں نہیں ختم ہوتا، بلکہ قادیانیوں کے خلاف کھلے طور پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے مکانوں کو تباہ کیا، جلایا، اور قتل کے مرتکب ہوئے۔"

"کم از کم دو اشخاص کو قادیان سے اخراج کی سزا دی گئی اس لئے کہ ان کے عقائد مرزا کے عقائد سے متفاوت تھے۔ یہ اشخاص حبیب الرحمٰن گواہ صفائی نمبر ۳ اور منشی اسماعیل ہیں۔" "کئی اور گواہوں نے قادیانیوں کے تشدد و ظلم کی عجیب و غریب داستانیں بیان کی ہیں۔" "جگت سنگھ گواہ صفائی نے بیان کیا کہ قادیانیوں نے اس پر حملہ کیا، ایک شخص منشی غریب شاہ کو قادیانیوں نے زدوکوب کیا، لیکن جب اس نے عدالت میں استغاثہ کرنا چاہا تو کوئی اس کی شہادت دینے کے لئے سامنے نہ آیا۔"

سب سے سنگین معاملہ عبدالکریم، ایڈیٹر "مباہلہ" کا ہے، جس کی داستان، داستانِ درد ہے۔ یہ شخص پہلا کے عقائد میں شامل ہوا اور قادیان میں جا کر مقیم ہو گیا وہاں اس کے دل میں شکوک پیدا ہوئے اور وہ مرزائیت سے تائب ہو گیا۔[1] اس کے بعد اس پر ظلم و ستم ہوا، اس نے قادیانی معتقدات پر تبصرہ کرنے کے لئے "مباہلہ" نامی اخبار جاری کیا، مرزا بشیر الدین نے ایک تقریر میں "مباہلہ" والوں کی موت کی پیشگوئی کی، اس تقریر میں ان لوگوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو مذہب کے لئے اقدام قتل پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ اس تقریر کے بعد جلد ہی عبدالکریم پر قاتلانہ حملہ کیا گیا، مگر وہ بچ گیا، لیکن اس کا ساتھی قتل کر دیا گیا۔"

"محمد امین ایک مرزائی تھا اور جماعت مرزائیہ کا مبلغ تھا، اس کو تبلیغ کے لئے بخارا بھیجا گیا، لیکن کسی وجہ سے بعد میں اسے اس خدمت سے علیحدہ کر دیا گیا، اس کی موت کلہاڑی کی ایک ضرب سے ہوئی جو چوہدری فتح محمد گواہ صفائی نمبر ۲ نے لگائی.... محمد امین پر مرزا کا عتاب نازل ہو چکا تھا.... محمد امین تشدد کا نشانہ بنا اور کلہاڑی کی ضرب سے قتل کیا گیا۔ پولیس میں واقعہ کی اطلاع پہنچی لیکن کوئی کارروائی عمل میں نہ آئی۔ چوہدری فتح محمد کا عدالت میں باقرار صالح یہ بیان کرنا تعجب انگیز ہے کہ اس نے محمد امین کو قتل کیا، مگر پولیس اس معاملہ میں کچھ نہ کر سکی، جس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ مرزائیوں کی طاقت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ گواہ سامنے آ کر سچ

---

[1] مولانا عبدالکریم کو مرزا محمود کے کیرکٹر پر اعتراض تھا، وہ مرزا محمود سے مطالبہ کرتے تھے کہ اگر آپ پر عائد کردہ الزامات غلط ہیں تو آئیے مباہلہ کر لیجئے، اخبار "مباہلہ" میں انہوں نے مرزا محمود کو بار بار مباہلہ کا چیلنج دیا۔ اس کے جواب میں مرزائی جماعت کی جانب سے انہیں وہ سزا دی گئی جس کا تذکرہ فاضل جج نے کیا ہے۔

برداشت کی جرأت نہیں کر سکتا تھا؟

"ہمارے سامنے عبدالکریم کے مکان کا واقعہ بھی ہے کہ عبدالکریم کو قادیان سے خارج کرنے کے بعد اس کا مکان نذر آتش کر دیا گیا اور قادیان کی کمال ٹاؤن کمیٹی سے حکم حاصل کر کے نیم قانونی طریقے پر اسے گرانے کی کوشش کی گئی:

"یہ افسوسناک واقعات اس بات کی منہ بولتی شہادت ہیں کہ قادیان میں قانون کا احترام بالکل اٹھ گیا تھا، آتش زنی اور قتل کے واقعات ہوتے تھے، مرزا نے کروڑوں مسلمانوں کو، جو اس کے ہم عقیدہ نہ تھے شدید دشنام طرازی کا نشانہ بنایا، اس کی تصانیف ایک لاشبہ پادری کے اخلاق کا انوکھا مظاہرہ ہیں، جو صرف نبوت کا مدعی نہ تھا، بلکہ خدا کا برگزیدہ انسان اور مسیح ثانی ہونے کا مدعی بھی تھا۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ حکام غیر معمولی حد تک مفلوج ہو چکے تھے۔ دینی و دنیاوی معاملات میں مرزا کے حکم کے خلاف کبھی آواز بلند نہیں ہوئی، مقامی افسروں کے پاس کئی مرتبہ شکایت پیش ہوئی لیکن وہ اس کے انسداد سے قاصر رہے، مسل پر کچھ اور شکایات بھی ہیں لیکن یہاں ان کے مضمون کا حوالہ دینا غیر ضروری ہے، اس مقدمہ کے سلسلہ میں صرف یہ بیان کر دینا کافی ہے کہ قادیان میں جور و ستم رانی کا فتور روا ہونے سے متعلق نہایت واضح الزامات عائد کئے گئے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ (حکومت کی طرف سے اس صورت حال کے انسداد کے لئے) کوئی توجہ نہ ہوئی۔ ان کارروائیوں کے سد باب کے لئے اور مسلمانوں میں زندگی کی روح پیدا کرنے کے لئے تبلیغ کانفرنس منعقد کی گئی۔"

اس کے بعد فاضل جج نے تفصیل سے مقدمہ پر بحث کی ہے۔ ان اقتباسات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ قادیان کے غیر مرزائی افراد کس قسم کی حالت سے دوچار تھے، اور "احرار اسلام" نے کتنی سنگلاخ زمین میں یہ کام شروع کیا تھا۔

مباہلہ کا چیلنج

مرزا غلام احمد قادیانی کے زمانے سے مرزائی امت کی یہ عادت چلی آتی ہے کہ بلند بانگ دعووں کے ذریعہ لوگوں پر رعب جمایا جائے۔ اور جب امتحان کا وقت آئے تو کوئی نہ کوئی حیلہ کر کے جان بچانے کی کوشش کی جائے۔ ۱۹۳۵ء میں "احرار" کی یورش سے تنگ آ کر میرزا محمود نے "احرار" کو مباہلہ کی دعوت دی، اپنی طرف سے شرائط تحریر کر کے اعلان کر دیا کہ "احرار" ہمارے ساتھ مباہلہ کی شرائط طے کریں۔ "احرار" تو میرزا محمود کے زیج زیبا کے عاشق تھے، انہوں نے فی الفور اعلان کر دیا کہ ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں، ہم فلاں تاریخ کو قادیان حاضر ہو جائیں گے۔ یہ خبر اخبار "مجاہد" میں چھپی تو مرزا محمود کے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے، فوراً واویلا کیا کہ "احرار" شرائط مباہلہ طے کئے بغیر قادیان پر چڑھائی کرنا چاہتے ہیں ان کو روکا جائے ——— احرار کا موقف یہ تھا کہ مباہلہ کی دعوت آپ نے دی ہے، شرائط آپ نے پیش کی ہیں، ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں عائد کی گئی، بس ذرا آنے کی اجازت ہو جائے۔ مگر میرزا محمود صاحب تو صرف اعلان کی حد تک مباہلہ کا رعب ڈالنا چاہتے تھے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ "احرار" سچ مچ قادیان میں آ دھمکیں گے۔ چنانچہ پھر حکومت عالیہ کے دربار میں درخواست کی گئی کہ "احرار" قادیان میں فلاں تاریخ کو آنے کا اعلان کر چکے ہیں، انہیں بزور روکا جائے، حکومت نے ۱۴۴ نافذ کر دی، اور

مرزا صاحب کی جان میں جان آئی۔

مباہلہ کا نتیجہ

یہاں اس امر کا ذکر کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک طرف تو حکومت کو "احرار" کے قادیان آنے سے روکنے پر مجبور کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف شیخ عبدالرحمن مصری کو (جو اس زمانہ میں مرزا محمود کے بہت قریب سمجھے جاتے تھے) احرار کو شرائط کے جال میں الجھانے کے لئے لاہور روانہ کر دیا گیا۔ ہدایت یہ تھی کہ جب تک حکومت کا حکم "احرار" کو روکنے کے لئے جاری نہیں ہو جاتا، اس وقت تک شرائط کا عقدہ حل نہ ہونے دیا جائے۔ چنانچہ جوں ہی حکومت نے "احرار" کے داخلہ قادیان پر پابندی عائد کی، فوراً شیخ عبدالرحمن مصری کو تار اور خط کے ذریعہ اطلاع دی گئی کہ اب "احرار" سے شرائط طے کرنے کی ضرورت نہیں، فوراً واپس چلے آؤ۔ اس خط و کتابت کی مصدقہ نقل ہمارے پاس موجود ہے۔

لیکن اس مباہلہ کا اثر یہ ہوا کہ یہی شیخ عبدالرحمن مصری جن کو ذمہ دار بنا کر احرار سے شرائط طے کرنے کے لئے بھیجا گیا، ۱۹۳۷ء میں خود ہی مباہلے کے میدان میں مرزا محمود کو چیلنج کرنے لگے اور جب مرزا صاحب اپنی صفائی پیش کرنے سے کترا گئے تو اس نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ عدالت میں شیخ مصری نے جو حلفیہ بیان مرزا محمود کے بارے میں دیا، وہ یہ تھا:

> "موجودہ خلیفہ (مرزا محمود) سخت بدچلن ہے، یہ تقدس کے پردے میں عورتوں کا شکار کھیلتا ہے۔ اس کام کے لئے اس نے بعض مردوں اور بعض عورتوں کو بطور ایجنٹ رکھا ہوا ہے۔ ان کے ذریعہ یہ معصوم لڑکیوں اور لڑکوں کو قابو کرتا ہے۔ اس نے ایک سوسائٹی بنائی ہوئی ہے جس میں مرد اور عورتیں شامل ہیں اور اس سوسائٹی میں زنا ہوتا ہے۔"
> (فتح حق [illegible] شائع کردہ: احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور)

شیخ مصری کا یہ بیان، مذہبی تاریخ میں انوکھی مثال ہے کہ ایک مرید اپنے واجب الاطاعت خلیفہ کے بارے میں حلفیہ طور پر اپنے مشاہدات کو کھلی عدالت میں اتنے کھلے الفاظ میں بیان کرے ـــــ اگر شیخ مصری کے اس بیان کو احرار سے مباہلہ کا نتیجہ کہا جائے تو کیا بے جا ہوگا؟

احرار کی تبلیغی مہم

"احرار کے نزدیک قادیانی، ناموس رسالت کے قزاق اور انگریز کے وفادار پالتو تھے۔ قادیانیت، سامراج کی سب سے بڑی عیاری اور دجل و تلبیس کا دام فریب تھا۔ قادیانیوں کی حکومت کے لئے جاسوسی اور خوشامد اسلام اور مسلمانوں سے غداری کے مترادف تھی۔ اس لئے احرار کے ہاں ان کی خرافات اور مرزائیوں کی عزت و احترام کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ قادیانیت کو کسی سنجیدہ بحث و تجزیہ کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں مرزائیت، اسلام اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ایک مذاق کی حیثیت رکھتی تھی اور مرزائی جماعت ایک مسخروں کا ٹولہ تھا۔ اس لئے احرار نے علمی بحثوں سے ہٹ کر مسلمانوں کو قادیانیوں سے نفرت دلانے پر توجہ کی، اور اسے اپنے مذہبی فرائض میں شامل کر لیا۔

احرار کی تبلیغی مہم کے کئی پہلو تھے، ان میں سب سے اہم ترین پہلو یہ تھا کہ مرزا غلام احمد اور ان کے حواریوں کے اخلاق و کردار کو ان کی کتابوں سے پیش کیا جاتا، اور مسلمانوں کو توجہ دلائی جاتی کہ جن لوگوں کی یہ حالت ہو کیا وہ نبی یا مجدد، مسیح موعود یا مذہبی پیشوا ہو سکتے ہیں؟ احرار جگہ جگہ جلسے کرتے اور مرزائی لٹریچر سے وہ مواد پیش کرتے جس سے مرزائیت ایک [illegible] بن کر رہ جاتی۔ مرزائیوں کو شکایت ہوتی کہ "احرار" ان کے "مسیح موعود" کو گالیاں نکالتے ہیں، ان کے "خلیفہ صاحب" کی بے ادبی کرتے ہیں، لیکن یہ شکایت بے جا تھی، احرار کا جرم اگر تھا تو یہ تھا کہ وہ مرزائی لٹریچر کے آئینے میں مرزائیت کا بھیانک چہرہ مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیتے تھے، مثلاً سیرۃ المہدی میں صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب قادیانی نے بہت سے واقعات درج کئے کہ مرزا غلام احمد نامحرم عورتوں سے

حکم الٰہی ان پر لاگو نہیں ہوتا، حکم الحکام یہ تو انگریزوں کے لئے ہیں۔ قادیان کا خانوادۂ نبوت تو اتنا مقدس ہے کہ پیغمبر حرم عورتیں اس سے جس قدر مس ہو اختلاط زیادہ کریں گی اتنی ہی رحمتیں اور برکتیں ان پر نازل ہونگی

لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

اب غور فرمائیے کیا یہ لٹریچر اور یہ منطق سنجیدہ بحث ونظر کی مستحق ہے! یہ صرف ایک مثال عرض کی گئی ہے، ورنہ قادیانی لٹریچر اس قسم کے ہزلیات وخرافات کے تعفن سے بھرا ہوا ہے۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جب تک مرزائی حلقوں تک محدود رہے تب تک وہ "اسرار ومعارف" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور جب اسے پبلک اسٹیج پر پیش کیا جائے تو یک لخت وہ گالی ہو جاتا ہے چنانچہ احرار جب اپنی تقریر میں ان قادیانی "اسرار معارف" کو پیش کرتے تو مرزائی چلا اٹھتے کہ ہمیں گندی گالیاں دی جا رہی ہیں۔ کاش! ان بھلے لوگوں سے کوئی کہتا کہ اگر تمہارے لٹریچر کا مواد پیش کر دینا ہی "گندی گالی" ہے تو اس میں مجرم "احرار" ہیں یا تمہارے حضرت صاحب! حاصل یہ کہ احرار نے مرزائیوں کے خلاف اس قدر نفرت پھیلائی کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے یہ لطیفے گلی گلی پہنچ گئے۔ اور "مرزائی" کا لفظ خود مرزائیوں کے نزدیک بھی واقعۃً گالی بن کر رہ گیا۔۔۔۔ قادیانیوں سے یہ عمومی نفرت نہ سنجیدہ مقالات سے پیدا ہو سکتی تھی، نہ عالمانہ بحثوں سے، نہ دار الافتاء کے فتووں سے۔۔۔

احرار کے تنفیری کارنامہ کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ مرزائیوں کی انگریز پرستی اور اسلام دشمنی کو اس انداز سے بیان کرتے کہ انگریز اور قادیانی بیک وقت دونوں تلملا اٹھتے، مرزائیوں کی تاریخ کا سب سے بدترین باب یہ ہے کہ اس نے ایک طرف تمام عالم اسلام کو کافر گردانا، اور دوسری طرف ہر ایسے موقع پر جہاں اسلام اور انگریز کے مفاد کے درمیان ٹکراؤ ہوا وہاں اسلام کے بجائے "کافر انگریز" سے وفاداری کا مظاہرہ کیا۔۔۔۔ ترکی خلافت کو تاخت وتاراج کیا جا رہا تھا، پورا عالم اسلام خون کے آنسو رو رہا تھا، لیکن مرزائی قادیان میں انگریز کی مدح وستائش اور مسلمانوں کی مذمت میں مشغول تھا جسٹس منیر نے اپنی منافقانہ زبان کے باوجود یہ تسلیم کیا ہے کہ:

"پھر احمدیوں کو تحریک احمدیہ کے بانی اور اس کے پیشوا کے خلاف جو بڑی بڑی شکایات تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ انگریزوں کے "ذلیل خوشامدی" ہیں۔" جب انہوں نے (مرزا غلام احمد نے) عقیدۂ جہاد کی تاویل میں "مہربان انگریزی گورنمنٹ" اور اس کی مذہبی رواداری کی تعریف نہایت خوشامدانہ لہجے میں کرنی شروع کی تو اس تاویل پر چند در چند شبہات پیدا ہونے لگے، پھر جب مرزا صاحب نے ممالک اسلامی کی عدم رواداری اور انگریزوں کی فراخ دلانہ مذہبی پالیسی کا موازنہ ومقابلہ توہین آمیز انداز میں کیا تو مسلمانوں کا غیظ وغضب اور بھی زیادہ مشتعل ہو گیا، احمدی جانتے تھے کہ ان کے عقائد دوسرے مسلم ممالک میں اشاعت ارتداد پر محمول کئے جائیں گے، اور ان کا یہ خیال اس وقت اور بھی پختہ ہو گیا جب افغانستان میں عبداللطیف (احمدی) کو سنگسار کیا گیا جب پہلی جنگ عظیم میں (جس میں ترکوں کو شکست ہو گئی تھی) بغداد پر ۱۹۱۸ء میں انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، اور قادیان میں اس "فتح" پر جشن مسرت منایا گیا تو مسلمانوں میں برہمی پیدا ہوئی اور احمدی انگریزوں کے پٹھو سمجھے جانے لگے"۔

(رپورٹ تحقیقاتی عدالت ۲۰۸)

احرار جنگ آزادی کے مجاہد تھے، وہ اپنے دین ومذہب اور قوم ووطن کی آزادی کے لئے انگریزی حکومت کی آہنی دیوار سے ٹکرا

رہے تھے، احرار نے مرزائیت کے خلاف نفرت کی سی فضا پیدا کی۔ احرار کے
لیڈروں نے ہر سال قادیان میں جلسہ کیا اور کوئی جلسہ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ تقریر
میں مرزائیت کے خلاف نہ بولا گیا ہو۔ احرار نے انگریز کی خوشامد پرستی سے
نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا کہ قادیانیوں کو اپنی روش سے نفرت ہونے
لگی۔ کیونکہ وہ انگریز پرستی کو اپنا دین کا شعار قرار
دیتے تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی انگریز کی خوشامد اور وفاداری کو اپنا
خاندانی پیشہ ظاہر کیا کرتا تھا۔ لیکن احرار کی یلغار کے بعد انہیں انگریز
پرستی کا لفظ گالی تصور کرنے لگا۔ مرزائیوں کے لیے یہی ہوتا تو مرزا
غلام احمد کی وہ تمام کتابیں دفن کر دیتے جن میں انگریز کی گھٹیا خوشامد
درج ہے۔ اور جن میں ملکہ برطانیہ کو "خدا کا نور" قرار دیا گیا ہے۔

اقلیت قرار دینے کا مطالبہ

قادیانی اپنے معاندانہ نظریات کے لحاظ سے کسی وقت بھی مسلمانوں
کی صف میں شمار نہیں کئے گئے، لیکن انگریزی سیاست انہیں مسلمانوں میں شامل
رکھنے پر مصر تھی، مسلمانوں کی جانب سے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے
کا مطالبہ سب سے پہلے علامہ اقبال مرحوم نے اٹھایا۔ اس کے بعد احرار نے
اس کو مستقل مشن بنا لیا۔ مرزا غلام احمد اور مرزائی جماعت کی کفریات کو
پیش کر کے انہیں مسلمانوں سے جداگانہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ قریبا
ہر بڑے جلسے میں کیا جاتا، اگرچہ تقسیم سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد
بھی (۱۹۴۷ء تک) ارباب اقتدار نے احرار کے اس مطالبہ کو درخور اعتنا
نہ سمجھا لیکن اس مطالبہ کو بار بار دہرانے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مسلمانوں کے
ذہن میں یہ مطالبہ راسخ ہوتا چلا گیا، اور عملی طور پر عام مسلمانوں نے قادیانیوں
کو کبھی اپنی صف میں جگہ نہیں دی۔

مرزائیوں کے خلاف احرار کی مہم کا ایک پہلو یہ تھا کہ الیکشن میں
کسی مرزائی کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ مرزائی مسلمانوں کی سیٹ

پر مسلمانوں کے نمائندوں کی حیثیت سے کھڑے ہوتے اور اسباب اقتدار کے
ساتھ اپنے غیر معمولی اثر و رسوخ اور دولت کے بل بوتے پر کامیاب
ہونے کی کوشش کرتے، لیکن احرار کو جہاں پتہ چل جاتا کہ فلاں سیٹ پر کوئی
احمدی مسلمانوں کے ووٹ سے آگے جانے کی تیاری کر رہا ہے، یہ فوراً
وہاں پہنچ جاتے اور پوری قوت سے مرزائیوں کی مزاحمت کرتے۔ اکثر
و بیشتر مرزائیوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا — واقعہ یہ ہے کہ اس محاذ
پر صرف احرار نے کام کیا — میں اس عنوان کو مسٹر جسٹس منیر کے ایک
اقتباس پر ختم کرتا ہوں، موصوف لکھتے ہیں:

> "احرار کی بڑی بڑی سرگرمیوں میں ایک یہ تھی کہ وہ
> کسی نہ کسی شکل میں احمدیوں کی مخالفت کرتے رہتے
> تھے، یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ احرار کی پیدائش ہی احمدیوں
> کی نفرت سے ہوئی ہے، ابھی مجلس احرار کی تاسیس
> پر دو ہی سال گزرے تھے کہ انہوں نے ایک قرارداد
> منظور کی جس کا منشا یہ تھا کہ کوئی قادیانی کسی مجلس
> عاملہ کا ممبر منتخب نہ کیا جائے۔ قادیان تقسیم سے پہلے
> تقریباً خالص احمدی قصبہ تھا، ۱۹۳۴ء میں احرار
> نے قادیان میں ایک کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ
> کیا، لیکن جب اس جلسے کو ممنوع قرار دیا گیا تو انہوں نے
> اسی سال ۲۱ اکتوبر کو قادیان سے صرف ایک میل
> کے فاصلہ پر ایک گاؤں رجادہ کے دیانند اینگلو ویدک
> ہائی سکول کی گراؤنڈ میں کانفرنس منعقد کر لی جس میں
> حاضرین کی تعداد ہزاروں تک تھی، اس کانفرنس میں
> احرار کے مقبول عام خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
> نے احمدیوں کے خلاف پانچ گھنٹے کی ایک نفرت آمیز
> تقریر کی جس میں انہوں نے ایسی باتیں کہیں جن سے صرف

قادیان سے ربوہ تک

مختصر یہ کہ ان اکابر کی قیادت میں امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور "مجلس احرار اسلام" کے سرفروشوں نے اپنی شعلہ بار خطابت کے ذریعے انگریز اور انگریز کی ساختہ پرداختہ قادیانی نبوت کے خرمن امن کو پھونک ڈالا۔ تا آنکہ ۱۹۴۷ء میں انگریزی اقتدار رخت سفر باندھ کر رخصت ہوا تو برصغیر کی تقسیم ہوئی، اور پاکستان منصۂ وجود پہ جلوہ گر ہوا۔ اس تقسیم کے نتیجہ میں قادیانی نبوت کا منبع خشک ہوگیا اور قادیان کی منحوس بستی دار الکفر دار الحرب ہندوستان کے حصہ میں آئی۔

قادیانی خلیفہ اپنی "ارض حرم" اور "مکۃ المسیح" قادیان سے برقع پہن کر فرار ہوا۔ اور پاکستان میں ربوہ کے نام سے نیا دار الکفر تعمیر کرنے کے بعد شاہوار نبوت کی ترکتازیاں دکھانے اور پورے ملک کو مرتد کرنے کا اعلان کرنے لگا۔

قیام پاکستان کے بعد

قادیانیوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ پاکستان کے ارباب اقتدار پر ان کا تسلط ہے، ملک کے کلیدی مناصب ان کے قبضے میں ہیں، پاکستان کا وزیر خارجہ ظفر اللہ خاں خلیفہ قادیان (حال ربوہ) کا ادنیٰ مرید ہے اس لئے پاکستان میں مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا جعلی سکہ رائج کرنے میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی، ان کی امید افزائی کا خاص پہلو یہ بھی تھا کہ "احرار اسلام" کا قافلہ تقسیم ملک کی وجہ سے لٹ چکا تھا، تنظیم اور تنظیمی وسائل کا فقدان تھا۔ اور پھر "احرار اسلام" ناخدایان پاکستان کے دربار میں معتوب تھے، اس لئے قادیانیوں کو غرہ تھا کہ اب حریم نبوت کی پاسبانی کے فرائض انجام دینے کی کسی کو ہمت نہیں ہوگی لیکن وہ یہ بھول گئے تھے کہ حفاظت دین اور "تحفظ ختم نبوت" کا کام انسان نہیں کرتے خدا کرتا ہے، اور وہ اس کام کے لئے خود ہی رجال کار بھی پیدا فرما دیتا ہے۔

مجلس تحفظ ختم نبوت

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کے رفقاء قادیانیت کے عزائم سے بے خبر نہیں تھے، چنانچہ جدید حالات میں قادیانیت کے خلاف کام کرنے کا لائحہ عمل مرتب کرنے کے لئے ملتان کی ایک چھوٹی سی مسجد "مسجد سراجاں" میں ایک مجلس مشاورت ہوئی، جس میں امیر شریعتؒ کے علاوہ مجاہد ملت حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ، خطیب پاکستان مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ، مولانا عبد الرحمٰن میانوی، مولانا تاج محمود لائل پوریؒ اور مولانا محمد شریف جالندھریؒ شریک ہوئے۔ غور و فکر کے بعد ایک سیاسی تبلیغی تنظیم "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی بنیاد رکھی گئی اور اس کا ابتدائی میزانیہ ایک روپیہ یومیہ تجویز کیا گیا۔ چنانچہ صدر المبلغین کی حیثیت سے فاتح قادیان حضرت مولانا محمد حیات صاحب اطال اللہ حیاتہ، کو جو قادیان میں شعبۂ تبلیغ احرار اسلام" کے صدر تھے ملتان طلب کیا گیا۔ ان دنوں مسجد سراجاں ملتان کا چھوٹا سا حجرہ مجلس تحفظ ختم نبوت کا مرکزی دفتر تھا۔ وہی دار المبلغین تھا، وہی دار الاقامہ تھا وہی مشاورت گاہ تھی اور یہی چھوٹی سی مسجد اس عالمی تحریک "مجلس تحفظ ختم نبوت" کا ابتدائی کنٹرول آفس تھا۔ شہید اسلام حضرت زید رضی اللہ عنہ کے بقول ؎

وذلک فی ذات الالٰہ وان یشاء

یبارک علیٰ اوصال شلو ممزع

حق تعالیٰ شانہ نے اپنی قدرت کاملہ سے اس نحیف و ضعیف تحریک میں ایسی برکت ڈالی کہ آج اس کی شاخیں اقطار عالم میں پھیل

چکی ہیں اور اس کا مجموعی میزانیہ لاکھوں سے متجاوز ہے۔

قیادت باسعادت

"مجلس تحفظ ختم نبوت" کو یہ سعادت ہمیشہ حاصل رہی ہے کہ اکابرِ اولیاء اللہ کی قیادت و سرپرستی اور دعائیں اسے حاصل رہی ہیں حضرت اقدس رائے پوری" آخری دم تک اس تحریک کے قائد و سرپرست رہے۔ ان کے وصال کے بعد حضرت مولانا خیر محمد جالندھری حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہ، حضرت مولانا عبداللہ درخواستی مدظلہ اور حضرت مولانا خان محمد صاحب خانقاہ سراجیہ کندیاں، اس کے سرپرست رہے "مجلس تحفظِ ختم نبوت" کے بانی اور امیرِ اول امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ امیرِ شریعتؒ کی وفات ۱۹۶۱ء میں ہوئی اور خطیب پاکستان قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ ان کے جانشین مقرر ہوئے ان کے وصال کے بعد حضرت مجاہدِ ملت مولانا محمد علی صاحبؒ جالندھری کو امارت سپرد کی گئی، ان کے وصال کے بعد مناظرِ اسلام مولانا لال حسین اخترؒ امیرِ مجلس ہوئے۔ مولانا لال حسین اختر کے بعد عارضی طور پر فاتح قادیان حضرت مولانا محمد حیات صاحب مدظلہ کو مسندِ امارت تفویض ہوئی مگر اپنے ضعف و عوارض کی بناء پر انہوں نے اس گراں باری سے معذرت کا اظہار فرمایا، یہ ایک ایسا بحران تھا کہ جس سے اس عظیم الشان تحریک کی پیش قدمی رک جانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا، لیکن حق تعالیٰ شانہ، کا وعدہ حفاظت دیکھئے کہ ایک ایسی ہستی کو اس منصب عالی کے لئے کھینچ لایا جا رہا ہے جو اسلاف کے علوم و روایات کی امین ہے، اور جس پر ملتِ اسلامیہ کو بجا طور پر فخر حاصل ہے، میری مراد شیخ الاسلام حضرت العلامہ مولانا سید محمد یوسف بنوری، دامت برکاتہم سے ہے۔

تحفظ ختم نبوت اور ردِ قادیانیت، امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی وراثت و امانت تھی اور اس کا اہل علوم انوری کے وارث حضرت شیخ بنوری سے بہتر اور کون ہو سکتا تھا؟ چنانچہ حضرت امیر شریعت قدس سرہ کی امامت، خطیب پاکستان مولانا قاضی احسان احمد رحمۃ اللہ کی خطابت، مجاہد ملت مولانا محمد علی جالندھری نور اللہ مرقدہ کی ذہانت، مناظر اسلام مولانا لال حسین اختر رحمۃ اللہ علیہ کی دقت نظر، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہ کی بلندی عزم نے مجلس تحفظ ختم نبوت کی عزت و شہرت کو چار چاند لگا دیئے بلکہ ان حضرات کی قیادت نے قصر قادیانیت پر آتشی ضرب کاری لگائی کہ قادیانی تحریک کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت پر کذب و افترا کی آئینی مہر لگ گئی۔

غیر سیاسی جماعت

"مجلس تحفظ ختم نبوت" کا مقصدِ تاسیس عقیدہ ختم نبوت کی حفاظت اور امت مسلمہ کو قادیانی الحاد سے بچانا تھا، اس کے لئے ضروری تھی کہ جماعت خارزارِ سیاست میں الجھ کر نہ رہ جائے چنانچہ جماعت کے دستور میں تصریح کر دی گئی کہ جماعت کے ذمہ دار ارکان سیاسی معرکوں میں حصہ نہیں لیں گے، کیوں کہ سیاسی میدان میں کام کرنے کے لئے دوسرے حضرات موجود ہیں۔ اس لئے "مجلس تحفظ ختم نبوت" کا دائرہ عمل صرف ارشاد، اصلاح و تبلیغ اور ردِ قادیانیت تک محدود رہے گا، اس فیصلے سے دو فائدے متصور تھے، ایک یہ کہ جماعت تحفظ ختم نبوت کا پلیٹ فارم تمام مسلمانوں کا اجتماعی پلیٹ فارم رہے گا، اور عقیدہ ختم نبوت کا جذبہ اہلِ اسلام کے اتحاد و اتفاق اور ان کے باہمی ربط و تعلق کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگا۔ دوم یہ کہ "مجلس تحفظ ختم نبوت" کا اربابِ اقتدار سے یا کسی اور سیاسی جماعت سے تصادم نہیں ہوگا اور امتِ مسلمہ کا اجتماعی عقیدۂ ختم نبوت اطفال سیاست کا کھلونا بننے سے محفوظ رہے گا۔

مشکلات و موانع

حق تعالیٰ نے اس مختصر ترین جماعت کو جن دینی خدمات سے سرفراز فرمایا ان کی تفصیل معلوم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان مشکلات کا بھی ایک نظر مطالعہ کیا جائے جو اس کے راستہ میں کوہ گراں کی طرح حائل رہیں۔

قیام پاکستان کے بعد اس نوزائیدہ مملکت میں قادیانی مرتدین کو اثر و رسوخ خوفناک حد تک بڑھ گیا تھا، سر ظفر اللہ خان قادیانی پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ اور ملکی پالیسی کے خالق تھے۔ مسٹر ایم ایم احمد سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر تھے، فوج، پولیس، عدلیہ، انتظامیہ اور قانون سروس کے اہم اور نازک ترین کلیدی مناصب پر چن چن کر قادیانی افراد کو مقرر کیا گیا، یہ تمام لوگ جن کے ہاتھوں میں ملک کے نظم و نسق کی کلید تھی خلیفہ ربوہ کے مرید و مطیع تھے ان کا ہر اقدام خلیفہ کے اشارہ چشم و ابرو کا رہین منت تھا۔ گویا قادیانی خلیفہ صرف اپنی "مرتد جماعت" کا ہی امیر المومنین نہیں تھا بلکہ اپنے مریدوں کی وساطت سے نظم مملکت میں براہ راست دخیل تھا۔ اور مسلمانوں پر خلافت حکمرانی کر رہا تھا اور ملک کی قسمت کے فیصلے "ربوہ" کے دارالندوہ میں کئے جاتے تھے۔

ان حالات میں خلیفہ قادیانی کے باپ مرزا غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت کے خلاف لب کشائی کی اجازت کیونکر ہو سکتی تھی؟ یہی وجہ ہے کہ "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے کارکنوں کی زباں بندی، نظربندی اور پابندی روز کا معمول بن چکی تھی۔ ان مجرم ناآشناؤں کا "جرم بے گناہی" یہ تھا کہ کذاب قادیان مرزا غلام احمد کی نبوت کو غلط اور اس جھوٹی نبوت کے پرستاروں کو "کافر" کہنے کی "غلطی" کیوں کی جاتی ہے۔ ختم نبوت کے مجاہدین کہیں قادیان کی ہذیانی نبوت پر لب کشائی کرتے قانون فوراً وہاں ہتھکڑی لے کر پہنچ جاتا۔ گرفتاری، مقدمہ، پیشی، سزا اور بالآخر جیل مجاہدین ختم نبوت کا تحفہ تھا جو انہیں قادیانی گماشتوں کی جانب سے عطا کیا جاتا۔ بلا مبالغہ ایک ایک کارکن پر بیس بیس مقدمہ کا تانتا بندھا رہتا اور پھر یہ غیر ختم سلسلہ کہیں تھمنے کا نام نہ لیتا۔ اس جبر و تشدد اور ان ستم رانیوں کے باوجود مجاہدین ختم نبوت نے ہمت نہ ہاری بلکہ ان کے کیف و سرمستی میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا اور جور و ستم کے طوفان، قید و سلاسل کا خوف اور دار و رسن کے تشویشناک لمحات نہ روک سکے۔ بلکہ اس سنگلاخ زمین میں بھی "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے آہنی عزم جوانمردوں نے سفر جاری رکھا۔ اس کسمپرسی و بے بضاعتی کے عالم میں "مجلس تحفظ ختم نبوت" نے جن شعبوں میں کام کیا ان کا مختصر جائزہ پیش خدمت ہے۔

شعبۂ تبلیغ

"مجلس تحفظ ختم نبوت" نے ملک میں ایسا مخصوص "تبلیغی نظام" قائم کیا جو اپنی نوعیت کا منفرد "تبلیغی نظام" ہے، مجلس نے تدریجاً ایسے مبلغین کی مضبوط جماعت تیار کی جو ہر علاقہ میں بلا معاوضہ دعوت و تبلیغ کا کام انجام دیں اور "مجلس تحفظ ختم نبوت" ان کے مصارف کا کفیل ہو۔

ملک کے کسی حصے میں دعوت و تبلیغ اور رد قادیانیت کی ضرورت ہو مجلس کے مرکزی دفتر کو ایک کارڈ لکھ کر وقت طے کر لیجئے۔ مجلس کا مبلغ ٹھیک وقت پر وہاں پہنچ جائے گا۔ داعی اگر کچھ خدمت کرے تو وہ مجلس کے بیت المال میں جمع کر دیا جائیگا۔

اس نظام تبلیغ کا یہ فائدہ ہوا کہ لاہور سے کوئٹہ اور کراچی سے پشاور تک ہر طرف سے "مجلس تحفظ ختم نبوت" کو جلسوں کی دعوت آنے لگیں۔ مبلغین ختم نبوت اور رد قادیانیت پر اظہار خیال کرنے کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ آیا اور انہوں نے ملک کے چپے چپے اور قریہ قریہ میں ختم نبوت کی تبلیغ کی۔

مجلس کے تبلیغی اثرات کا اندازہ صرف ایک معمولی سے واقعہ سے

کیا جا سکتا ہے کہ ربوہ کی گرانی سے تنگ آ کر قادیانی خلیفہ نے اپنے گرانی بیٹھ کر اور شہر کے لئے ضلع سرگودھا کے ایک سرد مقام وادی سون کو منتخب کیا اور "نخلہ" کے نام سے وہاں ایک قادیانی مرکز تعمیر کرالیا۔ پانی کے لئے ٹیوب ویل اور بجلی پیدا کرنے کے لئے ایک لاکھ روپے کا جنریٹر لگایا گیا، قادیانی خلیفہ اور اس کے حواریوں کے لئے نفیس ترین بنگلے تعمیر کئے گئے۔ ختم نبوت کے کارکنوں نے مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکز کو اطلاع کی مرکز نے "نخلہ" کے متصل موضع "جابہ" میں ایک "ختم نبوت کانفرنس" منعقد کرانے کا اعلان کرایا۔ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے امیر شریعتؒ نے اس علاقہ کے مسلمانوں کو فتنۂ قادیانیت کے خدوخال سے آگاہ کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ قادیانی مرتدین کو "نخلہ" جانے کی ہمت نہ ہوئی، آج "نخلہ" کی ویرانی کَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ کی شکل میں اپنے بانیوں کا ماتم کر رہی ہے۔

ختم نبوت چنیوٹ کانفرنس اور جابہ کانفرنس

"مجلس تحفظ ختم نبوت" نے اپنے تبلیغی نظام کو مزید وسعت دینے کے لئے ایک خاص انتظام یہ کیا کہ جن علاقوں میں قادیانیوں کا زور تھا وہاں خود اپنے مصارف سے جلسے اور کانفرنسیں منعقد کرنے کا اہتمام کیا اور قادیانیوں کو خود ان کے علاقوں میں للکارا، اس قسم کی بے شمار کانفرنسیں منعقد کی گئی ان میں "چنیوٹ ختم نبوت کانفرنس" اور "جابہ ختم نبوت کانفرنس" کا ذکر خاص اہمیت رکھتا ہے الخ۔ مرزا غلام احمد قادیانی چونکہ مسیحیت کا مدعی اور جدید عیسائیت کا بانی تھا، اس لئے عیسائیوں کے تہوار کے دنوں میں ۲۵، ۲۶، ۲۷ دسمبر کو ان کی جماعت کا سالانہ مرکز ارتداد ربوہ کے نام سے تقسیم سے قبل مرکز کفر قادیان میں ہوتا تھا، اور تقسیم کے بعد نئے مرکز ارتداد ربوہ میں ہونے لگا، اس لئے قادیانیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی جانب سے ختم نبوت کانفرنس ان ہی تاریخوں میں پہلے قادیان میں ہوتی تھی اور اب ربوہ کے متصل چنیوٹ میں ہوتی ہے، اس عظیم الشان کانفرنس کا انتظام "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی طرف سے کیا جاتا ہے جس میں تمام اسلامی مکاتب فکر کے نامور علماء کرام قادیانیت کی تردید کرتے ہیں۔ اسی طرح "نخلہ" کے قریب موضع "جابہ" میں بھی ہر سال باقاعدگی سے ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوتی ہے اور وہاں جماعت کا دفتر اور مدرسہ بھی کام کر رہا ہے۔

مجلس تحفظ ختم نبوت کے ذیلی مراکز

تحریک ختم نبوت کی دعوت کو مزید وسعت دینے کے لئے "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی جانب سے ایک خاص اہتمام کیا گیا کہ ہر بڑے شہر میں جماعت کا دفتر قائم کر کے وہاں جگہ جگہ کے علاوہ ایک ایسے عالم کو مبلغ کی حیثیت سے مقرر کیا گیا جو قادیانیت کے اسرار و رموز پر ماہرانہ دسترس رکھتا ہو تاکہ مسلمانوں کا رابطہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے ساتھ قوی اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہو اور قادیانیوں کی مرتدانہ سرگرمیوں پر ہر لمحہ کڑی نگاہ رکھی جا سکے، یہ کام خاصا مشکل تھا لیکن بحمداللہ جماعت کو اس میں بڑی کامیابی ہوئی۔ اب خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے مجلس تحفظ ختم نبوت کی ذیلی شاخیں چھوٹے چھوٹے قصبات میں بھی موجود ہیں اور جماعت کے ضلعی دفاتر ان کا نظم و نسق چلا رہے ہیں۔ یہی انتظام بیرونی ممالک میں بھی کیا جا رہا ہے۔ اور ان شاء اللہ ان تمام ممالک میں جہاں قادیانی ارتداد کا فتنہ موجود ہے "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے مراکز عنقریب قائم کر دیئے جائیں گے، اب تک تقریباً ایک درجن ممالک میں جماعت کی شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔

مرکزی دارالمبلغین

جماعت "تحفظ ختم نبوت" کے پیش نظر ایک اہم ترین فریضہ یہ

شامل رہے طلبہ کو عربی مدارس میں قادیانیت کی تعلیم دی جائے تاکہ انہیں
قادیانیوں سے گفتگو کرنے کا موقع ملے تو وہ پوری طرح بصیرت و اطمینان
سے ان کے ساتھ قادیانیوں سے بحث و گفتگو کرسکیں۔ اس مقصد کے
لئے مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی دفتر میں ایک مدرسۃ المبلغین قائم
کیا گیا جس میں علماء کو تعلیم و تربیت کے لئے دو حصے میں تجویز کئے گئے۔ اول
یہ کہ جو علماء اس کے لئے کافی وقت نہیں دے سکتے انہیں تعطیلات
کے زمانے میں مدرسۃ المبلغین میں رکھا جائے اور ان کی رہائش و دیگر
ضروریات کا انتظام جماعت کی جانب سے کیا جائے۔ دوم یہ کہ جو حضرات
اس کے لئے مستقل وقت دے سکیں انہیں مجلس تحفظ ختم نبوت کے رفیق
کی حیثیت سے باقاعدہ وظیفہ دیا جائے اور قادیانیت کے مقابلہ میں
انہیں علمی اسلحے سے پوری طرح مسلح کیا جائے۔

اس کے علاوہ ایک خصوصی انتظام یہ کیا گیا کہ ملک کے بڑے
بڑے دینی مدارس میں مدرسۃ المبلغین کے نمائندے کچھ مدت قیام کریں اور
فارغ التحصیل یا منتہی طلبہ کو رد قادیانیت کی تربیت دی جائے۔ بحمد اللہ
مدرسۃ المبلغین کے اس تدریجی نظام کے تحت ہر سال مبلغین کی ایک اچھی جماعت
تیار ہو جاتی ہے جو اپنی اپنی جگہ تبلیغ ختم نبوت اور رد قادیانیت کے
فرائض انجام دیتی ہے اب تک ہزاروں کی تعداد میں ایسے مبلغین تیار ہو
چکے ہیں جن میں سے بعض حضرات بیرونی ممالک میں بھی کام کر رہے
ہیں۔ حال ہی میں مرکزی جماعت کے رہنما مولانا عبدالرحیم اشعر اور ان
کے رفیق مولانا اللہ وسایا المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ کے صدر
الشیخ حسین الحبشی کی دعوت پر انڈونیشیا تشریف لے گئے اور
المعہد الاسلامی اور دیگر اداروں کے طلباء کو قادیانیت پر تیاری مکمل
کرائی۔

مناظرے اور مباحثے

قادیانی مرتدین مناظروں اور مباحثوں کے مریض ہیں۔ ایک زمانے
میں وہ ہندو پاک میں ہر جگہ بھولے بھالے مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر ان سے
"حیات و وفات مسیح" اور "اجرائے نبوت" کے موضوع پر بحث چھیڑ
دیا کرتے تھے۔ "مجلس تحفظ ختم نبوت" کو قادیانی مرتدین کی اس جارحیت
کا نوٹس لینا ضروری تھا، چنانچہ ختم نبوت کے مبلغین کو سینکڑوں مرتبہ قادیانیوں
سے گفتگو اور مناظرہ و مباحثہ کی نوبت آئی، خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے
ہر جگہ مرتدین کو ذلت آمیز شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور قادیانی ٹولہ،
مجلس کے مبلغین سے اس قدر زچ ہوا کہ قادیانی خلیفہ کو باقاعدہ اعلان کرنا
پڑا کہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے کسی مبلغ سے مناظرہ نہ کیا جائے۔ بسا اوقات
ایسا بھی ہوا کہ ختم نبوت کے مرکزی دفتر کو اطلاع ہوئی کہ فلاں جگہ مرتدین مسلمانوں
کو گمراہ کر رہے ہیں، جماعت کا فاضل مبلغ کتابوں کا صندوق لے کر سینکڑوں
میل کی مسافت طے کر کے وہاں پہنچا تو قادیانی مرتدین نے وہاں راہ فرار
اختیار کرنے کو سب سے بڑی فتح سمجھا۔ پورے ملک کے لئے "مجلس
تحفظ ختم نبوت" کا اعلان تھا، اور اب یہ اعلان پوری دنیا کے لئے
ہے، اگر کسی جگہ بھی قادیانی مرتدین مسلمانوں کو پریشان کر رہے ہوں تو مجلس
کے مرکزی دفتر کو "مجلس تحفظ ختم نبوت" تغلق روڈ ملتان کے پتہ پر ایک
اطلاع نامہ لکھ دیجئے۔ ختم نبوت کے مجاہدین ان شاء اللہ فوراً اس محاذ پر
پہنچ جائیں گے۔ اور قادیانی مرتدین سے نمٹ لیں گے ان شاء اللہ

مجاہد ملت حضرت محمد علی جالندھری صاحبؒ یہ لطیفہ سنایا کرتے تھے
کہ کسی سفر میں وہ اسٹیشن پر ایسے وقت پہنچے کہ ریل کے آنے میں کچھ وقت
تھا، غور کیا کہ اس مختصر سے فارغ وقت کو کیسے کام میں لایا جائے، چائے
کے اسٹال پر گئے چائے نوش کی پیسے ادا کئے اور چائے والے سے کہا،
میرا نام محمد علی جالندھری ہے "مجلس تحفظ ختم نبوت" کا نمائندہ ہوں میرا
پتہ یہ ہے، اگر خدانخواستہ کسی وقت کوئی مرزائی تمہارے علاقے میں شرارت
کرے تو مجھے خط لکھ دینا، مولانا مرحوم فرماتے تھے کہ سات برس بعد اس
شخص کا خط آیا کہ ہمارے قصبے میں مرزائی مبلغین قادیانیت کی تبلیغ کر

بسے ہیں اور انہوں نے ایک خاندان کو مرتد کر لیا ہے یہ خط ملتے ہی ہم وہاں پہنچے، قادیانیوں کو چیلنج کیا تو قادیانی بھاگ گئے اور نو مرتد گھرانے کو قادیانیت کی حقیقت سمجھائی تو وہ دوبارہ مشرف باسلام ہوا- اس کے بعد قادیانیوں کو اس قصبے کا رخ کرنے کی جرأت نہ ہوئی- یہ سینکڑوں واقعات میں سے ایک معمولی سا واقعہ ہے جو مجاہدین ختم نبوت کے ذوق و شغف، محنت و خلوص اور عزم و تدبر کی ٹھیک ٹھیک عکاسی کرتا ہے۔

مسلم قادیانی مقدمات

مجلس تحفظ ختم نبوت کو قادیانیت کے خلاف ہمہ گیر مسائل سے واسطہ تھا اور اس کے رہنماؤں کو قادیانی مسئلہ کے ہر پہلو پر مسلمانوں کی اعانت اور رہنمائی کی ضرورت لاحق رہتی تھی چنانچہ مجلس نے ایک اہم خدمت اپنے ذمہ یہ لے رکھی تھی (اور ابھی تک اس کے ذمہ ہے) کہ اسلام اور قادیانیت کے تقابل کے سلسلہ میں جس قدر مقدمات عدالتوں میں جائیں ان میں نہ صرف مسلمانوں کی اخلاقی و قانونی مدد کی جائے بلکہ حسب ضرورت مقدمہ کے مصارف کا تکفل بھی کیا جائے اس قسم کے مقدمات کو تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلی قسم ان مقدمات کی ہے جو انتظامیہ کی جانب سے مجاہدین ختم نبوت اور دیگر علماء امت پر محض اس "جرم" میں دائر کئے گئے کہ انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی جماعت کے خلاف لب کشائی کی گستاخی کیوں کی؟ اس قسم کے مقدمات روزمرہ کا معمول تھے اور ان کے مصارف کا بہت سا بار گراں "مجلس تحفظ ختم نبوت" کو برداشت کرنا ہوتا تھا، تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۴ء تک کے دوران بہت سے ایسے حضرات بھی تھے جن کے نان و نفقہ کی جانب بھی مجلس تحفظ ختم نبوت کو توجہ کرنا پڑی۔

دوسری قسم ان فوجداری مقدمات کی تھی جو مسلم قادیانی تنازع کی صورت میں رونما ہوتے رہے- قادیانیوں کی ہمیشہ یہ عادت رہی ہے کہ جہاں انہیں اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کے مواقع میسر آئیں [illegible] جو وہاں وہ مسلمانوں کی اذیت اور دل آزاری کا کوئی [illegible] اور بعض اوقات کمزور مسلمانوں کو دہشت زدہ کرنے میں اپنی فرعونیت کا [illegible] سرائی بھی کیا کرتے ہیں کہ آج فلاں مجرم نے مسلمانوں پر مسلح حملہ کر دیا۔ "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے رہنماؤں کو جہاں کہیں ایسے فساد کی اطلاع ہوئی فوراً وہاں پہنچے اور اگر معلوم ہوا کہ قادیانیوں کی زیادتی ہے تو مسلمانوں کی طرف سے مقدمہ کی سرپرستی کی اور مسلمانوں کو ہر طرح قانونی، اخلاقی اور مالی مدد بہم پہنچائی۔

تیسری قسم ان دیوانی مقدمات کی تھی جو مسلم قادیانی قضیہ کے سلسلہ میں عدالت میں دائر ہوتے تھے اور جن میں بنیادی طور پر تصفیہ طلب یہ نکتہ ہوتا تھا کہ آیا قادیانی مسلمان ہیں یا خارج از اسلام؟ مثلاً کسی قادیانی نے دھوکہ دے کر کسی مسلمان خاتون سے شادی کر لی- یا شادی کے بعد معاذ اللہ اسلام سے مرتد ہو کر قادیانی بن گیا- اس صورت میں کبھی قادیانیوں کی جانب سے خانہ آبادی کا دعوے ہوتا اور کبھی مسلمانوں کی جانب سے اس نکاح کو کالعدم قرار دینے کا- اس نوعیت کے مقدمات کا سلسلہ وقتاً فوقتاً جاری رہتا تھا- مجلس ختم نبوت کو ملک کے کسی حصہ میں اس قسم کے مقدمہ کی اطلاع ہوئی تو مجلس نے نہایت فراخدلی سے ان مقدمات کی سرپرستی کی اور مجلس کے مبلغین نے قادیانیوں کی کتابوں سے ان کا کفر و ارتداد ثابت کر کے عدالت کو صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں مدد دی- چنانچہ اس نوعیت کے تمام مقدمات کی مختلف عدالتوں نے قادیانیوں کے کفر و ارتداد کا فیصلہ کرتے ہوئے مسلم قادیانی نکاح کو کالعدم قرار دیا، اسی طرح کبھی کسی مسجد کی تولیت کے معاملے میں قادیانیوں کے کفر و اسلام کا نکتہ عدالتوں میں زیر بحث آیا- اور کبھی کسی وراثت کے مقدمہ میں، ایسے مقدمات میں بھی "مجلس تحفظ ختم نبوت" نے مسلمانوں کی وکالت کے فرائض انجام

دینے اور ملت اسلامیہ کو قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا۔

مجلس تحفظ ختم نبوت اور مدارس عربیہ :

مجلس تحفظ ختم نبوت کا اصل موضوع تو قادیانی فتنہ کا استیصال تھا۔ لیکن اس تنظیم کے اکابر نے دینی تعلیم کی اہمیت کو واضح کرنے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ کیونکہ دینی مدارس ہی دین کے قلعے اور علم دین کے سرچشمے ہیں اور یہیں سے اسلام کے سپاہی تیار ہو کر کفر و ارتداد کو شکست دیتے ہیں۔ چنانچہ اکثر و بیشتر دینی مدارس کے جلسوں میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے خطیب اور مبلغ قوم سے خطاب کرتے اور مسلمانوں کو دینی مدارس کے قیام و استحکام کی ترغیب دیتے۔ بالخصوص امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مجاہد ملت مولانا محمد علی جالندھری اور خطیب پاکستان قاضی احسان احمد شجاع آبادی تو دینی مدارس کے نقیب تھے۔ شاہ جی فرمایا کرتے تھے کہ اپنے گاؤں میں دینی مدرسہ قائم کر لو۔ اور پھر مجھے کارڈ لکھ دو۔ میں اس کے جلسہ میں تقریر کرنے چلا آؤں گا۔ چنانچہ ان حضرات کی دعوت و ترغیب سے سینکڑوں مکاتب وجود میں آئے اور بعض جگہ خود مجلس تحفظ ختم نبوت کے زیر اہتمام بھی دینی مدارس جاری کئے گئے، خصوصاً ایسے علاقے جہاں قادیانیوں کا اثر تھا وہاں مجلس نے خود دینی مدارس جاری کئے چنانچہ ملتان، بہاول پور، سکھر، چناب، سیالکوٹ، پسرور، ضلع مظفر گڑھ، اکثریہ، ضلع مظفر گڑھ میں مجلس کے زیر اہتمام دینی مدارس چل رہے ہیں، جس کے جملہ مصارف مرکزی مجلس تحفظ ختم نبوت ادا کرتی ہے۔ قادیانیوں کے گڑھ ربوہ میں انشاء اللہ عنقریب دینی مدرسہ جاری کیا جا رہا ہے۔

شعبہ نشر و اشاعت

مجلس نے تبلیغ اسلام اور رد قادیانیت کے لئے نشر و اشاعت کے شعبہ پر بھی خصوصی توجہ دی ہے اور مجلس کے شعبہ نشر و اشاعت نے عربی، اردو، انگریزی، سندھی، پشتو اور بنگلہ میں بھی بہت سی کتابیں پمفلٹ اور اشتہارات لاکھوں کی تعداد میں شائع کئے ہیں۔ مجلس کے اشاعتی کارنامے سے تعارف کے لئے مندرجہ ذیل مختصر سی فہرست پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہوگا

- حیات مسیحؑ، فیصلہ کمشنر بہاول پور • نزول مسیحؑ
- التصریح فی ما تواتر فی نزول المسیحؑ
- القادیانی و القادیانیہ
- قادیانیت، مرزائیوں کے عقیدے و ارادے
- فیصلہ مقدمہ بہاولپور • فیصلہ مقدمہ راولپنڈی
- فیصلہ مقدمہ جیمس آباد • فیصلہ مقدمہ کھوسلہ
- فیصلہ مقدمہ رحیم یار خان
- ترک مرزائیت لسند فی نبی
- ابوظہبی میں مجلس تحفظ ختم نبوت کی عظیم کامیابی
- قادیانی مذہب و سیاست
- عالم اسلام کے مسلمان مرزا کی نظر میں
- محمد قادیانی۔ دعاوی مرزا۔
- موجودہ بحران کا ذمہ دار کون ؟
- غداروں کی نشاندہی • اربعین ختم نبوت
- شرائط نبوت، ربوہ ثانی یہود نہ بن سکا،
- خواجہ غلام فریدؒ اور مرزا قادیانی
- ملت اسلامیہ کا موقف
- موقف الامۃ من القادیانیہ (عربی)
- مرزائیت کا اصلی چہرہ
- حکومت کے پانچ سوالوں کا جواب

- مرزا کی عبرتناک موت
- حضرت مسیح مرزا قادیانی کی نظر میں
- قادیانیوں کی پاس اٹالوں سے دو خط
- قادیانیت علامہ اقبال کی نظر میں
- فتنۂ قادیانیت اور پیام اقبال
- ربوہ سے تل ابیب تک
- بیٹا جس نے باپ کا جنازہ نہ پڑھا
- قادیانیوں سے ستر سوالات
- محضرنامہ بخدمت خواجہ ناظم الدین
- 〃 〃 ایوب خاں
- 〃 〃 یحییٰ خاں
- 〃 〃 مسٹر ذوالفقار علی بھٹو
- 〃 〃 ارکان اسمبلی
- 〃 〃 ارکان صوبائی اسمبلی
- عرضداشت بنام وزیر قانون پاکستان
- مرزائیوں کی خوفناک چالیں
- قادیانی ملک اور ملت کے غدار ہیں
- نوادرات امیر شریعتؒ
- فتویٰ تکفیر قادیان
- انگلستان میں مجلس تحفظ ختم نبوت کی کامیابی
- دعاوی مرزا قادیانی
- قادیانیت نے عالم اسلام کو کیا دیا؟
- شہادت القرآن - انگریزی نبی
- ترک مرزائیت - سوچنے کی بات
- حیات عیسیٰ علیہ السلام

- قادیانی دین، کفر خالص • التنبیہ القادیانی
- اعداء المسلمین فی العالم
- مرزائی یہودی نوع میں
- اتحاد یا تیرہ ماہی
- احیائے کا گرگٹ، ایک مذہبی غدار
- آئینہ مرزائیت : جمعیت شرعیہ
- غیر ممالک میں قادیانیوں کی تبلیغ کی حقیقت
- قادیانیوں کی سیاسی چالیں
- مرزا جی کی ایک پیشین گوئی
- قادیانیہ مجاہد ملت
- فتنۂ قادیانیت، قادیانی لٹریچر
- تحریک کشمیر اور قادیانی
- مسئلہ ختم نبوت اور ہمارے اکابر
- مرزا جی کی آسان پہچان
- قادیانیت ایک خطرناک تحریک
- مرزائیوں کے خطرناک عزائم
- خدارا پاکستان کو بچائیے

اور ان کے علاوہ سینکڑوں مختلف اشتہارات جو مختلف اوقات میں لاکھوں کی تعداد میں شائع کئے گئے۔

مختصر یہ کہ مجلس تحفظ ختم نبوت دنیا کی مختلف زبانوں میں مسلمانوں کو فتنۂ قادیانیت سے آگاہ کرنے کے لئے لاکھوں روپے کا لٹریچر چھاپ کر تقسیم کر چکی ہے اور ان کے علاوہ مجلس تحفظ ختم نبوت کا ترجمان ہفت روزہ "لولاک" لائلپور قادیانیت کے مدوجزر سے قوم کو آگاہ رکھتا، اس کے مصارف کا بیشتر حصہ مجلس تحفظ ختم نبوت کا صدر دفتر ادا کرتا ہے۔

مجلس تحفظ ختم نبوت اور تنظیم ملت

اہل اسلام، قادیانی فتنے سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ لیکن قادیانیت کے خلاف بیشتر کام غیر منظم شکل میں ہوا۔ مجلس تحفظ ختم نبوت کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ قادیانیت کے خلاف امت مسلمہ کو رشتۂ تنظیم میں منسلک کیا جائے، اور پوری امت کو قادیانیوں کے خلاف "بنیان مرصوص" بنادیا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مجلس نے دو عظیم تر کارنامے انجام دیئے۔

اوّل یہ کہ ملک کے ہر شہر، ہر محلہ، ہر قصبہ اور ہر قریہ میں مسلمانوں کو دعوت دی گئی کہ وہ مجلس تحفظ ختم نبوت کی تنظیم میں شامل ہوکر ہر جگہ اس کی شاخیں قائم کریں اور قادیانیوں کی دست برد سے ناموس رسالت کو بچانے کے لئے رشتۂ وحدت میں منسلک ہوجائیں۔ بحمداللہ "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی یہ پرخلوص دعوت رائیگاں نہیں گئی۔ بلکہ مسلمانوں نے فراخ دلی سے اس پر لبیک کہی اور ملک میں مجلس کی ہزاروں شاخیں قائم ہوئیں۔

علاوہ ازیں جو حضرات اپنے مخصوص اعذار کی بنا پر مجلس تحفظ ختم نبوت کے باقاعدہ رکن نہیں بن سکتے تھے انہوں نے مجلس کی دعوت سے ہمدردی وخیرخواہی اور بڑی حد تک سرپرستی کا التزام فرمایا اور مسئلہ ختم نبوت کے بیان میں کسی خوف ملامت کی پروا نہیں، بالخصوص ائمہ مساجد اور خطیب حضرات نے اس سلسلہ میں بہت ہی اہم خدمت انجام دی حق تعالیٰ شانہ، ان سب کو جزائے خیر دے۔ آمین

آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی ہر مسجد، خواہ اس کا تعلق کسی بھی مکتب فکر سے ہو، قادیانیت کے خلاف ایک "اسلامک سنٹر" ہے۔ اس طرح مجلس تحفظ ختم نبوت کی تنظیم ہر مسلمان کو جس کے دل میں قادیانیت کے خلاف ذرا بھی نفرت ہے۔ تحفظ ختم نبوت کا سپاہی سمجھتی ہے اور اس کا

فرمائے کہ ہم اولیائی، من کانوا، وا ینما کانوا،

تمام امت مسلمہ ایک اسٹیج پر

مجلس تحفظ ختم نبوت نے دوسرا کارنامہ یہ انجام دیا کہ امت مسلمہ کے مختلف فرقوں کو ختم نبوت کے اسٹیج پر جمع کیا۔ انگریز نے اپنے دور اقتدار میں "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی حکمت عملی کے ماتحت، مختلف اسلامی فرقوں کے درمیان شدید تلخیوں کا زہر کچھ ایسا گھول دیا تھا کہ ان کا آپس میں کسی مسئلہ پر مل بیٹھنا قادیانیوں کے نزدیک ناممکن تھا۔ مرتدین اور زنادقہ نے اس افتراق وتصادم سے خوب فائدہ اٹھایا۔ قیام پاکستان کے بعد یہ صورت حال نہ صرف قائم رہی۔ بلکہ قادیانی سازشوں نے اس میں مزید اضافہ کردیا اور مسلمانوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پورے پاکستان پر یا کم از کم بلوچستان کے صوبے پر قبضہ وتسلط جمانے کے منصوبے کا اعلان کردیا اور قادیانیوں کے سرکاری آرگن "الفضل" نے مسلمانوں کو یہاں تک دھمکی دے ڈالی کہ:

"ہم فتحیاب ہوں گے۔ ضرور تم مجرموں کی طرح ہمارے
سامنے پیش ہوگے۔ اس وقت تمہارا بھی وہی حشر ہوگا
جو فتح مکہ کے دن ابوجہل اور اس کی پارٹی کا ہوا۔"

("الفضل ۳ جنوری ۱۹۵۲ء")

مجلس تحفظ ختم نبوت کے رہنماؤں نے، جو ہمیشہ قادیانیت کی نبض پر ہاتھ رکھنے کے خوگر تھے۔ بجا طور پر یہ محسوس کیا کہ اگر اس نازک موقع پر امت اسلامیہ کو قادیانیوں کے مکروہ عزائم اور ان کی لن ترانیوں سے آگاہ کرکے تمام فرقوں اور جماعتوں کو ایک متحدہ پلیٹ فارم پر جمع نہ کیا گیا۔ تو چند دن بعد زمین مسلمانوں کے پاؤں تلے سے نکل چکی ہوگی اور مسلمانوں کو انگریز کے بعد قادیانی مرتدین کی غلامی کا روز بد دیکھنا نصیب ہوگا۔ اس احساس نے رہنمایان مجلس تحفظ ختم نبوت کو بے چین اور مضطرب کرڈالا۔ اور وہ ماہی بے آب کا منظر پیش کرنے لگے۔ انہوں

نے ایک سازش تو ملک کا طوفانی دورہ کر کے جگہ جگہ جلسے منعقد کر کے قادیانی سازشوں کو بے نقاب کیا۔ ان کے عزائم سے متنبہ کیا اور پورے ملک کو قادیانیوں کے خلاف آتش بنا کر رکھ دیا۔

دوسری طرف انہوں نے اسلامی فرقوں کے ممتاز راہنماؤں کو وقت کی نزاکت کا احساس دلایا اور اتحاد ملت کا صور پھونکا۔ اس سلسلہ میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے عظیم رہنما مجاہد ملت مولانا محمد علی صاحب جالندھریؒ کا کارنامہ ناقابل فراموش ہے۔ موصوف نے اپنی ذہانت و خطابت کا سارا زور امت مسلمہ کے فرقوں کو متحد کرنے پر صرف کر دیا۔ انہوں نے ایک ایک دروازے پر دستک دی۔ اپنے دل کی بے چینی کا اظہار کیا۔ ناموس رسالت کا واسطہ دیا اور مسلمانوں کو اس آفت کبریٰ سے بچانے کا لائحہ عمل ان کے سامنے رکھا۔ بات دل سے نکلی تھی، دلوں تک پہنچی۔ تمام اسلامی فرقے "تحفظ ختم نبوت" کے اسٹیج پر متحد ہو گئے اور مسلمانوں کی متفقہ مجلس عمل تحفظ ختم نبوت وجود میں آئی۔

۵۳ء کی تحریک ختم نبوت

مجلس عمل کی قیادت میں، جس کے صدر حضرت مولانا سید ابوالحسنات قادری اور سیکرٹری جناب سید مظفر علی شمسی حضرت امیر شریعت کی تجویز اور مولانا جالندھری کی تائید سے مقرر کئے گئے تھے۔ ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت چلی۔ قادیانیوں کے بارے میں مسلمانوں کے متفقہ مطالبات ارباب اقتدار کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ لیکن اس وقت اقتدار قادیانیوں کے شکنجہ میں تھا۔ اس لئے ارباب اقتدار نے اسلامی مطالبات کا جواب گولی سے دیا، مجلس عمل کے معزز راہنما جیلوں کی زینت بنے۔ ہزاروں مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا اور لاکھوں پس دیوار زنداں بھیج دیئے گئے۔ جو مہینوں نہیں سالوں تک "جرم بے گناہی" کی سزائیں کاٹتے رہے۔

۵۳ء کی تحریک ختم نبوت بظاہر ناکامی سے ہمکنار اور تشدد کا شکار ہوئی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ تحریک اپنے مقاصد میں پورے طور پر کامیاب رہی۔ تفصیل کی گنجائش نہیں تاہم چند اہم امور کی جانب اشارہ ضروری ہے۔

اوّل ——— تحریک کا سب سے اہم مطالبہ یہ تھا کہ قادیانی وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان کو برطرف کیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تحریک کے سبب نہ صرف سر ظفر اللہ خان کی وزارت خارجہ کو بیا کر لے گیا بلکہ اس کے نام حافظ بھی "خدا کی بے آواز لاٹھی" کا نشانہ بن گئے۔ خواجہ ناظم الدین سے جنرل اعظم تک کا جو حشر ہوا وہ کس کو معلوم نہیں۔؟

دوم ——— تحریک ختم نبوت کا دوسرا اہم مطالبہ یہ تھا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت تسلیم کیا جائے۔ بلاشبہ یہ مطالبہ اقتدار کی عدالت میں سماعت نہ ہوا۔ لیکن تحریک کے بعد عوام کی عدالت نے قادیانیوں سے وہی سلوک کیا۔ جو ایک سازشی کافر ٹولے سے کیا جانا چاہیئے۔

سوم ——— تحریک کا اہم مقصد پاکستان کو قادیانی سازش سے محفوظ کرنا تھا۔ بحمد اللہ یہ مقصد بھی پوری طرح حاصل ہوا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک نے قادیانیوں کی تمام سازشوں کو ناکام بنا دیا۔ وہ سازشی خلیفہ جو پہلے ۱۹۵۲ء سے بلوچستان کو مرتد کرنے کا اعلان کر رہا تھا۔ ——— سب نے دیکھا کہ وہ تحریک کے بعد تحقیقاتی عدالت کے کٹہرے میں اپنے بیانات کا حساب چکا رہا ہے۔

چہارم ——— قادیانیوں کے نزدیک مسلمانوں کا اتحاد ناممکن تھا۔ لیکن ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت نے "ناممکن" کو ممکن بلکہ ایک امر واقعی بنا کر دکھایا اور قادیانیوں کو اپنی لغت سے "ناممکن" کا یہ لفظ حذف کر دینا پڑا بحمد اللہ جب سے اب تک مسلمان قادیانیوں کے خلاف متحد ہیں اور اس اسلامی اتحاد کا مظاہرہ ہر سال "ختم نبوت چنیوٹ کانفرنس" میں ہوتا ہے۔

پنجم ——— ۵۳ء کی تحریک نے مسلمانوں کو دائمی بیداری تنظیم اور مقصد کے لئے ایک مسلسل تب و تاب عطا کر دی ہے۔ آج کہ

، مفسر جو مرکز وہ مقصد عظیم حاصل ہوا اور قادیانیت کا کاشانہ اسلام کے جسم سے نکال پھینکا گیا۔"

۲۹ مئی ۷۴ء سے سات ستمبر تک

۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے بعد ایک سرکاری افسر نے مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے طنزاً کہا "شاہ جی! وہ آپ کی تحریک کا کیا ہوا؟" فرمایا "میں نے اس تحریک کے ذریعہ ایک "ٹائم بم" مسلمانوں کے دلوں کی زمین میں چھپا دیا ہے۔ جب وہ اپنے وقت پر پھٹے گا۔ تو قادیانیوں کو اقتدار کی کوئی طاقت تباہی و بربادی سے نہیں بچا سکے گی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ۲۹ مئی ۷۴ء کو یہ "ٹائم بم" خود قادیانیوں کے ہاتھوں ربوہ ریلوے اسٹیشن پر پھٹا۔ جس سے قادیانیت کو زلزلہ آیا۔ قادیانیوں کے قصر خلافت ربوہ پر مایوسیوں کے بادل منڈلاتے رہے اور سات ستمبر ۱۹۷۴ء کو جب مطلع صاف ہوا تو پوری دنیا نے دیکھا کہ قادیانیت کا مصنوعی سورج اسلامی افق سے غروب ہو چکا ہے اور آئین پاکستان میں قادیانیوں کا نام غیر مسلم اقلیتوں کی فہرست میں سکھوں، ہندوؤں اور اچھوتوں کے ساتھ درج ہے اور دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ نہ تو امریکہ سے برطانیہ تک اقتدار کی کوئی طاقت قادیانیوں کو اس انجام بد سے بچا سکی نہ یہودیوں کا سرمایہ ان کی ذلت و رسوائی کے داغ مٹا سکا۔ سچ ہے کہ "قصہ ہر چہ گو بہ دیدہ گو بہ"۔ ۵۳ء کی طرح ۷۴ء کی تحریک میں بھی مسلمانوں نے "مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے پلیٹ فارم پر جمع ہو کر مثالی اتحاد و تنظیم کا مظاہرہ کیا۔ اور ناموس رسالت کے تحفظ کے لئے قربانیاں پیش کیں۔" مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے صدر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری نے اپنے امراض و اشتغال اور ضعف و کبر سنی کے باوجود جوانمردی و اولوالعزمی سے مسلمانوں کی قیادت کی معزز ارکان اسمبلی نے قومی اسمبلی میں اہل اسلام کی ترجمانی کے فرائض انجام دیئے اور ملت اسلامیہ کے تمام اکابر و اصاغر نے اپنی ہمت و بساط سے بڑھ چڑھ کر ناموس رسالت پر جاں نثاری کا نمونہ پیش کیا۔ اس گئے گزرے زمانے میں یہ اتحاد، یہ تنظیم یہ اولوالعزمی اور یہ پرخلوص قربانیاں حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا زندہ معجزہ تھا۔ اس موقع پر مجلس تحفظ ختم نبوت نے دیگر خدمات کے علاوہ مجلس عمل کے مصارف کا بار برداشت کیا اور قومی اسمبلی پر قادیانیت کی حقیقت واضح کرنے کے لئے "ملت اسلامیہ کا موقف" نامی کتاب شائع کی۔ خلاصہ یہ کہ ۷۴ء کی تحریک کی کامیابی دراصل ۵۳ء کی تحریک کا ثمرہ تھی۔ جب سے اب تک "مجلس تحفظ ختم نبوت" نے مسلمانوں کو ختم نبوت کے پلیٹ فارم پر متحد رکھنے کے لئے نہایت جانفشانی اور خلوص سے کام کیا۔

ختم نبوت کا پیام (ایک عالمی پیام)

"مجلس تحفظ ختم نبوت" کے وسائل نہایت محدود تھے۔ اس کا ضعف و ناتوانی اندرون ملک بھی کام پر قابو پانے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن مجلس کے راہنماؤں کو اولوالعزمی اسباب و وسائل سے زیادہ مسبب الاسباب پر نظر رکھ کر چلنے کی خو گر تھی۔ وہ ختم نبوت کی دعوت دنیا کے ہر اس خطہ میں پھیلانا چاہتے تھے۔ جس میں کوئی انسانی آبادی موجود ہو۔ "مجلس تحفظ ختم نبوت" کے امیر مفکر مولانا محمد علی جالندھری کی تقریروں کا یہ فقرہ بہت سے لوگوں کے حافظہ میں محفوظ ہوگا کہ

"آج کل امریکہ چاند پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر کسی وقت چاند پر انسان آباد ہوا۔ اور اگر زمین سے کوئی انسانی قافلہ چاند پر منتقل ہوا تو جو سیارہ انسانی آبادی کے سب سے پہلے قافلہ کے ساتھ جائے گا اس میں ان شاء اللہ مجلس تحفظ ختم نبوت" کا نمائندہ بھی ہوگا۔"

اس لئے مجلس نے قلت وسائل کے باوجود فتنہ قادیانیت کے

تعاقب کو اندرون ملک تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ عالم اسلام کو بھی مسلسل اس فتنہ سے آگاہ رکھا۔ مثلاً

الف:- باہر سے آنے والے اسلامی ممالک کے وفود سے ملاقاتیں کی گئیں اور فتنہ قادیانیت کی طرف توجہ دلائی گئی۔ چنانچہ جشن قرآن کریم راولپنڈی اور سربراہی کانفرنس لاہور کے موقع پر مجلس تحفظ ختم نبوت نے عالم اسلام کے ان معزز مہمانوں سے رابطہ قائم کیا انہیں قادیانیوں کی سازشوں سے باخبر کیا گیا اور اس سلسلہ میں ضروری لٹریچر فراہم کیا گیا۔

ب:- مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر شیخ الاسلام مولانا محمد یوسف بنوری نے جن کا عالم اسلام کی ممتاز علمی شخصیتوں سے دیرینہ تعارف اور دوستانہ تعلقات تھے۔ عالم اسلام کے چیدہ افراد کو اس فتنہ کے استیصال کی طرف متوجہ کیا۔

ج:- جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ رابطہ عالم اسلامی (سعودی عرب) المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ (مصر) اور دیگر اسلامی اداروں کو توجہ دلائی اور ان سے قراردادیں منظور کرائیں۔

متعدد موقعوں پر عالم اسلام کے قائد شاہ فیصل شہید اور دیگر سربراہوں سے ملاقات کی اور انہیں اس فتنہ کی سرگرمیوں سے آگاہ کیا۔

ہر سال جماعت کے نمائندے حج پر تشریف لے جاتے ہیں۔ اور دنیا بھر کے حجاج کرام سے رابطہ قائم کر کے ان کو قادیانیوں کی تحریک ارتداد سے متنبہ کرتے ہیں۔

یورپ کے مسلمانوں کی دعوت پر مناظر اسلام مولانا لال حسین اختر مرحوم نے انگلینڈ، جرمنی، آسٹریلیا، امریکہ اور جزائر فجی آئرلینڈ کا دورہ کیا۔ جس سے لاکھوں مسلمان قادیانیوں کے ارتداد سے محفوظ ہو گئے۔ مولانا مرحوم کا قیام ان ممالک میں قریباً تین سال رہا قادیانیوں کے خلاف وہاں خوب کام ہوا۔ انگلینڈ میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے لئے ایک عمدہ بلڈنگ خرید کی گئی اور اسی میں مجلس کا مرکز قائم ہوا۔ ووکنگ مسجد جو قادیانیوں کا مشہور اڈا تھا ان سے واگذار کرا کر مسلمانوں کی تحویل میں دی گئی جزائر فجی میں تعلیم قرآن کا مدرسہ جاری ہوا۔ جو فیجی مسلم لیگ کے زیر اہتمام بحسن و خوبی چل رہا ہے۔

مجلس تحفظ ختم نبوت کے ممتاز رہنما مولانا سید منظور احمد شاہ

حجازی نے دو مرتبہ متحدہ عرب امارات کا دورہ کیا۔ وہاں کی عدالت عالیہ اور دیگر ممتاز شخصیتوں کو قادیانی لٹریچر سے ان کی کفریہ عبارتیں پڑھ کر سنائیں۔ اور ان کے عقائد و نظریات کی تفصیل پیش کی۔ جس کے نتیجہ میں وہاں کی عدالت عالیہ نے ان کو خارج از اسلام اور سازشی گروہ قرار دیا۔

مولانا سید منظور احمد شاہ حجازی نے بحرین کا دورہ کیا اور وہاں "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی شاخ قائم کی گئی۔ بحمد اللہ تمام عرب امارتوں میں قادیانی دجل و فریب کھل چکا ہے اور قادیانیوں کے خلاف مؤثر کارروائی شروع ہو چکی ہے۔

۷ ستمبر ۷۴ء کے فوراً بعد حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری نے انگلینڈ کا دورہ کیا اور وہاں قادیانیت کے خلاف کام کو مزید مؤثر و منظم کیا گیا۔

حال ہی میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہ نے مولانا عبدالرزاق اسکندر کی معیت میں مشرقی افریقہ کے متعدد ممالک کا دورہ کیا۔ ان تمام ممالک میں مجلس تحفظ ختم نبوت کی شاخیں قائم کی گئیں اور مسلمانوں کو قادیانیوں کے خلاف منظم کیا گیا۔

مجلس تحفظ ختم نبوت کے عظیم رہنما مولانا عبدالرحیم اشعر، مولانا اللہ وسایا کی معیت میں "المجلس الاعلیٰ" کے صدر جناب الشیخ

میں اجتماعی کی دعوت پر افریقہ تشریف لے گئے۔ وہاں مجلس تحفظ ختم نبوت "سنٹر کو قائم ہو چکا ہے۔ وہاں بھی انشاء اللہ عنقریب قادیانیوں کو غیرمسلم اقلیت قرار دے دیا جائے گا۔

نائیجیریا اور دیگر مغربی یا افریقی ممالک میں بھی مجلس تحفظ ختم نبوت کے نمائندے پہنچ چکے ہیں۔ اور الحمد للہ وہ قادیانیت کے خلاف خوب کام کر رہے ہیں۔

آثار و نتائج

اکابر دیوبند کی مساعی اور مجلس تحفظ ختم نبوت کے متعدد خدمات کا مختصر سا خاکہ آپ کے سامنے آ چکا ہے۔ اب ایک نظر ان آثار و نتائج پر بھی ڈال لینا چاہیئے۔ جو جماعت کی جہد مسلسل اور امت اسلامیہ کے اتفاق و تعاون کے نتیجہ میں رونما پذیر ہوئے۔

اول:۔ پاکستان کی قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا۔ علاوہ ازیں تقریباً تیس اسلامی ملک قادیانیوں کو کافر، مرتد، دائرہ اسلام سے خارج اور خلاف قانون قرار دے چکے ہیں۔

دوم:۔ ختم نبوت کی تحریک پاکستان میں کامیاب ہوئی۔ تو پوری دنیا پر قادیانیوں کا کفر و نفاق واضح ہو گیا۔ اور دنیا کے بعید ترین ممالک کے مسلمان بھی قادیانیوں کے بدترین کفر سے واقف ہو گئے۔

سوم:۔ بہاولپور سے ماریشس تک بہت سی عدالتوں نے قادیانیوں کی غیرمسلم حیثیت کی بنا پر فیصلے دیئے۔

چہارم:۔ "مجلس تحفظ ختم نبوت" کی تحریک نے نہ صرف پاکستان کو بلکہ دیگر اسلامی ممالک کو قادیانیوں کے غلبہ و تسلط سے محفوظ کر دیا اور تمام دنیا کے مسلمان قادیانیوں کو ایک سازشی اور توڑ پھوڑ کرنے والا سمجھ کر ان سے محتاط اور چوکنا رہنے لگے۔

پنجم:۔ بے شمار لوگ جو قادیانیوں کے دام ہمرنگ زمین کا شکار ہو کر مرتد ہو گئے تھے۔ جب ان پر قادیانیت کا کفر کھل گیا تو وہ قادیانیت کو چھوڑ کر دوبارہ دامن اسلام سے وابستہ ہو گئے۔

ششم:۔ ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کا ملازم پیشہ نوجوان طبقہ قادیانیوں سے بہت مرعوب تھا چونکہ قادیانی پاکستان میں اعلیٰ مناصب پر قابض تھے۔ اس لئے وہ ایک طرف اپنے ماتحت محکمے میں قادیانیت کی تبلیغ کرتے اور دوسری طرف اچھے مناصب کے لئے صرف قادیانیوں کا انتخاب کرتے۔ اس سے مسلمانوں کے نوجوان طبقہ کی صریح حق تلفی ہوتی تھی اور بہت سے نوجوان اچھی ملازمت کے لالچ میں قادیانی مذہب کے ہمنوا ہو جاتے تھے۔ اب بھی اگرچہ کلیدی اسامیوں پر بہت سے قادیانی فائز ہیں اور ملازمتوں میں ان کا حصہ مسلمانوں کی نسبت اب بھی زیادہ ہے۔ مگر اب قادیانیوں کے سامنے مسلمان نوجوانوں کا احساس کمتری ختم ہو رہا ہے اور نوجوانوں کی طرف سے مطالبے ہو رہے ہیں کہ قادیانیوں کو ان کی حصہ رسدی سے زیادہ کسی ادارے میں نشستیں نہ دی جائیں۔

ہفتم:۔ تمام پاکستان سے ۱۹۷۴ء تک "ربوہ" مسلمانوں کے لئے ایک ممنوعہ قصبہ تھا۔ وہاں مسلمانوں کے داخلہ کی اجازت نہیں تھی حتیٰ کہ ریلوے اور ڈاک خانہ کے سرکاری ملازموں کے لئے قادیانی ہونے کی شرط تھی۔ لیکن اب "ربوہ" کی سنگینی ٹوٹ چکی ہے۔ وہاں اکثر سرکاری ملازم مسلمان ہیں۔ ایک سال سے مسلمانوں کی نماز باجماعت بھی ہوتی ہے اور مجلس تحفظ ختم نبوت کا مبلغ نماز جمعہ پڑھا رہا ہے۔

ہشتم:۔ قادیانی اپنے مردوں کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے پر اصرار کیا کرتے تھے۔ لیکن اب مسلمانوں کے قبرستان میں ان کا دفن کیا جانا ممنوع ہے۔

نہم:۔ پاسپورٹ، شناختی کارڈ اور فوجی ملازمتوں کے فارموں میں قادیانیوں کو اپنے مذہب کی تصریح کرنا پڑتی ہے۔

دوم: پاکستان میں ختم نبوت کے خلاف کچھ لکھنا قابل تعزیر جرم قرار دیا جا چکا ہے۔

سوم: سعودی عرب، لیبیا اور بعض دیگر اسلامی ممالک میں قادیانیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ اور انہیں "اسلام کے جاسوس" قرار دیا جا چکا ہے۔

چہارم: مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کے خلاف لب کشائی کی پاکستان میں اجازت نہیں تھی۔ مگر اب صورت حال تبدیل ہو چکی ہے۔

پنجم: قادیانی جو بیرونی ممالک میں یہ پروپیگنڈہ کیا کرتے تھے کہ پاکستان میں قادیانیوں کی حکومت ہے اور دارالخلافہ "ربوہ" ہے وہ اس جھوٹ پر نہ صرف پوری دنیا میں ذلیل ہو چکے ہیں، بلکہ خدا کی زمین اپنی فراخی کے باوجود ان پر تنگ ہو رہی ہے۔

مجلس تحفظ ختم نبوت اور بیت المال

مجلس تحفظ ختم نبوت کے وسیع ترین تبلیغی نظام کا ایک مختصر خاکہ آپ کے سامنے آ چکا ہے۔ البتہ اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ جماعت کے لاکھوں روپے کے مصارف کا انتظام کیسے ہوتا ہے۔ جماعت کے بیت المال کے لئے کوئی مستقل ذریعہ حاصل نہیں۔ اس نے محض حق تعالیٰ شانہ، کے خزانہ عامرہ پر توکل کرتے ہوئے ایک روپیہ یومیہ کے میزانیہ سے اپنا کام شروع کیا اور جوں جوں جماعت کا ٹھوس کام سامنے آتا گیا حق تعالیٰ شانہ، نے عام مسلمانوں کی خدمت و تعاون کی طرف متوجہ فرمایا اور وہ تمام حضرات جن کو مسئلہ ختم نبوت اور تحفظ ناموس رسالت سے دلچسپی تھی انہوں نے اپنے صدقات جماعت کے بیت المال میں جمع کرانے شروع کر دیئے۔ گویا جماعت کا کل سرمایہ توکل علی اللہ اور مسلمانوں کا دست تعاون ہے۔

جماعت نے بیت المال کے نظام میں جن امور کا لحاظ رکھا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے۔

مجلس تحفظ ختم نبوت میں جس قدر کارکن کام کرتے ہیں ان کے قوت لایموت کا انتظام جماعت کر دیتی ہے اور ان پر پابندی عائد ہے کہ کسی مسلمان کی جانب سے ایک پیسہ بھی انہیں دیا جائے وہ جماعت کے بیت المال کی رسید دیں اور وہ پیسہ بیت المال میں جمع کرائیں۔ جماعت کے مبلغین اور کارکنوں نے اس سلسلہ میں جس بے مثال قربانی اور نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ اس کی نظیر موجودہ دور میں مشکل سے ملے گی۔

اہل اسلام کی جانب سے زکوٰۃ، صدقات، صدقہ فطر، چرم قربانی اور دیگر عطیات کی شکل میں جو امداد جس مد میں دی جاتی ہے بیت المال کی جانب سے اس کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ وہ احتیاط کے ساتھ اس مد میں خرچ کی جائے۔

چنانچہ اسی بیت المال سے مبلغین کے مشاہرات، رفقاء کے اخراجات، مدارس اور طلبہ کی ضروریات، اندرون و بیرون ملک کا تبلیغی نظام، دنیا کی مختلف زبانوں میں تحریر کردہ اور شائع کردہ لٹریچر کی اشاعت اور بیرون ملک جانے والے وفود کے اخراجات پورے کئے جاتے ہیں۔ گویا جس نے جماعت کو ایک روپیہ بھی دیا وہ ان تمام شعبوں میں حصہ دار ہے۔

جماعت کی جانب سے ہر سال ایک روئداد شائع ہوتی ہے جس میں گذشتہ سال کی کارکردگی اور آئندہ لائحہ عمل کے ساتھ ساتھ تمام عطیہ دہندگان کے نام اور ان کی رقوم کی تصریح کی جاتی ہے نیز مصارف کی تفصیل بھی پیش کی جاتی ہے۔ تاکہ ہر مسلمان یہ اطمینان کر سکے کہ آیا اس کی بھیجی ہوئی رقم بیت المال میں جمع ہوئی یا نہیں؟

آمد و صرف کے حسابات باقاعدہ رجسٹرڈ کئے جاتے ہیں اور ہر سال سرکاری آڈیٹر سے حسابات کی پڑتال کرائی جاتی ہے۔

ہر مسلمان کو اس امر کی اجازت ہے کہ جب چاہے جماعت کے حسابات کا معائنہ کر سکتا ہے۔

گزشتہ سال حکومت نے مجلس تحفظ ختم نبوت کو ایک تبلیغی و خیراتی اسلامی ادارہ تسلیم کرتے ہوئے اس کے بیت المال میں داخل کئے جانے والے عطیات کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

لاکھوں روپیہ کا میزانیہ ہونے کے باوجود جماعت کے کارکنوں کا اپنا تقرر و نفوس پر تا ہے۔ ہم اپنے احباب کی اس دولت فقر کی نمائش کر گئے ہیں۔

آئندہ عزائم اور جماعت کا لائحہ عمل

بہت سے لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا لہٰذا ختم نبوت کا مشن اب ختم ہو چکا لیکن یہ غلط فہمی ہے۔ جماعت ختم نبوت کا مشن ختم نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے دائرہ کار اور اس کی ذمہ داریوں میں کئی سو گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ اب تک جماعت کی بیشتر توجہ اندرون ملک قادیانیوں کے رد و تعاقب کی طرف تھی۔ مگر ستمبر ۱۹۷۴ء کے بعد پوری دنیا جماعت ختم نبوت کی دعوت و تبلیغ کا میدان بن چکا ہے۔ جہاں جہاں قادیانی پہنچے ہیں۔ وہاں وہاں سے جماعت کے امیر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہ کو تقاضوں پر تقاضے آ رہے ہیں۔ کہ یہاں ختم نبوت کے کام کی ضرورت ہے۔ اس لئے پہلے سے پہلے اگر جماعت کو دسیوں کارکنوں کی ضرورت تھی تو اب سیکڑوں کی نہیں ہزاروں کی ضرورت ہے۔ پہلے اگر اس کا کام ہزاروں میں چل سکتا تھا۔ تو اب لاکھوں نہیں کروڑوں کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ بہر حال پہلے بھی خدا کے بھروسہ پہ جماعت چل رہی تھی اور آئندہ بھی اس کا یہی سہارا ہے تاہم مسلمانوں کے سامنے جماعت کے نئے مسائل اور نئے تقاضوں کا پیش کرنا بھی ضروری ہے۔

۱۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ ختم نبوت کی تحریک پوری دنیا میں پھیل چکی ہے اور کم و بیش ہر جگہ قادیانیوں سے وہی معرکہ گرم ہے جو یہاں پاکستان میں ہوا۔ اس لئے فوری ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری دنیا کے ممالک میں اور بالخصوص ان ممالک میں جہاں قادیانیوں کا زیادہ تسلط ہے ختم نبوت کے مضبوط مرکز قائم کئے جائیں اور چونکہ باہر کی دنیا قادیانیوں کے کفر سے واقف نہیں اس لئے ضرورت ہے کہ یہاں سے کثیر تعداد میں مبلغ بھیجے جائیں اور ان کے ساتھ ضروری لٹریچر بھی دیا جائے۔

۲۔ اسی طرح یہ امر بھی فوری طور پر توجہ طلب ہے کہ اردو، عربی، انگریزی، فارسی، فرانسیسی اور افریقی و ایشائی ممالک کی معروف زبانوں میں خصوصاً ان ممالک کی زبانوں میں جہاں قادیانی ہیں۔ رد قادیانیت پر لٹریچر تیار کر کے شائع کیا جائے۔ یہ لاکھوں روپیہ کا منصوبہ ہے۔ مگر جماعت کو توکلاً علی اللہ یہ امید ہے کہ وہ ۷۶ء میں تقریباً ستر ہزار روپے کا اشاعتی لٹریچر تیار کر کے بیرونی ممالک میں بھیج سکے گی۔

۳۔ ایک اہم ترین ضروری بات یہ ہے کہ بیرونی ممالک سے ذہین فطین نوجوانوں کو پاکستان لایا جائے اور انہیں قادیانیت کی تعلیم دے کر ان کے ممالک میں تبلیغ ختم نبوت کا کام ان کے سپرد کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ملتان میں ایک عالمی مرکز تبلیغ زیر تعمیر ہے۔ جس میں انشاء اللہ ان تمام ضروریات کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

۴۔ پاکستان میں قادیانیوں کی سازشی سرگرمیاں ختم نہیں ہوئیں بلکہ زیادہ گہری ہو گئی ہیں۔ اس لئے جماعت کی مجلس شوریٰ نے فیصلہ کیا ہے کہ لاہور، اسلام آباد اور بالخصوص ربوہ میں ختم نبوت کے مراکز تعمیر کئے جائیں۔ جن میں جامع مسجد، ختم نبوت لائبریری، اور ختم نبوت درس گاہ کا انتظام کیا جائے۔ یہ انتظام اس لئے ضروری ہے کہ قادیانیوں کی سرگرمیوں پر قریبی رابطہ کے ذریعہ کڑی نظر رکھی جا سکے۔

۵۔ ختم نبوت کے کارکنوں کے درمیان عالمی سطح پر مواصلاتی رابطہ و تعلقات کو مستحکم کرنے کی بھی فوری ضرورت ہے۔ تاکہ کسی ملک اور کسی خطے میں قادیانیوں کی ارتدادی و سازشی سرگرمیوں کا سراغ ملے تو اس کا یکایک تعاقب کیا جا سکے۔

ملتِ اسلامیہ کی فتح

اسلام آباد، ۷ ستمبر (اے پ پ) قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا جو فیصلہ صادر کیا ہے اس کی روشنی میں آئین پاکستان کی متعلقہ دفعات کی ترمیم کے بعد یہ صورت ہو گی ——— آرٹیکل نمبر ۲۶۰۔ جو شخص خاتم الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلعم کی ختم نبوت پر مکمل ایمان نہیں لاتا یا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی انداز میں نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا کسی ایسے مدعی نبوت یا مذہبی مصلح پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ از روئے آئین و قانون مسلمان نہیں ہے۔ آرٹیکل نمبر ۱۰۶ کلاز نمبر ۳۔ اس میں لفظوں "کے بعد کے قادیانی یا لاہوری گروپ کے جو اشخاص "احمدی" کہلاتے ہیں" کے جملے کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اضافے کے بعد کلاز نمبر ۳ کی یہ صورت ہو گی صوبائی اسمبلیوں میں بلوچستان، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ کی کلاز نمبر ۲ میں دی گئی نشستوں کے علاوہ ان اسمبلیوں میں عیسائی، ہندو، سکھ، بدھ اور پارسی اعتقاد رکھنے والوں یا شیڈول کاسٹ کے لیے اضافی نشستیں ہوں گی۔ آئین پاکستان میں دوسری ترمیم کے بل کا متن یہ ہے: چونکہ یہ مصلحت ہے کہ بعد ازیں درج اغراض کے لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں مزید ترمیم کی جائے لہٰذا بذریعہ ہذا حسب ذیل قانون وضع کیا جاتا ہے۔ مختصر عنوان اور آغاز نفاذ ۱۔ یہ آئین (ترمیم دوم) ایکٹ ۱۹۷۴ء کہلائے گا۔ ۲۔ یہ فی الفور نافذ العمل ہو گا۔ آئین کی دفعہ ۱۰۶ میں ترمیم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں جسے بعد ازیں آئین کہا جائے گا۔ دفعہ ۱۰۶ کی شق ۳ میں لفظ اشخاص کے بعد الفاظ اور قوسین "اور قادیانی یا لاہوری جماعت کے اشخاص (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں)" درج کیے جائیں گے۔ آئین کی دفعہ ۲۶۰ میں ترمیم آئین کی دفعہ ۲۶۰ میں شق نمبر ۲ کے حسب ذیل نئی شقیں درج کی جائیں گی۔ نمبر ۳۔ جو شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو آخری نبی ہیں کے خاتم النبیین ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا جو حضرت محمد کے بعد کسی بھی مفہوم یا کسی بھی قسم کا نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تصور کرتا ہے وہ آئین یا قانون کی اغراض کے لیے مسلمان نہیں ہے۔ بیان اغراض جیسا کہ تمام ایوان کی خصوصی کمیٹی کی سفارشوں کے مطابق قومی اسمبلی میں طے پایا ہے کہ اس بل کا مقصد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں اس طرح ترمیم کرنا ہے تاکہ ہر وہ شخص جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا حضرت محمد صلعم کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تسلیم کرتا ہے اسے غیر مسلم قرار دیا جائے۔

(عبد الحفیظ پیرزادہ وزیر انچارج)

ادارہ مرکزیہ ۔ دعوت و ارشاد ۔ چنیوٹ پاکستان

زیرِ سرپرستی: شیخ الاسلام حضرۃ مولانا محمد یوسف بنوری دامت برکاتہم

مندرجہ ذیل شعبوں کی تکمیل و ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

شعبۂ دارالمبلغین: جس کے تحت علماء کرام کو قادیانیت اور دیگر فرقِ باطلہ کے بارے میں تربیت دی جائے گی اور بیرونی ممالک میں تبلیغ کے لیے بھی علماء کو تیار کیا جائے گا۔

شعبۂ نشر و اشاعت: جس کے تحت قادیانیت اور دیگر فرقِ باطلہ کے عقائد و نظریات اور گمراہ کن پراپیگنڈہ کا محاسبہ کیا جائے گا۔ اس شعبہ کی تعمیر تکمیلی مراحل میں ہے اور اس کے تحت "مطبع ارشاد" کے نام سے جدید ترین پریس کا منصوبہ طے ہو چکا ہے۔

شعبۂ تصنیف و تالیف: جس کے تحت اردو، عربی، انگلش اور دیگر زبانوں میں لٹریچر مہیا کیا جائے گا اور وسیع تر بنیادوں پر بہت بڑی لائبریری قائم کی جائے گی۔

ربوہ کے پڑوس میں تحفظ عقیدہ ختمِ نبوۃ کا یہ عظیم ادارہ

تکمیل و ترقی کی راہ میں قدم قدم پر آپ کے تعاون و سرپرستی کا محتاج ہے۔

منجانب

خادمِ نبوّت منظور احمد چنیوٹی ناظم ادارہ مرکزیہ دعوت و ارشاد چنیوٹ پاکستان

قطب العالم مرشد العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ چشتی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۱۰ھ)

اور

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۲۳ھ)

حضرۃ سید نفیس الحسینی

شیخ العرب والعجم اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ (م ۱۳۱۰ھ) نے قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کو بیعت ہونے کے آٹھویں روز بعد بشارت غیبی کی بنا پر فرمایا: "میاں مولوی رشید احمد جو نعمت حق تعالیٰ نے مجھے دی ہے، وہ آپ کو دے دی، آئندہ اس کو بڑھانا آپ کا کام ہے۔"

حضرت قطب الارشاد گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ میں اس وقت بہت ہی متعجب ہوا کہ حضرت کیا فرماتے ہیں۔ وہ کون سی چیز ہے، جو اعلیٰ حضرت کو حق تعالیٰ نے دی تھی اور مجھے عطا ہوئی۔ آخر پندرہ برس کے بعد معلوم ہوا کہ کیا تھا۔" (امداد المشتاق ص ۲۱)

جنگ شاملی کے بعد انگریزی حکومت نے شیخ العرب والعجم اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے اور گرفتار کنندہ کے لیے صلے کا اعلان بھی کر دیا۔ اعلیٰحضرت نے ایک روحانی اشارے کی بنا پر وطن کو خیرباد کہی اور بہ نیت ہجرت حرمین شریفین گھر سے باہر نکلے۔ چونکہ حضرت اقدس گنگوہی سے زیادہ تعلق خاطر تھا اس لیے الوداعی ملاقات کے لیے گنگوہ تشریف لے گئے۔ (امداد المشتاق ص ۲۳)

سب سے زیادہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کو اپنے روحانی باپ اعلیٰحضرت حاجی صاحب کی مفارقت اور ہندوستان میں مقیم رہ جانے کا غم تھا جو آپ کو کبھی کروٹ چین نہ لینے دیتا تھا۔ راتوں آپ کو اس رنج میں نیند نہ آتی اور دنوں آپ اس دھن میں رہتے کہ کسی طرح اعلیٰ حضرت کی ایک دفعہ زیارت کر لوں، مگر جائیں تو جائیں کہاں اور ملیں تو کس طرح ملیں؟ نہ اعلیٰحضرت کی کوئی جائے قیام معلوم نہ بحالت روپوشی کسی جگہ کا تعین۔ آخر شدہ شدہ آپ کو پنجلاسہ (پنجاب) کا پتہ چلا اور آپ بسم اللہ کہہ کر گنگوہ سے پیدل کھڑے ہوئے۔ راتوں چلتے دنوں چھپتے، خاردار جنگل پیدل قطع کرتے پنجلاسہ پہنچے۔ اعلیٰحضرت کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضرت گنگوہی نے ہر چند اصرار کیا کہ بندہ کو ہمرکاب لے چلیں مگر اعلیٰحضرت نے منع فرمایا کہ اس طرح خدا کا حکم ہے۔ جاؤ تمہیں خدا کے سپرد کیا۔ آپ کو وہاں سے

رخصت فرمایا حضرت سے بادل ناخواستہ الفراق الفراق کہتے ہوئے رخصت
اور ابھی چند ہی قدم چلے تھے کہ حضرت نے تسلی و تشفی دی اور فرمایا: "میاں
رشید احمد سے فکر نہ کرو کہ ابھی بہت سے کام لینے ہیں، گھبراؤ مت۔
ہندوستان پہنچ کر وقت تم سے وصال کرادیں گے۔ خدا تمہاری عمر دراز
کرے۔ اور آپ بھی تسلی دے، اس کے بعد دیر تک چھاتی سے لگائے
رکھا اور آخر کار جدائی شفقت اور بے تابانہ محبت کے انداز پر خود بھی چشم نم
ہوئے اور مولانا کو بھی رلایا۔" (تذکرۃ الرشید ص ۹۰ ج ۱)

جرم بغاوت کی پاداش میں گرفتاری سے ملنے والی تین سال
رہ چکے تھے۔ اپنے شیخ و مرشد اعلیٰ حضرت مخدوم الکل حاجی امداد اللہ
شاہ صاحب سے جو تھا سال تھا۔ آپ کی محبت شیخ جو قسمت نے آپ کے
دل میں ودیعت رکھ دی تھی دن بدن بڑھتی جاتی تھی۔ گو آپ تعلیم و تعلم کے
دینی مشغلے سے اپنے دل کو بہلاتے اور پاک خدا کی یاد میں رات دن گزارتے
تھے مگر مرشد العرب والعجم کی زیارت و پابوسی کا شوق اور حاضری حرم محترم کا
علاوہ اشتیاق آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیتا تھا۔ یہ زمانہ آپ پر عسرت کا
تھا حق تعالیٰ کی طرف سے آپ فقر کے امتحان میں مبتلا کیے گئے تھے:

(تذکرۃ الرشید ص ۲۰۰ ج ۱)

۱۲۸۰ھ کو ایک چیدہ و برگزیدہ قافلے کے ساتھ بعد اشتیاق
سفر حرمین شریفین اختیار فرمایا۔ جنۃ الحرام میں حج و عمرہ کے علاوہ اپنے
شیخ برحق مرشد العرب والعجم اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کے فیض صحبت کی
جو نعمتیں آپ نے حاصل فرمائیں ان کا کسی کو علم ہی کیا ہے جو بیان کی
جائیں۔ مختصر یہ ہے کہ جب تک آپ مکہ معظمہ میں مقیم رہے، فرط محبت
کے باعث آپ کو اعلیٰ حضرت نے اپنے ہی پاس رکھا، حج کے لیے عرفات
جاتے وقت آپ کا اونٹ اعلیٰ حضرت نے اپنے اونٹ سے متصل کیا اور
منیٰ و مزدلفہ میں آپ کو اپنے ساتھ ہی ٹھہرائے رکھا۔ آپ نے مکہ معظمہ
میں خواب دیکھا کہ ابدال جیسے اہل خدمت اولیاء کا ایک گروہ جا رہا ہے اور
آپ ان کو دیکھ رہے ہیں۔ آپ فرماتے تھے کہ میں نے خواب ہی میں دعا
مانگی کہ یا اللہ مجھے بھی ان سے لاحق کر دے۔ یہ دعا مانگ کر میں ان کے
پیچھے دوڑا اور ان کی جماعت میں جا ملا۔ صبح کو یہ خواب اعلیٰ حضرت سے
ذکر کیا تو مسکرا کر فرمانے لگے: "پھر اب کیا چاہتے ہو، لاحق ہو گئے۔" جلد اکرام
ہی میں آپ نے یہ خواب دیکھا کہ آپ کے ہاتھ کی چاروں انگلیوں سے
خون جاری ہے۔ دو سے بکثرت اور تیسری سے کم اور چوتھی سے اور کچھ
کم۔ آپ فرماتے تھے کہ میں نے یہ خواب حضرت مولانا مظفر حسین صاحب
کاندھلوی سے بیان کی تو یہ تعبیر دی کہ تمہاری چاروں نسبتیں جاری ہوں گی
دو کا جریان بہت زیادہ ہوگا۔ (تذکرۃ الرشید ص ۲۰۹ ج ۱)

پہلے سفر حج میں آپ کا قیام حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں دو
سال رہا۔ دوسرا سفر حجاز ۱۲۹۴ھ میں کیا۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم
نانوتوی بھی شریک سفر تھے۔ یہ منتخب روزگار قافلہ شب کے وقت مکہ
معظمہ پہنچا۔ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کو اپنے لاڈلے اور چہیتے پیارے
ہندی قافلے کے جدہ سے روانہ ہونے کی اطلاع مل چکی تھی، باوجود ضعف و
نقاہت کے شفقت استقبال اور جوش محبت میں شہر سے باہر ملنے کی
خواہش پوری کیے بغیر نہ رہ سکے۔ خدا جانے کس وقت کے منتظر کھڑے
اور رات کی جانب آنے والے قافلے کا انتظار فرما رہے تھے۔ جس وقت
قافلہ باب مکہ پر پہنچا تو سب نے دیکھا کہ اعلیٰ حضرت ٹیکے سے کمر باندھے
ہوئے فصیل کے پاس کھڑے ہیں۔ شیخ کے شیدا اور مرشد کے جانثار
خدام اسی وقت سواری سے نیچے اتر پڑے اور بغلگیر ہو کر خوب دل کھول
کر ملے۔ شب اعلیٰ حضرت کے مکان پر قیام ہوا۔ صبح کو سارے مجمع کی
دعوت بھی انہی کے دستر خوان پر ہوئی۔ ہر چند حضرت گنگوہی نے عرض کیا کہ
آدمی بہت ہیں مگر اعلیٰ حضرت نے یہ فرما کر کہ "میری خوشی اسی میں ہے کہ

سب احباب میرے یہاں کھاویں" مجبور فرما دیا۔ (تذکرۃ الرشید ص ۲۲۵/۱)

اس سفر مقدس سے واپسی ۱۲۹۵ھ میں ہوئی۔ ۱۲۹۹ھ میں شورش شوق و محبت نے پھر سفر پر مجبور کیا اور تیسری مرتبہ مرشد العرب والعجم شیخ الکل اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی زیارت و شرف ملازمت سے مشرف و کامیاب ہوئے۔ (تذکرۃ الرشید ص ۲۴۴/۱)

یہ حضرت قطب الارشاد گنگوہیؒ کا آخری سفر مبارک تھا۔ اس کے بعد خط و کتابت ہی سے اعلیٰ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے سلسلۂ دوام محبت و عقیدت قائم رہا۔

مکاتیب رشیدیہ کے ابتدائی صفحات میں حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے بارہ گرامی نامے حضرت گنگوہیؒ کے نام ہیں۔ تلخیص پیش خدمت ہے۔ القابات اور دعائیں ملاحظہ ہوں۔

مکتوب ۱ | بخدمت فیضدرجت سراپا خیر و برکت عزیزم مولوی رشید احمد صاحب ہمت فیوضہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

الحمدللہ فقیر بفضلہ تعالیٰ مع الخیر ہوں اور آپ کی صلاح فلاح دارین کی دعا کرتا ہوں۔ .... اللہ تعالیٰ فقیر کا اور آپ کا خاتمہ بالخیر فرما کر اپنے صدیقین و مقربین کے زمرے میں داخل فرماوے ..... ایک ضروری اطلاع یہ ہے کہ فقیر آپ کی محبت کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اور الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی محبت کو میرے دل میں ایسا مستحکم کر دیا ہے کہ کوئی شے اس کو ہلا نہیں سکتی ہے اور میں اپنے سب احباب کی محبت کو اپنے لیے وسیلۂ نجات جانتا ہوں لہٰذا یقین جانو کہ مجھ کو دنیا میں کسی سے ملال و کدورت نہیں ہے تو پھر اپنے عزیزوں سے جو اس گنہگار کے حقیقی کے حامی ہیں کیونکر کدورت رکھوں گا۔ اول تو کسی کو مقدور نہیں کہ فقیر کے سامنے آپ کے خلاف زبان ہلاوے۔ کیونکہ اس بارہ میں اس کو سرد نسبت سے ملال و رنج کے کیا فائدہ ہوگا۔ دوسرے جو کوئی فقیر کو دوست رکھتا ہے وہ ضرور آپ سے محبت رکھتا ہے تو اس کے خلاف کبھی کوئی تحریر آپ کے پاس جاوے تو اس کو باور نہ کرنا۔ عزیزم دل کامل ایمانی صداقت محبت سے کامل کینہ و کدورت۔ آپ کی دعا میرے حق میں مقبول ہے دعا فرماویں کہ اللہ تعالیٰ اب اس اخیر زمانہ میں میرے دل کو نور محبت و معرفت سے نور علیٰ نور فرماوے۔

(مکاتیب رشیدیہ طبع جدید طبع اول مکتبہ فاروقیہ الٰہی سرفی ص ۱)

مکتوب ۲ | از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت فیضدرجت جامع علوم شریعت و طریقت عزیزم مولانا رشید احمد صاحب سلمہ گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ عنایت نامہ مورخہ پانزدہم بعد بذریعہ رجسٹری ڈاک ورود مسرت ورود لایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مکروہات دارین سے محفوظ رکھ کر قرب مراتب و درجات عالیات عطا فرماوے اور آپ کی ذات بابرکات کو ذریعہ ہدایت خلق فرماوے۔ آمین۔ اگرچہ بظاہر آپ کی علالت سے بہت بڑا نقصان معلوم ہوا اور خصوصاً حدیث شریف کے درس موقوف ہو جانے کا بہت افسوس ہے مگر باطنی و حقیقت میں اس کے نتائج و برکات بہت بڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دارین میں اس کا نعم البدل عطا کرے .... الحمدللہ آپ کی کیفیات باطنی و حالات متعددہ سن کر کروڑ کروڑ شکر اللہ تعالیٰ کا بجا لایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات اور قرب کو ترقی بالائے ترقی بخشے اور ہم سب بہروں کی نجات کا وسیلہ بناوے .... آپ تکلیف فرما کر اپنی خیر و عافیت سے مسرور فرماتے رہیں کہ خاطر کو تعلق رہتا ہے .... والسلام۔ از مکہ معظمہ محلہ الباب ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۰۹ھ بعد لکھنے اس خط کے مسرت نامہ مورخہ دوم شوال ملا۔ بالکل کیفیت معلوم ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے فیض ظاہر و باطن سے ہمیشہ خلق کو مستفیض فرماوے۔ آمین۔ عزیزم امیر شاہ خان صاحب آپ کے نہایت معتقد اور نہایت ارادت و محبت رکھتے ہیں۔ کچھ دن ایسی

ہوگئی کہ جو خط آپ کی نیابت سے مستفیض نہ ہو سکے آپ تیقن کی وجہ سے ایسے ہی محبت رکھتے ہیں۔ اس پر کچھ شبہ نہیں کہ فرزند کی وفات کی وجہ سے فقیر کے نقصان بے حد اثر ہوئے۔ تمہاری محبت نے اکیلا کام کیا ہے انشاءاللہ تعالیٰ قیامت میں بھی ایسی ہی شادی کی امید ہے تمہاری محبت کا نہایت اہم سبب ہے۔ زیادہ والسلام

صفحہ ۳۰،۳۰۲ (مرقومہ بست و ششم ذی الحجہ ۱۳۰۹ھ)

مکتوب ۳ | از فقیر امداد اللہ عفی عنہ۔ بخدمت فیض درجت سراپا خیر و برکت سراسر محبت عزیزم جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہٗ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ آپ کے دو قطعہ خط بدست عزیزم امیر شاہ خاں صاحب وصول ہوئے۔ کیفیت مندرجہ معلوم ہونے سے بجائے خوشی قلب پر صدمہ شدید پہنچا۔ اعنی عزیزم برخوردار محمد محمود سلمہ کے انتقال پر ملال کا حال دیکھ کر بہت ہی رنج ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہر چند صبر کام میں لایا تاہم آنکھوں سے اشک جاری ہوئے۔ آخر بجز صبر چارہ نہ دیکھا۔ لاچار صبر کیا۔ فقیر خوب جانتا ہے کہ ایسے ہونہار نونہال کے انتقال کا صدمہ جو آپ کو ہوگا وہ بیان سے باہر ہے۔ کیوں نہ ہو برخوردار موصوف بصفات حمیدہ ایسا ہی تھا جس نے سنا وہی غمگین اور ملال ہوا۔ کیونکہ یہ دار فانی ہے یہاں ہر بعد چل چلاؤ ہے۔ کوئی آج کوئی کل چلا جا رہا ہے۔ آپ اس بات کا خیال کر کے صبر فرماویں۔ سب کو وہاں جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا نعم البدل عنایت فرما کر اس رنج کو خوشی سے مبدل فرمائے۔ اللہ تعالیٰ برخوردار عزیز مسعود احمد صاحب کو بھی توفیق خیر عنایت فرمائے کہ آپ کی یادگار و جانشین رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا تمہارا خاتمہ بالخیر کرے۔ فقط از مکہ معظمہ (۲۲ رجب ۱۳۱۰ھ) (مہر)

مکتوب ۴ | از فقیر امداد اللہ عفا اللہ عنہ بخدمت فیض درجت سراپا خیر و برکت سراسر خلوص و محبت عزیزم مولانا مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہٗ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ الحمدللہ فقیر خیریت سے ہے آپ کے واسطے دعائے خیر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے عشق و محبت و رضا میں رکھ کر آپ کا فیض جاری کر کے حسن خاتمہ نصیب فرما دے۔ . . . صفحہ ۵ (از مکہ مکرمہ ۲۳ رمضان ۱۳۱۰ھ) (مہر)

مکتوب ۵ | از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت فیض درجت سراپا خیر و برکت عارف باللہ عزیزم جناب مولانا مولوی رشید احمد زید عرفانہٗ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ الحمدللہ فقیر خیریت سے ہے اور آپ کی صحت و سلامتی خدا تعالیٰ کی جناب سے مطلوب . . . .

عزیزم مولوی قاری حافظ احمد صاحب کبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہونگے آپ اپنی جماعت سے خیال کر کے دعا فرماویں۔ یہ قاری صاحب آپ سے طالب دعا ہیں۔ آپ دعا فرماویں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا آپ کا حسن خاتمہ فرما دے۔ آمین۔ صفحہ ۵ (مہر) (از مکہ مکرمہ ۱۵ جمادی الاول ۱۳۱۱ھ)

مکتوب ۶ | جامع فضل و کمال جناب محبی مخلصی عزیزی مولوی رشید احمد صاحب زاد اللہ عرفانکم۔ پس از دعا ترقی درجات واضح رائے محبت پیرائے باد کہ آپ کا راحت و محبت نامہ عین حالت انتظاری میں وصول ہو کر باعث اطمینان خاطر ہوا۔ ایک مدت سے تعلق قلبی اس طرف متعلق تھا جو پائے احوال آں مخلص تھا۔ خدا نے کیا راحت نامہ محبت شمامہ کاشف حالات ہوا۔ عزیزم بے شک آپ کا عذر عدم ارسال نامجات نہایت ہی قوی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو زائل فرما کر صحت کلی عطا فرما دے۔ آمین۔ میری بھی یہی حالت ہے کہ مضامین دل میں جوش مارتے ہیں مگر بوجہ ضعف و نقاہت بدنی و بصری کے لکھنے پڑھنے سے معذوری ہے اور غیر سے اپنا اظہار مطلب کراتا اور زیادہ دشواری ہے۔ چونکہ ہر مضمون اس قابل نہیں ہوتا کہ ہر ایک سے کہا سنا جائے۔ بدیں وجہ ساکت ہوکر

بیٹھ جاتا ہوں اور ارسال خطوط سے معذور رہتا ہوں مگر تعلق قلبی بہت بالغ برعقت آپ کے ساتھ ہے۔ ہمیشہ آپ کے لیے دست بدعا رہتا ہوں۔ خدا قبول فرماوے۔ سن کل الوجوہ صحت مرحمت فرماوے اور فیضان آنعزیز سے خلق اللہ کو فیضیاب فرماوے۔ آمین۔ ص۲۰۶

مکتوب ۷ — از طرف فقیر امداد اللہ عفی عنہ۔ بخدمت بابرکت فیضدرجت عزیزم مولوی رشید احمد صاحب سلمہٗ بعد سلام مسنون کے واضح رائے ہو کہ عزیز مولوی مسعود علی صاحب کا خط ۲۹ جمادی الاوّل کا ارسال ہوا۔ کل ۲۲ جمادی الثانیہ کو پہنچا۔ اس سے حال پُرملال انتقال اہلیہ آن عزیز معلوم ہوا۔ کمال صدمہ ہوا۔ افسوس صد افسوس کہ آپ پر صدمات متواترہ کے ہجوم نے یکداغ نیک باشد وداغ دگر بنہند آہی امتحان اسی کا نام ہے اور ایسے مواقع میں ثابت قدم رہنا آپ ہی جیسے بزرگواروں کا کام ہے۔ آپ کو صبر وشکر کی تعلیم کی حاجت نہیں کیونکہ آپ مجسمۂ صبر وسراپا شکر ہیں۔ ہاں یہ دعا ہے کہ خداوند کریم آپ کو کمال اجر عطا فرماوے اور آپ کو تادیر اپنے بچوں کے سر پر زندہ رکھے اور آپ کے فیوض سے اہل اسلام کو مستفیض کرے۔ ایں دعا از ما واز روح الامین آمین باد۔ مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت اور چند طواف کئے گئے۔ اللہ جل شانہٗ قبول فرماوے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ص۲۰۶

(المرقوم ۲۳ جمادی الثانی)

مکتوب ۸ — از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت فیضدرجت جامع شریعت وطریقت عزیزم مولانا مولوی رشید احمد صاحب محدث گنگوہی لازال اللہ فیوضہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ذات بابرکات کو باعث استقامت خلق وواسطہ ہدایت کرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کی صحت خلق اللہ کے واسطے بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بعافیت تمام صحیح وسلامت رکھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فقیر نے پہلے ہی لکھا ہے کہ اپنی خیریت مزاج سے جلد جلد مسرور وممتاز فرماتے رہیں کہ سیاست غریب کے واسطے ہمیشہ دل کو تعلق رہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلاوے اور ہمارے اور فقیر کا بھی وقت قریب ہے دعائے حسن خاتمہ سے مدد فرماویں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ص۲۰۸ (مہر)

(از مکہ معظمہ پنجم شوال ۱۳۰۹ھ)

مکتوب ۹ — محبی ومخلصی عزیزم مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہٗ بعد سلام سنت الاسلام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فقیر کو ضعف ونقاہت بہت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غرض پا برکاب ہے۔ سب وجہ سے دعا کا محتاج ہے کہ خدا تعالیٰ خاتمہ بالخیر کرے۔ آمین۔ ص۲۰۸

(العبد الضعیف فقیر امداد اللہ عفی عنہٗ) (مہر)

مکتوب ۱۰ — محبی ومخلصی عزیزم مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہٗ بعد سلام مسنون المرام۔ آنکہ خط پہنچا۔ الحمد للہ کہ آپ کو صحت کلی حاصل ہوئی۔ آپ کی صحت سے ایک عالم کو فائدہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ خاتمہ بالخیر کرے۔ ص۲۰۸

(از عبد ضعیف امداد اللہ عفی عنہٗ) (مہر)

مکتوب ۱۱ — از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ۔ بخدمت بابرکت فیضدرجت عزیزم مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہٗ۔

سلام علیکم چو مد خاطری — گر از چشم دوری بدل حاضری

دعائے ترقی درجات عالیات ودجانی مشہور ضمیر منیر باد ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ برائے ہمیں عزیزان ومحبان دعائے خیر میکنم شما ہم دعا فرمایند کہ

تذکرۃ الرشید جلد اول صفحہ ۱

مکتوب ۳ حق بمنزوہ بنا شیرار حق برکی و بر تم مد

از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت فیض درجت جامع شریعت و طریقت عزیزم مولانا رشید احمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ .... مطلب ضروری یہ ہے کہ فقیر کی وہ مثنوی شریف جو ایک زمانہ سے فقیر کے ساتھ دس میں تھی اور اپنے خیال کے موافق اس پر کچھ مطالب و فوائد مع کیے تھے۔ اس دفعہ اس مثنوی کو مولوی عبداللہ بنسیری بواسطہ عزیزم مولوی ابو احمد صاحب بمبئی کے طبع کرانے کی غرض سے فقیر سے لے گئے .... فقیر نے سیٹھ صاحب کو لکھ بھیجا ہے کہ مثنوی کا طبع ہو جانا موقوف کر کے دونوں مثنوی آپ کی خدمت میں مقام گنگوہ پہنچا دیں ...... آپ بذریعہ حافظ قمر الدین یا کسی اور معتبر شخص کے ذریعے فقیر کی مثنوی کو سہارنپور سے اپنے پاس منگوا کر رکھ لیں۔ اس بارہ میں توقف نہ فرماویں۔

۱۳ از مکہ معظمہ دہم رمضان شریف روز دوشنبہ ۱۳۰۶ھ

(مہر)

ذیل میں مرشد العرب والعجم اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ کی خدمت میں ایک عریضہ حضرت قطب الارشاد گنگوہی قدس سرہٗ کا بھی ملاحظہ ہو۔

۱۳۔ حضور نے جو بندہ ناکارہ کے حالات سے استفسار فرمایا ہے میرے سر آنکھوں پر، اس ناکس کے کیا حالات اور کس درجہ کی کوئی خوبی ہے جو آفتاب کمالات کے روبرو عرض کروں۔ بجز اس کے شرمندہ ہوں، کچھ نہیں ہوں مگر جو ارشاد حضرت ہے تو کیا کروں، بناچار کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ حضرت مرشدی! علم ظاہری کا تو یہ حال ہے کہ آپ کی خدمت سے دور رہ کر غالباً عرصہ سات سال سے کچھ زیادہ ہوا ہے اس سال تک دو سو سے چند زیادہ آدمی سند حدیث حاصل کر کے گئے اکثر ان میں وہ ہیں کہ انھوں نے درس جاری کیا اور سنت کے جاری کرنے میں سرگرم ہیں۔ اور اشاعت دین ان سے ہوتی اور اس شرف سے زیادہ کوئی شرف نہیں اگر قبول ہو جاوے اور حضرت کے قدوم نعلین کی حاضری کے ثمرہ کا یہ خاصہ ہے کہ جو قلب میں غیر حق تعالیٰ سے نفع و ضرر کا احتمال نہیں رہا اور بعض اوقات اپنے مشائخ کی طرف سے بھی بیگانگی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کسی کی مدح و ذم کی پرواہ نہیں رہی اور ذام و مادح کو دو رسے جانتا ہوں اور معصیت کی طبعاً نفرت اور اطاعت کی طبعاً رغبت پیدا ہو گئی ہے اور یہ اثر اسی نسبت یادداشت بزرگ کا ہے جو مشکوٰۃ انوار حضرت سے پہنچا ہے۔ پس زیادہ عرض کرنا گستاخی اور شوخ چشمی ہے۔ یا اللہ! معاف فرما کہ حضرت کے ارشاد سے تحریر ہوا ہے۔ جھوٹا ہوں۔ کچھ نہیں ہوں۔ تیرا ہی ظل ہے۔ تیرا ہی وجود ہے۔ میں کیا ہوں۔ کچھ نہیں ہوں اور وہ جو میں ہوں وہ تو ہے اور میں اور تو خود شرک در شرک ہے۔ استغفر اللہ استغفر اللہ استغفر اللہ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ اب عرض ہے حضور فرما کر قبول فرما دیں۔ والسلام ۱۳۰۶ھ

(مکاتیب رشیدیہ مطبوعہ میرٹھ ص ۱)

قطب العالم شیخ العرب والعجم اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ اپنی شہرۂ آفاق تالیف ضیاء القلوب کے آخر میں قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہما (المتوفی ۱۲۹۷ھ) کو خلافت عظمیٰ سے سرفراز کر کے اپنا جانشین نامزد فرماتے ہیں۔ یہ الہامی تحریر قول فیصل کا درجہ رکھتی ہے۔

ارشاد فرماتے ہیں:

ہر کس کہ ایں فقیر محبت و عقیدت و ارادت دارد مولوی رشید احمد صاحب سلمہ و مولوی محمد قاسم سلمہ را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند بجائے من راقم اوراق بلکہ بمدارج فوق از من شمارند اگرچہ بظاہر معاملہ برعکس شد کہ او شان بجائے من و من بمقام او شان شدم و صحبت او شان را غنیمت دانند کہ ایں چنیں کسان دریں زمان نایاب اند و از خدمت بابرکت ایشان فیض یاب بودہ باشند و طریق سلوک کہ دریں رسالہ (ضیاء القلوب) نوشتہ شد در نظر شان تحصیل نمایند۔ انشاء اللہ تعالیٰ بے بہرہ نخواہند ماند۔ اللہ تعالیٰ در عمر شان برکت دہاد و از تمامی نعمائے عرفانی و کمالات قربیت خود مشرف گرداناد و بمراتب عالیات رساناد و از نور ہدایت شان عالم را منور گرداناد و تاقیامت فیض او شان جاری داراد و بحرمۃ النبی و آلہ الامجاد۔

جو صاحب اس فقیر سے محبت، عقیدت اور ارادت رکھتے ہیں مولوی رشید احمد صاحب سلمہ اور مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ کو جو تمام کمالات علوم ظاہری و باطنی کے جامع ہیں، میری جگہ بلکہ مدارج میں مجھ سے فوق سمجھیں۔ اگرچہ ظاہر میں معاملہ برعکس ہے کہ میں ان کی جگہ پر اور وہ میری جگہ پر ہیں اور ان کی صحبت کو غنیمت سمجھیں کہ ان جیسے لوگ اس زمانے میں نایاب ہیں اور ان کی خدمت بابرکت سے فیضیاب ہوتے رہیں اور سلوک کے طریقے جو اس رسالہ (ضیاء القلوب) میں لکھے گئے ہیں ان کے حضور حاصل کریں۔ انشاء اللہ تعالیٰ بے بہرہ نہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی عمر میں برکت دے اور معرفت کی تمام نعمتوں اور اپنی قربت کے کمالات سے مشرف فرمائے اور بلند رتبوں تک پہنچائے اور ان کے نور ہدایت سے دنیا کو روشن کرے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں قیامت تک اُن کا فیض جاری رکھے۔

(ضیاء القلوب صفحہ ۹ مطبع مجتبائی دہلی)

اعلیٰ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ بعض معترضین کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم و مولوی رشید احمد صاحب و مولوی محمد یعقوب صاحب و مولوی احمد حسن صاحب وغیرہم از عزیزاں فقیر اند و تعلق با فقیر میدارند ہیچگاہ خلاف اعتقادات فقیر و خلاف مشرب مشائخ طریق خود مسلکے نخواہند پذیرفت۔"

(رسالہ در بیان وحدۃ الوجود ص۳ مطبوعہ راشد کمپنی دیوبند۔ از اعلیٰ حضرت حاجی صاحبؒ)

"فیصلہ ہفت مسئلہ" کے آخر میں حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ عامۃ المسلمین اور خصوصاً اپنے متوسلین کو ارشاد فرماتے ہیں:

"اہل اللہ کی صحبت اختیار کریں، خصوصاً عزیزی جناب مولوی رشید احمد صاحب کے وجود بابرکت کو ہندوستان میں غنیمت کبریٰ و نعمت عظمیٰ سمجھ کر ان سے فیوض و برکات حاصل کریں کہ مولوی صاحب موصوف جامع کمالات ظاہری و باطنی کے ہیں اور ان کی تحقیقات محض للہیت کی راہ سے ہیں ہرگز اس میں شائبہ نفسانیت نہیں۔"

(فیصلہ ہفت مسئلہ ص۱۳ مطبوعہ راشد کمپنی دیوبند)

آخر میں شیخ العرب والعجم اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کا ایک مکتوب مبارک درج کیا جاتا ہے جو قطب الارشاد حضرت گنگوہی کے علو مرتبت پر شاہد صادق اور ان کے معترضین کے لیے جواب شافی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

از فقیر امداد اللہ چشتی بخدمت محبان عموماً۔ ان دنوں بعض خطوط ہندوستان سے اس فقیر کے پاس آئے، اس میں تحریر تھا کہ مولوی رشید احمد صاحب کے ساتھ بعض لوگ سوء ظن رکھتے ہیں کہ ہم مولوی صاحب کو کیا سمجھیں۔ لہٰذا فقیر کی جانب سے مشتہر کرا دو اور طبع کرا دو کہ مولوی رشید احمد صاحب عالم ربانی، فاضل حقانی ہیں، سلف صالحین کا نمونہ ہیں، جامع بین الشریعۃ والطریقۃ ہیں، شب و روز خدا اور اس کے رسولؐ کی رضامندی میں مشغول رہتے ہیں، حدیث پڑھانے کا شغل رکھتے ہیں۔ مولانا مولوی محمد اسحٰق صاحب کے بعد اس قسم کا فیض علم دین کا مولوی صاحب سے جاری ہوا ہے۔ ہندوستان میں مولوی صاحب ایک فرد واحد ہیں۔ مسائل مشکلہ کی عقدہ کشائی مولوی صاحب سے ہوتی ہے۔ ہر سال میں پچاس آدمی کے قریب علم حدیث پڑھ کر ان سے سند لیتے ہیں۔ اتباع سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں محو ہیں، محبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور عشق خداوندی میں مستغرق ہیں، حق گو ہیں، لا یخافون لومۃ لائم کے مصداق ہیں۔ خدا کے اوپر پورے طور سے توکل رکھتے ہیں۔ بدعات سے پورے طور سے مجتنب ہیں۔ اشاعت سنت ان کا پیشہ ہے۔ بدعقیدوں کو خوش عقیدہ بنانا ان کا حرفہ ہے۔ ان کی صحبت اہل اسلام کے واسطے کیمیا اور اکسیر اعظم ہے۔ ان کے پاس بیٹھنے سے اللہ یاد آتا ہے۔ یہی اللہ والوں کی علامت ہے۔ متقی اور تارک الدنیا ہیں، راغب الی الآخرۃ ہیں۔ تصوف اور سلوک میں کامل ہیں، امیر و غریب ان کے نزدیک یکساں ہیں، سب کی توجہ برابر ہے۔ واضح ہو کہ فقیر نے جو کچھ ان کی ثنا میں ضیاء القلوب میں تحریر کیا ہے وہ حق ہے اور اب فقیر کا حسن ظن اور محبت بہ نسبت پہلے کے ان کے ساتھ بہت زیادہ ہے۔ فقیر ان کو اپنے واسطے ذریعہ نجات کا سمجھتا ہے۔ میں صاف کہتا ہوں کہ جو شخص مولوی صاحب کو برا کہتا ہے وہ میرا دل دکھاتا ہے۔ میرے دو بازو ہیں، ایک مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم، دوسرے مولوی رشید احمد صاحب۔ ایک جو باقی ہے اس کو بھی نظر لگتے ہیں۔ میرا اور مولوی صاحب کا عقیدہ ایک ہے۔ میں بھی بدعات کو برا کہتا ہوں، جو مولوی صاحب کا امور دینیہ میں مخالف ہے، وہ میرا مخالف ہے اور خدا اور رسولؐ کا مخالف ہے۔ اور بعض جہلا جو کہہ دیتے ہیں کہ شریعت اور ہے اور طریقت اور ہے، محض ان کی کم فہمی ہے۔ طریقت بے شریعت خدا کے گھر مقبول نہیں، صفائی قلب کفار کو بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ قلب کا حال مثل آئینہ کے ہے، آئینہ زنگ آلود ہے تو پیشاب سے بھی صاف ہو جاتا ہے اور گلاب سے بھی صاف ہو جاتا ہے لیکن فرق نجاست اور طہارت کا ہے۔ ولی اللہ کو پہچاننے کے واسطے اتباع سنت کسوٹی ہے، جو متبع سنت ہے وہ اللہ کا دوست ہے اور اگر مبتدع ہے تو محض بے ہودہ ہے۔ خرق عادات تو دجال سے بھی بہت ہوں گی۔ خدا فرماتا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرو نہ ہووے اور مروج بدعات ہووے وہ خدا کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اس فقیر سے جو اہل علم محبت رکھتے ہیں، یہ امر باعث اتباع سنت کے ہے۔ کسی کی مخالفت سے مولوی صاحب کا نقصان نہیں۔

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

مولوی صاحب وہ شخص ہیں کہ خواص کو چاہیے کہ ان کی صحبت سے مستفید ہوں اور ان کی صحبت کو غنیمت کثیر سمجھیں اور میں چاہتا ہوں کہ

مولوی صاحب کی نسبت مجھے کوئی کلمہ ایسی کا دشمنا سے اوپر
تحریر کرے، مجھ کو ان امور سے سخت ایذا ہوتی ہے۔ عجب بات ہے
کہ میرے لختِ جگر کو ایذا پہنچاویں اور اپنے آپ کو میرا دوست سمجھیں۔
ہرگز نہیں۔ مولوی صاحب پکے حنفی المذہب صوفی المشرب ہیں، باخدا
عالمِ کامل ہیں، اُن کی زیارت کو غنیمت سمجھیں۔ والسلام

مہر حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی مؤرخہ ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۱۰ھ
منقول از الشہاب الثاقب مؤلفہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی
ص ۶۹، مطبوعہ میرٹھ۔

امداد اللہ فاروقی

اسلامی قوانین کا نفاذ

ہمارے تمام مسائل کا واحد حل ہے

اور

پوری قوم اس بات پر متفق ہے کہ پاکستان میں قرآن و سُنّت
کے مکمل نظام کا نفاذ ہماری اصل منزل ہے

اس لیے

میں قوم کے ذمہ دار حضرات سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ
اپنی صلاحیتیں اور وسائل ملک میں اسلام کے
عادلانہ نظام کے لیے وقف کر دیں

عبد العزیز

فیصل آباد ——— گوجرانوالہ

ارضِ دیوبند[1]

جناب سید حامد میاں صاحب
مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور

شاد باش و شاد زی اے سرزمینِ دیوبند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند　(ظفر علی خان مرحوم)

جن حضرات نے دیوبند کر تعلیم حاصل کی ہے وہ خصوصاً ان معلومات سے مستغنی ہوں گے۔ محلِ وقوع۔ شمالی ہند میں ۲۹ درجہ ۵۸ دقیقہ عرض البلد اور ۷۷ درجہ ۳۵ دقیقے طول البلد پر ضلع سہارنپور کے متعلقات میں ایک قصبہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا قیام طوفانِ نوح کے بعد ہوا۔

محلِ وقوع کوہِ ہمالیہ کے قریب سہارنپور[3] واقع ہے اس کے مشرق میں بجنور، مغرب میں ضلع کرنال اور جنوب میں مظفر نگر ہے۔

یہ ضلع علاقہ دوآبہ میں واقع ہے۔ اس کے مشرق میں دریائے گنگا اور مغرب میں دریائے جمنا ہے۔ ان دونوں دریاؤں کے درمیان جو شہر ہیں وہ علاقہ دوآبہ میں واقع کہلاتے ہیں۔ دارالعلوم کی مطبوعہ ۱۳۶۱ھ میں تحریر ہے۔ یہ قصبہ ہمیشہ سے اپنے گرد و نواح کے جملہ متعلقات اور دیہات میں آب و ہوا کی عمدگی اور خوبی میں مشہور ہے۔ البتہ نہر کے جاری ہونے کے بعد سے آب و ہوا میں سابقہ

۱۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کا نام "دیبن" تھا بعد میں دیوبند کہلانے لگا جیسے کہ آگے شیخ علاء الدین چشتی م ۹۵۹ھ کے تذکرے سے معلوم ہوگا۔ عبدالقادر بدایونی نے بھی شیخ دانیال عثمانی م جو ساتویں صدی ہجری میں گزرے ہیں، لکھتے ہیں اپنے عقیدت مندانہ سلام میں "دیبن" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

شیخ عثمانی کہ بعہد پارسائی بے عدیل　　نازل دیبہ منورہ اصل دیبن دار السلام　　(ماخوذ تاریخ دیوبند)

میں نے اپنے رشتہ داروں سے "دیوی بن" نام بھی سنا ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ اس کا صحیح و مستقل نام یہ ہے "دیوی بن بر لبِ دریائے گنگ" ہو سکتا ہے کہ قدیم زمانہ میں جہاں آبادی ہوگی اس کے قریب سے دریائے گنگا تک کوئی بن ہو۔ وہ حضرات یہی فرماتے تھے کہ پہلے دریا قریب بہتا تھا پھر دور ہٹ گیا اور راستہ بدل لیا۔　واللہ اعلم　(حامد میاں غفرلہ)

۲۔ بحوالہ شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ از اقبال حسن خان پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ اقبال خان نے شیخ الہند پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا ہے۔ (تاریخ دیوبند مصنفہ سید محبوب رضوی طبع دوم مطبوعہ آزاد پریس دیوبند شائع کردہ علمی مرکز دیوبند)

۳۔ ۷۲۶ھ / ۱۳۲۶ء میں عہدِ غیاث الدین تغلق ایک بزرگ شاہ ہارون چشتی کے قیام سے سہارنپور کی آبادی کا آغاز ہوا۔ ابتداءً شاہ ہارون پور کے نام سے موسوم رہا، پھر کثرتِ استعمال سے سہارنپور ہو گیا۔ اس کا تاریخی نام "شہرِ زیب" ہے۔ بحوالہ جغرافیہ سہارنپور

بالآثار المحمودة والأخبار
المسعودة وأبنية مرصوصة
وأمكنة مخصوصة
وأشجار وثمار ومتنزهات وأنهار
وحياض ورياض وآجام وغياض
منيعة الجدر فيها القصور ترتيبة
وللخير بعيدة من الشرور
بلدة طيبة ورب غفور
وقد تشرفت بالمدرسة ودفن فيها
مولانا محمد قاسم رحمة الله تعالى صارت نوراً على نور
أطيب البلاد هواءً وأحسنها لطافة وصفاءً
وأطيبها صباحاً ومساءً وأكثرها نسماً
وضياءً تقوى الأجسام والأرواح وتروح
النفوس والأشباح أرضها موسومة معشبة
ومطورة مخصبة طينها اللازب أحكم من
الجص محماة المسنون أثبت من الرصاص
في الرص وبهذا يستدل على قوة
أمزجة سكانها وتصلب طباع قطانها

پختہ اور مستحکم عمارتیں ہیں، اور اس کے اندر مختلف قسم کی
تفریح گاہوں، نہروں، حوض اور باغات، جنگلات
کے ساتھ، خوش منظر جھاڑیاں ہیں۔ محفوظ مکانات
بلند محلات ہیں۔ یہ شہر خیر سے قریب اور شر سے دور
ہے، جیسے ارشاد ربانی ہے۔

بلدۃ طیبۃ ورب غفور[1]

مدرسے سے اسے شرف حاصل ہوا اور اسی میں
مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ مدفون ہوئے تو نور علیٰ نور
ہوگیا۔[2]

ہوا میں عمدہ لطافت اور صفائی کے لحاظ سے
نہایت خوبصورت ہے اور صبح و شام کی لطافت کے لحاظ
سے پسندیدہ و دلکش ہے (فضا) منور اور روشن ہے
کہ روح و جسم کے لئے قوت بخش ہے۔ اور روح و
جسم کو فرحت بخشتی ہے۔

اس کی زمین کنوانی اور چارہ پیدا کرنے والی
ہے اور بارش کو قبول کرنے والی سرسبز اور شاداب ہے
یہاں چکنی مٹی[3] چونہ سے زیادہ مضبوط اور سیسہ
کی مانند مضبوط ہے۔ اس سے یہاں کے باشندوں
کی قوت مزاجی طبائع کی پختگی پر استدلال کیا جا سکتا ہے

---

[1] - بخاری طلبہ جو تحصیل علم کے لئے مدینہ منورہ سے آتے تھے۔ وہاں کے سکون کو دیکھ کر کہتے تھے کہ یہاں مدینہ منورہ کی خوشبو آتی ہے۔

[2] - مجھے جناب حامد حسن صاحب عثمانی دیوبندی مرحوم و مغفور نے جو پٹواری کہلاتے تھے بیان کیا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ کی جب قبر مبارک کھودی گئی تو میں وہاں تھا۔ قبر کے اندر کی مٹی سے خوشبو آرہی تھی۔ جہاں آپ کا جسم خاکی رکھا جاتا تھا رحمۃ اللہ۔ جناب حامد حسن صاحب اگرچہ بعض بدعات کی رسوم بھی کیا کرتے تھے۔ مگر ان کو حضرت کی اس کرامت کی وجہ سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے کافی عقیدت تھی جناب حامد حسن صاحب مرحوم نے دراز عمر پائی۔

[3] - مٹی بہت عمدہ ہے اس لئے وہاں لحد کا رواج ہے۔ شق کا نہیں۔ نیز اس سرزمین میں سبزہ خودرو ہے یہی حال پورے علاقہ کا ہے

فلله درها من ثمرة تدل مسماها على انها من
اشجار الجنة و فواكه
أعني اشبه نبات الجنة والعسر
ذو مانح طيبة فائحة و اذوق
لذيذة متنوعة للنفوس مطبية
اما الالوان فمنها احمر كالجلنار
كانها علقت بالشجر الاخضر نار
وصفراء فائق لونها تسر الناظرين
وتعجب برائحها الوسيما المشتاقين
وخضراء تزهو بخضرتها على ما
تحت الخضراء وسوداء
هي لاصناف الثمار كالسويداء
واما رائحتها فللارواح
الطيبة رائحتها تفوق
المسك الاذفر وتزري
بالعود والعنبر واما
انما تمها فحلاوتها احلى
من الشهد وحموضتها اشهى
من تعلّبس الكثوب

(الہدیۃ السنیۃ صفحہ ۱ مطبوعہ ۱۳۰۷ھ)

نیز ان چیزوں میں سے کہ جن سے اس شہر کی فضیلت اور کھل کر سامنے آتی ہے۔ آموں کی کثرت اور ان کی لطافت و عمدگی ہے۔ کیا ہی عمدہ پھل ہے۔ جن کا نام ابنبہ خود ہی بتلا رہا ہے کہ پھلوں میں نباہت والا اور ارفع ہے اور جنت کے میووں سے بہت مشابہ ہے۔ دل فریب رنگوں والے اور عمدہ مہکتی خوشبو والے قسم قسم کے لذیذ ذائقوں
والے ان کے رنگ بعض کے تو ایسے سرخ ہوتے ہیں جیسے گل انار ایسا لگتا ہے کہ سبز درخت پر آگ کی چنگاریاں لگا دی گئی ہیں بعض گہرے زرد رنگ ہیں دیکھنے والے کی نظر کو بھلے معلوم ہوتے ہیں اور اپنی بلند خوش منظری سے مشتاق لوگوں کو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

اور بعض سبز رنگ ہیں اپنی سبزی میں آسمان تلے سبزیوں سے فوقیت لے جاتے تھے اور بعض سیاہ رنگ ہیں وہ تو پھلوں کی تمام قسموں کے دل کا بھی اندرونی حصہ جیسے ہیں اور رہی ان کی خوشبو تو کہاں عمدہ خوشبوئیں اور کہاں یہ۔

یہ مشک سے بھی بڑھی ہوئی ہے اور عود عنبر کو (اپنے مقابلے میں) گھٹا دیتی ہے۔

رہے ذائقے تو ان کی شیرینی شہد سے زیادہ ہے اور اس کی (عجیب طرح کی) ترشی بہ نسبت عرقوب کے پھلوں کے (جو سیب کی طرح مگر بے ذائقہ ہوتے ہیں۔ خیار شنبر سے چھوٹے ہوتے ہیں اور دوران میں رس ہوتا ہے) زیادہ مرغوب ہوتی ہے

الہدیۃ السنیۃ مطبوعہ مجتبائی دہلی صفحہ ۱ مطبوعہ ۱۳۰۷ھ

اس کے بعد صفحہ ۱۵ پر دیوبند کے تعریفی قصیدہ پر آپ نے رسالہ ختم فرمایا ہے

جو حضرات دیوبند میں تعلیم پا چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہاں آم ٹوکریوں کے حساب سے بہت سستے فروخت ہوا کرتے تھے اور اہل دیوبند دوپہر کو کھانے کے ساتھ اور بعض دفعہ کھانے کے بجائے آم ہی کھایا کرتے تھے۔

حضرت نے یہاں دیوبند کے بیروں کا ذکر نہیں فرمایا۔

یہاں کے بیر خوش رنگ گول نہایت لذیذ بڑے اور سیب کے رنگ کے ہوتے ہیں۔ اور اس قدر خوشبو دار ہوتے ہیں

اپنے دانتوں سے کر وجھک نکالتے جیسے بیز کرمی دیکھنے۔
نوادر کے شاہنامہ میں ہے کہ جب سکندر نے ملک
تین سپہ ایران پر حملہ کیا تو اس موقع پر اس نے ہندوستان سے
تلواریں منگائی تھیں۔ عرب کے لوگ سیف مہند کی زمانہ جاہلیت
سے تعریف کرتے آئے ہیں۔ اہل ہند کو فولاد سازی میں مہارت
حاصل تھی۔ اب یہ صنعت دیوبند میں باقی نہیں رہی تلوار چلانے
کا فن قریبی زمانہ تک باقی تھا۔ تلوار کے ہاتھ کی اتنی زیادہ اور
صفائی سے مشق کرتے تھے کہ کیلے کے تنہ میں سے تلوار گزار دیتے
تھے اور اس کے کٹ جانے کے باوجود درخت کھڑا رہتا تھا حالانکہ
تلوار بیچ سے گزر چکی ہوتی تھی اور ہلانے سے اوپر کا تنہ الگ
گر جاتا تھا۔

اسی طرح بنوٹ اور لاٹھی چلانے کی عمدہ مشق کرتے تھے
کہ ایک گٹھڑے کے نیچے کبوتر یا کوئی پرندہ چھوڑ دیتے تھے اور
اس پر کھڑے ہو کر لکڑی کے ہاتھ اتنی پھرتی سے چلاتے تھے کہ پرندہ
کو اپنی ہر چہار جانب لکڑی گھومتی نظر آتی تھی اور وہ اس کے
نیچے سے نہ اڑ سکتا تھا۔ استادان فن اپنا فنی مظاہرہ اس
طرح کیا کرتے تھے۔۔

نیز شب برات کی لڑائی جو آتش بازی کی ہوتی تھی لیکن
درحقیقت اس میں فریقین ایک دوسرے پر آتش بازی کرتے
تھے۔ اس میں زخمی ہونا تو معمولی بات تھی۔ بعض اوقات لوگ
مر بھی جاتے تھے۔ لیکن ان کا خون معاف ہوتا تھا یہ اس علاقہ
کے باشندوں کی بے جگری کا ثبوت ہے۔ حکومت ہند نے
۱۹۲۷ء سے ممنوع قرار دے دیا اس کی تفصیل تاریخ دیوبند میں ہے

مولانا سید حامد میاں صاحب

دیوبند میں مسلمانوں کی آبادکاری اور فروغ

یہاں مسلمانوں کی آبادکاری کا سلسلہ چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں شروع ہوا

حضرت خواجہ عثمان ہارونی (وفات ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء) کی بیعت و خلافت سے سرفراز ہو کر دو بزرگوں نے ہندوستان کا راستہ اختیار کیا۔ یہاں پہنچ کر ایک بزرگ خواجہ معین الدین چشتیؒ لاہور سے اجمیر تشریف لے گئے اور دوسرے بزرگ قاضی دانیال قطری نے اپنی دعوت و تبلیغ اور رشد و ہدایت کے لئے دیوبند کی سرزمین کو منتخب فرمایا۔ سلطان قطب الدین ایبکؒ (۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء، ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء) کی جانب سے جس زمانہ میں شمس الدین التمش بدایوں کا گورنر تھا، اہل فضل و کمال کو ڈھونڈ کر بلانا اور ان کی حتی الامکان قدر افزائی کرتا تھا۔ اس نے قاضی دانیال کے علم و فضل کی شہرت سنی تو ان کو بدایوں آنے کی دعوت دی۔ شیخ جب بدایوں پہنچے تو پھر وہیں کے ہو رہے اور وہیں ان کی اولاد و احفاد کا سلسلہ چلا جو ابھی تک موجود ہے۔ ان کا دیوبند میں اتنے عرصہ قیام رہ کر ان سے علمی سلسلہ پھیلا جو ان کی شہرت کا باعث بنا۔ قاضی دانیال قطری کو التمش نے بدایوں کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔

شیخ علاء الدین سہروردی

یہ بزرگ شیخ شہاب الدین سہروردی (وفات ۶۳۰ھ/۱۲۳۲ء) کے خلیفہ ہیں۔ شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی (وفات ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء یا ۶۶۱ھ/۱۲۶۲ء) اور شیخ سعدی شیرازی رحمہم اللہ ان کے ہم درس اور پیر بھائی تھے۔ مقامی روایت یہ بھی چلی آ رہی ہے کہ یہ ابن جوزی کے شاگرد تھے۔

آپ کی وفات ۱۰ شعبان ۶۴۳ھ/۱۲۴۶ء میں ہوئی۔ دیوبند میں مزار ہے۔ سب سے قدیم مزار آپ ہی کا ہے۔ آپ کے مزار کی شہرت "شاہ جنگل باش" کے نام سے ہے۔ دیوی کنڈ کی جانب مغرب سہارنپور مظفر نگر روڈ کے متصل ہے۔ ایک روایت یہ مشہور ہے کہ شیخ سعدی شیرازی (جن کا اسم مبارک شرف الدین ہے) سیاحت ہند کے دوران اپنے ان ہی بزرگ ساتھی سے ملاقات کے لئے دیوبند تشریف لائے تھے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

بہند آمدم بعد ازاں رستخیز - وزانجا براہ یمن تا حجیز

۱؎ قطب الدین ایبک نے ۵۹۱ھ/۱۱۹۴ء میں فتح کیا تھا اور ۶۰۰ھ/۱۲۰۳ء میں التمش کو بدایوں کا گورنر مقرر کیا تھا۔

اس زمانے میں ہندوستان کا اطلاق زیادہ تر ذراع دہلی پر ہوتا تھا۔

شیخ معز الاسلام دیوبند کے شیوخ صدیقی کے مورث اعلیٰ ہیں آپ ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں دیوبند تشریف لائے آپ شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی کے شرف صحبت سے مستفیض تھے۔ مزار بڑے بھائیاں میں آپ کی مسجد کے قریب بتلایا جاتا ہے۔

شاہ ولایتؒ فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء - ۷۸۹ھ/۱۳۸۸ء) کے عہد حکومت میں شیخ شہاب الدین بخاری مشہور بہ شاہ ولایت دیوبند تشریف لائے۔ شاہ ولایت کو شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء (م ۷۶۵ھ/۱۳۶۵ء) سے شرف بیعت حاصل تھا مولد و مسکن بخارا تھا وفات ۱۰ ربیع الاول ۷۸۰ھ/۱۳۷۸ء آپ کا مزار دارالعلوم کے جنوب مغرب میں ہے۔

ایک اور بزرگ: ایک بزرگ قالو قلندر (وفات ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء) کا مزار مبارک بھی تحصیل کے قریب سبزی فروشوں کے بازار میں واقع ہے آپ سے بھی اپنے زمانہ میں اہل دیوبند مستفیض ہوئے۔

شیخ جیا صاحب خانقاہ جلال الدین اکبر کے ابتدائی عہد سلطنت میں یہ بزرگ دیوبند تشریف لائے ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اجمیر سے دہلی آئے اور چند روز وہاں قیام فرمایا۔ اکبر کو ان سے عقیدت ہو گئی اس نے حکم دیا کہ شیخ جہاں قیام کرنا پسند کریں وہاں ان کی حسب منشاء انتظام کر دیا جائے۔ شیخ جیا نے دیوبند کے قیام کو پسند کیا۔ اکبر کے حکم کے مطابق مرزا بیگ ابن خواجہ محب علی بخشی نے شیخ کے لئے مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی۔ مسجد کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۶۵ھ/۱۵۵۷ء میں مسجد تعمیر ہوئی ہے۔

اسی محلہ خانقاہ میں حضرت اقدس مولانا انور شاہ الکشمیری قدس سرہٗ مدفون ہیں۔

شیخ ابوالوفا عثمانی آپ اوائل نویں صدی ہجری میں دیوبند آئے خاندان عثمانی اہل دیوبند کے مورث اعلیٰ ہیں۔ شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی کی اولاد میں ہیں دونوں بزرگوں میں پانچ پشت کا فاصلہ ہے۔

شیخ کا نسب یہ ہے۔

ابوالوفا بن عبداللہ بن حسین بن عبدالرزاق بن عبدالحکیم بن حسن بن عبداللہ عرف منیب الدین بن یعقوب بن عیسیٰ بن اسمٰعیل بن محمد بن ابوبکر بن علی بن عثمان بن عبداللہ حربانی بن عبدالرحمٰن گازرونی بن عبدالعزیز ثالث بن خالد بن ولید بن عبدالعزیز ثانی بن عبدالعزیز بن عبدالکبیر بن عمرو ابن امیرالمومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ۔

شیخ عبدالرحمٰن گازرونی محمود غزنوی کے قاضی لشکر تھے ان کے ہمراہ ہندوستان آئے اور پانی پت کی فتح کے بعد وہاں مقیم ہو گئے دیوبند کے تمام شیوخ عثمانی ابوالوفا عثمانی رحمۃ اللہ کی اولاد میں ہیں

حضرت شیخ الہند قدس سرہ کا سلسلہ نسب بھی یہی ہے اور ہرسہ برادران ذی القدر مفتی عزیز الرحمٰن قدس سرہٗ مولانا حبیب الرحمٰن اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہم اللہ کا بھی یہی ہے۔

ان ہی کی اولاد میں دیوان لطف اللہ گزرے ہیں۔ یہ شاہجہاں کے عہد میں دیوان کے عہدہ پر فائز تھے۔ ان کے دیوان خانہ کی جگہ اب دارالعلوم کا مہمان خانہ ہے۔

سید محمد اسمٰعیل بندگی جانشین ہوئے اور تمام عمر درس و تدریس اور تربیت باطنی میں مشغول رہے۔ آپ نے ۱۹ محرم ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء میں وفات پائی، اور اپنے والد کے پہلو میں بائیں جانب دفن ہوئے۔

بندگی محمد اسمٰعیل اور ان کے فرزند سید محمد عارف اور ان کے فرزند سید وجیہ الدین کی نسبت عالمگیری کے پروانہ میں بہت بلند کلمات استعمال کئے گئے ہیں۔

"دریں ولایت شیخ وجیہ الدین پسر غفران پناہ
معارف آگاہ شیخ محمد عارف ولد مغفرت پناہ بندگی
شیخ محمد اسمٰعیل کہ بصلاح و تقویٰ آراستہ لیاقت تعلیم
دارد بجائے پدر خود در خانقاہ بتدریس و تذکیر
باجماعت طالب علمان و فقراء و صوفیہ مشغول است"

یہ فرمان ۷ شوال ۴۳ جلوس عالمگیری میں غضنفر علی صوبہ دار دوآبہ کے دستخط سے جاری ہوا ہے۔ اسی طرح کا دوسرا فرمان جلوس عالمگیری کے [illegible] کا سید [illegible] صاحب کے نام محمد عرب کے دستخط سے جاری ہوا ہے۔

ان سب حضرات کی قبریں اپنے جد بزرگوار کے مزار کے احاطہ میں ہیں۔ سید محمد عارف رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۱۱۵۰ھ میں بعہد محمد شاہ ہوئی۔ دیوبند میں یہ خانقاہ دینی علوم کی اولین شمع تھی جس کو حق تعالیٰ نے گیارہویں صدی کے اوائل میں سید محمد ابراہیم قدس سرہٗ کے مقدس ہاتھوں سے روشن کیا تھا۔

سید محمد عارف کے صاحبزادے سید وجیہ الدینؒ کے بارے میں بھی فرمان میں ایسے الفاظ موجود ہیں "شیخ وجیہ الدینؒ پسر شیخ مرحوم بصلاح و تقویٰ آراستہ لیاقت تعلیم دارد بجائے پدر خود در خانقاہ بتدریس باجماعت طالب علمان و فقراء و صوفیا مشغول است [illegible] حضرت است"۔ فرامین شاہی اور سرکاری دستاویزات میں جن کا ذکر [illegible] ان بزرگوں کی نسبت یہ الفاظ لکھے گئے ہیں "غفران پناہ" "مغفرت پناہ" "معارف آگاہ" ان الفاظ سے ان حضرات کے علم و فضل [illegible] منزلت اور ان کی علمی و دینی خدمات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے [illegible] کے زمانہ سے لے کر [illegible] کی آخری زندگی تک [illegible] خانقاہ میں ایامِ جد درس و تدریس اور بیعت و ارشاد کا سلسلہ جاری رہا، ایک فتوے سید وجیہ الدینؒ کے دستخط کا موجود ہے جس پر ۱۱۵۱ھ کی مہر ثبت ہے۔

محمد شاہ بادشاہ (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء - ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کے عہد میں سید ابرار اللہ بن فضل اللہ کو دیوبند اور اس کے اطراف و جوانب کا قاضی مقرر کیا گیا۔ خاندان کے ایک بزرگ سید نور الحق کا وظیفہ نواب نجیب الدولہ (وفات ۱۱۸۴ھ) کی سرکار سے جاری تھا۔

غرض دیوبند میں اس بلند پایہ پر درس و تدریس و تصوف کا سلسلہ دستور چلا آرہا تھا، اور درسگاہ مدتوں سے قائم چلی آرہی تھی تاآنکہ اسی سلسلے میں قیام دارالعلوم بھی دیوبند میں ہوا ہے لیکن اہل دیوبند اور اس خاندان کو ایک عظیم سانحہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں سکھوں کے ایک بڑے گروہ نے دیوبند پر قزاقانہ حملہ کیا۔ اس وقت جنہوں نے مزاحمت کی ان کے گھروں کو آگ لگادی۔ اس حادثہ میں دیوبند کے کئی محلے جل کر راکھ کا ڈھیر ہوگئے۔

ایک یادداشت میں مرقوم ہے کہ

شیخ علاؤ الدین [illegible] ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے جو میرٹھ سے تقریباً ۱۹ میل جنوب میں واقع ہے، وہاں بہت سے مشائخ کرام گذرے ہیں جو اسی خاندان کے تھے، اس خاندان کے جد امجد شیخ بدر الدین م [illegible] تھے ان کو مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔

حضرت سید صاحب قدس سرہ نے ۱۲۲۲ھ ۱۸۰۷ء سے ۱۲۳۲ھ تک نواب امیر خان والی ٹونک کے یہاں تشریف رکھی۔ ہندوستان کی فوجی اعتبار سے مضبوط ترین ریاست ہوتی تھی۔ اس کی فوج چالیس ہزار تک ہو جاتی تھی بڑی جاندار تھی۔ اس کے پاس سید صاحب یہ نصب العین لیکر گئے تھے کہ اس کی عظیم الشان قوت سے دلی کی آزادی اور احیاء اسلام کا کام لیا جائے۔ اور ہندوستان کو انگریزوں کے ہاتھ میں جانے سے بچایا جائے۔ مگر جب ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور نواب امیر خان نے سید صاحب کے سمجھانے اور روکنے کے باوجود انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کا فیصلہ کر لیا تو سید صاحب نواب امیر خان[1] سے علیحدہ ہو کر دہلی چلے گئے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز نے اپنے تمام شاگردوں اعزاء اور اقارب کو ہدایت کر دی تھی کہ سید صاحب سے باقاعدہ بیعت کر کے کمالات روحانی سے استفادہ کریں۔ آپ کا یہ ارشاد جہاں سید صاحب کے کمال کا اظہار کرتا ہے وہاں یہ بھی بتلاتا ہے کہ آپ کو ان کی سیاسی رائے گرامی سے اتفاق تھا اسی لئے خاندان ولی اللہ کے وہ افراد جو چشم و چراغ تھے سید صاحب کے ہمیشہ ساتھ رہے۔

آپ ٹونک سے واپسی پر دہلی اور پھر وہاں سے ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں دوآبہ کے اضلاع کے دورہ پر روانہ ہوئے اس دورہ میں آپ نے معاشی اصلاح کے ساتھ اخلاقی اصلاح بھی فرمائی۔ اور ذہنیت وایثار اور جذبۂ جہاد کی روح لوگوں میں تازہ کی۔

آپ کے ساتھ بہت اعلیٰ خاندانی اور علمی حیثیت رکھنے والے اور اولیاء اللہ شامل ہوگئے۔ آپ کا یہ قافلہ بے نظیر علماء کی جماعت پر مشتمل ہو گیا جو ہر اعتبار سے اعلیٰ اور جامع صفات تھی (حالانکہ ۱۸۰۱ء میں یہ علاقہ (دوآبہ) بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اثر آنا شروع ہو گیا تھا) ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں آپ نے سفر حج کیا۔ آپ کی معیت میں قافلہ کے سات سو حضرات نے یہ سعادت حاصل کی ۱۲۳۹ھ میں ۔ سفر سے واپسی ہوئی پھر آپ ہمہ تن جہاد کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت[2] ہندوستان

---

[1] انگریزوں نے اس سے مقابلہ کے بجائے چال بازیوں سے کام لیا اس کے ساتھیوں کو توڑنا شروع کیا حتیٰ کہ وہ تنہا رہ گیا۔ ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء میں مجبوراً اسے انگریزوں سے معاہدہ کرنا پڑا جس کی رو سے صرف ریاست ٹونک کا اقتدار امیر خان کے پاس باقی رہ گیا۔

[2] محمد ایوب خان جنہوں نے ۱۹۵۸ء کے بعد خود کو فیلڈ مارشل بھی بنا لیا تھا اور صدر پاکستان تو تھے ہی سیدھی باتیں کرنے لگے تھے چنانچہ سید صاحب کے تقدس و جہاد کے بارے میں کچھ نازیبا الفاظ استعمال کئے تھے کہ پہاڑوں میں وہ کیا لینے آئے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انہیں تاریخ کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا تھا۔ ورنہ وجہ بھی معلوم ہو جاتی۔ اب بعض اور لوگ بھی یہ اشکال پیش کرتے ہیں اگرچہ حقیقتاً یہ ان کی اپنی ناسمجھی ہے۔ سید صاحب کو بربنائے مجبوری اور اسی طرح حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہما کو بھی تحریک کیلئے یہی علاقہ منتخب کرنا پڑا۔ ان حضرات کی نظر پورے ہندوستان کے ہر علاقہ اور وہاں کے خواص و عوام پر ایوب خان سے بہت زیادہ تھی اور وہ زیادہ جانتے تھے اور جانتے ہوئے ایسا کیا تھا۔ حامد میاں غفرلہٗ

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ انگریزوں کے خلاف مرکز بنا کر جہاد کیا جائے اس لئے آپ نے افغانستان کے قریبی حصہ صوبہ سرحد کو منتخب فرمایا۔ وہاں افغانستان اور بخارا و ترکی وغیرہ سے امداد کی توقع تھی۔ چنانچہ ۱۲۴۱ھ میں قافلہ کے ساتھ وطن عزیز کو خیرباد کہا۔ اور آزاد قبائل کا ارادہ فرمایا۔ پنجاب سے گزرنا مشکل تھا اس لیے راجستھان کا طویل راستہ[۱] اختیار فرمایا۔ نیز اس راستہ میں بعض ریاستیں ایسی تھیں جن کے دلوں میں حریت موجزن تھی۔ جب قافلہ گوالیار پہنچا تو مہاراجہ دولت راؤ سندھیا نے اور ان کے سالے وزیر راجہ ہندو راؤ نے بڑے اہتمام کے ساتھ قافلہ کو ٹھہرایا ان دنوں مہاراجہ سندھیا استسقاء کے مرض میں مبتلا تھے اور سارا کام راجہ ہندو راؤ کرتے تھے۔ مہارانی نے اصرار کیا کہ سید صاحب اتنی مدت گوالیار میں قیام کریں کہ لشکر کے لئے پورا ساز و سامان فراہم کیا جا سکے۔ مگر سید صاحب نے معذرت کی۔ گوالیار کے قیام میں سید صاحب نے ہمراہیوں کو باقاعدہ فوجی طریق پر پانچ حصوں میں تقسیم کیا۔ اور ہر جماعت کا ایک مستقل سرلشکر بنا دیا۔ قافلہ گوالیار سے روانہ ہو کر سندھ ہوتا ہوا قندھار اور کابل کے راستہ سے صوبہ سرحد میں داخل ہوا۔ آزاد قبائل کے لوگ بڑی کثرت سے سید صاحب کے حلقہ بیعت میں داخل ہوگئے سرحد پہنچنے پر ۱۲ جمادی الثانیہ ۱۲۴۲ھ کو باقاعدہ سید صاحب کے ہاتھ پر امامت و خلافت کی بیعت کی گئی۔

سید صاحب نے وہاں مرکز قائم کر کے جہاد کا اعلان کر دیا۔ اور والی کابل سلطان ہرات شاہ بخارا، قوت اور آزاد قبائل کے دیگر سرداروں کو امداد کے لئے خط لکھے۔ ان خطوط میں جہاد کی ضرورت کو واضح کرتے ہوئے بیان کیا گیا تھا۔ کہ جہاد کا مقصد ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا ہے۔

سید صاحب نے جب دو آبہ کا دورہ فرمایا تھا اسی وقت سے دیوبند[۲] کے بڑے بڑے خاندان حضرت کے ساتھ ہو گئے تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے نزدیک جانب مشرق قاضی مسجد

۱۔ شاندار ماضی ص ۱۴۳۔ و تاریخ دیوبند ص ... نیز تذکرۃ العابدین میں اجمیر، ٹونک، مارواڑ، بہاولپور، حیدرآباد سندھ، شکارپور، خان گڑھ، درۂ دہار، درہ بولان، پشین کے مقامات سے گزرنا بھی لکھا ہے ص ۱۳۳/۱۶۔

۲۔ دیوبند کا علاقہ قدیم زمانہ میں "مدھ دیش" کہلاتا تھا۔ شمالی ہند کی راجگان کی راجدھانی جب تک "ہستنا پور" (ضلع میرٹھ) رہی یہ علاقہ اس کے ماتحت رہا پھر مہابھارت کی جنگ میں کوروں کی شکست کے بعد اندرپرست (دہلی) کے مہاراجگان کی مملکت میں ہو گیا قدیم اہمیت کی بنا پر ہی شاید میرٹھ کو ہمیشہ چھاؤنی رکھا گیا ہے۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں دیوبند وغیرہ کے علاقوں میں اعلیٰ خاندانوں نے جو صاحب روحانیت و علم و فضل تھے آبادی اختیار کی۔ اشرف السوانح میں ہے: "جیسے اس گرد و نواح میں مسلمان شرفا کے بڑے بڑے قصبے ہیں مثلاً دیوبند، گنگوہ، کیرانہ، جھنجھانہ، کاندھلہ اور پانی پت وغیرہ ویسے ہندوستان میں کہیں اور نہیں پائے جا(تے)۔ اور جتنی دین داری اور جتنا علم کا چرچا ان اطراف میں ہے۔ اتنا اور کہیں نہیں دیکھا گیا اور جس کثرت سے بڑے بڑے علماء و فضلاء و صلحاء اس ملک میں گزرے ہیں اور موجود ہیں اتنے اور کہیں نہیں۔" اشرف السوانح جلد اول ص ۱۵۔ طبع اول

اولاد میں سے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ سے تحصیل علوم کی تھی مزار مبارک دارالعلوم کے شمالی دروازہ کے سامنے میدان میں ہے۔ دارالعلوم کے دوسرے مہتمم مولانا رفیع الدین صاحبؒ آپکے صاحبزادے تھے۔

۱۶۔ شیخ بلند بخت مولوی فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ شیخ بلند بختؒ کے دو چھوٹے بھائی[1] مقصود علی اور سید احمد بھی سید صاحب کے ساتھ شریک جہاد تھے سید صاحب اہم معرکوں کو سر کرنے کے لئے ان کو مامور فرماتے تھے چنانچہ کوہ کنہر ڈی کی جنگ میں لڑائی کا نقشہ کچھ بگڑ گیا تھا مگر شیخ بلند بخت نے اپنی عسکری مہارت اور جرأت وہمت سے جنگ جیت لی۔ ایک مرتبہ مولانا محمد اسمٰعیل شہید نے اپنی جگہ ان کو جانشین بنایا تھا۔ ان ہی اوصاف عالیہ اور حسن تدبر کی بناپر یہ سید صاحب کی مجلس مشاورت کے رکن بھی تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ "ڈر موت کے خوف سے پیدا ہوتا ہے ہم اپنی جانیں خدا کی راہ میں قربان کر چکے ہیں بس ہمیں کیا ڈر ہے۔" ان کی مہر پہ یہ الفاظ کندہ تھے۔

"بفضل خدا گشت بختم بلند"

صوبہ سرحد میں پھتر پائی کی گڑھی پر حملے میں شیخ بلند بخت کے بھائی مقصود علی نے دوسرے چند غازیوں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا جب ان کو بھائی کی شہادت کی خبر ملی تو نہایت صبر وضبط سے فرمایا الحمد للہ! میرا بھائی جو مراد لے کر آیا تھا وہ پوری ہو گئی ہم سب کو اللہ تعالیٰ شہادت نصیب کرے" چنانچہ معرکہ بالاکوٹ میں سید صاحب کے ساتھ ان کی یہ آرزو پوری ہو گئی۔ گویا کہ شہادت سے سرفراز ہوگئے۔

سید صاحب کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ مقصود علی پشتو بے تکلف بول لیتے تھے ایک موقع پر ان کی پشتو دانی کی وجہ سے جاسوسی کاروائی کامیاب ہوئی۔

۱۷۔ سید احمد برادر شیخ بلند بخت کے بارے میں بھی خاندان میں یہ روایت مشہور ہے کہ انہوں نے بھی بالاکوٹ میں شہادت پائی ہے "تاریخ دیوبند" تحریر فرماتے ہیں "مولوی جعفر علی بستوی نے شہدائے بالاکوٹ میں دیوبند کے دو نام لکھے ہیں شیخ بلند بخت اور ستر خان۔ شاید اصل میں سید احمد ہی تھے جن کا نام سہوًا ہے بعد میں ان کی جرأت مردانگی اور تہور کی بناء پر ستر خان زبان زد ہو گیا یہ شیخ بلند بخت کے سب سے چھوٹے بھائی تھے راقم سطور کا یہ ننھیالی خاندان ہے۔" ص۳۱۲ تاریخ دیوبند

(شاندار ماضی جلد دوم ص۲۱۳ پہان

حضرات کی کرامات جو دیوبند میں مشہور ہیں ذکر فرمائی گئی ہیں ؟[2]

مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ بالاکوٹ کے معرکہ میں ایک پل تڑوانے کی ضرورت پیش آئی تاکہ دشمن ادھر سے حملہ نہ کر سکے سید صاحب نے شیخ نصر اللہ خورجوی اور ستر خاں کو بھیجا انہوں نے پل توڑ دیا معرکہ بالاکوٹ میں سید صاحبؒ کے اس خاص دستے میں شامل

---

[1] سید صاحب کے تذکرہ نگاروں نے یہ نام علی محمد لکھا ہے۔ لیکن ان کے خاندانی شجرہ کے مطابق صحیح نام مقصود علی ہے۔ علی محمد شیخ بلند بخت کے کوئی بھائی نہیں تھے تاریخ دیوبند مجاہدین کے شوق جہاد کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ کوٹلہ میں سب سے پہلی جنگ کے موقع پر ایک مجاہد عبدالمجید خاں جہاں آبادی بیمار تھے۔ سید صاحب نے لشکر ترتیب دیتے وقت ان کا نام خارج کر دیا۔ انہیں معلوم ہوا تو خود حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ نے میرا نام کیوں نکال دیا"؟ سید صاحب نے فرمایا۔ تم بیمار ہو بولے کہ آج پہلا موقع ہے جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد قائم ہو رہی ہے آپ مجھ کو ضرور شامل رکھیں ان کے اصرار پر سید صاحب نے اجازت دیدی۔ (سید احمد شہید جلد دوم ص ۳۰۱)

[2] ان کی کرامتیں میری دادی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا بیان کیا کرتی تھیں میں نے بھی ان سے سنی ہیں (حامد میاں غفرلہٗ)

تھے جنہوں نے نہایت جرأت اور بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے سید صاحب کے ساتھ جام شہادت نوش کیا اور شہید بھائیوں میں شیخ باقر بخت کے سوا ان کے باقی بھائی غیر شادی شدہ تھے ان کی شہادت کی تفصیل نہیں ملتی۔ اس لئے کہ اس دستے کے سب ہی لوگوں نے شہادت حاصل کی۔ حالات بتانے والا کوئی زندہ نہیں بچا (بروز جمعہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو تاریخ حریت کا یہ المناک واقعہ پیش آیا)[1]

۸:- مجاہدین کے سب سے پہلے معرکہ میں جو اکوڑہ (سرحد) میں پیش آیا۔ جس میں ۳۰ مجاہدین شہادت سے سرفراز ہوئے ان میں دیوبند کے ایک صاحب، عبدالرزاق بھی شامل تھے۔ اس معرکہ میں ۳۵ مجاہدین زخمی ہوئے سات سو سکھ فوجی قتل ہوئے۔

۹:- شہداء بالاکوٹ میں دیوبند کے ایک اور بزرگ عبدالعزیز کا نام گرامی بھی ملتا ہے۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

۱۰:- غازی حفیظ اللہ دیوبند کے ایک بزرگ۔

شیخ ابوالبرکات (جن کے نام پر محلہ ابوالبرکات موسوم ہے) کی اولاد میں سے تھے۔ سید صاحب کی معیت میں شریک جہاد رہے۔ یہ سید صاحب کے خلیفہ بھی تھے اور ان کے ہاتھوں پر ان کے والد ماجد نے بیعت کر لی تھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پاکیزگی سیرت کی عجیب حالت تھی۔ غلام رسول مہر صاحب نے لکھا ہے حفیظ اللہ دیوبندی سید صاحب کے پاس نالہ میں (جو وہاں پہاڑی بارانی نالہ ہے) پہنچ گئے۔ وہاں ان کی بائیں آنکھ کے نیچے تیر لگا۔ اور اس کا پیکان پار ہو گیا۔ میاں جی چشتی نے انہیں چند لڑکوں کے پاس سایہ دار درخت میں بیٹھا دیا۔ راستہ میں انہیں امان اللہ خاں لکھنوی اور چند غازی ملے جو سید صاحب کے پاس جا رہے تھے۔ حفیظ اللہ بھی ان کے ساتھ جانے لگے دوسرے غازیوں نے انہیں یہ کہہ کر روک دیا کہ آپ زخم کھائے ہوئے ہیں۔ وہ پھر ان لڑکوں کے پاس پہنچے اور ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ رہے بعد میں سید صاحب کا فیل بان ان کا ہاتھ پکڑ کر میدان سے باہر لے گیا۔ بعد میں ان پر سید صاحب سے عشق و تعلق کی بناء پر وارفتگی کا عالم طاری رہا۔ اہل دیوبند کے اصرار پر دیوبند آگئے تھے اور غازی کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔[2]

تغمدهم الله جميعا برحمته ورضوانه واسكنهم الفردوس الاعلى من جنة النعيم

[1] تاریخ دیوبند بحوالہ سید احمد شہید جلد دوم ص ۳۸۱ و ۴۱۳

[2] تاریخ دیوبند۔ بحوالہ سید احمد شہید ص ۴۰۴ بحوالہ وقائع۔ جلد سوم ص ۲۱۰ و ۲۱۱۔

کو مسلمانوں کا ایک جگہ اس طرح جمع ہو جانا کہ جس طرح سب حضرت شیخ الہند
رحمۃ اللہ کے زمانہ میں جمع ہو گئے تھے یہ تو محال ہے البتہ اپنی سی کوشش
کی جا سکتی ہے" اس کے بعد ان کا خطاب تین گھنٹہ جاری رہا جس کے بعد
ظہر کی نماز کا وقت قریب آگیا تھا۔ انہوں نے یہ خطاب مدرسہ صولتیہ میں
نچلی منزل کے بڑے کمرے میں فرمایا تھا۔ اس میں ہندو پاکستان کے چیدہ چیدہ
علماء کو بلایا گیا تھا جن کی تعداد بیس بائیس کے قریب تھی بیٹھ کر ہی خطاب
فرمایا تھا مجھے بھی از راہ شفقت مدعو فرمایا تھا مجھے حضرت شیخ الہند
قدس سرہ کی عظمت شان کا اتنا علم نہ تھا جتنا حضرت مولانا محمد یوسف
صاحب نور اللہ مرقدہ سے اس دن سنا اور سن کر محو حیرت ہو گیا۔

اس مجلس میں مولاناؒ کے قریب فرانس کے مبلغ بھی بیٹھے تھے مولانا نے
اس روز پورے عالمی حالات پر ہر اعتبار سے جامع خطاب فرمایا تھا۔
جو حضرات اس مجلس میں شریک ہوتے ان میں جوان اور عمر رسیدہ علما
سب ہی تھے۔ ان حضرات کو شاید اور بھی باتیں مجھ سے زیادہ یاد ہوں کاش
وہ خطاب ٹیپ کر لیا گیا ہوتا۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پورے اور مکمل حالات اس
لئے جمع ہی نہیں ہو سکے کہ انگریز کی دسترس سے کوئی جگہ محفوظ نہ تھی اس
کی سلطنت پر سورج ہی غروب نہ ہوتا تھا۔

اسی سفر میں مدینہ منورہ میں ایک معمر بزرگ مولانا محمد القرشی
رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ یہ سندھ کے رہنے والے
تھے۔ ان کے صاحبزادے عبداللہ القرشی بڑے قانون دان اور انگریزی
زبان سے بھی واقف ہیں سگریٹوں کی دکان ہے، مولانا محمد القرشیؒ خود
تحریک شیخ الہند کے ایک کارکن تھے اسی بنا پر ترک وطن کر کے مدتوں سے
مدینہ منورہ جا بسے۔ انہوں نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک
آزادی ہند پر ایک مفصل کتاب تحریر فرمائی تھی لیکن جب وہاں بھی
انگریزی تسلط ہوا تو ایسے لوگوں کی خانہ تلاشی لی جانے لگی اور انہیں کہتے

ہو جانے کے خطرے کی بنا پر انہوں نے اس کتاب کو جو انہوں نے تحریر کی تھی تب
تلف کر دیا کہ ان کے بارے میں بتایا گیا کہ احقر نے ان سے
سے گذارش کی کہ دوبارہ مرتب فرما دیں لیکن وہ اتنی عمر رسیدہ
ہو رہے تھے کہ اسے دوبارہ مرتب کر سکنا مشکل تھا کہ وہ اسے
یکجا اور مرتب فرما رہے ہوں گے یا اس کا پتہ نہیں۔

نہ معلوم اس طرح کتنے اہل علم کی معلومات ان کے ساتھ ہی
رخصت ہو گئیں، انگریز کے آخری دور میں یہی حال رہا ہے۔ والد ماجد
قدس سرہ نے "الجمعیۃ" کے تبلیغ نمبر میں تحریر فرمایا ہے کہ آخری دور
تک تمام معلومات راز میں رکھی جایا کرتی تھیں کسی کا رسالہ کا کوئی پتہ
نہیں رکھا جاتا تھا۔

مجاہد ملت نمبر حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ کی
وفات پر شائع ہوا تھا۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ
۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو وفات پائی۔ آپ کو ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی پر جب
غسل کے لئے لٹایا گیا تو پیٹھ بالکل سیاہ ہو رہی تھی اور اس پر نشانات تھے
لوگوں کو حیرت ہوئی کہ یہ کیونکر ہوئے۔ آپ کے ان رفقاء نے جو اسارت مالٹا
میں ساتھ تھے بتلایا کہ یہ نشانات ان دروں کے ہیں جو اسارت مالٹا میں
آپ پر پڑتے رہے۔ انہوں نے بتلایا کہ شیخ الہندؒ نے ہمیں ہدایت کی تھی
کہ میرے سامنے ان مصائب کا جو مجھ پر پڑ رہے ہیں کبھی ذکر نہ کرنا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن

مصنفہ ڈاکٹر اقبال حسن خان پی ایچ ڈی ص ۱۵۳

حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے اخفا کا یہ عالم تھا کہ کتمان جو عادت
طبیعت ثانیہ تھا تو ایسی صورت میں ان کے کارنامے اور بھی مستور رہے
نیز جب وہ اسارت سے رہا ہوئے تو وہ بھی انگریزی دور تھا، اور
تحریک جاری تھی اور حضرت کے جوش جہاد کا وفات تک یہی حال تھا،

حاجی محمد عابد مہتمم اول دارالعلوم دیوبند کے رشتہ دار اعلیٰ [illegible] کے
خلیفہ بھی تھے، سال پیدائش [illegible] ہے ۔ جمادی الاول [illegible] روز [illegible]
میں آپ نے وفات پائی سرائے پیرزادگان میں آپ کا مزار ہے،
آپ کے بارے میں حضرت اقدس مولانا شاہ اشرف علی
صاحب تھانوی قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں

حضرت حاجی [illegible] صاحب دیوبندی خلیفہ حضرت حاجی سید محمد
عابد صاحبؒ دیوبندی بھی بڑے صاحب نسبت بزرگ تھے بعض لوگوں
کا خیال تھا کہ وہ اپنے شیخ سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ حج سے واپس آنے
کے بعد ان کے اوپر ایسی حالت طاری ہوئی جس سے لوگوں کو یہ گمان ہوا
کہ جنون ہو گیا ہے، اپنی چیزیں لوگوں کو مفت دے ڈالتے کھانے پکوا
پکوا کر تقسیم عام کرتے اور ہر وقت ایک سکر کی سی کیفیت غالب رہتی
اس زمانہ میں حضرت والا اتفاق سے دیوبند تشریف لائے تو عیادت کے
لئے پہنچے حاجی صاحب نے حضرت والا سے خلوت میں فرمایا کہ آپ سے
ایک بات کہتا ہوں جو میں نے اب تک کسی سے ظاہر نہیں کی لیکن اب
آپ اس کو میری زندگی میں کسی پر ظاہر نہ کریں۔ وہ یہ بات ہے کہ میں نے
حرم شریف میں بعض انبیا علیہم السلام کی بیداری میں زیارت کی ہے
جو میری حالت ہے یہ انہیں حضرات کی نظر کا اثر ہے۔

حضرت والا سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا تنہائی میں کوئی خاص بات
فرمائی ہے۔ حضرت والا نے یہ بات فرمائی کہ ہاں ایک خاص بات تو ہے
لیکن مجھے ممانعت فرمائی ہے کہ میری زندگی میں کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ اس
لئے میں اس کو ظاہر نہیں کرتا۔ حضرت والا نے حسب وصیت حاجی صاحب کی
زندگی میں کسی پر وہ بات ظاہر نہ فرمائی البتہ بعد وفات اظہار کا اہتمام نہیں
فرمایا، اس واقعہ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ حاجی صاحبؒ نے اپنے اس خاص
راز باطنی کا اہل حضرت والا کو سمجھا اور کسی پر اس کا اظہار نہ فرمایا بلکہ حضرت
والا کو بھی اس کے اظہار سے ممانعت فرما دی۔

اشرف السوانح صہ ۱۲۹ تا صہ ۱۵۱

باب دوازدہم مطبوعہ کتب خانہ اشرفیہ دہلی

سید محمد حسن نبیرہ سید غلام رسول بغدادی رحمۃ اللہ علیہما

سید محمد حسن ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے، آپ سید غلام رسول صاحب
بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے ہوتے ہیں اور دیوبند کے مشہور بزرگ
سید محمد عبداللہ صاحب عرف میاں جی منے شاہ صاحب آپ کے ملموں [illegible]
ہوتے ہیں۔

میاں جی منے شاہ صاحبؒ کے خاندانی حالات اور شجرہ نسب کا
پتہ نہیں چل سکا یہ بزرگ اولیا کاملین میں سے تھے۔ ان کے زمانے کے تمام
بزرگ ان کی درویشی اور بزرگی کا بہت لحاظ رکھتے تھے چنانچہ حضرت مولانا
محمد قاسم صاحب نانوتوی نے دارالعلوم کی موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد جن
حضرات سے رکھوایا ان میں میاں جی بھی شامل تھے، فارسی کے نہایت باکمال استاد
تھے، قلعہ کی مسجد میں ان کا مکتب جاری تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کی تعلیم میں
بڑی برکت دی تھی، شاگردوں میں ہندو مسلمان سب شامل تھے۔ میاں جی منے شاہ
نے ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۳ء میں وفات پائی، بندگی شاہ محمد عمر کے قبرستان میں مزار ہے۔
مولانا فضل الرحمان عثمانی (وفات ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء)

نے ایک بار دوران درس حضرت اقدس مدنی قدس سرہ نے میاں جی منے شاہ صاحب کا واقعہ نقل فرمایا کہ لکھنؤ کی طرف سے ایک معروف
عالم دیوبند تشریف لائے تو میاں جی صاحب ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آئے۔ نیت باندھی اور تھوڑی دیر بعد نیت
توڑ کر چلے گئے کہ امام صاحب تو اینٹوں کے بھٹے میں گئے ہوئے ہیں، دریافت کرنے پر ان عالم نے بتلایا کہ میں گھر اینٹوں کے عمارت
کے واسطے کر آیا تھا، مجھے نماز میں ان کا خیال آیا تھا، میاں جی منے شاہ صاحب کے ایسے واقعات بہت مشہور ہیں اور حضرت میاں اصغر حسین

(باقی صفحہ [illegible])

دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے تھے۔ مجلس شوریٰ کے آخر عمر تک رکن رہے۔ دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی، فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔

خانقاہ و مدرسہ سرائے پیرزادگان کا ذکر ہو چکا ہے طلبہ اور روحانی مستفیضین کی تعداد کی کثرت کی بنا پر اس کے نام اوقات تھے لیکن ایک حادثۂ عظیم کے بعد اس کا احیاء نہ ہو سکا تھا اس کے بعد آخری زمانہ میں دیوبند میں قدیم طرز کے صرف تین مدرسوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مدرسہ مولوی مہتاب علی[2] کا تھا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کی عربی تعلیم کا آغاز اسی مکتب سے ہوا تھا۔
دوسرا مدرسہ میاں جی امام علی کا تھا جو امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے

اور تیسرا مدرسہ جو کالی مسجد میں تھا جس کے مالک ... دیوبند کے مشہور بزرگ میاں جی منے شاہ پڑھاتے تھے ان مدرسوں میں فارسی کے ساتھ ہندو بچے بھی پڑھا کرتے تھے۔

فقط هُمنا تغرمنّا الكلام
على مُصطفنا اوقف البلام

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(بقیہ ص ۷۵۱) صاحب کے بھی اسی طرح کشف و کرامات کے واقعات، جنات کے واقعات اور ان کے موثر تعویذات بہت مشہور ہیں بعض حضرات نے دیوبند میں تعلیم حاصل کی ہے اور حضرت میاں صاحب کا شرف تلمذ حاصل ہوا ہے۔ وہ سب جانتے ہیں حضرت اقدس مولانا السید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ عرف میاں صاحب ابن جناب سید محمد حسن صاحبؒ پیدائش ۱۲۹۴ھ ۱۸۷۷ء وفات ۱۳۶۴ھ ۱۹۴۵ء، حضرت شیخ الہندؒ سے حدیث و تفسیر پڑھی، دارالعلوم میں حدیث و تفسیر کا درس دیتے تھے، اردو زبان میں پچیس کتابیں تصنیف فرمائیں۔ یہ کتابیں عوام و خواص میں بہت مقبول ہیں، گجرات کے علاقہ راندیر میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ (الذکریٰ دیوبند)۔

حضرت مولانا اختر حسین صاحب مدرس علیا دارالعلوم دیوبند ہیں اور ان کے دوسرے بھائی حضرت حاجی جلال صاحب تمغت وہی ملک و قوت رکھتے ہیں۔ کثر اللہ امثالہم (حامد میاں غفرلہ)

[1] اب میاں ابراہیم رحمۃ اللہ کی اولاد سرائے سے شہر میں آباد ہو چکی ہے، صرف دو ایک گھرانے رہ گئے ہیں، وہ بھی حسب حال اور روایت سلف سے عاری۔

[2] مولانا مہتاب علی صاحب (وفات ۱۲۹۳ھ) مولانا ذوالفقار علی کے بڑے بھائی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے تایا جان تھے۔ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں دیوبند کے رئیس شیخ کرامت حسین کے دیوان خانہ میں جو مدرسہ قائم تھا اس میں عربی پڑھاتے تھے۔ دارالعلوم قائم کرنے کے لیے پہلا چندہ حاجی محمد عابد صاحب کا تھا اور دوسرا چندہ انہی مولانا مہتاب علی صاحب نے دیا قیام دارالعلوم کے بعد اس کی مجلس شوریٰ کے رکن قرار پائے۔

[illegible]

اگر دارالعلوم نہ ہوتا؟

دارالعلوم دیوبند نے برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں جو انمٹ نقوش ثبت کیے ہیں وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ برصغیر کی تاریخ سے معمولی واقفیت رکھنے والا ہر شخص اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ابنائے دارالعلوم فکر و عمل کے ہر میدان میں قیادت و راہنمائی کے منصب بلند پر فائز رہے ہیں۔ فکر و عمل کا کوئی گوشہ ایسا ہو گا جو فضلائے دارالعلوم کی حیرت انگیز جد و جہد کا رہینِ منت نہیں یا پھر یہ کہ برصغیر ہی نہیں بلکہ اکنافِ عالم میں فرزندانِ دارالعلوم نے جانگداز مصائب برداشت کر کے دینی ملی اور قومی خدمات کے پھریرے نصب کیے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے فضلاء دارالعلوم کی ہمہ جہت خدمات عظیمہ کو احاطۂ تحریر میں لایا جانا ممکن ہی نہیں بالاختصار عرض کیا جا سکتا ہے کہ اگر دارالعلوم دیوبند نہ ہوتا تو :-

- ★ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بظاہر ناکام ہو جانے والی شکستہ دل مسلمان قوم کی دینی و قومی روایات کا تحفظ نہ ہوتا۔
- ★ تعلیماتِ ولی اللّٰہی کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کا اہتمام نہ ہوتا اور تحریکِ سید احمد شہید کو برگ و بار میسر نہ آتے۔
- ★ دیانند سرسوتی، سوامی شردھانند، پادری فنڈر اور اس قبیل کے دیگر اسلام دشمن افراد کی چلائی ہوئی تحریک فتنۂ ارتداد کی سرکوبی و بیخ کنی نہ ہوتی۔
- ★ پاک و ہند اور دیگر براعظموں میں مدارس و مساجد کے ذریعہ قال اللّٰہ و قال الرسولؐ کی صدائیں نہ گونجتیں۔ برصغیر کے چپہ چپہ پر مدارس اور مساجد کے جال بچھائے جانا فرزندانِ دارالعلوم ہی کی کوششوں اور کاوشوں کا رہینِ منت ہے۔
- ★ دین و دنیا کو الگ الگ کرنے کی رسوائے زمانہ فرنگی سازش کامیاب ہو جاتی اور اسلام ایسا ہمہ گیر دین محض "پرسنل عقیدہ" ہو کر رہ جاتا۔

تحریکِ آزادی کی مسلمانوں کے مقدس خون سے آبیاری نہ ہوتی اور فرنگی سامراج کے ظالمانہ اقتدار کی رسی مزید دراز ہو جاتی جس کے بعد وہ مسلمانوں کو رنگ و نسل کے اعتبار سے مسلمان اور فکر و نظر کے اعتبار سے عیسائی بنانے میں مکمل طور پر کامیاب ہو جاتا حتیٰ کہ مسلم قومیت کی بنیاد پر مسلمانوں کی علیحدہ مملکت وجود میں نہ آتی۔ ★ اتحاد عالم اسلامی کی منظم تحریک، تحریک ریشمی رومال کے نام سے وجود میں نہ آتی۔ اس تحریک نے بدیشی قوم کے دل و دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں اور اس تحریک کی قیادت و راہنمائی کا شرف بھی دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالبعلم، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کو حاصل ہوا جس کی پاداش میں اس بطلِ جلیل اور اس کے جانثار ساتھیوں کو وطن سے دور جزیرہ مالٹا میں طویل مدت کے لیے پسِ دیوارِ زنداں ہونا پڑا۔ ★ اسلام کے خلاف مستشرقین کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات اور اسلام و پیغمبر اسلامؐ پر کیے گئے جارحانہ حملوں کا شافی و کافی جواب نہ دیا جاتا اور جس کا جی چاہتا "لائف آف محمدؐ" اور "رنگیلا رسولؐ" ایسی شرمناک کتابیں تصنیف کرتا۔ ★ علم حدیث اور علم تفسیر کی لاتعداد علمی کتابیں وجود میں نہ آتیں اور اردو ایسی عام فہم اور بین الاقوامی زبان میں اسلامی لٹریچر منتقل نہ ہوتا۔ ★ عظمتِ صحابہؓ اور عزتِ اسلاف کا تحفظ نہ ہوتا۔ ★ سارقینِ ختمِ نبوت کا عملی و علمی تعاقب نہ کیا جاتا۔ ★ بدعات کے اندھیاروں میں سنت کی مشعلیں روشن نہ ہوتیں اور الحاد و زندقہ، تجدد و نیچریت کے خد و خال نہ دھندلاتے۔ ★ علم و عمل کی اس فقید المثال چھاؤنی سے عالم، فاضل، مفسر، محدث، متکلم، فقیہہ، مفتی، مقرر، خطیب، مناظر، مدرس، سیاس، قراء اور حفاظ تیار نہ ہوتے۔

الغرض یہ دارالعلوم ہی کا فیضان ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے میں خدا کے آخری دین کے چراغ روشن ہوئے۔

محمد شریف شیوہ

تو نے بکھرے موتیوں کو آج یکجا کر دیا — سچ تو یہ ہے بند اک کوزے میں دریا کر دیا

ناز جتنا بھی کریں تجھ پر وہ کم ہے "الرشید" — تو نے ذرّوں کو ستاروں سے شناسا کر دیا

سینکڑوں اہلِ صحافت کر نہ پائے تھے جسے — مرحبا وہ کام تو نے آج تنہا کر دیا

تیرے مضمونوں کے عنواں آفتاب و ماہتاب — منزلِ تاریخ کا پُرنور رستا کر دیا

بھولی بسری داستاں بھی، بکھرے بکھرے واقعات — تو نے کڑیاں جوڑ کر اک ربط پیدا کر دیا

چھیڑ کر مردانِ حق کی داستانِ قید و بند — ہر دلِ حساس میں اک حشر برپا کر دیا

تیرا یہ نمبر سنہری باب ہے تاریخ کا — زندۂ جاوید تو نے نام اپنا کر دیا

تو نے ہر دل میں سجایا نقشۂ دار العلوم — ہر نظر میں تو نے اس کا نقش پیدا کر دیا

کاش! میں بھی دیکھ سکتا، ان کو شیوؔ اک نظر

وہ کہ جن لوگوں نے اس ملت کو زندہ کر دیا

[illegible] ساہیوال

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان ـــــــ ملک میں

سامراجی اثرات کے خاتمہ

اسلامی نظام کے نفاذ

اور

جمہوری اقدار کی بحالی

کے لیے شب و روز جدوجہد میں مصروف ہے اور جمعیۃ علماء اسلام کے زیر اہتمام اسلامیان پاکستان کے تنازعات کے اسلامی تصفیہ کیلیے

ـــ ملک بھر میں ـــ

شرعی عدالتوں کا نظام

عملی جدوجہد کا آغاز کر رہا ہے

اسلامیان پاکستان سے اپیل ہے کہ اس مقدس جدوجہد میں جمعیۃ علماء اسلام کے ساتھ دامے، قدمے، سخنے تعاون فرمائیں

منجانب

مرکزی شعبۂ نشر و اشاعت جمعیۃ علماء اسلام پاکستان

حکایتِ مہر و وفا

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

(از حضرت سید نفیس الحسینی)

جس زمانے میں حضرت مجدد الفِ ثانی قدس سرہٗ کی تجدیدی شان جلوہ گر ہوئی تو ایک جہان نے ان کے سلسلے سے سعادت و ہدایت کی روشنی پائی۔ لیکن ایک طبقہ ایسا بھی تھا کہ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور وہ ان کے مرتبہ و مقام کی پہچان سے قاصر رہا۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی ذاتِ والا صفات کے خلاف فتویٰ بازی میں مشغول ہو گیا۔ بڑی بڑی کتابیں ان کے رد میں لکھیں لیکن خدا کے فضل و کرم سے آج ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ اس کے برعکس حضرت مجدد قدس سرہٗ کا آفتابِ عالمتاب آج بھی پوری آن بان اور شان سے ضو افشاں ہے۔ یہی صورت حال حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ اور مجدد مائۃ سیزدہم حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ کے زمانے میں پیش آئی۔ ان کا پھریرا بھی بحمد اللہ پورے آب و تاب سے لہرا رہا ہے۔

بندگانِ دیوبند کی تجدیدی تحریک بھی حضرت مجدد الفِ ثانی حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے۔ تعجب نہیں اگر انہیں بھی اپنے پیش روؤں کی طرح باطل سے ٹکرانا پڑا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

ہر زمانے میں ایسے بندگانِ خدا بھی بستے ہیں کہ سعادتِ ازلی کے نشے سے وہ حق و باطل میں فرق و تمیز کر لیتے ہیں۔
ذیل میں دارالعلوم دیوبند اور اکابر علماء دیوبند کے بارے میں چند معاصر علماء و مشائخ اور کچھ دیگر بزرگوں کے تاثرات پیش کیے جاتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالرحیم سہارنپوری قدس سرہٗ (م ۱۳۰۲ھ)

آپ قطب ربانی، رئیس المجاہدین، غازی اسلام حضرت اخوند عبدالغفور صاحب سوات قدس سرہٗ (م ۱۲۹۵ھ) کے خلیفۂ اعظم تھے۔ مزار مبارک سہارنپور میں ہے۔ آپ اکابر علمائے دیوبند کے معاصر تھے۔ مولانا عبیداللہ شاہ صاحب کراچی "تعلیمات رحیمی" میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت پیر و مرشد (حضرت شاہ عبدالرحیم سہارنپوریؒ) بدرجۂ غایت متبع سنت اور محترز از بدعت تھے۔ کبھی عرس اور محفل رقص و سرود و شعر خوانی میں شریک نہیں ہوتے تھے اور اپنے خادمان کو اتباع شرع کا تاکید فرماتے تھے اور بدعات سے منع فرماتے تھے۔ (تعلیمات رحیمی۔ ص ۵۲، ۵۳)

آپ کا فیضان باران رحمت کی صورت تھا۔ آپ کے خلفاء کرام کے نام اس ترتیب سے ملتے ہیں۔ ص ۱۰۹، ۱۱۰

۱۔ حضرت مولانا محمد امیر باز خان صاحب قدس سرہٗ
۲۔ حضرت مولانا عبداللہ شاہ صاحب جلال آبادی ثم الکراچی قدس سرہٗ
۳۔ حضرت مولانا شاہ ابوالحسن سہارنپوری قدس سرہٗ
۴۔ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری نور اللہ مرقدہٗ جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مجاز تھے۔
۵۔ حضرت مولانا عبدالخالق صاحب ساکن تتم ضلع بنگلہ قدس سرہٗ
۶۔ حضرت مولانا قاری عبدالحکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ تخت ہزاروی
۷۔ حضرت مولانا نور محمد صاحب لدھیانوی نور اللہ مرقدہٗ

حضرت مولانا محمد امیر باز خان صاحب جانشین اور حضرت مولانا عبداللہ شاہ صاحب دونوں مدرسہ دیوبند ہی کے تعلیم یافتہ تھے۔ باقی تمام خلفاء پر بھی اکابر علماء دیوبند کا مسلک اعتدال ہی غالب تھا۔ حضرت مولانا عبداللہ شاہ صاحب سے ایک صاحب نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی نسبت دریافت کی۔ آپ نے فرمایا کہ حضرت مولانا کی نسبت بہت قوی اور غیر متناہی ہے۔ (رہنمائے طریقت سلطان کراچی ص ۱۳۸۴ھ)

حضرت مولانا عبداللہ شاہ صاحب قدس سرہٗ کے سلسلے میں اس وقت حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قادری (حال مقیم خانقاہ قادریہ

بندر کراچی) صاحب ارشاد ہیں جو علمائے دیوبند کے شیدائی ہیں۔

قطب عالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری قدس سرہ (م ۱۳۳۷ھ) کا سلسلہ آفتاب کی طرح درخشاں ہے۔ آپ نے تصنیف و اشاعت کی نسبت بہت ہی کارہائے نمایاں کیے ہیں۔ آپ کے خلیفۂ اعظم و جانشین برحق قطب الارشاد حضرت مولانا عبدالقادر رائپوری (م ۱۳۸۲ھ) قدس سرہ نے عرب و عجم میں اس سلسلے کو پھیلا دیا ہے۔

حضرت قاری عبدالحکیم صاحب تخت ہزاروی کے سلسلے میں اس وقت جناب صوفی برکت علی صاحب لدھیانوی دارالاحسان سالار والا ہیں جن کے حلقے میں جدید طبقہ سے تعلق رکھنے والے بعض بڑے افسر بھی شامل ہیں۔

جناب صوفی صاحب معتقد اکابر علماء دیوبند حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی، حضرت تھانوی وغیرہم کو مقبول بارگاہ خداوندی سمجھتے اور ان کی تصانیف سے استفادہ کرتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کو تو وہ حضرت علاؤ الدین علی احمد صابر کلیری کا مدرسہ کہتے ہیں۔ اس بنا پر کہ بزرگان دیوبند سلسلۂ عالیہ چشتیہ صابریہ کے چشم و چراغ ہیں۔

حضرت صوفی نور محمد صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ ام المدارس کے بانی اور "نورانی قاعدہ" کے مصنف ہیں۔ وہ مسلک علماء دیوبند کے حامل تھے۔ اُن کی اولاد حضرت مرشد مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری قدس سرہ کے حلقہ بگوش ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

حضرت سائیں توکل شاہ صاحب انبالوی قدس سرہ

حضرت مولانا مشتاق احمد چشتی انبیٹھوی مؤلف "انوار العاشقین" فرماتے ہیں:

"حضرت عارف باللہ سائیں توکل شاہ صاحب قدس سرہ نے عاجز سے فرمایا تھا کہ میں نے ایک دفعہ خواب دیکھا کہ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا رہے ہیں۔ مولانا محمد قاسم (نانوتوی) تو جہاں پائے مبارک حضور کا پڑتا ہے وہاں دیکھ کر پاؤں رکھتے ہیں اور میں بے اختیار جا کر انہوں کو حضور کے پاس پہنچوں چنانچہ میں آگے ہو گیا۔" (انوار العاشقین ص [illegible])

حضرت سائیں صاحب کے بعض الہامی جملے حضرت قطب الارشاد گنگوہی قدس سرہ کی شان میں بھی مشہور ہیں۔

سر سید احمد خاں مرحوم (م ۱۳۱۵ھ)

"مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے۔ ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز سے کچھ کم ہو۔ الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحٰق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا۔ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے۔"

(علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء ص [illegible])

حضرت خواجہ غلام فرید قدس سرہ (م ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء)

حضرت خواجہ غلام فرید پنجاب میں سلسلۂ عالیہ چشتیہ نظامیہ کے جلیل القدر مشائخ میں سے تھے۔ فرمانروایان ریاست بہاولپور کے پیر و مرشد تھے۔ اُن کے ملفوظات کا ایک مجموعہ مقابیس المجالس کے نام سے ہے۔ عرب کے سلاسل طریقت کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ سلسلۂ چشتیہ میں اس وقت صرف حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ہیں جو چشتی صابری ہیں، آگے فرماتے ہیں:

حاجی امداد اللہ صاحب کہ بندگے ست کامل زندہ
است۔ بعد ازاں فرمودند کہ اکثر علمائے جید از
دیوبند و دہلی و سہارنپور و گنگوہ از مریدان حاجی
صاحب ہستند و مولوی رشید احمد گنگوہی نیز
مرید و خلیفۂ اکبر مولوی موصوف است و دیگر خلفائے
وے ہم بسیار اند چنانچہ مولوی محمد قاسم صاحب
و محمد یعقوب صاحب"

مقابیس المجالس، جلد ۲، صفحہ ۴۴

(مقدمہ دیوان فرید ص۳۵ مطبوعہ عزیز المطابع بہاولپور ۱۹۴۴ء)

حضرت شاہ ابو الخیر مجددی دہلوی (م ۱۳۴۱ھ)

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ کی اولاد میں ہیں۔
ہندوستان اکابر علماء دیوبند کے معاصر اور ہندوستان کے نامور
مشائخ میں سے تھے۔ آپ اور بندگان دیوبند کے درمیان نہایت خوشگوار
روابط تھے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے اساتذہ
میں سے تھے۔ آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا ابو الحسن زید مدظلہ کی
خدمت میں راقم سطور دہلی میں دو بار حاضر ہوا ہے۔ دوسری مرتبہ حاضری پر
اپنی تالیف "مقامات خیر" عطا فرمائی جو حضرت شاہ ابو الخیر کے حالات
میں لکھی ہے۔ ان دنوں آپ ہی دہلی کی شاہی عید گاہ کے امام ہیں ---
قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا
محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ سے حسن عقیدت رکھتے ہیں، حدیث میں حضرت
مولانا عبد العلی (تلمیذ حضرت نانوتوی) اور حضرت مولانا محمد شفیع (داماد
حضرت شیخ الہند) کے شاگرد ہیں۔ اپنی تالیف "مقامات خیر" میں تحریر
فرماتے ہیں:

"آپ (حضرت شاہ ابو الخیر مجددی) سنہ ۱۳۱۹ھ میں
ہم جیسوں بھائیوں کو مدرسہ مولوی عبد الرب میں داخل
کیا۔ ۱۳۲۲ھ میں یہ عاجز کامل طور پر پڑھنے کے لیے
مدرسے سے وابستہ ہو گیا۔ اس مدرسہ میں جناب مولانا
عبد الوہاب، جناب مولانا حکیم جی محمد مظہر اللہ و جناب
مولانا محبوب الٰہی صاحبان سے علوم متفرقہ کی کتابیں
پڑھیں اور حدیث شریف کا دورہ حضرت مولانا عبد العلی
حضرت مولانا محمد شفیع کے حلقہ میں کیا۔ صحیح مسلم اور سنن
ابن ماجہ حرفاً حرفاً از اول تا آخر مولانا عبد العلی سے اور
جامع ترمذی اور سنن ابو داؤد و نسائی مولانا محمد شفیع سے
پڑھیں"۔ (طبع اول ص۳۹، مطبوعہ دہلی ۱۳۹۲ھ)

حضرت مولانا عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر آپ نے "مقامات خیر"
میں حضرت شاہ ابو الخیر صاحب کے مخلصین میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ عاجز اب چند دیگر حضرات کا ذکر کرتا ہے تاکہ معلوم
ہو کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے دل آپ (حضرت
شاہ ابو الخیر صاحب) کی طرف کس طرح مائل تھے
اور وہ آپ کا احترام کس طرح کرتے تھے۔" ص۲۶۱

اس کے بعد سب سے پہلے حضرت مولانا عبد العلی رحمۃ اللہ کا ذکر
مبارک کیا ہے۔ اس عنوان کے ساتھ "حضرت استاذی مولانا عبد العلی"

"اس عاجز نے آپ سے پڑھا ہے۔ آپ عاشق صادق
بارگاہ نبوی اور دلدادہ کامل حضرت محمد قاسم نانوتوی
تھے۔ جمعہ کے دن مدرسہ عبد الرب میں صدہا افراد کے
سامنے آپ (حضرت شاہ ابو الخیر صاحب) کے
انگوٹھے کے دامن کو اپنی آنکھوں سے ملتے تھے
اور فرماتے تھے مجھ کو اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی خوشبو آتی ہے لہٰذا آپ نے ایک مرتبہ ایک
خواب لکھ کر حضرت سیدی الوالد کو ارسال کیا۔
خواب یہ ہے:
"مسجد میں آپ تشریف رکھتے ہیں اور [illegible] اچانک
پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں تبدیل ہو گئے
یہ حالت آپ ہی کی ہے۔ آپ نے ۱۹ شعبان ۱۳۲۶ھ
میں اس عاجز کو سند عنایت فرمائی، دو دن پہلے
جب کاتب سے اس عاجز کا نام لکھوا رہے تھے
تو یہ الفاظ لکھوائے: "اما بعد فإن أخانا
في الدين المولوي أبا الحسن زيد بن
العالم الرباني الجامع بين الشريعة و
الطريقة مولانا عبد الله شاه أبي الخير
نوّر الله مرقده۔ الخ
آپ نے جس وقت حضرت سیدی الوالد کا اسم
گرامی لیا، زار و قطار رونے لگے۔ اس عاجز نے آپ
کی یہ کیفیت دو حضرات کے ساتھ ہمیشہ دیکھی، ایک
سیدی الوالد اور دوسرے مولانا نانوتوی قدس اللہ
اسرارہم۔ حضرت سیدی الوالد کے پاس اگر کبھی
کوئی عمدہ میوہ یا شیرینی آتی تھی یا حضرت [illegible] سے
شکار کر کے لاتے تھے تو حضرت مولانا کو بھی ارسال
فرماتے تھے۔ (ص ۴۶۲)

• حضرت شاہ ابوالخیر قدس سرہ جمعہ کی نماز مدرسہ
عبدالرب میں پڑھا کرتے تھے اور نماز کے بعد حضرت
مولانا عبدالعلی سے کافی دیر تک صحبت رہتی تھی۔
(ص ۴۶۸)

"جس دن عاجز مولانا ابوالحسن زید نے صحیح بخاری
ختم کی، حضرت مولانا عبدالعلی کے شانے پر ایک رو
مال پڑا تھا۔ آپ نے دائیں ہاتھ سے رومال کی گرہ
کی طرف اشارہ کر کے فرمایا صاحبزادہ یہ گرہ کھولو۔ میں
نے گرہ کھولی تو ایک اشرفی برآمد ہوئی۔ آپ نے ہدیۃً
پیش کر کے فرمایا صاحبزادہ یہ قبول کرو۔ اس وقت آپ کو
حضرت سیدی الوالد قدس سرہٗ یاد آ گئے اور ان کے
واسطے دعا فرمائی۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری
تھے۔ آپ نے بخاری ختم اور ابن ماجہ پڑھانے کے
بعد عاجز سے فرمایا، صاحبزادہ کچھ اور شروع کرو۔ پھر
فرمایا قصیدہ بردہ پڑھو۔ چنانچہ جب کچھ دن میں مبارک
قصیدہ کا سبق ہوا اور آپ کے عشقِ نبوی کا کچھ اندازہ
اس وقت ہوا۔ یہ عاجز قصیدہ کا سارا شعر پڑھتا تھا
اور آپ کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو جاتا تھا
آپ اتنا روتے تھے کہ تکلم نہیں فرما سکتے تھے۔ آپ کی
ریشِ مبارک سے آنسو کے قطرے ٹپکتے تھے۔ آپ کو
اپنے استاد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت
سیدی الوالد قدس اللہ اسرارہما سے بھی کامل قلبی تعلق تھا
جب بھی ان دو حضرات کا ذکر فرماتے تھے۔ آبدیدہ ہو
جایا کرتے تھے۔" (مقاماتِ خیر ص ۴۶۱)

• آپ (حضرت مولانا عبدالعلی) نے فرمایا کہ میں نے
حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں
یہ خواب دیکھا کہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف
لائے ہیں۔ آپ اونٹ پر سوار ہیں اور اونٹ کی نکیل

مولانا کے منڈھے پڑی ہوئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی کیفیت میں ہیں جس کا بیان محدثین نے کیا ہے۔ البتہ آپ کی لحیۂ مبارک حلق شدہ ہے اور میں آپ کی اونٹنی کے پیچھے چل رہا ہوں۔ اس خواب کو میں نے حضرت مولانا سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا: تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت مبارک کی ہے اور آپ کا اظہار حلق لحیہ کی صورت میں یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اب آپ کی یہ مبارک سنت ترک کر دی جائیگی۔ مولانا کی وفات ۱۲۹۷ھ میں ہوئی ہے۔ ان دنوں داڑھی منڈانے کا روز افزوں رواج مولانا کے خواب کی صحیح تعبیر بن کر سامنے آرہا ہے۔ (صفحہ ۴۲)

حضرت مولانا (عبدالعلی) رحمۃ اللہ کی شفقت اور مہربانی کا بیان یہ عاجز کیا کرے" (صفحہ ۴۲)

"پروردگار جل شانہ ان حضرات کی قبور کو انوار سے معمور فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ مدرسہ عبدالرب کے پانچ اساتذہ کرام اس عاجز کے مربی و معلم تھے۔ ان میں سے جناب مولانا مولوی عبدالوہاب صاحب تقسیم ہند کے بعد پاکستان تشریف لے گئے۔ جانے سے پہلے عاجز کے پاس تشریف لائے۔ وہی آخری ملاقات تھی پھر ان کی کوئی خبر نہ ملی اور نہ یہ معلوم ہوا کہ کہاں قیام فرمایا۔ رحمہ اللہ ورضی عنہ۔ باقی چار حضرات کی وفات کی تاریخیں درج ذیل ہیں۔

مولانا عبدالعلی میرٹھی کی وفات یکشنبہ ۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۸ء دلی میں مدرسہ مولوی عبدالرب میں ہوئی اور حضرات محدثین پاک و ہند کے جوار میں مہندیوں کے قبرستان میں: نمہ کنومۃ العروس استراحت فرما رہے ہیں۔

۱۔ جناب مولانا محمد شفیع والد حضرت مولانا محمد الحسن کی وفات ۹۱ سال کی عمر میں دوشنبہ ۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۰ھ مطابق ۸ نومبر ۱۹۶۰ء کو دیوبند میں ہوئی اور وہاں استراحت فرما رہے ہیں۔

۲۔ جناب مولانا حکیم پیر محمد مظہر اللہ کی وفات چہارشنبہ ۱۹ ربیع الاول ۱۳۸۹ھ مطابق ۱۹۶۶ء دلی میں ہوئی اور کوٹلہ فیروز شاہ کے پاس قبرستان میں آرام فرما رہے ہیں۔

۳۔ جناب مولانا محبوب الٰہی فرزند علامہ عبدالرحمن کی وفات جمعہ ۲۰ جمادی الآخرہ ۱۳۹۱ھ مطابق ۱۳ اگست ۱۹۷۱ء دیوبند میں ہوئی۔ اور وہاں استراحت فرما رہے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَآءِ اَسَاتِذَتِی قَدْ اَحْسَنُوْا اِلَیَّ فَاَحْسِنْ اِلَیْھِمْ وَاِلٰی کُلِّ مَنْ اَحْسَنَ اِلَیَّ وَھَدَانِیْ وَعَلَّمَنِیْ وَرَبَّانِیْ۔ اللّٰھم اجزھم عنی خیر الجزاء وارض عنہم وارحمھم یا ارحم الراحمین۔" (مقالات خیر صفحہ ۴۳)

حضرت مولانا ابوالحسن زید مجدہم نے بعض علماء دیوبند کی حضرت شاہ ابوالخیر قدس سرہ سے ملاقاتوں کا تذکرہ بھی مقالات خیر میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ایک دن جناب مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی آپ سے ملنے تشریف لائے۔ آپ ان سے نہایت محبت سے ملے۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ دونوں حضرات کی نہایت پُرلطف ملاقات رہی ...... مولوی صاحب آپ سے مل کر بہت خوش ہوئے اور آپ نے ان کو محبت و احترام سے رخصت کیا۔" (مقالات خیر صفحہ ۴۴)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور حضرت مولانا حافظ احمد (فرزند حضرت نانوتوی قدس سرہٗ) کی آپ سے حضرت شاہ ... ملاقات ... مقیم ہوئے:

"آپ نے خوش ہو کر فرمایا۔ ان ان کو بلاؤ۔ ہم ان سے ملیں گے چنانچہ دونوں صاحبان تشریف لائے۔ آپ نے نقاہت سے فرمایا ہم کو سہارا دو۔ چنانچہ سہارا لے کر آپ کھڑے ہو گئے اور دونوں سے محبت سے ملے۔ حافظ صاحب کی وجہ سے ان کے پدر بزرگوار کا ذکر آیا۔ آپ نے فرمایا: مولوی قاسم صاحب اور مولوی رشید احمد صاحب نے خانقاہ شریف میں حضرت شاہ عبدالغنیؒ سے حدیث پڑھی ہے۔ یہ دونوں صاحبان اپنے استاد کا اور ان کی جائے قیام کا اتنا ادب کرتے تھے کہ خانقاہ شریف کے دروازے کے باہر جوتی اتار دیا کرتے تھے اور خانقاہ شریف میں برہنہ پا داخل ہوتے تھے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ گزشتہ برس میں ہمارے حضرت والد ماجد علیل تھے۔ مولوی قاسم صاحب ملنے آئے۔ حضرت والد بوجہ علالت و ناتوانی لیٹے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب کو دیکھ کر آپ نے بیٹھنا چاہا لیکن مولوی صاحب نے بہت اصرار سے روکا اور پھر بڑی محبت سے آپ کو دبانے لگے اور آخر میں آپ سے کہا: "حضرت ہندوستان میں دو دجال پیدا ہو گئے ہیں۔ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔" اس واقعہ کو بیان کر کے حضرت سیدی الوالد قدس سرہٗ نے مولانا قاسم صاحب کی خدمت اسلام کا ذکر کیا۔" (ص ۲۴۱)

جناب مفتی عزیز الرحمٰن میرٹھ میں تفسیر مظہری کی تصحیح فرماتے تھے۔ مولوی حافظ کفایت اللہ آپ کو تفسیر سنایا کرتے تھے۔ حافظ صاحب جناب مولانا محمود الحسن کے شاگرد اور جناب مفتی صاحب کے مرید تھے۔ مفتی صاحب شاہ رفیع الدین دیوبندی کے اور وہ شاہ عبدالغنی مجددی کے خلیفہ تھے۔ ایک دن حافظ صاحب کے ساتھ جناب مفتی صاحب نسبت شریفہ مجددیہ لے کر حضرت سیدی الوالد سے ملنے تشریف لائے۔ حافظ صاحب کا بیان ہے کہ حضرت سیدی الوالد کھڑے ہو کر مفتی صاحب سے ملے اور دونوں حضرات کی آنکھوں سے محبت کے آنسو جاری ہو گئے۔ قدس سرہم ورحمہم۔ حافظ کفایت اللہ نے یہ بھی بیان کیا کہ اس کے علاوہ ایک دن جناب مفتی صاحب مع جناب مولانا محمود الحسن صاحب آپ سے ملنے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ آپ ان دونوں صاحبان سے مل کر بہت خوش ہوئے اور یہ دونوں صاحبان بھی آپ کی محبت لے کر رخصت ہوئے۔ حضرت مفتی صاحب تیرہ سو اکتیس یا تیس میں پھر آکر بھی آپ سے ملے تھے۔ رحمہم اللہ (ص ۲۵۶)

"مولانا رشید احمد گنگوہی کے فرزند مولانا حکیم محمد مسعود صاحب مع چند رفقا کے آپ سے ملنے آئے۔ آپ بڑی محبت سے ملے۔ سب کی خاطر شیر چائے سے کی۔ آپ کی محبت بھری باتیں سن کر حکیم جی اور ان کے رفقا متاثر ہوئے۔ سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آخر میں آپ نے فرمایا: مولوی صاحب ہمارے

دوست تھے اور ہم ان کے دوست تھے۔ رحمہم اللہ
(مقالات خیر ص۱۹۷)

مولانا مفتی پیر غلام رسول صاحب قاسمی (م ۱۹۰۲ء)

"اسوۂ اکابر" میں ہے:

"حضرت مولانا مفتی پیر غلام رسول صاحب قاسمی امرتسری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۹۰۲ء) سابق پنجاب کے جلیل القدر فاضل اجل اور شیخ طریقت تھے۔ آپ کو تمام علوم کی سند فراغ حضرت علامہ عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی قدس سرہٗ سے حاصل تھی اور طریقت میں آپ عارف باللہ حضرت خواجہ علاء الدین محمد صاحب تیراہی نقشبندی مجددی (چورہ شریف ضلع کیمبلپور) رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اعظم تھے۔ ایک دفعہ امرتسر میں کسی غلط فہمی کی بنا پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف عوام میں سب و شتم کا طوفان اٹھا تو حضرت مفتی صاحب قاسمی نے جلسہ عام میں عوام کو سرزنش کی اور مولانا گنگوہی کی توہین و تکفیر سے عوام کو روکا۔" (ص۱۶)

حضرت خواجہ ضیاء الملۃ والدین قدس سرہٗ زیب سجادہ سیال شریف

آپ حضرت قطب ربانی حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی قدس سرہٗ (المتوفی ۱۳۰۰ھ) کے پوتے اور سلسلہ عالیہ چشتیہ کے جلیل القدر مشائخ میں سے تھے۔ آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کی تحریک آزادیِ ہند سے بالکل متفق اور انگریزی اقتدار کے سخت مخالف تھے۔ جس زمانہ میں حضرت مولانا محمد ذاکر صاحب بانی جامعہ محمدی شریف دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرتے تھے، آپ کا سفر ہندوستان ہوا۔ دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام کو معلوم ہوا تو اثنائے سفر میں آپ کو تشریف آوری کی درخواست پیش کی جو آپ نے بخوشی قبول فرمائی۔ دیوبند ریلوے اسٹیشن پر دارالعلوم کے اساتذہ و طلباء اور عوام کے ایک جم غفیر نے آپ کا استقبال کیا۔ دارالعلوم میں محفل منعقد کر دی گئی اور ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ آپ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ حضرت خواجہ صاحبؒ نے خطاب میں دارالعلوم کی علمی و دینی و سیاسی خدمات کی تعریف و تائید فرمائی۔ بعد ازاں آپ نے دارالعلوم کو ۲۰۰ روپیہ کا عطیہ بھی مرحمت کیا۔

مؤلف تحریک جامعہ محمدی نے آپ کو تحریک خلافت اور تحریک آزادی کا مجاہد اعظم لکھا ہے (ص۱۰)

حضرۃ قاضی سلطان محمودؒ اعوان آستانہ عالیہ ضلع گجرات

قطب سوات حضرت اخوند عبدالغفور مدفون سیدو شریف (م ۱۲۹۵ھ) کے خلفائے کبار میں سے تھے۔ سلسلہ عالیہ قادریہ کے نامور شیخ تھے۔

"حضرت صاحبزادہ محبوب عالم صاحب مدظلہٗ حضرت قاضی (سلطان محمود) صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی بھتیجے ہیں۔ حضرت صاحبؒ نے آپ کو خود بھی پڑھایا اور آپ کی تعلیم کے لیے بہترین اساتذہ بھی رکھے۔ مثلاً مولوی عبدالرحمٰن صاحب فاضل دیوبندی۔" (ص۳۰)

(مقامات محمود۔ مؤلفہ معشوق یار جنگ، مطبوعہ استقلال پریس لاہور ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء)

مقامات محمود کے ص۳۱ پر مولوی عبدالرحمٰن صاحبؒ کا تعارف مختصراً ان الفاظ میں ہے:

"مولوی عبدالرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ساکن پنڈی سریال ضلع کیمبلپور (اٹک) حضرت قاضی صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اجازت یافتہ خلیفہ تھے۔ آپ دیوبند کے فارغ التحصیل بہت بلند پایہ عالم اور شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ہم درس تھے۔ ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء میں اسی برس سے زیادہ عمر میں وفات پائی۔"

حضرت میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفیٰ ۱۳۴۷ھ)

آپ خانقاہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ ملکان شریف ضلع گوجرانوالہ
کے بزرگ تھے۔ پنجاب تک ولایت سعت کا نمونہ تھے۔
مولانا مولوی انور علی شاہ۔ مولانا محمد انور شاہ کشمیری، صدر
دیوبند ہمراہ مولوی احمد علی صاحب مہاجر لاہوری شرقپور شریف
حاضر ہوئے اور حضرت میاں صاحب علیہ الرحمۃ کو بڑی ملاقات سے آپ
سے کچھ باتیں کرتے رہے اور شاہ صاحب خاموش رہے۔ پھر آپ نے مولانا
شاہ صاحب کو بڑی عزت سے رخصت کیا۔ موٹر کے اڈے تک حضرت
میاں صاحب خود سوار کرانے کے لیے ساتھ تشریف لاتے۔ شاہ صاحب نے
میاں صاحب علیہ الرحمۃ سے کہا "آپ میری کمر پر ہاتھ پھیر دیں" آپ نے پیار
کیا اور رخصت کرکے واپس مکان پر تشریف لائے۔ بعد ازاں آپ نے
فرمایا شاہ صاحب بڑے عالم ہو کر اور میرے جیسے خاکسار سے
کہتے تھے کہ میری کمر پر ہاتھ پھیر دیں اور میاں صاحب علیہ الرحمۃ نے
فرمایا کہ دیوبند میں چار نوری وجود ہیں، ان میں ایک شاہ صاحب ہیں۔

خزینۂ معرفت (حالات و کمالات حضرت میاں صاحب
شرقپوری) مؤلفہ حضرت صوفی محمد ابراہیم صاحب قصوری
صفحہ ۲۹۳ بار اول ۱۳۵۰ھ مطبوعہ فیروز پرنٹنگ پریس لاہور

اب حضرت میاں صاحب کا ارشاد شاہ صاحبؒ اور چند دیگر
اکابر دیوبند کے متعلق پڑھیے۔ حضرت میاں صاحبؒ نے فرمایا۔
"دیوبند میں چار نوری وجود ہیں۔ ان میں سے ایک مولانا
انور شاہ صاحب ہیں۔"

حضرت میاں صاحب کا یہ ارشاد کتاب "خزینۂ معرفت"
طبع اول میں آج بھی دیکھا جا سکتا ہے جو حضرت میاں صاحبؒ کے خلیفہ
حضرت صوفی محمد ابراہیم صاحب قصوری مرحوم کی تصنیف ہے۔ لیکن
معلوم ہوا ہے کہ اب جو اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے اس میں
سے حضرت میاں صاحب کا یہ ارشاد حذف کر دیا گیا ہے۔ اگر یہ واقعہ
صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ناشر کتاب نے آخر اپنے پیر و شیخ حضرت
میاں صاحب کے خلیفہ کی ایک "علمی خیانت" کا ارتکاب کر ہی ڈالا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(منقول از اسوۂ اکابر مولانا بہاؤ الحق قاسمی)

رسالہ "اسوۂ اکابر" مولانا بہاء الحق صاحب قاسمی مرحوم نے ۱۳۸۲ھ
میں تحریر فرمایا تھا مقصد یہ تھا مختلف فرقوں کی باہمی آویزش کو کسی طرح کم
کیا جائے۔ ۱۰ ہزار کی تعداد میں طبع کرکے حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری
نے بھیجا ... محمد عطاء الحق قاسمی کے ذریعے مفت تقسیم کرایا

حضرت میاں صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے
حضرت سید محمد اسمٰعیل شاہ صاحب کرموں والے، حضرت صوفی محمد ابراہیم
صاحب مؤلف خزینۂ معرفت اور حضرت صاحبزادہ محمد عمر صاحب بیربل
شریف، نے خاص طور پر میاں صاحبؒ کی روش کو قائم رکھا۔
مؤلف "اسوۂ اکابر" کا بیان ہے۔
"مولانا عبدالحنان ہزاروی مرحوم تلمیذ رشید حضرت
مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے بتایا کہ میں جب
تک آسٹریلیا مسجد لاہور میں مقیم رہا۔ حضرت میاں
صاحب شرقپوریؒ کے خلیفہ سید محمد اسمٰعیل شاہ صاحب
کرموں والے لاہور آنے پر میرے ہاں اکثر قیام
فرماتے۔" صفحہ ۲۲

حضرت صاحبزادہ محمد عمر صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو حضرت مفتی
اعظم ہند مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب
لاہوری رحمہما اللہ کے شاگرد رہے اپنی کتاب "انقلاب الحقیقت" میں خود تحریر فرماتے ہیں
کالج کی ملازمت میں ہی مجھے شریننگ کالج میں

عربی زبان کی تعلیم کے لیے جانا پڑا خوش قسمتی سے کالج
کے پروفیسر قاضی ضیاءالدین صاحب ایم اے مرحوم
جو نہایت شریف النفس اور صوفی آدمی تھے (حضرت
میروی علیہ الرحمۃ (حضرت خواجہ احمد صاحب خلیفہ
حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ) اور خاندان
چشتی علیہ الرحمۃ (حضرت خواجہ غلام نبی للّٰہی) سے باطنی
تعلقات رکھتے تھے اور دینیات کی سند دیوبند کی
رکھتے تھے گویا وہ ظاہری عالموں اور باطنی صوفیوں کی
درمیانی کڑی تھے۔ ان کے ایما سے ترجمۃ القرآن المجید
کے لیے مولانا حاجی احمد علی صاحب (شیرانوالہ دروازہ
لاہور) کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور چھ ماہ کے
عرصہ میں مجھے اتنی مہارت ہوگئی کہ بالتشدید مطالب
قرآنی ذہن میں آنے لگے۔

للہ الحمد حمدا کثیرا ص ۳

نیز فرماتے ہیں۔

مجھے اپنے زمانے کے بڑے بڑے علمائے کرام کی شاگردی
اور تلمذ کا فخر حاصل ہے اور بہت سے جناب علم سے
نیاز خاص رکھتا ہوں۔ میرے اساتذہ میں سے مولانا
عبداللہ ٹونکی مرحوم اور مولانا حافظ نذیر احمد مرحوم
جیسے منطقی اور ادیب اور فخر العلماء جناب مولانا
کفایت اللہ جیسے محدث بھی ہیں" ص ۵

آپ کے خلیفہ جناب حاجی فضل احمد صاحب مدیر "اسماعیل" لاہور
اپنے پیر و مرشد کی روش پر قائم ہیں۔

مولانا عبدالحق صاحب قاسمی کے رسالہ "اسوہ اکابر" سے یہی
واقعہ ذرا تفصیل سے ملتا ہے، ملاحظہ ہو۔

"مولانا عبدالحنان صاحب ہزاروی خطیب صدر
راولپنڈی نے مجھ (قاسمی) سے بیان فرمایا کہ ایک بار
حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ دیوبند
سے کشمیر جاتے ہوئے رونق افروز لاہور ہوئے (مولانا
عبدالحنان صاحب اس سفر میں حضرت شاہ صاحب کے
ہمراہ تھے) تو حضرت میاں صاحب شرقپوری کے
متوسلین میں سے ایک صاحب نے حضرت شاہ صاحب
کی خدمت میں حضرت میاں صاحبؒ کے شوق
ملاقات کا ذکر کیا تو شاہ صاحب نے سفر کشمیر سے
واپسی پر شرقپور تشریف لے جانے کا وعدہ فرمایا اور
جب آپ کشمیر سے واپس ہوکر لاہور تشریف لائے
تو انہی صاحب نے وعدہ کی یاد دہانی کرائی چنانچہ آپ
شرقپور تشریف لے گئے۔ اس سفر میں مولانا عبدالحنان
صاحب کو حضرت شاہ صاحبؒ کی ہمرکابی کا شرف
حاصل رہا۔ حضرت میاں صاحب نے حضرت شاہ
صاحب کے ساتھ انتہائی اکرام و احترام کا معاملہ فرمایا
بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کو چند روپے اور چند
کپڑے بھی بطور ہدیہ پیش کیے اور رخصت کے وقت
سواری پر سوار کرانے کے لیے باہر تک ساتھ
تشریف لائے۔"

مولانا مولوی عبدالحنان صاحب موصوف نے میرے مضمون کی
تائید کرتے ہوئے اس واقعہ کی مزید تفصیل یہی ارشاد فرمائی ہے۔

حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ
کی خدمت میں حضرت شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

کو جب گاڑی کا وقت قریب ہوا تو اس وقت میاں صاحب
مکان کی بالائی منزل پر تشریف فرما تھے۔ حضرت کے
خادم نے حضرت شاہ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت
میاں صاحب کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اوپر تشریف
لے جائیں تو بیٹھے ہوئے ملاقات کے استقبال و اکرام
کے لیے کھڑے نہیں ہوتے۔ آپ خود ان کے پاس
جاکر بیٹھ جاتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا
ویسا ہی کریں گے۔ جیسا میاں صاحب کا طریقہ ہے چنانچہ
حضرت میاں صاحب اطلاع ہونے پر تشریف لائے
اور حضرت شاہ صاحب کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے
حضرت شاہ صاحب سے مصافحہ کیا پھر چار پانچ منٹ
تک خاموش رہے۔ پھر فرمایا۔

"میں خداوند کریم کا شکر کس زبان سے ادا کروں جس نے
ایک مدت کی تمنا کو آج پورا کر دیا۔"

اس کے بعد حضرت میاں صاحب نے شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب
دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اکابر علماء دیوبند کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"ان حضرات کو اب کہاں ڈھونڈیں۔"

آپ نے حضرت شیخ الہند کے ایک خط کا بھی ذکر کیا اور فرمایا

"میرے پاس موجود و محفوظ ہے۔"

"حضرت میاں صاحب نے دو کپڑے (کرتہ، تہبند، شاید
پگڑی بھی، لیکن پورا یاد نہیں) اور پانچ روپے کرتے کی جیب میں ڈال کر
حضرت شاہ صاحب کو ہدیۃً پیش کیے اور ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر
حضرت شاہ صاحب کو رخصت کرنے کے لیے بنفس نفیس موٹر کے
اڈہ تک تشریف لائے۔" (دارالعلوم ماہ جون ۱۹۶۲ء ص...)

پر عمل برتاؤ تھا جو حضرت میاں صاحب نے حضرت شاہ
صاحب کے ساتھ فرمایا۔

حضرت مولانا مشتاق احمد چشتی انبہٹوی

خلیفہ حضرت حافظ محمد صابر علی امبہٹوی سلسلہ عالیہ چشتیہ
صابریہ کے شیخ طریقت، تذکرہ خواجگان چشتیہ صابریہ المعروف بہ "انوار العاشقین"
شیخ الاسلام حضرت مولانا انوار اللہ خاں صاحب چشتی حیدرآبادی استاذ
نظام عثمان علی خان دکن کے ارشاد پر تصنیف کیا۔ جو ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء
میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔

مؤلف "انوار العاشقین" نے حضرت قطب الاقطاب مرشد العرب
والعجم اعلیٰحضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ کا زمانہ بھی پایا ہے۔
حضرت حاجی صاحب اور ان کے مسترشدین سے انہیں بہت تعلق خاطر
تھا۔ قطب الارشاد حضرت گنگوہیؒ اور حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ اور
دیگر بزرگان دیوبند سے انہیں والہانہ عقیدت و محبت تھی ذیل کا اقتباس
انہی جذبات کا آئینہ دار ہے۔

"حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء بیشمار
ہر دیار و امصار میں ہیں متاخرین چشتیہ صابریہ میں باوجود
قیام مکہ معظمہ کے کہ وہاں حاضر ہو کر شہرت کا ہونا
نادر ہے، حضرت ممدوح کے برابر مشائخ میں سے
کسی کو اس درجہ شہرت نہیں ہوئی۔ منجملہ آپ کے خلفاء
کے حضرت بقیۃ السلف حجۃ الخلف مولانا رشید احمد
صاحب گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب
نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی
مسلم علماء اور صلحاء گزرے ہیں۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے

خلفا میں آجکل بزرگ اور عالم باعمل مانے جاتے ہیں جیسے
حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی صدر مدرس مدرسہ عالیہ
دیوبند اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبہٹوی صدر
مدرس مدرسہ عالیہ دیوبند۔ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائپوری
حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبہٹوی اور حضرت
مولانا رشید احمد صاحب کے صاحبزادے حضرت مولانا
حکیم مسعود احمد صاحب خاص گنگوہ میں مولانا کے
جانشین اور اوقات کے پابند ہیں۔ راقم الحروف ان سے
مل کر خوش ہوتا ہے اور جس طرح حضرت مولانا رشید احمد
صاحب عاجز کے ساتھ نوازش و کرم سے پیش آتے
تھے اسی طرح حکیم صاحب کمال شفقت و محبت سے پیش آتے
ہیں یہ حضرات تو مولانا کے خلفا رہیں۔ مگر جناب مولوی
شاہ ظہور احمد انبہٹوی کو جو نسبت خاص روح مقدس
حضرت مولانا سے ملی جو راقم الحروف پاتا ہے وہ فنافی الشیخ
کے درجہ سے کم نہیں۔ لہذا یہ بدرجہ اولیٰ خلافت کے
لائق ہیں بارک اللہ فی عمرہم وصلاحہم۔ حاجی والد حسن
صاحب بھی حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے
عمدہ خلفا میں ہیں اور مشائخانہ طریقہ اور لباس صوفیانہ
رکھتے ہیں حضرت مکرمی مولانا اشرف علی صاحب
تھانوی سے عالم و جاہل دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔
ذات ستودہ صفات، مضامین عالیہ نہایت آسان عبارت
میں بیان فرماتے ہیں جس سے قادر الکلام ہیں۔ زبردست
مصنف ہیں صدہا کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے اپنی تمام عمر جہاں
تک ہمیں معلوم ہے بوجہ کسر نفسی اور کمال تواضع کے

کسی کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا تھا۔ بیعت بھی حضرت
قبلہ عالم حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے نیابۃً
کرتے تھے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عشق
اور محبت میں فنا تھے کمالات امدادیہ میں نقل کیا ہے کہ
حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ
اپنے بندوں کو ایک لسان عطا فرماتا ہے جیسا کہ شمس تبریز کے
واسطے مولانا روم کو لسان بنایا تھا اور مجھ کو مولانا محمد قاسم
لسان عطا ہوتے ہیں اور جو میرے قلب میں آتا ہے مولوی
صاحب اس کو بیان کر دیتے ہیں۔ میں بعض اصطلاحات
نہ جاننے کی وجہ سے اس کو بیان نہیں کر سکتا عاجز راقم الحروف
عرض کرتا ہے کہ زمانہ طالب علمی میں یہ عاجز ایک دفعہ
حضرت مخدوم العالمین خواجہ سید مخدوم علاؤالدین علی احمد
صابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت سے خواب میں مشرف
ہوا تو اس وقت حضور مخدوم مولانا محمد قاسم نانوتوی کی
صورت میں نظر آئے اور حضرت عارف باللہ شیخ
توکل شاہ صاحب حیدری دانباوی، رحمۃ اللہ علیہ نے
عاجز سے فرمایا تھا کہ میں نے ایک دفعہ خواب دیکھا
کہ حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جا
رہے ہیں مولانا محمد قاسم تو جہاں پہلے مبارک
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑتا ہے وہاں دیکھ کر پاؤں
رکھتے ہیں اور میں بے اختیار بھاگا ہوں کہ حضور کے
پاس پہنچوں۔ چنانچہ میں آگے ہو گیا"
انوار العاشقین ص ۸۲ تا ۸۸ شائع کردہ مجلس اشاعت العلوم
حیدرآباد دکن بار اول مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد، دکن

جناب پیر کرم شاہ صاحب الازہری سجادہ نشین بھیرہ ایڈیٹر "ضیائے حرم"

خانقاہ محمدیہ سیال شریف کے

مستفیض ہیں۔ عالم و فاضل ہیں

مکتوب بنام مولانا کمال الدین رد قادیانیت کے اس تحریر سے چند

اقتباس ملاحظہ ہوں:

"حضرت قاسم العلومؒ کی تصنیف لطیف مسمّٰی بہ تحذیر الناس کو متعدد بار بغور و تامل سے پڑھا اور ہر بار نیا لطف و سرور حاصل ہوا۔"

"جہاں تک فکر انسانی کا تعلق ہے حضرت مولانا قاسمؒ کی یہ نادر تحقیق کئی شپرہ چشموں کے لیے سرمہ بصیرت کا کام دے سکتی ہے۔ یہ فرزندان ساحلِ مصطفوی از اُن کے لیے بے قرار دلوں اور بے تاب نگاہوں کی وارفتگیوں میں اضافہ کا بہترین سامان اس (تحذیر الناس) میں موجود ہے۔"

"مولانا نے خاتم النبیین کی آیت کی تحقیق فرماتے ہوئے تصریح فرمائی ہیں کہ ختم نبوت کے دو مفہوم ہیں، ایک وہ ہے جہاں تک عوام کی عقل و فکر کی رسائی ہے اور دوسرا وہ ہے جسے خواص ہی خداداد نور فراست سے سمجھ سکتے ہیں۔"

"ختم نبوت کا یہ ہمہ گیر مفہوم جو سبقاً و فضلاً اور ابتداءً اور انتہاءً کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اگر امت مرزائیہ وغیرہ کی سطح سے بلند تر ہو تو اس میں کسی کا کیا قصور۔"

محمد کرم شاہ از بھیرہ ضلع سرگودھا "ڈھول کی آواز" صفحہ ۱۳۸

حضرت مولانا غلام محمد گھوٹوی رحمۃ اللہ علیہ

خلیفہ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی قدس سرہ و سابق شیخ الجامعہ عباسیہ بہاولپور مؤلف "چراغ سنت" نے آپ کا حسب ذیل بیان نقل کیا ہے۔

"مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا زمانہ میں نے نہیں پایا۔ مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری اور مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کی زیارت ایک دفعہ کی ہے۔ مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی ایک دفعہ زیارت کی ہے اور ایک دفعہ وعظ بھی سنا ہے۔ اس سے زیادہ ان حضرات کے ساتھ مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا۔ مگر میرا اعتقاد ان بزرگوں کے متعلق یہ ہے کہ یہ سب حضرات علماء ربانیین اور اولیاء امت محمدیہ سے تھے۔ احقر کو بعض مسائل میں ان سے اختلاف بھی ہے۔ مگر میرا اعتقاد یہی ہے اور اس اعتقاد کے اختیار کرنے کا سبب ان کی تصنیفات کا مطالعہ اور استفادہ، اور قبول عام ہے بالخصوص مولانا اشرف علی تھانوی دامت برکاتہم کی خدمات دینیہ پر نظر کر کے شبہ ہوتا ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہیں۔"

فقط

۱۴ جمادی الثانیہ ۱۳۳۵ھ

* چراغ سنت مولفہ مولانا سید فردوس علی شاہ صاحب صفحہ ۲

حضرت مولانا مفتی محمد مظہر اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ دہلوی (م ۱۳۸۶ھ / ۱۹۶۶ء)

مفتی و امام مسجد فتحپوری دہلی۔

آپ حضرت مولانا مفتی محمد مسعودؒ خلیفہ ارشد قطب ربانی حضرت سید امام علی شاہ صاحب مکان شریف قدس سرہ (م ۱۲۸۲ھ) کے پوتے تھے۔ مولانا محمد مسعودؒ نے حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلویؒ کے تلامذہ حضرت نواب قطب الدینؒ (م ۱۲۸۹ھ) اور حضرت مولانا سید نذیر حسین محدث دہلویؒ (م ۱۳۲۰ھ) سے کتب حدیث شریف پڑھی تھیں۔

مولفِ "تذکرہ مظہر مسعود" رقمطراز ہے۔

"تعلیم و تدریس میں اعلیٰ حضرت (مولانا محمد مسعودؒ) کا مسلک مسلکِ ولی اللّٰہی تھا کیوں کہ اسی خاندان سے فیض پایا تھا۔"

آگے چل کر مولف کی رائے یہ ہے کہ "شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلکِ معتدل کی جن علماء نے پیروی کی ہے، وہ ہمیشہ اختلافات سے بالاتر رہے ہیں۔" ص ۴۲

حضرت مولانا مفتی مظہر اللہ صاحبؒ کو بھی یہی روش پسند تھی۔ "تذکرہ مظہر مسعود" آپ کے صاحبزادے پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے آپ کے حالات میں لکھا ہے۔ ان کا بیان ہے۔

"اہل سنت والجماعت میں مختلف جماعتیں موجود ہیں مگر حضرت نے خود کو کبھی کسی جماعت سے وابستہ نہیں فرمایا۔ حضرت کا مسلک تائیدِ حق تھا، خواہ وہ کسی جماعت میں ہو، یہی وہ معتدل راستہ تھا جس کی وجہ سے ہر مسلک کے لوگ، کیا خواص کیا عوام، حضرت کی بے انتہا قدر و منزلت کرتے تھے۔" ص ۲۳۲

"جس کسی سے حضرت اختلافِ رائے رکھتے وہ اخلاص کی بنیاد پر ہوتا۔ اس لیے ہمیشہ ذاتیات سے بالاتر ہوتا۔ یگانگت و محبت کو ہر حالت میں قائم رکھتے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آیا ہے۔ حضرت سے شاہی دہلی کے مشہور عالم رئیس مفتی محمد کفایت اللہ مرحوم و حضرت عقیدت قدس سرہ کے درمیان بعض مسائل پر اختلافِ رائے رہا ہے، مگر یہ اختلاف کبھی بغض و عناد نہیں بنا۔ جن کو اللہ وسعتِ علم سے نوازتا ہے، ان کو وسعتِ قلبی بھی عطا فرماتا ہے۔ یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ آپس میں ملاقاتیں بھی ہوتیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت قبلہ مفتی صاحب کے ہاں تشریف لے گئے۔ دستک دی، خادم آیا، اندر اطلاع ہوئی مگر مفتی صاحب ذرا دیر سے تشریف لائے۔

ع مری تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

حضرت قبلہ سے مصافحہ ہوا۔ اندر تشریف لے گئے۔ حضرت نے دیکھا کہ کچھ بان کے ٹکڑے صحن میں بکھرے پڑے ہیں۔ سمجھ گئے کہ مفتی صاحب چارپائی بُن رہے تھے۔ چنانچہ حضرت نے دریافت فرمایا: "کیا کر رہے تھے؟" مفتی صاحب نے فرمایا کہ "کچھ نہیں" ——— پھر دوبارہ حضرت نے دریافت فرمایا تو مفتی صاحب نے حقیقتِ حال بیان فرمائی کہ وہ چارپائی بُن رہے تھے۔ حضرت نے فرمایا: "یہ تو میں بھی بُن لیتا ہوں، لائیے ہم دونوں بُنتے ہیں۔" چنانچہ چارپائی نکالی گئی اور ان دونوں جلیل القدر علماء (رحمہما اللہ تعالیٰ) نے چارپائی بُنی۔ چارپائی کی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔" تذکرہ مظہر مسعود ص ۲۳۵

"معتبر ذرائع سے یہاں تک معلوم ہوا ہے کہ جب مفتی صاحبؒ کا وصال ہوا تو انہوں نے وصیت فرمائی تھی کہ نمازِ جنازہ حضرت امام صاحب (حضرت قبلہ) پڑھائیں۔ اس سے کمال عقیدت و محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ محبتیں ان حضرات کے لیے سبق آموز ہیں جو خواہ مخواہ دل میں رنجشوں کو پرورش دے کر دل کو ویران کرتے ہیں۔" ص ۲۳۹

"آپ نے میانہ روی کی روش کو اپنایا، جس کی بنا پر آپ کو صلحائے

تلامذہ اور شہر کے معززین و عوام نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔ انتقال پرملال کی خبر ملتے ہی شام کو بغرض تعزیت ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند حضرت مولانا سید محمد میاں، حضرت مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا وحیدالدین قاسمی صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند اور جنرل منیجر اخبار الجمعیۃ دہلی مرحوم کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے اور دوپہر تک پس ماندگان کے پاس بیٹھے رہے۔ تذکرہ مظہر مسعود ص ۳۲۵

حضرت مفتی مظہر اللہ صاحب رحمۃ اللہ کی بیعت حضرت سید صادق علی شاہ صاحب فرزند و جانشین قطب ربانی مکان شریف قدس سرہا سے تھی۔ لیکن خلافت حضرت مولانا رکن الدین صاحب الوری رحمۃ اللہ علیہ سے پائی۔

حضرت مولانا محمد ذاکر صاحب مدظلہ بانی جامعہ محمدی شریف

مؤلف تحریک جامعہ محمدی رقمطراز ہیں:

• مولانا محمد ذاکر صاحب نے ابتدائی تعلیم ترانہ بانی قصبے میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے جہاں سے آپ نے حدیث، تفسیر اور فقہ کی تعلیم کو مکمل کیا۔ آپ حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگردوں میں سے ہیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے تحریک خلافت اور تحریک آزادی کے مجاہد اعظم ضیاء العارفین حضرت خواجہ محمد ضیاء الملت والدین سیالوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دست حق پرست پر بیعت کی ......

...... آپ نے اپنے شیخ طریقت کے ساتھ تحریک خلافت میں بھی حصہ لیا۔ غیر ملکی اقتدار کی کھل کر مخالفت کی جس کے نتیجے میں مولانا موصوف کو بار بار قید و بند کی صعوبتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔"

• "تحریک جامعہ محمدی" ص ۹۔ شائع کردہ شعبہ تالیف و تصنیف جامعہ محمدی شریف ضلع جھنگ

• جامعہ محمدی شریف کے بانیوں نے امام حضرت مجدد الف ثانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بتلائے ہوئے اسی نسخہ شافی یعنی الجمع بین المتضادات کو اصل الاصول قرار دیا ہے اور اس اصل الاصول کو تحریک کے تین اساسی عناصر

(ا) جدید و قدیم علوم کا امتزاج

(ب) مسلک اعتدال اور

(ج) اتحاد عالم اسلام میں پیوست کرنے کی کوشش کی ہے۔"

تحریک جامعہ محمدی ص ۴۵

حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی (م ۱۳۱۳ھ)

آپ حضرت شاہ محمد آفاق مجددی دہلوی کے خلیفہ اجل اور ہندوستان کے مشائخ کبار میں سے تھے۔

حضرت گنج مراد آبادی کے خلیفہ مولانا شاہ تجمل حسین بہاری اپنی تالیف "کمالات رحمانی" میں اپنی بیعت سے متعلق رقمطراز ہیں:

"اب بیعت کا جو عزم ہوا کہ مجھ کو (مولانا شاہ تجمل حسین بہاری کو) عقیدت اور غلامی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ سے تھی۔ آپ کو (حضرت گنج مراد آبادی کو) کشف سے معلوم ہوا۔ آپ نے حضرت مولانا کی تعریف کی کہ اس کم سنی میں ان کو ولایت ہوگئی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کی بھی تعریف کی کہ ان کے قلب میں ایک نور باطنی ہے جس کو ولایت کہتے ہیں۔ حضرت مولانا (محمد علی) مونگیری نے بھی اس روایت کی تصدیق کی ہے:"

(طبع سوم ص۱۰۱ اسلامیہ آزاد پریس پٹنہ۔ شائع کردہ خانقاہ رحمانی مونگیر)

حضرت خواجہ سید غلام محی الدین صاحب گولڑوی

آپ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی قدس سرہما کے نور نظر تھے۔ مولانا کامل الدین اپنی تالیف "ڈھول کی آواز" میں رقمطراز ہیں کہ ایک مرتبہ تحذیر الناس کی عبارت پر بعض معترضین سے بحث ہوئی تو انھوں نے کہا کہ سیال شریف اور گولڑہ شریف سے فتویٰ لاؤ تو ہم ان جائیں گے۔ مولانا کامل الدین چلے سیال شریف اور پھر گولڑہ شریف حاضر ہوئے ہر دو مقامات سے سنہری تحریریں پائیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

"احقر گولڑہ شریف پہنچا۔ صوفی غلام نبی کی وساطت سے حضرت مولانا غلام محی الدین صاحب سجادہ نشین سے ملاقات ہوئی۔ سب واقعہ بیان کیا گیا۔ انھوں نے مولانا غلام محمد صاحب گھوٹوی شیخ الحدیث جامعہ عباسیہ بہاولپور خلیفہ خاص حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو (جو اتفاقیہ وہاں آئے ہوئے تھے) حکم دیا کہ آپ میری طرف سے ان کو لکھ دیں۔ انھوں نے الفاظ ذیل لکھے جو سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل ہیں۔

قال "میرا مذہب یہ ہے کہ علماء دیوبند مسلمان ہیں اور دین کا کام کر رہے ہیں جو شخص ان کے حق میں کچھ بکتا ہے اس کا ایمان خطرے میں ہے۔ میرے قبلہ حضرت شیخ پیر صاحب (حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی) کا بھی یہی مذہب تھا۔" ختم۔

(ڈھول کی آواز ص۹۹۔ مولفہ مولانا کامل الدین آزکالوی مطبوعہ شائی پریس سرگودھا)

حضرت خواجہ قمر الدین صاحب سجادہ نشین سیال شریف مدظلہ

قطب العارفین حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی قدس سرہ کے پڑپوتے اور حضرت خواجہ ضیاء الملۃ والدین کے فرزند و جانشین ہیں۔ حضرت سیالوی مدظلہ کی ایک سنہری تحریر جو انھوں نے مولانا کامل الدین آزکالوی کو عنایت فرمائی، ملاحظہ ہو:

"میں نے تحذیر الناس کو دیکھا، میں مولانا محمد قاسم صاحب کو اعلیٰ درجہ کا مسلمان سمجھتا ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ میری حدیث کی سند میں ان کا نام موجود ہے۔ خاتم النبیین کے معنی بیان کرتے ہوئے جہاں مولانا کا دماغ پہنچا ہے وہاں تک معترضین کی سمجھ نہیں گئی۔ قضیہ فرضیہ کو قضیہ

واقعہ حقیقیہ سمجھ لیا گیا ہے۔ (فقیر قمر الدین سیال شریف)

(ذکر حول کی آواز مؤلفہ مولانا کمال الدین ترکاری ص۶۶ مطبوعہ شاکی پریس سرگودھا)

حضرت مولانا خواجہ سدید الدین صاحب (حفظہ اللہ) چشتی نظامی [illegible] ضلع سرگودھا

آپ کے دادا بزرگوار حضرت خواجہ محمد معظم الدین رحمۃ اللہ شمس العارفین حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی قدس سرہ کے خلیفہ اجل تھے۔ آپ نے قصبہ پپلاں ضلع میانوالی کے دیوبندی اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ آپ عالم و فاضل ہیں اور مسلکِ اعتدال کے حامل۔ آپ کے اُستاذ محترم خاتم المحدثین حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ کے ہمدرس اور شیخ العالم حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندی رحمۃ اللہ کے باکمال شاگرد تھے۔ راقم سطور نے ذاتی طور پر آپ کو وسیع المشرب پایا ہے۔ لاہور میں بارہا آپ کی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ آپ کے صاحبزادہ جناب غلام نظام الدین صاحب میرے گہرے دوست ہیں۔ وہ جب لاہور آتے ہیں میرے ہاں بھی تشریف لاتے ہیں۔ فقیر بھی دو مرتبہ مرولہ شریف میں ایک دو شب اُن کی مہمانی کا شرف حاصل کر چکا ہے۔ چند سال پیشتر ۶ جمادی الثانی ۱۳۸۸ھ (ستمبر ۱۹۶۸ء) کو جب حاضری ہوئی تو حضرت خواجہ قمر الدین صاحب سیالوی مدظلہٗ بھی ایک خاص جماعت کے ساتھ وہاں تشریف لائے ہوئے تھے جن میں علماء بھی تھے۔ صبح ناشتہ کے بعد جو مجلس تھی اس کی یاد اب تک تازہ ہے اُس میں اکابر علماء دیوبند کا تذکرہ بھی ہوا۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کی تحذیر الناس کی عبارت کے بارے میں علماء میں سے کسی نے سوال کیا۔ حضرت خواجہ قمر الدین صاحب نے حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی تائید کے ساتھ فرمایا کہ معترضین ان کی عبارت کو سمجھے نہیں۔ میں علماء دیوبند کی تکفیر سے بری ہوں۔ پھر شیخ الاسلام حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہوئے۔ "انوار الایضاح" کا پورا واقعہ بیان فرمایا کہ کس طرح حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ مصر تشریف لے گئے اور ایک کتب خانے میں "انوار الایضاح" کا قلمی نسخہ دیکھا اور پھر عملی جدوجہد سے آکر اپنے حافظے سے اس کو من و عن نقل کر کے شائع کرا دیا۔ حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا:

"مولانا انور شاہ صاحب کا حافظہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا"

ایک معتبر عالم مجلس میں آئے تو خواجہ صاحب نے اُن سے پوچھا آپ نے حدیث کس سے پڑھی تھی۔ انھوں نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہ کا نام لیا۔ آپ نے دریافت فرمایا "مولانا محمود حسن صاحب کو بھی دیکھا تھا؟" پھر خود ہی فرمایا "مولانا صاحب بڑے محدث تھے" حضرت خواجہ قمر الدین صاحب مدظلہٗ نے اپنے استاد گرامی حضرت علامہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر بھی نہایت والہانہ انداز میں کیا۔ تبرکات کے حق میں ان کے ایک رسالے کا بھی ذکر کیا (حضرت علامہ اجمیریؒ کے اکابر دیوبند سے گہرے روابط تھے۔ وہ جمعیۃ علماء ہند کے صدر بھی رہے) اپنے استاذ محترم کی علمی شان بیان کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے فرمایا: "مولانا احمد رضا خان صاحب کا عشقِ رسولؐ بے شک ہے مگر بلحاظِ علم و فضل انھیں اپنے استاذ علامہ معین الدین اجمیریؒ کے برابر نہیں سمجھتا"

اس مجلس میں اور بھی باتیں ہوئیں، کیونکہ ہمارا عنوان "حکایت مہر و وفا" ہے اس لیے انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔

حضرت پیر احمد شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) چورہ شریف

"اُسوۂ اکابر" میں ہے:

"مشہور ہندوستان کے اور کئی ایسے مشائخ طریقت ماضی قریب میں گزرے ہیں جن کے عمل سے ثابت ہے کہ وہ دیوبند کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے حضرات کے ساتھ حسنِ ظن رکھتے تھے۔ ان میں سے

بعض نے خود علمائے دیوبند کی شاگردی اختیار فرمائی جیسے حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب (گولڑہ شریف ضلع کیمبل پور) کہ وہ صاحب جانشین حضرت خواجہ شمس الدین محمد صاحب چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں دیوبند کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئے ... علمائے دیوبند کے علم و تقویٰ کی مدح فرماتے تھے ... قاسمی نے خود حضرت پیر صاحب کی زبانی کئی دفعہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی اور حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری کی شان میں تعریفی الفاظ سنے ہیں۔ (...)

در مدح شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی

زمینِ فخر و سمِ دیو ایجادِ کمند آمد — نگاہِ حضرتِ محمود اینک دیوبند آمد

قیامت را بقامت نسبتے دادم غلط کردم — قیامتہا بلا گردانِ آں بالا بلند آمد

ادب نا آشنا قدرِ سخنہائش چہ میداند — کہ در درگاہِ حضرت ہر کہ آمد ارجمند آمد

چہ خوانم از ثنائش چہ گویم از تماشائش — ثنا خود فروش آمد تماشا خود پسند آمد

بہ پیشِ لیلئے لیلیٰ مہر و مہ را بری سنجد — نگاہِ حضرتِ مجنوں چہ کامل پسند آمد

زانفاسِ گرامی خاکِ پنجاب آبرو دارد
گرامی از مریدانش غلامی[1] سربلند آمد

[1] مولوی عزیز الدین احمد غلامی تلمیذ خاص حضرت مصنف ہیں۔

مولانا دیدار علی شاہ صاحبؒ الوری (م ۱۳۵۴ھ)

مسجد وزیر خان لاہور کے خطیب و مفتی مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری اور مولانا ابوالبرکات سید احمد قادری لاہوری کے والد تھے۔

مولانا دیدار علی شاہ صاحب کے ایک رسالہ "تحقیق المسائل" کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اور مولانا و استاذنا رئیس المحدثین استاذ مولانا محمد قاسم صاحب مغفور و حضرت مولانا احمد علی صاحب مرحوم مغفور محدث سہارنپوری کے فتویٰ اجوبہ سوالات خمسہ کی نقل۔ زمانہ طالب علمی میں کی ہوئی احقر کے پاس موجود ہے۔"

رسالہ "تحقیق المسائل" صفحہ ۳ سطر ۳، ۴، ۵
مطبوعہ لاہور پرنٹنگ پریس لوہاری منڈی ۱۹۰۰ء

حضرت پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑویؒ

پنجاب میں سلسلہ عالیہ چشتیہ کے مشہور پیر تھے۔ قطب زمانہ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی قدس سرہٗ کے خلیفہ اکمل تھے

"اسوۂ اکابر" کے مؤلف کا بیان ہے:

"حضرت مولانا محمد حسن صاحب کوٹلی والے فرماتے ہیں کہ میں حضرت پیر صاحب گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھا۔ ایک شخص آیا اور اس نے دریافت کیا: "آپ مولوی قاسم صاحب کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں؟" حضرت پیر صاحبؒ نے جواباً فرمایا:

"تم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق پوچھتے ہو؟ سائل نے عرض کیا: جی ہاں انہی کے متعلق۔ حضرت پیر صاحب نے فرمایا:

"وہ حضرت حق کی صفت علم کے مظہر اتم تھے۔"

اسوۂ اکابر ص مؤلفہ مولانا محمد بہاء الحق قاسمی خطیب ماڈل ٹاؤن لاہور۔ مطبوعہ آفتاب عالم پریس لاہور [illegible]

حضرت پیر صاحب گولڑویؒ نے ایک فتویٰ متعلقہ تکرار جماعت کی تصدیق و تائید میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا ایک فتویٰ اپنی کتاب "فتوحات صمدیہ" (مطبوعہ ملتان بار سوم ص) میں درج کیا اور اس پر جلی قلم سے یہ عنوان تحریر فرمایا:

"نقل فتویٰ جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی عم فیضہٗ۔"

حضرت گنگوہیؒ کے وصال کے بعد جب یہ فتویٰ خانقاہ عالیہ گولڑہ شریف کی طرف سے شائع کیا گیا تو حضرت کا نام یوں درج کیا:

"حضرت مولانا مولوی رشید احمد صاحب گنگوہیؒ"

(اسوۂ اکابر ص)

جناب حضرت خواجہ شہید اللہ صاحب فریدی مدظلہٗ

آپ نو مسلم انگریز ہیں۔ حضرت سید ذوقی شاہ صاحبؒ (خلیفہ حضرت مولانا وارث حسن صاحب لکھنویؒ) کے خلیفہ ہیں۔ آپ نے "تربیۃ العشاق" کے نام سے اپنے پیر و مرشد کے ملفوظات جمع کیے ہیں۔ ص ۱۱ پر ایک ملفوظ نقل فرماتے ہیں، عنوان یہ ہے:

"حضرت اقدسؒ کو حضرت حاجی صاحبؒ اور مولانا گنگوہیؒ سے خلافت" ملفوظ ملاحظہ ہو:

"حسب ذیل خواب حضرت اقدسؒ نے ۳۰ دسمبر ۱۹۴۰ء (مطابق ذوالقعدہ ۱۳۵۹ھ) میں بیان فرمایا۔

دارالعلوم دیوبند کا مشورہ دیا۔ واپس آکر میں نے حضرت والد صاحب سے حضرت الاستاذ کا فیصلہ عرض کر دیا۔ چنانچہ دیوبند کے لیے تیاری شروع ہو گئی اس زمانہ میں مرشدی و مولائی حضرت اقدس ثانی صاحب علی پوریؒ ابھی حیات تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کی۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند جانے پر بشاشت کا اظہار فرمایا اور دعوات صالحہ سے مجھے رخصت کیا چنانچہ میں نے دارالعلوم دیوبند میں ڈیڑھ دو سال رہ کر دورۂ حدیث شریف کی سعادت حاصل کی۔

مولانا سید محمد اعظم فرماتے ہیں کہ میرے پیر و مرشد حضرت ثانی صاحب علی پوریؒ بزرگان دیوبند کو کلمات خیر سے یاد کیا کرتے تھے اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تو وہ بہت تعریف فرماتے تھے۔

مولانا محمد اعظم حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ اس وقت اسی سال کی عمر میں ہیں۔ آپ کے والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ علماء دیوبند حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک حقیقت پر عامل ہیں۔ عارف کامل حضرت سید جماعت علی شاہ صاحب ثانی علی پوری قدس سرہٗ قطب ربانی بابا فقیر محمد چوراہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اعظم تھے۔ آپ کی روش صوفیہ سلف کا نمونہ تھی۔ حضرت مولانا حافظ محمد شفیع صاحب سنکھتروی رحمۃ اللہ علیہ بھی آپ کے خلفاء میں سے تھے جو بزرگان دیوبند سے نہایت درجہ عقیدت رکھتے تھے۔

حضرت صاحبزادہ سید محمد حسین شاہ صاحب علی پوریؒ

خلف الرشید حضرت پیر حافظ سید جماعت علی شاہ صاحب علی پوریؒ (م ۱۴۱۰ھ) والد ماجد نے آپ کو مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ آپ وہاں سے فارغ التحصیل ہوئے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہم فاضلین کی دستار بندی اس سال حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ کے دست مبارک سے ہوئی تھی۔ آپ نے علی پور میں مدرسہ قائم کیا ہوا تھا طالب علموں کو خود بھی کتابیں پڑھاتے تھے اور مدرسہ شریف کے طالب علموں کو دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور پہنچنے کی تلقین فرماتے تھے۔

قطب عالم حضرت شاہ عبدالرحیم رائپوری قدس سرہٗ (م ۱۹۱۹ء)

ابتداء میں قطب العارفین حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب سہارنپوری قدس سرہٗ خلیفہ اعظم رئیس الکاملین فخر الاسلام حضرت اخوند عبدالغفور صاحب سوات نور اللہ مرقدہ (م ۱۲۹۵ھ) سے مرید تھے۔ ایک زمانہ ان کی خدمت میں رہنے کے بعد خلافت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت پیر و مرشد کے ارشاد پر رائپور میں جو حضرت رائے پوری کا ننھیال گاؤں تھا۔ آپ نے اقامت اختیار کی۔ قصبہ رائے پور سے باہر ذرا فاصلہ پر جنوب مشرق کی جانب ایک مسجد و خانقاہ کی بنا ڈالی۔ جو بعد میں خانقاہ گلزار رحیمی کے نام سے موسوم ہوئی ہے ۵ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ کو آپ کے شیخ عالیمقام نے وفات پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ شیخ بزرگوار کی وفات کے بعد آپ کبھی کبھی کلیر شریف بھی جایا کرتے تھے اکثر تنہا سفر فرماتے کسی کو ساتھ نہ رکھتے بعض اوقات کئی شب و روز وہاں قیام بھی فرماتے ایک مرتبہ وہاں حاضر ہوئے تو عجیب واقعہ پیش آیا۔ جس نے آپ کی زندگی میں ایک خاص انقلاب پیدا کیا جسے مرشدنا و مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری (م ۱۳۸۲ھ) قدس سرہٗ بارہا اپنی مجالس میں بیان فرماتے رہتے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوریؒ ایک شب کو تاجدار اولیاء حضرت خواجہ علاؤ الدین علی احمد صابر کلیری قدس سرہٗ کے مزار مبارک کے قریب ہی مسجد سے ملحق صحن میں محو خواب تھے۔ نصف شب کو آپ نے بارش محسوس کی۔ آپ فوراً اندر سایہ میں چلے گئے پھر غور کیا تو معلوم ہوا کہ بارش نہ تھی دوبارہ آپ باہر آکر آرام فرما ہوئے۔ کچھ وقفہ بعد پھر یہی کیفیت ہوئی۔ اب آپ کو یقین ہو گیا کہ بارش انوار ہے۔ آپ اٹھے وضو کیا اور نوافل میں مشغول ہو گئے اچانک آپ نے آواز سنی۔ "عبدالرحیم ..... عبدالرحیم" آپ نے خیال کیا کہ مجھ کو میرا استاد

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے تربیتوں میں سے تھے۔

آپ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی تحریک آزادی کے ممتاز مجاہدین میں سے تھے۔

آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا عبدالباری صاحب کو اجازت و خلافت شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری سے ہے۔

حضرت مولانا تاج محمود امروٹی قدس سرہٗ

آپ حضرت خواجہ محمد صدیق صاحب بھرچونڈی شریف کے خلفائے عظام میں سے تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی تحریک آزادی کے سرگرم مجاہد تھے۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے پیر بھائی اور مربی تھے۔ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ لاہوری قدس سرہٗ آپ ہی کے خلیفۂ اعظم تھے۔

آپ کے صاحبزادے سید محمد شاہ صاحب آج کل جمعیۃ علماء اسلام سندھ کے امیر ہیں۔

حضرت حاجی فضل واحد صاحب ترنگزئی قدس سرہٗ

بیک واسطہ غازی اسلام حضرت اخوند عبدالغفور صاحب سوات قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک آزادی کے سرگرم مجاہد تھے۔ انگریز کے خلاف برسرپیکار رہے۔

- "دارالعلوم دیوبند کے اساسی اصول ہشتگانہ الہامی ہیں" (محمد علی جوہرؒ)
- "ہے دلِ روشن مثالِ دیوبند" (اکبر الٰہ آبادی)
- "گنجینۂ فقر را کلید ست رشید" (گرامی)
- "محمود رسید در مقامِ محمود" (گرامی)

- "کل رائے تجلّی ست مدعئے انور شاہ" (اقبالؒ)
- "میں مثنوی مولانا روم کی تفہیم کے سلسلے میں مولانا اشرف علی تھانوی کا مقلد ہوں" (اقبالؒ)
- "میں یقین دلاتا ہوں کہ مولانا (سید حسین احمد مدنی) کی حمیت دینی کے احترام میں کسی عقیدتمند سے پیچھے نہیں ہوں" (اقبالؒ)
- "مقدمۂ کراچی میں بر سرِ عدالت مولانا محمد علی جوہرؒ نے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے قدم چوم لیے تھے"
- "شیخ اکمل آں بخاری مرد راہ، حضرت سید محمد انور شاہ" (گرامی)
- "اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ انور شاہ صاحبؒ کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے" (اقبالؒ)
- "خدا کی قسم میں نے انور شاہ جیسا آدمی ہرگز نہیں دیکھا" (علامہ رشید رضا مصری)
- اس میں قائل ہوں کہ انور شاہ کو محمود الحسنؒ سب کے دل سے قدردان اور سب کی نظر سے بلند (ظفر علی خانؒ)

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

قابلِ مطالعہ کتابیں

مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ ۳۲۰-اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مدرسہ عربیہ اسلامیہ رجسٹرڈ بورے والا ضلع ملتان کے مختصر کوائف

یہ مدرسہ [illegible] میں قطب العالم حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری کے فرمان اور ترغیب دینے پر قائم ہوا۔ پھر [illegible] میں آپ نے اور آپ کے مرید حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے موجودہ عمارت کی بنیاد رکھی۔ یہ شاندار عمارت اب دو منزل اور ایک مسجد پر مشتمل ہے۔

مدرسہ ہذا کے مندرجہ ذیل شعبوں میں تعلیم کا اہتمام کیا گیا ہے:-

درس نظامی، درجہ عربی زنانہ، درجہ حفظ مردانہ، درجہ حفظ زنانہ، درجہ تجوید۔

۱۔ **درس نظامی:** کا نصاب وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے مطابق ہے جو جدید علوم اور تقاضوں پر مشتمل ہے۔

۲۔ **درجہ تجوید:** عربی طلبہ کے لیے روایت حفص تک تجوید حاصل کرنا ضروری ہے۔

۳۔ **درجہ عربی زنانہ:** میں سہ سالہ نصاب رائج ہے جو صرف، نحو، فقہ، حدیث، ترجمہ قرآن پاک و تفسیر پر مشتمل ہے۔

۴۔ **درجہ حفظ مردانہ و زنانہ:** میں اردو نوشت و خواند فقہ کی کتابوں کے لیے لازمی ہے۔

۵۔ **دارالافتاء:** بھی عوام کی دینی رہنمائی کے لیے قائم کیا گیا ہے۔

۶۔ **کتب خانہ:** مدرسہ کے کتب خانہ میں دس ہزار سے اوپر عربی، فارسی، اردو، انگریزی کی کتابیں فراہم کی گئی ہیں۔

۷۔ **دارالمطالعہ:** طلباء مدرسہ اور عوام کے لیے دارالمطالعہ کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

۸۔ **دارالاقامہ:** میں ڈیڑھ صد سے اوپر مسافر طلباء جو قرآن پاک اور درس نظامی کی تعلیم کے لیے مختلف علاقوں سے آئے ہیں ان کے قیام و طعام، پوشاک، ادویات وغیرہ جملہ ضروریات مدرسہ ہی فراہم کرتا ہے۔

۹۔ مستند اور تجربہ کار معلمین و معلمات یکجا اکٹھے کر دیئے ہیں جو انضباط اوقات کے ساتھ تعلیمی فرائض میں مشغول ہیں۔

۱۰۔ ان تمام انتظامات پر ایک لاکھ سے اوپر کے اخراجات کا بجٹ مستقل ہے مگر آمدنی مستقل نہیں اور نہ ہی کوئی سفیر ہے جو باہر سے چندہ لانے کا [illegible] پر مامور ہو۔ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اسی کے بھروسہ پر خوش اسلوبی سے تمام کام انجام پاتے ہیں۔ مدرسہ رجسٹرڈ ہے حساب باقاعدہ آڈٹ ہوتا ہے۔ مدرسہ انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

حکیم الاسلام حضرت علامہ قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند مدرسہ ھذا کے بارے میں فرماتے ہیں: "مدرسہ بحمداللہ اپنے تعلیمی کام میں مشغول و منہمک ہے اور مستفیدوں اور طلباء کو علم پہنچا رہا ہے۔ کارکن مخلص اور اسلامی سادگی کا نمونہ ہیں۔"

عبدالرحیم نعمانی مہتمم مدرسہ عربیہ اسلامیہ بورے والا ضلع ملتان

تبلیغ اسلام اور تعلیم و اشاعت قرآن کا بے مثل تاریخی ادارہ

انجمن خدام الدین پاکستان

لاہور، کراچی

مؤسس و بانی قطب الاقطاب شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری نور اللہ مرقدہ

جب برصغیر پر برطانوی تسلط و استبداد اپنی انتہا کو پہنچ گیا، تحریک مجاہدین اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکام ہو گئی تو حصول مقاصد کے لیے علمائے حق نے تحریک دارالعلوم دیوبند کا آغاز کیا جس نے آگے چل کر تحریک علی گڑھ اور تحریک دیوبند کو قرآن حکیم کی اساس پر دہلی میں "نظارۃ المعارف القرآنیہ" کی شکل میں جمع کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے جنگ عظیم اول شروع ہو گئی اس سے تحریک ہجرت و تحریک ریشمی رومال معرض وجود میں آئی جس میں شرکت کی پاداش میں برٹش سامراج نے حضرت شیخ التفسیر کو لاہور میں نظر بند کر دیا تو گویا نظارت المعارف دہلی سے خدام الدین و قاسم العلوم کے نام سے لاہور منتقل ہو گئے۔

انجمن کے شعبہ جات — مدرسہ قاسم العلوم

جس کی مستقل عمارت اور عظیم الشان مسجد بھی موجود ہے۔ بحمداللہ الحاد کے اس دور پر فتن میں گذشتہ نصف صدی سے اسلامی علوم و فنون کی سرمدی تعلیمات کی شمع فروزاں کیے ہوئے ہے۔ اس شعبہ کی زیر نگرانی درس نظامی، درس قرآن عمومی و خصوصی علاوہ حفظ قرآن اور قرأت و تجوید کا معقول انتظام ہے۔ سالانہ دورہ تفسیر قرآن کے فضلاء کو حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مدنیؒ، حضرت عثمانیؒ، حضرت لاہوریؒ کے دستخطوں سے مزین سند دی جاتی ہے۔ بفضل تعالیٰ ۷ ہزار کے قریب علماء دورہ تفسیر سے استفادہ کر چکے ہیں۔

مدرسۃ البنات

انجمن نے لاہور اور کراچی میں مسلمان بچیوں کی قرآن و سنت کی ضروری تعلیم کے ساتھ ساتھ امور خانہ داری سکھلانے کا معقول بندوبست کیا ہے۔

شعبہ نشر و اشاعت

حضرت شیخ التفسیرؒ کے ۲۴ رسائل ۳ لاکھ کی تعداد میں چھپ کر دنیا کے کونے کونے میں مفت تقسیم ہو چکے ہیں جبکہ انگریزی کے رسائل کی تعداد پچاس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ علاوہ ازیں سورہ علق، سورہ عصر، سورہ قریش، سورہ کوثر اور تفسیر معوذتین بڑی تعداد میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں اور خلاصۃ المشکوٰۃ، مجموعہ صد احادیث اکثر مدارس کے نصاب میں شامل ہیں۔ نیز حضرت بانی مرحوم کا قرآن عزیز عکسی طباعت سے مزین مع فہرست مضامین قرآنیہ کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ بانی مرحوم نے حضرت امروٹی قدس سرہ کا ترجمہ بزبان سندھی دس بار چھپوایا جس سے سندھ میں بہت استفادہ کیا گیا۔

ہفت روزہ خدام الدین لاہور

۱۹۵۰ء میں حضرت بانی ادارہ نے رفقاء کی خواہش پر "خدام الدین" کے اجراء کی اجازت دی جو دینی و روحانی دنیا کا ایک کثیر الاشاعت اور مقبول عام پرچہ ہے اور جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے لاتعداد گم کردہ راہ لوگوں کو ہدایت نصیب فرمائی۔ انجمن نے آج تک کوئی سفیر وغیرہ نہیں رکھا نہ ہی چندہ کی اپیل کی، الحمدللہ رب العزت اپنے خصوصی فضل سے تمام ضروریات پوری فرما دیتے ہیں۔

احقر عبیداللہ انور امیر انجمن خدام الدین رجسٹرڈ لاہور۔

مختصر فہرست

کتاب	قیمت
اشرف الجواب حصہ اول	۱/۲۵
〃 〃 دوم	-/۶
〃 〃 سوم	۲/۵۰
〃 〃 چہارم	-/۷
اسالیب الانشاء	-/۵
اشراق نوری ترجمہ قدوری	-/۹
انفاس قدسیہ	-/۷
النحو الواضح مصری (ابتدائیہ)	۱۳/۵۰
〃 (ثانویہ)	-/۱۸
القراءۃ الرشیدہ کامل (مصری)	-/۲۰
ازالۃ الرین حقوق الوالدین	-۴۰
اسلام کی صداقت غیر مسلموں کی نظر میں	-/۴
انتباہات المفیدہ	-/۳
الفوز الکبیر (مصری)	۳/۵۰
اسلام اور پردہ (مدنی)	-۴۰
ابن الوقت کی خانہ تلاشی	-/۴
آنکھوں کی ٹھنڈک	-/۸
اقامۃ القیامۃ	-/۵
اعمال قرآنی مع ترجمہ مکمل	-/۳
السیف الجلی کامل	-/۱۵
الجھن کی پہیلی	-۶۰
بانی دارالعلوم دیوبند	-/۲
بہشتی زیور ہندی حصہ اول	-/۲
تحفۃ الادب شرح اردو نفحۃ العرب	-/۱۸
تیسیر المبتدی	-۵۰
تذکرۃ الرشید	۲۲/۵۰
تقریر شیخ الاسلام	۱/۲۰
تقریر سیرت اسعد مدنی	-۶۰
تاریخ محمودیت رد قادیانیت	-/۴
جوہرہ نیرہ	-/۳۰
چشمۂ ہدایت شرعیہ	-/۱
حقیقت یزید	-/۲
حفظ الایمان مع بسط البنان	-/۷۵
خط امام غزالی بنام خاص شاگرد خود	-/۶۰
خطبات مدراس	-/۲
ڈاڑھی کا فلسفہ	-/۶۰
دینی ضرورت	۱/۵۰
دارالعلوم کا مکمل فوٹو	-/۵
راہ سنت	-/۹
رویت ہلال	-/۷۵
رفیق سفر مع آداب و احکام	-/۱
رحمانی قاعدہ عربی	-/۶۰
〃 〃 اردو	-/۶۰
شریعت و طریقت	-/۱۲
شرح اردو علم الصیغہ	-/۵
شرح کریما اردو	-/۵
شیخ الاسلام صحافیوں کی نظر میں	-/۵
شرح اردو گلزار دبستاں	-/۳

کتاب	قیمت
شرح اردو نورالانوار جلد اول	[illegible]
〃 〃 دوم	[illegible]
〃 قطبی تصوریت	۵/-
〃 تصدیقات	[illegible]
〃 ملاحسن	۱۱/-
〃 میبذی	۱۲/-
〃 صغری	-/۶۰
〃 کبری	۱/۲۰
شیخ الاسلام جنتری	-/۶۰
شرح جزری مع تحفۃ الاطفال	۱/۵۰
〃 فارسی کی پہلی	۱/۵۰
〃 نحو میر	۶/-
شیخ الاسلام کے اہم چند غیر مطبوعہ خطوط	۳/-
فتاوی احتیاط طہر	-/۴۰
عالمگیری مصری مع قاضی خاں و بزازیہ	۲۰۰/-
شامی مصری کامل	۴۰۰/-
فیض الملہم شرح اردو مسلم شریف فی قسط	۴/-
فصل الخطاب فی تحقیق مسئلۃ الغراب	۱/۲۰
قرآن اور اس کے حقوق	۷/-
قاعدہ انجمن حمایت الاسلام	-/۶۰
قطع الوتین مکمل	۱/-
قبر پر اذان کی تحقیق	۱/-
قلائد الازہار شرح عربی کتاب الآثار امام محمدؒ	۲۵/-
〃 〃 جلد دوم	۳۰/-
〃 〃 جلد سوم	۳۰/-
کشف الظلام فی تحقیق الالف واللام	-/۴۰
کمالات اشرفیہ	۱۲/-
کاروان خیال آزاد	۲/۵۰
کلمات طیبات	۱/۴۰

کتاب	قیمت
کیا پردہ ملک کی ترقی میں رکاوٹ ہے	-/۴
لطائف فقہیہ زیر طبع	
مکاتیب حضرت مدنیؒ	۳/-
معدن الحقائق شرح اردو کنز الدقائق	
〃 〃 〃 جلد اول	۲۳/-
〃 جلد دوم	۲۳/-
مجالس الابرار فی جز	۵/-
مسافر آخرت	-/۳۰
ملفوظات و مخطوطات	۵/-
مرقات شرح مشکوٰۃ مصری فی جلد	۳۰/-
مکاتیب طیب	۵/-
مخزن اخلاق	۲۲/-
میٹرا میڈیکا	۴/-
معلم الانشاء عربی	[illegible]
مسئلہ تقلید اور جماعت اسلامی	۱/-
نور الدرایہ شرح اردو ہدایہ فی قسط	۴/-
نیل الامانی شرح اردو مختصر المعانی جلد اول	۳/-
〃 〃 جلد دوم	۲/-
نحو میر درسی	۱/۵۰
نصیحت المسلمین	۴/-
نایاب خطوط شیخ الاسلامؒ	
رحمۃ للعالمین	۳۶/-
تاریخ اسلام اکبر خاں	۶۰/-
القاموس الجدید اردو سے عربی	۱۸/-
〃 عربی سے اردو	۱۵/-
القراءۃ الواضحہ اول	۲/۴۵
〃 دوم	۳/۵۰
〃 سوم	۴/۵۰
؁ ؁	؁